

سیرت

محمّد ﷺ  
خاکِ انبیین

مُصَنَّفٌ

حضرت مرزا بشیر احمد ایم۔ اے

## بیادگار مقدس

حضرت اقدس حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی  
مسیح موعود و مہدی معہود جزى اللہ فی حلل الانبیاء علیہ  
و علی مطاعہ محمد الصلوٰۃ والسلام جن کی بعثت کے  
ذریعہ سے اس زمانہ میں اللہ کے حکم کے ساتھ دوبارہ  
جمال محمدی کا ظہور ہوا۔

از طرف احقر الخدام  
خاکسار مرزا بشیر احمد

قادیان مورخہ ۱۲ شوال ۱۳۳۸ھ

مطابق یکم جولائی ۱۹۲۰ء



## پیش لفظ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح پر آج تک ہزاروں کتب لکھی گئی ہیں۔ لیکن حضرت مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کی تصنیف سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں تمام واقعات کی صحت کا مدار سب سے اوّل قرآن کریم اور دوسرے نمبر پر صحاح ستہ پر رکھا گیا ہے اور کتب تاریخ میں متاخرین کی بجائے ابتدائی مورخین اور سیرت نگاروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ غیر مستند مواد سے پاک ہے اور اس کی صحت اور مستند ہونے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

حضرت میاں صاحب نے اپنی اس تصنیف میں اس امر کا خاص طور پر اہتمام فرمایا ہے کہ مغرب کے متعصب مستشرقین نے جن مقامات پر تاریخ اسلام کے بعض واقعات کو قابل اعتراض ٹھہرایا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کی کوشش کی ہے آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے علم کلام کی روشنی میں ان کا رد فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں علاوہ تاریخی مواد کے آج کل زیر بحث آنے والے بہت سے علمی مسائل مثلاً "جمع و ترتیب قرآن کریم"، "معجزہ کی حقیقت"، "جہاد بالسیف"، "غیر مسلموں سے رواداری"، "جزیہ"، "غلامی"، "عورتوں کے حقوق"، "تعدد ازواج"، "شادی اور طلاق کے متعلق اسلامی قوانین اور اسلام کی عادلانہ جمہوری طرز حکومت پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔

حضرت میاں صاحب نے کمال عشق اور محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کردار کو موجودہ دور کے ذوق کے مطابق انتہائی دلنشین رنگ میں پیش فرمایا ہے اور فرط عقیدت کے باوجود سند اور درایت کے لحاظ سے ضعیف روایات کو اس مجموعہ میں راہ نہیں پانے دی اور واقعات کو مستند ماخذ سے ان کے صحیح تناظر میں پیش فرمایا ہے۔

انہی خصوصیات کی بناء پر یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی۔ حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے۔

"میں سمجھتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سیرتیں شائع ہو چکی

ہیں ان میں سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس تصنیف میں ان علوم کا بھی پر تو ہے جو

اعتراضات اور طرز تحریر کو مد نظر رکھنے کے واسطے میں نے لائف آف محمد (رحمہ اللہ) مصنفہ سرویم میور، محمد (رحمہ اللہ) مصنفہ پروفیسر مارگولیس اور بعض دیگر تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھا ہے۔ جغرافیہ عرب کے واسطے معجم البلدان کو میں نے نہایت کار آمد اور قابل اعتبار رفیق پایا ہے۔ جامعیت کے لحاظ سے تاریخ خمیس اور سیرۃ الحلبيہ کا میں نے جواب نہیں دیکھا مگر افسوس تحقیق سے خالی ہیں۔

غرض میں نے اپنی طرف سے پوری تحقیق اور چھان بین سے کام لیا ہے مگر انسان مرکب من الخطاء والنسيان فارجو ممن طالع کتابی هذا ان یسامحنی اذا وقف علی خطاء او سهو فیہ ویدعوا اللہ ان یمہدینی الی الصراط المستقیم فانہ لامضل لمن ہداه ولا ہادی لمن اضله بیدہ الخیر کلہ و هو المستعان۔

اس کتاب کی تیاری میں جن احباب کی طرف سے مجھے کسی قسم کی مدد پہنچی ہے ان سب کا میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خصوصاً استاذی المکرم حضرت مولوی شیر علی صاحب بی اے۔ ایڈیٹر ریویو آف ریلیجنز قادیان کا جن کے مفید مشورہ سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اور مکرمی جناب مولوی فضل دین صاحب وکیل قادیان کا جنہوں نے مسودوں کے مطالعہ کے علاوہ مجھے ضروری حوالجات کی تلاش میں بہت مدد دی۔ اور مکرمی ماسٹر احمد حسین صاحب فرید آبادی ثم قادیانی کا جنہوں نے ادبی لحاظ سے مضمون میں مناسب اصلاح کی۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد

۱۳ شوال ۱۳۳۸ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۲۰ء

بسم الله الرحمن الرحيم  
نحمده و نصلى على رسوله الكريم

## عرض حال

### جلد اول

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری جو ”ہمارا آقا“ کے نام سے رسالہ ریویو آف ویلیجنز قادیان کے اردو ایڈیشن میں ۱۹۱۹ء کے ابتدا سے شائع ہو رہی ہے اس وقت اس کا پہلا حصہ جو آپ کی مکی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے بعد نظر ثانی کتابی صورت میں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں صرف آنحضرت ﷺ کے سوانح تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس زمانہ کی عام تاریخ اور صحابہ کرامؓ کے حالات پر بھی ہر مناسب موقعہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے گویا مضمون کے لحاظ سے اس کتاب کا نام دراصل تاریخ اسلام حصہ اول سمجھنا چاہئے۔

میرا ارادہ ہے واللہ الموفق کہ آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کو تین حصوں میں تقسیم کروں۔

پہلا حصہ وہ ہے جو بعض ابتدائی امور، جغرافیہ عرب، بعثت نبویؐ کے وقت قبائل عرب کی تقسیم اور ان کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالت، تاریخ کعبہ و مکہ، تاریخ قریش، آنحضرت ﷺ کے قبیلہ کے حالات، آپ کی پیدائش و حالات زندگی تا بعثت، دعویٰ نبوت و اشاعت اسلام اور حالات زندگی بعد بعثت تا ہجرت تحریر کئے گئے ہیں۔ یہ وہ حصہ ہے جو بعد نظر ثانی و مناسب تغیر و تبدل اب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

دوسرا حصہ جو ابھی معرض تحریر میں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کے حالات اور اس زمانے کی اسلامی تاریخ پر مشتمل ہو گا۔

اور تیسرا حصہ آنحضرت ﷺ کی سیرت کے متعلق ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ و ہو الموفق۔

اس کتاب کی تصنیف سے میری یہ غرض ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو عموماً آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور ابتدائی اسلامی تاریخ سے بالکل بے خبر ہیں۔ مختصر طور پر عام فہم اور سادہ مگر دلچسپ پیرایہ میں صحیح حالات سے واقف کیا جاوے اور نیز یہ بھی کہ تا اس ذریعہ سے خدا چاہے تو میرے لئے سعادت اخروی کا سامان پیدا ہو۔

یہ ایک نہایت تکلیف دہ منظر ہے کہ ہمارے نوجوان دیگر اقوام و مذاہب کے بادشاہوں، جرنیلوں اور مدبروں کے حالات سے تو واقف ہیں اور ان کی سوانح عمریاں پڑھتے ہیں مگر اپنے آقا اور مقتدا آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں مگر ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک اردو زبان میں آنحضرت ﷺ کی کوئی بھی ایسی سوانح عمری نہیں لکھی گئی جو اس زمانہ کی طبائع کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

مولانا شبلی کی تصنیف جس کے بعض حصے ابھی تک معرض طبع میں نہیں آئے میرے اس ریمارک سے مستثنیٰ ہے مگر بعض وجوہات سے وہ بھی عام اسلامی پبلک کے دائرہ تہت میں نہیں آ سکتی۔ بہر حال میری طبیعت نے اردو لٹریچر میں ایک کمی کو محسوس کیا ہے جسے پورا کرنے کی میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے اگر میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں تو زہے قسمت اور اگر نہیں تو خدا سے دعا ہے کہ میری یہ ادھوری اور ناقص کوشش کسی ایسے نیک دل میں تحریک کرے کہ جو اس کمی کو پورا کر سکے۔

میں نے اس کتاب کی تیاری کے لئے کسی ایک کتاب پر پورا بھروسہ نہیں کیا خصوصاً متاخرین کی تصنیفات کو بغیر اپنی مستقل تحقیق کے ہرگز قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ متقدمین میں سے چار کتب تاریخی طور پر آنحضرت ﷺ کے سوانح کے لئے اصل مآخذ سمجھی گئی ہیں۔ اہل اول سیرۃ ابن ہشام جو سیرۃ ابن اسحاق سے ماخوذ ہے۔ دوسرے طبقات ابن سعد۔ تیسرے طبری اور چوتھے ولقدی۔ ان سب کا میں نے حتی الوسع باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اور سب سے فائدہ اٹھایا ہے ان کتب کے بیان کردہ واقعات کی چھان بین اور تحقیق کے واسطے میں نے قرآن شریف اور کتب احادیث خصوصاً صحاح ستہ کو حتی الوسع ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ متاخرین کی کتب میں سے زر قانی۔ شرح مواہب اللدنیہ۔ تاریخ الکامل ابن اثیر۔ اسد الغابہ اور اصابہ فی معرفۃ الصحابہ اور سیرۃ النبی مصنفہ مولانا شبلی سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یورپ کے

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلام کی تبلیغ میں بہت آسانی پیدا ہو جائے گی۔

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا موجودہ ایڈیشن ان تین جلدوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۲۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تھیں (پہلی جلد پر حضرت میاں صاحب نے بعد میں نظر ثانی بھی فرمائی تھی)۔ اس طرح یہ مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لیکر ۷ ہجری تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت میاں صاحب رضی اللہ عنہ باوجود انتہائی خواہش کے اپنی زندگی میں اس مہتمم بالشان علمی شاہکار کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ حضرت میاں صاحب نے سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حصہ کے لئے مجوزہ عنوانات بھی اپنے مخصوص انداز میں مرتب فرما کر شائع کر دیئے تھے۔ یہ عنوانات بھی موجودہ ایڈیشن میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اس کام کی تکمیل جماعت کے تعلیم یافتہ طبقہ پر ایک قرض ہے۔ خدا تعالیٰ کرے کہ ہم اس کو ادا کر سکیں۔

حضرت میاں صاحبؒ نے اس مگر انقدر تصنیف کو محض ایک تاریخ کی حیثیت سے نہیں لکھا بلکہ آپ کا اول ترین مقصد اس سے یہ تھا کہ قوم کے نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”اے اللہ! تو اپنے فضل سے ایسا کر کہ تیرے بندے اسے پڑھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور تیرے برگزیدہ رسولؐ کے پاک نمونہ پر چل کر تیری رضا حاصل کریں۔“

جماعت کے ہر فرد کو یہ کتاب پڑھ کر حضرت میاں صاحب رضی اللہ عنہ کی اس نیک خواہش کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے اور دوسروں کو اسے تحفہ میں دینا چاہیے کیونکہ یہ تصنیف ایک مثبت دلیل ہے اس عقیدت و ارادت کی جو جماعت احمدیہ کا ہر فرد حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھتا ہے۔

آخر میں ان واقف زندگی احباب کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے اس ایڈیشن کی تیاری میں مختلف خدمات سرانجام دی ہیں۔ مولوی محمد اعظم اکسیر۔ مولوی سلطان احمد شاہد۔ مولوی فضل کریم تبسم۔ مولوی مقصود احمد قمر۔ مولوی مبارک احمد نجیب۔ طاہر محمود احمد اور رانا محمود احمد شاہد۔ احباب انہیں بھی اور خاکسار کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام

سید عبدالحی

# فہرست مضامین

## سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

### حصہ اول

۳	..... تاریخ اسلام کے ابتدائی ماخذ
۴	..... قبل از اسلام روایات و اشعار
۵	..... قرآن شریف
۹	..... تاریخ اسلام کے روایتی ماخذ
۴۳	..... <u>عرب کا ملک اور اس کے باشندے</u>
۵۲	..... ظہور اسلام سے پہلے عرب کا تہذیب و تمدن
۵۴	..... تعلیم اور قدیم شاعری
۵۹	..... عورت کی حیثیت
۶۱	..... قدیم مذاہب عرب
	<u>مکہ مکعبہ اور قریش</u>
۶۵	..... ابوالانبیاء خلیل اللہ
۶۸	..... اسماعیل ذبح اللہ
۶۹	..... حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب

۷۵	تعمیر کعبہ
۷۷	تولیت کعبہ
۷۹	کعبہ کی دوبارہ 'سہ بارہ تعمیر
۸۱	نقشہ کعبہ و مسجد حرام
۸۲	قریش
۸۸	چاہ زمزم کی تلاش
۸۹	اصحاب الفیل
۹۳	<u>ابتدائی زندگی</u>
۹۳	ولادت باسعادت
۹۷	کھالت
۱۰۰	سفر شام
۱۰۳	حرب فجار
۱۰۴	حلف الفضول
۱۰۶	مشاغل تجارت
۱۰۷	حضرت خدیجہؓ سے شادی
۱۰۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت
۱۰۸	کعبہ کی جدید تعمیر
۱۱۳	<u>ابتدائی زندگی پر ایک سرسری نظر</u>
۱۱۷	آغاز رسالت
۱۳۶	ایام کش مکش
۱۳۶	ہجرت حبشہ
۱۶۵	مسلمانوں کے خلاف معاہدہ قریش اور مسلمانوں کا بایکٹ
۱۶۸	شق القمر کا معجزہ
	<u>توسیع اشاعت</u>
۱۸۱	قبائل کا دورہ
۱۸۱	طائف کا سفر
۱۸۳	آپؐ کی خدمت میں جنات کا وفد

۱۸۸	قبیلہ دوس میں اسلام
۱۸۹	معراج اور اسراء
۲۰۸	ہجرت نماز کا فرض ہونا
	سلطنت ہائے روم و فارس کی جنگ اور اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
۲۱۶	کی پیگھو کی
۲۱۷	قبائل عرب کو تبلیغ اسلام
۲۲۰	<u>وطن سے بے وطن</u>
۲۲۱	یثرب میں اسلام
۲۲۲	بیعت عقبہ اولیٰ
۲۲۷	بیعت عقبہ ثانیہ
۲۳۶	آغاز سفر ہجرت اور قریش کا تعاقب
۲۳۹	سفر ہجرت اور سراقہ بن مالک کا تعاقب
۲۴۴	<u>مکی زندگی پر ایک سرسری نظر</u>

## حصہ دوم

۲۴۱	<u>مدینہ کا ابتدائی قیام اور حکومت اسلامی کی تاسیس</u>
۲۶۴	نزدول قباء
۲۶۶	ورود مدینہ اور جمعہ کی پہلی نماز
۲۶۹	تعمیر مسجد نبوی
۲۷۱	ابتدائے اذان
۲۷۵	مواخات انصار و مہاجرین
۲۷۷	مدینہ کی سوسائٹی کی تقسیم اور یہود کے ساتھ معاہدہ
۲۸۳	قبائل عرب کی متحدہ مخالفت
۲۸۷	<u>جہاد بالسیف کا آغاز اور اصولی بحث</u>



۲۹۱	.....	کبھی کوئی شخص جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا
۲۹۳	.....	صحابہ کی زندگیاں جبر کے خیال کی مکتب ہیں
۲۹۵	.....	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی خواہش جبر کے خیال کو جھٹلاتی ہے
۲۹۷	.....	فتح مکہ کے موقع پر سینکڑوں کفار اسلام سے منکر رہے
۲۹۷	.....	وجوہات جنگ
۳۱۵	.....	اسلامی آداب جہاد

ابتدائی لڑائیاں۔ روزہ کی ابتداء۔ تحویل قبلہ

### اور جنگ بدر کے متعلق ابتدائی بحث

۳۲۷	.....	غزوات و سرایا کا آغاز
۳۲۸	.....	تحویل قبلہ
۳۳۶	.....	صیام رمضان
۳۳۷	.....	عید الفطر
۳۳۹	.....	جنگ بدر کے متعلق ایک ابتدائی بحث

غلاموں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

### سلوک اور مسئلہ غلامی کے متعلق آپ کی تعلیم

۳۹۱	.....	مسلمانوں نے غلامی کی آزادی کی تعلیم پر کس طرح عمل کیا
۳۹۸	.....	آزاد شدہ غلاموں کے لئے تمام ترقی کے دروازے کھلے تھے
۳۹۹	.....	تمام غلاموں کو یکفخت کیوں نہ آزاد کر دیا گیا
۴۰۲	.....	اسلامی ممالک میں غلامی کیوں قائم رہی
۴۰۵	.....	غلاموں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت
۴۰۶	.....	آئندہ غلامی کو روکنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم
۴۰۹	.....	جنگی قیدیوں کا مسئلہ
۴۱۷	.....	لونڈیوں کا مخصوص مسئلہ

### جنگ بدر۔ اسلامی سلطنت کا استحکام اور رؤساء قریش کی تباہی

۴۷۷	.....	روی سلطنت کی فتح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیچھوٹی
-----	-------	---

## حضرت عائشہ کار خستہ اور ان کی عمر کی بحث

تعدد ازدواج کا مسئلہ۔ دو فرضی واقعات ..... ۴۴۳

قبائل نجد اور یہود کے ساتھ جنگ کا آغاز۔ حضرت فاطمہؓ

اور حفصہؓ کی شادی اور بعض متفرق واقعات ..... ۴۵۲

عید الاضحیٰ ..... ۴۵۴

جنت البقیع اور اس کا پہلا دفن ..... ۴۶۲

تزوج ام کلثوم ..... ۴۶۳

قتل کعب بن اشرف ..... ۴۶۶

ولادت امام حسنؓ ..... ۴۸۰

ایک مصیبت کا دھکہ۔ قانون ورثہ۔ حرمت شراب

کفار کی غداری اور دو دروناک واقعات ..... ۴۸۲

جنگ احد ..... ۴۸۲

غزوہ حراء الاسد ..... ۵۰۳

یہود کی دوسری غداری۔ جمع و ترتیب قرآن۔ حضرت زینب

کی شادی۔ واقعہ اُفک اور منافقین کی فتنہ پردازی ..... ۵۲۲

ولادت حسینؓ ..... ۵۲۸

تزوج ام سلمہؓ ..... ۵۳۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب خاص اور عبرانی کی تعلیم ..... ۵۳۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بین الاقوامی قاضی کی حیثیت میں ..... ۵۳۹

مدینہ میں خسوف قمر اور صلوٰۃ خسوف ..... ۵۴۲

پردے کے احکام کا نزول ..... ۵۴۷

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقصد مطلب وحی اتار لیا کرتے تھے ..... ۵۵۵

جویریہ بنت حارث کی شادی ..... ۵۷۰

۵۷۲ ..... عزل یعنی برتھ کنٹرول کی اجازت  
 مدینہ کا محاصرہ اور مسلمانوں کی نازک حالت۔ کفار کی نافرمانی۔ حقیقت معجزہ

۵۷۳	..... جنگ احزاب
۵۷۸	..... معجزہ کی حقیقت
۵۹۷	..... بنو قریظہ کی غداری اور مدینہ میں یسود کا خاتمہ۔ قانون شادی و طلاق
۶۰۴	..... ریحانہ کا غلط واقعہ
۶۱۳	..... انصار کے رئیس اعظم کی وفات اور نعماء جنت کی حقیقت
۶۱۶	..... فنون سیاہ گری کی طرف توجہ
۶۳۰	..... مدنی زندگی کے پہلے دور کا خاتمہ اور اسلامی طریق حکومت
۶۳۲	..... حکومت کا حق صرف جمہور کو حاصل ہے
۶۳۳	..... حکومت کے لئے مشورہ ضروری ہے
۶۳۶	..... بنو امیہ کی خلافت صحیح اسلامی خلافت نہ تھی
۶۳۸	..... کیا امارت سے دستبرداری کی جاسکتی ہے
۶۴۱	..... اسلامی اطاعت کا معیار
۶۴۴	..... کیا امارت کا حق صرف قریش کے ساتھ مخصوص ہے
۶۴۸	..... غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات
۶۵۰	..... مذہبی رواداری
۶۵۱	..... جزیہ کا مسئلہ
۶۵۳	..... عام سلوک اور سیاسی تعلقات
۶۵۵	..... عدل و انصاف
۶۵۶	..... غریب ذمیوں کی امداد
۶۵۷	..... دوسری اقوام کے مذہبی بزرگوں کا احترام

### حصہ سوم

۶۵۹	..... مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز اور صلح حدیبیہ سے پہلے کا زمانہ
۶۶۳	..... ثمامہ بن اخیال رئیس یمامہ کا اسلام لانا
۶۶۶	..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں جائیں گے

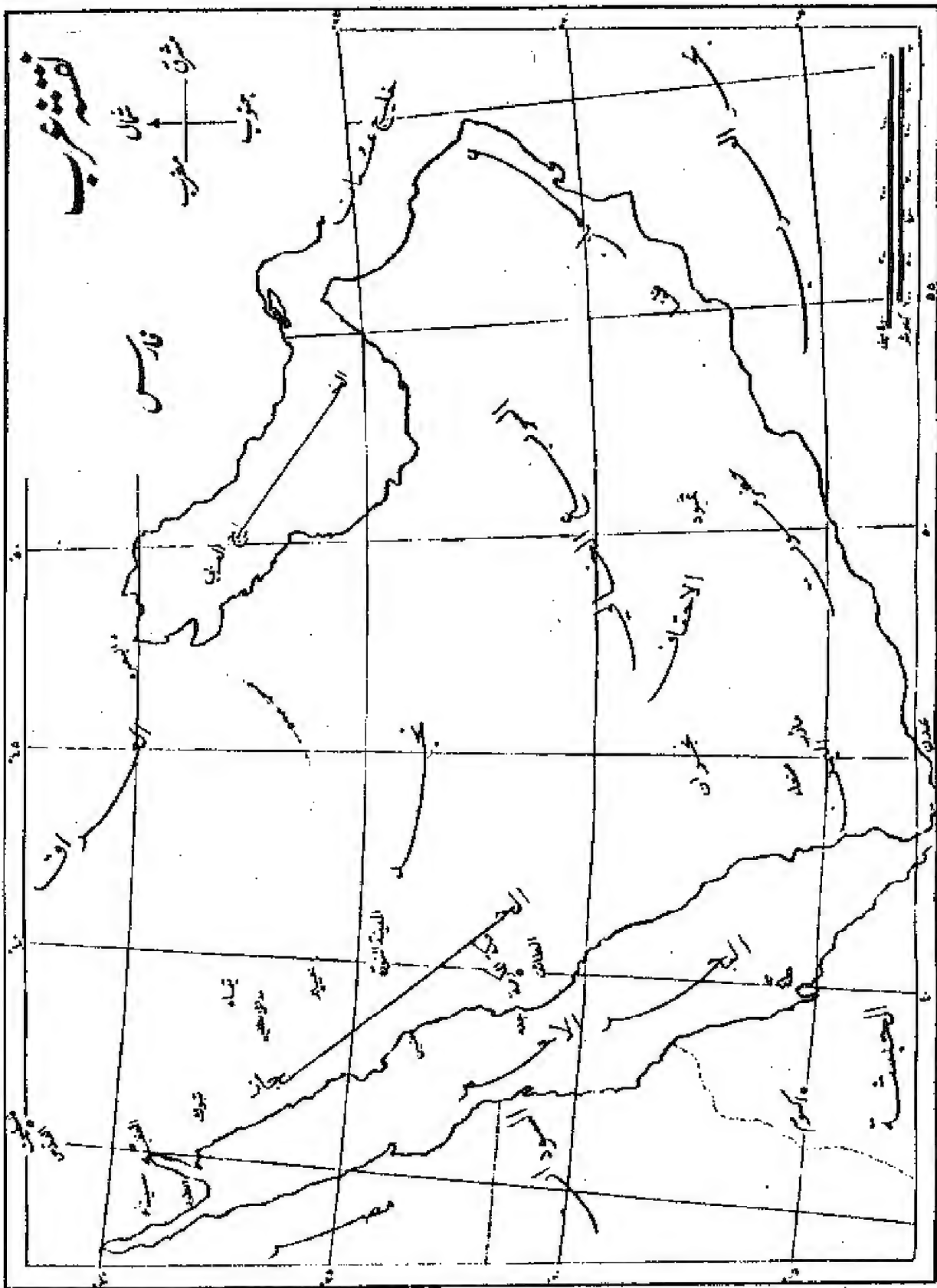
- ۶۷۰ ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص کا مسلمان ہونا
- ۶۷۱ ..... ایک مسلمان اور کافر کے ازدواجی تعلق کے متعلق اسلامی تعلیم
- ۶۷۵ ..... سفر سے واپسی کی دعا
- ۶۷۷ ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق توریہ کا الزام
- ۶۸۳ ..... زید بن حارثہ کی امارت پر لوگوں کا اعتراض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب
- ۶۸۴ ..... مساوات اسلامی پر ایک مختصر نوٹ
- ۶۸۸ ..... عام تعلقات میں مراتب کو ملحوظ رکھنے کی تلقین
- ۶۹۱ ..... سوشل اجتماعوں میں برادرانہ اختلاط
- ۶۹۳ ..... خادم و آقا کے تعلقات
- ۶۹۴ ..... بیاہ شادی کے معاملات میں اسلامی تعلیم
- ۶۹۵ ..... مرد و عورت میں حقوق کی مساوات
- ۶۹۷ ..... اسلام میں دولت کی تقسیم کا نظریہ
- ۷۰۱ ..... معذور لوگوں کی ذمہ داری حکومت پر ہے
- ۷۰۲ ..... اقتصادی مساوات کے متعلق ایک خاص نکتہ
- ۷۰۴ ..... اسلام ایک وسطی نظریہ پیش کرتا ہے
- ۷۰۶ ..... استثنائی حالات میں خوراک کی مساویانہ تقسیم
- ۷۰۹ ..... دینی اور روحانی امور میں مساوات
- ۷۱۷ ..... ام قرفہ کے قتل کا غلط واقعہ
- ۷۲۱ ..... اہل خیبر کی شرارت اور ابو رافع یہودی کا قتل
- ۷۲۶ ..... مدینہ میں بارش کا قحط اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے استسقاء
- ۷۲۸ ..... اسلام میں قبولیت دعا کا مسئلہ
- ۷۳۸ ..... اہل خیبر کی طرف سے مزید خطرہ اور قتل اسیر بن رزام
- ۷۴۱ ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش
- ۷۴۴ ..... قبائل عک و عیینہ کی غداری
- ۷۴۸ ..... صلح حدیبیہ اور اس کے عظیم الشان نتائج
- ۷۶۱ ..... بیعت رضوان
- ۷۸۵ ..... اسلامی سیاست اسلام کے دینی نظام سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہے
- ۷۸۷ ..... اسلام کی امن اور جنگ کی طاقت کا مقابلہ

## اسود و احمر کے نام اسلام کا پیغام

۷۹۲	قیصرو کسریٰ کو دعوت حق
۷۹۲	اسلام کا تبلیغی نظریہ
۷۹۳	دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں
۷۹۵	اسلام کا عالمگیر مشن
۷۹۶	اسلام کی دائمی شریعت
۷۹۷	انگلوٹھی کی تیاری
۷۹۸	عرب کے چاروں اطراف میں تبلیغی مہم
۷۹۹	قیصرو کسریٰ کی باہمی کشمکش اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان پیچیدگیاں
۸۰۲	ہرقل کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط
۸۱۳	کسریٰ کے نام خط
۸۱۸	مقوقس مصر کے نام خط
۸۲۲	نجاشی کے نام تبلیغی خط
۸۲۸	رئیس غسان کے نام خط
۸۳۰	رئیس یرامہ کے نام خط
۸۳۱	جوعے اور شطرنج کی ممانعت
۸۳۷	مجوزہ عناوین

# سیرت خاتم النبیین ﷺ

حصہ اول



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
لَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

## سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کے ابتدائی ماخذ



اسلام کا آغاز ایک ایسے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جو اکثر ملکوں کے لیے ایک غیر تاریخی زمانہ تھا جبکہ نہ صرف ابھی بطبع کی ایجاد عالم وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ فن تحریر و تصنیف بھی ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھا۔ معروف مسیحی سنہ کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ۵۷۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اکثر اقوام عالم فن تصنیف سے بالکل نا آشنا تھیں اور صرف ایسی قوموں میں کسی حد تک اس کا رواج پایا جاتا تھا جو کسی نہ کسی جہت سے علمی یا سیاسی رنگ میں ترقی یافتہ تھیں، لیکن جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، اسلام سے پہلے عرب کا ملک نہ صرف بیرونی دنیا سے بالکل منقطع تھا بلکہ اندرونی تحریکات کے لحاظ سے بھی ہر قسم کی علمی اور سیاسی اور تمدنی تحریک سے کلیتہً خالی تھا، اس لیے گو اسلام سے پہلے بھی عرب میں بعض لکھے پڑھے لوگ پائے جاتے تھے مگر ان کا مبلغ علم محض نوشت و خواندہ تک محدود تھا اور اسلام سے پہلے زمانہ کی کوئی عربی تصنیف یا اس زمانہ کے متعلق عرب کی تاریخ کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ہے۔ بیشک بعض قدیم اقوام عرب کے آثار و کتبات موجود ہیں، لیکن عرب جیسے ملک کی تاریخ کے لیے یہ ماخذ کسی صورت میں مربوط اور تفصیلی معلومات کی بنیاد نہیں بن سکتا۔



دوسرے درجہ پر ان قوموں اور حکومتوں کا ریکارڈ ہے جو اس زمانہ میں عرب کے پہلو میں واقع تھیں۔ جن میں سلطنت ہائے روم و فارس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ چونکہ عرب کی حدود ملتی تھیں اس لیے ان حکومتوں کی تاریخ میں کہیں کہیں عرب کا ذکر بھی آ جاتا ہے، مگر لازماً یہ ذکر بہت مختصر ہے اور صرف جزوی امور سے تعلق رکھتا ہے اور ملک کے اندرونی حالات کے متعلق اس ضمنی تذکرہ سے کوئی بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی ذیل میں یہودی اقوام کی تاریخ اور بائبل کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جن میں کہیں کہیں عرب کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں۔

**قبل از اسلام روایات و اشعار** تیسرے درجہ پر خود عرب کی اندرونی روایات ہیں اور دراصل عرب کی تاریخ قبل از اسلام کے لیے یہی روایات بطور بنیاد کے ہیں عرب میں نبی تحریر و تصنیف کا رواج نہیں تھا لیکن زبانی روایات کو سینہ بہ سینہ محفوظ رکھنے کی طرف عام توجہ تھی اور اس غرض کے لیے عربوں کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ اس کی مثال کسی دوسری قوم میں نظر نہیں آتی۔ ہر قبیلہ میں ایک خاص طبقہ ایسے لوگوں کا ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ بلکہ اس پاس کے ہمسایہ قبیلوں کی تاریخ کو بھی پوری صحت اور وفاداری کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اس فن کو عربوں میں علم انساب یعنی نسب ناموں کا علم کہتے تھے۔ تاریخ میں زمانہ قبل از اسلام کے کئی لوگوں کا نام اس فن کے ماہرین کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اسی طرح یہ علم ایک نسل سے دوسری نسل تک اور دوسری سے تیسری تک چلتا چلا جاتا تھا اور ہر قبیلہ کی تاریخ اس کے راویوں کے سینوں میں محفوظ رہتی تھی۔

اسی ضمن میں ایک خاص ذریعہ قدیم تاریخ عرب کی حفاظت کا وہ اشعار بھی ہیں جو قبل از اسلام شاعروں نے کہے ہیں کیونکہ ان میں بھی خاص خاص حصے قبائل عرب کی تاریخ کے آ جاتے ہیں۔ اسلام سے پہلے زمانہ میں عربوں میں شعر کا فن اس کمال کو پہنچا ہوا تھا کہ بعض ناقدین شعر کی رائے میں باوجود اسلامی شعراء کی ترقی کے اسلامی زمانہ بھی بعض جہت سے اس کی مثال پیش نہیں کرتا۔ عربوں کی زندگی قبائلی تمدن کا رنگ رکھتی تھی۔ اور قریباً ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی شاعر ہوتا تھا جو اپنے قبیلہ کے خاص خاص حالات کو اپنے زور وابدویانہ اشعار میں محفوظ رکھتا تھا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ان اشعار کو یاد رکھتے اور اپنی مجالس میں سناتے رہتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے شعراء میں امراء اقیس، نابغہ ذبیانی، زہیر، طرفة بن العتہ، علقمہ، عشی، عمرو بن کلثوم، امیہ بن ابی صلت، کعب بن زہیر، لبید، حسان بن ثابت، غنارہ وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جن کے بہتے اشعار آج تک محفوظ ہیں اور اس قدر حیرت انگیز فصاحت اور زور بیان اور قلمی مصوری کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ وہ اس زمانہ کی کسی قوم اور کسی ملک کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ مذکورہ بالا شعراء میں سے مؤخر الذکر چار شاعر جن میں آخر الذکر ایک مشہور شاعرہ کا نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے تھے

۱۔ "لائف آف محمد" مصنفہ سر ولیم مورایڈیشن ۱۸۹۳ء صفحہ ۶ دیکھا چہ ۷۔ لائف آف محمد۔ میور دیکھا چہ صفحہ ۴۶ ۸۔

۹۔ اسلامی اصطلاح میں عرب کا زمانہ قبل از اسلام جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے ۱۰۔

۱۱۔ کتاب اشعار الشعراء لابن قتیبہ ۱۲۔

ہمارے بیان کہ عربوں کی تاریخ قبل از اسلام زبانی روایتوں میں محفوظ تھی، بعض نادانوں کو تعجب میں ڈالے گا کہ ایک وسیع ملک کی تاریخ جو سینکڑوں سالوں پر پھیلی ہوئی ہو محض زبانی روایتوں میں کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے؟ لیکن اسے ناظرین کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ اقوام عالم کی تاریخ اسی قسم کی زبانی روایات تک محدود ہوتی تھی صرف فرق یہ ہے کہ جہاں بہت سی قوموں میں یہ روایتیں ایک غیر محفوظ صورت میں زبان زد خاص و عام تھیں اور بعد میں تاریخی زمانہ میں اگر وہ جس صورت میں پائی گئیں، جمع کر لی گئیں۔ وہاں اس غیر تاریخی زمانہ میں بھی عربوں میں ان روایتوں کی حفاظت کا بہت سہ دوسری قوموں کی نسبت بہتر انتظام تھا۔ کیونکہ ان میں یہ دستور تھا کہ اپنے قبیلہ کی تاریخ کو روایات یا اشعار کے ذریعہ یاد رکھتے تھے اور یہ بتایا جاتا تھا کہ عربوں کا حافظہ اس غرض کے لیے خاص طور پر ترقی یافتہ تھا۔ بہر حال عرب کی قبل از اسلام تاریخ کیلئے عربوں کی زبانی روایات جو بعد میں تحریری طور پر بھی ضبط میں آگئیں، سب بڑا ماحذ ہیں۔ اور چونکہ ان کی مدد کے بغیر قدیم تاریخ عرب کا ڈھانچہ تیار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کوئی مؤرخ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان روایات کا تحریری ضبط بعد کی کئی کتابوں میں موجود ہے، مگر سب سے زیادہ مکمل صورت میں مشہور اسلامی مؤرخ ابو جعفر محمد ابن جریر طبری کی تاریخ میں پایا جاتا ہے جس میں اس منتشر مواد کے بیشتر حصہ کو ایک مربوط صورت میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور بعد کی اکثر کتابیں کم و بیش اسی مجموعہ کی خوشہ چین ہیں۔

اسلام کی آمد سے عرب کی تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نے عرب کی سوئی ہوئی طاقتوں کو اس طرح بیدار کر دیا تھا، جیسے ایک گہری نیند سویا ہوا شخص کسی اچانک شور سے چونک کر بیدار ہو جائے۔ اور اس وقت سے عرب کی تاریخ میں بھی ایک انقلابی صورت پیدا ہو گئی۔ جیسے کہ ایک تاریخی میں ٹھپڑی چیز ایک لخت سورج کی تیز روشنی کے سامنے آجائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح اور آغاز اسلام کی تاریخ کے متعلق اس قدر مضبوط تاریخی مواد موجود ہے کہ یقیناً اس سے بڑھ کر آج تک کسی مذہب اور کسی بانی مذہب کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ مواد متعدد صورتوں میں پایا جاتا ہے اور ہم ان مختلف صورتوں کا ایک اجمالی نقشہ ذیل کے اوراق میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

**قرآن شریف** سب سے اول نمبر پر اسلامی تاریخ کا وہ مضبوط قلعہ ہے جو قرآن شریف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قرآن شریف کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف خدا کا کلام ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بصورت وحی نازل ہوا۔ یہ نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس سالہ نبوت کی زندگی پر پھیلا ہوا تھا۔ یعنی الہام سے ہی آپ کے دعویٰ کی ابتداء ہوئی اور قرآن شریف کا آخری حصہ اُس وقت نازل ہوا جبکہ آپ کی وفات بالکل قریب تھی۔ اس طرح اگر آپ کی

نبوت کے مجموعی ایام کے مقابلہ پر قرآنی آیات کی مجموعی تعداد کو رکھ کر دیکھا جائے تو روزانہ نزول کی اوسط ایک آیت سے بھی کم بنتی ہے، کیونکہ جہاں آپ کی نبوت کے ایام کم بیش سات ہزار نو سو ستر بنتے ہیں، وہاں قرآنی آیات کی تعداد صرف چھ ہزار دو صد پچیس ہے اور چونکہ قرآنی الفاظ کی مجموعی تعداد ستر ہزار نو سو چونتیس ہے اس لیے فی آیت بارہ الفاظ کی اوسط ہوتی جس سے روزانہ نزول کی اوسط کم بیش نو لفظ بھی جاسکتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف بہت ہی آہستہ آہستہ نازل ہوا تھا۔ اور گویہ درست ہے کہ قرآن شریف کے نزول میں بعض اوقات نامے بھی آجاتے تھے اور بعض دوسرے ایام میں ایک ہی وقت میں متعدد آیات کٹھی نازل ہو جاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی فسان شریف کبھی بھی ایک وقت میں اتنی مقدار میں نازل نہیں ہوا کہ اسے لکھ کر محفوظ کرنے یا ساتھ ساتھ یاد کرتے جانے میں کوئی مشکل محسوس ہوتی ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جو جو آیات قرآن شریف کی نازل ہوتی جاتی تھیں انہیں ساتھ ساتھ لکھواتے جاتے اور خدائی تفہیم کے مطابق ان کی ترتیب بھی خود مقرر فرماتے جاتے تھے۔ اس بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل حدیث بطور مثال کے پیش کی جاسکتی ہے :

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ مُثَنَّى بْنُ عَمَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَانَتْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ شَيْءٌ مِّنْ عَالِمَيْنِ مِّنْ كَانَتْ يَكْتُبُ فَيَقُولُ مَنْعُوا هَؤُلَاءِ الْآيَاتِ فِي سُورَةِ النَّبِيِّ يَذْكُرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا إِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْآيَةُ فَيَقُولُ مَنْعُوا هَذِهِ الْآيَةَ فِي السُّورَةِ النَّبِيِّ يَذْكُرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا۔

”یعنی حضرت ابن عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ ثالث (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کاتب وحی رہ چکے تھے) فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیات کٹھی نازل ہوتی تھیں تو آپ اپنے کاتبان وحی میں سے کسی کو بلا کر ارشاد فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورۃ میں فلاں جگہ لکھو اور اگر ایک ہی آیت اترتی تھی تو پھر بھی اسی طرح کسی کاتب وحی کو بلا کر اور جگہ بنا کر اسے تحریر کروا دیتے تھے“

جن صحابہ سے کاتب وحی کا کام لیا جاتا تھا ان کے نام اور حالات تفصیل و تعیین کے ساتھ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے زیادہ معروف صحابہ یہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، زبیر بن العوامؓ، شرجیل بن حسنہؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ۔ اس فہرست سے ظاہر ہے کہ آنحضرت

۱۔ کتاب الاتقان فی علوم القرآن طبعی ج ۱ صفحہ ۲۶۶ تا ۲۶۷ ۲۔ ترمذی والبوداؤد سند احمد بحوالہ مشکوٰۃ ابوالفتح ابن القرآن

۳۔ فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۹ و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۲۴ ۴۔

صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے اسلام سے ہی ایک معتبر جماعت قرآنی وحی کے قلمبند کرنے کے لیے میسر رہی تھی اور اس طرح قرآن شریف نہ صرف ساتھ ساتھ تحریر میں آتا گیا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کی موجودہ ترتیب بھی جو بعض مصالح کے ماتحت نزول کی ترتیب سے جدا رکھی گئی ہے قائم ہوتی گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جبکہ نزول قرآن مکمل ہو چکا تھا حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول نے حضرت عمرؓ کے مشورہ سے زید بن ثابتؓ انصاری کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی رہ چکے تھے حکم فرمایا کہ وہ قرآن شریف کو ایک باقاعدہ مصحف کی صورت میں اکٹھا لکھوا کر محفوظ کر دیں۔ چنانچہ زید بن ثابتؓ نے بڑی محنت کے ساتھ ہر آیت کے متعلق زبانی اور تحریری ہر قسم کی پختہ شہادت متیا کر کے اسے ایک باقاعدہ مصحف کی صورت میں اکٹھا کر دیا۔ اس کے بعد جب اسلام مختلف ممالک میں پھیل گیا، تو پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالثؓ کے حکم سے زید بن ثابتؓ کے جمع کردہ نسخہ کے مطابق قرآن شریف کی متعدد دستند کاپیاں لکھوا کر تمام اسلامی ممالک میں بھجوا دی گئیں۔

دوسری طرف قرآن شریف کے حفظ کرانے کا ایسا انتظام تھا کہ اس کے نزول کے ساتھ ساتھ صحابہ کی ایک جماعت اُسے مقرر کردہ ترتیب کے مطابق حفظ کرتی جاتی تھی اور گو جزوی طور پر حفظ کرنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سارے قرآن کے حافظ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ جن میں سے کم از کم چار ایسے تھے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجربہ کر کے اور ہر طرح قابل اعتماد پاکر دوسرے صحابہ کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تو جبکہ قرآن شریف مکمل ہو کر ایک مصحف کی صورت میں آچکا تھا، حفاظ قرآن کی تعداد نے ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ترقی کی کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں صرف ایک جگہ کی اسلامی فوج میں تین سو سے زائد حافظ قرآن موجود تھے۔ ان اسباب کے نتیجہ میں جن کے پیچھے خدائی حفاظت کا ہاتھ کام کر رہا تھا، ابتدائے اسلام سے ہی قرآن شریف کا متن ہر قسم کی تحریف اور دست برد کے خطرہ سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اور اس زمانہ کے بعد تو اس کے مستند نسخے اس طرح مختلف ممالک میں پھیل گئے اور حفاظ قرآن کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ تحریف کا امکان ہی باقی نہیں رہا۔ اور جیسا کہ دوست و دشمن سب نے تسلیم کیا ہے اس بات میں ذرہ بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آج کا قرآن بغیر کسی زیر و زبر کے فرق کے وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس بارہ میں مثال کے طور پر بعض عیسائی محققین کی رائے درج ذیل کی جاتی ہے:

سر ولیم میور لکھتے ہیں :-

”دنیا کے پردے پر غالباً قرآن کے سوا کوئی اور کتاب ایسی نہیں جو بارہ سو سال کے طویل

۱۔ بخاری منتخب فضائل القرآن باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۵۔ بخاری منتخب فی فضائل القرآن باب جمع القرآن وفتح الباری جلد ۹

۲۔ بخاری فضائل القرآن ۵۔ کنز العمال باب فی القرآن فصل فی فضائل القرآن ۵

عرصہ تک بغیر کسی تحریف اور تبدیلی کے اپنی اصلی صورت میں محفوظ رہی ہو۔  
پھر لکھتے ہیں :

”ہماری اناجیل کا مسلمانوں کے قرآن کے ساتھ مقابلہ کر: جو بالکل غیر محرف و مبدل چلا آیا ہے۔  
دو ایسی چیزوں کا مقابلہ کرنا ہے جنہیں آپس میں کوئی بھی نسبت نہیں۔  
پھر لکھتے ہیں :

”اس بات کی پوری پوری اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود ہے کہ قرآن اب بھی اُسی شکل و صورت  
میں ہے جس میں کہ محمدؐ نے اُسے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔  
پھر لکھتے ہیں :

”ہم یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت محمدؐ سے لے کر آج تک اپنی اصل  
اور غیر محرف صورت میں چلی آئی ہے۔  
نولڈ کی جو جرمنی کا ایک نہایت مشہور عیسائی مستشرق گذرا ہے اور جو اس فن میں گویا استاد  
مانا گیا ہے۔ قرآن شریف کے متعلق لکھتا ہے کہ :  
”آج کا قرآن بعینہ وہی ہے جو صحابہ کے وقت میں تھا۔“

پھر لکھتا ہے :

”یورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف ثابت کریں قطعاً ناکام رہی ہے۔“

اس خصوصیت کے علاوہ کہ قرآن شریف اپنے زمانہ نزول سے لے کر آج تک بالکل محفوظ چلا آیا ہے۔ ایک  
بڑی خصوصیت قرآن شریف میں یہ بھی ہے کہ بوجہ اس کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس سالہ نبوت  
کی زندگی کے دوران میں آہستہ آہستہ کر کے نازل ہوا تھا۔ آپؐ کی نبوت کی زندگی کا کوئی حصہ ایسا نہیں  
ہے جس پر قرآن شریف کے کسی نہ کسی حصہ سے براہ راست روشنی نہ پڑتی ہو اور یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا  
کے اس قول کی عملی تفسیر ہے کہ کَانَ خُلُقُهُ انْقِرَاضًا یَعْنِیَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سیرت قرآن میں  
آجاتی ہے۔ گویا قرآن شریف وہ کتاب ہے جس میں آپؐ کے اخلاق و عادات اور آپؐ کی روزانہ زندگی  
کے حالات ہر روز ساتھ ساتھ قلمبند ہوتے جاتے تھے اور یقیناً دُنیا کی تاریخ میں اور کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جس  
کی سیرت کے متعلق اس قدر مضبوط اور مستند عصری ریکارڈ محفوظ ہو۔ بیشک بعض ایسے لوگ گذرے ہیں اور اس  
زمانہ میں بھی پائے جاتے ہیں جن کی سوانح عمریاں ان کی زندگی میں ہی یا ان کی وفات کے جلد بعد شائع ہو گئی ہیں



مگر خصوصیت قرآن شریف کے وجود میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ گویا آپ کی روزِ زندگی ہر روز ساتھ ساتھ ضبط میں آتی گئی ہے وہ آج تک کسی اور فرد کو نصیب نہیں ہوئی۔ مغربی محققین نے قرآن شریف کی اس خصوصیت کا بھی کھلے الفاظ میں اقرار کیا ہے؛ چنانچہ سر و تیم میور لکھتا ہے:

”قرآن کی یہ خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے محمد کی سیرت و سوانح اور آغاز اسلام کی تاریخ کے لیے قرآن ایک بنیادی چیز قرار پاتا ہے جس سے ان ہر دو کے متعلق تمام تحقیق طلب امور کو پوری صحت کے ساتھ جانچا جاسکتا ہے۔ قرآن شریف میں ہیں وہ ذخیرہ میسر ہے جس میں محمد کے الفاظ خود آپ کی زندگی میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ اور یہ ریکارڈ آپ کی زندگی کے ہر حصہ سے یعنی آپ کے مذہبی خیالات سے آپ کے سبک افعال سے آپ کی خانگی سیرت سے یکساں تعلق رکھتا ہے..... حقیقتہً محمد کی سیرت کیلئے قرآن ایک ایسا سچا آئینہ ہے کہ اسلام کے سارے ابتدائی زمانہ میں یہ بات بطور ایک مثل اور کمالات کے مشورہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سیرت قرآن میں ہے۔“

پھر انگلستان کا مشہور مسیحی مستشرق پروفیسر نکلسن اپنی انگریزی تصنیف ”عرب کی ادبی تاریخ“ میں لکھتا ہے:

”اسلام کی ابتدائی تاریخ کا علم حاصل کرنے کے لیے قرآن ایک بے نظیر اور ہر شک و شبہ سے بالاکتاب ہے اور یقیناً بڑھ مذہب یا سمجھت یا کسی قدیم مذہب کو اس قسم کا مستند عصری ریکارڈ حاصل نہیں ہے، جیسا کہ قرآن میں اسلام کو حاصل ہے۔“

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کے لیے قرآن شریف نہ صرف اسلامی لٹریچر میں سب سے زیادہ مستند اور صحیح ریکارڈ ہے بلکہ آپ کی سیرت کے متعلق میں اسے وہ پوزیشن حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب کو دنیا کے کسی اور فرد کے متعلق حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی صحت بھی اس پائے کی ہے کہ دوست تو دوست کسی بدترین دشمن کو بھی اس کے متعلق حرف گیری کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

تاریخ اسلام کا روایتی ماخذ تاریخ ابتدائے اسلام اور سیرت رسول کے لیے دوسرا بڑا ماخذ وہ روایات ہیں جو بصورت حدیث یا تفسیر یا سیرت و مغازی ابتدائے

اسلام میں ایک منظم سلسلہ روایت کے ذریعہ صحابہ سے تابعین تک اور تابعین سے تابع تابعین تک اور تبع تابعین سے ان کے بعد آنے والے لوگوں تک پہنچیں اور پھر باقاعدہ کتابوں کی صورت میں ضبط تحریر میں آکر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ اس ذخیرہ کا پایہ بھی دوسری امتوں کی تاریخ کے مقابلہ پر بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی جماعت عطا فرمائی تھی جس نے اپنے اخلاص اور جوشِ محبت میں آپ کی ہر حرکت و سکون کا نظیر و خور کے ساتھ مطالعہ کیا اور اپنی عظیم المثال قلبی مصوری میں آپ کی ایک ایسی کامل و مکمل تصویر پیچھے چھوڑی کہ جس کے کمال کی نظیر دنیا کی کسی اور تصویر میں نظر نہیں آتی۔ حدیث میں صحابہ کے اقوال پڑھ کر انسانی عقل و دماغ رہ جاتی ہے کہ کس طرح صحرا تے عرب کے ان ناخواندہ بادیہ نشینوں نے اپنے آقا و سرور کی ہر حرکت و سکون کو لوحِ سادخ پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح سوتے تھے اور کس طرح اگتے تھے کس طرح کھاتے تھے اور کس طرح پیتے تھے۔ کس طرح اٹھتے تھے اور کس طرح بیٹھتے تھے اور کس طرح چلتے تھے۔ اور کس کھڑے ہوتے تھے۔ کس طرح بولتے تھے اور کس طرح خاموش رہتے تھے۔ کس طرح ہنستے تھے۔ اور کس طرح روتے تھے۔ کس طرح خوش ہوتے تھے اور کس طرح ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے۔ کس طرح گھر میں رہتے تھے اور کس طرح سفر میں وقت گزارتے تھے کس طرح بیویوں سے ملنے تھے اور کس طرح بچوں سے ہم کلام ہوتے تھے۔ کس طرح عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کس طرح غیروں کے ساتھ معاملہ رکھتے تھے۔ کس طرح دوستی نبھاتے تھے اور کس طرح دشمنوں کے ساتھ میش آتے تھے۔ کس طرح صلح میں کام کرتے تھے اور کس طرح جنگ میں لڑتے تھے۔ کس طرح بندوں کا حق ادا کرتے اور کس طرح خدا کا حق بجالاتے تھے۔ کس طرح اللہ تعالیٰ کا کلام سُنتے اور کس طرح اسے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ غرض آپ کی زندگی کی تصویر کا ہر پہلو اپنی پوری پوری تفصیل میں اور اپنے باریک درباریک خط و خال کے ساتھ ہمارے سامنے محفوظ ہے۔ حدیث کی کسی کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کی ذرتی گردانی کریں اس کے ہر صفحہ پر آپ کی تصویر کا کوئی نہ کوئی پہلو زندگی کی اصل آب و تاب میں چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ ادویوں محسوس ہو گا کہ ایک جیتی جاگتی تصویر اپنی پوری دلکشی کے ساتھ ہمارے سامنے اٹھڑی ہوئی ہے۔

### روایت کا طریقہ

اس جگہ غیر مسلم ناظرین کی واقفیت کے لیے یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ روایت بیان کرنے کا طریق مسلمانوں میں اس طرح رائج تھا کہ نیچے کے راوی سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ ہر راوی کا نام لیتے ہوئے اُوپر کو چلنے جاتے تھے حتیٰ کہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یا آپ کے کسی صحابی پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچنے والی روایت حدیث کہلاتی ہے اور صحابی تک پہنچ کر ختم ہو جانے والا روایت اشرا کہلاتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کی بہت سی صورتیں ہیں۔ طریق بیان عموماً یوں ہوتا تھا کہ:۔ مجھ سے الفت نے بیان کیا اور الفت نے بت سے سنا تھا۔ اور بت سے ست نے روایت کی تھی اور ست کو ج نے خبر دی تھی کہ ایک مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے فلاں امر کے متعلق یہ الفاظ بیان فرمائے تھے یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہمارے سامنے یہ یہ واقعہ پیش آیا تھا وغیرہ الٹ۔ روایت کا یہ ایک بہت سادہ سانقصہ ہے اور نہ عملاً بیان کرنے کے کئی طریقے تھے اور فنِ اصولِ حدیث کے علماء نے ہر طریق کے متعلق مفصل بحث کر کے ان کے مدارج قائم کر دیئے ہیں۔ بہر حال طریقِ روایت کی تفصیلی صورت جو بھی ہو یہ ایک ایسا محفوظ طریقہ ہے جس سے ہر روایت کی قدر و منزلت

اس کے ہر درجہ پر جانچی جاسکتی ہے اور دیکھنی کے لحاظ سے بھی اس میں ایک ایسا ذاتی عنصر داخل ہے کہ جس سے نہ صرف وہ مجلس جس میں کوئی روایت بالآخر بیان کی گئی تھی بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس بھی جس سے روایت کا آغاز ہوتا ہے ایک زندہ تصویر کے طور پر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں بیان کیا گیا ہے روایت کا یہ علم قبل از اسلام زمانہ میں بھی عربوں میں ایک حد تک رائج تھا، مگر اسلام میں اگر وہ ایک نہایت منظم اور سائنٹیفک علم بن گیا جس کی امداد کے لیے کئی ضمنی علوم کی ایجاد بھی وقوع میں آئی۔ اس جگہ اس علم کی ساری تفصیلات کے بیان کرنے کی تو گنجائش نہیں، مگر مختصر طور پر اس علم کا ڈھانچہ بصورت ذیل سمجھا جاسکتا ہے۔

**روایت و درایت کے اصول** اصل الاصول اس علم کا یہ ہے کہ ہر واقعہ کی صحت و دو طریق پر آزمائی جاسکتی ہے اور جب تک ان دونوں طریق سے کسی واقعہ

کی صحت پایہ ثبوت کو نہ پہنچ جاوے اس پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پہلا طریق روایت ہے۔ یعنی یہ دیکھنا کہ جو واقعہ ہم تک پہنچا ہے، اس کی صحت کے متعلق بیرونی شہادت کیسی میسر ہے یعنی جس واسطہ سے وہ ہم تک پہنچا ہے۔ وہ واسطہ کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ دوسرا طریق درایت ہے یعنی یہ دیکھنا کہ واقعہ کی صحت کے متعلق اندرونی شہادت کیسی موجود ہے۔ یعنی قطع نظر واسطہ کے کیا وہ واقعہ اپنی ذات میں اور اپنے ماحول کی نسبت سے ایسا ہے کہ اُسے درست اور صحیح یقین کیا جائے۔ یہ وہ دو بنیادی اصول ہیں جو مسلمانوں نے اپنے ہر روایتی اور تاریخی علم کی پڑتال کے لیے ایجاد کئے۔ اور ابتدائے اسلام سے ان کا اس پر عمل رہا ہے۔ ان ہر دو اصول کے ماتحت بہت سے قابل لحاظ امور قرار دیئے گئے ہیں جن میں سے زیادہ معروف امور کو ہم اپنے الفاظ میں درج ذیل کرتے ہیں:

روایت کے اصول کے ماتحت یہ باتیں زیادہ قابل لحاظ قرار دی گئی ہیں:

- (۱) راوی معروف الحال ہو۔
- (۲) راوی صادق القول اور دیانت دار ہو۔
- (۳) بات کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔
- (۴) اس کا حافظہ اچھا ہو
- (۵) طے سے مبالغہ کرنے یا خلاصہ نکال کر رپورٹ کرنے یا روایت میں کسی اور طرح تصرف کرنے کی عادت نہ ہو۔
- (۶) روایت بیان کردہ میں راوی کا کوئی اپنا ذاتی تعلق نہ ہو جس کی وجہ سے یہ خیال کیا جاسکے کہ اُس کی روایت متاثر ہو سکتی ہے۔
- (۷) دو اوپر نیچے کے راویوں کا آپس میں ملنا زمانہ یا حالات کے لحاظ سے قابل تسلیم ہو۔



(۸) روایت کی تمام کڑیاں محفوظ ہوں اور کوئی راوی اوپر سے یا درمیان سے یا نیچے سے چھٹا ہوا نہ ہو۔  
 (۹) مذکورہ بالا اوصاف کے ماتحت کسی روایت کے راوی جتنے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد ہوں گے اتنی ہی وہ روایت زیادہ پختہ سمجھی جائے گی۔

(۱۰) اسی طرح ایک روایت کے متعلق معتبر راویوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ روایت زیادہ مضبوط قرار دی جائے گی۔

روایت کے اصول کے ماتحت مندرجہ ذیل امور زیادہ قابل لحاظ سمجھے گئے ہیں :

(۱) روایت کسی معتبر اور مستند عصری ریکارڈ کے خلاف نہ ہو۔ اس اصل کے ماتحت ہر روایت جو قرآن شریف کے خلاف ہے قابل رد ہوگی۔

(۲) کسی مسلمہ اور ثابت شدہ حقیقت کے خلاف نہ ہو۔

(۳) کسی دوسری مضبوط تر روایت کے خلاف نہ ہو۔

(۴) کسی ایسے واقعہ کے متعلق نہ ہو کہ اگر وہ صحیح ہے تو اس کے دیکھنے یا سننے والوں کی تعداد یقیناً زیادہ ہونی چاہیئے، لیکن پھر بھی اس کا راوی ایک ہی ہو۔

(۵) روایت میں کوئی اور ایسی بات نہ ہو جو اسے عقلاً یقینی طور پر غلط یا مشتبہ قرار دیتی ہو۔

یہ وہ اصول ہیں جو مسلمان محققین نے اپنی روایات کی چھان

بین کے لیے آغاز اسلام میں مقرر کئے اور انہی کے مطابق

### روایت کے متعلق بعض ابتدائی مثالیں

وہ اپنی روایات کی تحقیق و تدقیق کرتے رہے ہیں۔ اور ہر ممکنہ کھسکا ہے کہ روایات کی پڑتال کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی کسوٹی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں لازماً ہر مسلمان محدث یا مؤرخ کے پیش نظر ہی ہیں مگر اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ وہ اصول ہیں جو مسلمان محققین نے ابتدائے اسلام میں اپنی روایات کی تحقیق کے لیے وضع کئے اور جنہیں وہ بالعموم اپنی تصانیف میں ملحوظ رکھتے رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ذاتی میلان کی وجہ سے ایک محقق کسی بات کو زیادہ وزن دیتا ہو اور دوسرا کسی اور کو یا کوئی معتقد اپنے مجموعہ کو زیادہ جامع بنانے کے لیے یا بعض روایات کی امکانی صحت کے خیال سے کمزور روایتوں کو بھی لے لیتا ہو یا کوئی معتقد ایسے ہی غیر محتاط ہو، کیونکہ کسی طبقہ کے سب لوگ ایک درجہ کے نہیں ہوتے مگر ہر حال روایت و روایت دونوں کے اصول کو ابتدائی مسلمانوں نے بالعموم اپنے مد نظر رکھا ہے اور زیادہ محتاط معتقدین پوری سختی کے ساتھ ان پر کاربند رہے ہیں۔ روایت کے اصول کے متعلق تو ہمیں مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اسلامی

۱۔ ان اصول کے لیے دیکھو فتح المغیش معتقدہ مائتھ زین الدین عبدالرحیم ابن الحسین العراقی اور ممنوعات کبیر معتقدہ ملا علی بن

محمد سلطان قاری اور مقدمہ ابن صلاح وغیرہ ۲

تحقیق کا یہ پہلو دوست و دشمن سب کے نزدیک مستم ہے؛ البتہ چونکہ بعض مغربی محققین نے جن میں سرولیم میور بھی شامل ہیں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں نے درایت کے پہلو کو مد نظر نہیں رکھا اور صرف روایت کے اصول کے ماتحت اپنی روایتوں کی پڑتال کرتے رہے ہیں۔ اس لیے درایت کے پہلو کے متعلق اس جگہ بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ یہ اعتراض کس قدر غلط اور بے بنیاد ہے۔

سب سے پہلے خود قرآن شریف اس بات کو پیش کرتا ہے کہ محض روایت پر بنیاد رکھنا ہر صورت میں کافی نہیں بلکہ کسی خبر کو صحیح سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کے متعلق اچھی طرح تحقیق کر لی جائے چنانچہ فرماتا ہے:

إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا بِهِ

”یعنی اگر تمہارے پاس کوئی خبر پہنچے تو یہ دیکھ لیا کرو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ پھر اگر یہ راوی قابل اعتماد نہ ہو تو اچھی طرح سارے پہلوؤں پر نظر ڈال کر سوچ لیا کرو“

اس آیت سے گویا ہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف روایت کی صحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مگر غور کرنے سے یہ بات محقق نہیں رہتی کہ دراصل یہ آیت روایت و درایت دونوں پہلوؤں کی حامل ہے؛ چنانچہ فاسق کے لفظ میں تو روایت کے پہلو کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ دیکھ لیا کرو کہ خبر لانے والا کیسا ہے اور تبیینوا کے لفظ میں درایت کا پہلو مد نظر ہے یعنی دوسری جہت بھی خبر کی اچھی طرح چھان بین کر لیا کرو۔

پھر فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ..... كَذَلِكَ إِذَا سَمِعْتُمُوهُ فَلَا

الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَأْنْفُسِهِمْ خَبِيرُونَ..... وَكَذَلِكَ إِذَا سَمِعْتُمُوهُ فَلَا تَمْسُكُوا

بِهِ قُلُوبَكُمْ لَنَأَنَّ لَكُمْ مِمَّا هَذَا شَيْعَانُكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ

”یعنی جو لوگ رسول خدا کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ کے خلاف بہتان لگانے میں شریک ہوئے ہیں وہ اے مسلمانو! انہیں میں سے ایک پارٹی ہیں مگر تمہیں چاہیے تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے متعلق نیک گمان کرتے۔ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم نے اس بہتان کو سننے ہی یہ کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ پاک و بے عیب ہے۔ یہ تو ایک صاف بہتان نظر آتا ہے“

اس آیت میں صراحت کے ساتھ درایت کے اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ صحابہ کو اس بات پر توجہ کی گئی ہے کہ خواہ حضرت عائشہ پر الزام لگانے والے بظاہر مسلمان ہی تھے، مگر جب تم حضرت عائشہ

کے حالات سے اچھی طرح آگاہ تھے اور تم جانتے تھے کہ وہ خدا سے پاک کے رسولؐ کی بیوی اور دن رات آپؐ کی صحبت میں رہنے والی ہے تو تمہیں چاہیے تھا کہ ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے اس خبر کو سنتے ہی بہتان اور افتراء قرار دیکر ٹھکرا دیتے۔ گویا اس آیت میں مننار بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک روایت کے متعلق صرف یہ دیکھ کر اس کے روی بظاہر اچھے لوگ ہیں اسے نہیں مان لینا چاہیے بلکہ خدا واد عقل کے ماتحت دوسری باتیں بھی دیکھنی ضروری ہیں۔ اور اگر دوسری باتیں روایت کو مشتبہ قرار دیں تو اُسے قبول نہیں کرنا چاہیے۔

اسی قرآنی اصل کے ماتحت حدیث میں بھی یہ تاکید آتی ہے کہ محض کسی بات کو سن کر اُسے سچا نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ ہر جہت سے تحقیق کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ حقیقت کیا ہے اچنانچہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

كُنْ بِالنَّحْوِ كَذِبًا اَنْ يُحْدِثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ  
”یعنی ایک انسان کے بھوٹا ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ وہ جو بات بھی سنے اُسے بلا تحقیق آگے روایت کرنا شروع کر دے“

اس حدیث میں گو روایتی تحقیق کی طرف بھی اشارہ ہے مگر اصل مقصود درایتی تحقیق ہے جیسا کہ بِكُلِّ مَا سَمِعَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی محض کسی بات کا سننا اس کے قبول کیے جانے کا باعث نہیں بننا چاہیے بلکہ دوسری جہات سے بھی غور کرنا چاہیے کہ آیا جو خبر ہمیں پہنچی ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں، بلکہ اس حدیث میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو شخص تحقیق کرنے کے بغیر کوئی ہر سنی سنائی بات آگے روایت کر دیتا ہے وہ جھوٹ کی اشاعت کا ایسا ہی ذمہ دار ہے جیسا کہ جھوٹ بولنے والا شخص۔

الغرض کسانِ شریف و حدیث دونوں اس اصول کو بیان کرتے ہیں کہ ہر خبر کی تصدیق کے متعلق روایت وراثت دونوں پہلوؤں پر نظر رہنے چاہئیں، چنانچہ اس اصل کے ماتحت حدیث میں کثرت کے ساتھ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہ اور ان کے بعد آنے والے مسلمان محققین نے ہمیشہ روایت کے پہلو کے ساتھ وراثت کے پہلو کو بھی نظر رکھا ہے اور بسا اوقات روایتی لحاظ سے ایک روایت کے مضبوط ہونے کے باوجود وراثت کی بنا پر اُسے رد کر دیا ہے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَلَوْ مَلَأَ الْوُضُوءُ وَمَعَا مَسَّتِ النَّارُ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ  
يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَلَوْ مَلَأَ مِنَ الدُّهْنِ أَسْتَوْصَأُ مِنَ الْحَمِيمِ ..... فَقَالَ أَبُو عِيسَى وَكَثَرُوا أَهْلَ  
الْعِلْمِ عَلَى بَرَكِ الْوُضُوءِ

”یعنی ایک مجلس میں ابو ہریرہ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جس چیز کو آگ نے

ٹھوہا ہو اس کے استعمال سے وضو ضروری ہو جاتا ہے۔ اس پر ابن عباس نے ابو ہریرہ کو لوک کر کہا کہ کیا پھر ہم گھی یا تیل کے استعمال کے بعد بھی وضو کیا کریں۔ اور کیا ہم گرم پانی کے استعمال کے بعد بھی وضو کیا کریں؟ یہ روایت درج کر کے ترمذی علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے اکثر علماء کا اسی پر عمل ہے کہ آگ پر تیار کی ہوئی چیز کے استعمال سے وضو ضروری نہیں ہو جاتا۔

اس حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ تک کی روایت کو جن کی روایات کی تعداد سارے صحابہ سے زیادہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے اس عقلی دلیل سے رد کر دیا کہ اول تو محض آگ پر کسی چیز کا تیار ہونا اس بات سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا کہ اس کے استعمال سے وضو ضروری ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ جب دین کی بنا ریسی اور آسانی پر ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول کس طرح منسوب ہو سکتا ہے کہ بس جس چیز کو بھی آگ چھو جائے اُس سے وضو واجب ہو جاتا ہے اور اسی لیے باوجود حضرت ابو ہریرہ کی اس صریح حدیث کے اکثر ائمہ حدیث و فقہ کا یہی مذہب ہے کہ آگ والی چیز کے استعمال سے وضو واجب نہیں ہوتا۔ اور بعض دوسری حدیثوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ حضرت ابن عباس یا بعد کے ائمہ حدیث کے نزدیک ابو ہریرہ نے جو روایت بیان کی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو ہے، مگر وہ قابل عمل نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابن عباس اور دوسرے محققین کے نزدیک اس روایت میں ابو ہریرہ کو غلط فہمی ہوتی ہے یا آپ کا ارشاد بعض خاص قسم کے حالات کے متعلق ہو گا جسے ابو ہریرہ نے عام سمجھ کر اُسے وسعت دے لی۔ بہر حال باوجود اس کے کہ اصول روایت کے لحاظ سے یہ حدیث بالکل صحیح قرار پاتی ہے، مسلمان محققین نے درایت کی بنا پر اسے صحیح تسلیم نہیں کیا۔ اور جب ابو ہریرہ جیسے کلمہ مشق راوی کی روایت درایت کی عرج سے محفوظ نہیں سمجھی گئی تو میسر صاحب کے اس قول کی حقیقت ظاہر ہے کہ مسلمان صرف روایتی پہلو کو دیکھ کر ہر بات کو صحیح مان لیا کرتے تھے اور درایت کو کام میں نہیں لاتے تھے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے :

عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ كُنْتُ مَعَ الْأَسْوَدِ بْنِ يَزِيدَ فَحَدَّثَ الشَّعْبِيُّ عَنْ حَدِيثِ فَاطِمَةَ  
بِثِ قَيْسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا سَجَدَ لَا نَفْقَةَ فَأَخَذَ الْأَسْوَدُ  
مِنْ خَصِي فَحَبَبَهُ بِهِ فَقَالَ وَتِلْكَ تَحَدَّثُ بِمِثْلِ هَذَا قَالَ عُمَرُ لَا تَشْرُكُ  
كِتَابَ اللَّهِ رُسُلَهُ نَبِيِّنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ امْرَأٌ وَلَا تَذَرِي حِفْظَ  
أَذْنَيْكَ ۝

”یعنی ابواسحاق سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں ایک مجلس میں اسود بن یزید کے ساتھ بیٹھا تھا

کہ شعبی نے یہ روایت بیان کی کہ فاطمہ بنت قیس صحابیہ بیان کرتی ہے کہ جب اس کے خاوند نے اُسے طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مکان اور خرچ نہیں دلایا۔ اس پر اسود نے ایک کنکروں کی ٹہنی اٹھا کر شعبی کو ماری اور کہا کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو؟ حالانکہ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ ہم ایک عورت کے بیان پر قرآن اور سنت رسول کو نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ نہیں معلوم کہ اصل بات کیا تھی اور اس نے کیا سمجھایا اصل بات کیا تھی اور اُسے کیا یاد رہا؟

اس حدیث میں گویا حضرت عمرؓ غلیظہ ثانی ایک صحابیہ کی روایت کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ ان کی رائے میں قرآنی تعلیم اور سنت رسولؐ کے خلاف ہے اور اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہو گا اُسے یا تو وہ سمجھی نہیں ہوگی یا بعد میں بھول گئی ہوگی۔ بہر حال حضرت عمرؓ نے روایت کی بنا پر ایک روایتی لحاظ سے صحیح حدیث کو رد کر دیا اور جمہور اسلام کا یہی فتویٰ ہے کہ فاطمہ کی روایت غلط تھی اور حضرت عمرؓ کا خیال درست ہے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

مَنْ مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ أَنَّهُ سَمِعَ عُثْبَانَ بْنَ مَالِكٍ الْأَنْصَارِيَّ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَبْتَغِي بِذَلِكَ دُخَانَهُ قَالَ مَحْمُودٌ فَخَذْتُهَا فَوَضَعْتُهَا فِي بُحْبُوحِ أَبِي يُونُسَ صَاحِبِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَتَتْهَا عَلَى أَبِي يُونُسَ وَقَالَ وَاللَّهِ مَا أَظَنُّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَا فَخَذْتُ قَطُّ لِي

”یعنی محمود بن الربیع روایت کرتے ہیں کہ میں نے عتبان بن مالک سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص پر دوزخ کی آگ حرام کر دی ہوئی ہے جو سچی نیت سے خدا کی رضا کی خاطر لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کرتا ہے، لیکن جب میں نے یہ روایت ایک ایسی مجلس میں بیان کی جس میں ابوایوب انصاری صحابی بھی موجود تھے تو ابوایوب نے اس روایت سے انکار کیا اور کہا خدا کی قسم میں ہرگز نہیں خیال کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہو“

اس حدیث میں حضرت ابوایوب انصاری نے ایک ایسی حدیث کو جو اصول روایت کے لحاظ سے صحیح تھی اپنی روایت کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گویہ ممکن ہے کہ حضرت ابوایوب کا استدلال درست نہ ہو مگر بہر حال یہ حدیث اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ صحابیہ یونسی کو راندہ طور پر ہر روایت کو قبول نہیں کر لیتے تھے، بلکہ روایت و روایت ہر دو کے اصول کے ماتحت پوری تحقیق کر لینے کے بعد قبول کرتے تھے۔

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:



قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَلَمَّا مَاتَ عُمَرُ كَثُرَتْ ذَايَا لِعَائِشَةَ فَقَالَتْ يَرْحَمُ اللَّهُ  
عُمَرُ وَاللَّهِ مَا حَدَّثَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ الْيَتِيمَ يَسْعَدُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ  
وَلَكِنْ قَالَ إِنَّ اللَّهَ يَزِيدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ قَالَ وَقَالَتْ  
عَائِشَةُ حَسْبُكُمْ الْقُرْآنُ وَلَا تَنْزِيلُ وَلَا دَرَكٌ وَذُرْ أُخْرَى لِي

”یعنی ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ پر یہ روایت بیان کرتے تھے کہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت پر رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ  
حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد میں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے بیان کی تو فرمائی گئیں۔ اللہ تعالیٰ  
عمرؓ پر رحم فرمائے۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا بلکہ یہ کہا تھا کہ ایک کافر  
کے مرنے کے بعد اگر اس کے ورثاء اس پر روئیں تو اس وجہ سے اس کا عذاب اور زیادہ ہو جاتا ہے۔  
(کیونکہ جب وہ زندہ تھا تو ان کے اس فعل میں ان کا مؤید ہوا کرتا تھا) اور پھر حضرت عائشہؓ کہنے  
لگیں کہ ہمیں قرآن کا یہ قول کافی ہے کہ کوئی نفس دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔“

اس حدیث سے بھی روایت کے پہلو کا استعمال نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے یعنی حضرت عائشہؓ نے حضرت  
عمرؓ جیسے جلیل القدر انسان کی روایت کو صرف ایک بالمقابل روایت بیان کر دینے سے ہی رد نہیں کیا بلکہ ساتھ  
ہی اپنے خیال میں اس کے غلط ہونے کی قرآن شریف سے ایک دلیل بھی دی۔ پس اس جگہ اس بحث میں پڑنے  
کی ضرورت نہیں ہے کہ آیا حضرت عائشہؓ کا خیال درست تھا یا کہ حضرت عمرؓ کا۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ  
یہ الزام بالکل غلط ہے کہ مسلمان محققین صرف ایک روایت کو سن کر اُسے قبول کر لیتے تھے۔ کیونکہ حق یہ ہے کہ وہ  
پوری طرح درایت کو کام میں لاتے اور ہر چیز کو اپنی عقل خدا داد کے ساتھ تول کر پھر قبول کرتے تھے اور اس بنا پر  
بعض اکابر صحابہ تک میں باہم اختلاف ہو جاتا تھا۔

**درایت کے کمزور پہلو** یہ چار مثالیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں اور جو صرف نمونہ کے طور پر درج کی  
گئی ہیں درندہ اس قسم کی مثالیں اسلامی تاریخ میں کثرت کے ساتھ پائی جاتی  
ہیں۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار جلیل القدر صحابیوں کے فعل سے یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ ابتدائی  
اسلام سے ہی درایت کا پہلو روایت کے پہلو کے ساتھ ساتھ چلا آیا ہے اور مسلمان محققین پوری دیانتداری اور آزادی  
کے ساتھ درایت کے اصول کو اپنی روایات کی تحقیق اور پڑتال میں استعمال کرتے رہے ہیں اور اسی قسم کی مثالیں  
بعد کے زمانوں کے متعلق بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر ہم اپنے اس مضمون کو زیادہ لمبا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ایک  
عقل مند انسان کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ بہر حال یہ صاحب اور ان کے ہم عقیدہ اصحاب کا یہ اعتراف

بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مسلمان محققین صرف روایت کے پہلو کو دیکھتے تھے اور درایت سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہاں اگر ہمارے معترضین کا یہ منشاء ہے کہ ہر حال میں درایت کے پہلو کو ترجیح اور غلبہ ہونا چاہیے اور خواہ ایک بات اصول روایت کے لحاظ سے کیسی ہی پختہ اور مضبوط ہو وہ اگر درایت کے پہلو کے لحاظ سے مشکوک نظر آتی ہے تو بہر صورت اسے رد کر دینا چاہیے تو یہ خیال نہ صرف بالکل غلط ہے بلکہ علمی ترقی کے لیے بھی سخت مضر اور نقصان دہ ہے۔ درایت خواہ کیسی ہی اچھی چیز ہو مگر اس کے ساتھ دو خطرناک کمزوریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ اول یہ کہ اس کا تعلق استدلال کے ساتھ ہوتا ہے اور استدلال ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ دوسرے یہ کہ درایت کی بنا زیادہ تر انسان کے سابقہ تجربہ اور معلومات پر ہوتی ہے اور تجربہ اور معلومات ایسی چیزیں ہیں کہ روز بدلتی رہتی ہیں کیونکہ ان میں ہر وقت وسعت اور ترقی کی گنجائش ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر درایت کے پہلو پر زیادہ بھروسہ کرنا اپنے اندر ایسے خطرات رکھتا ہے جنہیں کوئی دانا شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک شخص کسی روایت کو قرآن شریف کی کسی آیت کے خلاف سمجھ کر رد کر دیتا ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرا شخص اُسے کسی قرآنی آیت کے خلاف نہ پائے بلکہ وہ دونوں کی ایسی تشریح کر دے کہ ان کے درمیان کوئی تضاد نہ رہے۔ یا مثلاً ایک شخص ایک روایت کو کسی ثابت شدہ حقیقت کے خلاف سمجھتا ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے شخص کے نزدیک وہ چیز جسے ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا گیا ہے، وہ ثابت شدہ حقیقت نہ ہو۔ یا ایک شخص ایک روایت کو انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف سمجھتا ہے، مگر ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرا شخص جس کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ وسیع ہے وہ اسے اس کے خلاف نہ سمجھے وغیرہ اہم۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ درایت کے پہلو پر زیادہ زور دینا نہ صرف اصولاً غلط ہے، بلکہ علمی ترقی کے لیے بھی ایک بہت بھاری روک ہے اور اس پر زیادہ زور دینا انہی لوگوں کا کام ہے جو اپنے محدود علم اور محدود تجربہ اور محدود مشاہدہ اور محدود استدلال سے ساری دنیا اور سارے زمانوں کے علم کو ناپنا چاہتے ہیں۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ نظریہ دنیا کی علمی ترقی کے لیے ایک ستم قاتل سے کم نہیں۔ اگر ابتدائی مسلمان محدث یا مؤرخ درایت پر اس قدر زور دیتے جتنا میوڑ صاحب اور ان کے ہم عقیدہ اصحاب چاہتے ہیں کہ دینا چاہیے تھا تو یقیناً بانی اسلام کے متعلق بہت سے مفید معلومات کا ذخیرہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا، کیونکہ اس صورت میں ان میں سے کوئی مصنف کسی بات کو اور کوئی کسی کو اپنی درایت کے خلاف پا کر ترک کر دیتا حالانکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ صحیح درایت کے خلاف نہ ہوں، چنانچہ ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ کئی باتیں جو گزشتہ زمانوں میں سمجھ نہیں آتی تھیں آج انکا سمجھنا آسان ہو رہا ہے۔ پس پختہ اور صحیح اصول وہی تھا جو ابتدائی مسلمان مصنفین نے اختیار کیا کہ انہوں نے اصل بنیاد روایت کے اصول پر رکھی مگر روایت کی مدد کے لیے ایک حد تک درایت کو بھی کام میں لاتے رہے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک عمدہ ذخیرہ روایات کا جمع کر دیا۔ اور اب یہ ہم لوگوں کا کام ہے کہ روایت و درایت کے اصول کے مطابق اس ذخیرہ کی چھان بین کر کے صحیح کو سقیم سے جدا کر لیں۔

گو اصول روایت کے لحاظ سے کسی روایت کا لکھا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے  
روایات کا قلمبند ہونا اور اسلامی روایات میں ایک بڑا حصہ ایسی روایتوں کا شامل ہے جو کم از کم

ابتداء میں صرف زبانی طور پر سیدہ بسینہ مروی ہوئی ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتداء اسلام سے ہی بعض راویوں کا یہ طریق رہا ہے کہ جو حدیث بھی وہ سُنتے تھے یا جو روایت بھی ان تک پہنچتی تھی اُسے وہ فوراً لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے اور جب کسی کو آگے روایت سُنتا تھے تو اس بھی ہوئی یا دو داشت سے پڑھ کر سُنتا تھے۔ جس سے ان روایات کو مزید مضبوطی حاصل ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے لوگ صحابہ کرام میں بھی پائے جاتے تھے اور بعد میں بھی۔ بلکہ بعد میں جوں جوں علم ترقی کرتا گیا اور فن تحریر زیادہ پھیلتا گیا، ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی، حتیٰ کہ اس زمانہ میں اگر جبکہ روایات کتابی صورت میں جمع ہونے لگیں اور موجودہ کتب حدیث وغیرہ کے مجموعے عالم وجود میں آنے شروع ہوئے جس کا آغاز دوسری صدی ہجری سے سمجھا جاسکتا ہے روایات کو لکھ کر محفوظ کر لینے کا طریق عام طور پر رائج ہو چکا تھا اور راوی لوگ اپنی روایات کو دوسروں تک پہنچاتے ہوئے اپنی تحریری یادداشتوں سے کثرت کے ساتھ مدد لینے لگ گئے تھے، لیکن چونکہ محض کسی تحریری یادداشت کا موجود ہونا اسے قابلِ سند نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کی تائید میں معتبر زبانی تصدیق بھی موجود نہ ہو اور اسی لیے آج تک ہر مکتب ملک کی حدیثوں میں ہر دستاویز کی تصدیق کے لیے زبانی شہادت ضروری قرار دی جاتی ہے اس لیے بالعموم محدثین نے زبانی اور تحریری روایت کے امتیاز کو اپنے مجموعوں میں ظاہر نہیں کیا۔ لیکن اس میں ہرگز کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اب جو احادیث کے مجموعے ہمارے سامنے ہیں ان سب میں ایک معتبر حصہ ایسی روایتوں کا شامل ہے جو زبانی انتقال کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی ایک راوی سے دوسرے راوی تک منتقل ہوتی ہوئی نیچے اُتری ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق میں ہم اس جگہ اختصار کی غرض سے صرف صحابہ کے زمانہ کی چند مثالیں درج کر دیں گے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خود صحابہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور روایات کو لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے اور پھر اُنسی مجموعہ سے آگے سلسلہ روایت چلاتے تھے تو یہ ایک قطعی ثبوت اس بات کا ہو گا کہ یہ طریق بعد کے زمانہ میں (جبکہ فن تحریر بہت زیادہ وسیع ہو گیا اور روایات کے لکھنے کے لیے ہر قسم کی سہولت میسر آ گئی) بدرجہ اولیٰ جاری رہا۔ سب سے پہلی اور اصولی حدیث ہم اس معاملہ میں وہ درج کرنا چاہتے ہیں جن میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تحریک فرمائی ہے کہ جس شخص کو میری باتیں یاد نہ رہتی ہوں اُسے چاہیے کہ انہیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرے؛ چنانچہ ترمذی میں یہ روایت آتی ہے کہ:

هَذَا أَهْوَيْتُهُ قَالَ كَانَ رَجُلٌ مِنْ الْأَنْصَارِ يَخْلِسُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 فَيَسْمَعُ مِنَ النَّبِيِّ الْحَدِيثَ وَلَا يَحْفَظُهُ فَشَكَاهُ إِلَى النَّبِيِّ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
 اسْتَعِينْ بِمِثْلِكَ أَوْ مَا يَسْتَدِيرُ لِحُطِّهِ - (ترمذی ابواب العلم باب ما جاء في الرخصة فيه)



”یعنی ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک انصاری شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی باتیں سُنتا ہوں مگر مجھے وہ یاد نہیں رہتیں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے دائیں ہاتھ کی مدد حاصل کر کے میری باتوں کو لکھ لیا کرو۔“

اس حدیث سے ہمیں یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تحریر کیا کرتے تھے کہ جس شخص کو میری باتیں یاد نہ رہتی ہوں، وہ انہیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرے اور آپ کے اس فرمان کے ہوتے ہوئے اگر ہمیں تاریخ میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر نظر نہ بھی آدے کہ فلاں فلاں صحابی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے تو بھی قیاس یہی ہوگا کہ بعض صحابی ضرور حدیثیں لکھا کرتے تھے، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت سے صحابہ جیسی جماعت میں سے کسی فرد نے بھی فائدہ نہ اٹھایا ہو اور بہر حال جس صحابی کو آپ نے براہ راست مخاطب کر کے یہ الفاظ فرماتے تھے اُس نے تو ضرور اس ارشاد کی تعمیل کی ہوگی مگر یہ صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ حدیث میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ بعض صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بھی سُنتے تھے وہ لکھ لیا کرتے تھے۔ اس پر بعض لوگوں نے انہیں منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خوش ہوتے ہیں کبھی غصہ میں ہوتے ہیں، تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اس پر لکھنا چھوڑ دیا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا:

اُكْتُبْ فَاَلَّذِي نَسِيْتُ بِيَدِهِ مَا يَخْذُرُ جُ مِنْهُ اِلَّا الْحَقُّ اِلَيْهِ

”یعنی تم بیشک لکھا کرو کیونکہ خدا کی قسم میری زبان سے جو کچھ نکلتا ہے سچ اور راست نکلتا ہے۔“

اس کے بعد عبداللہ بن عمرو آپ کی باتیں لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے، چنانچہ بخاری میں آتا ہے:

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ يَقُولُ مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَدٌ اَلَّا يَخْدِيثُنَا

عَنْهُ مَعِيَ اِلَّا مَا كَانَ مِنْ عِبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اُكْتُبُ

”یعنی ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کی مجھ سے زیادہ حدیث

محفوظ نہیں ہے سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ حدیث سُنانے پر لکھ لیا کرتے

تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔“

پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے:

عَنْ اَبِي جَعْفَرَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيٍّ هَذَا عِنْدَكَ كِتَابٌ قَالَ لَا اِلَّا كِتَابُ اللَّهِ اَوْ فَمِنْ اَمْلِيَّةٍ

رَجُلٌ مُسْلِمٌ أَوْ مَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ قُلْتُ مَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ قَالَ  
الْعَقْلُ وَفِكَاتُ الْأَسِيرِ دَلَالَةُ الْقَتْلِ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ ۝

”یعنی ابوجحیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت علی سے یہ دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ سوائے قرآن شریف کے اور کچھ نہیں۔ ہاں ایک مسلمان کی خدا داد عقل ہے جس سے وہ خود سوچ کر اور قیاس کر کے فتویٰ معلوم کر سکتا ہے، البتہ میرے پاس یہ ایک لکھا ہوا صحیفہ ضرور موجود ہے۔ میں نے پوچھا اس صحیفہ میں کیا ہے فرمانے لگے کہ اس میں فلاں فلاں مسئلہ کے متعلق چند حدیثیں لکھی ہیں“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کا بھی یہی طریق تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خاص باتوں کو لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ پھر ایک اور حدیث آتی ہے کہ :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خُطِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفُتِحَ مَكَّةَ فَقَالَ ..... فَبَاءَ رَجُلٌ  
مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ أَكْتُبْ لِي فَقَالَ أَكْتُبُوا لِأَيِّ فُلَانٍ ۝

”یعنی ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔ جس میں یہ یہ کچھ فرمایا۔ اس پر ایک یمنی شخص نے آگے بڑھ کر عرض کیا یا رسول اللہ ! یہ خطبہ مجھے لکھ دیجئے۔ آپ نے حکم دیا کہ وہ خطبہ اُسے لکھ کر دے دیا جائے“

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ صحابہ کے زمانہ سے ہی حدیثوں کے لکھنے کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ اور بعض صحابہ اس پر کاربند تھے اور یقیناً اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا حدیثوں کو لکھ کر محفوظ کر لینے کا رواج زیادہ ہوتا گیا مگر جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اس مختصر نوٹ میں بعد کے زمانہ کی مثالیں درج کرنے کی گنجائش نہیں، البتہ صرف اس اظہار کے لیے کہ بعد میں حدیثوں کے قلمبند کرنے کے طریق میں کس قدر وسعت ہو گئی تھی اس جگہ صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے تیحی بن یحییٰ ایک مشہور راوی گذرے ہیں جن سے امام بخاری اور امام مسلم اور ابوداؤد سجستانی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے روایت لی ہے ان کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ اُن کے پاس چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہوئی محفوظ تھیں جس سے وہ آگے روایت کیا کرتے تھے، چنانچہ وہ قیامت الاعیان میں لکھا ہے کہ :

سُئِلَ يَحْيَى كَمْ كُتِبَتْ مِنْ الْحَدِيثِ فَقَالَ كُتِبَتْ بِسِدِّي هَذِهِ سِتًّا وَمِائَةً أَلْفًا  
حَدِيثًا ۝

۱۔ بخاری کتاب المسلم باب کتابہ المسلم ۝ ۲۔ بخاری کتاب المسلم باب کتابہ المسلم ۝

۳۔ قیامت الاعیان مصنف ابن خلکان حالات یحییٰ بن یحییٰ ۝

”یعنی یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کتنی حدیثیں لکھی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیث لکھی ہے“

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یحییٰ بن معین جامعین حدیث میں سے نہیں ہیں۔ جنہوں نے امام بخاری اور مسلم وغیرہ کی طرح کوئی مجموعہ حدیث پیچھے چھوڑا ہو بلکہ ان کا حدیث لکھنا صرف ایک راوی کی حیثیت میں تھا۔ اسی پر دوسرے زواۃ حدیث کا قیاس ہو سکتا ہے۔

الغرض اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ صحابہ کے زمانہ سے ہی احادیث و روایات کا ضبط تحریر میں آنا شروع ہو چکا تھا اور بعد میں یہ سلسلہ زیادہ وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں ایک معتد بہ حصہ ایسی روایتوں کا موجود ہے جو زبانی روایتوں کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی مروی ہوتی ہوئی جامعین حدیث تک پہنچی ہیں۔ ہمارا یہ مطلب نہیں بلکہ اکثر صحابہ حدیث لکھنے کے عادی تھے یا یہ کہ بعد کے راوی سب کے سب لازماً حدیث لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسا دعویٰ یقیناً واقعات کے خلاف ہوگا، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی بعض نے حدیث لکھنے کا طریق شروع کر دیا تھا اور بعد کے زمانہ میں یہ طریق زیادہ وسیع ہو گیا گو پھر بھی یقیناً احادیث کا ایک معتد بہ حصہ زبانی روایت پر ہی مبنی رہا ہے اور موجودہ مجموعوں میں ہر دو قسم کی روایات شامل ہیں۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ میری طرف منسوب کر کے سوائے قرآن شریف کے اور کچھ نہ لکھا کرو۔ اور اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ صحابہ حدیث نہیں لکھتے ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو واقعات کے مقابل پر کوئی استدلال قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ جب واقعہ یہ ہے کہ بعض صحابہ حدیث لکھا کرتے تھے تو کوئی استدلالی دلیل اس کے مقابل پر کیا وزن رکھ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ان احادیث کی حقیقت کے متعلق جن میں لکھنے سے منع کیا گیا ہے فوراً نہیں کیا گیا۔ دراصل یہ احادیث خاص زمانہ اور خاص حالات کے متعلق ہیں اور صرف ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھا کرتے تھے اور اس حکم سے غرض یہ تھی کہ تا قرآنی وحی کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہونے پائے۔ عام لوگوں کے لیے یا عام حالات میں کوئی روک نہیں تھی۔ واللہ اعلم۔

**حدیث و سیرۃ کی روایتوں میں ایک بنیادی فرق** اس اصولی بحث کے ختم کرنے سے

قبل یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ گو مسلمان مصنفین

نے اپنی روایات کی پڑتال میں روایت و درایت ہر دو قسم کے اصول کو علی قدر مراتب ملحوظ رکھا ہے مگر انہوں نے ہر قسم کی روایت کے لیے ایک ہی معیار نہیں رکھا بلکہ وہ ایک دانشمند محقق کی طرح اس غرض و فائیت کے

مناسب حال جس کے لیے کوئی روایت مطلوب ہوتی تھی اپنے معیار کو نرم یا سخت کرتے رہے ہیں۔ یعنی بعض علوم میں اُنہوں نے اپنا معیار سخت رکھا ہے اور بعض میں نرم۔ مثلاً حدیث میں جہاں عقائد و اعمال کا تعلق تھا محدثین نے بڑی سختی کے ساتھ روایات کو پرکھا ہے اور اپنے معیار کو بہت بلند رکھا ہے۔ لیکن سیرۃ و تاریخ وغیرہ میں اتنی سختی نہیں کی، چنانچہ علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ اپنی سیرۃ میں لکھتے ہیں کہ:

لَا يَخْفَى أَنَّ السِّيَرَةَ تَجْمَعُ الصَّحِيحَ وَالضَّعِيفَ وَالْمُرْسَلَ وَالْمُنْقَطِعَ

”یعنی۔ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ سیرۃ کی روایتوں میں صحیح اور ضعیف اور مرسل اور منقطع سبھی قسم کی روایتیں شامل ہیں۔“

اور پھر امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ حدیث کی زبانی اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

إِذَا رَوَيْنَا فِي الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ شِدَّةً نَادِرًا وَثِقَاتًا فِي الْفَضَائِلِ وَنَحْوِهَا  
تَسَاهَلْنَا

”یعنی ہمارا اصول یہ ہے کہ جب ہم حلال و حرام کے مسائل کے لیے کوئی روایت بیان کرتے ہیں تو ہم اس کی تحقیق میں بڑی سختی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن فضائل اور سیرۃ میں اپنے معیار کو نرم کر دیتے ہیں۔“

اور اس اصول کی مزید تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

”الَّذِي ذَهَبَ إِلَيْهِ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ التَّرَخُّصُ فِي التَّقَاتِ وَمَا لَأَحْكَمَ فِيهِ مِنْ  
أَخْبَارِ الْمُعَاذِيِّ وَمَا يَجْعَلُ مَجْزَى ذَلِكَ وَأَنَّهُ يُقْبَلُ فِي الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لِقَوْلِ  
تَخَلُّقِ الْأَحْكَامِ بِهَا

”یعنی اکثر اہل علم نے یہی طریق رکھا ہے کہ ایسی باتیں جن میں شرعی احکام نہ بیان ہوں جیسے سیرۃ معاذی وغیرہ اُن میں اپنے معیار کو نرم رکھنا چاہیے، کیونکہ ان امور میں ہم ایسی روایتوں کو بھی قبول کر سکتے ہیں جنہیں دینی اور فقہی احکام کے معاملہ میں قبول نہیں کر سکتے۔“

امام احمد بن حنبلؒ نے اس اصول کی تشریح میں ایک لطیف مثال بھی بیان کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

إِبْنُ إِسْحَاقَ رَجُلٌ كَثُوبٌ هَذِهِ الْأَحَادِيثُ يَعْنِي الْمُعَاذِيَّ وَنَحْوَهَا

إِذَا جَاءَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ أَرَدْنَا نَأْتُوا مَا هَكَذَا وَفِيمَنْ أَصَابَهُ يَدْيُهُ الْأَرْبَعُ

”یعنی ابن اسحاق صاحب سیرۃ و معاذی بیشک اس رتبہ کے آدمی ہیں کہ ہمیں ان سے سیرۃ و تاریخ

میں روایت لیتے ہوئے تامل نہیں ہونا چاہیئے، لیکن جب حلال و حرام کے مسائل کا سوال ہو تو ہمیں ایسے آدمی چاہئیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی چار انگلیاں مضبوطی کے ساتھ ملا کر باہم جھٹ کر لیں۔ جس سے مراد یہ تھی کہ حدیث میں ایسے راوی درکار ہیں جن میں کوئی رخنہ نہ نکالا جاسکے۔

الغرض حدیث و سیرۃ کی روایتوں کے معیار میں ہمیشہ سے ایک اصولی فرق مد نظر رکھا گیا ہے اور یہی ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ حدیث میں جس کی روایت نے دین کی بنیاد بننا تھا سخت معیار رکھنا ضروری تھا تاکہ کوئی کمزور روایت حدیث کے ذخیرہ میں راہ پاک کو دینی فتنہ کا باعث نہ بنے، لیکن سیرۃ و تاریخ میں یہ پہلو ایسا خطرناک نہیں تھا۔ بلکہ سیرۃ و تاریخ میں زیادہ قابل توجہ یہ بات تھی کہ اساسی مواد جمع ہو جائے جس میں بعد میں اصول مقررہ کے ماتحت چھان بین کی جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مکتب حدیث کا روایتی پہلو کتب سیرۃ و مخازی وغیرہ کی نسبت بہت زیادہ مضبوط اور بلند سمجھا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا تاکہ جہاں ایک طرف دین کو فتنہ و اختلاف سے بچایا جاتا وہاں تاریخ میں جامعیت قائم رہتی۔ خوب سوچ لو کہ تاریخ کے لیے یہی پالیسی مناسب تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی روایت بالبداهت غلط اور باطل ہو ہر وہ روایت لے لی جادے تاکہ بعد کی تحقیق اور ریسرچ کے لیے ایک بنیادی ذخیرہ محفوظ ہو جائے مگر حدیث کے لیے یہ پالیسی سخت نقصان دہ تھی، کیونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ معیار کو ایسا سخت رکھا جائے کہ خواہ کوئی مضبوط روایت گر جائے مگر بہر حال جو حدیث لی جائے وہ پختہ اور قابل اعتماد ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احادیث کا سارا مجموعہ غلطی سے پاک ہے یا یہ کہ سیرت و تاریخ کا مجموعہ کمزور روایات پر مبنی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ بالعموم حدیث کا معیار سیرت و تاریخ سے بالا و بلند ہے۔ اور اسی لیے مسلمان مورخین میں سے جو لوگ زیادہ محقق گذرے ہیں انہوں نے سیرۃ و تاریخ کے واقعات کے لیے ان روایات کو ترجیح دی ہے جو دینی مسائل کے ضمن میں کتب حدیث میں مروی ہوتی ہیں۔ اور مصنف کتاب ہذا کا بھی اس تصنیف میں یہی مسلک رہا ہے۔

### کتب اصول حدیث

روایت کا جو علم مسلمانوں نے ایجاد کیا جس کے اندر اصول روایت و درایت دونوں شامل ہیں وہ عموماً علم اصول حدیث کے نام سے

موسوم کیا جاتا ہے اس علم کے متعلق بہت سی تصنیفات پائی جاتی ہیں جن میں متقدمین اور متاخرین ہر دو کی تصانیف شامل ہیں مگر آجکل جو کتب اس فن میں زیادہ معروف و متداول ہیں جن میں اکثر متقدمین کی تحریرات کا خلاصہ آگیا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) علوم الحدیث المعروف بمقدمہ ابن صلاح مصنفہ حافظ ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن المعروف بابن صلاح المتوفی ۷۴۳ھ۔



(۲) فتح المغیث فی اصول الحدیث مصنفہ حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی المتوفی ۸۰۵ھ

(۳) شرح الفیہ العراقی فی اصول الحدیث مصنفہ محمد بن عبدالرحمن السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ

(۴) موضوعات کبیر مصنفہ نور الدین ملا علی بن محمد سلطان القاری المتوفی ۱۰۶۱ھ

ان کتب میں روایت و درایت ہر دو کے اصول پوری شرح و ضبط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور ہر پہلو کے متعلق متعدد مثالیں دے دے کر بات کو واضح کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر کتاب حقیقۃً موضوع روایتوں کے بیان میں ہے مگر منہا اصول حدیث کی بحث بھی آجاتی ہے۔

فن اصول حدیث یا علم روایت کے ضمنی علوم میں دو علم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اعمیٰ علم مصطلحات حدیث اور علم اسماء الرجال۔ مقدم الذکر علم میں حدیث کی اصطلاحات کا بیان ہوتا ہے جن سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مختلف اعتبار سے حدیث کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کے کیا کیا نام ہیں اور ہر حدیث کی ایک قسم دوسری اقسام کے مقابل پر کیا وزن رکھتی ہے۔ اس علم کے تحت حدیث کی جو اقسام مختلف جہات سے مقرر کی گئی ہیں، ان میں سے زیادہ معروف یہ ہیں :

متواتر - مشہور - عزیز - غریب - شاذ - منکر - صحیح - حسن - ضعیف - متردک - موضوع - مرفوع

موقوف - مقطوع - متصل - منقطع - معلق - مرسل - معضل - معطل - بدس - مضطرب - بدرج

قولی - فعلی - تقریری - قدسی وغیرہ وغیرہ۔

اس علم میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس وقت زیادہ معروف و متداول یہ ہیں :

(۱) نزهة النظر فی توضیح نخبة الفكر مصنفہ ابو الفضل احمد ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ۔

(۲) ایواقیت والدرر مصنفہ شیخ عبدالرزاق المنادی المتوفی ۱۰۳۱ھ۔

فن اسماء الرجال اس علم کا نام ہے جس میں حدیث و سیرت وغیرہ کے راویوں کے حالات زندگی کو تنقیدی نظر کے نیچے لاکر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے تاکہ جب بھی کوئی روایت سامنے آوے تو اس کے سلسلہ رواۃ کا امتحان کیا جاسکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ علم بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے حتیٰ کہ بقول سرمدیم میور اس علم کے ذریعہ چالیس ہزار راویوں کے حالات زندگی ضبط میں آگئے ہیں۔ جو یقیناً دنیا کی تاریخ میں ایک فینیکس ریکارڈ ہے۔ یہ مجموعہ سرسری حالات کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ صحیح تنقیدی اصول کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ جس میں ہر راوی کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات، جائے رہائش، حالات زندگی، عادات و اطوار، علمی قابلیت، ذہن حافظہ اور سمجھ، دیانت و امانت، طریق روایت کی خصوصیات، استادوں کے نام، شاگردوں کے نام، ہم عصروں کے نام وغیرہ وغیرہ پوری صحت اور تعین کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلا شخص جس نے اس علم کی طرف باقاعدہ فن کے رنگ میں توجہ کی وہ شعبہ بن الحجاج المتوفی ۱۹۰ھ تھے۔ ان کے بعد امام یحییٰ بن سعید القطان المتوفی ۱۹۸ھ نے اس علم کو اور ترقی دی اور سب سے پہلا مجموعہ تیار کیا۔ بعد کے علامہ احمد بن عبد اللہ الحللی المتوفی ۲۶۱ھ نے اور امام عبد الرحمن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ نے اس فن میں مفید کتابیں لکھیں اور ہر دور نے اپنی تصانیف کا نام کتاب الجرح والتعديل رکھا۔ مگر اس فن میں متقدمین کی کتب میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب الکمال فی معرفۃ الضعفاء والمترکین مصنف ابو احمد عبد اللہ بن محمد بن عدی المتوفی ۳۶۵ھ تھی۔ ان کے علاوہ حافظ عقیلی اور امام دارقطنی وغیرہ نے بھی اس فن میں کتابیں لکھی ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر کتب اب ناپید ہو چکی ہیں گو بعد کی کتب میں ان سب کے کثرت کے ساتھ حوالے آتے ہیں۔

بعد کی کتب میں سے جو ابتدائی کتب پر مبنی ہیں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ معروف و متداول ہیں :

- (۱) الکمال فی معرفۃ الرجال مصنف حافظ عبد الغنی بن عبد الواحد المقدسی المتوفی ۳۸۰ھ
- (۲) تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال مصنف حافظ جمال الدین یوسف بن زکی المرزی۔ المتوفی ۷۲۲ھ
- (۳) میزان الاعتدال فی نعت الرجال (دین جلد) مصنف حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد الذہبی۔ المتوفی ۷۴۸ھ
- (۴) تہذیب التہذیب (بارہ جلد) مصنف حافظ ابو الفضل احمد بن علی بن محمد بن علی بن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ
- (۵) استیعاب فی معرفۃ الاصحاب (۲ جلد) مصنف حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ
- (۶) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (۵ جلد) مصنف حافظ عز الدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبد الکریم المعروف ابن اثیر الجزری المتوفی ۷۴۰ھ۔

(۷) اصحابہ فی معرفۃ الصحابہ (۱۰ جلد) مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اوپر کی فہرست میں مؤخر الذکر تین کتابیں دراصل فن اسماء الرجال سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ محض صحابہ کے حالات میں ہیں لیکن چونکہ یہ دونوں علوم آپس میں بڑی حد تک ملتے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کتب کو اس فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

اقسام کے لحاظ سے روایات کا علم تین قسموں میں منقسم ہے۔ (۱) حدیث کتب حدیث (۲) تفسیر اور (۳) سیرۃ و تاریخ۔ مؤخر الذکر علم کے ایک حصہ کو مخازی بھی کہتے



یہیں۔ حدیث روایات کے لیے مجموعے کا نام ہے جس کی اصل غرض و غایت دینی مسائل کا ضبط ہے خواہ ضمنی طور پر اس میں تفسیری اور تاریخی حصہ بھی آجائے۔ حدیث میں عموماً وہ روایات درج ہوتی ہیں جن کی سند بالآخر کسی نہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ یعنی آخری راوی یہ بیان کرتا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے سنا یا یوں کرتے دیکھا۔ یا میرے سامنے آپ کے سامنے کسی نے یوں کیا اور آپ نے اسے نہیں روکا۔ مگر کتب حدیث میں کچھ حصہ ایسی روایات کا بھی آجاتا ہے جو صرف صحابہ کے اقوال و اعمال تک محدود ہوتا ہے جنہیں اصطلاحی طور پر آثار کہتے ہیں۔ حدیث کی کتابیں بے شمار ہیں جو زیادہ تر دوسری اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں، مگر یہ سب ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ کیونکہ سب محدثین نے ایک سخت معیار نہیں رکھا اور نہ ایک سی احتیاط برتی ہے۔ حدیث کی زیادہ معروف کتابیں مع ان کے مختصر حالات و کوائف کے درج ذیل کی جاتی ہیں :

(۱) صحیح بخاری	مصنفہ امام محمد بن اسماعیل بخاری ۱۹۳ھ تا ۲۵۶ھ	یہ سب کتب حدیث میں صحیح ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ امام بخاری صاحب نے چار لاکھ روایات کے مجموعہ میں سے صرف چار ہزار احادیث چُن کر اس مجموعہ میں درج کی ہیں اور انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے۔ بلا ریب ان کا معیار سب محدثین سے بالا و ارفع ہے :
(۲) صحیح مسلم	مصنفہ امام مسلم بن حجاج ۲۰۳ھ تا ۲۶۱ھ	اس کا درجہ بخاری سے نیچے مگر باقی کتب حدیث سے اوپر سمجھا جاتا ہے۔ جس روایت میں بخاری اور مسلم اتفاق کر لیں اسے متفق علیہ کہتے ہیں جو سب سے مضبوط سمجھی جاتی ہے :
(۳) جامع ترمذی	مصنفہ ابوعلی محمد بن عیسیٰ ترمذی ۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ساتھ اگلی چار کتابیں بل کر صحاح ستہ کہلاتی ہیں اور یہ سب معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا درجہ قریباً اسی ترتیب کے مطابق سمجھا جاتا ہے
(۴) سنن ابوداؤد	مصنفہ ابوداؤد سلیمان بن اشعث ۲۰۲ھ تا ۲۵۵ھ	

(۵) سنن نسائی	مصنف احمد بن حنبل النسائی ۲۱۵ھ تا ۲۴۱ھ مصنف محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی ۲۰۹ھ تا ۲۴۳ھ	جو اس فہرست میں ملحوظ رکھی گئی ہے ۛ
(۶) سنن ابن ماجہ		
(۷) مؤطا امام مالک	مصنف امام مالک ابن انس ۱۶۵ھ تا ۲۰۵ھ	یہ کتاب بہت بلند پایہ ہے بلکہ بعض نے اسے بخاری کے برابر قرار دیا ہے مگر چونکہ اس کے بیشتر حصہ کا اسلوب فقہ کے طریق پر ہے، اس لیے اسے حدیث کی کتاب کے طور پر صحاح میں شمار نہیں کیا گیا ورنہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے وہ کسی مجموعہ حدیث سے کم نہیں۔ امام مالک فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں ۛ
(۸) مسند امام ابو حنیفہ	مصنف امام نعمان بن ثابت ابو حنیفہ ۸۰ھ تا ۱۵۰ھ	فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے سب سے بلند ترین یہ محدث نہیں تھے ورنہ انھوں نے اس طرف توجہ کی مگر بعض احادیث اپنی فقہ کی بنیاد کے لیے جمع کی ہیں ۛ
(۹) مسند امام شافعی	مصنف امام محمد بن ادریس شافعی ۱۰۵ھ تا ۲۰۴ھ	یہ بھی فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور ان کی کتاب اپنی فقہ کی تائید میں چہند احادیث کا مجموعہ ہے ۛ
(۱۰) مسند احمد	مصنف امام احمد بن محمد بن حنبل ۱۶۱ھ تا ۲۴۱ھ	یہ بھی فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے ہیں مگر ان کی احادیث کا مجموعہ بھی نہایت شاملا ہے اور حدیث کی کتابوں میں غالباً سب سے بڑا ہے مگر صحت

روایت کا معیار صحاح کے برابر نہیں ہے		
صحاح ستہ کے بعد اس کا مرتبہ اچھا ہے	مصنفہ عبداللہ بن عبد الرحمن دارمی ۱۸۱ھ تا ۲۵۵ھ	(۱۱) سنن دارمی
مشہور محدث ہیں	مصنفہ سلطان بن احمد طبرانی ۲۹۰ھ تا ۳۲۰ھ	(۱۲) معجم کبیر و اوسط و صغیر
"	مصنفہ علی بن محمد دارقطنی ۳۰۶ھ تا ۳۸۵ھ	۱۳ سنن دارقطنی
"	مصنفہ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم۔ ۳۲۱ھ تا ۳۵۵ھ	(۱۴) مستدرک حاکم
"	مصنفہ احمد بن حنین بیہقی ۳۸۴ھ تا ۴۵۸ھ	(۱۵) متفرق کتب حدیث وسیرہ

مذکورہ بالا محدثین کے علاوہ بھی ایسے محدث گذرے ہیں جنہوں نے باوجود بعد زمانہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ تک روایت کا سلسلہ پہنچا کر احادیث نقل کی ہیں۔ مگر ہم نے زیادہ معروف محدثین کے نام بعد کی فہرست میں درج کر دیئے ہیں اور اس فہرست میں بھی تخریر الذکر محدثین کے مجموعوں میں کیا بوجہ بعد زمانہ اور کیا بوجہ احتیاط کی کسی کے کمزور اور ضعیف روایات کا حصہ زیادہ آگیا ہے، مگر ہر حال حدیث کا یہی مجموعہ ہے جس سے ایک مؤرخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح اور آغاز اسلام کی تاریخ کے متعلق علی قدر مراتب فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ فی الجملہ احادیث کا مجموعہ سیرت و

۱۰ شاذ ابن حبان۔ سعید بن منصور۔ ابن ابی شیبہ۔ عبدالرزاق۔ ابویعلیٰ۔ ابن عدی۔ عقیلی۔ خطیب بغدادی۔ ہزار۔ ابن عساکر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن مرددہ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بعض مؤرخ بھی ہیں۔

تاریخ کی روایات سے زیادہ پختہ اور زیادہ قابلِ اقتباس ہے اور احادیث کی جو اعلیٰ کتابیں ہیں مثلاً بخاری اور مسلم ان کے مقابلہ پر توسیرۃ کی روایات کی حیثیت بہت ہی کم ہے۔

## سنت اور حدیث میں فرق

درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ سو جانتا چاہیے کہ یہ جو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حدیث اور سنت ہم معنی الفاظ ہیں، یہ درست نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ حدیث اور سنت دو مختلف چیزیں ہیں کیونکہ جہاں حدیث ان لفظی روایات کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے متعلق صحابہ سے تابعین تک اور تابعین سے تبع تابعین تک اور تبع تابعین سے ان کی بعد کی نسل تک پہنچیں اور پھر ائمہ حدیث کی تحقیق و تدقیق کے بعد کتابی صورت میں جمع ہو گئیں وہاں سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل یعنی تعامل کا نام ہے جو کسی لفظی روایت کے ذریعہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے متحدہ تعامل کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اور دوسری سے تیسری تک اور تیسری سے چوتھی تک پہنچا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ مثلاً قرآن شریف میں نماز کا حکم ہے اور اب قطع نظر اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیل کے متعلق کوئی زبانی ہدایت دی تھیں یا نہیں آپ نے صحابہ کے سامنے اپنے عمل سے اس کی ساری تفصیلات کر کے دکھادیں اور عمر بھر اس تعامل کو تکرار کے ساتھ دہرا دہرا کر ان کے ذہن نشین کرادیا اور خود اپنی عمر بھر ان کو نماز کی تفصیلات پر قائم کر دیا اور پھر صحابہ کے ذریعہ یہ تعامل تابعین تک پہنچا۔ جنہوں نے صحابہ کی گئی زبانی تشریح سے نہیں بلکہ عملی تعامل سے اس کو صحابہ سے سیکھا اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے چلتا چلا گیا، اسی طرح دوسرے مسائل کا حال ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد قرآن شریف اور سنت پر ہے جو ابتداء سے ہی ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو چلے آئے ہیں اور حدیث صرف ایک زائد چیز ہے جو علمی تشریح یا ضمنی تائید وغیرہ کے لیے کام آ سکتی ہے۔ ورنہ اس پر اسلام کی اصل بنیاد نہیں ہے لیکن غلطی سے بعض لوگوں نے حدیث اور سنت کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے۔ اس بحث کو ہمارے اس مضمون کے ساتھ تعلق نہیں ہے مگر ہم نے خیال کیا کہ حدیث کے متعلق اس عام غلط فہمی کو اس جگہ دور کر دیا جائے تاکہ نادانوں کے دلوں میں یہ شبہ نہ پیدا ہو کہ گویا اسلام کی بنیاد ایک ایسی چیز پر ہے جو ڈیڑھ دو سو سال بعد ضبط میں آئی ہے۔

روایات کا دوسرا مجموعہ روایتی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں چونکہ قرآن شریف کی تشریح کا تعلق ہے جو زیادہ تر علمی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس علم میں بھی

حدیث کے برابر احتیاط نہیں برتی گئی۔ مگر بہر حال یہ بھی ایک مفید مجموعہ ہے جس کے متعلقہ حصوں سے سیرۃ و تاریخ کی تدوین میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کی زیادہ معروف کتابیں جن میں منقولی اور روایتی طریق پر قرآن شریف کی تفسیر درج کی گئی ہے یہ ہیں :

(۱) تفسیر ابن جریر (۲۰ جلد)	مصنف امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری ۲۲۴ تا ۳۱۰ھ	منقولی تفسیر میں یہ سبک جامع مجموعہ ہے، مگر اس مجموعہ میں کمزور روایات بھی شامل ہو گئی ہیں۔
(۲) تفسیر ابن کثیر (۱۰ جلد)	مصنف حافظ عماد الدین سیوطی بن عمر ابن کثیر ۳۰۰ تا ۳۷۳ھ	یہ تفسیر نہایت معتبر اور مستند بھی جاتی ہے جس کے متعلق علامہ درقانی کا قول ہے کہ اس جیسی اور کوئی تفسیر نہیں نکلتی گئی۔
(۳) الدر المنثور فی التفسیر بالماثور (۶ جلد)	مصنف شیخ بلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر السیوطی ۸۴۹ تا ۹۱۱ھ	یہ بعد کی تصنیف ہے جس میں رطب فیاض سب کچھ جمع ہو گیا ہے۔

**سیرت و تاریخ کی ابتدائی کتب**  
تیسرا سلسلہ سیرۃ و تاریخ و مغازی کا ہے۔ اس سلسلہ کی غرض غایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و سوانح اور ابتدائی اسلامی جنگوں اور ابتدائی اسلامی تاریخ کے متعلق روایات جمع کرنا تھی مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ روایتیں بحیثیت مجموعی حدیث کی روایتوں سے کمزور ہیں کیونکہ اس سلسلہ کے جمع کرنے والوں کی غرض سیرت و تاریخ کے سارے مواد کو ایک جگہ جمع کر دینا تھی تاکہ کوئی بات منقطع میں آنے سے رہ نہ جائے اور پھر بعد میں آنے والے اس کی چھان بین خود کر لیں جو فکر کن شریف اور صحیح احادیث کو سامنے رکھ کر مشکل نہیں ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدائی تصنیفات جن میں ہم نے جغرافیہ اور تاریخ عرب کی کتب بھی شامل کر لی ہیں یہ ہیں:

(۱) کتاب المغازی	مصنف محمد بن مسلم بن شہاب زہری ۱۵۰ تا ۲۴۰ھ	یہ کتاب غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اور ابتدائی جنگوں کی تاریخ میں سب سے پہلی تصنیف ہے۔ امام زہری تابعین میں سے تھے اور متعدد صحابہ کو دیکھا اور ان کی باتوں کو سنا تھا۔ نہایت ثقہ
------------------	---	--

اور وسیع اعلم انسان تھے مگر افسوس کہ ان کی کتاب اب ناپید ہو چکی ہے۔ البتہ بعض کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں اور امام زہری کی زبانی روایات تو اکثر کتابوں میں آتی ہیں اور نہایت معتبر خیال کی جاتی ہیں۔

موسٰی بن عقبہ امام زہری کے شاگرد ابن رشید میں سے تھے اور بعض صحابہ کو دیکھا تھا۔ نہایت قحط مصنف تھے اور جو کچھ لیتے تھے جانچ تول کر لیتے تھے۔ حدیث میں امام مالکؒ ان کے شاگرد تھے مگر افسوس کہ ان کی کتاب بھی ناپید ہے۔

مصنفہ موسٰی بن عقبہ المتوفی  
۳۱۱ھ

(۲) المغازی

ابن اسحاق بھی امام زہری کے شاگردوں میں سے تھے اور سیرۃ میں بڑا پایہ رکھتے ہیں۔ انکی کتاب سیرۃ و مغازی میں بطور بنیاد کے سمجھی گئی ہے اور اکثر بعد کے مؤرخین ان کے خوشہ چین ہیں بعض لوگوں نے ان کی ثقاہت پر شبہ کیا ہے مگر یہ درست نہیں؛ البتہ چونکہ ان کا طبعی میلان سیرۃ کی طرف تھا، اس لیے حدیث کے سخت معیار کے مطابق وہ پورے نہیں اترتے۔ اسی لیے امام بخاری نے حدیث میں ان سے روایت نہیں لی لیکن تاریخ میں آزاد دی سے لی ہے۔ ان کی کتاب عام طور پر نہیں ملتی لیکن ابن ہشام کی سیرۃ میں اس کا بیشتر حصہ اس

مصنفہ محمد بن اسحاق المتوفی  
۱۵۱ھ

(۳) سیرۃ ابن اسحاق

<p>طرح آگیا ہے کہ اصل کتاب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔</p>		
<p>یہ بہت پائے کے مؤرخ تھے اور نہایت ثقہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی سیرت جو بیشتر طور پر سیرت ابن اسحاق پر مبنی ہے۔ بہت جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ان کی سیرت سب سے زیادہ مقبول و متعارف ہے۔</p>	<p>مصنفہ عبدالمالک بن ہشام المتوفی ۲۱۳ھ</p>	<p>(۲) سیرۃ ابن ہشام</p>
<p>یہ صاحب بہت وسیع المعولہ مؤرخ تھے۔ مگر چونکہ جھوٹ پھیل چکا اور صحیح و سقیم میں کوئی پرہیز نہیں تھا اس لیے اکثر محققین کے نزدیک ان کی تصنیفات بالکل ناقابل اعتبار اور ناقابل سند سمجھی گئی ہیں ان کے متعلق ہم ایک علیحدہ نوٹ دیں گے۔</p>	<p>مصنفہ محمد بن عمر اوائدی ۳۱۰ھ تا ۳۰۶ھ</p>	<p>(۵) کتاب السیرۃ کتاب النوازی</p>
<p>ابن سعد اوائدی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ان کے سیکرٹری بھی تھے مگر باوجود اس نسبت کے خود ثقہ اور معتبر سمجھے گئے ہیں ان کی کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بہت تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے پہلی و جلدیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہیں اور باقی آپ کے صحابہ کے حالات میں۔ اگر اوائدی کی روایتوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کتاب بہت اچھی اور مستند ہے۔</p>	<p>مصنفہ محمد بن سعد ۱۶۸ھ تا ۱۶۲ھ</p>	<p>(۶) طبقات کبیر</p>



(۷) تاریخ الامم والملوک

مصنف ابو جعفر محمد بن جریر الطبری  
۲۲۳ھ تا ۳۱۰ھ

یہ کتاب سیرۃ کی کتاب نہیں بلکہ تاریخ کی کتاب ہے، مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ بھی اس کے اندر شامل ہے اس لیے اسے سیرت کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ طبری اسلام کے مشہور اور مستند علماء میں سے تھے اور ان کی کتاب جو بارہ جلدوں میں ہے نہایت جامع تاریخ بھی گئی ہے۔ انھوں نے ابن اسحاق اور واقدی اور ابن سعد کی بیشتر روایتوں کو جمع کرنے کے علاوہ بہت سی نئی روایتیں بھی درج کی ہیں اور سیرت و تاریخ میں ایک نہایت عمدہ ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

(۸) شمائل ترمذی

مصنف ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی  
۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ

ترمذی کی حدیث کا ذکر حدیث کی ذیل میں گذر چکا ہے، مگر انہوں نے شمائل نبوی پر ایک علیحدہ رسالہ بھی لکھا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ مبارک اور ذاتی عادات و خصائل میں ایک مختصر مگر عمدہ تصنیف ہے۔

(۹) کتاب المعارف

مصنف عبد اللہ بن مسلم بن قتیبة  
۲۱۳ھ تا ۲۷۹ھ

یہ کتاب تاریخ عرب اور اسلام کے متعلق معلومات عامہ پر مشتمل ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاص خاص اصحاب کے حالات بھی درج ہیں۔

(۱۰) فتوح البلدان

مصنف ابو جعفر احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری۔ المتوفی ۲۷۹ھ

اس کتاب میں ان فتوحات کا ذکر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

<p>خلفاء کے ہاتھ پر ہوئیں۔ مشہور اور متداول کتاب ہے۔</p>		
<p>ابو یوسف مشہور فقہ گزرے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان ٹیکسوں وغیرہ کے مسائل اور تاریخ بیان کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کی طرف سے مفتوح قبائل پر لگائے جاتے تھے۔</p>	<p>مصنف قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم المتوفی ۱۸۲ھ</p>	<p>(۱۱) کتاب الخراج</p>
<p>اس کتاب میں دنیا کی مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ سے ابتداء کر کے بالآخر عرب کے حالات درج کرتے ہوئے خلفائے بنو عباس تک اسلامی تاریخ کو مکمل کیا گیا ہے۔</p>	<p>مصنف ابو الحسن علی بن حسین محرمی المتوفی ۳۴۶ھ</p>	<p>(۱۲) مروج الذهب</p>
<p>مکہ کی مستند اور ابتدائی تاریخ ہے۔</p>	<p>مصنف ابوالولید محمد بن عبد الحکیم ازرقی۔ المتوفی ۲۲۳ھ</p>	<p>(۱۳) تاریخ مکہ</p>
<p>جغرافیہ عرب کی ابتدائی اور مستند کتاب ہے۔</p>	<p>مصنف ابو محمد حسن بن احمد بن یحییٰ الہمدانی المعروف بابن حاکم المتوفی ۳۲۳ھ</p>	<p>(۱۴) صفة جزيرة العرب</p>

یہ وہ ذخیرہ ہے جو تاریخی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ابتدائی اسلامی تاریخ کا اصل ماخذ اور

۱۔ اس مصنف کی ایک کتاب اکلیل بھی ہے جو دس جلدوں میں ہے اور قبیلہ حمیر کے حالات اور تاریخ میں کے علاوہ بہت سے دوسرے مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ دیکھو کشف الظنون زیر نام اکلیل ۲

منبع ہے اور بعد کی سب کتابیں اسی منبع کی خوشہ چین ہیں، لیکن جیسا کہ اوپر ظاہر کر دیا گیا ہے یہ سب کتب سیرت کی کتابیں نہیں اور نہ ہی صحیح معنی میں وہ سب کی سب تاریخ کی کتابیں ہیں مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آغاز اسلام کی تاریخ کے ساتھ ان کتب کے معنائیں کو ایک طبعی جوڑ ہے، اس لیے ہم نے انہیں سیرت کی کتابوں میں شامل کر لیا ہے۔ باقی جیسا کہ اوپر اشارہ کر دیا گیا ہے خالص سیرت کی اصل ابتدائی کتابیں جو اس وقت پائی جاتی ہیں، وہ صرف چار ہیں۔ اعمیٰ سیرت ابن ہشام۔ کتاب السیرت والمغازی لواقفی۔ طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری۔ لیکن ان میں سے چونکہ واقفی مطعون و متروک ہے، اس لیے عملاً ماخذ صرف تین رہ جاتے ہیں۔ یعنی ابن ہشام۔ ابن سعد اور طبری۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر سیرت کی حقیقی بنیاد انہیں تین کتابوں پر ہے۔

### واقفی کے متعلق ایک مختصر نوٹ

واقفی کے متعلق ہمیں کچھ علیحدہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن بد قسمتی سے یورپین مصنفین نے اسے اتنا نوازا ہے کہ اس کی حقیقت کے اظہار کے لیے ایک علیحدہ نوٹ ضروری ہو گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، واقفی کا زمانہ ۱۲۰ھ سے یکو ۱۵۰ھ تک تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ کے لحاظ سے وہ کسی دوسرے مؤرخ سے کم محفوظ پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر یہ بات کسی شخص کے ذاتی صفات و عادات کا رخ بدل نہیں سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ واقفی اپنی وسعت علم کے باوجود ایک بالکل ناقابل اعتبار اور غیر ثقہ شخص تھا اور محققین نے اسے بالاتفاق جھوٹا اور دروغ گو قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی ساری روایتیں فلفل اور جھوٹی ہوتی تھیں۔ دُنیا میں جھوٹے سے جھوٹا انسان بھی ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ حق یہ ہے کہ ایک جھوٹے آدمی کی بھی اکثر باتیں سچی اور واقعہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس بات میں بھی ہرگز کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص جھوٹ بولنے کا عادی ہو اس کی کوئی بات بھی قابلِ حجت نہیں رہتی۔ واقفی کے متعلق یہ مسلم ہے کہ وہ ایک بہت عالم انسان تھا اور اس کے تاریخی معلومات اتنے وسیع تھے کہ اس زمانہ میں کسی اور مؤرخ کے کم ہوں گے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وسعت معلومات نے ہی اس کے سر کو پھرا دیا تھا کہ وہ کسی بات کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرنے کی بجائے خود اپنی طرف سے بات بنا کر بیان کر دیا کرتا تھا، چنانچہ اس کے متعلق ایک محقق کا یہ بہت اچھا مقلوہ ہے کہ ”اگر واقفی سچا ہے تو بے نظیر ہے۔ اور اگر جھوٹا ہے تو تب بھی عظیم المثال ہے“ مگر بد قسمتی سے واقفی کی یہی طلاقت لسان اور یہی وسعت علم ہمارے یورپین مصنفین کو اس کا دلدادہ بنا رہی ہے۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں کہ واقفی سچا تھا یا جھوٹا۔ اس کی عادت ایک متنازعہ حدیث کی طرح تحقیق کر کے بات کرنے کی تھی یا کہ فوہی واہی تباہی کہتے جانے کی۔ ان کو صرف اس بات سے غرض ہے کہ واقفی

ہر کچھ کتاب ہے تفصیل سے کتاب ہے اور یوں کتاب ہے جیسے کوئی شخص پاس بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ اگر اس کا کوئی قول کسی صحیح اور مضبوط روایت کے خلاف ہے تو ہوا کرے اُن کے لیے سب روایتیں برابر ہیں اور سوائے اپنے دماغ کی شہادت کے اور کوئی شہادت قابل قبول نہیں مسلمان محققین نے جو اپنی عمر میں کچھ کچھ کر ہر روایت سے بال کی کھال نکالی ہے اور ہر رادی کے صحیح صحیح حالات معلوم کر کے علم روایت کے لیے ایک بچہ ترازو متیا کر دیا ہے اہل مغرب کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ بہر حال ہم کسی کے قلم اور زبان کو تو روک نہیں سکتے مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ واقعی کے متعلق ان مسلمان محققین نے جن کی دیانت و امانت اور اصابت رائے کو سب نے تسلیم کیا ہے کیا راستے دی ہے :

نام رائے دہندہ	الفاظ جن میں رائے کا اظہار کیا گیا ہے	ترجمہ اُردو
امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ ۱۹۱ھ تا ۲۴۱ھ	هُوَ كَذَّابٌ يُقَلِّبُ الْحَدِيثَ	واقعی ایک پرے درجہ کا جھوٹ بولنے والا شخص ہے جو روایتوں کو بگاڑ بگاڑ کر بیان کرتا ہے
ابو احمد عبد اللہ بن محمد المعروف بابن عدی ۲۴۶ھ تا ۳۶۵ھ	أَخَاوِثُهُ غَيْرُ مَحْفُوظَةٍ وَالْبَلَاءُ مِنْهُ	واقعی کی روایتیں قابل اعتبار نہیں ہیں اور یہ خرابی خود اس کے نفس کی طرف سے ہے۔
ابو حاتم محمد بن ادريس ۱۹۵ھ تا ۲۴۷ھ	يُضَعِّمُ الْحَدِيثَ	واقعی اپنے پاس سے جھوٹی حدیثیں بنا کر بیان کیا کرتا تھا۔
علی بن عبد اللہ بن جعفر المعروف بابن المدینی ۱۹۱ھ تا ۲۲۳ھ	يُضَعِّمُ الْحَدِيثَ لَا أَزْهَاهُ فِي شَيْءٍ	واقعی جھوٹی روایتیں بناتا تھا میرے نزدیک وہ کسی جھٹ سے بھی قابل قبول نہیں۔
امام علی بن محمد دارقطنی ۳۰۶ھ تا ۳۸۵ھ	فِيهِ ضَعْفٌ	واقعی کی روایتیں ضعیف ہوتی ہیں۔
اسحاق بن ابراہیم المعروف بابن راہزبہ ۱۹۱ھ تا ۲۳۸ھ	هُوَ عَدُوٌّ مِمَّنْ يُضَعِّمُ الْحَدِيثَ	میرے نزدیک واقعی جھوٹی روایتیں گھڑنے والوں میں سے ایک ہے۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ ۱۹۲ھ تا ۲۵۶ھ	مَشْرُوكُ الْحَدِيثِ	واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کوئی روایت لی جائے۔
امام یحییٰ بن معین ۱۸۵ھ تا ۲۳۳ھ	لَيْسَ بِشَيْءٍ كَانَ يَقْلِبُ	واقعی اہل علم کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ حدیثوں کو بگاڑ بگاڑ کر بیان کیا کرتا تھا۔
امام شافعی علیہ الرحمۃ ۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ	كُتِبَ الْوَأَقْدَى كُلُّهَا كَذِبٌ كَانَ يَنْصَحُ الْأَسَانِيدَ	واقعی کی سب کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ وہ اپنے پاس سے جھوٹی سندیں گھڑ لیا کرتا تھا۔
امام ابو داؤد سجستانی ۲۰۲ھ تا ۲۴۵ھ	لَا أَكْتُبُ حَدِيثَهُ - إِنَّهُ كَانَ يَفْتَعِلُ الْحَدِيثَ	میرے نزدیک واقعی کی روایات مقبول نہیں، وہ اپنے پاس سے حدیثیں گھڑ لیا کرتا تھا۔
امام نسائی علیہ الرحمۃ ۲۱۵ھ تا ۳۰۳ھ	الْوَأَقْدَى مِنَ الْكُذَّابِينَ الْمَعْرُوفِينَ بِالْكَذِبِ	واقعی ایسے جھوٹے لوگوں میں سے تھا، جن کا جھوٹ ظاہر اور عیاں ہے اور اُسے سب جانتے ہیں۔
محمد بن بشار بن دار ۱۹۶ھ تا ۲۵۲ھ	مَا نَأْيْتُكَ الْكَذِبَ مِنْهُ	میں نے واقعی سے بڑھ کر کوئی جھوٹا نہیں دیکھا۔
امام نووی المتوفی ۶۹۲ھ	مُتَعَفِّكٌ بِإِتِّفَاقِهِمْ	واقعی سب محققین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف روایت ہے۔

علامہ ذہبی - المتوفی ۷۴۸ھ	اِسْتَقْرَأَ اِلْجَمَاعُ عَلٰی ذٰلِكَ اَلْوَقْدِي	سب محققین نے واقدی کے کمزور ہونے کے متعلق اجماع کیا ہے۔
قاضی احمد بن محمد بن ابراہیم المعروف بابن خلکان - المتوفی ۶۸۱ھ	مَنْعُوهُ فِي الْبَحْثِ يَثْبُتُ تَكَلُّمُؤَافِقَتِهِ	محققین نے واقدی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اس پر بہت اعتراض کئے ہیں۔
علامہ زرقانی المتوفی ۱۱۲۲ھ	اَلْوَقْدِي لَا يُعْتَبَرُ بِهِ اِذَا اِنْفَرَدَ فَكَيْفَ اِذَا خَالَعَ	واقدی اگر کسی بات کے بیان کرنے میں اکیلا ہو تو محققین کے نزدیک اس کی روایت قابل حجت نہیں ہے۔ پھر اس پر خود قیاس کر لو کہ ایسی بات میں اس کی روایت کا کیا وزن ہو سکتا ہے جو وہ دوسروں کے خلاف کتا ہوئے۔

یہ وہ شہادت ہے جو مسلمان محققین نے جن میں بہت سے خود واقدی کے ہمصر تھے۔ پوری پوری تحقیق کے بعد دی ہے۔ اب ہمارے یورپین مصنفین خود سوچ لیں کہ ان کا دل پسند مؤرخ کس شان کا انسان ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ واقدی کی ہر روایت غلط ہے۔ یقیناً اس کی روایتوں کا بیشتر حصہ صحیح ہو گا۔ مگر جس شخص کی صداقت و عدالت کا یہ حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے وہ اپنی کسی روایت میں بھی جس میں وہ اکیلا راوی ہے یا جس میں وہ دوسرے راویوں کے خلاف بات کتا ہے کسی عقلمند کے نزدیک قابل حجت نہیں سمجھا جاسکتا۔ واللہ اعلم۔

بہر حال ہماری تحقیق میں محمد بن عمر واقدی باوجود ابتدائی مؤرخوں میں ہونے کے ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور جہاں تک خالص سیرۃ کی کتب کا تعلق ہے صرف ابن ہشام اور ابن سعد اور ابن جریر طبری ہی وہ تین ابتدائی مؤرخ ہیں جن کی کتب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح کی بنیاد رکھی جانی چاہیے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ان مؤرخین کی ہر روایت درست اور صحیح ہے ایسا دعویٰ مؤرخین تو درکنار محدثین کے متعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہ تین مؤرخ ٹوٹا اپنی ذات میں قابل اعتماد ہیں اور



خواہ بے اعتیاطی یا متد کی کمزوری کی وجہ سے ان کی بعض روایتیں بھی غلط اور نا درست ہوں مگر بہر حال وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اصل حال سمجھے جاسکتے ہیں؛ البتہ ان کی تائید میں یا بعض ضمنی مسائل کے حل کے لیے مذکورہ بالا فہرست کی دوسری تاریخی مکتب بھی کام دے سکتی ہیں۔

### متاخرین کی کتب

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ باقی جتنی بھی کتابیں سیرۃ و تاریخ اسلام کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ خواہ کسی ہی مفید اور جامع ہوں وہ سیرت میں اصل ماخذ نہیں سمجھی جاسکتیں، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لیا ہے مندرجہ بالا کتب کے لیے ہے پس انہیں کسی تشریح کی تائید میں یا سہولت کی غرض سے تو پیش کیا جاسکتا ہے، مگر سند کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ مصنف کتاب ہذا نے بھی اپنی اس تصنیف میں جہاں کہیں کسی بعد کی کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ صرف سہولت کے خیال سے دیا ہے تاکہ متفرق حوالہ جات کی بجائے ایک حوالہ پر ہی اکتفا ہو سکے، لیکن ایسا حوالہ ہمیشہ اس تسلی کے بعد دیا گیا ہے کہ اس کا اصل ابتدائی کتب میں موجود ہے یا اس ہمہ متاخرین کی کتب بھی بڑی قدر قیمت کی چیز ہیں، کیونکہ ان میں نہایت محنت و جانفانی سے اصل کتب تاریخ و حدیث کی انتہائی ذرق گردانی کے بعد ایک قیمتی ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور بعض صورتوں میں ایسا بھی ہے کہ ایک اصل کتاب تو اب ناپید ہے، لیکن کسی بعد کے مؤرخ کی کتاب میں اس کی کسی روایت کے آجانے سے اس کا یہ حصہ محفوظ رہ گیا ہے اسی طرح ایک محدود دائرہ کے اندر بعض متاخرین کی کتب بھی اصل ماخذ کا کام دے جاتی ہیں بشرطیکہ وہ خود معتبر اور مستند ہوں۔ بہر حال متاخرین کی کتب سیرۃ و تاریخ میں سے مندرجہ ذیل مکتب قابل ذکر ہیں:

<p>(۱) الروض الالاف</p> <p>یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور سیرۃ ابن ہشام کی شرح کے طور پر لکھی گئی ہے نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے۔</p>	<p>مصنف عبد الرحمن بن عبد اللہ بن ابی</p> <p>۵۰۸ تا ۵۸۱ھ</p>	
<p>(۲) تاریخ الکامل</p> <p>یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں میں ہے اور زیادہ تر طبری سے ماخوذ ہے اور عمدہ صورت میں مرتب شدہ ہے۔ اصل سیرۃ کا حصہ صرف دو جلد میں آ جاتا ہے۔</p>	<p>مصنف حافظ ابن اثیر الجزری</p> <p>۵۵۵ تا ۶۳۰ھ</p>	



(۳) تاریخ انفیس فی احوال انفس انفیس	مصنفہ حسین بن محمد بن حسن دیار بحری۔ المتوفی ۹۶۶ھ	یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور بہت سی کتب کے معلومات کا مجموعہ ہے جو دیکش صورت میں مرتب کیا گیا ہے۔
(۴) شرح مواہب اللدنیہ	مصنفہ ملا محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المتوفی ۱۲۲۲ھ	یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے جو سب کی سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ سے متعلق ہیں۔ نہایت جامع اور مستند کتاب ہے اور انتہائی تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں سیرۃ کی روایتوں کے علاوہ احادیث کے حوالے بھی کثرت کے ساتھ درج ہیں۔ خاکسار کی رائے میں اس کتاب سے بڑھ کر کوئی جامع اور معتقانہ مجموعہ سیرۃ میں نہیں پایا جاتا۔
(۵) انسان ایمن فی سیرۃ الایمن المامون	مصنفہ علی بن برہان الدین النجفی ۹۷۵ھ تا ۱۰۴۳ھ	یہ کتاب جو تین جلدوں میں ہے اور عرف عام میں سیرۃ خلیفہ کے نام سے مشہور ہے نہایت جامع کتاب ہے مگر افسوس کہ قریب چن داں دیکش نہیں ہے۔
(۶) مجمع البلدان	مصنفہ ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ الحموی المتوفی ۶۲۳ھ	یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور جغرافیہ کے نہایت مفصل معلومات پر مشتمل ہے۔

ان کے علاوہ سیرۃ کا زرونی ۶۹۳ھ، سیرۃ مغلطی ۶۶۲ھ، سیرۃ دیلمی ۵۰۵ھ، سیرۃ غلطی ۵۰۸ھ،  
سیرۃ ابن ابی طی ۶۳۳ھ، شرف المصطفیٰ نیشاپوری ۶۰۶ھ، اکتاف ۶۳۳ھ، عیون الاثر لابن میداناس  
۶۳۳ھ، نور النبراس شرح عیون الاثر ۸۳۱ھ، کشف اللثام ۵۵۵ھ، مواہب اللدنیہ ۹۲۳ھ، سیرۃ ابن  
عبد البر ۴۶۳ھ، شرف المصطفیٰ ابن جوزی ۵۹۶ھ، تاریخ ابوالفداء ۶۳۲ھ وغیرہ بہت سی اور کتابیں ہیں مگر

ان میں سے کئی ناپید ہیں اور جو موجود ہیں وہ ٹھونسا اس حیثیت کی نہیں ہیں کہ مندرجہ بالا کتب کے ہوتے ہوئے کسی سند یا تشریح میں پیش کی جاسکیں۔

**خلاصہ بحث** خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ابتدائی تاریخ اسلام کے لیے مندرجہ ذیل اصول مآخذ بکھے جاتے ہیں :

(۱) قرآن شریف (۲) کتب تفسیر منقولہ (۳) کتب حدیث (۴) کتب سیرۃ و تاریخ و مغازی۔  
ان کے باہمی مدارج اسی ترتیب سے واقع ہیں جس میں کہ انہیں اوپر درج کیا گیا ہے یعنی سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ یقینی مآخذ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن شریف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سالہ نبوت کی زندگی میں آہستہ آہستہ کر کے نازل ہوا اور ساتھ ساتھ ضبط تحریر میں آ گیا۔ یہ وہ کلید عمومی دماسٹر کی آہ ہے جس سے سیرۃ رسولؐ اور تاریخ اسلام کی ہر الجھن یقینی صحت کے ساتھ کھولی جاسکتی ہے۔ دوسرے درجہ پر حدیث ہے جس کے سلسلہ روایت میں محدثین نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط کے ساتھ کام لیا ہے مگر پھر بھی ہر حال وہ قرآن شریف کی قطعیت کو نہیں پہنچتی اور بعض کمزور روایتیں اس مجموعہ میں راہ پا گئی ہیں۔ تیسرے درجہ پر وہ تفسیری روایات ہیں جو قرآن شریف کی تشریح و توضیح میں وارد ہوئی ہیں، مگر ان میں کمزور روایتوں کا حصہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ چوتھے درجہ پر سیرۃ و تاریخ کی ابتدائی کتابیں ہیں جو تاریخ کی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی اصل بنیاد ہیں مگر بد قسمتی سے یہی وہ ذخیرہ ہے جس میں کمزور اور ضعیف روایتوں نے زیادہ دخل پایا ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کا یہ پہلا فرض ہے کہ سیرۃ و تاریخ کی روایتوں کی جرح و تعدیل کے لیے قرآن شریف و حدیث کی شمع کو ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کا صحیح مرقع کبھی بھی تیار نہیں ہو سکے گا۔ اس اصول بنیاد کے قائم کرنے کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

وما توفیقنا الا باللہ ونرجو منه خیرا

۱۔ مختلف علوم و فنون میں اسلامی تصنیفات اور ان کے مصنفین کے حالات معلوم کرنے کے لیے دو کتابیں بہت مفید اور قابل قدر ہیں۔  
۱۔ کتاب الفہرست مصنفہ ابن ندیم اور کتاب کشف الخون عن اسمی الکتاب و الفنون مصنفہ علامہ ملا کاظم چلبی۔ ان کتب سے اکثر اسلامی تصنیفات کا خواہ وہ کسی فن میں ہوں اور خواہ وہ اب تک محفوظ ہوں یا ناپید ہو چکی ہوں اور ان کے مصنفین کے حالات کا پتہ چل سکتا ہے۔ اسی قسم کی ایک مستند کتاب رذیات الایمان مصنفہ قاضی احمد بن محمد بن ابراہیم ابن خلکان ہے جس میں جملہ مشاہیر اسلام کے مختصر حالات ترتیب وار درج کئے گئے ہیں ۲۔

## عرب کا ملک اور اس کے باشندے

**محل وقوع اور حدودِ اربعہ** برِ اعظم ایشیا کے نقشہ پر اگر آپ نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جنوب مغرب میں ایک جزیرہ نماداً واقع ہے جو وسعت

رقبہ کے لحاظ سے دُنیا کے تمام جزیرہ نماؤں میں سب سے بڑا ہے۔ یہ عرب کا ملک ہے، جہاں اسلام پیدا ہوا اور جہاں اس نے اپنی طفولیت کے ایام گزارے۔ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا نام عرب اس لیے پڑا ہے کہ عربی زبان اصول فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض محققین عربی کو اتم الاسنہ یعنی تمام زبانوں کی ماں قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ لفظ عرب کے روٹ میں فصاحت و بلاغت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس زبان کے بولنے والی قوم اور ملک کا نام عرب مشہور ہو گیا ہے۔ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ غیر آباد اور جنگلی حصہ کی زیادتی کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا ہے۔ کیونکہ عرب کے معنی ایک غیر ذی زرع علاقہ کے بھی ہیں۔

جائے وقوع کے لحاظ سے عرب کا ملک تقریباً نصف منطقہ حارہ میں واقع ہے اور نصف منطقہ معتدلہ میں۔ گویا خطِ سرطان اس کے وسط سے گزرتا ہے۔ عرب کی جنوبی اور شمالی حدود علی الترتیب ۱۳ عرض بلد شمالی اور ۲۲ عرض بلد شمالی ہیں اور مغربی اور مشرقی حدود علی الترتیب ۲۳ اور ۶۰ طول بلد مشرقی ہیں۔

حدودِ اربعہ عرب کی یہ ہیں۔ مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمان۔ مغرب میں بحر احمر ہے۔ جنوب میں بحر ہند ہے اور شمال میں شام اور عراق ہیں۔

**شکل اور رقبہ** عرب کی شکل ایک بے قاعدہ سے مستطیل کی ہے جس کے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی۔ ساحل کی لمبائی، ملک کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم ہے جس کا لازمی نتیجہ عمدہ بندرگاہوں کی کمی ہے۔

عرب کا رقبہ تقریباً بارہ لاکھ مربع میل ہے اور طول اوسطاً سولہ سو میل ہے اور عرض اوسطاً سات سو میل ہے۔ گویا وسعت کے لحاظ سے عرب دُنیا کے بڑے ملکوں میں سے ہے، لیکن آبادی پر نظر ڈالیں تو بعض پھوٹے سے

پھوٹے ملک بھی اس سے بڑے ہوتے نظر آتے ہیں؛ چنانچہ موجودہ زمانہ میں بھی عرب کی مجموعی آبادی اسی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ آگے ظاہر ہو جائے گی۔

**سطح زمین** سطح زمین اور نوعیت اراضی کے لحاظ سے ماہران جغرافیہ عرب کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول۔ ساحلی علاقہ جو ہموار زمین پر مشتمل ہے اور باقی علاقوں کی نسبت معتدل ہے۔

دوسرے پہاڑی علاقہ جس کے درمیان کی وادیاں گویا ملک کی جان ہیں۔ اور تیسرے صحرائی علاقہ جو بحر ریگستان ہونے کے عموماً بنجر اور غیر آباد ہے۔

عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ شمالاً جنوباً پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ چلا گیا ہے جسے جبل السراہ کہتے ہیں۔ اس پہاڑی سلسلہ کی بعض چوٹیاں آٹھ ہزار بلکہ دس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہے مگر اوسطاً بلندی بہت کم ہے۔ اس سلسلہ کے قریباً وسط سے ایک اور پہاڑی سلسلہ جو دراصل کئی پہاڑی سلسلوں سے مرکب ہے اور شمالاً جنوباً بھی دور تک پھیلا ہوا ہے، عرب کو دو سگڑوں میں کاٹتا ہوا ملک کے مشرقی ساحل کی طرف منکسل گیا ہے۔ اس وسیع علاقہ کو جو عرب کے وسط میں واقع ہے اور سطح سمندر سے خاصہ اونچا ہے۔ سطح مرتفع نجد کہتے ہیں اس کی اوسط بلندی چار ہزار فٹ سمجھی جاسکتی ہے۔ سطح مرتفع نجد کے شمال اور جنوب اور کچھ مشرق میں نہایت وسیع صحرا واقع ہیں۔ عرب کا شمالی صحرا بالآخر شمال میں صحرائے شام سے جاملتا ہے اور جنوبی صحرا جو وسعت میں بہت بڑا ہے اور خالص ریگستان ہے اربع النہالی کے نام سے مشہور ہے۔ عرب کے جنوب اور جنوب مشرق میں بھی خاصے اونچے پہاڑی سلسلے ہیں چنانچہ عمان کی بعض چوٹیاں دس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتی ہیں۔

عرب میں قابل ذکر دریا کوئی بھی نہیں ہاں وادیاں اور برساتی نالے ہیں جو بارش کے وقت بہہ نکلتے ہیں اور بعض اوقات سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، مگر عام طور پر پانی کی اس قدر قلت ہے کہ بعض جگہ سینکڑوں میل تک پانی نہیں ملتا۔ کہیں کہیں چشمے ہیں اور انہی پر تمام آبادی کی سیرابی کا دار و مدار ہے۔ ایسے چشمے جن کے ارد گرد درخت اور باغات لگائے جاتے ہیں اور ان کے چاروں طرف میل ہاتے میل تک بنجر صحرا ہوتا ہے نخلستان کہلاتے ہیں جو عرب میں ایک خاص نعمت سمجھے جاتے ہیں۔ عرب میں بین کا علاقہ سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب ہے اور دوسرے علاقہ جات کی نسبت اس میں نالوں اور چشموں کی بھی کثرت ہے۔ اسی طرح مکہ سے جنوب مشرق کی طرف بیس میل کے فاصلہ پر طائف کا علاقہ بھی ایک زرخیز اور خوشگوار علاقہ ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

**آب و ہوا** ماہران جغرافیہ جانتے ہیں کہ عرب کو بیرونی ہوائیں دو ہی طرف سے پہنچ سکتی ہیں۔ یعنی شمال مشرق اور جنوب مغرب سے۔ مگر عرب کی ان دونوں طرفوں میں گریبا خشکی ہی خشکی ہے، اس لیے یہ ہوائیں بھی لازماً خشک ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں عموماً بارش کی بہت قلت ہے۔

ہاں پہاڑی علاقے کچھ نہ کچھ پانی ان ہواؤں سے بھی پھوٹتے ہیں۔ اور اس طرح ان علاقوں میں کچھ بارش ہو جاتی ہے۔

خطِ سرطان کا ملک کے وسط سے گزرنا بھی اس کی صحرائی حالت اور کئی بارش کی وجہ بتلا رہا ہے کیونکہ جیسا کہ جغرافیہ دانوں سے صحتی نہیں ایسا علاقہ دائمی ہواؤں کے لحاظ سے سکون کا منطقہ ہوتا ہے پس عام طور پر یہی کہا جائے گا کہ عرب ایک بہت خشک ملک ہے اور چونکہ کیا بوجہ اپنے محل وقوع کے اور کیا بلحاظ نوعیت اراضی کے عرب عموماً ایک بہت گرم ملک ہے، اس لیے اس کی آب و ہوا بحیثیت مجموعی گرم اور خشک کہلائے گی۔

عرب میں رات اور دن کے درجہ حرارت میں بہت فرق ہوتا ہے جس کا باعث ریت کی کثرت ہے جو دن کے وقت خوب چمکتی ہے اور رات کو بہت جلد اپنی گرمی چھوڑ کر خوب ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ تبہم کی کثرت بھی اسی وجہ سے ہے۔ عرب میں بعض اوقات ایک قسم کی گرم ہوا چلتی ہے جسے سموم کہتے ہیں۔ جب یہ ہوا چلتی ہے تو بالکل اندھیل کر دیتی ہے اور اس میں اس قدر ریت اڑتی ہے کہ بعض اوقات اس کی وجہ سے جان اور مال کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ موسم سرما میں ملک کے بعض حصوں میں کافی سردی پڑتی ہے، چنانچہ ہم آگے چل کر پڑھیں گے کہ جس موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ خندق پیش آیا اس میں مدینہ میں سردی کی اس قدر شدت تھی کہ لوگ سردی سے ٹھہرے جاتے تھے اور رات کو بستر سے اٹھنا غیر معمولی ہمت چاہتا تھا۔ مگر یہی علاقہ گرمیوں میں بھی کی طرح پگھلتا تھا۔

**پیداوار** نہایتی پیداوار کے لحاظ سے عرب کا ملک ایک نہایت ہی غریب ملک ہے بعض جگہ سینکڑوں میل تک بستی کا نشان تک نہیں ملتا اور ملک کا بیشتر حصہ خشک پہاڑیوں اور بخر صحراؤں سے بھرا ہوا ہے۔ سب سے بڑی پیداوار کھجور ہے جو قریباً سارے آباد ملک میں ہوتی ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ عربوں کی اصل اور بڑی خوراک جس پر ان کا گذارہ ہے یہی ہے اور اس سے وہ کئی قسم کی اشیاء تیار کرتے ہیں۔ عرب کے بعض حصوں میں دوسرے پھل بھی ہوتے ہیں اور جہاں پانی میسر ہے لوگوں نے اپنے باغ لگا رکھے ہیں۔ حجاز میں طائف اپنے باغات کے لیے خاص شہرت رکھتا تھا اور اب بھی رکھتا ہے۔

وہ علاقے جہاں کھیتی باڑی ہو سکتی ہے مثلاً بعض ساحلی علاقے اور پہاڑوں کی وادیاں وغیرہ۔ وہاں بعض قبائل کھیتی باڑی کر کے اپنے لیے کچھ غلہ پیدا کر لیتے ہیں، چنانچہ جو اور جو ارضیں کہیں بونے جاتے ہیں۔ کچھ گندم بھی ہو جاتی ہے۔ لوبیا اور دالیں اکثر جگہ ہوتی ہیں۔ بعض ترکاریاں بھی پیدا کی جاتی ہیں اور قہوہ اور گرم مصالحہ جات بھی ہوتے ہیں۔ بارانی علاقوں میں گھاس وغیرہ اچھا آگ آتا ہے۔ یہ علاقے جانوروں کے واسطے چراگاہ کا کام دیتے ہیں۔ تمام قبائل کی اپنی اپنی چراگاہیں الگ الگ مقرر ہیں۔ سطح مرتفع نجد خصوصاً چراگاہوں کا مرکز ہے۔ حیوانی پیداوار کے ضمن میں تین جانور خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ یعنی اُونٹ، گھوڑا، اور گدھا۔ اُونٹ تو گویا عرب کی ضروریات زندگی کا حصہ ہے۔ اس کے بغیر عرب جیسے ملک میں سفر کرنا قریباً محال ہے۔ ضرورت کے وقت اس کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ عرب کا گھوڑا بعض خوبیوں کی وجہ سے دنیا کے گھوڑوں میں بہت اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ عرب لوگ اسے بہت عزیز رکھتے ہیں اور عام طور پر اس کی نسل باہر جانے نہیں دیتے۔



نجدی گھوڑا عرب میں خاص قدر و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گدھا بھی عام ہے اور سواری کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب اس کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ عرب میں بھیڑ بکریاں بھی بہت ہوتی ہیں اور امرار ان کے گلے کے گلے رکھتے ہیں۔ گائے بیل بھی ہوتے ہیں، مگر کم۔ بھینس عرب میں نہیں ہوتی۔

جنگلی جانوروں میں شیر، چیتا، بعض علاقوں میں لٹا ہے۔ بھڑیئے، لکڑ بگڑ، بندر اور گیدڑ وغیرہ کافی ہوتے ہیں۔ ہرن بھی لٹا ہے اور جنگلی بکری بھی پہاڑوں میں پائی جاتی ہے۔ گورخر (جنگلی گدھا) بھی ہوتا ہے جس کا عرب لوگ شوق سے شکار کھیتے ہیں۔

پرندوں میں عام پرندوں کے ذکر کو ترک کرتے ہوئے صرف شتر مرغ قابل ذکر ہے۔ یہ ایک بہت بڑا جانور ہوتا ہے جس کی لمبی لمبی ٹانگیں ہوتی ہیں اور ایسا تیزی سے بھاگتا ہے کہ گھوڑے کو بھی پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ ریٹگنے واسے جانوروں میں سے صرف گرگٹ کی قسم کے جانوروں کی کثرت ہے باقی کم ہیں۔ گوساںپ وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

مڈی جس کا گوشت کھایا جاتا ہے کثرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور باغی اور فصلوں وغیرہ کا بڑا نقصان کرتی ہے۔ ساحل کے قریب پھسل بھی ملتی ہے اور لوگ اسے پکڑتے ہیں۔

معدنی پیداوار عرب کی بہت کم ہے۔ قیمتی اور کار آمد دھاتیں تو گویا بالکل ہی نہیں ہیں کچھ سیسہ اور تانبا لٹتا ہے اور کچھ چاندی اور لوہا۔ کوندہ گندھک اور نمک بھی پائے جاتے ہیں۔ سونا بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ اور ایک انگریز مسٹر برٹن نے مدین میں اسل کی تلاش بھی کی تھی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بحرین میں سمندر کے کناروں سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں اور ان کی خاصی تجارت ہے۔ اب تو پٹرول کے بڑے بڑے ذخائر عرب میں دریافت ہو چکے ہیں۔

ملکی تقسیم کے لحاظ سے عرب کئی حصوں میں منقسم ہے جن میں بڑے بڑے حصے یہ ہیں:

ملکی تقسیم

۱۔ مغرب میں حجاز ہے جو بحر احمر کے ساتھ ساتھ یمن سے لے کر شام تک پھیلے ہوئے ساحلی علاقے کا نام ہے۔ اس میں مکہ اور طائف اور مدینہ اور جدہ وغیرہ بڑے بڑے شہر آباد ہیں۔ ظہور اسلام کے وقت عرب مستعربین سے قبائل بنو کنانہ قبائل حذیل اور قبائل ہوازن اور بنو قحطان میں سے بعض قبائل آزد وغیرہ اس علاقہ میں آباد تھے۔

حجاز کے جنوب میں اور بعض کے نزدیک اُس کے اندر شامل تھاہم بھی ایک مشہور علاقہ ہے جو بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔

۲۔ عرب کے جنوب مغرب میں یمن ہے جو ایک بہت مشہور اور نہایت شاداب علاقہ ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ ایک اچھی طاقتور اور متحد سلطنت کا مرکز تھا اور ظہور اسلام سے قبل حبشہ کے اور ظہور اسلام کے وقت

فارس کے ماتحت تھا۔ اس کا بڑا شہر منہار کسی زمانے میں بہت مشہور اور سلطنت یمن کا پایہ تخت تھا۔ سبکی قوم جس کا قرآن شریف میں ذکر آتا ہے۔ ایک زمانہ میں اسی جگہ آباد تھی۔ بنو قحطان کا مولد و مکن بھی یمن تھا۔ اور یہیں سے اکثر قبائل بنو قحطان نے عرب کے شمال کی طرف رحلت کی تھی، چنانچہ مدینہ کے آدس اور خزدرج بھی جنہوں نے اسلام میں انصار کا لقب پایا، یہیں سے گئے تھے۔

یمن کے ساتھ ہی ملا ہوا ایک اور علاقہ بحرآن ہے جو یمن کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ ظہور اسلام کے وقت یہ علاقہ عرب کے عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مباہلہ کے لیے جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی آتا ہے انہی لوگوں کو بلایا تھا۔

۳۔ عرب کے جنوب میں یمن کے مشرق کی طرف حضرموت ہے اور حضرموت کے مشرق کی طرف ہمدون ہے۔ یہ ہمدون مشہور علاقے ہیں۔

۴۔ عرب کے جنوب مشرق میں عمان ہے جس کا دار الخلافہ مستط ایک مشہور شہر ہے۔

۵۔ مشرق میں خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ المنہار کا علاقہ ہے جس کے قرب میں بحرین کے جزائر ہیں اور اسی وجہ سے بعض اوقات المنہار کو بحرین بھی کہہ لیتے ہیں۔ بحرین کے ساحل سے موٹی نکالے جاتے ہیں۔

۶۔ وسط عرب میں نجد ہے جو ایک نہایت وسیع اور مشہور علاقہ ہے اور کئی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں جن میں سے بعض عرب کے شاداب حثوں میں شمار ہوتے ہیں منقسم ہے۔ قبائل غطفان اور سقیم وغیرہ اس جگہ آباد تھے۔ یہ نامہ جو نجد کے جنوب مشرق میں ہے بنو عصفہ یعنی سیلمہ کذاب کے قبیلے کا مکن تھا۔

۷۔ یہ نامہ اور حضرموت کے درمیان الاحقاف، ایک معروف علاقہ ہے۔ قوم عاد کا جن کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے، یہی مکن تھا۔ مگر آج کل یہ بالکل ویران وغیر آباد ہے۔

۸۔ نجد کے شمال مشرق میں حجاز کے ساتھ ملا ہوا خیبر بھی ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جو قدیم زمانہ میں یہود کا ایک بڑا مرکز تھا اور قلعوں کے ساتھ مستحکم کیا گیا تھا خیبر کے شمال مشرق میں نینما بھی یہود کا ایک مرکز تھا۔ تینا کے قریب ہی تھر کی بستی ہے جس میں ثمود کی قوم آباد تھی جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ تھر کے غربی جانب ساحل ہند کی طرف مدین کا علاقہ ہوتا تھا جہاں حضرت موسیٰؑ اپنی بعثت سے پہلے حضرت شعیبؑ کے پاس آکر ٹھہرے تھے۔

عرب ایک بہت کم آباد ملک ہے۔ بارش کی کمی، ریگستان کی زیادتی۔ نباتاتی اور معدنی پیدوار کی قلت وغیرہ کئی باتوں نے بل لا کر اس کی آبادی کو بڑھنے نہیں دیا۔ پھر بھی آج کل ستراسی لاکھ کے قریب اس کی آبادی بتائی جاتی ہے جو ملک کے حالات کے ماتحت کم نہیں ہے۔

تقسیم اقوام کے لحاظ سے مؤرخین نے قبائل عرب کو دو اور ایک لحاظ سے تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔



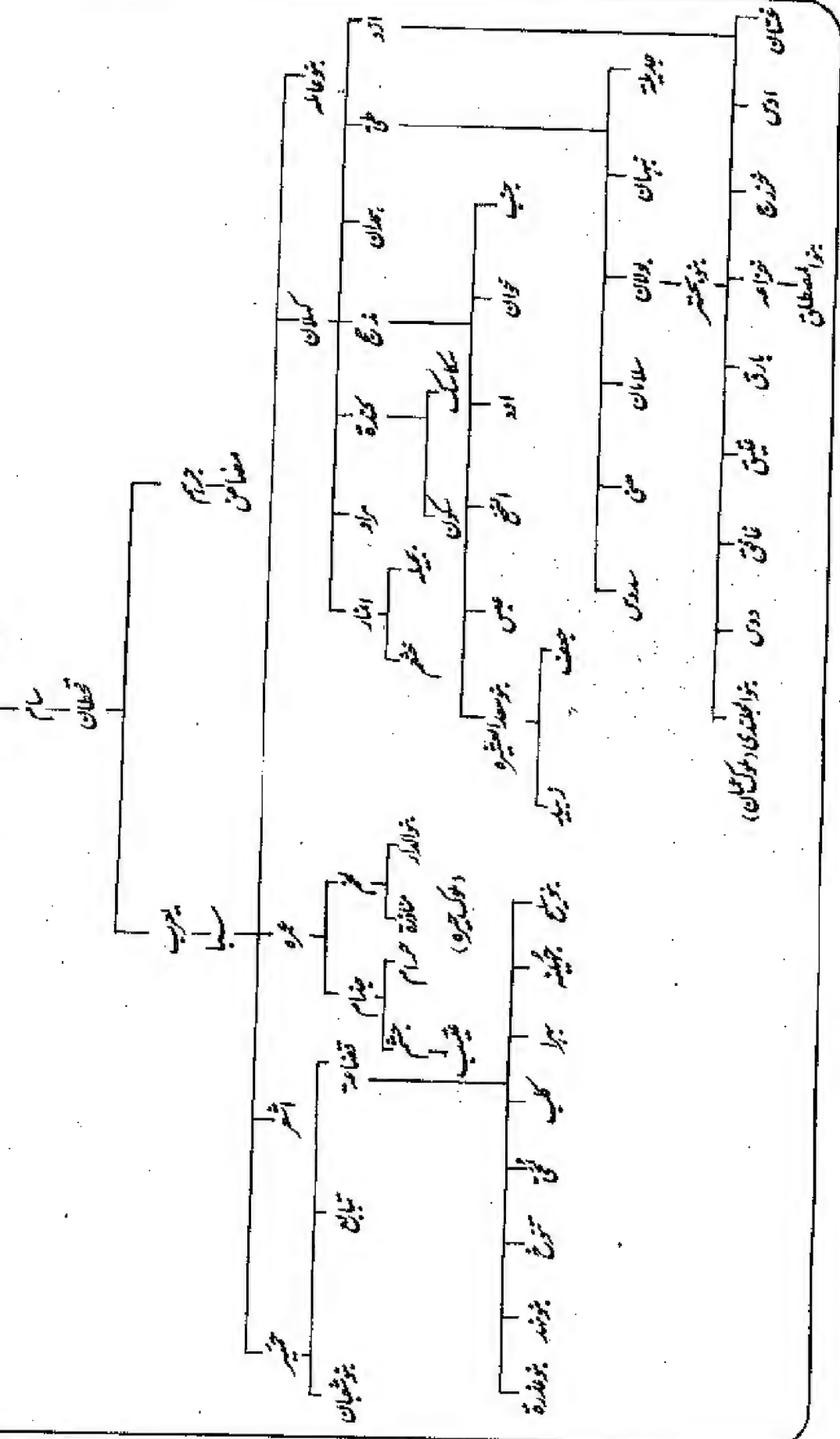
اول - عرب عاربہ - یعنی ملک کے قدیم اور اصلی باشندے جو آگے پھر دو جہتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں؛ (الف) عرب کے وہ قدیم ترین باشندے جو اسلام سے بہت عرصہ پہلے فنا ہو چکے تھے۔ بعد زمانہ کی وجہ سے ہمیں ان کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں؛ مگر اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی قبائل تھے اور ملک کے مختلف جہتوں میں آباد تھے اور ان میں سے بعض قبائل کی اچھی اچھی زبردست اور متحکم ریاستیں تھیں۔ عاد، ثمود، طسم، جدیس اور جرہم الاولیٰ وغیرہ انہی میں سے چند مشہور قبائل کے نام ہیں۔ عاد کا وطن احاف میں تھا اور ثمود حجاز کے شمال میں جوٹ میں آباد تھے۔ ان قدیم ترین قبائل کو ان کے فنا ہو جانے کی وجہ سے عرب باندہ بھی کہتے ہیں۔

(ب) وہ قبائل جو بنو قحطان کہلاتے ہیں اور بعض روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ حضرت صود کی اولاد سے تھے۔ بہر حال یہ عرب باندہ کے بعد ملک میں پھیلے۔ ان کا اصل وطن یمن تھا جہاں سے یہ سارے عرب میں پھیل گئے۔ اور ان کی کئی شاخیں ہو گئیں۔

عرب کے شمال میں سلطنت فارس و روم کے ساتھ علی الترتیب ملی ہوئی حیرہ اور غتان دو مشہور ریاستیں تھیں۔ ان کے لڑماں روا بھی بنو قحطان سے تھے۔ ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان بہت پھیل چکے تھے اور ملک میں ان کا کافی زور تھا۔ اور ملک کا ایک بڑا حصہ ان سے آباد تھا۔ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج بھی بنو قحطان میں سے تھے۔ بعض اوقات عرب عاربہ کی اصطلاح صرف بنو قحطان کے واسطے استعمال کی جاتی ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں میں سے ہی وہ قوم تھی جو مستقل طور پر ملک میں قائم رہی۔ بنو قحطان کے مشہور قبائل کا شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(دیکھئے اگلا صفحہ)

# حضرت نوح علیه السلام



دوم - عرب مستعربہ یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگ جو عرب میں آکر آباد ہوئے۔ اُن میں زیادہ تر حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد تھی جو حجاز میں آکر آباد ہوئی۔ ان کو عدنانی بھی کہتے ہیں، کیونکہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں بڑا شخص جس سے یہ لوگ پھیلے عدنان تھا۔ بنو عدنان بھی آہستہ آہستہ کئی شاخوں میں منقسم ہو گئے۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ قریش جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے بنو عدنان ہی کی ایک شاخ تھے۔ اور جیسا کہ آگے ظاہر ہو جائے گا ظہور اسلام کے وقت عرب مستعربہ میں سب سے زیادہ طاقتور اور صاحب اثر قریش ہی کا قبیلہ تھا۔

عرب مستعربہ کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عدنان حضرت اسماعیل سے کئی پشت بعد پیدا ہوئے تھے۔ مگر چونکہ عدنان اور حضرت اسماعیل کی درمیانی کڑیوں کے متعلق روایات میں کچھ اختلاف ہے اس وجہ سے بعض غیر مسلم مورخین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل اسماعیل میں ہونے کے متعلق اعتراض کا موقع مل گیا ہے حالانکہ جس صورت میں عرب کی متفقہ روایات کی رو سے حضرت اسماعیلؑ کا عرب میں آکر آباد ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف عدنان کے متعلق عرب کی تمام روایات متفق ہیں کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے تھا تو درمیانی کڑیوں کے متعلق اختلاف اصل مسئلے پر ہرگز کوئی اثر نہیں ڈال سکتا ہے۔

بہر حال مشہور عدنانی قبائل کا شجرہ درج ذیل ہے :-

(دیکھئے اگلا صفحہ)



ظہور اسلام سے پہلے عرب کا تہذیب و تمدن  
 ساحل علاقوں کے بیرونی دنیا سے ایک بالکل

منقطع حالت میں تھا۔ حتیٰ کہ نہ اُس پر کبھی کسی بیرونی قوم یا سلطنت کا اثر ہوا اور نہ عرب لوگ خود کبھی مستقل طور پر اپنے وطن سے باہر نکلے۔ خود ملک کے اندر بھی اسلام سے پہلے کبھی کوئی تمدن مرکزی سلطنت قائم نہیں ہوئی۔ بیشک بعض اوقات بعض علاقہ جات میں بعض ریاستیں قائم ہوئیں مگر اُن کا اثر صرف مقامی تھا اور تمام ملک کبھی بھی کسی ایک تاجدار کے سامنے نہیں جھکا، بلکہ عموماً ہر قبیلہ آزاد تھا اور اپنا الگ الگ سردار رکھتا تھا۔ مگر عرب میں سرداری کسی کو باقاعدہ درجہ میں نہ ملتی تھی اور نہ ہی سرداری کوئی باقاعدہ حکومت کے رنگ میں ہوتی تھی، بلکہ عموماً کسی قبیلہ میں جو شخص سب سے زیادہ قابل ہوتا تھا، اُس کی مرضی پر لوگ چلتے تھے اور وہ قوم کا سردار سمجھا جاتا تھا۔

طرز زندگی کے لحاظ سے عربوں کی خوراک و لباس اور عام بُود و باش نہایت سادہ اور ابتدائی تھی۔ عام خوراک عربوں کی اُونٹوں اور بکریوں کا دودھ اور کھجور تھی۔ جو کے ستو بھی عموماً استعمال ہوتے تھے۔ ذی ثروت لوگ گوشت بھی کھاتے تھے اور اُونٹ یا بکری کے بٹھنے ہوئے گوشت کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ شوربے میں روٹی کو بھگو کر کھانا ایک اعلیٰ قسم کی غذا بھی جاتی تھی جسے عرب لوگ خریدتے تھے۔ لباس میں بھی یہی سادگی اور غربت کا عالم تھا۔ عام لوگوں کے پاس ایک چادر سے زائد کپڑا نہ ہوتا تھا جو وہ تہہ بند کے طور پر باندھے پھرتے تھے۔ قیص صرف خاص خاص لوگ استعمال کرتے تھے اور رُجیہ تو گویا ایک بڑی نعمت تھی۔ گھروں میں عموماً فرش یا چارپائی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ عموماً کھجور کی چٹائیوں پر سوتے تھے، البتہ ذی ثروت لوگوں میں لکڑی کے تخت استعمال ہوتے تھے۔ اوڑھنے کو عموماً اُونٹ کی اُون کے بنے ہوئے بچدے سے کبل ہوتے تھے۔ باقاعدہ مکان کم تھے عموماً خیمے یا چھوس کے چھتر یا پکٹے مکان استعمال ہوتے تھے، البتہ بعض خاص خاص عمارتیں پتھروں کی بھی بنائی جاتی تھیں۔

قیمت آبادی کے لحاظ سے عرب دو حصوں میں منقسم تھے۔ الحضر اور البدو یعنی شہروں میں رہنے والے اور جنگل میں رہنے والے۔ شہروں میں رہنے والے چونکہ ایک جگہ جم کر سکونت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے اُن کا ایک خاص تمدن تھا اور اُن میں ایک مدنیّت کا رنگ تھا مگر بدوی لوگوں کی زندگی جنگلی اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی تھی۔ وہ خیموں اور عارضی گھروں میں رہتے تھے اور اپنے بال بچوں اور مویشیوں کو لے کر ایک وسیع علاقہ میں ادھر ادھر آزادانہ پھرتے رہتے تھے۔ جہاں پانی اور سبزی پلتے وہیں ڈیرہ لگا دیتے۔ پھر کبھی اور طرف نکل جاتے۔ اسی طرح اُن کی ساری عمر بسر ہو جاتی تھی۔ اس طرز زندگی کے نقشے قدیم شاعروں نے اپنے کلام میں نہایت خوبی کے ساتھ کھینچے ہیں۔ ان لوگوں کی زبان شہری لوگوں کی نسبت زیادہ صاف اور خالص تھی اور ان میں اصل عربی فطرت اور عربی ماد است کی تصویر زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کا پیشہ زیادہ تر ایک چرواہے کا سمجھنا چاہیے۔

عربوں میں لین دین عموماً جنس کا جنس سے ہوتا تھا، لیکن سونے اور چاندی کے بچدے سے بکے بھی چلتے تھے۔ چنانچہ چاندی کے دو سکے رائج تھے۔ درہم اور اوقیہ۔ ایک اوقیہ کی قیمت چالیس درہم کے برابر کبھی

جاتی تھی۔ سونے کا مروج سکہ دینار تھا۔ ترازو سے تولنے کا رواج کم تھا۔ عموماً پ کا دستور تھا، چنانچہ مہند اور صاع عرب کے دو مشہور پیمانے تھے۔ ناپنے کا آلہ صرف ذراع یعنی ہاتھ تھا جسے گویا ڈیڑھ فٹ کے برابر سمجھنا چاہیے۔  
ختنہ کی رسم عربوں میں عام تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات عورتیں بھی ختنہ کرواتی تھیں۔ مردوں کو غسل دینے اور کفن میں پیٹ کر دفن کرنے کا رواج تھا۔ عرب لوگ دائمی رکھتے اور عموماً مونچھیں کترواتے تھے۔ سود لینے دینے کا رواج بھی کم دبیش پایا جاتا تھا۔

### عربوں کی تجارت

عربوں کے قومی پیشے صرف تین تھے۔ اول زراعت جو ملک کے ایک نہایت قلیل حصہ تک محدود تھی۔ دوسرے مویشیوں کا پالنا جسے انگریزی میں پاسچرنگ کہتے ہیں۔ یہ بھی ملک کے صرف خاص خاص حصوں میں ہی ممکن تھا۔ تیسرے تجارت جسے گویا ملک کا سب سے بڑا پیشہ سمجھنا چاہیے۔ عرب کے لوگ ہمیشہ سے تجارت پر پیشہ رہے ہیں۔ خصوصاً وہ قبائل جو ساحل سمندر کے پاس یا مہمان ملکوں کے قرب میں آباد تھے قدیم سے تجارت میں مصروف چلے آئے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں تو مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی مال لانے اور لے جانے کا بڑا ذریعہ عرب لوگ ہی تھے، چنانچہ ایک طرف شام و مصر اور دوسری طرف مواصلہ بحر ہند کے درمیان ان کے تجارتی قافلے برابر آتے جاتے تھے جو گویا ہندوستان اور شام و مصر کے درمیان ایک تجارتی کڑی کا کام دیتے تھے۔ مگر سمندر کا راستہ کھل جانے سے عربوں کی اس تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور اس قدیم راستہ پر جو شام سے حجاز اور پھر یمن اور پھر حضرموت کے اندر سے ہوتا ہوا عرب کے مشرقی ساحل کی طرف جاتا تھا تجارتی قافلوں کی آمد و رفت عملاً بالکل رک گئی اور صرف ملک کے اندر کی معمولی تجارت باقی رہ گئی۔ یہ اندرونی تجارت حجاز، یمن، بحرین اور نجد وغیرہ کے اندر اندر محدود تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قریباً ایک سو سال پہلے شام کے ساتھ حجاز و یمن کی تجارت کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ گواسس پہلے پیمانہ پر تو نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن پھر بھی ملک میں اس سے کچھ جان آگئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش مکہ کے تجارتی قافلے باقاعدہ شام اور یمن کی طرف آتے جاتے تھے اور بعض اوقات عرب کے دوسرے حصوں کی طرف بھی جاتے تھے مگر اس زمانہ میں قریش مکہ کی بڑی تجارت شام سے تھی۔ مکہ سے شام کی طرف جانے کا زیادہ استعمال راستہ بحر احمر کے ساتھ ساتھ شمال کو جاتا تھا۔ یثرب کا شہر جس نے بعد میں مدینہ کا نام پایا اسی راستہ کے قرب میں واقع تھا۔ شامی راستہ پر وہ مقام جہاں سے مدینہ کا راستہ مشرق کی طرف الگ ہو جاتا تھا مبدلہ ہے جہاں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان سب سے پہلی لڑائی ہوئی۔

برآمد کا مال عموماً قیمتی دھاتوں، موتیوں، جانوروں کی کھالوں، گرم مصالحہ جات اور خوشبودار چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور بیساکہ قیاس کیا جاسکتا ہے۔ درآمد بالعموم فلتہ۔ پارچات۔ سامان حرب۔ شراب اور کھانے کی خشک چیزوں پر مشتمل تھی۔

عرب میں قاعدہ تھا کہ سال کے مختلف حصوں میں ملک کے مختلف مقاموں میں تجارتی میلے لگا کرتے تھے



جن میں دُور دراز سے تاجر لوگ آکر شامل ہوتے اور تجارت کرتے تھے۔ ان میلوں کے لیے قرب شام میں دو دروازے آباد تھے۔  
مکہ میں مشعر، عمان میں دُبا، یمن میں صنعاء اور حجاز میں عکاظ خاص شہرت رکھتے تھے۔

### تعلیم اور قدیم شاعری

تعلیم عرب میں تھی تو سہی مگر بہت ہی کم تھی۔ سوائے خاص خاص اشخاص کے سارا ملک اُن پڑھ تھا اور یہ چند خواندہ لوگ بھی زیادہ تر شہروں میں آباد تھے، مگر باوجود اس جہالت کے عربوں کو اپنی فصاحت اور بلاغت پر بڑا گھمنڈ تھا حتیٰ کہ عرب اپنے سوا باقی تمام دُنیا کو غبی یعنی گنگ کتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ زبان کی فصاحت میں عرب کو واقعی مدد درجہ کمال حاصل تھا۔ زمانہ جاہلیت کے شعراء کا کلام آج تک محفوظ ہے اس کے اندر جو فصاحت و بلاغت جو زور اور جوش و غروش جو آزا دانہ زندگی کی جھلک اور طبعی بہادری لہریں نظر آتی ہیں وہ کسی اور قوم اور کسی اور وقت کی شاعری میں کم ملیں گی۔ اور ان لوگوں میں یہ ایک خصوصیت تھی کہ اپنے دلی خیالات کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ بالکل ننگی زبان میں کہہ جاتے تھے کوئی تفتیش نہیں کوئی بناوٹ نہیں طبعیت پر کوئی زور نہیں۔ اسی لیے اُن کا کلام ان کے خیالات۔ جذبات اور عادات کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔

عرب قوم اپنی اس غُری کو خود بھی خوب سمجھتی تھی؛ چنانچہ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب ایک دوسرے کو صرف تین موقعوں پر مبارکباد کہتے تھے۔ اول کسی لڑکے کی ولادت پر۔ دوسرے کسی شاعر کے سر نکالنے پر اور تیسرے عمدہ پھیرے کے پیدا ہونے پر۔ اس مختصر فقرہ میں عربی زندگی کا پورا نقشہ آجاتا ہے۔ عرب میں شعراء گویا ملک کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ اُن کو یہ طاقت حاصل تھی کہ اپنے کلام کے زور سے دو قبائل کے درمیان جنگ کرا دیں اور ملک میں آگ لگا دیں۔ عرب کے خاص خاص مقامات میں شعراء جمع ہو کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ عکاظ جو نخلہ اور طائف کے درمیان مکہ سے مشرق کی طرف ایک شاداب جگہ ہے ایسے میلوں کے لیے زمانہ جاہلیت میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ یہاں ہر سال ذیقعدہ میں میلہ لگتا تھا اور دُور دراز سے لوگ جمع ہوتے تھے اور علاوہ دوسری باتوں کے مختلف قبائل عرب کے درمیان فصاحت و بلاغت اور شاعری کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام اطراف عرب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مختلف قبائل کے وفد حاضر ہوئے تو اُن میں سے بنو تمیم نے جو معیار صداقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اس سے ملک عرب میں شاعری کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ اُنہوں نے بجائے اور دیلیوں میں پڑنے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تو صرف اس لیے آئے ہیں کہ آپ کے اور اپنے شاعر کا مقابلہ کرا کے دیکھیں؛ چنانچہ انہوں نے اپنا شاعر کھڑا کر دیا جس نے اپنے قبیلہ کی تعریف میں چند اشعار کہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی طرف

سے حنان بن ثابت انصاری کو کھڑے ہونے کا ارشاد فرمایا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی تعریف میں چند نوردار شعر کہے جن کی نصاحت کا موبایا بنو تمیم کو ماننا پڑا اور اس کے بعد یہ قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

**مادات اور قومی خصائل** عرب کے گندے خصائل میں سے ان کی تین عادتیں خاص امتیاز رکھتی تھیں شراب خوری۔ قمار بازی اور زنا ملک میں ان کی اتنی کثرت تھی کہ خدا کی

پناہ۔ اور اس پر تعجب یہ ہے کہ عموماً ان کو جاتے فخر سمجھا جاتا تھا؛ چنانچہ زمانہ جاہلیت کے شاعر بڑے مزے لے لے کر ان سیہ کاریوں کے متعلق اپنے کارنامے سناتے ہیں بلکہ اس قسم کے ذکر کے بغیر عربوں میں شعر کی کچھ حقیقت ہی نہ سمجھی جاتی تھی؛ چنانچہ یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ قصیدہ کے شروع میں خواہ وہ کسی غرض سے کہا گیا ہو شاعر چند کھلی کھلی باتوں میں اپنی اصل یا مفروضہ معشوقہ کا ذکر کرے اور اس کے ساتھ اپنی چند مجلسوں کے کارنامے سناتے۔ کعب بن زہیر ایک مشہور شاعر تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر لایا جو آجکل بابت شعاد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے شروع میں بھی شاعر اپنی محبوبہ ہی کی جدائی کا دکھڑا روتا ہے۔ بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خود مالک اپنی لونڈیوں سے بدکاری کر دیتے اور اس کی آمد وصول کرتے تھے۔ یہ بھی گویا ایک آمد کا ذریعہ تھا، مگر شرفاء کا دامن اس قسم کی انتہائی بے حیائی سے پاک تھا۔ جہالت اور بے جا بوش و خروش کا عرب میں یہ حال تھا کہ بات بات پر تلوار چل جاتی تھی تاہم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات ایک ذرا سی بات پر دو قبیلوں میں جنگ شروع ہوتی پھر آہستہ آہستہ بعض دوسرے قبائل بھی شریک ہو گئے اور سالہا سال تک قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔ ذیل کا واقعہ ایام عرب کی تاریخ کا ایک معمولی ورق ہے۔

پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں کلیب بن ربیعہ ایک بڑا طاقتور اور صاحب اثر رئیس گذرا ہے یہ قبیلہ بنو تغلب بن وائل کا سردار تھا جو عرب کے شمال مشرق میں رہتے تھے۔ کلیب کی بیوی حیلہ بنت مرہ قبیلہ بنو بجزین داتل سے تھی۔ اس حیلہ کا ایک بھائی تھا جس کا نام جتاس تھا جو اپنی خالہ بسوس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ بسوس کے پاس ایک شخص سعد نامی بطور مہمان آکر ٹھہرا۔ سعد کی ایک اونٹنی تھی جس کا نام سراب تھا۔ .... جو بوجہ تعلقات رشتہ داری کے کلیب کی چراگاہ میں جتاس کی اونٹیوں کے ساتھ مل کر چرا کرتی تھی۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کلیب ایک درخت کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے اس کو ایک پرندے کی آواز آئی۔ کلیب نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک پرندے نے اس درخت پر ایک گونسل بنا کر اس میں انڈے دے رکھے تھے۔ کلیب نے اس پرندے کی طرف اپنے سردار انہ بدوی انداز میں دیکھا اور بولا کہ کسی سے مت ڈریں تیری حفاظت کروں گا۔ دوسرے دن جب کلیب وہاں سے گذرا تو اس نے دیکھا

کہ انڈے درخت سے نیچے گرے پڑے ہیں اور کسی جانور کے پاؤں سے ملے ہوئے ہیں اور پرندہ اوپر درو بھری آواز نکال رہا ہے۔ کلیب کو اپنی کل کی بات یاد آئی اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے ادھر ادھر نظر کی تو سعد کی اُونٹنی چر رہی تھی۔ کلیب نے خیال کیا کہ ضرور انڈے اسی اُونٹنی نے توڑے ہوں گے غصہ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے سارے جتاس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ دیکھو جتاس! اس وقت میرے دماغ میں ایک خیال ہے اگر مجھے اس کا یقین ہو تو میں کچھ کر گذروں۔ مگر دیکھو آئندہ سعد کی یہ اُونٹنی اس گتے کے ساتھ یہاں نہ چرا کرے؟ جتاس کی رگوں میں بھی عرب کا بدوی خون تھا اس نے سنانے سے جواب دیا۔ یہ ہمارے مہمان کی اُونٹنی ہے جہاں میری اُونٹنیاں چریں گی وہیں یہ بھی چرے گی۔ کلیب نے کہا۔ اچھا تو اگر مجھے یہ اُونٹنی پھر یہاں نظر آئے گی تو میں اس کے شیردان میں تیرا بھر دے ہلاک کر دوں گا۔ جتاس بولا۔ اگر تو نے ایسا کیا تو مجھے بھی دائل کے بتوں کی قسم ہے کہ میں خود تیرا سینہ تیرے چھید کر رکھ دوں گا۔ یہ کہہ کر جتاس وہاں سے چلا گیا اور کلیب سخت غضب کی حالت میں اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی حلیہ سے کہنے لگا۔ کیا تو کسی ایسے آدمی کو جانتی ہے جو میرے مقابل پر اپنے پڑوسی کی حفاظت کی جرأت کرے گا؟ اس نے کہا۔

”ایسا تو کوئی نہیں مگر ہاں میرا بھائی جتاس ہے اگر وہ اپنے منہ سے کوئی بات کہہ بیٹھے تو وہ اُسے ضرور پورا کرے گا۔“

اس کے بعد حلیہ نے اپنی طرف سے اس بھگڑے کو روکنے کی بہت کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکی آخر ایک دن جب کلیب اپنے اُونٹوں کو پانی پلا رہا تھا، اتفاقاً جتاس بھی اُدھر سے اپنے اُونٹ لے آیا اور مزید اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے گتے سے وہی سعد کی اُونٹنی چھوٹ کر کلیب کے اُونٹوں میں آکر پانی پینے لگ گئی۔ کلیب نے اُسے دیکھا اور خیال کیا کہ جتاس نے دیدہ دانستہ اُسے چھوڑا ہے اس پر اُس نے اپنی کان لی اور اُس کے شیردان میں تیرا بھر دے اپنے نشانہ پر بیٹھا اور سعد کی اُونٹنی تڑپتی اور چلتی ہوئی دوڑی اور جتاس کی خالہ بسوس کے دروازے کے سامنے پہنچ کر گر گئی۔ بسوس نے یہ نظارہ دیکھ کر اپنا سر پیلٹا مشروع کر دیا۔ اور زور سے چلا چلا کر کہا۔ شرم شرم! ہم ذلیل کئے گئے اور ہمارے مہمان کی اُونٹنی مار دی گئی۔ جتاس نے یہ الفاظ سُننے تو شرم اور غیرت سے کٹ گیا اور غضب میں آکر اُس نے کلیب کو قتل کر دیا۔ کلیب کے قتل نے قبیلہ تغلب میں آگ لگا دی اور اپنے سردار کے انتقام کے لیے وہ ایک جان ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجہ میں قبائل تغلب اور بکر میں وہ خطرناک لڑائیاں ہوئیں اور اتنا قتل و خون ہوا کہ خدا کی پناہ۔ آخر چالیس سال کے بعد جب دونوں قبائل کٹ کٹ کر کمزور ہو گئے تو ریاست حیرہ کے بادشاہ منذر ثالث کے ذریعہ سے اُن میں پھر صلح ہوئی۔ یہ جنگ تاریخ عرب میں جنگ بسوس کے نام سے مشہور ہے۔

عرب کے جنگوں میں عام طور پر شمار یعنی انتقام کا بڑا دخل ہوتا تھا۔ شمار کا عقیدہ گویا عرب کے دین و مذہب کا جزو اعظم تھا۔ اُن کا ایمان تھا کہ جب تک بدلہ نہ لے لیا جاوے مقتول کی روح ایک جانور کی صورت اختیار

کر کے ہو امیں نوحہ کرتی پھرتی ہے۔ اُس جانور کو عرب لوگ سُدی کہتے تھے۔ جب کسی قبیلے کا کوئی آدمی مارا جاتا تو اس کے رشتہ داروں اور اہل قبیلہ کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ قاتل یا اُس کے کسی رشتہ دار یا اس کے قبیلہ کے کسی آدمی کو اُس کے بدلے میں قتل کریں۔ مقتول کے بدلے میں دیت یعنی خون بہا لینے کا بھی رواج تھا، مگر اس میں مالی پہلو اتنا متصور نہ تھا جتنا یہ کہ قاتل کا قبیلہ ذلیل اور شرمندہ ہو کر مقتول کا خون بہا ادا کرے، لیکن عموماً جب تک مقتول کا بدلہ قتل کے ساتھ نہ لے لیا جاتا۔ اُس وقت تک اُس کے رشتہ داروں کے دلوں میں ایک آگ سی لگی رہتی تھی جسے صرف قاتل کا خون ہی بجھا سکتا تھا، لیکن جب ایک طرف کی آگ بجھ جاتی تھی تو دوسری طرف یہی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور اس طرح یہ سلسلہ ایسا وسیع ہوتا چلا جاتا تھا کہ بعض اوقات قبیلے کے قبیلے اس میں بھسم ہو جاتے تھے۔

صرف قاتل کو مار دینے تک مقتول کا انتقام ختم نہ ہوتا تھا بلکہ مُردوں کے ہاتھ پاؤں کان ناک وغیرہ کاٹ کر بھی اپنے دل کو ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ اس طریق کو عربوں میں مُشلہ کہتے تھے اور عرب کی جنگوں میں اس کا عام رواج تھا۔ چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جنگ اُحد میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کے ساتھ جنوں نے جنگ بدر میں اس کے باپ عتبہ کو قتل کیا تھا یہی سلوک کیا بلکہ نہایت بیدردی کے ساتھ آپ کا جگر نکال کر چبا گئی۔ عورتیں اور بچے جو جنگ میں قید ہو کر آتے تھے ان کو قتل کر ڈالنے میں بھی عربوں کو دریغ نہ ہوتا تھا۔ انتقام پورا کرنے کے واسطے مُردوں کی کھوپڑیوں میں شراب پینا۔ نیزہ مار کر حاملہ عورتوں کا حمل گرا دینا۔ فعلت کی حالت میں سوتے ہوئے آدمیوں پر حملہ کر کے مار دینا وغیرہ اللہ یہ ایسی باتیں تھیں جن کو عرب کی سوسائٹی عموماً ناجائز نہیں سمجھتی تھی۔

جنگوں میں عرب کا دستور تھا کہ ایک اپنی جگہ پر آگ جلادیتے تھے اور دورانِ جنگ میں اسے برابر جلتا رکھتے تھے اور اس کے بجھ جانے کو بُری فال خیال کرتے تھے، چنانچہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب جنگ احزاب میں کسی وجہ سے ایک افسر کی آگ بجھ گئی تو وہ گھبرا کر رات کے وقت اکیلا ہی میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ جس کی وجہ سے باقی فوج میں بھی بھاگ پڑ گئی۔

جنگ میں عموماً عورتیں بھی ساتھ جاتی تھیں جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ غیرت اور جوش دلانے کے شعر پڑھ پڑھ کر آتشِ حرب کو بھڑکاتی رہیں۔ زخمیوں کی نگہداشت بھی عموماً عورتیں ہی کرتی تھیں؛ چنانچہ یہ رسم ایک حد تک اسلام میں بھی قائم رہی۔

لڑائی میں یہ عام دستور تھا کہ پہلے ایک ایک آدمی کا انفرادی مقابلہ ہوتا تھا اور پھر عام دھاوا ہو جاتا تھا۔ جنگ میں عرب لوگ عموماً تین قسم کے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ تیرکمان۔ نیزہ اور تلوار۔ بچاؤ کے واسطے زره اور خود استعمال کی جاتی تھیں۔ عرب لوگ جنگ گھوڑے پر بھی کرتے تھے اور پیدل بھی۔ لیکن بہادری کے درمیان یہ بہادری کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ لڑائی کے وقت گھوڑے سے اتر کر اپنے عزیز گھوڑے کی کوچیں کاٹ کر اُسے نیچے گرا دیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ ہم نے اپنے واسطے بھاگنے کا کوئی راستہ کھلا نہیں رکھا۔ جنگوں میں بار باری

کے لیے اُونٹ استعمال ہوتا تھا۔

عربوں میں بہادری اور شجاعت نہایت اعلیٰ وصف سمجھے جاتے تھے اور عرب شاعر اپنی اور اپنے قبیلہ کی بہادری کے کارنامے دلی جوش و خروش کے ساتھ منظوم کرتے تھے اور بہادری گویا اُن کے قومی خصائص میں سب سے نمایاں تھی۔ موت کے ڈر کو ایک سخت قابلِ شرم بات خیال کیا جاتا تھا اور موت سے ڈرنے والا سب کی نظروں میں مطہور ہو جاتا تھا۔ دراصل بہادری عربوں کی زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم تھی۔

عربوں کی غیرت اور غرور کے قہقہے بھی بہت مشہور ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا مشہور مثنوی جس میں وہ عمرو بن ہند کو خاص عربی انداز میں مخاطب کرتا ہے، عربوں کی غیرت کی ایک عام مثال ہے۔ عموماً عرب لوگ اپنے مفاد کے مقابلہ میں عہدِ پیمان کا زیادہ پاس نہ کرتے تھے، تاہم عربوں کے اندر وفاداری کی بعض مثالیں حیرت انگیز ہیں۔ سموئل بن عاد یہ نے اسرہالقیس کی امانت کی حفاظت میں اپنے جوان بیٹے کے قتل کی پروا نہیں کی۔

عربوں میں سخاوت ایک نہایت اعلیٰ وصف سمجھا جاتا تھا۔ اور پڑوسی اور جہان کی حفاظت ان کے دین و مذہب کا حصہ تھی۔ جہان نوازی تو عربوں کی فطرت میں تھی۔ رات کو کسی ادنیٰ جگہ آگ جلا رکھتے تھے تاکہ اسے دیکھ کر مصیبت مُسافر اُن تک پہنچ سکے۔ جہان کی خاطر گھر کا سب کچھ خرچ کر ڈالنے میں دریغ نہ تھا۔ اس ضمن میں عرب کے مشہور ہیسرو حاتم طائی کی سخاوت و جہان نوازی کے قہقہے زبان زدِ خلایق ہیں۔

قبیلہ کی پاسداری عربوں کا فرض عین تھا۔ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں۔ اگر وہ غلطی کریں تو میں بھی غلطی کروں گا اور اگر غزیہ ٹھیک راستہ پر چلیں تو میں بھی ٹھیک راستہ پر چلوں گا۔  
عرب میں اپنے حسبِ نسب پر فخر کرنے کی عادت عام تھی اور اپنے باپ داداؤں کے کارناموں کا فخریہ لہجہ میں ذکر کرنا اُن کا خاصہ تھا۔ یہ اسی بکتر کا نتیجہ تھا کہ عرب لوگ غلاموں اور خادموں کو نہایت تحارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

دشمن کے ساتھ معاملہ کرنے میں عرب لوگ عموماً خالم اور سخت گیر تھے۔ ثار کا خونی عقیدہ اُن پر بیان ہو چکا ہے۔ یہ گویا عرب کے دین و مذہب کا جزوِ اعظم تھا۔ ثار کے مقابلہ میں خدائی قنار و قدر کی بھی پروا نہ تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

سَأَغِيلُ عَجِي الثَّارَ بِالشَّيْفِ جَابِلًا ۝ عَلَيَّ قَتْنَاءُ اللَّهِ مَا كَانَ جَابِلًا

”میں اپنے اُوپر سے شرم و عار کو موزوں کر لیا تھا دھوؤں گا، پھر اللہ کی قنار مجھ پر جو چاہے لاوے مجھے پروا نہیں ہے۔“  
عرب لوگ نہایت ذکی اور ذہین تھے اور اُن کا حافظہ غضب کا تیز تھا چنانچہ قدیم سے اُن کا دستور تھا کہ اپنی تمام قومی اور خاندانی روایات کو یاد رکھتے تھے اور مختلف موقعوں پر سُناتے رہتے تھے۔ جنگ میں جب



دو جانباز سپاہی مقابلہ کے واسطے آگے بڑھتے تھے تو پہلے ایک دوسرے کا حسب نسب ضرور دریافت کرتے تھے اور اگر کوئی پنج ذات کا ہوتا تھا تو اُس کو اپنے مقابلہ میں آنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

عربوں میں سال اور ماہ چاند کی گردش کے حساب سے شمار کئے جاتے تھے اور بارہ مہینوں میں سے پہلا ساتواں اور آخری دواہینے عزت کے مہینے سمجھے جاتے تھے جن میں ہر قسم کا قتال ممنوع تھا، لیکن بعض اوقات اپنی سہولت کے واسطے عرب انہیں آگے پیچھے بھی کر لیتے تھے تاکہ اگر کوئی ضرورت آپڑے تو ان مہینوں میں بھی بلا خوف گناہ جنگ و جدال کر سکیں۔ اس رسم کو نسبی کہتے تھے یہ۔

### عورت کی حیثیت

عرب میں عورت کی حالت بحیثیت مجموعی اچھی نہ تھی۔ بیشک عموماً عورت کو اپنا خاندان خود انتخاب کرنے کا اختیار تھا مگر اس اختیار کے بعد وہ عذابِ اختیار تھی۔ ماں ہوشیار عورتیں اپنے خاوندوں پر اچھا اثر رکھتی تھیں۔ جنگ میں عورتوں کے ساتھ جانے کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اُن کا کام مردوں کو غیرت دلانا اور زخموں کی خبر گیری کرنا تھا۔ عورتیں شعر بھی کہتی تھیں، اپنا پنچہ غنا زما نہ جاہلیت کی ایک مشہور شاعرہ ہے جو بعد میں مسلمان ہو گئی تھی یہ۔

عورتوں میں پردے کی رسم نہ تھی بلکہ وہ کھلی پھرتی تھیں۔ تعدد ازواج کی کوئی حد نہ تھی اور بعض بیویاں کوئی شخص رکھنی چاہتا تھا رکھتا تھا۔ بعض اوقات باپ کی منگوحہ پر بیٹا وارث کے طور پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اور وہ حقیقی بہنوں سے بھی ایک وقت میں شادی کر لیتے تھے مگر ان باتوں کو اشرافِ عرب اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ عرب میں طلاق کا عام رواج تھا اور خاوند جب چاہتا بیوی کو الگ کر سکتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی رسم بھی عرب میں تھی۔ مگر یہ رسم خاص خاص قبائل میں تھی۔ عام نہ تھی۔

لڑکیوں کو در نہ ملتا تھا اور نہ ہی بیوی کو حشی کہ اگر کسی شخص کی زینہ اولاد نہ ہوتی تھی تو اس کے مرنے پر سب ترکہ اُس کا بھائی لے جاتا تھا اور اس کی بیوی اور لڑکیاں یونہی خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔

### رسوم اور رسوم پرستی

یہ ابھی بیان کیا جانے لگا کہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں بہت سے مذاہب پائے جاتے تھے جو مختلف عقائد اور مختلف خیالات کے پیرو تھے لیکن عادات اور قومی اخلاق کے لحاظ سے تمام عرب گویا ایک قوم کے حکم میں تھا اور جو جو عادات اور اخلاق ہم نے اُدپر بیان کی ہیں وہ سب میں نمایاں طور پر پائی جاتی تھیں، چنانچہ زما نہ جاہلیت میں یثرب میں ایک یہودی رئیس فقیون تھا اس کعبخت کا یہ عام حکم تھا کہ شہر میں جس لڑکی کی بھی شادی ہو وہ پہلے اُس کے گھر میں آدے۔ چنانچہ مدینہ کے اکثر یہودی اپنی ناکھنڈ لڑکیاں شادی کے وقت پہلے اس کے گھر بھیجتے تھے اور اس کے بعد وہ کسی اور کے واسطے جائز ہوتی تھیں۔ آخر ایک غیرت مند شخص نے فقیون کو قتل کر ڈالا کیونکہ اسی طرح اس زمانہ



میں عیسائیوں کی حالت بھی بہت خراب تھی جیسا کہ میٹور صاحب نے بھی اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے۔ غرض عرب میں کیا بُت پرست، کیا یہودی اور کیا نصاریٰ سب اخلاق و عادات اور قومی خصائل کے لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگین تھے اور قتل و غارت، قمار بازی، زنا، شراب خوری کا بازار ہر طرف گرم تھا۔

اسی طرح رسوم کی پابندی بھی سب میں مشترک تھی اور رسوم پرستی اس درجہ کی تھی کہ مذہب بھی اس کے سامنے سچ تھا۔ عجیب عجیب رسوم ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک تقسیم بالائزلام کی رسم تھی۔ یعنی ایک قربانی میں دس لوگ حصہ ڈالتے تھے اور پھر اس کی تقسیم حصہ رسدی سے نہ کرتے تھے بلکہ قربانی کے تیروں سے ایک قسم کا قرعہ ڈالا جاتا تھا اور پھر اس طرح جو کسی کا حصہ نکلتا تھا وہ اُسے مل جاتا تھا اور بعض خالی بھی رہ جاتے تھے۔ ہر تیر کا نام اور الگ الگ حصہ مقرر ہوتا تھا۔

تیروں سے فال لینے کی رسم بھی عام تھی۔ ہر کام کرتے ہوئے تیر سے فال لیتے تھے۔ کعبہ میں بھی فال کے تیر رکھے ہوئے تھے اور وہاں جا کر لوگ فال نکالتے تھے۔ پرندوں کی اڑان سے بھی فال لینے کا دستور تھا۔ ایک عجیب رسم عرب کے بعض قبائل میں یہ تھی کہ جب کسی سفر کے اداوے سے گھر سے نکلتے تھے تو اگر راستہ میں کسی وجہ سے واپس آنا پڑتا تھا، تو دروازوں کے ذریعہ اندر نہ داخل ہوتے تھے بلکہ پشت کی طرف سے آتے تھے۔ قرآن شریف میں بھی اس کی طرف اشارہ آتا ہے۔

بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی آدمی مرجاتا تھا تو اس کی قبر کے پاس اُس کے اُونٹ کو باندھ دیتے تھے حتیٰ کہ وہ بھوک پیاس سے مرجاتا تھا۔ عورتوں میں سخت زور کرنے کی عادت تھی۔ سال سال تک ماتم چلا جاتا تھا۔

عرب میں بالعموم عورتیں جانوروں کا دودھ نہ دوتی تھیں اور اسے عورت کے لیے ایک عجیب سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی خاندان میں کوئی عورت ایسا کرتی دیکھی جاتی تھی تو وہ خاندان دُوسروں کی نظروں میں گر جاتا تھا۔

جانوروں کو بُتوں وغیرہ کے نام پر یا کسی نذر وغیرہ کے نتیجہ میں آزاد چھوڑ دینے کی بھی رسم تھی اور اس تعلق میں چار قسم کے جانور زیادہ معروف تھے۔ اقل سائبہ جو ایسی اونٹنی کو کہتے تھے جس نے پلے درپلے دس مادہ پتھے جئے ہوں ایسی اونٹنی پر سواری ترک کر دی جاتی تھی۔ اور اس کا دودھ بھی سوائے مہمانوں کے استعمال کے حرام سمجھا جاتا تھا اور اس کی اُون بھی نہیں کاٹی جاتی تھی۔ دوسرے بیکرہ جو سائبہ اونٹنی کے گیارہویں مادہ بچہ کو کہتے تھے۔ بیکرہ کو اس کے کان درمیان میں کاٹ کر اس کی مال کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ تیسرے حاتم جو ایسے اُونٹ کا نام رکھا جاتا تھا جو اُپر تلے دس مادہ بچوں کا باپ ہو اُسے سانڈ کے طور پر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ چوتھے وصیلہ جو ایسی بکری کو کہتے تھے جو پانچ بھولوں میں مسلسل دس مادہ پتھے جنتی تھی۔ ایسی بکری کی بعد کی اولاد کا گوشت صرف مرد

کھاتے تھے عورتوں کے لیے حرام تھا۔ البتہ اگر ان میں سے کوئی بچہ مرجاتا تھا تو اس کا گوشت عورتیں بھی کھا سکتی تھیں۔ قرآن شریف میں بھی ان جانوروں کا ذکر آتا ہے۔

نکاح کے متعلق بھی عجیب عجیب رسوم رائج تھیں۔ عموماً نکاح کی صورتیں چار تھیں جن میں سب سے عجیب اور سب سے گندی صورت یہ تھی کہ ایک عورت کے پاس یکھنت چند آدمی پہنچ جاتے تھے اور وہاں یکے بعد دیگرے اپنا منہ کالا کرتے تھے اور جب وہ کوئی بچہ جنمتی تھی تو پھر یہ لوگ دوبارہ اس کے پاس جمع ہوتے تھے اور وہ عورت جس شخص کے متعلق کہہ دیتی تھی کہ بچہ اس کا ہے، اسی کی طرف وہ منسوب ہوتا تھا۔ مگر شرفار کا دامن اس قسم کی بے حیائیوں سے پاک تھا۔

یہ چند رسوم صرف شمال کے طور پر لکھی گئی ہیں ورنہ عرب میں رسوم کی بے حد کثرت تھی اور عجیب عجیب رسومات کا وجود پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام نے سب گندی رسوم کو یک قلم منسوخ کر دیا۔

### قدیم مذاہب عرب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب کے پیرو پائے جاتے تھے، جن میں سے زیادہ ممتاز بت پرست۔ وہیریہ۔ جوسی، صابی، عیسائی اور یہودی تھے۔ ان مذاہب میں سب سے زیادہ عام اور سارے ملک میں پھیلا ہوا بت پرستی کا مذہب تھا جسے گویا ملک کا اصل مذہب کہنا چاہیے۔ بت پرست اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بھی قائل تھے، مگر اس تک پہنچنے کا وسیلہ بتوں کو سمجھتے تھے، لیکن اس درمیانی واسطہ میں وہ ایسے الجھے ہوئے تھے کہ اصل جمود کا خیال دل سے نکل گیا تھا۔ مشرک بتوں کے علاوہ عموماً ہر قبیلہ کا اپنا اپنا خاص بت بھی تھا۔ چنانچہ مکہ میں اسات اور نائلہ قریش کے بت تھے۔ جن کے سامنے قربانیاں ذبح کی جاتی تھیں۔ عترتی نخلہ میں قریش اور بنو کنانہ کا مشترکہ بت تھا۔ طائف میں لات بنو ثقیف کا بت تھا۔ منات اوس اور خزرج کا بت تھا۔ دمرہ الجندل میں دوز بنو کلب کا بت تھا۔ قبیلہ حذیل کا بت سواع تھا۔ یغوث قبائل مذحج اور مطلق کا بت تھا۔ نسر دوا نکلاع کا بت تھا اور یثوق مین میں ہمدان کا بت تھا وغیرہ وغیرہ۔ سب بڑا بت جبل تھا جو کعبہ میں نصب تھا۔ جنگ میں فتح کے موقع پر اسی کے نام کے نعرے لگتے تھے۔

عرب کے بت پرستوں کا مذہبی مرکز کعبہ تھا۔ جہاں انھوں نے بہت بت جمع کر رکھے تھے۔ اور عرب کے مشرک لوگ ملک کے تمام حصوں سے ہر سال حج کے واسطے مکہ میں جمع ہوتے تھے۔ یہ گویا ابراہیمی تعلیم کی ایک بقیہ نشانی تھی۔ مگر مراسم حج میں بنی ان لوگوں نے کئی قسم کی مشرکانہ باتیں شامل کر لی تھیں جو اسلام نے خارج کر دیں۔ مکہ کی اس مذہبی خصوصیت کی وجہ سے مکہ اور اس کے ارد گرد کا علاقہ حرم کا علاقہ تھا جہاں ہر قسم کا کشت و خون سخت ممنوع تھا۔ اسی طرح حج اور عمرہ کے لیے لوگوں کی آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے

سال میں چار مہینے یعنی محرم۔ رجب۔ ذیقعدہ مذی الحجۃ عام عزت کے مہینے سمجھے جاتے تھے جن میں کشت و خون رگ جاتا تھا اور لوگ امن کے ساتھ ادھر ادھر آ جاسکتے تھے۔

بُت پرستی کے علاوہ عرب میں دہریت بھی تھی۔ اس کے پیرو خدا کی ہستی۔ بعثت بعد الموت۔ جزا و سزا وغیرہ کے قائل نہ تھے۔ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔

پھر عرب میں مجوسی بھی تھے جو آتش پرست اور ستارہ پرست تھے، مگر یہ لوگ خدا کی ہستی کے بھی قائل تھے۔ اور عبادات کا بھی ان کے مذہب میں دستور تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ مذہب جو اپنی اصل کے لحاظ سے ایرانی ہے درحقیقت الہامی مذہب میں سے تھا مگر آہستہ آہستہ بگڑ گیا۔ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ موجودہ پارسی قوم اسی مذہب کی تابع ہے۔

ایک مذہب صابی تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی آتا ہے۔ یہ مذہب یوحسیت اور یسویت کا مجموعہ تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوگ عام طور پر صابی کا لفظ ہر اس شخص پر بول دیتے تھے جس نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے توحید سے ملنا جلد مذہب اختیار کر لیا ہو۔ چنانچہ بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو بھی صابی کہہ کر پکارتے تھے۔

عیسائیت عرب میں ظہور اسلام سے بہت عرصہ پہلے داخل ہو چکی تھی اور بعض قبائل اُسے اختیار کر چکے تھے۔ عرب میں نجران کا علاقہ اس مذہب کا بڑا مرکز تھا۔

عرب کے یہودی ابتداء شام کی طرف سے آئے تھے اور پھر اس کی اتباع میں بعض دوسرے قبائل بھی یہودی بن گئے تھے۔ یہود کے بڑے مرکز یثرب۔ خیبر اور تیمنا تھے۔

ایک مذہب اور تھا جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہوتا تھا اور توحید کا مدعی تھا اس کا نام بعض لوگوں نے مذہب حنیفی رکھا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل زمانہ میں اور اس سے کچھ پہلے بعض لوگ عرب کی انتہائی بُت پرستی سے متنفر ہو کر اور آفتاب رسالت کی طلوع کرنے والی کبروں کی پیشگی طور پر روشنی پاتے ہوئے اس مذہب کی طرف مائل تھے مگر ان کی تعداد تمام عرب میں چند نفوس سے زیادہ نہ تھی اور یہ لوگ تیرہا سب کے سب مکہ اور اُس کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی زید بن عمرو جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی تعلقات تھے انہی لوگوں میں سے تھے، مگر بعثت نبویؐ سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ سعید بن زید جو مشہور صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہی کے صاحبزادے تھے۔ زید کو بُت پرستی سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ بتوں کے چڑھاوے کا کھانا تک نہ کھاتے تھے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ یہ کیا چیزیں ہیں جنہیں تم پوجتے ہو؟ طائف میں اُمیہ بن ابی صلت ایک مشہور شاعر اور معزز رئیس تھا وہ بھی بُت پرستی

ترک کر کے مذہب حنیفی اختیار کر چکا تھا۔ اُمیہ جنگِ بدر کے بعد تک زندہ رہا مگر اسلام لانا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بڑے شوق سے اس کے مواعدا نہ اشعار سُنے اور انہوں کے ساتھ فرمایا کہ اُمیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ایک اور شخص ورقہ بن نوفل تھا جو حضرت خدیجہؓ کا چچا زاد بھائی تھا اور مکہ میں رہتا تھا۔ یہ بُت پرستی ترک کر کے بعد میں عیسائی ہو گیا تھا اور توریت و انجیل سے واقف تھا اور ان کا مطالعہ رکھتا تھا، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الہی فرشتہ نازل ہوا تو اُس نے آپؐ کی تصدیق کی اور اسی تصدیق کی حالت میں فوت ہوا۔ ایک شخص قس بن ساعدہ جو بکر بن وائل کے علاقہ میں رہتا تھا اور نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھا چنانچہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عکاظ کے میلے میں اُس کا ایک خطبہ سنا تھا؛ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ زمانہ نبوت میں فرماتے تھے کہ میں نے عکاظ میں قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ سنا تھا جو اُس نے اُونٹ پر چڑھے چڑھے دیا تھا اور آپؐ اُس کی فصاحت کی تعریف فرماتے تھے۔ قس بھی شرک ترک کر کے توحید اختیار کر چکا تھا مگر اسلام سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

ایک اور شخص عثمان بن حویرث تھا۔ یہ مکہ کا رہنے والا تھا اور بُت پرستی ترک کر کے دین حنیفی کا متبع ہو گیا تھا، لیکن بعد میں جب وہ قیصرِ روم کے دربار میں پہنچا تو عیسائی ہو گیا اور اسی مذہب پر اس کی وفات ہوئی۔ یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔

غرض عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب پائے جاتے تھے مگر باوجود ان مختلف مذاہب کے عرب کا اصل اور عام مذہب بُت پرستی تھا اور دوسرے لوگ اتنے بھی نہ تھے جیسے آٹے میں نمک۔ اور وہ بھی سخت بگڑی ہوئی اور ناکامی کی حالت میں تھے جیسا کہ خود یورپین مورخین کو بھی اقرار ہے؛ چنانچہ قدیم مذاہب عرب پر ریویو کرتے ہوئے سرولیم میور لکھتے ہیں :-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جوانی کے زمانہ میں عرب ایک بندھی ایک پر چلنے والے لوگ تھے اور ملک کی حالت ہر قسم کے تغیر و اصلاح کے سخت مخالف تھی بلکہ اس کی تمام تاریخ میں شاید اس زمانہ سے بڑھ کر کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ جب اس کی اصلاح اس وقت سے زیادہ مشکل اور ناپس کُن ہو..... عیسائی مذہب کی پانچ سو سال کی تبلیغی کوششوں کا یہی نتیجہ تھا کہ ملک میں خال خال عیسائی نظر آتے تھے اور بس۔ یہودی مذہب زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن ایک تبلیغی مذہب کے طور پر وہ بھی اب گویا بالکل رہ چکا تھا لیکن بُت پرستی اور بنو اسماعیل کے توہمانہ اعتقادات کا دیرپا ہرمت سے جوش مانتا

ہوا کعبہ کی دیواروں سے آٹھ گز آٹھ گز

یہ حالت صرف عرب ہی کی نہ تھی بلکہ یہ وقت ساری دنیا پر ایک سخت تاریکی کا وقت تھا اور تمام مذاہب بگڑ چکے تھے اور گمراہی چاروں طرف اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھی۔ اسی طرف یہ آیت قرآنی اشارہ کرتی ہے کہ :-

ظَلَمَ الْفَاسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

”یعنی اس وقت فتنی اور تری ہر دو میں فساد ظاہر ہو چکا ہے“

یعنی الہام الہی پر بنیاد رکھنے والے مذاہب بھی خراب ہو چکے ہیں اور وہ مذاہب بھی جن کی بنیاد الہام پر نہیں ہے۔ اب دیکھو کہ جب دنیا میں اندھیرا اچھا جاتا ہے تو سورج نکلتا ہے۔ اور جب زمین تپ جاتی ہے تو وہ بارش کو بھیجتی ہے۔ تو کیا روحانی اندھیرے کے بعد روحانی سورج نہ نکلتا؟ اور کیا روحانی زمین کی تپش روحانی بارش کو نہ بھیجتی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُقَدِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ

”یعنی اللہ تعالیٰ رات اور دن کی لمبائی کو آپس میں بدلتا رہتا ہے“

نیز فرماتا ہے:

إِخْلُصُوا لِلَّهِ يُخَيِّبَ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

”جان لو اس وقت کہ زمین کو زندہ کر رہا ہے بعد اسکے کہ وہ مر چکی تھی“

پس ناگہاں اس تاریکی کے زمانہ میں ایک سورج نکلا جس نے اپنی شعاعوں سے اطرافِ عالم میں اُجالا کر دیا۔ اور اس شدید گرمی کے وقت میں اچانک ایک بادل اُٹھا جس نے پیاسی زمین پر رحمت کی بارشیں برسائیں۔ اور ندی نالے جو خشک پڑے تھے پانی سے بہہ نکلے۔ یہ سورج کس اُفتی سے طلوع ہوا اور کس طرح نصف النہار پر پہنچا اور یہ بادل کس دامن کوہ سے اُٹھا اور کس طرح ساری دنیا پر بھیا گیا؟ ان سوالات کا جواب انشاء اللہ ذیل کے ادراک میں ملے گا۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ



# مکہ، کعبہ اور قریش

**ابوالانبیاء خلیل اللہ** حضرت ابراہیم کا نام نامی کسی معترفی کا محتاج نہیں۔ کون ہے جو ابوالانبیاء خلیل اللہ کو نہیں جانتا۔ مسلمان، عیسائی، یہودی بھی ان کو مانتے ہیں۔ آپ کا زمانہ مولے طو پر اکیس بائیس سو سال قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔ یعنی آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ستائیس اٹھائیس سو سال پہلے گزرے ہیں۔ آپ نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور عراق کے رہنے والے تھے مگر بعد میں مصر وغیرہ میں سے ہوتے ہوئے بالآخر جنوبی فلسطین میں آباد ہو گئے۔ آپ نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام سارہ تھا۔ دوسری کا نام ہاجرہ تھا۔ اور تیسری کا نام قطورا۔ ان میں سے مؤخر الذکر کے ذاتی حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیں اس جگہ ان سے تعلق ہے مگر اس قدر ذکر غیر مناسب نہ ہو گا کہ وہ قوم مدین کی نسل سے تھی۔ حضرت ابراہیم کی پہلی دو بیویوں میں سے سارہ حضرت ابراہیم کے قریبی عزیزوں میں سے تھیں مگر ہاجرہ ایک غیر خاندان سے تھیں اور مصر کی رہنے والی تھیں۔ ان دونوں کے بطن سے اولاد ہوئی اور اس قدر پھیل کہ آج دنیا کے ہر گوشہ میں پائی جاتی ہے۔ حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمعیل پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیم کے بڑے لڑکے تھے۔ اور حضرت سارہ سے اسحاق پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بچے خدا کی خاص بشارت کے ماتحت پیدا ہوئے تھے اور دونوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص برکت کے وعدے تھے۔ اور ان کے نام بھی خدائی الہام کے ماتحت رکھے گئے تھے۔ اور اسمعیل کے متعلق تو حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ کی خاص دُعا بھی تھی۔ جیسا کہ ان کا نام بھی جو دراصل سمیع ایل ہے۔ ظاہر کرتا ہے؛ چنانچہ ان دونوں بچوں کو خدا تعالیٰ نے عظیم الشان برکات کا وارث بنایا اور حسب وعدہ ان دونوں کی نسل کو دنیا میں ہر قسم کے انعام سے مالا مال کیا۔ چنانچہ بنو اسرائیل جن میں حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد اور حضرت یسماٰن اور حضرت یحییٰ ناصر علی جیسے عالی مرتبہ نبی پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق کی اولاد سے ہیں۔ مگر اس جگہ ہمارا تعلق بنو اسماعیل سے ہے جو عرب میں آباد ہوئے اور جن سے خضر اولین و آخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود نکلا۔

۱۔ پیدائش باب ۱۶ آیت اور باب ۱۷ آیت ۲۰ باب مذکور آیت ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ پیدائش باب ۱۶ آیت و باب ۱۷ آیت ۱۸  
۲۔ قرآن شریف سورۃ صافات آیت ۱۰۲ و پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱، ۱۲ یعنی خدا نے دُعا سن لی



## سکونت حجاز اور مکہ کی آبادی

اسمعیلؑ ابھی بچہ ہی تھے کہ اُن کی سوتیلی ماں سارہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو

گھر سے نکال دو۔ ابراہیمؑ کو طبعاً اس قول پر بہت رنج پیدا ہوا۔ مگر خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے فرمایا کہ رنجیدہ مت ہو اور اس بات کو بُرا نہ جان بلکہ جیسے سارہ کہتی ہے ویسے ہی کر۔ اسحاقؑ بھی تیری اولاد ہے مگر مجھے ہاجرہ کے فرزند اسمعیلؑ سے ایک قوم بنانا ہے۔ چنانچہ اس الہی ارشاد کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے سینکڑوں میل کا سفر اختیار کر کے حضرت اسمعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ کو عرب کے علاقہ حجاز کے اندر وادی بکعہ میں لا کر آباد کیا۔ یہ وہ وادی ہے جہاں اب مکہ آباد ہے۔ اُس وقت یہ ایک بالکل غیر آباد ویران وادی تھی۔ اس وادی میں صفوا اور مرکہ کی گھاٹیوں کے پاس ان دو بے کس اور بے بس جانوں کو تھوڑے سے زاد کے ساتھ جنگل میں چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ اپنے دطن کو واپس روانہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو واپس جاتے دیکھ کر حضرت ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے آئیں اور نہایت درد آمیز الفاظ میں کہنے لگیں: ”آپ کہاں جاتے ہیں۔ اور ہم کو اس طرح کیوں اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“ حضرت ابراہیمؑ خاموشی کے ساتھ قدم بڑھاتے گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ آخر ہاجرہ نے کہا: ”آپ کچھ تو بولیں کیا خدا نے آپ سے ایسا فرمایا ہے؟“ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: ”ہاں“ اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ اس پر ہاجرہ بولیں: ”اگر اللہ کا حکم ہے، تو پھر آپ بیشک جائیں۔ اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہ کہہ کر ہاجرہ واپس لوٹ آئیں۔“ قرآن شریف میں اس واقعہ کا حضرت ابراہیمؑ کے ان الفاظ میں ذکر آتا ہے:-

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ خَالِيَةً مِنْ دَرَجٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنْ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝

یعنی جب حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور اسمعیلؑ کو وادی مکہ میں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو انھوں نے تھوڑی دُور جا کر پیچھے نظر ڈالی اور خدا کے حضور یوں دعا کی کہ:

”اے ہمارے رب! میں نے اپنی نسل کے ایک حصے کو اس غیر آباد، بخر وادی میں تیرے عزت والے گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ تادہ تیری عبادت کو قائم کریں اور تیرے لئے ان کی زندگی وقف ہو۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مت جھکا دے اور ان کو اچھے اچھے ثمرات کا رزق عطا کر تاکہ وہ تیرے شکر گزار ہوں۔“

عام مَدْعٰیٰں بیان کرتے ہیں اور حدیث میں بھی ذکر آتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ کا زاد ختم ہو گیا تو وہ اذنا بشری

کے ماتحت ان کو اپنے بیٹے کے متعلق سخت فکر پیدا ہوا اور وہ ادھر ادھر پانی کی تلاش میں پھریں مگر پانی کی ایک بوند تک نہ ملی اور پتے کی حالت پیاس سے جلد جلد ابتر ہوتی گئی۔ آخر باجرہ سے اسٹیل کی حالت زار دیکھی نہ گئی، اس لیے وہ وہاں سے اُنھیں تاکہ اپنے پتے کی پیاس کی موت کو نہ دیکھیں اور آسمان کی طرف مُنہ کر کے روئیں۔ اور پانی کی تلاش میں پھر ادھر ادھر بھاگیں اور ارد گرد کے علاقہ پر ابھی طرح نظر ڈالنے کی غرض سے صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئیں۔ لیکن وہاں سے بھی جب کوئی چیز نظر نہ آئی تو بھاگتی ہوئی مردہ کی پہاڑی پر آئیں۔ وہاں سے پھر دوڑتی ہوئیں صفا کی طرف گئیں اور اس طرح اُنھوں نے ایک نہایت گھبراہٹ اور بیتابی کی حالت میں ان پہاڑیوں پر سات چکر لگائے اور ساتھ ساتھ زار زار روتی بھی جاتی تھیں اور اللہ سے دُعا بھی کرتی جاتی تھیں۔ مگر نہ تو کوئی پانی کا پتہ ملتا تھا اور نہ ہی کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ آخر جب باجرہ کا کرب انتہا کو پہنچ گیا تو ساتویں چکر کے بعد باجرہ کو ایک غیبی آواز سنائی دی کہ ”اے باجرہ اللہ نے تیری اور تیرے پتے کی آواز سن لی ہے“ یہ آواز سن کر وہ واپس آئیں تو جس جگہ پتہ شدت پیاس کی وجہ سے بے تاب کی حالت میں تڑپ رہا تھا وہاں ایک خدائی فرشتہ کو کھڑا پایا جو اپنے پاؤں کی ایڑی اس طرح زمین پر مار رہا تھا کہ گویا کوئی چیسہ کھود کر نکال رہا ہے۔ حضرت باجرہ آگے بڑھیں تو جس جگہ وہ ایڑی مار رہا تھا وہاں اُنھوں نے ایک چشمہ پایا جس میں سے پانی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ باجرہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے فوراً اپنے پتے کو پانی دیا اور اس خوف سے کہ پانی ضائع نہ ہو جائے اس کے ارد گرد پتھر رکھ دیئے اور اسے ایک حوض کی صورت میں بنا دیا۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ”خدا باجرہ پر رحم کرے۔ اگر وہ اس پانی کو نہ روکتی تو وہ ایک بہنے والا چشمہ ہو جاتا“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ حج میں صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرنا باجرہ ہی کی مقدس یادگار ہے۔ ان واقعات کی ایک اجمالی اور کسی قدر محرف و مبتدل نقشہ بائبل میں بھی مذکور ہے۔

حضرت باجرہ کی مقدس یادگار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پاس تھا کہ ایک دوسری روایت سے پتہ لگتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ جب خدا تمھارے ہاتھ پر مصر کا ملک فتح کرائے تو اہل مصر سے نیکی اور احسان کا سلوک کرنا کیونکہ بوجہ ہماری ماں ہاجرہ کے (جو مصری تھیں) تم پر اہل مصر کا خاص حق ہے۔ بہر حال حضرت ابراہیمؑ کے حضرت باجرہ اور اسٹیل کو مکہ کی دیران آبادی میں آباد کر کے واپس چلے جانے پر ایک غیبی چشمہ کا وجود ظہور میں آیا اور اس کے بعد اس چشمہ کی وجہ سے جو اسلامی تاریخ میں چاہ تو مزم کے نام سے مشہور ہے وادی بکتہ میں اور لوگ بھی آباد ہونے لگے اور مکہ کی آبادی شروع ہوئی۔ لکھا ہے کہ اس جگہ سب سے پہلے آباد ہونے والا قبیلہ جرہم تھا جو بنو قحطان کی ایک شاخ تھا۔ یہ قبیلہ مین سے آیا تھا اور پہلے وادی بکتہ سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ لیکن جب اُن کو مزم کے وجود سے اطلاع ہوئی تو ان کے تیس

مضاض بن عمرو جبرہمی نے حضرت ہاجرہ سے چشمہ کے پاس ڈیرہ لگانے کی اجازت چاہی۔ حضرت ہاجرہ نے خوشی اجازت دیدی اور اس طرح قیدہ جبرہم کے لوگ دادی بکتہ میں آباد ہو گئے۔

**اسماعیل ذبیح اللہ** حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو دادی بکتہ میں آباد کرنے کے بعد حضرت ابراہیم

گاہے گاہے کہہ آیا کرتے تھے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ جب حضرت اسماعیل کی عمر کچھ بڑی ہوئی یعنی بعض روایات کی رو سے وہ تیرہ سال کے ہو گئے تو حضرت ابراہیم نے ایک خواب دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ چونکہ ابھی تک حضرت ابراہیم پر یہ تعلیم نازل نہیں ہوئی تھی کہ انسانی قربانی ظاہری صورت میں جائز نہیں ہے اور ملک میں انسانی قربانی کا دستور تھا، اس لیے حضرت ابراہیم نے اپنی اس خواب کو ظاہر میں پورا کرنا چاہا اور حضرت اسماعیل سے اس کا ذکر کیا۔ اسماعیل نے کہا کہ آپ بیشک اپنی خواب کو پورا کریں، میں خدا کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل کو باہر لے گئے۔ اور اسماعیل کو زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور دفا دار بیٹے نے خاموشی اور خوشی کے ساتھ اپنی گردن باپ کے سامنے رکھ دی۔ قریب تھا کہ حضرت ابراہیم چھری چلا دیتے، مگر اُس وقت خدائی فرشتہ نے آواز دی کہ لمے ابراہیم! تو نے اپنی طرف سے اپنی خواب کو پورا کر دیا۔ اب اسماعیل کو چھوڑ اور اس کی جگہ ایک مینڈھا لے کر خدا کے راستے میں قربان کر دے کہ ظاہر میں ہی اس کی علامت ہے لیکن خواب کا جو حقیقی منشا ہے وہ اور طرح پورا ہو گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا اور اس کی یادگار میں مسلمانوں میں حج کے موقع پر قسربانی کی رسم قائم ہوئی۔

اس خواب کے حقیقی منشا کے متعلق اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک صحیح معنی یہی ہیں کہ ذبح کرنے سے خدا کے رستے میں وقف کرنا مراد ہے جو گویا دنیوی لحاظ سے زندگی کا خاتمہ کر دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل کو بکتہ میں آباد کرنے کی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ کعبۃ اہلک کی تعمیر ہو اور اس کی خدمت اور توحید کے قیام کے لیے حضرت اسماعیل کی زندگی وقف ہو جائے اور پھر جب مردِ زمانہ سے بُت پرستی نے توحید پر قلبہ پالیا تو اسی مقدس خواب کی تعبیر میں خدا نے حضرت اسماعیل کی نسل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پیدا کیا جنہوں نے اپنے حلقہ بگوشوں کے ساتھ توحید کی اشاعت کے لیے اپنی زندگیوں کو حقیقی معنوں میں قربان کر دیا۔ اور یہی وہ ذبح عظیم یعنی عظیم الشان قربانی ہے جس کی طرف قرآن شریف میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نے اسماعیل کی ظاہری قسربانی کے بدلہ میں ایک عظیم الشان قربانی کو مقرر کر دیا اور حج کے موقع پر جانور قربان کرنے کی رسم بھی مسلمانوں میں اسی مقدس یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہے کہ انہیں خدا کے رستے میں قربان ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

## حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کے متعلق بعض اعتراضات کا جواب

اس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ بعض عیسائی مؤرخین کی طرف سے یہ

۱۔ مزاح کیا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیل کے عرب میں آباد ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل اسماعیل میں ہونا بھی ان کے نزدیک غیر مسلم ہے۔ نیز ان کا دعویٰ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جن بیٹے کو ذبح کرنا چاہا تھا وہ جیسا کہ بائبل میں بیان ہوا ہے حضرت اسحاقؑ تھے۔ نہ کہ حضرت اسماعیل۔ ان ہردو اعتراضات کا جواب مختصر طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ :

- ۱۔ حضرت اسماعیل کا عرب میں آکر آباد ہونا اور قریش مکہ کا حضرت اسماعیل کی نسل میں سے ہونا عرب کی متحدہ روایات سے قطعی طور پر ثابت ہے اور عرب کی کوئی ایک روایت بھی اس کے خلاف نہیں پائی جاتی۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد۔ اور چونکہ کسی قوم کی تاریخ کے متعلق سب سے مقدم شہادت اس کی اپنی صحیح روایات ہی ہوتی ہیں، اس لیے مذکورہ بالا شہادت کے ہوتے ہوئے کوئی غیر متعصب شخص اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت اسماعیل عرب میں آکر آباد ہوئے اور قریش کا قبیلہ آپ ہی کی مبارک نسل میں سے تھا۔
- ۲۔ قرآن شریف نے بھی جس کی تاریخی اسناد دوست و دشمن میں مسلم ہے قریش کو نسل ابراہیم میں شمار کیا ہے۔

۳۔ خود بائبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت سارہ کی ناراضگی کی وجہ سے حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ وطن سے بے وطن ہوئے تھے۔ اب اگر حجاز وہ ملک نہیں جہاں وہ آکر آباد ہوئے تو پھر وہ جگہ کونسی ہے جہاں ان کی نسل پائی جاتی ہے۔

۴۔ بائبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ایسی جگہ جا کر آباد ہوئے تھے جو غیر آباد اور بیابان جگہ تھی۔ جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی اور نہ کوئی آبادی تھی۔ اور یہ نقشہ مکہ کی دادِ خیز ذی زرع پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ پھر بائبل سے ہی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل فاران میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ اور قطع نظر اس کے کہ فاران کے معنی ہی ایک غیر آباد بنجر جگہ کے ہیں۔ عرب کے جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں کہ فاران مکہ یا حجاز کی پہاڑیوں کا

۱۔ دیکھو بخاری و مسلم و طبری و ابن ہشام و ابن سعد و زرقانی و غیرہ، ۲۔ قرآن شریف سورۃ حج آیت ۶۴ : ۷۰  
 ۳۔ پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۴ : ۷۰ پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۶ : ۷۰ پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۷ : ۷۰  
 ۴۔ فصل الخطاب جلد ۲ صفحہ ۳۸

نام ہے۔ اور جو لوگ عرب میں ہو آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان دادی فاطمہ میں جو پتھے گلِ جذیریہ پتھے نظر آتے ہیں، اُن سے اگر یہ پوچھا جاوے کہ یہ پھول کہاں سے لائے گئے ہیں تو اُن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ مِنْ تَبْرِیْقَةِ فَارَانَ یعنی دشتِ فاران سے۔ اس شہادت کے ہوتے ہوئے اگر فاران کسی اور جگہ کا بھی نام ہے تو بیشک ہو لیکن جبکہ حجاز میں بھی فاران کا ہونا ثابت ہے تو لامحالہ نسلِ اسمعیل سے تعلق رکھنے والا فاران یہی حجاز والا فاران سمجھا جائے گا نہ کہ کوئی اور۔

۶۔ بائبل میں یہ بھی مذکور ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسمعیل کی نسل حویہ سے بیکر شوریٹ بستی تھی۔ اور خود عیسائی محققین نے تسلیم کیا ہے کہ حویہ اور شوریٹ سے عرب کی مقابل کی اطراف مراد ہیں۔

۷۔ بائبل میں حضرت اسمعیل کے متعلق وحشی یعنی جنگل میں رہنے والے کے الفاظ بھی آتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ بات بطور پیش گوئی کے مذکور ہے کہ اسمعیل جنگل میں بنے والا ہو گا۔ اور یہ بات حضرت اسمعیل کے مکہ میں آباد ہونے کے ساتھ بالکل مطابقت رکھتی ہے۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ خود لفظ عرب کے معنی بھی جنگل اور ویران علاقہ کے ہیں۔ جیسا کہ اعراب کے لفظ سے ظاہر ہے جس کے معنی جنگل کے رہنے والوں کے ہیں۔

۸۔ سیحیوں کے مشہور امام پروسس یعنی سینٹ پال نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت اسمعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ کو عرب سے نسبت ہے۔

۹۔ قیدار جو سکہ طور پر حضرت اسمعیل کی اولاد سے تھا۔ اس کے متعلق بائبل سے یہ بات ثابت ہے کہ اُس کی نسل عرب میں آباد تھی۔

۱۰۔ اسی قیدار بن اسمعیل کے متعلق انسائیکلو پیڈیا میں یہ الفاظ درج ہیں کہ وہ اسمعیل کا بیٹا تھا، جس کی نسل عرب کے جنوبی حصہ میں آباد ہوئی۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات دونوں روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت اسمعیل عرب میں آباد ہوئے اور عرب کی آبادی کا ایک حصہ انہی کی نسل سے ہے اور جب یہ ثابت ہے تو عرب کی ان زبردست روایات

۱۔ بحکم البلدان جلد ۶ صفحہ ۳۲۳ ۲۔ فصل الخطاب جلد ۲ صفحہ ۳۸ ۳۔ پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۸

۴۔ انسائیکلو پیڈیا بلیکا مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء بحوالہ دیویلو آف ریلیجز جلد ۲۳ ۵۔ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲

۶۔ تاج و اقرب الموارد وغیرہ ۷۔ غلطیوں باب ۴ آیت ۲۲ تا ۲۵ ۸۔ یسعیاہ باب ۴۱ آیت ۱۳ تا ۱۸

۹۔ انسائیکلو پیڈیا بلیکا مطبوعہ لندن ۱۸۹۲ء بحوالہ دیویلو آف ریلیجز جلد ۲۳



کو جن سے قریش کا حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہونا ظاہر ہوتا ہے رد کرنا ہرگز انصاف پر مبنی نہیں سمجھا جاسکتا۔  
 دوسرا سوال یہ ہے کہ ذبیح کون تھا؟ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں سے کس کو خدا کی راہ میں قربان کر دینے کا تہیہ کیا تھا۔ سو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سوال کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔  
 کیونکہ خواہ حضرت اسماعیلؑ ذبیح ثابت ہوں یا اسحاقؑ اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعاوی پر یا اسلام کے کسی بنیادی اصول پر اثر نہیں پڑتا، مگر ایک تاریخی واقعہ کے لحاظ سے یہ بات ضرور قابل تہمتی ہے کہ ذبیح کون ہے؟  
 سو جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ہماری رائے میں درست بات یہی ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ تھے۔ ذکر حضرت اسحاقؑ بے شک بائبل میں حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بیان کیا گیا ہے مگر اول تو بائبل کی تاریخی حیثیت زیادہ معتد نہیں ہے۔ دوسرے خود بائبل ہی کے بیان سے یہ دعویٰ قطعی ثابت ہوتا ہے اور اسلامی روایات کی شہادت مزید برآں ہے۔ بہر حال اس مسئلہ میں ہمارے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ نے ہم سے نیک اور صالح اولاد کی دعا کی اور ہم نے اُسے ایک عظیم بیٹے کی بشارت دی۔ اور جب وہ لڑکا کچھ بڑا ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے اس بیٹے کو ذبیح کر رہے ہیں۔ اس پر ابراہیمؑ اپنے اس بیٹے کو خدا کی راہ میں جہانی طور پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو گئے اور بیٹے نے بھی خدائی حکم کے سامنے تسلیمِ غم کر دیا، لیکن میں اس وقت جبکہ ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو گرا کر اس کے گلے پر چھری پھیرنے لگے خدائی فرشتہ نے انہیں اس فعل سے روک دیا۔ الخ۔ اور پھر اس کے بعد آگے چل کر آتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو اسحقؑ کی بشارت دی۔ اس بیان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ جس بیٹے کے ذبیح کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ تیار ہوتے تھے وہ اسماعیلؑ تھے نہ کہ اسحقؑ۔ کیونکہ قرآن شریف نے حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے کا ذکر کر کے اُس کے ساتھ ذبیح کے واقعہ کو جوڑا ہے اور اسحقؑ کی پیدائش کا اس کے بعد ذکر کیا ہے حالانکہ اگر حضرت اسحقؑ ذبیح ہوتے تو ذبیح کا ذکر اسحقؑ کے ساتھ ملا کر ہونا چاہیے تھا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے کے ساتھ۔

(۲) قرآن شریف میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ خدا نے جب حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی تو اس کے ساتھ ہی اسحاقؑ کے بیٹے یعقوبؑ کی بھی بشارت دی یعنی ایک ہی وقت میں بیٹے اور پوتے دونوں کی بشارت دی گئی۔ اب جب شروع سے ہی حضرت اسحاقؑ کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوبؑ کی بشارت بھی موجود تھی تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اسحاقؑ کو جہانی طور پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے جبکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی زندگی کم از کم اس وقت تک مقدر ہے کہ اس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہو۔

(۳) حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اَنَا ابْنُ الذَّبِيحَيْنِ یعنی میں دو



ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ یعنی ایک حضرت اسماعیل اور دوسرے عبداللہ بن عبدالمطلب جنہیں آپ کے دادا نے ایک نذر کے نتیجہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور وہ اس کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس حدیث سے کم از کم اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک محقق بات یہی تھی کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔

(۴) بائبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں یہ طریق رائج تھا کہ سب سے بڑا بچہ خدا کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا۔ اور چونکہ وقف بھی روحانی رنگ میں ذبح کا ہم معنی ہے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اس رسم کے پائے جانے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے، کیونکہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے لڑکے تھے اور اسحق چھوٹے۔

(۵) ذبح کے متعلق قومی رنگ میں جتنی بھی رسوم تھیں وہ سب عربوں میں پائی جاتی تھیں اور اب بھی پائی جاتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی بنو اسرائیل میں نہیں پائی جاتی جو اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے نہ کہ حضرت اسحق۔ کیونکہ اگر ذبیح حضرت اسحق ہوتے تو یہ رسوم بنو اسماعیل کی بجائے بنو اسرائیل میں پائی جاتی چاہیے تھیں، مگر معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ مثلاً بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی خدا کے لیے وقف ہو جو ذبح کا حقیقی مفہوم ہے وہ بال منڈوانے سے باز رہتے تھے۔ مگر باوجود اس کے کہ بائبل حضرت اسحق کے ذبح ہونے کی مدعی ہے۔ بنو اسرائیل میں ایسی کوئی رسم نہیں پائی جاتی جو اس قربانی کی یادگار بھی جاسکے۔ لیکن اس کے بالمقابل عربوں میں جو نسل اسماعیل میں سے ہونے کے دعویدار ہیں یہ رسم اسلام سے پہلے بھی پائی جاتی تھی اور اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ حج کے موقع پر قربانی سے پہلے عربوں میں بال منڈانے یا کترانے سے باز رہنے کا دستور تھا جو اسلام میں بھی قائم رہا۔ اسی طرح عربوں میں حج کے موقع پر جانوروں کی قربانی کا دستور تھا، جو اس منڈے کی قربانی کی یادگار تھا جو حضرت اسماعیل کے بدلے میں قربان کیا گیا۔ اور یہ دستور اسلام میں بھی قائم رہا۔ مگر بنو اسرائیل میں یہ رسم کہیں نظر نہیں آتی۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قربانی کا ورثہ حضرت اسماعیل کی اولاد نے پایا ہے نہ کہ حضرت اسحق کی اولاد نے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم نے یہ ورثہ پایا ہے اسی کا جدِ اعلیٰ ذبیح سمجھا جانا چاہیے۔

(۶) بائبل میں مقام ذبح یعنی قربان گاہ ”موریا“ کو ظاہر کیا گیا ہے، مگر یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ جگہ کہاں واقع ہے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ یہ ایک پہاڑی جگہ ہے۔ بائبل میں اس جگہ کے متعلق تصریح نہ ہونے کی وجہ سے خود یہودی اور مسیحی علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ جگہ کہاں اور کونسی ہے، لیکن فور کریں تو متحدہ کے پاس کی پہاڑی

”مروہ“ کے ساتھ یہ نام اور یہ تشریح بالکل منطبق ہو جاتی ہے۔ اور نام میں جو خیف سافرق ہے وہ زبانوں کے اختلاف کی بنا پر قابل لحاظ نہیں ہے۔ بیشک یہ درست ہے کہ اب حج کے موقع پر قربانی مروہ کے پاس نہیں ہوتی بلکہ منیٰ میں ہوتی ہے لیکن اول تو منیٰ اور مروہ ایک دوسرے کے پاس ہی ہیں۔ دوسرے حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصل قربانی گاہ مروہ ہی تھی۔ مگر بعد میں حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے آبادی سے فاصلہ پر مقرر کر دی گئی۔

(۷) بائبل نے باوجود اس کے کہ ذبیح حضرت اسحق کو بیان کیا ہے اس واقعہ کی تفصیل میں ایسی باتیں درج کی ہیں کہ وہ حضرت اسحق پر نہیں بلکہ حضرت اسماعیل پر صادق آتی ہیں۔ قربانی کا ذکر بائبل میں کتاب پیدائش میں کیا گیا ہے مگر اس بیان میں جہاں اسحق کو ذبیح کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی انہیں حضرت ابراہیم کا اکلوتا بیٹا کہہ کر پکارا گیا ہے، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسحق کسی صورت میں بھی حضرت ابراہیم کے اکلوتے بیٹے نہیں کہلا سکتے بلکہ اکلوتا کہلانے کا حق اگر کسی کے لیے سمجھا جاسکتا ہے تو وہ حضرت اسماعیل ہیں۔ کیونکہ حضرت اسماعیل تیرہ چودہ سال کی عمر تک حقیقتہً حضرت ابراہیم کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مگر حضرت اسحق کو کبھی بھی یہ پوزیشن حاصل نہیں ہوئی۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ابتداءً بائبل میں بھی اسماعیل کو ہی ذبیح بیان کیا گیا تھا مگر بعد میں قومی رقابت کے جذبات سے متاثر ہو کر یہودی علماء نے اس نام کو بدل کر اسحاق کر دیا مگر تفصیلات میں بعض ایسی باتیں باقی رہ گئیں جو اس تحریف کو بے نقاب کر رہی ہیں۔ اسی طرح بائبل کے اس بیان میں یہ مذکور ہے کہ بیٹے کے ذبیح سے روک دینے کے بعد خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے فرمایا کہ ”تو نے میرے رستے میں قربانی کے لیے اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا اب میں تیری اولاد میں بہت برکت ڈال گا اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی“ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ذبیح وہ روکا ہے جس کی نسل میں وہ عظیم الشان نبی پیدا کیا جانا مقدر تھا جو بلا امتیاز قوم و ملت ساری دنیا کے لیے مبعوث ہونے والا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں آکر پورا ہوا، کیونکہ آپ ہی وہ نبی ہیں جو ساری دنیا کے لیے مبعوث ہوئے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ سے پہلے نبی صرف خاص خاص قوموں کی طرف آتے تھے مگر میں سب اقوام عالم کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اس کے مقابل پر بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی حضرت یسح نامی کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں کہ ”میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا تھا اور یہ کہ میں نچوں (یعنی بنی اسرائیل) کی روٹی کھوں (یعنی غیر قوموں) کے آگے نہیں ڈال سکتا۔“ اسرائیلی نبیوں کی یہ محدود رسالت اور اس کے مقابل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر دعوت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ساری

۱۔ موطا امام مالک ۱: ۱۰۰ پیدائش باب ۲۲ ۲۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب جُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا ۳۔

۴۔ متی باب ۱۵ آیت ۲۴ ۵۔ مرقس باب ۱۰ آیت ۲۴ ۶۔

قوموں کو برکت دینے کا وعدہ جو بیٹے کے ذبح کے انعام میں حضرت ابراہیمؑ سے کیا گیا وہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں پورا ہوا۔ اور یہ کہ ذبح حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ اسحاق۔

اس بحث کے ختم کرنے سے قبل ایک اور اعتراض کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو بعض متعصب سچیوں کی طرف سے حضرت ہاجرہ کے متعلق کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت ہاجرہ محض ایک لونڈی تھیں اور حضرت ابراہیمؑ کی بیوی حضرت سارہ تھیں اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لونڈی کی اولاد سے ہیں۔ اس اعتراض کے متعلق پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اعتراض محض حد اور حد اوت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ورنہ ایک ہی منہ سے ایک ہی وقت میں یہ دو اعتراض نہیں نکل سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نسل اسماعیل میں سے نہیں ہیں اور یہ کہ آپ ایک لونڈی کی نسل سے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لیکن چونکہ غرض یہ ہے کہ اگر ایک اعتراض نشانہ پر نہ بیٹھے، تو دوسرا اس کی جگہ لینے کے لیے تیار ہو۔ اس لیے ایک ہی سانس سے یہ گرم دوسرا ہوا نکالی جا رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر دو اعتراض غلط اور غیر موثر ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسل اسماعیل میں سے ہونے کی بحث تو اوپر گزر چکی ہے اور حضرت ہاجرہ کے متعلق اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اول تو کسی یقینی دلیل سے ان کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ عربی نسخوں میں ان کے متعلق عموماً جباریۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی لونڈی اور لڑکی ہر دو کے ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ہاجرہ کبھی غلامی کی قید میں رہی تھیں تو پھر بھی اس بات سے کسی کو شمار نہیں ہو سکتا کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اپنے عقد میں لے لیا تو انہیں بیوی کے طور پر رکھا تھا نہ کہ لونڈی کے طور پر۔ اور اگر محض ایک عرصہ کے لیے قید غلامی میں رہنا قابل اعتراض ہے تو ہمارے معترضین کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس داغ سے حضرت سارہ بھی محفوظ نہیں رہیں۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں تشریف لے گئے تو مصر کے بادشاہ نے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیمؑ سے چھین کر اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا اور پھر انہیں کچھ عرصہ کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی۔ اور بنو اسرائیل کے جد امجد حضرت یوسف بن یعقوب کا مصر میں غلام بن کر فروخت ہونا اور ایک عرصہ دراز تک اسی حالت میں زندگی گزارنا تو ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس سے سکولوں کے کم سن بچے بھی واقف ہیں۔ پس اگر حضرت ہاجرہ کی زندگی کا کوئی حصہ قید غلامی میں بسر بھی ہوا تو یہ کوئی طعن کی بات نہیں ہے۔ لیکن سچی یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ہی غیر ثابت ہے بلکہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب مصر کا بادشاہ اپنے فعل شنیع کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی سارہ سے مرعوب ہوا تو اس نے نہ صرف حضرت سارہ کو آزاد کر دیا بلکہ اپنے حرم سے ایک شریف اور ہونہار لڑکی بھی حضرت سارہ اور حضرت ابراہیمؑ کے پیش کی اور وہ لڑکی بھی حضرت ہاجرہ ہیں۔ بائبل اور اسلامی روایات ہر دو میں جس طرح شاہ مصر کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ سے مرعوب ہونا اور ان کی بزرگی اور قوت

رُوحانی کا قائل ہونا بیان ہوا ہے۔ اس سے یہ ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ ہاجرہ خود شاہ مصر کے قریبی عزیزوں میں سے ایک لڑکی ہوں۔ جو اس نے اپنے اس فعل کی تلافی میں جو حضرت سارہ کے بارے میں اُس سے سرزد ہوا حضرت ابراہیم اور سارہ کی خدمت میں پیش کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ بعد میں لونڈی قرار دے دی گئی۔ یہ صرف قیاس ہی نہیں ہے بلکہ بعض پرانے محققین نے اسے بطور ایک حقیقت کے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی عالم جس کا نام دہشلوم ہے اپنی تورات کی تفسیر میں یہاں تک لکھتا ہے کہ ہاجرہ خود شاہ مصر کی اپنی لڑکی تھی جو اس نے سارہ کی کرامت دیکھ کر اس کی خدمت کے لیے پیش کر دی تھی ۛ

الغرض لونڈی ہونے کا الزام بالکل غلط اور نادرست ہے، لیکن اگر بالفرض غلامی ثابت بھی ہو تو یقیناً ایسی غلامی کسی داغ کا باعث نہیں ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو جبراً اس کی آزادی سے محروم کر کے قید میں ڈال لیا جائے جیسا کہ عموماً اس زمانہ میں ہوتا تھا۔ اگر یہی غلامی ہے تو دنیا کی کوئی شریف اور آزاد قوم بھی اس غلامی کے داغ سے محفوظ نظر نہیں آتی۔ خود بنی اسرائیل کی قوم ایک بڑے بڑے عرصہ تک یعنی ابتداء مصر میں اور پھر بابل میں غلامی کی قید میں محبوس رہی ہے۔ مگر یقیناً اس وجہ سے بنی اسرائیل کے نبی اور بادشاہ غلام زادے نہیں کہلا سکتے اور نہ ہی حضرت سارہ کا شاہ مصر کے حرم میں عارضی طور پر محبوس رہنا یا حضرت یوسف کا عزیز مصر کے گھر میں بطور غلام کے زندگی بسر کرنا کسی اسرائیلی فرزند کے لیے باعث طعن سمجھا جاسکتا ہے۔ فافہم ۛ

اس ضمنی مگر ضروری بحث کے بعد ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے **تعمیر کعبہ** کہ حضرت ابراہیم نے خدائی حکم کے ماتحت حضرت ہاجرہ اور ان کے فرزند دہشلوم کو مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں لا کر آباد کیا۔ اور پھر واپس تشریف لے گئے۔ جب حضرت ابراہیم عرب میں دوبارہ سہ بارہ تشریف لائے تو حضرت ہاجرہ فوت ہو چکی تھیں۔ اور اتفاق سے دونوں دفعہ حضرت اسماعیل بھی کہیں باہر گئے ہوتے تھے اور اس وجہ سے باپ بیٹے کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس پر حضرت ابراہیم چوتھی دفعہ پھر عرب میں تشریف لائے اور اس دفعہ دونوں نے مل کر مکہ میں ایک عبادت خانہ کی تعمیر شروع کی۔ یہ عبادت خانہ دراصل بہت پرانا تھا۔ مگر اس کے نشان مرث چکے تھے۔ اور حضرت ابراہیم نے خدا سے علم پاکر اسے نئے بہرے سے تعمیر کرنے کی تجویز کی تھی۔ حضرت اسماعیل تعمیر کے کام میں آپ کے مددگار تھے اور آپ کو پتھر لا کر دیتے تھے۔ جب دیواریں کچھ اونچی ہو گئیں تو حضرت ابراہیم نے ایک خاص پتھر لیکر کعبہ کے ایک کونہ میں نصب کیا تاکہ وہ لوگوں کے لیے بطور نشان کے ہو کہ بیت اللہ کا طواف یہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ حجر اسود ہے جسے حج میں طواف کے وقت منہ سے یا ہاتھ کے اشارہ سے بوسہ دیتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حجر اسود کوئی بالذات مقدس چیز



نہیں ہے۔ اور نہ ہی طواف کے وقت اسے بوسہ دینا کسی طرح شریک سمجھا جاسکتا ہے بلکہ وہ محض علامت کے طور پر ہے اور اصل تقدس صرف ان پاک روایات کو حاصل ہے جو خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، تو آپؐ نے حجر اسود کی طرف مہذبہ کر کے فرمایا کہ اے پتھر میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے اور تجھے نفع یا نقصان کی کوئی طاقت حاصل نہیں ہے۔ اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے ہرگز بوسہ نہ دیتا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ طواف میں صرف حجر اسود اسے کونے کو ہی بوسہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ واسے دوسرے کونے کو بھی بوسہ دیا جاتا ہے اور باقی دو کونوں کو بوسہ دینا اس لیے ترک کیا جاتا ہے کہ بوجہ جیلم کی جگہ چھوٹ جانے کے وہ اپنی اصلی جگہ پر قائم نہیں ہے۔ اس طرح بھی حجر اسود کی کوئی خصوصیت نہیں رہتی۔ غرض حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بل کر ان گھڑت پتھروں کا ایک بے پھت چوکر کو مٹا تیار کیا جس کی بلندی نو ہاتھ تھی اور طول ۳۲ ہاتھ تھا اور عرض ۲۲ ہاتھ تھی یہی خانہ کعبہ ہے جو آج مرجع خلافت ہے۔

### دُعائے خلیل قرآن شریف میں اس تیسرے ذکر ان الفاظ میں آتا ہے:

إِنَّا أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِكَابَّةٍ مُّبَارَكَةٍ وَهِيَ أَلَمْلَمٌ مِّنَ اللَّيْلِ  
وَرَأَيْتُ فِيهَا رِجَالًا لَّهُمْ أَجْنَادٌ مِّنَ الْبَيْتِ وَأَسْمِعِلُ مَا رَكِبْنَا فَتَقَبَّلْنَا مِنَّا  
إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا  
أُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ مَا دَرَأَيْنَا مِنَّا سَكَنًا وَثَبَّ عَلَيْنَا إِمَّاكَ أَنتَ الْغَوَّابُ الرَّحِيمُ  
رَبَّنَا وَالْقُدْسَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ  
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

” بیشک پہلا گھر جو لوگوں کے فائدہ کی غرض سے خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو دادی بکتہ میں ہے جو برکت دیا گیا ہے اور ہدایت کا باعث بننے والا ہے سارے جہان کے لیے۔ اور یاد کر جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اُس وقت وہ اللہ سے دعائیں کرتے تھے کہ اے ہمارے رب تو ہماری طرف سے اس خدمت کو قبول کر۔ بیشک تو بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تو ہم دونوں کو اپنے فرمانبردار بندے بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرمانبردار

جماعت پیدا کر اور ہم کو عبادت اور حج کے طریقے بتا اور ہماری طرف رجوع برحمت ہو۔ بیشک تو رحمت کے ساتھ رجوع کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ اے ہمارے رب تو مبعوث کچھ یوں میں اپنا ایک رسول انہی میں سے جو تیری آیات اُن کو سنائے اور انکو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک و صاف کرے۔ بیشک تو غالب اور حکیم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی دروندانہ دعا کا نتیجہ تھی، چنانچہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اَنَا دُمُوءُ اِبْنِ اِهِيْمَ يَعْنِيْ بَنِيْ اِبْرَاهِيْمَ كِي دُعَا كَا ثَمَرُهُ هُوَ اِي۔

**اعلان حج** جب کعبہ کی تعمیر مکمل ہو چکی تو ذات باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کو ارشاد ہوا:

”وَحَلِّقْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ النَّاسِ اِيْمَانًا وَتَقَاتِيْمًا وَالتَّزَكِّيَّ السَّجُوْدَ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَا اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحْمٰنِيْنَ عَلٰى كُلِّ صَا مِرْيَاتِيْنَا مِنْ كُلِّ فُجْعَةٍ عَيْنِيْ لَكَ“  
میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے پاک و صاف رکھ۔ اور اعلان کر لوگوں میں کہ وہ اس کے حج کے لیے آئیں۔ وہ آئیں گے تیرے پاس پیدل چل کر اور ڈوبی ڈوبی یعنی لمبے لمبے سفر کرنے والی اڈنیوں پر سوار ہو کر جو ہر دور دراز رستے سے آئیں گی۔

یہ اعلان کعبہ اشد کے مرکز بننے کی بنیاد ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد جلدی ہی کعبہ تمام عرب کا مذہبی مرکز بن گیا اور عرب کے دور دراز حصوں سے اُس کے حج کے لیے لوگ آنے لگے۔

**تولیت کعبہ** یہ بتایا جا چکا ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے آباد ہونے والا قبیلہ جرمم الثانیہ تھا ان کے رئیس مضا بن عمرو کی لڑکی سے حضرت اسماعیلؑ کی شادی ہوئی جس سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں سے بڑے کا نام نابت اور اُس سے چھوٹے کا نام قیس دار تھا۔ اہل عرب زیادہ تر قیدار بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔ اور قریش بھی قیدار کی نسل سے ہیں۔ جب تک حضرت اسماعیلؑ زندہ رہے، وہ خود کعبہ کے متولی تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے نابت متولی ہوئے۔ جب یہ بھی وفات پا گئے تو کعبہ کی تولیت نابت کے نانا مضا بن عمرو کے پاس آگئی اور پھر ایک بڑے لمبے عرصہ تک قبیلہ جرمم ہی کے پاس رہی۔

مگر ایک طویل زمانہ کے بعد بنو قحطان کی ایک شاخ قبیلہ خزاعہ نے قبیلہ جرمم پر غلبہ پالیا اور کعبہ کی تولیت اُن سے چھین لی۔ قبیلہ جرمم کو مکہ سے نکلے جانے کا سخت صدمہ ہوا اور وہ یہاں سے نکل کر یثرب کی طرف



ہجرت کر گئے لیکن مکہ سے نکلنے سے پہلے اُن کے رئیس عمرو بن الحرث نے اپنے قومی اموال کو چاہہ زمزم میں ڈال کر اُسے اُدپر سے بند کر دیا اور اس طرح جب قبیلہ خزاعہ کے لوگ مکہ میں داخل ہوئے تو یہ مقدس چشمہ غائب تھا اور پھر یہ سینکڑوں سال تک بند رہا حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے اس کا نشان پتہ لگا کر اُسے پھر جاری کیا۔ بہر حال قبیلہ جرحم کے بعد قبیلہ خزاعہ مکہ کا حاکم اور کعبہ کا متولی ہوا۔ کعبہ میں بُت پرستی کی آمد اسی قبیلہ خزاعہ کے رئیس عمرو بن لُحی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ جسے شام میں بُت پرستوں کو بُت پوجتے دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کعبہ میں بھی ایسے بُت ہوں اور لوگ انہیں پوجیں۔ چنانچہ اس نے چند بُت شام سے لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے۔ یہ چونکہ اس وقت کعبہ عرب کا مذہبی مرکز بن چکا تھا اور لوگ ہر سال یہاں حج کے واسطے جمع ہوتے تھے اس لیے اس ذریعہ سے تمام ملک میں بُت پرستی پھیل گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے عرب کے کسی حصہ میں بُت پرستی نہ تھی بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ کعبہ میں بتوں کی آمد عرب کے ہر حصہ میں بُت پرستی کے پھیل جانے اور مستحکم ہو جانے کا بڑا باعث ہوئی اچنانچہ اس کے بعد آہستہ آہستہ صرف کعبہ میں بتوں کی تعداد ۳۶۰ تک پہنچ گئی۔ ایک بڑے عرصہ کے بعد کعبہ کی تولیت قبیلہ خزاعہ کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔ اس کی وجہ لکھتے ہوئے مؤرخین ایک عجیب قصہ بیان کرتے ہیں جس کا یہاں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قہر بن مالک کی اولاد یعنی قبیلہ قریش میں پانچویں صدی مسوی کے نصف کے قریب ایک شخص گذرا ہے جس کا نام قُصّی بن کلاب تھا۔ یہ بہت سجدار شخص تھا اور نوجوانی کے ایام میں ہی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت اس کا حیل کی اولاد کا ورثہ ہے جو کسی اور قوم کے ہاتھ میں نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مکہ آیا اور آہستہ آہستہ رسوخ پیدا کر کے حلیل بن حبشیہ خزاعی کی لڑکی جثی سے شادی کر لی جو اس زمانہ میں قبیلہ خزاعہ کا رئیس تھا۔ اور اس وقت اُسی کے ہاتھ میں کعبہ کی تولیت تھی۔ حلیل جب مرنے لگا تو اُس نے یہ وصیت کی کہ میرے بعد کعبہ کی تولیت میری لڑکی جثی زوجہ قُصّی کے سپرد ہو۔ اس طرح کعبہ کی تولیت عملاً قُصّی کے ہاتھ میں آ گئی۔ مگر قُصّی کا دل صرف ایک خزانہ کی حیثیت پر قنطاری نہیں پاسکتا تھا بلکہ وہ ایک اصل حقدار کے طور پر مکہ کا حاکم اور کعبہ کا متولی بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ اپنا حق جمانا شروع کیا۔ جب قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے اور لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ اُدھر قُصّی نے بھی اپنی قوم کے لوگ جمع کر لیے اور دونوں قبیلوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ آخر اس بات پر صلح ہوئی کہ کسی شخص کو ثالث مقرر کیا جائے۔ جو فیصلہ یہ ثالث کرے اُسے فریقین قبول کر لیں۔ چنانچہ ایک شخص عمرو بن عوف ثالث مقرر ہوا جس نے یہ فیصلہ دیا کہ کعبہ کی تولیت کا اصل حقدار قُصّی ہے۔ اور یہ کہ جتنے آدمی

قبیلہ خزاعہ کے مارے گئے ہیں ان کا کوئی فدیہ نہیں لیکن قصتی کے تمام مقتولوں کا فدیہ قبیلہ خزاعہ ادا کرے۔ اس طرح ایک بڑے بے عرصہ کے بعد کعبہ کی تولیت پھر بنو اسماعیل میں آگئی۔ اور چونکہ کعبہ کی تولیت دنیوی جاہ و اقتدار کا ذریعہ بھی تھی کیونکہ وہ قبیلہ جس کے ہاتھ میں یہ تولیت ہوتی تھی تمام عرب میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے قریش اس ذریعہ سے بہت معزز و مکرم ہو گئے۔

**کعبہ کی دوبارہ سہ بارہ تعمیر** ہر دنیوی چیز کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ لگا ہوا ہے؛ چنانچہ کعبہ بھی حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کے بعد کئی دفعہ گرا اور کئی دفعہ بنا۔ بعض

اوقات کسی سیلاب کے زور سے جو مکہ کی وادی میں کبھی کبھی آجاتا تھا اس کی عمارت کو نقصان پہنچ جاتا تھا۔ اور اس کے متواتر اسے گرا کر پھر تعمیر کرتے تھے اور بعض اوقات آگ یا کسی اور حادثہ کے نتیجہ میں ایسا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہر اس قوم کو کعبہ کی تعمیر کرنی پڑی جس کے ہاتھ میں اس کی تولیت گئی۔ بنو جرہم، خزاعہ اور قریش بھی نے اپنے اپنے وقت میں اس کی تعمیر کی۔ قصتی نے بھی ایک دفعہ اس کی تعمیر کی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور انھوں نے اس کے اندر کچھ خرمیاست بھی کیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کی بلندی کو زیادہ کر کے اُس کے اوپر پھت ڈالی اور اس کے اندر چھ ستون بنائے اور پھت میں ایک روشندان بنایا۔ اور کعبہ کے دروازے کو اونچا کر دیا۔ مگر چونکہ ان کے پاس سامان تھوڑا تھا اس لیے وہ کعبہ کو اس کی اصل ابراہیمی بنیادوں پر کھرانہ کر سکے، بلکہ انہوں نے ایک طرف کو قریشیاساٹ ہاتھ جگہ چھوڑ دی۔ اس چھوڑے ہوئے حصہ کو حطیم یا حجر کہتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کعبہ کا حصہ ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ طواف کے وقت اس حصہ کے باہر سے ہو کر گزرنا ضروری ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عائشہ سے فرمایا کہ حطیم خانہ کعبہ کا ہی حصہ ہے اور قریش نے اسے اس لیے باہر چھوڑ دیا تھا کہ ان کے پاس خرچ نہ ہو گیا تھا اور انہوں نے کعبہ کے دروازے کو اس لیے اونچا کر دیا تھا کہ مادہ جسے چاہیں اندر آنے دیں اور جسے چاہیں روک دیں اور اسے عائشہ اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوتی اور مجھے اُن کے تزلزل کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان کی تعمیر کردہ عمارت کو گرا کر پھر اصل ابراہیمی بنیادوں پر ساری عمارت کو تعمیر کرتا اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر دیتا اور اس کے دروازہ کو نیچا کر دیتا اور اس کے موجودہ دروازے کے مقابل پر ایک اور دروازہ بھی لگواتا۔ چنانچہ اس حصہ میں جب کسی وجہ سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے جو اس وقت مکہ کے حاکم تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کو پورا کیا اور کعبہ کے اندر بجائے چھ ستونوں کے صرف تین ستون بنوائے، لیکن عبدالملک بن مروان نے جب مکہ پر غلبہ پایا تو غالباً اس خیال سے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تو اور کسی کو بھی اس کا حق نہیں ہے۔ حجاج بن یوسف کو حکم دیا

کہ عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کو اگر پھر اسی رنگ میں عمارت بنوادی جاوے جس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی، چنانچہ حجاج نے ایسا ہی کیا مگر تین ستونوں والی تبدیلی کو بحال رکھا۔

**کسوۃ کعبہ** شروع شروع میں کعبہ پر کوئی غلاف وغیرہ نہ ہوتا تھا، لیکن بعد میں یمن کے ایک بادشاہ بتع اسد نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو غلاف چڑھا رہا ہے چنانچہ اس نے کعبہ پر غلاف چڑھوا دیا۔ اس کے بعد غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہو گئی۔ چنانچہ قریش کعبہ پر ہمیشہ غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ اسلام میں بھی یہ رسم جاری رہی۔ چنانچہ آج تک کعبہ پر باقاعدہ ہر سال نیا قیمتی غلاف چڑھایا جاتا ہے اور پرانا غلاف اتار کر حاجیوں میں تقسیم یا فروخت کر دیا جاتا ہے۔ آجکل جو غلاف چڑھایا جاتا ہے وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور اس پر جگہ جگہ کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات لکھی ہوتی ہوتی ہیں۔

**حرمت کعبہ** زمانہ جاہلیت کے عربوں میں کعبہ کی عزت غالباً کچھ اس سے بھی زیادہ تھی جو مسلمانوں کے دلوں میں ہے کیونکہ وہ کعبہ کو گویا ایک قسم کا معبود سمجھتے تھے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہ چڑھاوے ایک زمین دوز خزانہ میں کعبہ اور اس کے پجاریوں اور حجاج کی ضروریات کے واسطے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ کعبہ خود تو حرم تھا ہی اس کے طفیل سے مکہ بلکہ مکہ کے آس پاس کا علاقہ بھی حرم قرار دیا گیا تھا جہاں ہر قسم کا کشت و خون ممنوع تھا اشرف حرم کی خصوصیت بھی کعبہ ہی کی وجہ سے تھی تاکہ حاجی لوگ امن کے ساتھ بغیر کسی خوف و خطر کے حج کے واسطے آجاسکیں۔ یہ بھی دستور تھا کہ جس چیز کی خاص طور پر حرمت ظاہر کرنی ہو وہ کعبہ پر آویزاں کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کی سات مشہور لٹھیں کعبہ پر آویزاں کئے جانے کی وجہ سے ہی سبع متعلقات کہلاتی ہیں۔

**کعبہ کے ارد گرد مکانات کی تعمیر** اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ قصی کے زمانہ تک کسی قوم نے کعبہ کے پاس مکان نہیں بنائے تھے بلکہ اس سے کچھ ہٹ کر عارضی گھروں اور غیموں میں رہتے تھے لیکن قصی کی تحریک سے قریش نے کعبہ کے چاروں طرف مکانات تیار کر لیے اور مکہ گویا باقاعدہ شہر ہو گیا۔ لیکن یہ مکانات کعبہ کے ساتھ ملتی نہ تھے بلکہ حاجیوں کے طواف کے واسطے کعبہ کے چاروں طرف کافی جگہ درمیان میں چھوڑ دی گئی تھی۔ یہ جگہ گویا مسجد حرام کا صحن تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس جگہ کی تنگی محسوس کی گئی اور ارد گرد کے مکانات اگر مسجد حرام کا صحن وسیع کر دیا گیا۔ کعبہ اور مسجد حرام کا نقشہ جس حالت میں کہ وہ اب ہے یہ ہے :-

(دیکھئے اگلا صفحہ)



**قریش** قریش اس قبیلہ کا نام ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور جو اس زمانہ میں مکہ میں آباد تھا۔ یہ قبیلہ عرب کی متفقہ روایات کی رو سے حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہے اور عدنانی قبائل کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قبیلہ قریش کے بانی کے متعلق روایات مختلف ہیں بعض روایات میں نصر بن کنانہ کو اس کا بانی قرار دیا گیا ہے اور بعض میں فہر بن مالک کو۔ مگر یہ اختلاف عملاً واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کیونکہ نصر بن کنانہ کے ہاں مالک بن نصر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہوا جس کی نسل چلی ہو اور اسی طرح مالک کے ہاں سوائے فہر کے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ گویا نصر کی اولاد بھی عملاً وہی ہے جو فہر کی ہے۔

قریش کی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اس قبیلہ کو قریش کا نام ایک پھل کی مشابہت میں دیا گیا تھا جو بہت بڑی ہوتی ہے اور باقی پھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ اور جسے عربی زبان میں قریش کہتے ہیں۔ گویا اس لفظ میں قریش کی طاقت اور اقتدار کی طرف اشارہ تھا، لیکن دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جب قصی نے کعبہ کی تولیت حاصل کرنے کے بعد اس قبیلہ کی مختلف شاخوں کو جمع کر کے مکہ میں آباد کیا تو اس وقت ان کا نام قریش ہوا۔ کیونکہ عربی زبان میں قریش کے روٹ میں جمع کرنے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

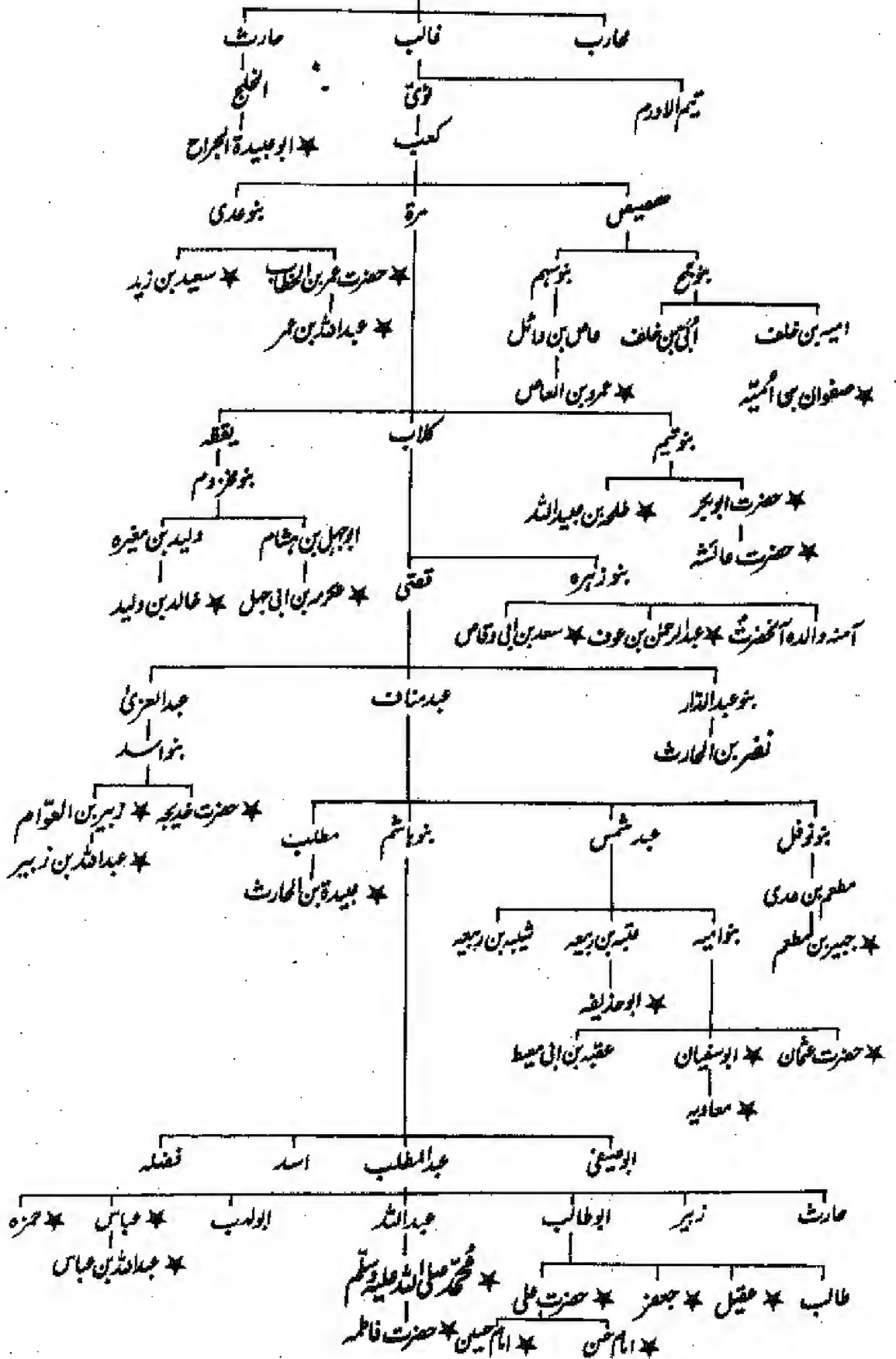
**قبیلہ قریش کی اندرونی شاخیں** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش کئی قبائل میں تقسیم ہو چکے تھے جن کا بعض اوقات آپس میں فساد بھی ہو جاتا تھا۔ گو باقاعدہ لڑائی کی نوبت کبھی نہیں پہنچی۔

ان قبائل میں سے بعض قبائل اور بعض مشہور افراد کا شجرہ درج ذیل ہے۔ اس شجرہ میں جن ناموں کے ساتھ بنو کا لفظ لگایا گیا ہے وہ ایسے لوگوں کے نام ہیں جن کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مشہور قبائل قریش خاص طور پر منسوب ہوتے تھے اور جن کے ساتھ یہ لفظ درج نہیں وہ صرف مشہور افراد ہیں۔ اور جو اسماء خطوط کے اندر درج ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مشہور لوگوں کے نام ہیں۔ ان میں سے مسلمانوں کے نام گول دائرہ میں دکھائے گئے ہیں اور کفار کے نام چوکور خطوط میں۔ لیکن چونکہ اس شجرہ میں سب نام نہیں دکھائے گئے اس لیے ایک ہی لائن میں درج شدہ ناموں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

(دیکھئے اگلا صفحہ)

## عدنان

نہر بن مالک



\* نشان شدہ افراد کو اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا



بعض افراد اس شجرہ میں ایسے نظر آئیں گے جن کی طرف کوئی قبیلہ منسوب نہیں حالانکہ وہ قریش میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ عرب کی اقوام میں یہ دستور تھا کہ جب تک تو ایک شخص کی اولاد میں اتحاد و اتفاق رہتا تھا وہ اس کی طرف منسوب ہوتی تھی لیکن جب آپس میں عداوت اور رقابت ہو جاتی تھی تو طرفین ایک واحد مورث کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے اپنے قبیلہ کے واسطے مشترک مورث کے نیچے کسی اور شہور آدمی کا نام اختیار کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قحطی کی اولاد قحطی کی طرف منسوب نہیں بلکہ ان میں سے کوئی بنو ہاشم بن گئے اور کوئی بنو امیہ اور کوئی بنو عبد الدار وغیرہ۔ حالانکہ ان میں سے کوئی شخص بھی قحطی کی سی شہرت کا نہ تھا۔

### قحطی بن کلاب

نضر بن کنانہ اور فہر بن مالک اپنے اپنے زمانہ میں بہت نامور اور صاحب اقتدار اشخاص گذرے ہیں۔ ان کے بعد پانچویں صدی مسوی میں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً سو ڈیڑھ سو سال پہلے قحطی بن کلاب نے قریش میں بہت اقتدار حاصل کیا۔ یہ شخص ایک غیر معمولی قابلیت کا مالک تھا۔ قبیلہ خزاعہ سے اس کے کعبہ کی تولیت چھین لینے کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ قحطی نے تمام قبائل قریش کو اکٹھا کر کے مکہ میں آباد کیا۔ اسی واسطے اُسے مجمع یعنی جمع کرنے والا بھی کہتے ہیں۔ مگر قحطی کا کام اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس نے اپنی قوم کی ایک باقاعدہ تنظیم کی اور مکہ میں گویا ایک جمہوری سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ قحطی نے کعبہ کی تولیت اور قبیلہ قریش کے دوسرے انتظامی کاموں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ان فرائض کی ادائیگی قریش کے مختلف قبائل کے رؤساء کے سپرد کر دی۔

تولیت کعبہ کے مناصب کی تقسیم اس انتظام کے ماتحت کعبہ کی تولیت کے کام یہ مقرر کئے گئے:

(۱) سقایہ یعنی آیام حج میں حاجیوں کے واسطے پانی کا انتظام

چونکہ مکہ میں پانی کی بہت قلت تھی کیونکہ زمزم کا چشمہ ایک عرصہ سے اٹ کر گم ہو چکا تھا۔ اور اگر وہ ہوتا بھی تو چونکہ حج کے موقعوں پر غیر معمولی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے اس لیے یہ کام خاص انتظام چاہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ کام بنو ہاشم میں تھا اور عباس بن عبد المطلب کے سپرد تھا۔

(۲) دفادہ یعنی آیام حج میں غریب حاجیوں کی اعانت کا انتظام۔ اس کام کے لیے قریش میں ہر سال چندہ جمع ہوتا تھا۔ زمانہ نبوی میں یہ کام بنو نوفل میں تھا اور عارض بن عامر کے سپرد تھا۔

(۳) حجابہ یعنی کعبہ کی دربانی اور کلید برداری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام بنو عبد الدار میں تھا۔ اور عثمان بن طلحہ کے سپرد تھا۔ یہ تینوں کام قحطی نے اپنی زندگی میں خود اپنے پاس رکھے تھے۔

قریش کے عام انتظامی کاموں کی تقسیم یہ تھی:

### تقسیم نظام قبیلہ

(۱) عقاب یعنی جنگوں وغیرہ کے موقع پر علم برداری۔ یہ کام بھی قحطی کے اپنے

پاس تھا اور اس کے بعد بنو عبد الدار میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ کام طلحہ بن ابی طلحہ کے سپرد تھا۔

اسی کا دوسرا نام یثود تھا۔

(۲) قیادہ یعنی جنگوں اور قافلوں میں کمان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام بنو امیہ میں تھا اور ابوسفیان کے سپرد تھا۔

(۳) سفارت یعنی قریش کی طرف سے بوقت ضرورت کسی دوسرے قبیلہ یا حکومت کی طرف سفر ہو کر جانا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام بنو عدی میں تھا اور حضرت عمرؓ کے سپرد تھا۔

(۴) دیات اور مغارم یعنی باہم لڑائیوں میں خون بہا وغیرہ کا فیصلہ کرنا۔ یہ کام بنو تیم میں تھا اور حضرت ابوجبرؓ کے سپرد تھا۔

(۵) قبیلہ یعنی جنگوں میں سوار فوج کی انفری اور کیمپ کا انتظام۔ یہ منصب خاندان مخزوم میں تھا اور ولید بن میسرہ کے سپرد تھا۔

(۶) ازلام یعنی خال کشی کا انتظام۔ یہ کام بنو جمح میں تھا اور صفوان بن امیہ کے سپرد تھا۔

(۷) مشورہ یعنی اہم اجتماعی کاموں میں بین القبائل مشورہ کا انتظام۔ یہ کام بنو اسد میں تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یزید بن ربیعۃ الأسود کے سپرد تھا۔

(۸) قضار یعنی مقدمات کا فیصلہ۔ یہ کام بنو سہم میں تھا اور عارض بن قیس کے سپرد تھا۔ وغیرہ وغیرہ +

### دارالندوة

قتی نے کعبہ کے پاس ایک دارالندوة بھی بنایا جس میں قریش اپنے تمام قومی کام سرانجام دیتے تھے اور یہیں سردان قریش باہم مشورہ کے لیے جمع ہوتے تھے۔ یہ گویا قریش کا کونسل ہال تھا۔ ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ بھی سردان قریش نے دارالندوة میں ہی کیا تھا۔ دارالندوة کے مشورہ میں شریک ہونے کے لیے یہ ایک شرط تھی کہ عمر چالیس سال سے کم نہ ہو۔ یہاں شادی کے لیے بھی قریش دارالندوة میں ہی جمع ہوتے تھے۔ اور یہیں اپنی رسوم ادا کرتے تھے۔ اگر کہیں جنگ پر باہر جانا ہوتا تھا یا کسی تجارتی قافلہ کو روانہ ہونا ہوتا تو لوگ یہیں سے جمع ہو کر روانہ ہوتے تھے۔ دارالندوة کا انتظام قتی نے خود اپنے پاس رکھا تھا۔

قتی کے ان غیر معمولی کارناموں نے اسے تمام اطراف عرب میں مشہور کر دیا تھا۔ اور قریش کا تو گویا وہ ایک قسم کا بادشاہ تھا، مگر اس انتظام سلطنت سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قریش کے اند کوئی باقاعدہ سلطنت تھی یا یہ کہ افراد کی آزادی پر کوئی خاص پابندیاں تھیں بلکہ یہ انتظام صرف اہم قومی معاملات کو آسانی کے ساتھ طے کرنے کے واسطے کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ فرائض کی تفصیلی تقسیم سب کی سب قتی کے اپنے ہاتھ سے مکمل ہوتی ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی شاخ اس سے پہلے کی ہو یا کوئی شاخ بعد میں حسب ضرورت قائم کی گئی ہو مگر بہر حال اس کام کی اصولی داغ بیل قتی ہی کے ہاتھ سے قائم ہوئی تھی۔

### عبدمناف

قتی کے چار بیٹے تھے۔ عبدآلدار۔ عبدالعزیٰ۔ عبدمناف اور عبدقتی۔ عبدآلدار چونکہ

بڑا تھا اس لیے قسطنطنیہ میں رہتے ہوئے اپنے تمام کام یعنی کعبہ کی تولیت کے تینوں مناصب اور دارالندوة اور لواء اس کے پٹو کئے، مگر عبدالدار اپنے باپ کی قابلیت کا آدمی نہ تھا اس لیے قریش کی عام ریاست عبدالمناف نے حاصل کی جو بہت لائق اور قابل آدمی تھا۔ عبدالمناف کے چار بیٹے تھے۔ عبدشمس۔ مطلب۔ ہاشم اور نوفل۔ یہ چاروں باپ ہی طرح قابل تھے۔ چنانچہ عبدالمناف کی وفات کے بعد ان سب نے مل کر اس بات کی کوشش کی کہ عبدالدار کی اولاد سے کعبہ کی تولیت چھین لیں۔ اس پر طرفین کا باہم جھگڑا ہو گیا۔ قریش کے بعض قبائل ایک طرف ہو گئے اور دوسرے دوسری طرف۔ اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جاتی۔ مگر آخر صلح صفائی کے ساتھ فیصلہ ہو گیا۔ اور دو مناصب یعنی رقادہ اور سقایہ بنو عبدالمناف کو مل گئے اور باقی تین مناصب یعنی دارالندوة کا انتظام لواء اور حجابہ بنو عبدالدار کے پاس رہے۔ بنو عبدالمناف نے آپس میں مشورہ کے ساتھ سقایہ اور رقادہ کا متولی ہاشم کو مقرر کر دیا۔

**ہاشم** ہاشم نہایت قابل معاملہ فہم اور سخی آدمی تھا۔ اُس نے حاجیوں کو بہت آرام پہنچایا اور قریش کے سامنے بہت زور و آواز بکھیر کر کر کے اُن کی مختلف ضروریات کے واسطے سامان ہتیا کئے۔ اُس کے زمانہ میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا تو اس نے اپنے پاس سے اخراجات کر کے قحط کے ایام میں غراب کو کئی طرح سے مدد دی۔ ان فیاضیوں کی وجہ سے ہاشم کا نام بہت شہرت پا گیا۔ اس کے علاوہ ہاشم نے خود جا جا کر رومی اور غسانی فرمانرواؤں سے قریش کے تجارتی قافلوں کے لیے حقوق حاصل کئے اور ہاشم کے دوسرے بھائیوں نے بھی کم و بیش اسی قسم کی خدمات انجام دیں۔ چنانچہ قریش کے تجارتی قافلوں کی شام اور یمن وغیرہ کی طرف آمد و رفت ہاشم ہی کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ غوما سردیوں میں تجارتی قافلے یمن کی طرف جاتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف اور یہ دونوں سلسلے رَحَلَتُ الشَّتَاءُ اور رَحَلَتُ الصَّیْفِ کہلاتے تھے۔

**امیہ کی رقابت** ہاشم کی اس ترقی کو دیکھ کر ہاشم کے بھتیجے امیہ بن عبدالمطلب کے دل میں خد پیدا ہوا اور اس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اور اسی کی طرح لوگوں میں مخالفت کے نام پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اس ناکامی سے اُن کا قریش کے ہنسی مذاق کا نشانہ بن گیا۔ آخر امیہ کو اتنا جوش آیا کہ اُس نے ہاشم کو کھلا چیلنج دے کر اپنے مقابلہ کے لیے بلایا۔ ہاشم نے پہلے تو توجہ نہ کی لیکن آخر قریش کے کہنے سننے سے جو اس قسم کا تماشہ دیکھنے کے خواہشمند رہتے تھے، ہاشم رضی ہو گیا اور شرط یہ عٹھری کہ کوئی ثالث ان کی بڑائی کا فیصلہ کرے اور جو بارے وہ دوسرے کو پچاس اونٹ دے۔ اور دس سال کے لیے مکہ سے جلا وطن کیا جاوے۔ ایک کاہن جو قبیلہ خزاعہ سے تھا ثالث مقرر ہوا۔ اُس نے اپنی کاہنی زبان کے دو چار فقرے بول کر ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ چنانچہ امیہ نے پچاس اونٹ ہاشم کے حوالے کئے اور

مکتے سے نکل گیا اور دس سال تک شام وغیرہ میں پھرتا رہا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ پہلی عداوت اور رقابت ہے جو بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان پیدا ہوئی۔ ہاشم کے بعد عبد المطلب بن ہاشم نے بھی اپنے زور کے ساتھ بنو ہاشم کو بنو امیہ پر غالب رکھا، لیکن عبد المطلب کی وفات کے بعد ہاشم کے پوتوں میں کوئی اس جیسا صاحب اثر شخص نہ نکلا اس لیے بنو امیہ آہستہ آہستہ زور پکڑ گئے اور ہاشم کا خاندان غربت کی حالت میں مبتلا ہو کر کمزور ہو گیا۔ ہاشم ایک دفعہ شام کی طرف بغرض تجارت نکلا تو راستہ میں یثرب یعنی مدینہ بھی گھبرا۔ وہاں ہاشم نے قبیلہ خزرج کی شاخ بنو تجار کی ایک لڑکی سلمیٰ سے شادی کی جس سے مدینہ میں ہی سلمیٰ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ رکھا گیا۔

**مُطَلِب** کچھ عرصہ کے بعد ہاشم کا باہر سفر میں ہی انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اُس کے چار لڑکے تھے۔ ابو قحیف، اسد، فضلہ اور شیبہ۔ مگر یہ چاروں چونکہ کم عمر تھے اور شیبہ تو مدینہ میں ہی تھا اس لیے ہاشم کی وفات پر اس کی جگہ اس کے بڑے بھائی مطلب نے لی یعنی ستایہ اور رفاہ کے کام اس کے سپرد ہوئے۔ جب مطلب کو کسی شخص نے اس کے بھتیجے شیبہ بن ہاشم کی ہوشیاری اور ہونہاری کی خبر دی تو وہ فوراً مدینہ جا کر شیبہ کو لے آیا۔ مکتے میں جب چچا بھتیجے داخل ہوئے تو لوگوں نے خیال کیا کہ شاید مطلب کوئی غلام لڑکا لایا ہے۔ اسی لیے شیبہ کا نام عبد المطلب یعنی مطلب کا غلام مشہور ہو گیا۔ یہ وہی عبد المطلب ہیں جو ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہیں اور جن کی آغوش میں آپ نے اپنی عمر کے ابتدائی آٹھ سال گزارے۔

**عَبْدُ الْمُطَلِب** مطلب کی پوزیشن چونکہ صرف ایک گارڈین کی تھی اس لیے اس کی تولیت کے وہ مناصب جو عہد منات کے گھرانے میں تھے اس کی وفات کے بعد عبد المطلب کو ملے کیونکہ اپنے بھائیوں میں یہی سب سے ہوشیار تھا۔ عبد المطلب نہایت سمجھدار اور قابل شخص تھا مگر چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھا اور اپنی عمر کا ایک حصہ باہر گزار کر آیا تھا، اس لیے شروع شروع میں اُسے اپنی پوزیشن کو قائم رکھنے کے لیے بہت مشکلات کا سامنا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو عبد المطلب کی دراشت میں اس کے چچا نوفل بن عبد منات نے جھگڑا کیا۔ عبد المطلب نے قریش سے اپیل کی، لیکن قریش نے اس معاملہ میں دخل دینے سے انکار کر دیا جس پر عبد المطلب نے یثرب میں اپنی نھال بنو نجار کو کہلا بھیجا کہ میرا چچا میری دراشت میں بے جا مداخلت کرتا ہے۔ وہاں سے فوراً اتنی بہادری سے اسے کی مدد کو کتہ پہنچ گئے۔ جس وقت یہ لوگ مکتے میں پہنچے تو اس وقت نوفل چند آدمیوں کے ساتھ مسجد حرام میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے آتے ہی اُسے کہا کہ ہمارے نواسے شیبہ بن ہاشم کو اس کا سارا ورثہ دے دو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ نوفل مرعوب ہو گیا اور اُس نے مداخلت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ بنو عبد المطلب اور بنو ہاشم کے درمیان رجش پیدا ہو جانے کا ذکر اُدپر گذر چکا ہے۔ اب بنو نوفل کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے۔



گویا بعد منات بن قحطی کے باقی بیٹوں میں سے بنو ہاشم کے ساتھ صرف بنو مطلب کے تعلقات اچھے رہے اور اس طرح اس خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف بنو ہاشم اور بنو مطلب تھے اور دوسری طرف بنو نوفل اور بنو عبد شمس۔ اس جھگڑے بندی کا یہاں تک اثر تھا کہ جب بنو ہاشم اور دیگر مشلمانوں کو کفار مکہ نے شب ابی طالب میں محصور کر دیا تو اس وقت بھی بنو مطلب نے بنو ہاشم کا ساتھ دیا اور قریش سے الگ رہے مگر بنو نوفل اور بنو عبد شمس نے کفار کا ساتھ دیا اور بنو ہاشم کی مخالفت کی۔ مطلب نے جو حسن سلوک کا معاملہ عبدالمطلب سے کیا تھا وہ بھی بنو مطلب اور بنو ہاشم کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا موجب ہوا اور بنو مطلب ہمیشہ بنو ہاشم کے ساتھ ایک جان ہو کر رہے، چنانچہ اسی رشتہ اتحاد کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ غم کی تقسیم میں سے (یعنی مال فقیست میں سے) وہ پانچواں حصہ جو اللہ اور اُس کے رسول اور رسول کے قریبی رشتہ داروں اور مشرک اسلامی ضروریات کے لیے الگ کیا جاتا تھا، بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب کا حصہ بھی بٹکاتے تھے۔ اور جب بنو نوفل اور بنو عبد شمس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابری رشتہ کی بنا پر درخواست کی کہ بنو مطلب کی طرح اُن کو بھی غم سے حصہ ملا کرے تو آپ نے انکار کیا اور فرمایا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب تو ایک ہی ہیں۔

### چاہ زمزم کی تلاش

چاہ زمزم جو مکہ کی آبادی کا پہلا سبب تھا صدیوں سے بند ہو کر گم ہو چکا تھا۔ جب عبدالمطلب کے ہاتھ میں سقایۃ الحجاج کا کام آیا تو اُس نے

ایک خواب کی بنا پر اس کھونے ہوئے چشہ کا نشان تلاش کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ اور اس کا لڑکا عارث اس کی تلاش میں مصروف ہوئے لیکن قریش میں سے کسی نے بنو ہاشم کی مدد نہ کی۔ بلکہ بعض نے اُٹا باپ بیٹے کا مذاق اڑایا۔ عبدالمطلب نے اس وقت اپنی کمزوری پر شرم و غیرت کے جوش میں اگر نذر مانی کہ اگر خدا اُسے دس پتھے دے گا اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے جو ان ہو جائیں گے تو اُن میں سے ایک کو وہ خدا کی راہ میں قربان کر دے گا۔ کچھ عرصہ کی محنت کے بعد عبدالمطلب کو زمزم کی جگہ کا نشان مل گیا جسے کھودنے سے یہ پُرانا چشمہ پھر نکل آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ دفینہ بھی برآمد ہوا جو قبیلہ جرحم نے مکہ چھوڑتے ہوئے اُس میں دفن کر دیا تھا۔ اس غیر مترقبہ واقعہ نے تمام قریش پر عبدالمطلب کا سکتہ بٹھلایا اور گواہوں نے شروع میں عبدالمطلب کے ساتھ دفینہ کے بارے میں جھگڑا کرنا چاہا، لیکن بالآخر مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی بڑائی کے اس قدر قائل ہو گئے کہ بالآخر عبدالمطلب کی یہ حالت تھی کہ تمام قریش اُسے اپنا نہایت واجب الاحترام سردار جانتے تھے۔

عبدالمطلب کا بڑا ہم مجلس ابوسفیان کا والد حرب بن امیہ تھا لیکن بالآخر عبدالمطلب کی ترقی نے اس کے دل میں بھی حسد کی چنگاری پیدا کر دی اور اُس نے اپنے باپ کی طرح بنو ہاشم سے مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا۔

اس منافرت کے بعد عبد المطلب کی مجلس زیادہ تر عبداللہ بن جدعان تھی کے ساتھ رہی جو مکہ کا ایک شریف مزاج رئیس تھا۔

**عبداللہ** چاہہ زمزم کے واقعہ کے بعد عبد المطلب بڑا صاحب اثر ہو گیا اور خدا کی قدرت کہ اس کی اولاد بھی جلد جلد بڑھنے لگی۔ حتیٰ کہ آفران کی تعداد دس تک پہنچ گئی۔ جب یہ لڑکے جوان ہو گئے اور ایفائے نذر کا وقت آگیا تو عبد المطلب اُن سب کو اپنے ساتھ لیکر کعبہ کی طرف گیا اور وہاں جا کر قبل کے سامنے قرعہ اندازی کی۔ اللہ کی قدرت کہ قرعے کا تیر سب سے چھوٹے لڑکے عبداللہ کے نام نکلا جو عبد المطلب کو سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اس وقت عبد المطلب کی جو حالت تھی وہ بیان میں نہیں آسکتی، مگر عبد المطلب قول کا پکا تھا اور نذر بہر حال پوری کر فی مٹی اس لیے وہ عبداللہ کو لے کر ذبح کرنے کے واسطے روانہ ہوا اور عبداللہ بھی سر تسلیم خم کئے اپنے باپ کے ساتھ ہو لیا جب رؤسائے قریش کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے عبد المطلب کو اس سے روکا اور آخر ایک واقعہ کار کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ عبداللہ اور دس اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے اور اگر اُونٹوں کے نام قرعہ نکلے تو عبداللہ کی جگہ دس اُونٹ قربان کر دیئے جائیں کہ یہی اس زمانے میں ایک آدمی کا خون بہا تھا چنانچہ عبد المطلب نے عبداللہ اور دس اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا، مگر پھر بھی تیر عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ عبد المطلب نے دس اور نام کئے اور بیس پر قرعہ ڈالا، لیکن اب کی دفعہ بھی عبداللہ ہی کا نام نکلا۔ دس اور نام کئے گئے، لیکن پھر بھی عبداللہ ہی کا نام تھا۔ چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر، اسی، نوے مگر ہر دفعہ عبداللہ کا نام آتا تھا۔ آخر تو تک نوبت پہنچی اور اب کی مرتبہ قرعہ اُونٹوں کے نام نکلا۔ لیکن اس پر بھی عبد المطلب نے مزید تسلی کے واسطے پھر دو دفعہ قرعہ ڈالا مگر دونوں دفعہ اُونٹوں کا نام نکلا۔ جس پر تو اُونٹ ذبح کئے گئے اور عبداللہ کی جان بھی۔ اس وقت سے قریش میں ایک آدمی کا خون بہا تو اُونٹ مقرر ہو گئے۔

**اصحاب انبیل** عبد المطلب کے زمانہ میں یمن کا علاقہ افریقہ کے ملک حبشہ کے ماتحت تھا جو ان ایام میں ایک طاقتور حکومت کا مرکز تھا۔ اور چونکہ حبشہ ایک عیسائی ملک تھا اس لیے یمن کا گورنر بھی عیسائی ہوا کرتا تھا۔ عبد المطلب کے زمانہ میں یمن کے والی کا نام ابرہہ الاسمرم تھا۔ یہ شخص کعبہ سے سخت دشمنی رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح عرب کے لوگوں کو کعبہ سے پھیر دے۔ چنانچہ اُس نے کعبہ کے مقابلہ پر یمن میں ایک معبد تیار کیا اور لوگوں میں تحریک کی کہ وہ بجائے کعبہ کے اس عبادت گاہ کے حج کے لیے آیا کریں۔ عرب کی فطرت بھلا اس بات کو کس طرح برداشت کر سکتی تھی کہ عرب کی سرزمین میں کعبہ کے مقابلہ پر کوئی اور معبد قائم ہو۔ چنانچہ نکھاسے کہ ایک عرب نے جوش میں آکر اس معبد میں جا کر پاخانہ کر دیا۔ ابرہہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے غصہ میں آکر ارادہ کیا کہ مکہ پر فوج کشی کر کے کعبہ کو ہمارا کر دے۔ چنانچہ اُس نے حبشہ کے بادشاہ



نجاشی سے اجازت لی۔ اور ایک بڑے بھاری لشکر کے ساتھ جس کی تعداد بعض روایات سے ساٹھ ہزار پتہ لگتی ہے اور بہر حال وہ ہزاروں پر مشتمل تھا، یمن سے نکلا اور راستہ میں مختلف قبائل عرب کو شکست دیتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا اور شہر کے سامنے اپنی فوجیں ڈال دیں۔ جب قریش کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت پریشان ہوئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھوں نے عبدالمطلب کو ابراہیم کے پاس بطور وفد کے روانہ کیا۔ عبدالمطلب کی وجہیہ شکل اور نجابت نے ابراہیم پر بہت اچھا اثر کیا۔ اور وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا۔ اور اپنے ترجمان سے کہا کہ ان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ عبدالمطلب نے جو شاید پہلے سے اس گفتگو کے طریق کو سوچ کر آیا تھا کہا کہ آپ کی فوج نے میرے اڈنٹ پکڑ لیے ہیں وہ مجھے دلوادیے جائیں۔ اُس نے اڈنٹ تو واپس دلوادیے، مگر جو اثر اس کے دل پر عبدالمطلب کی وجاہت اور قابلیت کا ہوا تھا وہ سب جاتا رہا اور اُس نے منہ بنا کر کہا: میں تمہارے کعبہ کو ہمارے گھرنے کے واسطے آیا ہوں، مگر تم نے اس کی فکر نہ کی اور اپنے اڈنٹوں کی فکر کی؟ عبدالمطلب نے بے پروائی کے انداز میں کہا: اَنَا رَبُّ الْاِیْمَلِ وَرَبُّنِیْنِیَّتِ رَبُّ یَمَعْنَعُ۔ یعنی میں تو صرف اڈنٹوں کا مالک ہوں، اس لیے مجھے ان کا فکر ہے۔ مگر اس گھر کا بھی ایک مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کریگا۔ ابراہیم نے یہ جواب سنا تو بہت بگڑا اور کہا کہ: اچھا پھر میں دیکھوں گا کہ اس گھر کا مالک مجھے اس سے کس طرح روکتا ہے؟ چنانچہ وہ اپنے لاؤ لشکر کو لے کر آگے بڑھا مگر خدائی تصرف ایسا ہوا کہ جو نہی کہ اس باقی کا رخ جس پر ابراہیم سوار تھا مکہ کی طرف کر کے اُسے چلایا گیا تو وہ چلنے سے رک گیا اور باوجود انتہائی کوشش کے آگے نہ بڑھا اور پھر اس لشکر پر ایسی آفت آئی کہ لشکر کا لشکر تباہ ہو کر پرندوں کی خوراک بن گیا۔ اس کی تفصیل روایات میں یوں بیان ہوئی ہے کہ جب یہ لشکر مکہ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، تو اُس وقت خدائی تصرف کے ماتحت اُن کے اوپر سے ایسے پرندوں کے ٹول گزرے جن کے پنجوں میں ایسی دھیرا لود مٹی کے ریزے گئے ہوتے تھے کہ جس جس کے اوپر یہ ریزے گرنے لگے وہ ایک چیچک کی سی مہلک اور متعدی بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور جب لشکر میں ایک دفعہ یہ بیماری پھوٹی تو پھر بڑی سرعت سے ایک سے دوسرے کو لگتی چلی گئی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ متعدی بیماریاں بسا اوقات مٹی کے ذرات یا دوسرے ذرائع سے پھیل جاتی ہیں۔ پس بالکل ممکن ہے کہ یہ پرندے کسی ایسی جگہ سے اُٹھ کر آئے ہوں جو کسی متعدی بیماری کے جراثیم سے توڑا ہوا اور اس طرح اُن کے واسطے سے لشکر میں کوئی چیچک وغیرہ کی مہلک بیماری پھیل گئی ہو۔ چنانچہ ابراہیم کے متعلق تو خاص طور پر ذکر آتا ہے کہ اُسے کوئی ایسی بیماری ہوئی تھی، جس سے اس کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا تھا۔ قرآن شریف میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ ؕ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْنَهُم

فَاَتَمَّيْنٰهُ ۝۱۰۱۱ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّفًاۙ اَبَابِیْلَ ۝۱۰۱۲ تَزُوِيْهِمْۙ بِجَبَارٍۙ مِّنْۙ سَیِّئِیْنِ ۝۱۰۱۳ فَجَعَلْنٰهُمْ كَعَصْفٍ مَّاكُوْلٍ ۝۱۰۱۴

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اُس نے اُن کی تجاویز کو خاک میں نہیں ملا دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے ٹھنڈ کے ٹھنڈ بھیجے جو اُن پر مٹی کے پتھر پڑے مارتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک بوسیدہ بھوسے کی طرح کر دیا۔

ابنِ ہشام کا یہ حملہ تاریخ میں اصحابِ اخیل کا حملہ کہلاتا ہے یعنی ہاتھی والوں کا حملہ جس کی وجہ یہ ہے کہ ابرہہ کی فوج میں ایک ہاتھی یا بعض روایتوں کی رُود سے متعدد ہاتھی بھی تھے۔ چونکہ قریش مکہ کے لیے ہاتھی ایک عجیب اور نئی چیز تھی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، اس لیے انہوں نے نہ صرف حملہ آوروں کا نام اصحابِ اخیل رکھا بلکہ اس سال کا نام بھی 'عامِ اخیل' رکھ دیا۔ اصحابِ اخیل کی تباہی سے کعبۃ اللہ کی عزت اور قریش کا رعب بہت بڑھ گیا اور دُوسرے قبائلِ عرب انہیں آگے سے بھی زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔

**عبداللہ کی شادی**  
اصحابِ اخیل کے واقعہ سے چند ماہ پیشتر عبدالمطلب نے آمنہ بنت وہب سے جو قریش کے قبیلہ بنو زہرہ میں سے ایک معزز گھرانے کی نہایت شریف لڑکی تھی اپنے رُود کے عبداللہ کی شادی کی۔ اُس وقت عبداللہ کی عمر پچیس سال کی یا بعض روایتوں کی رُود سے سترہ سال کی تھی۔ اسی موقع پر آمنہ کی ایک چھازاد بہن ہالہ بنت وہب سے عبدالمطلب نے خود بھی شادی کی۔ حمزہ اسی ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔

**عبداللہ کی وفات**  
عبداللہ کو نکاح کے بعد مصلحتِ الہی سے زیادہ مہلت نہیں ملی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جب وہ تجارت کے لیے شام کو گئے تو واپسی پر بیمار ہو کر یثرب میں ٹھہر گئے اور وہیں انتقال کیا اور اپنے رشتہ دار قبیلہ بنو نجار کے درمیان دفن ہوئے۔ اُس وقت اُن کی زوجہ آمنہ حمل سے تھیں۔ اپنے اس بچہ کے لیے جو ابھی اپنی ماں کے بطن میں ہی تھا عبداللہ نے جو ترکہ چھوڑا وہ قابلِ ذکر ہے۔ یعنی "پانچ اُونٹ۔ چند بکریاں اور ایک لڑکی اُمّ ایمن"۔ یہ ترکہ اس کے لیے تھا جس نے ہر دو عالم کا بادشاہ بننا تھا۔

عبدالمطلب کو جب اپنے فرزند عبداللہ کی بیماری کی خبر پہنچی تو اُس نے فوراً اپنے بڑے بیٹے عارض کو

مدینہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ مدینہ جا کر عبداللہ کو اپنے ساتھ لے آوے مگر جب حادثہ مدینہ پہنچا، تو عبداللہ فوت ہو چکے تھے۔ اُس نے واپس آکر بڑے باپ کو خبر دی کہ تیرا عزیز لڑکا اس جہانِ فانی سے گزر چکا ہے۔ اس وقت عبدالمطلب کو جو صدمہ ہوا وہ قیاس ہی کیا جاسکتا ہے مگر اس صدمہ سے بہت بڑھ کر وہ صدمہ ہو گا جو آمنہ کے دل کو پہنچا جس کا شوہر اس غریب الوطنی کی حالت میں شادی سے تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے داغِ ہجرت دے گیا۔ نئی نئی شادی کی حالت میں کم عمر لڑکیاں جو طبعاً اپنے اندر شرم و حیا کا زیادہ مادہ رکھتی ہیں ایسے موقعوں پر اپنے غمِ الم کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ اس لیے اُن کو اندر ہی اندر صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اس تکلیف کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس موقع پر حضرت آمنہ کو اٹھانی پڑی ہوگی۔ مگر خدا کی تسلی جلد ہی آمنہ کے سہارے کے لیے آئی۔ چنانچہ انہی ایام میں آمنہ نے ایک خواب دیکھا کہ اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے اور انہیں خواب میں ہی بتایا گیا کہ اس لڑکے کا نام محمد رکھنا۔ نیز انہوں نے یہ بھی خواب دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک چمکتا ہوا نور نکلا ہے اور دُور دراز ملکوں میں پھیل گیا ہے۔

# ابتدائی زندگی

**ولادت باسعادت** آمنہ کے نور کے ظہور کا وقت نزدیک آ رہا تھا اور وضع حمل کے دن قریب تھے۔ وہ شعب بنی ہاشم میں رہتی تھیں۔ اور اس وقت کے انتظار میں تھیں کہ جب اُن کے مروجہ شوہر کی یاد کو زندہ رکھنے والا بچہ دنیا کی روشنی میں آوے اور ان کے صدمہ رسیدہ دل کے لیے تسکین و راحت کا موجب ہو۔ چنانچہ واقعہ اصحاب اہل کے پچیس روز بعد ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اگست ۱۹۰۱ء عیسوی کو یا ایک جدید اور غالباً صحیح تحقیق کی رُو سے ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۰۱ء بروز پیر بوقت صبح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ واقعہ قبل کے اس قدر مفصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ہونا اپنے اندر یہ خدائی اشارہ رکھتا تھا کہ جس طرح خدا نے کعبہ کے خلاف اس ظاہری حملہ کو غائب و خاموش کیا ہے اسی طرح اب وقت آتا ہے کہ دین الہی کے مقابل پر باطل پرستی کا سر کچلا جائے۔ اور قرآن شریف میں اصحاب اہل کے حملہ کا ذکر بھی بغیر اسی غرض و مقصد کے ماتحت نظر آتا ہے۔ بہر حال بچہ کے پیدا ہوتے ہی آمنہ نے عبدالمطلب کو اطلاع بھجوا دی۔ جو سُننے ہی فوراً خوشی کے جوش میں آمنہ کے پاس چلے آئے۔ آمنہ نے اُن کے سامنے لڑکا پیش کیا اور کہا کہ میں نے ایک خواب میں اس کا نام محمد دیکھا تھا۔ عبدالمطلب بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر بیت اللہ میں لے گئے اور وہاں جا کر خدا کا شکر ادا کیا اور بچے کا نام محمد رکھا جس کے معنی ہیں ”بہت قابلِ تعریف“ اور پھر اسے واپس لا کر خوشی خوشی ماں کے سپرد کر دیا۔

مورخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق بعض عجیب عجیب واقعات لکھے ہیں مثلاً یہ کہ اس وقت کسریٰ شہنشاہ ایران کے محل میں سخت زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے اور فارس کا مقدس آتشکدہ جو صدیوں سے برابر روشن چلا آتا تھا دفعۃً بجھ گیا۔ اور بعض دریا اور چشمے خشک ہو گئے اور یہ کہ آپ کے اپنے گھر میں بھی رنگارنگ کے کمرے ظاہر ہوئے وغیرہ ذالک۔ مگر یہ روایتیں عموماً کمزور ہیں۔ یہ بھی روایت آتی ہے جو غالباً صحیح ہے کہ آپ کے ولادت کے زمانہ میں آسمان پر غیر معمولی کثرت کے

ساتھ تارے ٹوٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر نختون پیدا ہوئے تھے اگر یہ درست ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ بعض اوقات بچوں میں اس قسم کی قدرتی باتیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی آپ میں قدرتی طور پر تھی اور وہ یہ کہ آپ کی پشت پر بائیں جانب ایک گوشت کا اٹھا ہوا ٹکڑا تھا جو عام طور پر مسلمانوں میں ختم نبوت یعنی مہر نبوت کے نام سے مشہور ہے۔

**رضاعت اور ایام طفولیت**  
مکہ کے شرفاء میں یہ دستور تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ نہ پلاتی تھیں بلکہ عام طور پر بچے شہر سے باہر بدوی لوگوں میں دانیوں کے سپرد کر دیتے جاتے تھے اس کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ جنگل کی کھلی ہوا میں وہ مگر بچے تندرست اور طاقتور ہوتے تھے اور زبان بھی عمدہ اور صاف سیکھتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں آپ کی والدہ نے اور پھر ثویبہ نے دودھ پلایا۔ ثویبہ آپ کے چچا ابولہب کی لڑکی تھی جسے ابولہب نے اپنے یتیم بھتیجے کی ولادت کی خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔ اسی ثویبہ نے حضرت حمزہؓ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ گویا اس طرح حمزہ جو آپ کے حقیقی چچا تھے دودھ کے رشتہ سے آپ کے بھائی بن گئے۔ ثویبہ کی یہ چند دن کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں نہیں بھولے جب تک وہ زندہ رہی آپ ہمیشہ اس کی مدد فرماتے رہے اور اُس کے مرنے کے بعد بھی آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا اس کا کوئی رشتہ دار باقی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ کوئی نہ تھا۔

ثویبہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت مستقل طور پر حلیمہ کے سپرد ہوئی جو قوم ہوازن کے قبیلہ بنی سعد کی ایک خاتون تھی اور دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر مکہ میں دایہ کے طور پر کسی بچے کی تلاش میں آتی تھی۔ ایک یتیم بچے کو اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے حلیمہ ابتداءً خوش نہ تھی، کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ کوئی زندہ باپ والا بچہ لے جہاں زیادہ انعام و اکرام کی امید ہو سکتی تھی۔ چنانچہ شروع میں اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ لے جانے سے ٹافل کیا مگر جب کوئی اور بچہ نہ ملا اور اس کے ساتھ کی سب عورتوں کو بچے مل چکے تھے تو وہ خالی ہاتھ جانے سے بہتر سمجھ کر آپ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ لیکن جلد ہی حلیمہ کو معلوم ہو گیا کہ جو بچہ وہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس کا ستارہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ اُس کی اپنی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے ہم پر بہت تنگی کا وقت تھا، مگر آپ کے آنے کے ساتھ یہ تنگی فراخی میں بدل گئی۔ اور ہماری ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی۔ حلیمہ کا وہ لڑکا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دودھ پیتا تھا اس کا نام عبد اللہ تھا اس کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کا نام شیماء تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز رکھتی تھی۔



دو سال کے بعد جب رضاعت کی مدت پوری ہوئی تو دستور کے مطابق حلیمہ آپ کو لے کر مکہ میں آئی مگر اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت ہو چکی تھی کہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو آپ کی والدہ سے اجازت لے کر آپ کو پھر واپس لے جاوے، چنانچہ اُس نے باصرار کہا کہ ابھی اس بچہ کو کچھ عرصہ اور میرے پاس رہنے دو۔ میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں گی۔ آمنہ نے پہلے تو انکار کیا، مگر پھر اس کے اصرار کو دیکھ کر اور یہ خیال کر کے کہ مکہ کی آب و ہوا سے باہر کی آب و ہوا اچھی ہے اور ان ایام میں مگر کی آب و ہوا کچھ خراب بھی تھی آمنہ نے مان لیا اور حلیمہ آپ کو لے کر پھر خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی اور اس کے بعد قریباً چار سال کی عمر تک آپ حلیمہ کے پاس رہے اور قبیلہ بنو سعد کے لڑکے لڑکیوں میں کھیل کود کر بڑے ہوتے۔ اس قبیلہ کی زبان خاص طور پر صاف اور فصیح تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی زبان سیکھی۔

حلیمہ آپ کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ اور قبیلہ کے تمام لوگ آپ کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے حلیمہ خوفزدہ ہو گئی۔ اور آپ کو واپس مکہ میں لا کر آپ کی والدہ کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعہ تاریخ میں اس طرح پر مذکور ہے کہ ایک دفعہ آپ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ مل کر کھیل رہے تھے اور کوئی بڑا آدمی پاس نہ تھا کہ اچانک دو سفید پوش آدمی نظر آئے اور انہوں نے آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا اور آپ کا سینہ چاک کر دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر آپ کا رضاعی بھائی عبداللہ بن حارث بھاگا ہو گیا اور اپنے ماں باپ کو اطلاع دی کہ میرے قریبی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑ لیا ہے اور اس کا سینہ چاک کر رہے ہیں۔ حارث اور حلیمہ یہ سننے ہی بھاگے آئے تو دیکھا کہ کوئی آدمی تو وہاں نہیں ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک خوفزدہ حالت میں کھڑے ہیں اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا ہے۔ حلیمہ نے آگے بڑھ کر آپ کو گلے سے لگایا اور پوچھا ”بٹا کیا بات ہوئی ہے؟“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا ماجرا بتایا اور کہا کہ وہ کوئی چیز میرے سینہ میں تلاش کرتے تھے۔ جسے انہوں نے نکال کر پھینک دیا۔ پھر حلیمہ اور حارث آپ کو اپنے غیمہ میں لے گئے۔ اور حارث نے حلیمہ سے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے۔ پس مناسب ہے کہ تُو اسے فوراً لے جا اور اس کی والدہ کے سپرد کر آ“ چنانچہ حلیمہ آپ کو مکہ میں لائی اور آمنہ کے سپرد کر دیا۔ آمنہ نے اس جلدی کا سبب پوچھا اور اصرار کیا تو حلیمہ نے انہیں یہ سارا قصہ سنا دیا اور یہ ڈر ظاہر کیا کہ شاید یہ لڑکا کسی جتن وغیرہ کے اثر کے نیچے آ گیا ہے۔ آمنہ نے کہا۔ ”ایسا ہرگز نہیں۔ سکتا۔ میرا بیٹا بڑی شان والا ہے۔ جب یہ حمل میں تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا ہے جو

۱۔ اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حلیمہ اور حارث نے وہاں کوئی خون بہا ہوا نہیں پایا اور عشقِ صدر کی کوئی اور علامت دیکھی اور نہ ہی کوئی باہر پھینکی ہوئی چیز انہیں نظر آئی۔ ۲۔ یعنی یہ کسی جتن وغیرہ کے اثر کے نیچے آ گیا ہے۔



دور دراز ملکوں تک پھیل گیا ہے۔

اس واقعہ کی فی الجملہ تائید صحیح مسلم کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض بچوں کے ساتھ بل کر کھیل رہے تھے آپ کے پاس جبرائیل آئے اور آپ کو زمین پر لٹا کر آپ کا سینہ چاک کر دیا اور پھر آپ کے سینہ کے اندر سے آپ کا دل نکالا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر باہر پھینک دی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ کمزوریوں کی آلائش تھی جو اب تم سے جدا کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد جبرائیل نے آپ کے دل کو مصطفیٰ پانی سے دھویا اور سینہ میں واپس رکھ کر اُسے پھر جوڑ دیا۔ جب بچوں نے جبرائیل کو آپ کو زمین پر گراتے اور سینہ چاک کرتے ہوئے دیکھا تو وہ گھبرا کر دوڑے ہوئے آپ کی دانی کے پاس گئے اور کہا کہ محمد کو کبھی نے قتل کر دیا ہے۔ جب یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو فرشتہ قائب تھا اور آپ ایک خوفزدہ حالت میں کھڑے تھے۔ صحیح مسلم کی تصدیق کے بعد ابن ہشام کی روایت کو ایک ایسی تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ بلا کسی قوی دلیل کے ہم اسے کمزور کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ایک کشفی نظارہ تھا۔ چنانچہ شتی صدر کی ظاہری علامات کا مفقود ہونا یعنی اس وقت آپ کی دانی وغیرہ کو اس کی کسی ظاہری علامات کا نظر نہ آتا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک کشف تھا جس کا دائرہ دوسرے بچوں تک بھی وسیع ہو گیا۔ اور جیسا کہ خود اس کشف کے اندر یہ تصریح ہے اس سے مراد یہ تھی کہ خدائی فرشتہ نے تمثیل ہو کر عالم کشف میں آپ کا سینہ چاک کیا اور تمام کمزوریوں کی آلائش آپ کے اندر سے نکال دی۔ امارت میٹ میٹ سے ثابت ہے کہ معراج کی بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی قسم کے شتی صدر کا واقعہ ہوا اور فرشتوں نے آپ کا دل نکال کر زمزم کے مصفا پانی سے دھویا اور پھر اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

اس جگہ یہ ذکر کرنا بھی غیر مناسب نہ ہو گا کہ سرورِ قیوم نے اس واقعہ کا ذکر کر کے طعن کے رنگ میں

۱۔ ابن ہشام : نہ مسلم جلد اباب الاسراء : ۳۰ بعض ناظرین شاید کشف کی اصطلاح سے واقف نہ ہوں، اس لیے ان کی اقصیت کی غرض سے لکھا جاتا ہے کہ جس طرح انسان کو رات کے وقت سوتے ہوئے کوئی نظارہ دکھایا جاتا ہے جسے وہ اُس وقت اصل سمجھتا ہے حالانکہ وہ دراصل خواب ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات ایسے نظارے خدا کے خاص بندوں کو بیداری کی حالت میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یعنی عالم بیداری میں اُن پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہری حواس سے الگ ہو کر (یا بعض اوقات ظاہری حواس کے ہوتے ہوئے بھی) کوئی خاص نظارہ دیکھتے ہیں اور ایسی حالت میں جو نظارہ وہ دیکھتے ہیں وہ اصطلاح میں کشف کہلاتا ہے۔ کشف میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ آدمیوں تک اس کا اثر پہنچتا ہے یعنی صاحب کشف کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ایسے نظارہ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ منہ

۲۔ بخاری باب المعراج :

یہ ریمارک کیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ ایک مرگی کا دورہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا۔ ہم کسی کی زبان کو تو نہیں روک سکتے مگر یقیناً میٹور صاحب نے یہ اعتراض کرتے ہوئے پُرے درجے کے تعصب سے کام لیا ہے۔ کیونکہ اول تو سب لوگ جانتے ہیں کہ مرگی کا بیمار ایک کمزور دماغ والا انسان ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خود میٹور صاحب کو اقرار ہے کہ آپ بہترین توانے جہانی کے مالک تھے۔ علاوہ ازیں خود یہ روایت بھی جس کی بناء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اس اعتراض کو رد کرتی ہے۔ کیونکہ روایت میں یہ صاف لکھا ہے کہ اس نظارہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی نے بھی دیکھا اور اسی نے بھاگ کر اپنے والدین کو اطلاع دی کہ میرے قریشی بھائی کو دو سفید پوش آدمی زمین پر گر کر اس کا سینہ چاک کر رہے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی مرگی ایسی بھی ہوتی ہے جس کے متعلق دوسرے لوگ اس قسم کے نظارہ کی شہادت دیں۔ بیشک وہ شخص جسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے وہ خود اپنے خیال میں یہ گمان کر سکتا ہے کہ اُسے کسی نے پکڑ کر زمین پر دے مارا ہے لیکن یہ کہ اُسے دیکھنے والے لوگ بھی اس قسم کا نظارہ دیکھیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسے سوائے ایک متعصب انسان کے کوئی شخص زبان پر نہیں لاسکتا۔

بہر حال جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو حلیمہ آپ کو واپس لا کر آپ کی والدہ کے سپرد کر گئی۔ یہ چار سال خدمت حلیمہ کی کوئی معمولی خدمت نہ تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو چھوٹی سے چھوٹی خدمت کو بھی فراموش نہ کرتے تھے؛ چنانچہ آپ نے عمر بھر حلیمہ کی یہ خدمت یاد رکھی اور ہمیشہ اس کے ساتھ نہایت اعلیٰ سلوک کیا۔ چنانچہ جب ملک میں ایک دفعہ قحط پڑا اور حلیمہ مکہ میں آئی تو آپ نے اُسے چالیس بکریاں اور ایک اونٹ عطا فرمایا۔ زمانہ نبوت میں وہ ایک دفعہ آئی تو آپ نے اُسے دیکھتے ہی میری ماں، میری ماں کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنے اوپر کی چادر اتار کر اُس کے نیچے بھائی۔ پھر جب ایک جنگ (یعنی جنگِ خنین) میں قبیلہ ہوازن کے ہزار باقیدی پکڑے ہوئے آئے تو آپ نے اسی رشتہ کی خاطر ان سب کو رہا کر دیا۔ اور ایک پانی بھی اُن قیدیوں کے ہدیہ میں نہیں لی۔ اور اپنی ایک رضاعی بہن کو جو اُن قیدیوں میں آئی تھی انعام سے بالا مال کر کے واپس کیا۔ حلیمہ اور اس کے خاوند حارث کے اسلام لانے کے متعلق اختلاف ہے، مگر راجح قول یہی ہے کہ وہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلام کی حالت میں فوت ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی عبداللہ اور بہن شیماء نے بھی اسلام پر وفات پائی۔

والدہ کی کفالت اور سفرِ شرب

جب حلیمہ آپ کو آپ کی والدہ کے پاس واپس لائی تو آپ کی عمر کم و بیش چار سال کی تھی، اس کے بعد آپ اپنی والدہ کی

کفالت میں رہے۔ جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو اپنے رشتہ دار بنو نجار سے ملنے کی غرض سے آمنہ شرب گئیں اور آپ کو بھی ساتھ لے گئیں۔ ام امین بھی ساتھ تھی۔ ممکن ہے اس سفر میں آمنہ کو اپنے مرحوم شوہر کے مزار

دیکھنے کا بھی خیال ہو۔ بہر حال وہ یثرب گئیں اور وہاں تقریباً ایک مہینہ تک قیام کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ زمانہ آخر عمر تک یاد رہا۔ تقریباً پچاس سال کے بعد جب آپ ہجرت کر کے مدینہ گئے تو آپ نے صحابہ کو وہ مکان بتایا جہاں آپ اپنی والدہ کے ساتھ ٹھہرے تھے اور وہ جگہ بتانی جہاں آپ مدینہ کے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتے تھے۔ اور وہ تالاب بھی دکھایا جہاں آپ نے تیرنے کی مشق کی تھی۔

### والدہ کی وفات

تقریباً ایک ماہ کے قیام کے بعد آمنہ واپس روانہ ہوئیں مگر اپنے شوہر کی طرح ان کی موت بھی غریب الوطنی میں ہی مقدر تھی چنانچہ راستہ میں ہی بیمار ہو گئیں اور مقام ابوالوس میں انتقال کیا اور یہیں دفن کی گئیں۔ زمانہ نبوت میں جب آپ ایک دفعہ اس مقام پر سے گزرے تو اپنی والدہ کی قبر پر بھی تشریف لے گئے اور اُسے دیکھ کر چشم پُر آب ہو گئے۔ صحابہ نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ بھی رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: اللہ نے مجھے یہ تو اجازت دی کہ میں اپنی والدہ کی قبر کو دیکھوں لیکن دعا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپ کی والدہ کی مغفرت نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔ اور کیا نہ ہوگا۔ لیکن اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور موقعوں پر فرمایا ہے کہ جو شخص شریک کی حالت میں فوت ہو اُس کے لیے دُعا مانگنا درست نہیں ہے بلکہ اس کے معاملہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے۔

والدہ کی وفات ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پوری حالت میں آگئے۔ اور چھوٹی عمر میں وطن سے باہر عزیز و اقرباء سے دور ماں کی جدائی کا صدمہ ایسی حالت میں کہ باپ پہلے ہی گذر چکا ہو کوئی معمولی صدمہ نہیں، چنانچہ ان باتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ایک گہرا اور مستقل اثر ڈالا۔ بے شک آپ اللہ کی طرف سے رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کئے گئے۔ مگر غاہری اسباب کے لحاظ سے ان باتوں کا بھی آپ کی طبیعت پر بہت اثر ہوا اور ایک حد تک یہ انہی ابتدائی صدموں کا نتیجہ تھا کہ آپ کے اخلاق میں غرباء کی محبت اور مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی نے ایک خاص ممتاز رنگ اختیار کیا۔ قرآن شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نیک کاموں کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوَىٰ ۝ ..... فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تُفْقِرْ لَهُ ۝  
 ”یعنی کیا ہم نے تجھے یتیم پا کر پناہ نہیں دی۔ پس اب تیرا فرض ہے کہ تُو بھی یتیموں کے ساتھ شفقت اور نرمی کا سلوک کرے؟“

۱۔ ابن ہشام و ابن سعد و طبری ۲۔ یہ عام مؤرخین کی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آمنہ بنت وہب  
 ۳۔ یہ فوج میں فوت ہوئی تھیں اور ان کی قبر مکہ کی راوی جون میں ہے۔ واللہ اعلم ۴  
 ۵۔ مسلم و ابن ماجہ ۶۔ سورۃ النمل و ایت ۱۰۱، ۱۰۲

## عبد المطلب کی کفالت

والدہ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خادمہ ام ایمن کے ساتھ مکہ پہنچے۔ یہ اتم ایمن وہی ہے جو آپ کے والد کی وفات پر ایک لڑکی کی حیثیت میں آپ کو وراثت میں پہنچی تھی۔ بڑے ہو کر آپ نے اسے آزاد کر دیا تھا اور اس کے ساتھ بہت احسان کا سلوک فرماتے تھے۔ بعد میں ام ایمن کی شادی آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے ساتھ ہو گئی اور اس کے بطن سے اسامہ بن زید پیدا ہوئے۔ اتم ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تک زندہ رہی۔ بہر حال والدہ کی وفات کے بعد آپ اتم ایمن کے ساتھ مکہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر آپ کو عبد المطلب نے براہ راست اپنی کفالت میں لے لیا۔ عبد المطلب آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ غارہ کعبہ کا طواف کرتے تو آپ کو اپنے کندھے پر بٹھالیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئے۔ عبد المطلب کی عادت تھی کہ صحن کعبہ میں فرش بچا کر بیٹھا کرتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس فرش پر ان کے ساتھ بیٹھ سکے۔ حتیٰ کہ عبد المطلب کے اپنے لڑکے بھی ہٹ کر بیٹھتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبت کے جوش میں سیدھے عبد المطلب کے پاس جا بیٹھتے تھے اور وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپ کے چچا بعض اوقات آپ کو فرش پر بیٹھنے سے روکتے تو عبد المطلب ان کو منع کر دیتے اور کہتے کہ اسے تم کچھ نہ کہو۔

## عبد المطلب کی وفات

اسی محبت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دن گذر رہے تھے کہ عبد المطلب کو بھی پیغام اجل آگیا۔ جب ان کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ تھے اور روتے جاتے تھے۔ یہ تیسرا صدقہ تھا جو آپ کو بچپن میں اٹھانا پڑا۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی اور عبد المطلب کی عمر اختلاف روایات کے ساتھ آٹھ سال سے لے کر ایک سو چالیس سال کی تھی۔

مختلف بیویوں سے عبد المطلب کے کئی بیٹے تھے جن میں سے زیادہ معروف کے نام یہ ہیں۔ حارث، زبیر، ابوطالب، ابوہب، عبد اللہ، عباس اور حمزہ۔ ان میں ابوطالب اور عبد اللہ کی ماں ایک تھی۔ اور غالباً اسی نسبت سے عبد المطلب نے مرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی کفالت میں دیا اور ان کو آپ کا خاص خیال رکھنے کی وصیت کی۔ چنانچہ اس وقت سے آپ اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں رہنے لگے۔ قومی کاموں میں سے ستایہ اور رقادہ کا کام جو عبد المطلب کے پاس تھا وہ انہوں نے اپنے زندہ لڑکوں میں سے بڑے لڑکے زبیر کے سپرد کیا۔ مگر چونکہ یہ کام بہت سارے پیچھے چاہتا تھا اس لیے زبیر نے اپنی طاقت سے زیادہ دیکھ کر یہ دونوں کام ابوطالب کے سپرد کر دیئے لیکن ابوطالب بھی غریب آدمی تھے اس لیے رقادہ کا کام بنو نوفل کی طرف منتقل ہو گیا اور ستایہ کا کام ابوطالب نے بالآخر عباس کے سپرد کر دیا جو نبی اکبر امیر آدمی تھے۔



اس موقع پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ عبدالمطلب کی زندگی تک تو بنو ہاشم نہایت معزز و محترم تھے اور گویا تمام قبائل قریش میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد بنو ہاشم میں سے کوئی ایسا شخص نہ نکلا جو اس اعزاز کو قائم رکھ سکے اس لیے قریش کی عام سرداری ان کے ہاتھ سے بھل گئی اور بنو ہاشم کے رقیب بنو امیہ آہستہ آہستہ بہت زور پکڑ گئے۔

### ابوطالب کی کفالت

ابوطالب نے اپنے والد کی وصیت پر نہایت دیانت اور خوبی سے عمل کیا اور اپنے بچوں سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھا۔ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے اور رات کے وقت بھی ٹوٹا اپنے ساتھ ہی سلاتے تھے۔

### سفر شام اور واقعہ بحیرا ہب

جب آپ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو ابوطالب کو ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کا سفر پیش آ گیا۔ چونکہ سفر لمبا اور دشمن مقام اس لیے انہوں نے ارادہ کیا کہ آپ کو مکہ ہی میں چھوڑ جائیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی جدائی نہایت شاق تھی۔ چنانچہ روانگی کے وقت جو شش محبت میں آپ ابوطالب سے پٹ گئے اور رونے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر ابوطالب کا دل بھرا آیا اور وہ آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

شام کے جنوب میں بصری ایک مشہور مقام ہے، وہاں پہنچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہاں ایک سیائی راہب رہتا تھا جس کا نام بحیرا تھا۔ جب قریش کا قافلہ اُس کی خانقاہ کے پاس پہنچا تو اس راہب نے دیکھا کہ تمام بٹھرا اور درخت وغیرہ یکھنٹ مسجدہ میں گر گئے۔ اُسے معلوم تھا کہ الہی نوشتوں کی رو سے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اس لیے اُس نے اپنی فراست سمجھ لیا کہ اس قافلے میں وہی نبی موجود ہوگا۔ چنانچہ اُس نے اپنے قیافہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا۔ اور اس سے ابوطالب کو اطلاع دی۔ اور ابوطالب کو نصیحت کی کہ آپ کو اہل کتاب کے شر سے محفوظ رکھیں۔

علم روایت کی رو سے اس واقعہ کی سند کمزور ہے لیکن اگر فی الحقیقت ایسا واقعہ گزرا ہو تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ درختوں وغیرہ کا مسجدہ کرنا راہب کا ایک کشفی نظارہ سمجھا جانے کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کے لحاظ سے کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

### کیا اسلام مسیحیت سے متاثر ہوا ہے؟

اس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ میسور صاحب اور بعض دیگر غیر مسلم مؤرخین نے بحیرا راہب کے واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سے پہلے کسی عیسائی سے ملنا بیان ہوا ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ مسیحیت سے متاثر ہو کر کیا تھا اور آپ کی تعلیم اسی اثر کا نتیجہ تھی۔ مگر یہ خیال بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے اور جس شخص کو آپ کی تعلیم اور سوانح کا غور و بہت بھی مطالعہ ہے اور تعصب نے اُس کی آنکھ پر پردہ نہیں ڈال رکھا وہ اس اعتراض سے کبھی دھوکا

نہیں کھا سکتا۔ بے شک یہ درست ہے کہ ہر ذی عقل انسان اپنی استعداد کے مطابق اپنے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے اور ماحول کے حسن و قبح کے نتیجہ میں اچھے یا بُرے تاثرات کا قائل ہونا بھی ایک فطری امر ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی عیسائی کے ساتھ بعثت سے پہلے ملے ہوں گے اور آپ کو عیسائیت کی تعلیم کے سُننے کا موقعہ میسر آیا ہوگا تو طبعاً آپ کے دل میں اس کے اچھے اور بُرے حصوں کے متعلق تاثرات بھی پیدا ہوتے ہوں گے۔ مگر یہ خیال قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ آپ کی نبوت اور تعلیم ان تاثرات کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ اول تو بعثت سے پہلے آپ کا کسی عیسائی سے ایسے حالات میں ملنا ثابت نہیں کہ جس کے متعلق یہ سمجھا جاسکے کہ اُس نے آپ کی طبیعت پر کوئی گہرا اور مستقل اثر چھوڑا ہو۔ لیکن اگر بالفرض اس قسم کا کوئی اثر تھا بھی تو یقیناً وہ کوئی اچھا اثر نہیں تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم میں عیسائیت کے اکثر اصولی مسائل سے شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً موجودہ اوقات عیسائی مذہب کی بنیاد زیادہ تر اُلوہیت مسیح تثلیث اور کفارہ کے عقائد پر ہے۔ مگر ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ قرآن شریف میں ان تینوں مسائل کے خلاف نہایت سختی سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسیح کی مروجہ خدائی اور تثلیث کے متعلق یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ یہ ایسا عقیدہ ہے کہ قریب ہے کہ اس سے زمین و آسمان پھٹ جائیں۔ اندیس غالات اسلام کی تعلیم کو عیسائیت کی طرف منسوب کرنا ایک مجنونانہ کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

باقی رہا یہ امر کہ قرآن شریف میں حضرت مسیح ناصری کی تعریف کی گئی ہے۔ سو اس سے بھی مندرجہ بالا اعتراض کی تائید میں کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اول تو حضرت مسیح کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بطور ایک نبی کے ہے نہ کہ بطور ابن اللہ یا خدا ہونے کے جو عیسائی مذہب کا دعویٰ ہے۔ دوسرے یہ تعریف حضرت مسیح کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن شریف نے سارے گذشتہ انبیاء کی تعریف کی ہے اور انہیں نہایت بزرگ اور قابل احترام ہستیاں قرار دیا ہے بلکہ قرآن شریف نے بڑے زور کے ساتھ اس اصول کو پیش کیا ہے کہ دنیا کی ساری قوموں میں خدا کے رسول گذرے ہیں۔ اور اس طرح اُس نے مسلمانوں کے دلوں میں تمام اقوام عالم کے بزرگوں کی عزت قائم کر دی ہے مگر یہ ایک یقین حقیقت ہے کہ حضرت مسیح کی خدائیت اور عیسائی مذہب کے دوسرے اصول عقائد کو اسلام نے نہایت سختی کے ساتھ رد کیا ہے اور حضرت مسیح کو ایک انسان رسول سے زیادہ حیثیت نہیں دی جو اپنی زندگی کے دن گزار کر دوسرے رسولوں کی طرح وفات پا گئے۔ پس مسیحی مذہب متاثر ہونے کا اعتراض بالکل غلط اور باطل ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مسیحی مذہب کی بعض دینی اور اخلاقی تعلیمات اسلام میں بھی پائی جاتی ہیں جس سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسلام نے ان تعلیمات کو مسیحیت سے اخذ کیا ہے تو یہ بھی ایک فضول اعتراض ہوگا کیونکہ



اول تو جب کہ اسلام اور موجود الوقت مسیحیت کی بہت سی اصولی تعلیمات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں تو کسی ضمنی حصہ میں ان دو تعلیموں کا آپس میں متشابہ ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں سمجھا جاسکتا کہ ایک تعلیم دوسرے سے ماخوذ ہے۔ دوسرے جب کہ اسلام حضرت مسیح کو خدا کا ایک برگزیدہ رسول قرار دیتا ہے اور خود بھی خدا کی طرف سے ہونے کا مدعی ہے تو یہ لازمی تھا کہ بوجہ ایک ہی منبع سے نکلی ہوئی چیزیں ہونے کے اسلام اور مسیحیت کی بعض تعلیمیں ایک دوسرے کے متشابہ ہوتیں۔ کیونکہ بہر حال ہدایت کے اصول ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ایک ہی ہیں۔ تیسرے قرآن شریف خود اس بات کا مدعی ہے کہ اس نے سب گزشتہ تعلیموں کی دائمی صداقتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے **فَإِنَّمَا كُنْتُ نَذِيرًا** یعنی قرآن کے اندر تمام گزشتہ صحف کی پختہ اور مستقل باتیں جمع کر دی گئی ہیں پس اس جہت سے بھی مسیحیت کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن شریف نے اپنے اس خاصہ کو کہ اس میں گزشتہ تعلیمات کی سب دائمی صداقتیں اور پختہ اور مستقل باتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ ایک کمال کے رنگ میں پیش کیا ہے اور اس پہلو سے اسے گویا ایک شہد کی محکم سے تشبیہ دی ہے۔ جو ہر قسم کے پھل اور پھول سے اس کا جو ہرے کر باریکر باریکر کیمیائی رنگ میں ایک نہایت لطیف چیز تیار کر دیتی ہے جو باوجود مختلف پھلوں اور پھولوں کا جو ہر ہونے کے ایک بالکل ہی نئی چیز ہوتی ہے جسے کسی خاص پھل یا پھول کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں قرآن شریف نے صرف گزشتہ صحف ہی سے اُن کی پختہ تعلیمات کو اخذ نہیں کیا بلکہ چونکہ وہ ایک دائمی شریعت کا حامل ہے اس لیے اس نے قیامت تک کی ضروریات کے پیش نظر بہت سی نئی باتوں کو بھی زائد کر کے ایک کامل اور ابدی شریعت پیش کی ہے اور خدا کی طرف سے اس میں ایسے خواہش و دلچسپ کر دیتے گئے ہیں کہ اس ظاہری عالم کی طرح وہ قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کی دینی ضروریات کا سامان اپنے اندر مخفی رکھتا ہے جو حسب ضرورت ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ دراصل قرآن شریف مندرجہ ذیل تعلیمات کا مجموعہ ہے :

اول گزشتہ صحف کے وہ جتنے جو ایک دائمی اور عالمگیر شریعت کا جزو بن سکتے تھے۔

دوم آئندہ کے لیے مختلف اقوم عالم کی ضروریات کے مناسب حال مستقل تعلیم جو حقوق العباد اور حقوق اللہ کی کامل ادائیگی اور ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے قیامت تک کے لیے ضروری تھی۔

بہر حال یہ خیال کہ قرآن شریف یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مسیحیت یا کسی اور مذہب کی تعلیم کا نتیجہ تھی، بالکل غلط اور باطل ہے۔ اور ایسا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیم سے

قطعاً نابلد ہے۔ اور بالخصوص بھاراراسہب وغیرہ کی ملاقات کی طرف اسلامی تعلیمات کو منسوب کرنا تو ایک بالکل ہی مضحکہ خیز بات ہے جو کسی دانا شخص کی زبان پر نہیں آسکتی۔

**آپ کا بکریاں چرانا**  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب شام کے سفر سے واپس آئے تو بدستور ابوطالب کے پاس ہی رہتے تھے مگر چونکہ عرب میں بچوں کو غونا موشی چرانے کے کام پر لگادیتے تھے اس لیے اس زمانہ میں آپ نے بھی کبھی کبھی یہ کام کیا اور بکریاں چرائیں۔ زمانہ نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ بکریاں چرانا بھی انبیاء کی سنت ہے۔ اور میں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر سفر میں آپ کے اصحاب جنگل میں پیلو جمع کر کے کھانے لگے تو آپ نے فرمایا۔ کالے کالے پیلو تلاش کر کے کھاؤ۔ کیونکہ جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا تو اس وقت کا میرا تجربہ ہے کہ کالے رنگ کے پیلو زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔

**بدیلوں سے خدائی حفاظت**  
اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات اپنے ساتھی سے کہا جو بکریاں چرانے میں آپ کا شریک تھا کہ تم میری بکریوں کا خیال رکھو تاکہ میں ذرا شہر جا کر لوگوں کی مجلس دیکھ آؤں۔ انی دنوں میں دستور تھا کہ رات کے وقت لوگ کسی مکان پر جمع ہو کر کہانیاں سُناتے اور شعر و غزل کا شغل کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اسی میں ساری ساری رات گزار دیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بچپن کے شوق میں یہ تماشا دیکھنے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اس نیکو کام میں نجات النبیین کی شرکت پسند نہ آئی، چنانچہ ایک جگہ آپ گئے مگر راستے میں ہی نیند آگئی اور سو گئے اور صبح تک سوتے رہے۔ ایک دفعہ اور آپ کو یہی خیال آیا مگر پھر بھی دستِ فیسی نے روک دیا۔ زمانہ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نے ساری عمر میں صرف دو دفعہ اس قسم کی مجلس میں شرکت کا ارادہ کیا، مگر دونوں دفعہ روک دیا گیا۔

**حرب فجار**  
عرب ایک نہایت جنگجو قوم تھی اور لڑنے مرنے کو یہ لوگ فخر سمجھتے تھے۔ اسی لیے بات بات پر تلوار کھینچ جاتی تھی اور جب کبھی ایسا موقع آتا تو ایک بڑے پیارے میں خون بھر کر سب اس کے اندر انگلیاں ڈبو کر قسم کھاتے تھے کہ رو کر مر جائیں گے مگر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ مختلف قبائل کی آپس میں عداوت رہتی تھی کیونکہ ہر قبیلہ کو اپنی عزت اور بڑائی کا از بس خیال تھا۔ ایسی صورت میں میلوں وغیرہ میں جہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں لڑائی کی وجوہات پیدا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

۱۔ اس کی معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء کا کام بھی اپنی نوعیت کے محاف سے گلہ بانی کا رنگ رکھتا ہے پس اللہ تعالیٰ ان سے ان کی ابتدائی عمر میں چرواہے کا کام لے کر تصویری زبان میں یہ اشارہ کر دیتا ہے کہ اب تم انسانوں کی گلہ بانی کیلئے بھی تیار ہو جاؤ۔  
۲۔ بخاری کتاب بدو خلق باب یحکفون علی اصنام ۴۰ طبری ۴

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بچپن ہی تھا تو عکاظ کے میدان کے موقع پر جو مکہ سے جانب مشرق تین دن کی مسافت پر ایک خوشگوار وادی میں لگا کر مانتھا قبائل قیس عیلان اور بنو کنانہ کے درمیان کچھ بھید پھاڑ شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں قیس عیلان کے مختلف قبائل مکہ سے جنوب مشرق میں طائف اور مکہ کے درمیان آباد تھے۔ ایک عرصہ تک تو دونوں طرف کے رؤساء نے جنگ کی نوبت آنے سے بچاتے رکھا، مگر آہستہ آہستہ تعلقات کشیدہ ہوتے گئے اور بالآخر لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اس جنگ کو تاریخ میں حرب فجار کہتے ہیں جس کے معنی ناجائز جنگ کے ہیں۔ کیونکہ اس جنگ کی ابتداء شہر حرم میں ہوئی تھی جس کے اندر لڑنا عرب کے قدیم دستور کے مطابق ممنوع تھا۔

غرض یہ جنگ ہوئی اور ایسے زور شور سے ہوئی کہ زمانہ جاہلیت کی جنگوں میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ بنو کنانہ بثلولیت قبیلہ قریش ایک طرف تھے اور قیس عیلان بثلولیت قبیلہ ہوازن دوسری طرف۔ اس جنگ کی سب سے خطرناک آخری لڑائی تھی جو حرب فجار کی چوتھی لڑائی کہلاتی ہے۔ اس میں جوش کا یہ عالم تھا کہ بعض سرداروں نے اپنے آپ کو رتوں سے بندھوا دیا تھا کہ اگر بھاگنا چاہیں بھی تو نہ بھاگ سکیں۔ دن کے شروع حصہ میں قیس عیلان کا پلہ بمباری رہا۔ لیکن آخر میں بنو کنانہ نے وبالیا۔ اور قیس عیلان کی شکست کے بعد ہر دو فریق میں صلح ہو گئی۔

اس لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خود قتال نہیں کیا بلکہ آپ کی شرکت صرف اس حد تک محدود تھی کہ آپ فوج میں شامل تھے اور اپنے چچاؤں کو تیر بچراتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ اس لڑائی میں ہر قبیلہ کا افسرانگ الگ تھا۔ چنانچہ بنو ہاشم زبیر بن عبد المطلب کے ماتحت تھے مگر بنو کنانہ کی ساری فوج کا افسر حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا والد اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

**حلف الفضول** قدیم زمانہ میں عرب کے بعض شریف دل اشخاص کو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ باہم ملکر عہد کیا جاوے کہ ہم ہمیشہ حقدار کو اس کا حق حاصل کرنے میں مدد دیں گے اور ظالم کو ظلم سے روکیں گے۔ اور عربی میں چونکہ حق کو فضل بھی کہتے ہیں جس کی جمع فضول ہے، اس لیے اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ بعض روایتوں کی رُو سے چونکہ اس تجویز کے محرک ایسے شخص تھے جن کے ناموں میں فضل کا لفظ آتا تھا، اس لیے یہ عہد حلف الفضول کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بہر حال حرب فجار کے بعد اور غالباً اسی جنگ سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبد المطلب کے دل میں یہ تحریک

پیدا ہوتی کہ اس حلف کو پھر تازہ کیا جاوے؛ چنانچہ اس کی تحریک پر بعض قبائل قریش کے نمائندگان عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے جہاں عبداللہ بن جدعان کی طرف سے ایک دعوت کا انتظام تھا۔ اور پھر سب اتفاق کر کے باہم قسم کھائی کہ ہم ہمیشہ ظلم کو روکیں گے اور مظلوم کی مدد کریں گے۔ اس عہد میں حصہ لینے والوں میں بنو ہاشم۔ بنو مطلب۔ بنو اسد۔ بنو زہرہ اور بنو تیم شامل تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس موقع پر موجود تھے اور شریک معاہدہ تھے؛ چنانچہ آپ ایک دفعہ نبوت کے زمانہ میں فرماتے تھے کہ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسی قسم میں شریک ہوا تھا کہ اگر آج اسلام کے زمانہ میں بھی مجھے کوئی اس کی طرف بلاتے، تو میں اس پر لبیک کہوں گا اور شاید اسی خیال کا اثر تھا کہ جب ایک دفعہ امیر معاویہ کے زمانہ میں ان کے بھتیجے ولید بن عقبہ بن ابوسفیان نے جو اس وقت مدینہ کے امیر تھے حضرت حسین بن علی بن ابی طالب کا کوئی حق دیا تو حضرت حسین نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ولید نے میرا حق نہ دیا تو میں تلوار نکال کر مسجد نبوی میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کی طرف لوگوں کو بلادوں گا۔ جس وقت عبداللہ بن زبیر نے یہ سنا تو کہا کہ اگر حسین نے اس قسم کی طرف بلایا تو میں اس پر ضرور لبیک کہوں گا اور ہم یا تو اس کا حق دلوائیں گے اور یا اس کو شمشیر میں سب مارے جائیں گے۔ بعض اور آدمیوں نے بھی اسی قسم کے الفاظ کہے جس پر ولید دب گیا اور اس نے حضرت حسین کا حق ادا کر دیا۔ یہ خیال رہے کہ عبداللہ بن زبیر بنو اسد میں سے تھے جو حلف الفضول میں شریک تھے۔

**حلیہ مبارک** اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ان تھے اور جسمانی نشو و نما مکمل ہو چکا تھا۔ اس لیے اس موقع پر آپ کا حلیہ بیان کر دینا مناسب ہو گا۔ لکھا ہے کہ آپ میانہ قد تھے۔ رنگ بہت خوبصورت تھا یعنی نہ تو بہت ہی سفید جو بڑے لگے اور نہ ہی گندم گول بلکہ گندم گول سے کچھ سفید تھا۔ سر کے بال بالکل سیدھے لکھنار نہ تھے بلکہ کسی قدر خمدار تھے۔ داڑھی گھنی اور خوبصورت تھی۔ جسم درمیانہ تھا۔ جلد نازک اور ملائم تھی اور آپ کے جسم اور پسینہ میں ایک قسم کی خوشبو پائی جاتی تھی۔ سر بڑا تھا۔ سینہ فراخ۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ہتھیلیاں چوڑی۔ چہرہ گول۔ پیشانی اور ناک اونچی۔ آنکھیں سیاہ اور روشن۔ اور پلکیں دراز تھیں۔ چلنے میں وقار تھا۔ مگر عموماً تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتا تھا۔ گفتگو میں آہستگی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اگر سنے والا چاہے تو آپ کے الفاظ کو گن سکتا تھا۔ ناراضگی کے وقت چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ اور خوشی کے موقع پر بھی چمک اٹھتا تھا۔ انگلستان کا مشہور مورخ سر ولیم میور آپ کا حلیہ بیان کر کے لکھتا ہے کہ: ”آپ کا سردار نہ رنگ ڈھنگ ایک اجنبی شخص کے دل میں کچھ ایسا رعب پیدا کر دیتا

نہ یاد رکھنے کا مقام ہے کہ بنو قریظہ اور بنو آبیہ اس موقع پر بھی بنو ہاشم سے الگ رہے۔

لے ابن ہشام ۵ ۶ بخاری کتاب صفۃ النبی وشمائل ترمذی۔



تھا جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جب اُسے آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ آپ سے واقف ہو جاتا تھا تو اس کے دل میں بجائے ڈر اور خوف کے عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا ہونے لگتے تھے ۱۱

**مشاغل تجارت** جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب جوان تھے اور

کاروبار زندگی میں مصروف ہونے کا وقت آگیا تھا۔ اور چونکہ ابوطالب کی مالی حالت بھی اچھی نہیں تھی اس لیے بھی اس بات کی ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مناسب کام شروع کر کے اُن کے بوجھ کو ہلکا کریں؛ چنانچہ ابوطالب کی خواہش اور تحریک پر آپ نے تجارت کا کام شروع فرمادیا۔

مکہ سے تجارت کے قافلے مختلف علاقوں کی طرف جاتے تھے۔ جنوب میں یمن اور شمال میں شام کی طرف تو باقاعدہ تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ مکران وغیرہ کے ساتھ بھی تجارت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ان سب ملکوں میں تجارت کی غرض سے گئے ۱۲ اور ہر دفعہ نہایت دیانت و امانت اور خوش اسلوبی اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کیا۔ مکہ میں بھی جن لوگوں کے ساتھ آپ کا معاملہ پڑا وہ سب آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے؛ چنانچہ سائب ایک صحابی تھے۔ وہ جب اسلام لائے تو بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا: میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ ۱۳ سائب نے عرض کی: ”ہاں یا رسول اللہ! آپ پر میرے مال باپ قربان ہوں۔ آپ ایک دفعہ تجارت میں میرے شریک تھے اور آپ نے ہمیشہ نہایت صاف معاملہ رکھا۔“ عبداللہ بن ابی الحسام ایک اور صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کیا اور میرے ذمہ آپ کا کچھ حساب باقی رہ گیا جس پر میں نے آپ سے کہا کہ آپ یہیں اسی جگہ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ مگر مجھے بھول گیا اور تین دن کے بعد یاد آیا اس وقت جب میں اس طرف گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہیں کھڑے تھے۔ مگر آپ نے سوائے اس کے مجھے کچھ نہیں کہا کہ ”تم نے مجھے تکلیف میں ڈالا ہے۔“ میں یہاں تین دن سے تمہارے انتظار میں ہوں۔“ اس سے غالباً یہ مراد نہیں کہ آپ مسلسل تین دن تک اسی جگہ ٹھہرے رہے بلکہ منشاریہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مناسب اوقات میں کبھی کبھی دفعہ اس جگہ جا کر دیر دیر تک عبداللہ کا انتظار فرماتے ہوں گے تاکہ عبداللہ کو آپ کی تلاش کی وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

۱۱۔ میور صفحہ ۲۵ ۱۲۔ زاد النبراس اور سند حنبلی بحوالہ سیرۃ النبی ۱۳

۱۴۔ البداء و جلد ۲ صفحہ ۳۱۶

۱۵۔ البداء و جلد ۲ صفحہ ۳۳۳

اسی قسم کے واقعات سے مکہ والوں میں آپ کا نام امین مشہور ہو گیا تھا اور آپ کی دیانت اور امانت کی وجہ سے سب لوگ آپ کی بہت عزت کرتے تھے اور آپ کو نہایت راست باز اور صادق القول یقین کرتے تھے۔ تجارتی کاروبار کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کے قریب ہوئی تو خدیجہ بنت خویلد نے جو قبیلہ بنو اسد کی ایک نہایت شریف اور مالدار خاتون تھی اور مکہ کی تجارت میں اسکا بہت بڑا حصہ تھا آپ کو تجارتی مال دے کر شام کی طرف تجارت کی غرض سے بھیجا۔ اور اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ کر دیا۔ اس سفر میں آپ کی محنت اور برکت اور دیانتداری کے طفیل اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت نفع ہوا اور آپ نہایت کامیاب ہو کر واپس آئے۔ اسی طرح آپ نے دو تین تجارتی سفر دوسرے علاقوں کی طرف بھی کئے۔

**حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی** حضرت خدیجہؓ ایک بیوہ اور صاحبِ اولاد عورت تھیں اور یکے بعد دیگرے دو خاوند کرچی تھیں۔ مگر دونوں فوت ہو چکے تھے۔ چونکہ نہایت معزز اور دولت مند اور شریف تھیں حتیٰ کہ ان کی شرافت کی وجہ سے ان کا نام طاہرہ مشہور ہو گیا تھا۔ اس لیے مکہ کے کئی لوگوں نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا، مگر انھوں نے سب کا انکار کیا۔ اب جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا معاملہ پڑا اور انھوں نے آپ کے اخلاقی فاضلہ اور قابلیت کو دیکھا اور اپنے خادم میسرہ کو بھی آپ کی تعریف میں رطب اللسان پایا تو انھوں نے خود آپ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے مشورہ کے بعد قبول کر لیا، چنانچہ آپ کے رشتہ دار اور خدیجہؓ کے قریبی رشتہ دار جمع ہوئے اور ابوطالب نے پانسو درہم مہر پر خدیجہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح پڑھ دیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال کی تھی۔ گویا خدیجہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ اس نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے خدیجہؓ کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد نے شرکت کی تھی۔

**آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی اولاد ہوئی وہ سب سوائے ابراہیم کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی، چنانچہ حضرت خدیجہؓ سے آپ کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئے۔ لڑکوں کے نام قاسم، طاہر اور طیب تھے۔ بعض روایتوں میں ایک پوتھا بیٹا عبداللہ بھی بیان ہوا ہے۔ مگر عام خیال یہ ہے کہ طیب کا دوسرا نام عبداللہ تھا۔ لڑکیوں کے نام زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور فاطمہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی



آپ کے دعویٰ نبوت سے پہلے پیدا ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم آپ کے بڑے بیٹے قاسم کے نام پر تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زینہ اولاد سب بچپن میں ہی فوت ہو گئی۔ مگر لڑکیاں سب بڑی ہوئیں اور اسلام لائیں، لیکن سولہ جھوٹی لڑکی فاطمہ الزہراء کے باقی کسی لڑکی کی نسل نہیں چلی۔ بڑی لڑکی زینب ابوالعاص بن ربیع کے ساتھ بیاہی گئیں جو حضرت خدیجہ کے عزیزوں میں سے تھے۔ ابوالعاص کے ہاں زینب کے بطن سے ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی امامہ پیدا ہوئے۔ لڑکا تو بچپن میں ہی فوت ہو گیا، مگر لڑکی بڑی ہوئی اور حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علیؑ کے عقد میں آئی، مگر اس کی نسل نہیں چلی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ابوالعاص ہجرت کے کئی سال بعد تک اسلام نہیں لائے۔ جس کی وجہ سے زینب کو بھی بعض تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی فوت ہو گئیں۔

رقیہ اور اتم کثوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب کے دو لڑکوں عقبہ اور عقیبہ کے عقد میں آئیں مگر اسلام کے زمانہ میں جب ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی تو پیشتر اس کے گڑھ بننا ہوتا یہ دونوں نکاح فسخ ہو گئے۔ اس کے بعد رقیہ اور اتم کثوم یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفان کے نکاح میں آئیں جس کی وجہ سے ان کو ذوالنورین یعنی دونوں ہلال کہتے ہیں۔ مگر ان دونوں کی نسل نہیں چلی۔ یعنی رقیہ کے بطن سے تو ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہو کر فوت ہو گیا اور اتم کثوم کے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔ رقیہ کا جنگ بدر کے زمانہ میں اور اتم کثوم کا فتح مکہ کے بعد انتقال ہو گیا۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؑ تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ یہ ہجرت کے بعد حضرت علیؑ کے عقد میں آئیں اور انہی کے بطن سے حضرت امام حسنؑ اور حسینؑ پیدا ہوئے جن کی اولاد سید کھلاتی ہے۔ حضرت فاطمہؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چھ ماہ بعد فوت ہوئیں۔ حضرت خدیجہ کی اولاد جو ان کے پہلے دو خاندانوں سے تھی وہ دو لڑکوں ہند اور ہالہ اور ایک لڑکی حند پر مشتمل تھی جو خدا کے فضل سے سب مسلمان ہو گئے تھے۔

**کعبہ کی جدید تعمیر** تعمیر کعبہ کا واقعہ باب دوم میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا چکا ہے چونکہ کعبہ کی عمارت کو کسی وجہ سے نقصان پہنچ گیا تھا، اس لیے قریش نے اسے گرا کر پھر از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر گرانے کا کام شروع کرنے سے سب ڈرتے تھے کہ خدا کا گھر ہے کوئی آفت نہ آجائے۔ آخر ولید بن مغیرہ نے جو معمر اور سرداران قریش میں سے تھا اس کام کو شروع کیا اور جب لوگوں نے ایک رات انتظار کر کے دیکھ لیا کہ ولید پر اس وجہ سے کوئی آفت نہیں آئی تو پھر سب

شامل ہو گئے۔ جب پُرانی عمارت کو گراتے گراتے حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر پہنچے تو رک گئے اور ان کے اُوپر  
 نئی تعمیر شروع کی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ساحل کے پاس ایک بڑی کشتی ڈوٹ گئی تھی۔ اس کی لکڑی قریش نے خرید لی۔  
 لیکن چونکہ یہ لکڑی ساری چھت کے لیے ناکافی تھی اس واسطے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ قریش کعبہ کی اس جدید  
 تعمیر کو ابراہیم خلیل اللہ کی بنیادوں پر کھڑا نہیں کر سکے، بلکہ ایک طرف سات ہاتھ جگہ چھوڑ دی بعض اور  
 تہہ بیلایاں بھی قریش نے نکلیں مگر ان کا بیان اُوپر گزر چکا ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جب قریش کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے حجرِ اسود کی جگہ پر پہنچے تو قبائل قریش کے اندر اس بات پر سخت جھگڑا  
 ہوا کہ کون قبیلہ اسے اس کی جگہ پر رکھے۔ ہر قبیلہ اس عزت کو اپنے لیے چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ آپس میں لڑنے  
 مرنے کو تیار ہو گئے اور بعض نے تو زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق ایک غول سے بھرے ہوئے پیالے  
 میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں کھاتیں کہ لڑکر مر جائیں گے مگر اس عزت کو اپنے قبیلہ سے باہر نہ جانے دیں گے۔ اس  
 جھگڑے کی وجہ سے تعمیر کا کام کئی دن تک بند رہا۔ آخر ابوامیہ بن مغیرہ نے تجویز پیش کی کہ جو شخص سب سے پہلے  
 حرم کے اندر آتا دکھائی دے وہ اس بات میں حکم ہو کر فیصلہ کرے کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ اللہ کی  
 قدرت لوگوں کی آنکھیں جو اُنھیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لارہے ہیں۔ آپ کو دیکھ  
 کر سب پکار اُٹھے۔ "این این" اور سب باتفاق کہا کہ "ہم اس کے فیصلہ پر راضی ہیں" جب آپ قریب  
 آئے تو اُنھوں نے آپ سے حقیقت امر بیان کی اور فیصلہ چاہا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ایسا  
 فیصلہ فرمایا کہ سب سردارانِ قریش دنگ رہ گئے اور آفرین پکار اُٹھے۔ آپ نے اپنی چادر لی اور اس پر  
 حجرِ اسود کو رکھ دیا۔ اور تمام قبائل قریش کے رؤساء کو اس چادر کے کونے پکڑوا دیئے اور چادر اٹھانے کا حکم  
 دیا۔ چنانچہ سب نے مل کر چادر کو اٹھایا اور کسی کو بھی شکایت نہ رہی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصویری زبان  
 میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل جو اب ہر سر پیکار ہیں وہ اس پاک وجود کے  
 ذریعہ سے ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے۔ جب حجرِ اسود کی اصلی جگہ کے محاذ میں چادر پہنچی تو آپ نے اپنے  
 دست مبارک سے اُسے چادر پر سے اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا یہ جیسا کہ پہلے کہا گیا تھا تصویری  
 زبان میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ عنقریب نبوت کی عمارت کے "کونے کا پتھر" آپ کے  
 وجود سے اپنی جگہ پر قائم ہو گا۔

عام مورخین کعبہ کی اس تعمیر کی تاریخ کے متعلق صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ یہ آپ کی پینتیس سال کی عمر کا واقعہ  
 ہے حالانکہ اگر اس زمانہ کے حالات کو مد نظر رکھ کر دیکھا جاوے تو دراصل نئی عمارت کے واسطے سامان  
 جمع کرنے اور پُرانی عمارت کو گرانے وغیرہ کا کام ایک کافی لمبا وقت چاہتا تھا۔ لہذا قرین قیاس یہ ہے کہ

اس کام کی تیاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ اور نئی عمارت کے واسطے سامان یعنی پتھر لکڑی وغیرہ آہستہ آہستہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ایک صحیح روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعمیر کعبہ کے واسطے پتھر اٹھا اٹھا کر جمع کر رہے تھے تو آپ کے چچا عباس نے آپ سے کہا۔ بھتیجے اپنا تہ بند اپنے شانہ پر رکھ لو تاکہ پتھروں کی رگڑ وغیرہ نہ لگے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیل حکم تو کی مگر چونکہ اس سے آپ کے جسم کا کچھ ستر والا حصہ ننگا ہو گیا۔ آپ شرم کے مارے زمین پر گر گئے اور آپ کی آنکھیں پتھر لگیں اور آپ بے تاب ہو کر "میرا تہ بند میرا تہ بند" پکارنے لگ گئے۔ حتیٰ کہ پھر آپ نے جلدی سے اپنا تہ بند دُست کر لیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو صرف ابتدائی عمر کی طرف ہی منسوب ہو سکتا ہے، چنانچہ بعض گزشتہ مورخین نے بھی لکھا ہے کہ یہ صغریٰ کا واقعہ ہے۔ یہاں حجر اسود کے متعلق حکم بن کوفیلہ کرنے کا واقعہ بیشک بعد کا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ روایت ہے کہ آپ کو آواز دیکھ کر سب لوگ امین امین پکار اُٹھے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ امین کا لقب آپ نے اس وقت پایا جب معاملات میں پڑ کر آپ کی امانت و دیانت روز روشن کی طرح ظاہر ہو کر مسلم ہو گئی۔

**زید بن حارثہ کا آپ کی خدمت میں آنا** حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے تھے جن کا نام حکیم بن حزام تھا۔ یہ بڑے تاجر آدمی تھے اور ہمیشہ تجارتی

قافلوں کے ساتھ ادھر ادھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ یہ کہیں تجارت کے لیے گئے تو چند ایک غلام خرید کر لائے۔ اور ان میں سے ایک غلام اپنی پھوپھی کی نکلیا۔ اس کا نام زید بن حارثہ تھا۔ زید دراصل ایک آزاد خاندان کا لڑکا تھا مگر کسی لوٹ مار میں قید ہو کر غلام بنایا گیا تھا۔ خدیجہؓ نے زید کو ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ یہ دستور تھا کہ اپنے غلاموں اور خادموں کو نہایت محبت اور پیار کے ساتھ رکھتے تھے۔ اور ان سے اپنے رشتہ داروں کی طرح سلوک کرتے تھے، چنانچہ زید کے ساتھ بھی آپ کو محبت تھی۔ اور زید چونکہ ایک وفادار دل رکھتا تھا، اس لیے اُسے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ارادت ہو گئی۔ اُسی زمانہ میں زید کا باپ حارثہ اور اس کا چچا کعب زید کا پتہ پتے پتے مکتہ آنکھوں سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انھوں نے عاجزی سے استدعا کی کہ زید کو رہا کر کے اُن کے ساتھ بھیج دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں اگر زید جانا چاہے تو میری طرف سے بخوشی اجازت ہے" اس پر زید کو بلایا گیا اور آپ نے اُسے کہا "زید تم ان کو پہچانتے ہو کہ یہ کون ہیں؟ اُس نے عرض کی "ہاں یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں" آپ نے فرمایا "یہ تم کو لینے آئے ہیں۔ اگر تم جانا

چاہتے ہو تو میری طرف سے تم کو بخوشی اجازت ہے۔ زید نے جواب دیا میں آپ کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ آپ میرے لیے میرے چچا اور باپ سے بڑھ کر ہیں۔ زید کا باپ غصہ میں بولا میں! تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے؟ زید نے کہا ہاں! کیونکہ میں نے ان میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ اب میں کسی کو ان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زید کا یہ جواب سنا، تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور زید کو خانہ کعبہ کے پاس لے جا کر بلند آواز سے فرمایا: لوگو! گواہ رہو کہ آج سے میں زید کو آزاد کرتا اور اسے اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ یہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔ زید کے والد اور چچا نے یہ نظارہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اور زید کو بخوشی آپ کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اُس دن سے زید بجائے زید بن حارثہ کے زید بن محمد کہلانے لگے۔ لیکن ہجرت کے بعد جب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم اُترا کہ منہ بولا بیٹا بنانا جائز نہیں ہے تو زید کو پھر زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اور پیار اس وفادار خادم کے ساتھ وہی رہا جو پہلے تھا، بلکہ دن بدن ترقی کرتا گیا اور زید کی وفات کے بعد زید کے روکے اسامہ بن زید سے بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ اتم امین کے بطن سے تھے آپ کا وہی سلوک اور وہی پیار تھا۔

زید کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام صحابہ میں سے صرف انہی کا نام قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔

**علی بن ابی طالب کا آنحضرت کے گھرانے** ابو طالب ایک بہت باعزت آدمی تھے مگر غریب تھے اور بڑی تنگی سے اُن کا گزارہ چلتا تھا۔ خصوصاً ان

آیات میں جبکہ مکہ میں ایک قحط کی صورت تھی اُن کے دن بہت ہی تکلیف میں کھٹے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا کی اس تکلیف کو دیکھا تو اپنے دوسرے چچا عباس سے ایک دن فرمانے لگے چچا! آپ کے بھائی ابو طالب کی معیشت تنگ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اُن کے بیٹوں میں سے ایک کو آپ اپنے گھر لے جائیں اور ایک کو میں لے آؤں؟ عباس نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور پھر دونوں بیٹے ابو طالب کے پاس گئے اور اُن کے سامنے یہ درخواست پیش کی۔ اُن کو اپنی اولاد میں عقیل سے بہت محبت تھی۔ کہنے لگے عقیل کو میرے پاس رہنے دو اور باقیوں کو اگر تمہاری خواہش ہے تو لے جاؤ! چنانچہ جعفر کو عباس اپنے گھر لے گئے اور علیؑ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس لے آئے۔ حضرت علیؑ کی عمر اس وقت قریباً چھ سات سال کی تھی۔ اس کے بعد علیؑ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے۔



## صبح کی سفیدی

اب آپ کی عمر چالیس سال کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اور وقت آگیا تھا کہ صبح کی سفیدی اُنہی مشرق میں نمودار ہو دیوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی مکہ کی عام سوسائٹی میں زیادہ خلا ملا نہیں کیا مگر ان آیام میں خصوصاً آپ کی طبیعت کا یہ حال تھا کہ دن رات اللہ تعالیٰ کی طلب اور اس کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ مکہ کے پاس شہر سے تین میل کے فاصلہ پر سنیٰ کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب کوہ حرا میں ایک غار ہے جس کو غار حرا کہتے ہیں۔ ان آیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام دستور تھا کہ وہاں جاتے اور غور و فکر اور یاد خدا میں مشغول رہتے۔ عام طور پر کئی کئی دن کا کھانا ساتھ لے جاتے اور شہر میں نہ آتے۔ بعض اوقات حضرت خدیجہؓ بھی ساتھ جاتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جسے قرآن شریف میں تلاش حق کا زمانہ کہا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَجَدَكَ مُضِلًّا مُهْدًى - ۱

”یعنی اللہ نے تجھے اپنی تلاش میں سرگردان و حیران پایا۔ پس اُس نے تجھ کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتا دیا۔“

اسی زمانہ میں رویہ صالحہ کا آغاز ہوا جس کا عرصہ چھ ماہ کا بیان ہوا ہے۔ گویا نبوت کی ابتدائی سیڑھی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ:

أَوَّلَ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ النَّوْمُ فِي النَّوْمِ - وَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْهُ مِثْلَ خَلْقِ الْقَبْحِ وَكُنْتُ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءَ فَيَتَجَشَّأُ فِيهِ وَهُوَ السَّعْبُ اللَّيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَّةِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ - فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءَ

یعنی شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس رنگ میں وحی کی ابتداء ہوتی وہ رویہ صالحہ کی صورت میں تھی جو آپؐ نیند کی حالت میں دیکھتے تھے۔ ہر ایک رویہ جو آپؐ دیکھتے تھے وہ صبح کی سفیدی کی طرح پوری ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں آپؐ کو خلوت و تنہائی میں رہنا بہت محبوب تھا۔ آپؐ غار حرا میں جاتے اور وہاں کئی کئی رات عبادت کرتے رہتے پھر گھر آتے اور اپنے ساتھ کچھ اور زاد لے جاتے۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو پھر خدیجہؓ سے آکر لے جاتے۔ آپؐ اسی حالت میں تھے کہ آپؐ کے پاس خدا کی طرف سے حق آگیا۔ اس وقت آپؐ غار حرا میں تھے۔



## ابتدائی زندگی پر ایک سرسری نظر

**واقعات کی قلت** اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوا لیکن طبیعت سیر نہیں اور ہاتھ سے قلم رکھنے کو جی نہیں چاہتا اور دل یہ محسوس کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی چالیس سالہ زندگی کے واقعات اس تفصیل کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں جیسا کہ بعد کے زمانہ کے محفوظ ہیں۔ ایک حد تک یہ ایک طبعی امر ہے کیونکہ جس نظر سے آپ کو نبوت کے زمانہ میں دیکھا جاتا تھا، وہ پہلے زمانہ میں موجود نہیں تھی لیکن پھر بھی اگر ابتدائی مورخین کی طرف سے آپ کی قبل البعثت زندگی کے حالات پر زیادہ توجہ کے ساتھ نظر ڈالی جاتی اور زیادہ محنت اور زیادہ کوشش کے ساتھ واقعات کی تلاش کی جاتی تو بعض مزید حالات دریافت ہو سکتے تھے، تاہم جو کچھ بھی موجود ہے وہ دوسرے سابقہ نبیوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور وہ اس عظیم الشان پاک و بے لوث زندگی کا کافی دشانی ثبوت ہے جو آپ نے بعثت سے پہلے گزاری۔

**آپ کی اُمت** ناظرین نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ اس چالیس سالہ زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ دراصل عرب میں تعلیم بہت ہی کم تھی اور اس لحاظ سے شرفاء اور عوام میں بہت کم امتیاز تھا بلکہ بڑے بڑے سردار بھی عموماً اسی طرح اُن پڑھ اور ناخواندہ ہوتے تھے جس طرح عوام تھے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں پڑھے لکھے لوگ بھی کہیں کہیں پائے جاتے تھے اور ایسے لوگ عموماً دوسرے مقامات کی نسبت قدرے زیادہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ثابت ہے کہ آپ بالکل ناخواندہ اور اُمتی تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اُمت میں خدائی تصرف کا بھی ہاتھ تھا۔ تاکہ دنیا میں آپ کے علمی معجزہ کی شان دوبالا ہو کر چمکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مانہ نبوت میں چونکہ اکثر مراسلات اور معاہدات وغیرہ آپ کے سامنے تیار ہوتے اور آپ کی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ اس لیے آپ کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں کچھ حروف شناسی ہو گئی تھی، چنانچہ ایک حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ لکھے جانے کے وقت آپ نے کفار کی طرف سے اعتراض ہونے پر اپنے نام کے ساتھ سے ”رسول اللہ“ کے الفاظ خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کر ان کی جگہ ”ابن عبد اللہ“ کے الفاظ لکھ دیئے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ اس موقع پر جو محمد کتب کا لفظ حدیث میں لکھ دینے کے لیے استعمال ہوا ہے اُس سے مراد لکھا دینے کے ہوں۔ کیونکہ بعض اوقات عام محاورہ میں لکھنے اور لکھوانے ہر دو کے لیے ایک ہی لفظ بول دیتے ہیں۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کا جو حصہ کاٹا وہ خود اپنے ہاتھ سے کاٹا مگر کاٹنے کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ آپ نے اپنے کاتب لکھوایا، لیکن بہر حال جو بھی مراد لی جاوے اس سے یقیناً آپ کی اُمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

### حلقہ احباب

بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستانہ تعلقات کا دائرہ بہت ہی محدود نظر آتا ہے۔ دراصل شروع سے ہی آپ کی طبیعت علیحدگی پسند تھی اور آپ نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں بھی مکہ کی عام سوسائٹی میں زیادہ خلا نہیں کیا، تاہم بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کے ساتھ آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان سب میں ممتاز حضرت ابوبکرؓ یعنی عبداللہ بن ابی قحافہ تھے۔ جو قریش کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے قوم میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دوسرے درجہ پر حکیم بن حزام تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ یہ نہایت شریف الطبع آدمی تھے۔ شروع شروع میں یہ اسلام نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت اور اخلاص رکھتے تھے۔ آخر سعادتِ طبعی اسلام کی طرف کھینچ لائی۔ پھر زید بن عمرو سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تھے۔ یہ صاحب حضرت عمرؓ کے قریبی رشتہ دار تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی شرک ترک کر رکھا تھا۔ اور اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کی طرف منسوب کرتے تھے مگر یہ اسلام کے زمانہ سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔

اسلام اپنے تفصیلی مسائل کے ساتھ تو بہر حال بعد میں ہی اُترا ہے

### بعثت سے پہلے آپ کا مذہب

اس لیے بعثت سے پہلے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاربند ہونے کا تو کوئی شخص مدعی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی ہوا ہے۔ لیکن یہ بات تاریخ سے پایہ ثبوت تک پہنچی ہوتی ہے کہ بمقتضائے فطرت صحیحہ آپ ہمیشہ عرب سوسائٹی کی گندی رسوم سے مجتنب رہے اور شرک بھی آپ نے کبھی نہیں کیا، چنانچہ زمانہ نبوت میں آپ حضرت عائشہؓ سے فرماتے تھے کہ میں نے بتوں کو چڑھاؤ کا کھانا کبھی نہیں کھایا۔ اور ایک روایت میں حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کھسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے کبھی بتوں کو پوجا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ پھر لوگوں نے پوچھا کیا آپ نے کبھی شراب پی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا کہ میں ہمیشہ سے ان باتوں کو قابلِ نفرت سمجھتا رہا ہوں، لیکن اسلام سے پہلے مجھے شریعت اور ایمان کا کوئی علم نہیں تھا۔

## آپ کے اخلاق و عادات

یہ بتایا جا چکا ہے کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اندر امین کے لقب سے مشہور تھے جو آپ کی امانت و

دیانت اور اخلاق فاضلہ کا بین ثبوت ہے آپ کی راست گفتاری کا یہ حال تھا کہ ابو جہل جیسا معاند جو آپ کے خون کا پیاسا تھا ایک دفعہ زمانہ نبوت میں آپ کو مخاطب ہو کر کہنے لگا :

إِنَّا لَا نَكْذِبُكَ وَلَكِنْ نَكْذِبُ بِمَا جِئْتَ بِهِ

”اے محمد! ہم تجھے جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اس بات کو جھوٹا کہتے ہیں جو تو لایا ہے“

ابوسفیان ہر قل شہنشاہ روم کے سامنے پیش ہوا۔ تو ہر قل نے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے

میں پوچھا :

هَلْ كُنْتُمْ تَتَّبِعُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ ؟

”کیا تم نے اس دعویٰ سے پہلے کسی اس شخص کا کوئی جھوٹ دیکھا ؟“

ابوسفیان اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برسرِ پیکار تھا۔ لیکن اس سوال کے جواب میں اُسے

بھی بجز ”نہیں“ کے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ امیتہ بن خلف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا۔

لیکن جب حضرت سعد بن معاذ نے اس کو یہ خبر سنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری موت کی پیش گوئی

کی ہے تو اُس کے اوسانِ خطا ہو گئے۔ اور اس نے مگر جا کر اپنی بیوی سے یہ ذکر کیا اور کہا :

وَاللَّهِ مَا يَكْذِبُ مُعْتَذِرًا إِذَا أَحْدَثَ شَيْءًا

”خدا کی قسم۔ محمد جب کوئی بات کہتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا“

پھر انظر بن الحارث اشد ترین معاندین اسلام میں سے تھا۔ لیکن جب اس نے کسی شخص سے یہ کہتے سنا

کہ نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جھوٹا ہے تو بے اختیار ہو کر بولا :

قَدْ كَانَ مُعْتَذِرًا فَبِكُمْ غُلًا مَا أَحْدَثْنَا أَرْصَاكُمْ فَبِكُمْ وَأَمْدَقُكُمْ

حَدِيثًا وَأَعْظَمُكُمْ أَمَانَةً حَتَّى إِذَا أَرْتَيْتُمْ فِي صَدْعِيهِ الشَّيْبَ وَ

جَاءَكُمْ بِمَا جَاءَكُمْ بِهِ قُلْتُمْ سَاحِرٌ زَلَّ اللَّهُ مَا هُوَ بِسَاحِرٍ

”یعنی محمد تم میں ہی ایک چھوٹا سا بچہ ہوتا تھا اور وہ تم سب میں سے زیادہ پسندیدہ اخلاق

والا تھا اور سب سے زیادہ راست گو تھا اور سب سے زیادہ امین تھا اور اس کے متعلق تمہاری

یہی رائے رہی۔ حتیٰ کہ جب تم نے اس کی زلفوں میں سفیدی دیکھی اور وہ

بڑھاپے کو پہنچا اور وہ تمہارے پاس وہ کچھ لایا جو کہ وہ لایا تو تم یہ کہنے لگے کہ وہ ساحر ہے اور جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم وہ جھوٹا اور ساحر تو ہرگز نہیں۔

اس سے انتظار بن الحارث کی بھی وہی مراد تھی جو ابو جہل نے کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ اُس کے لئے ہوتے دین کو جھوٹا کہتے ہیں۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام شروع کی۔ اور ایک پہاڑی پر چڑھ کر قریش کو جمع کیا۔ اور اُن سے کہا کہ ”اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کی پھلی داوی میں ایک بڑا شکوہ جمع ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟“ تو باوجود اس کے کہ بظاہر یہ بات بالکل بعید از امکان تھی سب نے کہا:

لَعَنَ مَا جَرَّبَنَا حَلِيثًا إِلَّا صِدْقًا

”ہاں! ہم مانیں گے کیونکہ ہم نے تجھ کو ہمیشہ صادق پایا ہے۔“

آپ نے فرمایا:

”تو پھر میں تم کو بتاتا ہوں کہ اللہ کا عذاب تمہارے قریب آ رہا ہے جس سے اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔“ یہ سب شہادتیں اشد ترین دشمنوں کی ہیں۔ اور مومنوں کی طرف سے تو کبھی شہادت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُن کا ایمان لانا ہی ایک زبردست مجسم شہادت ہے لیکن میں اس موقع پر آپ کی زوجہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شہادت درج کرنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہلی دفعہ خدائی فرشتہ وحی لے کر آیا اور آپ نے سخت گھبرا کر خدیجہ سے کہا کہ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ تو خدیجہ نے جو محرم حال تھی بے ساختہ طور پر یہ الفاظ کہے کہ:

كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَتَّصِلُ بِرَحْمَةِ وَلَدَيْكَ الْحَدِيثِ  
وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الْغَنِيَّةَ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ  
”ہرگز نہیں ہرگز نہیں! خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ اور صادق القول ہیں۔ اور لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔ اور آپ نے گمشدہ اخلاق کو اپنے اندر جمع کیا ہے۔ اور آپ مہمان نواز ہیں۔ اور حق کی راہ میں لوگوں کے مددگار ہوتے ہیں۔“

یہ اس معزز خاتون کی شہادت ہے جو دن رات اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے سوتے جاگتے آپ کو دیکھتی تھی۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

## آغاز رسالت

### طلوع آفتاب

نبیج کی سفیدی اُفتی مشرق میں نمودار ہو رہی تھی۔ اور آفتاب عالم تاب طلوع کرنے کو تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول غار حرا میں تشریف لے جاتے اور اپنے رنگ میں عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے۔ روایا صالحہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ماہ گزراے یہ

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال کی تھی اور طبیعت نبوت و رسالت کی پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ رمضان کا مبارک مہینہ تھا اور اس کے آخری عشرہ کے ایام تھے اور پیر کا دن تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معمول غار حرا میں عبادت الہی میں مصروف تھے کہ یکجہت آپ کے سامنے ایک غیر مانوس ہستی نمودار ہوئی۔ اُس ربانی رسول نے جو خدائی فرشتہ جبرائیل تھا آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اِقْرَأْ پڑھ یعنی مُننہ سے بول یا لوگوں تک پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ میں تو نہیں پڑھ سکتا یعنی میں تو یہ کام نہیں کر سکتا فرشتہ نے یہ جواب سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچڑا اور اپنے سینے سے لگا کر بھیڑا اور پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پھر وہی جواب تھا۔ فرشتہ نے پھر بچڑا اور زور سے بھیڑا اور پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأْ۔ مگر ادھر سے پھر وہی تاثر تھا۔ اُس پر اُس ربانی رسول نے آپ کو تیسری دفعہ بچڑا اور نہایت زور سے بھیڑا گویا اپنی انتہائی کوشش سے اس معانقہ کے ساتھ آپ کے قلب پر اثر ڈالتا تھا۔ اور پھر اس تسلی کے بعد کہ اب آپ کی طبیعت اس پیغام کے لینے کے لیے آمادہ ہو چکی ہے اس نے آپ کو چھوڑ کر کہا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ  
الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝  
پڑھ یعنی مُننہ سے بول یا لوگوں تک پہنچا اپنے رب کا نام۔ جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا اس

لے نبیج بکوارہ زرقانی باب مبعث البتہ صلعم ۛ ۛ ۛ قرآن کے سننے پیغام پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں اِقْرَأْ مَنَاجِیَ السَّلَامِ  
یعنی میرا سلام لے پہنچا دو۔ دیکھو اقرب الموارد ۛ ۛ ۛ یہ ایسا ہی جواب تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ نے دیا تھا کہ میں نبوت کا اہل  
نہیں ہوں یہ کام کسی اور کے سپرد فرمایا جاوے مگر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس بات کو کون جانتا ہے کہ رسالت کا اہل کون ہے۔  
ۛ ۛ بخاری کتاب بدو الوجی ۛ ۛ ۛ اس جگہ نحوی ترکیب میں لفظ استعد اقراء کا مفعول ہے۔ عربی قواعد کوئی لہ سے اقراء کے مفعول  
پر بعض اوقات ب زائد آجایا کرتی ہے۔ دیکھو اقرب الموارد ۛ ۛ ۛ



نے انسان کو ایک ٹون کے لوٹھڑے سے۔ ہاں پڑھ۔ تیرا رب بہت عزت و شان والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ سکھایا اس نے انسان کو وہ کچھ جو وہ جانتا نہ تھا۔ لے یہ کہہ کر فرشتہ فاطمہ ہو گیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سخت گھبراہٹ اور اضطراب کی تھی اور دل دھڑک رہا تھا کہ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اسی حالت میں آپ جلدی جلدی غار حرا سے نکل کر گھر کی طرف لوٹے اور خدیجہؓ سے فرمایا: ”ذِمَّتُوفِي“۔ ذِمَّتُوفِي“ مجھ پر کوئی پکڑا ڈالو۔ مجھ پر کوئی پکڑا ڈالو۔ حضرت خدیجہؓ اپنے محبوب خاندن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی سے آپ کو پکڑا اور ڈھا دیا۔ جب ذرا اطمینان ہوا۔ اور گھبراہٹ کچھ کم ہوتی تو آپ نے سارا ماجرا حضرت خدیجہؓ کو سنایا اور آخر میں فرمایا: لَنْتَذْخِشِيَتْ عَلَى نَفْسِي“ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ مگر خدیجہؓ جو آپ کی حالت سے خوب واقف تھیں بولیں:

كَلَّا أَبْشِرْ فَوَاللَّهِ لَا يُغْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحْمَةَ وَلَتَصِدُقَ الْحَدِيثَ  
وَتُحْمِلُ الْكَلَّ وَتُكْسِبُ الْمُدَّوْرَ وَتَقْرِي الْعَتِيفَ وَتُعِينِ عَلَى نَوَاصِبِ الْحَقِّ.  
”نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ خوش ہوں۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رُسا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور صادق القول ہیں اور لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں اور معدوم اخلاق کو آپ نے اپنے اندر جمع کیا ہے اور آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی باتوں میں لوگوں کے مددگار بنتے ہیں۔“

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو شمرک کا نازک ہو کر عیسائی مذہب کا پیرو ہو چکا تھا۔ اور گذشتہ صفحہ انبیاء سے کسی قدر واقف تھا اور اب بوڑھا تھا حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کی بینائی تک بھی جا چکی تھی۔ اس کے پاس آپ کو لے جا کر حضرت خدیجہؓ نے کہا: ”بھائی ذرا اپنے اس بھتیجے کی بات تو سن لو“ اُس نے کہا: ”ہاں کیا معاملہ ہے؟“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ماجرا سنایا۔ جب ورقہ ساری کیفیت سن چکا تو بولا: ”یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰؑ پر وحی لاتا تھا۔ اے کاش! مجھ میں طاقت ہوتی۔ اے کاش! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھے وطن سے نکال دے گی۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حیران ہو کر پوچھا: ”اَوْ مُخْبِرٌ جِئْتُكَ“ ”کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟“ ورقہ نے کہا: ”ہاں کوئی رسول نہیں آیا کہ اس کے ساتھ اُس کی قوم نے عداوت نہ کی ہو۔ اور اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ تیری مدد کروں گا“ مگر ورقہ کو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے کیونکہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

لے یعنی اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ انسان کو مسلم کے ذریعہ سے نئے نئے علوم سکھائے جائیں۔  
لے بخاری باب بدعہ اہل مدینہ۔

## فترۃ وحی

اس کے بعد وحی کا سلسلہ رک گیا۔ اور ایک عرصۃ تک جس کا اندازہ ابن عباسؓ کی ایک روایت کے مطابق چالیس یوم بیان ہوا ہے۔ یہ سلسلہ رک رہا۔ اس زمانہ کو فترۃ کا زمانہ کہتے ہیں۔ گویا آفتاب رسالت کی روشنی ایک دفعہ نظر آئی اور پھر فاقہ ہو گئی۔ آپؐ کے بہائے تشنہ پر بارش کا ایک پھینٹا پڑا اور پھر بادل پھٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایام سخت گھبراہٹ اور بے چینی کی حالت میں گزارے۔ دن رات اُٹھتے بیٹھتے یہی خیال تھا کہ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے اور کیا ہونے والا ہے اور اس غیر مانوس غیبی رسولؐ کا آنا کیا معنی رکھتا ہے اور کیا یہ پیامِ سلام خدا کی طرف سے ہے یا میرے اپنے نفس کا ہی کوئی غفی پر تو ہے؟ ان سوالات نے آپؐ کو سخت بے چین کر رکھا تھا حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان ایام میں آپؐ کو اتنی گھبراہٹ تھی کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور ارادہ کیا کہ وہاں سے اپنے آپ کو گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیں مگر ہر ایسے موقع پر الہی فرشتہ آواز دیتا: دیکھو محمدؐ ایسا نہ کرو تم واقعی اللہ کے رسولؐ ہو، یہ آواز سن کر آپؐ رک جاتے مگر پھر بے چینی اور اضطراب کی حالت پیدا ہوتی تو بے اختیار ہو کر پھر اپنے آپ کو ہلاک کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ میں ظاہری معنی مراد نہ ہوں اور اپنے آپ کو بلندی سے گرا کر زندگی کا خاتمہ کر دینے کا یہ مطلب ہو کہ چونکہ آپؐ کو یہ ڈر تھا کہ کہیں اس غیبی فرشتہ کا نظر آنافنس ہی کا پرتو نہ ہو۔ یا یہ سب نظارہ خدا کی طرف سے بطور امتحان کے ہو، اس لیے آپؐ نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے نفس کو مزید گرا کر اور پست و مخلوب کر کے گویا خدا کی راہ میں اسے بالکل ہی مار دیں۔ اس صورت میں پہاڑ پر سے اپنے آپ کو گرا دینے کے الفاظ گویا بطور استعارہ کے سمجھے جائیں گے۔ بہر حال خواہ کوئی بھی معنی ہوں آپؐ کے لیے یہ دن بڑی کش مکش کے دن تھے اور اسی کش مکش کی حالت میں آپؐ ایک دن غارِ حرا سے گھر کی طرف واپس آئے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی۔ گویا کوئی شخص آپؐ کو مخاطب کر رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے پیچھے، دائیں بائیں سب طرف دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر آپؐ نے اُد پر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک عظیم الشان کُرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہے جو غارِ حرا میں آپؐ کو نظر آیا تھا۔ آپؐ نے یہ نظارہ دیکھا تو سہم گئے اور گھبراتے ہوئے جلدی جلدی گھر آئے۔ اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: دُشْرُونِی! دُشْرُونِی! مجھ پر کوئی کپڑا ڈھانک دو، خدیجہؓ نے جلدی سے کپڑا اوڑھ لیا۔ اور آپؐ لیٹ گئے۔ آپؐ کا لیٹنا تھا کہ ایک پُر جلال آواز آپؐ کے کانوں میں آئی:

۱۔ بخاری باب مذکور

۲۔ زرقانی جلد اباب مراتب الوحی

۳۔ بخاری باب بدو الوحی

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ قُمْ فَأَنذِرْ ۚ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۚ وَشَيْئًا بَكَ تَطْلُبْ ۚ  
وَالرَّجْزَ قَاطِعْ ۚ

”یعنی اے چادر میں پٹے ہوئے شخص! اٹھ کھڑا ہو۔ اور لوگوں کو خدا کے نام پر بیدار کر۔ اٹھ اور اپنے رب کی بڑائی کے گیت گا اور اپنے نفس کو پاک و صاف کر اور ہر قسم کے شرک سے پرہیز کر“  
اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری ہو گیا۔

### آغازِ تبلیغ

اب آپ کی طبیعت میں یکسوئی اور اطمینان تھا؛ چنانچہ آپ نے لوگوں کو توحید باری تعالیٰ کی طرف بلانا شروع کیا اور شرک کے خلاف تعلیم دینے لگے مگر شروع شروع میں آپ نے اپنے منہ کا کھلم کھلا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ نہایت خاموشی کے ساتھ کارروائی شروع کی اور صرف اپنے ملنے والوں کے حلقہ تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔

### اسلام کا پیغام

گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لاقی ہوئی تعلیم کا ڈھانچہ بیان کرنے کے لیے اہل موقعہ آگے آتے گا، لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ بھی ایک مختصر سا خاکہ اسلام کا درج کر دیا جائے تاکہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ کیا تھا اور اس کے اصول کیا تھے۔ سو جانا چاہیے کہ جو مذہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا اس کا نام اسلام ہے جس کے معنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینے کے ہیں اور یہی آپ کی لاقی ہوئی تعلیم کا حقیقی خلاصہ ہے۔ آپ کے مذہب کا پہلا اور سب سے بڑا اصول توحید باری تعالیٰ ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک خدا ہے جو اپنی ذات و صفات میں واحد لا شریک ہے اور وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کی پیدا کردہ اور اسی کے سہارے سے قائم ہے، اس لیے اس کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں اور وہ تمام معبود جو خدا کے سوا لوگوں نے بنا رکھے ہیں وہ سب فرضی اور باطل ہیں۔ یہ وہ سب سے پہلا اور سب سے بڑا اصول ہے جو آپ نے اہل مکہ کے سامنے پیش کیا۔ دوسرا اصول آپ نے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک خاص غرض و غایت کے ماتحت پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ لوگ اُسے پہچان کر اس کے رنگ میں رنگین ہوں اور اپنے لیے اُبدی ترقی کا سامان پیدا کریں۔ اور اس غرض کے لیے اُس نے انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک دُنیا کی زندگی جو کہ دارالعمل ہے اور ایک آخرت کی زندگی جو کہ دارالجزا ہے اور ان ہر دو زندگیوں کے درمیان موت کو حد فاصل مقرر کیا گیا ہے۔ تیسرا اصول آپ نے یہ پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لیے اپنی طرف سے رسول اور نبی مبعوث کرتا

رہتا ہے جو خدا سے علم پاکر دنیا کی ہدایت کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسے رسول اور نبی ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں گذرے ہیں اور انہیں میں سے آپ بھی خدا کے ایک رسول ہیں۔ یہ وہ تین اصل الاصول ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مشن کی بنیاد تھیں۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا بعض مزید اصول اور ان اصول کی مزید فروغ اور مزید تفصیلات نازل ہوتی گئیں حتیٰ کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیم موجودہ قرآن مجید کی صورت میں اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور آپ سب اولین و آخرین کے سردار اور خاتم النبیین اور آخری اور کامل شریعت لانے والے قرار دیتے گئے۔

**سب پہلا مسلمان** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے مشن کی تبلیغ شروع کی تو سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ بنت خویلد نے ایک لمحہ کے لیے بھی تردد

نہیں کیا۔ حضرت خدیجہ کے بعد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے بعض حضرت ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ کا نام لیتے ہیں بعض حضرت علیؓ کا جن کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ اور بعض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کا۔ مگر ہمارے نزدیک یہ جگہ افضل ہے۔ حضرت علیؓ اور زید بن حارثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آدمی تھے اور آپ کے بچوں کی طرح آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا اور ان کا ایمان لانا۔ بلکہ ان کی طرف سے تو شاید کبھی قول اقرار کی بھی ضرورت نہ تھی۔ پس ان کا نام بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں اور جو باقی رہے ان سب میں سے حضرت ابوبکرؓ مستلمہ طور پر مقدم اور سابق بالایمان تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر حسان بن ثابت انصاری حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کہتے ہیں۔

إِذَا تَذَكَّرْتَ شَجْعًا مِنْ أَخِي تَعَفٍّ      فَاذْكُرْ أَخَاكَ أَبَا بَكْرٍ بِمَا فَعَلَ  
خَيْرَ الْأَبْرِيَّةِ أَلْقَاهَا وَأَعَدَّ لَهَا      بَعْدَ النَّبِيِّ وَأَذْفَاهَا بِمَا حَمَلَ  
أَتَانِي النَّاسُ الْمُتَعَمِّدُ مُشْهَدُهُ      وَأَوَّلُ النَّاسِ مِنْهُمْ صَدَقَ الرَّسُولُ

یعنی "جب تمہارے دل میں کبھی کوئی درد آمیز یاد تمہارے کسی اچھے بھائی کے متعلق پیدا ہو تو اس وقت اپنے بھائی ابوبکرؓ کو بھی یاد کر لیا کرو۔ اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے جو یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگوں میں سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ منصف مزاج تھا اور وہ سب سے زیادہ پورا مکر نیوالا تھا اپنی اُنی دہائیوں کو جو اُس نے اٹھائیں۔ ہاں ابوبکرؓ وہی تو ہے جو غار ثور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرا شخص تھا جس نے اپنے آپ کو آپ کی اتباع میں بالکل محو کر رکھا تھا اور وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا اسے خوبصورت بنا دیتا تھا اور وہ ان سب لوگوں میں سے پہلا تھا جو رسول پر ایمان لائے۔

حضرت ابوبکرؓ اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے قریش میں بہت محترم و معزز تھے۔ اور اسلام میں تو ان کو  
 وہ رتبہ حاصل ہوا جو کسی اور صحابی کو حاصل نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک لمحہ کے لیے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کے دعویٰ میں شک نہیں کیا بلکہ سننے ہی قبول کیا۔ اور پھر انھوں نے اپنی ساری توجہ اور اپنی جان اور مال کو آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت میں وقف کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں ابوبکرؓ  
 کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد وہ آپؐ کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ اپنی خلافت کے زمانہ  
 میں بھی انہوں نے بے نظیر قابلیت کا ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق یورپ کا مشہور مستشرق سپرنگر  
 لکھتا ہے کہ :

”ابوبکرؓ کا آغاز اسلام میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانا اس بات کی  
 سب سے بڑی دلیل ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ دھوکا کھانے والے  
 ہوں مگر دھوکا دینے والے ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ صدقِ دل سے اپنے آپ  
 کو خدا کا رسول یقین کرتے تھے۔“

اور سر و کیم میور کو بھی سپرنگر کی اس رائے سے کئی اتفاق ہے۔

**سابقین** حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، اور زید بن حارثہ کے بعد اسلام لانے والوں  
 میں پانچ اشخاص تھے جو حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغ سے ایمان لائے۔ اور یہ سب کے سب  
 اسلام میں ایسے جلیل القدر اور عالی مرتبہ اصحاب نکلتے کہ چوٹی کے صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے  
 نام یہ ہیں :

اول حضرت عثمانؓ بن عفان جو خاندان بنو امیہ میں سے تھے۔ اسلام لانے کے وقت ان کی عمر قریباً تیس  
 سال کی تھی۔ حضرت عمرؓ کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے خلیفہ ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نہایت باحیا  
 با وفا۔ نرم دل۔ قیاض اور دولت مند آدمی تھے۔ چنانچہ کئی موقعوں پر انہوں نے اسلام کی بہت بہت مالی خدمات  
 کیں۔ حضرت عثمانؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے  
 انہیں پے درپے اپنی دو لڑکیاں شادی میں دیں جس کی وجہ سے انہیں ذوالنورین کہتے ہیں۔

دوسرے عبدالرحمن بن عوفؓ تھے جو خاندان بنو زہرہ سے تھے جس خاندان سے آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی والدہ تھیں۔ نہایت سمجھدار اور بہت سلیبی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے۔ حضرت عثمانؓ کی  
 خلافت کا سوال انہی کے ہاتھ سے طے ہوا تھا۔ اسلام لانے کے وقت ان کی عمر قریباً تیس سال کی  
 تھی۔ عہد عثمانی میں فوت ہوئے۔



تیسرے سعد بن ابی وقاصؓ تھے جو اس وقت بالکل نوجوان تھے یعنی اس وقت اُن کی عمر انیس سال کی تھی۔ یہ بھی بنو نہرہ میں سے تھے اور نہایت دلیر اور بہادر تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عراق انہی کے ہاتھ پر فتح ہوا۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔

چوتھے زبیر بن العوامؓ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے زاد بھائی تھے۔ یعنی صفیہ بنت عبد المطلب کے صاحبزادے تھے اور بعد میں حضرت ابو بکرؓ کے داماد ہوئے۔ یہ بنو اسد میں سے تھے اور اسلام لانے کے وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر کو غزوہ خندق کے موقع پر ایک خاص خدمت سرانجام دینے کی وجہ سے حواری کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ زبیرؓ حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں جنگ جمل کے بعد شہید ہوئے۔

پانچویں طلحہ بن عبید اللہؓ تھے جو حضرت ابو بکرؓ کے خاندان یعنی قبیلہ بنو تیم میں سے تھے اور اس وقت بالکل نوجوان تھے۔ طلحہ بھی اسلام کے خاص فدا یان میں سے تھے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

یہ پانچوں اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ہیں یعنی اُن دستِ اصحاب میں داخل ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے خاص طور پر جنت کی بشارت دی تھی اور جو آپؐ کے نہایت مقرب صحابی اور مشیر شمار ہوتے تھے۔

ان لوگوں کے بعد اور لوگ جو شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، وہ بعض تو قریش میں سے تھے اور بعض دوسرے قبائل میں سے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں :

ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن الجراحؓ جن کے ہاتھ پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شام فتح ہوا۔ یہ نہایت نیک اور صوفی مزاج آدمی تھے جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امین الملت کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ابو عبیدہ قریش کے قبیلہ بنو خلیج میں سے تھے جنہیں بعض اوقات فہر بن مالک کی طرف منسوب کر کے فہری بھی کہہ لیتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی نظریں ابو عبیدہ کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ اگر حضرت عمرؓ کی وفات پر ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو وہی خلیفہ ہوتے۔ حضرت ابو بکرؓ بھی ابو عبیدہؓ کی بہت قدر کرتے تھے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جن لوگوں کو حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کا اہل قرار دیا تھا، اُن میں سے ابو عبیدہؓ بھی تھے۔ ابو عبیدہؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ بڑے طاعون سے شہید ہوئے۔

پھر عبیدہ بن الحارثؓ تھے جو بنو مطلب میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی

رشتہ دار تھے۔ پھر ابوسلمہ بن عبدالاسد تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے اور بنو مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی وفات پر ان کی بیوہ اتم سلمہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی۔ ابوحنیفہ بن عتبہ تھے جو بنو امیہ میں سے تھے۔ ان کا باپ عتبہ بن ربیعہ سردار ان قریش میں سے تھا۔ ابوحنیفہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں سید کذاب کے ساتھ ہوئی تھی۔ سعید بن زیدؓ تھے جو بنو عدی میں سے تھے اور حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔ یہ زید بن عمرو بن نفیل کے صاحبزادے تھے جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی شرک ترک کر رکھا تھا۔ سعیدؓ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔ عثمان بن مظعونؓ تھے جو بنو جمح میں سے تھے۔ نہایت صوفی مزاج آدمی تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی شراب ترک کر رکھی تھی اور اسلام میں بھی تارک دنیا ہونا چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے کہ اسلام میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی۔ ارقم بن ابی ارقمؓ جن کے مکان کو جو کوہ صفا کے دامن میں تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اپنا تبلیغی مرکز بنایا۔ ارقمؓ بنو مخزوم میں سے تھے۔ پھر عبداللہ بن جحش اور عبید اللہ بن جحش تھے۔ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹی زاد بھائی تھے۔ مگر قبیلہ قریش سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ زینب بنت جحش جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں انہی کی بہن تھیں۔ عبید اللہ بن جحش ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی بت پرستی ترک کر رکھی تھی۔ اسلام آیا تو وہ مسلمان ہو گیا، لیکن جب وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گیا تو کبھی وجہ سے وہاں اسلام سے منحرف ہو کر عیسائی ہو گیا۔ اس کی بیوہ اتم حبیبہ جو قریش کے مشہور رئیس ابوسفیان کی لڑکی تھی بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئی۔

ان لوگوں کے علاوہ عبداللہ بن مسعودؓ تھے جو غیر قریشی تھے اور قبیلہ حذیل سے تعلق رکھتے تھے۔ عبداللہ ایک بہت غریب آدمی تھے اور عقبہ بن ابی معیط رئیس قریش کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے اور آپؐ کی صحبت سے بالآخر نہایت عالم و فاضل بن گئے۔ فقہ حنفی کی بنیاد زیادہ تر انہی کے اقوال و اجتہادات پر مبنی ہے۔ پھر بلالؓ بن رباح تھے جو امیہ بن خلف کے حبشی غلام تھے ہجرت کے بعد مدینہ میں اذان دینے کا کام انہی کے سپرد تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے اذان کہنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں شام فتح ہوا تو ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے اصرار پر انہوں نے پھر اذان کہی جس پر سب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آ گیا، چنانچہ وہ خود اور حضرت عمرؓ اور دوسرے

صحاب جو اس وقت موجود تھے اتنے روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ حضرت عمرؓ کو بلانے سے اتنی محبت تھی کہ جب وہ فوت ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "آج مسلمانوں کا سر وار گزر گیا" یہ ایک غریب حبشی غلام کے متعلق بادشاہ وقت کا قول تھا۔ پھر امیر بن فہیرہ تھے جن کو حضرت ابو بکرؓ نے غلامی سے آزاد کر کے خود اپنے پاس نوکر رکھ لیا تھا۔ پھر خیابث بن الارت تھے جو ایک آزاد شدہ غلام تھے اور ان دنوں مکہ میں لوہار کا کام کیا کرتے تھے۔ پھر ابو ذرؓ تھے جو قبیہ فہار سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ سنا تو تحقیقات کے لیے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ مکہ آیا اور واپس جا کر ابو ذرؓ کو حالات سے اطلاع دی، مگر اس سے ابو ذرؓ قسطنطینی نہیں ہوتی اس لیے اس کے بعد وہ خود مکہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کا قصہ بخاری میں مفصل درج ہے اور بہت دلچسپ ہے۔ ابو ذرؓ نہایت زاہد اور صوفی مزاج آدمی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی صورت میں بھی مال جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ اس بناء پر بعض اوقات بعض دوسرے صحابہ سے ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ یہ وہ چند لوگ ہیں جو ابتدائی تین چار سال میں اسلام لائے۔ ان میں سے شادی شدہ لوگوں کے بیوی بچے بھی عموماً ان کے ساتھ تھے، چنانچہ اس زمانہ میں مسلمان ہونے والی عورتوں میں مؤمنین نے حضرت خدیجہؓ کے بعد اسماء بنت ابی بکرؓ اور فاطمہ بنت خطابؓ زوجہ سید بن زید کا نام خاص طور پر لیا ہے۔ ان کے علاوہ عورتوں میں عباس بن عبد المطلب کی بیوی اُم فضل بھی ابتدائی مسلمانوں میں سے تھیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک عباسؓ خود اسلام نہیں لائے تھے۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تین چار سالہ تبلیغی جدوجہد کا نتیجہ بھی چند گنتی کی جانیں تھیں۔ مگر ان سابقین الاولین میں سے سوائے حضرت ابو بکرؓ کے ایک بھی ایسا نہ تھا جو قریش میں کوئی خاص اثر یا جاہت رکھتا ہو۔ بعض غلام تھے اور اکثر لوگ غریب اور کمزور تھے۔ بعض البتہ قریش کے اعلیٰ گھرانوں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان میں سے بھی زیادہ تر نوجوان تھے۔ بلکہ بعض کو تو گویا پتے ہی کہنا چاہیے اس لیے وہ ابھی اس حالت کو نہ پہنچے تھے کہ اپنے قبیلے میں کوئی اثر پیدا کر سکیں اور جو معمر تھے وہ غربت یا کمزوری اور وجہ سے کوئی اثر نہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے قریش میں یہ عام خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صرف چھوٹے اور کمزور لوگوں نے مانا ہے، چنانچہ جب کئی سال بعد ہرقل شہنشاہ روم نے رئیس مکہ ابوسفیان سے دریافت کیا کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑے لوگ مانتے ہیں یا کہ کمزور اور چھوٹے لوگ؟ تو ابوسفیان نے یہی جواب دیا کہ کمزور اور چھوٹے لوگ مانتے ہیں۔ جس پر ہرقل نے کہا اور خوب کہا کہ اللہ کے رسول کو شروع شروع میں چھوٹے لوگ ہی مانا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیعت لینے کا طریق  
اس موقع پر یہ ذکر نامناسب نہ ہو گا کہ جب کئی  
شخص مسلمان ہونے کے لئے آتا تھا تو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ آپ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مقررہ الفاظ میں اسلام کا اقرار  
کرواتے تھے اور یہ عہد دیتے تھے کہ آئندہ وہ ہر معروف امر میں آپ کی فرمانبرداری کرے گا۔ اسلام کے  
اقرار میں اصولی باتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کروا کے اقرار لیا جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کو ایک واحد  
لا شریک یقین کروں گا اور کسی قسم کا شرک نہیں کروں گا اور ہر قسم کے اعمال شنیعہ مثلاً چوری، زنا، قتل،  
جھوٹ وغیرہ سے پرہیز کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے آپ اقرار تو یہی لیتے تھے  
جو مردوں سے لیا جاتا تھا، مگر آپ عورتوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے تھے بلکہ صرف زبانی اقرار  
لے لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب جہاد بالسیف کے متعلق احکام نازل ہوئے تو آپ نے بیعت میں جہاد  
کے متعلق بھی الفاظ زیادہ فرمادیئے، لیکن عورتوں کی بیعت آخر تک اسی ابتدائی صورت میں قائم رہی۔  
بیعت کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ آپ غیر محرم عورتوں کے ساتھ مصافحہ  
نہیں کرتے تھے۔ اور پردہ کا حکم نازل ہونے کے بعد تو شرعاً غیر محرم مرد و عورت کا ایک دوسرے  
پر اپنی زینت کا اظہار خواہ وہ نظر کے ذریعہ ہو یا لمس وغیرہ کے ذریعہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔

ابتدائی اخفا اور قریش کا رویہ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں قریش میں برس

مسلمانوں کا کوئی خاص مرکز بھی نہ تھا جہاں وہ جمع ہو سکتے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مسلمانوں  
کی تبلیغ سے جو متلاشیان حق آتے تھے ان سے آپ عموماً اپنے مکان کے اندر ہی ملتے تھے یا شہر سے  
باہر کسی جگہ ملاقات فرماتے تھے اس اخفا کا یہاں تک اثر تھا کہ بعض اوقات خود مسلمانوں کو ایک دوسرے  
کے اسلام کا پتہ نہ لگتا تھا جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان اپنے اسلام کو عام طور پر چھپاتے تھے  
اور سرداران قریش کے کانوں تک تو بہت ہی کم خبر پہنچتی تھی لیکن اگر کبھی خبر پہنچ بھی جاتی تو بھی ان کی  
طرف سے ان آیام میں عموماً مسلمانوں سے کوئی تعارض نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی مخالفت عملاً ہنسی مذاق  
تک ہی محدود رہتی تھی کیونکہ وہ اس تمام کارروائی کو ایک بچوں کا کھیل سمجھتے تھے۔ یا اگر کبھی کوئی شخص  
زیادہ سختی سے مخالفت کرتا بھی تھا تو یہ اس کا ذاتی فعل ہوتا تھا۔ اور اسلام کے خلاف قریش

۱۔ ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ اولیٰ و عقبہ ثانیہ و قرآن شریف سورۃ ممتحنہ رکوع ۲ و بخاری باب

وفود الانصار الی النبی صلعم۔ نیز بخاری کتاب الاحکام باب بیعتہ النساء

۲۔ بخاری کتاب الاحکام باب بیعتہ النساء ۳۔ قرآن حکیم سورہ نور ۲۱۱



کی طرف سے اس وقت کوئی متحدہ مخالفانہ کوشش نہ تھی۔

## ابتدائی زمانہ کے ارکان اسلام

اصول اسلام کا ذکر اوپر گزر چکا ہے یعنی یہ کہ اس ابتدائی زمانہ میں جبکہ شریعت اسلامی کے نزول کی ابتدا تھی ارکان اسلام میں سے صرف ایمان باللہ اور توحید پر اصل زور تھا۔ اس کے بعد ایمان بالرسول بعثت بعد الموت اور جہاد کا عقیدہ تھا۔ اور گود حقیقت یہ وہ بنیادی اصول ہیں کہ اگر غور سے دیکھو تو سب کچھ ان کے اندر آ جاتا ہے لیکن جس طرح بعد میں یہ اور دوسری اصولی باتیں تدوینی رنگ میں ارکان ایمان قرار دی گئیں یہ حال ادائل میں نہ تھا۔ اسی طرح ارکان اعمال کا حال تھا۔ بلکہ اعمال میں تو موجودہ ارکان یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ میں سے کوئی رکن بھی اس وقت تک باقاعدہ طور پر قائم نہ ہوا تھا۔ البتہ احادیث سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ابتداء میں جبرائیل نے آپ کو نماز اور وضو کا طریق سکھا دیا تھا مگر باقاعدہ پانچ وقت کی نماز بہت بعد میں شروع ہوتی اور روزہ وغیرہ تو اس سے بھی بہت عرصہ بعد میں شروع ہوئے۔ ابتداء میں صرف نماز تھی اور وہ بھی ایک نفلی رنگ رکھتی تھی۔ یعنی ان ابتدائی ایام میں مسلمان اپنے طور پر گھروں میں یا مکہ کے پاس کی گھاٹیوں میں دو دو چار چار مل کر جب موقع ملا ایک عام عبادت کے رنگ میں نماز ادا کر لیا کرتے تھے، چنانچہ اس ابتدائی زمانہ کے متعلق مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مکہ کی کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک اس طرف سے ابوطالب کا گذر ہوا۔ ابوطالب کو ابھی تک اسلام کی کوئی خبر نہ تھی اس لیے وہ کھڑا ہو کر نہایت حیرت سے یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جب آپ نماز ختم کر چکے تو اس نے پوچھا "بھتیجے یہ کیا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چچا! یہ دین الہی اور دین ابراہیم ہے" اور آپ نے ابوطالب کو مختصر طور پر اسلام کی دعوت دی، لیکن ابوطالب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر ساتھ ہی اپنے بیٹے حضرت علیؓ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "ہاں بیشک بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تم کو سوائے نیکی کے اور کسی طرف نہیں بلائے گا" غالباً اسی زمانہ کے قریب کا ایک اور واقعہ ہے کہ سعد بن ابی وقاص اور چند اور مسلمان مل کر کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک چند مشرکین وہاں آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک نئے رنگ کی عبادت کرتے دیکھ کر ڈانسا جس پر باہم کچھ ٹکرا رہی ہو گئی۔

## کھلی تبلیغ کا آغاز

یہ ابتدائی زمانہ اسی طرح خاموش اور خفیہ تبلیغ میں گذر رہا تھا۔ اور بعثت نبویؐ پر قریباً تین سال گذر چکے تھے اور اب چوتھا سال شروع تھا کہ الہی حکم نازل ہوا کہ "فَاصْذَعْ بِمَا تُؤْمَرُ"



”یعنی لے رسول ابو حکم تجھے دیا گیا ہے وہ کھول کھول کر لوگوں کو سنا دے“ لے  
اور اس کے قریب ہی یہ آیت اتری کہ : فَاذْكُذْ هُنَّ ذُنُوبُهُنَّ الْاَقْرَبَيْنِ۔ یعنی اپنے قریبی  
رشتہ داروں کو ہوشیار و بیدار کر دیجئے

جب یہ احکام اترے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکار کر اور  
ہر قبیلہ کا نام لے لے کر قریش کو بلایا یہ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا : لے قریش ! اگر میں  
تم کو یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بڑا شکر ہے جو تم پر حملہ کرنے کو تیار ہے تو کیا تم میری بات کو مانو گے؟  
بظاہر یہ ایک بالکل ناقابل قبول بات تھی مگر سب نے کہا : ہاں ہم ضرور مانیں گے کیونکہ ہم نے ہمیشہ صادق القول  
پایا ہے۔ آپ نے فرمایا : تو پھر سنو ! میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اللہ کے مذاپ کا شکر تمہارے قریب پہنچ چکا  
ہے۔ خدا پر ایمان لاؤ تا اس عذاب پہنچ جاوے جب قریش نے یہ الفاظ سنے تو کھل کھلا کر ہنس پڑے اور آپ  
کے چچا ابولہب نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا : تَبَّالْتَّ اَلَسْنَا جَمْعُكُمْ نَا؟ محمدؐ تو ہلاک ہو گیا اس غرض  
سے تو نے ہم کو جمع کیا تھا؟ پھر سب لوگ ہنسی مذاق کرتے ہوئے منتشر ہو گئے یہ

### اقرار بار کی دعوت

انہی دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے ارشاد فرمایا  
کہ ایک دعوت کا انتظام کرو اور اس میں بنو عبد المطلب کو بلاؤ۔ تاکہ  
اس ذریعہ سے ان تک پیغام حق پہنچایا جاوے چنانچہ حضرت علیؑ نے دعوت کا انتظام کیا۔ اور آپ  
نے اپنے سب قریبی رشتہ داروں کو جو اس وقت کم و بیش چالیس نفوس تھے اس دعوت میں بلایا۔ جب  
وہ کھانا کھا چکے تو آپ نے کچھ تقریر شروع کرنی چاہی مگر بد بخت ابولہب نے کچھ ایسی بات کہدی جس سے  
سب لوگ منتشر ہو گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ ”یہ موقعہ تو جاتا رہا۔  
اب پھر دعوت کا انتظام کرو“ چنانچہ آپ کے رشتہ دار پھر جمع ہوئے۔ اور آپ نے انہیں یوں مخاطب کیا کہ  
لے بنو عبد المطلب ! دیکھو میں تمہاری طرف وہ بات لیکر آیا ہوں کہ اس سے بڑھ کر اچھی بات کوئی شخص اپنے  
قبیلہ کی طرف نہیں لایا۔ میں تمہیں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم میری بات مانو تو تم دین و دنیا کی بہترین نعمتوں  
کے وارث بنو گے۔ اب بتاؤ اس کام میں میرا کون مددگار ہوگا؟ سب خاموش تھے اور ہر طرف مجلس میں  
ایک سناٹا تھا کہ یکھنت ایک طرف سے ایک تیرہ سال کا ڈبلا پتلا بچہ جس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا  
تھا اٹھا اور یوں گویا ہوا : گویں سب میں کمزور ہوں اور سب میں چھوٹا ہوں مگر میں آپؐ کا ساتھ دوں گا“  
یہ حضرت علیؑ کی آواز تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کے یہ الفاظ سنے تو اپنے رشتہ داروں

کی طرف دیکھ کر فرمایا: "اگر تم جانو تو اس بچے کی بات سنو اور اسے مانو، حاضرین نے یہ نظارہ دیکھا تو بجائے عبرت حاصل کرنے کے سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور ابولہب اپنے بڑے بھائی ابوطالب سے کہنے لگا۔ "وآب محمد تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم اپنے بیٹے کی پیروی اختیار کرو" اور پھر یہ لوگ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمزوری پر ہنسی اڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

**دار ارقم میں پہلا تبلیغی مرکز** غالباً انہی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مکہ میں ایک تبلیغی مرکز قائم کیا جاوے۔ جہاں مسلمان نماز وغیرہ کے لیے بے روک ٹوک جمع ہو سکیں اور امن و اطمینان اور خاموشی کے ساتھ باقاعدہ اسلام کی تبلیغ کی جاسکے۔ اس غرض کے لیے ایک ایسے مکان کی ضرورت تھی جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو۔ چنانچہ آپ نے ایک نو مسلم ارقم بن ابی ارقم کا مکان پسند فرمایا۔ جو کوہ صفا کے دامن میں واقع تھا۔ اس کے بعد تمام مسلمان یہیں جمع ہوتے یہیں نماز پڑھتے۔ یہیں تلاش بیان حق آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی تبلیغ فرماتے۔ اسی وجہ سے یہ مکان تاریخ میں خاص شہرت رکھتا ہے اور دارالاسلام کے نام سے مشہور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریباً تین سال تک دار ارقم میں کام کیا۔ یعنی بعثت کے چوتھے سال آپ نے اسے اپنا مرکز بنایا اور چھٹے سال کے آخر تک آپ نے اُس میں اپنا کام کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ دار ارقم میں اسلام لانے والوں میں آخری شخص حضرت عمرؓ تھے جن کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور وہ دار ارقم سے نکل کر ہر ملاء تبلیغ کرنے لگ گئے۔

دار ارقم میں جو اشخاص ایمان لائے وہ بھی سابقین میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں۔ اول مصعب بن عمیر جو بنو عبد الدار میں سے تھے اور بہت شکیل اور حسین تھے اور اپنے خاندان میں نہایت عزیز و محبوب سمجھے جاتے تھے یہ وہی نوجوان بزرگ ہیں جو ہجرت سے قبل یثرب میں پہلے اسلامی مبلغ بن کر بھیجے گئے اور جن کے ذریعہ مدینہ میں اسلام پھیلا۔ پھر زید بن الخطاب تھے جو حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا، چنانچہ جب اُن کے عہد خلافت میں کسی شخص نے اُن کے سامنے اپنے بھائی کا مرثیہ پڑھا، تو اُنہوں نے فرمایا کہ "اگر میں ایسے شعر کہہ سکتا تو میں بھی اپنے بھائی کا ایسا مرثیہ کہتا" اُس شخص نے جواب دیا "اے امیر المومنین! جس قسم کی مبارک موت آپ کے بھائی کو نصیب ہوئی ہے وہ اگر میرے بھائی کو نصیب ہوتی تو میں تو کبھی بھی اُس کا نوحہ نہ کرتا اور مرثیہ نہ کہتا" حضرت عمرؓ کی طبیعت

بڑی محنت سے شناساں تھی۔ فرمایا۔ خدا کی قسم جس طرح آج تم نے اس قول سے مجھے تسلی دی ہے۔ ایسی کبھی کسی نے نہیں دی۔ اور اس کے بعد پھر کبھی اپنے بھائی کی وفات پر اس طرح غم کا اظہار نہیں کیا۔

پھر اس زمانہ میں ایمان لانے والوں میں سے ایک عبداللہ ابن اتم مکتومؓ تھے جو نابینا تھے اور حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں میں سے تھے اُن کے متعلق ایک دل چسپ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن مغیرہ کو جو قریش کا ایک بہت معزز رئیس تھا نہایت شوق اور سرگرمی سے تبلیغ فرما رہے تھے ابن اتم مکتومؓ جلدی جلدی آئے اور کبھی دینی مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کرنا چاہا۔ لیکن اپنے شوق میں انھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہاں کن لوگوں کا مجمع ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس کام میں مصروف ہیں اور آداب مجلس رسولؐ کے ماتحت ان کو ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع کے لحاظ سے اُن کا یہ فعل پسند نہ آیا اور آپؐ کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوتے مگر آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ تعاضل تھا کہ آپؐ نے اُن کو زبان سے کچھ نہیں فرمایا بلکہ صرف آپؐ نے یہ کیا کہ اُن کی طرف سے بے اتفاقی کر کے ولید سے اپنی بات جاری رکھی۔ عبداللہ ابن اتم مکتومؓ کو اپنی غلطی کی طرف تو خیال نہیں گیا مگر آپؐ کی اس بے اتفاقی پر ملال ہوا اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ چونکہ ولید ایک بڑا آدمی ہے اس لیے آپؐ نے شاید اس کے مقابلہ میں مجھ غریب کی پروا نہیں کی۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد تھا کیونکہ اس وقت غریب امیر کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ آپؐ ایک ایسے شخص کو تبلیغ فرمانے میں مصروف تھے جس کو ان باتوں کے سننے کا بہت کم موقع ملتا تھا اور ابن اتم مکتومؓ کے لیے یہ موقع ہر وقت میسر تھا اس لیے آپؐ نے اس موقع کو ماتم سے دینا پسند نہ فرمایا اور ابن اتم مکتومؓ کے قطع کلام کو بُرا مانا جو حقیقت میں تھا بھی آدابِ مجلس کے خلاف مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کا یہ عالم تھا کہ جب آپؐ کو ابن اتم مکتومؓ کے دلی ملال پر اطلاع ہوئی اور ایک قرآنی وحی بھی اس بارے میں نازل ہوئی تو آپؐ نے اُن کی بڑی دلداری کی اور عرب کے طریق کے مطابق اپنی چادر مبارک بچھا کر اس پر ان کو بٹھایا۔

پھر اس زمانہ میں مسلمان ہونے والوں میں ایک جعفر بن ابی طالبؓ تھے جو حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے۔ جعفرؓ کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ وہ خلق اور خلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتے تھے۔ پھر عمارؓ بن یاسرؓ تھے جو قبیلہ مذحج سے تھے اور اپنے باپ یا سر اور والدہ سمیتہ کے ساتھ مکہ میں رہتے تھے۔ پھر صہیبؓ بن سنانؓ تھے جو عام طور پر صہیبؓ رومی کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر دراصل وہ رومی نہ تھے بلکہ کسی زمانہ میں جبکہ ان کا باپ ایرانی

حکومت کی طرف سے کسی جگہ کا عامل تھا، روسیوں کے ہاتھ قید ہو کر غلام بنالیے گئے تھے اور پھر کچھ مدت تک اُن میں بطور غلام مقیم رہے بالآخر عبداللہ بن جبریل قرشی نے جو مکہ کا ایک رئیس تھا انہیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ صہیبؓ جب مسلمان ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک فال کے طور پر فرمایا کہ یہ ہمارا پہلا روسی پھل ہے۔ صہیبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اتنے دلدادہ تھے کہ جب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش نے ان کو روکا کہ تو ہمارے اندر ایک غریب غلام کی حیثیت میں آیا تھا اور اب تو ہم میں رہ کر امیر ہو گیا ہے اس لیے ہم تجھے نہیں جانے دیتے۔ انہوں نے کہا۔ تم میری ساری دولت لے لو اور مجھے جانے دو۔ اس شرط پر قریش نے انہیں جانے دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو آپؐ نے خوشی کے ساتھ فرمایا کہ:

”صہیبؓ نے بہت نفع والی تجارت کی ہے“ جب حضرت عمرؓ اپنے عہد خلافت میں مہلک طور پر زخمی ہوئے تو انہوں نے اپنی جگہ صہیبؓ کو ہی جو اس وقت پاس موجود تھے امام الصلوٰۃ مقرر فرمایا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ کا جنازہ بھی صہیبؓ نے پڑھا تھا۔ ابو موسیٰؓ اشعری بھی غائب اُسی زمانہ میں یا اس کے قریب مسلمان ہوئے تھے۔ ابو موسیٰؓ مین کے رہنے والے تھے اور نہایت خوش الحان تھے۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق ایک دفعہ فرمایا کہ ”ابو موسیٰؓ کو تو لہجہ داد دی سے صحتہ ملا ہے“ یہ وہی ابو موسیٰؓ ہیں جو حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان ثالث مقرر ہوئے تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دارالرقم میں داخل ہونے کے زمانہ سے کچھ پہلے ہی حکم کلی

### قریش کی مخالفت کا آغاز اور اس کے اسباب

تبلیغ شروع ہو گئی تھی۔ اور مکہ کے گلی کوچوں میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ قریش اب تک تو ایک حد تک خاموش تھے لیکن اب ان کو بھی منکر شروع ہوا کہ کہیں یہ ”مرزن“ زیادہ نہ پھیل جاوے اور اسلام کا پودا مکہ کی زمین میں جڑ نہ پکڑ جاوے۔ اس لیے اب انہوں نے بھی اس کی طرف توجہ شروع کی اور اسلام کی اشاعت کو بزور روکنا چاہا۔ اس مخالفت کے کیا اسباب تھے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر نیا الٰہی سلسلہ جو دُنیا میں قائم ہوتا ہے دُنیا کی طرف سے ضرور اس کی مخالفت ہوتی ہے کیونکہ وہ لازماً اپنے اندر ایسی باتیں رکھتا ہے جس سے اس وقت کی دُنیا محض نا آشنا ہوتی ہے بلکہ یہ وہ باتیں ہوتی ہیں جن کو دُنیا اپنی موجودہ عادات اور موجودہ عقاید و خیالات کے واسطے ایک یقینی موت سمجھتی ہے۔ درحقیقت انبیاء کی بعثت ہی ایسے وقت میں ہوتی ہے کہ جب دُنیا کے لوگ اس راستہ کو چھوڑ چکے ہوتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ وہ چلیں۔ اور وہ اپنے موجودہ غلط راستہ کو ہی صحیح راستہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ پس جب بھی کبھی کوئی نیا نبی آتا اور دُنیا کو سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے تو دُنیا اس کی باتوں کو غلط خیال کرتی اور اس کے مقابلہ کے لیے



تیار ہو جاتی ہے؛ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :  
يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ  
يَسْتَهْزِئُونَ ۚ

”یعنی وائے حسرت لوگوں پر کہ کوئی بھی رسول اُن کی طرف ایسا نہیں  
آیا جس کے ساتھ اُنھوں نے ہنسی اور محمٹھانہ کیا ہو۔“

اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ بڑے بکھے جاتے ہیں وہی عموماً مخالفت میں بھی بڑھے ہوتے  
ہوتے ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَوْمٍ مَّجْرِمًا ۖ أَكَا بَرُّ مُجْرِئِهَا لِيَسْأَلُوا فِيهَا  
”یعنی سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ ہر جگہ رسول کے مقابلہ پر بڑے لوگ  
ہی خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کر نیوالے اور فتنہ و فساد کے بانی بن جاتے ہیں۔“

چنانچہ دیکھ لو حضرت ابراہیمؑ مبعوث ہوئے تو اُن کی قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے اُن کو بچو کر آگ  
میں بھونک دیا۔ حضرت موسیٰؑ آئے تو اُن کو بھی اکابر قوم کی طرف جنگ و جدل کے مصائب دیکھنے پڑے۔  
حضرت یسوعیؑ کی باری آئی تو اُن کی قوم کے علماء اور فریسیوں نے مل ملا کر اُن کو دار پر کھچو ادیا۔ ہندوستان میں  
کرشن مبعوث ہوئے تو اُن کی قوم ان کو ہلاک کرنے کے لیے اُنھیں کھڑی ہوئی۔ تو کیا سرور انبیاءؑ اس سنت رسل  
سے باہر رہتا؟ نہیں بلکہ جتنا عظیم الشان مشن انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اتنی ہی شدید آپ کی  
مخالفت ہونی چاہیے تھی کیونکہ آپؐ ایسے زمانہ میں مبعوث ہوئے تھے کہ جب تاریکی کا خاص زور تھا  
اور ضروری تھا کہ نور کے آنے پر تاریکی کی فوجیں اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں؛ چنانچہ  
ایسا ہی ہوا کہ سارے گذشتہ انبیاء کی نسبت آپؐ کی مخالفت سب سے زیادہ ہوئی۔ اس مخالفت  
کے موٹے موٹے ظاہری اسباب یہ تھے :

(۱) قریش ایک پرے درجہ کی بُت پرست قوم تھی اور بُتوں کی عزت و محبت ان کے دلوں میں استقامت  
جی ہوئی تھی کہ اُن کے خلاف ایک لفظ بھی سننا اُنہیں گوارا نہ تھا۔ خانہ کعبہ جو محض اللہ تعالیٰ کی  
عبادت کے واسطے بنایا گیا تھا۔ اس میں بھی ان ظالموں نے سینکڑوں بُت جمع کر رکھے تھے اور اپنی تمام  
ضروریات کے لیے انہی بُتوں کا مُنہ تھکتے تھے۔ اب اسلام آیا تو اس کا بنیادی اصول ہی توحید باری تعالیٰ  
تھا اور صاف حکم تھا کہ کسی انسان یا درخت یا پتھر یا ستارے وغیرہ کے سامنے سرمت  
بھکاؤ۔ بلکہ :



وَأَسْجُدْ فَارْتَلِّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ - ۱۷

”صرف اسی ذات کے سامنے بھکوجن نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے۔“  
پھر یہی نہیں بلکہ قریش کے بتوں کو ان کے خیال میں تہک آمیز لفظوں میں یاد کیا جاتا تھا اور ان کو جہنم کا ایندھن قرار دیا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً فرمایا :-

إِن كُنتُمْ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ - ۱۸

”یعنی اے لوگو! تم اور تمہارے وہ بت جن کو تم پوجتے ہو دوزخ کا ایندھن ہیں۔“  
ان باتوں نے قریش کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی اور وہ ایک جان ہو کر اسلام کو مٹانے کے واسطے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(۲) بت پرستی کے علاوہ عرب میں عادات اور اخلاق کا جو حال تھا وہ اس کتاب کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ زنا۔ شراب۔ قمار بازی۔ غارتگری۔ قتل۔ حرام خوری کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا، مگر اسلام ان سب باتوں سے روکتا تھا۔ گویا اسلام لانے سے ان کو ایک نئی زندگی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اور قریش اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ یہی حال رسوم پرستی کا تھا جو گویا عربوں کے دین و مذہب کا جزو بن چکی تھیں، مگر اسلام سب گندی اور خلاف اخلاق اور خلاف مذہب رسوم کو پاؤں کے نیچے مٹاتا تھا۔

(۳) اپنے آباؤ اجداد کی عزت اور ہر بات میں خواہ وہ درست ہو یا غلط ان کی پیروی اختیار کرنا عربوں کے دین و مذہب کا جزو تھا۔ اسی وجہ سے ان کو اصرار تھا کہ :

بَلْ يَتَّبِعُ مَا آَلَفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۖ

”یعنی ہم تو بہر حال اسی بات کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔“  
مگر اسلام خداداد عقل کو سپر اور جھوٹ کے درمیان حکم قرار دیتا تھا اور ان کے مشرک آباء کے متعلق صاف کہتا تھا :

أَوْ كُنُوا كَانِ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۖ

”کیا وہ اپنے آباؤ اجداد ہی کی اتباع کریں گے خواہ ان کے آباء گمراہ اور بیوقوف ہی کیوں نہ ہوں۔“  
(۴) قریش ایک نہایت مشگرتہ قوم تھی۔ یہ لوگ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے اور غلاموں کو تو خصوصیت سے ذلیل اور زیر رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اسلام حقوق کے معاملہ میں ان سب امتیازات کو مٹا کر ایک

مالگیر اخوت قائم کرنا اور آقا اور غلام کو خدا تعالیٰ کے حضور میں ایک صف میں کھڑا کرنا تھا اور یہ بات رسولؐ قریش کے واسطے موت کے پیالہ سے کم نہ تھی۔

(۵) قریش میں بڑے بڑے صاحب اثر اور مالدار لوگ موجود تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کے ان دونوں باتوں سے خالی تھے۔ یعنی نہ تو آپؐ اپنی خلوت پسند طبیعت کی وجہ سے لیڈران قریش میں سے تھے اور نہ مال و دولت کے لحاظ سے کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے ایسی حالت میں سردارانِ مکہ کے لیے آپؐ کی اتباع اختیار کرنا ایک ایسی بڑی قربانی تھی جس کے لیے یہ لوگ ہرگز تیار نہیں تھے اور اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ :

لَوْلَا نُسْرَتُنَا لَهَذَا الْقُرْآنِ عَلَى رَحِيلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِثِ عَظِيمٍ ۖ

”کیوں نہ یہ قرآنِ مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوا۔“

(۶) ان اسباب کے علاوہ ایک باعث یہ بھی تھا کہ قریش کے مختلف قبائل کے درمیان سخت رقابت اور دشمنی رہتی تھی اس لیے باقی قبائل کو ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اُن پر بھی قسم کا امتیاز لے جاوے اور قبائل بنو امیہ اور بنو مخزوم کو تو خصوصیت سے بنو ہاشم کے ساتھ سخت عدوت تھی۔ اسی لیے سب قبائل سے بڑھ کر ان دو قبائل نے اسلام کی مخالفت میں حصہ لیا۔

**اُمۃ الکفر** قریش میں سے جن لوگوں نے اسلام کی زیادہ مخالفت کی اور اس تحریک میں

وہ دوسروں کے لیڈر بن گئے جاتے تھے وہ سب ایک قسم کے نہ تھے بعض میں ذاتی شرافت تھی اور وہ اپنے رنگ میں بالعموم شرافت ہی کا معاملہ کرنا چاہتے تھے مگر کچھ تو اپنی بڑائی کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول نہ کر سکتے تھے اور کچھ انہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی کہ اس طرح بعض ”خام خیالوں“ کے ہاتھ سے اُن کے دینِ آبائی کی بربادی ہو رہی ہے اُن میں زیادہ متنازعہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اول مطعم بن عدی جو قبیلہ بنو نوفل سے تھا اور رؤساء قریش میں سے تھا بطعم بکا مشرک تھا مگر معاملات میں حتیٰ اوسع شرافت کا طریق اختیار کرتا تھا چنانچہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے معاہدہ بایں کاکہ کو توڑنے اور سفرِ طائف سے واپسی پر آپؐ کو اپنی پناہ میں مکہ میں داخل کرنے میں مطعم نے خاص شرافت اور خاص جرأت سے کام لیا تھا۔ دوسرے ابوالختری تھا جو قبیلہ بنو اسد سے تھا۔ ابوالختری بھی مخالفت میں حتیٰ اوسع شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتا تھا۔ اسی ذیل میں ایک شخص زبیر بن ابوامیہ تھا جو حضرت ام سلمہؓ کا بھائی تھا۔ اور باوجود مخالفت کے عموماً شرافت کا پہلو اختیار کرتا تھا۔

دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جن کی مخالفت کچھ شرارت کا پہلو بھی لیے ہوئے تھی۔ ان میں یہ لوگ ممتاز تھے۔ اول عقبہ بن ربیعہ جو بنو عبد شمس میں سے تھا اور بہت مالدار اور صاحب اثر تھا۔ جنگ بدر کے موقع پر جب عقبہ اپنے سرخ اونٹ پر سوار ہو کر اسلامی لشکر کے سامنے آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیکھ کر فرمایا کہ اگر اس گروہ میں کسی میں کچھ شرافت ہے، تو اس سرخ اونٹ کے سوار میں ہے۔ عقبہ کا بھائی شیبہ بھی اسی کے زیر اثر تھا۔ یہ دونوں جنگ بدر میں حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ دوسرے ولید بن مغیرہ تھا جو حضرت خالد بن ولید کا والد اور قریش کا رئیس اعظم تھا۔ حتیٰ کہ قریش اسے اپنا باپ سمجھتے تھے۔ ولید ہجرت نبوی کے تین ماہ بعد اتفاقی طور پر تیر چوکھ جانے سے ہلاک ہوا۔ تیسرے عاص بن دائل بھی تھا جو حضرت عمرو بن عاص کا باپ تھا۔ یہ بھی نہایت دولت مند اور بڑا صاحب اثر تھا۔ عاص ہجرت کے دوسرے ماہ پاؤں سوچ جانے سے نہایت تکلیف اٹھا کر مکہ میں مر گیا۔

تیسری قسم کے گروہ کی حالت بالکل مختلف تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں بالکل اندھے ہو رہے تھے اور ہر جائز و ناجائز طریق سے کوشش کرتے تھے کہ اسلام اور بانی اسلام کو صفحہ دنیا سے مٹا دیں۔ اور مسلمانوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالیں۔ اور قریش میں انہی لوگوں کا زیادہ زور تھا اور انہی لوگوں کی کثرت تھی۔ ان میں خاص طور پر ممتاز یہ لوگ نظر آتے ہیں۔ اول عمرو بن ہشام جو بنو مخزوم میں سے تھا۔ یہ وہ شخص ہے جسے گویا راس المعانیدین سمجھنا چاہیے۔ قریش میں یہ نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اور وہ اسے ابوا حکم یعنی دانائی کا باپ کہتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے اس کا نام ابو جہل رکھا۔ یہ جنگ بدر میں دو انصار لڑکوں کے ہاتھ سے واصل جہنم ہوا۔ دوسرے ابولہب بن عبد المطلب جو بنو ہاشم میں سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔ ابولہب مخالفت اور ایذا رسانی میں ابو جہل کا ہم پلہ تھا اور اسے یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ معانیدین اسلام میں سے صرف اسی کا نام قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ ابولہب جنگ بدر سے تھوڑا عرصہ بعد مکہ میں بیمار پڑ کر ہلاک ہوا۔ تیسرے عقبہ بن ابی معیط تھا جو بنو امیہ میں سے تھا اور پہلے درجہ کا شریہ اور بد باطن شخص تھا۔ یہ جنگ بدر میں شریک ہوا اور مارا گیا۔ پھر امیہ بن خلف تھا جو بنو نجیح میں سے تھا شرارت اور عداوت میں یہ ابو جہل کا مثل تھا۔ جنگ بدر میں قتل ہوا۔ امیہ کا بھائی اُبی بن خلف بھی اسی قماش کا آدمی تھا۔ یہ جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے زخمی ہوا اور اسی زخم سے اپنی کیفر کردار کو پہنچا۔ پھر انضر بن الحارث تھا جو بنو عبد المطلب میں سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت دکھ دیا کرتا تھا۔ یہ جنگ بدر میں قید ہوا اور اپنے جرموں کی پاداش میں مارا گیا۔ پھر اسود بن عبد لغوث۔ حارث بن قیس۔ اسود بن مطلب۔ ابوقیس بن فاکہ۔ منبہ بن الحجاج۔ منبہ بن الحجاج۔ مالک بن طلاطلہ۔ حکم بن ابی العاص۔ زکاتہ بن یزید وغیرہ بھی شرارت اور عداوت میں

کم و بیش بہت حصہ لیتے تھے۔

ان کے علاوہ بعض اور لوگ بھی تھے جو عداوت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، لیکن چونکہ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے اس لیے ان کا اس جگہ اس فہرست میں ذکر کرنا شاید درست نہ ہو البتہ اپنے اپنے موقع پر ان کا ذکر خود آجائے گا۔

## اسلام اور بانی اسلام کے خلاف کفار مکہ کی عداوت

اسلام کے خلاف جب قریش کی مخالفت شروع ہوئی تو پھر وہ دن بدن بڑھتی گئی اور خطرناک صورت اختیار کرتی گئی؛ چنانچہ سرورِ عالم میسرہ لکھتا ہے کہ قریش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ:

”یہ نیا مذہب صفحہ دنیا سے ملیا میٹ کر دیا جاوے اور اس کے متبعین اس سے بزورِ روک دیتے جاویں۔ اور قریش کی طرف سے جب ایک دفعہ مخالفت شروع ہوئی تو پھر دن بدن اُن کی ایذا رسانی بڑھتی اور آتشِ غضب تیز ہوتی گئی۔“

درحقیقت جو نکتہ مخالفین اسلام نے اسلام کے خلاف برپا کیا اور اس کے مٹانے کے واسطے جو جو تدابیر کیں وہ ایک لمبی اور دردناک کہانی ہے جس کا سلسلہ ہجرت کے آٹھویں سال تک پہنچتا ہے۔

## ابوطالب کے پاس قریش کا پہلا وفد

سب سے پہلی کوشش قریش کی یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی ہمدردی اور حفاظت سے محروم کر دیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں اس وقت تک بین القبائل تعلقات کو خراب کئے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ ابوطالب قبیلہ بنو ہاشم کے رئیس تھے اور باوجود مشرک ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مربی اور محافظ تھے اس لیے ان کے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہاتھ اٹھانا بین القبائل سیاست کی رُو سے بنو ہاشم کے ساتھ جنگ چھیڑنے کے مترادف تھا جس کے لیے دوسرے قبائل قریش ابھی تک تیار نہ تھے۔ لہذا پہلی تجویز انھوں نے یہ کی کہ ابوطالب کے پاس دوستانہ رنگ میں ایک وفد بھیجا کہ وہ اپنے بھتیجے کو اشاعتِ اسلام سے روک دیں؛ چنانچہ ولید بن مغیرہ۔ عاص بن داکل۔ عقبہ بن ربیعہ۔ ابوہریرہ بن ہشام۔ البرسفیان وغیرہ جو سب رؤساء قریش میں سے تھے ابوطالب کے پاس آئے اور نرمی کے طریق پر کہا کہ ”آپ ہماری قوم میں معزز ہیں۔ اس لیے ہم آپ سے درخواست

کرتے ہیں کہ آپ اپنے بھتیجے کو اس نئے دین کی اشاعت سے روک دیں اور یا پھر اس کی حمایت سے دستبردار ہو جاویں۔ اور ہمیں اور اس کو چھوڑ دیں کہ ہم آپس میں فیصلہ کر لیں، ابوطالب نے اُن کے ساتھ بہت نرمی کی باتیں کیں اور اُن کے غصہ کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر انہیں ٹھنڈا کر کے واپس کر دیا۔

لیکن چونکہ اُن کی ناراضگی کا سبب موجود تھا بلکہ دن بدن ترقی کرتا جاتا تھا اور قرآن شریف میں بڑی سختی سے شہرک کے رد میں آیات نازل ہو رہی تھیں۔

## دوسرا وفد

اس لیے کوئی لمبا عرصہ نہ گذرا تھا کہ یہ لوگ پھر ابوطالب کے پاس جمع ہوئے اور ان سے کہا کہ اب معاملہ حد کو پہنچ گیا ہے اور ہم کو جس اور پلید اور شتر البرتہ اور سفہاء اور شیطان کی ذریت کہا جاتا ہے اور ہمارے معبودوں کو جہنم کا ایندھن قرار دیا جاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو لایعقل کہہ کر ہیکارا جاتا ہے۔ اس لیے اب ہم صبر نہیں کر سکتے اور اگر تم اس کی حمایت سے دستبردار نہیں ہو سکتے، تو پھر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہم پھر تم سب کے ساتھ مقابلہ کریں گے حتیٰ کہ دونوں فریقوں میں سے ایک ہلاک ہو جاوے، ابوطالب کے لیے اب نہایت نازک موقعہ تھا اور وہ سخت ڈر گئے۔ اور اُسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا۔ جب آپ آئے تو اُن سے کہا کہ ”اے میرے بھتیجے! اب تیری باتوں کی وجہ سے قوم سخت مشتعل ہو گئی ہے اور قریب ہے کہ تجھے ہلاک کر دیں۔ اور ساتھ ہی مجھے بھی۔ تو نے ان کے عقلمندوں کو سفیہ قرار دیا۔ اُن کے بزرگوں کو شتر البرتہ کہا۔ ان کے قابلِ تعظیم معبودوں کا نام ہیزم جہنم اور وقود النار رکھا اور خود انہیں جس اور پلید بٹھرایا۔ میں تجھے خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ اس دشنام دہی سے اپنی زبان کو تمام کر اور اس کام سے باز آ جاؤ، ورنہ میں تمام قوم کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھ لیا کہ اب ابوطالب کا پائے ثبات بھی لغزش میں ہے اور دنیاوی اسباب میں سے سب سے بڑا سہارا مخالفت کے بوجھ کے نیچے ڈب کر ٹوٹا چاہتا ہے۔ مگر آپ کے ماتھے پر بل تک نہ تھا۔ نہایت اطمینان سے فرمایا۔ چچا یہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ نفس الامر کا عین محل پر بیان ہے اور یہی تو وہ کام ہے جس کے واسطے میں بھیجا گیا ہوں کہ لوگوں کی خرابیاں اُن پر ظاہر کر کے انہیں سیدھے رستے کی طرف بلاؤں اور اگر اس راہ میں مجھے مزاد پیش ہے تو میں بخوشی اپنے لیے اس موت کو قبول کرتا ہوں۔ میری زندگی اس راہ میں وقف ہے اور میں موت کے ڈر سے اظہارِ حق سے رُک نہیں سکتا۔ اور اے چچا! اگر آپ کو اپنی کمزوری اور تکلیف کا خیال ہے تو آپ بیشک مجھے اپنی پناہ میں رکھنے سے دستبردار ہو جاویں۔ مگر میں احکامِ الہی کے پہنچانے سے کبھی نہیں رُکوں گا۔ اور خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہیں رہوں گا اور میں اپنے



کام میں لگا رہوں گا حتیٰ کہ خدا سے پورا کرے یا میں اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر فرما رہے تھے اور آپ کے چہرہ پر سچائی اور نورانیت سے بھری ہوئی رقت نمایاں تھی۔ اور جب آپؐ غریر خیمہ کر چکے تو آپؐ بیکفایت چل پڑے اور وہاں سے رخصت ہونا چاہا مگر ابوطالب نے پیچھے سے آواز دی۔ جب آپؐ لوٹے تو آپؐ نے دیکھا کہ ابوطالب کے آنسو جاری تھے۔ اُسوقت ابوطالب نے بڑی رقت کی آواز میں آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا: ”بھتیجے جا اور اپنے کام میں لگا۔ جب تک میں زندہ ہوں اور جہاں تک میری طاقت ہے میں تیرا ساتھ دوں گا۔“

**تیسرا وفد** جب اس دفعہ بھی قریش ناکام رہے تو انہوں نے ایک اور چال چلی اور وہ یہ کہ قریش کے ایک اعلیٰ خاندان سے ایک ہونہار نوجوان عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر ابوطالب کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ ”ہم عمارہ بن ولید کو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ قریش کے بہترین نوجوانوں میں سے ہے۔ پس تم ایسا کرو کہ تمہارے عوض میں تم اس لڑکے کو لے لو اور اس سے جس طرح چاہو فائدہ اٹھاؤ۔ اور چاہو تو اسے اپنا بیٹا بنا لو۔ ہم اس کے حقوق سے کلیشہ دستبردار ہوتے ہیں اور اس کے عوض تم تمہارے پسر دکر دو جس نے ہمارے آبائی دین میں رخنہ پیدا کر کے ہماری قوم میں ایک فتنہ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس طرح جان کے بدلے جان کا قانون پورا ہو جائے گا اور تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ ابوطالب نے کہا: ”یہ عجیب انصاف ہے کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر اپنا بیٹا بناؤں اور اسے کھلاؤں اور پلاؤں اور اپنا بیٹا تمہیں دے دوں کہ تم اسے قتل کر دو۔ واللہ یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ قریش کی طرف سے مطعم بن عدی نے کہا کہ ”پھر اے ابوطالب! تمہاری قوم نے تو تم پر ہرزنگ میں حجت پوری کر دی ہے۔ اور اب تک جھگڑے سے اپنے آپ کو بچا رہے مگر تم ان کی کوئی بات بھی ماننے نظر نہیں آتے۔“ ابوطالب نے کہا: ”واللہ میرے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا اور مطعم میں دیکھتا ہوں کہ تم بھی اپنی قوم کی بیٹھ ٹھونکنے میں میرے ساتھ بے وفائی کرنے پر آمادہ ہو۔ پس اگر تمہارے تیور بدلے ہوئے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم نے جو کرنا ہو وہ کر ڈیو۔“

**مسلمانوں کے متعلق قریش کا فیصلہ** ردّ سائر قریش ابوطالب کی طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ تجویز کی کہ جس جس قبیلہ میں سے کوئی شخص مسلمان ہو چکا تھا وہ قبیلہ اپنے اپنے آدمی پر دباؤ ڈال کر اسے اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرے اچنانچہ سب نے مل کر باہم مشورہ سے یہ فیصلہ کیا کہ نو مسلموں پر ان کے اپنے قبیلہ کی طرف سے زور ڈالا جائے تاکہ کسی قسم کی بین القبائل پیچیدگی نہ پیدا ہو اور

انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب نو مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں گے تو آپ اکیلے کچھ نہیں کر سکیں گے اور یہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اس فیصلہ میں یہ بھی قرار پایا کہ صرف زبانی دباؤ تک نہ رہا جائے بلکہ ہر رنگ میں تنگ کر کے اور تکلیف میں ڈال کر نو مسلموں کو واپس لانے کی کوشش کی جائے جب ابو طالب کو اس مشورہ سے اطلاع ہوئی تو انہوں نے بھی ایک جوانی تدبیر کے طور پر بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ایک جگہ جمع کیا اور حالات بنا کر تحریک کی کہ اس عداوت کے طوفان میں ہمیں محمدؐ کی حفاظت کرنی چاہیے چنانچہ ابولہب کے سوا جو اسلام کی عداوت میں اندھا ہو رہا تھا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور کومی غیرت میں آکر دوسروں کے مقابلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کے لیے تیار ہو گئے یہ ان حالات نے مکہ کی فضا میں ایک آتش فشاں پیدا کر دیا تھا۔ مگر چونکہ ابھی تک مسلمانوں کی ایذا رسانی کا فیصلہ ہر قبیلہ کی حدود کے اندر محدود تھا، اس لیے کوئی بنی القبائل بیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں مسلمانوں کے لیے انفرادی طور پر سخت مصائب و آلام کا دروازہ کھل گیا اور اس وقت سے لیکر ہجرت یثرب تک کی داستان ایک ٹون کے آنسوؤں لانے والی داستان ہے۔

**مسلمانوں کی تکالیف کا نمونہ** ان آیات میں جو جو تکالیف مسلمانوں کو پہنچیں ان کو وہی جانتے تھے جن کو یہ مصائب بھیلنے پڑے مگر ہاں تاریخ نے

جہاں تک ان واقعات کو محفوظ رکھا ہے اور وہ یقیناً اصل واقعات سے بہت کم ہیں۔ ان کا نمونہ درج ذیل ہے :

**حضرت عثمانؓ بنو امیہ** میں سے تھے اور ایک نسبتاً پختہ عمر کے اور مرقہ الحال آدمی تھے، لیکن قریش کے مذکورہ بالا فیصلہ کے بعد ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے ان کو رستیوں سے باندھ کر پٹیا اور ان بیچاروں نے سامنے سے اُت تک نہیں کی لیے زبیر بن العوام قبیلہ اسد سے تھے اور ایک جوان مرد آدمی تھے مگر ان کا ظالم چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کے ناک میں آگ کا دھواں دیا کرتا تھا کہ اسلام سے باز آ جا دیں مگر وہ بڑی خوشی کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کرتے اور کہتے کہ میں صداقت کو پہچان کر پھر انکار نہیں کر سکتا۔ یہ سید بن زید جو حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے بنو عدی سے تھے اور اپنے حلقہ میں معزز تھے، لیکن جب عمر بن الخطابؓ کو ان کے اسلام کا علم ہوا تو وہ انہیں گرا کر ان کی چھاتی پر سوار ہو گئے اور اسی کش مکش میں اپنی بہن کو بھی زخمی کر دیا۔ عبداللہ بن مسعود جو قبیلہ حذیل میں سے تھے۔ انہیں قریش نے عین مہین کعبہ میں مار مار کر ہلکان کر دیا۔ ابوذر غفاریؓ کو قریش نے اتنا پیشا کہ مارنے

۱۔ ابن ہشام و طبری ۲۔ طبقات ابن سعد حالات عثمان بن عفان ۳۔ سہ زرقانی جلد ۱ باب اول من اسلم ۴

۵۔ ابن ہشام ذکر اسلام عمر ۶۔ سہ اسد الغابہ ۷

مارتے زمین پر پھینکا دیا اور قریب تھا کہ جان سے مار ڈالتے، مگر عباس بن عبدالمطلب نے یہ کہہ کر انکو قریش سے چھڑایا کہ "جانتے ہو کہ یہ شخص بنو غفار میں سے ہے جو تمہارے شامی تجارت کے راستہ پر آباد ہیں۔ اگر ان کو علم ہوا، تو تمہارا راستہ روک دیں گے۔ یہ سختیاں ان لوگوں پر تھیں جو طاقور قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر جو حال غلاموں اور دوسرے کمزور لوگوں کا تھا وہ پڑھ کر تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذیل کی چند مثالیں قریش کے مظالم کا صرف ایک معمولی نمونہ ہیں۔

بلال بن رباح اُمیہ بن خلف کے ایک حبشی غلام تھے۔ اُمیہ ان کو دوپہر کے وقت جبکہ اُدھر سے آگ برستی تھی اور کتھ کا پتھر پلا میداں بھٹی کی طرح پیتا تھا، باہر سے جاتا اور تنگا کر کے زمین پر لٹا دیتا اور بڑے بڑے گرم پتھر ان کے سینے پر رکھ کر کہتا لات اور عڑی کی پرستش کر اور محمد سے علیحدہ ہو جاؤرناسی طرح عذاب دے کر مار ڈوں گا۔ بلال زیادہ عربی نہ جانتے تھے۔ بس صرف اتنا کہتے اُحد اُحد یعنی اللہ ایک ہی ہے۔ اللہ ایک ہی ہے۔ اور یہ جواب سُکر اُمیہ اور تیز ہو جاتا اور ان کے گلے میں رتہ ڈال کر انہیں شریروں کوں کے حوالے کر دیتا اور وہ ان کو مکہ کی پتھر لے گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے جس سے اُنکا بدن خون سے تر بتر ہو جاتا۔ مگر ان کی زبان پر سوائے اُحد اُحد کے اور کوئی لفظ نہ آتا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اُن پر یہ جو دستور دیکھے تو ایک بڑی قیمت پر خرید کر انہیں آزاد کر دیا۔

ابو فیکہ صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے۔ ان کو بھی یہ لوگ اسی طرح گرم زمین پر لٹا دیتے اور سینے پر اتنے بھاری پتھر رکھتے کہ ان کی زبان باہر نکل آتی۔

عائز بن فہیرہ بھی ایک غلام تھے انہیں بھی اسلام کی وجہ سے سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ ان کو حضرت ابو بکرؓ نے خرید کر اپنے پاس بکریاں چرانے پر نوکر رکھ لیا۔

بلیثہ بنو عدی کی لونڈی تھی۔ اسلام لانے سے پہلے عمر اس کو اتنا مارتے کہ مارتے مارتے تھک جاتے، لیکن جب ذرا دم لے لیتے تو پھر اُسی طرح مارنا شروع کر دیتے وہ سامنے سے صرف اتنا کہتی کہ عمر! اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا تو خدا اس ظلم کو بے انتقام نہیں چھوڑے گا۔

زئیرہ بنو مخزوم کی لونڈی تھی۔ ابو جہل نے اُسے اس بے دردی سے پٹا کہ اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ابو جہل اس کی طرف اشارہ کر کے طنز اکھا کرتا تھا کہ "اگر اسلام سچا ہوتا تو کیا بھلا اسے مل جاتا اور ہم محروم رہتے؟ صہیب بن سنان رومی ہر چند کہ اب غلام نہ تھے اور تھے بھی نسبتاً خوشحال، لیکن قریش ان کو اتنا پیٹتے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے۔ یہ وہی صہیبؓ ہیں جن کو حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے پر امام الصلوٰۃ مقرر کیا تھا اور انہوں نے ہی حضرت عمرؓ کا جنازہ پڑھایا تھا۔

خباثت بن الارت بھی اب غلام نہ تھے بلکہ آزاد تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے، مگر ایک دفعہ قریش نے اُن کو پکڑ کر اُہنی کی بمٹی کے دہکتے ہوئے کونوں پر اُٹا لیا اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر چڑھ گیا، مہاکہ کروٹ نہ بدل سکیں، چنانچہ وہ کوئلے اُسی طرح جل جل کر اُن کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے۔ خباثت نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ سے یہ واقعہ بیان کیا اور اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی جو زخموں کے داغوں سے بالکل سفید تھی۔ خباثت کے متعلق یہ روایت بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ منکہ کے ایک رئیس عاص بن وائل نے اُن سے کچھ تلواریں بنوائیں اور جب خباثت نے قیمت کا مطالبہ کیا تو وہ کہنے لگا تم لوگ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ جنت میں انسان کو ہر قسم کی نعمت سونا اور چاندی وغیرہ سب حسب خواہش ملے گی۔ سو تم اپنی تلواروں کی قیمت مجھ سے جنت میں آکر لے لینا کیونکہ واللہ اگر تمہیں جنت میں جانے کی توقع ہے تو مجھے تو بڑبڑاہلی ہونی چاہیئے اور یہ بکر قیمت دینے سے انکار کر دیا۔

عمارؓ اور ان کے والد یاسرؓ اور ان کی والدہ سمیتہ کو بنی مخزوم جن کی غلامی میں سمیتہ کسی وقت رہ چکی تھیں۔ اتنی تکالیف دیتے تھے کہ ان کا حال پڑھ کر بدن پر لرزہ پڑنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ جب ان فدا نیان اسلام کی جماعت کسی جسمانی عذاب میں مبتلا تھی اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرف آنکھلے۔ آپؐ نے اُن کی طرف دیکھا۔ اور درود مندانہ لہجہ میں فرمایا: **مَشَرَّاءَ اِلَیْہِمْ سِرْفَانٌ مَّوْعِدُکُمْ الْجَنَّةَ**۔ ”لے آئے ال یا سر صبر کا دامن نہ چھوڑنا کہ خدا نے تمہاری انہی سیکھنوں کے بدلے میں تمہارے لیے جنت تیار کر رکھی ہے“ آخر یاسرؓ تو اسی عذاب کی حالت میں جاں بحق ہو گئے۔ اور بوڑھی سمیتہ کی ران میں ظالم ابو جہل نے اس بے دردی سے نیزہ مارا کہ وہ اس کے جسم کو کاٹتا ہوا ان کی شرمگاہ تک جا نکلا۔ اور اس بے گناہ خاتون نے اسی جگہ تڑپتے ہوئے جان دیدی۔ اب صرف عمارؓ باقی رہ گئے۔ ان کو بھی ان لوگوں نے انتہائی عذاب اور دُکھ میں مبتلا کیا اور ان سے کہا کہ ”جب تک محمدؐ کا کفر نہ کرو گے اسی طرح عذاب دیتے رہیں گے“ چنانچہ آخر عمارؓ نے سخت تنگ آکر کوئی نازیبا الفاظ منہ سے کہہ دیئے جس پر کفار نے انہیں چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد عمارؓ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زار زار رونے لگے۔ آپؐ نے پوچھا ”کیوں عمارؓ کیا بات ہے؟“ انھوں نے کہا ”یا رسول اللہؐ میں ہلاک ہو گیا۔ مجھے ظالموں نے اتنا دُکھ دیا کہ میں نے آپؐ کے متعلق کچھ ناگفتنی الفاظ منہ سے کہہ دیئے“ آپؐ نے فرمایا: ”تم اپنے دل کا حال کیسا پاتے ہو؟“ اُس نے عرض کیا: ”یا رسول اللہؐ میرا دل تو اُسی طرح مومن ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں اُسی طرح سرشار“ آپؐ نے فرمایا۔ تو پھر خیر ہے خدا تمہاری اس لغزش کو معاف کرے۔



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تکالیف  
 مسلمانوں کی ان تکالیف کے مقابلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی حالت بھی مخالفت کے اس طوفان بے تیزی میں چننا  
 تسلی بخش نہ تھی۔ بے شک بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اس فیصلہ کے بعد جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے آپ کو  
 اپنے اعزہ و اقارب کی عمومی حمایت حاصل تھی۔ اور قریش کی بین القبائل سیاست میں یہ حمایت خاصہ وزن  
 رکھتی تھی، لیکن اول تو آپ کے چچا ابولہب کی بیوفائی اور غداری نے اس فیصلہ کی طاقت کو ایک حد تک  
 کمزور کر دیا تھا۔ دوسرے خود قریش بھی یہ دھمکی دے چکے تھے کہ اگر بنو ہاشم اور بنو مطلب آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی پشت و پناہ بننے سے باز نہیں آئیں گے تو پھر ہم ان سب کا مقابلہ کریں گے اور گواہی تک  
 انھوں نے اس دھمکی کو پورے طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا تھا، لیکن وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے اور  
 طعن و تشنیع اور نوک جھونک سے گذر کر کبھی کبھی اپنا بچاؤ رکھ کر عملی پھیڑ پھیڑ بھی کر لیتے تھے، چنانچہ سب  
 سے پہلے تو انہوں نے ایک مجلس کر کے اس سوال پر غور کیا کہ اب جو حج کا موسم آئے گا تو اس موقعہ پر  
 لازماً باہر سے آنے والے حاجیوں میں اسلام کے متعلق چرچا ہوگا اور لوگ آکر ہم سے پوچھیں گے کہ یہ نیا  
 نبی کون ہے اور کیا کہتا ہے اس لیے ہمیں باہم مشورہ سے کوئی جواب سوچ رکھنا چاہیے تاکہ ہمارا  
 آپس کا اختلاف کوئی بڑا اثر پیدا نہ کرے، چنانچہ سب روسا و قریش و تہذیب بن مغیرہ کے مکان پر جمع  
 ہوئے اور ولید نے ان کے سامنے ایک افتاء بھی تقریر کر کے ساری بات سمجھائی اور بتایا کہ اب حج کا وقت  
 آ رہا ہے اور محمد کے اس دعویٰ کی خبر باہر پہنچ چکی ہے اور لازماً حج پر آنے والے لوگ ہیں اس کے متعلق  
 پوچھیں گے۔ پس ہمیں چاہیے کہ باہم مشورہ سے کوئی ایک پختہ جواب سوچ رکھیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک  
 دوسرے کے خلاف باتیں کہہ کر خود اپنے اثر کو مٹالیں۔ اس پر ایک شخص بولا کہ ہمارا جواب صاف ہے کہ  
 یہ شخص ایک کاہن ہے اور کاہنوں کی سی باتیں کر کے اس نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ولید نے  
 کہا کہ ہم اسے کاہن کس طرح کہہ سکتے ہیں جبکہ اس میں کاہنوں کی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔ نہ کاہنوں کا  
 ساتر نم ہے اور نہ کاہنوں کا مخصوص انداز بیان۔ دوسرے نے کہا کہ پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد مجنون  
 ہے اور اپنے جنون کے جوش میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ولید نے کہا۔ ہماری یہ بات کون مانے گا۔ اور  
 جنون کی وہ کونسی علامتیں ہیں جو ہم محمد میں دکھا سکیں گے۔ نہ اس میں وہ وحشت ہے اور نہ وہ اضطراب  
 اور نہ ہی وہ دوسرے جو ایک مجنون میں لازماً پائے جاتے ہیں۔ پھر ہمارے جنون کے ادعا کو کون سنے گا۔  
 تیسرا بولا کہ پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے اور اپنے جادو و اثر اشعار سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا  
 ہے۔ ولید نے کہا۔ ہم اسے شاعر کہہ کر اس کے کلام میں شعر کے خصائص از قلم و جہاز و ہزج اور قرین و مقبول  
 اور مہذب کہاں سے دکھائیں گے۔ اس پر ایک چوتھا شخص بولا کہ اسے ایک ساحر کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔



دیکھنے لگا کہ پھر ہم اس میں ساحروں کی سی ٹھونکیں مارنا اور گرہیں ڈالنا اور گرہیں کھولنا کس طرح دکھائیں گے۔ لوگوں نے کہا تو پھر اسے عہد شمس تم ہی بتاؤ کہ پھر یہیں کیا کہنا چاہیے۔ ولید نے کہا۔ اس معاملہ میں میں خود حیران ہوں کہ کیا کیا جائے۔ جو بات بھی سوچتا ہوں وہ محمد پر چسپاں ہوتی نظر نہیں آتی اور ایسی بات کہنا جس سے لوگوں کو تسلی نہ ہو خود اپنے آپ کو تنہی کا نشانہ بنانا ہے۔ اس طرح اس مجلس میں کچھ عرصہ باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یہ مشورہ قرار پایا کہ اور کوئی بات تو خیال میں آتی نہیں اور جو باتیں پیش کی گئی ہیں ان میں ساحر والی زیادہ وزن دار ہے۔ پس یہ فیصلہ ہوا کہ حج کے موقع پر باہر سے آنیوالے لوگوں کے سامنے محمد کے متعلق سب لوگ یہی کہیں کہ یہ ایک ساحر ہے جو اپنی مخفی سحر کاری سے باپ کو بیٹے، سے بھائی کو بھائی سے خاوند کو بیوی سے جڈا کر تاجدار بنا رہا ہے؛ چنانچہ جب حج کا موقع آیا تو قریش کے بچے بچہ کی زبان پر یہی فقرہ تھا کہ محمد تو ایک ساحر ہے جو جس گھر میں داخل ہوتا ہے انشتاق و اختلاف کا بیج بو کر نکلتا ہے۔ اور ان کے اس پروپیگنڈا نے تمام قبائل عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف ایک خطرناک ہیجان پیدا کر دیا۔

قریش نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مکہ کے اوباشوں اور خود سر لوگوں کو اکسایا کہ وہ جس طرح بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتے رہیں؛ چنانچہ اس انگشت میں آکر شہر کے آوارہ مزاج لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ کے سامنے بھی اور پیچھے بھی طرح طرح کی بکواس کرتے رہتے تھے جس کی غرض سوائے دل دکھانے اور اشتعال پیدا کر کے فساد برپا کرنے کے اور کچھ نہ تھی۔ جو لوگ آپ کے پڑوس میں رہتے تھے ان کا یہ معمول تھا کہ آپ کے گھر میں پتھر پھینکتے۔ دروازے پر کانٹے بچھاتے۔ گھر کے اندر گندی اور بدبو دار چیزیں لا کر ڈال دیتے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کی وجہ سے عداوتی تکلیف پہنچتی تو وہ خوش ہو کر ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ایک نہایت گندی اور متعفن چیز آپ کے گھر میں پھینک دی۔ آپ خود اُسے اٹھا کر باہر لائے اور فرمایا۔ ”اے نبوخذ مناف! یہ تم اچھا ہمسائیگی کا حق ادا کرتے ہوئے مگر جن کانوں تک یہ آواز پہنچتی وہ شرافت کی اپیل کے لیے بالکل بہرے تھے۔ انہی دنوں میں قریش نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بجائے محمد کے تہذیب یعنی بدنام اور مذمت شدہ کہہ کر پکارا جاوے؛ چنانچہ کچھ عرصہ تک مکہ میں اس نام کا چرچا رہا اور قریش کو اتنی بھی شرم نہ آئی کہ یہ وہی شخص ہے جسے ہم اس کے دعویٰ سے پہلے امین کہہ کر پکارتے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس فعل سے اطلاع ہوئی تو آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میرا نام تو محمد ہے اور جو محمد ہو وہ تہذیب کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھو خدا مجھے ان کی

گایوں سے کس طرح محفوظ رکھتا ہے۔

مگر اس زمانہ میں بھی قریش کی ایذا رسانی صرف زبانی باتوں تک محدود نہ تھی بلکہ وہ بعض اوقات جوش میں آکر یا موقع نکال کر آپ کو غلی نقصان پہنچانے اور جسمانی تکلیف میں مبتلا کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ غالباً یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن ابی معیط غصہ میں اٹھا اور آپ کے گلے میں کیڑا ڈال کر اس زور کے ساتھ بھینچا کہ آپ کا دم رکنے لگ گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کو علم ہوا تو وہ دوڑے آئے اور آپ کو اس بد بخت کے شر سے بچایا اور قریش سے مخاطب ہو کر کہا:

اَلْقَتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ

”کیا تم ایک شخص کو صرف اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب خدا ہے۔“

ایک اور موقع پر آپ نے صحن کعبہ میں توحید کا اعلان کیا تو قریش جوش میں آکر آپ کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ آپ کے ربیب یعنی حضرت خدیجہؓ کے فرزند حارث بن ابی ہالہ کو اطلاع ہوتی تو وہ بھاگے آئے اور خطرہ کی صورت پا کر آپ کو قریش کی شرارت سے بچانا چاہا۔ مگر اس وقت بعض نوجوانان قریش کے اشتعال کی یہ کیفیت تھی کہ کسی بد باطن نے تلوار چلا کر حارث کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ اور اس وقت کے شور و شغب میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تلوار چلا لے والا کون تھا۔

ان مصائبِ مسلمانوں کو صبر کی تلقین

الغرض یہ وقت اسلام اور اہل اسلام کے لیے سخت نازک وقت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی کبھی ذاتی تکلیف کی تو پروا نہیں تھی مگر مسلمانوں اور خصوصاً کمزور مسلمانوں کے مصائب کی وجہ سے آپؐ مزدور نہ کر مند تھے، مگر دوسری طرف آپؐ اس بات کو بھی خوب جانتے اور سمجھتے تھے کہ قومیں مصائب میں سے گزر کر ہی بنا کرتی ہیں۔ اس لیے آپؐ ایک جہت سے ان مصائب کو مسلمانوں کی تربیت کا بھی ذریعہ سمجھتے تھے اور اپنے صحابہ کو صبر و تحمل کی تعلیم دیتے اور گزشتہ انبیاء کے متبعین کی تکالیف کا ذکر کر کے ان کو بتاتے تھے کہ قدیم سے یہی سنت چلی آتی ہے کہ اللہ کے رسولوں اور ان کے متبعین کو دکھ دیئے جاتے ہیں، لیکن آخر کار مومنوں کی فتح ہوتی ہے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس ٹیک لگاتے بیٹھے تھے جناب بن اللات اور بعض دوسرے صحابہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! مسلمانوں کو قریش کے ہاتھ سے اتنی تکالیف پہنچ رہی ہیں

۱۔ بخاری باب ما جاء في اسماء الرسول

۲۔ بخاری باب ما لقي النبي صلعم

۳۔ اصحابہ ذکر حارث

آپ ان کے لیے بددعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ یہ الفاظ سنتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا :

”دیکھو تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کا گوشت وہ بے کے کانٹوں سے نوح نوح کر ہڈیوں تک صاف کر دیا گیا مگر وہ اپنے دین سے متزلزل نہیں ہوتے۔ اور وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سروں پر آ رہے چلا کر ان کو دھوکے کر دیا گیا مگر ان کے قدموں میں لغزش نہیں آئی۔ دیکھو خدا اس کام کو ضرور پورا کرے گا۔ جی کہ ایک شتر سوار منعاً (شام) سے لے کر حضرت تک کا سفر کرے گا۔ اور اس کو سوائے خدا کے اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ مگر تم تو جلدی کرتے ہو“

ایک اور موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوف مع چند دوسرے اصحاب کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا : ”یا رسول اللہ ہم مشرک تھے تو ہم معزز تھے۔ اور کوئی ہماری طرف آنکھ تک نہیں اٹھا سکتا تھا، لیکن جب مسلمان ہوتے ہیں کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں اور ہم کو ذلیل ہو کر کفار کے مظالم پہننے پڑتے ہیں پس یا رسول اللہ! آپ ہم کو اجازت دیں کہ ہم ان کفار کا مقابلہ کریں“ آپ نے فرمایا :

إِنِّي أُمِرْتُ بِالْعَفْوِ - فَلَا تُقَاتِلُوا

یعنی ”مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا حکم ہے پس میں تم کو لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا“ صحابہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول کے سامنے تسلیم غم تھا۔ انھوں نے صبر اور برداشت کا وہ نمونہ دکھایا کہ تاریخ اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔

# ایام کشمکش

**ہجرت حبشہ** جب مسلمانوں کی تکلیف انتہا کو پہنچ گئی اور قریش اپنی اینداز رسانی میں ترقی کرتے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں اور فرمایا کہ ”حبشہ کا بادشاہ عادل اور انصاف پسند ہے۔ اس کی حکومت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔“ حبشہ کا ملک جو انگریزی میں ایثیوپیا یا ابی سینیا کہلاتا ہے، تبرا عظم افریقہ کے شمال شرق میں واقع ہے اور جاتے وقوع کے لحاظ سے جنوبی عرب کے بالکل مقابل پر ہے اور درمیان میں بحیرہ احمر کے سوا کوئی اور ملک حائل نہیں۔ اس زمانہ میں حبشہ میں ایک مضبوط عیسائی حکومت قائم تھی اور وہاں کا بادشاہ نجاشی کہلاتا تھا۔ بلکہ اب تک بھی وہاں کا حکمران اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ حبشہ کے ساتھ عرب کے تجارتی تعلقات تھے اور ان ایام میں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں حبشہ کا دارالسلطنت اکسوم (AXSUN) تھا جو موجودہ شہر عدرا (ADOWA) کے قریب واقع ہے اور اب تک ایک مقدس شہر کی صورت میں آباد چلا آتا ہے۔ اکسوم ان دنوں میں ایک بڑی طاقت ور حکومت کا مرکز تھا اور اس وقت کے نجاشی کا ذاتی نام اصمہ تھا۔ جو ایک عادل بیدار مغز اور مضبوط بادشاہ تھا۔ بہر حال جب مسلمانوں کی تکلیف انتہا کو پہنچ گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ جن جن سے ممکن ہو حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر ماہ رجب ۱۰ھ نبوی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے زیادہ معروف کے نام یہ ہیں: حضرت عثمان بن عفان اور ان کی زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ۔ عبدالرحمن بن عوف۔ زبیر ابن العوام۔ ابو حذیفہ بن عتبہ۔ عثمان بن مظعون۔ مصعب بن عمیر۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد اور ان کی زوجہ آمنہ سلمہ۔

۱۔ ابن ہشام و طبری : ۲۔ طبری : ۳۔ جیمبرس انسائیکلو پیڈیا : ۴۔ بخاری بحوالہ زرقانی : ۵۔ ابن سعد : ۶۔ ابن ہشام :

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان ابتدائی مہاجرین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو قریش کے طاقتور قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور کمزور لوگ کم نظر آتے ہیں جس سے دُور باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اولے سے یہ کہ طاقتور قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہ تھے۔ دُوسرے سے یہ کہ کمزور لوگ مثلاً غلام وغیرہ اس وقت ایسی کمزوری اور بے بسی کی حالت میں تھے کہ ہجرت کی بھی طاقت نہ رکھتے تھے۔

جب یہ مہاجرین جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے شعیبہ پہنچے جو اُس زمانہ میں عرب کا ایک بندرگاہ تھا تو اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ ان کو ایک تجارتی جہاز مل گیا جو حبشہ کی طرف روانہ ہونے کو بالکل تیار تھا، چنانچہ یہ سب امن سے اس میں سوار ہو گئے اور جہاز روانہ ہو گیا۔ قریش مکہ کو ان کی ہجرت کا علم ہوا تو سخت برہم ہوئے کہ یہ شکارِ مفت میں ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ان مہاجرین کا پیچھا کیا مگر جب ان کے آدمی ساحل پر پہنچے تو جہاز روانہ ہو چکا تھا، اس لیے غائب و غاسر واپس لوٹ آئے۔ حبشہ میں پہنچ کر مسلمانوں کو نہایت امن کی زندگی نصیب ہوئی اور خدا خدا کر کے قریش کے مظالم سے چھٹکارا ملا۔

**قریش کے اسلام کی جھوٹی افواہ اور بعض مہاجرین حبشہ کی واپسی** لیکن جیسا کہ بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے ابھی ان

مہاجرین کو حبشہ میں گئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک اڑتی ہوئی افواہ ان تک پہنچی کہ تمام قریش مسلمان ہو گئے ہیں اور مکہ میں اب بالکل امن و امان ہے۔ اس خبر کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر مہاجرین بلا سوچے سمجھے واپس آ گئے۔ جب یہ لوگ مکہ کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ اب ان کے لیے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ بالآخر بعض تو راستہ میں سے ہی واپس لوٹ گئے اور بعض چھپ چھپ کر یا کسی ذی اثر اور طاقتور شخص کی حمایت میں ہو کر مکہ میں آ گئے۔ یہ شوال ۸ھ نبوی کا واقعہ ہے یعنی آغاز ہجرت اور مہاجرین کی واپسی کے درمیان صرف ڈھائی تین ماہ کا فاصلہ تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں حبشہ کی ہجرت رجب کے مہینہ میں ہوئی تھی اور مہاجرین کی مزعومہ واپسی کی تاریخ شوال بیان کی گئی ہے۔

گو حقیقت یہ افواہ بالکل جھوٹی اور بے بنیاد تھی جو مہاجرین حبشہ کو واپس لانے اور ان کو تکلیف میں ڈالنے کی غرض سے قریش نے مشہور کر دی ہوگی۔ بلکہ زیادہ غور سے دیکھا جاوے تو اس افواہ اور مہاجرین کی واپسی کا قصہ ہی بے بنیاد نظر آتا ہے لیکن اگر اسے صحیح سمجھا جاوے تو ممکن ہے کہ اس کی شد میں وہ واقعہ ہو جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے اور وہ جیسا کہ بخاری میں آتا ہے۔ یہ ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحن کعبہ میں سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائیں اس وقت وہاں کئی ایک رؤساء کفار بھی موجود



تھے۔ اور بعض مسلمان بھی تھے۔ جب آپ نے سورۃ ختم کی تو آپ نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ ہی تمام مسلمان اور کافر بھی سجدہ میں گر گئے۔ کفار کے سجدہ کی وجہ حدیث میں بیان نہیں ہوتی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت پڑاثر آواز میں آیات الہی کی تلاوت فرمائی اور وہ آیات بھی ایسی تھیں جن میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی واحدانیت اور اس کی قدرت و جبروت کا نہایت صحیح و بلیغ رنگ میں نقشہ کھینچا گیا تھا اور اس کے احسانات یاد دلانے گئے تھے اور پھر ایک نہایت پُر رعب و پُر جلال کلام میں قریش کو ڈرایا گیا تھا کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے تو ان کا وہی حال ہو گا جو ان سے پہلے ان قوموں کا ہوا جنہوں نے خدا کے رسولوں کی تکذیب کی اور پھر آخر میں ان آیات میں حکم دیا گیا تھا کہ آؤ اللہ کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ اور ان آیات کی تلاوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان یکھفت سجدہ میں گر گئے تو اس کلام اور اس نظارہ کا ایسا ساحرانہ اثر قریش پر ہوا کہ وہ بھی بے اختیار ہو کر مسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر گئے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ایسے حالات کے ماتحت جو اُپر بیان ہوئے ہیں بسا اوقات انسان کا قلب مرعوب ہو جاتا ہے۔ اور وہ بے اختیار ہو کر ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو دراصل اس کے اصول و مذہب کے خلاف ہوتی ہے؛ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات ایک سخت اور ناگہانی آفت کے وقت ایک دہریہ بھی "اللہ اللہ" یا "ام رام" یا "رام" پکارا کرتا ہے اور قریش تو دہریہ نہ تھے بلکہ بہر حال خدا کی ہستی کے قائل تھے۔ پس جب اس پُر رعب و پُر جلال کلام کی تلاوت کے بعد مسلمانوں کی جماعت یکھفت سجدہ میں گر گئی تو اس کا ایسا ساحرانہ اثر ہوا کہ ان کے ساتھ قریش بھی بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر گئے۔ لیکن ایسا اثر عموماً وقتی ہوتا ہے اور انسان پھر جلد ہی اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے؛ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا اور سجدہ سے اُٹھ کر قریش پھر وہی بُت پرست کے بُت پرست تھے۔

بہر حال یہ ایک واقعہ ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ پس اگر مہاجرین حبشہ کی واپسی کی خبر درست ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد قریش نے جو مہاجرین حبشہ کے واپس لانے کے لیے یتاب ہو رہے تھے اپنے اس فعل کو آڑ بنا کر خود ہی یہ افواہ مشہور کر دی ہوگی کہ قریش مکہ مسلمان ہو گئے ہیں اور یہ کہ اب مکہ میں مسلمانوں کے لیے بالکل امن ہے اور جب یہ افواہ مہاجرین حبشہ تک پہنچی تو وہ طبعاً اسے سُن کر بہت خوش ہوئے اور سُنتے ہی خوشی کے جوش میں واپس آ گئے۔ لیکن جب وہ مکہ کے پاس پہنچے تو حقیقت امر سے آگاہی ہوئی جس پر بعض تو چھپ چھپ کر اور بعض کسی طاقتور اور صاحب اثر رئیس قریش کی حفاظت میں ہو کر مکہ میں آ گئے اور بعض واپس چلے گئے۔ پس اگر قریش کے مسلمان ہو جانے

کی افواہ میں کوئی حقیقت تھی تو وہ صرف اسی قدر تھی جو سورۃ النجم کی تلاوت پر سجدہ کرنے والے واقعہ میں بیان ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال اگر مہاجرین حبشہ واپس آئے بھی تھے تو ان میں سے اکثر پھر واپس چلے گئے۔ اور چونکہ قریش دن بدن اپنی ایذا رسانی میں ترقی کرتے جاتے تھے اور ان کے مظالم روز بروز بڑھ رہے تھے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر دوسرے مسلمانوں نے بھی خنیفہ ہجرت کی تیاری شروع کر دی اور موقعہ پا کر آہستہ آہستہ نکلتے گئے۔ یہ ہجرت کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ بالآخر ان مہاجرین حبشہ کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی جن میں اٹھارہ عورتیں بھی تھیں یہ اور مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت ہی محفوظ مسلمان رہ گئے۔ اس ہجرت کو بعض مؤرخین ہجرت حبشہ ثانیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

**ایک جھوٹا واقعہ** ہجرت حبشہ کے تعلق میں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کفار قریش کے سجدہ کرنے اور مہاجرین حبشہ کے واپس چلے آنے کے متعلق بعض مؤرخین ایک عجیب قصہ نقل کرتے ہیں جو یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا از حد شوق رہتا تھا کہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسی بات نازل ہو جو قریش کو اسلام کی طرف کھینچنے والی اور ان کی منافرت کو دور کرنے والی ہو۔ لہذا جب آپ سورۃ النجم کی آیات تلاوت فرماتے ہوئے ان آیات پر پہنچے کہ :

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۖ وَمَنْوَةَ الْثَالِثَةِ ۖ أَهَلَّ ۚ

”یعنی کیا تم نے مشرکین کے بتوں لات اور عزیٰ اور منات کی طرف دیکھا ہے؟“

تو شیطان نے آپ کے اس شوق سے فائدہ اٹھایا اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیئے کہ :

تَلَلَّتِ الْعَرَابُ نِسْفَ الْعُلَىٰ ۖ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَشَرٌّ ۚ

”یعنی لات اور عزیٰ اور منات بڑے جلیل القدر بت ہیں اور انکی شفاعت کی امید بھنی چاہیے“

جب قریش نے یہ الفاظ سنے تو وہ خاموش ہو گئے کہ ان کے بتوں کی عظمت اور قوت کو مان لیا گیا ہے۔ لہذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے سورۃ النجم ختم کرنے پر سجدہ کیا تو قریش نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا اور اس طرح گویا صلح صفائی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی جبرائیل آپ کے پاس آئے اور آپ کو اس فطی سے آگاہ کیا۔ اور شیطان کی القاد کردہ آیت کی جگہ وہ الہی کلام آپ پر وحی کیا جو اب قرآن شریف میں موجود ہے اور اس طرح قریش پھر ناراض ہو گئے۔ لیکن چونکہ قریش کے ساتھ صلح صفائی ہو جانے کی خبر شائع ہو چکی تھی اس لیے پیشتر اس کے کہ اس کی تردید ہوتی وہ حبشہ بھی پہنچ گئی اور

اس طرح بعض مہاجرین واپس آگئے۔

یہ وہ قصہ ہے جو اس موقع پر بعض مؤرخین لکھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ قصہ سراسر جھوٹ ہے۔ اور ہر معقول رنگ میں اس کا جھوٹا ہونا ثابت ہے؛ چنانچہ کبار محدثین اور ائمہ حدیث مثلاً علامہ عینی۔ قاضی عیاض اور علامہ نووی نے کھول کھول کر اور دلائل دے دے کر اس کو غلط اور موضوع ثابت کیا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لَا صِحَّةَ لَهُ لِقْلًا وَلَا عَقْلًا ۝

یعنی ”نقل اور عقل دونوں سے یہ قصہ غلط ثابت ہوتا ہے“

اور قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ:

لَمْ يَخْرُجْهُ أَهْلُ الصَّحَّةِ وَلَا رَوَاهُ ثِقَّةٌ بِسَنَدٍ سَلِيْبٍ مَعَ ضَعْفِ  
نَقْلَتِهِ وَاضْطِرَابِ رِوَايَاتِهِ وَانْقِطَاعِ أَسَانِيْدِهِ وَأَكْثَرُ الطَّرِيقِ فِيْهَا مُعْيِفَةٌ  
وَأَحْيَا لَمْ يَسْنِدْهَا أَحَدٌ مِنْهُمْ وَلَا رَفَعَهَا إِلَى صَاحِبٍ ۝

یعنی ”مخاطب اور ثقہ لوگوں نے اس کی روایت نہیں کی، کیونکہ اس قصہ میں روایت کا اضطراب اور سند کی کمزوری بہت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے طریقے بہت کمزور اور بوسے ہیں۔ اور کسی راوی نے اس کی سند کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یا آپ کے کسی صحابی تک نہیں پہنچایا“

اور علامہ نووی لکھتے ہیں:

لَا يَصِحُّ فِيْهِ شَيْءٌ وَلَا مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ وَلَا مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ ۝

یعنی ”اس قصہ میں کوئی بات بھی درست نہیں نہ نقل کے طریق پر اور نہ عقل کے طریق پر“

دوسری طرف اکثر ائمہ الحدیث نے اس قصہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ مثلاً صحاح ستہ میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں؛ حالانکہ صحاح ستہ میں سورۃ نجم کی تلاوت اور قریش کے مسجد کا ذکر موجود ہے جس صاف ظاہر ہے کہ ان محدثین کے سامنے یہ روایت آئی۔ لیکن انھوں نے اسے غلط اور ناقابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا۔ اسی طرح کبار مفسرین مثلاً امام رازی نے اس قصہ کو لغو اور جھوٹا قرار دیا ہے۔ اور صوفیاء میں سے ابن عربی جیسے باریک بین انسان نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ: ”لَا أَصِلُ لَهَا“ یعنی اس قصہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ویسے بھی اگر صرف سورۃ نجم کی آیات پر ہی جو شروع سے لیکر آخر تک شرک کے خلاف بھری

۱۔ مینی شرح بخاری ۴ ۲۔ شفا قاضی عیاض بحوالہ زرقانی ۳۔ نووی شرح مسلم ۵

۴۔ تفسیر کبیر باب سورۃ نجم ۶۲ ۵۔ زرقانی ۶

پڑی ہیں۔ نظر ڈالی جاوے تو اُسی سے اس کا بطلان ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ہرگز خیال نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے مواضع کلام میں جس میں توحید باری تعالیٰ پر اس قدر زور دیا گیا ہے ایک صریح طور پر شرکاذن فقرہ داخل کیا جاسکتا تھا۔ اور ایک ہی وقت میں ایک ہی زبان پر یہ دو انتہائی طور پر متضاد باتیں جاری ہو سکتی تھیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی کے لحاظ سے بھی عقل انسانی اس قصہ کو دوسرے دھکے دیتی ہے۔ بھلا جس شخص نے اپنی بعثت سے پہلے بھی ساری عمر بت پرستی نہ کی ہو حالانکہ اس کی ساری قوم بت پرست ہو۔ تو کیا عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ اس وقت جبکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آگیا ہو کہ بت پرستی کے خلاف آواز اٹھا اور صرف خدا نے واحد کی پرستش کا لوگوں کو حکم دے اور اس کے مذہب کا بنیادی پتھر ہی توحید باری تعالیٰ ہو جس کی وجہ سے وہ دن رات لوگوں کے ساتھ جھگڑتا ہو تو کیا اس وقت وہ قریش کو خوش کرنے کے لیے بت پرستی کی طرف ٹھیک جائے گا؟ آخر عقل بھی کوئی چیز ہے؟ ذرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالو۔ کیا کبھی آپ نے کفار کو خوش کرنے کی غرض سے اپنے مذہب کے کسی اصول کو چھوڑا؟ کیا کبھی آپ نے کفار کو اپنے ساتھ ملانے کی غرض سے مہانت اختیار کی؟ قرآن تو صریح کہتا ہے:-

وَذُو الْقَرْبَيْنِ اِيْمَانًا فَذُو الْقَرْبَيْنِ اِيْمَانًا

یعنی کفار کو ہمیشہ یہ حسرت ہی رہی کہ تو مہانت کر کے اٹھی ہاں میں ہاں ملاوے تو وہ بھی

مہانت اختیار کر لیں۔ اور اس طرح ظاہری صورت میں ملاپ کی ہو جاوے

کیا ایسے شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے کبھی قریش کی خاطر توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کیا ہوگا؟

البتہ ایک توجیہ اس قصہ کی ممکن ہے اور جیسا کہ علامہ قسطلانی اور زرقانی نے لکھا ہے اور بہت سے محققین نے اس کی تائید کی ہے ممکن ہے کہ یہ توجیہ درست ہو اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری کی روایت کے مطابق صحیح کعبہ میں سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائی ہوں تو ممکن ہے کہ شیاطین قریش میں سے کسی نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر تِلْكَ الْخَرَابِثُ الْغَلِيَّةُ کا فقرہ ملا دیا ہو جس کی وجہ سے اس وقت بعض لوگوں میں اشتباہ واقع ہو گیا ہو کہ شاید یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہے ہیں۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت کے وقت قریش کی یہ عام عادت تھی کہ وہ اس کے اثر کو مٹانے کے لیے شور کیا کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف میں بھی ان کے یہ الفاظ آتے ہیں کہ:



لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۲﴾  
 یعنی ”قریش کہا کرتے تھے کہ جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جاوے تو اس  
 میں شور کے گڑبڑ پیدا کر دیا کرو۔ شاید اسی طرح تم غالب آ سکو۔“

اس توجیہ کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قریش کی یہ عادت تھی کہ وہ کعبہ طواف  
 کرتے ہوئے یہی فقرہ تِلْكَ الْغُرَابِيُّ اُتْعِلٰی والا پڑھا کرتے تھے۔ پس تعجب نہیں کہ جب آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی آیات تلاوت فرمائی ہوں تو ان میں سے کسی نے حسب عادت یہاں بھی  
 اس فقرہ کو داخل کر دیا ہو۔ اور اس طرح بعض لوگوں کو عارضی طور پر اشتباہ واقع ہو گیا ہو کہ شاید یہ الفاظ  
 بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے ہیں۔ اس توجیہ کی تائید ابن عربی۔ قاضی عیاض۔ ابن جریر۔  
 امام تازی اور حافظ ابن حجر نے بھی کی ہے۔ لیکن ایک اور بات ہے جو اس افواہ اور مہاجرین کی واپسی کے قہقہہ کو  
 بھرے سے ہی شائبہ کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ کہ تاریخ میں ہجرت حبشہ کے آغاز کی تاریخ رجب شہنہ نبوی  
 اور سجدہ کی تاریخ رمضان شہنہ نبوی بیان ہوئی ہے اور پھر تاریخ میں ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے  
 کہ اس افواہ کے نتیجہ میں مہاجرین حبشہ کی واپسی شوال شہنہ نبوی میں ہوئی تھی۔ گویا آغاز ہجرت اور  
 واپسی مہاجرین کے زمانوں میں صرف دو سے لے کر تین ماہ کا فاصلہ تھا۔ اور اگر سجدہ کی تاریخ سے زمانہ کا  
 شمار کریں تو یہ عرصہ صرف ایک ہی ماہ کا بنتا ہے۔ اب اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ قطعی طور پر  
 ناممکن ہے کہ مکہ اور حبشہ کے درمیان اس قلیل عرصہ میں تین سفر مکمل ہو سکے ہوں۔ یعنی سب سے پہلے  
 مسلمان مکہ سے حبشہ پہنچے۔ اس کے بعد کوئی شخص قریش کے اسلام کی خبر لے کر مکہ سے حبشہ گیا اور پھر مسلمان حبشہ  
 سے روانہ ہو کر مکہ میں واپس آئے۔ ان تین سفروں کی تکمیل قطع نظر اس عرصہ کے جو زمانہ امور میں صرف ہو جاتا  
 ہے اس قلیل عرصہ میں قطعاً ناممکن تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات ناممکن تھی کہ سجدہ کے زمانہ سے لیکر  
 مہاجرین حبشہ کی مذکورہ واپسی تک دو سفر مکمل ہو سکے ہوں کیونکہ اس زمانہ میں مکہ سے حبشہ جانے  
 کے لیے پہلے جنوب میں آنا پڑتا تھا اور پھر وہاں سے کشتی لے کر جو ہر وقت موجود نہیں ملتی تھی بحر احمر کو عبور  
 کر کے افریقہ کے ساحل تک جانا ہوتا تھا۔ اور پھر ساحل سے لیکر حبشہ کے دارالسلطنت اکسوم تک جو  
 ساحل سے کافی فاصلہ پر ہے پہنچنا پڑتا تھا۔ اور اس زمانہ کے آہستہ سفروں کے لحاظ سے اس قسم  
 کا ایک سفر بھی ڈیڑھ دو ماہ سے کم عرصہ میں ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس جہت سے گویا یہ قہقہہ  
 سے ہی غلط اور بے بنیاد قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر بالفرض اس میں کوئی حقیقت تھی بھی تو وہ یقیناً اس سے  
 زیادہ نہیں تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ واللہ اعلم ۛ



نجاشی کے دربار میں قریش کا ناکام وفد  
بہر حال قریش نے جب مسلمانوں کو اس طرح اپنے

ہاتھوں سے صحیح سلامت نکلے جاتے دیکھا اور حبشہ میں ان کو امن و امان کی زندگی بسر کرتے پایا تو ان کے غضب کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ اور بالآخر انھوں نے اپنے دو ممتاز ممبر یعنی ایک عمرو ابن العاص اور دوسرے عبداللہ بن ربیعہ کو حبشہ کی طرف روانہ کرنے کی تجویز کی اور اس وفد کے ساتھ نہ صرف نجاشی کے واسطے گرامی قیمت تحفے تیار کئے بلکہ اس کے تمام درباریوں کے واسطے بھی تحائف تیار کئے گئے جو زیادہ تر چمڑے کے سامان کے تھے جس کیلئے ان دنوں میں عرب خاص شہرت رکھتا تھا۔ اور اس طرح بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ یہ وفد روانہ ہوا۔ اس وفد کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو حبشہ سے واپس لا کر پھر ان کو اپنے مظالم کا تختہ مشق بنائیں، چنانچہ حبشہ میں پہنچ کر عمرو بن العاص اور ان کے ساتھی نے پہلے نجاشی کے درباریوں کے ساتھ ملاقات کی اور ان کے سامنے تحائف پیش کئے اور پھر ان کے ذریعہ سے نجاشی کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ اور تحفے تحائف پیش کرنے کے بعد نجاشی سے ان الفاظ میں درخواست کی کہ: اے بادشاہ سلامت ہمارے چند بیوقوف لوگوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا ہے اور ایک نیا دین نکالا ہے جو آپ کے دین کے بھی مخالف ہے اور ان لوگوں نے ملک میں فساد ڈال دیا ہے اور اب ان میں سے بعض لوگ وہاں سے بھاگ کر یہاں آگئے ہیں پس ہماری یہ درخواست ہے کہ آپ ان کو ہمارے ساتھ واپس بھجوا دیں۔ درباریوں نے ان کی تائید کی لیکن نجاشی نے جو ایک بیدار مغز حکمران تھا یکطرفہ فیصلہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ: ”یہ لوگ میری پناہ میں آئے ہیں۔ پس جب تک میں خود ان کا اپنا بیان نہ سُن لوں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ چنانچہ مسلمان مہاجرین دربار میں بلائے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر نجاشی نے پوچھا کہ: ”یہ کیا معاملہ ہے اور یہ کیا دین ہے جو تم نے نکالا ہے؟“ حضرت جعفر بن ابی طالب نے مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا کہ: اے بادشاہ! ہم جاہل لوگ تھے۔ بُت پرستی کرتے تھے۔ مُردار کھاتے تھے۔ بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے۔ ہمسایوں سے بد معاہدگی کرتے تھے اور ہم میں سے مضبوط کمزور کا حق دبا لیتا تھا۔ اس حالت میں اللہ نے ہم میں اپنا ایک رسول بھیجا جس کی نجابت اور صدق اور امانت کو ہم سب جانتے تھے۔ اُس نے ہم کو توحید سکھائی اور بُت پرستی سے روکا اور راست گفتاری اور امانت اور صلہ رحمی کا حکم دیا۔ اور ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی اور بدکاری اور جھوٹ اور یشموں کا مال کھانے سے منع کیا اور خوریزی سے روکا۔ اور ہم کو عبادت الہی کا حکم دیا۔ ہم اس پر ایمان لائے اور اس کی اتباع کی۔ لیکن اس وجہ سے ہماری قوم ہم سے ناراض ہو گئی اور اُس نے ہم کو دکھوں اور مصیبتوں میں ڈالا اور ہم کو طرح طرح کے عذاب دیتے اور ہم کو اس دین سے جبراً روکنا چاہا۔ حتیٰ کہ ہم تنگ آکر اپنے وطن سے نکل آئے اور آپ کے ملک میں آکر پناہ لی۔ پس اے بادشاہ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کے

تحت ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور حضرت جعفر سے کہنے لگا کہ جو کلام تم پر اُترا ہے وہ مجھے سناؤ۔ اس پر حضرت جعفر نے بڑی خوش الحانی کے ساتھ سورۃ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں۔ یہ آیات سن کر نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اس نے رقت کے لہجہ میں کہا: خدا کی قسم یہ کلام اور ہمارے مسیح کا کلام ایک ہی منبع ثور کی کرنیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کہہ کر نجاشی نے قریش کے وفد سے کہا: تم واپس چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ اور نجاشی نے ان کے تحفے بھی واپس کر دیئے۔

لیکن قریش کے غوثی سفیر اس طرح آسانی کے ساتھ خاموش نہیں کتے جاسکتے تھے۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نے دربار میں پھر رسائی حاصل کی اور نجاشی سے عرض کیا کہ حضور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ مسیح کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔ مسلمان فکر مند ہونے کے چونکہ ہم مسیح کے ابن اللہ ہونے کے منکر ہیں اس لئے کہیں عمرو بن العاص کی یہ چال چل نہ جاوے۔ مگر یہ لوگ تلوار کے سایہ کے نیچے بھی حق بات کہنے سے رکنے والے نہ تھے، چنانچہ جب نجاشی نے پوچھا کہ تم مسیح کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ تو جعفر نے صاف عرض کیا کہ اے بادشاہ! ہمارے اعتقاد کی رُو سے مسیح اللہ کا ایک بندہ ہے خدا نہیں ہے مگر وہ اس کا ایک بہت مقرب رسول ہے اور اسکی اس کلام سے عالم ہستی میں آیا ہے جو اس نے مریم پر ڈالا۔ نجاشی نے فرش پر سے ایک تینکا اٹھایا اور کہا: واللہ جو تم نے بیان کیا ہے میں اس سے مسیح کو اس تینکے کے برابر بھی بڑا نہیں سمجھتا۔ نجاشی کے اس کلام پر دربار کے پادری سخت برہم ہوئے مگر نجاشی نے ان کی کچھ پروا نہ کی اور قریش کا وفد بے نیل مرام واپس آگیا۔

اس کے بعد مہاجرین حبشہ ایک عرصہ تک بڑے امن کے ساتھ حبشہ میں رہے لیکن اُن میں سے اکثر تو ہجرت یثرب کے قریب مکہ میں واپس آگئے اور بعض حبشہ میں ہی مقیم رہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے اور جنگ بدر اور احد اور احزاب تمام ہو چکیں تب یہ لوگ عرب میں واپس آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ خیبر سے واپس آ رہے تھے۔

ابتداء میں جبکہ ابھی اکثر مہاجرین حبشہ میں ہی تھے نجاشی کو اپنے ایک حریف سے جنگ پیش آگئی اس پر صحابہ نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ضرورت پیش آئے تو ہمیں بھی نجاشی کی امداد کرنی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ذبیر ابن العوام کو دریائے نیل کے پار میدان جنگ میں بھیجا کہ حالات سے اطلاع دیں۔ اور پیچھے صحابہ خدا سے دعائیں کرتے رہے کہ نجاشی کی فتح ہو۔ چنانچہ چند دن کے بعد حضرت ذبیر نے واپس آکر اطلاع دی کہ نجاشی نے خدا کے فضل سے فتح پائی ہے۔

## حضرت ابوبکرؓ کا ہجرت کے ارادے سے نکلنا

حدیث میں حضرت عائشہؓ سے روایت آتی ہے کہ جب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے

تو ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کے ارادہ سے مکہ سے نکلے مگر جب جنوب کی طرف جاتے ہوئے برکۃ الخمار میں پہنچے تو وہاں اتفاقاً قبیلہ قارہ کے رئیس ابن الدغنے سے ملاقات ہو گئی۔ ابن الدغنے نے اس سفر کا سبب پوچھا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، اس لیے میں نے اب ارادہ کیا ہے کہ اللہ کی زمین میں کہیں نکل جاؤں اور آزاد ہو کر اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن الدغنے نے کہا: تمہارے جیسے شخص کو تو نہ خود مکہ سے نکلنا چاہیے اور نہ لوگوں کو چاہیے کہ اسے نکالیں..... آؤ میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ واپس لوٹ چلو۔ اور مکہ میں ہی اپنے رب کی عبادت کرو۔ چنانچہ ابوبکرؓ ان کے کہنے پر واپس چلے آئے۔ مکہ پہنچ کر ابن الدغنے نے رسوا قریش کو ملامت کی اور کہا کہ: کیا تم ایسی ایسی نیک صفات والے شخص کو نکالتے ہو؟ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی جس میں وہ نماز اور قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ اور چونکہ وہ نہایت ریق القلب تھے۔ اس لیے جب وہ قرآن شریف پڑھتے تو بسا اوقات ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے۔ قریش کی عورتیں اور بچے جو نسبتاً سادہ طبع اور تعصبات مذہبی سے آزاد تھے یہ نظارہ دیکھتے تو ان کے قلوب پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا اور چونکہ ویسے بھی حضرت ابوبکرؓ قریش میں بہت معزز تھے اس لیے ان کی یہ والہانہ عبادت لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرتی تھی۔ اس پر قریش نے ابن الدغنے کے پاس شکایت کی کہ ابوبکرؓ اپنی آواز سے قرآن پڑھتا ہے اور اس سے ہماری عورتیں اور بچے اور کمزور لوگ فتنہ میں پڑتے ہیں۔ لہذا تم اسے روک دو۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کو روکنا چاہا۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ: میں یہ کام ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں اگر تمہیں کوئی ڈر ہے تو میں تمہاری پناہ سے نکلتا ہوں مجھے اپنے مولیٰ کی پناہ بس ہے۔ اس کے بعد قریش نے حضرت ابوبکرؓ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں مگر وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔

## اسلام حمزہؓ

ہجرت حبشہ کے متعلق سلسلہ واقعات کو ایک جگہ بیان کرنے کی وجہ سے ہم نے بعض درمیانی واقعات کا ذکر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بیان کرتے

ہیں۔ اب تک مسلمانوں کی ظاہری حالت نہایت کمزور تھی۔ کیونکہ مسلمان ہونے والوں میں سے سوائے حضرت ابوبکرؓ کے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو قریش میں کوئی اثر رکھتا ہو یا کم از کم جس سے قریش کچھ ڈبتے ہوں مگر اب خدا کے فضل سے دو ایسے شخص اسلام میں داخل ہوئے جو اپنی وجاہت اور رعب

کی وجہ سے اسلام کی ظاہری شان کو ایک حد تک مضبوط کرنے والے ثابت ہوئے۔ ہماری مراد حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ہے جو دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے سالانہ نبوی میں سلمان ہوئے۔

حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی، لیکن ابھی تک مشرک تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ ہر روز صبح سویرے تیرکمان لے کر باہر نکل جاتے تھے اور سارا دن شکار کھیلتے رہتے تھے۔ شام کو واپس آکر پہلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور پھر قریش کی ان مجلسوں میں دورہ لگاتے جو وہ صحن کعبہ میں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں جما کر بیٹھا کرتے تھے اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر جاتے تھے۔ ایک دن حمزہ اسی طرح شکار سے واپس آئے تو ایک خادمہ نے ان سے کہا: کیا آپ نے سنا کہ ابھی ابو الجہل (یعنی ابو جہل) آپ کے بھتیجے کو سخت برا بھلا کہتا گیا ہے اور بہت گندی گندی گالیاں دی ہیں۔ مگر محمدؐ نے سامنے سے کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ سن کر حمزہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور خاندانی غیرت جوش زن ہوئی۔ فوراً کعبہ کی طرف گئے اور پہلے طواف کیا۔ طواف کرنے کے بعد اس مجلس کی طرف بڑھے جس میں ابو جہل بیٹھا تھا اور جاتے ہی بڑے زور کے ساتھ ابو جہل کے سر پر اپنی کمان ماری اور کہا: میں سنا ہوں کہ تو نے محمدؐ کو گالیاں دی ہیں۔ سن میں بھی محمدؐ کے دین پر ہوں اور میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔ پس اگر تجھ میں کچھ ہمت ہے تو میرے سامنے بول۔ ابو جہل کے سامنے ابو جہل کی حمایت میں اُسٹھے اور قریب تھا کہ لڑائی ہو جاتی مگر ابو جہل حمزہ کی دلیری اور جرأت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر روک دیا کہ حمزہ حق بجانب ہے واقعی محمدؐ سے زیادتی ہو گئی تھی اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا یہ

حمزہ جوش میں یہ الفاظ کہہ بیٹھے تھے کہ میں بھی محمدؐ کے دین پر ہوں۔ لیکن جب گھر آئے اور غصہ کم ہوا تو کچھ گھبرائے اور دپنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ اب شرک چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے یہ بعثت نبوی کے چھٹے سال کا واقعہ ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں ہی مقیم تھے یہ حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کی خوشی میں یاد دینے ہی اپنے اخلاص کے جوش میں مگر بہر حال اُسی دن جس دن حمزہؓ مسلمان ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے صحن کعبہ میں بر ملا توحید کا اعلان کیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دوسرے مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ قریش نے حضرت ابو بکرؓ کی اس جسارت کو دیکھا تو جوش میں آکر ان پر ٹوٹ پڑے اور اس بے ددی سے مارا کہ نکھا ہے کہ جب ان کے قبیلہ کے لوگ انہیں اٹھا



کمران کے گھرے گئے تو وہ بالکل بے ہوش تھے اور ضربات کی وجہ سے اٹکانا کٹنا ایک ہو رہا تھا۔ جب انہیں ہوش آیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے اور جیتک آپ کی خیریت کی خبر نہیں سنی حضرت ابوبکر کو چین نہیں آیا۔

**اسلام عمرؓ** ابھی حضرت حمزہؓ کو اسلام لائے صرف چند دن ہی گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک اور خوشی کا موقع دکھایا یعنی حضرت عمرؓ جو ابھی تک لشکرِ مخالفین میں سے تھے مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ حضرت عمرؓ کی طبیعت میں سختی کا مادہ تو زیادہ تھا ہی مگر اسلام کی عداوت نے اُسے اور بھی زیادہ کر دیا تھا، چنانچہ اسلام سے قبل عمرؓ غریب اور کمزور مسلمانوں کو ان کے اسلام کی وجہ سے بہت سخت تکلیف دیا کرتے تھے لیکن جب وہ انہیں تکلیف دیتے دیتے تھک گئے اور ان کے واپس آنے کی کوئی صورت نہ دیکھی تو خیال آیا کہ کیوں نہ اس فتنہ کے بانی کا ہی کام تمام کر دیا جاوے۔ یہ خیال آنا تھا کہ تلوار لے کر گھر سے نکلے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش شروع کی۔ راستہ میں ایک شخص نے انہیں نیکی تلوار ہاتھ میں لیے جاتے دیکھا تو پوچھا: "عمر! کہاں جاتے ہو؟" عمرؓ نے جواب دیا: "مخبر کا کام تمام کرنے جانا ہوں" اُس نے کہا: "کیا تم مخبر کو قتل کر کے بنو عبد مناف سے محفوظ رہ سکو گے؟" ذرا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں، حضرت عمرؓ جھٹ پٹے اور اپنی بہن فاطمہ کے گھر کا راستہ لیا۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو اندر سے قرآن شریف کی تلاوت کی آواز آئی۔ جو خطاب بن الارث خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ عمرؓ نے یہ آواز سنی تو غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ جلدی سے گھر میں داخل ہوئے لیکن ان کی آہٹ سنتے ہی خبابؓ تو جھٹ کہیں چھپ گئے اور فاطمہ نے قرآن شریف کے اوراق بھی ادھر ادھر چھپا دیئے۔ حضرت عمرؓ اندر آئے تو لگا کر کہا: "اے میں نے سنا ہے تم اپنے دین سے پھر گئے ہو، یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زید سے پٹ گئے۔ فاطمہ اپنے خاوند کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو وہ بھی زخمی ہوئیں مگر فاطمہ نے دیری کے ساتھ کہا: "ہاں عمر! ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو ہم اسلام کو نہیں چھوڑ سکتے" حضرت عمرؓ نہایت سخت آدمی تھے لیکن اس سختی کے پردہ کے نیچے محبت اور نرمی کی بھی ایک جھلک تھی جو بعض اوقات اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ بہن کا یہ دیرانہ کلام سنا تو آنکھ اُپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ خون میں تر رہ تھی۔ اس نظارہ کا عمرؓ کے قلب پر ایک خاص اثر ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بہن سے کہنے لگے: "مجھے وہ کلام تو دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے؟" فاطمہ نے کہا: "میں نہیں دکھاؤں گی کیونکہ تم ان اوراق کو منافع کر دو گے" عمرؓ نے جواب دیا: "میں نہیں نہیں تم مجھے دکھا دو۔ میں ضرور واپس کر دوں گا"۔

۱۔ چیس جلد ۱ صفحہ ۲۲۲ پر ہے یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ابتدائے زمانہ سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو ساتھ ساتھ کھواتے جاتے تھے اور یہ نسخے متعدد صحابہ کے پاس محفوظ رہتے تھے۔ منہ



فاطمہ نے کہا: ”مگر تم نجس ہو اور قرآن کو پاکیزگی کی حالت میں ہاتھ لگانا چاہیے پس تم پہلے غسل کرو اور پھر دیکھنا: غالباً ان کا منشاء یہ بھی ہوگا کہ غسل کرنے سے عمر کا قصہ بالکل فرو ہو جائے گا اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جب عمر غسل سے فارغ ہوئے تو فاطمہ نے قرآن کے اوراق نکال کر ان کے سامنے رکھ دیتے۔ انہوں نے اٹھا کر دیکھا تو سورۃ طہ کی ابتدائی آیات تھیں حضرت عمرؓ نے ایک موعوب دل کے ساتھ انہیں پڑھنا شروع کیا اور ایک ایک لفظ اس سید فطرت کے اندر گھرکتے جاتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے حضرت عمرؓ اس آیت پر پہنچے کہ:

إِنَّمَا أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي  
إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيَجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۖ

یعنی میں ہی اس دنیا کا واحد خالق و مالک ہوں میرے سوا اور کوئی قابل پرستش نہیں پس تمہیں چاہیے کہ صرف میری ہی عبادت کرو اور میری ہی یاد کے لیے اپنی دعاؤں کو وقف کر دو۔ دیکھو موعوب گھڑی جلد آنے والی ہے مگر ہم اس کے وقت کو مخفی رکھے ہوئے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے کئے کا سچا سچا بدلہ پاسکے۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ آیت پڑھی تو گویا ان کی آنکھ کھل گئی اور سوتی ہوئی فطرت چونک کر بیدار ہو گئی بے اختیار ہو کر بولے: یہ کیسا عجیب اور پاک کلام ہے!

خبا ب نے یہ الفاظ سنے تو فوراً باہر نکل آئے اور خدا کا شکر ادا کیا اور کہا: یہ رسول اللہ کی دعا کا نتیجہ ہے کیونکہ خدا کی قسم ابھی کل ہی میں نے آپ کو یہ دعا کرتے سنا تھا کہ یا اللہ تو عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام (یعنی ابو جہل) میں سے کوئی ایک ضرور اسلام کو عطا کر دے۔ حضرت عمرؓ کو اب ایک ایک پل گراں تھی۔ خبا ب سے کہا: مجھے ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ بتاؤ۔ مگر کچھ ایسے آپسے سے باہر ہو رہے تھے کہ تلوار اُسی طرح ننگی کھینچ رکھی تھی۔ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں مقیم تھے؛ چنانچہ خبا ب نے انہیں وہاں کا پتہ بتا دیا۔ عمر گئے اور دروازہ پر پہنچ کر زور سے دھک دی۔ صحابہ نے دروازے کی دراڑ میں سے عمر کو ننگی تلوار تھامے ہوئے دیکھ کر دروازہ کھولنے میں تامل کیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دروازہ کھول دو“ اور حضرت حمزہؓ نے بھی کہا۔ دروازہ کھول دو۔ اگر نیک ارادہ سے آیا ہے تو بہتر؛ ورنہ اگر نیت بد ہے تو واللہ اسی کی تلوار سے اُس کا سر اُڑا دوں گا۔ دروازہ کھولا گیا۔ عمر ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئے۔ ان کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور عمر کا دامن پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کہا: ”عمر کس ارادہ سے آئے ہو؟ واللہ میں دیکھتا ہوں

کہ تم خدا کے عذاب کے لیے نہیں بنائے گئے۔ عمر نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں مسلمان ہونے آیا ہوں۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو خوشی کے جوش میں اللہ اکبر کہا اور ساتھ ہی صحابہ نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

حضرت عمرؓ کی عمر اس وقت ۳۳ سال کی تھی اور آپ اپنے قبیلہ بنو عدی کے رئیس تھے۔ قریش میں سفار کا عہدہ بھی انہی کے سپرد تھا اور ویسے بھی نہایت بازعب اور جبری اور دیر تھے۔ ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور انھوں نے دار ارقم سے نکل کر بڑا مسجد حرام میں نماز ادا کی۔ حضرت عمرؓ آخری صحابی تھے جو دار ارقم میں ایمان لاتے اور یہ بعثت نبوی کے چھٹے سال کے آخری ماہ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مکہ میں مسلمان مردوں کی تعداد چالیس تھی۔

جب حضرت عمرؓ کے اسلام کی خبر قریش میں پھیلی تو وہ سخت جوش میں آ گئے۔ اور اسی جوش کی حالت میں انھوں نے حضرت عمرؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت عمرؓ باہر نکلے تو ان کے ارد گرد لوگوں کا ایک بڑا جمع اکٹھا ہو گیا اور قریب تھا کہ بعض جوشیلے لوگ ان پر حملہ آور ہو جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ بھی نہایت دیرری کے ساتھ ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ آخر اُسی حالت میں مکہ کا رئیس اعظم عاص بن وائل اُپر سے آگیا اور اس جوم کو دیکھ کر اس نے اپنے سردارانہ انداز میں آگے بڑھ کر پوچھا: "یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا: "عمر صابی ہو گیا ہے۔" اُس نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے کہا: "تو خیر پھر بھی اس ہنگامہ کی ضرورت نہیں۔ میں عمر کو پناہ دیتا ہوں۔" اس آواز کے سامنے عربی دستور کے مطابق لوگوں کو خاموش ہونا پڑا اور وہ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ چند دن تک اس میں رہے کیونکہ عاص بن وائل کی پناہ کی وجہ سے کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا تھا، لیکن اس حالت کو حضرت عمرؓ کی غیرت نے زیادہ دیر تک برداشت نہ کیا؛ چنانچہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے عاص بن وائل سے جا کر کہہ دیا کہ میں تمہاری پناہ سے نکلتا ہوں۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد میں مکہ کی گلیوں میں بس پٹتا پیٹتا ہی رہتا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ نے کبھی کسی کے سامنے آنکھ نہ میچی نہیں کی۔

حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کے قریب ہی ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرؓ بھی مسلمان ہوئے۔ عبداللہ اس وقت بالکل بچہ تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھوں نے بہت بڑا رتبہ حاصل کیا اور اسلام کے چوٹی کے علماء میں سے سمجھے جانے لگے۔

۱۔ ابن ہشام والرد من الالف و زر قانی۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے متعلق بعض اور روایات بھی ہیں۔ مگر ہم نے اس جگہ صرف اہل سیرۃ کی معروف روایت کو لے لیا ہے۔

۲۔ زر قانی ۳۔ زر قانی ۴۔

آنحضرت ﷺ کی قریش کے ایک وفد سے ملاقات جب قریش نے دیکھا کہ حضرت حمزہ اور حضرت عمرؓ جیسے ذی قدرت لوگ بھی

اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں تو انہیں بہت فکر دامنگیر ہوا اور انہوں نے باہم مشورہ کر کے پہلے تو عقبہ بن ربیعہ کو آپ کے پاس بھیجا تاکہ وہ کسی طرح آپ کو راضی کر کے اشاعت اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے لیکن جب عقبہ کو اس مشن میں ناکامی ہوئی بلکہ قریش نے دیکھا کہ انا عقبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متاثر اور مرعوب ہو کر واپس آیا ہے۔ تو انہوں نے ایک دن کعبہ کے پاس جمع ہو کر باہم مشورہ کیا اور یہ تجویز کی کہ چند رؤسا اکٹھے ہو کر آپ کے ساتھ بات کریں؛ چنانچہ اس تجویز کے مطابق ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور ابو جہل اور امیہ بن خلف اور عقبہ اور شیبہ اور ابوسفیان اور اسود بن مطلب اور نضر بن حارث اور ابو بختری وغیرہ صحن کعبہ میں مجلس جما کر بیٹھ گئے اور ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام دیکر روانہ کیا گیا کہ تمہاری قوم کے رؤسا تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں تم ذرا صحن کعبہ میں آکر ان کی بات سن جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے موقعوں کی تلاش میں خود رہتے تھے، فوراً تشریف لے گئے۔ اور یہی علیک سلیک کے بعد قریش نے یوں گفتگو شروع کی کہ .... ”اے محمد! دیکھو تمہاری وجہ سے قوم میں کتنا اختلاف وانشقاق پیدا ہو رہا ہے۔ تم نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب میں رخنہ ڈال کر اپنی قوم کے بزرگوں کو برا بھلا کہا۔ ان کے قابلِ شکریم معبودوں کو گایاں دیں اور ان کے ذی عزت بزرگوں کو لایق قرار دیا۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی ہتک اور ذلت کیا ہو سکتی ہے جو تم نے کی ہے اور کر رہے ہو۔ مگر ہم تمہارے معاملہ میں حیران ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اگر تو تمہاری یہ بیماری جلد و جہد اس غرض سے ہے کہ تم اسس ذریعہ سے مال جمع کر کے مالدار بن جاؤ تو ہم تمہیں اتنا مال جمع کئے دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند کہلا سکو۔ اگر جاہ و عزت کی طلب ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار اور رئیس بنالینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر حکومت کی حرص ہے تو ہمیں اس میں بھی تامل نہیں کہ تمہیں اپنا بادشاہ قرار دے لیں۔ اور اگر تمہارا یہ شور و شغب کسی بیماری یا آسیب کا نتیجہ ہے تو ہم اپنے پاس سے خرچ کر کے تمہارے علاج کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر کے خوش ہو سکتے ہو تو تمہیں عرب کی بہترین لڑکی تلاش کر کے پیش کیے دیتے ہیں“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خاموشی کے ساتھ رؤسائے قریش کی اس تقریر کو سنا اور جب وہ اپنی بات ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا ”اے معشر قریش! مجھے ان چیزوں میں سے کسی کی تمنا نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی آسیب یا بیماری لاحق ہے۔ میں تو خدا کی طرف سے ایک رسول ہوں اور خدا کا

پیغام لے کر تمہاری طرف آیا ہوں۔ اور میرا دل تمہاری ہمدردی سے معمور ہے۔ اگر تم میری بات سنو اور مانو تو دین و دنیا میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اور اگر تم لمسے زد کر دو تو میں اس صورت میں صبر و تحمل کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کروں گا۔ قریش نے کہا: تو اے محمد! گویا تم ہماری اس تجویز کو منظور نہیں کرتے۔ اچھا اگر تم نے اپنی رسالت ہی منوانی ہے تو آؤ اسی کے متعلق فیصلہ کر لو۔ تم دیکھتے ہو کہ ہمارا یہ ملک کس قدر بے آب و گیاہ ہے اور خشک پتھروں اور چٹانوں یا ریت کے بے پناہ تودوں کے سوا یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم واقعی خدا کے رسول ہو تو اپنے خدا سے کہو اس ملک میں بھی شام و عراق کی طرح نہریں جاری کروادو اور ان پہاڑوں کو اڑا کر زرخیز میدان بنادو۔ پھر ہم ضرور تمہاری رسالت کے قائل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: میں تو خدا کی طرف سے ایک پیغامبر ہوں اور میرا کام صرف یہ ہے کہ تمہیں حق و باطل کا راستہ دکھا دوں اور تمہارے نفع نقصان کی بات تمہیں سمجھا دوں۔ ہاں میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم اگر خدا کی آواز پر لبیک کہو گے تو خدا اپنے وقت پر ضرور تمہیں دین و دنیا کے انعامات کا وارث بنائے گا۔ قریش نے کہا اچھا یہ بھی نہیں تو کم از کم تمہارے ساتھ خدا کا کوئی فرشتہ ہی اترتا نظر آتا اور محلات میں تمہارا بسیرا ہوتا اور تمہارے ہاتھ میں سونے چاندی کے ڈھیر ہوتے مگر ان میں سے کوئی چیز بھی تو تمہیں میسر نہیں ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح بازاروں میں پھرتے اور ہماری طرح اپنی روزی کے متلاشی ہوتے ہو۔ پھر وہ کونسی علامت ہے جس سے ہم تمہیں خدا کا بھیجا ہوا سمجھ لیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو ان باتوں کا اس رنگ میں مدعی نہیں ہوں جو تم ڈھونڈتے ہو۔ ہاں یہ میں نے کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ اگر تم مجھے مانو گے تو خدائی سنت کے مطابق دین و دنیا کی حسانت سے ضرور حصہ پاؤ گے۔ قریش نے بگڑا کر کہا کہ اگر یہ بھی نہیں تو پھر وہ عذاب ہی لاؤ جس کا تم وعدہ دیتے ہو۔ آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی ہم پر اگر سے۔ یا فرشتوں کی کوئی فوج ہی خدائی جھنڈے کے نیچے ہمارے سامنے آدھکے۔ خدا کی قسم ہمیں تو اب بس یہی نظر آ رہا ہے کہ یا ہم زندہ رہیں گے یا ٹورے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے غصہ کو دباتے ہوئے خاموش ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مغموم دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر واپس تشریف لے آئے۔ جب آپ واپس چلے آئے تو ابو جہل نہایت غضبناک ہو کر بولا کہ ”اے معشر قریش! تم نے دیکھ لیا کہ محمد نے تمہاری ساری باتوں کو ٹھکرا دیا ہے اور وہ اپنی اس فتنہ انگیزی سے کبھی باز نہیں آئے گا۔ اب واللہ میں بھی اس وقت تک چین نہیں لوں گا کہ جب تک محمد کا سر کھل کر نہ رکھ دوں۔ اور پھر بنو عبد مناف میرے ساتھ ہو کر ناچاہیں کر گزریں۔“ بنو عبد مناف کے جو لوگ وہاں موجود تھے اور وہاں ہی تھے جو بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ماسوائے تھے۔ ان سب نے بیک آواز کہا: ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم محمد کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو بیشک کرو۔ دوسرے دن ابو جہل ایک بڑا سا پتھر لے کر صحن کعبہ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب آپ تشریف لائے تو اس کے دل پر کچھ ایسا رعب طاری



ہوا کہ وہیں بُت بن کر کھڑا رہا اور آگے بڑھ کر دار کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔

**آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا اور غیب** کے متعلق ایک اور روایت بھی آتی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ

خدا کی سنت اسی طرح پر ہے کہ جو لوگ خدا کے سرسین کے سامنے زیادہ بیابک ہوتے ہیں عموماً انہیں پر خدا تعالیٰ اپنے رسولوں کا رعب زیادہ مستط کرتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آراشہ نامی شخص مکہ میں کچھ اونٹ بیچنے آیا اور ابو جہل نے اُس سے یہ اونٹ خرید لیے مگر اونٹوں پر قبضہ کر لینے کے بعد قیمت ادا کرنے میں حیل و حجت کرنے لگا۔ اس پر آراشہ جو مکہ میں ایک اجنبی اور بے یار مددگار تھا بہت پریشان ہوا اور چند دن تک ابو جہل کی منت و سماجت کرنے کے بعد وہ آخر ایک دن جبکہ بعض رؤساء قریش کعبۃ اللہ کے پاس مجلس جماعت بیٹھے تھے، ان لوگوں کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے معزین قریش آپ میں سے ایک شخص ابو الحکم نے میرے اونٹوں کی قیمت دبا رکھی ہے آپ مہربانی کر کے مجھے یہ قیمت دلوادیں۔ قریش کو شرارت جو سو جھی تو کہنے لگے ایک شخص یہاں محمد بن عبداللہ نامی رہتا ہے تم اس کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں قیمت دلا دے گا۔ اور اس سے عرض ان کی یہ سچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بہر حال انکار ہی کریں گے اور اس طرح باہر کے لوگوں میں آپ کی سبکی اور ہنسی ہوگی۔ جب آراشہ وہاں سے لوٹا تو قریش نے اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کر دیا کہ دیکھو کیا تماشہ بنتا ہے، چنانچہ آراشہ اپنی سادگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ایک مسافر آدمی ہوں اور آپ کے شہر کے ایک تیس ابو الحکم نے میری رقم دبا رکھی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھے یہ رقم دلا سکتے ہیں۔ پس آپ مہربانی کر کے مجھے میری رقم دلوادیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، چنانچہ آپ اُسے لے کر ابو جہل کے مکان پر آئے اور دروازہ پر دستک دی۔ ابو جہل باہر آیا تو آپ کو دیکھ کر ہٹا بکا رہ گیا۔ اور خاموشی کے ساتھ آپ کا منہ دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا یہ شخص کہتا ہے کہ اس کے پیسے آپ کی طرف نکلتے ہیں۔ یہ ایک مسافر ہے آپ اس کا حق کیوں نہیں دیتے؟ اس وقت ابو جہل کا رنگ فی ہور ہاتھا۔ کہنے لگا: ”محمدؐ بھڑو! میں ابھی اس کی رقم لاتا ہوں“ چنانچہ وہ اندر گیا اور آراشہ کی رقم لا کر اسی وقت اس کے حوالے کر دی۔ آراشہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اور واپس آکر قریش کی اسی مجلس میں پھر گیا۔ اور وہاں جا کر ان کا بھی شکریہ ادا کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے ایک بہت ہی اچھے آدمی کا پتہ بتایا۔ خدا اُسے جزاء خیر دے اُس نے اُسی وقت میری رقم دلا دی۔ رؤساء قریش کے منہ میں زبان بند سچی اور وہ ایک دوسرے کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ جب آراشہ چلا گیا تو انھوں نے اس آدمی سے دریافت کیا جو آراشہ کے پیچھے ابو جہل



کے مکان تک گیا تھا کہ کیا قصہ ہوا ہے۔ اُس نے کہا۔ واللہ! میں نے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا ہے اور وہ یہ کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاکر ابوالحکم کے دروازہ پر دستک دی اور ابوالحکم نے باہر آ کر محمد کو دیکھا تو اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ گویا ایک قالب بے رُوح ہے اور چونہی کہ اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ اس کی رقم ادا کر دو، اُسی وقت اُس نے اندر سے پانی پانی لا کر سامنے رکھ دی، تھوڑی دیر کے بعد ابوہریرہ بھی اس مجلس میں آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی سب لوگ اس کے پیچھے ہو لیے کہ اے ابوالحکم تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ محمد سے اس قدر ڈر گئے۔ اُس نے کہا۔ خدا کی قسم! جب میں نے محمد کو اپنے دروازے پر دیکھا، تو مجھے یوں نظر آیا کہ اُس کے ساتھ لگا ہوا ایک سُست اور غضبناک اُونٹ کھڑا ہے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر ذرا بھی چون دھرا کر دوں گا تو وہ مجھے چبا جائے گا۔

جو الزامات قریش اُردی کی طرف آنحضرت

### ایک عیسائی غلام سے تعلیم حاصل کرنے کا الزام

تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ بعض عیسائیوں سے باتیں سیکھتے ہیں اور پھر انہیں اپنا رنگ دے کر اپنی تعلیم کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر ایک جابر نامی عیسائی کا نام لیا جاتا تھا جو مکہ کے ایک مشرک رئیس ابن حضرمی کا غلام تھا۔ یہ شخص چونکہ عیسائی تھا اور عیسائیت کی تعلیم بُت پرستی کی نسبت اسلام کے زیادہ قریب تھی اور مکہ کے مناظر میں جبر کو شریک اور بُت پرستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے مذہبی شوق میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملتا رہتا تھا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کے شوق کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ قریش نے یہ نظارہ دیکھا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بدنام کرنے کی غرض سے مشہور کرنا شروع کیا کہ ”محمد تو جبر سے تعلیم حاصل کرتا ہے“ اسلام اور مسیحیت کی تعلیم کے اختلاف اور جبر کی علمی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک نہایت فضول اور لغو اعتراض تھا، مگر قریش کو تو صرف اعتراض کی ضرورت تھی۔ معقول یا غیر معقول ہونے سے سروکار نہ تھا۔ اس لیے وہ بڑے شوق سے اس اعتراض کو دوہراتے رہے۔ قرآن شریف نے اس اعتراض کا خوب جواب دیا ہے کہ جس شخص کی طرف تم محمد رسول اللہ کی تعلیم کو منسوب کرتے ہو اس کی زبان تو ظاہری اودھ معنوی ہر دو رنگ میں لگتا ہے، پھر وہ قرآن جیسی کتاب میں محمد رسول اللہ کا استاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ شخص غیر عربی ہونے کی وجہ سے اس فصیح اور بلیغ عربی کلام کا معلم کس طرح سمجھا جاسکتا ہے جو قرآن شریف میں استعمال ہوا ہے اور دوسری طرف معنوی رنگ میں اس شخص کی جہالت معارف قرآنی کا سرچشمہ

کس طرح قرار دی جاسکتی ہے۔

قرآنی آیات محمولہ بالا میں جو عجیب یعنی غیر عربی کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ابھی اناجیل کا عربی ترجمہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس لیے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حیراناجیل کے کوئی حصہ سنانا ہو گا تو وہ لازماً عبرانی یا یونانی میں ہوں گے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کس طرح سمجھتے اور کس طرح عربی کے قالب میں ڈھالتے ہوں گے۔

بعض روایتوں میں حیر کے سوا بعض اور لوگوں کے نام بھی اس تعلق میں بیان ہوئے ہیں جن کے متعلق قریش اعتراض کیا کرتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتے ہیں۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ غلاموں کے طبقہ میں سے تھے۔ بہر حال قریش سمجھنے کے لیے کچھ دن اس اعتراض کو شہرت دیکر بھی اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر جو آگ نہ بجھنے والی تھی وہ کیسے بجھتی؟

ابتر ہونے کا الزام  
انہی آیات میں بعض قریش نے یہ کہہ کر بھی اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو لا وارث اور بے نسل ہے۔ چند دن تک اس کا سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ وحی نازل ہوئی کہ :

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ  
یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! ہم نے تیری نسل اور تیری برکات و فیوض کے سلسلہ کو بہت بڑا بنایا ہے۔ پس تو خدا کے لیے اپنے نفس کی طاقتوں اور اپنی نسل و اموال کو بیشک بے دریغ خرچ کر۔ کیونکہ یہ خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے ! البتہ تیرے بدخواہ دشمنوں کے سارے سلسلے مٹا دیئے جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس شاندار اور آپ کے معاندین کے لیے جس ہیبت ناک طریق پر آپ کا یہ الہام پورا ہوا ہے وہ تاریخ کا ایک کھلا ورق ہے جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ انہی اعتراض کرنے والوں کی اولاد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ گجشوں میں داخل ہو کر اس بات پر مہر لگادی کہ نہ صرف قریش بلکہ تمام قبائل عرب میں سے اگر کسی شخص کی نسل حقیقتاً قائم رہی ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ہیں۔

قریش کی طرف سے مصالحت کی تجویز  
جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ان آیات میں قریش سخت تیرج و تاب کھا رہے تھے اور ہر شخص اس سوچ میں

۱۔ دیکھو ٹیکسٹ اینڈ کمن آف نیو ٹیسٹمنٹ مصنفہ اے سوٹرایم۔ اے اور شائع کردہ میسنزڈ کورٹھ لندن صفحہ ۷۲  
۲۔ تفسیر البحر المحیط زیر آیت ۱۰۴ سورۃ نحل۔ نیز لائف آف محمد صلعم مصنفہ سر ولیم مور صفحہ ۶۵  
۳۔ ابن ہشام اور قرآن شریف سورۃ کوثر

پڑا ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوتے دین کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس ادھیڑ میں ایک دن روسائے قریش میں سے ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل اور امیہ بن خلف وغیرہ آپس میں بات کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہنے لگے: "لے ٹھہر! یہ اختلاف تو بہت بڑھتا جاتا ہے اور ہمارا قومی شیرازہ بکھڑ رہا ہے۔ کیا کوئی باہم مصالحت کی تدبیر نہیں ہو سکتی؟" آپ نے دریافت فرمایا: "وہ کیسے؟" انھوں نے جواب دیا کہ ہم اور تم اپنی عبادت کو مشترک کر لیتے ہیں۔ یعنی تم اپنے خدا کے ساتھ ہمارے بتوں کو بھی پوج لیا کرو اور ہم اپنے بتوں کی عبادت میں تمہارے خدا کو بھی شریک کر لیا کریں گے۔ اس طرح مصالحت ایک یہ فائدہ بھی ہو گا کہ ہم میں سے جو فریق حق اور راستی پر ہے اس کا فائدہ دوسرے کو بھی پہنچتا رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ذرا غور تو کر دیکس طرح ہو سکتا ہے؟ میں اپنے خدا کو مانتے ہوئے تمہارے بتوں کو کس طرح پوج سکتا ہوں۔ اور تم بت پرستی پر قائم رہتے ہوئے میرے خدا کی پرستش کس طرح کر سکتے ہو؟ یہ دونوں باتیں تو ایک دوسرے کے اس قدر مخالف اور متضاد واقع ہوتی ہیں کہ کسی طرح ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ انہی آیام میں قرآن شریف کی یہ آیات نازل ہوئیں کہ:

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۖ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۖ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ  
مَا أَعْبُدُ ۖ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۖ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ  
لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۚ

"یعنی اے کفار کے گروہ! جن بتوں کو تم پوجتے ہو۔ میں انہیں قابل پرستش نہیں سمجھتا۔ اور نہ تم اپنے بتوں کو پوجتے ہوئے میرے خدا کی پرستش کر سکتے ہو۔ پس یہ ناممکن ہے کہ میں کہی تمہارے بتوں کی پرستش کروں جس طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ تم اپنے بتوں پر ایمان لاتے ہوئے میرے واحد لا شریک خدا کے سامنے جھکو۔ میرا دین اور ہے اور تمہارا دین اور ہے اور یہ دونوں کبھی بھی ایک جگہ مل نہیں سکتے۔"

اس جواب سے قریش نے سمجھ لیا کہ ان کے اس ہوائی قلعہ کے کوئی پاؤں نہیں ہیں۔

قریش کو ان کی اُپر تلے کی  
ناکامی نے سخت متعل کر دیا

مسلمانوں کے خلاف قریش کا معاہدہ اور مسلمانوں کا بائیکاٹ

تھا۔ سب سے پہلے ابوطالب کے معاملہ میں انہیں ذلت کا ٹنڈ دیکھنا پڑا اور وہ بنو ہاشم کو مسلمانوں سے جدا نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو ہر طرح کے مصائبِ آلام میں مبتلا کر کے دیکھ لیا کہ یہ چٹان اپنی

جگہ سے ہٹنے والی نہیں ہے۔ بعدہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام نے ان کی آنکھیں اس حقیقت کے دیکھنے کے لیے کھول دیں کہ شروع شروع میں مخالف رہنے کے بعد بھی ان کے بڑے سے بڑے لوگ اسلام کی زد میں بہہ جانے سے محفوظ نہیں ہیں۔ زناں بعد حبشہ کا وفد نجاشی کے دربار سے خائب و خاسر ہو کر یثرب اور قریش کو اس معاملہ میں سخت زلت نصیب ہوئی۔ اور اب انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیلہ جنبانی کمر کے ایسی ٹٹہ کی کھائی کہ بایں و شاید ان پے درپے ناکامیوں اور ذلتوں نے قریش کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی؛ چنانچہ انھوں نے ایک عمل اقدام کے طور پر باہم مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام افراد بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات قطع کر دیتے جاویں اور اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے مستبردار نہ ہوں تو ان کو ایک جگہ محصور کر کے تباہ کر دیا جاوے؛ چنانچہ محرم سنہ نبوی میں ایک باقاعدہ معاہدہ لکھا گیا کہ کوئی شخص خاندان بنو ہاشم اور بنو مطلب سے رشتہ نہیں کرے گا اور نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کرے گا۔ نہ ان سے کچھ خریدے گا اور نہ ان کے پاس کوئی کھانے پینے کی چیز جانے دے گا اور نہ ان سے کسی قسم کا تعلق رکھے گا۔ جب تک کہ وہ ٹٹہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے الگ ہو کر آپ کو ان کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ جس میں قریش کے ساتھ قبائل بنو کنناہ بھی شامل تھے۔ یہ باقاعدہ لکھا گیا اور تمام بڑے بڑے رؤساء کے اُس پر دستخط ہوئے اور پھر وہ ایک اہم قومی عہد نامہ کے طور پر کعبہ کی دیوار کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام بنو ہاشم اور بنو مطلب کیا مسلم اور کیا کافر دسوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے جس نے اپنی عداوت کے جوش میں قریش کا ساتھ دیا (شعب ابی طالب میں جو ایک پہاڑی درہ کی صورت میں تھا، محصور ہو گئے اور اس طرح گویا قریش کے دو بڑے قبیلے مکہ کی تمدنی زندگی سے عملاً بالکل منقطع ہو گئے اور شعب ابی طالب میں جو گویا بنو ہاشم کا خاندانی درہ تھا قیدیوں کی طرح نظر بند کر دیئے گئے۔ یہ چند گنتی کے دوسرے شلمان جو اس وقت مکہ میں موجود تھے وہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔

جو جو مصائب اور سختیاں ان آیام میں ان محصورین کو اٹھانی پڑیں ان کا حال پڑھ کر بدن پر لرزہ پڑ جاتا ہے۔ صحابہ کا بیان ہے کہ بعض اوقات انھوں نے جانوروں کی طرح جنگلی درختوں کے پتے کھا کھا کر گزارہ کیا۔ سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے وقت ان کا پاؤں کسی ایسی چیز پر جا پڑا جو تر اور نرم معلوم ہوتی تھی۔ غالباً کوئی کھجور کا ٹکڑا ہو گا۔ اس وقت ان کی بھوک کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے فوراً اُسے اٹھا کر نگل لیا اور وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے آج تک پتہ نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ ایک دوسرے

موقعہ پر بھوک کی وجہ سے ان کا یہ حال تھا کہ انہیں ایک سوکھا ہوا چمڑہ زمین پر پڑا ہوا مل گیا تو اُسی کو انہوں نے پانی میں نرم اور صاف کیا اور پھر ٹھون کر کھایا اور تین دن اسی غیبی ضیافت میں بسر کئے۔ یہ بچوں کی یہ حالت تھی کہ محلہ سے باہر ان کے رونے اور چلانے کی آواز جاتی تھی جسے سن سن کر قریش خوش ہوتے تھے لیکن مخالفین اسلام سب ایک سے نہ تھے۔ بعض یہ دردناک نظائے دیکھتے تھے تو ان کے دل میں رحم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ حکیم بن حزام کبھی کبھی اپنی بھوپھی حضرت خدیجہ کے لیے غنیمہ غنیمہ کھانا لے جاتے تھے۔ مگر ایک دفعہ ابو جہل کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تو اس کی بخت نے راستہ میں بڑی سختی کے ساتھ روکا اور باہم ہاتھ پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ مصیبت برابر اڑھائی تین سال تک جاری رہی اور اس عرصہ میں مسلمان سوائے حج وغیرہ کے موسم کے جبکہ شہر حرم کی وجہ سے امن ہوتا تھا باہر نہیں نکل سکتے تھے جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ قریش میں بعض نرم دل اور شریف مزاج لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ ان مظالم کو دیکھتے تو دل میں

### اس ظلم سے مسلمانوں کی رہائی

گڑھتے مگر قوم کے متفقہ فیصلہ کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتے تھے، اس لیے دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا کر رہ جاتے آخر خدا کی طرف ایسا سامان پیدا ہو گیا کہ انہیں اس معاملہ میں جرأت کے ساتھ قدم اٹھانے کی ہمت پڑ گئی۔ اس کی تفصیل یوں بیان ہوتی ہے کہ جب اس بائیکاٹ پر قریباً تین سال کا عرصہ گزر گیا، تو ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے فرمایا کہ مجھے خدا نے بتایا ہے کہ ہمارے خلاف جو معاہدہ لکھا گیا تھا اس میں سوائے خدا کے نام کے ساری تحریر مٹ چکی ہے اور کاغذ کھایا جا چکا ہے۔ ابوطالب فوراً اٹھ کر خانہ کعبہ میں پہنچے جہاں بہت سے رؤسائے قریش مجلس لگائے بیٹھے تھے اور انکو خطاب ہو کر کہنے لگے کہ تمہارا یہ ظالمانہ معاہدہ کب تک چلے گا۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے کہ خدا نے اس معاہدہ کی ساری تحریر سوائے اپنے نام کے محو کر دی ہے۔ تم ذرا یہ معاہدہ نکالو تاکہ دیکھیں کہ میرے بھتیجے کی یہ بات کہاں تک درست ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہاں ہاں! ضرور دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ معاہدہ منگا کر دیکھا گیا تو واقعی وہ سب کرم خوردہ ہو چکا تھا۔ اور سوائے شروع میں خدا کے نام کے کوئی لفظ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ اس پر بعض قریش تو اور بھی زیادہ چمک اُٹھے۔ لیکن وہ جن کے دل میں پہلے سے انصاف اور رحم اور قربات داری کے جذبات پیدا ہو رہے تھے ان کو اس معاہدہ کے خلاف آواز اٹھانے کا ایک عمدہ موقعہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ رؤسائے قریش میں سے ہشام بن عمرو، زبیر بن ابی امیہ، مطلق بن عدی، ابوالخیر

۱۔ الرؤس الاف حالات نقص میفہ ۲۔ ابن سعد ذکر حضر قریش ۳۔ ابن ہشام ۴۔ ابن سعد ۵۔ قریش کی عادت تھی کہ اپنی تحریرات کے شروع میں باسمک اللہ کے لفظ لکھا کرتے تھے اور معاہدہ میں صرف یہی جتہ باقی رہ گیا تھا ۶۔ ابن ہشام و ابن سعد ۷۔



اور زمر بن اسود نے باہم مل کر یہ تجویز کی کہ اس ظالمانہ اور قطع رحمی کرنے والے معاہدہ کو اب ختم کر دینا چاہیئے۔ یہ تجویز کے یہ لوگ دوسرے رؤساء قریش کی مجلس میں گئے اور ان میں سے ایک نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے قریش کیا یہ مناسب ہے کہ تم تو مزے کے ساتھ زندگی بسر کرو اور تمہارے مہمائی اس طرح مصیبت میں من کاٹیں۔ یہ معاہدہ ظالمانہ ہے اسے اب منسوخ کر دینا چاہیئے۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے اس کی تائید کی۔ لیکن ابو جہل بولا: ہرگز نہیں یہ معاہدہ قائم رہے گا اسے کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا، کسی نے جواب دیا: نہیں اب یہ قائم نہیں رہ سکتا۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، اسی حیل و حجت میں مطعم بن عدی نے ہاتھ بڑھا کر یہ بوسیدہ دستاویز چاک کر دی۔ اور ابو جہل اور اس کے ساتھی دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔

صحیفہ چاک کرنے کے بعد یہ لوگ ہتھیار لگا کر شعب ابی طالب کے دروازہ پر گئے اور تلواروں کے سایہ کے نیچے محصورین کو باہر نکال لاتے۔ یہ واقعہ بعثت نبوی کے دسویں سال کا ہے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اڑھائی تین سال تک محصور رہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ آپ بعثت کے ساتویں سال ماہ محرم میں محصور ہوئے تھے۔

غالباً ابھی آپ شعب ابی طالب میں ہی تھے کہ شق القمر کا مشہور معجزہ ظاہر ہوا یعنی بعض کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ طلب کیا۔ اور آپ نے انہیں چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کا معجزہ دکھایا۔ اس واقعہ کا قرآن شریف میں اس طرح ذکر آتا ہے:

اِقْرَبَتِ السَّاعَةُ وَالشَّقُّ الْقَمَرُ ۚ وَان يَرَوْا آيَةً يُعْرَضُوا  
وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۚ وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا ۚ اَهُوَ آءُهُمْ وَكُلُّ  
اَمْرٍ مُّسْتَقَرٌّ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِيهِ  
مُزِدٌ جَرٌّ ۝

”موعود گھڑی قریب آگئی ہے اور چاند پھٹ گیا۔ اگر یہ لوگ کوئی نشان دیکھیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے اور ایسا جادو ہوتا ہی چلا آیا ہے۔ انھوں نے ہمارے رسول کی تکذیب کی اور اپنی حرص و آرزو کے پیچھے پڑے رہے، حالانکہ ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ بہر حال ہم نے انہیں ایک ایسی خبر پہنچا دی ہے جس میں ان کے لیے ایک تنبیہ اور بیداری کا سامان موجود ہے۔“

اور حدیث میں اس معجزہ کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے :-

إِنَّ أَهْلَ مَكَّةَ سَأَلُوا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُرِيْعَهُمْ أَيْدَهُمْ فَادَّاهُمُ الْقَمَرُ شَقَّتَيْنِ حَتَّى رَأَوْهُمَا ابْتَيْنَهُمَا

”یعنی کفارِ مکہ نے آپ سے کوئی معجزہ طلب کیا جس پر آپ نے انہیں چاند کو دو ٹکڑوں میں دکھایا۔ حتیٰ کہ انہیں چاند کا ایک ٹکڑا احرام پہاڑی کے ایک طرف نظر آتا تھا اور دوسرا دوسری طرف“

اور ایک دوسری روایت میں جو عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے یہ الفاظ ہیں :-

رَأَى النَّاسُ الْقَمَرَ وَنَحْنُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَخْنِي فَقَالَ اشْهَدُوا ....  
..... فَرَقَّةٌ فَوْقَ الْجَبَلِ وَفَرَقَّةٌ دُونَهُ

”یعنی ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ ایک ٹکڑا پہاڑی کے اوپر کی جانب تھا اور دوسرا نیچے کی طرف“

اس کے علاوہ حدیث اور مکتب سیرۃ میں شق القمر کے متعلق اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں بعض مزید تفصیلات بھی دی گئی ہیں مگر زیادہ معتبر روایات وہی ہیں جو اوپر درج کر دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ ہمیں اس جگہ اس مسئلے کے متعلق مناظرانہ رنگ میں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں اس لیے اس موقع پر صرف مندرجہ بالا روایات کا اندراج کافی ہے؛ البتہ ایک مختصر تشریحی نوٹ اس بات کے متعلق درج کرنا ضروری ہے کہ اس معجزہ کی حقیقت کیا تھی۔ آیا واقعی چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا یا یہ کہ صرف دیکھنے والوں کی نظروں پر ایسا تصور ہوا کہ چاند انہیں دو ٹکڑوں میں نظر آیا۔ نیز یہ کہ اس معجزہ کی غرض و غایت کیا تھی؟

سو اس کے متعلق جاننا چاہیے کہ گو خدا کی قدرت کے آگے کوئی بات بھی انہونی نہیں اور جو شخص یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ سارا عالم خدا کے دستِ قدرت سے عالم وجود میں آیا ہے وہ اس بات کے ماننے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں کر سکتا کہ اگر خدا چاہے تو اپنے ایک اشارہ سے اس کے سارے تار و پود کو طیاسٹ کر کے رکھ دے مگر جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے ثابت شدہ بات یہی ہے کہ چاند حقیقتاً دو ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ خدائی تصرف کے ماتحت صرف دیکھنے والوں کو دو ٹکڑوں میں نظر آیا تھا اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کیونکہ جبکہ ایک مشفق انسان اپنی قوتِ ارادی یعنی ہینوٹزم کے زور سے دوسروں کو ایک مرنی چیز اپنی غیر اصلی صورت میں دکھا سکتا ہے تو خدا کی قدرت اور اس کے رسول کی روحانی طاقت کے آگے تو یہ بات

کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی کہ اس وقت دیکھنے والوں کی آنکھوں پر ایسا تصرف ہوا ہو کہ انہیں چاند دو ٹکڑوں میں پھٹا نظر آیا ہو۔ بہر حال ہمارے نزدیک اصل حقیقت یہی ہے کہ چاند حقیقتہً دو ٹکڑے نہیں ہوا تھا بلکہ صرف دیکھنے والوں کو دو ٹکڑوں میں نظر آیا تھا۔ اور اگر غور کیا جائے تو حدیث کے الفاظ بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ایک تصرفِ الہی تھا جو دیکھنے والوں کی نظروں پر کیا گیا اور اکثر محققین نے اسی تشریح کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض اس معجزہ کو اس کی ظاہری صورت میں بھی قبول کیا جائے تو پھر بھی ہرگز جائے اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں لامحدود ہیں جن کی معمولی وسعت تک بھی انسان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ ابھی ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے کہ جنوبی امریکہ کے ملک لاپلاٹا میں ایک ستارہ دو ٹکڑے ہوتا دیکھا گیا۔ اس ستارے کا نام نورا پیکٹورس (NOVA PICTORIS) تھا جنوبی امریکہ کی سب سے بڑی رصد گاہ واقعہ جونس برگ نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ اور سائنسدان کہتے ہیں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس سے پہلے بھی کوئی آسمانی ستارہ دو ٹکڑے ہو گیا ہو۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خدائی تصرف کے ماتحت چاند میں سے کوئی ٹکڑا الگ ہو گیا ہو یا چاند دو ٹکڑے ہو کر پھریل گیا ہو اور کوئی سائنسدان اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

اب رہا دوسرا سوال کہ اس معجزہ کی غرض و غایت کیا تھی۔ اور دراصل اس بحث میں یہی اصل اور اہم سوال ہے کیونکہ اسی سے اس معجزہ کی حقیقت اور شان ظاہر ہو سکتی ہے۔ سو اس کے متعلق جاننا چاہیئے کہ دراصل علم تبیینِ روایا میں چاند سے حکومت و بادشاہ مراد ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عادل و انصاف پسند ہوں یا کہ ظالم و جابر۔ اور اس تائید کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں؛ چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب خیبر کے یہودی رئیس یحییٰ بن اخطب کی لڑکی صفیہ نے یہ خواب دیکھا کہ چاند اس کی گود میں آگرا ہے تو اس کے باپ نے اس کی یہ تعبیر کی تھی کہ صفیہ کسی دن عربوں کے بادشاہ کے عقد میں آئے گی؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فتحِ خیبر کے بعد صفیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئی۔ اسی طرح جب حضرت عائشہ نے خواب دیکھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند آگرے ہیں تو واقعات نے اس خواب کی یہی تعبیر ثابت کی کہ اس سے اُن کے حجرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دفن ہونا مراد ہے۔ اس صورت میں گویا کفار مکہ کو چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کا معجزہ دکھانے میں یہ اشارہ تھا کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے اور اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ گویا جب کفار قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا تو خدا تعالیٰ نے ان کی نظروں میں چاند کو دو ٹکڑے کر کے زبانِ حال سے

بتا دیا کہ تم معجزہ مانگتے ہو اور یہاں تمہاری موت کی گھنٹی بج رہی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف نے اس معجزہ کے بیان کیا تھا جو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (یعنی تمہاری قیامت قریب آگئی ہے) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ گویا جب کفار نے معجزہ مانگا تو انہیں جواب میں شق القم کا معجزہ دکھا کر یہ بتایا گیا کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہو کر محمد رسول اللہ کی حکومت کا دور دورہ شروع ہونے والا ہے جو آپ کے مخالفین کو ہار دینے کی دلیل ہو گا۔ اور چونکہ کفار اپنی روایات کی بنا پر اس اشارے کو سمجھتے تھے وہ بے اختیار ہو کر بول اُٹھے کہ سِحْرٌ مُّثْتَبِتٌ یعنی اے محمد! اگر تمہاری موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ایسا ہو گیا تو پھر یہ ایک بڑا پکا جادو ہو گا۔ الغرض شق القم کے معجزہ میں اصل غرض و غایت یہی تھی کہ کفار کو بتایا جائے کہ اب تمہاری حکومت کا خاتمہ ہے۔ اسی تشریح کے ساتھ شق ایک عظیم الشان معجزہ قرار پاتا ہے، ورنہ محض ظاہر میں بنے تیجہ طور پر چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا کو علم ہیئت کی رُو سے ایک عجوبہ ہو مگر روحانی رنگ میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ اسی لیے گذشتہ علماء میں سے بھی امام غزالی اور شاولی اللہ صاحب محدث دہلوی جیسے محققین نے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ صرف ایک خدائی تصرف تھا جس کے ماتحت کفار کو چاند دو ٹکڑوں میں ہو کر نظر آیا، ورنہ حقیقت میں چاند دو ٹکڑے نہیں ہوا تھا بلکہ اور جب حقیقتہ چاند دو ٹکڑے نہیں ہوا بلکہ صرف دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دیا تو لامحالہ اس میں کوئی خاص حکمت ہوگی اور وہ حکمت وہی تھی جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔ شق القم کا معجزہ ہجرت قریباً پانچ سال قبل سنہ نبوی میں ہوا تھا۔

### حضرت خدیجہ اور ابوطالب کی وفات

جب آپ شعب ابی طالب سے بچے تو آپ کو پنے درپے دو نہایت شدید صدمے پہنچے یعنی حضرت خدیجہ اور ابوطالب یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ یہ دونوں عمر رسیدہ تھے اور وفات ہر سال کے لیے مقتدر ہے لیکن ان دونوں کا شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے زمانہ کے اس قدر قریب فوت ہونا اس بات کا قوی شبہ پیدا کرتا ہے کہ محصور ہونے کی غیر معمولی سختی کا ان کی وفات میں بہت کچھ دخل تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل سختی کے اثر کے نیچے اُن کی محنتیں بالکل شکستہ ہو گئی تھیں لیکن جب تک تو وہ محصور رہے ان کی طبیعتوں کو مقابلہ کے خیال نے سنبھالے رکھا مگر جو نہی کہ وہ باہر آئے۔ محاصرہ کی لمبی سختی نے اپنا اثر ظاہر کر دیا اور دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے موت کا شکار ہو گئے۔ ان پنے درپے صدموں کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال یعنی سنہ نبوی کا نام عام الحزن

یعنی غلوں کا سال رکھا۔ ابوطالب گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطور باپ کے تھے اور آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپ کو بھی ان سے بہت محبت تھی۔ جب ابوطالب مرض الموت میں تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ ان کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ جب ان کی وفات قریب تھی، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں ابوہل و غیرہ مشرکین بھی بیٹھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کی وفات قریب دیکھ کر فرمایا: چچا! آپ صرف کلمہ شہادت پڑھ دیں۔ میں قیامت کے دن خدا کے حضور آپ کے متعلق عرض کروں گا، یہ سن کر ابوہل و غیرہ گھبرائے اور ابوطالب سے کہنے لگے کہ کیا آپ اپنے والد عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے؟ اور مختلف صورتوں میں ابوطالب کو سمجھاتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوطالب کی زبان سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مڑا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو دروند ہو کر فرمایا: اچھا میں بھی اپنے رب آپ کے واسطے مغفرت چاہتا ہوں گا سوائے اس کے کہ میں اس سے روک دیا جاؤں، مگر ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ آپ اس سے روک دیئے گئے۔ اور شرک اور کفر پر مرنے والوں کے لیے یہ حکم نازل ہوا کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں بلکہ ان کا معاملہ خدا پر چھوڑنا چاہیے۔

ایک روایت یہ بھی آتی ہے جو بعید نہیں کہ درست ہو کہ ابوطالب نے مرتے ہوئے رؤسا قریش سے یہ الفاظ کہے کہ اے قریش کے گروہ! تم خدا کی خلق میں ایک برگزیدہ قوم ہو اور خدا نے تمہیں بڑی عزت دی ہے۔ میں تمہیں محمد کے متعلق نصیحت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ وہ تم میں ایک اعلیٰ اخلاق کا انسان ہے اور عربوں میں اپنے صدق اور سداد کی وجہ سے امتیاز رکھتا ہے اور پر صبح پوچھو تو وہ ہماری طرف وہ پیغام لایا ہے جس سے خواہ زبان انکار کرتی ہے، مگر دل اُسے مانتا ہے۔ میں نے عمر بھر محمد کا ساتھ دیا ہے اور ہر تکلیف کے موقع پر اس کی حفاظت کے لیے آگے بڑھا ہوں اور اگر مجھے اور مہلت ملی تو آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا۔ اور اے قریش! میری تمہیں بھی یہ نصیحت ہے کہ اسے دکھ دینے کے درپے نہ ہو بلکہ اس کی نصرت اور اعانت کرو کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اس کے بعد ابوطالب کی جلد ہی وفات ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات پر سخت صدمہ ہوا۔ اور چونکہ ابوطالب ہمیشہ قریش کے مقابل میں آپ کے حامی اور محافظ رہے تھے، اس لیے ان کی وفات سے آپ کی پوزیشن اور بھی زیادہ نازک ہو گئی۔ وفات کے وقت جو سترہ نبوی میں واقع ہوئی ابوطالب کی عمر اسی سال سے اوپر تھی۔ ابوطالب کو زندگی بھر شرک پر قائم رہے اور اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی مگر



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ انہیں اپنے باپ کی طرح سمجھا اور ان کی محبت و وفاداری اور خدمت و اطاعت اور عزت و احترام کا وہ اعلیٰ نمونہ دکھایا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ دوسری طرف ابوطالب نے بھی آپ کے ساتھ ہمیشہ نہایت درجہ مرتبہ اور وفادارانہ سلوک رکھا اور اپنے آپ کو ہر قسم کی تکلیف میں ڈالنا گوارا کیا مگر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کا یہ سلوک جہاں ان کی اپنی شرافت و وفاداری کا ثبوت ہے وہاں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مشرکانہ خیالات کے ماتحت غلطی خوردہ خیال کرتے ہوں، مگر جھوٹا اور دھوکا دینے والا ہرگز نہیں سمجھتے تھے۔ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق اور راست گفاری اور اخلاص کے دل سے قائل تھے، چنانچہ اس موقع پر یہ طور صاحب لکھتے ہیں :-

”ابوطالب نے باوجود اپنے بھتیجے کے مشن پر ایمان نہ لانے کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر جس رنگ میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کی اور جس طرح اپنی ذات اور اپنے خاندان کو اپنے بھتیجے کی خاطر قربانی کے لیے پیش کیا، اس سے ابوطالب کی ذاتی شرافت و نجابت پر ایک نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ابوطالب کی یہ قربانیاں اس بات کا بھی قطعی ثبوت ہیں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دعویٰ میں مخلص خیال کرتا تھا۔ یقیناً ابوطالب ایک خود غرض اور دھوکے باز انسان کے واسطے اس قدر قربانی کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا اور اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کو دیکھنے اور پڑتال کرنے کے لیے بھی غیر معمولی مواقع حاصل تھے۔“

ابوطالب کی وفات سے چند دن بعد حضرت خدیجہ نے بھی انتقال کیا۔ خدیجہ نے بڑی بڑی دکھ اور تکلیف کی گھڑیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا اور ان کو آپ سے اور آپ کو ان سے بہت محبت تھی، اس لیے طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ وفات کے بعد جب کبھی ان کا ذکر آتا تو آپ کی آنکھیں ڈبڈباتیں اور آپ اکثر ان کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ خدیجہ اپنے زمانہ کی بہترین عورتوں میں سے تھی۔ اور حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آپ حضرت خدیجہ کا اس کثرت سے ذکر خیر کیا کرتے تھے کہ مجھے ان پر غیرت آنے لگتی تھی اور میں کہتی تھی کہ آپ تو اس طرح خدیجہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ گویا دنیا میں بس وہی ایک عورت پیدا ہوئی ہے۔ آپ فرماتے تھے۔ عائشہ! اس میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور خدا نے مجھے اولاد بھی اسی سے دی، غرض آپ ہمیشہ

نہایت محبت کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا ذکر فرماتے تھے۔ اگر گھر میں کبھی کوئی جانور وغیرہ ذبح ہوتا تو آپؐ حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو ضرور حصہ بھیجتے۔ ایک دفعہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہاجرہ بنت خویلد آپؐ سے ملنے کے لیے آئیں اور دروازہ پر آکر اجازت چاہی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ بیتاب ہو کر اٹھے کہ خدیجہؓ کی سی آواز ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن ہاجرہ آئی ہے۔ جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے، قید ہو کر آئے تو ان کی زوجہ یعنی آپؐ کی صاحبزادی زینبؓ نے جو ابھی تک مکہ ہی میں تھیں۔ ان کے قیدیہ کے طور پر اپنے گلے کا مارا مار کر بھیجا۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے زینبؓ کو جہیز میں دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسؓ کو دیکھا تو مرحومہ خدیجہؓ یاد آگئی اور آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ صحابہ سے فرمایا اگر چاہو تو خدیجہؓ کی یہ یادگار اس کی بیٹی کو واپس کر دو۔ انہیں اشارہ کی دیر بھی فوراً واپس کر دیا۔ وفات کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ متحکم کے مقام حجون میں دفن کی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے مگر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ کیونکہ ابھی تک جنازہ کی نماز مقرر نہ ہوتی تھی۔

**آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکالیف میں اضافہ** حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کے بعد قریش مکہ آپؐ کی ذات کے متعلق بہت دیر ہو گئے

اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکالیف پہنچانی شروع کیں۔ ایک دفعہ آپؐ ایک راستہ پر چلے جاتے تھے کہ ایک شیر نے برسرِ عام آپؐ کے سر پر خاک ڈال دی۔ ایسی حالت میں آپؐ گھر تشریف لائے۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی نے یہ دیکھا تو جلدی سے پانی لے کر آئیں اور آپؐ کا سر دھویا۔ اور زار زار رونے لگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا: بیٹی رو نہیں۔ اللہ تیرے باپ کی خود حفاظت کرے گا اور یہ سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ پھر ایک دفعہ آپؐ صحن کعبہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے سربسجود تھے اور چند رؤساء قریش بھی وہاں مجلس لگائے بیٹھے تھے کہ ابو جہل نے کہا: اس وقت کوئی شخص بہت کرے تو کسی اڈٹنی کا بچہ دان لاکر محمدؐ کے اوپر ڈال دے۔ چنانچہ عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور ایک ذبح شدہ اڈٹنی کا بچہ دان لاکر جو خون اور گندی آلائش سے بھرا ہوا تھا آپؐ کی پشت پر ڈال دیا اور پھر سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ فاطمہ الزہراءؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ دوڑی آئیں اور اپنے باپ کے کندھوں سے یہ بوجھ اتارا۔ تب جا کر آپؐ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ روایت آتی ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رؤساء قریش کے نام لے کر جو اس طرح اسلام کو ذلیل کرنے اور مٹانے کے درپے تھے

۱۔ بخاری باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہؓ ۲۔ ابن ہشام وطبری ۳۔ زرقاتی ۴۔

۵۔ ابن ہشام وابن سعد ۶۔ طبری ۷۔

بدو عالمی اور خدا سے فیصلہ چاہا۔ راوی کہتا ہے کہ پھر میں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ بدر کے دن مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو کر راوی بدر کی ہوا کو متعفن کر رہے تھے۔

**حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کی شادی** نکاح کرنا اسلام میں ضروری قرار دیا گیا ہے اور سوائے معذوری کی صورت کے تہجد سے روکا گیا

ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

النِّكَاحُ مِنْ شُنَّتِي فَمَنْ لَمْ يَتِمَّلْ بِشُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔

”یعنی شادی کرنا میری سنت میں داخل ہے اور جو میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں۔“

اور خصوصاً ایک نبی اور شارع نبی کے واسطے تو شادی کرنا از بس ضروری ہے نہ صرف اس لیے کہ اس ذریعہ سے وہ جن معاشرت کا نمونہ اپنی امت کے واسطے قائم کر سکے بلکہ اس لیے بھی کہ تبلیغ احکام کے کام میں اس کی بیوی اس کی مددگار ہو۔ کیونکہ عورتوں کے متعلق جو مسائل ہوتے ہیں ان کی تبلیغ و تعلیم جس خوبی کے ساتھ ایک عورت کر سکتی ہے مرد نہیں کر سکتا بلکہ درحقیقت انبیاء کے واسطے تو مناسب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہو تو وہ حتی الوسع ایک سے زیادہ بیویاں کریں تا ان کے لیے تبلیغ و تعلیم کا کام اور بھی زیادہ آسان ہو جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر گذشتہ انبیاء علیہم السلام تعدد وازدواج کے مسئلہ پر کاربند تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں سے بھی کثرت ایسے ہی نبیوں کی تھی جن کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ اور تعجب ہے کہ عیسائی لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اس مسئلہ کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں مگر اپنے ان بزرگوں کی طرف نہیں دیکھتے جن کو وہ خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول یقین کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسری قوموں کے بھی اکثر نبی تعدد وازدواج پر عامل تھے۔ غرضیکہ شادی کرنا بلکہ حتی الوسع ایک سے زیادہ شادیاں کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ لہذا حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جلد ہی دوسری شادی کا خیال آنا آپ کے منصب نبوت کے لحاظ سے ایک طبعی امر تھا، مگر ایسے حالات میں ایک نبی کے واسطے بیوی کا انتخاب بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ کئی باتوں کو دیکھنا اور کئی امور کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کیں کہ وہ اس معاملہ میں آپ کا ہادی اور رہنما ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو سنا اور آپ کو ایک رویا کے ذریعہ اپنے انتخاب کے اطلاع دی، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ انہی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا کہ جبرائیل علیہ السلام آپ کی

لے بخاری حالات غزوہ بدر : ۱۷ ابن ماجہ : ۱۷۷۰ مثلاً دیکھو حالات حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام : ۱۷۷۰ مثلاً دیکھو حالات حضرت کرشن اور راجندر جی وغیرہ :

خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور آپ کے سامنے ایک سبز رنگ کا ریشمی رومال پیش کر کے عرض کیا کہ یہ آپ کی بیوی ہے دنیا اور آخرت میں۔ آپ نے رومال یکو دیکھا تو اس پر حضرت عائشہ بنت ابوبکرؓ کی تصویر تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد خولہ بنت حکیم زوجہ عثمان بن مظعون آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" آپ نے فرمایا "کس سے کروں؟" اس نے عرض کیا کہ "آپ چاہیں تو کنواری لڑکی بھی موجود ہے اور بیوہ عورت بھی" آپ نے فرمایا "کون؟" خولہ نے عرض کیا "کنواری تو آپ کے عزیز دوست ابوبکر صدیقؓ کی لڑکی عائشہ ہے اور بیوہ سودہ بنت زمعہ ہے جو آپ کے خادم سکران بن عمرو مرحوم کی بیوہ ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اچھا تو پھر تم ان دونوں کے متعلق بات کرو اچنانچہ خولہ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور ان کی اہلیہ اُم رومان سے ذکر کیا۔ وہ پہلے بہت حیران ہوئے۔ اور کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے بھائی ہیں یہ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہلا بھیجا کہ دین کی اخوت سے رشتہ پراثر نہیں پڑتا تو پھر انہیں کیا غدر ہو سکتا تھا بلکہ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی رسول خدا کی بیوی بنے اس کے بعد خولہؓ حضرت سودہ بنت زمعہ کے پاس گئیں۔ وہ اور ان کے عزیز بھی راضی تھے۔ لہذا سوال سنہ نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان ہر دو کے ساتھ چار چار سو درہم مہر پر نکاح پڑھا گیا اور حضرت سودہ کا تو نکاح کے ساتھ ہی رخصتانہ بھی ہو گیا۔ لیکن چونکہ عائشہؓ کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی اس لیے ان کا رخصتانہ ہجرت کے بعد تک ملتوی رہا۔

اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ جو جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں خدیجہ الکبریٰؓ کی وفات سے خالی ہوئی تھی وہ دراصل حضرت عائشہؓ سے ہی پُر ہوئی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تجویز حضرت عائشہؓ ہی کے متعلق تھی اور وہی آپ کو خواب میں بھی دکھائی گئی تھیں۔ لیکن حضرت سودہؓ کا نکاح ایک خاص مصلحت اور خاص ضرورت کے ماتحت تھا اور وہ یہ کہ چونکہ یہ زمانہ مسلمانوں کے واسطے ایک سخت تکلیف اور مصیبت کا زمانہ تھا اور ظالم قریش کی طرف سے سب مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں پر جو روجھا کے تبرچل رہے تھے اور خصوصاً بے یار و مددگار غریبہ کے لیے تو یہ انتہائی مصائب کے دن تھے اس لیے ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ صدمہ خوردہ اور غم رسیدہ بیوہ بغیر کسی انتظام کے چھوڑ دی جاوے اور اسلام کی وجہ سے مصیبت کے دن کاٹے اس لیے اور نیز اس لیے بھی کہ آپ

۱۔ بخاری واسد الغابہ

۲۔ اس وقت تک صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنا اخوت کا رشتہ سمجھتے تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رشتہ اخوت کا نہیں بلکہ انیت اور ابوت کا ہے لیکن یہ کہ اس روحانی رشتہ کا اثر جسمانی رشتوں پر نہیں ہے۔ ۳۔ زرقانی واسد الغابہ



نے مسلمانوں کو آپس میں محبت رکھنے اور ایک دوسرے کی ہمدردی اور مدد کرنے کا عمل سبق بھی دینا تھا جب آپ کے سامنے سوڈہ کا ذکر آگیا تو آپ نے بلا تامل یہی فیصلہ کیا کہ آپ انہیں خود اپنے سایہ عاطفت میں لے لیں اور یہ آپ کی طرف سے ایک قربانی تھی جو حالات پیش آمدہ کے ماتحت کی گئی۔ کیونکہ اول تو سوڈہ ایک بیوہ تھیں۔ دوسرے وہ اچھی عمر رسیدہ تھیں۔ چوتھی کہ شادی سے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ مباشرت کے بالکل ناقابل ہو گئیں۔ تیسرے اُن میں آپ کی زوجیت کے واسطے کوئی امتیازی قابلیت بھی نہ تھی اور نہ کوئی خاص وجہ کشش تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کا آپ کے حرم میں آنا یہ معنی رکھتا تھا کہ آپ اپنی اس بیوی پر ایک سوت لا رہے ہیں جو خدائی انتخاب کے ماتحت آپ کی زوجہ بنی تھی اور اس وجہ سے آپ کو بہت محبوب تھی۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اپنی محبوب بیوی پر کوئی شخص یونہی بلا خاص وجہ کے سوت نہیں لایا کرتا۔ پس حضرت عائشہؓ کے ہوتے ہوئے آپ کا حضرت سوڈہ جیسی عمر رسیدہ خاتون کے ساتھ نکاح کرنا صاف بتا رہا ہے کہ نعوذ باللہ یہ کوئی عیش و عشرت کا سامان نہ تھا جو آپ اپنے گھر لائے تھے بلکہ یہ ایک قربانی تھی جو آپ کو حالات پیش آمدہ کے ماتحت کرنی پڑی تھی۔

پس آپ کی اصل اور مستقل تجویز حضرت عائشہؓ ہی کے لیے تھی جن کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا تھا اور وہی دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مناسب بھی تھیں۔ کیونکہ :-

اول :- وہ بالکل نوعمر لڑکی تھیں اور اس لیے پوری طرح اس قابل تھیں کہ اسلامی تعلیمات کو جلد، آسانی اور بخوبی سیکھ کر ایک دینی معلم بن سکیں جو ایک شارع نبی کی بیوی کے واسطے ضروری ہے۔

دوسرے :- وہ نہایت درجہ ذہین اور ذکی تھیں جس کی وجہ سے دینی مسائل کے سیکھنے اور تفقہ فی الدین کے لیے نہایت مناسب تھیں۔

تیسرے :- بوجہ کم عمر ہونے کے ان کے متعلق بظاہر توقع تھی جو پوری بھی ہوئی کہ وہ ابھی بہت لمبی عمر پائیں گی اور اس طرح انہیں مسلمان عورتوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ کا زیادہ موقع مل سکے گا۔ چوتھے :- اسلام ہی میں اُن کی پیدائش ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسلامی تعلیم گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی اور بچپن سے ہی اُنہوں نے اسلامی عادات و اطوار اچھی طرح سیکھ لیے تھے اور تعلیم اسلامی کا ایک بہت عمدہ نمونہ تھیں۔

پانچویں :- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اقل المؤمنین اور افضل المسلمین کی صاحبزادی تھیں جس کی وجہ سے ان کی تربیت نہایت اعلیٰ اور کامل اور شعائر اسلامی کے عین مطابق ہوئی تھی اور اس لیے وہ عورتوں میں نمونہ بننے کے خاص طور پر قابل تھیں۔

ان وجوہات سے حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بننے کے واسطے سب سے بڑھ کر مناسب تھیں اور انہی وجوہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے واسطے ان کو پسند فرمایا؛ چنانچہ یہ باتیں



اپنا پھل لائیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے وجود سے امت محمدیہ کو بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں۔ احادیث کا وہ حصہ جو عورتوں کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے زیادہ تر حضرت عائشہؓ ہی کے اقوال و روایات پر مبنی ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ عام دینی مسائل میں بھی ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:-

كَانَ الْأَكْبَرُ مِنَ مَعَاصِيَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزِيحُ جُحُونَ إِلَى قَوْلِهَا وَيَسْتَفْتُونَهَا بِهِ

”یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے صحابہ بھی حضرت عائشہؓ کے قول کی طرف رجوع کرتے اور ان سے فتویٰ پوچھتے تھے۔“

غرض اصل اور مستقل تجویز آپ کی حضرت عائشہؓ سے تھی اور وہی اس منصبِ عالی کے لائق تھیں۔ باقی رہی حضرت سوڈہ بنت زمعہ کی شادی۔ سوچیں کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ ایک قربانی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ کیونکہ یہ شادی ایک خاص مرتبہ اصول کے ماتحت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دلی محبت اور قلبی توجہ اور حقیقی مہربانی کا ایک بین ثبوت ہے جو آپ ان مصائب کے زمانہ میں اپنے خدام اور ان کے پسماندگان کے مال پر فرماتے تھے اور یہ بات حضرت سوڈہ کی ہی شادی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جیسا کہ آگے چل کر اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہو جائے گا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کے نکاح کے سوا جو کہ خود بالذات مقصود تھا باقی جتنے بھی نکاح آپ نے کیے وہ سب خاص حالات۔ خاص ضروریات اور خاص مصالح کے ماتحت کئے گئے۔ چنانچہ آپ کا خواب بھی یہی ظاہر کرتا ہے جس میں آپ کو صرف حضرت عائشہؓ کی تصویر دکھائی گئی تھی اور یہ الفاظ کہے گئے تھے کہ ”اب تیری یہ بیوی ہے دنیا اور آخرت میں“ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے خاص محبت تھی چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا:- ”أَتَى النَّاسَ أَحَبُّ إِلَيْكَ“ یعنی ”یا رسول اللہ! لوگوں میں سے آپ کو کس سے زیادہ محبت ہے؟“ آپ نے فرمایا ”عائشہؓ سے“ اس نے پوچھا ”یا رسول اللہ! مردوں میں سے کس سے زیادہ ہے؟“ فرمایا ”أَبُو هَارٍ“ عائشہؓ کے باپ سے۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت سوڈہ کا نکاح شوال سنہ نبوی میں ہوا تھا۔ اور عام روایات کے مطابق حضرت سوڈہ کے نکاح کی رسم حضرت عائشہؓ کے نکاح سے چند روز پہلے وقوع میں آئی تھی۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔

تعدد از دواج پر ایک مختصر نوٹ  
حضرت عائشہؓ اور حضرت سوڈہ کی شادی کے ذکر میں ہمارے غیر مسلم ناظرین کے دل میں تعدد از دواج کا مسئلہ ضرور

کھٹکا ہو گا اس مسئلہ کے متعلق مفصل بحث تو انشا اللہ کتاب کے حصہ دوم میں آنے گی، مگر اس جگہ بھی ایک مختصر سائوٹ لکھنا خالی از فائدہ نہ ہو گا۔ سو جاننا چاہیے کہ اسلام کے کئی ایسے مسائل ہیں جن کے متعلق مخالفین نے یکطرفہ خیالات کے ماتحت اعتراض کر دیئے ہیں اور کبھی ٹھنڈے دل سے اُن پر غور نہیں کیا اور نہ تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں ان کی حقیقت کو پرکھا ہے۔ انہی میں سے ایک تعدد ازدواج کا مسئلہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ سو اس بارہ میں پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ فطرت بے شک ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اس کی ہدایت کے واسطے ودیعت کیا ہے لیکن یہ نور بعض اوقات مخالف عناصر کے نیچے دب کر کمزور یا مٹ رہا ہو جاتا ہے۔ اور ایسے حالات میں اس کا فتویٰ قابل قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو پھر تعصبات سے پاک نہ کیا جاوے؛ چنانچہ دیکھ لو مسئلہ طلاق کے متعلق عیسائی فطرت صدیوں سے مخالف عناصر کے نیچے دب کر کمزور ہو گئی تھی اس لیے اس کا آج تک یہی فتویٰ چلا آیا ہے کہ عورت کی طرف زنا سرزد ہونے کے سوا اسے طلاق دینا ہرگز جائز نہیں ہے؛ چنانچہ اسی کے مطابق مسیحیوں نے اپنے قوانین بھی وضع کر لئے لیکن اب مشاہدہ اور تجربہ کے دھکے کھا کر ان کی سوئی ہوئی فطرت کچھ بیدار ہوتی ہے اور وہ اس طرف آہے ہیں کہ زنا ہی نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی ایسے حالات ہو سکتے ہیں جن کے ماتحت میاں بیوی کا جن معاشرت کے ساتھ اکٹھا رہنا محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب عیسائی ممالک میں اسلامی تعلیم کے مطابق طلاق کے متعلق قانون پاس ہو رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کان کو بھلی معلوم ہوتی ہیں اور دل اُن کی طرف پسندیدگی کا میلان محسوس کرتا ہے مگر دراصل یہ ایک دھوکا ہوتا ہے۔ کیونکہ عملی زندگی میں اگر ان کی حقیقت کا راز کھل جاتا ہے انہی میں سے مسئلہ طلاق ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور انہی میں سے تعدد ازدواج کا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ مختصر نوٹ سپرد قلم کیا جا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک بڑی اچھی تعلیم ہے کہ انسان ہر حالت میں ایک بیوی رکھے اور کبھی حالت میں بھی اسے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا اختیار نہ ہونا چاہیے لیکن اگر ہم غور سے کام لیں اور بنی نوع انسان کی مختلف ضروریات پر نظر ڈالیں تو ماننا پڑتا ہے کہ بعض اوقات انسان پر ضرور ایسے حالات آتے ہیں کہ جب نہ صرف خود اس کی بلکہ سوسائٹی کی فلاح و بہبودی اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ مثلاً (۱) کوئی ایسا شخص ہے جس کی ایک بیوی موجود ہے مگر بیوی کے کسی نقص کی وجہ سے اُس سے اولاد نہیں ہوتی یا (۲) ہوتی تو ہے مگر ماں کے کسی نقص کی وجہ سے مَر رہا ہو یا (۳) کوئی ایسا شخص ہے جس کی بیوی ایسے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ خاندان کی خاص ہمدردی اور توجہ کی تو ضرور حقدار ہے مگر وہ صحیح اہلی معاشرت کے قابل نہیں رہی یا (۴) کوئی شخص بوجہ اپنے مخصوص حالات کے ایک بیوی کے ساتھ اپنے تقویٰ اور اخلاق کو قائم نہیں رکھ سکتا یا (۵) کسی شخص کی دوسری شادی کے ساتھ کوئی اہم ملکی یا قومی مفاد وابستہ ہیں یا (۶) کسی زمانہ میں

کسی ملک اور قوم کی حالت اس بات کی متقنی ہے کہ نسل کی ترقی یا قومی اخلاق کی حفاظت کے واسطے لوگ عام طور پر ایک سے زیادہ شادیاں کریں یا (۷) دوسری شادی کے واسطے کوئی اور ایسی وجہ ہیں جن کو عقل جائز قرار دیتی ہے تو ایسے حالات میں ہر اک صحیح الدماغ شخص کا ضمیر بشرطیکہ وہ تعصبات کے نیچے ڈب کر نہ گیا ہو تعدد ازدواج کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دے گا۔ اور اس قسم کے حالات میں مرد اور عورت دونوں سے توقع رکھی جائے گی کہ وہ زیادہ اہم اغراض کے حصول کے لیے اپنے جذبات کی قربانی کرنے کے واسطے تیار ہو جائیں۔

اسلام ایک عملی مذہب ہے اور بنی نوع انسان کی تمام جائز ضروریات کو پورا کرنے والا ہے اور شکر کا مقام ہے کہ صدیوں کی ٹھوکروں کے بعد اب عیسائی دنیا بھی آہستہ آہستہ اسلامی تعلیم کی طرف آرہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ دنیا جان لے گی کہ جو پاک اور کامل تعلیم تعصبات مذہبی و سیاسی کے سبب صدیوں سے اعتراضات کا تختہ مشق بنی رہی ہے وہی اس قابل ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام جائز ضروریات کو پورا کر کے دنیا میں حقیقی امن کی بنیاد قائم کر سکے۔

افسوس معترضین نے بغیر سوچے سمجھے اسلامی مسئلہ تعدد ازدواج کے متعلق یہ خیال کر لیا ہے کہ غرضاً یہ ایک عیش و عشرت کا راستہ ہے جو اسلام اپنے متبعین کے واسطے کھولتا ہے؛ حالانکہ اگر ان قیود کو جن کے ساتھ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے نظر غور سے دیکھا جاوے تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے واسطے دوسری شادی ہرگز عیش و عشرت کا سامان نہیں ہو سکتی بلکہ سچ پوچھو تو یہ ایک قربانی ہے جو اسے خاص حالات اور خاص ضروریات کے ماتحت کرنی پڑتی ہے اور اگر کوئی مسلمان ان قیود کو توڑ کر عیش و عشرت کی غرض سے ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے تو یہ اس کا ایک ذاتی فعل ہو گا جو کسی صورت میں بھی اسلامی شعار نہیں کہلا سکتا۔ وہ ایک ایسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ بعض دوسرے مذاہب کے اکاذیب لوگ جن کا مذہب کسی صورت میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت نہیں دیتا۔ گھر میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر منہ کالا کرتے پھرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام میں تعدد ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا۔ یعنی یہ لازمی نہیں قرار دیا گیا کہ ہر مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ بلکہ صرف یہ ایک استثناء ہے جو خاص حالات کے پیش آ جانے کی صورت میں جائز رکھی گئی ہے اور مثلاً بیشتر مسلمان ایک ہی شادی پر اکتفا کرتے ہیں۔

# توسیع اشاعت

## قبائل کا دورہ

حج کے ایام میں ہر دور دراز کے علاقہ سے مکہ میں لوگ جمع ہوتے تھے اور اشہر حرم میں عکاظ۔ مجنہ اور ذوالجہانیز بڑی بڑی قند میں لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتداء سے ہی یہ طریق تھا کہ ان موقعوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور مختلف قبائل عرب کی فردگاہوں پر جا جا کر انہیں اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ لیکن طبعاً اب تک آپ کی زیادہ توجہ قریش مکہ کی طرف تھی لیکن جن ایام میں قریش مکہ نے مسلمانوں کو شیعہ ابی طالب میں محصور کر کے ان کے ساتھ تعلقاً قطع کر دیئے اور ان کے ساتھ سیل ملاپ بند ہو گیا تو ان دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر قبائل عرب کی طرف زیادہ توجہ شروع کی؛ چنانچہ محصور ہونے کے زمانہ میں آپ اشہر حرم میں جبکہ سب طرف امن ہوتا تھا حج میں آنے والے قبائل کا خاص طور پر دورہ کیا کرتے تھے اور عکاظ وغیرہ کے اجتماعات میں بھی باقاعدہ جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ لیکن قریش مکہ نے اس تبلیغ میں بھی روک تھام شروع کر دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قبائل کا مسلمان ہو جانا ان کے لیے قریباً قریباً ویسا ہی خطرناک ہے جیسا کہ خود مکہ والوں کا اسلام لے آنا؛ چنانچہ یہ قریش ہی کی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ باوجود اس کے کہ آپ نے کئی دفعہ قبائل کا دورہ کیا اور ہر کیپ میں جا جا کر اسلام کی دعوت دی لیکن کہیں بھی کامیابی کی امید نہ بندھی۔

## طائف کا سفر

جب محاصرہ اٹھ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حرکات و سکنات میں ایک گونہ آزادی نصیب ہوئی تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ طائف میں جا کر وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ طائف ایک مشہور مقام ہے جو مکہ سے جنوب مشرق کی طرف چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس زمانہ میں قبیلہ بنو ثقیف سے آباد تھا۔ کعبہ کی خصوصیت کو الگ رکھ کر طائف گویا مکہ کا ہم پلہ تھا اور اس میں بڑے بڑے صاحب اثر اور دولت مند لوگ آباد تھے۔ اور طائف کی اس اہمیت کا غامد مکہ والوں کو بھی اقرار تھا چنانچہ یہ مکہ والوں کا ہی قول ہے کہ:

لَوْلَا نَزَلْ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِيِّينَ عَظِيمٍ

”یعنی اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا“

غرض سوال سنہ نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف اکیلے تشریف لے گئے یہ یا بعض روایتوں کی رُو سے زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے تیج وہاں پہنچ کر آپ نے دس دن قیام کیا اور شہر کے بہت سے رؤساء سے یکے بعد دیگرے ملاقات کی، مگر اس شہر کی قسمت میں بھی مکہ کی طرح اس وقت اسلام لانا مقدر نہ تھا۔ چنانچہ سب نے انکار کیا بلکہ ہنسی اڑائی۔ آخر آپ نے طائف کے رئیس عظیم عبدیاسیلؓ کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی مگر اس نے بھی صاف انکار کیا بلکہ تمسخر کے رنگ میں کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو مجھے آپ کے ساتھ گفتگو کی مجال نہیں اور اگر جھوٹے ہیں تو گفتگو لا حاصل ہے اور پھر اس خیال سے کہ کہیں آپ کی باتوں کا شہر کے نوجوانوں پر اثر نہ ہو جائے، آپ سے کہنے لگا۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ یہاں کوئی شخص آپ کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے بعد اس بد بخت نے شہر کے ادارہ آدمی آپ کے پیچھے لگا دیتے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے تو یہ لوگ شور کرتے ہوئے آپ کے پیچھے ہوئے اور آپ پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے آپ کا سارا بدن خون سے تر ہوتا گیا۔ برابر تین میل تک یہ لوگ آپ کے ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور پتھر برساتے چلے آئے۔

طائف سے تین میل کے فاصلہ پر مکہ کے رئیس عقبہ بن ربیعہ کا ایک باغ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں آکر پناہ لی اور ظالم لوگ تھک کر واپس لوٹ گئے۔ یہاں ایک سایہ میں کھڑے ہو کر آپ نے اللہ کے حضور یوں دعا کی :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْکُوْ مُنْعَفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَ هُوَ اَفْزَعُ عَلَی النَّاسِ  
اَللّٰهُمَّ نَا اَرْحَمَ الرَّحِیْمِیْنَ اَسْتَ رَبُّ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ وَ اَسْتَ رَبِّیْ وَ اَلْخ  
یعنی ”اے میرے رب میں اپنے ضعفِ قوت اور قلتِ تدبیر اور لوگوں کے  
مقابلہ میں اپنی بے بسی کی شکایت تیرے ہی پاس کرتا ہوں۔ اے میرے  
خدا تو سب بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور کمزوروں اور بیکسوں کا تو ہی نگہبان  
و محافظ ہے اور تو ہی میرا پروردگار ہے..... میں تیرے ہی منہ کی روشنی  
میں پناہ کا خواستگار ہوتا ہوں کیونکہ تو ہی ہے جو ظلمتوں کو دور کرتا اور  
انسان کو دنیا و آخرت کے حسنات کا وارث بناتا ہے“

عقبہ و شیبہ اس وقت اپنے اس باغ میں موجود تھے جب انھوں نے آپ کو اس حالت

۱۔ ابن سعد ۲۔ ابن ہشام و طبری ۳۔ ابن سعد ۴۔

۵۔ حدیث میں ابن عبدیاسیل کا نام آتا ہے۔ دیکھو بخاری کتاب بدر الخلق و ذکر الملائکہ ۶۔



میں دیکھا تو دُور و نزدیک کی رشتہ داری یا قومی احساس یا نہ معلوم کس خیال سے اپنے عیسائی غلام عداس نامی کے ہاتھ ایک کشتی میں کچھ انگور لگا کر آپ کے پاس بھجوائے۔ آپ نے لے لے لیے اور عداس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور کس مذہب کے پابند؟ اس نے کہا: میں مینوا کا ہوں اور مذہب عیسائی ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا وہی مینوا جو خدا کے صالح بندے یونس بن مثنیٰ کا مسکن تھا؟ عداس نے کہا: ہاں۔ مگر آپ کو یونس کا حال کیسے معلوم ہوا؟ آپ نے فرمایا: وہ میرا بھائی تھا۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کا نبی تھا اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ پھر آپ نے اُسے اسلام کی تبلیغ فرمائی جس کا اس پر بہت اثر ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر بخش اخلاص میں آپ کے ہاتھ ٹھوم لیے۔ اس نظارہ کو دُور سے کھڑے کھڑے عتبہ اور شیبہ نے بھی دیکھ لیا، چنانچہ جب عداس ان کے پاس واپس گیا۔ تو اُنہوں نے کہا عداس! یہ تجھے کیا ہوا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ چومنے لگا۔ یہ شخص تو تیرے دین کو خراب کر دے حالانکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔

تھوڑی دیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باغ میں آرام فرمایا اور پھر وہاں سے روانہ ہوئے اور محلہ میں پہنچے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں کچھ دن قیام کیا۔ اس کے سے روانہ ہو کر کوہ حرا پر آئے۔ اور چونکہ سفر طائف کی بظاہر ناکامی کی وجہ سے مکہ والوں کے زیادہ دلیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے یہاں سے آپ نے کسی شخص کی زبانی مطعم بن عدی کو کہلا بھیجا کہ میں مکہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں، کیا تم مجھے اس کام میں مدد دے سکتے ہو؟ مطعم پتکا کا فر تھا مگر طبیعت میں شرافت تھی اور ایسے حالات میں انکار کرنا شرفاء عرب کی فطرت کے خلاف تھا، اس لیے اُس نے اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو ساتھ لیا اور سب مسلح ہو کر کعبہ کے پاس کھڑے ہو گئے اور آپ کو کہلا بھیجا کہ آجائیں۔ آپ آئے اور کعبہ کا طواف کیا اور وہاں سے مطعم اور اس کی اولاد کے ساتھ تلواروں کے سایہ میں اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ راستہ میں ابو جہل نے مطعم کو اس حالت میں دیکھا تو حیران ہو کر کہنے لگا۔ ”اَمْجِئْزًا مَّرْتَابِعٌ“ یعنی کیا تم نے محمد کو صرف پناہ دی ہے یا اس کے تابع ہو گئے ہو؟ مطعم نے کہا: میں صرف پناہ دینے والا ہوں تابع نہیں ہوں۔ اس پر ابو جہل نے کہا: اچھا پھر کوئی حرج نہیں؟ مطعم کفر کی حالت میں ہی فوت ہوا مگر مسلمان ناقدر شناس نہیں تھے حضرت حسان بن ثابتؓ نے جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر تھے مطعم کے اس شریفانہ برتاؤ پر اسکی مدح میں درودار اشعار کہے جو ان کے دیوان میں اب تک محفوظ ہیں۔ طائف کا سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک خاص واقعہ ہے۔ اس سفر کے حالات سے آپ کی ارفع شان اور بلند ہمتی اور بے نظیر صبر و استقلال

کا پتہ چلتا ہے؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتا ہے :-

”فہمہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سفر طائف میں عظمت اور شجاعت کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ایک تنہا شخص جسے اُس کی قوم نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور تو ذکر دیدہ خدا کی راہ میں دلیری کے ساتھ اپنے شہر سے نکلتا ہے اور جس طرح یونس بن مثنیٰ نینوا کو گیا، اسی طرح وہ ایک بُت پرست شہر میں جا کر اُن کو توحید کی طرف بلاتا اور توبہ کا وعظ کرتا ہے۔ اس واقعہ سے یقیناً اس بات پر بہت روشنی پڑتی ہے کہ فہمہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے صدقِ دعویٰ پر کس درجہ ایمان تھا۔“

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ کو کبھی جنگ اُحد والے دن سے بھی زیادہ تکلیف پہنچی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: عائشہ تیری قوم کی طرف سے مجھے بڑی بڑی سخت گھڑیاں دیکھنی پڑی ہیں اور پھر آپؐ نے سفر طائف کے حالات سنائے اور فرمایا کہ اس سفر سے واپسی پر میرے پاس پہاڑوں کا فرش تہ آیا اور کہنے لگا کہ مجھے خدا نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تا اگر ارشاد ہو تو میں یہ پہلو کے دونوں پہاڑ ان لوگوں پر پیوست کر کے ان کا خاتمہ کر دوں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں میں سے وہ لوگ پیدا کر دے گا جو خدا کے واحد کی پرستش کریں گے۔“

طائف کے سفر کے متعلق یہ بھی روایت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کا وفد

آتی ہے کہ جب آپؐ اس سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے تو نخلہ میں رات کے وقت جبکہ آپؐ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھے جنات کا ایک گروہ جو ساٹھ نفوس پر مشتمل تھا اور شام کے ایک شہر نصیبین سے آیا تھا آپؐ کے پاس سے گذرا اور اُس نے آپؐ کی تلاوت کو سنا اور اس سے متاثر ہوا۔ اور جب یہ جن اپنی قوم کی طرف واپس گئے تو اُنہوں نے اپنی قوم سے آپؐ کی بعثت اور قرآن شریف کا ذکر کیا۔ قرآن شریف میں اس واقعہ کا دو جگہ ذکر آتا ہے۔ اور دونوں جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جنوں کے آنے کا خود براہ راست علم نہیں ہوا بلکہ ان کے چلے جانے کے بعد خدائی وحی کے ذریعہ اس بات کی اطلاع دی گئی کہ ایک جنوں کا گروہ آپؐ کی تلاوت کو سُن گیا ہے۔ حدیث میں بھی

بہ زیادہ صحیح طور پر یہ شہر شام اور عراق کے درمیان واقع ہے۔ منہ

متفرق جگہ اس واقعہ کا ذکر آتا ہے اور گویا یہی بیان سے حدیث کا بیان بعض تفصیلات میں مختلف ہے مگر آل ایک ہی ہے کہ جنات کے ایک وفد نے ایک سفر کی حالت میں آپ کی تلامذت قرآنِ کریم کو سنا اور پھر اس سے متاثر ہو کر اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ گیا۔ یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ ایک سے زیادہ دفعہ ہوا ہو جس کی وجہ سے روایات میں باہمی اختلاف ہو گیا ہے۔ لیکن اس جگہ ہمیں اس واقعہ کی ظاہری تفصیلات سے زیادہ سروکار نہیں ہے بلکہ مختصر طور پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس جگہ جنات سے کیا مراد ہے اور ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلنا اور پھر کلامِ مجید کی تلامذت سُن کر واپس لوٹ جانا کس غرض و غایت کے ماتحت تھا۔

سو جاننا چاہیے کہ جنوں کی ہستی کا عقیدہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کم و بیش دُنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے اور مذہبی اور غیر مذہبی ہر دو قسم کے لٹریچر میں اس کا وجود ملتا ہے مگر اس کی تفصیلات میں بہت اختلاف بعض قوموں کے لٹریچر میں جنات کے اندر ایک قسم کی خدائی طاقت تسلیم کی گئی ہے اور انہیں قابلِ پرستش مانا جاتا ہے۔ بعض میں ان کو بلا استثناء ایک ناپاک مخلوق قرار دیا گیا ہے اور گویا شیطان اور ابلیس کی طرح خیال کیا جاتا ہے مگر اسلام ان ہر دو قسم کے خیالات کو رد کرتا ہے اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ جن اللہ تعالیٰ کی ایک مخفی مخلوق ہے جس میں انسانوں کی طرح اچھے اور بُرے دونوں قسم کے افراد پائے جاتے ہیں لیکن اس مخلوق کا دائرہ انسانوں سے بالکل جدا ہے اور ایک علیحدہ عالم سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت تمثیلی رنگ میں جنوں کے وجود کا خاص خاص انسانوں کو نظارہ کرا دیا جاتا ہے۔ مگر ظاہر حالات میں یہ ہر دو مخلوق ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ قرآنِ شریف میں جنوں کا ذکر چھ بیس مختلف مقامات پر آتا ہے۔ ان سب مقامات میں جن کے لفظ سے ایک ہی معنی نرادر نہیں ہیں، کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے یہ لفظ عربی زبان میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن ان ۲۶ مقامات کے مجموعی مطالعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ جن خدا تعالیٰ کی ایک مخفی مخلوق ہے جو انسانوں کی طرح (گو اپنی تفصیلات میں یقیناً اس سے بہت مختلف) ترقی اور تنزل دونوں کا مادہ رکھتی ہے اور اپنے اعمال

۱۔ مثلاً بخیر صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجہر فی الصبح

۲۔ سورۃ سبا: ۱۳، ۱۵، ۲۲، ۵۴، سورۃ النعام: ۱۰۰، ۱۱۲، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۳۰

سورۃ رحمن: ۳۲، سورۃ اعراف: ۲۹، ۱۸۰، سورۃ کہف: ۵۱، سورۃ نمل: ۱۸، ۲۰

سورۃ قصص یعنی طہ سجدہ: ۲۶، ۲۹، سورۃ احقاف: ۱۹، ۳۹، سورۃ جن: ۶، ۱۱

سورۃ بنی اسرائیل: ۸۹، سورۃ ہود: ۱۲، سورۃ سجدہ: ۱۳، سورۃ الناس: ۴، ۵

میں اچھے اور بُرے رستے کے اختیار کرنے کے لیے اپنی حدود و مقررہ کے اندر اندر صاحب اختیار ہے مگر جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے حقیق کا لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ اس مخفی مخلوق کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ بعض جگہ یہ لفظ غیر اصطلاحی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

در اصل جن ایک عربی لفظ ہے جس کے روٹ میں پھینے یا چھپانے یا نظروں سے پوشیدہ ہونے یا پردہ میں رہنے یا اڑ میں آ جانے یا سایہ یا اندھیرا کرنے کے معنے ہیں۔ چنانچہ عربی میں جنت باغ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے درخت زمین پر سایہ کر کے اُسے چھپاتے ہیں۔ جنین اس بچہ کو کہتے ہیں جو ابھی رحم مادر میں ہے کیونکہ وہ رحم کے پردوں میں مخفی ہوتا ہے۔ مجتہ وصال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے ایک جنگجو سپاہی لڑائی کے وقت میں اڑ لیتا ہے۔ جنون ریوانگی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جنان دل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سینہ میں مخفی ہوتا ہے۔ اسی طرح جنانِ رات یا لباس کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اندھیرا کرنے یا ڈھانکنے کا ذریعہ ہیں۔ جن قبر یا کفن کو کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مڑے کو اپنے اندر چھپاتے ہیں۔ جان سانپ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عموماً زمین کے مخفی سوراخوں میں زندگی گزارتا ہے۔ جنتہ اور صنی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سرد اور چھاتی کو ڈھانکتی ہے وغیرہ ذاکسٹ۔ اس اصل کے ماتحت بعض اوقات عربی محاورہ میں جن کا لفظ ایسے اُمرار و دروڑ کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے جو بوجہ امارت اور قوت و منزلت اور لشکر کے عام لوگوں کی سوسائٹی میں میل جول نہیں رکھتے اور علیحدگی میں زندگی گزارتے ہیں، چنانچہ بسا اوقات قرآن شریف میں جن کا لفظ اُنس یعنی عاشق الناس کے مقابلہ میں اُمرار کے طبقہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور ان معنوں میں یہ لفظ عموماً بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ایسی قوموں پر بھی جن کا لفظ بول دیتے ہیں جو کسی ایسی علیحدہ اور منقطع جگہ میں آباد ہوں کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا زیادہ میل ملاپ ممکن نہ ہو اور انہی دو معنوں کے پیش نظر بعض محققین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنوں کے وفد کے حاضر ہونے سے یہ مراد لیا ہے کہ یہ لوگ یا تو خاص اُمرار کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے جنہوں نے بر ملا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پرہیز کیا اور علیحدگی میں آپ کا کلام سُنکر واپس چلے گئے اور یا وہ کسی دُور افتادہ قوم کے افراد ہوں گے جو اپنے ماحول کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے بالکل جدا اور علیحدہ رہتی ہوگی۔ ہمیں ان معنوں کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے اور اگر نخلہ میں جنوں کے وفد کے حاضر ہونے سے مراد اُمرار کے کسی وفد کا حاضر ہونا یا کسی دُور افتادہ منقطع قوم کے افراد کا پیش ہونا مراد ہے تو پھر اس میں خدا تعالیٰ کا یہ اشارہ ہو گا کہ اُسے رسولِ مکتہ اور طاقت میں بظاہر اپنی ناکامیوں کو دیکھ کر پریشان اور دلگیر نہ ہو کیونکہ اب وقت آتا ہے کہ عوام الناس تو کیا بُرے



بڑے امیر و کبیر لوگ تیرے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے اور دنیا کی دُور افتادہ قومیں تیری غلامی کا جُؤا اپنی گردنوں پر رکھیں گی۔

لیکن اگر جن سے وہ مخفی مخلوق مراد ہے جس کی تفصیلات کا ہم کو علم نہیں، لیکن اس کا وجود نصوص قرآنی کے ساتھ ثابت ہے تو اس میں بھی کسی عقلمند انسان کو شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کی خلق کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کسی مخلوق کی نظر اس کی انتہا کو نہیں پاسکتی۔ جہاں انسان کے سوا اس مَرئی دنیا میں ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں قسم کی دوسری مخلوق موجود ہے جن میں سے بعض قسم کی مخلوق مَرئی ہونے کے باوجود ہماری کوتاہ نظر سے پوشیدہ رہتی ہے اور اس مخلوق کے وجود پر علم طب اور سائنس کے دوسرے شعبے یقینی قطعی شاہد ہیں تو پھر اس بات کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق جن کی قسم کی بھی موجود ہوگی جو باوجود انسانی نظر سے پوشیدہ ہونے کے اسی طرح زندہ اور قائم ہوگی جس طرح انسان اپنے دائرہ کے اندر زندہ اور قائم ہے۔ بیشک اسلام ہمیں اس رنگ میں جنات کی تعلیم نہیں دیتا کہ ہم مومنہ بھوتوں وغیرہ کی صورت میں کسی ایسی مخلوق کے قائل ہوں جس کے افراد انسانی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہوئے انسان کے لیے ایک تماشہ بنتے پھریں اور انسان کے سامنے مختلف صورتیں بدل بدل کر اُس کی تفریح یا تنویر کا سامان بہم پہنچائیں۔ یہ خیالات جابلانہ توہم پر مبنی ہیں جن کا کوئی ثبوت اسلامی تاریخ یا حدیث یا قرآن کریم میں نہیں ملتا مگر یہ کہ جس طرح دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار دوسری مخلوق ہے جس میں بڑی چھوٹی کثیف لطیف مَرئی وغیر مَرئی ہر قسم کی چیزیں شامل ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق جن بھی ہے جو جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے۔ انسان کی نظروں سے مخفی ہے اور ایک جداگانہ عالم سے تعلق رکھتی ہے اور عام حالات میں انسان کے ساتھ اس کا کوئی سروکار نہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس پر کوئی عقلمند اعتراض نہیں کر سکتا۔

باقی رہا یہ سوال کہ ان معنوں کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کے وفد آنے سے کیا مراد ہے سو اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نظارہ ایک کشفی نظارہ سمجھا جائے گا اور اس سے مراد یہ ہوگی کہ اس انتہائی درجہ پریشانی اور بے بسی کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نظارہ دکھا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اے رسول گو ویسے ہر وقت ہی ہماری نصرت تیرے ساتھ ہے لیکن جس طرح گرمی کی شدت خاص طور پر بادل کو کھینچتی ہے اسی طرح اب وقت آگیا ہے کہ ہماری مخفی طاقتیں تیری رسالت کی تائید میں خصوصیت کے ساتھ مصروف کار ہو جائیں، چنانچہ اس کے بعد جلد ہی حالات نے پٹا کھایا اور ہجرت یثرب کا پردہ اُٹھتے ہی خدا کی مخفی تجلیات اسلام کے جھنڈے کو اٹھا کر کہیں کا کہیں لے گئیں۔ اور روایات میں جو سات کا لفظ آتا ہے سو اس سے مخفی طاقتوں کا کامل ظہور مراد ہے کیونکہ عربی میں سات کا عدد کمال کے اظہار کے لیے آتا ہے اور شام کے شہر نصیبین



میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فتوحات کی رد و عرب کے بعد شام کے ملک سے شروع ہوگی۔  
واللہ اعلم ۛ

### قبیلہ دوس میں اسلام

ابتدائی ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی کوششوں کے علاوہ اشاعت اسلام کا بڑا ذریعہ یہی تھا کہ کسی قبیلہ کا کوئی شخص اسلام لے آیا تو پھر اس کے ذریعہ سے اس قبیلہ میں آہستہ آہستہ اسلام پھیلنے لگا۔ یا مسلمان مکہ سے نکل کر کہیں گئے تو اپنے ساتھ اس نور کی شعاعوں کو بھی لیتے گئے۔ مثلاً قبیلہ بنو غفار میں ابو ذر غفاری کے واسطے سے اور حبشہ میں مہاجر بن حبشہ کے ذریعہ سے اور یمن کے قبیلہ اشعر میں ابو موسیٰ اشعری کے مسلمان ہونے سے اسلام داخل ہو چکا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ایک اور قبیلہ میں بھی اس کا اثر پہنچ گیا اور وہ یوں ہوا کہ طفیل بن عمرو قبیلہ دوس کا ایک معزز رئیس تھا اور شاعر بھی تھا۔ وہ کبھی تقریب پر مکہ آکھلا قریش نے اُسے دیکھا تو فکر پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور مسلمان ہو جاوے۔ اس لیے وہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم ہمارے شہر میں ایسی حالت میں آئے ہو کہ یہاں ایک شخص نے ہم میں سخت فتنہ اور تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ اس کی باتیں باپ کو بیٹے سے بھائی کو بھائی سے اور خاندان کو بیوی سے جدا کر دیتی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ تم اس کی ساحرانہ باتیں سُنو اور متاثر ہو جاؤ۔ لہذا ہم تمہیں بروقت ہوشیار کرتے ہیں کہ دیکھنا کہیں اس کی باتوں میں نہ آجانا۔ طفیل کہتے ہیں کہ مجھے قریش نے اس معاملہ میں اس طرح بار بار تاکید کی کہ میں ان کی بات کو سچا سمجھ کر بہت خائف ہو گیا حتیٰ کہ میں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے کان میں اچانک اس ساحر کی کوئی آواز پڑ جاوے اور میں کسی فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ میں ایک دن اسی حالت میں صبح کے وقت مسجد حرام میں گیا تو وہاں میں نے ایک کونہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ مجھے یہ نظارہ بھلا معلوم ہوا اور میں آہستہ آہستہ آپ کے قریب چلا گیا۔ خدا کی قدرت! باوجودیکہ میرے کان بند تھے پھر بھی کچھ کچھ آواز مجھے سُنانی دینے لگی اور میں نے دل میں کہا۔ میری ماں مجھے کھوٹے۔ میں ایک سمجھدار شخص ہوں اور نیکی بدی کی تمیز رکھتا ہوں۔ پس کیا خراج ہے کہ میں اس شخص کی بات سُن لوں۔ اگر وہ اچھی ہوتی تو مان لوں گا اور اگر بُری ہوتی تو انکار کر دوں گا۔ یہ خیال دل میں آنا تھا کہ میں نے کانوں سے روئی نکال پھینکی اور قرآن کی تلاوت سُنا رہا۔ اور جب رسول اللہ نماز ختم کر چکے اور گھر کی طرف لوٹے تو میں ساتھ ہو لیا اور آپ سے عرض کیا کہ مجھے آپ اپنی باتیں سُنائیں۔ آنحضرت

۱۔ یعنی میں مردوں۔ یہ ایک عربی کا محاورہ ہے جو کسی غلطی وغیرہ کے ارتکاب پر استعمال کیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے کہ اس سے مرنا بہتر ہے۔ منہ ۛ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کلام الہی سنایا اور توحید کی تبلیغ فرمائی۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ میں وہیں مسلمان ہو گیا پھر میں نے آپ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اپنے قبیلہ میں ممتاز حیثیت رکھتا ہوں اور لوگ میری بات مانتے ہیں۔ پس آپ دعا کریں کہ میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی ہدایت دے۔ آپ نے اجازت دی اور دعا فرمائی۔ جب قبیلہ اپنے قبیلہ میں پہنچے تو انھوں نے سب پہلے اپنے والد اور بیوی کو تبلیغ کی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر قبیلہ والوں کی طرف رخ کیا اور ان کو اسلام کی طرف بلایا، مگر انھوں نے انکار کیا اور نہ مانا بلکہ نفرت و مخالفت میں بڑھتے گئے۔ یہ حالت دیکھ کر طفیل پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میری قوم نے تکذیب کی ہے اور مخالفت میں بڑھ گئی ہے۔ پس اب آپ ان کے واسطے بدعا کریں۔ آپ نے ہاتھ اٹھائے مگر بھائے بدعا کر لے کے یہ الفاظ فرمائے کہ: **اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا** یعنی اے میرے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے جاؤ اور نرمی اور محبت سے تبلیغ میں لگے رہو۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں پھر اپنے قبیلہ کی طرف واپس آیا اور ان میں تبلیغ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کی اور جنگ بدر اور احد اور احزاب ہو چکیں تب جا کر میری قوم نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد میں ان میں سے ستر خاندانوں کے ساتھ مدینہ میں ہجرت کر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ خیبر میں مصروف تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ جو احادیث کے ایک مشہور راوی ہیں قبیلہ دوس سے تھے اور انہی لوگوں میں مدینہ آئے تھے۔

طفیل بن عمرو دوسی کے متعلق یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قریش مکہ نے بہت زیادہ تنگ کرنا شروع کیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ میرے پاس چل کر قیام فرمادیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب ہجرت کا حکم دے گا، نبھی میرا نکلتا ہوگا اور پھر جہاں کا ارشاد ہوگا وہیں جانا ہوگا۔

**معراج اور اسرار** معراج اور اسرار کے مسئلہ کو اسلامی لٹریچر میں جو پوزیشن حاصل ہے اور جو لمبی

لمبی بحثیں اس بارے میں کی گئی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ بحثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے متواتر عرصہ بعد سے لیکر آج تک کے لٹریچر میں پائی جاتی ہیں، مگر ہمیں ایک مورد رخ ہونے کی حیثیت میں ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ معراج اور اسرار کے متعلق تاریخی لحاظ سے جو بات ثابت ہے اسے مختصر طور پر اپنے ناظرین کے

سامنے رکھ دیں مگر پیشتر اس کے کہ اصل واقعات بیان کیے جائیں بعض ان اصولی غلطیوں کا ذکر ضروری ہے جو اس بحث میں عام طور پر واقع ہوتی ہیں جن میں بد قسمتی سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی مبتلا ہو گیا ہے۔

پہلی غلطی یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ایک حصہ نے ادران کی پیروی میں بیشتر غیر مسلم مؤرخین نے یہ سمجھ لیا ہے کہ معراج اور اسرار ایک ہی واقعہ کے دو مختلف نام ہیں یا کم از کم یہ کہ وہ ایک ہی واقعہ کے دو مختلف حصوں کے نام ہیں حالانکہ قرآن شریف اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی روایات کے مطالعہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل معراج اور اسرار دو مختلف چیزیں ہیں جو خواہ ایک دوسرے کے قریب قریب واقع ہوتی ہوں اور خواہ ان کا آپس میں روحانی رنگ میں کوئی جوڑ اور رابطہ بھی ہو مگر حقیقت وہ ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہیں یعنی معراج تو اس روحانی سفر کا نام ہے جس میں آپ کو مکہ سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا گیا جہاں بالآخر آپ خداوند عالمیان کے دربار میں پیش ہوئے۔ اور اسرار ایک دوسرا سفر ہے جو آپ کو بعض مصالح کے ماتحت مکہ سے لیکر بیت المقدس تک کرایا گیا۔ قرآن شریف نے ان ہر دو سفروں کو علیحدہ علیحدہ سورتوں میں علیحدہ علیحدہ کیفیات اور تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے؛ چنانچہ سورۃ نجم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس روحانی پرواز کا ذکر آتا ہے۔ وہ معراج ہے۔ جیسا کہ بخاری میں بھی سورۃ نجم کی آیات کو معراج کے واقعہ پر چسپاں کر کے اشارہ کیا گیا ہے۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں جس سفر کا ذکر ہے وہ اسرار ہے۔ اور ان دونوں کی تفصیلات اور کیفیات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں اسرار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن شریف نے آسمان کا ذکر تک نہیں کیا اور سورۃ نجم کے بیان میں بیت المقدس کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

اسی طرح احادیث کے بغور مطالعہ سے بھی معراج اور اسرار کا جدا جدا ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ بخاری میں جو قرآن شریف کے بعد اسلامی طریقہ میں صحیح ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اسرار اور معراج کے علیحدہ علیحدہ باب باندھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ دو مختلف چیزیں ہیں اور دونوں سفروں کی جدا جدا ابتداء بیان کرنے میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ ہر دو سفر ایک دوسرے سے جدا تھے۔ یعنی جہاں اسرار کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے لے کر بیت المقدس تک کی سیر کرائی گئی وہاں معراج کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ کو مکہ سے آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ گویا ہر دو سفروں کی ابتداء علیحدہ علیحدہ طور پر مکہ سے ہی ہوئی جس سے ان کا ایک دوسرے سے





حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر اٹھائے جانے کا نظارہ دکھایا گیا۔ اس وقت آپ سو رہے تھے مگر یہ کہ آپ کا یہونا عام لوگوں کی طرح کا سونا نہ تھا بلکہ اس خاص شانِ نبوت سے تعلق رکھتا تھا جس میں آپ کی آنکھ تو سوتی تھی مگر دل بیدار رہتا تھا۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ معراج کا نظارہ آپ کو نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں دکھایا گیا۔ اور ایک تیسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ معراج کے نظارہ کے بعد آپ بیدار ہو گئے۔ اور ایک چوتھی روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی شخص تم میں سے یہ کہے کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جسمانی آنکھوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کو دیکھا تو وہ جھوٹا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو۔ اور فرماتی ہیں کہ میرے تو اس خیال سے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں کہ آپ نے ان جسمانی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ پھر کتب سیرۃ میں بھی ایسی روایات کی کمی نہیں ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج ایک روحانی امر تھا نہ کہ ظاہری اور جسمانی سفر۔ چنانچہ مشہور اسلامی مؤرخ ابن اسحاق نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مَا فَتَقَدَّ جَسَدُهُ يَعْنِي مَعْرَاجَ كِي رَاَتْ اَنَحَضْرَتَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم كَا جَمْعٍ مَّاءٍ غَائِبٍ نِّہِیْ ہُوَ اَبْلَكُ تَمَامٍ وَتَمَّ اِسَى مَادَى دُنْيَا مِیْن مَوْجُوْدٍ شَا۔ اس سے بڑھ کر معراج کے روحانی ہونے کے متعلق کیا شہادت ہوگی؟

اسی طرح اسراء کے متعلق قرآن شریف اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ وہ ایک روحانی امر تھا جو خاص مصالح کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا؛ چنانچہ قرآن شریف نے اس کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ سفر رات کے وقت ہوا جیسا کہ انہی کے لفظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک ہی رات کے دوران میں مکمل ہو کر ختم ہو گیا جیسا کہ نیشا کے لفظ سے پایا جاتا ہے۔ اور سوم یہ کہ اس سفر کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہم اپنے رسول کو اپنے بعض نشانات دکھائیں۔ اب جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ تینوں باتیں اسراء کو ایک روحانی سیر ثابت کرتی ہیں نہ کہ ایک ظاہری اور جسمانی سفر۔ کیونکہ اول تو عام حالات میں ظاہری سفر کا وقت دن ہے اور رات کے وقت سفر کرنا ایک استثنائی صورت رکھتا ہے۔ اور اس کے مقابل پر روحانی سیر یعنی رؤیا وغیرہ کے لئے اصل وقت رات ہے اور دن کے وقت اس کا واقع ہونا ایک گونہ استثنائی رنگ رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رات کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ یہ ایک روحانی سفر تھا جو بصورتِ رویا و وقوع پذیر ہوا۔ ورنہ رات کے ذکر میں کوئی خاص حکمت نظر نہیں آتی۔ دوسرے اس سفر کے متعلق ان الفاظ کا استعمال کیا جانا کہ وہ ایک رات کے دوران میں مکمل ہو کر ختم ہو گیا سولے

۱۔ بخاری ابواب صفة النبی باب شَأْنُ عَیْنِہٖ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ ۛ ۛ ۛ بخاری ابواب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ ۛ  
 ۲۔ بخاری کتاب التوحید باب قَوْلِہٖ وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰی تَخْلِیْمًا ۛ ۛ بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ نجم ۛ  
 ۳۔ ابن ہشام ذکر الاسراء ۛ ۛ سورۃ بنی اسرائیل ۲۱ ۛ



اس کے اور کسی غرض و غایت کے لیے نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے رُوحانی ہونے کی طرف اشارہ کیا جائے۔ کیونکہ عام حالات میں مادی اسباب کے تحت مکہ سے لے کر بیت المقدس تک کا سفر ایک رات کے اندر اندر پورا ہونا بالکل ممکن نہ تھا۔ تیسرے اس سفر کی غرض و غایت کے متعلق جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے بندے کو یہ سفر اس لیے کرایا ہے کہ اُسے اپنے بعض نشانات دکھائیں، یہ بھی اسے ایک رُوحانی امر ثابت کرتا ہے کیونکہ مکہ سے لے کر بیت المقدس کا ظاہری اور جسمانی سفر خواہ وہ ایک رات کے قلیل عرصہ میں ہی تکمیل کو پہنچ جائے ایک عجوبہ منائی کے سوا اپنے اندر کوئی خاص شان کا پہلو نہیں رکھتا جسے متعام نبوت کے مناسب حال سمجھا جاسکے، البتہ اگر اس سفر کو کشفی رنگ میں ایک رُوحانی امر سمجھا جائے جس سے تصویری زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی آئندہ ترقیات اور فتوحات مُراد ہوں تو تب بیشک وہ ایک مقتدرانہ پیشگوئی کی صورت میں ایک بہت بڑا نشان قرار پاتا ہے جس کے مقابل پر ظاہری سفر کو کچھ بھی حیثیت حاصل نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن شریف نے اسی سورۃ بنی اسرائیل میں جس کے ابتداء میں اسرار کا ذکر آتا ہے، اسرار کے متعلق رُویا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ سفر ایک رُویا کے رنگ میں متعاندہ کہ ایک ظاہری اور جسمانی سفر۔ مگر اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربی میں رُویا کے معنی صرف خواب کے نہیں ہوتے بلکہ عربی محاورہ کے مطابق رُویا کا لفظ ہر اس رُوحانی نظارہ پر بولا جاتا ہے جو کسی انسان کو بطریق خواب یا کشف وغیرہ دکھایا جائے اور ہر قسم کے رُوحانی مناظر اس کے اندر شامل ہیں۔ پس جہاں اسرار یا معراج کے متعلق رُویا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہاں اس سے اُردو محاورہ کے مطابق خواب مُراد نہیں ہوتی بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا رُوحانی کشف مُراد ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ارفع اور اعلیٰ شان کے مطابق غامض مصالح الہی کے ماتحت دکھایا گیا۔ بہر حال قرآن شریف نے واضح ارشادات کے ذریعہ اس بات کو کھول کر بتا دیا ہے کہ اسرار کوئی مادی امر نہیں تھا بلکہ وہ رُوحانی سفر تھا جس کی غرض و غایت خدا کے بعض مقتدرانہ نشانات دکھانا ہی تھی۔

اسی طرح حدیث میں بھی اسرار کے متعلق صاف اشارہ آتا ہے کہ وہ ایک رُوحانی امر تھا نہ کہ جسمانی اور ظاہری سفر۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مکہ کی مسجد حرام سے لیکر بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی تو اس پر کفارِ مکہ نے جن میں سے بعض بیت المقدس کو دیکھ چکے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بیت المقدس نہیں گئے یہ اعتراض کیا کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ درست ہے تو آپ بیت المقدس کا کوئی نظارہ بیان کریں۔

اس پر آنحضرت کی طبیعت میں بے چینی پیدا ہوئی۔ کیونکہ گواہ آپ رویا میں بیت المقدس کو دیکھ چکے تھے مگر آپ جانتے تھے کہ یہ ایک رویا کا معاملہ ہے جس میں ممکن ہے کہ آپ کے ذہن کا نقشہ ظاہر کے ساتھ بالکل مطابقت نہ رکھتا ہو اور آپ کو رویا کے مخصوص مناظر کے سوا بیت المقدس کے عام مناظر کا علم بھی نہیں تھا اس لیے طبعاً آپ کو کفار کے اس اعتراض پر لوگوں کی ٹھوکر کے خیال سے فکر پیدا ہوا مگر اللہ تعالیٰ نے فوراً کشفی رنگ میں بیت المقدس کا ظاہری نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے لاکھڑا کیا اور آپ نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرماتے ہوئے کفار کو بتایا کہ بیت المقدس کی یہ یہ نشانیاں ہیں۔ اس پر کفار شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ اب اگر اسرار اس ظاہری جسم کے ساتھ ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے مناظر کو واقعی اپنی ان جسمانی آنکھوں کے ساتھ ملاحظہ فرما چکے تھے۔ تو کفار کے اعتراض پر آپ کو فکر مند ہونے اور اللہ تعالیٰ کو بیت المقدس کا دوبارہ نظارہ کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ کفار کے اعتراض پر آپ کا فکر مند ہونا اور خدا تعالیٰ کا دوبارہ نظارہ دکھانا صاف ظاہر کرتا ہے کہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قبل بیت المقدس کو حقیقی طور پر نہیں دیکھا تھا اور صرف اعتراض ہونے پر اس کا حقیقی نظارہ دکھایا گیا اور پہلا نظارہ جو اسرار کے موقع پر ہوا تھا، اس میں بیت المقدس کا نقشہ صرف عالم رویا کا ایک اجمالی نقشہ تھا جس کی بنا پر آپ اس بستی کی تفصیلات نہیں بتا سکتے تھے۔

الغرض قرآن شریف اور احادیث اور تاریخ یمنوں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ معراج اور اسرار خالصتہً روحانی امور تھے جو بعض خاص مصالح کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے اور جن لوگوں نے اس کے خلاف اذعان کیا ہے ان کے ہاتھ میں سوائے کمزور اور بزدلے استدلال کے اور کچھ نہیں۔ ہاں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ہماری مراد معراج اور اسرار کے روحانی ہونے سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ نظارے معمولی خواب کے نظارے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کی حالت میں دکھائے گئے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے اس نے اسرار اور معراج کی حقیقت کو ہرگز نہیں سمجھا اور یقیناً وہ ان لوگوں سے بڑھ کر غلطی خوردہ ہے جو ان مناظر کو جسمانی اور ظاہری حالت کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کے روحانی مقام کے لحاظ سے اس کے روحانی قوی تیز اور لطیف ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر اسی نسبت اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے لیے اُن کے مقام قرب کے لحاظ سے روحانی بلندیوں کے دروازے کھولتا ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ روحانی مناظر آپ کے ارفع و اعلیٰ مقام کے لحاظ سے

دوسروں کے لطیف ترین کثوف سے بھی آگے نکلے ہوئے تھے جن میں آپ کو ایک سرسبز نورانی جسم کے ساتھ ان بلند ترین روحانی چوٹیوں کی سیر کرائی گئی جہاں آج تک کسی بشر کا قدم نہیں پہنچا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے مقابل پر محض ایک خواب کو کچھ بھی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی اس کے سامنے محض ایک ظاہری اور جسمانی پرواز کو جو ایک عجوبہ منائی سے بڑھ کر نہیں کوئی حقیقت حاصل ہے۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کسی بشر کو اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر لے جانے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ قرآن شریف اور صحیح احادیث اور مستند تاریخی روایات سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اسرار یا معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جسم عنصری کے ساتھ اٹھائے گئے ہوں بلکہ اس کے برعکس جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ قسم کی روحانی پرواز تھی جو بطریقِ رؤیا آپ کو کرائی گئی اور تصویری اور تعبیری زبان میں اس پرواز کے اندر بہت سی حقائق اور اشارات مخفی تھے جو ایک عظیم الشان نشان کے طور پر اپنے وقت پر پورے ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف اس جگہ اس بات کے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ گو خدائی قدرت کے لحاظ سے بھی کچھ ممکن ہے مگر خدا تعالیٰ نے بعض امور کو خود اپنی سنت کے خلاف قرار دیدیا ہے۔ اور انہی میں کسی بشر کا اس جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں صراحت کے ساتھ یہ ذکر آتا ہے کہ جب ایک موقع پر کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کیا کہ آپ ہیں آسمان پر چڑھ کر دکھلا دیں تو آپ نے انہیں خدائی منشار کے ماتحت یہ جواب دیا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ! میں تو صرف ایک انسان رسول ہوں اور ایک انسان رسول کا اس طرح آسمان پر جانا خدائی سنت کے خلاف ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ واقعہ قرآن شریف نے اسی سورۃ میں بیان فرمایا ہے جس میں اسرار کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری آیات میں بھی یہ صاف مذکور ہے کہ ایک انسان اس دنیوی زندگی میں عالم مادی کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔

اسرار اور معراج کے بارے میں دو اصولی غلطیوں کے ازالہ کے بعد ہم اصل واقعہ کو لیتے ہیں یعنی یہ کہ ان کثوف کی تفصیلات کیا تھیں۔ وہ کس جہت کی آیت الہی کے حامل تھے اور وہ کب وقوع پذیر ہوئے۔ پہلے ہم معراج کو لیتے ہیں۔ سو بانا چاہیے کہ معراج ایک عربی لفظ ہے جو عجم سے نکلا ہے جس کے معنی اُپر چڑھنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے عربی میں معراج سیڑھی کو بھی کہتے ہیں جو گویا اُپر چڑھنے کا آلہ اور واسطہ ہے۔ معراج کی تفصیل قرآن شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ :-  
عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى - ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى - وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى -

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى - فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى - فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى - مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى - أَفَتَسْمُرُونَ عَلَى مَا تَلْمِزُونَ - وَلَقَدْ رَأَوْا نَزْلَةً أُخْرَى - عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَى - عِنْدَ هَاجِنَةِ الْأُمَادِ - إِذْ يَنْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى - مَا رَأَى الْبَصَرُ وَمَا طَعَى - لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى ۝

”یعنی خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود تعلیم دی ہے۔ وہی خدا جو بڑی طاقتوں کا مالک اور صاحب قوت و سطوت ہے سو (اس تعلیم کے نتیجہ میں) یہ رسول الہستادہ ہو کر بلند ہوا حتیٰ کہ وہ بلند ہوتا ہوا اُچی اُعلیٰ تک جا پہنچا۔ پھر وہ خدا سے قریب ہوا اور خدا بھی اس کی طرف جھکا حتیٰ کہ وہ دونوں یوں ہو گئے جیسے دو کمانوں کے پلنے سے اُن کا چتہ ایک ہو جاتا ہے (یعنی کھانیں تو الگ الگ رہتی ہیں مگر تیر چلانے کی جگہ ایک ہو جاتی ہے اور مقصد و منزلت کے لحاظ سے کوئی دوئی نہیں رہتی) اس حالت میں خدا نے اپنے اس رسول کو وہ وحی کی جو اُسے کرنا تھی۔ اور رسول کے قلب صافی نے اس نظارہ کے دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی بلکہ جو کچھ دیکھا ٹھیک ٹھیک دیکھا۔ کیا اے لوگو تم ہمارے رسول کے ان رُوحانی مناظر کو شک کی نظر سے دیکھتے ہو؟ حالانکہ اس نے تو اس وقت (اس سے بھی بڑھ کر) ایک اور نظارہ بھی دیکھا تھا۔ وہی جو اُس نے اس انتہائی بیری کے قریب دیکھا۔ وہ بیری جو ابدی رہائش والی جنت کے پاس ہے جبکہ اس بیری پر ایک غاں بھی کھتی کا ظہور ہو رہا تھا۔ یقیناً اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ غلط راستہ پر نہیں پڑی اور نہ ہی وہ حد مقررہ سے آگے نکلی۔ اور آپؐ نے اس نظارہ میں خدا تے ذوالجلال کے بڑے بڑے نشان ملاحظہ کئے ۝

اس قرآنی بیان کی تشریح و تفصیل میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں اُن میں بدقسمتی سے کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے اور جیسا کہ قاعدہ ہے جوں جوں کوئی روایت اعتبار کے اعلیٰ مقام سے نیچے گرتی گئی ہے توں توں اس میں کمزور حصہ کا دخل زیادہ ہوتا گیا ہے۔ اس لیے ہم اس جگہ صرف مضبوط اور معتبر روایتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے۔ اور اُن میں سے بھی صرف اس حصہ پر



اکتفا کریں گے جو ہماری تحقیق میں اختلاف و اختلاط سے پاک ہے۔ سو جانا چاہیے کہ معراج کے متعلق صحیح روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام کے اس حصہ میں جو عظیم کہلاتا ہے لیٹے ہوئے تھے اور نقطہ اور نوم کی درمیانی حالت تھی۔ یعنی آپ کی آنکھ تو سوتی تھی مگر دل بیدار تھا کہ آپ نے دیکھا کہ جبرائیل علیہ السلام نمودار ہوئے ہیں۔ حضرت جبرائیل نے آپ کے قریب آکر آپ کو اٹھایا اور چاہہ زمزم کے پاس لاکر آپ کا سینہ چاک کیا اور آپ کے دل کو زمزم کے مصفا پانی سے اچھی طرح دھویا۔ اس کے بعد ایک سونے کی طشتری لائی گئی جو ایساں حکمت کبریٰ تھی اور حضرت جبرائیل نے آپ کے دل میں حکمت و ایساں کا غرر بھر کر آپ کے سینہ کو پھر اسی طرح بند کر دیا۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام آپ کو اپنے ساتھ لے کر آسمان کی طرف اٹھ گئے اور پہلے آسمان کے دروازہ پر پہنچ کر دستک دی۔ دربان نے پوچھا کون ہے؟ جبرائیل نے جواب دیا میں جبرائیل ہوں۔ اور میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دربان نے پوچھا۔ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا ہے؟ جب جبرائیل نے کہا۔ ہاں۔ اس پر دربان نے دروازہ کھول کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہا۔ اندر داخل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بزرگ انسان کو دیکھا جس نے آپ کو مخاطب ہو کر کہا: ”مرحباً اے صالح نبی اور اے صالح فرزند“ اور آپ نے بھی اُسے سلام کیا۔ اس شخص کے دائیں اور بائیں ایک بہت بڑی تعداد میں رُحوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ جب وہ اپنے دائیں طرف دیکھتا تھا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمنا اٹھتا تھا اور جب بائیں طرف دیکھتا تھا تو غم سے اس کا منہ اتر جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ صاحب کون ہیں؟ جبرائیل نے کہا۔ یہ آدم ہیں اور ان کے دائیں طرف ان کی نسل میں سے اہل جنت کا سایہ پڑ رہا ہے، جسے دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں اور بائیں طرف اہل نار کا سایہ ہے جسے دیکھ کر وہ غم محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد جبرائیل آپ کو لے کر آگے چلے اور دوسرے آسمان کے دروازہ پر بھی آپ کو وہی واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے اندر داخل ہو کر آپ نے دو شخصوں کو دیکھا۔ جنہوں نے ان الفاظ میں آپ کا خیر مقدم کیا کہ ”مرحباً اے صالح نبی اور صالح بھائی“ اور آپ نے بھی انہیں سلام کیا۔ اور جبرائیل نے آپ کو بتایا کہ یہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ ہیں۔ جو خالہ زاد بھائی تھے۔ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام آپ کو اپنے ساتھ لے کر تیسرے اور چوتھے اور پانچویں آسمان میں سے گزرے جن میں آپ نے علی المرتضیٰ حضرت یوسف اور حضرت ادیس اور حضرت ہارون کو پایا۔ چھٹے آسمان پر آپ کی ملاقات حضرت موسیٰ سے ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ نے بھی آپ کو اسی طرح مرحب کہا۔ اور آپ نے سلام کیا۔ جب آپ ان سے آگے گزرنے لگے تو حضرت موسیٰ رو پڑے۔ جس پر آواز آئی۔ اے موسیٰ! کیوں روتے ہو؟ حضرت موسیٰ نے کہا۔ اے میرے اللہ! یہ نوجوان میرے پیچھے آیا۔ مگر اس کی اُمت میری اُمت کی نسبت جنت میں زیادہ داخل ہوگی۔ اے میرے اللہ!



میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص میرے پیچھے آکر مجھ سے آگے نکل جائے گا بلکہ اس کے بعد آپ ساتویں آسمان میں داخل ہوئے جہاں آپ کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی۔ جو بیتِ معمور کے ساتھ ٹیک لگاتے بیٹھے تھے۔ یہ بیتِ معمور آسمانی عبادت گاہ کا مرکز تھا (جس کے گویا نطل کے طور پر دنیا میں کعبۃ اللہ تعمیر ہوا تھا) حضرت ابراہیمؑ نے بھی آپ کو دیکھ کر اسی طرح مزحبا کہا جس طرح حضرت آدمؑ نے کہا تھا۔ (کیونکہ وہ بھی حضرت آدمؑ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد تھے) اور آپ نے بھی اسی طرح ان کو سلام کہا۔

اس کے بعد آپ اور آگے بڑھے اور وہاں پہنچے جہاں اس وقت تک کسی بشر کا قدم نہیں پہنچا تھا۔ یہاں آپ نے اپنے اوپر سے بہت سی قہلوں کے چلنے کی آواز سنی (جو گویا قضا و قدر کی قلیں تھیں) اس کے بعد آپ کو اپنے سامنے ایک بیری کا سا درخت نظر آیا جو گویا زمینی تعلقات کے لیے آسمان کا آخری نقطہ تھا اور اس کے ساتھ سے جنتِ مادی شروع ہوتی تھی۔ اس بیری کے درخت کے پھل اور پتے بڑے بڑے اور عجیب و غریب قسم کے تھے۔ جب آپ نے اس درخت کو دیکھا تو اس پر ایک فوق البیان اور گونا گوں تختی کا ظہور ہوا جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ الفاظ میں یہ طاقت نہیں کہ انہیں بیان کر سکیں۔ اس بیری کے نیچے چار دریا بہہ رہے تھے جن کے متعلق جبرائیلؑ نے آپ کو بتایا کہ ان میں سے دو دریا تو دنیا کے ظاہری دریا نیل و فرات ہیں اور دو باطنی دریا ہیں جو جنت کی طرف کو بہتے ہیں اس موقع پر آپ کو حضرت جبرائیلؑ اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آئے اور آپ نے دیکھا کہ وہ چھ سو پڑوں سے آراستہ ہیں۔ اس کے بعد آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔ اور بالا خر آپ نے دیکھا کہ آپ خداؑ ذو الجلال کے دربار میں پیش ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے بلا واسطہ کلام فرمایا اور بعض بشارات دیں اور آخر کار خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ آپ کی امت کے لیے رات دن میں پچاس نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ آپ یہ حکم لے کر واپس آنے تو راستہ میں حضرت موسیٰؑ نے آپ کو روک کر پوچھا کہ آپ کو کیا احکام ملے ہیں؟ آپ نے پچاس نمازوں کا حکم بیان کیا۔ حضرت موسیٰؑ یہ حکم سن کر چونک پڑے اور کہا کہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ واسطہ پڑنے کی وجہ سے صاحبِ تجربہ ہوں۔ آپ کی امت کو اتنی نمازوں کی ہرگز برداشت نہ ہوگی پس آپ واپس جائیں اور خدا سے اس حکم میں تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ گئے اور اللہ تعالیٰ نے پچاس میں دس کی کمی کر کے چالیس نمازوں کا حکم دیا۔ مگر واپسی پر حضرت موسیٰؑ نے پھر روکا اور کہا کہ یہ بھی بہت زیادہ ہیں آپ واپس جا کر مزید رعایت مانگیں۔ اس پر آپ پھر گئے اور

لے یہ فقرہ حضرت موسیٰؑ کی طرف سے نعوذ باللہ حمد کے طور پر نہیں تھا بلکہ ایک طبعی رشک کا اظہار تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع شان کو ظاہر کرنے کے لیے غالباً خدائی تصرف کے ماتحت کہا گیا۔ منہ

دن کی مزید رعایت منظور ہوئی۔ غرض اس طرح حضرت موسیٰ کے مشورہ پر آپ بار بار خدا کے دربار میں گئے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں کا حکم دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ نے آپ کو پھر روکا اور مزید رعایت کے لیے واپس جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں بنی اسرائیل کو دیکھ چکا ہوں اور وہ اس سے بھی کم عبادت کو نباہ نہیں سکے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اب مجھے واپس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس پر غیب سے آواز آئی: اے محمد! یہ پانچ نمازیں بھی ہیں اور پچاس بھی کیونکہ ہم نے ایک نماز کے بدلے میں دن کا اجر مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح ہمارے بندوں سے تخفیف بھی ہو گئی اور ہمارا اصل حکم بھی قائم رہا۔ اس کے بعد جب آپ مختلف آسمانوں میں سے ہوتے ہوئے نیچے اترے تو آپ کی آنکھ کھل گئی۔ (یعنی یہ کشف کی حالت جاتی رہی) اور آپ نے دیکھا کہ آپ اسی طرح مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعض روایتوں میں معراج ہی کے ذکر میں ایک گھوڑے کی قسم کی سواری براق نامی کالایا جانا اور آپ کا اس پر سوار ہو کر یہ سفر طے کرنا اور آپ کے سامنے دو یا تین دودھ اور شراب وغیرہ کے پیالوں کا پیش کیا جانا وغیرہ بیان ہوا ہے مگر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظارے دراصل اسرار کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور جیسا کہ بعض متقدمین کی بھی رائے ہے یہ راویوں کی غلطی سے معراج کے ذکر میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ واللہ اعلم ۝

دوسرا واقعہ اسرار کا ہے۔ اسرار بھی ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی کسی کو رات کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے یا سفر کرانے کے ہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ روحانی سفر رات کے وقت کرائی گئی تھی، اس لیے اس کا نام اسرار رکھا گیا۔ اسرار کے متعلق جو ذکر قرآن شریف میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ:-

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ..... وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحْكَمَا بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آتَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ۔

”یعنی پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو ایک رات کے دوران میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اپنے اس بندے کو اپنے بعض نشانات دکھا دیں۔ بے شک خدا بہت سُنتے

والا اور دیکھنے والا ہے..... یہ وہی موقعہ تھا جب اسے رسول ہم نے  
تجھے یہ کہا کہ تیرے رب نے اب لوگوں کو گھیر لیا ہے اور جو رویا ہم نے  
تجھے دکھائی وہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش تھی۔

اور حدیث میں جو تفصیلات اسرار کے واقعہ کی بیان ہوئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:  
”ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک خدائی فرشتہ آپ کے پاس آیا اور ایک  
گدھے سے بڑا مگر فخر سے چوٹا جانور بڑا نامی جو نہایت خوبصورت سفید رنگ لمبے جسم کا تھا آپ کے سامنے  
پیش کر کے اس پر آپ کو سوار کیا اور پھر آپ کو ساتھ لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس جانور کا  
قدم اس تیزی کے ساتھ اٹھتا تھا کہ ہر قدم نظر کی انتہائی حد تک لے جاتا تھا اور آپ بہت جلد بیت المقدس  
میں پہنچ گئے۔ جہاں آپ نے اس جانور کو اس حلقہ میں باندھ دیا جہاں گذشتہ انبیاء اسے باندھا کرتے  
تھے اور پھر آپ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں گذشتہ انبیاء کی ایک جماعت جن میں حضرت ابراہیم  
اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام خاص طور پر مذکور ہوتے ہیں، پہلے سے موجود تھی۔ آپ نے  
ان انبیاء کے ساتھ مل کر نماز پڑھی جس میں آپ امام ہوتے اور باقی انبیاء مقتدی بنے۔ اس کے بعد جبرائیل  
نے (کیونکہ یہ فرشتہ جبرائیل تھا) آپ کے سامنے دو پیالے پیش کئے۔ ان میں سے ایک میں دودھ  
تھا اور دوسرے میں شراب تھی۔ آپ نے دودھ کا پیالہ لے لیا اور شراب رد کر دی۔ جس پر جبرائیل نے کہا  
آپ نے فطرت کی بات پہچان لی۔ اگر آپ شراب کا پیالہ لیتے تو آپ کی امت بھٹکتی پھرتی۔  
اور بعض دوسری روایتوں میں اس کی مزید تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ:

”جب حضرت جبرائیل آپ کے سامنے بڑا ق لائے اور آپ اس پر سوار ہونے لگے تو وہ کچھ چمکا  
جس پر جبرائیل نے بڑا ق سے کہا۔ بڑا ق ٹھہرو ٹھہرو۔ واللہ آج تک تم پر کوئی اس شان کا شخص سوار نہیں  
ہوا۔ اس پر بڑا ق شرم سے پسینہ پسینہ ہو کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد آپ اس پر سوار ہو کر حضرت  
جبرائیل کے ساتھ بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں آپ کو ایک بڑھیا ملی جسے دیکھ کر  
آپ نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ جبرائیل نے کہا آگے چلتے آگے چلتے۔ جب آپ آگے  
روانہ ہوئے تو عتوزی دیر کے بعد آپ کو راستہ کے ایک طرف سے کسی نے آواز دے کر بلایا کہ محمد ادر  
آؤ۔ مگر جبرائیل نے آپ سے پھر کہا۔ چلتے آگے چلتے۔ جب آپ آگے آئے تو کچھ دیر کے بعد آپ کو راستہ  
میں چند آدمیوں کی ایک جماعت ملی۔ جنہوں نے ان الفاظ میں آپ کو سلام کہا کہ: ”اے اول محمد پر خدا کا  
سلام ہو۔ اے آخر محمد پر خدا کا سلام ہو۔ اے حاشر (یعنی جمع کرنے والے) تجھ پر خدا کا سلام ہو۔ جبرائیل

نے کہا آپ بھی ان کے سلام کا جواب دیں؛ چنانچہ آپ نے بھی انہیں سلام کہا اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔  
 تھوڑی دیر کے بعد پھر یہی جماعت آپ کو راستہ میں ملی اور پھر انہی الفاظ میں سلام کہا اور کچھ وقفہ  
 کے بعد پھر تیسری دفعہ یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس میں پہنچ گئے۔ یہاں جبرائیل  
 نے آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے۔ ایک میں پانی تھا۔ دوسرے میں شراب تھی اور تیسرے میں  
 دودھ تھا۔ آپ نے دودھ کا پیالہ لے لیا اور باقی دونوں رد کر دیئے۔ جبرائیل نے کہا: آپ نے فطرت کی  
 بات اختیار کی۔ اگر آپ پانی لیتے تو آپ کی اُمت غرق ہو جاتی اور اگر آپ شراب کا پیالہ لیتے تو  
 آپ کی اُمت بھٹکتی پھرتی۔ پھر آپ کے سامنے حضرت آدم اور ان کے بعد کے انبیاء لائے گئے۔ اور  
 آپ نے ان کا امام بنکر انہیں نماز پڑھائی۔ اس کے بعد جبرائیل نے آپ سے کہا کہ وہ جو آپ نے راستہ میں  
 بڑھیا دیکھی تھی وہ دنیا تھی اور دنیا کی عمر میں اب صرف اسی قدر وقت باقی رہ گیا ہے جو اس بڑھیا کی عمر میں باقی  
 رہتا ہے اور وہ جو آپ کو کوئی شخص راستہ کے ایک طرف بلاتا تھا وہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے  
 ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ جو آپ کو آخر میں ایک جماعت ملی تھی اور انہوں نے آپ کو  
 سلام کہا تھا وہ خدا کے رسول حضرت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام تھے۔ اس کے بعد آپ مکہ  
 کی طرف واپس لوٹ آئے۔

یہ وہ واقعات ہیں جو معراج اور اسراء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے اور جو شخص ان واقعات  
 کو غور سے مطالعہ کرے گا وہ ان کی غرض و غایت کے متعلق کبھی بھی شک و شبہ میں نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً جبکہ  
 اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ یہ واقعات ظاہر کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ نہایت اعلیٰ قسم کے  
 کشوف تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی تعریف کے ماتحت دکھائے گئے۔ یہ بات تو ادنیٰ مطالعہ  
 سے بھی ظاہر ہے کہ معراج اور اسراء دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع شان اور آپ کی  
 اُمت کے مرتبہ کی بلندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ علاوہ اور اشارات کے دونوں کشوف میں آپ کا  
 گزشتہ انبیاء سے ملنا اور ان سے آگے نکل جانا یا نماز میں ان کا امام بننا اسی حقیقت کا حامل ہے۔ ان  
 کشوف میں بعض انبیاء کا خاص طور پر آپ کی ملاقات کے لیے منتخب کیا جانا بھی اپنے اندر ایک معنی  
 رکھتا ہے۔ دراصل یہ انبیاء وہی ہیں جن کی اُمتوں سے یا تو آپ کی اُمت کو خاص طور پر واسطہ پڑنے  
 والا تھا۔ اور یا یہ انبیاء بعض خاص صفات کے حامل تھے اور ان کشوف میں اس حقیقت کا اظہار مقصود  
 تھا کہ آپ کا وجود ان انبیاء کی مخصوص صفات میں بھی ان سے بالا دارفع ہے۔ اُمتوں کے تعلق کے  
 لحاظ سے حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور ایک جہت سے حضرت ابراہیم اور حضرت آدم علیہم السلام خاص امتیاز



رکھتے ہیں اور اسی لیے اسرار اور معراج دونوں میں ان انبیاء کو خاص طور پر نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے حضرت عیسیٰؑ تو مسیحی اقوام کے مرکزی نقطہ تھے جو اُس زمانہ میں بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نہ صرف یہودیت کے بانی مبنی تھے جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عنقریب رابطہ پڑنے والا تھا بلکہ وہ ایک ایسی شریعت کے لانے والے تھے جو اپنی تدوین اور تعین اور الہامی نوعیت کی وجہ سے اسلامی شریعت کے ساتھ بہت قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ و سید شامی اقوام کے جدِ امجد ہونے کے علاوہ مسیحیت اور یہودیت اور حنیفیت اور اسلام کے لیے ایک مشترک واجب الاحترام ہستی تھے۔ اور بالآخر حضرت آدمؑ کا وجود تھا جو گویا تمام بنی نوع آدم کا اجتماعی نقطہ تھا۔ اس جہت سے معراج اور اسرار میں ان انبیاء کا مخصوص طور پر چننا جانا صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود میں وہ عظیم الشان ہستی مبعوث ہوئی ہے جو سید ولدِ آدم اور فخرِ اولین و آخرین ہے۔ اور خدا کی طرف سے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ آپؐ کی اُمت کا قدم ان سب اُمتوں پر بالادار ہے۔ حضرت موسیٰؑ چونکہ ایک خاص سلسلہ کے بانی ہونے کی وجہ سے ان رموز سے زیادہ آشنا تھے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پردازِ روحانی کی حقیقت کو فوراً سمجھ لیا اور اس طبعی رشک کی وجہ سے جو فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے (نہ کہ کسی حسد کی بنا پر) اس انکشاف نے انہیں وقتی طور پر غم میں ڈال دیا کہ ایک پیچھے آنے والا نوجوان اُن سے آگے نکلا جا رہا ہے۔ اسرار میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا راستہ پر کھڑے ہو کر آپؐ کو اول اور آخر اور حاشہ کہہ کر پکارنا اور سلام کرنا بھی اپنے اندر ہی لطیف اشارہ رکھتا ہے کہ اے نبیوں کے سر تاج ہم پہچان گئے ہیں کہ گو آپؐ سب انبیاء کے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں مگر رتبہ کے لحاظ سے آپؐ ہی سب سے اول ہیں اور آپؐ ہی نسلِ آدم کا وہ مرکزی نقطہ ہیں جس کے قدموں میں مختلف اقوامِ عالم کا جمع ہونا مقدر کیا گیا ہے۔ پس لیجئے ہماری طرف سے سلام اور دعا کی پیش کش حاضر ہے اے قبول کیجئے ۛ

مندرجہ بالا غرض و فائیت کے اظہار کے علاوہ جو معراج اور اسرار ہر دو میں مقصود ہے ان روحانی سفر کی علیحدہ علیحدہ غرض اور علیحدہ علیحدہ تشریح بھی ہے۔ اور جہاں تک ہم نے غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ معراج تو زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی کمالات کے اظہار کے لیے ہے اور اسرار آپؐ کی ظاہری اور دنیوی ترقی کو ظاہر کرنے کے واسطے ہے۔ اسی لیے جہاں معراج کے واسطے آسمان

۱۔ حاشیہ کے معنی جمع کرنا والے کے ہیں۔ یعنی مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر قوم اور ہر ملک کی طرف الگ الگ رسول مبعوث ہوتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقوامِ عالم اور تمام عالم کے لیے مبعوث کیے گئے۔ منہ



کو چننا گیا۔ اسرار کا آخری نقطہ زمین رکھی گئی ہے۔ اس طرح جہاں معراج میں آپ کا بغیر کسی سواری اور بغیر کسی خطا ہری اور مادی واسطہ کے اُپر اٹھایا جانا بیان ہوا ہے وہاں اسرار میں بُراق کی سواری کا واسطہ رکھا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ آپ کی اور آپ کے اتباع کی دنیوی اور ظاہری ترقی میں مادی اسباب کا بھی دخل ہو گا گو جیسا کہ بُراق کی غیر معمولی رفتار میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مادی اسباب محض ایک پردہ کے طور پر ہوں گے اور اصل سبب وہ غیبی تائید ہوگی جو ہر قدم پر آپ کے ساتھ رہے گی۔ معراج میں آپ کا سب نبیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی طرف اشارہ رکھتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ آپ اپنے مقام اور مرتبہ کے لحاظ سے سب بالا اور ارفع ہیں اور نہ صرف یہ کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت اپنے رُوحانی کمالات میں سب شریعتوں سے فائق و برتر ہے بلکہ آپ کے فیضانِ رُوحانی میں وہ خصوصیت رکھی گئی ہے جو پہلے کسی بشر کو حاصل نہیں ہوئی یعنی آپ کی سچی اور کامل پیروی انسان کو بلند ترین رُوحانی مدارج تک پہنچا سکتی ہے۔ اور کوئی رُوحانی مرتبہ ایسا نہیں ہے جہاں تک آپ کی پیروی کی برکت سے انسان نہ پہنچ سکتا ہو۔ آپ سے پہلے جتنے بھی نبی آئے وہ بیشک اپنے متبعین کے لیے سراسر رحمت و برکت بن کر آئے اور بیشک انھوں نے اپنے پیچھے چلنے والوں کے لیے خدائی انعامات کے دروازے کھولے، لیکن آپ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کی پیروی انسان کو انتہائی کمالات تک پہنچانے کے لیے کافی ہو اور اسی لیے پہلی امتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق تھا کہ جب کوئی شخص کسی نبی کی کامل پیروی کے نتیجہ میں ترقی کر کے اس انتہائی رُوحانی حد تک پہنچ جاتا تھا جہاں تک یہ پیروی اُسے لے جاسکتی تھی تو اس کے بعد اگر یہ شخص اپنی استعداد اور شوق اور کوشش کے لحاظ سے مزید رُوحانی ترقی کے قابل ہوتا تھا تو خدا تعالیٰ اُسے براہِ راست مہیبت اور انعام کے رنگ میں اُپر اٹھا لیتا تھا۔ جس میں اس کے نبی متبوع کی پیروی کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اعلیٰ اور ارفع مقام ہے کہ ایک انسان آپ کی اتباع میں ہی جملہ قسم کے رُوحانی مقامات تک پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس کی طرف آپ کی اس رُوحانی پرواز میں اشارہ کیا گیا ہے جو معراج کے سفر میں آپ کو کرائی گئی۔ اور اسی حقیقت کی طرف قرآن شریف کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ:

وَلَيَكُنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ

یعنی ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک رسول ہی نہیں بلکہ خاتمِ انبیین بھی ہیں“ جن کی مہر تصدیق سے انسان کو ہر قسم کے اعلیٰ ترین رُوحانی انعامات مل سکتے ہیں اور کوئی رُوحانی مرتبہ آپ کے اتباع کی سائی سے باہر نہیں ہے۔

معراج میں جن نبیوں کے ساتھ آپ کی ملاقات ہوئی وہ یہ ہیں :  
حضرت آدمؑ - حضرت عیسیٰؑ - حضرت یحییٰؑ - حضرت یوسفؑ - حضرت ادریسؑ حضرت ہارونؑ  
حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام۔

ان آٹھ نبیوں میں سے دو تو صرف ایک صنفی تعلق کی وجہ سے اس نظارہ میں آئے ہیں۔ یہ دو نبی حضرت  
یحییٰؑ اور حضرت ہارونؑ ہیں۔ جن میں سے مقدم الذکر نبی حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی ہونے کے علاوہ ان کے  
یہ بطور رفاص کے بھی تھے اور نوراندہ کر نبی حضرت موسیٰؑ کے نائب تھے اور بھائی بھی تھے پس اس جہانی  
اور روحانی تعلق کی وجہ سے یہ دو نبی اس نظارہ میں شامل کئے گئے۔ لیکن ایک لطیف بات یہ ہے کہ  
جہاں حضرت یحییٰؑ کو بوجہ جدا اور علیحدہ حیثیت رکھنے کے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ رکھا گیا وہاں حضرت ہارونؑ  
کو حضرت موسیٰؑ کی ماتحتی کی وجہ سے ان سے نیچے کے مگر متصل آسمان میں دکھایا گیا۔ باقی جو چھ انبیاء ہیں ان  
میں سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت آدمؑ کی خصوصیت اور پر بیان ہو چکی ہیں  
کہ وہ اپنی اپنی نسل اور اپنی اپنی اُمت کے نمائندوں کی حیثیت میں دکھائے گئے ہیں اور بقیہ دو انبیاء یعنی  
حضرت یوسفؑ اور حضرت ادریسؑ کی خصوصیت خود حدیث میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے  
خداداد حسن ذاتی کی وجہ سے اور حضرت ادریسؑ اپنے مخصوص علو مکانی کی وجہ سے ممتاز تھے۔ اور انہیں اس نظارہ  
میں لاکر یہ اظہار مقصود تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم ان امتیازی خصائص رکھنے والے نبیوں سے  
بھی ان کے امتیازی خصائص میں بالا اور ارفع ہے۔ واللہ اعلم ۵

معراج کا ایک نظارہ اس خاص تہی سے تعلق رکھتا ہے جو سدرۃ المنتہی پر ہوئی جس کے متعلق آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بیان کی الفاظ میں طاقت نہیں ہے سو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کے قرب الہی کی طرف اشارہ تھا جس میں محب محبوب میں جلوہ ہائے خاص کی نیرنگیوں کا ظہور ہوا جس  
کے بیان کی کوشش تو درکنار اس کے علم کی کوشش بھی بے سود ہے، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس نظارہ میں آپؐ  
نے خدا کی ان خاص اور ممتاز تجلیات کا مشاہدہ کیا جن کے دیکھنے کی طاقت صرف اس مقام پر پہنچ کر ہی  
ماصل ہو سکتی ہے جو آپؐ کو حاصل ہوا۔ سدرہ کے نیچے چار دریاؤں کو بہتے دیکھنا جن میں دو ظاہری  
دریا تھے اور دو باطنی اس غرض کے اظہار کے لیے تھا کہ خدا کی یہ تجلیات ہر دو صورتوں میں اثر انداز  
ہوں گی۔ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ روحانی طور پر بھی اور دنیوی رنگ میں بھی۔ اور چاروں کے عدد  
میں یہ اشارہ تھا کہ آپؐ کی اُمت پر ظاہری اور روحانی ترقی کے دو دو دور آئیں گے۔ ایک دور ان  
ہر دو قسم کی تجلیات کا خود آپؐ کے وجود باوجود سے شروع ہوگا۔ اور ایک بعد کے زمانہ میں آئے گا۔

جبکہ مسلمان اپنے درمیانی زمانہ میں گھر گھر پھر دوبارہ اٹھیں گے اور اس طرح ہر دور میں دو دو تجلیات کا ظہور ہو کر چار نہریں مکمل ہو جائیں گی۔

بالآخر پنجگانہ نماز کے فرض کئے جانے کا نظارہ ہے اس کا ایک حصہ تو ظاہر سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تعبیر سے خارج ہے، لیکن پچاس سے پانچ تک کی کمی کا منظور ہونا ایک نہایت لطیف روحانی نظارہ ہے جس میں اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اصل تعداد جو فرض کی جانیوالی تھی وہ پانچ ہی تھی مگر ساتھ ہی یہ مقتدر تھا کہ ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا تھا کہ امت محمدیہ کو انکی نیکیوں کا بدلہ بڑھ چڑھ کر عطا کیا جائے، اس لیے یہ نمازیں ابتداء میں پچاس کی صورت میں فرض کی گئیں۔ اور پھر ایک لطیف رنگ میں جس میں منی طور پر اللہ تعالیٰ کی شفقت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت کا اظہار بھی مقصود ہے۔ یہ تعداد گھٹا کر پانچ کر دی گئی۔ اور باتوں باتوں میں مسلمانوں کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ تمہارے متعلق یہ اندیشہ کیا گیا ہے کہ تم ان پانچ نمازوں کی ادائیگی میں بھی سستی نہ دکھاؤ۔ اس لیے دیکھنا تم اس میں سستی نہ ہونا۔ ان حقائق کے علاوہ معراج میں اور بھی بہت سے اشارات تھے مگر ایک تاریخی مضمون میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔

اسرار کا واقعہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس تعلق کی طرف اشارہ کرنے والا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو عنقریب دوسری امتوں کے ساتھ پڑنے والا تھا۔ نیز اس میں ان آزمائشوں پر متنبہ کرنا مقصود تھا جو آپ کے متبعین کو ان کی ترقی کے زمانہ میں پیش آنے والی تھیں۔ اس واقعہ میں سب پہلا اشارہ یہ تھا کہ اب جو اسلام پر ایک تنگی کا زمانہ ہے اسے ہم عنقریب دور کر دیں گے اور مصائب کی موجودہ تاریکی دن کی روشنی میں بدل جائے گی۔ چنانچہ آیت اسرار میں ”رات“ کا لفظ استعمال کیا جانا اسی حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کیونکہ تصویری زبان میں تنگی اور مصیبت کا زمانہ رات کے وقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اس سفر کی ابتداء اور انتہا کے لیے مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے الفاظ کا بیان کیا جانا اس غرض سے ہے کہ اے مسلمانو! اب تک تمہارا واسطہ صرف قدیم عربی مذہب و تمدن کے ساتھ رہا ہے جس کا مرکز مسجد حرام ہے۔ لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ بھی تمہارا واسطہ پڑے گا اور تمہاری توجہ کا مرکز مسجد حرام سے وسیع ہو کر یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی مرکز بیت المقدس تک جاپہنچے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہجرت کے بعد اسلام کا محاذ غیر معمولی طور پر وسیع ہو کر یہودیت اور عیسویت کے مقابل پر آ گیا اور اسرار میں جو پیش گوئی کی گئی تھی وہ لفظ بلفظ پوری ہوئی۔

اس کے بعد بڑا قیام کی سواری کا منظر ہے جس کے متعلق اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس سے یہ مراد تھی کہ جو مقابلہ دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو پیش آئے وہ الہی ہے اس میں بیشک مسلمانوں کی کامیابی بظاہر مادی اسباب کے ماتحت نظر آئے گی مگر ان اسباب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیر معمولی طاقت

و دیعت کی جائے گی جس میں ان نتائج کو جو خدا پیدا کرے گا ان کے ظاہری اسباب سے کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ اور مسلمانوں کی سواری گویا بجلی کی طرح اُڑتی ہوئی آگے بھل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تیسرے اس روحانی نظارہ میں یہ اشارہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے جس نئے ماحول کا دروازہ کھولا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اسلام کے لیے ہر قسم کی برکات رکھی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔ **بَادِكُنَا حَوْلَهُ** یعنی ہم نے اس نئے میدان کے ماحول کو تمہارے لیے بابرکت بنایا ہے اور تازہ بخشا ہے کہ ایسا ہی ہو کہ عرب اور اہل عرب کی حدود سے باہر بھل کر اسلام نے ایسا محسوس کیا کہ گویا یہ ماحول پہلے سے انہی کے لیے تیار کیا جا چکا تھا اور اس محاذ میں اسلام کی غیر معمولی فتوحات پہلے سے مقدر تھیں۔ دورانِ سفر میں جو نظارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے ان کی تشریح تو خود کشف کے اندر موجود ہے کہ ان فتوحات کے زمانہ میں مسلمانوں کو دنیا کے اموال اُنبغۃ بنی طرف کھینچیں گے مگر گویہ دنیا کی نعمتوں کا پانی پینے کی حد تک بے شک استعمال کیا جائے لیکن چونکہ اس کی کثرت غرق کر دینے کا سامان بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ اہلیس کا نظارہ عقیدہ کی گراہیوں اور ضلالتوں کا جہتہ ہے۔ اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کی فاتحانہ یلغار میں انہیں شیطانی طاقتیں جادۂ صواب سے منحرف نہ کر دیں۔ پھر نبیوں کی ملاقات ہے جو اپنے اندر برکت اور سلام کے پیغام کے علاوہ یہ معنی بھی رکھتی ہے کہ آئندہ فتوحات میں دنیا کی قومیں اسلامی برکات سے مستفیج ہو کر اس کی برتری کا سکہ مائیں گی۔ چنانچہ یہ ایک تازہ بخشا کھلا ہوا ورق ہے کہ یورپ و امریکہ کی موجودہ بیداری اسلام ہی کے ساتھ واسطہ پڑنے کے نتیجہ میں ہے۔ ورنہ اسلام سے قبل یہ سب قومیں جہالت کی نیند سو رہی تھیں اور یورپ کے غیر متعصب محققین نے اسلام کے اس فیض و برکت کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغرب نے علوم جدیدہ کا پہلا سبق اسلام ہی سے سیکھا ہے۔ بالآخر بیت المقدس میں پہنچ کر آپ کی اقتداء میں گزشتہ نبیوں کے نماز پڑھنے کا نظارہ ہے۔ مگر یہ نظارہ ایسا ہے جو خود اپنی آپ تفسیر ہے جس کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اسرائیل میں بعض اور حقائق بھی ہیں مگر ہم اختصار کے خیال سے صرف اہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

الغرض معراج اور اسرائیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نہایت اعلیٰ درجہ کے کشف تھے جن میں آپ کی اور آپ کی امت کی آئندہ فتوحات اور ترقیوں کے نظارے دکھائے گئے۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ کشف خدا کی طرف سے تھے کیونکہ ان میں آپ کو جو کچھ دکھایا گیا اسی طرح وقوع پذیر ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا۔ اب دیکھو کہ اس عظیم الشان پہلو کے مقابلہ پر محض ظاہری



اور جسمانی سفر کو کیا حقیقت حاصل ہے۔ اگر ان سفروں کو ظاہری جسمانی سفر قرار دیا جائے تو اس سے زیادہ اس کے معنی نہیں بنتے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملکہ کے ماتحت آپ کو ایک خارق عادت رنگ میں جسمانی طور پر مکہ سے اٹھا کر بیت المقدس تک پہنچا دیا اور زمین سے اٹھا کر آسمانوں کی سیر کرا دی۔ یہ بیشک ایک بہت پُر لطف اور مقتدرانہ نظارہ سمجھا جاسکتا ہے مگر اسے اس عظیم الشان حقیقت سے جو ان روحانی مناظر میں مخفی ہے جس کا دامن ہجرت یثرب سے لے کر گویا قیامت تک پھیلا ہوا ہے کچھ دور کی بھی نسبت نہیں مگر افسوس ہے کہ خود مسلمان کہلانے والوں کا ایک طبقہ بھی اسے ایک عجوبہ نمائی سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتا، حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان روحانی مناظر میں اس کے بڑے بڑے نشانات مخفی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے شوق کم و بیش سبھی انبیاء کو ہوتے آئے ہیں اور سارے نبیوں کو ہی ان کی امتوں کے آئندہ حالات کا فی الجملہ نظارہ کرایا جاتا رہا ہے اور اسی طرح بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ معراج بھی ہر نبی کو ہوا ہے اور حضرت موسیٰ کے کشف روحانی کا ذکر تو خود قرآن شریف میں بھی آتا ہے مگر فکر ہر کس بقدر ہمت و استقامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نظارہ دکھایا گیا اور جو معراج آپ کو نصیب ہوا وہ اپنی بلندی اور اپنی وسعت اور اپنے گونا گوں کوائف میں ایک ایسی ارفع شان رکھتا ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ

معراج اور اسرار کے وقوع کی تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے مگر روایات کا کثیر حصہ اس طرف گیا ہے کہ یہ نظارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت یثرب سے کچھ عرصہ پہلے دکھلانے گئے تھے اور کم از کم اسرار کے کشف کی جو تشریح ثابت ہوتی ہے وہ اسی خیال کی مؤید ہے کہ اسرار کا کشف ہجرت کے قریب ہی ہوا تھا اور امام بخاری نے بھی جن کا پایہ روایت میں بہت بلند مانا گیا ہے۔ اسرار اور معراج کو ہجرت کے واقعات سے معاً پہلے لکھا ہے۔ پس اکثر مؤرخین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ اسرار اور معراج ہجرت کے کم و بیش ایک سال پہلے وقوع پذیر ہوئے اس طرح ان کا زمانہ سال ۱۲ سنہ نبوی یا ابتداء ۱۳ سنہ قرار پاتا ہے۔ اور اسرار کے متعلق تو یقیناً یہی صحیح ہے کہ معراج کا واقعہ غالباً اس سے پہلے کا ہے۔ ان کی آپس کی ترتیب کے متعلق بھی مؤرخین میں اختلاف ہے جو لوگ ان دونوں سفروں کو ایک ہی سفر یا ایک ہی سفر کے دو حصے قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے بالعموم اسرار کو پہلے اور معراج کو بعد میں رکھا ہے کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ پہلے آپ مکہ سے بیت المقدس تک گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی طرف اٹھائے گئے۔ لیکن ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ بلکہ اسرار اور معراج جدا جدا چیزیں



ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کو جداگانہ چیزیں ماننے والوں کے درمیان بھی ان کی ترتیب کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن اسحاق نے اسرار کو پہلے رکھا ہے اور معراج کو بعد میں۔ اور اس خیال کی تائید بخاری سے بھی ہوتی ہے جس میں اسرار اور معراج کے الگ الگ باب باندھ کر اسرار کو معراج سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ مگر ابن سعد نے صراحت کے ساتھ اس کے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور معین تاریخیں بیان کر کے معراج کو اسرار سے پہلے رکھا ہے، چنانچہ ابن سعد نے معراج کی تاریخ رمضان سنہ نبوی بیان کی ہے اور اسرار کی تاریخ الاول سنہ ۱۲ اور طبری کا بھی اسی طرف میلان نظر آتا ہے کہ معراج کا واقعہ اسرار سے پہلے کا ہے کیونکہ طبری نے معراج کو ابتداء دعویٰ میں رکھا ہے۔ ہم ان تاریخوں کی تحقیق میں تو نہیں گئے مگر واقعات کے تفصیلی مطالعہ سے ہم اس طرف ضرور مائل ہیں کہ معراج کا واقعہ اسرار سے پہلے ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

**پنجگانہ نماز کا فرض ہونا** معراج سے پہلے اسلام میں نماز کا آغاز تو ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اصحاب مکہ کی گھاٹیوں میں اکیلے اکیلے یا ایک ایک یا دو دو مل کر نماز پڑھا کرتے تھے مگر باقاعدہ صورت میں پانچ وقت کی نماز کا آغاز معراج میں ہوا اور اس وقت سے اسلامی عبادات کا پہلا اور سب سے بڑا رکن اپنی موجودہ صورت میں قائم ہو گیا۔ یعنی اول پو پھٹنے کے بعد مگر سورج نکلنے سے پہلے فجر کی نماز۔ دوسرے سورج ڈھلنے کے بعد مگر اس کے زیادہ نیچے ہونے سے پہلے ظہر کی نماز۔ تیسرے سورج کے نیچے ہو جانے کے بعد مگر روشنی دھیمی پڑنے سے پہلے عصر کی نماز۔ چوتھے سورج کے ڈوبنے کے بعد مگر شفق غائب ہونے سے پہلے مغرب کی نماز۔ پانچویں شفق غائب ہونے کے بعد مگر نصف شب سے پہلے عشاء کی نماز۔ ان پانچوں فرض نمازوں کے اوقات کے متعلق گو قرآن شریف نے صرف ایک اجمالی اشارہ کیا ہے۔ مگر حدیث میں صراحت کے ساتھ ان کی تعیین بیان ہوئی ہے۔ جہاں یہ مذکور ہے کہ معراج کے بعد حضرت جبرائیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر پانچوں نمازوں کے اوقات بالتفصیل سمجھائے۔

اسلامی نماز کی ظاہری شکل و صورت جو خدائی حکم کے ماتحت قائم کی گئی ہے یہ ہے کہ نماز کی ابتداء قیام کی حالت سے ہوتی ہے۔ جبکہ نماز پڑھنے والا اپنے سینہ پر ہاتھ باندھ کر خدا کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد رکوع کی حالت ہے جو گویا خدا کی تعظیم اور بندے کے تذلل کا دوسرا درجہ ہے جبکہ نماز پڑھنے والا قیام کی حالت کو چھوڑ کر اپنے خالق و مالک کے سامنے دوہرا ہو کر جھک جاتا ہے۔

۱۰ ابن ہشام ذکر اسرار ۱۱ بخاری ابواب الاسرار والمعراج ۱۲ طبقات ابن سعد جلد ۱ ۱۳ طبری ذکر معراج ۱۴

۱۵ سورۃ بنی اسرائیل: ۲۰ ۱۶ بخاری کتاب مواقیات الصلوۃ ۱۷

تیسری حالت سجدہ کی ہے جو ایک درمیانی قیام کے بعد آتی ہے جبکہ نماز پڑھنے والا انتہائی عاجزی اور تذلل کی صورت میں خدا کے سامنے زمین پر گر کر اپنی جبینِ نیاز اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ اور چونکہ یہ حالت انتہائی تذلل اور تعبد کی حالت ہے، اس لیے اسے ایک درمیانی وقفہ کے ساتھ دو دفعہ دوہرا جاتا ہے اور اس طرح نماز کی ایک رکعت پوری ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد اسی صورت میں دوسری اور تیسری اور چوتھی رکعت پڑھی جاتی ہے اور آخر میں نماز پڑھنے والا قعدہ میں دو زانو بیٹھ کر جو گویا ایک مقرب اور تسکین یافتہ درباری کی کیفیت ہے، اپنی نماز کو تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ نماز کی ہر حالت یعنی قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کے لیے علیحدہ علیحدہ کلمات جو ہر حالت کے مناسب حال دُعا اور تحمید اور تسبیح وغیرہ پر مشتمل ہیں مقرر کر دیئے گئے ہیں، مگر ساتھ ہی اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ علاوہ مقررہ کلمات کے نماز پڑھنے والا اپنی زبان میں بھی جس طرح مناسب خیال کرے نماز کے اندر دُعا اور تحمید اور تسبیح وغیرہ سے کام لے سکتا ہے۔ نماز میں اتحاد فی العورت کی غرض سے یہ پابندی بھی لگائی گئی ہے کہ خواہ کوئی مسلمان کسی جگہ ہو وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔ اور سوائے کسی ناگزیر مجبوری کے یہ بھی لازمی ہے کہ ایک محلہ یا گاؤں یا قصبہ کے سب مسلمان مقررہ اوقات میں مسجد میں جمع ہو کر یا اگر مسجد نہ ہو تو کسی دوسری جگہ میں اکٹھے ہو کر ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کیا کریں تاکہ ان کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ بجائے منتشر ہونے کے دن بدن مضبوط ہوتا چلا جاوے۔ نماز میں نشاط کی کیفیت پیدا کرنے اور خدا کے دربار میں صفائی کی حالت میں پیش ہونے کی غرض سے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ نماز سے پہلے ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے جسم کی ہر سہ اطراف کو یعنی منہ ہاتھ اور پاؤں کو پانی سے دھو لیا کرے۔ اس عمل کو اسلامی اصطلاح میں وضو کہتے ہیں جو گویا نماز کی اغراض کے لیے غسل کا قائم مقام ہے۔

الغرض معراج کے ساتھ اسلامی عبادات کے سب سے بڑے رکن کا قیام عمل میں آیا اور پانچ وقت کی باقاعدہ نماز کا آغاز ہو گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ جس میں وہ خدا کے حضور میں حاضر ہو کر اس سے باتیں کرتا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اگر نماز کو اس کے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے اور دل کی توجہ بھی اس کے ساتھ ہو تو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے ایک بہترین کیفیت کی حامل ہے۔ انسانی جسم اور رُوح میں فطری طور پر ایک ایسا رابطہ اور اتحاد رکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چھوٹے سے چھوٹا تغیر بھی دوسرے پر ایک گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ مثلاً جسم کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو فوراً رُوح بھی بے قرار ہونے لگتی ہے۔ اور اگر رُوح کو کوئی صدمہ پہنچے تو اس کا فوری اثر جسم پر پڑتا ہے اور جسم میں بھی ساری کیفیات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں جو خود جسم کو تکلیف پہنچنے کی

صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ رُوح خوش ہو تو جسم پر بھی خوشی کے آثار تبسم وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اگر رُوح مغموم ہو تو انسان کا چہرہ فوراً غم کا نقشہ پیش کرنے لگ جاتا ہے۔ الغرض جسم اور رُوح کے درمیان ایک فطری رابطہ اور اتحاد ہے جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے گہرا اثر قبول کرتے ہیں اس لیے اسلامی شریعت میں کمال حکمت کی عبادت کا جسمانی نقشہ ایسا تجویز کیا گیا ہے جو انسانی رُوح میں تعبد اور تذل کی کیفیات پیدا کرنے کے لیے اپنے اندر ایک طبعی خاصیت رکھتا ہے؛ چنانچہ نماز میں قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کی حالتیں اسی غرض و غایت کے ماتحت رکھی گئی ہیں کہ تانا انسانی رُوح کے اندر ان جسمانی کیفیات کے مناسب حال رُوحانی کیفیات پیدا کی جائیں اور ہر حالت کے لیے جو دعایا تحمید یا تسبیح کے الفاظ مقرر کیے گئے ہیں وہ بھی اس رُوحانی کیفیت کے مناسب حال تجویز کئے گئے ہیں جو ہر جسمانی کیفیت کے مقابلہ میں رُوح کے اندر پیدا کرنی مقصود ہے۔ مثلاً نماز میں سجدہ کی حالت میں انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے انتہائی تعبد اور تذل کی حالت ہے اس لیے جو الفاظ سجدہ کی حالت میں پڑھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں یعنی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى (میرا رب جو سب سے بالا و بلند ہے وہ سب عیبوں سے پاک اور سب کمزوریوں سے منزہ ہے) وہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑائی اور بزرگی کے سب سے زیادہ حاصل ہیں تاکہ انسانی رُوح یہ محسوس کرے کہ میں جس ہستی کے سامنے سجدہ کر رہی ہوں وہ ایک ایسی برتر و بالا ہستی ہے کہ اس کے سامنے میرا یہی منصب ہے کہ انتہائی تعبد و تذل کے ساتھ اس کے آگے گر رہی ہوں۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی انسانی رُوح قرب الہی کی طرف بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے اور ناممکن ہے کہ سجدہ کی حالت میں ایک انسان اپنی توجہ کو قائم رکھتے ہوئے اپنے دل میں کوئی دُعا یا تغیر محسوس نہ کرے البتہ جو لوگ نماز کو محض ایک رسم کے طور پر ادا کرتے ہیں اور دل کی توجہ ان کے ساتھ نہیں ہوتی ان کی رُوح بے شک نماز کے اعمال میں سے گزر کر بھی خالی کی خالی نکل آتی ہے کیونکہ ان کے عمل میں کوئی جان نہیں ہوتی اور بے جان عمل کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔

الغرض اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ نماز حقیقی معنوں میں مومن کی معراج ہے۔ اور مسلمان اس مبارک عبادت پر جتنا بھی فخر کریں وہ تھوڑا ہے۔ یقیناً نماز کے مقابلہ پر کسی مذہب کی کوئی عبادت نہیں ٹھہر سکتی کیونکہ جس طرح نماز میں جسم اور رُوح کی ان باریک دربار یک کیفیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو تعبد کے لیے ضروری ہیں وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔ پھر نماز میں ان مختلف کیفیات کو جس ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے وہ بھی فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ سب سے پہلے درجہ پر قیام ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس میں سینہ پر ہاتھ باندھے ہوئے ایک مومن خدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ اس کے بعد رکوع ہے جو قیام اور سجدہ کے بین بین تعبد و تذل کا ایک درمیانی مرتبہ ہے۔ اس کے بعد سجدہ ہے جس میں گویا انسانی رُوح اپنے خالق و مالک کی اعلیٰ اور کامل صفات کا مطالعہ کر کے اس کے سامنے بیٹاب ہو کر زمین پر گر جاتی ہے۔

سب سے آخر میں قعدہ ہے جو سجدہ کے بعد ایک سکون کی کیفیت ہے جس میں انسان تعبد و تذلل کے مراحل میں سے گذر کر گویا خدا کے تسلی یافتہ بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نماز پڑھنے والا دونوں طرف منہ پھیر کر سلام کہتا ہے اور نماز سے فارغ ہو جاتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب اسے دنیا میں واپس جا کر دوسرے لوگوں تک بھی اس سلامتی کے پیغام کو پہنچانا چاہیے جو اُس نے اپنے خدا سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ نماز کی کوئی حالت بھی خاموشی کی حالت نہیں بلکہ ہر حالت کے ساتھ اس حالت کے مناسب حال و عا اور تحید اور تسبیح وغیرہ کے کلمات مقرر کر دیئے گئے ہیں تاکہ یہ مبارک کلمات جسم کی ظاہری حالت اور دل کی باطنی توجہ کے ساتھ مل کر ایک پورا اور حقیقی نقشہ تعبد اور تذلل اور سوال کا پیدا کر دیں۔ بھلا اس کامل و مکمل عبادت کے مقابلہ پر دوسرے مذاہب کا گانا بجانا یا کسی غیر فطری حالت میں محض کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر کوئی الفاظ منہ سے کہہ دینا کیا حقیقت رکھتا ہے؟ اور پھر اسلام نے نماز کی عبادت کو ایک اجتماعی صورت دینے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی قرار دی کہ ایک حلقہ کے سب مسلمان باہم مل کر ایک امام کے پیچھے با ترتیب صفوں میں قبلہ رخ کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کریں۔ اور ضمنی طور پر اس روزانہ پنجوقتہ اجتماع میں بہت سے دوسرے اجتماعی مفاد کا دروازہ بھی کھول دیا گیا ہے۔ غرض وضو سے لیکر اپنے اختتام تک نماز ایک نہایت ہی بابرکت عبادت ہے جس سے بڑھ کر قرب الہی کے حصول اور دل کی طہارت کے لیے کوئی دوسری عبادت تصور میں نہیں آسکتی۔ اور دن رات کے مختلف وقتوں میں پانچ نمازوں کا مقرر کیا جانا بھی اپنے اندر روحانی حفاظت اور روحانی تقویت کا ایک ایسا غیر معمولی سامان رکھتا ہے جو یقیناً کسی اور مذہب میں پایا نہیں جاتا۔

**کیا اسلامی عبادتوں میں ظاہری شکل و صورت پر زیادہ زور دیا گیا ہے** بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی عبادتوں

میں ظاہری فارم یعنی شکل و صورت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس کے بغیر انہیں ناقص سمجھا ہے اور اصل چیز جو دل کی کیفیت سے تعلق رکھتی ہے اور جو گویا عبادت کی رُوح بھی جانی چاہیے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ عبادت میں اصل چیز اس کی رُوح ہے اس لیے اس کے واسطے کسی ظاہری شکل و صورت کے مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہیں صرف دل کی توجہ کافی ہونی چاہیے اور یہ کہ اسلام نے عبادت کی ایک فارم مقرر کر کے اور پھر اس پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر اس کی اصل رُوح کو مٹا دیا ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو آج کل اسلامی عبادتوں کے متعلق کیا جاتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہ اعتراض بالکل فضول اور برباد ہے۔ یعنی نہ تو یہ خیال درست ہے کہ عبادت چونکہ دل کی توجہ کا نام ہے اس لیے عبادتوں میں کسی فارم یعنی ظاہری شکل و صورت کے مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ یہ درست ہے کہ اسلام نے عبادت کی ظاہری شکل و صورت پر



ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس کی اصل حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ دونوں خیال اسلامی تعلیم کی رُو سے قطعاً غلط اور بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔

پہلے ہم اس اعتراض کو لیتے ہیں کہ کیا عبادت میں کسی ظاہری شکل و صورت کے مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ سو جانتا چاہیے کہ یہ خیال کہ چونکہ عبادت کا حقیقی تعلق انسان کی قلبی کیفیت سے ہے اس لیے اس کے واسطے کسی ظاہری فارم یعنی شکل و صورت کی ضرورت نہیں ایک بالکل جہالت اور نادانی کا خیال ہے۔ کیونکہ اول تو جب جسم بھی خدا کا پسیدہ مخلوق ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی خدا کی عبادت میں حصہ لے اور اسے اپنے خالق و مالک کی عبادت کے لیے غرض یا آزاد قرار دے دینا کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسان کا جسم اور اس کے سارے اعضا اور ان اعضا کی ساری طاقتیں خدا کی پیدا کردہ ہیں پس اگر رُوح پر خدا کی مخلوق ہونے کی وجہ سے عبادت کا فرض عائد ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسم اس فرض کی ادائیگی سے باہر رہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ:

وَمِمَّا ذَرَّفْنَاهُ مَضَىٰ نُحْضِقُونَ۔ لہ

یعنی ”سچا مسلمان وہ ہے کہ جو ان سب چیزوں اور سب طاقتوں کو جو خدا نے اُسے

عطا کی ہیں خواہ وہ جسمانی ہیں یا رُوحانی۔ مادی ہیں یا غیر مادی ہمارے رستے میں خرچ

کرتا ہے اور ہر ایک چیز میں سے جو ہم نے اُسے دی ہے ہمارا حق نکالتا ہے۔“

پس اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ عبادت کا حق صرف رُوح کے ذمہ ہے اور جسم اس سے آزاد ہے۔

بلکہ اسلامی تعلیم کی رُو سے رُوح اور جسم دونوں اس بوجھ کے نیچے ہیں اور عقل بھی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔

دوسرے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر رُوح یعنی سپرٹ کے لیے کسی نہ کسی جسم یعنی ظاہری فارم کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی رُوح بغیر جسم کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور جو شخص کسی رُوح کو جسم کے بغیر زندہ رکھنے کی سعی کرتا ہے وہ یقیناً بہت جلد رُوح کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ مثلاً بزرگوں اور افسروں کا ادب و احترام ایک سراسر رُوحانی کیفیت ہے مگر کیا کوئی شخص اس جذبہ کی رُوح کو بغیر کسی ظاہری اور جسمانی پابندی کے زندہ رکھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے بزرگوں اور افسروں کے سامنے بھی اسی طرح آزادی اور بے پروائی کے ساتھ بہتے ہوئے جس طرح میں اپنے ہم عمر دوستوں یا اپنے عزیزوں وغیرہ کے ساتھ رہتا ہوں ان کے ادب و احترام کے جذبہ کو اپنے دل میں قائم رکھ سکتا ہوں تو اس کا یہ دعویٰ غلط اور باطل ہوگا اور ایسا شخص بہت جلد ادب و احترام کی رُوح کو ضائع کر کے خالی ہاتھ



رہ جائے گا۔ دراصل فطرت انسانی کے ماتحت رُوح اور جسم کے درمیان ایک ایسا گہرا رابطہ اور عمیق تعلق ہے کہ کبھی بھی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور یہ دونوں چیزیں ہر وقت ایک غیر معلوم مگر چمکانہ قانون کے ماتحت ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک انسان مختلف کے ساتھ رونے کی شکل بنائے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس ظاہری تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے دل کے اندر بھی غم و اہم کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کا دل مغموم ہے مگر کسی وجہ سے اس کے ظاہری جسم میں ہنسی کی صورت پیدا کر دی جاوے تو اس کے ساتھ ہی اس کے دل کا غم خوشی میں تبدیل ہونا شروع ہو جائے گا۔ پس عبادات میں جسم یعنی ظاہری فارم اور شکل و صورت کا تجویز کیا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جسم اور رُوح ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک صورت میں پیوست ہیں اور جسم کو شامل کرنے کے بغیر عبادت کی رُوح ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی اور لحظہ بہ لحظہ کمزور ہو کر بہت جلد مر جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے ہر نظام میں ہر رُوح کے لیے کوئی نہ کوئی جسم مقرر کیا جاتا ہے اور تعجب ہے کہ جو لوگ اسلامی عبادات پر زیادہ معترض ہیں وہی اس مزمومہ ظاہر پرستی میں دوسروں سے آگے نکلے ہوئے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ و امریکہ کے سارے نظام اور سارے تہذیب و تمدن کی بنیاد ظاہری فارم اور ضابطہ پر مبنی ہے اور یقیناً جتنا زور مغربی ممالک میں ہر چیز کی فارم پر دیا جاتا ہے اتنا کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔ مثلاً ایک ماتحت کے لیے افسر کا ادب لازمی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے ادب محض ایک قلبی کیفیت کا نام ہے لیکن کوئی مغربی حکومت اس بات پر تسلی نہیں پاتی کہ اس کے افراد صرف اپنے دل میں اپنے افسروں کا ادب محسوس کر لیا کریں اور پس۔ بلکہ اس کے لیے یورپ و امریکہ کی ہر حکومت میں بے شمار ضوابط مقرر ہیں اور افسروں کے احترام کی غرض سے ماتحتوں کو سینکڑوں ظاہری پابندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے کیونکہ دنیاوی معاملات میں ان لوگوں کے دل دوسروں کی نسبت اس بات کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی جذبہ کی رُوح کو بغیر ظاہری فارم کے زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ دینی معاملات میں اس فطری قانون کو نظر انداز کیا جاوے۔ الغرض جسم کو عبادت میں شامل کرنا نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ جسم بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش میں حصہ لے بلکہ اس لیے بھی کہ ظاہری اور جسمانی پابندی کے بغیر اندرونی رُوح کا بقا ممکن نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسلام نے اپنی عبادات میں ظاہری شکل و صورت پر زیادہ زور دیا ہے اور عبادت کی رُوح کی طرف جو اصل چیز ہے پوری توجہ نہیں دی۔ سو یہ اعتراض بھی بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے گو اسلام نے جسم کو عبادت میں شامل کر کے ہر عبادت کے لیے ایک ظاہری صورت تجویز کی ہے لیکن چونکہ ہر حال رُوح جسم پر مقدم ہے اس لیے اسلام نے اصل نور عبادت کی رُوح پر دیا ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس قدر زور عبادت کی رُوح پر اسلام میں پایا جاتا ہے

وہ کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ نماز جو اسلام میں ساری عبادتوں سے افضل قرار دی گئی ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

قَوْلُكَ لِلْمُصَلِّينَ ۖ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۚ وَيَخْنَعُونَ الْعَاثُونَ ۝

یعنی ”تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنی نماز کی اصل حقیقت غافل ہیں۔ وہ ایک ایسا کام کرتے ہیں جو لوگوں کو تو نظر آتا ہے مگر اس کے اندر کوئی رُوح نہیں ہے۔ اُنھوں نے صرف برتن کو زور رکھا ہے اور اصل رُوح جس کے لیے یہ برتن مقرر ہے اُن کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔“

اس قرآنی آیت میں جس وضاحت اور زور کے ساتھ اور جس موثر انداز میں اسلامی عبادات کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں اور ہمارا دعویٰ ہے کہ کوئی دوسرا مذہب اس سے بہتر تعلیم نہیں پیش کر سکتا۔ ان مختصر اور سادہ الفاظ میں اس غایت درجہ اہم اور نہایت وسیع مسئلہ کا ایسا پختہ آجاتا ہے کہ جس کے بعد حقیقتاً کسی اور تشریح کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ آیت ہم نے صرف مثال کے طور پر دی ہے ورنہ اسلامی شریعت اس قسم کی تعلیم سے بھری پڑی ہے کہ عبادات میں گو فطرت انسانی کے ازلی قانون کے ماتحت جسم کا ہونا بھی ضروری ہے مگر اصل چیز رُوح ہے جس کے بغیر کسی جسم کو زندہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مثلاً قربانی کے مسئلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَالْبُذُنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ ۚ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عَلَيْهَا صَوَافَتٍ ۚ فَإِذَا ذُكِبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا الْقَائِلَ وَالْمَعْتَرِ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۚ لَنْ يَبَالِ اللَّهُ لِعُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَكِنْ يَبَالُ الشَّقَاؤُ مِنْكُمْ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَذَا مِنْكُمْ ۚ

یعنی ”ہم نے قربانی کے جانوروں کو تمہارے لیے خدا کی شناخت کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور ان میں تمہارے لیے بہت خیر و برکت رکھی گئی ہے۔ پس جب تم انہیں ذبح کرنے کے لیے باندھو تو اُن پر خدا کا نام پڑھ لیا کرو۔ اور پھر جب وہ اپنے پہلو پر گر کر جاں بحق ہو جائیں تو تم ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور حاجت مندوں اور فقیروں کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اس غرض سے تمہارے قابو میں

دے رکھا ہے تاکہ تم خدا کے شکر گزار بندے بنو۔ مگر یاد رکھو کہ ان جانوروں کا گوشت اور خون خدا کو نہیں پہنچتا بلکہ جو چیز خدا کو پہنچتی ہے وہ اس تقویٰ کی رُوح ہے جس سے تم یہ کام کرتے ہو اور ہم نے اسی تقویٰ کی رُوح کو تمہارے قابو میں رکھنے کے لیے یہ طریق مقرر کیا ہے تاکہ تم اس رنگ میں جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے اس کی بڑائی بیان کر سکو۔ اور اے رسول بشارت دے ان لوگوں کو جو اس رنگ میں خدا کی عبادت بجالاتے ہیں۔

اسی طرح حدیث میں بھی کثرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وارد ہوئے ہیں جن میں آپؐ نے اسلامی عبادات کے متعلق یہ تشریح فرمائی ہے کہ ان میں اہل اور حقیقی مقصود عبادت کی رُوح ہے۔ چنانچہ روزہ کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں :-

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ بِاللَّهِ حَاجِبَةً فَإِنْ أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ

”یعنی جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ اور ریاکاری کو ترک نہیں کرتا اور اسی پر عامل رہتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ خدا کو اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں یعنی اس صورت میں اس کا روزہ کوئی روزہ نہیں۔ بلکہ وہ بلاوجہ بھوکا اور پیاسا رہتا ہے جس کا اسے کوئی بھی ثواب نہیں۔“

پھر اسی پر یہ نہیں بلکہ اسلام نے اپنی مختلف عبادات میں ایسی تعلیم دی ہے کہ جس میں اس اصول کو کہ عبادت میں اصل چیز اُس کی رُوح ہے عملاً ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ وہ قبلہ رخ ہو کر ادا ہونی چاہیے لیکن ایسے حالات میں جبکہ کسی مجبوری سے قبلہ رخ ہونا مشکل ہو جائے۔ مثلاً انسان جب کسی سواری پر سوار ہو اور سواری کا رخ اس کے قابو میں نہ ہو یا کسی وقت بادل وغیرہ کی وجہ سے قبلہ کا رخ معلوم نہ ہو سکے تو اس قسم کی صورتوں میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ پھر جدھر سواری کا رخ ہو یا جس طرف انسان قیاس کر لے کہ ادھر قبلہ ہے ادھر ہی منہ کر کے نماز ادا کر لی جائے۔ یا مثلاً نماز کے لیے قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعدہ کی حالتیں لازمی قرار دی گئی ہیں لیکن بایں ہمہ اگر بیماری کی وجہ سے کوئی شخص کھڑا نہ ہو سکے یا کوئی اور معذوری ہو تو اس کے لیے اجازت ہے کہ بیٹھ کر ہی نماز ادا کر لے اور اگر بیٹھ بھی نہ سکے تو لیٹے لیٹے ہی نماز پڑھ لے۔ یہی اصول دوسری عبادتوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ گویا جہاں کہیں بھی عبادت کی رُوح اور اس کا جسم وقتی حالات کی مجبوری کی وجہ سے آپس میں ٹکرائے گئے ہیں اور دونوں

کو ایک وقت میں اختیار نہیں کیا جاسکتا تو وہاں اسلام یہ حکم دینا ہے کہ جسم کو چھوڑ دو اور رُوح کو اختیار کرو۔ جو اس بات کا عمل ثبوت ہے کہ اسلام میں اصل مقصود عبادت کی رُوح کو قرار دیا گیا ہے اور جسم کو محض جسم کی ظاہری شکریت اور رُوح کے بقا کے لیے رکھا گیا ہے۔ وہو المراد۔ پس یہ الزام کہ اسلام نے اپنی عبادات میں جسم کو شامل کر کے رُوح کو مٹا دیا ہے یا یہ کہ جسم پر زیادہ زور دے کر رُوح کو کمزور کر دیا ہے بالکل قلط اور بے بنیاد ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں اسلامی تعلیم ایک ایسا اعلیٰ اور وسطیٰ اور دیکھش نمونہ پیش کرتی ہے جو نہ صرف ہر اعتراض سے بالا ہے بلکہ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا اور پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اسلام نے اپنی عبادات کے لیے جسم بھی ایسے تجویز کئے ہیں کہ ان سے بڑھ کر عبادت کی رُوح کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے کوئی صورت خیال میں نہیں آ سکتی۔

### سلطنت روم و فارس کی باہمی جنگ اور اسکے متعلق آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی قبل اور اسلام سے

کے ابتدائی زمانہ میں تمام متمدن دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ وسیع سلطنتیں دو تھیں سلطنت فارس اور سلطنت روم اور یہ دونوں سلطنتیں عرب کے قریب واقع تھیں سلطنت فارس عرب کے شمال مشرق میں تھی اور سلطنت روم شمال مغرب میں۔ چونکہ ان سلطنتوں کی سرحد ملتی تھی اس لیے بعض اوقات ان کا آپس میں جنگ جہل بھی ہو جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی جس کا اب ہم ذکر کر رہے ہیں۔ یہ سلطنتیں برسرِ پیکار تھیں اور سلطنت فارس نے سلطنت روم کو زیر کیا ہوا تھا۔ اور اس کے کئی قیمتی علاقے جیسے یسے تھے اور اُسے برابر باقی چلی جاتی تھی۔ قریش چونکہ بُت پرست تھے اور فارس کا بھی قریباً قریباً مذہب تھا۔ اس لیے قریش مکہ فارس کی ان فتوحات پر بہت غور و خروش تھے۔ مگر مسلمانوں کو سلطنت روم سے ہمدردی تھی کیونکہ رومی سلطنت عیسائی تھی اور عیسائی بوجہ اہل کتاب ہونے اور حضرت مسیح نامہری سے نسبت رکھنے کے بُت پرست اور محسوس اقوام کی نسبت مسلمانوں کے بہت قریب تھے۔ ایسے حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے علم پاکر پیشگوئی فرمائی کہ گواہی وقت روم فارس سے مغلوب ہو رہا ہے مگر چند سال کے عرصہ میں وہ فارس پر غالب آجائے گا۔ اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔ یہ پیشگوئی سن کر مسلمانوں نے جن میں حضرت ابوبکرؓ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے مکہ میں عام اعلان کرنا شروع کیا کہ ہمارے خدا نے یہ بتایا ہے کہ عنقریب روم فارس پر غالب آئے گا۔ قریش نے جواب دیا کہ اگر یہ پیشگوئی سچی ہے تو آؤ شرط لگاؤ چونکہ اس وقت تک اسلام میں شرط لگانا ممنوع نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے منظور کر لیا اور دوسرا قریش اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان چند اونٹوں کی مارجیت پر شرط قرار پائی اور چھ سال کی معیاد مقرر ہوئی مگر جب آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ”چھ سال کی میعاد مقرر کرنا غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو میعاد کے متعلق بیضیع سینین کے الفاظ فرمائے ہیں جو عربی محاورہ کی رُو سے تین سے لے کر نو تک کے لیے بولے جاتے ہیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ آپؐ مکہ میں ہی مقیم تھے اور ہجرت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد مقررہ میعاد کے اندر اندر ہی جنگ نے اچانک پلٹا کھایا اور رُوم نے فارس کو زیر کر کے تھوڑے عرصہ میں ہی اپنا تمام علاقہ واپس چھین لیا۔ یہ ہجرت کے بعد کی بات ہے۔ اس واقعہ کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یوں ذکر کیا ہے کہ:-

”جب فارس کی فتوحات کا سیلاب ابھی تک برابر بڑھا چلا جاتا تھا۔ محمد (صلعم) نے اپنی تیسویں سورۃ میں یہ پیش گوئی کی کہ عنقریب رُوم فارس پر غالب آئے گا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں واقعات نے اس پیش گوئی کو سچا ثابت کیا۔“

**قبائل عرب کو تبلیغ اسلام** قبائل کے دورہ کے متعلق مختصراً اور پر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انبیاءؑ تو کبھی بھی یایوس نہیں ہوتے مگر ظاہری حالات کے لحاظ سے مکہ

کی حالت اس وقت سخت یایوس کن تھی۔ قریش عداوت اور ایذا رسانی میں دن بدن ترقی کرتے جاتے تھے اور موجودہ صورت میں اُن کے مُسلماں ہونے کی بظاہر بہت ہی کم اُمید تھی۔ دوسری طرف آپؐ کے طائف کے سفر نے اس شہر کے متعلق بھی فی الحال کوئی اُمید پیدا نہیں کی تھی۔ انہیں حالات کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دن بدن اپنی توجہ کو دیگر قبائل عرب کی طرف زیادہ پھیرتے جاتے تھے اور چونکہ قبائل کی تبلیغ کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ حج کے موقع پر مکہ اور منیٰ میں اور شہر حرم کے آیام میں عکاظ، حجتہ اور ذوالحجاز کے میلوں کے موقع پر ان کے پاس جا کر تبلیغ کی جاوے، اس لیے آپؐ نے ان موقعوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا شروع کیا اور کثرت کے ساتھ قبائل کا دورہ شروع کر دیا۔ بعض اوقات حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ یا زید بن حارثہؓ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ مگر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قریش نے اس میں بھی روک ٹوک شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب نے تو گویا اپنا یہ معمول کر لیا تھا کہ جہاں آپؐ تشریف لے جاتے وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جب آپؐ اپنی تقریر شروع فرماتے تو وہ شور کرنے لگتا اور لوگوں سے کہتا کہ اس کی بات نہ مانو کیونکہ یہ اپنے دین سے پھر گیا ہے اور تمہارا دین بھی بگاڑنا چاہتا ہے۔ لوگ جب دیکھتے کہ آپؐ کے اپنے رشتہ دار ہی آپؐ کو جھٹلا رہے ہیں تو وہ بھی تکذیب کرتے گئے۔

۱۔ ترمذی تفسیر سورۃ روم وغنیس جلد اول چیمبرس انسائیکلو پیڈیا حالات ہر قل و تذکرہ بانی زمین ثانیین ایپارہ

۲۔ لائق آف محمد صفحہ ۱۱۹ ۳۔ ابن ہشام باب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفسہ

علی القباہلی ۴۔ ابن سعد



اور بعض وقت ہنسی اور مذاق بھی اڑاتے۔ ابولہب کے علاوہ ابوہل نے بھی کئی دفعہ آپ کے پیچھے جا کر لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب میں ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا، میں نے آپ کو ذوالحجاز میں دیکھا کہ آپ لوگوں کے جمعوں میں گھس کر توحید کا وعظ فرماتے پھرتے تھے۔ اُس وقت ابوہل آپ کے پیچھے پیچھے تھا اور آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا تھا: اے لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ چاہتا ہے کہ تم کو لات وعزائی کی پرستش سے پھیر دے۔

ایک دفعہ آپ بنو عامر بن صعصہ کے ڈیرے میں تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت کوئی قریش آپ کے ساتھ نہ تھا۔ آپ نے انہیں توحید کا وعظ فرمایا اور اسلام کی تائید میں اُن سے مدد چاہی جب آپ تقریر ختم کر چکے تو اُن میں سے بحیرہ بن فراس نامی ایک شخص بولا: "واللہ اگر یہ شخص میرے ہاتھ آجائے تو میں سارے عرب کو زیر کر لوں" اور پھر آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ہم نے تمہارا ساتھ دیا اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ گئے۔ تو تمہارے بعد حکومت میں ہمارا حصہ ہو گا یا نہیں؟" آپ نے فرمایا: "حکومت کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے" اُس نے کہا: "خوب! تمام عرب کے سامنے سینہ سپر ہم ہوں اور حکومت غیر کے ہاتھ میں جاوے! جاؤ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں" غرض آپ نے مختلف قبائل کا دورہ فرمایا اور بنو عامر بن صعصہ، بنو محارب، فزارہ، غسان، مضرہ، حنیفہ، سلیم، عتبہ، کندہ، کلب، عارث، عذرہ، حضارہ وغیرہ سب کو باری باری اسلام کی دعوت دی، مگر سب نے انکار کیا۔ اور سب سے زیادہ سختی کے ساتھ انکار کرنے والے بنو حنیفہ تھے جو یہاں کے رہنے والے تھے۔ میلہ کذاب جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عہد میں نبوت کا دعویٰ کیا اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبائل کا دورہ بھی ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ ہر دو جہان کا بادشاہ جس کا نام لینے پر بعد کے مسلمان شہنشاہ جن کے نام سے دنیا کا بپتی تھی اپنے تختوں سے نیچے اتر آتے تھے، قبائل عرب کے بدوی رئیسوں کے خیموں میں جاتا ہے اور ایک ایک رئیس کے خیمہ پر دستک دیکر خالق کو نمین کا پیغام پیش کرتا ہے اور پیچھے پڑ پڑ کر استدعا کرتا ہے کہ یہ تمہارے بچلے کی چیز ہے، اسے لے لو مگر ہر دروازہ اس کے لیے بند کیا جاتا ہے اور ہر خیمہ سے اس کو یہ آواز آتی ہے کہ جاؤ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ اور خدا کا یہ بند اپنے مقدس مال کی گھٹری اٹھا کر اگلے خیمے کا راستہ لیتا ہے۔

بہر حال اب اسلامی منظر چاروں طرف تاریک و تاریک تھا۔ مکہ میں قریش اسلام کے جانی دشمن تھے اور ہر وقت اُسے نیست و نابود کر دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ طائف والوں نے اسلام کا نام لینے پر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسادیتے تھے۔ دیگر قبائل عرب آپ کو صاف صاف جواب دے چکے تھے۔ گویا ہری اسباب کے لحاظ سے اب اسلام کے لیے نہ جاتے ماندن نہ پائے رفتن کی حالت تھی مگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین تھا اور اسی نے اسے قائم کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور اس زمانہ میں بھی اس کی تائید نصرت کے وعدے ہو رہے تھے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ کی وحی الہی میں خصوصیت کے ساتھ بڑے پرشکوہ اور پُر رعب الفاظ میں اسلام کی آئندہ ترقی اور فتوحات کے نقشے کھینچے جا رہے تھے۔ اور مخالفین اسلام کی آئندہ ناکامیاں اور ان کی ہلاکت کی پیشگوئیاں دنیا کو سنائی جا رہی تھیں۔ قریش ان باتوں کو سننے اور بے اختیار ہنس دیتے۔ مگر خداوندِ عالمیان اپنی قدرت کے زور سے یہ سب نظارے دکھانے والا تھا اور پردہ غیب سے عنقریب کچھ ظاہر ہونے والا تھا؛ چنانچہ ناگاہ یثرب کی جانب کا کنارہ ٹوٹ کر گرا اور اسلامی چشمہ کا پانی جو چاروں طرف راستہ بند ہونے کی وجہ سے اب تک اپنے کناروں کے ساتھ ٹکرا کر رہ جاتا تھا بڑے زور کے ساتھ اس راستہ سے بہ نکلا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کی کیفیت بیان کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یثرب اور اہل یثرب کا مختصر سا حال تحریر کر دیں تاکہ ان واقعات کا سمجھنا آسان ہو جاوے :

# وطن سے بے وطن

## یثرب اور اہل یثرب

مکہ کے شمال کی طرف تقریباً اڑھائی سو میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے جس کا نام مدینہ ہے۔ اب تو اس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے کیونکہ ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری دس سال یہیں گزارے اور یہیں آپ فوت ہوئے اور یہیں آپ کا مزار مبارک ہے اور یہی ابتداء میں خلافت اسلامی کا مرکز رہا ہے۔ مگر اسلام سے پہلے یہ شہر ایک گنہگار کی حالت میں تھا اور اس کا نام یثرب تھا۔ ہجرت کے بعد رسول خدا کا مسکن ہو جانے کی وجہ سے اس کا نام مدینۃ الرسول مشہور ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ صرف مدینہ رہ گیا۔ اسلام سے پہلے یثرب کی آبادی مذہباً دو حصوں میں منقسم تھی۔ یعنی یہود اور بُت پرست۔ یہود پھر آگے تین قبائل میں تقسیم شدہ تھے یعنی بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ اور بُت پرستوں کی بھی دو شاخیں تھیں جن کا نام اوس اور خزرج تھا۔ یہی اوس و خزرج بعد میں اسلام لاکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دیکر انصار کے لقب سے ملحق ہوئے۔ اسلام سے پہلے اوس و خزرج عموماً آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں ان کے درمیان ایک خطرناک لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی جو جنگ بُعث کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں اوس و خزرج کے بڑے بڑے نامور سردار کٹ کر ہلاک ہو گئے۔

چونکہ یہودی لوگ علمی اور مذہبی لحاظ سے ان بُت پرستوں پر فوقیت رکھتے تھے اور دولت و اقتدار میں بھی عموماً بڑھے ہوئے تھے، اس لیے یہود کا ان پر خاص اثر تھا۔ حتیٰ کہ اگر کسی مُشرک کے اولاد زینہ نہ ہوتی تھی تو وہ منت مانتا تھا کہ اگر میرے اولاد زینہ ہوتی تو میں اپنے پہلے لڑکے کو یہودی بنا دوں گا۔ یہود کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اوس و خزرج بھی کتبِ سادی اور سلسلہ رسالت سے کچھ کچھ آشنا ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہود میں الہی نوشتوں کی رو سے ان دنوں ایک نبی کا انتظار تھا، اس لیے یہ بات اوس اور خزرج کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ یہود ان سے کہا کرتے تھے کہ اب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہم اس کا ساتھ دے کر بُت پرستوں اور کافروں کو نیست و نابود کر دیں گے اور وہ ایک بڑی سلطنت قائم کریگا اور ہم اُسے مان کر دُنیا میں طاقتور ہو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

## یشرب میں اسلام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب دستور مکہ میں ایشہ حرم کے اندر قبائل کا دورہ کر رہے تھے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ یشرب کا ایک مشہور شخص سوید بن صامت مکہ میں آیا ہوا ہے۔ سوید مدینہ کا ایک مشہور شخص تھا اور اپنی بہادری اور نجابت اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے کمال کہلاتا تھا اور شاعر بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا پتہ لیتے ہوئے اس کے ڈیرے پر پہنچے اور اُسے اسلام کی دعوت دی۔ اُس نے کہا: میرے پاس بھی ایک خاص کلام ہے جس کا نام مجلہ لقمان ہے۔ آپ نے کہا: مجھے بھی اس کا کوئی حصہ سناؤ۔ جس پر سوید نے اس صحیفہ کا ایک حصہ آپ کو سنایا۔ آپ نے اس کی تعریف فرمائی کہ اس میں اچھی باتیں ہیں، مگر فرمایا کہ میرے پاس جو کلام ہے وہ بہت بالا اور آرفع ہے چنانچہ پھر آپ نے اُسے قرآن شریف کا ایک حصہ سنایا۔ جب آپ ختم کر چکے تو اُس نے کہا: ہاں واقعی یہ بہت اچھا کلام ہے۔ اور گو وہ مسلمان نہیں ہوا مگر اُس نے فی الجملہ آپ کی تصدیق کی اور آپ کو جھٹلایا نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مدینہ میں واپس جا کر اُسے زیادہ مہلت نہیں ملی اور وہ جلد ہی کسی جنگاں میں قتل ہو گیا۔ یہ جنگ بُعاث سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد اسی زمانہ کے قریب یعنی جنگ بُعاث سے قبل آپ پھر ایک دفعہ حج کے موقع پر قبائل کا دورہ کر رہے تھے کہ اچانک آپ کی نظر چند آدمیوں پر پڑی۔ یہ قبیلہ اوس سے تھے اور اپنے بُت پرست رقیبوں یعنی خزرج کے خلاف قریش سے مدد طلب کرنے آئے تھے۔ یہ بھی جنگ بُعاث سے پہلے کا واقعہ ہے۔ گویا یہ طلب مدد اسی جنگ کی تیاری کا ایک حصہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ آپ کی تقریر سن کر ایک نوجوان شخص جس کا نام ایاس تھا بے اختیار بول اٹھا: ”خدا کی قسم جس طرف یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو بلاتا ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں“ مگر اس گروہ کے سردار نے ایک کنکروں کی ٹٹھی اٹھا کر اس کے منہ پر ماری اور کہا: ”چُپ رہو۔ ہم اس کام کے لیے یہاں نہیں آئے۔ اور اس طرح اس وقت یہ معاملہ یونہی دب کر رہ گیا۔ مگر لکھا ہے کہ ایاس جب واپس وطن جا کر فوت ہونے لگا، تو اس کی زبان پر کلمہ توحید جاری تھا۔“

اس کے کچھ عرصہ بعد جب جنگ بُعاث ہو چکی تو سالہ نبوی کے ماہ رجب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ میں یشرب والوں سے پھر ملاقات ہو گئی۔ آپ نے حسب و نسب پوچھا تو معلوم ہوا کہ قبیلہ خزرج کے لوگ ہیں اور یشرب سے آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت محبت کے لہجہ میں کہا: ”کیا آپ لوگ میری کچھ باتیں سن سکتے ہیں؟“ انہوں نے کہا: ”ہاں! آپ کیا کہتے ہیں؟“ آپ بیٹھ گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن شریف کی چند آیات سن کر اپنے منہ سے آگاہ کیا۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: ”یہ موقع ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہود ہم سے سبقت لے جا دیں۔“ یہ کہہ کر سب

مسلمان ہو گئے۔ یہ چھ اشخاص تھے جن کے نام یہ ہیں :

- (۱) ابوامامہ اسعد بن زرارہ جو بنو نجار سے تھے اور تصدیق کرنے میں سب سے اول تھے۔
- (۲) عوف بن حارث یہ بھی بنو نجار سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے نخیال کا قبیلہ تھا۔
- (۳) رافع بن مالک جو بنو زریق سے تھے۔ اب تک جو قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ وہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمایا۔
- (۴) قطیبہ بن عامر جو بنی سلمہ سے تھے۔
- (۵) عقبہ بن عامر جو بنی حرام سے تھے اور
- (۶) جابر بن عبد اللہ بن رمان جو بنی عبیدہ سے تھے۔

اس کے بعد یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہوئے اور جاتے ہوئے عرض کیا کہ ہمیں غامد جنگیوں نے بہت کمزور کر رکھا ہے اور ہم میں آپس میں بہت نا اتفاقیاں ہیں ہم یثرب میں جا کر اپنے بھائیوں میں اسلام کی تبلیغ کریں گے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ہم کو پھر جمع کر دے پھر ہم ہر طرح آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے اچنانچہ یہ لوگ گئے اور ان کی وجہ سے یثرب میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔

یہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں یثرب والوں کی بیعت عقبہ اولیٰ ۳ سنہ نبوی

طرف سے ظاہری اسباب کے لحاظ سے ایک بیم درجا کی حالت میں گذارا۔ آپ اکثر یہ خیال کیا کرتے تھے کہ دیکھیں ان چھ مصدقین کا کیا انجام ہوتا ہے اور آیا یثرب میں کامیابی کی کوئی امید بندھتی ہے یا نہیں مسلمانوں کے لیے بھی یہ زمانہ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایک بیم درجا کا زمانہ تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ سردارانِ مکہ اور رؤساء طائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کو سختی کے ساتھ زد کر چکے ہیں دیگر قبائل عرب بھی ایک ایک کر کے اپنے انکار پر مہر لگا چکے تھے۔ مدینہ میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی تھی، مگر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کبریاں مصائب و آلام کے طوفان اور شدائد کی آندھلوں میں قائم رہ سکے گی۔ دوسری طرف مکہ والوں کے مظالم دن بدن زیادہ ہو رہے تھے۔ اور انھوں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسلام کو مٹانے کا بس یہی وقت ہے مگر اس نازک وقت میں بھی جس نے یہ نازک وقت اسلام پر کبھی نہیں آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص صحابی ایک مضبوط چٹان کی

لے اس سے قبل حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں اس قسم کا ذکر گذر چکا ہے اسی ضمن میں یہ دوسرا واقعہ ہے جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن شریف ساتھ ساتھ ضبط تحریر میں آتا جاتا تھا۔ منہ بہ منہ ابن ہشام و طبری و زرقانی



طرح اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اور آپ کا یہ عزم و استقلال بعض اوقات آپ کے مخالفین کو بھی حیرت میں ڈال دیتا تھا کہ یہ شخص کس قلبی طاقت کا مالک ہے کہ کوئی چیز اسے اپنی جگہ سے ہلانہیں سکتی۔ بلکہ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں خاص طور پر ایک رعب اور جلال کی کیفیت پائی جاتی تھی اور مصائب کے ان تند طوفانوں میں آپ کا سر اور بھی بلند ہوتا جاتا تھا۔ یہ نظارہ اگر ایک طرف قریش مکہ کو حیران کرتا تھا تو دوسری طرف ان کے دلوں پر کبھی کبھی لرزہ بھی ڈال دیتا تھا۔ ان آیام کے متعلق سرورہم میور لکھتا ہے:

”ان آیام میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے سامنے اس طرح سینہ سپر تھا کہ انہیں بعض اوقات حرکت کی تاب نہیں ہوتی تھی۔ اپنی بالآخر فتح کے یقین سے معمور مگر بظاہر بے بس اور بے یار و مددگار۔ وہ اور اس کا چھوٹا سا گروہ اس زمانہ میں گویا ایک شیر کے منہ میں تھے مگر اس خدا کی نصرت کے وعدوں پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے جس نے اسے رسول بنا کر بھیجا تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایسے عزم کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا تھا جسے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلانہیں سکتی تھی۔ یہ نظارہ ایک ایسا شاندار منظر پیش کرتا ہے جس کی مثال سوائے اسرائیل کی اس حالت کے اور کہیں نظر نہیں آتی کہ جب اس نے مصائبِ آلام میں گھر کر خدا کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ اے میرے آقا! اب تو میں ہاں صرف ہیں ہی اکیلارہ گیا ہوں۔ نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ نظارہ اسرائیلی نبیوں سے بھی ایک رنگ میں بڑھ کر تھا..... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ الفاظ اسی موقع پر کہے گئے تھے کہ اے میری قوم کے صنادید تم نے جو کچھ کرنا ہے کرو میں بھی کسی اُمید پر کھڑا ہوں“

الغرض اسلام کے لیے یہ ایک بہت نازک وقت تھا کہ مکہ والوں کی طرف سے تو ایک گونا گونا امید ہو چکی تھی، مگر مدینہ میں اُمید کی کرن پیدا ہو رہی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑی توجہ کے ساتھ اس طرف نظر لگانے ہوئے تھے کہ آیا مدینہ بھی مکہ اور طائف کی طرح آپ کو روک رہا ہے یا کہ اس کی قسمت دوسرے رنگ میں لکھی ہے؛ چنانچہ جب حج کا موقعہ آیا تو آپ بڑے شوق کے ساتھ اپنے گھر سے نکلے اور منیٰ کی جانب عقبہ کے پاس پہنچ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ناگاہ آپ کی نظر اہلِ یثرب کی ایک چھوٹی سی جماعت پر پڑی جنہوں نے آپ کو دیکھ کر فوراً پہچان لیا۔ اور نہایت محبت اور اخلاص سے آگے بڑھ کر آپ کو لے اب کے یہ بارہ اشخاص تھے۔ جن میں سے پانچ تو وہی گزشتہ سال کے مصدقین تھے اور سات نئے تھے۔ اور اوس اور غزرج دونوں قبیلوں میں سے تھے۔

ان کے نام یہ ہیں :-

- (۱) ابوامامہ اسعد بن زرارہ  
 (۲) عوف بن حارث  
 (۳) رافع بن مالک  
 (۴) قطبہ بن عامر  
 (۵) عقبہ بن عامر  
 (۶) معاذ بن حارث  
 (۷) ذکوان بن عبد قیس  
 (۸) ابو عبد الرحمن یزید بن ثعلبہ  
 (۹) عبادہ بن صامت  
 (۱۰) عباس بن عبادہ بن فضلہ  
 (۱۱) ابو الہیثم بن تہیان  
 (۱۲) عیوم بن ساعدہ
- یہ پانچ اصحاب سابقہ مصدقین میں سے تھے۔
- از قبیلہ بنی نجار (خزرج)  
 از قبیلہ بنو زریق (خزرج)  
 از بنی بلی (حلیف خزرج)  
 از بنی عوف (خزرج)  
 از بنی سالم (خزرج)  
 از بنی عبدالاشہل (اوس)  
 از بنی عمرو بن عوف (اوس)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے الگ ہو کر ایک گھاٹی میں ان سے ملے۔ انھوں نے شرب کے حالات سے اطلاع دی اور آپ کی دفعہ سب نے باقاعدہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت مدینہ میں اسلام کے قیام کا بنیادی پتھر تھی۔ چونکہ اب تک جہاد بالسیف فرض نہیں ہوا تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے صرف ان الفاظ میں بیعت لی جن میں آپ جہاد فرض ہونے کے بعد عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم خدا کو ایک جانیں گے۔ شرک نہیں کریں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ قتل سے باز رہیں گے۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور ہر نیک کام میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ بیعت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

”اگر تم صدق و ثبات کے ساتھ اس عہد پر قائم رہے تو تمہیں جنت نصیب ہوگی اور اگر کمزوری دکھائی تو پھر تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ جس طرح چاہے گا کرے گا۔“

یہ بیعت تاریخ میں بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ وہ جگہ جہاں بیعت لی گئی تھی عقبہ کہلاتی ہے جو مکہ اور منیٰ کے درمیان واقع ہے۔ عقبہ کے لفظی معنی بلند پہاڑی رستے کے ہیں۔ مکہ سے رخصت ہوتے ہوئے ان بارہ نو مسلمین نے درخواست کی کہ کوئی اسلامی معلم ہمارے ساتھ بھیجا جاوے جو ہمیں اسلام کی تعلیم دے اور ہمارے مُشرک بھائیوں کو اسلام کی تبلیغ کرے۔ آپ نے مصعب بن عمیرؓ کو جو قبیلہ عبدالدار کے ایک نہایت مخلص نوجوان تھے ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اسلامی

ہفتخ ان دنوں میں قاری یا مقرر کی کہلاتے تھے کیونکہ ان کا کام زیادہ تر قرآن شریف سنانا تھا کیونکہ یہی تبلیغ اسلام کا بہترین ذریعہ تھا۔ چنانچہ مصعبؓ بھی یشرب میں مقرر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

یشرب میں اسلام کا چرچا مصعبؓ بن عمیر نے مدینہ پہنچ کر اسعد بن زرارہ کے مکان پر قیام کیا جو مدینہ میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔ اور ویسے بھی ایک نہایت

مخلص اور با اثر بزرگ تھے اور اسی مکان کو اپنا تبلیغی مرکز بنایا اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور چونکہ مدینہ میں مسلمانوں کو اجتماعی زندگی نصیب تھی اور تھی بھی نسبتاً امن کی زندگی، اس لیے اسعد بن زرارہ کی تجویز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعبؓ بن عمیر کو جمعہ کی نماز کی ہدایت فرمائی اس طرح مسلمانوں کی اشتراکی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مدینہ میں گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور اوس وغیر ج بڑی شریعت کے ساتھ مسلمان ہونے شروع ہو گئے بعض صورتوں میں تو ایک قبیلہ کا قبیلہ ایک دن میں ہی سب کا سب مسلمان ہو گیا، چنانچہ بنو عبد الاشہل کا قبیلہ بھی اسی طرح ایک ہی وقت میں اکٹھا مسلمان ہوا تھا۔ یہ قبیلہ انصار کے مشہور قبیلہ اوس کا ایک ممتاز حصہ تھا اور اس کے رئیس کا نام سعد بن معاذ تھا۔ جو صرف قبیلہ بنو عبد الاشہل کے ہی رئیس اعظم نہ تھے بلکہ تمام قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ جب مدینہ میں اسلام کا چرچا ہوا تو سعد بن معاذ کو یہ برا معلوم ہوا اور انہوں نے اسے روکنا چاہا۔ مگر اسعد بن زرارہ سے ان کی بہت قریب کی رشتہ داری تھی۔ یعنی وہ ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے اور اسعد مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے سعد بن معاذ خود براہ راست دخل دیتے ہوئے رکتے تھے کہ کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو جائے۔ لہذا انہوں نے اپنے ایک دوسرے رشتہ دار اُسید بن الحنفیر سے کہا کہ اسعد بن زرارہ کی وجہ سے مجھے تو کچھ حجاب ہے مگر تم جا کر مصعبؓ کو روک دو کہ ہمارے لوگوں میں یہ بے دینی نہ پھیلے۔ اور اسعد سے بھی کہہ دو کہ یہ طریق اچھا نہیں ہے۔ اُسید قبیلہ عبد الاشہل کے ممتاز رؤساء میں سے تھے۔ حتیٰ کہ ان کا والد جنگِ بعاث میں تمام اوس کا سردار رہ چکا تھا۔ اور سعد بن معاذ کے بعد اُسید بن الحنفیر کا بھی اپنے قبیلہ پر بہت اثر تھا۔ چنانچہ سعد کے کہنے پر وہ مصعب بن عمیر اور اسعد بن زرارہ کے پاس گئے اور مصعب سے مخاطب ہو کر فقہ کے لہجہ میں کہا۔ ”تم کیوں ہمارے آدمیوں کو بے دین کرتے پھرتے ہو اُس سے باز آ جاؤ، ورنہ اچھا نہ ہو گا۔“ پھر اس کے کہ مصعب کچھ جواب دیتے اسعد نے آہستگی سے مصعب سے کہا کہ یہ اپنے قبیلہ کے ایک با اثر رئیس ہیں ان سے بہت نرمی اور محبت سے بات کرنا، چنانچہ مصعب نے بڑے ادب اور محبت کے رنگ میں اُسید سے کہا کہ ”آپ ناراض نہ ہوں بلکہ مہربانی فرما کر تھوڑی دیر تشریف رکھیں اور ٹھنڈے دل سے ہماری بات سن لیں اور اُس کے

بعد کو رائے قائم کریں۔ اُسید اس بات کو معقول سمجھ کر بیٹھ گئے اور مصعب نے انہیں قرآن شریف سنایا اور بڑی محبت کے سیرایہ میں اسلامی تعلیم سے آگاہ کیا۔ اُسید پر اتنا اثر ہوا کہ وہیں مسلمان ہو گئے۔ اور پھر کہنے لگے کہ میرے پیچھے ایک ایسا شخص ہے کہ جو اگر ایمان لے آیا تو ہمارا سارا قبیلہ مسلمان ہو جائے گا۔ تم ٹھہرو میں اسے ابھی یہاں بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُسید اٹھ کر چلے گئے اور کسی بہانہ سے سعد بن معاذ کو مصعب بن عمیر اور سعد بن زرارہ کی طرف بھجوا دیا۔ سعد بن معاذ آئے اور بڑے غضبناک ہو کر سعد بن زرارہ سے کہنے لگے کہ ”دیکھو سعد تم اپنی قرابت داری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس پر مصعب نے اسی طرح نرمی اور محبت کے ساتھ ان کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ آپ ذرا تھوڑی دیر تشریف رکھ کر میری بات سن لیں اور پھر اگر اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض ہو تو بے شک رد کر دیں۔ سعد نے کہا۔ ہاں یہ مطالبہ تو معقول ہے اور اپنا نیزہ ٹیک کر بیٹھ گئے اور مصعب نے اسی طرح پہلے قرآن شریف کی تلاوت کی اور پھر اپنے دلکش رنگ میں اسلامی اصول کی تشریح کی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یہ بُت بھی رام تھا۔ چنانچہ سعد نے سنُون طریقِ غسل کر کے کلمہ شہادت پڑھ دیا۔ اور پھر اس کے بعد سعد بن معاذ اور اُسید بن الحنظل دونوں مل کر اپنے قبیلہ والوں کی طرف گئے۔ اور سعد نے اُن سے مخصوص عربی انداز میں پوچھا کہ ”اے بنی عبد الاشہل تم مجھے کیسا جانتے ہو؟“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”آپ ہمارے سردار اور سردار ابن سردار ہیں۔ اور آپ کی بات پر ہمیں کامل اعتماد ہے۔“ سعد نے کہا۔ ”تو پھر میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں جب تک تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لاؤ۔“ اس کے بعد سعد نے انہیں اسلام کے اصول بھانے اور ابھی اس دن پر شام نہیں آئی تھی کہ تمام قبیلہ مسلمان ہو گیا اور سعد اور اُسید نے خود اپنے ہاتھ سے اپنی قوم کے بُت نکال کر توڑ دیے۔

سعد بن معاذ اور اُسید بن الحنظل جو اس دن مسلمان ہوئے دونوں چوٹی کے صحابہ میں شمار ہوتے ہیں اور انصار میں تو لاریب ان کا بہت ہی بلند پایہ تھا۔ بالخصوص سعد بن معاذ کو تو انصارِ مدینہ میں وہ پوزیشن حاصل ہوئی جو مہاجرین مکہ میں حضرت ابوبکرؓ کو حاصل تھی۔ یہ نوجوان نہایت درجہ مخلص نہایت درجہ وفادار اور اسلام اور بانی اسلام کا ایک نہایت جاں نثار عاشق نکلا۔ اور چونکہ وہ اپنے قبیلہ کا رئیسِ عظیم بھی تھا اور نہایت ذہین تھا۔ اسلام میں اُسے وہ پوزیشن حاصل ہوئی جو صرف خاص بلکہ انھیں صحابہ کو حاصل تھی اور لاریب اس کی جوانی کی موت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ”سعد کی موت پر تو رحمن کا عرش بھی حرکت میں آگیا ہے۔“ ایک گہری صداقت پر مبنی تھا۔ غرض اس طرح مُرعت کے ساتھ اور غرض میں اسلام پھیل گیا۔ یہود خوف بھری آنکھوں کے

ساتھ یہ نظارے دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں یہ کہتے تھے کہ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

یہ تو مدینہ کے خوش کن واقعات ہیں۔ جو بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد پیش آئے مگر ادھر تک میں یہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے واسطے نہایت تنگی اور سختی کا گذرا۔ قریش دن بدن اپنے مظالم میں ترقی کرتے جاتے تھے خصوصاً جب ان کو مدینہ کے حالات سے اطلاع ہوئی تو ان کی دشمنی کی آگ بہت ہی بھڑک اٹھی اور انہوں نے آگے سے بھی بڑھ کر مظالم شروع کر دیئے اور بے چارے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔

### بیعت عقبہ ثانیہ ۱۳ سنہ نبوی

اگلے سال یعنی ۱۳ سنہ نبوی کے ماہ ذی الحجہ میں حج کے موقعہ پر اوس اور خزرج کے کئی سو آدمی مکہ میں آئے۔ ان میں ستر شخص ایسے شامل تھے جو یا تو مسلمان ہو چکے تھے اور یا اب مسلمان ہونا چاہتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مکہ آئے تھے مصعب بن عمیر بھی ان کے ساتھ تھے مصعب کی ماں زندہ تھی اور گو مشرکہ تھی مگر ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب اسے ان کے آنے کی خبر ملی تو اس نے ان کو کہلا بھیجا کہ پہلے مجھ سے آکر مل جاؤ پھر کہیں دوسری جگہ جانا۔ مصعب نے جواب دیا کہ میں ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملا آپ سے مل کر پھر تمہارے پاس آؤں گا۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ سے مل کر اور ضروری حالات عرض کر کے پھر اپنی ماں کے پاس گئے۔ وہ بہت جلی ٹھنی بیٹھی تھی۔ ان کو دیکھ کر بہت روتی اور بڑا شکوہ کیا مصعب نے کہا: ماں! میں تم سے ایک بڑی اچھی بات کہتا ہوں جو تمہارے واسطے بہت ہی مفید ہے اور سارے جھگڑوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا وہ کیا ہے؟ مصعب نے آہستہ سے جواب دیا: بس یہی کہ بت پرستی ترک کر کے مسلمان ہو جاؤ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔ وہ بچی مشرکہ تھی، سننے ہی شور مچا دیا کہ مجھے ستاروں کی قسم ہے میں تمہارے دین میں کبھی داخل نہ ہوں گی۔ اور اپنے رشتہ داروں کو اشارہ کیا کہ مصعب کو پکڑ کر قید کر لیں۔ مگر وہ بھاگ کر نکل گئے یہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مصعب سے انصار کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور ان میں سے بعض لوگ آپ سے انفرادی طور پر ملاقات بھی کر چکے تھے۔ مگر چونکہ اس موقع پر ایک اجتماعی اور خلوت کی ملاقات کی ضرورت تھی، اس لیے مراسم حج کے بعد ماہ ذی الحجہ کی وسطی تاریخ مقرر کی گئی کہ اس دن نصف شب کے قریب یہ سب لوگ گذشتہ سال والی گھاٹی میں آپ کو آکر ملیں تاکہ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ علیحدگی میں بات چیت ہو سکے اور آپ نے انصار کو تاکید فرمائی کہ اکٹھے نہ آئیں بلکہ ایک ایک دو دو کر کے وقت مقررہ پر گھاٹی میں پہنچ جائیں۔ اور سوتے کو نہ جگائیں اور نہ غیر حاضر کا انتظار کریں۔ چنانچہ جب مقررہ تاریخ آئی



تورات کے وقت جبکہ ایک تہائی رات جاچکی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے گھر سے نکلے اور راستہ میں اپنے چچا عباس کو ساتھ لیا جو ابھی تک مشرک تھے، مگر آپ سے محبت رکھتے تھے اور خاندان ہاشم کے رئیس تھے اور پھر دونوں مل کر اس گھاٹی میں پہنچے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ انصار بھی ایک ایک دودھ کر کے آ پہنچے۔ یہ ستر اشخاص تھے اور آدس دغز راج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ سب پہلے عباس نے گفتگو شروع کی کہ ”اے خزرج کے گروہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز و محبوب ہے اور وہ خاندان آج تک اس کی حفاظت کا ضامن رہا ہے اور ہر خطرہ کے وقت میں اس کے لیے سینہ سپر ہوا ہے مگر اب محمد کا ارادہ اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس چلے جانے کا ہے۔ سو اگر تم اسے اپنے پاس لے جانے کی خواہش رکھتے ہو تو تمہیں اس کی ہر طرح حفاظت کرنی ہوگی اور ہر دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو بہتر ورنہ ابھی سے صاف صاف جواب دے دو کیونکہ صاف صاف بات اچھی ہوتی ہے۔“ البراء بن معرور جو انصار کے قبیلہ کے ایک معمر اور بااثر بزرگ تھے نے کہا۔ عباس! ہم نے تمہاری بات سن لی ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ خود بھی اپنی زبان مبارک سے کچھ فرمادیں۔ اور جو ذمہ داری ہم پر ڈالنا چاہتے ہیں وہ بیان فرمادیں۔“ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی چند آیات تلاوت فرمائیں اور پھر ایک مختصر سی تقریر میں اسلام کی تعلیم بیان فرمائی۔ اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے لیے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جس طرح تم اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی حفاظت کرتے ہو۔ اسی طرح اگر ضرورت پیش آئے تو میرے ساتھ بھی معاملہ کرو۔ جب آپ تقریر ختم کر چکے تو البراء بن معرور نے عرب کے دستور کے مطابق آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: یا رسول اللہ! ہمیں اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ کو حق و صداقت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ ہم اپنی جانوں کی طرح آپ کی حفاظت کریں گے ہم لوگ تلواروں کے سایہ میں پلے ہیں اور.... مگر ابھی وہ بات ختم کرنے نہ پائے تھے کہ ابوالہیثم بن تہمان نے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ان کی بات کاٹ کر کہا: یا رسول اللہ! یثرب کے یہود کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ آپ کا ساتھ دینے سے وہ منقطع ہو جائیں گے ایسا نہ ہو کہ جب اللہ آپ کو غلبہ دے تو آپ یہیں چھوڑ کر اپنے وطن میں واپس تشریف لے آویں اور ہم نہ ادھر کے رہیں نہ ادھر کے۔“ آپ نے ہنس کر فرمایا: ”نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تمہارا خون میرا خون ہوگا۔ تمہارا دوست میرے دوست اور تمہارے دشمن میرے دشمن۔“ اس پر عباس بن عبادہ انصاری نے اپنے ساتھیوں پر نظر ڈال کر کہا۔ لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ اس عہد و پیمان کے کیا معنی ہیں؟ اس کا یہ مطلب ہے کہ اب تمہیں ہر اسود و احمر کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے اور ہر قربانی کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔“

لوگوں نے کہا: "ہاں ہم جانتے ہیں۔ مگر یا رسول اللہ! اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: "تمہیں خدا کی جنت ملے گی، جو اس کے سارے انعاموں میں سے بڑا انعام ہے۔" سب نے کہا: "ہمیں یہ سود منظور۔" یا رسول اللہ! اپنا ہاتھ آگے کریں۔" آپ نے اپنا دست مبارک آگے بڑھا دیا اور یہ ستر جاں نثاروں کی بیعت ایک دفاعی معاہدہ میں آپ کے ہاتھ پر پک گئی۔ اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔

جب بیعت ہو چکی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ موسیٰ نے اپنی قوم میں سے بارہ نقیب چنے تھے، جو موسیٰ کی طرف سے اُن کے نگران اور محافظ تھے۔ میں بھی تم میں سے بارہ نقیب مقرر کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے نگران اور محافظ ہوں گے۔ اور وہ میرے لیے عیسیٰ کے حواریوں کی طرح ہوں گے اور میرے سامنے اپنی قوم کے متعلق جوابدہ ہوں گے۔ پس تم مناسب لوگوں کے نام تجویز کر کے میرے سامنے پیش کرو۔ چنانچہ بارہ آدمی تجویز کئے گئے جنہیں آپ نے منظور فرمایا۔ اور انہیں ایک ایک قبیلہ کا نگران مقرر کر کے اُن کے فرائض سمجھا دیئے۔ اور بعض قبائل کے لیے آپ نے دو دو نقیب مقرر فرمائے۔ بہر حال ان بارہ نقیبوں کے نام یہ ہیں: ۱۔

ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار میں سے تھے۔ جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری تھی۔ یثرب میں نماز جمعہ کی ابتداء انہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اول درجہ کے مخلصوں میں سے تھے۔ ہجرت کے بعد جنگ بدر سے پہلے فوت ہو گئے۔

(۱) اسعد بن زرارہ

ان کا ذکر بھی گذر چکا ہے۔ قبیلہ اوس کے خاندان بنو عبد شمس میں سے تھے۔ اکابر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا والد جنگ بُعاث میں قبیلہ اوس کا قائد اعظم تھا۔ اُسید نہایت مخلص اور نہایت سمجھدار تھے۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ انصار میں سے تین اشخاص اپنی فضیلت میں جواب نہیں رکھتے تھے یعنی اُسید بن الحنفیہ، سعد بن معاذ اور عباد بن بشر۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُسید بڑے پائے کے صحابی تھے۔ حضرت ابو بکرؓ

(۲) اُسید بن الحنفیہ

<p>اُسید کی بڑی عزت کرتے تھے۔ عہدِ فاروقی میں وفات پائی۔</p>	
<p>ان کا ذکر بھی اُوپر گزر چکا ہے۔ حلفاء بنی عبدالاشہل سے تھے۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے، دکر لڑے اور شہادت پائی۔</p>	<p>(۳) ابوالہیثم مالک بن قتیہان</p>
<p>قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ساعدہ سے تھے۔ اور تمام قبیلہ خزرج کے رئیس تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ممتاز ترین انصار میں شمار ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ آنحضرت کی وفات پر بعض انصار نے انہی کو خلافت کے لیے پیش کیا تھا جس کی وجہ سے وہ خلافتِ ابوبکرؓ کے سوال پر مترنزل ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فوت ہوئے۔</p>	<p>(۴) سعد بن عبادہ</p>
<p>قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تھے اور بڑے معتمد اور بزرگ آدمی تھے۔ ہجرت پہلے ہی وفات پا گئے۔</p>	<p>(۵) البراء بن معرور</p>
<p>قبیلہ خزرج کے خاندان بنو حارث سے تھے اور مدینہ کے مشہور شاعر اور اول درجہ کے خلیصین میں سے تھے جنگِ ہند میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی تھی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی شہادت کے بعد یہ امیرِ عسکر ہوئے اور لڑتے لڑتے شہادت پائی۔</p>	<p>(۶) عبداللہ بن رواحہ</p>
<p>قبیلہ خزرج کے خاندان بنو عوف میں سے تھے اور علماء صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں حضرت عثمانؓ کی خلافت میں فوت ہوئے۔</p>	<p>(۷) عبادہ بن صامت</p>

(۸) سعد بن الزبیر

قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ثعلبہ میں سے تھے۔ بڑے مخلص اور ممتاز صحابی تھے حضرت ابوبکرؓ انہیں بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

(۹) رافع بن مالک

ان کا ذکر اُدپر گذر چکا ہے۔ قبیلہ خزرج کے خاندان بنی زریقہ میں سے تھے۔ جب یہ اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ قرآنی سورتیں عطا فرمائیں جو اس وقت تک نازل ہو چکی تھیں۔ جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

(۱۰) عبداللہ بن عمرو

قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تھے جنگ اُحد میں شہید ہوئے اُن کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادہ جابر بن عبداللہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے والد سے اللہ تعالیٰ نے بالشفافہ کلام کیا اور ان سے خوش ہو کر کہا کہ "اے میرے بندے! تم نے جو مانگنا ہو مانگو یہ تمہارے والد نے عرض کیا۔ اے میرے خالق و مالک۔ میری بس یہ خواہش ہے کہ پھر زندہ کیا جاؤں تا پھر اسلام کے راستہ میں جان فدا کر دے اور ہوا۔ ہم ایسا ضرور کرتے ہیں مگر ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ کوئی بشر اس دنیا سے گذر کر پھر اس دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ عبداللہ بن عمرو کے متعلق یہ روایت بھی آتی ہے کہ ایک دفعہ جنگ اُحد کے چھیالیس سال بعد کسی سیلاب کی وجہ سے خطرہ پیدا ہوا تو اُن کی قبر کھود کر ان کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی تجویز کی گئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ان کی نعش اسی طرح صحیح و سلامت تھی جس حالت میں کہ انہیں دفن کیا گیا تھا۔

(۱۱) سعد بن خلیثمہ

قبیلہ اوس کے خاندان بنو حارثہ میں سے تھے جنگ بدر میں شہید ہوئے۔ جب یہ جنگ بدر کے لیے مدینہ سے نکلنے لگے تو ان کے والد نے کہا کہ ہم میں سے ایک کو گھر پر بٹھہرنا چاہیے اور چونکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، تم گھر پر بٹھہرو، مگر انھوں نے اصرار کیا۔ اور آخر یہ تجویز ہوئی کہ اس غرض کے لیے قرعہ ڈالا جائے، چنانچہ قرعہ میں ان کا نام نکلا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکل آئے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔

(۱۲) منذر بن عمرو

قبیلہ خزرج کے خاندان بنو ساعدہ سے تھے اور ایک صوفی مزاج آدمی تھے۔ ”بزمعوائد“ میں شہید ہوئے۔

جب یقیوں کا تقرر ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے انصار سے تاکید کی کہ انہیں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ قریش کے جاؤس سب طرف نظر لگائے بیٹھے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس قول و اقرار کی خبر نکل جائے اور مشکلات پیدا ہو جائیں۔ ابھی غائب وہ یہ تاکید کر ہی ہے تھے کہ گھاٹی کے اوپر سے رات کی تاریکی میں کسی شیطان کی آواز آئی کہ ”اے قریش! تمہیں بھی کچھ خبر ہے کہ یہاں (نعوذ باللہ) مذہم اور اس کے ساتھ کے مرتدین تمہارے خلاف کیا عہد و پیمان کر رہے ہیں۔ اس آواز نے سب کو چونکادیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالکل مطمئن رہے۔ اور فرمایا کہ اب آپ لوگ جس طرح آئے تھے اسی طرح ایک ایک دو دو ہو کر اپنی قیام گاہوں میں واپس چلے جائیں۔ عباس بن فضلہ انصاری نے کہا ”یا رسول اللہ! ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اگر حکم ہو تو ہم آج صبح ہی ان قریشیوں پر حملہ کر کے انہیں ان کے مظالم کا مزہ چکھادیں“ آپ نے فرمایا یہ نہیں مجھے ابھی تک اس کی اجازت نہیں ہے۔ بس تم صرف یہ کرو کہ خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے جاؤ۔ جس پر تمام لوگ ایک ایک دو دو کر کے دبے پاؤں گھاٹی سے نکل گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا عباس کے ساتھ مکہ میں واپس تشریف لے آئے۔ قریش کے کانوں میں چونکہ جھنک پڑ چکی تھی کہ اس طرح رات کو کوئی



خفیہ اجتماع ہوا ہے۔ وہ صبح ہوتے ہی اہل یثرب کے ڈیرہ میں گئے اور ان سے کہا کہ ”آپ کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں اور ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ ان تعلقات کو خراب کریں، مگر ہم نے سنا ہے کہ گذشتہ رات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ آپ کا کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اوس اور غزوہ ج میں سے جو لوگ بہت پرست تھے ان کو چونکہ اس واقعہ کی کوئی اطلاع نہ تھی، وہ سخت حیران ہوئے اور صاف انکار کیا کہ قطعاً کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ عبداللہ بن اُبی بن سلول بھی جو بعد میں منافقین مدینہ کا سردار بنا۔ اس گروہ میں تھا۔ اس نے کہا: ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ اہل یثرب کوئی اہم معاملہ طے کریں اور مجھے اس کی اطلاع نہ ہو؟ غرض اس طرح قریش کا شک رفع ہوا اور وہ واپس چلے آئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد انصار واپس یثرب کی طرف کوچ کر گئے، لیکن ان کے کوچ کر جانے کے بعد قریش کو کسی طرح اس خبر کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی اہل یثرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی عہد و میمان کیا ہے۔ جس پر ان میں سے بعض آدمیوں نے اہل یثرب کا بیچا کیا تبادلہ تو نکل گیا تھا، مگر سعد بن عبادہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے اُن کو یہ لوگ پکڑ لائے اور مکہ کے پتھر سے میدان میں لا کر خوب زد و کوب کیا اور سر کے بالوں سے پکڑ کر ادھر ادھر گھسیٹا۔ آخر جبیر بن مطعم اور حارث بن حرب کو جو سعد کے واقف تھے اطلاع ہوئی تو انہوں نے ان کو ظالم قریش کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔

**ہجرت یثرب** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دفعہ رؤیا میں یہ بتایا گیا تھا کہ آپ کو ایک دن مکہ سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانا ہو گا اور ساتھ ہی آپ کو ہجرت کی جگہ دکھائی گئی جو ایک باغوں اور چشموں والی جگہ تھی۔ چونکہ ابھی تک اس کی تشریح آپ پر نہیں کھلی تھی اور تشریح سے قبل ایک نبی بھی بعض اوقات اپنے اجتہاد میں غلطی کر سکتا ہے، اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ:

ذَهَبَ وَهَلَىٰ إِلَىٰ أَهْلِ الْيَمَامَةِ أَوْ حَجَرُ فَإِذَا هِيَ مَدِينَةُ يَثْرِبَ

یعنی ”میرا خیال اس طرف گیا کہ یہ جگہ یامہ یا حجر ہے (جو نجد میں دو شاداب جگہیں ہیں) مگر وہ یثرب نکل آیا“

چنانچہ جب یثرب میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تو تب آپ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہجرت کی جگہ یثرب ہے نہ کہ یامہ یا حجر۔ اس کے بعد جب انصار کے ساتھ سب قول و قرار ہو چکا اور وہ ایک دفاعی عہد پیمان کی بیعت کر کے واپس چلے گئے تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اب جو لوگ جا سکیں وہ سب یثرب کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں باوجود قریش کی طرف سے کئی قسم کی روکوں کے اکثر

مسلمان ہجرت کر گئے اور مکہ کے بہت سے مکانات خالی ہو گئے اور بالآخر صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے اہل و عیال اور ایسے کمزور لوگ جو ہجرت کی طاقت نہ رکھتے تھے یا جنہیں قریش ہجرت کے لیے نکلنے نہ دیتے تھے باقی رہ گئے۔ یہ سب مہاجرین مدینہ میں انصار کے مکانات میں متفرق طور پر بطور مہمان کے ٹھہرے اور اسی حالت میں رہے یہاں تک کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچ گئے اور مہاجرین کے واسطے آہستہ آہستہ الگ مکانات کا انتظام ہو گیا۔ مدینہ والوں نے جن کو مہاجرین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرنے اور پناہ دینے کی وجہ سے انصار کہتے ہیں نہایت گرمجوشی کے ساتھ مہاجرین کا استقبال کیا اور اپنے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر ان کے ساتھ سلوک کیا چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپ نے سب مہاجرین کو انصار کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔

خدا تعالیٰ کا نبی مہاجر کے لباس میں اب ہم اس عظیم الشان واقعہ کے قریب پہنچ گئے ہیں جس سے اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے وطن ماکہ کو چھوڑ کر یثرب کی طرف ہجرت کر جانا۔ اسلامی سنہ جو سن ہجری کہلاتا ہے اسی انقلابی تاریخ سے شمار کیا جاتا ہے۔

جب تمام مسلمان مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تو قریش کو اپنی سابقہ کارروائیوں کی وجہ سے اندیشہ ہوا کہ اس طرح تمام مسلمانوں کا وطن سے بے وطن ہو جانا ضرور کوئی رنگ لائے گا۔ علاوہ ازیں ان کو یہ بھی غصہ تھا کہ ان کا شکار ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے، اس لیے انہوں نے اپنی جگہ سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ اور ان کے مظالم کی پاداش کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کے متعلق اجازت کے منتظر تھے۔ مکہ والوں نے دیکھا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے مسلمان سب جا چکے ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب گویا اکیلا تنہا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کوئی ایسی تدبیر ہو کہ بس اس کا خاتمہ ہی ہو جائے چنانچہ وہ اس خیال سے اپنے قومی مشورہ گاہ یعنی دار الندوہ میں جمع ہوئے اور باہم مشورہ کرنے لگے کہ کیا کیا جاوے۔ اس مشورہ میں قرینا ایک تنویر قریش شامل تھے اور ایک ایسی صفت معمر نجدی شیخ بھی شریک تھا۔ پیش آمدہ صورت حال پر گفت و شنید ہونے کے بعد مشورہ کے آخری مراحل میں یوں گفتگو ہوئی :

ایک شخص :- محمد کو آہنی زنجیروں سے جکڑ کر ایک کمرہ میں بند کر دو کہ وہیں پڑا پڑا ہلاک ہو جائے۔

شیخ نجدی :- یہ رائے درست نہیں کیونکہ جب محمدؐ کے رشتہ داروں اور متبعین کو علم ہوگا تو وہ ضرور حملہ کر کے آئیں گے اور اس کو ٹھہرا لیں گے۔ اور پھر فساد آگے سے بھی بڑھ جائے گا۔

دوسرا شخص :- محمدؐ کو مکہ سے جلا وطن کر دو۔ جب وہ ہماری آنکھوں سے دور ہو گیا اور ہمارے شہر سے نکل گیا تو ہمیں کیا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ ہمارے شہر کو اس فتنہ سے نجات مل جائے گی۔

شیخ نجدی :- کیا تم نے محمدؐ کی شیعہ زبان اور طلاق لسانی اور سحر بیانی نہیں دیکھی۔ اگر وہ یہاں سے یونہی سلامت نکل گیا تو یقین جانو کہ اس کے بہکانے میں اگر کوئی نہ کوئی قبیلہ عرب تمہارے خلاف اُٹھ آئے گا اور پھر تم اس کے خلاف کچھ نہ کر سکو گے۔

غرض اسی طرح تھوڑی دیر تک باہم گفتگو ہوتی رہی کسی نے کچھ رائے دی اور کسی نے کچھ نہ۔ آخر ابو جہل بن ہشام بولا :-

ابو جہل :- میری رائے تو یہ ہے کہ قریش کے ہر اک قبیلہ سے ایک ایک جوان چٹا جلتے اور ان کے ہاتھ میں تلواریں دے دی جاویں۔ پھر یہ لوگ ایک آدمی کی طرح اکٹھے ہو کر محمدؐ پر حملہ کریں اور اُسے قتل کر دیں۔ ایسا کرنے سے اس کا خون سب قائلِ قریش پر پھیل جائیگا۔ اور بنو عبد مناف کو اتنی جرأت ہوگئی کہ ساری قوم کے ساتھ لڑیں۔ پس لا محالہ ان کو اس خون کے بدلے میں دیت قبول کرنی ہوگی۔ سو وہ ہم دے دیں گے۔

شیخ نجدی :- رائے ہے تو بس اس شخص کی۔ باقی سب فضول باتیں ہیں۔ پس اگر کچھ کرنا ہے تو جویہ کہتا ہے وہ کرو۔

غرض اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا :-

قرآن شریف میں ان کے اس مشورہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے :

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْيَهُودُ أَوْ يَفْشُلُونَكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِمَّا كَرِهْتُمْ

”اور یاد کر جبکہ کفار تیرے متعلق منصوبے کرتے تھے تاکہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں۔ یا وطن سے نکال دیں۔ اور وہ اپنی طرف سے خوب پختہ منصوبے کا نڈھ ہے

تھے مگر اللہ نے بھی اپنی جگہ تدبیر کر لی تھی۔ اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔“

اور یہ لوگ مشورہ کر کے نکلے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون سے اپنے پلید ہاتھ رنگیں اور ادھر

اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ سے اپنے نبی کو ان کے اس بدرائے سے اطلاع دیدی اور اجازت عطا فرمائی کہ شرب کی طرف ہجرت کر جائیں اور انیوالی رات مکہ میں نہ گذاریں۔

یہ اطلاع پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے۔ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ صبح یا شام آپ ہمارے مکان پر حضرت ابو بکرؓ سے ملنے تشریف لایا کرتے تھے۔ اُس دن جو بے وقت آئے اور آئے بھی اس طرح کہ آپ نے اپنا سر ایک کپڑے سے ڈھانکا ہوا تھا۔ تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی خاص بات ہے۔ آپ جا بڑے لے کر گھر کے اندر داخل ہوئے اور فرمایا: اگر یہاں کوئی غیر شخص ہو تو اُسے ذرا باہر بھیج دیں۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! آپ ہی کے گھر کے لوگ ہیں“ فرمایا: ”مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے“ حضرت ابو بکرؓ جو دن رات اس خبر کے انتظار میں تھے۔ فوراً بولے اَللّٰهُمَّ يَا رَسُولَ اللّٰهِ۔ یعنی ”یا رسول اللہ! مجھے بھی ساتھ رکھنے کا؟“ ارشاد ہوا ”ہاں“ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں۔ میں نے اس وقت تک کسی شخص کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب دیکھا کہ جو نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہاں“ حضرت ابو بکرؓ کے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر انھوں نے آپ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں نے ہجرت کی تیاری میں دو اونٹنیاں بول کی پتیاں کھلا کھلا کر پال رکھی ہیں، ان میں سے ایک آپ قبول فرمادیں۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں، مگر قیمتاؤں گا۔ ابو بکرؓ نے ناچار قبول کیا اور ہجرت کی تیاری شروع ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم نے جلدی جلدی ضروری سامان تیار کیا اور کھانا تیار کر کے ایک چمڑے کے برتن میں بند کیا اور پھر میری بہن اسماءؓ نے اپنے نطاق یعنی کمر پر باندھنے والے پٹکے کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا کھانے کے برتن پر باندھ دیا اور ایک پانی کے برتن پر۔ اس سبب اُن کو ذَاتُ الْيَتَاقَيْنِ یعنی دو نطاقوں والی کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ حضرت ابو بکرؓ سے اسی رات مکہ سے نکل جانے اور غار ثور میں پناہ لینے کی قرار داد کر کے اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

آغازِ سفر، ہجرت اور قریش کا تعاقب رات کا تاریک وقت تھا اور ظالم قریش جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اپنے خونی ارادے کے ساتھ آپ کے مکان کے ارد گرد جمع ہو کر آپ کے مکان کا محاصرہ کر چکے تھے۔ اور انتظار تھا کہ صبح ہو یا آپ اپنے گھر سے نکلیں تو آپ پر ایک دم حملہ کر کے قتل کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بعض کفار کی امانتیں پڑی تھیں۔ کیونکہ باوجود شدید مخالفت کے اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ کے صدق و امانت

کی وجہ سے آپ کے پاس رکھوا دیا کرتے تھے۔ لہذا آپ نے حضرت علیؓ کو ان امانتوں کا حساب کتاب سمجھا دیا اور تاکید کی کہ بغیر امانتیں واپس کئے مکہ سے نہ نکلنا۔ اس کے بعد آپ نے ان سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ اور تسلی دی کہ انہیں خدا کے فضل سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ وہ لیٹ گئے۔ اور آپ نے اپنی چادر جو سرخ رنگ کی تھی اُن کے اوپر اڑھا دی۔ اس کے بعد آپ اللہ کا نام لے کر اپنے گھر سے نکلے اُس وقت محاصرہ میں آپ کے دروازے کے سامنے موجود تھے مگر چونکہ انہیں یہ خیال نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر اول شب میں ہی گھر سے نکل آئیں گے۔ وہ اُس وقت اس قدر غفلت میں تھے کہ آپ اُن کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے اُن کے درمیان سے نکل گئے اور اُن کو خبر تک نہ ہوئی۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموشی کے ساتھ مگر جلد جلد مکہ کی گلیوں میں سے گذر رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں آبادی سے باہر نکل گئے اور غارِ ثور کی راہ لی۔ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ پہلے سے تمام بات طے ہو چکی تھی وہ بھی راستہ میں مل گئے۔ غارِ ثور جو اسی واقعہ کی وجہ سے اسلام میں ایک مقدس یادگار سمجھی جاتی ہے۔ بتکے سے جانب جنوب یعنی مدینہ سے مختلف جانب تین میل کے فاصلہ پر ایک بنجر اور ویران پہاڑی کے اوپر خاصی بلندی پر واقع ہے اور اس کا راستہ بھی بہت دشوار گزار ہے وہاں پہنچ کر پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اندر گھس کر جگہ صاف کی اور پھر آپ بھی اندر تشریف لے گئے۔

دوسری طرف وہ قریش جو آپ کے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپ کے گھر کے اندر بھانک کر دیہکتے تھے، تو حضرت علیؓ کو آپ کی جگہ پر لیٹا دیکھ کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ لیکن صبح ہوتی تو انہیں علم ہوا کہ ان کا شکار اُن کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس پر وہ ادھر ادھر بھاگے۔ مکہ کی گلیوں میں صحابہ کے مکانات پر تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ اس غصہ میں انہوں نے حضرت علیؓ کو پکڑا اور کچھ مارا پیٹا۔ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر جا کر شور کیا۔ اور ان کی صاحبزادی کو ڈانٹا ڈپٹا مگر ان باتوں سے کب بڑبڑاتا تھا۔

آخر انھوں نے عام اعلان کیا کہ جو کوئی محمدؐ کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا، اس کو ایک سو اونٹ انعام دیئے جائیں گے، چنانچہ کئی لوگ انعام کی طمع میں مکہ کے چاروں طرف ادھر ادھر نکل گئے۔ خود رؤساء قریش بھی سراغ لیتے لیتے آپ کے پیچھے نکلے اور عین غارِ ثور کے منہ پر جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر اُن کے سراغ رساں نے کہا کہ ”بس سراغ اس سے آگے نہیں چلتا۔ اس لیے یا تو محمدؐ یہیں کہیں پاس ہی چھپا ہوا ہے۔ یا پھر آسمان پر اڑ گیا ہے۔“ کسی نے کہا: ”کوئی شخص فردا اس غار کے اندر جا کر بھی دیکھ آئے۔“ مگر ایک اور شخص بولا کہ ”واہ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ بھلا کوئی شخص اس غار میں جا کر چھپ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت



تاریک و تاریک خطرناک جگہ ہے اور ہم ہمیشہ سے اسے اسی طرح دیکھتے آئے ہیں یہ بھی روایت آتی ہے کہ غار کے مُنہ پر جو درخت تھا۔ اُس پر آپ کے اندر تشریف لے جانے کے بعد مکڑی نے جالاتن دیا تھا اور عین مُنہ کے سامنے کی شاخ پر ایک کبوتری نے گھونسل بنا کر انڈے دے دیئے تھے۔ یہ روایت تو کمزور ہے لیکن اگر ایسا ہوا ہو تو ہرگز تعجب کی بات نہیں۔ مکڑی بعض اوقات چند منٹ میں ایک وسیع جگہ پر جالاتن دیتی ہے۔ اور کبوتری کو بھی گھونسل تیار کرنے اور انڈے دینے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس لیے اگر خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کی حفاظت کے لیے ایسا تصرف فرمایا ہو تو ہرگز بعید نہیں ہے بلکہ اس وقت کے لحاظ سے ایسا ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ بہر حال قریش میں سے کوئی شخص آگے نہیں بڑھا اور یہیں سے سب لوگ واپس چلے گئے۔

روایت آتی ہے کہ قریش اس قدر قریب پہنچ گئے تھے کہ اُن کے پاؤں غار کے اندر سے نظر آتے تھے اور ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر مگر آہستہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! قریش اتنے قریب ہیں کہ اُن کے پاؤں نظر آ رہے ہیں۔ اور اگر وہ ذرا آگے ہو کر جھانکیں تو ہم کو دیکھ سکتے ہیں“ آپ نے فرمایا :-

لَا تَخْذَرْنَ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا۔

یعنی ”ہرگز کوئی فکر نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

پھر فرمایا :-

وَمَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِإِثْنَيْنِ أَلَلَّهُ ثَالِثُهُمَا۔

یعنی ”اے ابوبکر! تم ان دو شخصوں کے متعلق کیا گمان کرتے ہو جنکے ساتھ تیسرا خدا ہے۔“

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جب قریش غار کے مُنہ کے پاس پہنچے، تو حضرت ابوبکرؓ سخت گھبرا گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ کو دیکھا تو تسلی دی کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے رقت بھری آواز میں کہا :

إِنْ قُتِلْتُ فَأَنَا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَإِنْ قُتِلْتَ أَنْتَ هَكَكَتِ الْأُمَّةُ۔

یعنی ”یا رسول اللہ! اگر میں مارا جاؤں تو میں تو بس ایک ایسی جان ہوں لیکن اگر

خدا نخواستہ آپ پر کوئی آپرچ آئے تو پھر تو گویا ساری امت کی امت مٹ گئی۔“

اس پر آپ نے خدا سے الہام پاکر یہ الفاظ فرمائے کہ :

”لَا تَخْزَنَ إِنَّا اللَّهُ مَعَنَا“ (سورۃ توبہ: ۴۰)

یعنی ”اے ابوبکر! ہرگز کوئی فکرنہ کرے کہ کیونکہ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم دونوں اس کی حفاظت میں ہیں“ یعنی تم تو میری وجہ سے نکر مند ہو اور تمہیں اپنے جوش اخلاص میں اپنی جان کا کوئی غم نہیں مگر خدا قتلے اس وقت نہ صرف میرا محافظ ہے بلکہ تمہارا بھی۔ اور وہ ہم دونوں کو دشمن کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

**سفر، ہجرت اور تعاقب سراقہ بن مالک**  
حضرت ابوبکرؓ نے گھر سے نکلے ہوئے اپنے بیٹے عبداللہ کو جو ایک بہت زیرک اور ہوشیار نوجوان تھے۔

ہدایت کی تھی کہ قریش کی حرکات کا خیال رکھیں اور روزانہ غارِ ثور میں اطلاع دے جایا کریں۔ چنانچہ وہ ایسا کرتے تھے کہ رات کو اندھیرا ہوتے ہی غارِ ثور میں پہنچ جایا کرتے تھے اور رات وہیں گزار کر صبح سویرے ہی واپس آ جایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے خادم عامر بن فہیرہ کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ دن بھر بکریاں چرائیں اور رات کو ان کے پاس دودھ پہنچا جایا کریں۔ اس طرح آپ تین رات تک غارِ ثور میں ٹھہرے اور اس عرصہ تک یہی انتظام جاری رہا۔ پھر جب قریش کے تعاقب کی کوشش میں کمی آگئی تو تیسرے دن صبح کے وقت آپ غار سے نکلے۔ یہ پیر کا دن تھا اور چار ربیع الاول یا بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق یکم ربیع الاول سنہ نبوی مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کی تاریخ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے پہلے سے ایک شخص عبداللہ بن اریقظہ کو جو قبیلہ بنی الدیل سے تھا اور باوجود عاص بن دائل رئیس مکہ کے ساتھ تعلق رکھنے کے قابل اعتماد تھا۔ معقول اجرت دینی کر کے بطور رہنما کے ساتھ چلنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ یہ شخص اپنے فن کا خوب ماہر تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے پہلے سے اپنی اُونٹنیاں سپرد کر رکھی تھیں اور سمجھا رکھا تھا کہ تین رات کے بعد تیسرے دن کی صبح کو اُونٹنیاں لے کر غارِ ثور میں پہنچ جائے۔ چنانچہ وہ حسبِ قرار داد پہنچ گیا۔ یہ بخاری کی مشہور روایت ہے مگر مورخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام جو قرآن شریف میں بھی مذکور ہے ایک خاص شانِ کلام ہے اور اس میں آپ کی اس ارفع شان کا پتہ چلتا ہے جو حضرت موسیٰ پر آپ کو حاصل تھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے تو فرعون کے تعاقب کے وقت اپنی قوم کے گھبراہٹ پر صر یہ لفظ کہے کہ ”إِنَّمَا رَبِّي سَيَهْدِي“ یعنی میرے ساتھ میرا خدا ہے وہ میرے لیے بچاؤ کا راستہ نکال دے گا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”إِنَّا اللَّهُ مَعَنَا“ کے الفاظ استعمال فرمائے۔ یعنی ”میرے اور میرے ساتھی دونوں کے ساتھ خدا ہے“ آپ کے اس جملہ پر مقابلہ نظر ڈالنے سے آپ کے برتر اخلاق اور آپ کے صحابہ کے اعلیٰ مقام اور آپ کے ساتھ خدا تعالیٰ کے بہتر سلوک پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ بخاری باب الہجرت

۲۔ بخاری باب الہجرت

۳۔ بخاری باب الہجرت

رات کو روانہ ہوئے تھے اور خود بخاری کی ہی ایک دوسری روایت میں اس کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ آپ رات کو روانہ ہوئے ہوں۔ بہر حال غار ثور سے نکل کر آپ ایک اونٹنی پر جس کا نام بعض روایات میں الْقَصْدُ بیان ہوا ہے، سوار ہو گئے اور دوسری پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کا خادم عامر بن نبیرہ سوار ہوئے۔ رات روانہ ہوتے ہوئے آپ نے مکہ کی طرف آخری نظر ڈالی اور حسرت کے الفاظ میں فرمایا: اے مکہ کی بستی! تو مجھے سب جگہوں سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے۔ اب یہ منور ہلاک ہوں گے۔ چونکہ ابھی تک تعاقب کا ڈر تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اصل راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کے قریب قریب یثرب کی طرف روانہ ہوئے اور برابر ایک رات اور دوسرے دن کا کچھ جھٹہ چلتے رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب جب سورج کی گرمی تیز ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے عرض کرنے پر آپ ایک بڑے پتھر کے سایہ میں آرام فرمانے کے لیے اترے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر آپ کے واسطے جگہ تیار کی اور آپ ذرا لیٹ کر سو گئے۔ اور حضرت ابوبکرؓ ادھر ادھر نظر دوڑا کر دیکھنے لگے کہ کوئی تعاقب کرنے والا تو نہیں آ رہا۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ کو ایک چروانا نظر آیا جس کے ساتھ چند بکریاں تھیں۔ جنھیں وہ اُسی پتھر کی طرف سایہ کی غرض سے لارہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے دودھ کی اجازت لے کر اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب اچھی طرح صاف کر دئے اور پھر اسے دودھ دہنے کو کہا۔ چنانچہ اس نے ایک برتن میں دودھ دیا۔ اور پھر حضرت ابوبکرؓ اسے پانی میں ٹھنڈا کر کے آپ کے پاس لائے۔ اس وقت تک آپ نیند سے جاگ چکے تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے سامنے دودھ کا برتن پیش کیا اور آپ نے اُسے نوش فرمایا۔ اور حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ اس سے میری طبیعت خوش ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے عرض کیا ”یا رسول اللہ کوچ کا وقت ہو گیا ہے“ آپ نے فرمایا: ”ہاں چلو!“

چنانچہ آپ آگے روانہ ہو گئے۔ لیکن ابھی آپ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ ایک شخص گھوڑا دوڑاتے ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر کہا: ”یا رسول اللہ! کوئی شخص ہمارے تعاقب میں آ رہا ہے“ آپ نے فرمایا: ”کوئی فکر نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

۱۔ بخاری باب الهجرة عن براء بن عازب ۲۔ حمیس ذرقانی ۳۔

۴۔ مسند احمد و ترمذی بحوالہ ذرقانی ۵۔ ترمذی و نسائی بحوالہ ذرقانی کتاب المغازی ۶۔

۷۔ بخاری باب المهاجرین ۸۔

یہ تعاقب کرنے والا سرفروہ بن مالک تھا جو اپنے تعاقب کا قصہ خود اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل گئے تو کفار قریش نے یہ اعلان کیا کہ جو کوئی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوبکرؓ کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا اسے اس قدر انعام دیا جائے گا اور اس اعلان کی انہوں نے اپنے پیغام رسالوں کے ذریعہ سے ہمیں بھی اطلاع دی۔ اس کے بعد ایک دن میں اپنی قوم بنو مدلیج کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ قریش کے ان آدمیوں میں سے ایک شخص ہمارے پاس آیا اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ میں نے ابھی ابھی ساحل سمندر کی سمت میں دُور سے کچھ شکلیں دیکھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی ہوں گے۔ سراقہ کہتا ہے کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ضرور وہی ہوں گے مگر میں نے اُسے ٹالنے کے لیے (اور یہ فخر خود حاصل کرنے کی غرض سے) کہا کہ یہ تو فلاں فلاں لوگ ہیں جو ابھی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں اس مجلس سے اٹھا اور اپنے گھر آکر اپنی خادمہ سے کہا کہ میرا گھوڑا تیار کر کے گھر کے پھوڑے میں کھڑا کر دے اور پھر میں نے ایک نیزہ لیا اور گھر کی پشت کی طرف سے ہو کر چپکے سے نکل گیا اور گھوڑے کو تیز کر کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں زمین پر گر گیا، لیکن میں جلدی سے اٹھا اور اپنا ترکش نکال کر میں نے ملک کے دستور کے مطابق تیروں سے فال لی۔ فال میرے منشاء کے خلاف نکلی مگر (اسلام کی عداوت کا جوش اور انعام کا لالچ تھا) میں نے فال کی پرواہ نہ کی۔ اور پھر سوار ہو کر تعاقب میں ہو گیا اور اس دفعہ اس قدر قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (جو اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کرنے جا رہے تھے) قرأت کی آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک دفعہ بھی منہ موڑ کر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر ابوبکرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر کی وجہ سے) بار بار دیکھتے تھے۔ میں جب ذرا آگے بڑھا تو میرے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی اور اس دفعہ اس کے پاؤں ریت کے اندر دھنس گئے اور میں پھر زمین پر آ رہا۔ میں نے اٹھ کر گھوڑے کو جو دیکھا تو اس کے پاؤں زمین میں اس قدر دھنس چکے تھے کہ وہ انہیں زمین سے نکال نہیں سکتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ اٹھا اور اس کی اس کوشش سے میرے ارد گرد سب غبار ہی غبار ہو گیا۔ اس وقت میں نے پھر فال لی اور پھر وہی فال نکلی۔ جس پر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو صلح کی آواز دی۔ اس آواز پر وہ ٹھہر گئے اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا۔ اس سرگزشت کی وجہ سے جو میرے ساتھ گذری تھی میں نے یہ سمجھا کہ اس شخص کا ستارہ اقبال پر ہے اور یہ کہ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب

رہیں گے؛ چنانچہ میں نے صلح کے رنگ میں ان سے کہا کہ آپ کی قوم نے آپ کو قتل کرنے یا کپڑا لانے کے لیے اس قدر انعام مقرر کر رکھا ہے اور لوگ آپ کے متعلق یہ یہ ارادہ رکھتے ہیں اور میں بھی اسی ارادے سے آیا تھا مگر اب میں واپس جاتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے انہیں کچھ زادِ راہ پیش کیا مگر انہوں نے نہیں لیا اور نہ ہی مجھ سے کوئی اور سوال کیا۔ صرف اس قدر کہا کہ ہمارے شعل کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اس کے بعد میں نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ کسی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک میں غلبہ حاصل ہو کر رہے گا، آپ سے عرض کیا کہ مجھے ایک امن کی تحریر لکھ دیں۔ جس پر آپ نے عامر بن فہیرہ کو ارشاد فرمایا اور اُس نے مجھے ایک چمڑے کے ٹکڑے پر امن کی تحریر لکھ دی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی آگے روانہ ہو گئے۔

جب سراقہ واپس لوٹنے لگا۔ تو آپ نے اُسے فرمایا: سراقہ اُس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے؟ سراقہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ ”کسریٰ بن ہرمز شہنشاہِ ایران؟“ آپ نے فرمایا: ”ہاں“۔ سراقہ کی آنکھیں کھل کی کھل رہ گئیں۔ کہاں عرب کے صحرا کا ایک بدوی اور کہاں کسریٰ شہنشاہِ ایران کے کنگن! مگر قدرِ ستِ حق کا تماشا دیکھو کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا خزانہ غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو کسریٰ کے کنگن بھی غنیمت کے مال کے ساتھ مدینہ میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے سراقہ کو بلایا جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو چکا تھا۔ اور اپنے سامنے اس کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن جو بیش قیمت جواہراتِ لدے ہوئے تھے پہنائے۔

سراقہ کے تعاقب سے رہائی ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔ راستہ میں زبیر بن العوامؓ سے ملاقات ہو گئی جو شام سے تجارت کر کے مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ مکہ کو واپس جا رہے تھے۔ زبیر نے ایک جوڑا سفید کپڑوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک حضرت ابوبکرؓ کی نذر کیا۔ اور کہا۔ میں بھی مکہ سے ہو کر بہت جلد آپ سے مدینہ میں آملوں گا۔ اور بھی کئی لوگ راستہ میں ملتے تھے اور چونکہ حضرت ابوبکرؓ بوجہ تجارت پیشہ ہونے کے اس راستہ سے بار بار آتے جاتے رہتے تھے اس لیے اکثر لوگ ان کو پہچانتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانتے تھے لہذا وہ ابوبکرؓ سے پوچھتے تھے کہ یہ ہمارے آگے آگے کون ہے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے۔ ”ہاں! یٰٰہْدِیْنِی السَّبِيلَ“ یہ میرا ہادی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ کوئی دلیل یعنی گائیڈ ہے جو راستہ دکھانے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے ساتھ لے لیا ہے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کا مطلب کچھ اور ہوتا تھا۔

۱۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایسے نازک ادبے مرموسانی کے وقت میں بھی لکھنے کا سامان ساتھ ہوتا تھا۔ ۲۔ بخاری بابِ الهجرة ۳۔ یہ نظارہ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت کشفِ حالت میں دکھایا گیا ہوگا۔ ۴۔ اسے اس الفبا پر ذکرِ سراقہ مشہور ہے۔ بخاری بابِ الهجرة ۵۔



## اختتام سفر اور تکمیل ہجرت

آٹھ روز کے سفر کے بعد راستہ میں مختلف جگہ ٹھہرتے ہوئے بارہ ربیع الاول ۳۱ھ نبوی مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو آپ مدینہ کے پاس پہنچے۔ اہل یثرب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مگر سے واپسی کے متعلق خبر پہنچ چکی تھی، اس لیے وہ ہر روز مدینہ سے باہر آپ کے استقبال کے لیے آتے اور دیر دیر تک انتظار کرتے رہتے تھے، مگر جب دھوپ تیز ہونے لگتی تھی تو مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتے تھے۔ اُس دن بھی وہ آپ کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے، مگر چونکہ دن بہت چڑھ آیا تھا اس لیے آج بھی مایوس ہو کر واپس چلے گئے تھے کہ اچانک جبکہ وہ ابھی اپنے گھروں میں پہنچے ہی تھے ایک یہودی نے جو اپنی گڑھی میں ایک بلند مقام پر کسی اپنی غرض سے کھڑا تھا۔ دُور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو سفید لباس میں چمکتے ہوئے دیکھا اور دُور سے پکار کر کہا: اے اہل عرب! جس کا تم راہ دیکھتے ہو وہ یہ آتا ہے یہ مخلص جماعت کے کان میں یہ آواز پہنچی اور مسلمان خوشی کے جوش میں دیوانے ہو کر آٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی جلدی ہتھیار سنبھال کر دوڑتے بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے۔

۱۔ زرقانی و محمود پاشا مصری..... بعض محققین کی تحقیق کے مطابق آٹھ ربیع الاول تاریخ تھی،

۲۔ عربوں میں ہتھیار لگا کر کسی کے استقبال کے لیے نکلنا اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ استقبال کرنے والا اپنے

مہمان کے لیے جان تک قربان کر دینے کے لیے تیار ہے :

# مکی زندگی پر ایک سرسری نظر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پہلے دور یعنی قبل از بعثت زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے جو قلت واقعات کی شکایت ہم نے بیان کی تھی وہ آپ کی زندگی کے دوسرے دور میں بھی پوری طرح دُور نہیں ہوئی۔ یہ دُرست ہے کہ ماموریت کے دعویٰ کے بعد ایسے لوگ موجود تھے جن کے واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک نمونہ کا حکم رکھتی تھی۔ اور جو آپ کی تمام حرکات و سکنات کو غور کی نظر سے مطالعہ کرتے تھے اور ہر وقت آپ کی صحبت میں رہنے کے خواہشمند تھے مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قریش کے مظالم نے مکہ میں مسلمانوں کو کبھی بھی اکٹھا نہیں ہونے دیا اور کبھی بھی ان کو اتنی فرصت اور موقعہ نہیں دیا کہ وہ اپنے آقا کی صحبت میں رہ کر اس کی زندگی کے تمام حالات کو آنے والی نسلوں کے لیے بالتفصیل محفوظ کر دیں۔ بائیں ہمہ بعثت سے قبل اور بعد کی زندگی کے حالات میں ایک بہت نمایاں فرق نظر آتا ہے اور الشارفہ تعالیٰ مدنی زندگی کے حالات میں یہ فرق بہت ہی نمایاں ہو جائے گا۔ کیونکہ مدینہ میں صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے اور آپ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کا ہر وقت موقعہ ملتا تھا اور انہوں نے بھی جس تفصیل اور بسط کے ساتھ اس زمانہ کے متعلق آپ کے سوانح کو ہم تک پہنچایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ دُنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انبیاء گزرے ہوں گے مگر جس تفصیل اور بسط کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تاریخ و حدیث میں محفوظ ہیں اس کا عشرِ عشر بھی کسی دوسرے نبی کے متعلق میسر نہیں۔ خدا ہزار ہزار رحمتیں نازل فرمائے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعت پر جس کے فضل آج بھی جبکہ ساڑھے تیرہ سو سال کا عرصہ آپ کی وفات پر گزر چکا ہے آپ کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور ہم اپنی زندگی کے ہر قدم پر آپ کے پاک نمونہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

قیام مکہ اور مین نبوی و ہجری

بعثت کے بعد آنحضرت ﷺ مکہ میں قریباً تیرہ سال ٹھہرے بعض روایات میں دس سال بیان کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک لحاظ سے دُرست ہے کیونکہ ابتداءِ وحی کے بعد آپ نے تین سال تک اپنے مشن کو مخفی رکھا تھا۔ پس اگر ان

تین سالوں کو نکال دیں تو باقی دس سال ہی رہ جاتے ہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ ہجرت کے وقت آپؐ کی عمر تیرپن سال کی تھی۔

ظہور اسلام سے پہلے قریش میں سنہ تاریخ عموماً عام الفیل کے حساب سے شمار ہوتا تھا؛ چنانچہ مؤرخین بھی بعثت نبوی سے پہلے کے واقعات کی تاریخ بتانے کے لیے عموماً عام الفیل کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن بعثت سے بعد کے واقعات کا سنہ بعثت نبوی سے شمار کیا جاتا ہے مگر یہ سنہ بھی صرف تیرہ سال یعنی ہجرت تک چلتا ہے۔ اس کے بعد سے مستقل طور پر سنہ ہجری شروع ہوتا ہے۔ جس کی تجویز اور تعیین ابتداء حضرت عمرؓ کے عہد میں ہوئی تھی۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بعثت نبوی عام الفیل کے چالیسویں سال ماہ رمضان میں ہوئی تھی اور چونکہ رمضان عربی مہینوں میں نواں مہینہ ہے اس لیے بعثت نبوی کا پہلا سال صرف چند ایام اور تین ماہ یعنی بقیہ رمضان اور شوال۔ ذیقعد اور ذی الحجہ کا شمار ہوتا ہے اور چونکہ ہجرت نبوی سنہ ۱۲ ابتداء ماہ ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد از بعثت مکی قیام دراصل صرف بارہ سال پانچ ماہ اور چند ایام کا بنتا ہے۔ ہاں اگر رویائے صالحہ کا زمانہ یعنی ابتدائی چند ماہ بھی زمانہ نبوت میں شمار کر لیے جاویں تو یہ کل عرصہ قریباً تیرہ سال کا ہو جاتا ہے۔

**نزول وحی کی کیفیت** کلام الہی کے نزول کی کیفیت اور اس کے نزول کے وقت متشکل غیثہ کے قلب کی حالت کو حقیقی طور پر سمجھنا تو صرف اسی شخص کا کام ہے جو اس کو چہ سے آشنا ہوتا ہے۔ جو اجمال نقشہ قرآن شریف اور حدیث میں بیان ہوا ہے۔ وہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِي بِلَاذِنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ هَلَّا حَكِيمٌ ۝ ۳

یعنی ”نہیں کلام کرتا اللہ کسی بندے سے مگر وحی کے طریق پر یا کسی پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو القاء کرتا ہے بندہ پر اللہ کے اذن سے بیشک اللہ تعالیٰ بہت بلند اور حکمت والا ہے“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کلام الہی کے تین طریق بتائے ہیں:

اول۔ وحی یعنی براہ راست لفظی کلام۔ جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی الفاظ براہ راست انسان کے کانوں میں پہنچیں۔  
وحی کی یہ صورت عموماً سب سے زیادہ باارعب اور شاندار ہوتی ہے۔

(ب) یہ کہ اس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی الفاظ جاری کیے جائیں ان دونوں طریقوں کو اسلامی اصطلاح میں وحی کہتے ہیں۔

دوسرے۔ مِنْ ذَرَّآئِ حِجَابٍ یعنی کسی تحریر کے سامنے آجانے یا کشف یا خواب یا قلبی افکار وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر بندہ پر ظاہر ہو۔

تیسرے۔ یُرْسِلَ رُسُلًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی فرشتہ وغیرہ بندہ کے پاس آوے اور خدا کی طرف سے اس کے ساتھ کلام کرے۔

اسی کے مطابق حدیث میں حضرت عائشہ کی روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ :

أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ مَلَصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَلَيَّ فَيَفْصِدُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِي الْمَلِكُ رَجُلًا فَيَكَلِّمُنِي فَأَعْبَى مَا يَقُولُ ۖ

یعنی کبھی تو میرے پاس وحی آتی ہے گھنٹی کی چھنکار کی طرح (تاکہ ٹیلیفون کی طرح پہلے الارم بجاکر ہوشیار اور متوجہ کیا جائے) اور یہ طرز وحی کی (بوجہ خدائی کلام کی براہ راست مابل ہونے کے) مجھ پر سخت ترین ہوتی ہے۔ پھر بعد اس کے کہ میں اس کا کلام خوب محفوظ کر چکا ہوتا ہوں یہ آواز مجھ سے جدا ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کوئی فرشتہ میرے پاس انسان کی صورت اختیار کر کے آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ سو میں اس کی بات کو بھی محفوظ کر لیتا ہوں ۖ

اس حدیث میں مِنْ ذَرَّآئِ حِجَابٍ والی صورت نہیں بیان کی گئی جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صورت جو رُیاء وغیرہ سے تعلق رکھتی ہے ایک نسبتاً عام صورت ہے اور اکثر لوگ علی قدر مراتب اس کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں بمقابلہ باقی دو صورتوں کے جن کا حلقہ صرف رسولوں اور خاص خاص لوگوں تک محدود ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام الہی کی بڑی اقسام تین ہیں مگر یہ کہ یہ تینوں قسمیں پھر

آگے بہت سی ماتحت اقسام میں منقسم ہیں جن کا موٹا نقشہ حسب ذیل صورت میں سمجھا جاسکتا ہے :-  
 (الف) کلام بصورت وحی یعنی براہ راست لفظی کلام جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔  
 (ب) کلام الہی کا براہ راست انسانی کانوں تک پہنچنا جو کئی طریق پر ہو سکتا ہے۔  
 (ج) خدائی تصرف کے ماتحت خود انسان کی زبان پر کوئی کلام جاری ہونا۔ یہ ہر دو صورتیں یقیناً اور نوم ہر دو حالتوں میں ممکن ہیں۔

دوم۔ کلام بواسطہ ارسالِ رسل یعنی خدا کی طرف کوئی فرشتہ وغیرہ انسان کے سامنے نمودار ہو کر اس کے ساتھ خدائی منشاء کے ماتحت کلام کرے۔ یہ بھی کئی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اور یقیناً اور نوم ہر دو حالتوں میں ممکن ہے۔

سوم۔ کلام پس پردہ۔ یعنی نہ تو خدا کا براہ راست کلام ہو اور نہ ہی کسی فرشتہ کا براہ راست واسطہ اختیار کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کسی پردے کے پیچھے رہ کر کسی رنگ میں اپنے منشاء کا اظہار فرمادے۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً

(الف) کشف یعنی عین بیداری یا نیم بیداری میں خدائی تصرف کے ماتحت کوئی نقشہ دکھایا جانا۔ خواہ وہ نقشہ اصل حالت کا منظر ہو یا قابلِ تعبیر ہو۔ یہ حالت یقیناً کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور جو اس ظاہری کے تعطل اور عدم تعطل ہر دو حالتوں میں ممکن ہے یعنی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری جو اس بھی کام کر رہے ہوتے ہیں اور اسی حالت میں باطنی جو اس میں ایک بیداری پیدا ہو کر کوئی نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایک آن واحد کے لیے ظاہری جو اس معطل ہو کر جو اس باطنی کو جگہ دے دیتے ہیں۔

(ب) رویا یا خواب جس کی کیفیت سے اکثر لوگ واقف ہیں جو نیند کی حالت میں دکھائی جاتی ہے اور بالعموم تعبیر طلب ہوتی ہے۔

(ج) کسی تحریر کا آنکھوں کے سامنے پھر جانا جو یقیناً اور نوم ہر دو حالتوں میں ممکن ہے۔

مندرجہ بالا صورتوں کے علاوہ ایک وحی خفی بھی ہوتی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات انسان کے دل میں ڈالا جانا۔ مگر اس کا پہچانا خاص مشق چاہتا ہے۔

یہ صرف ایک موٹا اور سرسری نقشہ ہے ورنہ درحقیقت کلام الہی کی صورتیں بہت ہیں اور بسا اوقات ایک سے زیادہ قیام ایک ہی وقت میں جمع بھی ہو جاتی ہیں۔

نزولِ وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حالت ہوتی تھی اس کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی



لَقَدْ رَأَيْتُهُ يُنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَنْفِصُهُ  
عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَمِّدُ غَرَقًا

”یعنی میں نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات سخت سردی کا دن ہوتا تھا، لیکن جب آپ پر  
وحی اُترتی تھی تو پسینہ آپ کی پیشانی سے پھوٹ پھوٹ کر بہتا تھا“

پھر زید بن ثابت جو آپ کے کاتب وحی تھے روایت کرتے ہیں کہ :

أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَخَذُوهُ عَلَيَّ فَخَذِي فَتَقَلَّتْ  
عَلَيَّ حَتَّى خِفْتُ أَنْ قَرَضَ فَخَذِي ثُمَّ سَرَى عَنْهُ

”یعنی ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران میری ران پر تھی کہ آپ پر وحی کی حالت طاری  
ہوئی اس وقت آپ کی ران مجھے اس قدر بو بھل محسوس ہوتی تھی کہ میں ڈر گیا کہ کہیں میری ران بوجھ  
سے ٹوٹ نہ جاوے۔ پھر اس کے بعد آپ کی یہ حالت جاتی رہی“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت چونکہ روحانی حسیں بیدار ہو کر بہت تیز ہو جاتی ہیں۔  
اس لیے عموماً انسان کی جسمانی طاقت معطل ہو جاتی ہے اور جسم مردہ کی طرح بے سہارا ہو کر گر جاتا ہے۔

اس جگہ اس شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے جو بعض نادان واقف اور سادہ مزاج لوگوں کے دل میں پیدا ہوا  
کرتا ہے کہ خدا بولتا کس طرح ہے؟ یعنی کیا خدا کی کوئی زبان ہے جس سے وہ کلام کرتا ہے؟ اس کے متعلق یاد  
رکھنا چاہیے کہ ہر ہستی کے حالات اور صفات کے مطابق اس کی طاقتوں کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ  
کی ہستی چونکہ نہایت لطیف اور غیر مادی اور غیر محدود اور دواء الوداء ہستی ہے اس لیے انسان کے حالات  
پر جو مادی بھی ہے اور مخلوق بھی اور محدود بھی اس کا قیاس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس یہ ایک انتہائی درجہ جہالت  
کا خیال ہو گا۔ اگر یہ سمجھا جاوے کہ چونکہ انسان کو کلام کرنے کے لیے ایک گوشت کے ٹوٹھڑے کی ضرورت  
ہے اس لیے خدا کی بھی کوئی ایسی زبان ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا اپنی دوسری لا تعداد  
طاقتوں کو کام میں لاتا ہے۔ اسی طرح وہ بولتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری زبان کے۔ اور سنتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری  
کانوں کے۔ اور دیکھتا بھی ہے مگر بغیر ظاہری آنکھوں کے۔ بے شک اس کی ہستی کو محسوس کرنا انسانی  
عقل سے بالا نہیں مگر اس کی ہستی کی کنہہ کو سمجھنا یقیناً عقل انسانی سے بالا درجہ ہے۔ ایک گراموفون کو ہی  
دیکھو۔ کیا انسان کی طرح اس کی بھی کوئی زبان ہے جس سے وہ بولتا ہے؟ پس جب مخلوق اور ادنیٰ چیزوں میں

اس قدر اختلاف موجود ہے تو خدا جیسی خالق و مالک۔ اول و آخر۔ ازلی وابدی لطیف و غیر محدود قادر مطلق ہستی کو انسان پر قیاس کرنا کس قدر جہالت کا فعل ہوگا۔

## جمع قرآن

جمع قرآن کے متعلق اصل بحث تو کتاب کے حصہ دوم میں آنے لگی مگر اس جگہ ایک مختصر نوٹ میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن شریف جو ہم مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے اور جسے ہم اللہ کا کلام سمجھتے ہیں جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ایک نکتہ نازل نہیں ہوا، بلکہ آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوا تھا اور اس تدریجی نزول میں کسی حکمتیں ہیں۔ جن کے بیان کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ جو سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں وہ مکی سورتیں کہلاتی ہیں اور بعد کی مدنی۔ قرآن شریف کا جو جو حصہ نازل ہوتا جاتا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو سنا دیتے تھے۔ اور بعض کو یاد کروا دیتے تھے اور اس کے مختلف نسخے لکھا بھی دیتے تھے۔ جس کے لیے آپؐ نے اپنے خواندہ صحابیوں میں سے متعدد کا تب وحی مقرر کیے ہوئے تھے چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب زمانہ جاہلیت میں حضرت عمرؓ غصہ کی حالت میں اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کے پاس لکھا ہوا قرآن شریف موجود تھا جس پر سے خطاب بن اللات تلاوت کر کے حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو سنا رہے تھے۔

قرآنی سورتیں قرآن شریف میں اسی ترتیب سے نہیں رکھی گئیں جس ترتیب سے ان کا نزول ہوا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود الہی حکم کے ماتحت اُن کی ایک خاص ترتیب مقرر فرمادی۔ چنانچہ ہر سورۃ کے ختم ہونے پر آپؐ ہایت فرماتے تھے کہ اے فلاں سورۃ میں فلاں جگہ ڈالو۔ جو ترتیب قرآنی آیات اور سورتوں کی آپؐ نے خدائی تقسیم کے ماتحت مقرر فرمائی وہی اب تک موجود ہے اور غور و تدبر کرنے والوں پر اس ترتیب کی خوبی محض نہیں رہ سکتی۔

## مکی سورتیں

چونکہ مکہ میں نزول شریعت کی ابتداء تھی اس لیے زیادہ تر عقائد کی اصولی باتوں پر ہی اکتفا کر گئی ہے۔ ویسے بھی چونکہ مکہ میں صرف مشرکین اور بت پرست رہتے تھے اس لیے مکی آیات میں زیادہ تر شرک اور بت پرستی ہی کی تردید کی گئی ہے اور ہستی باری تعالیٰ اور توحید کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ رسالت کی حقانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت اور اس پر کفار کے اعتراضوں کے جوابات اور گذشتہ انبیاء کے حالات مذکور ہیں۔ پھر ملائکہ کے وجود۔ قیامت۔ جزا و سزا۔ جنت و دوزخ۔ تقدیر وغیرہ کے مسائل پر دلچسپ بحثیں ہیں۔

اس کے علاوہ جاہلانہ رسوم اور بدعات سے روکا گیا ہے اور نیک عادات و اخلاقِ حسنہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور پھر اس سے اعلیٰ مقام یعنی عرفانِ الہی کی راہوں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے طریقوں کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔

عبادات میں مکی سورتیں سوائے نماز کے حکم کے باقی سب احکام سے خالی ہیں؛ چنانچہ حج، روزہ، زکوٰۃ کا کہیں ذکر نہیں آتا، کیونکہ یہ سب مدینہ میں فرض ہوئے تھے۔ جہاد بالسیف کا ذکر بھی مکی آیات میں نہیں ملتا، کیونکہ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غزو کا حکم تھا اور کفار پر تمام حجت کیا جا رہا تھا۔ پھر جب تمام حجت ہو چکا اور کفار اپنے مظالم سے باز نہ آئے بلکہ دن بدن ترقی کرتے گئے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کو اپنے وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ اور پھر ہجرت کے بعد بھی قریش نے مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا تب جا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاد بالسیف کی اجازت نازل ہوئی۔

اسی طرح چونکہ مکہ میں اسلامی سوسائٹی کی بالکل ابتدائی حالت تھی بلکہ حق تو یہ ہے کہ مکہ میں کوئی اسلامی سوسائٹی تھی ہی نہیں کیونکہ قریش کے بیدردانہ مظالم نے سب کو منتشر کر رکھا تھا اس لیے مکی سورتوں میں تمدنی احکام بھی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح سیاسی احکام بھی مکی سورتوں میں مفقود ہیں۔ گویا فقہی مسائل سے مکی سورتیں قریباً قریباً خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکی سورتیں عام طور پر بہت چھوٹی ہیں۔ اور ان کی زبان بھی زیادہ زوردار۔ جوش والی اور موزوں ہے بمقابلہ مدنی سورتوں کے جن میں احکام کی کثرت اور فقہی مسائل کی پیچیدگیوں کی وجہ سے طرزِ بیان میں مناسب تبدیلی آگئی ہے اور یہ تبدیلی نہایت موزوں اور بر محل ہے کیونکہ بلاغت اسی میں ہے کہ طرزِ کلام واقعات کے مناسب حال ہو۔

**ارتقاءِ نبوی** مسئلہ ارتقاء یعنی درجہ بدرجہ ترقی کرنا ایک ستم مسئلہ ہے اور گو اس کی وہ صورت جو اہل مغرب پیش کرتے ہیں درست نہ ہو مگر جہاں تک اصول کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ دن بدن اس کی حقانیت پر زیادہ سے زیادہ روشنی پڑتی جا رہی ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے خود اس مسئلہ کو قرآن شریف میں متعدد موقعوں پر بیان کیا ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی ہے اور انسانی پیدائش کے بیان میں تو خلقِ آدم کے ارتقائی مراحل بھی صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں میں تدبیر بھی ترقی کا اصول نمایاں طور پر کام کرتا نظر آتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہی اصول انبیاء علیہم السلام کے حالاتِ زندگی میں پایا جاتا ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انبیاء کا وجود کسی فوری انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے وہ بالکل غلط سمجھا ہے اور اس نے نبوت کی حقیقت پر بالکل غور نہیں کیا۔ کیونکہ جس طرح صحیفہ قدرت پر ہر اک چیز تدبیرِ باری تعالیٰ سے اسی طرح انبیاء بھی اپنی نبوت

میں تدریجاً نشوونما پاتے ہیں اور قطعاً کبھی فوری انقلاب کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ کئی درمیانی حالتوں میں سے گزرنے کے بعد اُس آخری مقام کو حاصل کرتے ہیں جس پر ان کے مراتب سلوک ختم ہوتے ہیں۔ تمام انبیاء جس طرح جسمانی لحاظ سے مراحل خلق میں سے گزرتے ہوئے پیدا ہوئے پھر انھوں نے اپنے بچپن کے دن گزارے۔ پھر وہ نوجوان ہوئے اور پھر اپنی بچگی کو پہنچے۔ اسی طرح روحانی لحاظ سے بھی وہ پہلے پیدا ہوتے ہیں اور پھر درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ اپنی بچگی کو پہنچتے ہیں۔ اور پھر مقام نبوت میں بھی وہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتے بلکہ دن بدن شاہراہ ترقی پر آگے قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تدریجی نشوونما قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے اور فوری انقلاب کے بد اثرات سے محفوظ رکھتا ہے نیز اور بھی کئی طرح سے مفید بلکہ ضروری ہوتا ہے مگر اس جگہ اس مسئلہ کی تفصیلات کی گنجائش نہیں اس جگہ ہم مختصر طور پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی میں یہ تدریجی نشوونما کس طریق پر کام کرتا نظر آتا ہے۔ اختصار کی غرض سے ہم آپ کی ابتدائی زندگی سے قطع نظر کر کے صرف دعویٰ اور اس کے مقدمات سے آپ کی زندگی کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

سب سے اول ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاشِ حق میں ترک دنیا کا طریق اختیار کیا اور غلوت میں رہنا شروع کیا۔ اس پر ایک عرصہ گزرا تو آپ پر رویائے صادقہ کا دروازہ کھولا گیا اور آپ کو پتے خواب آنے شروع ہوئے جو اپنے وقت پر پورے ہو ہو کر آپ کی بچگی کا موجب ہوتے رہے اور یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ جب آپ اس کو چھپے سے ایک حد تک آشنا ہو گئے اور طبیعت نبوت کے مناسب حال بچگی کو پہنچ گئی تو غارِ حرا میں آپ کے پاس الہی فرشتہ آیا اور اُس نے اللہ کی طرف سے آپ کے ساتھ کلام کیا اور رویا صادقہ سے اُدھر کا مقام آپ پر کھولا گیا، لیکن باوجود اس کے کہ آپ اس کو چھپے سے آشنا ہو چکے تھے آپ کی طبیعت اس تبدیلی کو پہلی دفعہ پوری طرح برداشت نہیں کر سکی اور آپ سخت خوفزدہ ہو چکے اور یہ خوف واضطراب آپ کو ایک عرصہ تک تکلیف دیتا رہا۔ حتیٰ کہ اس ربانی رسول کے بار بار آپ کے پاس آنے اور آپ کو تسلی دینے کے بعد آپ کو پورا پورا سکون حاصل ہوا۔

اس اطمینان کے بعد آپ نے اپنا کام شروع فرمایا۔ مگر اس میں بھی تدریجی ترقی کا پہلو موجود تھا۔ پہلے پہل آپ نے عام تبلیغ شروع نہیں کی۔ بلکہ صرف اپنے دوستوں اور عزیزوں تک تبلیغ کا کام محدود رکھا اور ڈھائی تین سال تک صرف غنیہ طور پر فرض تبلیغ ادا فرماتے رہے اس کے بعد آپ نے الہی حکم کے تحت کھلی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر اس زمانہ میں بھی آپ کے کام کا دائرہ عموماً مکہ والوں تک محدود رہا۔ بے شک باہر سے آنے والوں کے لیے بھی پیغامِ حق کا دروازہ کھلا تھا اور مسیحِ ناصری کی طرح متلاشیانِ حق سے یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ ”میں بچوں کا کھانا گتوں کے آگے کیونکر ڈال دوں“ مگر اوائل میں آپ کا

اصل روئے سخن قریش مکہ کی طرف تھا اور وہی اصل زیر تبلیغ تھے اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ لیکن جب مکہ والوں نے نہ صرف انکار پر اصرار کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو سخت سے سخت مظالم کا تختہ مشق بنایا بلکہ اس بات کا بھی عہد کر لیا کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے اور عملاً اپنے اوپر تبلیغ اسلام کا دروازہ بند کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی توجہ مکہ والوں سے ہٹا کر دیگر قبائل عرب کی طرف پھیر لی۔ طائف کا سفر اسی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں قریش مکہ میں سے ایمان لانے والوں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی ہے اور ان کی جگہ دیگر قبائل عرب میں اسلام زیادہ پھیلتا نظر آتا ہے۔ یثرب کے قبائل اوس اور خزرج اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ ہجرت کے بعد یہود اور نصاریٰ کے ساتھ معاملہ پڑا اور زینہ تبلیغ کی آخری سیڑھی اس وقت ختم ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عجم کے نام تبلیغی مراسلات بھیجے اور اسود و احمر کو پیغام شروع ہوا۔

اپنے مقام کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تدبیرِ بجا انکشاف ہوا چنانچہ شروع شروع میں تو آپ کی وحی میں آپ کے متعلق نبی اور رسول کا لفظ بھی استعمال نہیں ہوا۔ صرف ایک عمومی رنگ میں تبلیغ حق کا حکم تھا اور جب نبوت اور رسالت کے مقام کا اظہار ہوا تو اس کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک اپنے آپ کو صرف یکے از انبیاء خیال فرماتے رہے اور بس۔ اپنی فیضیت اور ختم نبوت کے متعلق قطعاً کوئی دعویٰ نہ تھا۔ بلکہ ہجرت کے بعد تک یہ حال تھا کہ اگر کوئی صحابی اپنے جوش عقیدت میں آپ کو دیگر انبیاء پر افضل قرار دیتا تھا تو آپ اسے سختی کے ساتھ روک دیتے تھے، چنانچہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ مدینہ میں ایک دفعہ ایک صحابی نے ایک یہودی کے سامنے حضرت موسیٰ پر آپ کی فیضیت بیان کی تو آپ اس صحابی پر بہت ناراض ہوئے اور حضرت موسیٰ کی ایک فیضیت بیان کر کے اس یہودی کی دلداری فرمائی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ آپ نے خود فرمایا کہ :

لَوْ كَانَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ حَيَّيْنِ لَمَادَسَعَهُمَا إِلَّا اِيْتَبَاعِي ۖ

”یعنی اگر اس وقت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو انکو بھی بجز میری پیروی کے چارہ نہ تھا۔“

پھر اہل میں جب کسی صحابی نے آپ کو خیر البریہ یعنی افضل الخلق کہہ کر پکارا تو آپ نے اُسے روکا اور فرمایا۔  
”ذَٰلِكَ اَبْرَاهِيْمُ“ یعنی افضل الخلق تو ابراہیمؑ تھے۔ نیز فرمایا : ”مجھے یونس بن مثنیٰ پر فیضیت مت دو“ لیکن پھر خود فرمایا کہ ”اَنَا سَيِّدُ دُنْيَا وَلَا فَخْرَ“ یعنی میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں۔ مگر اس وجہ سے میں اپنے اندر کوئی بکتر نہیں پاتا۔ یہ گویا ارتقاء علمی تھا کیونکہ آپ افضل الرسل اور سید الدلوم

۱۔ بخاری کتاب بدء الخلق باب وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۖ ۲۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۴ زیر آیت وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الْبَنِيَيْنِ ۖ ۳۔ مسند احمد جلد ۱ ۴۔ بخاری کتاب بدء الخلق ۵۔ ترمذی وابن ماجہ ۶۔



تو اوائل سے ہی تھے مگر اس کا انکشاف آپ پر آہستہ آہستہ ہوا اور یہ بھی درست ہے کہ آپ کے مدارج میں بھی آہستہ آہستہ ترقی ہوتی گئی تھی۔

**مکی زندگی میں اشاعت اسلام** بعثت کے بعد جو قریباً تیرہ سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں گزارے ان میں اسلام سرزمین عرب میں گویا پھیلنے لگا۔ چکا تھا اور قریش مکہ سے باہر بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا؛ چنانچہ ابوذر غفاری، عبداللہ بن مسعود، صدیق اکبر، بن ثعلبہ ازوی، ابو موسیٰ اشعری، طفیل بن عمرو دوسی، سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی وغیرہ کئی غیر قبائل کی مثالیں موجود ہیں جو اس زمانہ میں اسلام لائے، مگر اس میں شک نہیں کہ ابھی تک اسلام ایک نہایت کمزور حالت میں تھا اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے ان مخالف عناصر کے مقابلہ میں جن کا اسے سامنا تھا اس کی زندگی خطرہ سے باہر نہیں تھی۔

قریش مکہ میں سے ہجرت نبوی تک اسلام لانے والوں کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں ہے اور نہ کسی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن قرآن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قریش اور ان کے متعلقین میں سے ہجرت تک مسلمان ہونے والوں کی تعداد تین سو نفوس سے کسی صورت میں زیادہ نہیں ہوگی۔ اس تعداد میں عورتیں اور بچے سب شامل ہیں۔ گویا قریش مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ کوششوں کا نتیجہ یہی تین سو جانیں تھیں۔ اور یہ بھی بتایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو اپنی کم سنی یا مفلسی یا کسی اور وجہ سے قریش میں کوئی اثر یا رشوخ نہیں رکھتے تھے۔

قریش کے علاوہ دیگر قبائل عرب میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد اہل یثرب کو الگ رکھتے ہوئے بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ہاں یثرب میں البتہ جلد جلد اسلام پھیلا اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ والوں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد بشمولیت زن و فرزند کئی سو تک ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ اس طرح گویا ہجرت تک کل مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ قریباً ایک ہزار بنتی ہے۔ جن میں اگر عورتوں اور بچوں کو الگ رکھیں تو بالغ مرد شاید تین چار سو ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ہجرت کے بعد سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ میں موجود نہیں تھے بلکہ کچھ متفرق طور پر اپنے اپنے قبائل میں تھے۔ کچھ حبشہ میں تھے اور کچھ ہجرت کی طاقت نہ رکھنے والے ابھی تک مکہ میں ہی قریش کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ اس قلیل نفری کے ساتھ اسلام مذاہب عالم کی جولانگاہ میں بازی لے جانے کے دعوے بھرتا ہوا قدم زن ہو رہا تھا۔

**قریش کی ایذاء رسانیوں کا اثر مسلمانوں پر** قریش کے مظالم کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ ان مصائب پر مسلمانوں نے صبر اور برداشت کا جو اعلیٰ نمونہ دکھایا وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ صحیح روایات سے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص نے ان



اور صحابہ کو مقابلہ کی اجازت نہیں تھی، لیکن جب تمام حجت ہو چکا اور کفار اپنے مظالم سے باز نہ آئے بلکہ دن بدن زیادہ شوخ اور زیادہ متمرد ہوتے گئے اور انھوں نے اسلام کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی ٹھان لی اور ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کا پیچھا نہ چھوڑا تو باوجود اس کے کہ اس وقت بھی آپ کے پاس عرب کے مقابلہ کے لیے قطعاً کوئی جمعیت نہ تھی آپ نے وہی ٹھی بھر جماعت لے کر ان کا مقابلہ کیا۔ اور چونکہ اللہ کی نصرت آپ کے شامل حال تھی آپ اس مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔

**ہجرت نبوی اور اس کی علت** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجرت کوئی خوشی کا سفر نہ تھا جو سیر و سیاحت کی غرض سے کیا گیا ہو بلکہ یہ سفر قریش کے ان بیدردانہ مظالم کا نتیجہ تھا جن کا مسلمان سالہا سال سے تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ آخر تنگ آکر مسلمانوں اور ان کے محبوب آقا کو وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔ جو جو مظالم ان ابتدائی تیرہ سالوں میں مسلمانوں نے قریش مکہ اور ان کے ہم خیالوں کے ہاتھوں برداشت کئے ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنا محال ہے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ عرب جیسے جاہل اور آزاد ملک میں قریش جیسی وحشی اور شکستہ قوم اپنی عداوت کے جوش و خروش میں جو جو مظالم کمزور بے بس مسلمانوں پر کر سکتی تھی وہ سب اس نے کئے۔ مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ان پر ہنسی اور مذاق اڑایا گیا۔ انکے خلاف دلائل و آثار طعن و تشنیع اور گندی گالی گلوچ سے کام لیا گیا۔ ان کو خدا کی عبادت سے روکا گیا اور توحید کے اعلان سے جبراً منع کیا گیا۔ ان کو ان کے پیارے اور محبوب آقا سے الگ کر دینے کی کوشش کی گئی۔ ان کو نہایت بے دردانہ طور پر مارا اور پیٹا گیا۔ ان میں سے بعض کو نہایت وحشیانہ طور پر قتل کیا گیا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کا بائیکاٹ کر کے ان کو بھوک اور پیاس سے ہلاک کرنے کی مٹانی گئی۔ ان کے مال و متاع چھین لیے گئے۔ حتیٰ کہ ان کو اپنے وطن سے نکل کر بھاگنا پڑا اور جو ٹھہرے وہ سینے پر پتھر رکھ کر ٹھہرے۔ پھر ان کے آقا اور سردار کو جو انہیں ان کی جانوں سے زیادہ عزیز تھا سخت سے سخت دھک دینے لگے اور برملا بدنی تکالیف پہنچانی لگیں اور اس پر پتھر برسائے گئے حتیٰ کہ ان کا بدن خون سے تر ہو گیا اور آخر اس کے قتل کا منصوبہ کیا گیا۔ اور منصوبہ بھی ایسا کہ جس میں سب قبائل قریش شریک تھے۔ اور ہر قبیلہ اس کے تقدیر خون سے اپنے ناپاک ہاتھ رنگنے کے واسطے تیار ہو گیا اور اسلام کے پودہ کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی ٹھان لی گئی۔ تو کیا ان مظالم کے نتیجہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی ہجرت کوئی معمولی سفر تھا کہ یونہی رائیگاں جاتا اور خدائے غفور کی غیرت جوش میں نہ آتی؟ نہیں بلکہ ہجرت میں خدا کی طرف سے یہ صاف اشارہ تھا کہ اب قریش کے مظالم کا پیالہ سرسبز ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ظالم اپنی کیفر کردار کو پہنچے۔



## خاتمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہ سیرۃ خاتم النبیین ﷺ کا پہلا حصہ ختم ہوا  
خاکسار قسم المحرووف خدا تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالاتا ہے کہ اُس نے  
اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کے پورا کرنے کی توفیق دی۔ اب اے  
اللہ! تو اپنے فضل سے ایسا کر کہ تیرے بندے اسے پڑھیں اور اس سے  
فائدہ اٹھادیں اور تیری برگزیدہ رسولؐ کے پاک نمونہ پر چسل کر تیری  
رضا حاصل کریں۔ اور اے میرے مولا! تو مجھے بھی توفیق عطا کر کہ میں  
تیری رضا کے ماتحت اس کتاب کے باقی حصّوں کی تکمیل کر سکوں  
اور اپنے فضل کو میرے شامل حال رکھ ۛ

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ آمین

قسم آٹم

مرزا بشیر احمد

# سیرت خاتم النبیین ﷺ

حصہ دوم





## عرض حال

### جلد دوم

سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل دیباچہ تو بحکیل تصنیف کے وقت ہی لکھا جاسکے گا مگر اس جگہ چند الفاظ حصہ دوم کے متعلق مخصوص طور پر عرض کرنے ضروری ہیں ابتداءً "۱۹۱۹ء میں جب میں نے بطور خود رسالہ ریویو آف ریلہ جنڈ قادیان کے لئے سیرۃ کی تصنیف کا کام شروع کیا تو اس وقت اس کی غرض دعاغت بہت محدود تھی۔ چنانچہ سیرۃ کا حصہ اول جو ۱۹۲۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا وہ اسی محدود غرض دعاغت کے ماتحت تھا جو صرف یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سادہ اور مختصر سوانح عمری میسر آ جاوے۔ کوئی علمی تحقیق یا محققانہ تبصرے اس وقت میرے مد نظر نہ تھے۔ چنانچہ اسی غرض سے حصہ اول میں حوالے تک درج نہیں کئے گئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ قادیان کو اس کام کی بحکیل کی طرف توجہ پیدا ہوئی اور آپ نے ۱۹۲۹ء کے اوائل میں مجھے سیرت کے حصہ دوم کی تیاری کے متعلق ارشاد فرمایا تو ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ ہر قسم کے طبقہ کو مد نظر رکھ کر اس حصہ میں حصہ اول کی نسبت زیادہ مستقل تحقیق و تدقیق سے کام لیا جاوے لیکن یہ کوشش کی جاوے کہ کتاب کا حجم حتی الوسع زیادہ نہ ہونے پائے۔

جس حد تک میں اس ہدایت کی تعمیل کر سکا ہوں وہ اب سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم حصہ دوم کی صورت میں ناظرین کے سامنے ہے۔ اگر اس کے بعض حصوں میں میں نے حد مناسب سے زیادہ طوالت سے کام لیا ہے تو وہ غالباً میرے اس طبعی نقص کی وجہ سے ہے کہ میں تحریر میں اختصار پر زیادہ قابو نہیں رکھ سکتا اور میں ڈرتا ہوں کہ شاید اس جہت سے میں حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ کی ہدایت پر پوری طرح عمل نہیں کر سکا۔

تحقیق و تدقیق کی جہت سے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اگر اسے ایک نہ ختم ہونے والا میدان کہہ سکیں تو بے جا نہ ہو گا۔ میرے اپنے احساس کا یہ حال ہے کہ جب بھی میں نے سیرت کے مسودے کی نظر ثانی کی ہے مجھے اس میں قریباً "ہیشہ ہی تحقیق کے لئے ایک نیا دروازہ نظر آیا ہے اور بعض جگہ تو یقیناً" ایسے ہیں کہ ان میں مزید تحقیق کی ضرورت عیاں ہے مگر فی الحال جو کچھ بھی ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اسے قبولیت کا شرف عطا کرے اور اس کے ذریعہ سے اس مقصد کو پورا فرمائے جو اس کی تصنیف کی اصل غرض دعاغت ہے۔ اللہم آمین۔

حصہ دوم کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ حصہ اول کی نسبت اس حصہ میں چار زائد خصوصیات ہیں: اول زیادہ تحقیق و تدقیق۔ دوم زیادہ تفصیل و تشریح۔ سوم بہت سے ہنسی اور ضمنی مسائل کی بحث۔ چارم حوالہ جات کا اندراج۔ ان

خصوصیات کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اگر اور جب حصہ اول کا دو سرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو اسے ان مزید خصوصیات کی روشنی میں نظر ثانی کرنے کے بعد شائع کیا جاوے ورنہ یہ دونوں حصے بالکل غیر مربوط نظر آئیں گے۔

جن کتب سے میں نے حصہ دوم کی تیاری میں استفادہ کیا ہے ان کا اندازہ صرف ان اسماء سے نہیں لگ سکتا جو حوالہ کی صورت میں حاشیہ میں درج ہوئے ہیں۔ بالعموم متاخرین کی کتب کے حوالے درج نہیں کئے گئے کیونکہ جب بھی مجھے ان کتب میں کوئی نئی یا مفید بات ملی ہے تو میں نے بجائے ان کتب کا حوالہ دینے کے ان کے ماخذ کی طرف رجوع کر کے اصل کتاب کا حوالہ درج کر دیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس وجہ سے متاخرین کی کتب کی طرف سے میرے جذبہ تشکر میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔

ممکن ہے کہ بعض طبائع میں یہ سوال پیدا ہو کہ مولانا شبلی کی سیرت کے ہوتے ہوئے اس تصنیف کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا اصل جواب تو ہر دو کتب کے مطالعہ سے ہی مل سکتا ہے، لیکن میں اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے سیرۃ النبیؐ کی خوبیوں کا اعتراف ہے اور میں نے بعض جگہ اس سے اور دارالمصنفین کی دو سری تصنیفات سے فائدہ بھی اٹھایا ہے مگر تحقیق کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اور پھر ہر شخص کا نقطہ نظر اور اسلوب بیان بھی جدا ہوتا ہے اس لئے میری یہ ناچیز کوشش کسی کے ناگوار خاطر نہیں ہونی چاہئے بلکہ اگر کل کو کوئی اور شخص اپنی کوئی جدید تحقیق یا کوئی جدید نقطہ نظر اور جدید اسلوب بیان دنیا کے سامنے پیش کرے تو یقیناً "اسلامی لٹریچر" کی یہ ایک مزید خوش قسمتی ہوگی۔ وکل امرء ما نوى وانما الاعمال بالنیات۔

میرے لئے اس جگہ ان بزرگان و احباب کرام کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کسی نہ کسی رنگ میں امداد فرمائی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے کمال مہربانی سے اپنا نہایت قیمتی وقت خرچ کر کے حصہ دوم کے مسودے کا بیشتر حصہ ملاحظہ فرمایا اور وقتاً فوقتاً اپنے پیش قیمت ارشادات سے مستفیض ہونے کا موقع عطا کیا۔ حضرت مولوی شیر علی صاحب بی۔ اے ناظر تالیف و تصنیف جماعت احمدیہ قادیان نے قریباً ساری کامیاں ملاحظہ کیں اور مجھے ان کی تصحیح میں امداد دینے کے علاوہ بعض جگہ مفید مشورے بھی دیئے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب دروایم۔ اے سابق مبلغ اسلام لٹرن نے مسودے کے بعض خاص خاص حصے دیکھے اور مجھے اپنی قیمتی رائے سے مستفید کیا۔ مولوی ارجند خان صاحب مولوی فاضل پروفیسر جامعہ احمدیہ قادیان نے کتابوں کی درستی میں بہت قابل قدر امداد دی۔ فہرست اہم اللہ خیر۔ اسی طرح سینئر بکڈ پو تالیف و اشاعت قادیان اور سینئر الہ بخش نسیم پریس قادیان اور کاتب کتاب ہذا بھی اپنی ہمدردانہ توجہ کی وجہ سے قابل شکر ہیں۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد

کارکن نظارت تالیف و تصنیف جماعت احمدیہ قادیان

۳۰/۳/۳۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
لَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

## مدینہ کا ابتدائی قیام اور حکومتِ اسلامی کی تائیس

### مدینہ کے حالات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجرت کا بیان کتاب کے حجتہ اول میں گذر چکا ہے اب ہجرت کے بعد سے آپ کی مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ ہم آپ کی مدنی زندگی کا بیان شروع کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود مدینہ اور اس کی آبادی کا مختصر حال بیان کر دیا جاوے، کیونکہ اس کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے بعض حالات کا پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قبل مدینہ کا شہر یثرب کے نام سے مشہور تھا لیکن آپ کی ہجرت کے بعد لوگ اسے مدینۃ الرسول (یعنی خدا کے رسول کا شہر) کہہ کر پکارنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ اس کا نام صرف مدینہ مشہور ہو گیا۔ مدینہ عرب کے علاقہ حجاز کا قدیم شہر ہے جو مکہ سے شمال کی طرف دو ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر بحر احمر کے مشرقی ساحل سے قریباً پچاس میل مشرق کی طرف ہٹ کر واقع ہے۔ گویا مدینہ اس قدیم مگر صحرائی تجارتی راستے کے قریب میں آباد ہے جو مکہ سے شام کی طرف جاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مکہ اور شام کے درمیان آنے جانے والے تاجر بعض اوقات راستے سے کچھ ہٹ کر مدینہ میں بھی قیام کرتے جاتے تھے اور اس لیے مکہ اور مدینہ کے بہت سے لوگ آپس میں روشناس تھے اور بعض تو ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی رکھتے تھے۔

جگہ کے لحاظ سے مدینہ کو ایک دادی کہنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی اور انہی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی اُحد تھی جہاں بعد میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان ایک نہایت خطرناک جنگ وقوع میں آئی۔ عرب کے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں مدینہ میں بارش عموماً خاصی ہو جاتی ہے اور زمین بھی ویسی ریتی اور ناقص نہیں جو عموماً عرب کے دوسرے حصوں میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ

کے باشندے قدیم زمانہ سے عموماً زراعت پیشہ رہے ہیں۔ مدینہ میں گرمی شدت کی پڑتی ہے اور سرمای سردی بھی بہت تیز ہوتی ہے اور جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں مدینہ میں طیر یا وغیرہ کی و بار بھی بہت پڑتی تھی اور لوگ بخار سے سخت تکلیف اٹھاتے تھے۔ چنانچہ جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مدینہ میں ہجرت کر کے آئے تو بوجہ آب و ہوا کی تبدیلی کے انہوں نے بہت تکلیف اٹھائی اور بہت سے مسلمان بخار میں مبتلا ہو گئے اور ان کی محنتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ چنانچہ احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دُعا مروی ہے جو آپ نے مسلمانوں کی اس تکلیف کو دیکھ کر خدا کے حضور کی اور جس کے نتیجہ میں خدا نے مسلمانوں کو اس تکلیف سے نجات دی اور مدینہ کی فضا ایک بڑی حد تک وبائی جراثیم سے پاک ہو گئی۔

اس زمانہ میں مدینہ کی آبادی اکٹھی نہیں تھی بلکہ کسی قدر پھیلی ہوئی تھی اور ہر قوم الگ الگ حصوں میں آباد تھی اور خود حفاظتی کے لیے سب نے اپنے اپنے واسطے چھوٹے چھوٹے قلعے سے بنارکھے تھے۔ پرانی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ یثرب میں سب سے پہلے آباد ہونے والے لوگ عمالیق قوم کے آدمی تھے جنہوں نے وہاں کھجوروں کے باغات لگائے اور چھوٹے چھوٹے قلعے تیار کئے۔ ان کے بعد یہودی لوگ آباد ہوئے۔ ان یہود کے متعلق روایات میں اختلاف ہے کہ وہ نسل عرب تھے یا کہ باہر سے آئے تھے مگر عام مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ وہ زیادہ تر بنی نضیر تھے جو اپنے وطن سے نکل کر عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے اور پھر بعد میں آہستہ آہستہ عرب کے بعض پہلے باشندے بھی ان کا مذہب اختیار کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بہر حال عمالیق کے بعد مدینہ میں یہود آکر آباد ہوئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ عمالیق کو نیست و نابود یا جلا وطن کر کے ان کی جگہ خود لے لی۔ یہ یہود تین بڑے قبائل میں منقسم تھے یعنی بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ تینوں قبائل شروع میں عموماً بہت اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہتے تھے۔ ان یہود نے بھی اس زمانہ کے دستور کے مطابق اپنی رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے قلعے تیار کئے جو ایک دوسرے سے ملتی نہ تھے بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مدینہ کے آس پاس پھیلے ہوئے تھے۔ یہود کا پیشہ عموماً تجارت تھا، مگر ان میں سے بعض زراعت کا شغل بھی رکھتے تھے۔ بنو قینقاع زیادہ تر صناعی کا کام کرتے تھے۔ یہود چونکہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی نسبت زیادہ مہذب و متمدن تھے اور تعلیم میں بھی آگے تھے۔ اس لیے انہوں نے مدینہ کے گرد و نواح میں اپنا اثر پیدا کرنا شروع کیا اور جلد ہی بہت اقتدار حاصل کر لیا۔ وہ اسی اقتدار کی حالت میں تھے کہ یمن کی طرف سے بنو قحطان کے دو قبیلے جو اوس اور خزرج کے نام سے پکارے جاتے تھے مدینہ میں آکر آباد ہوئے۔ یہ قبائل ایک شخص حارثہ بن ثعلبہ کے دو بیٹوں اوس اور خزرج کی اولاد تھے اور آپس میں بہت اتفاق و محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ یہود سے بالکل الگ تھلگ رہے لیکن آخر یہود کے زور و اقتدار کی وجہ سے ان کے حلیف بن گئے۔



اس کے بعد آہستہ آہستہ اوس و خزرج نے بھی پھیلنا اور زور پکڑنا شروع کیا اور کچھ یہودی کچھ یہودی کی ہمسری کا دم بھرنے لگے لیکن چونکہ یہودی لوگ زیادہ ہوشیار اور زیادہ متمکن اور زیادہ با اثر ہونے کے علاوہ تعلیم اور امور مذہبی میں بھی زیادہ دخل رکھتے تھے اور اوس و خزرج محض بُت پرست اور عوامِ جاہل تھے اس لیے اوس و خزرج پر یہود کا ایک گہرا اثر تھا حتیٰ کہ جب کبھی کسی اوسی یا خزرجی شخص کے کوئی نرمیہ اولاد نہ ہوتی تو وہ یہ منت مانتا تھا کہ اگر میرے گھر بڑ کا پیدا ہوا تو میں اُسے یہودی بناؤں گا؛ چنانچہ اسی طرح کئی لوگ یہودی بن گئے اور ان کا زور دن بدن بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ یہودیوں نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اوس و خزرج پر طرح طرح کے مظالم شروع کر دیئے جس کے نتیجہ میں یہود اور اوس و خزرج کے تعلقات بہت خراب ہو گئے اور بالآخر موخر الذکر قبائل نے تنگ آکر ریاستِ غسان کے فرمانروا کی امداد سے یہود کے تمام سربراہان اور وہ لوگوں کو ہوشیاری سے قتل کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کا زور ٹوٹ گیا اور اوس و خزرج شہر میں طاقت پکڑ گئے لیکن یہود کے کمزور ہو جانے کا آہستہ آہستہ یہ اثر بھی ظاہر ہونے لگا کہ اوس و خزرج جو اس وقت تک یہود کے مقابلہ کی وجہ سے آپس میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے تھے اب آپس میں لڑنے اور جھگڑنے لگ گئے اور بالآخر یہ خانہ جنگیاں ایسی وسیع اور خطرناک صورت پکڑ گئیں کہ دونوں قومیں آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کٹ کٹ کر بہت کمزور ہو گئیں اور یہود کو جو غالباً اس خانہ جنگی کی آگ کو بھڑکانے والے تھے پھر طاقت پکڑ جانے کا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوس و خزرج نے پھر یہودی قبائل کی امداد کا سہارا ڈھونڈا اور ایک دوسرے کے خلاف ان کی مدد چاہی؛ چنانچہ بنو قینقاع قبیلہ خزرج کے حلیف بن گئے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ قبیلہ اوس کے اور اس طرح سارا شہر ایک خطرناک خانہ جنگی کی آگ سے شعلہ بار ہو گیا۔

اہلِ یثرب اسی خانہ جنگی کی حالت میں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے حکم پا کر مکہ میں نبوت کا دعویٰ کیا؛ چنانچہ اوس و خزرج کے درمیان آخری جنگ جو تاریخِ عرب میں جنگِ بعاث کے نام سے مشہور ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوت میں ہی ہوئی تھی جب کہ آپ مکہ میں مقیم تھے۔ اس لڑائی میں اس قدر خیزی ہوئی اور فریقین کے اتنے آدمی مارے گئے کہ اوس اور خزرج ناچار آپس میں صلح کرنے پر مجبور ہو گئے؛ چنانچہ دونوں قبیلوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ چند شرائط کے ماتحت عبداللہ بن ابی بن سلول کو جو قبیلہ خزرج کا ایک نامور اور ہوشیار رئیس تھا اپنا متحدہ سردار تسلیم کر لیا جاوے اور عبداللہ کی باقاعدہ تاجپوشی کی تیاری ہونے لگی۔ مگر عبداللہ کا سر ہنوز قبائل اوس و خزرج کی سرداری کے تاج سے مزن نہ ہونے پایا تھا کہ اسلام کی آواز مدینہ تک پہنچ گئی اور حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن ابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کو ایک ایسے رقیب کی آمد سمجھا جس نے اس سے اوس اور خزرج کی سرداری کا مجوزہ تاج چھین لیا؛ چنانچہ اس کے دل میں حسد و عداوت کی آگ شعلے لگ گئی اور چونکہ وہ اتنی جرات نہیں رکھتا تھا کہ اپنے قبیلہ والوں کے خلاف ہو کر حکم کھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکے اس لیے اُس نے بڑا طور پر مخالفت کرنے کی بجائے خفیہ عداوت اور ریشہ دوانی کا طریقہ شروع کر دیا اور جنگِ بدر کے بعد اس نے بظاہر اسلام

بھی قبول کر لیا، مگر اس کے دل کا یہ مرض کم نہ ہوا اور آخر اسی حالت میں اُس نے جان دی۔

### نزولِ قباء، ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء

مدینہ اور اُس کی آبادی کے یہ مختصر حالات بیان کرنے کے بعد ہم اپنے

اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب

انصار کے کانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی آواز پہنچی تو مدینہ کا میدان تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا اور لوگ جلدی جلدی اپنے ہتھیاروں کو دُور ست کر کے نہایت شوق کے ساتھ اس سمت میں پکے جدھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ یہ وقت بھی ایک عجیب وقت تھا۔ سرورِ عالم یعنی خدا کا وہ مقدس فرستادہ جس کے وجود میں نبوت و رسالت کے پیغام نے اپنے کمال کو پہنچنا تھا اپنے عزیز و اقارب کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے وطن سے نکلتا ہے اور ایک ایسی بستی کی طرف آتا ہے جو دنیوی رشتہ کے لحاظ سے گویا ایک غیروں کی بستی ہے مگر خدا انہی غیروں کے دلوں میں وہ محبت ڈال دیتا ہے کہ جس کے سامنے خون کے رشتے کی محبت بالکل ہیچ نظر آتی ہے اور آج سے مدینہ کے اوس و خمر رج کی قسمت اسلام کے نوشتہ تقدیر کے ساتھ اس طرح مخلوط طور پر یوں دی جاتی ہے کہ ناممکن ہے کہ دنیا کا کوئی مودخ ایک کے ذکر سے دُور سے دُور کر سکے۔ بیشک اسلام نے عرب کے ان بادیہ نشینوں کو جن کے بیشتر اوقات شراب اور زنا اور ہونے اور آپس کی لڑائی میں گزرتے تھے ایک تاریک ترین قعرِ مذلت سے اٹھایا اور ایک روشن ترین اور جِ سعادت پر پہنچا دیا اور اسلام پر کسی کا احسان نہیں ہے بلکہ ہر اک مسلمان کی گردن اسلام کے احسان کے نیچے ہے، لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان ابتدائی فدیایانِ اسلام نے جس جان نثارانہ قربانی اور جس والہانہ عشق و محبت سے اسلام کے نازک اور کم سن پودے کو اپنے خون کے پانی سے سینچا اس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ مگر مجھے اپنے مضمون کی طرف لوٹنا چاہیے۔ انصار کی نظر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑیں تو ان کے چہرے خوشی سے تھما اٹھے اور انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا دنیا و آخرت کے سارے انعامات انہیں آپ کے وجود میں حاصل ہو گئے ہیں؛ چنانچہ بخاری میں برابر بن عازب کی روایت ہے کہ جو خوشی انصار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے وقت پہنچی ویسی خوشی کی حالت میں میں نے انہیں کبھی کسی اور موقع پر نہیں دیکھا۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ہم نے یوں محسوس کیا کہ ہمارے لیے مدینہ روشن ہو گیا اور جب آپ فوت ہوئے تو اس دن سے زیادہ تاریک ہمیں مدینہ کا شہر کبھی نظر نہیں آیا۔

استقبال کرنے والوں کی ملاقات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی خیال کے ماتحت جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آیا سیدھے شہر کے اندر داخل نہیں ہوئے بلکہ دائیں طرف ہٹ کر مدینہ کی بالائی آبادی میں جو اصل شہر

سے دوڑ سائی میل کے فاصلہ پر تھی اور جس کا نام قبار تھا تشریف لے گئے اس جگہ انصار کے بعض خاندان آباد تھے جن میں زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور اس زمانہ میں اس خاندان کے رئیس کلثوم بن الہدم تھے۔ قبار کے انصار نے آپؐ کا نہایت پُر تپاک استقبال کیا اور آپؐ کلثوم بن الہدم کے مکان پر فروکش ہو گئے۔ وہ مہاجرین جو آپؐ سے پہلے مدینہ پہنچ گئے ہوتے تھے وہ بھی اس وقت تک زیادہ تر قبار میں کلثوم بن الہدم اور دوسرے معززین انصار کے پاس مقیم تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے سب سے پہلے قبار میں قیام کرنا پسند فرمایا۔ ایک آن کی آن میں سارے مدینہ میں آپؐ کی آمد کی خبر پھیل گئی اور تمام مسلمان جوشِ مسرت میں بیتاب ہو کر جوق در جوق آپؐ کی فرد گاہ پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت ایک عجیب لطیفہ ہوا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کی سادگی کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ جن اہالیانِ مدینہ نے آپؐ کو اس سے پہلے نہیں دیکھا ہوا تھا ان میں سے بعض اپنے خیال میں حضرت ابوبکرؓ کو ہی رسول اللہؐ سمجھتے رہے مگر جب مجلس میں دُھوپ آگئی اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی چادر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیا اس وقت اُن کی یہ غلط فہمی دُور ہوئی۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ باوجود عمر میں چھوٹا ہونے کے حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے اور مقابلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے اور چونکہ مجلس میں نشست کی کوئی خاص ترتیب بھی نہیں تھی اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی ممتاز جگہ معین تھی اس لیے ناواقف لوگوں کو دھوکا لگ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزولِ قبار یعنی تکمیلِ سفرِ ہجرت کی تاریخ کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ نام مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ پیر کا دن اور ربیع الاول ۱۲ سنہ نبوی کی بارہ تاریخ تھی۔ مگر بعض محققین نے آٹھ تاریخ لکھی ہے۔ عیسوی سنہ کے شمار سے یہ تاریخ بعض حساب دانوں کے خیال کے مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ اسلامی سن کا شمار اسی واقعہ ہجرت شروع ہوتا ہے مگر سال کی ابتداء ربیع الاول سے نہیں ہوتی جو کہ ہجرت کا مہینہ ہے بلکہ محرم سے ہوتی ہے جو کہ قمری مہینوں کا پہلا ماہ سمجھا جاتا ہے اور اس طرح پہلا سال ہجرت کا دراصل بارہ ماہ کا نہیں تھا بلکہ نو ماہ اور کچھ دن کا تھا۔ اس بارہ میں مؤرخین میں اختلاف ہے کہ اسلام میں ہجرت سن کا حساب ابتداء کس کے عہد میں شروع ہوا۔ حاکم نے اکلیل میں روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہجرت کے بعد اس کا حکم دیا تھا۔ لیکن دوسری روایات کی بنا پر جمہور مؤرخین کا یہ خیال ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ حساب حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں شروع ہوا تھا۔ واللہ اعلم ۛ

مؤرخین لکھتے ہیں کہ پہلا کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبار میں کیا وہ ایک مسجد کی تعمیر تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس مسجد کی بنیاد رکھی اور صحابہ نے مل کر مزدوروں اور معماروں کا کام کیا۔ اور

چند دن کی محنت سے یہ مسجد تیار ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مسجد سے آخر وقت تک بہت محبت رہی اچنانچہ مدینہ میں چلے جانے کے بعد آپ ہر ہفتہ قبار تشریف لے جاتے اور اس مسجد میں نماز ادا فرمایا کرتے تھے بعض علماء کا خیال ہے کہ قرآن تشریف میں جس مسجد کے متعلق اُس سَسَّ عَلَى الشَّقْوَىٰ مِنْ اَدَلِّ يَوْمٍ لِّهِ کے الفاظ بیان ہوئے ہیں وہ یہی مسجد قبار ہے۔ اور اس میں شک نہیں ہے کہ گو اس سے پہلے بھی بعض مسجدیں مسلمانوں نے بنائی تھیں، لیکن یقیناً قبار کی مسجد اسلام میں وہ پہلی مسجد تھی جس کی بناء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے تکمیل ہجرت کے بعد پہلے دن رکھی گئی اور جسے مسلمانوں نے گویا ایک قومی عبادت گاہ کے طور پر تعمیر کیا۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے اپنی جگہ حضرت علیؓ کو چھوڑ آئے تھے اور ان کو تاکید فرما آئے تھے کہ امانتیں وغیرہ پس کر کے بہت جلد مدینہ پہنچ جائیں، اچنانچہ ابھی آپ کو قبار میں تشریف لائے صرف تین دن ہی ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ بھی مع الخیر قبار میں پہنچ گئے لیکن ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت مکہ میں ہی تھے۔

ورد مدینہ اور جمعہ کی پہلی نماز غالباً ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قباء میں ہی مقیم تھے کہ مسلمانان مدینہ میں اس بات کے متعلق گفتگو شروع ہوئی کہ مدینہ میں آپ کس کے ہاں قیام فرما ہوں گے۔ ہر ایک خاندان یہ چاہتا تھا کہ سب آپ کی میزبانی کا فخر حاصل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ اختلاف پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ میں عبدالمطلب کے نخیال بنو نجار کے ہاں ٹھہروں گا۔ یہ ایک نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا جس سے آپ نے انصار کے مختلف قبائل میں ناداجب جذبات رقابت کے پیدا ہونے کا سد باب فرمادیا اور آپ کے اس ارشاد پر سب کی تسلی ہو گئی۔ کیونکہ گویا ان اخلاص میں سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے لیکن بنو نجار کو یہ ایک مزید اور مستم خصوصیت حاصل تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

قبار میں نذر اندوز دن کے قیام کے بعد جمعہ کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اندرونی حصہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انصار و مہاجرین کی ایک بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ آپ ایک اونٹنی پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے پیچھے تھے۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ راستہ میں ہی نماز جمعہ کا وقت آگیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سالم بن عوف کے محلہ میں ٹھہر کر صحابہ کے سامنے خطبہ دیا اور جمعہ کی نماز ادا کی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ گو اس سے پہلے جمعہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر یہ پہلا جمعہ تھا جو آپ نے خود ادا کیا۔ اور اس کے بعد سے جمعہ کی نماز کا طریق باقاعدہ جاری ہو گیا۔ دراصل جمعہ نمازوں کی عید ہے جیسا کہ روزوں کی عید عید الفطر اور حج کی عید عید الاضحیٰ ہے اور اسی لیے شریعت اسلامی میں جمعہ کی نماز کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس نماز میں امام

۱۔ توبہ ۱۰۸۔ ۲۔ مسلم باب الہجرت ۳۔ بخاری باب الہجرت عن عائشہؓ۔

۴۔ ابوداؤد باب الجمعۃ فی القریٰ ۵۔ ابن ہشام ذکر ہجرت۔



ایک خطبہ دیتا ہے جس میں حاضر وقت مسائل پر تقریر ہوتی ہے اور حاضرین کو ایمان و اعمال کے متعلق مناسب نصائح کی جاتی ہیں اور اس کے بعد دو رکعت نماز فرض ادا کی جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی حکم ہے کہ حتی الوسع ہر مسلمان کو چاہیے کہ جمعہ کے دن غسل کرے اور کپڑے بدلے اور خوشبو لگائے اور خطبہ شروع ہونے سے قبل مسجد میں پہنچ جاوے جس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پہلا جمعہ ادا کیا اس جگہ اب ایک مسجد ہے جسے اس جمعہ کی یادگار میں مسجد الحجہ کہتے ہیں۔

جمعہ سے فارغ ہو کر آپ کا قافلہ پھر آہستہ آہستہ آگے روانہ ہوا۔ راستہ میں آپ مسلمانوں کے گھروں کے پاس سے گذرتے تھے تو وہ جوشِ محبت میں بڑھ بڑھ کر عرض کرتے تھے ”یا رسول اللہ! یہ ہمارا گھر یہ ہمارا مال و جان حاضر ہے اور ہمارے پاس حفاظت کا سامان بھی ہے آپ ہمارے پاس تشریف فرما ہوں“ آپ ان کے لیے دُعاے خیر فرماتے اور آہستہ آہستہ شہر کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں نے خوشی کے جوش میں اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر گانا شروع کیا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا      مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوُدَاعِ  
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا      مَا دَعَى إِلَيْهِ دَاعِلُهُ

یعنی آج ہم پر کوہِ وداع کی گھائیوں سے چودھویں کے چاند نے طلوع کیا ہے۔ اس لیے اب ہم پر ہمیشہ کے لیے خدا کا شکر واجب ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے بچے مدینہ کی گلی کو چوں میں گاتے پھرتے تھے کہ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ خدا کے رسول آگئے۔“ اور مدینہ کے حبشی غلام آپ کی تشریف آوری کی خوشی میں تلوار کے کرتب دکھاتے پھرتے تھے۔ جب آپ شہر کے اندر داخل ہوئے تو ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ آپ اس کے پاس قیام فرمائیں اور ہر شخص بڑھ بڑھ کر اپنی خدمت پیش کرتا تھا۔ آپ سب کے ساتھ محبت کا کلام فرماتے اور آگے بڑھتے جاتے تھے جیسا کہ آپ کی ناقہ بنو نجار کے محلہ میں پہنچی اس جگہ بنو نجار کے لوگ ہتھیاروں سے سجے ہوئے صفت ہو کر آپ کے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور قبیلہ کی لڑکیاں و فیں بجا بجا کر یہ شعر گارہی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارِدٌ مِنْ بَنِي نَجَّارٍ      يَا حَبِذَا مُحْتَضِدًا مِنْ حَبَارِ

یعنی ہم قبیلہ بنو نجار کی لڑکیاں ہیں اور ہم کیا ہی خوش قسمت ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے محلہ میں ٹھہرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بنو نجار میں پہنچ کر پھر یہ سوال درپیش تھا کہ آپ کس شخص کے ہاں جہان ٹھہریں۔ قبیلہ کا ہر شخص خواہشمند تھا کہ اسی کو یہ فخر حاصل ہو، بلکہ بعض لوگ تو جوشِ محبت میں آپ کی اونٹنی کی باگوں پر ہاتھ ڈال دیتے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر آپ نے فرمایا: میری اونٹنی کو چھوڑ دو کہ یہ اس وقت مامور ہے۔ یعنی جہاں

۱۔ زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۵۹ مطبوعہ مصر مطبعہ الازہریۃ المصریۃ ۱۳۲۵ھ

۲۔ وداع ایک پہاڑی یا بعض روایتوں کی رو سے وہ مختلف الجہت پہاڑیوں کا نام ہے جہاں مدینہ والے اپنے مسافروں کو رخصت کیا کرتے تھے اور باہر سے آنے والوں کا استقبال بھی یہیں کیا جاتا تھا۔



خدا کا منشاء ہو گا وہاں یہ خود بیٹھ جائے گی۔ اور یہ کہتے ہوئے آپ نے بھی اس کی باگیں ڈھیلی پھوڑ دیں۔ اُونٹنی آگے بڑھی اور تھوڑی دُور خراماں خراماں چلتی ہوتی جب اس جگہ میں پہنچی جہاں بعد میں مسجد نبویؐ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات تعمیر ہوئے اور جو اس وقت مدینہ کے دوپٹوں کی افتادہ زمین تھی تو بیٹھ گئی، لیکن فوراً ہی پھراٹھی اور آگے کی طرف چلنے لگی۔ مگر چند قدم چل کر پھر لوٹ آئی اور اُسی جگہ جہاں پہلے بیٹھی تھی دوبارہ بیٹھ گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **هَذَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ** یعنی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے منشاء میں یہی ہماری قیام گاہ ہے۔ اور پھر خدا سے دُعا مانگتے ہوئے اُونٹنی سے نیچے اتر آئے اور دریافت فرمایا کہ اپنے آدمیوں میں سے یہاں سے قریب ترین گھر کس کا ہے ابویوب انصاری فوراً پک کر آگے ہو گئے اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! میرا گھر ہے اور یہ میرا دروازہ ہے۔ تشریف لے چلیے“ آپ نے فرمایا: ”اچھا جاؤ اور ہمارے لیے کوئی ٹھہرنے کی جگہ تیار کر دو۔“

**قیام دارابی ایوب** ابویوب انصاری فوراً اپنے مکان کو ٹھیک ٹھاک کر کے آگئے اور آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ان کے ساتھ اندر تشریف لے گئے۔ یہ مکان دو منزلہ تھا۔ ابویوب چاہتے تھے کہ آپؐ اوپر کی منزل میں قیام فرمائیں، لیکن آپؐ نے اس خیال سے کہ ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں کو آسانی رہے نچلی منزل کو پسند فرمایا اور وہاں فروکش ہو گئے۔ رات ہوئی تو ابویوب اور ان کی بیوی کو ساری رات اس خیال سے نیند نہیں آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے ہیں اور ہم آپؐ کے اوپر ہیں اور مزید اتفاق یہ ہو گیا کہ رات کو چھت پر ایک پانی کا برتن ٹوٹ گیا اور ابویوب نے اس ڈر سے کہ پانی کا کوئی قطرہ نیچے نہ ٹپک جاوے۔ جلدی سے اپنا لحاف پانی پر گرا کر اسے خشک کر دیا۔ صبح ہوئی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کمال اصرار آپؐ کی خدمت میں اوپر کی منزل میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی آپؐ نے پہلے تو تامل کیا، لیکن بالآخر ابویوب کے اصرار کو دیکھ کر رضامند ہو گئے۔ اس مکان میں آپؐ نے سات ماہ تک یا ابن اسحاق کی روایت کی رُو سے ماہ و مہینہ بھری تک قیام فرمایا۔ گویا جب تک مسجد نبویؐ اور اس کے ساتھ والے حجرے تیار نہیں ہو گئے آپؐ اسی جگہ مقیم رہے۔ ابویوب آپؐ کی خدمت میں کھانا بھجواتے تھے اور پھر جو کھا نا بچ کر آتا تھا وہ خود کھاتے تھے اور محبت و اخلاص کی وجہ سے اُسی جگہ انگلیاں ڈالتے تھے جہاں سے آپؐ نے کھایا ہوتا تھا۔ دوسرے اصحاب بھی عموماً آپؐ کی خدمت میں کھانا بھجھا کرتے تھے؛ چنانچہ ان لوگوں میں سعد بن عبادہ رئیس قبیلہ خزرج کا نام تاریخ میں خاص طور پر مذکور ہوا ہے۔ انس بن مالک مدینہ کے ایک دستل سالہ یتیم بچے تھے۔ ان کی والدہ جن کا نام اُمّ سلیم تھا اور جو بہت مخلص تھیں ان کو اپنے ساتھ لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

۱۔ بخاری کتاب الحجرت۔ بخاری میں اُونٹنی کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں ہوا مگر یہ ذکر موجود ہے کہ مسجد والی جگہ میں اُونٹنی خود بخود آکر بیٹھ گئی تھی جس پر آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے کہ یہی ہماری منزل ہے۔ باقی تفصیل کتب سیر میں ہے۔

۲۔ مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۷ وابن ہشام ۳۔ مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۷ وابن ہشام ۴۔

میں انس کو آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں آپ اس کے لیے دُعا فرمادیں اور اپنی خدمت کے لیے اسے قبول فرمادیں۔ آپ نے ان کے لیے دُعا کی خیر کی اور اپنی خدمت میں انہیں منظور فرمایا اور اس کے بعد سے انس بن مالک ہمیشہ آپ کی خدمت میں رہنے لگ گئے اور آپ کی وفات تک اس خدمت سے جدا نہیں ہوئے۔ یہ وہی انس ہیں جن سے بہت سی احادیث کتب حدیث میں مروی ہوئی ہیں اور جو خاص صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انس نے بڑی لمبی عمر پائی اور ۹۲ سالہ بھری میں بصرہ میں فوت ہوئے جبکہ ان کے سوا غالباً ایک یا دو صحابی اور زندہ تھے۔ اپنی آخری عمر میں انس اکثر کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے میرے مال اور میری اولاد میں اتنی برکت ہوئی ہے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی اور اب مجھے صرف جنت کی دُعا کے پورا ہونے کا انتظار ہے۔

مدینہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو کچھ روپیہ دیکر مکہ روانہ فرمایا جو چند دن میں آپ کے اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر مع الخیر مدینہ میں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی بکر حضرت ابو بکرؓ کے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے کر مدینہ پہنچ گئے۔

**تعمیر مسجد نبوی** مدینہ کے قیام کا سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھا۔ جس جگہ آپ کی اُٹھنی آکر بیٹھی تھی وہ مدینہ کے دو مسلمان بچوں اور اہل کی ملکیت تھی جو حضرت اسعد بن زرارہ کی نگرانی میں رہتے تھے۔ یہ ایک افتادہ جگہ تھی جس کے ایک حصہ میں کہیں کہیں کھجوروں کے درخت تھے اور دوسرے حصہ میں کچھ کھنڈرات وغیرہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسجد اور اپنے حجرات کی تعمیر کے لیے پسند فرمایا اور دس دینار یعنی نوٹے روپے میں یہ زمین خرید لی گئی اور جگہ کو ہموار کر کے اور درختوں کو کاٹ کر مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دُعا مانگتے ہوئے سنگ بنیاد رکھا اور جیسا کہ قبائر کی مسجد میں ہوا تھا صحابہ نے معماروں اور مزدوروں کا کام کیا جس میں کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شرکت فرماتے تھے۔ بعض اوقات اینٹیں اٹھاتے ہوئے صحابہ حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

هَذَا الْيَوْمَ لَا حِمْلَ خَيْبَرٍ هَذَا أَبَرُّ رَبَّنَا وَأَطْهَرُ

یعنی "یہ بوجہ خیبر کے تجارتی مال کا بوجھ نہیں ہے جو جانوروں پر لد کر آیا کرتا ہے بلکہ اسے ہمارے مولیٰ! یہ بوجھ تقویٰ اور طہارت کا بوجھ ہے جو ہم تیری رضا کے لیے اُٹھاتے ہیں۔"

اور کبھی کبھی صحابہ کام کرتے ہوئے عبداللہ بن رواحہ کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

اللَّهُمَّ إِنَّ الْأَجْرَ أَجْرُ الْأَخِيذَةِ فَإِذَا حَمِدَ الْأَنْصَارُ وَالْمُهَاجِرَةُ

یعنی "اے اللہ! اصل اجر تو صرف آخرت کا اجر ہے۔ پس تو اپنے فضل سے انصار و مہاجرین پر اپنی رحمت نازل فرما۔"

جب صحابہ یہ اشعار پڑھتے تھے تو بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا

ریتے تھے اور اس طرح ایک لمبے عرصہ کی محنت کے بعد یہ مسجد مکمل ہوئی یہ مسجد کی عمارت پتھروں کی ریلوں اور اینٹوں کی تھی جو ککڑی کے کھمبوں کے درمیان چٹن دی گئی تھیں اور چھت پر کھجور کے تنے اور شاخیں ڈالی گئی تھیں۔ مسجد کے اندر چھت کے سہارے کے لیے کھجور کے ستون تھے اور جب تک منبر کی تجویز نہیں ہوئی انہی ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے وقت ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ مسجد کا فرش کچا تھا اور چونکہ زیادہ بارش کے وقت چھت ٹپکنے لگ جاتی تھی اس لیے اسے اوقات میں فرش پر کچھڑا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس تکلیف کو دیکھ کر بعد میں کنکریوں کا فرش بنوا دیا گیا۔ شروع شروع میں مسجد کا رخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا تھا، لیکن تحویل قبلہ کے وقت یہ رخ بدل دیا گیا۔ مسجد کی بندی اُس وقت دس فٹ اور طول ایک سو پانچ فٹ اور عرض نوٹے فٹ کے قریب تھا، لیکن بعد میں اُس میں توسیع کر دی گئی۔

مسجد کے ایک گوشے میں ایک چھت دار چبوترہ بنایا گیا تھا جسے صُفہ کہتے تھے۔ یہ ان غریب مہاجرین کے لیے تھا جو بے گھر بار تھے۔ یہ لوگ یہیں رہتے تھے اور اصحاب الصُفہ کہلاتے تھے۔ ان کا کام گویا دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنا، عبادت کرنا اور قسمان شریفیت کی تلاوت کرنا تھا۔ ان لوگوں کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی خبر گیری فرماتے تھے اور جب کبھی آپ کے پاس کوئی حدیث وغیرہ آتا تھا یا گھر میں کچھ ہوتا تھا تو ان کا حق ضرور نکالتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات خود فاقہ کرتے اور جو کچھ گھر میں ہوتا تھا وہ اصحاب الصُفہ کو بھجوا دیتے تھے۔ انصار بھی ان کی مہمانی میں حتی المقدور مصروف رہتے تھے اور ان کے لیے کھجوروں کے خوشے لالا کر مسجد میں لٹکا دیا کرتے تھے۔ لیکن بائینہ ان کی حالت تنگ رہتی تھی اور بسا اوقات فاقہ تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور یہ حالت کئی سال تک جاری رہی حتیٰ کہ کچھ تو دینہ کی آبادی کی وسعت کے نتیجہ میں ان لوگوں کے لیے کام نکل آیا۔ اور کچھ قومی بیت المال سے امداد کی صورت پیدا ہو گئی۔

مسجد کے ساتھ ملحق طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رہائشی مکان تیار کیا گیا تھا۔ مکان کیا تھا ایک دس پندرہ فٹ کا چھوٹا سا حجرہ تھا اور اس حجرہ اور مسجد کے درمیان ایک دروازہ رکھا گیا تھا جس میں سے گزر کر آپ نماز وغیرہ کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ جب آپ نے اور شاخیاں کیں تو اسی حجرہ کے ساتھ ساتھ دوسرے حجرات تیار ہوتے گئے۔ مسجد کے آس پاس بعض اور صحابہ کے مکانات بھی تیار ہو گئے۔

یہ تھی مسجد نبوی جو دینہ میں تیار ہوئی اور اس زمانہ میں چونکہ اور کوئی پبلک عمارت ایسی نہ تھی جہاں قومی کام سرانجام دیئے جاتے اس لیے ایوان حکومت کا کام بھی یہی مسجد دیتی تھی۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگتی تھی۔ یہیں تمام قسم کے مشورے ہوتے تھے۔ یہیں مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا۔ یہیں سے احکامات صادر ہوتے تھے یہی قومی ہمان خانہ تھا اور ضرورت ہوتی تھی تو اسی سے جنگی قیدیوں کی جس گاہ کا کام بھی لے لیا جاتا تھا۔

سروہیم میورا اس مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”گو یہ مسجد سامان تعمیر کے لحاظ سے نہایت سادہ اور معمولی تھی، لیکن محمد (صلعم) کی یہ مسجد اسلامی تاریخ میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ رسول خدا اور ان کے اصحاب اسی مسجد میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ گزارتے تھے یہیں اسلامی نماز کا باقاعدہ باجماعت صورت میں آغاز ہوا۔ یہیں تمام مسلمان جمعہ کے دن خدا کی تازہ وحی کو سننے کے لیے مؤدبانہ اور مرغوب حالت میں جمع ہوتے تھے۔ یہیں محمد (صلعم) اپنی فتوحات کی تجاویز پختہ کیا کرتے تھے۔ یہی وہ ایوان تھا جہاں مفتوح اور تائب قبائل کے رفودان کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ یہی وہ دربار تھا جہاں سے وہ شاہی احکام جاری کئے جاتے تھے جو عرب کے دور دراز کونوں تک باغیوں کو خوف گرزادیتے تھے اور بالآخر اسی مسجد کے پاس اپنی بیوی عائشہ کے حجرے میں محمد (صلعم) نے اپنی جان دی اور اسی جگہ اپنے دو غلیفوں کے پہلو پر پہلوؤں مدفون ہیں۔“

یہ مسجد اور اس کے ساتھ کے حجرے کم و بیش سات ماہ کے عرصہ میں تیار ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نئے مکان میں اپنی بیوی حضرت سوڈہ کے ساتھ تشریف لے گئے بعض دوسرے مہاجرین نے بھی انصار سے زمین حاصل کر کے مسجد کے آس پاس مکانات تیار کر لیے اور جنہیں مسجد کے قریب زمین نہیں مل سکی۔ انہوں نے دور دور مکان بنائے اور بعض کو انصار کی طرف سے بنے بنائے مکان مل گئے تھے۔

### ابتداء اذان

ابھی تک نماز کے لیے اعلان یا اذان وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔ صحابہ عموماً وقت کا اندازہ کر کے خود نماز کے لیے جمع ہو جاتے تھے، لیکن یہ صورت کوئی قابل اطمینان نہیں تھی۔ اب مسجد نبوی کے تیار ہو جانے پر یہ سوال زیادہ محسوس طور پر پیدا ہوا کہ کس طرح مسلمانوں کو وقت پر جمع کیا جاوے۔ کسی صحابی نے انصاری کی طرح ناقوس کی رائے دی۔ کسی نے یہود کی مثال میں بوق کی تجویز پیش کی کسی نے کچھ کہا مگر حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ کسی آدمی کو مقرر کر دیا جائے کہ وہ نماز کے وقت یہ اعلان کر دیا کرے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اس فرض کو ادا کیا کریں گے چنانچہ اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا بلالؓ بلند آواز سے اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ کہہ کر پکارا کرتے تھے اور لوگ جمع ہو جاتے تھے بلکہ اگر نماز کے علاوہ بھی کسی غرض کے لیے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کرنا مقصود ہوتا تھا تو یہی ندا دی جاتی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ایک صحابی عبداللہ بن زید انصاری کو خواب میں موجودہ اذان کے الفاظ سکھائے گئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اس خواب کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو اذان کے طریق پر یہ الفاظ پکارتے سنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ خواب خدا کی طرف سے

ہے اور عبد اللہ کو حکم دیا کہ بلاں کو یہ الفاظ سکھادیں عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جب بلاں نے ان الفاظ میں پہلی دفعہ اذان دی تو حضرت عمرؓ اُسے شکر جلدی جلدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آج جن الفاظ میں بلاں نے اذان دی ہے بعینہ یہی الفاظ میں نے بھی خواب میں دیکھے ہیں۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے الفاظ سنے تو فرمایا کہ اسی کے مطابق وحی بھی ہو چکی ہے۔ الغرض اس طرح موجودہ اذان کا طریق جاری ہو گیا اور جو طریق اس طرح جاری ہوا وہ ایسا مبارک اور دلکش ہے کہ کوئی دوسرا طریق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ گویا ہر روز پانچ وقت اسلامی دنیا کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ہر مسجد سے خدا کی توحید اور محمدؐ رسول اللہ کی رسالت کی آواز بلند ہوتی ہے اور اسلامی تعلیمات کا خلاصہ نہایت خوبصورت اور جامع الفاظ میں لوگوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

**رکعات نماز میں ایزادی** یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ نماز جو اسلامی عبادات میں سب سے افضل عبادت بھی گئی ہے مکہ میں ہی فرض ہو چکی ہیں، لیکن اب تک سوائے نماز مغرب

کے جس میں تین رکعات تھیں باقی تمام فرض نمازوں میں صرف دو رکعات تھیں، لیکن ہجرت کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے حکم پا کر سفر کے لیے تو وہی دو رکعات نماز رہنے دی لیکن حضر کے لیے سوائے نماز فجر اور مغرب کے جو اپنی پہلی صورت میں قائم رہیں باقی نمازوں میں چار چار رکعات فرض کر دیں اور اس طرح سفر و حضر کا امتیاز قائم ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کے تمام احکام میں میانہ روی کو اختیار کیا گیا ہے اور ان عملی مشکلات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو انسان کو اس کی زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں، چنانچہ نماز کے مسائل میں ہی بہت سے احکام ایسے پائے جاتے ہیں جو حالات کے اختلاف سے بدل جاتے ہیں مثلاً سفر و حضر کی نماز کے امتیاز کے علاوہ جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ نماز کی ظاہری شکل و صورت کا ملحوظ رکھنا عام حالات میں ضروری ہے، لیکن جو شخص بیماری وغیرہ کی وجہ سے نماز کو اس کی مقررہ صورت میں ادا نہ کر سکتا ہو اس کے لیے اجازت ہے کہ ظاہری صورت کو ترک کر کے بیٹھے بیٹھے یا اگر یہ بھی مشکل ہو تو لیٹے لیٹے ہی نماز ادا کرے۔ اسی طرح نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنا واجبات میں سے ہے لیکن جب کوئی شخص سفر میں ہو اور سواری پر بیٹھے ہوئے اُسے جہت کا پتہ نہ لگ سکے یا وہ جہت کو قائم نہ رکھ سکے تو اسلام اُسے اختیار دیتا ہے کہ جدھر اس کی سواری کا رخ ہو اُدھر منہ کر کے نماز ادا کرے۔ اسی طرح نماز کے لیے مقررہ طریق پر وضو کرنا ضروری ہے، لیکن ایسا شخص جسے پانی نہ ملے یا جسے وضو کرنے سے بیماری کا اندیشہ ہو وہ وضو ترک کر سکتا ہے۔ وغیرہ ذالک۔

اسی طرح دوسرے امور میں بھی جہاں کہیں کوئی معقول عمل وقت پیدا ہو جاتی ہے اسلام اپنے احکام کی صورت



کو مناسب طور پر بدل کر اس کی جگہ کوئی دوسری صورت پیش کر دیتا ہے جس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ اقل تو اسلام کا پیغام ایک عالمگیر وسعت رکھتا ہے جس میں حالات کے اختلاف کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ شریعتِ اسلامی میں اصل مقصود عبادات کی رُوح ہے اور عبادات کا جسم صرف اس رُوح کے بقا اور حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور اسی لیے جہاں کہیں بھی حالات کے بدل جانے سے جسم کا اختیار کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہاں جسم کو ترک کر کے رُوح کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جملہ عبادات میں سب زیادہ غلط نماز پر دیا ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ نماز مومن کا معراج ہے۔ نیز فرماتے تھے کہ نماز ایسی عبادت ہے جس میں بندہ اپنے خدا سے مکلام عطا اور گویا اس کی مجلس میں پہنچ جاتا ہے اور آپؐ کو نماز سے اس قدر محبت تھی کہ نماز بھگانے تو غیر فرض ہی ہے دوسری نوافل نمازیں بھی آپؐ نہایت کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور نماز تہجد یعنی نصف شب کی نماز سے تو آپؐ کو اتنا شغف تھا کہ آپؐ نہایت التزام کے ساتھ بلا غلطی اس نماز کے لیے اٹھا کرتے تھے اور رات آتی ہے کہ آپؐ اس قدر دیر تک نماز تہجد میں کھڑے رہتے تھے کہ بعض اوقات آپؐ کے پاؤں متوڑ جاتے تھے اور آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ یعنی نماز تو میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور آپؐ اپنے صحابہ کو نماز کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ اگر لوگوں کو یہ علم ہو کہ نماز باجماعت میں کیا خوبی ہے تو خواہ انہیں اپنے گھٹنے گسیٹے ہوئے مسجد میں آنا پڑے وہ منورہ آئیں۔ اپنی آخری بیماری میں جبکہ آپؐ کو غشی پر غشی آتی تھی اور سخت بے چینی کی حالت تھی آپؐ نے ایک دفعہ صبح کے وقت اپنے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو مسجد میں صحابہ نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر آپؐ کا چہرہ اس قدر خوشی سے تپا اٹھا جیسے کوئی مرہبایا ہوا پھول یکلخت شگفتہ ہو جاتا اور بعض روایات میں ہے کہ آخری فقرہ جو آپؐ کی زبان سے سنا گیا وہ الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ تھا۔ یعنی میری اُمت کے لوگو! نماز اور غلاموں کے متعلق میری تعلیم کو فراموش نہ کرنا یہ

**یہودیوں میں پہلا مسلمان** اب تک مسلمان ہونے والے لوگوں میں غالباً بعض مسیحی تو شامل ہو چکے تھے، مگر یہودی کوئی نہیں تھا، لیکن اب ہجرت کے بعد یہ سلسلہ بھی شروع

ہوا اور گویہودیوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہت ہی متوڑے لوگ ایمان لائے لیکن یہ قوم بھی بالکل محروم نہیں رہی۔ سب سے پہلا یہودی جو مشرف بہ اسلام ہوا اس کا نام حصین بن سلام تھا۔ یہ شخص مدینہ کا رہنے والا تھا اور یہودیوں میں اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت اثر رکھتا تھا۔ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ہی تھے کہ یہ شخص آپؐ کے دعویٰ کو سن کر کچھ اسلام کی طرف مائل ہو چکا تھا، مگر ابھی تک اس نے اپنی اس حالت کا کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ جب آپؐ مدینہ میں تشریف لائے تو یہ شخص غنیہ طور پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چونکہ طبیعت میں سعادت تھی

پہلی ملاقات میں ہی مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اُسے یہ شوق ہوا کہ اس کی قوم کے لوگ بھی اس نود سے غروم نہ رہیں۔ جس سے خدا نے اس کے سینے کو منور کیا تھا، چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپؐ یہودیوں کے سر کا وردہ لوگوں کو اپنے پاس بلائیں اور انہیں اسلام کی تبلیغ کریں اور ان سے میرے متعلق راستے دریافت فرمائیں کہ میں ان میں کیسا آدمی سمجھا جاتا ہوں تاکہ اگر وہ میرے متعلق اچھی رائے کا اظہار کریں تو شاید میرے اسلام لانے کی خبر بھی ان کی ہدایت کا موجب ہو جاوے، چنانچہ حصین بن سلام ایک طرف ہو کر چھپ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی علماء کو اپنے پاس بلا کر اسلام کی تبلیغ کی مگر انہوں نے نہ مانا۔ اس کے بعد آپؐ نے حصین بن سلام کے متعلق راستے دریافت کی۔ جس پر انہوں نے حصین کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی اھلکما کہ وہ ہمارا سردار اور ابن سردار ہے وغیرہ ذاک۔ آپؐ نے کہا دیکھو اگر وہ مسلمان ہو جائے تو پھر تم بھی مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گے؟ انہوں نے کہا نعوذ باللہ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ حصین مسلمان ہو جاوے۔ آپؐ نے حصین کو آمادہ دی۔ اور وہ اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر آ گئے اور یہودی علماء سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے میری قوم کے لوگو! خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کے عذاب کو اپنے اوپر مت بوجھتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود ہے اور وہ وہی نبی ہیں جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا۔ پس خدا سے ڈرو اور انکلیب کی طرف قدم نہ بڑھاؤ۔ یہ سن کر پہلے تو یہودی لوگ سخت مبہوت ہو گئے اور پھر کہنے لگے کہ ہم حصین کی بات نہیں مانتے یہ جھوٹا اور کذاب ہے اور پھر حصین بن سلام کو گالیاں دیتے ہوئے وہ آپؐ کی مجلس سے اٹھ گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان ہونے پر حصین کا نام بدل کر عبداللہ کر دیا اور اسی نام سے وہ تاریخ و حدیث میں معروف ہیں۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو عام طور پر اس کا وہی نام رہنے دیتے تھے جو پہلے ہوتا تھا یا اگر کسی شخص کا نام مشرکانہ ہوتا تھا تو آپؐ اسے بدل دیتے تھے۔ حصین بن سلام کا نام مشرکانہ تو نہیں تھا، لیکن غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ یہ شخص یہود میں سے پہلا نو مسلم ہے اس کے نام کو خاص اسلامی رنگ میں بدلنا مناسب خیال فرمایا۔

**اہل فارس میں پہلا مسلمان** اسی زمانہ کے قریب قریب سلمان فارسی مسلمان ہوئے۔ سلمان ملک فارس کے بنے والے تھے اور ابتداءً زرتشتی مذہب کے پیرو تھے لیکن فطری

سعادت نے اس مذہب کی اس وقت کی حالت پر قسطنطنیہ پانی اور وہ کسی بہتر مذہب کی تلاش میں وطن سے نکلے اور بالآخر شام میں آکر عیسائی ہو گئے۔ اسی زمانہ میں کسی ٹوٹ مار میں وہ غلام بنائے گئے۔ مگر یہی غلامی ان کے اسلام کا باعث بن گئی۔ کیونکہ کئی آقاؤں کے تبادلہ کے بعد بالآخر مدینہ کے ایک شخص نے انہیں خرید کر اپنے پاس رکھ لیا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو سلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے پھر انہوں نے آہستہ آہستہ روپے کا انتظام کر کے اپنے آقا سے آزادی حاصل کر لی اور سب سے پہلی مرتبہ وہ غزوہ خندق میں شریک جہاد ہوئے اور انہی کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ سلمان نہایت پارسا اور متقی آدمی تھے اور بالکل درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ ان سے ایک دفعہ کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپؐ کے باپ کا کیا نام ہے تو انہوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا

کہیں ابنِ اسلام ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ان کے متعلق فرمایا کہ مسلمان مٹا اھل البیت ہے کہ سلمان ہم اہلبیت میں سے ہیں۔ اور ایک دفعہ جب کہ یہ قرآنی آیت نازل ہوئی کہ آئندہ ایک زمانہ میں ایک جماعت صحابہ کی مانند اور انہیں کی تعلیم کی حامل پیدا ہوگی تو صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے۔ اس پر آپؐ نے سلمان فارسی پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ لو کان الا یمعان ہذا الشتریا لئلا یرجأ اذ حبل من ھو لا یموت یعنی اگر ایمان خریا تک بھی اٹھ جائے گا تو ان فارسی الاصل لوگوں میں سے ایک شخص اسے دنیا میں پھر قائم کر دیگا۔

**قبیلہ اوس و خزرج کے غیر مسلم رؤساء** یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ میں ابھی تک اوس و خزرج کے بہت سے لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ بدستور اپنے مذہب پر قائم تھے۔

ان میں سے دو شخص خاص طور پر ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے؛ چنانچہ عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس خزرج کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کہ وہ کس طرح شروع میں تو اسلام سے الگ الگ رہا مگر بعد میں بظاہر مسلمان ہو گیا، لیکن درپردہ اسلام کا دشمن رہا اور منافقین مدینہ کا سردار بن گیا۔ دوسرا شخص ابو عامر تھا جو قبیلہ اوس کا رئیس تھا یہ شخص اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ میں ایک سیاح رہ چکا تھا اور بہت سے ممالک میں سفر کرنے کے بعد اب گویا تارک الدنیا ہو کر راہب کہلاتا تھا۔ ابو عامر کچھ فخریت کی طرف مائل تھا اور ایک آداب مذہبی معلم ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر اس نے آپؐ کی مخالفت شروع کی اور بالآخر اپنے بغض و حسد میں جلتا ہوا مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ وہ چند لوگ بھی جو اس کے زیر اثر تھے مدینہ چھوڑ گئے۔ جنگ اُحد میں ابو عامر مکہ والوں کی طرف ہو کر میدان جنگ میں آیا اور قدرتِ حق کا عجیب نظارہ ہے کہ اسی جنگ میں اس کا لڑکا حنظلہ جو ایک نہایت مخلص مسلمان تھا، مسلمانوں کی طرف سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ابو عامر فتح مکہ تک مکہ میں ہی مقیم رہا اور فتح مکہ کے بعد طائف چلا گیا اور جب طائف بھی صحابہؓ کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو وہ مسلمانوں کے خلاف رومی سلطنت کے ساتھ سازش کرنے کی نیت سے شام کی طرف نکل گیا، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ابو عامر جب مدینہ میں تھا تو طعن و تحقیر کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طرید و حید (یعنی وطن سے نکالا ہوا اکیلا چھوڑا ہوا شخص) کہہ کر پکارا کرتا تھا، لیکن آخر خود اس کا یہ انجام ہوا کہ بالآخر وہیں شام میں وہ بے وطنی اور بے کسی دہلیسی کی حالت میں بھٹکا ہوا مر گیا۔

**مواخات انصار و مہاجرین** اس وقت مدینہ کے مسلمان دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک تو وہ تھے جو مدینہ کے باشندے نہ تھے بلکہ مکہ یا کسی اور جگہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بوجہ اپنی ہجرت کے مہاجرین کہلاتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور

جو مکہ والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ان کی اعانت کا بیڑا اٹھایا تھا اس لیے

وہ انصار کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ مہاجرین عام طور پر مدینہ میں بالکل بے سرو سامان تھے کیونکہ غریب تو غریب تھے ہی، مگر مہاجرین بھی غونا، اپنا سب مال و متاع وطن میں چھوڑ کر نکل آئے تھے۔ انصار نے ان کے ساتھ حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا اور کوئی دقیقہ ان کی معائن و نوازی کا اٹھا نہیں رکھا، لیکن اس رشتہ اخوت کو اور بھی مضبوط کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز فرمائی کہ انس بن مالک کے مکان پر انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا اور باہم مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دُودُو کا جوڑا بنا کر انصار و مہاجرین کے کم و بیش فوٹے اشخاص کے درمیان باقاعدہ رشتہ اخوت قائم کر دیا۔ اس سلسلہ موافقہ پر طرفین کی طرف سے جس بہت سی اخلاص اور وفاداری کے ساتھ عملدرآمد ہوا وہ آج کل کی حقیقی اخوت کو بھی شرماتا ہے۔

انصار و مہاجرین بھائی بھائی بن گئے، گویا ایک جان و دو قالب ہو گئے۔ پہلی تجویز انصار نے اس رشتہ اخوت کے بعد یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست پیش کی کہ آپ ہمارے باغات کو ہم میں اور ہمارے بھائیوں میں تقسیم فرمادیں۔ لیکن چونکہ مہاجرین غونا تجارت پیشہ تھے اور کھیتی باڑی کے کام سے قطعاً ناواقف تھے بلکہ مکہ والے تو اس کام کو پسند بھی نہیں کرتے تھے، اس لیے پھر انصار نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ باغات کا انتظام اور محنت ہم کریں گے، مگر حاصل میں سے مہاجرین کو حصہ مل جایا کہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا حتیٰ کہ آہستہ آہستہ مہاجرین کی تجارتیں جن میں وہ مدینہ میں آکر مشغول ہو گئے تھے چل نکلیں اور ان کی اپنی جائیدادیں بھی بن گئیں اور انصار کی طرف سے امداد کی ضرورت نہ رہی۔ لکھا ہے کہ جب مہاجرین نے انصار کی طرف سے اس غیر معمولی لطف و شفقت کو دیکھا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انصار کے اس سلوک کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یا رسول اللہ انصار کی اس نیکی کو دیکھ کر ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں خدا سے سارا اجر وہی نہ لے جائیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا جب تک تم ان کی نیکی کے شکر گزار اور خدا کے حضور ان کے لیے دست بردار ہو گے تم اجر سے محروم نہیں ہو سکتے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف سعد بن الربیع انصاری کے بھائی بنے تھے سعد نے اپنا سارا مال و متاع نصف گن گنی کر عبدالرحمن بن عوف کے سامنے رکھ دیا اور جوش محبت میں یہاں تک کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں۔ میں ان میں سے ایک کو طلاق دیتے دیتا ہوں اور پھر اس کی عدت گزرنے پر تم اس کے ساتھ شادی کر لینا۔ یہ سعد کی طرف سے جوش محبت کا ایک بے اختیار اظہار تھا۔ ورنہ وہ اور عبدالرحمن دونوں جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، چنانچہ عبدالرحمن بن عوف نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لیے دعا کرتے ہوئے کہا کہ خدا یہ سب کچھ تمہیں مبارک کرے۔ مجھے بازار کا رستہ بتا دو، چنانچہ عبدالرحمن بن عوف نے تجارت شروع کی اور چونکہ وہ نہایت ہوشیار اور سمجھدار آدمی تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی تجارت چمک اٹھی اور بالآخر وہ ایک نہایت امیر کبیر آدمی بن گئے۔ ابھی ان کی تجارت ابتدائی حالت میں ہی تھی اور انہیں مدینہ میں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انہوں نے مدینہ کی ایک انصاری لڑکی سے شادی کر لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے

۱۔ بخاری باب الحجرت و نیز دیکھو مسلم کتاب الجہاد باب رد المہاجرین الی الانصار :

۲۔ مسلم باب مذکور : ۳۔ ابوداؤد :



پہلوں پر زعفران کا رنگ دیکھا جو عرب دستور کے مطابق شادی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ تو مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا۔  
 ”ابن عوف یہ کیا ماجرا ہے؟“ عبدالرحمن نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے؟“ آپ نے  
 پوچھا: ”مہر کیا دیا ہے؟“ عبدالرحمن نے جواب دیا: ”یا رسول اللہ! کھجور کی ایک گٹھلی کے برابر سونا دیا ہے؟“ آپ نے فرمایا:  
 ”اَوَّلَیْہِ ذَکْوَبِشَاقَہُ“ تو اب پھر ولیمہ کی دعوت کرنی ہوگی۔ خواہ صرف ایک بکری کے گوشت کی کیوں نہ ہو؟ یعنی اب تمہاری  
 حیثیت ایسی نہیں ہے کہ ایک دو دوستوں کو کھانا کھلا کر سمجھو کہ بس ولیمہ ہو گیا بلکہ کم از کم ایک بکری کے اندازہ کا گوشت تو  
 دعوت میں پکنا چاہیے۔ اس سلسلہ مواخات کا اثر وراثت تک پر تھا، چنانچہ یہ فیصلہ تھا کہ اگر کوئی انصاری فوت ہو تو  
 اس کا ترکہ حصہ رسدی اس کے بھائی مہاجر کو بھی ملے۔ یہ سمجھوڑ جنگ بدلتی قائم رہا جس کے بعد یہ وراثت خدا  
 کی وحی کے ماتحت منسوخ ہو گیا اور صرف حقیقی رشتہ ولد وراثت قرار دینے لگے۔ اس سلسلہ مواخات میں حضرت ابوبکر فارح  
 بن زید کے بھائی بنے حضرت عمر قتبان بن مالک کے۔ حضرت عثمان اوس بن ثابت کے۔ ابولہیدہ بن الجراح سعد بن  
 معاذ کے۔ سعید بن زید ابی بن کعب کے۔ سلمان فارسی ابودرداس کے۔ مصعب بن عمیر ابویوب انصاری کے۔ عمار بن یاسر عذینہ  
 بن میان کے۔ وغیرہ مالک۔

مواخات کا یہ سلسلہ کئی لحاظ سے مفید اور بابرکت ہوا۔

اقل :- جو پریشانی ادب بے اطمینانی مہاجرین کے دلوں میں اس بے وطنی و بے مروت سامانی کی حالت میں پیدا  
 ہو سکتی تھی وہ اس سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے۔

دوم :- رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملحدگی کے نتیجہ میں جن تکلیف کے پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ وہ ان نئے  
 روحانی رشتہ داروں کے مل جانے سے جو جہانی رشتہ داروں کی نسبت بھی زیادہ محبت کرنے والے اور زیادہ وفادار  
 تھے پیدا نہ ہوئی۔

سوم :- انصار و مہاجرین کے درمیان جو محبت و اتحاد مذہبی اور سیاسی اور تمدنی لحاظ سے ان ایام میں ضروری  
 تھا وہ مضبوط ہو گیا۔

چہارم :- بعض غریب اور بے کار مہاجرین کے لیے ایک سہارا اور ذریعہ معاش پیدا ہو گیا۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی بعثت سے قبل مدینہ کی آبادی دو حصوں میں

منقسم تھی۔ ایک قبیلہ پرست تھے جو قبائل اوس و خزرج میں منقسم تھے۔ اور دوسرے یہود تھے جن کے تین قبائل کا  
 ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ اسلام کی آمد نے ایک تیسری جماعت مسلمانوں کی پیدا کر دی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ  
 وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کی آبادی میں ایک اور فرقہ کا اضافہ ہو گیا جو منافقین کے نام سے یاد کیا جاتا



ہے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ایک آسمانی بارش کے طور پر تھا جس کے نتیجے میں زمین سے ہر قسم کی اچھتی بڑی روئیدگی نمودار ہوتی شروع ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ کی مسلمان آبادی بھی دو شاخوں میں منقسم ہو گئی اور مہاجرین و انصار کی اصطلاح کا آغاز ہو گیا۔ اب گویا مدینہ میں مندرجہ ذیل فرقوں کا وجود پایا جاتا ہے۔

اول :- مسلمان جو دو شاخوں میں منقسم تھے (الف) مہاجرین جو عموماً مکہ کے رہنے والے تھے اور جو کفار کے مظالم سے تنگ آ کر اپنے وطن سے نکل آئے تھے۔

(ب) انصار جو مدینہ کے باشندے تھے اور جنہوں نے اسلام اور باقی اسلام کی مدد اور حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ لوگ قریباً سب کے سب اوس وغزرج کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

دوم :- منافقین یعنی اوس وغزرج کے وہ لوگ جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر دل میں کافر تھے اور اسلام اور باقی اسلام کے خلاف خفیہ کارروائیاں کرتے رہتے تھے نیز ایسے لوگ بھی اسی گروہ میں شامل کئے جاتے تھے جو دیسے تو ایمان لے آئے تھے مگر ان کی عملی حالت عموماً غیر موثقانہ تھی اور غیروں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی اسی طرح قائم تھے۔

سوم :- بُت پرست یعنی اوس وغزرج کے وہ لوگ جو ابھی تک شرک پر قائم تھے۔

چہارم :- یہود جو قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ میں منقسم تھے۔

ان چار فرقوں میں سے پہلے فرقہ کی دونوں شاخیں پورے طور پر ایک نقطہ پر جمع تھیں کیونکہ ہر امر میں ان کی آنکھیں ایک ہی وجود کی طرف اٹھتی تھیں اور گمراہی و اطمینان میں ان کا رنگ و رنگ مختلف تھا اور عرب کے قدیم دستور اور رسم و رواج کے مطابق ان کا ایک نقطہ پر جمع ہونا آسان کام نہ تھا، لیکن اسلام کی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقناطیسی شخصیت نے دوسرے سب جذبات کو دبا دیا تھا۔ دوسرا گروہ جو منافقین کا تھا وہ ایک نہایت خطرناک گروہ تھا۔ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان تھے مگر دل میں اسلام کے سخت دشمن تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض اور حسد کی آگ سے جلے جاتے تھے۔ ان کی خفیہ ریشہ دوانیوں اور مخفی شراوتوں نے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کئی موقعوں پر نہایت خطرناک حالات پیدا کر دیئے مگر چونکہ یہ لوگ بظاہر مسلمان کہلاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں اپنے آپ کو شمار کرتے تھے، اس لیے انہیں بہر حال مسلمانوں کے ساتھ ملکر رہنا پڑتا تھا۔ اور وہ اس بات پر مجبور تھے کہ کم از کم ظاہری طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو اپنے اوپر تسلیم کریں۔ تیسرا گروہ، بُت پرستوں کا تھا۔ یہ لوگ ہجرت کے وقت تک تو کافی تعداد میں تھے مگر اس کے بعد ان کی تعداد جلد بحد کم ہوتی گئی اور تھوڑے عرصہ میں ہی مدینہ کا شہر شرک کے عنصر سے بالکل پاک ہو گیا۔ یہ لوگ گویا مسلمان نہ تھے لیکن عرب کے تمدن کے ماتحت وہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ اپنے کثیر التعداد مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ پس سیاسی طور پر یہ گروہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے تھا اور آپ کی حکومت کو

تسلیم کرتا تھا مگر چونکہ گروہ جو یہود پر مشتمل تھا وہ ہر طرح آزاد اور خود مختار تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دورانہ پیش طبیعت سے یہ بعید تھا کہ آپ ایسے حالات میں جبکہ شہر کا امن اور مسلمانوں کے جان و مال معرض خطر میں تھے اور پھر قریش کی عداوت کی وجہ سے اسلام کی موت اور زندگی کا سوال سامنے تھا ان یہود کو مدینہ میں بغیر کسی معاہدہ کے چھوڑ دیتے؛ چنانچہ اجماعی ہجرت پر بہت تھوڑا عرصہ ہی گذرا تھا کہ آپ نے ایک طرف مہاجرین اور اوس و خزرج اور دوسری طرف یہود کے عہد کو جمع کر کے ان کے سامنے اس ضرورت کو بیان کیا کہ مدینہ کی مختلف اقوام کے درمیان ایک باہمی معاہدہ ہو جانا چاہیے جس کے ماتحت آئندہ شہر کے امن اور اس کے مختلف الاقوام باشندوں کی حفاظت اور یہودی کا انتظام ہو سکے اور کوئی صورت جھگڑے اور امن شکنی کی پیدا نہ ہو چنانچہ پہلے تو آپ نے مسلمانوں اور اوس و خزرج کے اندرونی نظم و نسق کے متعلق چند قواعد فیصلہ فرمائے اور پھر اتفاق رائے سے یہود کے ساتھ ایک معاہدہ طے فرمایا جو یا منابطہ منبسطہ تحریر میں لایا گیا۔ یہ معاہدہ جس کی طرف احادیث اور قسسان شریف میں بھی اشارہ آتا ہے پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ میں درج ہے اور اس جگہ ہم اس کی موٹی موٹی شرطیں اپنے الفاظ میں ہنیہ تاخرین کرتے ہیں:

- ۱۔ مسلمان اور یہودی آپس میں ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف زیادتی یا ظلم سے کام نہیں لیں گے۔
- ۲۔ ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔
- ۳۔ تمام باشندگان کی جائیں اور اموال محفوظ ہوں گے اور ان کا احترام کیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ کوئی شخص ظلم یا جرم کا مرتکب ہو۔
- ۴۔ ہر قسم کے اختلاف اور تنازعات رسول اللہ کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش ہوں گے اور ہر فیصلہ خدائی حکم (یعنی ہر قوم کی اپنی شریعت) کے مطابق کیا جائے گا۔
- ۵۔ کوئی فریق بغیر اجازت رسول اللہ جنگ کے لیے نہیں نکلے گا۔
- ۶۔ اگر یہودیوں یا مسلمانوں کے خلاف کوئی قوم جنگ کرے گی تو وہ ایک دوسرے کی امداد میں کھڑے ہوں گے۔
- ۷۔ اسی طرح اگر مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو سب ملکر اس کا مقابلہ کریں گے۔
- ۸۔ قریش، مکہ اور ان کے معاونین کو یہود کی طرف سے کسی قسم کی امداد یا پناہ نہیں دی جائے گی۔
- ۹۔ ہر قوم اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کرے گی۔
- ۱۰۔ اس معاہدہ کی رُو سے کوئی ظالم یا آثم یا مفسد اس بات سے محفوظ نہیں ہوگا کہ اسے سزا دی جاوے یا اس سے انتقام لیا جاوے۔

اس معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات منضبط ہو گئے اور مدینہ میں ایک قسم کی منظم حکومت

کی بنیاد قائم ہو گئی جس کے ماتحت ہر قوم باوجود اپنے مذہب اور اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہونے کے ایک اجتماعی قانون اور مرکزی حکومت کے ماتحت آگئی اور اس مرکزی حکومت کے صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرار پائے۔

**مشرکین مدینہ کے نام قریش تکہ کا تہدیدی خط** ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لائے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ قریش مکہ کی طرف

سے عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس قبیلہ خزرج اور اس کے مشرک رفقاء کے نام ایک تہدیدی خط آیا کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ سے دستبردار ہو جاؤ؛ ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے؛ چنانچہ اس خط کے الفاظ یہ تھے:

اِنَّا نَقِيْمُ بِاللّٰهِ لَنُفَقَّ اَوْ قُتِلْنَا اَوْ قُتِلْنَا اَوْ لَنَسِيْعَ نِسَاءَكُمْ  
اَلَيْكُمْ بِاَجْمَعِنَا حَتّٰى نَقْتُلَ مَقَاتِلَكُمْ وَنَسِيْعَ نِسَاءَكُمْ

یعنی تم لوگوں نے ہمارے آدمی محمد (صلعم) کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اسکا ساتھ چھوڑ کر اس کے خلاف جنگ کرو یا کم از کم اسے اپنے شہر سے نکال دو؛ ورنہ ہم اپنا سارا لاؤ لٹکے کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمہارے سارے مردوں کو تہ تیغ کر دیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے لیے جائز کر لیں گے۔

جب یہ خط مدینہ میں پہنچا تو عبداللہ اور اس کے ساتھی جو پہلے سے ہی دل میں اسلام کے سخت دشمن ہو رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ کو اطلاع ملی تو آپ فوراً ان لوگوں سے ملے اور ان کو بھایا کہ میرے ساتھ جنگ کرنے میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے کیونکہ تمہارے ہی بھائی بند تمہارے مقابلہ میں ہوں گے۔ یعنی اوس اور خزرج کے مسلمانوں نے بہر حال میرا ساتھ دینا ہے پس میرے ساتھ جنگ کرنے کے صرف یہ منہ ہوں گے کہ تم لوگ اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں اور باپوں کے خلاف تلوار اٹھاؤ۔ اب تم خود سوچ لو؟ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو جن کے دلوں میں ابھی تک جنگ بعاث کی تباہی کی یاد تازہ تھی یہ بات کبھی آگئی اور وہ اس ارادے سے باز آ گئے۔ یہ جب قریش کو اس تدبیر میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد اسی قسم کا ایک خط مدینہ کے یہود کے نام ارسال کیا۔ مگر اس کا ذکر آگے چل کر اپنے وقت پر آئے گا۔ دراصل کفار مکہ کی غرض یہ تھی کہ جس طرح بھی ہوا اسلام کے نام و نشان کو صفحہ دنیا سے مٹا دیا جاوے۔ مسلمان ان کے مقابلہ سے تنگ اگر حبشہ گئے تو وہاں انہوں نے ان کا پھپکا کیا۔ اور اس بات کی کوشش میں اپنی انتہائی طاقت صرف کر دی کہ نیک دل نجاشی ابن مظلوم غریب الوطنوں کو مکہ والوں کے حوالے کر دے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آ گئے تو قریش نے آپ کا تعاقب کر کے آپ کو گرفتار کر لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اب جب انہیں یہ علم ہوا کہ آپ اور آپ کے اصحاب مدینہ پہنچ گئے ہیں اور وہاں اسلام سرعیت کے ساتھ پھیل رہا ہے تو انہوں نے یہ تہدیدی خط بھیج کر مدینہ والوں کو آپ

کے ساتھ جنگ کر کے اسلام کو طیاسیٹ کر دینے یا آپ کی پناہ سے دستبردار ہو کر آپ کو مدینہ سے نکال دینے کی تحریک کی۔ قریش کے اس خط سے عرب کی اس رسم پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنے جنگوں میں دشمنوں کے سارے مردوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں پر قبضہ کر لیا کرتے تھے اور پھر ان کو اپنے لیے جائز سمجھتے تھے اور نیز یہ کہ مسلمانوں کے متعلق ان کے اہلے اسکی بھی زیادہ خطرناک تھے۔ کیونکہ جب یہ سزا انہوں نے مسلمانوں کے پناہ دینے والوں کے لیے تجویز کی تھی تو خود مسلمانوں کے لیے ترقینا دہ اس سے بھی زیادہ سخت ارادے رکھتے ہوں گے۔

### ابو جہل کی دھمکی

قریش مکہ کا یہ خط ان کے کسی عارضی جوش کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ وہ مستقل طور پر اس بات کا نتیجہ کر چکے تھے کہ مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیں گے اور اسلام کو دنیا سے مٹا کر چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ قریش مکہ کے غلی اراذول کا پتہ دے رہا ہے۔

بخاری میں روایت آتی ہے کہ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد سعد بن معاذ جو قبیلہ اس کے رئیس یا علم تھے اور مسلمان ہو چکے تھے عمرو کے خیال سے مکہ گئے اور اپنے زمانہ جاہلیت کے دوست امیہ بن خلف رئیس مکہ کے پاس مقیم ہوئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ مکہ والے ان کے ساتھ مزید بھڑکھڑا کر بیٹھے، اس لیے انہوں نے فتنہ سے بچنے کے لیے امیہ سے کہا کہ میں کہتے ہوں کہ طواف کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہو کر ایسے وقت میں مجھے طواف کرو جو کہ میں علیحدگی میں امن کے ساتھ اس کام سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ چنانچہ امیہ بن خلف دوپہر کے وقت جبکہ لوگ عموماً اپنے اپنے گھروں میں ہوتے ہیں سعد کو لیکر کعبہ کے پاس پہنچا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ عین اسی وقت ابو جہل بھی وہاں آکھلا اور جو نبی اس کی نظر سعد پر پڑی اس کی آنکھوں میں غول اُتر آیا مگر اپنے غصہ کو دبا کر وہ امیہ سے یوں مخاطب ہوا کہ اے ابوصفوان یہ تمہارے ساتھ کون شخص ہے؟ امیہ نے کہا: یہ سعد بن معاذ رئیس اس ہے۔ اس پر ابو جہل نہایت غضبناک ہو کر سعد سے مخاطب ہوا کہ کیا تم لوگ یہ خیال کرتے ہو کہ اس مُرتد (مُرتد مسلم) کو پناہ دینے کے بعد تم لوگ امن کے ساتھ کعبہ کا طواف کر سکو گے اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم اس کی حفاظت اور امداد کی طاقت رکھتے ہو؟ خدا کی قسم اگر اس وقت تیرے ساتھ ابوصفوان نہ ہوتا تو تو اپنے گھر والوں کے پاس نکال کر نہ جاسکتا؟ سعد بن معاذ فتنہ سے بچتے تھے مگر ان کی رگوں میں بھی ریاست کا خون تھا اور دل میں ایمانی خیرت جوش زن تھی۔ کروک کر بولے: واللہ اگر تم نے ہم کو کعبہ سے روکا تو یاد رکھو کہ پھر تمہیں بھی تمہارے شاہی راستے پر امن نہیں مل سکے گا۔ امیہ نے کہا: سعد! دیکھو ابوالحکم سید اہل وادی کے مقابلہ میں یوں آواز بلند نہ کرو۔ سعد نے جواب دیا: جانے دو امیہ! تم اس بات میں نہ آؤ۔ واللہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی نہیں بھولی کہ تم کسی دن مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہو گے۔ یہ خبر سنا کر امیہ بن خلف سخت گھبرا گیا اور گھر میں آکر اس نے اپنی بیوی کو سعد کی اس بات سے اطلاع دی اور کہا کہ خدا کی قسم میں تو اب مسلمانوں کے خلاف مکہ سے نہیں نکلوں گا لیکن مگر تقدیر کے نوشتے پورے ہونے تھے۔ بعد کے موقع پر امیہ کو مجبوراً مکہ سے نکلنا پڑا



اور وہیں وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو کر اپنے کیفر کو وار کو پہنچا۔ یہ ایتہ وہی تھا جو حضرت بلالؓ پر اسلام کی وجہ سے نہایت سخت مٹام کیا کرتا تھا۔

**ولید بن مغیرہ کی موت اور قریش کے غونی ارادے** پھر اسی زمانہ کی بات ہے کہ خالد بن ولید کا والد

ولید بن مغیرہ جو مکہ کا ایک نہایت با اثر اور معزز

رئیس تھا بیمار ہو گیا اور جب اُس نے دیکھا کہ اب اُس کی موت قریب ہے تو وہ بے اختیار سا ہو کر رونے لگ گیا اس وقت مکہ کے بعض بڑے بڑے رئیس اس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر اس کے رونے کا سبب پوچھا تو ولید نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ میں موت کے ڈر سے روتا ہوں۔ واللہ ایسا ہرگز نہیں۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین پھیل جائے اور مکہ بھی اس کے قبضہ میں چلا جائے؟ ابوسفیان بن حرب نے جواب دیا کہ: اس بات کا غم نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہوگا، ہم اس بات کے ضامن ہوتے ہیں۔

یہ تمام باتیں قریش مکہ کے ان غونی ارادوں کا پتہ دے رہی ہیں جو وہ

**مدینہ میں خوف کی راتیں**

ہجرت کے بعد اسلام کے متعلق رکھتے تھے اور مسلمان ان ارادوں سے

نادانق نہ تھے بلکہ خوب سمجھتے تھے کہ مکہ والوں کے یہ بدلے ہونے تو ذرا عتق قریب کوئی رنگ لائیں گے اور اگر ان کو خدا کے وعدوں پر پورا بھروسہ تھا، لیکن فطرتاً وہ سخت خوفزدہ اور پریشان بھی تھے کہ دیکھتے ہیں کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ خوف ایسا غالب تھا کہ صحابہ کو مدینہ میں رات کے وقت نیند نہیں آتی تھی کہ نہ مسام کس وقت ان پر کوئی حملہ ہو جائے اور یہ خطرات طبعاً دوسرے مسلمانوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیادہ تھے اور چونکہ ویسے ہی آپؐ کو سب کی نسبت مسلمانوں کی حفاظت کا زیادہ فکر تھا۔ اس لیے آپؐ سب سے زیادہ محتاط رہتے تھے، چنانچہ لسانی میں ایک روایت آتی ہے کہ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَقْلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ يَشْفُرُ مِنَ اللَّيْلِ ۖ یعنی جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لاتے تو آپؐ کو مالا مالوں کو جاگتے رہتے تھے: اور اسی معنوں کی ایک روایت بخاری اور مسلم میں ہے کہ

أَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ ثُمَّ قَالَ لَيْتَ رَجُلًا مَسَالِمًا مِنْ أَصْحَابِي يَخْرُسُنِي اللَّيْلَةُ إِذَا سَمِعْنَا مَوْتَ السَّلَاحِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ هَذَا قَالَ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ جِئْتُ أَخْرَسَكَ فَنَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۖ یعنی: ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیر تک جاگتے رہے اور پھر فرمایا کہ اگر اس وقت ہمارے دوستوں میں سے کوئی مناسب آدمی پہرہ دیتا تو میں ذرا سو لیتا۔ اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی جھنکار سنی۔ آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی۔ یا رسول اللہ! میں سعد بن ابی وقاص ہوں۔ میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ پہرہ دوں۔ اس اطمینان کے

لے تاریخ الخلفاء جلد ۱ صفحہ ۳۹۸ ۖ لے دیکھو فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۶۰ ۖ

لے کتاب التمتی ۖ لے باب فضل سعد بن ابی وقاص ۖ



بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے سو گئے ۵ اور سلم کے اسی باب کی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ ابتدائے ہجرت کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر اپنی ذات کے متعلق نہ تھا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا فکر تھا اور ان خوف کے قیام میں آپ یہ مزدوری قیال فرماتے تھے کہ مدینہ میں رات کے وقت پہرہ کا انتظام رہے چنانچہ اس طرح سے بسا اوقات آپ خود رات کو جاگا کرتے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ہوشیار و چوکس رہنے کی تاکید فرماتے تھے اور آپ کا یہ سفر ڈرنا یا بزدلی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ احتیاط اور بیدار مغزی کی بنا پر تھا؛ ورنہ آپ کی ذاتی شجاعت اور مردانگی تو دوست دشمن میں مسلم ہے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک رات مدینہ میں کچھ شور ہوا اور لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے اور جس طرف سے شور کی آواز آئی تھی اُدھر کا رخ کیا۔ ابھی وہ تھوڑی دیر ہی گئے تھے کہ سامنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تواریح حائل کئے ابو طلحہ کے گھوڑے کی تنگی پیٹھ پر سوار واپس تشریف لا رہے تھے۔ جب آپ قریب آئے تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: میں دیکھ آیا ہوں کوئی فکر کی بات نہیں، کوئی فکر کی بات نہیں لیجے جس پر لوگ واپس لوٹ آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رات بھی آپ جاگ رہے تھے اور جو نبی آپ نے شور کی آواز سنی آپ جھٹ ابو طلحہ والے گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف نکل گئے اور لوگوں کے روانہ ہوتے ہوتے پتہ لیکر واپس بھی آ گئے۔

### قبائل عرب کی متحدہ مخالفت اور مسلمانوں کی نازک حالت

قریش مکہ کے جن غنی اراذل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ صرف انہی تک

محدود نہ تھے بلکہ ہجرت کے بعد سے انہوں نے قبائل عرب میں مسلمانوں کے خلاف ایک باقاعدہ پراپیگنڈہ جاری کر رکھا تھا اور چنوکعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے ان کا سارے عرب پر ایک گہرا اثر تھا، اس لیے ان کی اس نیکیخت سے تمام عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا سخت دشمن ہو رہا تھا۔ قریش کے قافلوں نے تو گویا اپنا یہ فرض قرار دے رکھا تھا کہ جہاں بھی جاتے تھے راستہ میں قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے بہتے تھے۔ چنانچہ قرآن شریف میں قریش کے ان اشتعال انگیز دوروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بیچارے مسلمان جو اس وقت تک صرف قریش کے خیال سے ہی سمے جاتے تھے اب بالکل ہی مراسیمہ ہونے لگے، چنانچہ حاکم اور طبرانی کی مندرجہ ذیل روایت انکی اس وقت کی مضطربانہ حالت کا پتہ دیتی ہے۔

لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَصْحَابُهُ الْمَدِينَةَ دَاوَتْهُمْ إِلَّا نَصَارَ دَرَمَثَهُمُ  
الْعَرَبُ عَنْ قَوْمٍ وَاحِدَةٍ ذَكَرْنَا لَا يُبَيِّتُونَ إِلَّا بِالسَّلَامِ وَلَا يَضْبَحُونَ إِلَّا بِتِلْكَ  
وَكَاثُوا يَقُولُونَ أَلَا قَرُونَ أَنَا لَعِينُ حَتَّى نَبْنِيَتْ أَمْنِينَ مُطْمَئِنِّينَ

۱۔ مسلم کتاب الفضائل باب فی شجاعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ سورۃ مؤمن اور سورۃ آل عمران ۱۹۷

لَا تَخَافُ إِلَّا اللَّهَ ۖ

”یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ہجرت کر کے مدینہ میں آئے اور انصار نے انہیں پناہ دی تو تمام عرب ایک جان ہو کر ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ رات کو بھی ہتھیار لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہتھیار لگائے رہتے تھے کہ کہیں کوئی اچانک حملہ نہ ہو جاوے اور وہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ہم اس وقت تک زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں جب ہم رات کو امن کی نیند سو سکیں گے اور سوائے خدا کے ہیں اور کسی کا ڈر نہ ہو گا۔“

قرآن شریف نے جو منافقین اسلام کے نزدیک بھی اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ مستند ریکارڈ ہے مسلمانوں کی اس حالت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

وَإِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا مِّنْ فَتَنَّا قَوْمًا يَّتَّبِعُونَ بَيْنَهُمْ وَأَسْفَلَ سَاقًا فَذُرُونَهُمْ ۚ وَذُرُّكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۖ

”یعنی اے مسلمانو! وہ وقت یاد رکھو جبکہ تم ملک میں بہت قوی تھے اور کمزور تھے اور تمہیں ہر وقت یہ خوف لگا رہتا تھا کہ لوگ تمہیں اچک کر لے جائیں یعنی اچانک حملہ کر کے تمہیں تباہ نہ کر دیں مگر خدا نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہاری مدد فرمائی اور تمہارے لیے پاکیزہ نعمتوں کے دروازے کھولے۔ پس تمہیں اب شکر گزار بندے بن کر رہنا چاہیئے۔“

پہلے اگر اللہ کی نصرت شامل حال نہ ہوتی تو اس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت بالکل ایسی نازک ہو رہی تھی کہ ظاہری اسباب کے ماتحت ان کی زندگی کے دن بہت محدود نظر آتے تھے۔ بیشک مکہ میں بھی ان کے لیے مصائب تھے اور سخت مصائب تھے اور انہیں دن رات قریش کے بے دردانہ مظالم کا تحقیر مشق بن کر رہنا پڑتا تھا، لیکن مدینہ میں ان کی حالت شروع شروع میں کتنی لحاظ سے زیادہ نازک اور زیادہ خطرناک ہو گئی تھی، کیونکہ مکہ میں صرف قریش کی طرف سے اندیشہ تھا اور قریش کے متعلق مسلمانوں کو ایک حد تک یہ اطمینان تھا کہ خواہ ان کی مخالفت کیسی بھی سخت صورت اختیار کرے جب تک مسلمان مکہ میں ہیں قبائل کے باہمی تعلقات کا خیال قریش کو اس بات سے باز رکھے گا کہ وہ ایک جتنے کی صورت میں مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر بلا تیز سب کو تہ تیغ کر دیں۔ مختلف قبائل کی باہمی رقابتیں رشتہ داری کے احساسات وغیرہ کئی اس قسم کی باتیں تھیں جو عموماً قریش کو

۱۔ حاکم بحوالہ باب السُّقُولِ فِيْ اَسْبَابِ السُّزُوْلِ زِيْرَايْتِ وَعَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِثْلَ

۲۔ سورۃ الانفال ۲۴۰

مسلمانوں کے خلاف ہاں کم از کم معزز خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے خلاف انتہائی کارروائی کرنے سے باز رکھتی تھیں، چنانچہ یاد ہو گا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ کس قدر طویل بحث و مآئل کے بعد اور پھر کتنی احتیاطوں کے ساتھ اختیار کیا تھا، لیکن اب ہجرت کے بعد نہ صرف یہ کہ قریش مکہ کی مخالفت بہت زیادہ چمک گئی تھی اور اس خیال نے کہ مسلمان اُن کے ہاتھ سے پھکر نکل گئے ہیں اور غیروں کے ہاں پناہ گزین بن گئے ہیں ان کے بغض و عداوت کی آگ کو خطرناک طور پر بھڑکا دیا تھا۔ بلکہ عرب کے دوسرے قبائل بھی ایک جان ہو کر مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور خود مدینہ کے شہر میں ایسے منافقین موجود تھے جو منافقین کے ہاتھ میں مسلمانوں کے خلاف ایک نہایت کارگر ہتھیار کا کام دے سکتے تھے اور یہود کا وجود مزید براں خطرے کے احتمالات پیدا کر رہا تھا اور ان خطرات کے مقابلہ میں انصار کی حیثیت کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات میں اگر مسلمانوں کو خدا کے وعدوں پر بھروسہ تھا، لیکن اس ظاہری حالت کو دیکھ کر اُن میں سے بہتوں کے دل اندھ ہی اندھ بیٹھے جاتے تھے اور خوفِ ادبِ عینی کا ایسا غلبہ تھا کہ ان بے چاروں کو رات کے وقت نیند نہیں آتی تھی۔ ناظرین کو چاہیے کہ ان باتوں کو اچھی طرح یاد رکھیں کیونکہ آگے چل کر انہیں باتوں نے اس جنگِ عظیم کی بنیاد بننا ہے جو مسلمانوں اور کفارِ عرب کے درمیان وقوع میں آئی اور جس نے عرب کی وسیع سرزمین میں خون کی ندیاں بہا دیں۔

### ہجرت کے بعد مہاجرین کا پہلا پتہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

ہجرت کے بعد مہاجرین کے ہاں جو پہلا پتہ مدینہ میں پیدا ہوا وہ عبداللہ بن زبیر تھے اور اسی لیے اُن کی پیدائش پر مہاجرین کو بہت غوشی ہوئی۔ عبداللہ بن زبیر تاریخِ اسلامی میں ایک بہت مشہور و معروف آدمی ہیں۔ ان کے والد زبیرؓ صحابہ کرام کا حال کتاب کے حصہ اول میں گذر چکا ہے۔ زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے زاد بھائی تھے اور کبار صحابہ میں شمار ہوتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے اپنی لڑکی اسماءؓ کو جو حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھیں۔ زبیرؓ کے عقد میں دیا تھا اور انہی اسماءؓ کے بطن سے ہجرت کے پہلے سال میں عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے جس وقت عبداللہ کو اُمّ اکرمؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے ایک کھجور کو اپنے منہ میں نرم کر کے اس کا لعاب عبداللہ کے منہ میں ڈالا اور ان کے لیے دُعا کرتے خیر فرمائی اور یہی اس کی پہلی خوراک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو عبداللہ بالکل یتیم تھے، لیکن بعد میں بڑے ہو کر انھوں نے اپنے علم و فضل سے بڑا رتبہ حاصل کیا۔ شاہانِ بنو امیہ کے قابلِ اعتراض مسلک کو دیکھ کر انہوں نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی، لیکن بالآخر عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں شہید ہوئے۔ حضرت عائشہؓ انہیں اپنے پتے کے طور پر رکھتی تھیں اور اسی لیے انکی کنیت عبداللہ کے نام پر اُمّ عبداللہؓ مشہور ہو گئی تھی۔

انصار کے دور نیسوں کی وفات

ہجرت کے پہلے سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دو غصص اصحاب کی وفات کا صدمہ اُٹھانا پڑا یعنی کلثوم بن الہدم

جن کے مکان پر آپ قبار میں قیام فرما ہوئے تھے اور جو ایک سحر آدمی تھے فوت ہو گئے اور اسی زمانہ میں اسعد بن زرارہ کا بھی انتقال ہوا۔ اسعد ان ابتدائی چھ اشخاص میں سے تھے جنہوں نے مکہ میں بیعت عقبہ اولیٰ سے بھی ایک سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی اور جن کے مکان پر اسلام کے سب سے پہلے مبلغ مصعب بن عمیر نے مدینہ میں قیام کیا تھا اور جو ہجرت سے قبل مدینہ میں نماز باجماعت اور جمعہ کا التزام کیا کرتے تھے۔ نیز اسعد ان بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں مقرر فرمائے تھے۔ چنانچہ ان کی وفات پر بنو نجار نے جن کے وہ نقیب تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اسعد بن زرارہ کا کوئی قائم مقام مقرر فرمایا جاوے لیکن چونکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا اب میں خود تمہارا نقیب ہوں کسی اور نقیب کی ضرورت نہیں ہے۔

**دو معاندین اسلام کی ہلاکت** اسی سال اسلام کے دو نہایت ذی اثر مخالفین کی موت بھی وقوع میں آئی، چنانچہ ولید بن مغیرہ کی موت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اسی کے قریب مکہ میں عاص بن دائل کی موت واقع ہوئی۔ یہ دونوں شخص اسلام کے سخت مخالف تھے اور مکہ میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر یہ ایک عجیب منظر ہے کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ان مرنے والوں کی اولاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو کر فدایان اسلام کی صفِ اول میں کھڑی نظر آتی ہے؛ چنانچہ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کے کارنامے تاریخ اسلام میں کسی معر فی کے محتاج نہیں۔

# جہاد بالسیف کا آغاز

اور

## جہاد کے متعلق اصولی بحث

**جہاد بالسیف کا آغاز** اب ہم ہجرت کے دوسرے سال اور اسلامی تاریخ کے اس حصہ میں داخل ہوتے ہیں جس میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کا آغاز ہوا۔ جہاد بالسیف کا مسئلہ

جس کے ماتحت مسلمانوں کی تلوار نیام سے باہر آئی باوجود حقیقت ایک بہت صاف اور سادہ مسئلہ ہونے کے ان متضاد خیالات کی وجہ سے جو بد قسمتی سے خود بعض مسلمانوں کی طرف اس کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں اور نیز بعض غیر مسلم مؤرخین کی تحریرات کی وجہ سے جو انہوں نے مؤرخ کی حیثیت سے ہٹ کر ایک متعصب مذہبی مناظر کی حیثیت میں لکھی ہیں ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ابتداءً تلوار کے سایہ کے نیچے پرورش پائی جو ہر اس شخص کے سر پر اٹھتی تھی جو اسلام لانے سے انکار کرتا تھا اور مسلمانوں کا یہ مذہبی فرض مقرر کیا گیا تھا کہ وہ تلوار کے ندر سے لوگوں کو مسلمان بنائیں۔ یہ خیال حقیقت سے کس قدر دور اور صحیح تاہم کنی واقعات کے کس قدر خلاف ہے؟ اس کا جواب ذیل کے اوراق میں ملے گا۔ حقیقت حال یہ ہے اور اس حقیقت کے شواہد بھی ظاہر ہو جائیں گے کہ اس ابتدائی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے ابتداءً جو کچھ کیا وہ دفاع اور خود حفاظتی میں کیا اور وہ بھی اس وقت کیا جبکہ قریش مکہ اور ان کی انگیخت پر دوسرے قبائل عرب کی معاونت کا رد و ایال اس حد کو پہنچ چکی تھیں کہ ان سے مقابلہ میں مسلمانوں کا خاموش رہنا اور اپنی حفاظت کے لیے ہاتھ نہ اٹھانا خود کشی کے ہم معنی تھا۔ جسے کوئی عقل مند نظر استحسان سے نہیں دیکھ سکتا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفاعی جنگ کے دوران جو کارروائیاں فرمائیں وہ حالات پیش آمدہ کے ماتحت نہ صرف بالکل جائز اور درست تھیں بلکہ جنگی ضابطہ اخلاق کا جو معیار آپؐ نے قائم فرمایا وہ آج بھی دنیا کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے جس سے زیادہ سختی اور سزا کی طرف مائل ہونا فذل اور رحم کے منافی ہے اور جس سے زیادہ نرمی اور رعایت کا طریق اختیار کرنا دنیا کے امن کے لیے



نہم قاتل۔ درحقیقت اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ فطرت کا مذہب ہے اس لیے نہ تو وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر صورت میں ہر گناہ اور ہر مجرم کی سزا ہونی چاہیے اور نہ وہ یہ سکھاتا ہے کہ کسی حالت میں بھی بدی کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہر دو تعلیمات افراط و تفریط کی راہیں ہیں اور ان پر عمل کرنے سے کسی بھی امن قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اقوام و افراد کے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے اور صحیح اور سچی تعلیم یہی ہے کہ جبراً آؤ سَبِّحْهُ سَبِّحْهُ سَبِّحْهُ مِثْلَهَا فَمَنْ حَفَا وَآمَنَ لَهَا فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۖ یعنی بدی اور مجرم کی سزا اس کے مناسب حال ہونی چاہیے، لیکن اگر عفو کرنے سے اصلاح ہوتی ہو تو عفو کرنا چاہیے اور اس رنگ میں عفو کرنے والا شخص خدا کے نزدیک اجر کا مستحق ہو گا۔ یہ قرآنی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی مشاہدہ اخلاق کا خلاصہ ہے اور آپ کی تمام جنگی کارروائیاں اسی آیت کی تفسیر ہیں۔

بجائے اسلامی لڑائیوں پر نظر ڈالنے سے پیشتر ہمارا  
کیا اسلام میں مذہب کے معاملہ میں جبر کرنا جائز ہے؟  
 فرض ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام مذہب ہی معاملات میں جبر کرنے کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے۔ یعنی کیا اسلامی تعلیم کی رو سے یہ جائز ہے کہ لوگوں کو جبراً اسلام میں داخل کیا جاوے اور عوار کے ذریعہ اسلام پھیلا دیا جاوے۔ اگر اسلام جبر کی اجازت دیتا ہے تو پھر بیشک معاملہ مشتبہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان ہو گا کہ شاید ابتدائی اسلامی جنگیں بھی لوگوں کو بزدل مسلمان بنانے کی غرض سے کی گئی ہوں، لیکن اگر یہ ثابت ہو کہ اسلامی تعلیم کی رو سے مذہب میں جبر ممنوع ہے تو پھر یہ ایک قوی ثبوت اس بات کا ہو گا کہ یہ ابتدائی اسلامی لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں بلکہ ان کی وجوہات کوئی اور تھیں۔ کیونکہ یہ ہرگز ممکن نہیں اور کوئی عقل مند اسے قبول نہیں کر سکتا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ایسے بڑے طور پر اس تعلیم کے خلاف قدم مارا ہو جو وہ خدا کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے اور جس پر ان کی قومی ہستی کا دار و مدار تھا۔

اب ہم قسطنطنیہ شریف پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں صریح طور پر جبری اشاعت کے خلاف احکام پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۖ

”اے رسول! تو کہہ دے لوگوں سے کہ یہ اسلام حق ہے تمہارے رب کی طرف سے

پھر اس کے بعد جو چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے“

پھر فرماتا ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَنْفُسُهُ يُتَّقِيهِ

وَمَنْ مَلَ قَاتَمًا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝

”یعنی اے رسول! تو لوگوں سے کہہ دے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آتا ہے۔ پس اب جو شخص ہدایت کو قبول کرے گا تو اس کا فائدہ خود اسی کے نفس کو ہوگا اور جو غلط راستہ پر چلے گا اُس کا وبال بھی خود اُسی کی جان پر ہے اور میں کوئی تمہاری ہدایت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔“

پھر فرماتا ہے:-

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمَرْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

یعنی ”دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہدایت اور گمراہی کا معاملہ پوری طرح کھل چکا ہے۔ پس اب جو شخص گمراہی کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آئے گا۔ وہ گویا ایک نہایت مضبوط کڑے کو پکڑ لے گا۔ جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور اللہ سُننے والا جاننے والا ہے۔“

اس قرآنی آیت کی عملی تشریح میں ایک حدیث آتی ہے کہ فَلَمَّا أُجْلِيَتْ بَنُو نَضِيرَ كَانَ فِيهِمْ مِنْ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ فَقَالُوا لَا تَدْعُ أَبْنَاءَنَا فَإِنَّ زَلَّ اللَّهُ تَعَالَىٰ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۝ یعنی جب بنو نضیر مدینہ سے جلا وطن کئے گئے تو ان میں وہ لوگ بھی تھے جو انصار کی اولاد تھے۔ انصار نے انہیں روک لینا چاہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآنی آیت کے ماتحت کہ دین کے معاملہ میں جبر نہ ہونا چاہیے انصار کو منع فرمایا کہ ایسا نہ کریں۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے متعلق وثیق رومی کی ایک روایت آتی ہے کہ كُنْتُ مَخْلُوكًا بِعَصْرِ فَكَانَ يَقُولُ أَسْلَمَ ..... قَالَ قَابِيَتْ فَقَالَ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ فَلَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ إِعْتَقَنِي فَقَالَ إِذْ هَبْتُ حَيْثُ شِئْتُ ۝ یعنی وثیق رومی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں میں ان کا غلام ہوتا تھا۔ آپؐ مجھ سے فرماتے سہیتا تھے کہ مسلمان ہو جاؤ مگر میں انکار کرتا تھا اور حضرت عمرؓ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ اچھا۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ یعنی ”دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں ہے۔“ پھر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے مجھے خود بخود آزاد کر دیا اور فرمایا اب جہاں چاہتے ہو چلے جاؤ۔

۱۔ سورۃ یونس ۱۰۹۰ ۝ سورۃ بقرۃ : ۲۵۴ ۝ البوداؤد کتاب الجہاد ۝  
۲۔ زمانہ جاہلیت میں جب کسی اسی یا خنزرجی مُشرک کے اولادِ نرینہ نہ ہوتی تھی تو وہ مُنت مانا تھا کہ اگر میرے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے یہودی بنا دوں گا۔ اس طرح اوس دغزرج کے کئی بچے یہودی بن گئے تھے۔

۳۔ عوارف بروایت الزلۃ الخفاء عن خلافة الخلفاء ۝

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَكْثَرُ الْكِتَابِ وَالْأُتَمِّينَ ؕ أَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمْتُمْ أَفَقَدْ اهْتَدَوا دِرَاجًا تَوَكَّدُوا فَوَاقِمًا  
خَلِيقَتِ الْبَلَاغُ ؕ وَاللَّهُ يَصِيِّرُهُم بِالْعِبَادِ ؕ

یعنی اے رسول ! کہہ دے اہل کتاب اور مشرکین سے کہ کیا تم اسلام کو قبول کرتے ہو؟ یعنی ان کو اسلام کا پیغام پہنچا دے۔ پھر اگر وہ اسلام کو قبول کر لیں تو جانو کہ وہ ہدایت پا گئے، لیکن اگر وہ تیری دعوت کو رد کر دیں تو تیرا کام تو صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھ رہا ہے ۱۱

قرآن شریف کی یہ آیات جگہ جگہ لے کر اُن کے نازل ہونے کی تاریخ کے مطابق ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے دین کے معاملہ میں جبر کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسلام نے دین کے معاملہ کو ہر شخص کے ضمیر پر چھوڑ دیا ہے کہ جس مذہب کو کوئی شخص اپنے لئے پسند کرے اختیار کرے لیکن آیات میں سورہ کہف کی آیت مکی زمانہ کی ہے۔ سورہ یونس کی آیت بعض محققین کے نزدیک مکی زمانہ کے آخری ایام کی ہے اور بعض کے نزدیک مدنی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت مدینہ کے ابتدائی سالوں کی ہے جبکہ اسلامی جنگوں کا آغاز ہوا تھا اور سورہ آل عمران کی آیت مدینہ کے آخری زمانہ کی ہے جبکہ مکہ اور طائف وغیرہ فتح ہو چکے تھے اور عرب کی جنگوں کا قریباً خاتمہ تھا۔ گویا یہ مختلف آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف زمانوں میں نازل ہوئی تھیں اور آخری آیت آپ کی وفات کے قریب نازل ہوئی تھی اور یہ ساری آیات قطعی اور یقینی طور پر جبری اشاعت کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور رسول کا صرف یہ کام بتا دینا ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو کھول کھول کر لوگوں کو سنادے۔ آگے ماننا نہ ماننا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ اب کیا یہ ممکن ہے کہ اس صریح اور واضح تعلیم کے ہوتے ہوئے جو بیانگ بلند دلائل لوگوں کو سنائی جاتی تھی اور جس کی طرف کفار کو بلایا جاتا تھا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کے لئے تلوار ہاتھ میں لیکر نکلتے۔ اور پھر کیا اس صورت میں کفار یہ اعتراض نہ کرتے کہ تم نے اپنے خدا کا کلام تو جبر کے خلاف سناتے ہو اور خود جبر کرتے ہو، مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ کفار کی طرف سے بھی یہ اعتراض نہیں ہوا، حالانکہ ان کی عادت تھی کہ خوب جی کھول کھول کر آپ کے خلاف اعتراض کیا کرتے تھے اور ان کے اعتراضات قرآن کریم اور کتب حدیث و تاریخ میں کثرت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جس  
آغاز جہاد کے وقت مسلمانوں کی حالت جبر کے خیال کی نگہب ہے

دقت مسلمانوں کی طرف سے  
جہاد کا آغاز ہوا اس وقت ان کی جو حالت تھی وہ بھی جبر کے خیال کو جھٹلاتی ہے۔ بھلا گنتی کے چند لوگ جبکہ خلافت

گویا سارا ملک ہتھیار بند تھا اور دشمن کا یہ حال تھا کہ خوف کے مارے ان کو رات کو نیند نہیں آتی تھی وہ جبر کے خیال سے جنگ شروع کر سکتے ہیں یا ایسی حالت میں تو صرف وہی شخص لڑائی کے لیے نکل سکتا ہے جو یا تو یہ سمجھتا ہو کہ اب موت سے بچنے کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی ہے کہ خود حفاظتی کے لیے تو اسے مکملی جاوے اور یا وہ یہ خیال کرتا ہو کہ اب مرنے کا ہے ہی کیوں نہ مردوں کی طرح میدان جنگ میں جان دی جاوے۔ ان دو غرضوں کے سوا بھی اور غرض کے لیے کوئی شخص جو مجنون نہیں ہے اس حالت میں لڑائی کے لیے نہیں نکل سکتا جو اس وقت مسلمانوں کی تھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی ابتدائی لڑائیاں دفاع اور خود حفاظتی کے لیے تھیں نہ کہ جبر اور تشدد کی غرض سے۔

**بھی کوئی شخص جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا** پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان

بنانے کی غرض سے تھیں تو تاریخ سے ہیں ایسے لوگوں کی مثالیں لکھرائی جائیں جو ہزاروں مسلمان بنائے گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ہزاروں مسلمانوں اور کافروں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں کوئی ایک مثال تو ایسے شخص کی ملنی چاہیے جسے تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی جبری تبلیغ کی نظر نہیں آتی۔ ہاں دوسری طرف ایسی مثالیں تاریخ سے ثابت ہیں کہ عین لڑائی کے دوران میں کسی مشرک نے اسلام کا اظہار کیا، لیکن مسلمانوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص خدا کا رسول ہے اس کے اسلام کو رد کیا اور اس کے اسلام کے اعلان کو رد کیا ہے اور اس کے اسلام کے اعلان کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں ہے اس کے اسلام کو اسلام نہیں سمجھا اور اسے تلوار کی گھاٹ اُتار دیا، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی میں اسامہ بن زید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے صاحبزادے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے ایک کافر کے سامنے ہوئے جب اس کافر نے دیکھا کہ اسامہ نے اس پر غلبہ پایا ہے تو کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں لیکن اسامہ نے اس کی پروا نہ کی اور اپنا نیزہ چلا دیا۔ جب لڑائی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس واقعہ کا ذکر ہوا تو آپ اسامہ پر رحمت نازل ہوئی اور فرمایا کہ جب وہ شخص اسلام کا اظہار کرتا تھا تو تم نے اسے کیوں مارا؟ اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ ڈر کے مارے ایسا کہتا تھا اور دل میں مسلمان نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ یعنی بالکل جگمی ہے کہ اسی وقت اس پر اسلام کی صداقت کھل گئی ہو اور وہ دل سے مسلمان ہو گیا ہو۔ مثلاً ایسا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا یہ میسر رکھا ہو کہ اگر میں لڑائی میں غالب آگیا تو معلوم ہو گا کہ ہمارے بُت جن کے لیے میں لڑ رہا ہوں سچے ہیں لیکن اگر میں مغلوب ہو گیا تو ثابت ہو گا کہ خدا ایک ہے۔ بہر حال اس کا میدان جنگ میں مسلمان ہونا اس بات کا یقینی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ذکر مسلمان ہوتا ہے پس جب اس بات کا امکان تھا کہ وہ دل سے مسلمان ہوتا ہے تو اسامہ کو اپنا ہاتھ روک لینا چاہیے تھا اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ناراض ہوئے اور اسامہ روایت کرتے ہیں کہ آپ مجھ پر اس قدر ناراض ہوئے کہ میں نے یہ تنہا کی کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور اب اس کے بعد مسلمان ہوتا تاکہ آپ کی یہ ناراضگی میرے حصہ میں نہ آتی۔ (مسلم کتاب الایمان)



پھر تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اگر کسی درجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص کے متعلق یہ علم ہو گیا ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا بلکہ محض ڈر یا طمع کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو آپ نے اس کا اسلام قبول نہیں فرمایا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک روایت آتی ہے کہ کسی لڑائی میں صحابہ نے ایک ایسے کافر کو قید کیا جو بنو ثقیف کے حلیفوں میں سے تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قیدی کے پاس سے گزرے تو اس نے قید سے رہائی پانے کے خیال سے کہا کہ ”اے محمد! مجھے کیوں قید میں رکھا جاتا ہے میں تو مسلمان ہوتا ہوں“ آپ نے فرمایا: ”اگر تم اس حالت سے پہلے اسلام لاتے تو خدا کے حضور یہ اسلام مقبول ہوتا اور تم نجات پا جاتے مگر اب نہیں“ اس کے بعد آپ نے اس کے بدلے میں دو مسلمان قیدی بنو ثقیف سے پھر ڈالنے اور اُسے کفار کو واپس کر دینے الغرض تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ نے کسی شخص کو توار سے ڈرا کر مسلمان بنایا ہو بلکہ جو مثال بھی ملتی ہے اس کے خلاف ملتی ہے اور یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں۔

اس جگہ اگر کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ لڑائی میں کسی کافر کی طرف اسلام کے اظہار پر اُسے چھوڑ دینا یہ بھی تو ایک رنگ کا جبر ہے تو یہ ایک جہالت کا اعتراف ہو گا۔ جبرِ ممانعت کے دور ہو جانے پر لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا حسن اخلاق اور احسان ہے نہ کہ جبر و ظلم۔ کفار عرب کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کرنا صرف اس بنا پر تھا کہ انھوں نے آپ کے خلاف توار اٹھائی تھی اور اسلام کی پُر امن تبلیغ کو بزور روکنا چاہتے تھے اور اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملک میں امن اور مذہبی آزادی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ اسے گھر میں بیٹھے ہوئے اسلام پر شرح صدر پیدا ہوتا ہے یا میدان جنگ میں جب بھی وہ اسلام کا اظہار کرے گا تو اس کے اظہار کے کم از کم یہ معنی ضرور ہوں گے کہ اب اس کی طرف سے وہ خطرہ دور ہو گیا ہے جن کی بناء پر یہ جنگ ہو رہی تھی تو اس صورت میں لازماً اس کے خلاف کارروائی بند کر دی جاوے گی۔ درحقیقت جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جانے کا جنگ کی ابتداء تو کفار کی طرف سے تھی۔ پس جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو طبعاً اس کے یہ معنی ہوتے تھے کہ اب وہ جنگ کو ترک کر کے صلح کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پس اس کے خلاف لڑائی روک دی جاتی تھی۔ یہی مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَخْتَوُوْا اِلَّا اِلَهَ الْاَلَلٰہِ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کفار سے جنگ کروں جو اسلام کے خلاف میدان جنگ میں نکلتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ مگر غلطی سے بعض لوگوں نے اس حدیث کے یہ معنی سمجھ لیے ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے تمام کافروں کے خلاف اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں؛ حالانکہ یہ معنی قرآنی تعلیم اور تاریخی واقعات کے صریح خلاف ہیں اور یہ ایک سراسر خلافِ دیانت فعل ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کے وہ معنی چھوڑ کر جو قرآن و تاریخ کے مطابق





لاتا تھا اسے کفار کی طرف سے دین کے ملتے میں ڈکھ دیا جاتا تھا اور بعض کو قتل کر دیا جاتا تھا اور بعض کو قید کر دیا جاتا تھا۔ پس ہم نے جنگ کیا اس وقت تک کہ مسلمانوں کی تعداد اور طاقت زیادہ ہو گئی اور نو مسلموں کے لیے فتنہ مٹا دیا اس واضح اور بین آیت اور اس واضح اور بین حدیث کے ہوتے ہوئے دو معینین حدیث سے جبری اشاعت کی تعلیم ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہرگز دیانتداری کا فعل نہیں سمجھا جاسکتا۔

صحابہ کی زندگیاں جبر کے خیال کی ٹھکانہ ہیں پھر پتے ایمان کی بعض علامات ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور جو کبھی بھی اس شخص میں پیدا

نہیں ہو سکتیں جو تلوار کے نعرے سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ مثلاً پتے ایمان میں محبت ہوتی ہے۔ اخلاص ہوتا ہے، قربانی ہوتی ہے، غیرت ہوتی ہے اور ناممکن ہے کہ یہ باتیں اس شخص میں پائی جائیں جس کا ایمان محض دکھاوے کا ایمان ہے اور جو صرف خوف کی وجہ سے کسی عقیدہ کا اظہار کرتا ہے مگر اس کا دل اس ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ پس ہمیں صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر دیکھنا چاہیے کہ کیا ان کا حال ان لوگوں کا سا نظر آتا ہے جن کا مذہب تلوار کے زور سے تبدیل کیا گیا ہو؟ کیا ان کے ایمان میں محبت کی بُرائی نہیں؟ کیا ان کے دل اخلاص سے خالی نظر آتے ہیں؟ کیا ان میں قربانی کی روح نہیں پائی جاتی؟ کیا ان میں غیرت کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ اگر یہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اندیشہ سب علامات صحابہ میں موجود ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں اور ان کی زندگیوں کا ہر کارنامہ ان کے ایمان ان کے اخلاص اور اسلام کے لیے اُن کی محبت اور قربانی اور غیرت پر شاہد ہے تو یہ کس قدر ظلم ہو گا کہ ان کے ایمان کی تہنیتی پر شبہ کیا جادے۔ دُور نہ جاؤ عکرمہ بن ابو جہل کی ہی مثال لے لو۔ یاپ ابو جہل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کا پیاسا تھا اور اسی کوشش میں ہلاک ہوا۔ خود عکرمہ کا یہ حال تھا کہ ہر لڑائی میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑا اور اسلام کو مٹانے کے لیے اس نے اپنی تمام کوشش صرف کر دی اور بالآخر جب کتبہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھ کر کتبے سے بھاگ گیا اور وہ زمین دیکھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے قتل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا، لیکن بالآخر جب مسلمان ہوا تو اس کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں اس نے باغیوں کے قلع فتح کرنے میں بے نظیر جان نثاریاں دکھلائیں اور جب ایک جنگ میں سخت گھمسان کا رن پڑا اور لوگ اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے تھے جیسے دھاتی کے سامنے گھاس گرتا ہے اس وقت عکرمہ چند ساتھیوں کو لے کر میں قلب لشکر میں جا کھڑا۔ بعض لوگوں نے منع کیا کہ اس وقت لڑائی کی حالت سخت خطرناک ہو رہی ہے اس طرح دشمن کی فوج میں گھسنا ٹھیک نہیں ہے لیکن عکرمہ نہ مانا اور یہی کہتا ہوا آگے بڑھتا گیا کہ میں لات و عزیٰ کی خاطر محمد رسول اللہ ﷺ سے لڑا ہوں۔ آج خدا کے رستے میں لڑتے ہوئے پیچھے نہیں رہوں گا۔ لڑائی کے خاتمہ پر دیکھا گیا تو اس کی لاش نیزوں تلوار کے زخموں سے پھینکی تھی۔ مایہ قربانی کا یہ حال تھا کہ جب خاتم میں سے عکرمہ کو کوئی جھٹہ مٹا تو وہ اسے صدقہ و خیرات اور خدمت دین میں بے دریغ خرچ کر دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ایک زمانہ تھا کہ میں خدا کے دین کے خلاف

خرج کیا کرتا تھا اب جب تک خدا کی راہ میں فرج نہ کروں مجھے چین نہیں آتا یہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو تلوار کے زور سے مسلمان ہوتے تھے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی خواہش خبر کے خیال کو جھٹلاتی ہے

ایک اور ثبوت  
اس بات کا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبہ اسلامان بنانے کی غرض سے نہ تھیں یہ ہے کہ آپ ہمیشہ صلح کے خواہشمند رہتے تھے۔ اور آپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح یہ لڑائیاں بند ہو جائیں اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہو، چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش نے سخت سے سخت شرطیں پیش کیں۔ حتیٰ کہ اکثر مسلمانوں نے ان شرطوں کے قبول کرنے کو اپنے لیے موجب ذلت سمجھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بات کی پروا نہ کی اور جس طرح قریش نے کہا اسی طرح ان کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ اب خود کا مقام ہے کہ اگر ان لڑائیوں میں آپ کی غرض یہ تھی کہ کفار کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جاوے تو صورت حال یہ ہونی چاہیے تھی کہ قریش صلح پر زور دیتے اور ایسی نرم شرطیں پیش کرتے جنہیں مسلمان بخوشی مان لینے کو تیار ہو جاتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلہ میں سختی کا پہلو اختیار کرتے اور صلح کی تجویز کو انہوں سے ٹال کر جنگ پھیلے رکھتے تاکہ کفار کے جبراً مسلمان بنانے کا موقعہ میسر نہ رہتا، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے جو اس بات کا ایک یقینی ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ جس طرح بھی ہو یہ جنگ رک جاوے اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہو۔ پھر اسی موقعہ پر جو قرآنی آیت نازل ہوئی وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض جبری تبلیغ نہ تھی بلکہ قیام امن تھی؛ چنانچہ بخاری میں روایت آتی ہے کہ یہ آیت قرآنی کہ **إِنَّا فَتَقْنَاكَ فَنَقَّبْنَا لَكَ** یعنی ہم نے تجھے یہ ایک بڑی کھلی کھلی فتح عطا کی ہے۔ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صلح اور قیام امن کا نام مسلمانوں کے لیے ایک کھلی کھلی فتح رکھا ہے اور حق بھی یہ ہے کہ صلح حدیبیہ ایک نہایت عظیم الشان فتح تھی جس کے مقابل میں ایک طرح سے بدر و خندق بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ گو بدر و خندق میں کفار کو ہزیمت ہوئی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں پیا ہو کر لوٹے لیکن ان جنگوں میں مسلمانوں کو ان کے جہاد کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ کفار ابھی تک اسی طرح برسرِ پیکار تھے اور جنگ جاری تھی، لیکن حدیبیہ میں گو کوئی کشت و خون نہیں ہوا اور بظاہر مسلمانوں کو ذب کر صلح کرنی پڑی، لیکن ان کے جہاد کا مقصد حاصل ہو گیا یعنی جنگ رک گئی اور ملک میں امن قائم ہو گیا۔ پس حقیقی فتح صلح حدیبیہ ہی تھی اور اسی لیے خدا نے اس کا نام فتح مبین رکھا اور یہ ایک نہایت زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی لڑائیاں

۱۔ اصحاب و اسد الغابہ و استیعاب

۲۔ بخاری کتاب التفسیر ۳۔ سورۃ فتح ۲۱

دفاع یا قیام امن کے لیے تمہیں نہ کہ اسلام کو بزور پھیلائے کی غرض سے۔

ایک اور جہت سے بھی اس سوال پر صلح کے زمانہ میں مسلمانوں کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی

خود ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دیکھا

جا رہے کہ آیا صلح کے زمانہ میں اسلام کو زیادہ ترقی حاصل ہوئی یا کہ جنگ کے زمانہ میں۔ اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ صلح کے زمانہ میں اسلام نے جنگ کے زمانہ کی نسبت غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی کی تھی تو یہ اس بات کا ایک اعلیٰ ثبوت ہوگا کہ یہ لڑائیاں اسلام کی جبری اشاعت کی غرض سے نہ تھیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال سے عمل جنگ کا آغاز ہو گیا تھا اور صلح حدیبیہ ہجرت کے چھٹے سال میں وقوع میں آئی۔ گویا صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمانوں پر قریباً پانچ سال جنگ کی حالت میں گزرے تھے۔ ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ان سپاہیوں کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے جو اسلامی فوج میں شامل ہو کر شریک جنگ ہوتے تھے۔ اعلان جنگ ماہ صفر سنہ ہجری میں ہوا اور قریش کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی لڑائی رمضان سنہ ہجری میں بدر کے موقع پر ہوئی۔ جہاں مسلمان کچھ اور تین سو تھے۔ دوسری لڑائی شوال سنہ ہجری میں احد کے موقع پر ہوئی جہاں مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی۔ تیسری لڑائی شوال سنہ ہجری میں ہوئی جو غزوہ احزاب یا غزوہ خندق کے نام سے مشہور ہے اس میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لڑائی چونکہ مدینہ میں ہوئی تھی اس لیے اس میں مسلمان زیادہ کثرت کے ساتھ شامل ہو سکے تھے والا اگر دور کا سفر ہوتا تو غالباً اس زمانہ میں اس کثرت کیساتھ مسلمان شامل نہ ہو سکتے کیونکہ کمزور اور ضعیف اور غریب لوگ کثرت سے رہ جاتے۔ بہر حال اس جنگ میں تین ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ اس کے بعد ذوقعدہ سنہ ہجری میں غزوہ صلح حدیبیہ وقوع میں آیا اور اس میں ڈیڑھ ہزار مسلمان شامل ہوئے۔ گویا اس چار پانچ سالہ جنگی زمانہ کے آخری غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد تین سو سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک پہنچی تھی اور اگر غزوہ خندق کی تعداد پر بنیاد رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعداد تین ہزار تک پہنچی تھی۔ اس کے بعد صلح کا زمانہ شروع ہوا اور قریباً پونے دو سال تک صلح رہی، لیکن اس صلح کے زمانہ میں جس غیر معمولی سرعت اسلام کی ترقی ہوئی وہ اس تعداد سے معلوم کی جاسکتی ہے جو غزوہ فجع مکتہ کے موقع پر جو رمضان سنہ ہجری میں ہوا مسلمانوں کی تھی۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس غزوہ میں اسلامی لشکر کی تعداد دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ گویا چار پانچ سالہ جنگ کے زمانہ میں قابل جہاد مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار یا زیادہ سے زیادہ تین ہزار تک پہنچی تھی اور پونے دو سالہ امن کے زمانہ میں یہ تعداد دس ہزار کو پہنچ گئی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لڑائیاں اسلام کی جبری اشاعت کی غرض سے نہ تھیں بلکہ دراصل یہ جنگ اسلام کی ترقی میں ایک روک تھام کیونکہ جو بھی یہ جنگ ختم ہوئی اسلام سرعت کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا۔ دراصل جنگ کی حالت میں کئی لوگ اسلام کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے اور کئی کمزور طبیعت لوگ کفار کی مخالفت بھی ڈرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی جنگ کی مصروفیت کی وجہ سے اصل تبلیغ کا موقع بہت کم ملتا تھا، لیکن جب جنگ رک گئی تو ایک طرف لوگوں کو اسلام کے متعلق غور کرنے کا موقع مل گیا اور کمزور طبائع کا خوف جاتا رہا اور



دوسری طرف تبلیغ کی سرگرمی زیادہ ہو گئی اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

**فتح مکہ کے موقع پر سینکڑوں کفار اسلام سے منکر رہے** ایک اور دلیل اس بات کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لڑائیاں اسلام

کی جبری اشاعت کے لیے نہیں تھیں یہ ہے کہ غزوہ مکہ کے موقع پر جب مکہ مسلمانوں کے ہاتھ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ایک فاتح کی حیثیت میں مکہ میں داخل ہوئے اس وقت گو بعض لوگ قریش کے میں سے اپنی مرضی سے مسلمان ہو گئے تھے، لیکن بہت قریب کفر پر قائم رہے اور ان سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ جو ان لوگوں کو اسلام کے متعلق شرح صدر ہوتا گیا وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوتے گئے ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں تھی؛ چنانچہ صفوان بن امیہ جو کہ مکہ کے رئیس امیہ بن خلف کا لڑکا تھا اور اسلام کا سخت دشمن تھا وہ بھی فتح مکہ کے موقع پر مسلمان نہیں ہوا اور کفر کی حالت میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر غزوہ حنین میں شریک ہوا جس میں اور بھی بہت مشرک شریک ہوئے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق سے اس پر اسلام کی حقانیت کھلتی گئی اور بالآخر وہ خود بشرح صدر مسلمان ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ لوگوں کو جبراً مسلمان بناتے تھے تو فتح مکہ کے بعد جبکہ قریش کی طاقت بالکل ٹوٹ چکی تھی اور اسلامی لشکر مکہ پر قابض تھا اس وقت مکہ والوں کو کیوں نہ جبراً اسلام میں داخل کیا گیا۔ فتح مکہ سے بہتر مسلمانوں کے لیے اسلام کی جبری اشاعت کا کوئی موقع ہو سکتا تھا۔ جبکہ تلوار کے ذرا سے اشارے سے ایک بہت بڑی جماعت اسلام میں داخل کی جاسکتی تھی، لیکن چونکہ اسلام مذہبی آزادی کا پیغام لیکر آیا تھا اور حکم تھا کہ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے کمال دیانتداری کے ساتھ ہر ایک شخص کو اس کے ضمیر پر آزاد چھوڑ دیا کہ جس مذہب پر کوئی چاہے رہے۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں تھا نہ مشرکین عرب اس کے متعلق ٹھنڈے طور پر غور کرنے کا موقع پاتے اور پھر اپنے مذہب کے مقابلہ میں اس کی خوبیوں کے قائل نہ ہوتے؛ چنانچہ لوہے کی تلوار نے نہیں بلکہ براین و آیات کی تلوار نے اپنا کام کیا اور ایک نہایت قلیل عرصہ میں مکہ کی سرزمین بشرک کے عنصر سے پاک ہوئی۔

**وجوہات جنگ** اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کن حالات میں اور کن لوگوں کے خلاف جہاد یا سیف کی اجازت دی گئی اور اس کی کیا وجوہات تھیں اس سوال کے جواب

میں میں اپنے پاس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتاریخ کے واقعات واضح ہیں۔ در ایک ادنیٰ عقل کا آدمی بھی ان کے مطالعہ سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہ ہو۔ سب سے پہلی



بات تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکتی زندگی میں جو جو مظالم قریش نے مسلمانوں پر کئے اور جو جو تہذیب اسلام کو  
 مٹانے کی انہوں نے اختیار کیں وہ ہر زمانہ میں ہر قسم کے حالات کے ماتحت کسی دو قوموں میں جنگ چھڑ جانے کا  
 کافی باعث ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ سخت تحقیر آمیز استہزاء اور نہایت دلاؤ دار طعن و قبیح کے علاوہ کفار مکہ  
 نے مسلمانوں کو خدائے واحد کی عبادت اور توحید کے اعلان سے جبراً روکا، اُن کو نہایت بے دردانہ طور پر مارا اور  
 پیٹا، ان کے اموال کو ناجائز طور پر غصب کیا۔ ان کا بایں کاٹ کر کے ان کو ہلاک و برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان  
 میں سے بعض کو غلامانہ طور پر قتل کیا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی۔ حتیٰ کہ ان مظالم سے تنگ آکر بہت مسلمان  
 مکہ کو چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، لیکن قریش نے اس پر بھی مبر نہ کیا اور نجاشی کے دبائے میں اپنا ایک وفد  
 بھیج کر یہ کوشش کی کہ کسی طرح یہ مہاجرین پھر مکہ میں واپس آجائیں اور قریش انہیں اسلام سے منحرف کرنے میں  
 کامیاب ہو جائیں اور یہاں ان کا خاتمہ کر دیا جائے پھر مسلمانوں کے آقا اور سردار کو جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز  
 سمجھتے تھے سخت تکالیف پہنچائی گئیں اور ہر قسم کے دُکھوں میں مبتلا کیا گیا اور قریش کے بھائی بندوقوں نے طاقت  
 میں خدا کا نام لینے پر آپ پر چھڑ برسا دیئے حتیٰ کہ آپ کا بدن ٹخن سے تر بتر ہو گیا اور بالآخر مکہ کی قومی پارلیمنٹ  
 میں سارے قبائل قریش کے نمائندوں کے اتفاق سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ محمد رسول اللہ کو قتل کر دیا جائے تاکہ اسلام  
 کا نام و نشان مٹ جائے اور توحید کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو اور پھر اس غوی قرار داد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے  
 نوجوان مکہ جو مختلف قبائل قریش سے تعلق رکھتے تھے رات کے وقت ایک جگہ بنا کر آپ کے مکان پر حملہ آور ہوئے  
 لیکن خدا نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ ان کی آنکھوں پر خاک ڈالتے ہوئے اپنے مکان سے نکل آئے اور غار  
 ثور میں پناہ لی۔ کیا یہ مظالم اور یہ غوی قرار دادیں قریش کی طرف اعلان جنگ کا حکم نہیں رکھتیں؟ کیا ان مناظر  
 کے ہوتے ہوئے کوئی عقلمند یہ خیال کر سکتا ہے کہ قریش مکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار نہ تھے؟  
 پھر کیا قریش کے یہ مظالم مسلمانوں کی طرف دفاعی جنگ کی کافی بنیاد نہیں ہو سکتے تھے؟ کیا دُنیا میں کوئی باغیرت  
 قوم جو خود کشی کا ارادہ نہ کر چکی ہو ان حالات کے ہوتے ہوئے اس قسم کے الٹی میٹم کے قبول کرنے سے پیچھے رہ سکتی  
 ہے جو قریش نے مسلمانوں کو دیا؟ یقیناً یقیناً اگر مسلمانوں کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو وہ اس سے بہت پہلے قریش  
 کے خلاف میدان جنگ میں اُتر آتی۔ مگر مسلمانوں کو اُن کے آقا کی طرف سے صبر اور عفو کا حکم تھا، چنانچہ لکھا ہے  
 کہ جب مکہ میں قریش کے مظالم بہت بڑھ گئے تو عبدالرحمن بن عوف اور دوسرے صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قریش کے مقابلہ کی اجازت چاہی، مگر آپؐ نے فرمایا اِنِّیْ اُمرِیْتُ بِالْعَفْوِ لَا  
 تُقَاتِلُوْا یعنی ”مجھے ابھی تک عفو کا حکم ہے اس لیے میں تمہیں لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چنانچہ  
 صحابہؓ نے دین کی راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور ذلت برداشت کی مگر صبر کے دامن کو نہ چھوڑا حتیٰ کہ قریش کے مظالم

کا پیالہ بھریز ہو کر پھیلنے لگ گیا اور خداوند عالم کی نظر میں اتمامِ حجت کی میعاد پوری ہو گئی۔ تب خدا نے اپنے بندے کو حکم دیا کہ تو اس بستی سے نکل جا کا اب معاملہ حق کی حد سے گذر چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہجرت قریش کے الٹی میٹم کے قبول کیے جانے کی علامت تھی اور اس میں خدا کی طرف سے اعلانِ جنگ کا ایک صغی اشارہ تھا جسے مسلمان اور کفار دونوں سمجھتے تھے چنانچہ دارالاندوہ کے مشورہ کے وقت جب کسی شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا جائے تو رؤساء قریش نے اس تجویز کو اسی بنا پر رد کر دیا تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل گیا تو پھر مندر مسلمان ہمارے الٹی میٹم کو قبول کر کے ہمارے خلاف میدان میں نکل آئیں گے اور مدینہ کے انصار کے سامنے بھی جب بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا سوال آیا تو انہوں نے فوراً کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس تمام عرب کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے نکلے اور آپ نے مکہ کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہیں ڈال کر فرمایا کہ اے مکہ تو مجھے ساری بستیوں سے زیادہ عزیز تھا مگر تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے تو اس پر حضرت ابو بکرؓ نے بھی یہی کہا کہ انھوں نے خدا کے رسول کو اس کے وطن سے نکالا ہے اب یہ لوگ منور ہلاک ہوں گے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم رہے آپ نے ہر قسم کے مقام برداشت کئے، لیکن قریش کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ کیونکہ اول تو پیشتر اس کے کہ قریش کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی سنت اللہ کے مطابق ان پر اتمامِ حجت ضروری تھا اور اس کے لیے نہلتِ حد کا رقی۔ دوسرے خدا کا یہ بھی منشاء تھا کہ مسلمان اس آخری حد تک صبر و صبر کا نمونہ دکھلائیں کہ جس کے بعد غاموش رہنا خود کشی کے ہم معنی ہو جائے جو کسی عقلمند کے نزدیک ستمِ فعل نہیں سمجھا جاسکتا۔ تیسرے مکہ میں قریش کی ایک قسم کی جمہوری حکومت قائم تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے شہریوں میں سے ایک شہری تھے۔ پس جن سیاست کا تعامن تھا کہ جب تک آپ مکہ میں رہیں آپ اس حکومت کا احترام فرمائیں اور خود کوئی امن شکن بات نہ ہونے دیں اور جب معاملہ حق کی حد سے گذر جائے تو آپ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ چوتھے یہ بھی ضروری تھا کہ جب تک خدا کی نظر میں آپ کی قوم اپنی کارروائیوں کی وجہ سے عذاب کی سستی نہ ہو جائے اور ان کو ہلاک کرنے کا وقت نہ آجائے تو آپ ان میں مقیم رہیں اور جب وہ وقت آجائے تو آپ وہاں سے ہجرت فرما جائیں۔ کیونکہ سنت اللہ کے مطابق نبی جب تک اپنی قوم میں موجود ہو ان پر ہلاک کر دینے والا عذاب نہیں آتا ہے اور جب ہلاکت کا عذاب آنے والا ہو تو نبی کو وہاں سے چلے جانے کا حکم ہوتا ہے۔ ان وجوہات سے آپ کی ہجرت اپنے اندر خاص اشارات رکھتی تھی مگر افسوس کہ ظالم قوم نے نہ پہچانا اور ظلم و تعدی میں بڑھتی گئی ورنہ اگر اب بھی قریش باز آجائے اور دین کے معاملہ میں جبر سے کام لینا چھوڑ دیتے اور مسلمانوں کو امن کی زندگی

بسر کرنے دیتے تو خدا رحم الرحیمین ہے اور اس کا رسول بھی رحمۃ اللعالمین تھا یقیناً اب بھی انہیں معاف کر دیا جاتا اور عرب کو وہ کشت و خون کے نظارے نہ دیکھنے پڑتے جو اس نے دیکھے، مگر تقدیر کے نوشتے پورے ہونے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت نے قریش کی عداوت کی آگ پر تیل کا کام دیا اور وہ آگ سے بھی زیادہ جوش و غروش کے ساتھ اسلام کو مٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان غریب اور کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھالے کے علاوہ جو ابھی تک مکہ میں ہی تھے سب پہلا کام جو قریش نے کیا وہ یہ تھا کہ جونہی کہ ان کو یہ علم ہوا کہ آنحضرت ﷺ مکہ سے پناہ کر نکل گئے ہیں وہ آپ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور وادی بکجہ کی چپۂ چپۂ زمین آپ کی تلاش میں پھان ماری اور خاص غار ثور کے منہ تک بھی جا پہنچے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی اور قریش کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ وہ عین منزل مقصود تک پہنچ کر غائب و خاسر واپس لوٹ گئے۔ جب وہ اس تلاش میں مایوس ہوئے تو انہوں نے عام اعلان کیا کہ جو شخص بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا اسے ایک سواؤنٹ جو آجکل کی قیمت کے حساب سے قریباً بیس ہزار روپیہ بنتا ہے انعام دیا جائیگا اور اس انعام کے لالچ میں مختلف قبائل کے بیسیوں نوجوان آپ کی تلاش میں چاروں طرف نکل کھڑے ہوئے؛ چنانچہ سراقہ بن مالک کا تعاقب جس کا ذکر کتاب کے حصہ اول میں گذر چکا ہے اسی انعامی اعلان کا نتیجہ تھا مگر اس تدبیر میں بھی قریش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غور کیا جاوے تو دو قوموں میں جنگ پھڑ جانے کے لیے صرف یہی ایک وجہ کافی ہے کہ کسی قوم کے آقا و سرور کے متعلق دوسری قوم اس طرح کا انعام مقرر کرے۔ بہر حال جب یہ تجویز بھی کارگر نہ ہوئی اور قریش کو علم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امن و عافیت کے ساتھ مدینہ پہنچ گئے ہیں تو بیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے رو سائے قریش نے مدینہ کے رئیس اعظم عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں کے نام ایک خطرناک تمہیدی خط ارسال کیا جس میں لکھا کہ :

اَتَكُمُ اَوْ نَيْتُمُ صَاحِبَنَا وَاِنَّا نَقْسِمُ بِاللّٰهِ لَنَقَاتِلَنَّ اَوْ تَخْرِجُنَّهٗ اَوْ نَنَسِيْرَهٗ اِلَيْكُمْ  
بَاَجْمَعِنَا حَتّٰى نَقْتُلَ مَقَاتِلَتَكُمْ وَنُسَبِّحَهُمْ بِسَاءَ كُنْتُمْ۔

”یعنی تم لوگوں نے ہمارے آدمی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے اور ہمیں خدا کی قسم ہے کہ یا تو تم اس کا ساتھ چھوڑ کر اس کے خلاف جنگ کرو یا کم سے کم اُسے اپنے شہر سے نکال دو ورنہ ہم ضرور بالضرور اپنا سارا لاؤ لشکر لے کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمہارے مردوں کو قتل کر ڈالیں گے اور تمہاری عورتوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے لئے جائز کر لیں گے۔“

اس خط سے جو تشویش بے چارے مہاجرین کو دامگیر ہو سکتی تھی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن انصار میں بھی اس نے ایک خطرناک سنسنی پیدا کر دی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ خود عبداللہ بن ابی کے پاس

تشریف لے گئے اور اسے یہ سمجھا کر ٹھنڈا کیا کہ تمہارے اپنے عزیز و اقارب میرے ساتھ ہیں کیا تم اپنے بگڑ گونشوں سے جنگ کرو گے؟ انہی ایام کے قریب سعد بن معاذ رئیس اوس عمرہ کی غرض سے مکہ آئے تو انہیں دیکھ کر ابو جہل کھی آنکھوں میں غون اُتر آیا اور اس نے بگڑ کر کہا کہ ”تم نے (نعوذ باللہ) اس مُرتد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اس کی حفاظت کر سکو گے“ لہٰذا اس زمانہ میں قریش کو اسلام کے استیصال کا اتنا خیال تھا کہ ولید بن مغیرہ رئیس مکہ جب مرنے لگا تو بے اختیار ہو کر رونے لگ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے۔ اُس نے جواب دیا میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین نہ پھیل جاوے۔ رسول قریش نے کہا۔ تم فکر مند نہ ہو۔ ہم اس بات کے ضامن ہیں کہ اس کے دین کو نہیں پھیلنے دیں گے یہ سب ہجرت کے بعد کی باتیں ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مظالم سے تنگ آکر مکہ کو چھوڑ چکے تھے اور خیال کیا جاسکتا تھا کہ اب قریش مسلمانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں گے۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ جب قریش نے دیکھا کہ اوس و خزرج مسلمانوں کی پناہ سے دستبردار نہیں ہوتے اور اندیشہ ہے کہ اسلام مدینہ میں جڑ نہ پکڑ جاوے تو انہوں نے دوسرے قبائل عرب کا دورہ کر کے ان کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانا شروع کر دیا اور چونکہ بوجہ خانہ کعبہ کے متوتی ہونے کے قریش کا سارے قبائل عرب پر ایک خاص اثر تھا اس لیے قریش کی انگیخت سے کئی قبائل مسلمانوں کے جانی دشمن بن گئے اور مدینہ کا یہ حال ہو گیا کہ گویا اس کے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔ چنانچہ یہ روایت اوپر گزر چکی ہے کہ :-

لَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابُهُ الْمَدِينَةَ وَأَوْقَعَهُمُ الْأَنْصَارُ رَمَتْهُمْ الْعَرَبُ عَنْ قَوْسٍ وَاحِدَةٍ - فَكَانُوا لَا يُبَيِّتُونَ إِلَّا بِالسَّلَاحِ وَلَا يَصْبَحُونَ إِلَّا فِيهِ دَقَاوِلُ أَمْزُونٍ أَوْ لَعِيْشٍ حَتَّى يَذِيْتُ أَمِينٍ لَا تَخَافُ إِلَّا اللَّهَ يَعْنِي ابْنُ بَنِي كَعْبٍ وَكَبَرُ أَصْحَابِهِ مِنْ تَحْتِهِ بَيَانٌ كَرْتِے ہيں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مدینہ میں تشریف لائے اور انصار نے انہیں پناہ دی تو تمام عرب ایک جان ہو کر ان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا، چنانچہ ان دنوں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ خوف کی وجہ سے وہ راتوں کو بھی ہتھیار لگا لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہتھیار لگائے پھرتے تھے کہ کہیں کوئی اچانک حملہ نہ ہو جاوے اور وہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھتے ہم اس وقت تک بچتے بھی ہیں یا نہیں کہ ہمیں امن کی راہیں گزارنے کا موقع ملے گا اور خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ رہے گا۔

خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَوَّلُ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ يَشْهَرُ مِنَ اللَّيْلِ لَيْحَةً ”جب شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے، تو دشمن کے حملہ کے خوف سے آپ غونار اتوں کو جاگا کرتے تھے۔“







کیوں نہ مردوں کی طرح میدان میں جان دوں اور یا یہ کہ اب مرنے سے بچنے کا اگر کوئی امکان ذریعہ ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ تلوار لے کر میدان میں نکل جاؤں۔ اور پھر ہر چہ بادا باد، مسلمانوں کی ابتدائی لڑائیاں اسی آخر اندک عزم کے ماتحت تھیں مگر باوجود اس خدائی حکم اور مسلمانوں کے اس اضطراری عزم کے اس وقت بہت کمزور دل مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ لڑائی کے خیال سے ان کے دل بیٹھے جاتے تھے، چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:-

فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَقْعَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ إِذَا أَسْخَتْ عَصِيَّةٌ وَمَقَاتِلُا رَبَّنَا إِنَّمَا كُنْتُمْ عَلَيْهِ قَاتِلِينَ ۖ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ

یعنی جب مسلمانوں پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ کفار سے اتنا ڈرتا تھا کہ خدا کے ڈر سے بھی ان کا د بڑھا ہوا تھا اور یہ لوگ کہتے تھے کہ اے رب ہمارے ڈر نے ابھی سے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا اور کیوں ہیں تھوڑی دیر اور مہلت نہ دی ؟ پھر فرماتا ہے:-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كَرْهٌ ۚ لَكُمْ دَعْوَىٰ عَلَىٰ أَنْ تَكْفُرُوا فَبَيْنَا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَخَيْرٌ لَّكُمْ أَنْ تَجِدُوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۖ

یعنی اے مسلمانو! ہم جانتے ہیں کہ جہاد بالسیف تم پر ایسے وقت میں فرض کیا گیا ہے کہ وہ تمہارے لیے ایک مشکل اور تکلیف دہ کام ہے مگر یاد رکھو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لیے موجب تکلیف سمجھو مگر دراصل وہ اچھی ہو۔ یا تم ایک چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھو مگر دراصل وہ بُری ہو اور بیشک اللہ اس بات کو جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ جہاد بالسیف کے متعلق سب سے پہلی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ۱۲ صفر ۲ھ مطابق ۱۵ اگست ۶۲۳ء

جہاد کے متعلق پہلی قرآنی آیت

کو نازل ہوئی جبکہ آپ کو مدینہ میں تشریف لائے قریباً ایک سال کا عرصہ گزرا تھا اور وہ یہ آیت ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَ بِأَيْمَانِهِمْ أَنْ يَفْعَلُوا وَاللَّهُ عَلِيمٌ غَائِبُونَ ۚ وَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ إِذَا أَسْخَتْ عَصِيَّةٌ وَمَقَاتِلُا رَبَّنَا إِنَّمَا كُنْتُمْ عَلَيْهِ قَاتِلِينَ ۖ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ

اجازت دی جاتی ہے لڑنے کی مسلمانوں کو جن کے خلاف کفار نے تلوار اٹھائی ہے۔ کیونکہ وہ

(مسلمان) مظلوم ہیں اور ضرور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے وہ ظلم کے ساتھ اپنے گھروں سے نکالے گئے صرف اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نہ ہو تو اس کے (دفاعی) جنگ کی اجازت دیکر) ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف ترقیقاً راہوں کے صومعے اور عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے معابد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ خدا کا نام لیا جاتا ہے ایک دوسرے کے ہاتھ سے تباہ و برباد کر دی جاویں اور اللہ تعالیٰ ضرور اُس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ قوی اور غالب خدا ہے۔

اس آیت کے الفاظ جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ ابتدائی اسلامی جنگوں کی غرض و غایت اور اس وقت کے مسلمانوں کی حالت کو ظاہر کر رہے ہیں وہ کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو اس آیت سے چار باتیں ثابت ہوتی ہیں :- اول - یہ کہ اس جنگ میں ابتداء کفار کی طرف سے تھی جیسا کہ ”يَقَاتُلُوْنَ“ کے لفظ سے ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ کفار مسلمانوں پر سخت ظلم کیا کرتے تھے اور ان کے یہی مظالم جنگ کا باعث تھے جیسا کہ ”بَاثْنَهُمْ ظُلُمًا“ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ کفار کی غرض یہ تھی کہ دین اسلام کو تلوار کے زور سے نیست و نابود کر دیں جیسا کہ ”لَقَدْ مَنَّا“ کے لفظ میں اشارہ ہے۔ چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے اعلان جنگ کی غرض خود حفاظتی اور دفاع تھی۔ جیسا کہ ”كُوَلَّدَ فَجَّ اللَّهُ النَّاسَ“ کے الفاظ سے پایا جاتا ہے۔ الغرض یہ آیت کریمہ جو جہاد بالسیف کے متعلق سب سے پہلی آیت ہے کمال صفائی کے ساتھ یہ بتا رہی ہے کہ ان جنگوں میں ابتداء کفار کی طرف سے تھی جو اسلام کو بزدور مٹانا چاہتے تھے اور مسلمان مظلوم تھے اور انہوں نے محض خود حفاظتی اور دفاع میں تلوار اٹھائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مخالفین اسلام کی طرف سے جہاد بالسیف کے متعلق جتنے بھی اعتراض ہوتے ہیں اُن کے جواب کے لیے یہی ایک آیت کافی ہے اگر کوئی سمجھے۔

قرآن سب سے زیادہ صحیح تاریخی شہادت ہے

اس جگہ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ شبہ گزرے کہ قرآن تو خود مسلمانوں کی اپنی مذہبی کتاب ہے اس کی شہادت کو کس طرح یہ رتبہ دیا جاسکتا ہے کہ اس پر ایک اہم تاریخی واقعہ کی بنیاد رکھی جاوے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا شبہ صرف اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو فن تاریخ اور اسلامی لٹریچر سے قطعاً ناواقف ہو۔ قرآن کریم کا تو وہ مرتبہ ہے کہ جس کے مقابل میں اسلامی تاریخ کا کوئی دوسرا ریکارڈ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ بھلا حدیث و تاریخ کی روایت کو باوجود محدثین اور مؤرخین کی اتنی چھان بین کے قرآن کے مقابلہ میں کیا وزن حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ صرف خوش عقیدگی کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک نئی صداقت ہے جس کو دوست و دشمن نے تسلیم کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں کسی مذہبی مسئلہ کا سوال نہیں ہے کہ کوئی غیر مسلم یہ کہہ کر قرآن کے خیال کو رد کر دے کہ میں قرآنی تعلیم کو خدا کی طرف سے نہیں مانتا۔ بلکہ یہاں تاریخی شہادت کا سوال ہے اور یہ تسلیم ہے کہ تاریخی شہادت سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مستند وہی ہوتی ہے جو اس وقت کی ہو جبکہ کوئی

واقعہ ہوا ہے اور ان لوگوں کی ہوجن کے سامنے وہ واقعہ ہوا ہے اور وہ اُسی وقت ضبط تحریر میں آجائے اور پھر اس کے بعد بھی ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے اور اس جہت سے جو مرتبہ قرآن کریم کو حاصل ہے وہ ہرگز کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی نہ صرف ضبط تحریر میں آگیا تھا بلکہ بہت سے حفاظ نے اس کو اپنے ذہنوں میں لفظ بلفظ محفوظ بھی کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ آج تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہا ہے اور اب بھی بعینہ اسی شکل و صورت میں ہے جیسا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں تھا۔ چونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، میں اس بحث میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہتا؛ ورنہ میں بتانا کہ قرآن کی صحت کا مرتبہ کیسا عالیشان ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی اور سند کو لانا صداقت کی ہتک کرنا ہے۔ صرف بطور مثال کے دو شہادتیں پیش کرتا ہوں اور وہ بھی ان لوگوں کی جو مخالفین اسلام میں سے ہیں۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ۔

سروہیم میور جو ایک بہت مشہور انگریز مؤرخ گذرے ہیں اور جن کی کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح میں غالباً سب مغربی کتب کے زیادہ متداول ہے وہ اپنی کتاب لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتے ہیں:-  
”اس بات کی مضبوط ترین شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں کا قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت سے لے کر آج تک غیر محرف و مبدل رہا ہے۔“

پھر لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کے قرآن کا ہماری انابیل کے ساتھ مقابلہ کرنا جو بد قسمتی سے بہت کچھ محرف و مبدل ہو چکی ہیں دُعا ایسی چیزوں کا مقابلہ کرنا ہے جن کو ایک دوسرے سے کوئی بھی مناسبت نہیں۔“

پھر لکھتے ہیں:

اس بات کی پوری پوری اندرونی اور بیرونی ضمانت موجود ہے کہ قرآن اب بھی اسی صورت و شکل میں جیسا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت میں تھا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سروہیم میور اسلام کے دوستوں میں سے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنی کتاب میں جا بجا اسلام اور بانی اسلام پر سخت حملے کیے ہیں مگر قرآن کی وہ ارفع شان ہے جسے کسی کا تعصب گہرا آلودہ نہیں کر سکتا۔ پھر نوادی کی جو جرمنی کا ایک نہایت مشہور عیسائی مستشرق گذرا ہے اور جو اس فن میں گویا اُستاد مانا گیا ہے۔ قرآن کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

”آج کا قرآن بعینہ وہی ہے جو صحابہ کے وقت میں تھا۔“

پھر لکھتا ہے کہ:-

”یورپین علماء کی یہ کوشش کہ قرآن میں کوئی تحریف ثابت ہو سکے قطعاً ناکام رہی ہے۔“  
 یہ قرآن کی عام صحت کے متعلق اہل مغرب کی شہادت ہے پھر خاص تاریخی نقطہ نگاہ سے سرولیم میور لکھتے ہیں کہ:  
 ”اسلام اور بائی اسلام کے متعلق تاریخی تحقیقات کرنے کے لیے قرآن ایک بنیادی پتھر ہے جس سے  
 ہر واقعہ کی صحت جانچی جاسکتی ہے۔“

پھر لکھتے ہیں :-

نبی اسلام کے سوانح کے لیے قرآن ایک یقینی کلید ہے۔“  
 پھر پروفیسر نکلسن جو انگلستان کا ایک مسیحی مستشرق ہے اور جس کی تصنیف ”عرب کی ادبی تاریخ“ بہت شائع اور  
 متعارف ہے، اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے :

”اسلام کی ابتدائی تاریخ کا علم حاصل کرنے کے لیے قرآن ایک منظر اور ہر قسم کے شک و شبہ سے  
 بالا کتاب ہے اور یقیناً بد مذہب اور سچیٹ یا کسی قدیم مذہب کو اس قسم کا مستند تاریخی ریکارڈ  
 حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں اسلام کو حاصل ہے۔“

الغرض قرآن کریم ابتدائی اسلامی تاریخ کا بالکل سچا اور سب سے زیادہ مستند ریکارڈ ہے اور اس کو وہ مرتبہ حاصل  
 ہے جو حدیث یا سیرت یا تاریخ کو حاصل نہیں ہے۔ پس جب قرآن کریم اپنی اس آیت میں جو سب سے پہلے جہاد بالیاف  
 کی اجازت میں نازل ہوئی نہایت واضح اور غیر مشکوک الفاظ میں یہ شہادت دے رہا ہے کہ ابتداء کفار کی طرف سے  
 تھی اور مسلمانوں نے محض دفاع میں تلوار اٹھائی تھی تو ریکارڈ اور بڑے استدلالات کر کے مسلمانوں کی طرف سے  
 ابتداء ہونے کا ثبوت تلاش کرنا ہرگز دیا ننداری کا فعل نہیں سمجھا جاسکتا۔

جہاد کے متعلق بعض دوسری قرآنی آیات اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی بعض  
 دوسری آیات بھی درج کر دی جاویں جو وقتاً فوقتاً

جہاد بالیاف کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں کیونکہ ان سے ابتدائی اسلامی جنگوں کے حالات پر  
 ایک ایسی روشنی پڑتی ہے جو کسی دوسری جگہ میسر نہیں آسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُواهُمْ  
 حَيْثُ تَقْبَلُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ ۝ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْغَنَّةَ أَشَدُّ مِنْ الْقَتْلِ وَلَا تَقَاتِلُواهُمْ  
 عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُفَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۝ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝  
 فَإِنْ أَنتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَقَاتِلُواهُمْ حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَيَكُونََ الدِّينُ لِلَّهِ ۝

۱۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ۶۔ دیکھو لائف آف محمد مصنفہ میور :

۲۔ دیکھو عرب کی ادبی تاریخ مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۳۲ ۵

فَإِنْ أَنْتَهُوَ أَفْلَاكُهُ فَإِنَّ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ؕ

اے مسلمانو! لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں مگر دیکھنا زیادتی نہ کرنا کیونکہ زیادتی کرنیوالوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ اور لڑو ان کفار سے جو تم سے لڑتے ہیں جہاں بھی ان کا اور تمہارا سامنا ہو۔ اور نکالو ان کو اس جگہ سے جہاں سے وہ تمہیں نکالیں۔ یعنی جہاں بھی وہ تمہارے اثر کو بزور مٹانا چاہیں تم ان کا مقابلہ کرو۔ اور بیشک وہ فتنہ جن کے یہ لوگ مرتکب ہو رہے ہیں وہ قتل سے بھی سخت تر ہے مگر ہاں لڑائی مت کرو حرم کے علاقہ میں لیکن اگر یہ کفار خود تم سے حرم میں لڑائی کی ابتداء کریں تو پھر بیشک تم بھی ان کا مقابلہ کرو۔ کیونکہ ناشکر گزادوں کی یہی سزا ہے اور اگر کفار اس سے باز آجائیں تو جانو کہ اللہ بھی غفور ورحیم ہے اور اے مسلمانو! تم لڑو ان کفار سے اس وقت تک کہ ملک میں فتنہ نہ ہے اور دین خدا ہی کے لیے ہو جاوے۔ یعنی دین کے معاملہ میں سوائے خدا کے اور کسی کا خوف نہ ہے اور ہر شخص آزادی نے اپنی ضمیر کے مطابق جو دین پسند کرے وہ رکھ سکے اور اگر یہ کفار جنگ سے باز آجائیں تو تم بھی فوراً رک جاؤ۔ کیونکہ کسی کو جنگ کشی کا حق نہیں ہے مگر صرف ظالموں کے خلاف ؕ

یہ آیت بھی اپنے معانی میں نہایت واضح ہے اور اس سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں کو جہاد کا حکم صرف ان لوگوں کے خلاف دیا گیا تھا جو ان سے دین کے معاملہ میں جنگ کرتے تھے اور ان کو تلوار کے زور سے ان کے دین سے پھیرنا چاہتے تھے اور نیز یہ کہ مسلمانوں کو یہ بھی حکم تھا کہ اگر یہ کفار جنگ سے باز آجائیں تو تمہیں بھی چاہیے کہ فوراً رک جاؤ اور اس آیت میں جنگ کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ملک میں فتنہ نہ رہے اور مذہب بھی آزادی قائم ہو جاوے۔

پھر فرماتا ہے :-

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؕ

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو اے نبی تمہیں چاہیے کہ تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر توکل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

پھر فرماتا ہے :-

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ؕ



”اور اگر کوئی مشرک تمہاری پناہ میں داخل ہو کر تمہارے پاس تحقیق دین کے لیے آنا چاہے تو اُسے آنے دو اور پھر اپنی حفاظت میں اُسے اُس کی جگہ میں واپس پہنچا دو۔“  
پھر فرماتا ہے:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَنَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجَرُوا ۚ وَالْإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِثْلُ بَرٍّ مِثْلُ اللَّهِ بِمَا تَعْمَلُونَ بِمِثْرَةٍ

”اور وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے ہیں مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ یعنی وہ تمہارے مصائب میں تمہارا ماتھ نہیں بٹاتے وہ تمہاری سیاسی دوستی کے حقدار نہیں ہیں؛ البتہ اگر وہ کسی دینی معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو مدد دو، لیکن ان کفار کے خلاف تمہیں مدد دو، لیکن ان کفار کے خلاف تمہیں دینے کی اجازت نہیں ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو اور اُسے مومنو! ہوشیار ہو کہ خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے“

وَأَذِقُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝  
”اور پورا کرو اپنے عہد کو کیونکہ یقیناً تمہیں اپنے عہد کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔“  
پھر فرماتا ہے:-

لَا يُلَهِكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَكَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

”نہیں منع کرتا اللہ تم کو ان لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملہ میں لڑائی نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یہ کہ تم ان سے مہربانی کا سلوک کرو اور ان سے عدل اور احسان سے پیش آؤ۔ بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے تم کو کہ دوست بناؤ ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے خلاف دین کے معاملہ میں لڑائی کی اور تمہارے گھروں سے تمہیں نکال دیا تمہارے نکالے جانے میں اعانت کی۔ اور جو کوئی دوستی لگائے گا ایسے دشمنوں کے ساتھ تو ایسے لوگ ظالموں میں سے سمجھے جائیں گے۔“

پھر فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْعَدْلِ وَلَا يَجْعَلْ مَنكُمْ سِتْنَانُ قَوْمٍ عَلَىٰ الْآخَرِ لَا تُعْزِلُوا  
إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ٥

اے مومنو! چاہیے کہ تم دنیا میں خدا کے لیے عدل و انصاف کو قائم کرو اور چاہیے کہ ہرگز نہ  
آمارہ کرے تم کو کسی قوم کی دشمنی اس بات پر کہ تم اس کے ساتھ انصاف سے پیش نہ آؤ۔ بلکہ  
تمہیں چاہیے کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا معاملہ کرو کیونکہ عدل و انصاف کرنا  
تقویٰ کا تقاضا ہے۔ پس تم متقی بنو اور یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

یہ قرآن شریف کا بیان گذرا ہے اور گو قرآن کے  
بیان کے بعد کسی اور بیان کی حاجت نہیں رہتی،

### جہاد بالسیف کے متعلق بعض اصولی روایات

لیکن اس خیال سے کہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ گذرے کہ شاید عام تاریخی روایات قرآن کے مخالف ہوں اس جگہ بعض  
روایات بھی درج کر دینی مناسب ہیں جن سے اسلام کی ابتدائی لڑائیوں پر ایک اصولی روشنی پڑتی ہے۔ سورت  
آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَسْتَمْتُوا بِإِقَاءِ الْعَدُوِّ وَاسْتَلُوا اللَّهَ الْعَاقِبَةَ فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا ۖ - اے مسلمانو! تمہیں  
چاہیے کہ دشمن کے مقابلہ کی خواہش نہ کیا کرو اور خدا سے امن و عاقبت کے خواہاں رہو اور اگر تمہاری خواہش  
کے بغیر حالات کی مجبوری سے کسی دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو جائے تو پھر ثابت قدمی دکھاؤ۔ اس سے صاف ثابت  
ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ کفار کی طرف سے اعلان جنگ ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کا  
پیغام قبول کر لیا تھا اور جنگ کا آغاز ہو چکا تھا پھر بھی مسلمانوں کو یہی حکم تھا کہ وہ اس جنگ کے جزوی مقابلوں میں  
بھی لڑائی کی خواہش نہ کیا کریں۔ ہاں البتہ اگر دشمن سے مقابلہ ہو جاوے تو پھر جم کر لڑیں۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّحْلِ يُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَيُقَاتِلُ حِمِيَّةً وَيُقَاتِلُ  
رِيَاءً أَيْ ذَلِكَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ يَتَكُونُ كَلِمَةً اللَّهُ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

”یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص ہے کہ وہ اپنی بہادری کے اظہار کے لیے  
جنگ کرتا ہے اور ایک شخص ہے کہ وہ خاندانی یا قومی غیرت کی وجہ سے لڑتا ہے اور ایک شخص ہے کہ وہ لوگوں کو دکھانے  
کے لیے لڑائی کرتا ہے۔ ان میں سے کونسا شخص فی سبیل اللہ لڑنے والا سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی بھی نہیں  
بلکہ خدا کے رستے میں وہ شخص لڑنے والا سمجھا جائیگا جو اس لیے لڑتا ہے کہ جو کوشش کفار کی طرف اللہ تعالیٰ کے دین  
کو مغلوب کرنے کی جباری ہے اس کا قلع قمع ہو اور خدا کا دین کفار کی ان کوششوں کے مقابل پر غالب آجاوے۔“

پھر روایت آتی ہے کہ :-

عَنْ بَرِيدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَأَذْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثٍ خِلَالٍ فَإِنْ أَجَابُوكَ فَأَقْبِلْ مِنْهُمْ وَكَفَّ عَنْهُمْ أَدْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوكَ فَأَقْبِلْ مِنْهُمْ وَكَفَّ عَنْهُمْ - ثُمَّ أَدْعُهُمْ إِلَى الرَّحُولِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْبُهَاجِرِينَ وَاخْبِرْهُمْ أَنَّكُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْهِمْ فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّكُمْ يَكُونُونَ كَأَغْرَابِ الْمُسْلِمِينَ يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللَّهِ تَعَالَى الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ وَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَلَهُمْ الْحِزْمَةُ فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ فَأَقْبِلْ مِنْهُمْ وَكَفَّ عَنْهُمْ فَإِنْ أَبَوْا فَلَا سَبْعِينَ بِإِلَهِهِ وَقَاتِلْهُمْ بِهِ

یعنی بریدہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی فوجی دستہ روانہ کرتے تھے تو اس کے امیر کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ جب تم اپنے دشمنوں کے سامنے ہو یعنی اس قوم سے تمہاری مٹھ بیٹھ ہو جاوے جن سے تمہاری لڑائی چھڑی ہوئی ہے تو لڑائی شروع کرنے سے پہلے انہیں تین باتوں کی دعوت دیا کرو۔ اگر ان تینوں میں سے وہ کوئی ایک بھی مان لیں تو پھر ان سے مت لڑو۔ سب سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ مان لیں تو ان کے اسلام کو قبول کرو اور ان سے اپنا ہاتھ کھینچ لو پھر اس کے بعد تم ان کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی تحریک کرو۔ اور ان سے کہو کہ اگر وہ ہجرت کریں گے تو ان کو مہاجرین کے حقوق دینے جائیں گے اور مہاجرین کی ذمہ داری بھی ان پر ہوگی اگر وہ ہجرت پر رضامند نہ ہوں تو پھر ان سے کہہ دو کہ وہ اسلام میں تو داخل ہو جائیں گے لیکن مہاجرین کے حقوق ان کو نہیں ملیں گے کیونکہ وہ صرف جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ تمہاری دعوت اسلام کو ہی رد کر دیں تو پھر ان سے کہو کہ تمہیں دینا قبول کر کے اسلامی حکومت کے ماتحت آجاؤ۔ اگر وہ یہ صورت مان لیں تو پھر بھی ان سے لڑائی مت کرو، لیکن اگر وہ انکار کریں تو پھر خدا کا نام لیکر ان سے لڑو۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

عَنِ الْحَارِثِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ بَعَثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْجَةٍ فَلَمَّا بَلَغْنَا الْمَخَارِ اسْتَعَشَشْتُ فَرَسِي فَبَسَمْتُ أَصْحَابِي فَبَلَغْنَا فِي أَهْلِ الْحَبَشَةِ فَقُلْتُ لَهُمْ قُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَالُوا هَذَا مَا نَحْنُ بِأَصْحَابِي فَقَالُوا احْرَمْتَنَا الْغَنِيمَةَ فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرُوهُ بِالَّذِي صَنَعْتُ فَخَدَعَنِي فَحَسَنَ لِي مَا صَنَعْتُ ثُمَّ قَالَ لِي أَمَّا إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَكَتَبَ لَكَ بِكُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ كَذَا وَكَذَا مِنْ الْأَجْرِ وَقَالَ أَمَّا إِنِّي مَا كُتِبَ لَكَ تَوْصِيَّةٌ بَعْدِي فَفَعَلْ وَهُمْ

”یعنی عارث بن مسلم بن عارث اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریر میں بھیجا۔ جب ہم منزل مقصود پر پہنچے تو میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے آگے کر لیا۔ جب قبیلہ کے لوگ مجھے ملے تو وہ اچانک حملہ کی وجہ سے ڈر کر عاجزی کرنے لگ گئے۔ جس پر میں نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس پر میرے بعض کمزور ساتھیوں نے مجھے ملامت کی کہ تم نے ہمیں غنیمت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے تو لوگوں نے اس واقعہ کی آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے مجھے بلایا اور میرے فعل کی تعریف کی۔ اور فرمایا کہ تم نے بہت ہی اچھا کام کیا ہے اور پھر کہا کہ خدا نے تمہارے لیے اس قبیلہ کے ہر آدمی کے بدلے میں اتنا اجر مقرر کیا ہے اور جو شہرستان میں فرمایا کہ آؤ میں تمہیں ایک پروانہ خوشنودی لکھ دیتا ہوں تاکہ ہمیشہ کے لیے میری یہ خوشنودی تمہارے پاس رہے! چنانچہ آپ نے مجھے ایک پروانہ لکھ دیا اور اس پر اپنی مہر ثبت فرمائی“

پھر روایت آتی ہے کہ :-

عَنْ عَاصِمِ بْنِ كَلْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَأَصَابَ النَّاسَ حَاجَةٌ شَدِيدَةٌ وَجَعَدُوا صَابًا وَاعْتَمُوا فَانْتَهَبُوا هِيَ فَإِنَّا قَدْ دُرْنَا لَتَغْلِي إِذْ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِي بِأَكْفَادٍ الْقُدْرُ بِقَوْمِهِ ثُمَّ جَعَلَ يَزِمُّ اللَّحْمَ بِالْأُتْرَابِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ اللَّهَبَةَ لَيْسَتْ بِأَحَلَّ مِنَ الْمَيْتَةِ يَه

یعنی ”عاصم بن کلب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی بیان کرتے تھے کہ ہم ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو ایک موقع پر لوگوں کو خطرناک بھوک لگی اور وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور (ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا) جس پر انھوں نے ایک بکریوں کے گلہ میں سے چند بکریاں پکڑ لیں اور انہیں ذبح کر کے پکانا شروع کر دیا۔ ہماری ہنڈیاں اس گوشت سے ابل رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوپر سے تشریف لے آئے اور آپ نے آتے ہی اپنی کھان سے ہماری ہنڈیوں کو الٹ دیا اور غصہ میں گوشت کے ٹکڑوں کو مٹی میں مٹانے لگ گئے اور فرمایا کہ لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے“

یہ ان لوگوں کا قصہ ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ ان کو لوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کسی یورپین فوج کو اس طرح کی حالت پیش آئے کہ ان کے پاس زادِ راہ ختم ہو گیا ہو اور فوجی لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں تو کسی چرتے ہوئے گلہ کی بکریوں پر قبضہ کر لینا تو معمولی بات ہے وہ نہ معلوم کیا کچھ جائز قرار دے لیں۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ رَجُلٌ يُرِيدُ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَهُوَ يَتَّبِعُنِي عَرْمَتًا مِنَ الدُّنْيَا فَقَالَ لَا أَجْرَ لَهُ فَأَعَارَ لَهُ ثَلَاثًا كُلُّ ذَاكَ يَقُولُ لَا أَجْرَ لَهُ

یعنی ”ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ — یا رسول اللہ ایک شخص ہے کہ اس کی اصل نیت تو جہاد فی سبیل اللہ کی ہے، لیکن ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آ جاتا ہے کہ جنگ میں کچھ مال و متاع بھی مل رہے گا تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ایسے شخص کے لیے ہرگز کوئی ثواب نہیں ہے۔ اس شخص نے حیران ہو کر تین دفعہ اپنا سوال دہرایا، مگر ہر دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا کہ اُس کے لیے ہرگز کوئی ثواب نہیں۔“

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد مکرئیو اے کی نیت خالصہ دینی ہونی چاہیے اور اگر حفاظت دین کے علاوہ کوئی ذرا سا خیال بھی اس کے دل میں پیدا ہو تو وہ ثواب سے محروم ہو جاتا ہے اور غنیمت اور دینی مال و متاع کی امید رکھنا مجاہد کے لیے قطعی حرام ہے۔

پھر روایت آتی ہے کہ :-

مَا مِنْ غَارِيَةٍ تَغْزُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُصِيبُكُمْ غَنِيمَةٌ إِلَّا تَعَجَّلُوا ثَلَاثِي أَخْبَرَهُمْ مِنَ الْآخِرَةِ  
وَيَسْبِقِي لَهُمُ الثَّلَاثُ وَإِنْ لَمْ يُصِيبُوا غَنِيمَةً لَمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ

یعنی ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو مجاہدین خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلتے ہیں اور ان کو لڑائی میں غنیمت کا مال ہاتھ آ جاتا ہے تو ان کا دو تہائی ثواب آخرت کا کم ہو جائے گا اور صرف ایک تہائی ثواب ملے گا۔ لیکن اگر انہیں کوئی غنیمت ہاتھ نہ آئے تو انکو پورا پورا ثواب ملے گا۔“

یہ حدیث گزشتہ حدیث کی نسبت زیادہ واضح ہے کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لڑائی میں خالصہ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے شامل ہوتا ہے اور اس میں کوئی لونی دُنیا کی نہیں ہوتی اور پھر اسے بغیر خیال اور امید کے غنیمت کا مال بھی مل جاتا ہے تو پھر بھی چونکہ اسے دُنیا کے اموال سے حصہ مل گیا ہے اس لیے اس کا آخرت کا اجر کم ہو جائے گا۔ لیکن جو شخص خالص جہاد کی نیت سے نکلتا ہے اور اُسے غنیمت کا مال مطلقاً نہیں ملتا وہ پورے پورے ثواب کا حقدار ہوگا۔ گویا جہاں گزشتہ حدیث صحابہ کے دل میں دُنیا کے اموال سے محض عدم رغبت پیدا کرتی تھی وہاں یہ حدیث دُوری اور ایک قسم کی نفرت پیدا کرتی ہے اور اس تعلیم کے ہوتے ہوئے ایک سچا مسلمان نہ صرف یہ کہ غنیمت وغیرہ کا خیال تک دل میں نہیں لاتے گا بلکہ غنیمت کے مواقع سے بھی حتیٰ الامکان پرہیز کرے گا اور اس کی یہی خواہش اور کوشش ہوگی کہ جس طرح بھی ہو غنیمت اُسے نہ ملے تاکہ جہاد کے ثواب میں کمی نہ آئے؛ چنانچہ کمزور لوگوں کو الگ رکھ کر جس کا



وجود کم دیش ہر قوم میں پایا جاتا ہے مگر جو یقیناً صحابہ کی جماعت میں دنیا کی ہر قوم سے کمتر تعداد میں تھے صحابہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ چنانچہ ابو داؤد کی روایت میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح مسلم بن حارث نے ایک دشمن قبیلہ پر حملہ کر کے غنیمت حاصل کرنی بجائے اسلام کی تحریک کر کے مسلمان بنالیا اور خود غنیمت سے محروم ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فعل کی بہت تعریف فرمائی اور اسے اپنی طرف سے ایک پروانہ خوشنودی عطا فرمایا۔

پھر ابو داؤد ہی کی روایت ہے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ میں مدینہ سے نکلنے لگے تو ایک بوڑھے انصاری نے غم ایک غریب صحابی وائل بن اسقع کو اپنی طرف سے سواری وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ جہاد کے بعد وائل بن اسقع کعب بن عجرہ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ یہ اونٹنیاں غنیمت میں دی ہیں تم اپنا حصہ لے لو۔ کعب نے کہا۔ جیتے جی! خدا تمہیں یہ مال مبارک کرے۔ میری نیت غنیمت کی نہ تھی بلکہ ثواب کی تھی اور حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

پھر نسائی میں ایک روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اعرابی ایمان لایا اور ایک غزوہ میں ساتھ ہوا۔ جب کچھ مال غنیمت ملا تو آپ نے اس کا حصہ بھی نکالا۔ اسے معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! آپ نے میرا حصہ نکالا ہے۔ خدا کی قسم میں تو اس خیال سے مسلمان نہیں ہوا تھا میری تو یہ نیت تھی کہ مجھے خدا کی راہ میں (حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس جگہ تیر لگے اور میں جنت میں جاؤں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر یہ شخص سچی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو خدا اُسے پورا کرے گا۔ تھوڑی دیر بعد لڑائی ہوئی تو وہ شخص وہیں حلق میں تیر کھا کر شہید ہوا۔ جب صحابہ اُسے آپ کے سامنے اٹھا کر لائے تو آپ نے پوچھا کیا یہ وہی ہے صحابہ نے عرض کیا۔ ہاں رسول اللہ! آپ نے فرمایا! خدا نے اس کی آرزو کو پورا کر دیا۔ پھر آپ نے اس کے کفن کے لیے اپنا جبّہ عطا کیا اور اس کے لیے خاص طور پر دُعا فرمائی۔

افسوس۔ صد افسوس! ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر یہ الزام لگاتے ہوئے خدا کا خوف نہیں کرتے کہ ان لڑائیوں میں اُن کی غرض لوٹ مار اور دنیا کمانا تھی۔

**عرب میں جنگ کا طریق**

کفار اور مسلمانوں کی لڑائیوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ جانتا بھی ضروری ہے کہ عرب میں جنگوں کا طریق دُور نگ رکھنا تھا جسے

انگریزی میں فیوڈ (FEUD) کہتے ہیں۔ یعنی جب کبھی دُور سے عرب کے دو قبائل میں جنگ چھڑتی تھی تو پھر

ابو داؤد میں اسکا نام مذکور نہیں مگر اسد الغابہ سے پتا لگتا ہے کہ اس کا نام کعب بن عجرہ تھا۔ کتاب الجہاد۔  
 ۲۔ کتاب الجہاد۔ ۳۔ آپر والی جملہ روایتوں میں جن میں ابواب وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا گیا وہ عموماً ابواب الجہاد والسیرو  
 المغازی سے لی گئی ہیں اور ان کے الفاظ تلخیص الصراح کی روایت کے مطابق درج کئے گئے ہیں۔

جب تک اُن میں باقاعدہ صلح نہ ہو جاتی تھی وہ ہمیشہ جنگ کی حالت میں سمجھے جاتے تھے اور موقعہ پاکر وقفہ وقفہ سے آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات یہ جنگیں بڑے بڑے لمبے عرصہ تک جاری رہتی تھیں؛ چنانچہ جنگ بسوس جس کا ذکر کتاب کے حصہ اول میں گذر چکا ہے اسی طرح وقفہ وقفہ سے چالیس سال تک جاری رہی تھی اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض جنگیں سو سو سال تک بھی جاری رہیں مگر مسلسل لڑتے رہنے کا عرب میں دستور نہیں تھا جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول تو چونکہ قبیلہ کا ہر شخص سپاہی ہوتا تھا اور کوئی باقاعدہ الگ فوج نہیں ہوتی تھی اس لیے قبائل عرب اپنی جنگوں کو مسلسل طور پر جاری نہیں رکھ سکتے تھے اور اپنے دوسرے کاروبار کی وجہ سے اس بات پر مجبور تھے کہ وقفہ دے کر لڑائی کریں۔ دوسرے چونکہ جنگ میں ہر شخص اپنا اپنا خرچ خود برداشت کرتا تھا اور اس غرض کے لیے عموماً کوئی قومی خزانہ نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ انفرادی مالی بوجھ بھی عربوں کو مجبور کرتا تھا کہ دم لے لے کر میدان میں آئیں۔ اس غیر مسلسل جنگ کو جاری رکھنے کے لیے بعض اوقات یہ طریق بھی اختیار کیا جاتا تھا کہ جب ایک لڑائی ہوتی تھی تو اُسی میں آئندہ کے لیے وعدہ ہو جاتا تھا کہ اب فلاں وقت فلاں جگہ پھر ملیں گے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا تھا؛ چنانچہ اُحد کے موقعہ پر ابوسفیان نے اسی قسم کا وعدہ مسلمانوں سے کیا تھا جس کے نتیجہ میں غزوہ بدر، اُحدہ و قریظ میں آیا۔ الغرض عربوں میں مسلسل لڑتے رہنے کا طریق نہیں تھا بلکہ وہ وقفہ ڈال ڈال کر لڑتے تھے اور درمیانی وقفوں کو لڑائی کی تیاری اور اپنے دوسرے کاروبار میں صرف کرتے تھے اور ان کی یہ ساری لڑائیاں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوتی تھیں۔ یہ ایک بڑا عجیب نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض مؤرخین نے ٹھوکر کھائی ہے۔ کیونکہ انہوں نے قریش اور مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں سے ہر لڑائی کے لیے الگ الگ وجوہات تلاش کرنی چاہی ہیں؛ حالانکہ حق یہ ہے کہ جب قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک دفعہ جنگ شروع ہو گیا تو پھر اس وقت تک کہ ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ سے ان کے درمیان صلح نہیں ہو گئی۔ یعنی صلح مدیہ تک جو ہجرت کے چھٹے سال ہوئی یہ دونوں قومی حالت جنگ میں تھیں اور اس عرصہ میں اُن کے درمیان جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں وہ اسی جنگ کے مختلف کانسے تھے اور ان کے لیے الگ الگ وجوہات تلاش کرنا سخت غلط ہے۔ ہاں بعض اوقات بیشک ایسا ہوا ہے کہ کسی درمیانی لڑائی کے لیے کوئی الگ تحریکی باعث بھی پیدا ہو گیا ہے، لیکن اصل سبب وہی مستقل پہلا جھگڑا رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات عرب کے جنگوں میں یہ بھی ہوتا تھا (اور دراصل یہ بات تو آج کل کے جنگوں میں بھی پائی جاتی ہے) کہ جنگ کر نیوالے قبائل کے ساتھ دوسرے قبائل بھی اپنے اپنے قومی مصالح کے ماتحت جنگ میں شامل ہو جاتے تھے مثلاً اگر الف اور ب میں جنگ شروع ہوتی تو علاوہ اس کے الف کے حلیف الف کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے اور ب کے حلیف ب کے ساتھ۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ دوران جنگ میں کوئی قبیلہ کسی وجہ سے الف کے ساتھ مل جاتا تھا اور کوئی دوسرا قبیلہ ب کے ساتھ ہو جاتا تھا اور اس طرح جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ قریباً قریباً ہی صورت اسلامی جنگوں میں پیش آئی۔ یعنی ابتداءً مسلمانوں کو قریش مکہ کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم ملا جسے بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر قبول کیا، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ بہت سے

دوسرے قبائل بھی اس جنگ کی پیٹ میں آتے گئے۔ مثلاً قریش مکہ نے کسی دوسرے قبیلہ کو مسلمانوں کے خلاف اپنے ساتھ گانٹھ لیا تو مسلمانوں کی اس کے ساتھ بھی جنگ چھڑ گئی یا قریش کے نورہ کو دیکھ کر کسی دوسرے قبیلہ نے خود بخود مسلمانوں کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دی تو اس سے بھی جنگ کا آغاز ہو گیا یا قریش کی ساز باز سے کسی حلیف قوم نے مسلمانوں سے دغا بازی کی تو اس طرح اس کے ساتھ بھی مسلمانوں کی لڑائی ہو گئی۔ وغیرہ الگ۔ الغرض جب جنگ کی آگ ایک دفعہ مشتعل ہو گئی تو اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ایک تھوڑے عرصہ میں ہی عرب کی سرزمین کے بیشتر حصہ سے اس آگ کے شعلے بلند ہونے لگ گئے۔

## اسلامی جنگوں کے اقسام

ابتدائی اسلامی جنگوں کے متعلق پوری بصیرت حاصل کرنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ مندرجہ بالا قرآنی آیات اور دیگر تائید کن روایات میں اشارے کیے گئے ہیں یہ اسلامی جنگیں سب ایک قسم کی نہ تھیں بلکہ مختلف قسم کے اسباب کے ماتحت وقوع میں آئی تھیں مثلاً بعض لڑائیاں دفاع اور خود حفاظتی کی غرض سے تھیں یعنی ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا۔ یہ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو کفار کے مظالم اور تباہی سے بچایا جاوے۔ بعض قیام امن کے لیے تھیں یعنی ان کا مقصد ملک میں فتنہ کو دور کرنا اور امن کو قائم کرنا تھا۔ بعض مذہبی آزادی کے قائم کرنے کی غرض سے تھیں۔ بعض تعزیری رنگ رکھتی تھیں۔ یعنی ان کی غرض دغایت کسی قوم یا قبیلہ یا گروہ کو ان کے کسی خطرناک جرم یا ظلم و ستم یا دغا بازی کی سزا دینا تھی۔ بعض سیاسی تھیں۔ یعنی ان کا مقصد کسی معاہدہ قبیلہ کی اعانت یا اس قسم کا کوئی اور سیاسی تقاضا تھا اور بعض ایسی بھی تھیں جن میں ان اغراض و مقاصد میں سے ایک سے زیادہ اغراض مد نظر تھیں مثلاً وہ دفاعی بھی تھیں اور تعزیری بھی یا سیاسی بھی تھیں اور قیام امن کی غرض بھی رکھتی تھیں۔ وغیرہ الگ۔ یہ ایک بڑا ضروری علم ہے جس کے نہ جاننے کی وجہ سے بعض مورخین نے ساری لڑائیوں کو ایک ہی غرض کے ماتحت لانے کی کوشش کی ہے اور پھر ٹھوکر کھائی ہے۔ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اوپر کی بحث میں ہم نے عام طور پر صرف دفاع اور خود حفاظتی کی غرض کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کی ابتداء زیادہ تر اسی غرض کے ماتحت ہوئی تھی جیسا کہ ابتدائی قرآنی آیت سے ظاہر ہے اور باقی اغراض بعد میں آہستہ آہستہ حالات کے ماتحت پیدا ہوتی گئیں۔

## اسلامی آداب جہاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی کا بیان شروع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مختصر طور پر وہ آداب بھی بیان کر دیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً جہاد میں ملحوظ رکھتے تھے اور جن کی صحابہ کو تاکید کی جاتی تھی۔ یہ آداب عموماً صحاح ستہ کی کتب الجہاد و السیر و المغازی سے ماخوذ ہیں۔ اور اس لیے میں نے صرف ان باتوں کا حوالہ درج کیا ہے جو یا تو بہت اہم ہیں اور یا نسبتاً کم عروف ہیں اور باقی کے حوالے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ سو جاننا چاہیے کہ :

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر و دل کو حتیٰ الوسع جمعرات کے دن شروع کرنا پسند فرماتے تھے اور گھر سے عموماً صبح کے وقت نکلتے تھے۔

۲۔ ردانگی سے قبل دُعا کرنا آپ کی سنت تھی۔

۳۔ دشمن کی حرکات و سکنات کا علم حاصل کرنے کے لیے آپ خبر رسانی کا پختہ انتظام رکھتے تھے اور عام طور پر خبر رسالوں کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ جب کوئی خبر لائیں تو عام مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں اور اگر کوئی تشویشناک خبر ہوتی تھی تو آپ پھر خود بھی اس کا عام اظہار نہیں فرماتے تھے، البتہ خاص خاص صحابہ کو اس کی اطلاع دے دیتے تھے۔

۴۔ جب آپ کسی جنگی غرض سے نکلتے تھے تو آپ کا یہ عام طریق تھا کہ اپنی منزل مقصود کا علم نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی کرتے تھے کہ اگر مثلاً جنوب کی طرف جانا ہوتا تھا تو چند میل شمال کی طرف جا کر پھر حکیر کاٹ کر جنوب کی طرف گھوم جاتے تھے۔

۵۔ آپ کی عادت تھی کہ شہر سے تھوڑی دُور نکل کر فوج کا جائزہ لیا کرتے تھے اور سب انتظام ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد آگے روانہ ہوتے تھے۔

۶۔ جب کوئی اہم ہم پیش آتی تھی تو آپ اس کے لیے صحابہ میں تحریک فرماتے تھے پھر جو لوگ اس کے لیے تیار ہوتے تھے وہ اپنا اپنا سامان جنگ اور سواری وغیرہ کا انتظام خود کرتے تھے، البتہ کسی ذی ثروت صحابی کو مقدرت ہوتی تھی تو وہ دوسروں کی امداد بھی کر دیتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹوٹا اس قسم کی امداد کی تحریک فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات جب گنجائش ہوتی تھی تو خود بھی امداد فرماتے تھے۔

۷۔ چھوٹے بچے یعنی پندرہ سال سے کم عمر کے بچے عموماً جنگ میں ساتھ نہیں لے جاتے تھے اور جو بچے اس شوق میں ساتھ ہو لیتے تھے انہیں جائزہ کے وقت جو عموماً شہر سے باہر نکل کر لیا جاتا تھا واپس کر دیا جاتا تھا۔

۸۔ جنگ میں عموماً چند ایک عورتیں بھی ساتھ جاتی تھیں جو کھانے پینے کا انتظام کرنے کے علاوہ تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام بھی کرتی تھیں اور لڑائی کے وقت فوجیوں کو پانی بھی لا کر دیتی تھیں بعض خاص خاص موقعوں پر مسلمان عورتوں نے کفار کے خلاف تلوار بھی چلائی ہے۔

۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ سفر میں اپنی ازدواج میں سے کسی ایک کو یا ایک سے زیادہ کو جیسا کہ موقع ہو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور اس کے لیے آپ قرعہ ڈالا کرتے تھے اور جس کا نام قرعہ میں نکلتا تھا اُسے ساتھ لے جاتے تھے۔

۱۰۔ جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عام طریق تھا کہ جب کبھی آپ کو کسی دشمن قبیلہ کے متعلق یہ اطلاع ملتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو آپ پیش دستی کر کے اس کے حملہ کو روکنے کی کوشش فرماتے تھے اور ایسا نہیں کرتے تھے کہ دشمن کو پوری طرح تیاری کر لینے کا موقع دیں اور اس کے حملہ کا انتظار کرتے

۱۔ زرقانی حالات غزوہ اُحد و خندق

۲۔ بخاری حالات غزوہ تبوک و زرقانی حالات غزوہ بنو لحيان

ریں اور جب وہ غلاماً حملہ کر دے تو پھر اس کا مقابلہ کریں۔ نیز آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسلامی لشکر دشمن تک اچانک پہنچ جائے اور اُسے اطلاع نہ ہو ان تدابیر سے آپ نے مسلمانوں کو بہت مصائب سے بچایا۔

۱۱۔ جب آپ کوئی فوجی دستہ روانہ فرماتے تھے تو انہیں چلتے ہوئے یہ نصیحت فرماتے تھے کہ جب تم دشمن کے سامنے ہو تو اُسے تین باتوں کی طرف دعوت دو۔ اور اگر ان باتوں میں سے وہ کوئی ایک بات بھی مان لے تو اُسے قبول کر لو اور لڑائی سے رُک جاؤ۔ سب پہلے اُسے اسلام کی دعوت دو اگر وہ لوگ مسلمان ہونا پسند کریں تو پھر انہیں ہجرت کرنے کی تحریک کرو۔ اگر وہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں، تو ان سے کہو کہ اچھا تم مسلمان رہو اور اپنے گھروں میں ٹھہرو، لیکن اگر وہ مسلمان ہونا ہی پسند نہ کریں تو پھر ان سے کہو کہ اپنے مذہب پر رہو، لیکن مسلمانوں کی عداوت اور ان سے جنگ کرنا چھوڑ دو اور اسلامی حکومت کے ماتحت آ جاؤ۔ اگر وہ لوگ یہ بھی نہ مانیں تو پھر اس کے بعد تمہیں ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔

۱۲۔ نیز جب آپ کوئی فوجی دستہ روانہ فرماتے تھے تو اُسے نصیحت فرماتے تھے کہ اُعْزِزُوا بِسْمِ اللَّهِ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تَغْلُوا وَلَا تَعْبُدُوا وَلَا تُمَيِّلُوا وَلَا تَقْتُلُوا وَلَيْسَ دَا وَلَا اِمْرًا قَدْ وَلَا تَقْتُلُوا اَصْحَابَ الصَّوَابِ وَلَا تَقْتُلُوا شَيْعًا فَإِنَّا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيرًا وَلَا اِمْرًا قَدْ وَاصِلُكُمْ وَاحْسِنُوا اِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ یعنی اے مسلمانو! بکلو اللہ کا نام لے کر اور چھاد کر حفاظتِ دین کی نیت سے مگر خبردار مالِ غنیمت میں بددیانتی نہ کرنا اور نہ کسی قوم سے دھوکا کرنا۔ اور نہ دشمنوں کے مقتولوں کا مثلہ کرنا اور نہ بچوں اور عورتوں اور مذہبی عبادت گاہوں کے لوگوں کو قتل کرنا اور نہ بہت بوڑھوں کو قتل کرنا اور ملک میں اصلاح کرنا۔ اور لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا کیونکہ تحقیق خدا تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ جب کسی فوج کو روانہ فرماتے تھے تو اس کے امیر کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ اَلَّذِينَ زَعَمُوا اَنَّهُمْ حَبَسُوا اَنْفُسَهُمْ لِلَّهِ فَذَرَهُمْ وَمَا زَعَمُوا اَنَّهُمْ حَبَسُوا اَنْفُسَهُمْ لَهُ..... وَلَا تَقْطَعَنَّ شَجَرًا مُّثْمِرًا وَلَا تَحْرَبَنَّ عَامِرًا۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے خیال میں اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے ان کو کچھ نہ کہنا اور اسی طرح جس چیز کو وہ مقدس سمجھتے ہوں اُسے بھی کچھ نہ کہنا اور پھلدار درخت کو نہ کاٹنا اور نہ کسی آبادی کو ویران کرنا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عرب میں یہ دستور تھا کہ بعض اوقات لڑائی میں دشمن کے بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے مقتولوں کے ہاتھ پاؤں اور ناگ کان وغیرہ کاٹ ڈالتے تھے جسے مثلہ کرنا کہتے تھے اور دشمن کے اموال و اہمیتہ اور ان کی آبادی کو تباہ و برباد کر دیتے تھے اور جہد و پیمان کی تو کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں سے روک دیا۔ مذہبی لوگوں اور مذہبی چیزوں کی حفاظت کے طریق میں بھی اسلام نے ایک نمایاں امتیاز پیدا کیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ جب



کسی جماعت کو روانہ فرماتے تھے تو اسے نصیحت فرماتے تھے کہ لَبْسُرُوا وَلَا تُنْفِرُوا دَلِيلَتُرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا لِيَعْنِي لُغُوں کو خوشخبریاں دو۔ یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو اور ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرو اور انہیں مشکلوں میں مبتلا نہ کرو۔

۱۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لازمی طریق تھا کہ جب کسی پارٹی یا دستہ یا فوج کو روانہ فرماتے تھے تو ان میں سے کسی شخص کو ان کا امیر مقرر فرما دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر تین آدمی بھی ہوں تو انہیں چاہیے کہ اپنے میں سے کسی کو اپنا امیر بنالیا کریں اور آپ امیر کی اطاعت کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ فرمایا کہ اگر تم پر ایک یوقوف جہشی غلام بھی امیر مقرر کر دیا جاوے تو اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ مگر ساتھ ہی یہ حکم تھا کہ اگر امیر کوئی ایسا حکم دے جو خدا اور اس کے رسول کے حکم کے صریح خلاف ہو تو اس معاملہ میں اس کی اطاعت نہ کرو مگر اس حال میں بھی اس کا ادب ضرور ملحوظ رکھو۔

۱۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ جب کسی غزوہ میں کسی پرزہائی پر چڑھتے تھے تو بکھیر کہتے جاتے تھے یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرتے تھے اور جب کسی بلندی سے نیچے اترتے تھے تو تسبیح کہتے تھے یعنی اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے تھے۔

۱۵۔ سفر میں صحابہ کو حکم ہوتا تھا کہ اس طرح پر پڑاؤ نہ ڈالاکریں کہ لوگوں کے لیے موجب تکلیف ہو۔ نیز حکم تھا کہ کوچ کے وقت اس طرح نہ چلا کر دو کہ راستہ رک جاوے اور اس میں میاں تک سختی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ اعلان فرمایا کہ جو شخص پڑاؤ اور رستے میں دوسروں کا خیال نہیں رکھے گا وہ جہاد کے ثواب محروم رہے گا۔

۱۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن کے سامنے ہوتے تھے تو پہلے ہمیشہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

۱۷۔ لڑائی کے لیے آپ صبح کا وقت پسند فرمایا کرتے تھے اور جب دھوپ تیز ہو جاتی تھی تو ٹوک جاتے تھے اور پھر دوپہر گزرا کر لڑائی کا حکم دیتے تھے یہ

۱۸۔ لڑائی سے قبل آپ خود صحابہ کی صف آرائی فرمایا کرتے تھے اور صفوں میں بے ترتیبی کو بہت ناپسند فرماتے تھے۔

۱۹۔ اسلامی لشکر کے ساتھ عموماً دو قسم کے جھنڈے ہوتے تھے ایک سفید ہوتا تھا جو کسی لکڑی وغیرہ پر لپٹا ہوتا تھا اسے تواء کہتے تھے۔ دوسرا عموماً سیاہ ہوتا تھا جس کی ایک طرف کسی لکڑی وغیرہ سے بندھی ہوتی تھی اور وہ ہوا میں لہراتا تھا اسے رآیہ کہتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے جھنڈے لڑائی کے وقت خاص خاص آدمیوں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔

۲۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ہر لڑائی میں اپنی فوج کا کوئی لفظی شعار مقرر فرما دیا کرتے تھے جس سے اپنا بیگانہ

پہچانا جاتا تھا۔

- ۲۱۔ فوج میں شور و شغب کو ناپسند کیا جاتا تھا اور نہایت خاموشی کے ساتھ کام کرنے کا حکم تھا۔
- ۲۲۔ لڑائی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی فوج کے مختلف دستوں پر مختلف صحابیوں کو امیر مقرر کر کے ان کی جگہیں متعین فرمادیتے تھے اور فرائض سمجھا دیتے تھے۔ ان کمانڈروں کے تقرر میں عموماً اس اصول کو مد نظر رکھا جاتا تھا کہ کسی دستہ پر اس شخص کو امیر بنایا جاوے جو ان میں صاحب اثر ہو۔
- ۲۳۔ بعض خاص خاص موقعوں پر آپ کا یہ بھی طریق تھا کہ صحابہ سے خاص بیعت لیتے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت لینے کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔
- ۲۴۔ میدان جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوتا تھا کہ جب تک میں حکم نہ دوں لڑائی شروع نہ کی جاوے۔
- ۲۵۔ لڑائی کے دوران میں بھی آپ خاص خاص احکام جاری فرماتے رہتے تھے اور خود یا کسی بلند آواز صحابی کے واسطے سے پکار پکار کر ضروری ہدایات کا اعلان فرماتے تھے۔
- ۲۶۔ مسلمانوں کو مجاہدین یا ہتھیار ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ حکم تھا کہ یا غالب آؤ یا شہید ہو جاؤ۔ ہانگی اغراض کے لیے وقتی طور پر پیچھے ہٹ آنے کی اجازت تھی۔ لیکن اگر کسی کسی بشری کمزوری کے ماتحت بعض لوگ بھاگ جاتے تھے تو آپ ان سے زیادہ ناظر من نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں آئندہ کے لیے ہمت دلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ شاید تم لوگ جنگی تدبیر کے طور پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے پیچھے ہٹ آئے ہو گے۔
- ۲۷۔ صحابہ کو حکم تھا کہ لڑائی میں کسی کے منہ پر ضرب نہ لگائیں۔
- ۲۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ضرب لگانے میں سب لوگوں سے زیادہ نرم مسلمان کو ہونا چاہیے۔
- ۲۹۔ تاکید دی حکم تھا کہ جب تک عملاً لڑائی نہ ہوے۔ قیدی نہ پکڑے جائیں۔ یہ نہیں کہ دشمن کو دیکھا اور کمزور یا کمزور قیدی پکڑنے شروع کر دیئے۔
- ۳۰۔ حکم تھا کہ جو قیدی پکڑے جائیں انہیں بعد میں حسب حالات یا تو بطور احسان کے یونہی چھوڑ دیا جاوے۔ یا ضروری ہو تو قید میں رکھا جاوے، مگر یہ قید صرف اس وقت رہ سکتی ہے کہ جب تک جنگ جاری رہے یا جنگ کی وجہ سے جو بوجھ پڑے ہوں وہ دور نہ ہو جائیں، اس کے بعد نہیں۔
- ۳۱۔ قیدیوں کے ساتھ نہایت درجہ نرمی اور شفقت کے سلوک کا حکم تھا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے صحابہ کو خود اپنے آرام کی نسبت بھی قیدیوں کے آرام کا خیال زیادہ رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی حکم تھا کہ جو قیدی آپس میں قریبی رشتہ دار ہوں ان کو ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ کیا جاوے۔

۳۲۔ قیدیوں کا فدیہ صرف نقدی کی صورت میں لینے پر اصرار نہ کیا جاتا تھا، چنانچہ بدر کے بعض خواندہ قیدیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھوتہ کیا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کو گوشت و خواندہ سکھادیں تو انہیں چھوڑ دیا جاوے گا۔ بعض اوقات کھار قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں بھی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نقد فدیہ کی صورت میں بھی مکاتبت کے طریق کی اجازت تھی۔

۳۳۔ مسلمانوں کو لوٹ مار اور غارت گری سے نہایت سختی سے روکا جاتا تھا، چنانچہ اس کے متعلق کسی قدر مفصل بحث اوپر گزر چکی ہے۔

۳۴۔ حکم تھا کہ اگر لڑائی کے وقت بھی کوئی دشمن اسلام کا اظہار کرے تو خواہ اس نے مسلمانوں کا کتنا ہی نقصان کیا ہو فوراً اس سے ہاتھ کھینچ لو۔ کیونکہ اب اس سے خطرہ کا احتمال نہیں رہا، چنانچہ اس ضمن میں اسامہ بن زید کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے۔

۳۵۔ عہد ویمان کے پورا کرنے کی نہایت سختی سے تاکید کی جاتی تھی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عہد کا اس قدر پاس تھا کہ جب حذیفہ بن یمان کہہ سے ہجرت کر کے بدر کے موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے تو انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ میں جب مکہ سے نکلا تھا تو قریش نے یہ شبہ کر کے کہ شاید میں آپ کی مدد کے لیے جا رہا ہوں مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں آپ کی طرف سے نہ لڑوں گا۔ تو آپ نے فرمایا۔ تو پھر تم جاؤ اور اپنا عہد پورا کرو ہمیں خدا کی امداد ہے۔ (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال احتیاط تھی؛ حالانکہ فتویٰ کے طور پر ایسا عہد جو جبر کے طور پر حاصل کیا جاوے واجب الایفاء نہیں) اور حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ جو مسلمان دشمن کے ساتھ ہو گا یا بے عہدی کر لیا میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

۳۶۔ میدان جنگ میں جو مسلمان شہید ہوتے تھے انہیں غسل نہیں دیا جاتا تھا اور نہ ہی خاص طور پر کفنیایا جاتا تھا۔ ۳۷۔ مجبوری کے وقت ایک ہی قبر میں کئی کئی شہداء کو اکٹھا دفن کر دیا جاتا تھا اور ایسے موقعوں پر ان لوگوں کو قبر میں پہلے اتارا جاتا تھا جو کسر آن شریف زیادہ جانتے تھے۔ نیز شہداء کے متعلق حکم تھا کہ انہیں میدان جنگ میں ہی دفنایا جاوے۔

۳۸۔ شہداء کا جنازہ بعض اوقات تو لڑائی کے فوراً بعد پڑھ دیا جاتا تھا اور بعض اوقات جب امن کی صورت نہ ہو تو بعد میں کسی اور موقع پر پڑھا دیا جاتا تھا۔

۳۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ حتیٰ الوسع دشمن کے مقتولوں کو بھی اپنے انتظام میں دفن کروا دیتے تھے۔

۳۰۔ اسلامی جنگوں میں لڑنے والے تنخواہ دار نہیں ہوتے تھے۔

۳۱۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کا یہ اصول تھا کہ سب سے پہلے امیرِ شکر غنیمت کے مال میں سے کوئی ایک چیز اپنے لیے بچن لیتا تھا جسے صفیہ کہتے تھے۔ پھر سارے اموال کا پانچواں حصہ خدا اور اس کے رسول کے لیے الگ کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد بقیہ مال فوج میں بھٹہ برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا اس طرح ہر کہ سوار کو پیدل کی نسبت دو حصے زیادہ دیا جاتا تھا اور نیز مصقول کافر کا ذاتی سامان جو اس کے جسم پر ہو وہ بھی مسلمان قاتل کا حق سمجھا جاتا تھا۔

۳۲۔ جو شخص خدا اور اس کے رسول کے لیے الگ کیا جاتا تھا اس میں کچھ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال اور اقربا میں تقسیم فرمادیتے تھے اور بیشتر حصہ اس کا مسلمانوں کی اجتماعی دینی اور قومی اغراض میں صرف ہوتا تھا اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ سے منہ مایا کہ مالِ غنیمت میں سے مجھے خمس کے علاوہ ایک اونٹ کے بال کے برابر بھی لینا حرام ہے وَالْخُمْسُ مَرْذُودٌ عَلَيْكُمْ اور پھر یہ خمس بھی تمہارے ہی کا آتا ہے۔

۳۳۔ لڑائی کے میدان میں عام طور پر نماز کی ادائیگی کا یہ طریق تھا کہ امام تو ایک ہی رہتا تھا لیکن فوج کے آدمی مختلف حصوں میں باری باری اگر امام کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے اور بقیہ فوج دشمن کے سامنے رہتی تھی اسے صلوٰۃ خوف کہتے تھے اور مختلف حالات کے ماتحت اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

۳۴۔ شروع شروع میں بعض صحابہ سفروں میں روزے رکھتے تھے اور بعض افطار کرتے تھے لیکن آخری ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ سفر میں روزہ نہ رکھا جاوے اور فرمایا تھا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے جن صحابہ نے آپ کے اس حکم کو محض ایک سفارش سمجھ کر روزہ رکھ لیا ان کے متعلق آپ نے فرمایا: اُولَٰئِكَ الْعَصَاۃُ یعنی یہ لوگ نافرمانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

۳۵۔ جاسوس کے قتل کا عرب میں دستور تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برقرار رکھا۔

۳۶۔ دشمن کے قاصد کو روک لینے یا کسی قسم کا نقصان پہنچانے یا قتل کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سختی سے منع فرماتے تھے؛ چنانچہ ایک دفعہ بعض لوگ کفار کے قاصد ہو کر آئے اور انھوں نے آپ کے سامنے گستاخانہ طریق سے باتیں کیں۔ آپ نے فرمایا تم قاصد ہو اس لیے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک اور موقع پر ایک قاصد آیا اور آپ سے مل کر مسلمان ہو گیا اور پھر اس نے آپ سے عرض کیا کہ میں اب واپس جانا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا۔ میں بدعہدی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ تم قاصد ہو نہیں بہر حال واپس جانا چاہیے۔ ہاں اگر پھر آنا چاہو تو آ جانا۔ چنانچہ وہ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد موقع پا کر پھر واپس آ گیا۔

۳۷۔ جب مکہ اور مدینہ کی سرزمینِ شمرک کے عنصر سے پاک ہو گئی اس وقت یہ اعلان کیا گیا کہ اگر اب بھی کوئی بیرونی مشرک مذہبی تحقیق کے لیے مجازیں آنا چاہے تو بخوشی آ سکتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ

اس کی حفاظت اور پُر امن واپسی کے ہم ذمہ دار ہوں گے یہ

۳۸۔ کفار میں سے جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیتے تھے اُن کی حفاظت اور حقوق کا آپ کو خاص خیال رہتا تھا اچنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ یعنی جو مسلمان کسی معاہدہ کافر کو قتل کرے گا، اُسے جنت کی ہوا تک نہیں پہنچے گی۔

نیز آپ نے یہ حکم جاری فرمایا تھا کہ جو مسلمان کسی معاہدہ کافر کو یونہی غلطی سے بلا ارادے کے قتل کر دے اس کا فرض ہو گا کہ اس کے رشتہ داروں کو اس کی پوری پوری دیت ادا کرے تاکہ عداوت کے علاوہ ایک غلام آزاد کرے۔

۳۹۔ معاہدہ کافر کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ تَنَقَّضَ أَوْ كَلَفَهُ فَوْقَ الطَّاقَةِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بَغْيًا غَرِيبًا فَلَا حَاجَةَ لَهُ إِلَى الْقِيَامَةِ یعنی جو مسلمان کسی معاہدہ کافر پر کسی قسم کا ظلم کرے گا یا اُسے نقصان پہنچائے گا یا اس پر کوئی ایسی ذمہ داری یا ایسا کام ڈالے گا جو اس کی طاقت باہر ہے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی خوشی اور مرضی کے لے گا تو اُسے مسلمانوں میں قیامت کے دن اس معاہدہ کافر کی طرف سے ہو کر اس مسلمان کے خلاف انصاف چاہوں گا۔

۵۰۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم کے خلاف جنگ کرنے کو نکلتے تھے تو فوج حاصل ہونے کے بعد مومنانین دن سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرتے تھے اور یہ غالباً اس لیے کہ تھے کہ وہاں کے لوگوں کے لیے اسلامی لشکر کا قیام موجب تکلیف اور پریشانی نہ ہو۔

۵۱۔ سب سے آخر میں مگر غالباً سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد میں دین کی حفاظت اور فتنہ کے سد باب کے سوا کسی اور نیت کو سخت ناجائز سمجھا جاتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام اعلان تھا کہ جو شخص غنیمت کے لالچ میں یا لڑائی کے انہار کے لیے یا کسی اور دنیاوی غرض سے نکلتا ہے وہ جہاد کے ثواب سے قطعی محروم ہے۔ اس ضمن میں کسی قدر مفصل بحث اور پُر گندرجکی ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہو گا کہ اس زمانہ میں عرب میں لڑنے کا طریق یہ ہوتا تھا کہ جب فوجیں ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتی تھیں تو خاص خاص لوگ انفرادی مقابلوں کے لیے نکل کر مبارز طلبی کرتے تھے اور ان انفرادی مقابلوں کے بعد عام حملہ کیا جاتا تھا۔ جنگ میں پیدل اور گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں طرح لڑنے کا دستور تھا مگر گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنا بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اونٹ غول صرف سفر کرنے یا اسباب اٹھانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ آلات حرب حملہ کے لیے تلوار نیزہ اور تیر کمان تک محدود تھے اور دفاع کے لیے ڈھال اور زہ اور خود استعمال کیے جاتے تھے۔ عرب کے بعض قبائل میں دشمن پر پتھر کی بارش برسانے کے لیے ایک قسم کی مشین بھی استعمال ہوتی تھی جسے



منجھتی کہتے تھے۔ اس شین کا خیال غالباً ایران سے عرب میں آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا استعمال محاصرہ طائف کے موقع پر فرمایا تھا۔

**آغازِ جہاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاطی تدابیر** یہ بتایا جا چکا ہے کہ جہاد باسیف کی اجازت میں پہلی قرآنی آیت بارہ صفر ۱ھ کو

نازل ہوئی تھی۔ یعنی دفاعی جنگ کے اعلان کا جو فدائی اشارہ ہجرت میں کیا گیا تھا اس کا باضابطہ اعلان صفر ۱ھ میں کیا گیا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیام مدینہ کی ابتدائی کارروائیوں سے فارغ ہو چکے تھے اور اس طرح جہاد کا آغاز ہو گیا۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ کفار کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء چار تدابیر اختیار کیں جو آپ کی اعلیٰ سیاسی قابلیت اور جنگی تدبیریں کی ایک تین دلیل ہیں۔ یہ تدابیر مندرجہ ذیل تھیں :-

اول آپ نے خود سفر کے آس پاس کے قبائل کے ساتھ باہمی امن و امان کے معاہدے کرنے شروع کئے تاکہ مدینہ کے ارد گرد کا علاقہ خطرہ سے محفوظ ہو جائے اس امر میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ ان قبائل کو مد نظر رکھا جو قریش کے شامی رستے کے قرب و جوار میں آباد تھے کیونکہ جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے یہی وہ قبائل تھے جن سے قریش مکہ مسلمانوں کے خلاف زیادہ مدد لے سکتے تھے اور جن کی دشمنی مسلمانوں کے واسطے سخت خطرات پیدا کر سکتی تھی۔

دوم آپ نے چھوٹی چھوٹی خبر رساں پارٹیاں مدینہ کے مختلف جہات میں روانہ کرنی شروع فرمائیں تاکہ آپ کو قریش اور ان کے خلفاء کی حرکات و سکنات کا علم ہو تا رہے اور قریش کو بھی یہ خیال رہے کہ مسلمان بے خبر نہیں ہیں اور اس طرح مدینہ اچانک حملوں کے خطرات سے محفوظ ہو جائے۔

سوم ان پارٹیوں کے بھجانے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ تا اس ذریعہ سے مکہ اور اس کے گرد و نواح کے کمزور اور غریب مسلمانوں کو مدینہ کے مسلمانوں میں آٹنے کا موقع مل جائے۔ ابھی تک مکہ کے علاقہ میں کئی لوگ ایسے موجود تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر قریش کے معاملہ کی وجہ سے اپنے اسلام کا برملا طور پر اظہار نہیں کر سکتے تھے اور نہ اپنی غربت اور کمزوری کی وجہ سے ان میں ہجرت کی طاقت تھی کیونکہ قریش ایسے لوگوں کو ہجرت سے جبراً روکتے تھے؛ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا** **وَجَعَلْنَا مِنْكَ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا** یعنی ”اے مومنو! کوئی وجہ نہیں کہ تم لڑائی نہ کرو اللہ کے دین کی حفاظت کیلئے اور ان مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر جو کمزوری کی حالت میں پڑے ہیں اور

دُعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! نکال ہم کو اس شہر سے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہم ناقوانوں کے لیے اپنی طرف سے کوئی دوست و مددگار عطا فرما۔ پس ان پارٹیوں کے بھجانے میں ایک یہ مصلحت بھی تھی کہ تا ایسے لوگوں کو ظالم قوم سے چھٹکارا پانے کا موقع مل جاوے۔ یعنی ایسے لوگ قریش کے قافلوں کے ساتھ ملے ملائے مدینہ کے قریب پہنچ جائیں اور پھر مسلمانوں کے دستے کی طرف بھاگ کر مسلمانوں میں آئیں؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلا دستہ ہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبیدہ بن الحارث کی سرداری میں روانہ فرمایا تھا اور جس کا عکرمہ بن ابوجہل کے ایک گروہ سے سامنا ہو گیا تھا اس میں مکہ کے دو کمزور مسلمان جو قریش کے ساتھ ملے ملائے آگئے تھے، قریش کو چھوڑ کر مسلمانوں میں آئے تھے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:

قَرَّبَ الشَّرِکَیْنِ اِلَى الْمُسْلِمِیْنَ اَبْنُ عَمْرِو وَحَلِیْمُ بْنُ زَهْرَةَ وَعُثْبَةُ بْنُ غَزْوَانَ حَلِیْفُ بَنِي نَضْلٍ وَكَانَا مُسْلِمِیْنِ وَكَانَتْهُمَا خَرَجَا یَتَوَضَّلَانِ بِالْكَفَّارِ اِلَى الْمُسْلِمِیْنَ۔ یعنی اس مہم میں جب مسلمانوں کی پارٹی لشکر قریش کے سامنے آئی تو دو شخص مقدار بن عمرو اور عبثہ بن غزوہ اور بنو نوفل کے حلیف تھے مشرکین میں سے بھاگ کر مسلمانوں میں آئے اور یہ دونوں شخص مسلمان تھے اور صرف کفار کی آڑ لے کر مسلمانوں میں آئے کسی لیے نکلے تھے۔ پس ان پارٹیوں کے بھجانے میں ایک غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی تھی کہ تا ایسے لوگوں کو ظالم قریش سے چھٹکارا پانے اور مسلمانوں میں آئے کا موقع ملتا ہے۔

چھارم۔ چوتھی تدبیر آپ نے یہ اختیار فرمائی کہ آپ نے قریش کے ان تجارتی قافلوں کی روک تھام شروع فرما دی جو مکہ سے شام کی طرف آتے جاتے ہوئے مدینہ کے پاس سے گزرتے تھے۔ کیونکہ (الف) یہ قافلے جہاں جہاں سے گزرتے تھے مسلمانوں کے خلاف عداوت کی آگ لگاتے جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ مدینہ کے گرد و نواح میں اسلام کی عداوت کا تخم بویا جانا مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک تھا (ب) یہ قافلے ہمیشہ مسلح ہوتے تھے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے قافلوں کا مدینہ سے اس قدر قریب ہو کر گزرنا ہرگز خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ (ج) قریش کا گذارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اور اندریں حالات قریش کو زیر کرنے اور ان کو ان کی ظالمانہ کارروائیوں سے روکنے اور صلح پر مجبور کرنے کا یہ سب سے زیادہ یقینی اور سریع اثر ذریعہ تھا کہ ان کی تجارت کا راستہ بند کر دیا جاوے۔ چنانچہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جن باتوں نے بالآخر قریش کو صلح کی طرف مائل ہونے پر مجبور کیا ان میں ان کے تجارتی قافلوں کی روک تھام کا بہت بڑا دخل تھا پس یہ ایک نہایت دانشمندانہ تدبیر تھی جو اپنے وقت پر کامیابی کا پھل لائی۔ (د) قریش کے ان قافلوں کا نفع بسا اوقات اسلام کو مٹانے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ بلکہ بعض قافلے تو خصوصیت کے ساتھ اسی غرض سے بھیجے جاتے تھے کہ ان کا سامرا نفع مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ اس صورت میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان قافلوں کی روک تھام خود اپنی ذات میں بھی ایک بالکل جائز مقصود تھی۔

بعض متعصب عیسائی مورخین نے جن کو اسلام کی خوبیاں بھی بدی کی شکل میں نظر آتی ہیں یہ اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ  
 - حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ قریش کے قافلوں کو ٹوٹنے کی غرض سے نکلتے تھے۔ ہم ان عدل والی صفات  
 کے بہنوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا تمہاری قرین جنھیں تم تہذیب و شرافت کے معراج کو پہنچا ہوا سمجھتے ہو جنگ کے  
 زمانہ میں دشمن قوموں کے تجارتی رستے نہیں روکتیں؟ اور کیا انہیں جب یہ خبر پہنچتی ہے کہ فلاں دشمن قوم کا کوئی تجارتی  
 جہاز فلاں جگہ سے گزر رہا ہے تو وہ فوراً اس کے پیچھے ایک بھری دستہ روانہ کر کے اس کو تباہ و برباد کر دینے یا اسے  
 مغلوب کرنے اس کے اموال پر قبضہ کر لینے کی تدابیر نہیں اختیار کرتیں؟ تو پھر کیا اس وجہ سے تمہارے فرمانرواؤں کا نام  
 ڈاکو اور لٹیرے اور غارت گر رکھا جاسکتا ہے؟ یقیناً ان مسلمانوں نے قریش کے قافلوں کی روک تھام کی تو اس غرض  
 سے نہیں کی کہ ان کے قافلوں کے اموال پر قبضہ کریں بلکہ اس لیے کہ تدابیر جنگ کا تقاضا تھا کہ قریش کی تجارت کا رستہ بند  
 کر دیا جاوے کیونکہ اس سے بہتر ان کو ہوش میں لانے اور صلح کی طرف مائل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ باقی اگر قریش  
 کا کوئی قافلہ مغلوب ہو گیا اور اس غلبہ کے نتیجہ میں اس کا مال و متاع مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو وہ جنگ کی فتوحات کا حصہ  
 تھا جس کا ہر قوم اور ... میں فاتح کو حقدار سمجھا گیا ہے کیا محترضین کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان کفار کے قافلوں کو تو  
 بیشک روکتے اور ان کے آدمیوں کو مارتے، لیکن قافلوں کے اموال کو اپنے تصرف میں نہ لاتے بلکہ اپنے خرچ پر اپنی فوج  
 کی حفاظت میں نہایت احتیاط کے ساتھ مکہ بھجوا دیا کرتے تاکہ ان اموال کی مدد سے قریش دوچار اور جرار شکر تیار  
 کر کے مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر چڑھا لاتے؟ اگر ان کا یہی خیال ہے تو انہیں یہ خیال مبارک ہو۔ ہمیں اعتراف ہے  
 کہ اسلام کا دامن اس قسم کی بے وقوفی اور بے غیرتی اور خود کشی کی تعلیم سے پاک ہے اور یہ کہنا کہ ان قافلوں کی روک  
 تھام میں مسلمانوں کو ٹوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی کس قدر ظلم کس قدر انصاف سے بعید ہے۔ کیا اس قوم کو ٹوٹ مار  
 کی تعلیم دی جاتی تھی جن میں سے بعض نے ایک جہاد کے سفر میں بھوکے سخت تنگ آکر اور گویا موت کے منہ میں پہنچ کر  
 کسی کے ایک گلے میں سے دو چار بکریاں پکڑ کر ذبح کر لیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر غصہ میں ہنڈیوں  
 کو الٹ دیا اور گوشت کو مٹی میں مسلتے ہوئے فرمایا کہ یہ ٹوٹ کا مال تمہارے لیے کس نے حلال کیا ہے؟ یہ تو ایک  
 مردار سے بڑھ کر نہیں؟ پھر کیا اس قوم کو ٹوٹ مار کی تعلیم دی جاتی تھی جن میں سے نو مسلم لوگ جہاد پر جاتے ہوئے آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ! اگر لڑائی میں ایک شخص کی اصل نیت تو حفاظت دین ہو لیکن  
 اسے کچھ یہ بھی خیال ہو کہ شاید غنیمت کا مال بھی مل جائے گا، تو کیا ایسے شخص کو جہاد کا ثواب ہوگا؟ اور آپ فرماتے تھے  
 ”ہرگز نہیں ہرگز نہیں ایسے شخص کے لیے کوئی ثواب نہیں ہے؟“ کیا ان واقعات کے جوہرے ہوئے قافلوں کی روک  
 تھام کو ٹوٹ مار کی تعلیم سمجھا جاسکتا ہے؟ پھر یہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو سمجھاتے رہتے تھے کہ  
 جہاد میں دنیا کے خیالات کی طوئی نہیں ہونی چاہیے بلکہ صحابہ پر آپ کی اس تعلیم کا اثر بھی تھا اور یہ اثر اس قدر غالب  
 تھا کہ وہ نہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے دلوں میں دنیا طلبی کے خیالات جاگزیں نہ ہوں بلکہ بعض اوقات  
 وہ ایسے جائز موقعوں سے بھی بچتے تھے جن میں کمزور طبیعتوں کے لیے اس قسم کے خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا

تھا، چنانچہ غزوہ بدر کے متعلق روایت آتی ہے کہ کئی صحابہ اس غزوہ میں اس لیے شریک نہیں ہوئے تھے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ ہم صرف قافلہ کی روک تھام کے لیے اختیار کی جا رہی ہے ورنہ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ قریش کے لشکر کے ساتھ جنگ ہوگا تو وہ ضرور شامل ہوتے۔ اور یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ صحابہ کو قافلوں کی روک تھام میں ان کے احوال و اہمیت کی وجہ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صورت حال یہ ہونی چاہیئے تھی کہ کسی قافلہ کی روک تھام کے موقع پر صحابہ زیادہ کثرت کے ساتھ شامل ہونے کے لیے آگے بڑھتے، مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے صحابہ ایک جیسے تھے۔ بیشک ان میں بعض کمزور بھی تھے اور طبعاً کمزوری ابتداء میں نسبتاً زیادہ تھی۔ مگر جو تبدیلی صحابہ کی جماعت نے آپ کی تربیت کے ماتحت دکھائی وہ فی الجملہ نہایت عظیم العتول اور حقیقتاً بے نظیر تھی۔



# ابتدائی لڑائیاں ۔ روزہ کی ابتداء ۔ تحویل قبلہ

اور

## جنگ بدر کے متعلق ابتدائی بحث

غزوات و سرایا کا آغاز اور غزوہ و دان صفر سہ ہجری  
اب مغازی کا عملی آغاز ہوتا ہے۔  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق  
تھا کہ کبھی تو خود صحابہ کو ساتھ لیکر نکلتے تھے اور کبھی کسی صحابی کی امارت میں کوئی دوستہ روانہ فرماتے تھے۔ مؤرخین نے  
ہر دو قسم کی مہموں کو الگ الگ نام دیئے ہیں، چنانچہ جن مہموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفس نفیس شامل ہوتے  
ہوں اس کا نام مؤرخین غزوہ رکھتے ہیں اور جن میں آپ خود شامل نہ ہوتے ہوں اس کا نام سترہ یا بعثت رکھا جاتا  
ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ غزوہ اور سترہ دونوں میں مخصوص طور پر جہاد بالسیف کی غرض سے نکلنا ضروری نہیں  
بلکہ ہر وہ سفر جس میں آپ جنگ کی حالت میں شریک ہوتے ہوں غزوہ کہلاتا ہے خواہ وہ خصوصیت کے ساتھ لڑنے  
کی غرض سے نہ کیا گیا ہو اور اسی طرح ہر وہ سفر جو آپ کے حکم سے کسی جماعت نے کیا ہو مؤرخین کی اصطلاح میں سترہ یا  
بعثت کہلاتا ہے خواہ اس کی غرض وفایت لڑائی نہ ہو، لیکن بعض لوگ نادانانہ قیقت سے ہر غزوہ اور سترہ کو لڑائی کی مہم  
سمجھنے لگ جاتے ہیں جو درست نہیں۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جہاد بالسیف کی اجازت ہجرت کے دوسرے سال ماہ صفر میں نازل ہوئی چونکہ قریش  
کے غوثی ارادوں اور ان کی خطرناک کارروائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے فوری کارروائی کی ضرورت  
تھی اس لیے آپ اسی ماہ میں مہاجرین کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہوئے مدینہ سے نکل کھڑے  
ہوئے۔ روانگی سے قبل آپ نے اپنے پیچھے مدینہ میں سعد بن عبادہ، سرس خنجر، کوا میر مقرر فرمایا اور مدینہ سے جنوب  
مغرب کی طرف مکہ کے راستہ پر روانہ ہو گئے اور بالآخر مقام دنان تک پہنچے اس علاقہ میں قبیلہ بنو نضیر کے لوگ  
آباد تھے۔ یہ قبیلہ بنو کنانہ کی ایک شاخ تھا اور اس طرح گویا یہ لوگ قریش کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہاں پہنچ کر آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو نضیر کے رئیس کے ساتھ بات چیت کی اور باہم رضامندی سے آپس میں ایک معاہدہ ہو گیا۔





مسلمانوں کی طرف جاتا دیکھ کر ان کو ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس لوٹ گئے۔ اور صحابہ کو اس مہم کا یہ عملی فائدہ ہو گیا کہ دو مسلمان رومیوں قریش کے ظلم سے نجات پا گئیں۔

اسی ماہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس  
شتر سوار مہاجرین کے ایک اور دستہ کو اپنے

### سریہ حمزہ بن عبدالمطلب ربیع الاول ۲ھ

حقیقی چچا حمزہ بن عبدالمطلب کی سرداری میں مدینہ سے مشرقی جانب بیضا البحر علاقہ عیص کی طرف روانہ فرمایا۔ حمزہ اور ان کے ساتھی جلدی جلدی وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مکہ کا تیس اعظم ابوجہل تین سو سواروں کا ایک لشکر لیے ان کے استقبال کو موجود ہے مسلمانوں کی تعداد سے یہ تعداد دس گنے زیادہ تھی مگر مسلمان خدا اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل میں گھر سے نکلے تھے اور موت کا ڈر انہیں پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں صف لائن کرنے لگیں اور لڑائی شروع ہونے والی ہی تھی کہ اس علاقہ کے تیس مجددی بن عمرو الجہنی نے جو دونوں فریق کے ساتھ تعلقات رکھتا تھا درمیان میں پڑ کر پیچ بچاؤ کر لیا اور لڑائی ہوتے ہوتے رک گئی یٰ ابن سعد نے جو عموماً اپنے استاد و اقسامی کی اتباع کرتا ہے لکھا ہے کہ یہ قریش کا ایک قافلہ تھا جس سے مسلمانوں کا سامنا ہوا تھا، لیکن ابن اسحاق نے بروایت ابن ہشام قافلہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ قریش کے تین سو سواروں سے سامنا ہوا تھا جو ابوجہل کے زیرِ کمان تھے اور کفار کی تعداد دوسرے قرآن سے ابن اسحاق کی روایت صحیح ثابت ہوئی ہے اور یہ یقینی ہے کہ کفار کا یہ دستہ مسلمانوں کے خلاف نکلا تھا، چنانچہ حمزہ بن جابر فہری کا حملہ بھی جس کا ذکر آگے آتا ہے اس خیال کا مؤید ہے۔

اسی مہینہ کے آخری ایام یا ربیع الآخر کے شروع میں آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کو پھر قریش کی طرف کوئی خبر موصول ہوئی جس پر آپ مہاجرین

### غزوہ بواط ربیع الآخر ۲ھ

کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر خود مدینہ سے نکلے اور اپنے پیچھے سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ کا امیر مقرر فرمایا لیکن قریش کا پتہ نہیں چل سکا اور آپ بواط تک پہنچ کر واپس تشریف لے آئے یٰ

اس کے بعد جمادی الاولیٰ میں پھر  
قریش مکہ کی طرف کوئی خبر پا کر

### غزوہ عشیہ اور سریہ سعد بن ابی وقاص جمادی الاولیٰ ۲ھ

آپ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور اپنے پیچھے اپنے رضاعی بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد کو امیر مقرر فرمایا۔ اس غزوہ میں آپ کئی چکر کاٹتے ہوئے بالآخر ساحل سمندر کے قریب بیح کے پاس مقام عشیہ تک پہنچے اور گو قریش کا مقابلہ نہیں ہوا مگر اس میں آپ نے قبیلہ بنو مدلج کے ساتھ انہیں شہر اظہر جو بنو ضمرہ کے ساتھ قرار پائی تھیں ایک معاہدہ طے فرمایا اور پھر واپس تشریف لے آئے۔ اسی سفر کے دوران میں آپ نے سعد بن ابی وقاص

کو آٹھ مہاجرین کے ایک دستہ پر امیر مقرر کر کے قریش کی خبر رسانی کے لیے خراء کی طرف روانہ فرمایا۔

کمرز بن جابر کا حملہ اور غزوہ سفوان جمادی الآخر ۲۸ھ

مگر باوجود صحابہ کی استعداد و مغزی و مدد مسلمان پارٹیوں کے مدینہ کے گرد و نواح میں اس طرح ہوشیاری کے ساتھ چکر لگاتے رہنے کے قریش کی شرارت نے اپنے لیے راستہ پیدا کر ہی لیا، چنانچہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لائے دس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مکہ کے ایک رئیس کمرز بن جابر فہری نے قریش کے ایک دستہ کے ساتھ کھال ہوشیاری سے مدینہ کی چراگاہ پر جو شہر سے صرف تین میل پر تھی اچانک حملہ کیا اور مسلمانوں کے اڈنٹ وغیرہ ٹوٹ کر چلتا ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ہوئی تو آپ فوراً زید بن حارثہ کو اپنے پیچھے امیر مقرر کر کے اور مہاجرین کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر اس کے تعاقب میں نکلے اور سفوان تک جو بدر کے پاس ایک جگہ ہے اس کا پیچھا کیا، مگر وہ پکڑ نہ لیا گیا۔ اس غزوہ کو غزوہ بدر الاولیٰ بھی کہتے ہیں۔

کمرز بن جابر کا یہ حملہ ایک معمولی بددیانتہ غارت گری نہیں تھی بلکہ یقیناً وہ قریش کی طرف مسلمانوں کے خلاف خاص ارادے سے آیا تھا بلکہ باطل ممکن ہے کہ اس کی نیت خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نقصان پہنچانے کی ہو، مگر مسلمانوں کو ہوشیار باکران کے اڈنٹوں پر ہاتھ صاف کرتا ہوا نکل گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ مدینہ پر چھاپے مار مار کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا جاوے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس سے پہلے مسلمانوں کو جہاد بالسیف کی اجازت ہو چکی تھی اور انھوں نے خود حفاظتی کے خیال سے اس کے متعلق ابتدائی کارروائی بھی شروع کر دی تھی، لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کفار کو عملاً کسی قسم کا مال یا جانی نقصان نہیں پہنچا تھا، لیکن کمرز بن جابر کے حملہ سے مسلمانوں کو عملاً نقصان پہنچا۔ گویا مسلمانوں کی طرف سے قریش کا چیلنج قبول کر لیے جانے کے بعد بھی عملی جنگ میں کفار ہی کی پہل رہی۔

مسیر عبد اللہ بن جحش بطرف نخلہ

کمرز بن جابر کے اچانک حملہ نے طبعاً مسلمانوں کو بہت متوحش کر دیا تھا اور چونکہ رد سار قریش کی یہ دھمکی پہلے سے موجود تھی کہ ہم مدینہ

پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کریں گے، مسلمان سخت فکر مند ہوئے اور انہی خطرات کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ فرمایا کہ قریش کی حرکات و سکنات کا زیادہ قریب سے ہو کر علم حاصل کیا جاوے تاکہ ان کے متعلق ہر قسم کی ضروری اطلاع بروقت میسر ہو جاوے اور مدینہ ہر قسم کے اچانک حملوں سے محفوظ رہے، چنانچہ اس غرض سے آپ نے آٹھ مہاجرین کی ایک پارٹی تیار کی تھی اور مصلحتاً اس پارٹی میں ایسے آدمیوں کو رکھا جو قریش کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے تاکہ قریش کے مخفی ارادوں کے متعلق خبر حاصل کرنے میں آسانی ہو اور اس پارٹی پر آپ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبد اللہ بن جحش کو امیر مقرر فرمایا۔ اور اس خیال سے کہ اس پارٹی کی غرض و غایت عامۃ المسلمین سے

بھی مخفی رہے آپ نے اس سر یہ کو روانہ کرتے ہوئے اس سر یہ کے امیر کو بھی یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کہاں اور کس غرض سے بھیجا جا رہا ہے بلکہ چلتے ہوئے ان کے ہاتھ میں ایک سر یہ خط دیدیا اور فرمایا کہ اس خط میں تمہارے لیے ہدایات درج ہیں۔ جب تم مدینہ سے دو دن کا سفر طے کرو تو پھر اس خط کو کھول کر اس کی ہدایات کے مطابق عملدرآمد کرنا؛ چنانچہ عبداللہ اور ان کے ساتھی اپنے آقا کے حکم کے ماتحت روانہ ہو گئے اور جب دو دن کا سفر طے کر چکے تو عبداللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو کھول کر دیکھا تو اس میں یہ الفاظ درج تھے۔ اِمْنَحْ حَتَّى تُنْزِلَ نَخْلَةَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ فَتَرْصُدْ بِهَا قُرَيْشًا وَتُعَلِّمَهُمُ تَارِخَ أَخْبَارِهِمْ يَحْتَسِبُ یعنی تم مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں جاؤ اور وہاں جا کر قریش کے حالات کا علم لو اور پھر ہمیں اطلاع لا کر دو۔ اور چونکہ مکہ سے اس قدر قریب ہو کر خبر رسانی کرنے کا کام بڑا نازک تھا۔ آپ نے خط کے نیچے یہ ہدایت بھی لکھی تھی کہ اس مشن کے معلوم ہونے کے بعد اگر تمہارا کوئی ساتھی اس پارٹی میں شامل رہنے سے متاثر ہو اور واپس چلا آنا چاہے، تو اسے واپس آنے کی اجازت دے دو عبداللہ نے آپ کی یہ ہدایت اپنے ساتھیوں کو سنادی اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم بخوشی اس خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ اس کے بعد یہ جماعت نخلہ کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوہ ان کا اؤنٹ کھویا گیا اور وہ اس کی تلاش کرتے کرتے اپنے ساتھیوں سے پھٹ گئے اور باوجود بہت تلاش کے انہیں نہ مل سکے اور اب یہ پارٹی صرف چھ کس کی رہ گئی۔ مسٹر مارگولیس اس موقع پر لکھتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ نے جان بوجھ کر اپنا اؤنٹ چھوڑ دیا تھا اور اس بہانہ سے پیچھے رہ گئے۔ ان جاں نثاران اسلام پر جن کی زندگی کا ایک ایک واقعہ ان کی شجاعت اور فدائیت پر شاہد ہے اور جن میں سے ایک غزوہ بدر معرکہ میں کفار کے ہاتھوں شہید ہوا اور دوسرا کئی خطرناک معرکوں میں نمایاں حصہ لیکر بالآخر عراق کا فاتح بنا اس قسم کا شبہ کرنا اور شبہ بھی محض اپنے من گھڑت خیالات کی بنا پر کرنا مسٹر مارگولیس ہی کا جھوٹا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ مارگولیس صاحب اپنی کتاب میں دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو کر لکھی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی جماعت نخلہ پہنچی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور ان میں سے بعض نے اخفاء راز کے خیال سے اپنے سر کے بال منڈا دیئے تاکہ راہگیر وغیرہ ان کو عمرہ کے خیال سے آئے ہوئے لوگ سمجھ کر کسی قسم کا شبہ نہ کریں؛ لیکن ابھی ان کو وہاں پہنچے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اچانک وہاں قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ بھی آن پہنچا جو طائف سے مکہ کی طرف جا رہا تھا اور ہر دو جماعتیں ایک دوسرے کے سامنے ہو گئیں مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خفیہ خفیہ خبر رسانی کرنے کیلئے بھیجا تھا، لیکن دوسری طرف قریش سے جنگ شروع ہو چکی تھی اور اب دونوں حریف ایک دوسرے کے سامنے تھے اور پھر طبعاً یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب جو قریش کے ان قافلہ والوں نے مسلمانوں کو دیکھ لیا ہے تو اس خبر رسانی کا راز بھی مخفی نہ رہ سکے گا۔ ایک دقت یہ بھی



تھی کہ بعض مسلمانوں کو خیال تھا کہ شاید یہ دن رجب یعنی شہر حرام کا آخری ہے جس میں عرب کے قدیم دستور کے مطابق لڑائی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اور بعض سمجھتے تھے کہ رجب گزر چکا ہے اور شعبان شروع ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ یہ سر یہ جمادی الآخر میں بھیجا گیا ہے اور شک یہ تھا کہ یہ دن جمادی کا ہے یا رجب کا یہ لیکن دوسری طرف نخلہ کی وادی عین حرم کے علاقہ کی حد پر واقع تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اگر آج ہی کوئی فیصلہ نہ ہو تو کل کو یہ قافلہ حرم کے علاقہ میں داخل ہو جائے گا جس کی حرمت یقینی ہوگی۔ غرض ان سب باتوں کو سوچ کر مسلمانوں نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ قافلہ پر حملہ کر کے یا تو قافلہ والوں کو قید کر لیا جاوے اور یا مار دیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کا نام لے کر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کفار کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن الحضرمی تھا مارا گیا اور دو آدمی قید ہو گئے، لیکن بد قسمتی سے جو تھا آدمی بھاگ کر نکل گیا اور مسلمان اسے پکڑ نہ سکے اور اس طرح انکی تجویز کامیاب ہوتے ہوئے رہ گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے قافلہ کے سامان پر قبضہ کر لیا اور چونکہ قریش کا ایک آدمی پکڑ کر نکل گیا تھا اور یقین تھا کہ اس لڑائی کی خبر جلدی مکہ پہنچ جائے گی عبداللہ بن جعش اور ان کے ساتھی سامان غنیمت لے کر جلد جلد مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

مسٹر مارگولیس اس موقع پر لکھتے ہیں کہ دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ دستہ دیدہ و دانستہ اس نیت سے شہر حرام میں بھیجا تھا کہ چونکہ اس ہمدینہ میں قریش طبعاً غافل ہوں گے۔ مسلمانوں کو ان کے قافلہ کو ٹوٹنے کا آسان اور یقینی موقع مل جائے گا، لیکن ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسی مختصر پارٹی کو اتنے دُور دراز علاقہ میں کسی قافلہ کی غارت گری کے لیے نہیں بھیجا جاسکتا خصوصاً جبکہ دشمن کا ہیڈ کوارٹر اتنا قریب ہو اور پھر یہ بات تاریخ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ پارٹی محض خبر رسانی کی غرض سے بھیجی گئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ علم ہوا کہ صحابہ نے قافلہ پر حملہ کیا تھا تو آپ سخت ناراض ہوئے، چنانچہ روایت ہے کہ جب یہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کو سارے ماجرا کی اطلاع ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا مَا أَمَرْتُكُمْ بِإِقْتَالِ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ ۖ میں نے تمہیں شہر حرام میں لڑنے کی اجازت نہیں دی ہوئی ۖ ذَٰلِجِ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ ذَٰلِكَ شَيْئًا ۖ اور آپ نے مال غنیمت لینے سے انکار کر دیا ۖ اس پر عبداللہ اور ان کے ساتھی سخت نادام اور پشیمان ہوئے۔ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ هَمَّكَوْا ۖ اور انہوں نے خیال کیا کہ بس اب ہم خدا اور اس کے رسول کی ناراضگی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے ۖ صحابہ نے بھی ان کو سخت ملامت کی کہ اور کہا صَنَعْتُمْ مَالَكُمْ تَوْمَرًا وَقَاتِلْتُمْ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَلَكُمْ تَوْمَرًا وَإِقْتَالٌ ۖ یعنی تم نے وہ کام کیا جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور تم نے شہر حرام میں لڑائی کی ۖ حالانکہ اس ہم میں تو تم کو مطلقاً لڑائی کا حکم نہیں تھا ۖ دوسری طرف قریش نے بھی شور



مچایا کہ مسلمانوں نے شہر حرام کی حرمت کو توڑ دیا ہے اور چونکہ جو شخص مارا گیا تھا یعنی عمرو بن الحضرمی وہ ایک رئیس آدمی تھا اور پھر وہ عقبہ بن ربیعہ رئیس مکہ کا حلیف بھی تھا اس لیے بھی اس واقعہ نے قریش کی آتش غضب کو بہت پھڑکا دیا اور انھوں نے آگے سے بھی زیادہ جوش و غروش کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی چنانچہ جنگ بدر جس کا ذکر آگے آتا ہے زیادہ تر قریش کی اسی تیاری اور جوشِ عداوت کا نتیجہ تھا۔ الغرض اس واقعہ پر مسلمانوں اور کفار ہمدرد میں بہت چہ میگوئی ہوئی اور بالآخر ذیل کی قرآنی وحی نازل ہو کر مسلمانوں کی تشفی کا موجب ہوئی:

لَئِنْ شِئْتُمْ نَحْنُ عَنْ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فَبِئْسَ الْقِتَالُ فَبِئْسَ الْيَوْمُ الْحَرْبُ وَاللَّهُ يَكْفُرُ بِهِ وَالنَّبِيُّ  
 الْحَرَامُ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَذَرَاؤُنَ يِقَاتِلُوكُمْ حَتَّى  
 يَرْزُقُوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنْ اسْتَطَاعُوا لَكُمْ يَعْنِي "لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ شہر حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ تو ان کو  
 جواب دے کہ بیشک شہر حرام میں لڑنا بہت بُری بات ہے، لیکن شہر حرام میں خدا کے دین سے لوگوں کو جبراً روکنا  
 بلکہ شہر حرام اور مسجد حرام دونوں کا کفر کرنا یعنی ان کی حرمت کو توڑنا اور پھر حرم کے علاقہ سے اس کے رہنے والوں کو  
 بزورِ مکانا جیسا کہ اے مشرک تو تم لوگ کر رہے ہو یہ سب باتیں خدا کے نزدیک شہر حرام میں لڑنے کی نسبت بھی زیادہ بُری  
 ہیں اور یقیناً شہر حرام میں ملک کے اندر فتنہ پیدا کرنا اس قتل سے بدتر ہے جو فتنہ کو روکنے کے لیے کیا جاوے۔ اور  
 اے مسلمانو! کفار کا تو یہ حال ہے کہ وہ تمہاری عداوت میں اتنے اندھے ہو رہے ہیں کہ کبھی وقت اور کسی جگہ بھی وہ  
 تمہارے ساتھ لڑنے سے باز نہیں آئیں گے اور وہ اپنی یہ لڑائی جاری رکھیں گے حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں  
 بشرطیکہ وہ اس کی طاقت پائیں۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام کے خلاف روسائے قریش اپنے خونی  
 پراپیگنڈا کو شہر حرام میں بھی برابر جاری رکھتے تھے بلکہ اشہر حرم کے اجتماعوں اور سفروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ  
 ان مہینوں میں اپنی مفسدانہ کارروائیوں میں اور بھی زیادہ تیز ہو جاتے تھے اور پھر کمال بے حیائی سے اپنے دل کو  
 جھوٹی تسلی دینے کے لیے وہ عزت کے مہینوں کو اپنی جگہ سے ادھر ادھر منتقل بھی کر دیا کرتے تھے جسے وہ نستی  
 کے نام سے پکارتے تھے اور پھر آگے چل کر تو انہوں نے غضب ہی کر دیا کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں باوجود پختہ عہد  
 بیمان کے کفار مکہ اور ان کے ساتھیوں نے حرم کے علاقہ میں مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ کے خلاف تلوار  
 چلائی اور پھر جب مسلمان اس قبیلہ کی حمایت میں نکلے تو ان کے خلاف بھی عین حرم میں تلوار استعمال کی۔ پس اس  
 جواب سے مسلمانوں کی تو تسلی ہونی ہی تھی قریش بھی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور اس دوران میں ان کے آدمی بھی اپنے  
 دو قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مدینہ پہنچ گئے، لیکن چونکہ ابھی تک سعد بن ابی وقاص اور عقبہ واپس نہیں آئے تھے۔  
 اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے متعلق سخت خدشہ تھا کہ اگر وہ قریش کے ہاتھ پڑ گئے تو قریش انہیں زندہ  
 نہیں چھوڑیں گے، اس لیے آپ نے ان کی واپسی تک قیدیوں کو چھوڑنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے آدمی

بحیرت مدینہ پہنچ جائیں گے تو پھر میں تمہارے آدمیوں کو چھوڑ دوں گا، چنانچہ جب وہ دونوں واپس پہنچ گئے، تو آپ نے فدیہ لے کر دونوں قیدیوں کو چھوڑ دیا، لیکن ان قیدیوں میں سے ایک شخص پر مدینہ کے قیام کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ اور اسلامی تعلیم کی صداقت کا اس قدر گہرا اثر ہو چکا تھا کہ اس نے آزاد ہو کر بھی واپس جانے سے انکار کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر آپ کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گیا اور بالآخر ہجر مہاجرہ میں شہید ہوا۔ اس کا نام حکم بن کیاں تھا۔

**تحویل قبلہ** باوجود جنگ و جدال کی بے انتہا مصروفیت کے تکمیل و تاسیس مذہب کا کام نہیں رک سکتا تھا کیونکہ بعثت نبویؐ کی یہی علتِ اولیٰ تھی۔ چنانچہ نماز مکہ میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ مدینہ میں باجماعت نماز کے التزام نے اذان کی ضرورت محسوس کرائی اور اس کا انتظام کیا گیا۔ مگر مسلمانوں کا قبلہ ابھی تک بیت المقدس تھا اور مکہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور مدینہ کے ابتدائی زمانہ میں بھی یہی طریق جاری رہا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ مکہ کے کعبہ کو قرار دیا جائے، کیونکہ وہ خدا کی عبادت کا پہلا گھر تھا جو دنیا میں تعمیر ہوا اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور عیسیٰ کے بعد عظیم اسماعیل ذبیح اللہ کی یادگار بھی اسی گھر سے وابستہ تھی اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن اور اسلام کا مبداء و منبع ہونے کی حیثیت میں بھی کعبہ ہی مسلمانوں کا قبلہ بننے کا حقدار تھا، لیکن چونکہ ابھی تک کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور یہ سلسلہ ہجرت کے سولہ سترہ ماہ بعد تک جاری رہا، لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے اصل قبلہ پر قائم کر دیا جائے، چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال شعبان کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حکم الہی کے نزول کی فکر ہوئی اور یحییٰ مسلمانوں کا رخ بیت المقدس کی طرف کعبہ کی طرف پھر گیا۔ قرآن شریف میں جو آیات اس بارہ میں نازل ہوئیں۔ وہ یہ ہیں:-

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ط يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ..... وَمَجْعَلْنَا قِبْلَةً لِّئَلَّا نَكُونَ لَكِبْرَةً اِلَّا لِمَنْ عَلِمَ مِنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقْبَتِهِمْ ذٰلِكَ كَانَ مَوْجِئًا لِّكَيۡدِ الْاَعْيُنِ هَدٰى اللّٰهُ ..... قَدْ نَرٰى ثَقَلَبَ وَجْهَكَ فِي السَّمٰوٰتِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَتَكَ تَرٰنَهَا قَوْلَ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَهُ ..... وَبِكُلِّ وُجْهَةٍ هُوَ مُوَلِّيٰهَا فَاَسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”مزدور جو قوف لوگ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کو اُن کے اس قبلہ سے کس بات نے پھیر دیا جس پر کہ وہ تھے۔ تو کہہ دے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہے وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف راستہ دکھا دیتا ہے اور اے رسول! ہم نے تیرے پہلے قبلہ کو تو صرف اس احسان کے طور پر رکھا تھا کہ یہ ظاہر ہو جاوے کہ کون خدا کے رسول کی سچی اتباع اختیار کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے اور بیشک پہلا قبلہ طبع پر ایک بوجھ رہا ہے سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی طرف سے ہدایت پر قائم ہیں اور اے رسول! ہم دیکھتے ہیں کہ تیری توجہ قبلہ کے معاملہ میں آسمان کی طرف لگی ہوئی ہے کہ کب کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم اُترتا ہے۔ لہذا اب ہم پھیر دیتے ہیں تجھے اس قبلہ کی طرف جو تجھے پسند ہے۔ پس اے رسول اپنے رخ کو مسجدِ حرام کی طرف پھیر لے اور اے مسلمانو! جہاں کہیں بھی تم ہو اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف رکھا کرو اور جانو کہ ہر قوم کے لیے توجہ کی ایک خاص سمت ہوتی ہے اور گو ہم نے تمہاری ظاہری سمت کو یہ مقرر کیا ہے لیکن یاد رکھو تمہاری باطنی سمت نیکیوں کی طرف بڑھنا ہونی چاہیئے اور اس ظاہر و باطن کی یکجہتی سے یہ فائدہ ہو گا کہ تم خواہ دُنیا کے کسی حصہ میں پھیلے ہوئے ہو گے تم میں اتحاد رہے گا۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے“

ان آیات قرآنی میں جہاں تحویلِ قبلہ کا حکم ہے وہاں قبلہ کی حکمت اور ضرورت بھی بیان کی گئی ہے کہ اس قوم میں ظاہری یکجہتی اور اتحاد فی العورت قائم رہتے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے ایک عرصہ تک مسلمانوں کو بیت المقدس کے قبلہ پر اس محض قائم رکھا تھا کہ وہ مشرکین پر کئے گئے جن کی ساری توجہ کا مرکز کعبہ تھا بطور ایک امتحان کے رہے اور وہ اپنے اندر ایمان کی خاطر قربانی کرنے کی رُوح پیدا کریں، لیکن جب آزمائش کا مناسب زمانہ گزر گیا تو اصل قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا گیا۔ اس موقع پر سرورِ عالم نے اعتراض کیا ہے کہ شروع شروع میں مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے اس لیے نماز پڑھتے تھے کہ تا اس طرح مدینہ کے یہودیوں کو اپنی طرف مائل کریں، لیکن جب دیکھا کہ وہ اس دائرہ میں نہیں آتے تو رخ بدل کر کعبہ کی طرف کر لیا گیا تاکہ مشرکین عرب کو خوش کرنے کی کوشش کی جاوے۔ تعصبِ بیشک انسان کو اندھا کر دیتا ہے لیکن اگر سرورِ عالم جیسا قابلِ شخص جو ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوبے کا کامیاب حاکم رہ چکا ہے۔ اسلام کے متعلق ایسی بے بنیاد باتیں کرے تو جائے تعجب مزدور ہے، مگر حقیقت ایسی واضح ہے کہ کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکتی جو طریقِ عملِ ہجرت سے کئی سال پہلے مکہ میں جاری ہوا ہو اور مدینہ جانے پر چند ماہ کے بعد منسوخ کر دیا ہو اس کے

متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ یہود مدینہ کو خوش کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا اور اس کی منسوخی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مشرکین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقوع میں آئی تھی کسی عقلمند کو دھوکے میں نہیں ڈال سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا قبلہ مشرکین کیلئے بطور ایک امتحان کے تھا اور اس امتحان کا وقت ہجرت کے پہلے ہی مناسب تھا، لیکن چونکہ مدینہ میں بھی مشرکین بستے تھے اس لیے مدینہ کے ابتدائی ایام میں بھی وہ امتحان جاری رہا۔ مگر جب مشرکین مدینہ قریباً مفقود ہو گئے تو اس امتحان کی ضرورت نہ رہی اور تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو گیا اور اس حکم میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ مسلمان اپنے اصل قبلہ پر قائم ہو گئے اور دوسرے یہ کہ نیا قبلہ یہود کے لیے ایک امتحان بن گیا جیسا کہ پہلا قبلہ مشرکین کے لیے امتحان تھا۔ پس حقیقت وہ نہیں جو میور صاحب کے خاتمہ تعصب نے خلق کی ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے اور قرآن جس کی شہادت کی تائید بھی حیثیت کو میور صاحب نے سب شہادتوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے اس کا شاہد ہے۔

**صیام رمضان**  
 نماز سے اتر کر اسلامی عبادات کا دوسرا بڑا رکن روزہ ہے۔ دراصل اسلام نے مختلف قسم کی عبادات مختلف قسم کے تزکیہ نفس کو مد نظر رکھ کر شروع کی ہیں یعنی اگر نماز ایک رنگ میں انسان کی آلائشوں اور کمزوریوں کو دور کرتی ہے اور اسے خدا کا مقرب بننے کے قابل بناتی ہے تو روزے کسی دوسرے رنگ میں یہ کام سرانجام دیتے ہیں اور زکوٰۃ ایک تیسرے میدان کے لیے مقرب ہے اور حج کا ان تینوں کے علاوہ ایک چوتھا مقصد ہے اور اس طرح مختلف عبادتیں مختلف مقاصد کو پورا کرتی ہیں اور مختلف جہات انسان کی اصلاح اور ترقی کے کام میں مدد دیتی ہیں اور اگر غور کیا جائے تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس ترتیب کے اسلامی عبادات کے مختلف ارکان شروع ہوئے ہیں وہی ان کی اہمیت کی ترتیب بھی ہے۔ یعنی سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع طور پر انسانی اخلاق اور روحانیت پر اثر ڈالنے والی عبادت وہ ہے جو سب سے پہلے قائم کی گئی اور اس کے بعد اس سے کم درجہ کی قائم کی گئی اور اس کے بعد اس سے کم کی و علیٰ ہذا القیاس۔ اور جو لوگ عبادات کو محض ایک رسم کے طور پر ادا نہیں کرتے اور ان کے اثر کو اپنے نفوس میں مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ عبادات میں اول نمبر نماز کا ہے اور پھر اس سے اتر کر روزہ کا۔ اور پھر دوسری عبادات کا۔ بہر حال اس وقت تک صرف نماز مشروع ہوئی تھی اور اب ہجرت کے دوسرے سال رمضان کی آمد پر روزوں کا بھی آغاز ہوا۔ یعنی یہ حکم نازل ہوا کہ رمضان کے مہینہ میں تمام بالغ مسلمان مرد و عورت باستثناء بیماروں اور ناتوانوں کے اور باستثناء مسافروں کے صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک ہر قسم کے کھانے پینے سے پرہیز کریں اور ان اوقات میں غاوند بیوی کے مخصوص تعلقات سے بھی پرہیز کیا جائے اور روزوں کے ایام کو خصوصیت کے ساتھ ذکر الہی اور قرآن خوانی اور صدقہ و خیرات میں گزارا جائے اور روزوں کی راتوں میں مخصوص طور پر نماز تہجد



کا التزام کیا جاوے وغیر ذالک؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کا رمضان گویا ایک مجتہم عبادت کا رنگ بکھاتا تھا اور گویوں تو آپ کی ساری زندگی ہی عبادت تھی، مگر روزوں میں آپ خصوصیت سے بیشتر حصہ وقت کا نوافل اور ذکر الہی میں گزارتے تھے اور راتوں کو کثرت کے ساتھ جاگتے تھے اور رمضان میں آپ اتنا صدقہ و خیرات کرتے تھے کہ صحابہؓ نے اس کو ایک تیز ہوا کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کسی روک کو خیال میں نہ لائے۔ نیز روزہ کی روح کو زندہ رکھنے کے لیے آپ ہمیشہ صحابہ کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ یہ نہ سمجھو کہ بس کھانا پینا چھوڑنے کی رسم ادا کر کے تم خدا کے نزدیک روزہ دار شمار ہو جاؤ گے بلکہ تمہیں روزہ کی اصل روح کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ اس سے تمہارے اندر طہارت نفس اور ضبط خواہشات اور مادۂ قربانی اور غرباء کی امداد کا احساس پیدا ہو اور فرماتے تھے کہ وہ شخص بہت بد قسمت ہے جس کو کوئی رمضان میسر آئے اور پھر اس کے گذشتہ گناہ معاف نہ ہوں۔ آپ نوافل کے طور پر بھی روزہ کی تحریک فرمایا کرتے تھے مگر آپ کی یہ سنت تھی کہ آپ ہر بات میں میانہ روی کا حکم دیتے تھے؛ چنانچہ آپ اس بات سے منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص مسلسل روزے ہی رکھتا چلا جاوے اور فرماتے تھے کہ انسان پر خدا نے اس کے نفس کا بھی حق رکھا ہے اور اس کی بیوی کا بھی حق رکھا ہے اور اس کے بچوں کا بھی حق رکھا ہے اور اس کے دوستوں کا بھی حق رکھا ہے اور ہمسایوں کا بھی حق رکھا ہے اور اسی طرح دوسرے حقوق ہیں اور ان میں سے ہر حق کو خدا کی شریعت اور منشاء کے ماتحت ادا کرنا عبادت میں داخل ہے۔ پس ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی شخص ایک خاص عبادت پر زور دیکر دوسرے حقوق کو نظر انداز کر دے۔ غرض اس طرح اس سال رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور اسلامی عبادات میں دوسرے رکن کا اضافہ ہوا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح پنجگانہ نماز فرض ہونے سے قبل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رنگ میں نفل نماز پڑھا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض کیے جانے سے پہلے آپ نفل روزے بھی رکھتے تھے، مگر وہ اس طرح باقاعدہ اور معتین اور موقت صورت میں شروع نہیں ہوتے تھے؛ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے قبل آپ یوم عاشورہ یعنی محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھا کرتے تھے اور صحابہ کو بھی اس کی تحریک فرماتے تھے۔

## عید الفطر

رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد رمضان کا آخر آیا تو آپ نے خدا سے حکم پا کر

صدقۃ الفطر کا حکم جاری فرمایا کہ ہر مسلمان جسے اس کی طاقت ہو اپنی طرف سے اور

اپنے اہل و عیال اور توابع کی طرف سے فی کس ایک صاع کے حساب سے کھجور یا انگور یا جو یا گندم وغیرہ بطور صدقہ عید سے پہلے ادا کرے اور یہ صدقہ غرباء اور مساکین اور یتامیٰ اور یتوکان وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاوے تاکہ ذی استطاعت

۱۔ قرآن شریف سورۃ بقرہ و بخاری ابواب الصیام ۲۔ بخاری

۳۔ ایک عربی پیمانہ ہے جو وزن کے لحاظ سے کچھ اوپر تین میر گندم کے برابر ہوتا ہے۔



لوگوں کی طرف سے عبادت صوم کی کمزوریوں کا کفارہ ہو جاوے اور غرباء کے لیے عید کے موقع پر ایک امداد کی صورت نکل آئے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر عید رشتہ داروں سے پہلے صدقہ الفطر باقاعدہ طور پر ہر چھوٹے بڑے مرد و عورت مسلمان سے وصول کیا جاتا تھا اور یتامیٰ اور غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

عید الفطر بھی اسی سال شروع ہوئی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ رمضان کا مہینہ ختم ہو جانے پر شوال کی پہلی تاریخ کو مسلمان عید منایا کریں۔ یہ عید اس بات کی خوشی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان کی عبادت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ مگر کیا شانِ دلربائی ہے کہ آپؐ نے اس خوشی کے اظہار کے لیے بھی ایک عبادت ہی مقرر فرمائی؛ چنانچہ حکم دیا کہ عید کے دن تمام مسلمان کسی کھلی جگہ جمع ہو کر پہلے دو رکعت نماز ادا کیا کریں اور پھر اس نماز کے بعد بیشک جائز طور پر ظاہری خوشی بھی منائیں کیونکہ روح کی خوشی کے وقت جسم کا بھی حق ہے کہ وہ خوشی میں جھٹھے۔ دراصل اسلام نے ان تمام بڑی بڑی عبادتوں کے اختتام پر جو اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ عیدیں رکھی ہیں؛ چنانچہ نمازوں کی عید جمعہ ہے جو گویا ہر ہفتہ کی نمازوں کے بعد آتا ہے اور جسے اسلام میں ساری عیدوں سے افضل قرار دیا گیا ہے پھر روزوں کی عید عید الفطر ہے جو رمضان کے بعد آتی ہے۔ اور حج کی عید عید الاضحیٰ ہے جو حج کے دوسرے دن منائی جاتی ہے اور یہ ساری عیدیں پھر خود اپنے اندر ایک عبادت ہیں الغرض اسلام کی عیدیں اپنے اندر ایک عجیب شان رکھتی ہیں اور ان سے اسلام کی حقیقت پر بڑی روشنی پڑتی اور یہ اندازہ کر نیکاموقعہ ملتا ہے کہ کس طرح اسلام مسلمانوں کے ہر کام کا ذکر الہی کے ساتھ پیوند کرنا چاہتا ہے۔

مجھے تاریخ سے ہٹنا پڑتا ہے؛ ورنہ میں بتانا کہ کس طرح اسلام نے ایک مسلمان کی ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل کو خدا کی یاد کا خمیر دیا ہے۔ حتیٰ کہ روزمرہ کے معمول اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، نہانے دھونے، کپڑے بدلنے، جوتا پہننے، گھر سے باہر جانے، گھر کے اندر آنے، سفر پر جانے، سفر سے واپس آنے، کوئی چیز بیچنے، کوئی چیز خریدنے، بلندی پر چڑھنے، بلندی سے اترنے، مسجد میں داخل ہونے، مسجد سے باہر آنے۔ دوست سے ملنے، دشمن کے سامنے ہونے، نیا چاند دیکھنے، بیوی کے پاس جانے۔ غرض ہر کام کے شروع کرنے اور ختم کرنے حتیٰ کہ چھینک اور اباسی تک لینے کوئی نہ کسی نہ کسی طرح خدا کے ذکر کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اس حالت میں اگر مشرکین عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو دراصل اس تعلیم کے لائے والے، لیکن کفار کے خیال میں اس تعلیم کے بانی والے تھے یہ کہتے ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا جنون ہو گیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ واقعی ایک اونیادار گویہ باتیں جنون کے ہوا اور کچھ نظر نہیں آسکتیں، مگر جس نے اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھا ہے وہ جانتا ہے کہ زندگی اسی کا نام ہے۔

## جنگ بدر کے متعلق ایک ابتدائی بحث

اسی سال رمضان کے مہینہ میں بدر کی جنگ وقوع میں آئی۔  
یہ جنگ چونکہ کئی لحاظ سے تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم

واقعہ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کے متعلق کسی قدر زیادہ تفصیلی نظر ڈالی جاوے۔ بدر وہ پہلی باقاعدہ لڑائی ہے جو کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی اور اس کے اثرات بھی ہر دو فریق کے لیے نہایت وسیع اور گہرے ثابت ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے اس کا نام ”یوم الفسرقان“ یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کا دن رکھا ہے اور اس کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کی خبر رسول خدا کے ذریعہ قریش مکہ کو ہجرت سے پہلے دی گئی تھی۔

جنگ بدر کے تحریکی سبب کے متعلق زمانہ حال میں بعض محققین نے اختلاف کیا ہے اور اسی اختلاف کے متعلق ہم اس ابتدائی نوٹ میں کچھ بحث کرنا چاہتے ہیں۔ عام مؤرخین کا یہ خیال ہے اور متقدمین میں سے تو اس بارہ میں

کسی ایک مؤرخ نے بھی اختلاف نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے ایک تجارتی قافلہ کی اطلاع ملی تھی جو ابوسفیان کی سرداری میں شام کی طرف مکہ کو واپس آ رہا تھا اور آپ اسی قافلہ کی روک تھام کے لیے مدینہ سے نکلے تھے، لیکن جب آپ بدر کے قریب پہنچے تو اس وقت آپ کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا ایک بڑا لشکر

مکہ سے آیا ہے اور پھر قافلہ تو بیچ کر نکل گیا اور قریش کے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی مٹھ بھیر ہو گئی۔ دوسری طرف زمانہ حال میں جماعت احمدیہ قادیان کے ایک معزز فرد مولوی شیر علی صاحب بی۔ اے نے رسالہ ریویو آف ریجینز قادیان

بابت سال ۱۹۱۱ء میں اور ہندوستان کے مشہور مؤرخ مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبیؐ میں بعض قرآنی آیات اور دیگر شہادات سے استدلال کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کو مدینہ میں ہی قریش کے لشکر کی اطلاع مل گئی تھی۔

اور وہ مدینہ سے ہی لشکر کے مقابلہ کے خیال سے نکلے تھے اور قافلہ کے ارادے سے نکلنے کا خیال غلط ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی اپنی رائے کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں کہ :

”مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمیعت عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔“

جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی خلق اور مسلمانوں کے قومی اخلاق پر روشنی پڑنے کا سوال ہے یہ

اختلاف چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ صحابہ قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلے تھے یا لشکر قریش کے مقابلہ کی غرض

سے یا یہ کہ انہیں دونوں کی اطلاع اور دونوں کا خیال تھا ان میں سے کوئی بھی مقصد ہو وہ مقصد جیسا کہ ہم جہاد کی

اصول بحث میں ثابت کر چکے ہیں بالکل درست اور جائز تھا اور کوئی معقول اور غیر متعصب شخص اس پر اعتراض نہیں

کر سکتا، لیکن تاریخی اور علمی نکتہ نگاہ سے یہ اختلاف ایک دلچسپ بحث کا رنگ اختیار کر گیا ہے اور کوئی علم دوست

مؤرخ اس کی طرف سے بے توجہی نہیں برت سکتا اور پھر صحیح واقعات کی تحقیق کی ذمہ داری مزید برآں ہے لیکن مشکل

یہ ہے کہ اس کی پوری پوری بحث اور مکمل چھان بین کے لیے ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے جس کی گنجائش ایک غاص  
تاریخ کی کتاب میں نہیں نکالی جاسکتی اور حق یہ ہے کہ میں نے اس بحث میں ایک مفصل مضمون لکھا بھی تھا لیکن پھر اسے  
اس خیال سے خارج کر دیا کہ اس قسم کا مضمون حقیقتہً علم کلام میں داخل ہے اور عام تاریخ کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔  
سواب میں نہایت مختصر طور پر اس معاملہ میں اپنی تحقیق کا ذکر کر کے اصل مضمون کی طرف لوٹا ہوں۔ میں نے ہر دو قسم کے  
خیالات کے متعلق کافی غور کیا ہے لیکن جہاں میں مولوی شیر علی صاحب اور مولانا شبلی کی تحقیق کو قدر کی نگاہ سے  
دیکھتا ہوں وہاں میں افسوس کے ساتھ بعض باتوں میں ان بزرگوں سے اختلاف بھی رکھتا ہوں اور میری رائے میں  
اصل حقیقت ان ہر دو قسم کے خیالات کے بین بین ہے۔ یعنی میری تحقیق یہ ہے کہ ایک طرف تو جدید تحقیق کا یہ حصہ  
ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں ہی لشکر قریش کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی اور دوسری طرف عام مؤرخین  
کا یہ خیال بھی ہرگز غلط نہیں ہے کہ صحابہ (یعنی اکثر صحابہ جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائیگا) صرف قافلہ ہی کی روک تھام کے  
خیال سے نکلے تھے اور لشکر قریش کا علم انہیں بدر کے قریب پہنچ کر ہوا تھا اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے قرآن  
مشریف اور تاریخ و حدیث دونوں میرے اس خیال کے مؤید ہیں۔ دراصل ہمارے ان جدید محققین نے قرآن شریف کے  
سارے بیان کو اپنے مد نظر نہیں رکھا اور صرف اس کے ایک حصہ کو لیکر (جو بظاہر تاریخی بیان کے مخالف نظر آتا ہے)  
حالانکہ دراصل وہ بھی تاریخی روایات کے مخالف نہیں ہے بلکہ تاریخ سے ایک زائد بات بتاتا ہے، اس  
بحث میں ساری تاریخی روایات کو عملاً ردی کی طرح پھینک دیا ہے؛ حالانکہ خود قرآن شریف کے دوسرے حصے ان  
تاریخی روایات کی تصدیق کرتے ہیں اور سوائے ایک زائد بات کے جس کی طرف قرآن شریف اشارہ کرتا ہے باقی  
ساری باتوں میں قرآنی بیان اور تاریخی بیان ایک دوسرے کے مطابق ہیں اور ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ تفصیلات  
سے قطع نظر کرتے ہوئے تاریخی بیان کا حاصل جو مضبوط روایات سے ثابت ہے اور جس کی تائید میں صحیح احادیث  
بھی پائی جاتی ہیں یہ ہے کہ بدر کے موقع پر مسلمان صرف قافلہ کی روک تھام کے خیال سے مدینہ سے نکلے تھے اور لشکر  
قریش کا علم انہیں بدر کے پاس پہنچ کر ہوا تھا اور اس طرح گویا لشکر قریش اور مسلمانوں کا مقابلہ اچانک ہو گیا  
تھا۔ اب اس تاریخی بیان کے مقابلہ میں ہم قرآن شریف پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے سو  
سورۃ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۚ يُجَادِلُونَكَ  
فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَكُمُ الْيَقِينُ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۚ وَإِذْ يُبْعِدُكُمُ اللَّهُ  
إِذْ هِيَ الطَّاغُوتَانِ أَنَّهَا لَكُمْ ذُلٌّ وَأَنَّ عَيْدَ ذَاتِ الشُّوْكَهْ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ  
أَنْ يُجِزِيَ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَقَدْ قَطَعَ وَابِرَ الْكَافِرِينَ ۚ إِذْ أَقْبَلْتُمْ بِالْعُدُوِّ الدُّنْيَا

وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالْزَكَاةِ أَشْفَلْ مِنْكُمْ وَكُلُّوْا أَعْدَتُمْ لَا تُخْلَفُكُمْ فِي الْبَيْعَةِ وَلَكِنْ لِيَقْنِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ..... وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي آعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَقَلِيلًا فِي آعْيُنِهِمْ لِيَقْنِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا هَذَا إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

یعنی اے رسول! جس طرح نکالا تجھے تیرے رب نے تیرے گھر (مدینہ) سے حق کے ساتھ اس حال میں کہ مومنوں میں سے بعض لوگ تیرے اس نکلنے کو ایک سخت مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے اسی طرح بھلے تیرے دشمن تجھ سے لڑتے ہوئے حق کے رستہ میں بعد اس کے کہ وہ حق ان کے لیے ظاہر ہو چکا تھا۔ (یعنی ان پر خدائی سنت کے مطابق اتمامِ محبت ہو چکا تھا) اور حق کو قبول کرنا ان کے لیے ایسا تھا کہ گویا وہ موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہوں اور موت بھی وہ جو سامنے نظر آ رہی ہو۔ اور یاد کرو اے مسلمانو! جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ وعدہ دیتا تھا کہ کفار کے دُور گرد ہوں (یعنی لشکر اور قافلہ میں سے کسی ایک گروہ پر ضرور تمہیں غلبہ حاصل ہوگا اور تمہارا حال یہ تھا کہ تم خواہش کر رہے تھے کہ ان گرد ہوں میں سے کم تکلیف اور کم مشقت واسے گروہ (یعنی قافلہ) سے تمہارا سامنا ہو، لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ (شکر سے تمہارا مقابلہ کرا کے) اپنی پیشگوئی کے مطابق حق کو قائم کر دے اور ان کفارِ مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے (یعنی اُمتِ الکفر ہلاک کر دیتے جائیں) ..... جبکہ تم بدر کی وادی کے درے کنارے پر پہنچے تھے اور قریش کا لشکر پرے کنارے پر تھا (یعنی تم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے تھے) اور قافلہ تمہارے نیچے (مکہ کی طرف کو) نکل چکا تھا (یعنی قافلہ تو بچکر نکل گیا اور تم اچانک لشکر کے سامنے آ گئے اور یہ سب کچھ خدائی تصرف کے ماتحت ہوا ورنہ) اگر لڑائی کے وقت کی تعیین تم پر چھوڑ دی جاتی تو (اس وقت ظاہری اسباب کے لحاظ سے تمہاری حالت ایسی کمزور تھی کہ) تم ضرور اس میں اختلاف کرتے (یعنی گو تم میں سے بعض یہ کہتے کہ ہم ہر حالت میں لڑنے کو تیار ہیں، لیکن بعض ضرور اس بات پر زور دیتے کہ لڑائی کے وقت کو پیچھے ڈال دیا جاوے تاکہ وہ کفار کے مقابلہ کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائیں تو پھر لڑائی کے لیے ان کے سامنے آئیں) لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ (تمہیں لشکرِ قریش کے مقابلہ پر لا کر) وہ کام کر گزرے جس کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا (یعنی وہ پیشگوئی پوری کرے جو خدائی نشان کے طور پر اُمتِ الکفر کی ہلاکت کے متعلق کی گئی تھی) ..... پھر وہ وقت بھی یاد کرو جب میدانِ جنگ میں اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھوں میں کفار کو تھوڑا کر کے دکھاتا تھا

(تاکہ تم بد دل نہ ہو) اور تمہیں کفار کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھانا تھا (تاکہ وہ بھی مقابلہ سے پیچھے نہ ہٹ جائیں) یہ بھی خدا نے اس لیے کیا کہ وہ اس بات کو گزرے جس کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا اور بیشک اللہ ہی کی طرف ہر کام کا مال ہے (یعنی تمام کاموں کا انتہائی تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جس طرح چاہے واقعات کو چلا سکتا ہے)۔

ان قرآنی آیات سے جو مسئلہ طور پر جنگِ بدر کے متعلق تسلیم کی گئی ہیں اور جن کے ترجمہ کی تشریح کیلئے (میں نے) بعض الفاظ زائد کر دیتے ہیں مندرجہ ذیل یقینی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اول۔ جس وقت آپؐ مدینہ سے نکلے اس وقت مومنوں میں سے بعض لوگ آپؐ کے نکلنے کو ایک مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے۔

دوم۔ مومنوں کی (مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب کی یا اکثر کی۔ مگر غالباً اکثر کی) یہ خواہش تھی کہ قافلہ کے ساتھ مقابلہ ہو۔

سوم۔ یہ خواہش اس لیے نہیں تھی کہ انہیں قافلہ کے اموال و امتعہ کا خیال تھا بلکہ اس لیے تھی کہ قافلہ والوں کی تعداد تھوڑی تھی اور ان کا سامانِ حرب بھی کم تھا اس لیے اس کے مقابلہ میں کم تکلیف اور کم مشکل پیش آنے کا احتمال تھا۔

چہارم۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شروع سے ہی یہ ارادہ تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ شکرِ قریش کے ساتھ ہو۔ تاکہ وہ آئندہ اکھڑ جو اپنے مظالم اور سرکشیوں اور غمی کار روایتوں کی وجہ سے ہلاک کئے جانے کے سزاوار ہو چکے تھے ایک خدائی نشان کے طور پر کمزور لوگوں کے ہاتھ سے ہلاک کر دیتے جائیں اور وہ پیشگوئی پوری ہو جو ان کی ہلاکت کے متعلق پہلے سے کی جا چکی ہیں۔

پنجم۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا تصرف کیا کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کا میلان قافلہ کے مقابلہ کی طرف تھا قافلہ تو بچکر نکل گیا اور لشکرِ قریش سے ان کا اچانک سامنا ہو گیا۔

ششم۔ یہ تصرف اس لیے کیا گیا کہ مسلمانوں کی حالت اس وقت ظاہری اسباب کے ماتحت اتنی کمزور تھی کہ اگر خود ان پر اس لڑائی کے وقت کی تعیین چھوڑ دی جاتی تو ان میں سے ایک فریق ضرور اس مقابلہ کے وقت کو پیچھے ڈالنے کی کوشش کرتا حالانکہ اللہ کا منشاء یہ تھا کہ ابھی مقابلہ ہو اور فیصلہ ہو جائے۔

ہفتم۔ یہ خدائی تصرف شکرِ قریش اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جانے کے وقت تک بھی جاری رہا؛ چنانچہ خدائی تصرف کے ماتحت دونوں فوجیں ایسے طور پر ایک دوسرے کے سامنے آئیں کہ دونوں ایک دوسرے کو ان کی اصلی تعداد سے کم نظر آتے تھے اور یہ اس لیے کیا گیا کہ مسلمانوں میں ہڈلی نہ پیدا ہو اور قریش بھی جرأت کے ساتھ آگے بڑھیں اور مقابلہ ہو جاوے۔

یہ وہ سات باتیں ہیں جو امرِ زیرِ بحث کے متعلق قرآن شریف سے یقینی طور پر پتہ لگتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ



سوائے نمبر اول کے یہ ساری باتیں تاریخی بیان کے عین مطابق ہیں اور ان میں وہی حالات بیان کئے گئے ہیں جو صحیح تاریخی روایات اور احادیث میں مذکور ہوئے ہیں پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم تاریخی بیان کو رد کریں کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ قرآنی بیان کے مخالف نہیں ہے بلکہ اس کے رد کرنے سے قرآنی بیان کا رد لازم آتا ہے۔ غور کا مقام ہے کہ تاریخی روایات سوائے اس کے اور کیا کہتی ہیں کہ مسلمانوں کا لشکر قافلہ کے خیال سے نکلا تھا، مگر اچانک اس کا مقابلہ لشکر قریش سے ہو گیا۔ مگر کیا قرآن شریف بھی یہی نہیں کہتا کہ مسلمانوں کو قافلہ کی خواہش تھی، مگر خدا تعالیٰ نے اس کا مقابلہ اچانک لشکر قریش سے کر دیا؟ اور قرآن شریف اس کی وجہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے یہ کام اپنے خاص تصرف کے ماتحت اس لیے کیا کہ تا بطور ایک خدائی نشان کے ائمۃ الکفر مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک کروا دیئے جائیں اور وہ شگونی پوری ہو جو ان کی ہلاکت کے متعلق پہلے سے کی جا چکی تھی اندریں حالات اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ مسلمان مدینہ سے ہی لشکر قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے اس بات کے ہم معنی ہے کہ نہ صرف یہ کہ تاریخ و احادیث کی کثیر التعداد مضبوط اور صحیح روایات کو بالکل ردی کی طرح پھینک دیا جاوے، بلکہ اس قرآنی بیان کو بھی غلط قرار دیا جاوے جسے خدا تعالیٰ نے بدر کے قصہ میں بطور مرکزی نقطہ کے رکھا ہے۔

پس حق یہی ہے کہ مسلمان قافلہ ہی کی روک تھام کے خیال سے نکلے لیکن جب بدر کے پاس پہنچے تو اچانک یعنی علی غیر میعاد لشکر قریش کا سامنا ہو گیا اور جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلنا ہرگز قابل اعتراض نہیں تھا۔ کیونکہ اول تو یہ مخصوص قافلہ جس کے لیے مسلمان نکلے تھے ایک غیر معمولی قافلہ تھا جس میں قریش کے ہر مرد و عورت کا تجارتی حصہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق روسا قریش کی یہ نیت تھی کہ اس کا منافع مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کیا جائے گا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یہی منافع جنگ اُحد کی تیاری میں صرف کیا گیا۔ پس اس قافلہ کی روک تھام تباہی جنگ کا ضروری حصہ تھی۔ دوسرے عام طور پر بھی قریش کے قافلوں کی روک تھام اس لیے ضروری تھی کہ چونکہ یہ قافلے مسلح ہوتے تھے اور مدینہ سے بہت قریب ہو کر گزرتے تھے ان سے مسلمانوں کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا جس کا سد باب ضروری تھا۔ تیسرے یہ قافلے جہاں جہاں سے بھی گزرتے تھے مسلمانوں کے خلاف قبائل عرب میں سخت اشتعال انگیزی کرتے پھرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت نازک ہو رہی تھی۔ پس ان کا راستہ بند کرنا دفاع اور خود حفاظتی کے پروگرام کا حصہ تھا۔ چوتھے قریش کا گذارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اس لیے ان قافلوں کی روک تھام ظالم قریش کو ہوش میں لانے اور ان کو ان کی جنگی کارروائیوں سے باز رکھنے اور صلح اور قیام امن کے لیے مجبور کرنے کا ایک بہت عمدہ ذریعہ تھی اور پھر ان قافلوں کی روک تھام کی غرض لوٹ مار نہیں تھی بلکہ جیسا کہ قرآن شریف صراحتاً بیان کرتا ہے خود اس خاص ہم میں مسلمانوں کو قافلہ کی خواہش اس کے اموال کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ

اس کے مقابلہ میں کم تکلیف اور کم مشقت کا اندیشہ تھا۔

اب رہی وہ بات جو قرآن شریف میں تاریخی بیان سے زائد پائی جاتی ہے سو وہ بھی تاریخ کے مخالف نہیں کہلا سکتی کیونکہ تاریخی بیان میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس کے خلاف ہو البتہ یہ ایک زائد علم ہے جو ہمیں قرآن شریف سے حاصل ہوتا ہے اور بعض تاریخی روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے مگر بہر حال یہی ایک بات ہے جو تاریخی نکتہ نگاہ سے قابل تشریح بھی جاسکتی ہے اور یہ بات قرآنی بیان کے مطابق یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلے تو اس وقت بعض مسلمان آپ کی اس مہم کو ایک مشکل اور نازک کام سمجھتے تھے اس پر بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے صحابہ کے دل میں یہ احساس تھا اگر محض قافلہ کی روک تھام کا خیال ہوتا تو تین سو چار دلوں سے زائد کی جمیعت کے ہوتے ہوئے یہ احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پس معلوم ہوا کہ قافلہ کی خبر کے ساتھ ساتھ کوئی اور خیال بھی تھا جو بعض مسلمانوں کو فکر مند کر رہا تھا۔ یہ خیال کیا تھا؟ اس سوال کا جواب تاریخ سے واضح طور پر نہیں ملتا اور نہ ہی قرآن شریف نے اسے صراحتاً بیان کیا ہے۔ پس اس کے متعلق لازماً قیاس کرنا ہو گا اور خوش قسمتی سے یہ قیاس مشکل نہیں ہے کیونکہ تاریخ و قرآن شریف ہر دو میں قافلہ کے ساتھ ساتھ لشکر قریش کا ذکر بھی چلتا ہے اور اس سارے قصہ میں اگر کوئی بات ایسی نظر آتی ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں فکر پیدا کر سکتی تھی تو وہ لشکر قریش کی اطلاع ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ مدینہ میں ہی لشکر قریش کی خبر بھی پہنچ گئی ہوگی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ فکر دامن گیر ہوا ہوگا کہ اگر لشکر سے مقابلہ ہو گیا تو سخت مشکل کا سامنا ہوگا۔ یہ وہ استدلال ہے جو اس آیت سے کیا گیا ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ استدلال ایک عمدہ استدلال ہے جو اس آیت کی روشنی میں یہ واقعی ماننا پڑتا ہے کہ قریش کی آمد آمد کی اطلاع مدینہ میں ہی پہنچ گئی ہوگی لیکن جو وسعت اس استدلال میں پیدا کر لی گئی ہے وہ ہرگز درست نہیں۔ یعنی اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مدینہ میں ہی سارے یا اکثر مسلمانوں کو یہ اطلاع پہنچ گئی تھی اور وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر اسی علم کے ماتحت مدینہ سے نکلے تھے۔ یہ یقیناً غلط ہے کیونکہ علاوہ اس کے قرآن شریف کا بقیہ بیان اور کثیر التعداد تاریخی روایات اسے قطعی طور پر غلط ثابت کرتی ہیں خود آیت زیر بحث بھی اس وسعت کو قبول نہیں کرتی کیونکہ آیت میں یہ صاف طور پر موجود ہے کہ یہ احساس صرف بعض صحابہ کو تھا جیسا کہ فریقہ کے لفظ سے پایا جاتا ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کے متعلق صرف بعض صحابہ فکر مند تھے۔ سب یا اکثر صحابہ فکر مند نہ تھے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن شریف کی رو سے مدینہ میں لشکر قریش کی خبر صرف بعض صحابہ کو پہنچی تھی اور اکثر اس سے بے خبر تھے اور یہ وہ صورت ہے جو قرآن شریف کے بقیہ بیان اور تاریخی روایات کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جب لشکر قریش کی خبر مدینہ میں پہنچی ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس کی اطلاع صرف بعض خاص خاص صحابہ کو دی ہو اور اکثر مسلمان اس سے بے خبر رہے ہوں اور وہ اسی بے خبری کی حالت میں صرف قافلہ کے خیال سے مدینہ سے نکلے ہوں اور پھر بدر کے پاس پہنچ کر قریش سے اچانک اُن کا سامنا ہو گیا ہو۔ اور

یہی صورت درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ قرآن شریف کا بقیۃ بیان اس کی تائید میں ہے اور تاریخ و حدیث میں بھی اس کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ سے نکلنے سے قبل خاص طور پر صحابہ سے مشورہ کرنا اور اس مشورہ کو ایسے رنگ میں چلانا کہ انصار بھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائیں تاکہ آپ کے ساتھ زیادہ جمیعت ہو۔ حالانکہ انصار اس سے پہلے کسی مہم میں شامل نہیں ہوئے تھے اور پھر جب بدر کے پاس پہنچ کر قریش کے ایک حبشی غلام کے ذریعہ لشکر قریش کی اطلاع ہوئی تو صحابہ کا اس کے متعلق شک کرنا اور اُسے جھوٹا سمجھنا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فوراً اُسے بلا تامل مان لینا اور فرمانا کہ یہ غلام سچ کہتا ہے۔ وغیرہ، بالکل یہ سب اس بات کی شہادتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی لشکر قریش کی آمد کی اطلاع تھی مگر صحابہ اس سے بے خبر تھے۔ سوائے ان خاص خاص صحابہ کے جنہیں قرآنی بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس خبر کی اطلاع ہو گئی ہوگی۔ اب صرف یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کی خبر مدینہ میں ہی مل جاتی اور پھر یہ کہ اگر آپ کو یہ خبر مل گئی تھی تو آپ نے کیوں صرف بعض صحابہ کو اطلاع دی اور اکثر مسلمان اس سے بے خبر رہے؟ سو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہاں ایسا ممکن تھا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تھے اور آپ پر خدا کا کلام نازل ہوتا تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ بسا اوقات آپ کو آسمان سے وحی کے واسطے واقعات یا غیب کی خبروں سے خدائی وحی کے ذریعہ اطلاع دی جاتی تھی پس اگر اس موقع پر بھی آپ کو خدائی الہام کے ذریعہ یہ اطلاع مل گئی ہو کہ قریش کا ایک لشکر آرہا ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں اور آپ کی زندگی کے واقعات کے لحاظ سے یہ ایک نہایت معمولی واقعہ سمجھا جائے گا۔ اور چونکہ ایسا الہام جو کسی پیشگوئی کا حامل ہو بعض اوقات تاویل طلب ہوتا ہے اور اس کی پوری تفہیم بعض اوقات خود مہم کو بھی واقعہ سے قبل نہیں ہوتی۔ اس لیے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاطاً اس الہی خبر کی اطلاع صرف خاص خاص صحابہ کو دی ہو اور اکثر مسلمانوں کو اس کی اطلاع نہ دی گئی ہو تاکہ ان میں اس خبر سے کسی قسم کی بددلی نہ پھیلے جیسا کہ قرآن شریف سے بھی پتہ لگتا ہے کہ اسی جنگ میں دوسرے موقع پر بددلی کے سدباب کے لیے خدا نے یہ تصرف فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی نظروں میں کفار کا لشکر ان کی اصلی تعداد سے کم نظر آتا تھا۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی یہ بات بالکل ممکن تھی کہ آپ کو مدینہ میں ہی لشکر قریش کی اطلاع موصول ہو جاتی۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب ابوسفیان کا قاصد مکہ میں پہنچا تو قریش نے تین دن تیاری میں صرف کئے۔ یہ اور پھر بدر تک پہنچنے میں آٹھ یا نو دن مزید لگ گئے۔ شعیہ کل گیارہ یا بارہ دن ہوئے۔ باوجود اس کے جب اسلامی لشکر بدر میں پہنچا تو لشکر قریش پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں سولہ رمضان کو پہنچے تھے اس لیے یہ ماننا

پڑے گا کہ قریش کا لشکر غالباً پندرہ تاریخ کو وہاں پہنچ گیا ہوگا اب ان پندرہ دنوں میں سے گیارہ یا بارہ دن تیاری اور سفر کے نکال دیں تو یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش نے تین یا چار رمضان کو مکہ سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کے مدینہ سے نکلنے کی تاریخ عقلاً بھی اور روایت بھی بارہ رمضان ثابت ہوتی ہے لہٰذا گویا قریش کی تیاری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج از مدینہ کے درمیان پورے آٹھ یا نو دن کا وقفہ تھا۔ اس عرصہ میں لشکر قریش کی اطلاع بڑی آسانی کے ساتھ مدینہ میں پہنچ سکتی تھی بلکہ یہ عرصہ ایک شخص کے مکہ سے مدینہ جانے اور مدینہ سے پھر مکہ واپس آجانے کے لیے بھی کافی تھا۔ کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ایک تیزر دسوار جو ہر قسم کے بوجھوں سے آزاد ہو تیسرے چوتھے دن مکہ سے مدینہ پہنچ جاتا تھا۔

اور اگر یہ سوال ہو کہ مکہ سے اطلاع دینے والا کون تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علاوہ اس کے کہ ابھی تک مکہ میں بعض کمزور اور عرب مسلمان موجود تھے جو اس قسم کے خطرات کی حالت میں خبر رسائی کا انتظام کر سکتے تھے۔ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی چچا عباس بن عبدالمطلب بھی مکہ میں ہی تھے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ ہر قسم کی ضروری خبریں مکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوا کر لاتے تھے۔ چنانچہ غزوہ اُحد کے متعلق تو خاص طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ عباس نے اس موقع پر لشکر قریش کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخفی طور پر بھجوائی تھی اور قاصد سے یہ شرط کی تھی کہ وہ تین دن کے اندر اندر یہ خبر مدینہ پہنچا دیکے؛ چنانچہ یہ قاصد واقعی تین دن میں مدینہ پہنچ گیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کی بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ نے شروع شروع میں یہ خبر صرف خاص خاص صحابہ پر ظاہر فرمائی اور بعد میں اعلان کیا۔ ان حالات میں کیا یہ قرین قیاس نہیں بلکہ میں کہوں گا کہ یہ اغلب نہیں ہے کہ بدر کے موقع پر بھی عباس کی کوئی مخفی تحریر آپ کو پہنچ گئی ہو اور آپ نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں بددلی نہ پیدا ہو اس کا ذکر صرف خاص خاص صحابہ سے فرمایا ہو اور عامۃ المسلمین سے اس خبر کو مخفی رکھا ہو؟ بلکہ ان حالات کی وجہ سے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں بدر کے موقع پر اس قسم کا پردہ رکھنا زیادہ ضروری تھا اور پھر یہ رازداری بدر میں اُحد کی نسبت آسان بھی زیادہ تھی کیونکہ اس موقع پر قافلہ کی آمد کی خبر بھی ساتھ موجود تھی جن کی وجہ سے لشکر قریش کی خبر آسانی کے ساتھ اور آخر وقت تک پردہ میں رکھی جاسکتی تھی اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اُحد کے موقع پر عباس کی چٹھی کی خبر ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ گو شروع میں راز رکھا جاسکتا تھا، لیکن بالآخر اس کے اظہار کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بدر کے موقع پر یہ خبر آخر وقت تک بالکل پردہ میں رہی اور ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ خدائی منشاء کے ماتحت جس کا قرآن شریف میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت تک یہ پردہ



رکھنا ضروری خیال کیا ہو

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن شریف اور تاریخ وحدیث کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو عام مورخین کا یہ خیال درست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے کے سارے مسلمان محض قافلہ کے خیال سے مدینہ سے نکلے تھے اور لشکر قریش کی اطلاع سے وہ سب قطعی طور پر بے خبر تھے اور نہ ہمارے جدید محققین کی یہ رائے درست ہے کہ مدینہ میں ہی سارے مسلمانوں کو لشکر قریش کی آمد آمد کی اطلاع ہو گئی تھی اور وہ اس اطلاع کے بعد مدینہ سے نکلے تھے بلکہ حق یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلے لشکر اور قافلہ دونوں کی اطلاع آپ کو پہنچ چکی تھی مگر شکر کی آمد مصلحتاً بصیغہ راز رکھی گئی اور سوائے بعض خاص خاص صحابہ کے جو غالباً صرف اکابر مہاجرین میں سے تھے باقی سارے مسلمان اس سے بالکل بے خبر رہے اور اسی بے خبری کی حالت میں وہ مدینہ سے نکلے تھے کہ بدر کے پاس پہنچ کر لشکر قریش سے ان کا اچانک سامنا ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

یہ سوال کہ کفار کی طرف سے جنگ بدر کا سبب کیا تھا۔ یعنی لشکر قریش مکہ سے کس غرض و غایت کے ماتحت نکلا تھا اس کے متعلق قرآن شریف مندرجہ ذیل صداقت پیش کرتا ہے :-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْلًا وَرَعَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُخِيطٌ ۖ "یعنی اے مسلمانو! تم ان کفار کی طرح مت بنو جو اپنے گھروں سے تکبر اور نمائش کا اظہار کرتے ہوئے نکلے تھے اور ان کی غرض یہ تھی کہ اللہ کے دین کے سستے میں جبری طور پر روکیں پیدا کریں۔ مگر اللہ نے انکی کارروائیوں کا محاصرہ کر کے انہیں خائب و خاسر کر دیا۔"

اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ خواہ تحریمی سبب کوئی ہوا ہو اس مہم میں قریش مکہ کی اصل غرض و غایت ان کے ان خونخواروں پر مبنی تھی جو وہ شروع سے اسلام اور باقی اسلام کے متعلق رکھتے تھے اور قاتلہ کی حفاظت یا عمرو بن حضری کے قتل کے انتقام کا خیال محض ایک آلہ تھا جس سے وہ عوام کو اشتعال دلانے اور ان کے جوشوں کو قائم رکھنے کا کام لیتے تھے اور تاریخ سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے؛ چنانچہ قافلہ کے خطرے کی اطلاع آنے پر بجائے اس کے کہ قریش جلدی سے نکل کھڑے ہوتے ان کا پورے ساز و سامان اور پوری تیاری کے ساتھ تین دن کے بعد نکلنا اور رستہ میں قافلہ کے بچ کر نکل جانے کی اطلاع آ جانے پر بھی بڑی رعوت کے ساتھ آگے بڑھنے پر اصرار کرنا اور پھر عین میدان جنگ میں پہنچ کر جب کہ بعض لوگوں کی طرف سے جنگ کے روک دینے جانے کی تحریک ہوتی ابوہریرہ وغیرہ کا نہایت سختی کے ساتھ لڑنے پر اصرار کرنا اور سارے لوگوں کا اسی کی تائید میں ہونا یہ سب اس بات کی یقینی شہادتیں ہیں کہ دراصل قافلہ کی حفاظت اور عمرو بن حضری کے قتل کے انتقام کا خیال ایک محض بہانہ تھا اور اصل غرض اسلام کو مٹانا اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا تھی۔



اس اصولی بحث کے بعد ہم جنگ بدر کے حالات کا بیان شروع کرتے ہیں۔ مگر ہم ناظرین سے استدعا کریں گے کہ ہماری اس اصولی بحث کو بدر کے حالات کے مطالعہ کے بعد ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ جنگ بدر کے حالات معلوم ہونے پر یہ بحث زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ آ سکتی ہے۔

---

# جنگ بدر

## اسلامی سلطنت کا استحکام

اور

## رؤساء قریش کی تباہی

جنگ بدر - رمضان ۲؎ مطابق مارچ ۶۲۳؎

اب ہم جنگ بدر کے حالات کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ یہ بیان کیا جا چکا

ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد قریش مکہ نے مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے کی تیاری شروع کر دی تھی اور اس دوران میں سریہ وادی نخلہ میں جو عمرو بن حفص کے قتل کا واقعہ ہوا تھا اس سے رؤساء قریش نے ناجائز فائدہ اٹھا کر عامۃ الکفار کے دلوں میں مسلمانوں کی عداوت کی آگ کو اور بھی زیادہ خطرناک طور پر شعلہ زن کر دیا تھا اور اُس شخص کی طرح جسے اپنے وہ مظالم تو بھول جاتے ہیں جو وہ خود دوسروں پر کرتا رہا ہے لیکن اگر کسی دوسرے کی طرف سے اُسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچ جاوے تو وہ اُسے ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ خواہ وہ جوابی رنگ ہی رکھتی ہو۔ قریش مکہ مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کو تباہ و برباد کر دینے کی تیاری میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ منہمک ہو گئے تھے۔ اسی اشار میں مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قریش مکہ کا ایک تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تیس چالیس یا بعض روایات کی رو سے ستر آدمی تھے ابوسفیان کی سرداری میں شام کی طرف سے مکہ کو واپس آ رہا ہے۔ اس قافلہ میں غیر معمولی طور پر قریش کے ہر مرد و عورت کا حصہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ جو چیز اور جو رقم بھی وہ تجارت میں لگا سکتے تھے وہ اس موقع پر انہوں نے لگا دی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس تجارت کے منافع کے متعلق قریش کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگی مصارفت میں خرچ ہوگا۔ چونکہ قافلوں کی روک تھام، نظام قریش کو جوش میں لانے اور انہیں ان کی خطرناک کارروائیوں سے روکنے کا ایک بہترین ذریعہ تھی اور دوسرے ان قافلوں کا مدینہ سے اس قدر قریب ہو کر گزرنا ویسے بھی مسلمانوں کے لیے کئی طرح سے خطرے کے احتمالات رکھتا تھا

اور پھر اس قافلہ کے خاص حالات ایسے تھے کہ اس کا پتہ نہ مل سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر پا کر اپنے دو مہاجر صحابی طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو خبر سانی کے لیے روانہ فرمایا اور دوسرے صحابہ کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ اس قافلہ کی روک تھام کے لیے نکلنے کو تیار ہیں مگر اتفاق ایسا ہوا کہ کسی طرح ابوسفیان کو بھی آپ کے اس ارادے کی اطلاع ہو گئی یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دیے ہی بطور خود اندیشہ محسوس کیا ہو۔ بہر حال اس نے ایک سوار مضمر نامی مکہ کی طرف بھگا دیا اور اُسے تاکید کی کہ بڑی تیزی کے ساتھ سفر کرتا ہوا مکہ میں پہنچے اور وہاں سے قریش کا لشکر قافلہ کی حفاظت اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے نکال لائے اور خود ابوسفیان نے یہ احتیاط اختیار کیا کہ اصل راستے کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے کی طرف ہٹ گیا اور چھپ چھپ کر مگر تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ جب ابوسفیان کا یہ قاصد مکہ پہنچا تو اُس نے عرب کے دستور کے مطابق ایک نہایت وحشت زدہ حالت بنا کر زور زور سے چلنا شروع کیا کہ اے اہل مکہ تمہارے قافلہ پر فحشہ اور اس کے اصحاب حملہ کرنے کے لیے نکلے ہیں چلو اور اُسے بچا لو یہ خبر سن کر مکہ کے لوگ گھبرا کر کعبۃ اللہ کے گرد جمع ہو گئے اور رؤساء قریش نے پھر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت درجہ اشتعال انگیز تقریریں کیں جس سے لوگوں کے سینے اسلام کی عداوت کے جوش سے بھر گئے اور انھوں نے مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر تباہ و برباد کر دینے کا پختہ عزم کر لیا۔ اُس وقت قریش کے جوش کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ ایک بڑا جہاز شکر تیار کر کے مسلمانوں کے خلاف نکلیں اور اس مہم میں ہر وہ شخص جو روٹنے کے قابل ہے شامل ہو اور جو شخص کسی مجبوری کی وجہ سے خود شامل نہ ہو سکتا ہو وہ اپنی جگہ کسی دوسرے شخص کو بھیجنے کا انتظام کرے۔ اور رؤساء قریش اس تحریک میں خود سب آگے آگے تھے صرف دو شخص تھے جنہوں نے شمولیت سے تامل کیا اور وہ ابولہب اور امیہ بن خلف تھے مگر ان کے تامل کی وجہ بھی مسلمانوں کی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ابولہب تو اپنی بہن فاطمہ بنت عبد المطلب کے خواب سے ڈرتا تھا جو اُس نے ضمضم کے آنے سے صرف تین دن پہلے قریش کی تباہی کے متعلق دیکھا تھا اور امیہ بن خلف اس پیشگوئی کی وجہ سے خائف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل ہونے کے متعلق قرآنی وحی اور جس کا علم اُسے سعد بن معاذ کے ذریعہ مکہ میں ہو چکا تھا لیکن چونکہ ان دونوں رؤساء کے پیچھے رہنے سے عامۃ الکفار پر بڑا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا اس لیے دوسرے رؤساء قریش نے جوش اور غیرت دلا دلا کر آخراں دونوں کو رضامند کر لیا۔ یعنی امیہ تو خود تیار ہو گیا اور ابولہب نے ایک دوسرے شخص کو کافی روپیہ دینا کر کے اپنی جگہ بھڑا کر دیا اور اس طرح تین دن کی تیاری کے بعد ایک ہزار بہ بڑا جہاز سپاہیوں کا لشکر مکہ سے نکلنے کو تیار ہو گیا۔

ابھی یہ لشکر مکہ میں ہی تھا کہ بعض رؤساء قریش کو یہ خیال آیا کہ چونکہ بنو کنانہ کی شاخ بنو بکر کے ساتھ اہل مکہ

کے تعلقات خراب ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر وہ ان کے پیچھے مکہ پر حملہ کر دیں اور اس خیال کی وجہ سے بعض قریش کچھ متزلزل ہونے لگے۔ مگر بنو کنانہ کے ایک رئیس سراقہ بن مالک بن جشم نے جو اس وقت مکہ میں تھا ان کو اطمینان دلایا اور کہا کہ میں اس بات کا ضامن ہوتا ہوں کہ مکہ پر کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ بلکہ سراقہ کو مسلمانوں کی مخالفت کا ایسا جوش تھا کہ قریش کی اعانت میں وہ خود بھی بدر تک گیا، لیکن وہاں مسلمانوں کو دیکھ کر اس پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ جنگ سے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بھاگ آیا۔ اسی واقعہ کی طرف قرآن شریف کی اس آیت میں اشارہ سمجھا گیا ہے کہ اِذْ زَيَّنَّا لِقَوْمِ الشَّيْطَانِ اَعْمَالَهُمْ ..... وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ جبکہ شیطان قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف حق بجانب قرار دیتا تھا اور انہیں ابھارتا تھا الخ

مکہ سے نکلنے سے پہلے قریش نے کعبہ میں جا کر دُعا کی کہ ”اے خدا ہم دونوں فریقوں میں سے جو گروہ حق پر قائم ہے اور تیری نظروں میں زیادہ شریف اور زیادہ افضل ہے تو اُس کی نصرت فرما اور دوسرے کو ذلیل و رسوا کر دے۔“ اس کے بعد کفار کا لشکر بڑے جاہ و شہم کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوا۔ تمام رؤسا قریش ساتھ تھے اور گانے بجانے والی عورتیں بھی جو اپنے اشعار کے ساتھ دفیں بجاتی ہوئی غیرت اور جوش و لاتی تھیں ہمراہ تھیں۔ راستہ میں رؤسا قریش نے اس ہم کو ایک خاص قومی گانہ خیال کرتے ہوئے اپنے فرج سے لشکر کی خوراک کا انتظام کیا؛ چنانچہ ان کی طرف سے ہر روز باری باری نو دس دس اونٹ سپاہیوں کی ضیافت کے لیے ذبح کئے جاتے تھے۔ جب یہ لشکر جحفہ میں پہنچا جو مکہ اور بدر کے درمیان گربدر کے قریب تر ایک مقام ہے تو ابوسفیان کے ایک قاصد کے ذریعے انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ ان کا قافلہ خطرہ کی جگہ سے پھرنے لگا گیا ہے اور اس لیے اب لشکر کو آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ اس خبر پر بعض لوگ واپس جانے کو تیار ہو گئے، لیکن ابوجہل اور اس کی پارٹی کے اثر کے ماتحت اکثر اہل لشکر نے جن کی نیتیں کچھ اور تھیں بلکہ ایک روایت کی دوسرے سب سے بڑی سختی سے انکار کیا اور کہا کہ ”خدا کی قسم ہم بدر تک ضرور جائیں گے اور وہاں جا کر تین دن تک جشن منائیں گے تاکہ ہمیشہ کے لیے ملک میں ہمارا رعب بیٹھ جاوے اور لوگ ہم سے ڈرنے لگ جائیں۔“ چنانچہ سوائے چند آدمیوں کے جو واپس لوٹ گئے تھے باقی سارا لشکر بڑے کردار کے

۱۔ انفال: ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱

ساتھ آگے بڑھا اور مکہ سے نکلنے کی تازخ سے نویں دن (ایک دن درمیان میں راستہ کھوئے جانے کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا) یعنی غنیمت کی اطلاع پہنچنے کے گیارہ یا بارہ دن کے بعد بدر کی وادی کے درے کنارے پر پہنچا اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس وقت لشکر قریش کی تعداد ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ لوگ رائج الوقت سامان حرب سے خوب آراستہ تھے؛ چنانچہ فوج میں سواری کے سات سواؤنٹ اور ایک تسو گھوڑے تھے اور سب سوار اور اکثر پیادہ زرہ پوش تھے اور دیگر سامان جنگ بھی مثلاً نیزہ اور تلوار اور تیرکمان وغیرہ کافی تعداد میں موجود تھا۔

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے لشکر قریش سے جدا ہو کر مدینہ کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل سفیان کے قافلہ کی خبر پا کر اپنے دو صحابی اطلاع حالات کے لیے روانہ فرما دیئے تھے لیکن ابھی وہ واپس نہیں لوٹے تھے کہ آپ کو کسی ذریعہ سے مخفی طور پر یہ اطلاع بھی پہنچ گئی کہ قریش کا ایک جبار لشکر مکہ سے آ رہا ہے۔ اس وقت جو کمزور حالت مسلمانوں کی تھی اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے نیز جنگی تدابیر کے عام اصول کے مطابق آپ نے اس خبر کو مشہر نہیں ہونے دیا تاکہ عامۃ المسلمین میں اس کی وجہ سے کسی قسم کی بددلی نہ پیدا ہو لیکن ایک بیدار مغز جرنیل کی طرح آپ نے بغیر اس خبر کے اظہار کے ایسے رنگ میں صحابہ میں تحریک فرمائی کہ بہت سے صحابہ باوجود یہ خیال رکھنے کے کہ یہ ہم قافلہ کی روک تھام کی غرض سے اختیار کی جا رہی ہے آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے حتیٰ کہ انصار بھی جو بیعت عقبہ ثانیہ کے معاہدے کے موافق صرف مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں آپ کی حفاظت کے ذمہ دار کچھ جلتے تھے اور جو اس وقت تک کسی غزوہ یا سریہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ مشرک جہاد ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ آپ نے مدینہ میں ایک مجلس قائم کی اور صحابہ سے مشورہ دریافت فرمایا۔ حضرت ابوبکر و عمر نے جان نثارانہ تقریریں کیں مگر آپ نے ان کی طرف کچھ التفات نہ کیا جس پر ردسار انصار سمجھ گئے کہ آپ کا روئے سخن اُن کی طرف ہے؛ چنانچہ اُن میں سے سعد بن عبادۃ رئیس خزرج نے جان نثارانہ تقریر کی اور عرض کیا یا رسول اللہ انصار ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں اور جہاں بھی آپ ارشاد فرمائیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ میں عام تحریک فرمائی اور انصار و مہاجرین کی ایک جمعیت آپ کے ساتھ نکلنے کو تیار ہو گئی۔ لیکن پھر بھی چونکہ عام خیال قافلہ کے مقابلہ کا تھا بہت سے صحابہ یہ خیال کر کے کہ محض قافلہ کی روک تھام کا معاملہ ہے جس کے لیے زیادہ لوگوں کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے شامل نہیں ہوئے۔ دوسری طرف وہ بعض خاص صحابہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لشکر قریش کی آمد کا علم ہو گیا تھا مگر جن کو اخفاء راز کا حکم تھا وہ اپنی جگہ فکر مند تھے کہ دیکھئے اس موقع پر جبکہ لشکر قریش سے بھی منہ ہٹا ہوا جانے کا احتمال ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں یا



نہیں، چنانچہ انہی لوگوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن شریف فرماتا ہے إِنَّ خَيْرَ لِقَاءِ الْمُؤْمِنِينَ لَكُمْ هُنَّ۔۔۔ یعنی مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کو مومنوں کا ایک فریق (اپنی ظاہری طاقت کا خیال کرتے ہوئے) پسند نہیں کرتا تھا اور اسے ایک مشکل اور نازک کام سمجھتا تھا، مگر چونکہ اُن کے آقا کا یہی منشاء تھا وہ دلی جوش کے ساتھ بیک بیک کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اس وقت تک گودہ دو صحابی جن کو آپ نے خبر رسانی کے واسطے بھیجا تھا واپس نہیں لوٹے تھے مگر چونکہ لشکر قریش کی اطلاع اچکی تھی آپ نے مزید توقف کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ اور بارہ رمضان کو بروز اتوار مدینہ سے انصار و مہاجرین کی ایک جمیعت کے ساتھ اللہ کا نام لیتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ اکابر صحابہ میں سے جو لوگ اس غزوہ میں شامل نہیں ہو سکے اُن میں سے حضرت عثمان بن عفان کا نام خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ان ایام میں چونکہ ان کی زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیمار تھیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود حکم دیا تھا کہ وہ ان کی تیمارداری کے لیے مدینہ میں ہی ٹھہریں۔ اسی طرح قبیلہ خزرج کے رئیس اعظم سعد بن عبادہ بھی عین وقت پر بیمار ہو جانے کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکے قبیلہ ادس کے رئیس اسید بن الحضیر بھی کسی مجبوری کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے۔ طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید چونکہ ابھی تک خبر رسانی کی مہم سے واپس نہیں آئے تھے اس لیے وہ بھی لڑائی کی عملی شرکت سے محروم رہ گئے باقی اکثر اکابر صحابہ آپ کے ہمراہ تھے۔

مدینہ سے تھوڑی دُور نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈیرہ ڈالنے کا حکم دیا اور فوج کا جائزہ لیا کم عمر بچے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کے شوق میں ساتھ چلے آئے تھے، واپس کئے گئے۔ سعد بن ابی وقاص کے چھوٹے بھائی عمیر بھی کم سن تھے۔ انہوں نے جب بچوں کی واپسی کا حکم سنا تو لشکر میں ادھر ادھر چھپ گئے لیکن آخر ان کی باری آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی واپسی کا حکم دیا۔ یہ حکم سن کر عمیر رونے لگ گئے اور آپ نے اُن کے غیر معمولی شوق کو دیکھ کر انہیں اجازت دے دی۔ اب لشکر اسلامی کی تعداد کچھ اوپر تین سو دس تھی۔ جن میں مہاجرین کچھ اُوپر ساتھ تھے اور باقی سب انصار تھے۔ مگر بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ساری فوج میں صوف ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے اور انہی پر سلمان باری باری سوار ہوتے تھے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی الگ سواری نہیں تھی یعنی آپ کو بھی دوسروں کے ساتھ باری باری سے چڑھنا اور اترنا پڑتا تھا۔ آپ کے ساتھیوں نے بڑے اصرار سے عرض کیا کہ ہم پیدل چلتے ہیں حضور سوار رہیں، مگر آپ نے نہ مانا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میں تم سے چلنے میں کمزور نہیں ہوں اور ثواب کی خواہش بھی مجھے کسی سے کم نہیں پھر میں کیوں نہ باری میں حصہ لوں۔ لشکر میں زرہ پوش صرف پچھ سات تھے اور باقی سامانِ حرب بھی بہت تھوڑا اور ناقص تھا۔ الغرض جائزہ وغیرہ کے کام

سے فارغ ہو کر آپ آگے روانہ ہوئے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ ایک شخص نے جو مشرک تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ کے ساتھ چل کر جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ صحابہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ شخص اپنی بہادری اور شجاعت میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ مگر آپ نے یہ فرما کر اُسے رد کر دیا کہ میں اس موقع پر ایک مشرک سے مدد نہیں لینا چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص پھر آیا، لیکن ادھر سے پھر وہی جواب تھا۔ تیسری دفعہ وہ پھر حاضر ہوا اور اپنی خدمات پیش کیں اور ساتھ ہی عرض کیا کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ہاں اب بڑی خوشی سے ہمارے ساتھ چلو۔

مدینہ سے نکلتے ہوئے آپ نے اپنے پیچھے عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر مقرر کیا تھا۔ مگر جب آپ روضہ کے قریب پہنچے جو مدینہ سے ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے تو غالباً اس خیال سے کہ عبداللہ ایک نابینا آدمی ہیں اور لشکر قریش کی آمد آمد کی خبر کا تقاضا ہے کہ آپ کے پیچھے مدینہ کا انتظام مضبوط رہے آپ نے ابولبابہ بن منذر کو مدینہ کا امیر مقرر کر کے واپس بھجوا دیا اور عبداللہ بن ام مکتوم کے متعلق حکم دیا کہ وہ صرف امام الصلوٰۃ رہیں مگر انتظامی کام ابولبابہ سرانجام دیں۔ مدینہ کی بالائی آبادی یعنی قباہ کے لیے آپ نے عام بن عدی کو الگ امیر مقرر فرمایا۔ اسی مقام سے آپ نے بسیس اور عدی نامی دو صحابیوں کو دشمن کی حرکات و سکنات کا علم حاصل کرنے کے لیے بدر کی طرف روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ وہ بہت جلد خبر لے کر واپس آئیں۔ روضہ سے آگے روانہ ہو کر جب مسلمان داعی صفراء کے ایک پہلو سے گزرتے ہوئے زفران میں پہنچے جو بدر سے صرف ایک منزل در سے ہے تو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قافلہ کی حفاظت کے لیے قریش کا ایک بڑا جزار لشکر متحدہ سے آ رہا ہے۔ اب چونکہ اخطار راز کا موقع گزر چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع کر کے انہیں اس خبر سے اطلاع دی اور پھر اُن سے مشورہ پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ظاہری اسباب کا خیال کرتے ہوئے تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ سے سامنا ہو کیونکہ لشکر کے مقابلہ کے لیے ہم ابھی پوری طرح تیار نہیں ہیں مگر آپ نے اس رائے کو پسند نہ فرمایا۔ دوسری طرف اکابر صحابہ نے یہ مشورہ سنا تو اُٹھ اُٹھ کر جاں نثارانہ تقریریں کیں اور عرض کیا ہمارے جان و مال سب خدا کے ہیں۔ ہم ہر میدان میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں اچانچہ مقتادہ بن اسود نے جن کا دوسرا نام مقتادہ بن عمرو بھی تھا کہا: یا رسول اللہ! ہم موسیٰ کے اصحاب کی طرح نہیں ہیں کہ آپ کو یہ جواب دیں کہ جاتو اور تیرا خدا جاکر لڑو ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ جہاں بھی چاہتے ہیں جلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم آپ کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے ہو کر لڑیں گے۔ آپ نے یہ تقریر سنی تو آپ کا چہرہ مبارک خوشی سے تھمنا لگ گیا۔ مگر اس موقع پر بھی آپ انصار کے جواب کے منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بھی کچھ بولیں۔ کیونکہ آپ کو یہ خیال تھا کہ شاید انصار یہ سمجھتے ہوں کہ بیعت عقبہ کے

ہاتھ ہمارا فرض صرف اس قدر ہے کہ اگر عین مدینہ پر کوئی حملہ ہو تو اس کا دفاع کریں؛ چنانچہ باوجود اس قسم کی  
جہاں شارانہ تقریروں کے آپ بھی فرماتے گئے کہ اچھا پھر مجھے مشورہ دو کہ کیا جاوے۔ سعد بن معاذ رئیس اس  
نے آپ کا منشاء سمجھا اور انصار کی طرف سے عرض کیا: "یا رسول اللہ! شاید آپ ہماری رائے پوچھتے ہیں۔ خدا کی  
قسم جب ہم آپ کو سچا سمجھ کر آپ پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے  
تو پھر اب آپ جہاں چاہیں جلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث  
کیا ہے۔ اگر آپ ہمیں سمندر میں کود جانے کو کہیں تو ہم کو دو جائیں گے اور ہم میں سے ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے  
گا اور آپ انشاء اللہ ہم کو لڑائی میں صابر پائیں گے اور ہم سے وہ بات دیکھیں گے جو آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے  
گی" آپ نے یہ تقریر سنی تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "سَيُرْفَاؤُنَا بِشِدَّةٍ فَإِنَّ اللَّهَ قَدْ وَعَدَنِي الظَّالِمَاتَيْنِ  
وَاللَّهُ لَكَاثِبٌ أَنْظُرَا إِلَى مَتَابَعِ الْقَوْمِ"۔ یعنی تو پھر اللہ کا نام لیکر آگے بڑھو اور خوش ہو کیونکہ اللہ نے مجھ سے  
وعدہ فرمایا ہے کہ کفار کے ان دو گروہوں (یعنی لشکر اور قافلہ) میں سے کسی ایک گروہ پر وہ ہم کو ضرور غلبہ دے گا۔  
اور خدا کی قسم میں گویا اس وقت وہ جگہیں دیکھ رہا ہوں جہاں دشمن کے آدمی قتل ہو کر گریں گے" آپ کے یہ الفاظ  
شکر صحابہ خوش ہوئے مگر ساتھ ہی انہوں نے حیران ہو کر عرض کیا: "هَلَّا كَثُرَتْ لَنَا الْقِتَالُ فَلَنَسْتَعِذَّ"۔ یعنی  
"یا رسول اللہ! اگر آپ کو پہلے سے لشکر قریش کی اطلاع تھی تو آپ نے ہم سے مدینہ میں ہی جنگ کے احوال  
کا ذکر کیوں نہ فرمایا کہ ہم کچھ تیاری تو کر کے نکلتے" مگر باوجود اس خبر اور اس مشورہ کے اور باوجود آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کی طرف سے اس خدائی بشارت کے کہ ان دو گروہوں میں سے کسی ایک پر مسلمانوں کو ضرور فتح حاصل  
ہوگی ابھی تک مسلمانوں کو معین طود پر یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ ان کا مقابلہ کس گروہ سے ہو گا اور وہ ان دونوں  
گروہوں میں سے کسی ایک گروہ کے ساتھ ٹھہر بیٹھ ہو جانے کا امکان سمجھتے تھے اور وہ طبعاً کمزور گروہ یعنی  
قافلہ کے مقابلہ کے زیادہ خواہشمند تھے۔

اس مشورہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ بدر کی طرف بڑھنے شروع ہوئے اور جب  
آپ بدر کے قریب پہنچے تو کسی خیال کے ماتحت جس کا ذکر روایات میں نہیں ہے آپ حضرت ابوبکر صدیق کو  
اپنے پیچھے سوار کر کے اسلامی لشکر سے کچھ آگے نکل گئے اس وقت آپ کو ایک بوڑھا بدوی ملا جس سے آپ کو  
باتوں باتوں میں یہ معلوم ہوا کہ اس وقت قریش کا لشکر بدر کے بالکل پاس پہنچا ہوا ہے۔ آپ یہ خبر سن کر واپس  
تشریف لے آئے اور حضرت علی اور زبیر بن العوام اور سعد بن وقاص وغیرہ کو دریافت حالات کے لیے آگے  
ردانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ بدر کی وادی میں گئے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مکہ کے چند لوگ ایک چشمہ سے پانی  
بھر رہے ہیں۔ ان صحابیوں نے اس جماعت پر حملہ کر کے ان میں سے ایک حبشی غلام کو پکڑ لیا اور اُسے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اس وقت آپ نماز میں مصروف تھے۔ صحابہ نے یہ دیکھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز میں مصروف ہیں، خود اس غلام سے پوچھنا شروع کیا کہ ابوسفیان کا قافلہ کہاں ہے؟ یہ جشی غلام چونکہ شکر کے ہمراہ آیا تھا اور قافلہ سے بے خبر تھا اس نے جواب میں کہا کہ ابوسفیان کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ابو الجہل یعنی ابو جہل اور عتبہ اور شیبہ اور امیہ وغیرہ اس دھوئیں کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں صحابہ نے جن کا میلان قافلہ کی طرف زیادہ تھا سمجھا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے اور دیدہ دانستہ قافلہ کی خبر کو چھپانا چاہتا ہے جس پر بعض لوگوں نے اُسے کچھ زد و کوب کیا، لیکن جب وہ اُسے مارتے تھے تو وہ ڈر کے مارے کہہ دیتا تھا کہ اچھا میں بتاتا ہوں اور جب اُسے پھوڑ دیتے تھے تو پھر وہی پہلا جواب دیتا تھا کہ مجھے ابوسفیان کا تو کوئی علم نہیں ہے، البتہ ابو جہل وغیرہ یہ پاس ہی موجود ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں یہ باتیں سنیں تو آپ نے جلدی سے نماز سے فارغ ہو کر صحابہ کو مارنے سے روکا اور فرمایا: جب وہ سچی بات بتاتا ہے تو تم اسے مارتے ہو اور جھوٹ کہنے لگتا ہے تو پھوڑ دیتے ہو۔ پھر آپ نے خود نرمی کے ساتھ اس سے دریافت فرمایا کہ شکر اس وقت کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ اس سامنے والے ٹیلے کے پیچھے ہے آپ نے پوچھا کہ شکر میں کتنے آدمی ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت ہیں مگر پوری پوری تعداد مجھے معلوم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ان کے لیے ہر روز کتنے اُونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ دس ہوتے ہیں۔ آپ نے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ایک ہزار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور حقیقت وہ اتنے ہی تھے۔ پھر آپ نے اس غلام سے پوچھا کہ رؤس قریش میں سے کون کون لوگ ہیں۔ اُس نے کہا۔ عتبہ، شیبہ، ابو جہل، ابوالخضر، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن حزام، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، ہبیل بن عمرو، نوفل بن خویلد، طعیمہ بن عدی، زعمہ بن اسود وغیرہ سب ساتھ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا، هَذَا مَلَكٌ قَدْ آتَاكَ اَيْنِكَمْ اَفَلَا ذَكَبْتَهَا۔ یعنی: لو کہ نے تمہارے سامنے اپنے جگر گوشے نکال کر ڈال دیئے ہیں۔ یہ نہایت دانشندانہ اور حکیمانہ الفاظ تھے جو آپ کی زبان مبارک سے بے ساختہ طور پر نکلے۔ کیونکہ بجائے اس کے کہ قریش کے اتنے نامور رؤس کا ذکر آنے سے کمزور طبیعت مسلمان بے دل ہوتے ان الفاظ نے ان کی قوت متحکمہ کو اس طرف مائل کر دیا کہ گویا ان سرداران قریش کو تو خدا نے مسلمانوں کا شکار بننے کے لیے بھیجا ہے۔

جس جگہ اسلامی لشکر نے ڈیرہ ڈالا تھا وہ کوئی ایسی اچھی جگہ نہ تھی۔ اس پر حباب بن منذر نے آپ سے دریافت کیا کہ آیا خدائی الہام کے ماتحت آپ نے یہ جگہ پسند کی ہے یا بعض فوجی مدبیر کے طور پر اسے اختیار کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس بارہ میں کوئی خدائی حکم نہیں ہے، تم کوئی مشوہ دینا چاہتے ہو تو

۱۔ ابن ہشام ۲۔ ابھی تک قافلہ کا خیال دل سے نہیں نکلا تھا اور اسی کی خواہش غالب تھی۔  
۳۔ طبری صفحہ ۱۲۸۹ ۴۔ مسلم و ابوداؤد ۵۔ ابن ہشام و طبری ۶۔



بات؟ حباب نے عرض کیا۔ تو پھر میرے خیال میں یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر قریش سے قریب ترین چشمہ پر قبضہ کر لیا جادے۔ میں اس چشمہ کو جانتا ہوں۔ اس کا پانی اچھا ہے اور ٹھوٹا ہوتا بھی کافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور چونکہ ابھی تک قریش ٹیلہ کے پڑے ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور یہ چشمہ خالی تھا، مسلمان آگے بڑھ کر اس چشمہ پر قابض ہو گئے لیکن جیسا کہ قرآن شریف میں اشارہ پایا جاتا ہے اس وقت اس چشمہ میں بھی پانی زیادہ نہیں تھا اور مسلمانوں کو پانی کی قلت محسوس ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ داوی کے جس طرف مسلمان تھے وہ ایسی اچھی نہ تھی کیونکہ اس طرف ریت بہت تھی جس کی وجہ سے پاؤں اچھی طرح جستے نہیں تھے۔

جگہ کے انتخاب کے بعد سعد بن معاذ رئیس ادس کی تجویز سے صحابہ نے میدان کے ایک حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ایک سائبان تیار کر دیا اور سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سائبان کے پاس باندھ کر عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! آپ اس سائبان میں تشریف رکھیں اور ہم اللہ کا نام لے کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اگر خدا نے ہمیں فتح دی تو یہی ہماری آرزو ہے، لیکن اگر خدا نخواستہ معاملہ دگرگوں ہوا تو آپ اپنی سواری پر سوار ہو کر جس طرح بھی ہو مدینہ پہنچ جائیں۔ وہاں ہمارے ایسے بھائی بند موجود ہیں جو محبت و اخلاص میں ہم سے کم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ ان کو یہ خیال نہیں تھا کہ اس مہم میں جنگ پیش آجائیگی اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آئے ورنہ ہرگز پیچھے نہ رہتے لیکن جب انہیں حالات کا علم ہوگا، تو وہ آپ کی حفاظت میں جان تک لڑا دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔“ لیجئے سعد کا جوش اخلاص تھا جو ہر حالت میں قابلِ تعریف ہے؛ ورنہ بھلا خدا کا رسول اور میدان سے بھاگے، چنانچہ حنین کے میدان میں بارہ ہزار فوج نے پیٹھ دکھائی، مگر یہ مرکز توجید اپنی جگہ سے متزلزل نہیں ہوا۔ بہر حال سائبان تیار کیا گیا اور تعداد بعض دوسرے انصار اس کے گرد پہرہ دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر نے اسی سائبان میں رات بسر کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات بھر خدا کے حضور گریہ و زاری سے دعائیں کیں اور لکھا ہے کہ سارے لشکر میں صرف آپ ہی تھے جو رات بھر جاگے۔ باقی سب لوگ باری باری اپنی نیند سولے۔ اور چونکہ نیند کا آنا بھی ایک اطمینان کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا قرآن شریف میں ذکر کیا ہے۔ پھر خدا کا مزید فضل یہ ہوا کہ کچھ بارش بھی ہو گئی جس سے مسلمانوں کو یہ موقع مل گیا کہ حوض بنانا کر پانی جمع کر لیں۔ اور یہ بھی فائدہ ہو گیا کہ ریت جم گئی اور پاؤں زمین میں دھسنے سے رک گئے۔ دوسری طرف قریش والی جگہ میں کچھڑکی سی صورت ہو گئی اور اس طرف کا پانی بھی کچھ گدلا ہو کر میللا ہو گیا۔ اس واقعہ کا بھی قرآن شریف نے ذکر کیا ہے۔

اب رمضان ۳۳ کی شہرہ تاریخ اور جمعہ کا دن تھا۔ اور عیسوی حساب سے ۶۳۰ء مارچ ۳۳ء تک صحیح



اُنھ کو سب سے پہلے نماز ادا کی گئی اور پرستار ان احدیت کھلے میدان میں خدا نے واحد کے حضور سر بسجود ہوئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد پر ایک خطبہ فرمایا اور پھر جب ذرا روشنی ہوئی تو آپ نے ایک تیر کے اشارہ سے مسلمانوں کی صفوں کو درست کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی سواد نامی صف سے کچھ آگے نکلا کھڑا تھا آپ نے اُسے تیر کے اشارہ سے پیچھے ہٹنے کو کہا مگر اتفاق سے آپ کے تیر کی لکڑی اُس کے سینہ پر جا لگی۔ اُس نے جرات کے انداز سے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو خدا نے حق و انصاف کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ مگر آپ نے مجھے ناحق تیر مارا ہے واللہ میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ صحابہ انگشت بندھاں تھے کہ سواد کو کیا ہو گیا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت شفقت فرمایا کہ اچھا سواد تم بھی مجھے تیر مار لو۔ اور آپ نے اپنے سینہ سے کپڑا اٹھا دیا۔ سواد نے فرط محبت سے آگے بڑھ کر آپ کا سینہ چوم لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”سواد یہ تمہیں کیا سوجھی؟“ اُس نے رقت بھری آواز میں عرض کیا: یا رسول اللہ! دشمن سامنے ہے کچھ خبر نہیں کہ یہاں سے بچ کر جانا مناسب یا نہیں۔ میں لے جاؤں کہ شہادت سے پہلے آپ کے جسم مبارک سے اپنا جسم چھو جاؤں۔ غالباً اسی وقت کے قریب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حذیفہ بن یمان اور ابو جہل حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ہم ابھی ابھی مکہ سے آرہے ہیں۔ جب ہم وہاں سے نکلے تھے تو قریش نے ہم کو روک دیا تھا اور پھر یہ عہد لیکر چھوڑا تھا کہ ہم آپ کے ساتھ ہو کر ان کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ گو یہ عہد قابلِ ایفاء نہیں تھا کیونکہ جبراً لیا گیا تھا مگر آپ نے فرمایا: ”تو پھر تم جاؤ اور اپنے عہد کو پورا کرو۔ ہم اللہ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور اُسی کی نصرت پر ہمارا بھروسہ ہے۔“ ابھی آپ صفوں کی درستی میں ہی مصروف تھے کہ قریش کے لشکر میں حرکت پیدا ہوئی اور لشکر کفار میدانِ قتال کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ یہ وہ موقع تھا جبکہ کفار کو مسلمان اصلی تعداد سے کم نظر آتے تھے۔ اس لیے وہ جرات کے ساتھ بڑھتے آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دُور سے دیکھا تو فرمایا: ”اے میرے مولا! یہ لوگ تبخر و غرور سے بھرے ہوئے تیرے دین کے ملانے کے لیے آئے ہیں تو اپنے وعدہ کے مطابق اپنے دین کی نصرت فرما۔“ اسی اشارہ میں قریش کے چند آدمی مسلمانوں کے چہرہ کی طرف بڑھے۔ صحابہ نے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور حکم دیا کہ ان کو پانی پی لینے دیا جائے، اچھا پتھر انہوں نے امن کے ساتھ پانی پیا اور اپنے لشکر کو واپس لوٹ گئے۔ دشمن کے ساتھ اس عدل و احسان کا معاملہ کرنا عرب کے ضابطہ اخلاق میں مفقود تھا اور یہ اسلام کی ایک خصوصیت ہے کہ اس نے خود حفاظتی قواعد کی رعایت رکھتے ہوئے دشمن سے بھی نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب فوجیں بالکل ایک دوسرے کے سامنے تھیں۔ مگر قدتِ الہی کا عجیب تماشا ہے کہ اس وقت لشکروں کے کھڑے ہونے کی ترتیب ایسی تھی کہ اسلامی لشکر قریش کو اصلی تعداد سے زیادہ بلکہ دو گنا نظر آتا تھا۔ جس کی

۱۔ ابن ہشام ۲۔ مسلم کتاب الجہاد باب الوفا بالعہد ۳۔ النفال: ۴۵۔

۴۔ ابن ہشام و طبری ۵۔ طبری و ابن ہشام ۶۔ سورۃ النحل: ۱۳۰۔

وجہ سے کفار مرعوب ہوئے جاتے تھے اور دوسری طرف قریش کا لشکر مسلمانوں کو ان کی اصلی تعداد سے کم نظر آتا تھا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دل بڑھے ہوئے تھے۔ قریش کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اسلامی لشکر کی تعداد کا صحیح اندازہ پتہ لگ جائے تاکہ وہ چھوٹے ہوئے دلوں کو سہارا دے سکیں۔ اس کے لیے ردسار قریش نے عیمر بن وہب کو بھیجا کہ اسلامی لشکر کے چاروں طرف گھوڑا دوڑا کر دیکھے کہ اس کی تعداد کتنی ہے اور آیا ان کے پیچھے کوئی کمک تو مخفی نہیں؟ چنانچہ عیمر نے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کا ایک چکر کاٹا، مگر اسے مسلمانوں کی شکل و صورت سے ایسا جلال اور عزم اور عسکت ایسی بے پردائی نظر آئی کہ وہ سخت مرعوب ہو کر لوٹا اور قریش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا مَا رَأَيْتُ شَيْئًا وَلَكِنِّي قَدْ رَأَيْتُ يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْشِ أَلْبَلَايَا تَحْمِلُ الْمُتَنَائِيَا نَوَاصِيحُ يَثُوبُ تَحْمِلُ الْمَوْتَ الْقَاطِعُ یعنی مجھے کوئی مخفی کمک وغیرہ تو نظر نہیں آئی، لیکن اے معشر قریش! میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے لشکر میں گویا اونٹنیوں کے کجادوں نے اپنے اوپر آدمیوں کو نہیں بلکہ موتوں کو اٹھایا ہوا ہے اور یہ شرب کی سانڈنیوں پر گویا ہلاتیں سوار ہیں؟ قریش نے جب یہ بات سنی تو ان میں ایک بے یقینی سی پیدا ہو گئی۔ سراقہ جو ان کا صامن بنکر آیا تھا کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ اُسے پاؤں بھاگ گیا۔ اور جب لوگوں نے اُسے روکا تو کہنے لگا۔ اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ یعنی مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تم نہیں دیکھتے؟ حکیم بن حزام نے عیمر کی رائے سنی تو گھبرایا ہوا عقبہ بن ربیعہ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ اے عقبہ! تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آخر عمر و حضری کا بدلہ ہی چاہتے ہو کہ وہ تمہارا حلیف تھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس کی طرف سے خون بہا ادا کرو اور قریش کو نیکر واپس لوٹ جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے تمہاری نیک نامی رہے گی؟ عقبہ کو جو خود گھبرایا ہوا تھا اور کیا چاہیے تھا جھٹ بولا "ہاں ہاں میں راضی ہوں اور پھر حکیم! دیکھو تو یہ مسلمان اور ہم آخر آپس میں رشتہ دار ہی تو ہیں۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ بھائی بھائی پر تلوار اٹھائے اور باپ بیٹے پر۔ تم ایسا کرو کہ ابھی ابوالحکم (یعنی ابو جہل) کے پاس جاؤ اور اس کے سامنے یہ تجویز پیش کر دو اور ادھر عقبہ نے خود اونٹ پر سوار ہو کر اپنی طرف سے لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ "رشتہ داروں میں لڑائی ٹھیک نہیں ہے۔ یہیں واپس لوٹ جانا چاہیے اور محمد کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ دوسرے قبائل عرب کے ساتھ پٹنار ہے۔ جو نتیجہ ہو گا دیکھا جائے گا۔ اور پھر تم دیکھو کہ ان مسلمانوں کے ساتھ لوٹنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ خواہ تم مجھے بزدل کہو، حالانکہ میں بزدل نہیں ہوں اِنِّیْ اَرٰی قَوْمًا مُّشْتَمِلِیْنَ بَعْجَ یعنی مجھے تو یہ لوگ موت کے فریار نظر آتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور سے عقبہ کو دیکھا تو فرمایا "اگر لشکر کفار میں سے کسی میں شرافت ہے تو اس سرخ اونٹ کے سوار میں ضرور ہے۔ اگر یہ لوگ اس کی بات مان لیں تو ان کے لیے اچھا ہو، لیکن جب حکیم بن حزام ابو جہل کے پاس آیا اور اُس سے یہ تجویز

۱۔ سورۃ انفال: ۴۵ ۲۔ طبری و ابن سعد و ابن ہشام کے سورۃ انفال: ۴۹

۳۔ یہ ایک پردہ رکھنے کی بات تھی ورنہ دل میں ردسار قریش خوب جانتے تھے کہ عمرو کے قتل کا تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ اصلی جہلن اسلام کے ناک کی ہے۔ ۴۔ ابن ہشام و طبری

بیان کی تو وہ فرعونِ امت بھلا ایسی باتوں میں کب آنے والا تھا چھٹے ہی بولا: "اچھا اچھا اب عقبہ کو اپنے سامنے اپنے رشتہ دار نظر آنے لگے ہیں" اور پھر اس نے عمرو حضرت کے بھائی عامر حضرت کو بلا کر کہا: "تم نے سنا تمہارا حلیف عقبہ کیا کہتا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ تمہارے بھائی کا بدلہ گویا ہاتھ میں آیا ہوا ہے" عامر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور اُس نے عرب کے قدیم دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑ کر اور ننگا ہو کر چلنا شروع کیا: "واعمرہ واعمرہ" ہائے افسوس! میرا بھائی بغیر انتقام کے رہا جاتا ہے۔ ہائے افسوس! میرا بھائی بغیر انتقام کے رہا جاتا ہے!! اس صحرائی آواز نے لشکرِ قریش کے سینوں میں عداوت کے شعلے بلند کر دیئے اور جنگ کی بھٹی اپنے پورے زور سے دہکنے لگ گئی۔ ابو جہل کے طعن نے عقبہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس غصہ میں بھرا ہوا وہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے لڑکے ولید کو ساتھ لیکر لشکرِ کفار سے آگے بڑھا اور عرب کے قدیم دستور کے مطابق انفرادی لڑائی کے لیے مبارز طلبی کی۔ چند انصار ان کے مقابلہ کیلئے آگے بڑھنے لگے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روک دیا اور فرمایا: "حمزہ اٹھو۔ علی تم اٹھو۔ عبیدہ تم اٹھو" یہ تینوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے اور آپ چاہتے تھے کہ خطرہ کی جگہ پر سب سے پہلے آپ کے عزیز واقارب آگے بڑھیں۔ دوسری طرف عقبہ وغیرہ نے بھی انصار کو دیکھ کر آواز دی کہ: "ان لوگوں کو ہم کیا جانتے ہیں۔ ہماری نگر کے ہمارے سامنے آئیں" چنانچہ حمزہ اور علی اور عبیدہ آگے بڑھے۔ عرب کے دستور کے مطابق پہلے روشناسی ہوئی۔ پھر عبیدہ بن مطلب ولید کے مقابل ہو گئے اور حمزہ عقبہ کے اور علی شیبہ کے لے حمزہ اور علی نے تو ایک دو داروں میں ہی اپنے حریفوں کو خاک میں ملا دیا، لیکن عبیدہ اور ولید میں دو چار اچھی ضربیں ہوئیں۔ اور بالآخر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کاری زخم کھا کر گرے۔ جس پر حمزہ اور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر ولید کا تو خاتمہ کر دیا اور عبیدہ کو اٹھا کر اپنے کیمپ میں لے آئے مگر عبیدہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور بدر سے واپسی پر راستہ میں انتقال کیا۔

ان انفرادی مقابلوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پھر اپنے ساتہان میں تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ جب تک میں حکم نہ دوں عام دھادانہ کیا جائے اور فرمایا کہ: "اگر کفار فوری حملہ کر کے آئیں تو پہلے تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، لیکن دیکھو تیر ذرا احتیاط سے چلانا۔ ایسا نہ ہو کہ یونہی بے فائدہ طور پر اپنے ترکش خالی کر دو اور تلوار صرف اس وقت نکالو کہ جب دونوں لشکر آپس میں مل جائیں" غالباً اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر یہ بھی فرمایا کہ لشکرِ کفار میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے دل کی خوشی سے اس مہم میں شامل نہیں ہوئے بلکہ ردِ سارِ قریش کے دباؤ کی وجہ سے شامل ہو گئے ہیں؛ ورنہ وہ دل میں ہمارے مخالفت نہیں۔ اسی طرح بعض ایسے لوگ بھی اس لشکر میں شامل ہیں جنہوں نے مکہ میں ہماری معیشت کے وقت میں ہم سے شرفیادہ سلوک کیا تھا اور ہمارا فرض ہے کہ ان کے احسان کا بدلہ آئیں۔ پس اگر کسی ایسے شخص پر کوئی مسلمان

غلبہ پائے تو اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے۔ اور آپؐ نے خصوصیت کے ساتھ قسم اول میں عباس بن عبد المطلب اور قسم ثانی میں ابوالہجری کا نام لیا اور ان کے قتل سے منع فرمایا۔ مگر حالات نے کچھ ایسی ناگزیر صورت اختیار کی کہ ابوالہجری قتل سے بچ نہ سکا گو اسے مرنے سے قبل اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپؐ سائبان میں جا کر پھر دعائیں مشغول ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے اور سائبان کے ارد گرد انصار کی ایک جماعت سعد بن معاذ کی زیرِ کمان پہرہ پرستین تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میدان میں سے ایک شور بلند ہوا اور معلوم ہوا کہ قریش کے لشکر نے عام حملہ کر دیا ہے۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رقت کی حالت میں خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے دعائیں کر رہے تھے اور نہایت اضطراب کی حالت میں فرماتے تھے کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَشْکُکَ عَفْوَکَ وَوَعْدَکَ اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهَلِّکْ هَذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُقْبَلْ فِی الْاَضْحٰی "اے میرے خدا اپنے وعدوں کو پورا کر۔ اے میرے مالک! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت آج اس میدان میں ہلاک ہو گئی تو دُنیا میں کچھ بچنے والا کوئی نہیں رہے گا۔" اور اس وقت آپؐ اس قدر کرب کی حالت میں تھے کہ کبھی آپؐ سجدہ میں گر جاتے تھے اور کبھی کھڑے ہو کر خدا کو پکارتے تھے اور آپؐ کی چادر آپؐ کے کندھوں سے گر کر پڑتی تھی اور حضرت ابوبکرؓ اٹھا اٹھا کر آپؐ پر ڈال دیتے تھے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے لڑتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آتا تھا تو میں آپؐ کے سائبان کی طرف بھاگا جاتا تھا، لیکن جب بھی میں گیا میں نے آپؐ کو سجدہ میں گر کر گراتے ہوئے پایا۔ اور میں نے سنا کہ آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ یَا خَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا خَیُّ یَا قَیُّوْمُ "یعنی" اے میرے زندہ خدا! اے میرے زندگی بخش آقا! حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اس حالت کو دیکھ کر بے چین ہوتے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی بے ساختہ عرض کرتے تھے "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر خدا ہوں۔ آپؐ گھبرائیں نہیں۔ اللہ اپنے وعدے ضرور پورے کرے گا۔" مگر اس سچے مقولہ کے مطابق کہ ہر کہ عارف تراست ترساں ترے آپؐ برابر دُعا اور گریہ و زاری میں مصروف رہے۔

دوسری طرف جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھر گئیں تو ابوجہل رئیس قریش نے بھی یوں دُعا کی کہ اے خدا! وہ فریق جس نے رشتہوں کو توڑ رکھا ہے اور دین میں ایک بدعت پیدا کی ہے تو آج اسے اس میدان میں تباہ و برباد کر دے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر یا اس سے قبل ابوجہل نے یہ دُعا کی تھی کہ "اے ہمارے رب اگر محمدؐ کا لایا ہوا دین سچا ہے تو آسمان سے ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا کسی اور دردناک عذاب سے ہمیں تباہ و برباد کر دے۔"

۱۔ طبری : ۲۔ بخاری مسلم : ۳۔ مسلم و ترمذی : ۴۔ نسائی وابن سعد : ۵۔ مسلم :  
 ۶۔ ابن ہشام : ۷۔ بخاری تفسیر سورۃ انفال : ۸۔ ابوجہل کی یہ دعائیں بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس  
 ہم میں دوسرا قریش کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا تھا اور عمر و حضرمی کے قتل کا انتقام وغیرہ ایک محض بہانہ اور  
 عامۃ الکفار کو جوش دلانے کا آلہ تھا۔



اب میدان کارزار میں کشت و خون کا میدان گرم تھا۔ مسلمانوں کے سامنے ان سے سہ چند جماعت تھی جو ہر قسم کے سامان حرب سے آراستہ ہو کر اس عزم کے ساتھ میدان میں نکلی تھی کہ اسلام کا نام و نشان مٹا دیا جاوے۔ اور مسلمان بیچارے تعداد میں تھوڑے۔ سامان میں تھوڑے۔ غربت اور بے وطنی کے صدمات کے مارے ہوئے طاہری اسباب کے لحاظ سے اہل مکہ کے سامنے چند منٹوں کا شکار تھے۔ مگر توحید اور رسالت کی محبت نے انہیں متوالا بنا رکھا تھا اور اس چیز نے جس سے زیادہ طاقتور دنیا میں کوئی چیز نہیں یعنی زندہ ایمان نے ان کے اندر ایک فوق العادت طاقت بھر دی تھی۔ وہ اس وقت میدان جنگ میں خدمتِ دین کا وہ نمونہ دکھا رہے تھے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہر اک شخص دوسرے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا اور خدا کی راہ میں جان دینے کے لیے بے قرار نظر آتا تھا۔ حمزہ اور علی اور زبیر نے دشمن کی صفوں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں۔ انصار کے جوشِ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ عبدالرحمن بن عوف روایت کرتے ہیں کہ جب نام جنگ شروع ہوتی تو میں نے اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی مگر کیا دیکھتا ہوں کہ انصار کے دونوں جوان لڑنے کے لیے پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل کچھ بیٹھسا گیا کیونکہ ایسے جنگوں میں دائیں بائیں کے ساتھیوں پر لڑائی کا بہت انحصار ہوتا تھا۔ اور وہی شخص اچھی طرح لڑ سکتا ہے جس کے پہلو محفوظ ہوں مگر عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں اس خیال میں ہی تھا کہ ان لڑکوں میں سے ایک نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا کہ گویا وہ دوسرے سے اپنی یہ بات مخفی رکھنا چاہتا ہے کہ چچا وہ ابو جہل کہاں ہے جو مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈکھ دیا کرتا تھا میں نے خدا سے عہد کیا ہوا ہے کہ میں نے قتل کروں گا یا قتل کرنے کی کوشش میں مارا جاؤں گا۔ میں نے ابھی اس کا جواب نہ دیا تھا کہ دوسری طرف سے دوسرے نے بھی اسی طرح آہستہ سے یہی سوال کیا۔ میں ان کی یہ جرأت دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ کیونکہ ابو جہل گویا سردارِ لشکر تھا اور اُس کے چاروں طرف آزمودہ کار سپاہی جمع تھے۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ وہ ابو جہل ہے۔ عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میرا اشارہ کرنا تھا کہ وہ دونوں پکتے باز کی طرح بھٹے اور دشمن کی صفیں کاٹتے ہوئے ایک آن کی آن میں وہاں پہنچ گئے اور اس تیزی سے دار کیا کہ ابو جہل اور اس کے ساتھی دیکھتے دیکھتے رہ گئے اور ابو جہل خاک پر تھا۔ عکرمہ بن ابو جہل بھی اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے باپ کو تو پہچان سکا مگر اُس نے پیچھے سے معاذ پر ایسا وار کیا کہ اُن کا بایاں بازو کٹ کر لٹکنے لگ گیا۔ معاذ نے عکرمہ کا پیچھا کیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ چونکہ کنا ہوا بازو لڑنے میں مزاحم ہوتا تھا۔ معاذ نے اُسے زور کے ساتھ کھینچ کر اپنے جسم سے الگ کر دیا اور پھر لڑنے لگ گئے۔ یہ غرض کیا مہاجر اور کیا انصار سب مسلمان پورے زور و شور اور اخلاص کے ساتھ لڑے مگر دشمن کی کثرت اور اس کے سامان کی زیادتی کچھ پیش نہ جانے دیتی تھی اور نتیجہ ایک عرصہ تک مشتبہ رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر دُعا دہتے ہیں مصروف تھے اور آپ کا اضطراب لمحہ لمحہ بڑھتا جاتا تھا مگر آخر ایک کافی لمبے عرصہ کے بعد آپ



سمجھ سے اٹھے اور خدائی بشارت سُبْحَرُ الْجَنَّةِ دُیُوتُونَ الذُّبُرُ کہتے ہوئے سابقان سے باہر نکل آئے۔  
 باہر آکر آپؐ نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو کشت و خون کا میدان گرم پایا۔ اُس وقت آپؐ نے ریت اور نکل  
 کی ایک ٹٹھی اٹھائی اور اُسے کفار کی طرف پھینکا۔ اور جوش کے ساتھ فرمایا: شَاحَتِ الْوُجُوہُ وِشْمُونِ کے منہ  
 بگڑ جائیں گے اور ساتھ ہی آپؐ نے مسلمانوں سے پکار کر فرمایا: یکدم حملہ کرو۔ مسلمانوں کے کانوں میں اپنے محبوب آقا  
 کی آواز پہنچی اور انھوں نے تکبیر کا نعرہ لگا کر یکدم حملہ کر دیا۔ دوسری طرف ادھر آپؐ کا ٹٹھی بھر کر ریت پھینکنا تھا کہ ایسی  
 آندھی کا جھونکا آیا کہ کفار کی آنکھیں اور منہ اور ناک ریت اور نکل سے بھر نے شروع ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ  
 خدائی فرشتوں کی فوج ہے جو ہماری نصرت کو آتی ہے اور روایتوں میں مذکور ہے کہ اس وقت بعض لوگوں کو یہ  
 فرشتے نظر بھی آئے۔ بہر حال عقبہ، شیبہ اور ابو جہل جیسے رؤساء قریش تو خاک میں مل ہی چکے تھے۔ مسلمانوں کے اس  
 فوری دھاوے اور آندھی کے اچانک جھونکے کے نتیجے میں قریش کے پاؤں اکھرنے شروع ہو گئے اور جلد ہی کفار  
 کے لشکر میں بھاگم پڑ گئی اور تھوڑی دیر میں میدان صاف تھا۔ مسلمانوں نے ستر قیدی پکڑے اور جب لڑائی کے  
 بعد مقتولین کی دیکھ بھال کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہی تعداد قریش کے مقتولین کی تھی اور جب مقتولین کی شناخت ہوئی تو قرآنی آیت  
 دَلْفُلَعٌ دَايِرَ الْكَافِرِيْنَ کی ہیئت ناک تفسیر آنکھوں کے سامنے تھی۔ یعنی تمام بڑے بڑے رؤساء قریش خاک میں  
 ملے پڑے تھے اور جو ایک دوسرے پہنچے تھے وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قیدی تھے؛ البتہ شروع شروع میں ابو جہل کی  
 لاش نظر نہ آتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی جاگرا چلچ دیکھے کہ ابو جہل کا کیا حال ہے۔ عبداللہ بن مسعود  
 گئے اور دیکھ بھال کے بعد اُسے ایک جگہ جان توڑتے ہوئے پایا۔ جبکہ وہ قریباً ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے  
 اُس سے پوچھا کیا تو ہی ابو جہل ہے؟ اُس نے کہا: هَذُوْنِ رُحْبٍ قَتَلْتُمُوْہُ۔ کیا تم نے مجھ سے بھی کوئی بڑا  
 شخص قتل کیا ہے؟ یعنی میں سب سے بڑا آدمی ہوں جو تم نے مارا ہے؟ پھر کہنے لگا: لَوْ غَيْرَ اَکَاہُ قَتَلْتُمْ شَہ کاش میں  
 کسی کسان کے ہاتھ قتل نہ ہوتا۔ پھر اس نے پوچھا کہ میدان کس کے ہاتھ میں رہا ہے؟ عبداللہ نے جواب دیا۔  
 خدا اور اس کے رسول کے ہاتھ۔ اس کے بعد ابو جہل بالکل بے حس و حرکت ہو گیا اور جان دیدی۔ اور عبداللہ بن مسعود  
 نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے قتل کی اطلاع دی۔ امیہ بن خلف جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی لشکر کفار منور پیا ہوگا اور بیٹھ دکھائے گا: یہ مسترآن کریم سورۃ قمر کی آیت: ۴۶ ہے جو کہ مجھ  
 میں ہجرت سے پہلے بطور پیشگوئی کے نازل ہوئی تھی اور اب خدا نے اسے آپؐ کی زبان پر دوبارہ جاری کر کے بتایا  
 کہ کفار کلمہ کے لیے اب وہی موعود ساعت آگئی۔ ۱۔ قرآن کریم سورۃ انفال: ۸۱ طبری و زرقانی: ۲۔ طبری: ۲  
 ۳۔ زرقانی: ۲۔ یعنی خدا نے یہ لڑائی اس لیے کرائی تھی کہ کفار کی جڑ کاٹ دی جاوے۔ ۴۔ بخاری: ۲  
 ۵۔ یہ اس نے اس لیے کہا کہ اہل کلمہ چونکہ زراعت کو بُرا سمجھتے تھے اس لیے بعض اوقات مدینہ کے لوگوں کو تحقیر کے  
 بہر میں کسان کہا کرتے تھے۔ ۶۔ زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۲۸ بحوالہ ابن عقبہ: ۲

کی پیشگوئی کی وجہ سے مکہ سے نہیں نکلتا تھا، مگر جس کا دل عداوتِ اسلام اور بغضِ رسولؐ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا انجام یوں ہوا کہ جس وقت لشکرِ قریش لپکا ہوا۔ اُس نے اپنے جاہلیت کے دوست عبدالرحمن بن عوف کے پاس پناہ ڈھونڈی جن کا اس کے ساتھ یہ معاہدہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے، لیکن جو نہی کہ بلال کی نظر اُمیہ پر پڑی اُس نے شور مچا دیا کہ دیکھو یہ رئیس الکفر بچکر نکلا جا رہا ہے جس پر چند انصاریوں نے اُس کا پیچھا کیا اور اُس کے ساتھ لڑکر اُسے مار کر گرا دیا بلکہ اُسے بچاتے بچاتے حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی کسی قدر زخمی ہو گئے۔

جب دوسرے کاموں سے فراغت حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوسرا قریش کو ایک جگہ جمع کر کے دفن کر دیا جاوے، چنانچہ ایک گڑھے میں جو بیسکل روسا کی لاشوں کو اکٹھا کر کے دفن دیا گیا۔ اور دوسرے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ پر دفن کر دیا گیا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عام طریق تھا کہ حتیٰ اوسع کسی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتے تھے خواہ وہ دشمن ہی کی کیوں نہ ہو۔ واپسی سے قبل آپؐ اس گڑھے کے پاس تشریف لے گئے جس میں دوسرا قریش دفن کئے گئے تھے اور پھر ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا اور فرمایا۔ هَذَا وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمْ اللَّهُ حَقًّا فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَقًّا۔ یعنی کیا تم نے اس وعدہ کو حق پایا جو خدا نے میرے ذریعہ تم سے کیا تھا۔ تحقیق میں نے اس وعدہ کو حق پایا ہے جو خدا نے مجھ سے کیا تھا۔ نِزْرَ فَرَمَا يَا أَهْلَ الْقَلْبِ بَشَرٌ عَشِيْرَةٌ النَّبِيِّ كُنْتُمْ لِنَبِيِّكُمْ كَذِبْتُمْ فِي دَمْدَمَةِ النَّاسِ وَأَخْرَجْتُمْ فِي دَاوَابِّ النَّاسِ وَقَاتِلْتُمْ فِي دَلَصَةِ النَّاسِ۔ یعنی اے گڑھے میں پڑے ہوئے لوگو! تم اپنے نبی کے بہت بُرے رشتہ دار بنے۔ تم نے مجھے جھٹلایا اور دوسرے لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے مجھے میرے وطن سے نکالا اور دوسروں نے مجھے پناہ دی۔ تم نے میرے خلاف جنگ کی۔ اور دوسروں نے میری مدد کی، حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! وہ اب مُردہ ہیں وہ کیا سنیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میری یہ بات وہ تم سے بھی بہتر سن رہے ہیں، یعنی وہ اس عالم میں پہنچ چکے ہیں جہاں ساری حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے اور کوئی پردہ نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات جو اوپر درج کئے گئے ہیں اپنے اندر ایک عجیب و دردِ عالم کی آمیزش رکھتے ہیں اور ان سے اس قلبی کیفیت کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس وقت آپؐ پر طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قریش کی مخالفت کی گزشتہ تاریخ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے تھی اور آپؐ عالمِ غیب میں اس کا ایک ایک ذوق اُٹاتے جاتے تھے اور آپؐ کا دل ان اوراق کے مطالعہ سے بے چین تھا۔ آپؐ کے یہ الفاظ اس بات کا بھی یقینی ثبوت ہیں کہ اس سلسلہ جنگ کے آغاز کی ذمہ داری کلیشہ کفارِ مکہ پر تھی۔ جیسا کہ آپؐ کے الفاظ تَاتَلَسْتُمْ فِي دَلَصَةِ النَّاسِ۔ سے ظاہر ہے۔ یعنی اے میری قوم کے لوگو! تم نے مجھ سے جنگ کی اور دوسروں نے میری مدد کی۔ اور

کم از کم ان الفاظ سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ میں یقین رکھتے تھے کہ ان جنگوں میں ابتداء کفار کی طرف سے ہوئی ہے اور آپ نے مجبور ہو کر محض خود حفاظتی میں تلوار اٹھائی ہے۔

اپنے مقتولین کی دیکھ بھال ہوئی تو معلوم ہوا کہ کل چودہ آدمی شہید ہوئے ہیں۔ جن میں سے چھ مہاجرین میں سے تھے اور باقی انصار تھے۔ انہیں میں وہ مخلص بچہ عمیرہ قاص بھی تھا جس نے رو کر ساتھ آنے کی اجازت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ زخمی تو بہت صحابہ ہوئے تھے، لیکن یہ نقصان ایسا نہیں تھا کہ اس عظیم الشان دینی فتح کی خوشی کو کمزور کر سکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ مسلمان شکر و امتنان کے جذبات سے معمور تھے۔ تین دن تک آپ نے بدر کی وادی میں قیام فرمایا۔ اور یہ وقت اپنے شہداء کی تکفین و تدفین اور اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی میں گزرا۔ اور اپنی دنوں میں غنیمت کے اموال کو جمع کر کے مرتب کیا گیا اور کفار کے قیدیوں کو جن کی تعداد ستر تھی محفوظ کر کے مختلف مسلمانوں کی سپردگی میں دے دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہیکل کی کہ قیدیوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کریں اور ان کے آرام کا خیال رکھیں۔ صحابہ نے جن کو اپنے آقا کی ہر خواہش کے پورا کرنے کا عشق تھا آپ کی اس نصیحت پر اس خوبی کے ساتھ عمل کیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی؛ چنانچہ خود ان قیدیوں میں سے ایک قیدی ابو عزیز بن عمیر کی زبانی روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے انصار مجھے تو پکی ہوئی روٹی دیتے تھے، لیکن خود کھجور وغیرہ کھا کر گزارہ کر لیتے تھے اور کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ اُن کے پاس اگر روٹی کا چھوٹا ٹکڑا بھی ہوتا تھا تو وہ مجھے دے دیتے تھے اور خود نہیں کھاتے تھے اور اگر میں کبھی شرم کی وجہ سے واپس کر دیتا تھا تو وہ اصرار کے ساتھ پھر مجھی کو دے دیتے تھے یہ جن قیدیوں کے پاس لباس کافی نہیں تھا انہیں کپڑے مہیا کر دیتے گئے تھے؛ چنانچہ عباس کو عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تھی یہ سروریم یور نے قیدیوں کے ساتھ اس مشفقانہ سلوک کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت کے ماتحت انصار و مہاجرین نے کفار کے قیدیوں کے ساتھ بڑی محبت اور مہربانی کا سلوک کیا؛ چنانچہ بعض قیدیوں کی اپنی شہادت تاریخ میں ان الفاظ میں مذکور ہے کہ ”خدا بھلا کرے مدینہ والوں کا وہ ہم کو سوار کرتے تھے اور آپ پیدل چلتے تھے۔ ہم کو گندم کی پتی ہوئی روٹی دیتے تھے اور آپ صرف کھجوریں کھا کر پڑھتے تھے۔ اس لیے (میں خود صاحب لکھتے ہیں) ہم کو یہ معلوم کر کے تعجب نہ کرنا چاہیے کہ بعض قیدی اس نیک سلوک کے اثر کے نیچے مسلمان ہو گئے اور ایسے لوگوں کو فوراً آزاد کر دیا گیا..... جو قیدی اسلام نہیں لائے اُن پر بھی اس نیک سلوک کا بہت اچھا اثر تھا۔“

یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب یہ قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا

کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان لوگوں کی سفارش کرتا تو میں ان کو یونہی چھوڑ دیتا۔ مطعم بکا مشرک تھا اور اسی حالت میں وہ مرا لیکن طبیعت میں شرافت کا مادہ رکھتا تھا؛ چنانچہ قریش کا ظالمانہ صحیفہ جس کی وجہ سے مسلمان شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے تھے اُسے مطعم نے ہی چاک کیا تھا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس آئے تھے تو اس وقت بھی مطعم نے ہی آپ کو اپنی پناہ میں لیکر مکہ میں داخل کیا تھا۔ یہ اسی احسان کی یاد تھی جس سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ جب کبھی کوئی شخص آپ کے ساتھ ذرا سا بھی نیک سلوک کرتا تھا تو آپ اس کے احسان کو بھی نہیں بھولتے تھے اور آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ آپ کو اس کے احسان کا عملی شکریہ ادا کرنے کا موقع ملتا رہے اور یہ نہیں تھا کہ دُنیاداروں کی طرح جب آپ ایک دفعہ کسی کے احسان کے جواب میں نیک سلوک کر لیتے تھے تو پھر یہ کہنے لگ جاتے تھے کہ بس اب احسان کا بدلہ اُتر گیا ہے۔ بلکہ جب کبھی کوئی شخص آپ کے ساتھ نیک سلوک کرتا تھا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے آپ کو اپنا خاص محسن بنالیتا تھا اور آپ کبھی بھی اس کے احسان کو اُترا ہوا نہیں سمجھتے تھے اور دراصل اعلیٰ اخلاق کا یہی تقاضا ہے کیونکہ جس احسان کے نیچے انسان ایک دفعہ آجائے پھر اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ کسی جوابی احسان سے اس کا بدلہ اُتر سکتا ہے۔ ایک تجارتی لین دین تو کھلا سکتا ہے مگر ایک اخلاقی ذمہ داری سے عہدہ برائی ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا۔

جو لوگ قید ہوتے تھے ان میں سے بعض رؤساء قریش میں سے تھے؛ چنانچہ النضر بن الحارث اور سہیل بن عمرو مکہ کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعض قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی رشتہ دار تھے مثلاً عباس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ عقیل آپ کے چچا زاد بھائی اور حضرت علی کے حقیقی بھائی تھے۔ ابوالعاص بن ریح تھے جو آپ کی صاحبزادی زینب کے خاوند یعنی آپ کے داماد تھے۔ بعض نورعین نے قید ہونے والے رؤساء میں عقبہ بن ابی معیط کا نام بھی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت حالت قید میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ درست نہیں ہے۔ حدیث اور تاریخ میں نہایت صراحت کے ساتھ یہ روایت آتی ہے کہ عقبہ بن ابی معیط میدان جنگ میں قتل ہوا تھا اور ان رؤساء مکہ میں سے تھا جن کی لاشیں ایک گڑھے میں دفن کی گئی تھیں؛ البتہ نضر بن حارث کا حالت قید میں قتل کیا جانا اکثر روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ان بے گناہ مسلمانوں کے قتل کے براہ راست ذمہ دار تھے جو مکہ میں کفار کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اور اغلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حارث بن ابی ہالہ جو بتدار اسلام میں نہایت ظالمانہ طور پر آنحضرت

۱۔ مطعم مکہ کا ایک رئیس تھا جو کفر کی حالت میں مر گیا تھا؛ ۲۔ بخاری کتاب المغازی؛

۳۔ بخاری کتاب الاضواء و کتاب سترۃ المصلی و کتاب الجہاد؛ ۴۔ ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۱۵؛



صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے تھے۔ ان کے قتل کرنا یوں میں نصر بن حارث بھی شامل تھا۔ لیکن یزید یقینی ہے کہ نصر کے سوا کوئی قیدی قتل نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسلام میں صرف دشمن ہونے اور جنگ میں خلاف حصہ لینے کی وجہ سے قیدیوں کے قتل کرنے کا دستور تھا؛ چنانچہ اس کے متعلق بعد میں ایک معین حکم بھی قرآن شریف میں نازل ہوا ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گو بہت سی روایات میں نصر بن حارث کے قتل کئے جانے کا ذکر آتا ہے لیکن بعض ایسی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ بدر کے بعد مدت تک زندہ رہا اور بالآخر غزوہ حنین کے موقع پر سلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر مقدم الذکر روایات کے مقابلہ میں یہ روایتیں عموماً کمزور بھی گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہر حال اگر قیدیوں میں سے کوئی شخص قتل کیا گیا تو وہ صرف نصر بن حارث تھا جو قصاص میں قتل کیا گیا تھا اور اس کے متعلق بھی یہ روایت آتی ہے کہ جب اس کے قتل کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہن کے وہ دردناک اشعار سنے جن میں آپ سے رحم کی اپیل کی گئی تھی تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اشعار مجھے پہلے پہنچ جاتے تو میں نصر کو معاف کر دیتا۔ بہر حال نصر کے سوا کوئی قیدی قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی حکم دیا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاوے۔

بدر سے روانہ ہوتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو مدینہ کی طرف روانہ فرمایا تاکہ وہ آگے آگے جا کر اہل مدینہ کو فتح کی خوشخبری پہنچا دیں؛ چنانچہ انہوں نے آپ سے پہلے پہنچ کر مدینہ والوں کو فتح کی خبر پہنچائی جس سے مدینہ کے صحابہ کو اگر ایک طرف اسلام کی عظیم الشان فتح ہونے کے لحاظ سے کمال درجہ خوشی ہوتی تو اس لحاظ سے کسی قدر افسوس بھی ہوا کہ اس عظیم الشان جہاد کے ثواب سے وہ خود محروم رہے۔ اس خوشخبری نے اس غم کو بھی غلط کر دیا جو زید بن حارثہ کی آمد سے تھوڑی دیر قبل مسلمانان مدینہ کو عموماً اور حضرت عثمانؓ کو خصوصاً رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہنچا تھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیچھے بیمار چھوڑ کر غزوہ بدر کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جن کی وجہ سے حضرت عثمانؓ بھی شریک غزوہ نہیں ہو سکے۔ مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے متعلق مشورہ کیا کہ ان کے متعلق کیا کرنا چاہیے۔ عرب میں بالعموم قیدیوں کو قتل کر دینے یا مستقل طور پر غلام بنالینے کا دستور تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر یہ بات سخت ناگوار گذرتی تھی۔ اور پھر ابھی تک اس بارہ میں کوئی الہی احکام بھی نازل نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ میری رائے میں تو ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ آخر یہ لوگ اپنے ہی بھائی بند ہیں اور کیا تعجب کہ کل کو انہی میں سے فدا یا ان اسلام پیدا ہو جائیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا



کہ دین کے معاملہ میں رشتہ داری کا کوئی پاس نہیں ہونا چاہیے اور یہ لوگ اپنے افعال سے قتل کے مستحق ہو چکے ہیں۔ پس میری رائے میں ان سب کو قتل کر دینا چاہیے بلکہ حکم دیا جاوے کہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے اپنے رشتہ داروں کو قتل کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فطری رحم سے متاثر ہو کر حضرت ابوبکر کی رائے کو پسند فرمایا اور قتل کے خلاف فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ جو مشرکین اپنا فدیہ وغیرہ ادا کریں انہیں چھوڑ دیا جاوے۔ چنانچہ بعد میں اسی کے مطابق الہی حکم نازل ہوا۔ چنانچہ ہر شخص کے مناسب حال ایک ہزار درہم سے لے کر چار ہزار درہم تک اس کا فدیہ مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح سارے قیدی رہا ہوتے گئے عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے اور ان کو آپ کے اور آپ کو ان سے بہت محبت تھی ان کے متعلق انصار نے عرض کیا کہ یہ ہمارا بھانجہ ہے۔ ہم انہیں بغیر فدیہ کے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن گو قیدی کو بطور احسان کے چھوڑ دینا اسلام میں جائز بلکہ پسندیدہ تھا مگر اس موقع پر عباس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں مانا۔ اور فرمایا کہ عباس فدیہ ادا کریں تو تب چھوڑے جائیں۔ عباس کے متعلق یہ بھی روایت آتی ہے کہ جب وہ مسجد نبوی میں بندھے ہوئے پڑے تھے تو رات کے وقت ان کے کواہنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند نہیں آتی تھی انصار کو معلوم ہوا تو انہوں نے عباس کے بندھن ڈھیلے کر دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اگر بندھن ڈھیلے کرتے ہو تو سب کے کرد۔ عباس کی کوئی خصوصیت نہیں، چنانچہ سارے قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دیئے گئے۔ آنحضرت کے داماد ابوالعاص بھی اسیران بدر میں سے تھے ان کے فدیہ میں ان کی زوجہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب نے جو ابھی تک مکہ میں تھیں کچھ چیزیں بھیجیں۔ ان میں ان کا ایک ہار بھی تھا۔ یہ ہار وہ تھا جو حضرت خدیجہ نے ہمیز میں اپنی لڑکی زینب کو دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو مرحومہ خدیجہ کی یاد دل میں تازہ ہو گئی اور آپ چشم پر آب ہو گئے اور صحابہ سے فرمایا اگر تم پسند کرو تو زینب کا مال اُسے واپس کر دو۔ صحابہ کو اشارہ کی دیر تھی زینب کا مال فوراً واپس کر دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقد فدیہ کے قائم مقام ابوالعاص کے ساتھ یہ شرط مقرر کی کہ وہ مکہ میں جا کر زینب کو مدینہ بھجوا دیں اور اس طرح ایک مومن روح دار کفر سے نجات پا گئی۔ کچھ عرصہ بعد ابوالعاص بھی مسلمان ہو کر مدینہ میں ہجرت کر آئے اور اس طرح خاندانی یوی پھر اکٹھے ہو گئے۔ حضرت زینب کی ہجرت کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ جب وہ مدینہ آنے کے لیے مکہ سے نکلیں تو مکہ کے چند قریش نے ان کو بزور واپس لے جانا چاہا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو ایک بد بخت ہبار بن اسود نامی نے نہایت

۱۔ مسلم کتاب الجہاد۔ ترمذی تفسیر سورۃ انفال و زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۴۰، ۴۴۱۔

۲۔ سورۃ محمد و کتاب الخراج صفحہ ۱۲۱۔

۳۔ ابن سعد ۴۷۰ یاد ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پڑدادی مدینہ کی تھیں۔

۴۔ بخاری ۵۷۰۰

وحشیانہ طریق پر ان پر نیزے سے حملہ کیا جس کے ڈر اور صدمہ کے نتیجہ میں انہیں استعاط ہو گیا۔ بلکہ اس موقع پر ان کو کچھ ایسا صدمہ پہنچ گیا کہ اس کے بعد ان کی صحت کبھی بھی پورے طور پر بحال نہیں ہوئی اور بالآخر انہوں نے اسی کمزوری اور ضعف کی حالت میں بے وقت انتقال کیا۔

قیدیوں میں جو غریب لوگ تھے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت یونہی بطور احسان رہا کر دیتے گئے۔ مگر جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کی رائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کے ساتھ مشروط فرمائی کہ دس دس پتوں کو ٹوشت و خاند سکھادیں تو رہا کئے جاویں اچنانچہ زید بن ثابتؓ نے جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب خاص کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔

تیدیوں میں اسیل بن عمرو بھی تھا جو رد سار قریش میں سے تھا اور نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھا اور عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یکسر دیتا رہتا تھا۔ جب وہ بدر میں قید ہوا تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اسیل بن عمرو کے اگلے دانت نکلو دیتے جاویں تاکہ وہ آپ کے خلاف دہر نہ پھیلا سکے۔ مگر آپؐ نے اس تجویز کو بہت ناپسند کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ عمرؓ نہیں کیا معلوم ہے کہ خدا آئندہ اسے ایسے مقام پر کھڑا کرے جو قابل تعریف ہو اچنانچہ فتح مکہ کے موقع پر اسیل مسلمان ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اس نے متززل لوگوں کو بچانے کے لیے اسلام کی تائید میں نہایت پُر اثر خطبے دیئے جس سے بہت سے لوگ گاتے ہوئے لوگ پیچ گئے اور اسی اسیل کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں وہ اور ابوسفیان اور بعض دوسرے رد سار مکہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے حضرت عمرؓ کو ملنے کے لیے گئے۔ اتفاق سے اسی وقت بلالؓ اور عمارؓ اور مہیبؓ وغیرہ بھی حضرت عمرؓ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو غلام رہ چکے تھے اور بہت غریب تھے مگر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ابتداء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے بلالؓ وغیرہ کو پہلے ملاقات کے لیے بلایا۔ ابوسفیان نے جسکی اندر غالباً ابھی تک کسی قدر جاہلیت کی رگ باقی تھی۔ یہ نظارہ دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اچنانچہ کہنے لگا ”یہ ذلت بھی نہیں دیکھنی تھی کہ ہم انتظار کریں اور ان غلاموں کو شرف ملاقات بخشا جاوے۔“ اسیل نے فوراً سامنے سے جواب دیا کہ ”پھر یہ کس کا تصور ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو خدا کی طرف بلایا۔ لیکن انہوں نے نوراً مان لیا اور ہم نے دیر کی پھر ان کو ہم پر فضیلت حاصل ہو یا نہ ہو؟“ قیدیوں میں ایک شخص ولید بن ولید تھا۔

۱۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰ حالات عباس بن عبدالمطلب : ۲۔ ابوداؤد : ۳۔ ابن ہشام

۴۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۱۵ : ۵۔ اصابہ واسد الغابہ حالات اسیل بن عمرو :

جو مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کا لڑکا اور خالد بن ولید کا بھائی تھا۔ صحابہ نے اس سے چار ہزار درہم فدیہ مانگا جو اس کے بھائیوں نے ادا کر دیا اور ولید رہا ہو کر مکہ پہنچ گیا۔ مکہ میں پہنچ کر ولید نے اسلام کا اظہار کر دیا۔ اس کے بھائی اس پر سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ تُو نے مسلمان ہی ہونا تھا تو فدیہ کیوں ادا کیا۔ ولید نے جواب دیا کہ میں نے اس لیے فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلام کا اظہار کیا ہے کہ مائوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں فدیہ سے بچنے کے لیے مسلمان ہوا ہوں۔ اس کے بعد مکہ والوں نے ولید کو اپنے پاس قید کر لیا اور سخت تکالیف پہنچائیں مگر وہ ثابت قدم رہا اور آخر کچھ عرصہ کے بعد موقع پا کر مدینہ بھاگ آیا۔

مکہ میں جب لشکر قریش کی شکست اور رؤساء قریش کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا اس حالت کو دیکھ کر ابوسفیان اور بعض دوسرے ذی اثر قریش نے اعلان کر دیا کہ کوئی شخص اس وقت تک مقتولین بدر پر نوحہ نہ کرے جب تک کہ ہم لوگ مسلمانوں سے بدر کا بدلہ نہ لے لیں اور اس طرح عامۃ الناس کے جوش نوحہ کو انتقام کی تیاری میں لگا دیا گیا، مگر بدر کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ عرب کی فطرت اسے آسانی سے دبا سکتی۔ چند دن کے صبر و خاموشی کے بعد پھر گھر گھر سے صدائے ماتم بلند ہونی شروع ہوئی اور بدر کے مقتول مکہ کی گلی کوچوں میں بر ملا طور پر پیٹے جانے لگے۔ عرب کی سی آتش فطرت اور پھر بدر کی سی تباہی اس کے نتیجہ میں جو ماتم بھی ہو سکتا تھا وہ ہوا اور برابر ایک ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع میں جبکہ قریش اظہار ماتم سے رُکے ہوئے تھے اور پھر اپنے جوش ماتم کو دبانے کے لیے وجہ سے پھوٹ پڑے اس وقت کی ایک مثال روایات میں خاص طور پر مذکور ہوئی ہے اور ناظرین کی بصیرت کے لیے ہم اُسے یہاں ذکر کرتے ہیں۔ اسود بن عبد یغوث مکہ کا ایک رئیس تھا اس کے دولڑکے اور ایک پوتا جنگ بدر میں مارے گئے تھے مگر رؤساء قریش کے فیصلہ کی وجہ سے وہ خاموش تھا اور فرط غم سے اندر ہی اندر گھلا جاتا تھا۔ ایک رات اس نے اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے باہر گلی میں سے رُنے چلانے کی آواز سنی۔ اُس آواز نے اُسے بے چین کر دیا اور اُس نے اپنے نوکر کو بلا کر کہا۔ دیکھو تو یہ آواز کیسی ہے۔ شاید رؤساء قریش نے ماتم کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو میرے سینے میں ایک آگ لگ رہی ہے میں بھی جی کھول کر ردوں کہ دل کا کچھ بخاؤ تو نکل جاوے۔ نوکر گیا اور خبر لایا کہ ایک عورت کا اونٹ کھویا گیا ہے اور وہ اس پر نوحہ کر رہی ہے۔ شاعری عرب کی فطرت میں تھی اسود کے منہ سے بے اختیار یہ شعر نکلے اور دُبلے ہوئے جذبات پھوٹ کر باہر آ گئے۔

أَشْبَكْنِي أَنْ يُضِلَّ لَنَا بَعِيرُ  
فَلَا تُشْكِنِي عَلَى تَبْكٍ وَلَعْنٍ  
وَبَكْنِي إِنْ بَكَيْتِ عَلَى عَقِيلٍ  
وَيَمْنَعُنَا مِنَ التَّوْمِ السُّهُودُ  
عَلَى بَذْرِ لَقَا صَرَبِ الْجُدُودِ  
وَبَكْنِي حَارِثًا أَسَدَ الْأَسُودِ

یعنی کیا وہ عورت اس بات پر روری ہے کہ اس کا ایک اُونٹ کھو گیا ہے اور اس نقصان کا غم اُسے رات کو سونے نہیں دیتا۔ اے عورت! تو اس اُونٹ پر کیا روتی ہے۔ رو بدر پر جہاں کہ ہماری قسمت نے یادری نہ کی۔ ہاں! اگر تُو نے رونا ہے تو رو میرے عمیل پر اور رو میرے حادث پر جو شیروں کا شیر تھا۔

غرض اس طرح ماتم کے رکنے کا اعلان دھرے کا دھرا رہ گیا اور ایک ایک گھر کے سارے قریش ماتم کی زد میں بہ گئے۔ صرف ایک گھر تھا جو خاموش تھا اور وہ البوسفیان کا گھر تھا۔ البوسفیان کی بیوی ہند قریش کے رئیس اعظم عقبہ بن ربیعہ کی لڑکی تھی اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بدر کے میدان میں عقبہ اور اس کا لڑکا ولید اور اس کا بھائی شیبہ سب خاک میں مل چکے تھے، مگر مردانہ صفت ہند نے ایک لفظ بھی نوحہ کا اپنے منہ سے نکلنے نہیں دیا۔ لوگ آ کر اس سے پوچھتے تھے کہ اے ہند! تو کیوں خاموش ہے۔ ہند جواب دیتی تھی کہ "اگر آنسو میرے غم کی آگ کو بجھا سکے تو میں بھی روتی لیکن میں جانتی ہوں کہ آنسو میری آگ کو نہیں بجھا سکتا اب یہ آگ اسی دقت بجھے گی کہ تم لوگ پھر محمدؐ کے خلاف میدان میں نکلو اور بدر کا بدلہ لو۔"

جنگ بدر کا اثر کفار اور مسلمانوں ہر دو کے لیے نہایت گہرا اور دیر پا ہوا اور اسی لیے تاریخ اسلام میں اس جنگ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جتنی کہ قرآن شریف میں اس جنگ کا نام یوم الفرقان رکھا گیا ہے۔ یعنی وہ دن جبکہ اسلام اور کفر میں ایک کھلا کھلا فیصلہ ہو گیا۔ بیشک جنگ بدر کے بعد بھی قریش اور مسلمانوں کی باہم لڑائیاں ہوئیں اور خوب سخت سخت لڑائیاں ہوئیں اور مسلمانوں پر بعض نازک نازک موقعے بھی آئے، لیکن جنگ بدر میں کفار مکہ کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی جسے بعد کا کوئی جراحی عمل مستقل طور پر درست نہیں کر سکا۔ تعداد مقتولین کے لحاظ سے بیشک یہ کوئی بڑی شکست نہیں تھی۔ قریش جیسی قوم میں سے ستر بہتر سپاہیوں کا مارا جانا ہرگز قومی تباہی نہیں کہلا سکتا۔ جنگ اُحد میں سی تعداد مسلمان مقتولین کی تھی، لیکن یہ نقصان مسلمانوں کے فاتحانہ رستہ میں ایک عارضی روک بھی ثابت نہیں ہوا۔ پھر وہ کیا بات تھی کہ جنگ بدر یوم الفرقان کہلاتی؟ اس سوال کے جواب میں بہترین الفاظ وہ ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائے اور وہ یہ ہیں۔ لِقَطْعِ ذَابِرِ الْكَافِرِينَ۔ واقعی اس دن کفار کی جڑ کاٹ گئی۔ یعنی جنگ بدر کی ضرب کفار کی جڑ پر لگی اور وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ اگر یہی ضرب بجائے جڑ کے شاخوں پر لگتی تو خواہ اس سے کتنا گنا زیادہ نقصان کرتی وہ نقصان اس نقصان کے مقابلہ میں میچ ہوتا، لیکن جڑ کی ضرب نے ہرے بھرے درخت کو دیکھتے دیکھتے ایندھن کا ڈھیر کر دیا۔ اور صرف وہی شاخیں بچیں، جو خشک ہونے سے پہلے دوسرے درخت سے پوند ہو گئیں۔ پس بدر کے میدان میں قریش کے نقصان کا پیمانہ یہ نہیں تھا کہ کتنے آدمی مرے بلکہ یہ تھا کہ کون کون مرے اور جب ہم اس نقطہ نگاہ سے قریش کے مقتولین پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ بدر میں فی الواقعہ قریش کی



جروکٹ گئی۔ عقبہ اور شیبہ اور امیتہ بن خلف اور ابو جہل اور عقبہ بن ابی معیط اور نصر بن حارث وغیرہ قریش کی قومی زندگی کی رُوحِ زداں تھے اور یہ رُوح بدر کی مادی میں قریش سے ہمیشہ کے لیے پرواز کر گئی اور وہ ایک قالب بے جان کی طرح رہ گئے۔ یہ وہ تباہی تھی جس کی وجہ سے جنگِ بدر یومِ فرقان کے نام سے موسوم ہوئی اور خود قریش بھی اس نقصان کے اندازہ کو خوب سمجھتے تھے، چنانچہ قریش کا ایک معزز شاعر بدر کے مقتولین کا نوحہ کرتا ہوا کہتا ہے اور کیا خوب کتاب ہے۔

الْأَقْدَمَاءُ نَعَدَ هُمْ أَنْفُسُ      وَفَلَا يَوْمَ يُدِيرُ لَمْ يَسْؤَدُوا

”ان رؤساء قریش کے بعد کہ جو بدو کے دن مارے گئے ایسے لوگ قومی ریاست کے مسند پر بیٹھے ہیں کہ اگر بدر کا دن نہ ہوتا تو یہ لوگ ہرگز رئیس نہ بن سکتے۔ اللہ اللہ کیا تباہی تھی جو اس قوم پر آئی! بدر کی شکست کیا تھی کہ گویا قوم راند ہو گئی۔ بے شک رؤساء زادے اب بھی قریش میں کافی موجود تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو ریاست کی صفِ دوم میں شمار کیے جاسکتے تھے، مگر وہ چوٹی کے سردار جو اسلام کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کی رُوح رواں تھے اور جن کے پیچھے اُن کی قوم باوجود عرب کی فطری آزادی کے اس معاملہ میں گویا بھیڑیوں کی طرح چلتی تھی۔ سب کے سب خاک میں مل گئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں کوئی خاص تقدیر کام کر رہی تھی کیونکہ ابولہب جو بدر کی جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا مگر جو مخالفینِ اسلام کی صفِ اول میں تھا وہ بھی ہلاکت سے نہیں بچا کیونکہ بدر کے چند دن بعد ہی وہ مکہ میں ایک مکر وہ بیماری میں مبتلا ہوا اور نہایت ذلت کی موت مر کر اپنے اُن ساتھیوں سے جلا جو بدر میں مارے گئے تھے۔ اب بے دے کے صرف ایک ابوسفیان رہ گیا تھا جسے شاید اس کی قسمت نے فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے کے لیے بچا لیا تھا۔ اور بدر کے بعد اُسی کے سر پر قریش کی سرداری کا تاج رکھا گیا تھا۔ بدر کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے سر ولیم مینور لکھتے ہیں :-

”بدر کے حالات میں ایسی باتوں کا بہت کچھ غصہ نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے محمد صاحب اس فتح کو جائز طور پر خدائی تقدیر کا کوشمہ شمار کر سکتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ یہ فتح بہت نمایاں اور فیصلہ کن تھی بلکہ اس جنگ میں غیر معمولی طور پر محمد (صلعم) کے اکثر بااثر دشمن خاک میں مل گئے تھے۔ ان رؤساء مکہ کے علاوہ جو جنگ میں قتل کیے گئے یا قید کر لیے گئے تھے ابولہب جو جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا وہ بھی قریش کی بھگوڑی فوج کے مکہ پہنچنے کے چند دن بعد ہی مکہ میں مر گیا۔ گویا کہ وہ خدائی حکم جس کی مار رؤساء مکہ پر پڑی ایک اہل تقدیر بھی تھے۔

دوسری طرف جنگِ بدر کے نتیجے میں مسلمانوں کی پوزیشن نمایاں طور پر مضبوط ہو گئی تھی کیونکہ اول تو اس عظیم الشان اور غیر متوقع فتح کی وجہ سے قبائلِ عرب پر مسلمانوں کا ایک قسم کا رعب بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے خود مسلمانوں





مخصوص طور پر موجود ہے؛ چنانچہ کتاب یسعیاہ میں ”عرب کے متعلق الہامی کلام“ کے عنوان کے نیچے یہ پیشگوئی درج ہے:

”عرب کے صحرا میں تم رات کا ٹرگے۔ اسے دواہیوں کے قافلو! پانی لیکر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔

اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے تنگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔“ کیونکہ خداوند نے مجھ سے یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس تک قیدار کی ساری حسرت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کی جو باقی رہی قسیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔“

الغرض یہ جنگ تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کے اثرات کفار اور مسلمانوں ہر دو کے واسطے نہایت گہرے اور دیر پا ثابت ہوئے اور جہاں کفار مکہ کی بڑکٹ گئی وہاں ظاہری اسباب کے لحاظ سے مسلمانوں کی جڑ زمین میں قائم ہو گئی لیکن اگر ایک لحاظ سے جنگ بدر کے یہ خوش کن ثمرات مسلمانوں کیلئے پیدا ہوئے تو دوسرے لحاظ سے وقتی طور پر مسلمانوں کے خطرات بھی بدر کے بعد زیادہ ہو گئے۔ کیونکہ لازماً بدر کی تباہی کی وجہ سے کفار مکہ کے سینے جذبہ انتقام سے بھر گئے اور چونکہ اب قریش کے قومی کاموں کا محل و عقد زیادہ تر نوجوانوں کے ہاتھ میں تھا جو طبعاً زیادہ جوشیلے اور عواقب کی طرف سے بے پروا ہوتے ہیں اس لیے بدر کے بعد مدینہ پر کفار کے حملہ کا خطرہ زیادہ مہیب صورت اختیار کر گیا۔ دوسری طرف دوسرے قبائل عرب جہاں جنگ بدر سے مرعوب ہوئے وہاں مسلمانوں کی طرف سے اُن کا فکر آگے سے بھی زیادہ بڑھ گیا اور انھوں نے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ اگر اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی صورت جلدی نہ ہوتی تو یہ قوم ملک میں اس قدر مضبوط ہو جاتے گی کہ پھر اس کا مٹانا ناممکن ہوگا، اس لیے جنگ بدر کے نتیجہ میں ان کی معاندانہ کوششیں زیادہ عملی اور خطرناک صورت اختیار کر گئیں اور یہودان مدینہ بھی چونک کر ہوشیار ہو گئے۔ ایک اور خطرناک نتیجہ بدر کا یہ نکلا کہ کفار مکہ جو اب تک صرف ظاہری زور اور گھمنڈ پر لڑ رہے تھے اب ایک کھلے میدان میں مسلمانوں سے رک اٹھا کر سختی اور دیر پردہ سازشوں کی طرف بھی مائل ہونے لگ گئے؛ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ جو جنگ بدر کے صرف چند دن بعد وقوع میں آیا اس خطرہ کی ایک پتہ مثال ہے لکھا ہے کہ بدر کے چند دن بعد عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ بن خلف جو ذی اثر قریش میں سے تھے صحن کعبہ میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے کہ اچانک صفوان نے عمیر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”اب تو جینے کا کوئی مزا نہیں رہا“

۱۔ یسعیاہ باب ۲۱ آیات ۱۳ تا ۱۷۔ ۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا کیا خوب نقشہ ہے۔

۳۔ مزدور کا دن اہل دن سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم اس معیار کو مزدور کے دن کے حساب سے ایک سال کہہ رہے ہیں ورنہ اصل معیار اس سے کچھ زیادہ ہوگی؛ چنانچہ بدر کی جنگ ہجرت کے ایک سال اور چند ماہ بعد واقع ہوئی۔

غیر نے اشارہ تاڑا اور جواب دیا کہ ”میں تو اپنی جان خطرہ میں ڈالنے کو تیار ہوں لیکن بچوں اور قرض کا خیال مجھے مانع ہو جاتا ہے، ورنہ معمولی بات ہے مدینہ جا کر چپکے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر آؤں اور میرے لیے وہاں جانے کا یہ بہانہ بھی موجود ہے کہ میرا لڑکا اُن کے پاس قید ہے“ صفوان نے کہا ”تمہارے قرض اور بچوں کا میں ذمہ دار ہوتا ہوں تم ضرور جاؤ اور جس طرح بھی ہو یہ کام کر گزرو، غرض تجویز پہنختہ ہو گئی اور صفوان سے رخصت ہو کر غیر اپنے گھر آیا اور ایک تلوار زہر میں بچھا کر مکہ سے نکل کھڑا ہوا جب وہ مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے جوان باتوں میں بہت ہوشیار تھے اُسے دیکھ کر خوفزدہ ہوئے اور فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ غیر آیا ہے اور مجھے اس کے متعلق اطمینان نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اُسے میرے پاس لے آؤ۔ حضرت عمرؓ اُسے لینے کے لیے گئے۔ مگر جاتے ہوئے بعض صحابہ سے کہہ گئے کہ میں غیر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملانے کے لیے لاتا ہوں، مگر مجھے اس کی حالت مشتبہ معلوم ہوتی ہے تم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ اور چوکس رہو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ غیر کو ساتھ لیے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ نے اُسے نرمی کے ساتھ اپنے پاس بٹھا کر پوچھا ”کیوں غیر کیسے آنا ہوا؟“ غیر نے کہا ”میرا لڑکا آپؐ کے ہاتھ میں قید ہے۔ اُسے چھڑانے آیا ہوں“ آپؐ نے فرمایا ”تو پھر یہ تلوار کیوں حائل کر رکھی ہے؟“ اُس نے کہا ”آپؐ تلوار کا کیا کہتے ہیں۔ بدر میں تلواروں نے کیا کام دیا؟“ آپؐ نے فرمایا ”نہیں ٹھیک ٹھیک بات بتاؤ کہ کیسے آئے ہو؟“ اس نے کہا بات وہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”اچھا تو گویا تم نے صفوان کے ساتھ مل کر صحن کعبہ میں کوئی سازش نہیں کی؟“ غیر سناٹے میں آگیا۔ مگر سنبھل کر بولا ”نہیں میں نے کوئی سازش نہیں کی“ آپؐ نے فرمایا ”کیا تم نے میرے قتل کا منصوبہ نہیں کیا؟“ مگر یاد رکھو خدا تمہیں مجھ تک پہنچنے کی توفیق نہیں دے گا۔“ غیر ایک گہرے فکر میں پڑ گیا اور پھر بولا ”آپؐ سچ کہتے ہیں۔ ہم نے واقعی یہ سازش کی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے خدا آپؐ کے ساتھ ہے جس نے آپؐ کو ہمارے ارادوں سے اطلاع دیدی ورنہ جس وقت میری اور صفوان کی بات ہوئی تھی اس وقت وہاں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا اور شاید خدا نے یہ تجویز میرے ایمان لانے ہی کے لیے کروائی ہے اور میں سچے دل سے آپؐ پر ایمان لاتا ہوں“ آپؐ غیر کے اسلام سے خوش ہوئے اور صحابہ سے فرمایا ”اب یہ تمہارا بھائی ہے اسے اسلام کی تعلیم سے آگاہ کرو اور اس کے قیدی کو چھوڑ دو“ الغرض عمیر بن وہب سلمان ہو گئے اور بہت جلد انھوں نے ایمان و اخلاص میں نمایاں ترقی کر لی اور بالآخر نورِ صداقت کے اس قدر گردیدے ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باصرار عرض کیا کہ مجھے مکہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ میں وہاں کے لوگوں کو جا کر تبلیغ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اور غیر نے مکہ پہنچ کر اپنے جوش تبلیغ سے کئی لوگوں کو خفیہ خفیہ مسلمان بنا لیا۔ صفوان جو دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر سننے کا منتظر تھا اور قریش سے کہا کرتا تھا کہ اب تم ایک خوشخبری سننے کے لیے تیار رہو۔ اُس نے جب یہ نظارہ

اگر اس جگہ کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کس طرح علم ہو گیا کہ تعمیر اس نیت سے آیا ہے تو اس کا سیدھا اور سادہ جواب یہ ہے کہ جس خدا نے آپ کو دنیا کی اصلاح کے لیے نبی بنا کر بھیجا تھا اور جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے اسی نے آپ کو اطلاع دیدی۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آپ کوئی معمولی انسان نہ تھے بلکہ آپ کو خدا کی طرف سے نبی اور رسول بلکہ خاتم النبیین ہونے کا دعویٰ تھا۔ لہذا ضروری ہے کہ آپ کی سیرت و سوانح کا منہاج نبوت کی روشنی میں مطالعہ کیا جاوے۔ پس جس طرح ضرورت زمانہ کے ماتحت دوسرے انبیاء و مرسلین کو اللہ غیب کی باتوں پر آگاہ کرتا رہا ہے اور ان کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً خارق و معجزات ظاہر ہوتے رہے ہیں اسی طرح ضروری تھا کہ آپ کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت کی مخفی طاقتوں کا اظہار کرے اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم دنیا کی دوسری باتوں کو معتبر لوگوں کی شہادت کی وجہ سے مانتے ہیں تو آیات و معجزات کو معتبر شہادت کے ہوتے ہوئے نہ مانیں، البتہ جس طرح دوسری باتوں میں تحقیق کے بعد ایک بات کو مانا جاتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ آیات و معجزات کے متعلق پوری پوری تحقیق سے کام لیا جاوے اور صرف اسی بات کو مانا جاوے جو معتبر شہادت سے پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہو تاکہ غلط اور موضوع تھے صحیح تاریخ کا حصہ نہ قرار پا جائیں مگر یہ ایک نازک اور اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق مفصل بحث انشاء اللہ کسی اور موقع پر آئے گی۔

بدر کا اثر مشرکین مدینہ پر ابھی تک مدینہ میں قبائل اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ شرک پر قائم تھے۔ بدر کی فتح نے ان لوگوں میں ایک حرکت پیدا کر دی اور ان

میں سے بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم الشان اور خارق عادت فتح کو دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے۔ اور اس کے بعد مدینہ سے بُت پرست عنصر بڑی سرعت کے ساتھ کم ہونا شروع ہو گیا مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے دلوں میں اسلام کی اس فتح نے بغض و حسد کی چنگاری روشن کر دی اور انہوں نے بڑا مخالفت کو خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے بظاہر تو اسلام قبول کر لیا لیکن اندر ہی اندر اس کے استیصال کے ذریعے ہو ہو کر منافقین کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ ان مؤخر الذکر لوگوں میں زیادہ ممتاز عبد اللہ بن ابی ابن سلول تھا جو قبیلہ خزرج کا ایک نہایت نامور رئیس تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے کے نتیجہ میں اپنی سرداری کے چھینے جانے کا صدمہ اٹھا چکا تھا۔ یہ شخص بدر کے بعد بظاہر مسلمان ہو گیا، لیکن اس کا دل اسلام کے خلاف بغض و عداوت سے لبریز تھا اور اہل نفاق کا سردار بن کر اس نے مخفی مخفی اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ریشہ دوانی کا سلسلہ شروع کر دیا، چنانچہ بعد کے واقعات سے پتہ لگے گا کہ



کس طرح شیخ بعض اوقات اسلام کے لیے نہایت نازک حالت پیدا کر دینے کا باعث بنا۔

## رومی سلطنت کی فتح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی

کتاب کے حصہ اول میں بیان کیا گیا تھا کہ ان آیام

میں روم اور فارس کی مملکتیں برسرِ پیکار تھیں اور مکہ والوں کی ہمدردی طبعاً اہل فارس کے ساتھ تھی جو انہی کی طرح مشرک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تشریف رکھتے تھے کہ آپ نے خدا سے الہام پاکر یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ اس جنگ میں گو ابتداءً روم کو نچا دیکھنا پڑے گا، لیکن بالآخر اُسے فارس پر فتح حاصل ہوگی اور تین سال سے لیکر نو سال کے عرصہ تک روم غالب آجائے گا۔ یہ پیشگوئی اُس وقت کی گئی تھی جبکہ فارس کی افواج روم کو ذبائی چلی جاتی تھیں اور بہت سے رومی علاقے فارس نے چھین لیے تھے اور بظاہر حالات روم کے لیے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اس حالت کو دیکھ کر کفار مکہ بہت خوش تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشگوئی فرمائی تو وہ کہتے تھے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ اب روم کو غلبہ حاصل ہو؛ چنانچہ ان کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے ایک شرط بھی باندھ لی یہ کہ حضرت ابوبکرؓ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کفار مکہ کے کہنے میں آکر قرآن شریف کی بیان کردہ معیاد کو تین سال سے لیکر نو سال کے عرصہ پر مشتمل تھی صرف چھ سال میں محصور کر دیا اور اس طرح قریش کو ایک جھوٹی خوشی کا موقع مل گیا، مگر بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمادی کہ خدائی معیاد کو تنگ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے پوری معیاد نو سال ہے اور اس وقت تک پیشگوئی کے پورا ہونے کا انتظار کرنا چاہیے؛ چنانچہ ابھی نو سال نہیں گزرے تھے کہ جنگ نے یکلفت پٹا کھایا اور روم نے فارس کو شکست پر شکست دیکر اپنا سارا علاقہ واپس چھین لیا اور جنگ کا اختتام روم کی فتح پر ہوا۔ یہ آیام وہی تھے جبکہ صحابہ نے قریش مکہ کو بدر کے میدان میں شکست دی تھی۔ گویا اس موقع پر مسلمانوں کے لیے دو خوشیاں جمع ہو گئیں اور قریش مکہ کے لیے دو ماتم یہ بعض روایات میں یہ مروی ہوا ہے کہ یہ فتح روم کو صلح حدیبیہ کے زمانہ میں حاصل ہوئی تھی مگر یہ دونوں روایتیں متضاد نہیں ہیں کیونکہ دراصل روم کی فتح کا زمانہ جنگ بدر سے لیکر صلح حدیبیہ کے زمانہ تک پھیلا ہوا تھا۔

۱۔ اس وقت تک اسلام میں شرط باندھنا ممنوع نہیں تھا؛ لہٰذا قرآن شریف سورۃ روم اور ترمذی جلد ۲ تفسیر سورۃ روم، لائف آف محمد مصنف سرولیم مہر صفحہ ۱۱۸-۱۱۹ و انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا حالات ہر قریب۔



# غلاموں کیساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک

اور

## مسئلہ غلامی کے متعلق آپ کی تعلیم

مسئلہ غلامی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ جنگ کو غلامی کے مسئلہ کے ساتھ ایک بنیادی تعلق ہے اور بدردہ پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو کفار

اور مسلمانوں کے درمیان وقوع میں آئی۔ اس لیے جنگ بدر کے تذکرہ میں طبعاً یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ غلامی کے متعلق کیا تعلیم دی اور کیا طریق اختیار کیا؟ لہذا پیشتر اس کے کرم آگے چلیں مسئلہ غلامی کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مگر چونکہ یہ مسئلہ نہایت وسیع اور نہایت نازک ہے اور اس پر پورے تبصرہ کے لیے بہت مباحث میں داخل ہونا پڑتا ہے جس کی اس جگہ گنجائش نہیں اور نہ ایک مؤرخ ہونے کی حیثیت میں ہم اس قسم کی علمی بحثوں میں زیادہ پڑ سکتے ہیں، اس لیے ہم اس جگہ صرف اصولی نقطہ نگاہ سے اس مسئلہ پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے اور اس میں بھی اپنے آپ کو صرف اس حد تک محدود رکھیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور طریق عمل کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

سو سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں تصریح کی گئی ہے دنیا میں غلامی کی ابتداء دراصل جنگ سے ہوتی ہے۔ شروع شروع میں غلام بنائے جانے کا طریق اس طرح پر جاری ہوا کہ جب دو قبیلوں یا دو قوموں یا دو ملکوں کے درمیان کسی وجہ سے جنگ چھڑتی تھی تو مفتوح فوج کے جنگجو لوگ بلکہ بسا اوقات مفتوح قوم کے بیشتر یا سارے کے سارے مرد قتل کر دیئے جاتے تھے اور عورتوں اور بچوں کو (سوائے اس کے کہ انہیں بھی واجب القتل سمجھا جادے) قید کر کے غلام بنایا جاتا تھا اور پھر ان غلاموں سے مختلف قسم کے کام اور محنتیں لی جاتی تھیں۔ اس کے بعد جب ایک طرف دنیا میں تمدن اور کاروبار نے ترقی کی اور مزدور پیشہ لوگوں اور خدمتگاروں کی مانگ زیادہ ہونی شروع ہوئی اور دوسری طرف عورتوں اور بچوں کو غلام بنالینے

کے عملی تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ خدمت اور مزدوری حاصل کرنے کا یہ ایک عمدہ اور آسان ذریعہ ہے کہ مفتوح قوم کے لوگوں کو غلام بنا کر رکھا جاوے اس لیے آہستہ آہستہ یہ طریق جاری ہو گیا کہ باستثناء ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے واجب القتل سمجھے جاتے تھے مفتوح قوم کے مردوں کو بھی بجائے قتل کرنے کے غلام بنالیا جاتا تھا اور پھر ان سے ملکی اور قومی اور انفرادی کاموں میں جبری محنت لی جاتی تھی۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ طریق ایسا وسیع ہو گیا کہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ بعض ممالک میں غلاموں کی تعداد اصل باشندوں سے بھی زیادہ ہو گئی اور غلامی کا طریق دنیا کے تمدن اور معاشرت کا ایک ضروری حصہ بن گیا۔ یہ غلام مالک کی کامل ملکیت سمجھے جاتے تھے اور اسے اختیار حاصل ہوتا تھا کہ انہیں جس طرح چاہے رکھے جو کام چاہے اُن سے لے جو سزا چاہے انہیں دے اور جب اور جس طرح چاہے انہیں کسی اور شخص کے پاس فروخت کر دے۔

اور بالآخر اس سلسلہ نے ایسی وسعت اختیار کر لی کہ ان غلاموں کی اولاد بھی مالک کی ملک متصور ہونے لگی۔ اور اس طرح ایک مستقل اور غیر متناہی سلسلہ غلامی کا جاری ہو گیا اور جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک بڑا فائدہ مند سلسلہ ہے کہ گویا مفت میں ایسے نوکروں اور مزدوروں کی خدمت حاصل ہو جاتی ہے جن کو کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں دینی پڑتی اور جو ہر حالت میں ہر قسم کی خدمت پر مجبور ہوتے تھے بلکہ علاوہ خدمت کے اُن سے اور بھی بعض فائدے اُٹھائے جاسکتے ہیں تو جھگی قیدیوں کے طریق کے علاوہ لوگوں نے اور بھی کئی قسم کے ظالمانہ طریق غلام بنانے کے ایجاد کر لیے۔ مثلاً بلا وجہ کسی کمزور قبیلہ یا قافلہ پر حملہ کر کے اُن کے مرد و زن کو پکڑ کر غلام بنالیا جاتا تھا اور پھر ان بد نصیب لوگوں کی نسل میں یہ غلامی کا داغ ہمیشہ کے لیے چلتا چلا جاتا تھا۔ الغرض آہستہ آہستہ غلامی کا جائز و ناجائز طریق دنیا میں رائج اور مستحکم ہو گیا اور جس وقت اسلام کی ابتداء ہوئی اس وقت تمام ممالک میں یہ طریق کم و بیش جاری تھا اور مملکت ہائے روم اور یونان اور ایران وغیرہ میں لاکھوں غلام دکھ اور مصیبت کی زندگی کاٹ رہے تھے اور کوئی اُن کا پرسان حال نہیں تھا اور کجیثیت مجموعی اُن کی حالت جانوروں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اس زمانہ میں عرب کے ملک میں بھی بزار غلام پائے جاتے تھے اور امرائے امارت میں غلاموں کی تعداد بھی گویا ایک ضروری حصہ سمجھی جاتی تھی اور عرب کے لوگ خصوصیت کے ساتھ غلاموں کو سخت حقیر و ذلیل خیال کرتے تھے اور جیسا بھی ظالمانہ سلوک چاہتے تھے اُن سے کرتے تھے؛ چنانچہ کتاب کے حصہ اول میں گذر چکا ہے کہ مسلمان ہونے والے غلاموں پر رسول اللہ نے کیسے کیسے سخت مظالم کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خدا سے الہام پا کر رسالت کا دعویٰ کیا تو آپ کی ابتدائی تعلیمات میں یہ بات بھی داخل تھی کہ غلاموں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک ہونا چاہیے۔ اور غلاموں کے آزاد کئے جانے کے متعلق بھی آپ نے اسی ابتدائی زمانہ میں تحریک شروع کر دی تھی بلکہ اس بارہ میں تو خصوصیت کے ساتھ ایک قرآنی وحی بھی نازل ہوئی کہ غلام کا آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے یہ اسلامی تعلیم کی خوبی اور کشش

کے ساتھ اس مخصوص تعلیم نے مل کر عرب کے غلاموں پر ایک نہایت گہرا اثر پیدا کیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو اپنے لیے ایک نجات دہندہ کی آواز سمجھنے لگ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود ان نہایت درجہ بے دروانہ مظالم کے جو رؤساء مکہ مسلمان ہونے والوں پر کرتے تھے۔ غلاموں میں اسلام بڑی سرعت کیساتھ پھیلنا شروع ہو گیا؛ چنانچہ جیسا کہ کتاب کے حصہ اول میں بیان کیا جا چکا ہے ابتدائی مسلمانوں میں غلاموں کی نسبت غیر معمولی طور پر زیادہ تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ لوگ ابتدائی زمانہ میں بھی اسلامی سوسائٹی میں ہرگز ذلیل نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں اسلامی احکام نازل ہوتے گئے غلاموں کی پوزیشن زیادہ مضبوط اور ان کی حالت زیادہ بہتر ہوتی گئی اور بالآخر اس انتظامی فرق کے سوا کہ ایک افسر ہوتا تھا اور دوسرا اس کے ماتحت کوئی اور امتیاز باقی نہ رہا۔ دوسری طرف غلاموں کی آزادی کی تحریک بھی دن بدن زیادہ مضبوط ہوتی گئی اور مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُر زور تعلیم اور آپ کے عمل نمونہ کے ماتحت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصہ لیا؛ چنانچہ قرآن شریف اور کتب حدیث و تاریخ اس کی تفصیل سے بھری پڑی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف اس حد تک محدود رہا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے اور آپ نے غلامی کے ناجائز اور ظالمانہ طریقوں کو منسوخ کرنے کے لیے کوئی تباہی اختیار نہیں کی؟ اگر یہی ہے تو گو پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے ایک عظیم الشان محسن قرار پاتے ہیں کہ آپ نے غلاموں کی حالت کو بہتر بنانے اور ان کی آزادی کی تحریک جاری کرنے اور اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے میں ایک نہایت نمایاں خدمت سرانجام دی مگر یقیناً اس سے آپ کا وہ حقیقی کام پردہ میں رہتا ہے جو آپ کی اس تحریک کی اصل روح رواں تھا۔ کیونکہ جہاں تک ہماری تحقیق ہے اور یہ تحقیق خوش عقیدگی کا ثمرہ نہیں بلکہ تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف غلاموں کی حالت کو بہتر ہی نہیں بنایا بلکہ آپ نے آئندہ کے لیے غلامی کے ناجائز اور ظالمانہ طریقوں کو منسوخ بھی کر دیا۔ گویا مسئلہ غلامی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں اصلاح کا کام دو حلقوں میں تقسیم شدہ تھا۔

اول حاضر الوقت غلاموں کی حالت کی اصلاح اور ان کی آزادی کا انتظام۔ دوم آئندہ کے لیے اصول احکامات۔ اور ہم اس جگہ ان دونوں قسم کے کاموں کے متعلق آپ کی تعلیم اور آپ کے طریق عمل کا نمونہ مختصر طور پر بدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

### موجود الوقت غلاموں کی اصلاح کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

طبعی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے ہم اس بحث کو لیتے ہیں جو حاضر الوقت غلاموں سے تعلق رکھتی ہے۔ سو جاننا چاہیے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ ..... وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ  
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَلًا فُجُورًا ۝

”اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کرو اور اپنے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ ..... اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ۔ اور جانو کہ اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا ان لوگوں کو جو تکبر اور بڑائی کا طرہ اختیار کرتے ہیں۔“  
اس آیت میں غلاموں کے ساتھ نیکی اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔  
پھر فرماتا ہے:

وَلَا تَسْكُنُوا الْمَشْرِكِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ دَوْلَامَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَا تُسْكِنُوا الْمَشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَا تَعْبُدُوا مِنْ خَيْرٍ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَا تُعْبُدُكُمْ وَلَا  
اور اے مسلمانو! نہ شادی کرو تم مشرک عورتوں کے ساتھ حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور  
جانو کہ ایک مسلمان لونڈی بہتر ہے ایک آزاد مشرک عورت سے خواہ تمہیں مشرک  
عورت اپنی ہی نظر آئے۔ اور اے مسلمانو! نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا تم مشرک  
مردوں کے ساتھ حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں اور جانو کہ ایک مسلمان غلام بہتر ہے  
ایک آزاد مشرک آدمی سے خواہ تمہیں مشرک آدمی اچھا ہی نظر آئے۔“

اس آیت میں علاوہ اس کے کہ غلاموں کی پوزیشن کو نمایاں طور پر مضبوط کیا گیا ہے۔ آزاد مسلمان مردوں  
اور عورتوں اور مسلمان لونڈیوں اور غلاموں کی باہمی شادیوں کے لیے دروازہ کھولا گیا ہے تا اس مساویانہ  
اور رشتہ دارانہ اختلاط کے نتیجہ میں غلاموں کی حالت جلد تر اصلاح پذیر ہو سکے؛ چنانچہ منجملہ اور مصالح کے  
اس اصل کے ماتحت قرآن شریف میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ چار بیویوں کی انتہائی اور استثنائی حد کے پورا  
ہو چکنے کے بعد بھی اگر کسی مسلمان کے لیے کسی غلام عورت کے ساتھ رشتہ کرنے کا سوال پیدا ہو تو یہ چار کی  
حد بندی اس کے راستہ میں روک نہیں ہوگی اور وہ ہر حالت میں غلام عورت کے ساتھ رشتہ کر سکے  
گا۔ تاکہ غلاموں کی حالت کی اصلاح کا رستہ کسی صورت میں بھی مسدود نہ ہونے پائے۔ پھر فرماتا ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ الْيَتَامَىٰ مِنْ بَعْدُ ..... إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۝

”اور اے رسول! جو شادیاں تم اب تک کر چکے ہو (یہ تمہاری تبلیغی تربیتی اور سیاسی ضروریات  
کے لیے کافی ہیں اس لیے) اب اس کے بعد تمہیں کوئی اور شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

البتہ اگر کسی غلام عورت کے ساتھ رشتہ کا سوال پیدا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے۔  
یہ حکم بھی اسی غرض و غایت کا حامل ہے جو اوپر بیان کر گئی ہے اور اس میں مزید غرض یہ شامل ہے کہ تا  
آنحضرت ﷺ کے طریق عمل سے مسلمانوں کے لیے ایک بہترین نمونہ قائم ہو جاوے۔  
پھر فرماتا ہے :-

وَلَا يُسْأَلُ زَيْنَتُهُ إِلَّا بِخَوْفٍ كَتَمَتْهُ..... أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهَا ۖ

”یعنی اے مسلمان عورتو! تم اپنی زینت سوائے اپنے غامدوں اور فلاں فلاں قریبی رشتہ داروں  
کے کسی پر ظاہر نہ کیا کرو۔ یعنی پردے کی ان حدود کو تیر نظر رکھو جو تمہارے لیے مقرر کی گئی ہیں۔  
البتہ تمہیں اپنے غلاموں سے پردہ نہیں کرنا چاہیے۔“

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کے متعلق اسلامی تعلیم کا اصل منشاء یہ تھا کہ مسلمان انہیں  
بالکل اپنے قریبی عزیزوں کی طرح سمجھیں۔ جتنی کہ مسلمان عورتیں اپنے غلاموں سے پردہ بھی نہ کریں تاکہ غیریت کا  
احساس بالکل جاتا رہے اور رشتہ داروں کا سا اختلاط پیدا ہو جائے۔  
پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ أَخَوَاتِكُمْ خَوَاتِمُكُمْ جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ فَمَنْ  
كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ فَلْيَلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تَكْلَفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ  
فَإِنْ كَلَفْتُمُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَأَعْيَنُوهُمْ ۖ

یعنی ”ابو ذر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ”تمہارے غلام تمہارے بھائی  
ہیں۔ پس جب کسی شخص کے ماتحت کوئی غلام ہو تو اُسے چاہیے کہ اُسے وہی کھانا دے جو وہ خود کھاتا ہے اور  
وہی لباس دے جو وہ خود پہنتا ہے اور تم اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دیا کرو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو  
اور اگر کبھی ایسا کام دو تو پھر اس کام میں خود ان کی مدد کیا کرو۔“ اور مدد کرنے کے الفاظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ  
وہ کام ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر وہ آقا کو خود کرنا پڑے تو وہ اسے اپنے لیے موجب عار سمجھے بلکہ ایسا ہونا چاہیے  
کہ جسے آقا خود بھی کر سکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو۔ یہ حدیث اپنے مطالب میں نہایت واضح ہے اور اس  
بات کا یقینی ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ غلاموں کے ساتھ کامل  
درجہ کے حسن سلوک اور انتہائی شفقت کا حکم دیا گیا ہے جس کی نظیر یقیناً کسی اور مذہب اور کسی اور قوم میں  
نہیں ملتی بلکہ یہ کہ درحقیقت اس تعلیم کا اصلی منشاء یہ تھا کہ مسلمان اپنے غلاموں کو بالکل اپنے بھائیوں کی طرح  
سمجھیں اور ہر امر میں جس طرح خود رہتے ہیں اسی طرح انہیں رکھیں تاکہ ان کے تمدن و معاشرت میں اسی طرح کی



بلندی پیدا ہو جائے جیسی کہ دوسرے آزاد لوگوں میں ہے اور ان کے دلوں سے پستی کے احساسات بالکل مٹ جائیں  
در نہ محض حسن سلوک کی غرض سے اس قدر انتہائی تعلیم نہیں دی جاسکتی تھی کہ غلاموں کو بعینہ اسی طرح رکھو جس طرح  
کہ خود رہتے ہو۔ کیونکہ حفظ مراتب تو ہوا ہی کرتا ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا ہے۔

پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ عِبَادَةَ بْنِ الْوَلِيدِ بْنِ عَبَادَةَ الصَّامِتِ قَالَ لَقِينَا أَبَا الْيُسْرِىَّ صَاحِبَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ  
وَمَعَهُ غُلَامٌ مَوْلًى وَعَلَيْهِ بُرْدَةٌ وَمَعَايِرَتِي وَعَلَى غُلَامِهِ بُرْدَةٌ وَمَعَايِرَتِي قَالَ قُلْتُ لَهُ يَا  
عَمِّ لَوْ أَنَّكَ أَخَذْتَ بُرْدَةَ غُلَامِكَ وَأَعْطَيْتَهُ مَعَايِرَتَكَ وَأَخَذْتَ مَعَايِرَتِي وَأَعْطَيْتَهُ بُرْدَتَكَ  
فَكَانَتْ عَلَيْكَ حُلَّةٌ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ قَالَ فَمَسَحَ بِرَأْسِي وَقَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ فِيهِ ثُمَّ قَالَ يَا ابْنَ  
أَخِي بَصُرْتُ عَيْنَايَ هَاتَيْنِ وَسَمِعْتُهِ أَذُنَايَ هَاتَيْنِ وَوَقَّاهُ قَلْبِي هَذَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يَقُولُ أُطْعِمُوهُمْ  
مِمَّا تَأْكُلُونَ وَاكْسُوهُمْ مِمَّا تَلْبَسُونَ فَكَانَ إِنْ أُعْطِيَتْهُ مِنْ مَتَاعِ الدُّنْيَا أَحَبَّ إِلَيَّ  
مِنْ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ خَسَافَةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝

یعنی ”عبادہ بن ولید روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابوالیسر کو ملے۔  
اس وقت ان کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا اور ہم نے دیکھا کہ ایک دھاری دار چادر اور ایک مینے چادر ان  
کے بدن پر تھی اور اسی طرح ایک دھاری دار چادر اور ایک مینے چادر ان کے غلام کے بدن پر تھی میں نے انہیں  
کہا چچا تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اپنے غلام کی دھاری دار چادر خود لے لیتے اور اپنی مینے چادر اُسے دے دیتے  
یا اس کی مینے چادر خود لے لیتے اور اپنی دھاری دار چادر اُسے دے دیتے تاکہ تم دونوں کے بدن پر ایک ایک  
طرح کا جوڑا تو ہو جاتا۔ ابوالیسر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے دعا کی اور کہا بھتیجے! میری ان آنکھوں نے  
دیکھا ہے اور میرے ان کانوں نے سنا ہے اور میرے اس دل نے اسے اپنے اندر جگہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ”اپنے غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی لباس پہناؤ جو تم خود  
پہنتے ہو پس میں اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میں دنیا کے اموال میں سے اپنے غلام کو برابر کا  
حصہ لے دوں بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن میرے ثواب میں کوئی کمی آوے۔“

یہ حدیث اپنے الفاظ کے زور دار ہونے میں گزشتہ حدیث سے بھی زیادہ واضح ہے اور اس سے یہ  
بھی پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر صحابہ عمل بھی کرتے تھے۔ بلکہ اس کی تعمیل میں انہیں  
اس درجہ انہماک تھا کہ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے اور ان کے غلاموں کے لباس میں درجہ  
کا اختلاف تو الگ رہا ظاہری صورت کا بھی خفیہ سا اختلاف پیدا ہو۔

پھر روایت آتی ہے :

عَنْ ابْنِ التَّوَارِثِ أَنَّ ابْنَ أَبِي عَرِيْبٍ قَالَ أَتَانِي طَالِبٌ وَمَعَهُ غُلَامٌ لَهُ فَاسْتَحْرَیْ رَمْتِیْ فَمِیْضَتْنِیْ کَرَابِیْسَ فَقَالَ یَعْلَمُ بِهِ اِخْتَارَیْتَهُمَا یَشْتُ فَاَخَذَ اَحَدَهُمَا وَاَخَذَ عَلِیُّ الْاٰخَرَ فَلَبَسَهُ ۝

یعنی ابو نوار جو روئی کے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؑ ان کی دوکان پر آئے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کا ایک غلام بھی تھا۔ علیؑ نے دو ٹھنڈی قمیصیں خریدیں اور پھر اپنے غلام سے کہنے لگے کہ ان میں سے جو قمیص تم چاہو لے لو، چنانچہ غلام نے ایک قمیص چُن لی اور جو دوسری قمیص رہ گئی وہ حضرت علیؑ نے خود پہن لی۔

اس روایت سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت خاص خاص صحابہ بعض اوقات یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ اپنی چیزوں میں سے انتخاب کا حق پہلے غلام کو دیتے تھے اور پھر جو چیز باقی رہ جاتی تھی وہ خود استعمال کرتے تھے۔ یہ انتہائی درجہ کا ایثار ہے جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کر سکتا ہے اور یقیناً غلاموں کے متعلق اس درجہ کا ایثار محض حسن سلوک کی غرض سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں وہی دُور کی غرض بھی مد نظر تھی کہ یہ غلام جلد تر اپنے اخلاق اور معاشرت میں آزاد لوگوں کے مرتبہ کو پہنچ کر آزاد کر دیئے جانے کے قابل ہو جائیں۔

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ ابْنِ حُرَیْرَةَ یُحَدِّثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنْهُ قَالَ لَا یُعْذَلُ اَحَدُكُمْ عَنْ بَیْئَةِ اَمَّتِیْ وَنِیْسَتِیْ فَنَآیْ وَفَتَرَیْ ..... وَنِیْسَتِیْ سَیِّدَتِیْ وَمَوْلَاۤیْ ۝

یعنی ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اے مسلمانو! تم لوگوں نہ کہا کرو کہ ”میرا غلام میری لونڈی“ بلکہ یوں کہا کرو کہ ”میرا آدمی میری عورت“ اور غلام بھی اپنے آقا کو رب یعنی مالک نہ کہا کرے بلکہ سید اور بزرگ کہہ کر پکارا کرے۔

اس حدیث میں آقا اور غلام کی ذہنیوں کو درست کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں ایک طرف آقا کے دل و دماغ سے بڑائی اور تکبر کے خیالات کو مٹایا گیا ہے۔ وہاں دوسری طرف غلام کے دل میں خود داری اور عزت نفس کے جذبات پیدا کئے گئے ہیں اور عملی اور معاشرتی اصلاح کے ساتھ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ ذہنی اصلاح مل کر سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے اور اس کے بعد حالات اور خیالات کی کامل تبدیلی میں کوئی امر مانع نہیں رہتا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث اور آثار ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام

میں موجود الوقت غلاموں کی اصلاح اور ان کی بہبودی اور آرام و آسائش کے متعلق انتہائی درجہ کا زور دیا گیا ہے بلکہ یہ کہ اس تعلیم میں اسلام کا اصل منشاء یہ تھا کہ غلاموں اور ان کے مالکوں کے تمدن و معاشرت اور عزت و آبرو کو ایک مساویانہ درجہ پر لا کر غلاموں کو جلد تر اس قابل بنادیا جاوے کہ وہ آزاد ہو کر ملک کے مفید اور کار آمد شہری بن سکیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غلاموں کے یہ حقوق جبکہ کسی قدر نمونہ اور درج کیا گیا ہے محض سفارشی رنگ نہیں رکھتے تھے بلکہ شرعی اور سیاسی احکام تھے اور حکومت اسلامی کی طرف سے نہایت سختی کے ساتھ غلاموں کے حقوق کی نگرانی کی جاتی تھی۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے :

عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ قَالَ كُنْتُ أَمْرِي غَلَامًا بِالسَّوْطِ فَسَمِعْتُ صَوْتًا مِنْ خَلْفِي إِعْلَمَ أَبَا مَسْعُودٍ فَلَمَّا أَفْهَمَهُ الصَّوْتَاتُ مِنَ الْخُصْبِ قَالَ فَلَمَّا دَفَى مِنِّي إِذَا هُوَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَإِذَا هُوَ يَقُولُ إِعْلَمَ أَبَا مَسْعُودٍ إِعْلَمَ أَبَا مَسْعُودٍ قَالَ فَالْقَيْتُ السَّوْطَ مِنْ يَدِي فَقَالَ إِعْلَمَ أَبَا مَسْعُودٍ إِنَّ اللَّهَ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَى هَذَا الْعِلَامِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ بِوَجْهِ اللَّهِ فَقَالَ أَمَا لَوْلَا لَمْ تَفْعَلْ لَفَعَلْتَ النَّارَ أَوْ لَمْ تَسْتَشْكِ النَّارَ

یعنی ابوسعود ہمدانی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے کسی بات پر اپنے غلام کو مارا اس وقت میں نے اپنے پیچھے سے آواز سنی کہ کوئی شخص کہہ رہا تھا۔ دیکھو ابوسعود یہ کیا کرتے ہو۔ مگر غصہ کی وجہ سے میں نے اس آواز کو نہ پہچانا اور غلام کو مارنا ہی گیا۔ اتنے میں وہ آواز میرے قریب آگئی اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی آواز دیتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں کہ دیکھو ابوسعود یہ کیا کرتے ہو۔ آپ کو دیکھ کر میری چھڑی میرے ہاتھ سے گر گئی اور آپ نے غصہ کی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا : ابوسعود تمہارے سر پر ایک خدا ہے جو تمہارے متعلق اس سے بہت زیادہ طاقت رکھتا ہے جو تم اس غلام پر رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں خدا کی خاطر اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا : اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہارے منہ کو جھلسی ۔

پھر حدیث میں آتا ہے :

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ سَيِّدِي رَوْحِي أَمْتُهُ وَهُوَ يُرِيدُ أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنِي وَبَيْنَهَا قَالَ فَصَبَدَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَسْبَرَةَ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ

مَا بَالُ أَحَدِكُمْ يُزْجِي عِبْدَهُ أُمَّتَهُ ثُمَّ يُرِيدُ أَنْ يُفْتَرِقَ بَيْنَهُمَا إِنْمَا الطَّلَاقُ بِمَنْ  
أَخَذَ بِالسَّاقِ إِلَيْهِ

یعنی ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں  
حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! میرے آقا نے اپنی لونڈی کے ساتھ میری شادی کر دی  
تھی مگر اب وہ چاہتا ہے کہ ہمارے نکاح کو فسخ کر کے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر  
دے۔ آپ یہ بات سُنکر غصہ کی حالت میں منبر پر چڑھ گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو  
کر فرمایا: اے مسلمانو! یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ اپنے غلاموں اور لونڈیوں کی شادی کرتے ہو اور پھر  
خود بخود اپنی مرضی سے ان میں علیحدگی کرنا چاہتے ہو؟ سن لو کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ طلاق دینے  
کا حق صرف خاوند کو ہے اور تم اپنے غلاموں کو طلاق پر مجبور نہیں کر سکتے۔  
پھر حدیث میں آتا ہے:

كَانَ مُعْرِضُ الْخَطَّابِ يَذْهَبُ إِلَى الْغُلَامِ كُلِّ يَوْمٍ سُبُّتٍ فَإِذَا وَجَدَ عَبْدًا فِي عَمَلٍ لَا يُطِيقُهُ  
دَضَعَهُ عَنْهُ مَتْنًا۔

یعنی امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر ہفتہ مدینہ کے مضافات میں  
جایا کرتے تھے اور جب انہیں کوئی ایسا غلام نظر آتا تھا جسے اس کی طاقت اور مناسبت کے لحاظ سے  
زیادہ کام دیا گیا ہو تو حکماً اس کے کام میں تخفیف کر دیتے تھے۔

موجود الوقت غلاموں کی آزادی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اب ہم اس سوال کے

دوسرے حصہ کو لیتے ہیں

جو حاضر الوقت غلاموں کی آزادی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جو اسلام اور بانی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔  
سو جاننا چاہیے کہ اس کے متعلق اسلام میں دو طریق اختیار کئے گئے اول سفارشی طریق اور دوسرے جبری طریق۔  
اور ان دونوں طریقوں کے متحدہ اثر کے ماتحت آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچائی گئی۔ پہلے ہم سفارشی طریق کو  
لیتے ہیں۔ سب سے پہلے جبکہ ابھی آنحضرت ﷺ کے دعویٰ کی ابستار ہی تھی اور آپ مکہ میں مقیم تھے آپ پر  
یہ خدا کی وحی نازل ہوئی:

وَمَا أَذِلَّتْ مَا الْعَقَبَةُ ۖ فَكَتَرَكَبَتْ إِلَيْهِ

یعنی "اے رسول! کیا تم جانتے ہو کہ دین کے راستے میں ایک بڑی گھاٹی والی چڑھائی کو نسی ہے جس  
پر چڑھ کر انسان قرب الہی کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے؟ اگر تم نہیں جانتے تو ہم بتاتے ہیں کہ وہ

غلام کا آزاد کرنا ہے :

پھر فرمایا :-

ذَلِكَ الْبَرُّ مَنْ أَمَّنَ بِاللَّهِ ..... وَأَتَى السَّعَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ  
وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۖ

یعنی اللہ کے نزدیک بہت بڑی نیکی یہ ہے کہ انسان خدا پر ایمان لائے اور اُس کی محبت میں مال  
خرچ کرے رشتہ داروں پر اور یتیموں پر اور مسکینوں پر اور مسافروں پر اور غلاموں کے آزاد کرنے پر  
اور حدیث میں آتا ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ اخْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً اَعْتَقَ اللَّهُ بِكُلِّ عَصْوِمَةٍ  
عُصْوًا مِنَ النَّارِ ۖ

یعنی "ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی مسلمان  
غلام آزاد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے دوزخ سے کلی نجات عطا کر دے گا۔"  
پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ عَلِمْتَنِي عَمَلًا يَدْخُلُنِي  
الْجَنَّةُ قَالَ لَآ اَنْ كُنْتُ اِقْتَصَرْتُ الْخُطْبَةَ لَقَدْ اَعْرَضْتَ الْمُسْئِلَةَ اَعْتَقِ النَّسَمَةَ  
وَفَلَاحِ الرِّقَبَةِ ۖ

یعنی "برابر بن عازب روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت  
میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ ! مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتائیں کہ میں اس سے سیدھا  
جنت میں چلا جاؤں۔ آپ نے فرمایا۔ تم نے لفظ تو مختصر کے ہیں، مگر بات بہت بڑی پوچھی  
ہے۔ تم ایسا کرو کہ غلام کو آزاد کرو اور اگر خود اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دوسروں کے ساتھ مل کر  
آزاد کرو۔"

پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اَيُّمَا رَجُلٍ كَانَتْ  
عِنْدَهُ وَلِيْدَةٌ فَعَلَمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا وَاَدَبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا  
وَمَزَّوَجَهَا فَلَهُ اَجْرَانِ ۖ



”یعنی“ ابو بکرؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کے پاس ایک لونڈی ہو اور وہ بہت اچھی طرح اسے تعلیم دے اور بہت اچھی طرح اس کی تربیت کرے اور پھر اُسے آزاد کر کے اس کے ساتھ خود شادی کرے تو ایسا شخص خدا کے حضور دوسرے ثواب کا مستحق ہوگا۔“

ان پر زور سفارشات کے علاوہ اسلامی تعلیم میں بعض غلطیوں اور گناہوں کے کفارہ میں غلام کے آزاد کرنے کا قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ جسے گویا سفارشی اور جبری طریق کے بین بین سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:-

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٌ قَدِيَّةٌ مُّسْلِمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَدَّقُوا ..... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۖ

یعنی ”کوئی شخص کسی مومن کو یونہی غلطی سے قتل کر دے تو اُس کی سزا یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی ادا کرے سوائے اس کے کہ اُس کے وراثہ اُسے یہ خون بہا خود بخود معاف کر دیں اور اگر ایسے شخص کو کوئی غلام آزاد کرنے کے لیے نہ ملے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔“

پھر فرماتا ہے:-

إِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٌ ..... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۖ

”اگر مقتول ایسی قوم میں سے ہے جو مسلمانوں کی دشمن اور ان سے برسرِ پیکار ہے، لیکن مقتول خود مومن ہو تو پھر قاتل کی صرف یہ سزا ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور اگر وہ کوئی غلام نہ پاوے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔“

وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ قَدِيَّةٌ مُّسْلِمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۖ

اور اگر مقتول کسی ایسی قوم میں سے ہو جن کے اور تمہارے درمیان عہد و پیمان ہے تو خواہ مقتول کافر ہی ہو۔ اس کے قاتل کی سزا یہ ہے کہ وہ مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرے اور ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔“

پھر فرماتا ہے :

كَلْفَارْتُهُ اِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِيْنٍ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعَمُوْنَ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ نَعْنُ لَمْ يَجِدْ فَمِيَامُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ

یعنی اگر کوئی شخص خدا کی قسم کھا کر پھر اُسے توڑے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو لباس عطا کرے یا ایک غلام آزاد کرے اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھے

پھر فرماتا ہے :

وَالَّذِيْنَ يُظْهِرُوْنَ مِنْ نِّسَابِهِمْ ثُمَّ يَعُوْذُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۚ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّلَاقَا مَا ..... فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مَسْكِيْنًا

یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد کر لیتے ہیں لیکن پھر کسی وجہ سے انہی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو ان کا کفارہ یہ ہے کہ وہ ایک غلام آزاد کریں اور اگر کوئی غلام نہ پائے تو ایسا شخص دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے اور اگر روزوں کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے

یہ وہ مختلف صورتیں ہیں جو اسلام نے کفارہ میں غلاموں کے آزاد کیے جانے کی بیان کی ہیں اور اسلام نے حسبِ عادت ان کے حالات کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے دو دو تین تین مقابلہ کی صورتیں تجویز کر کے ان میں مسلمانوں کو اختیار دے دیا ہے کہ جو صورت آسانی کے ساتھ اور بہتر طور پر اختیار کی جا سکے اسے اختیار کر لیا جاوے اور کمالِ حکمت کے ساتھ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی غلام کے آزاد کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں لازماً ساتھ ہی یہ الفاظ بھی زیادہ کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی غلام نہ پائے تو پھر یہ یہ صورت اختیار کی جاوے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا اصل منشاء یہ تھا کہ بالآخر غلامی کا سلسلہ بالکل مفقود ہو جانا چاہیے۔ اس کے مقابلہ میں جب سورۃ مجادلہ کی آیت میں دو ماہ کے روزوں کے مقابلہ کی صورت تجویز کی گئی ہے تو وہاں یہ الفاظ رکھے گئے ہیں کہ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر یوں کیا جاوے۔ پس غلام کے آزاد کئے جانے کی صورت کے مقابلہ میں لازماً ان الفاظ کا انکار ”اگر کوئی غلام نہ پاوے“ اس بات میں کوئی شبہ نہیں چھوڑنا کہ اسلام کی انتہائی غرض موجود الوقت غلاموں کی کلی آزادی تھی۔

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ قَالَتْ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِالْعِتَاقِ فِي كُسُوفِ الشَّمْسِ -

یعنی "اسماء بنت ابی بکر روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو حکم دیتے تھے کہ سورج گرہن کے موقع پر غلام آزاد کیا کریں۔"

اب ہم چیری آزادی کے طریق کو لیتے ہیں۔ سو اس کے متعلق اسلام نے مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ سُوَيْدِ بْنِ مِقْرَانَ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَبِائِي سَابِغِ اخْوَةِ ابْنِ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَمَا لَنَا خَاوِدٌ عَنِيذٌ وَاحِدٌ فَعَمَدٌ أَحَدُنَا فَلَطَمَهُ فَأَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَعْتَقَهُ ۖ

یعنی "سويد صحابی روایت کرتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے اور ہمارے پاس صرف ایک غلام تھا۔ ہم میں سے ایک کسی بات پر غصہ آیا تو اس نے اس غلام کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اس غلام کو آزاد کر دیں۔"

یہی حدیث ابن عمر سے بھی مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارے اور پھر اسے آزاد کر دے تو اسے اس کے اس فعل کا کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ کیونکہ غلام کا آزاد کیا جانا اسلام میں مالک کے مارنے کے فعل کی سزا قرار پا چکا ہے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو جبری طور پر آزاد کرنے کا ایک طریق یہ اختیار کیا کہ مالک کے لیے غلام کو مارنے کی سزا یہ مقرر کر دی کہ وہ اسے فوراً آزاد کر دے۔

پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مُحْتَرِمٍ فَهُوَ حُرٌّ ۖ

یعنی "ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں کوئی ایسا غلام آ جاوے جو اس کا قریبی رشتہ دار ہے تو وہ غلام خود بخود آزاد سمجھا جائیگا۔"

پھر حدیث میں آتا ہے :-

عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ أَعْتَقَ بَشْرًا لَهُ فِي مَمْلُوكٍ فَكَانَ لَهُ عَشْرَةٌ ۖ

۱۔ بخاری کتاب العتق ۲۔ مسلم کتاب الایمان ۳۔ ابن ماجہ کتاب العتق ۴۔

كُلُّهُ اِنْ كَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَهُ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَاَ لَاقِيَوْمَهُ عَلَيْهِ فَاَسْتَشَعَى بِهِ  
غَيْرَ مُشْفُوقٍ عَلَيْهِ ۝

یعنی "ابن عمر اور ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی غلام کی ملکیت میں دوسروں کے ساتھ حصہ دار ہو اور وہ اپنے حصہ میں غلام کو آزاد کر دے تو اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے دوسرے حصہ داروں کو بھی روپیہ دے کر غلام کو کلیتہً آزاد کرے اور اگر اس کے پاس اتنا روپیہ نہ ہو تو پھر بھی غلام کو مثلاً آزاد کر دیا جائیگا تاکہ وہ خود اپنی کوشش سے بقیہ رقم پیدا کرے اور دوسرے مالکوں کو ادا کر کے کئی طور پر آزاد ہو جاوے اور اس معاملہ میں غلام کو ہر قسم کی سہولت دی جائیگی ۝

پھر حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ مشرکین مکہ کے بعض غلام بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے جن پر مشرکوں نے آپ سے درخواست کی کہ وہ غلام انہیں واپس دے دیئے جائیں اور بعض مسلمانوں نے بھی اُن کی سفارش کی مگر اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے، چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

غَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَاَ اَبِي اَنْ يَرُدَّهُمْ وَقَالَ هُمْ عَتَقَاءُ اللَّهِ ۝

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر سخت ناراض ہوئے اور غلاموں کے واپس کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ تو خدا کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ کیا میں انہیں پھر غلامی اور شرک کی طرف لوٹا دوں ۝

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ وَلَدَتْ اَمْنَتُهُ مِنْهُ  
فِيهِ مُعْتَقَةٌ عَنْ دُبُرِ مِنْهُ ۝ وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
يَقُولُ اَمَّا نَوَلِدُ حُرَّةً وَاِنْ كَانَ سَقَطًا ۝

یعنی "ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کے ساتھ رشتہ کرے اور اُسے آزاد نہ بھی کرے تو پھر بھی اگر اس لونڈی کے بطن سے اس کے ہاں کوئی اولاد ہو جاوے تو اس کے بعد وہ لونڈی خود بخود آزاد سمجھی جائے گی اور ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ اُمّ ولدہ بیوی بہر حال آزاد سمجھی جائے گی خواہ بچہ کی پیدائش اسقاط کی صورت میں ہی ہو ۝

غلاموں کی آزادی کے لیے ایک مستقل انتظام

یہ مختلف طریقے جبری آزادی کے تھے جو اسلام نے قائم کئے۔ مگر ظاہر ہے کہ باوجود ان جبری

آزادیوں کے پھر بھی بہت سے غلام ایسے رہ جاتے تھے جو ان صورتوں میں سے کسی صورت سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے اور دوسری طرف عام سفارشی رنگ میں ان کا آزادی حاصل کرنا یقینی نہیں تھا اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا مستقل اور پختہ انتظام کیا جاتا جس سے یہ موجود الوقت غلام خود بخود آزادی حاصل کرتے جاتے۔ سو اس کے متعلق اسلام نے وہ پُرانا حکمت انتظام تجویز کیا جو مکاتبت کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور جس میں مالک اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اپنے حالات کے لحاظ سے (جس کا فیصلہ حکومت یا عدالت کے ہاتھ میں ہوتا ہے نہ کہ مالک کے ہاتھ میں) آزادی کی اہلیت کو پہنچ چکا ہو تو وہ اس سے مناسب رقم پیدا کرنے کی شرط کر کے اُسے آزاد کر دے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ يَشْتَرُونَ الْكَتَبَ بِمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُواهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا  
وَأَشْهُمُوا مِنْ مَّالِ اللَّهِ الَّذِي أَشْرَكْتُمْ بِهِ

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے غلاموں میں سے جو غلام تم سے مکاتبت کا عہد کرنا چاہیں تمہارا فرض ہے کہ اُن سے مکاتبت کا عہد کر کے انہیں آزاد کر دو بشرطیکہ وہ آزادی کے اہل بن چکے ہوں۔ اور ایسی صورت میں تمہارا یہ بھی فرض ہے کہ اس مال میں سے انہیں بھی حصہ دو جو دراصل تو خدا کا ہے مگر خدا نے اس مکاتبت کے نتیجہ میں تمہیں عطا کیا ہے۔"

یہ آیت غلاموں کی جبری آزادی کے انتظام کا بنیادی پتھر ہے اور اس کے الفاظ بہت مختصر ہیں مگر اس کے معانی نہایت وسیع اور نہایت دقیق ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو غلام ان کے ساتھ مکاتبت کا عہد کر کے آزاد ہوتا چاہیں ان کا فرض ہے کہ انہیں آزاد کر دیں بشرطیکہ وہ آزادی کے قابل بن چکے ہوں اور مکاتبت کے عہد سے یہ مراد ہے کہ غلام اور آقا کے درمیان یہ فیصلہ ہو جاوے کہ اگر غلام اپنے آقا کو اس قدر رقم ادا کر دے گا تو وہ آزاد سمجھا جائے گا اور اس کا طریق یہ تھا کہ اس قسم کے فیصلہ کے بعد غلام عملاً آزاد ہو جاتا تھا اور اس نیم آزادی کی حالت میں وہ کوئی کام یا پیشہ از قسم تجارت یا صنعت و حرفت یا زراعت یا ملازمت وغیرہ اختیار کر کے مکاتبت کی رقم پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا اور جب یہ رقم پوری ہو جاتی تھی تو وہ کلی طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا اور مکاتبت کی رقم کو مالک کے تصرف میں سمجھی جاتی تھی مگر مالک کا یہ فرض تھا کہ اُس میں سے مناسب حصہ غلام کو بھی دے۔ یہ انتظام ایسا مبارک اور پُر حکمت تھا کہ اس کے نتیجہ میں غلاموں میں سے اہل لوگ نہ صرف خود بخود بطور سچی کے آزاد ہوتے چلے جاتے





کے ہاتھ میں تھا کہ مالک کی مرضی پر۔ یہ حدیث اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ دراصل اسلامی تعلیم کا اصل منشاء یہی تھا کہ موجود الوقت غلاموں کی حالت کو بہتر بنا کر انہیں آزادی کے قابل بنایا جاوے اور جوں جوں یہ غلام آزادی کے قابل ہوتے جائیں توں توں انہیں آزادی ملتی جاوے۔

یہ مکاتبت کا طریق چونکہ غلاموں کی آزادی کے انتظام کا بنیادی پتھر تھا اس لیے اسلام میں اسے نہایت پسندیدہ سمجھا گیا ہے؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ تُحَقِّقُ عَلَى اللَّهِ عَوْنُهُمُ الْمَكَاتِبُ  
الَّذِي يُرِيدُ الْأَدَاءَ وَالنَّاسِخَ الَّذِي يُرِيدُ الْبِعَافَ وَالْمُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ﷻ  
یعنی "ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ تھے کہ تین قسم کے لوگ ایسے  
ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت کو اپنے اوپر ایک حق کے طور پر قرار دے لیا ہے۔ اول مکاتبت  
غلام جو اپنی مکاتبت کی رقم کی ادائیگی کی نگر میں ہے۔ دوسرے وہ شادی کر نیوالا شخص جو اپنی  
عفت کے بچانے کی نیت رکھتا ہے اور تیسرے مجاہد فی سبیل اللہ۔"

غلاموں کی آزادی کی تحریک صرف افراد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اسلامی سلطنت کا بھی یہ فرض قرار دیا گیا  
تھا کہ وہ قومی بیت المال میں سے ایک معتد بہ حصہ غلاموں کے آزاد کرانے میں صرف کرے؛ چنانچہ  
قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ  
وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ﷻ

یعنی "زکوٰۃ کے اموال فقراء اور مساکین پر خرچ ہونے چاہئیں اور محکمہ زکوٰۃ کے عاملین پر اور کمزور  
نوسلموں پر اور غلاموں کے آزاد کرنے میں۔ اور مقررہ صنفوں کے قرض کی ادائیگی میں اور  
اشاعت دین کے لیے اور مسافروں کو آرام پہنچانے کے لیے۔ یہ ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ  
نے مقرر کیا۔"

اس آیت کی رو سے اسلامی سلطنت کا فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے محاصل میں غلاموں  
کی آزادی پر روپیہ خرچ کرے۔

آزاد شدہ غلاموں کے متعلق تعلیم رکھا گیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد شدہ غلام بالکل  
بے سہارا اور بے یار و مددگار نہ رہیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انتظام فرمایا تھا کہ

مالک اور آزاد شدہ غلام کے درمیان ایک قسم کا رشتہ اخوت مستقل طور پر قائم رہے؛ چنانچہ آپ کے حکم کے ماتحت مالک اور آزاد شدہ غلام ایک دوسرے کے ”مولیٰ“ یعنی دوست اور مددگار کہلاتے تھے تاکہ آقا اور غلام دونوں کے دلوں میں یہ احساس رہے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور بوقت ضرورت ہم نے ایک دوسرے کے کام آنا ہے اسی مصلحت کے ماتحت آزاد شدہ غلام اور مالک ایک دوسرے کے متعلق حق موروثیت بھی عطا کیا گیا تھا۔ یعنی اگر غلام بے وارث مرتا تھا تو اس کا ترکہ اس کے سابقہ آقا کو جاتا تھا اور اگر مالک بے وارث رہ جاتا تھا تو اس کا ورثہ اس کے آزاد کردہ غلام کو ملتا تھا؛ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ الْوَلَاءَ لَمِنْ إِحْسَنِ دَعَى ابْنِ عَبَّاسٍ  
أَنْ رَجُلًا مَاتَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا إِلَّا عَبْدًا هُوَ  
إِخْتَقَهُ فَأَعْطَاهُ النَّبِيُّ ﷺ مِيرَاثَهُ يَوْمَ

یعنی ”عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام لا وارث مر جاوے تو اس کا ترکہ اس کے سابق مالک کو ملے گا اور ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص ایسی حالت میں مر گیا کہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا؛ البتہ اس کا ایک آزاد شدہ غلام تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ترکہ اس کے آزاد شدہ غلام کو عطا فرمادیا۔ چونکہ اس حق موروثیت کی بنیاد مالی اور اقتصادی خیالات پر مبنی نہیں تھی بلکہ اصل منشاء مالک اور آزاد شدہ غلام کے تعلق کو قائم رکھنا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم جاری فرمایا کہ یہ حق موروثیت کسی صورت میں بھی بیح یا ہبہ وغیرہ نہیں ہو سکتا؛ چنانچہ ابن عمر سے روایت آتی ہے کہ:

نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَهَبَتِهِ يَوْمَ  
یعنی ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد شدہ غلام اور آقا کے حق موروث کی خرید و فروخت اور اس کے ہبہ وغیرہ سے منع فرمایا ہے۔“

پھر آزاد شدہ غلاموں کی عزت و احترام کے قیام کے لیے حدیث میں آتا ہے:-

عَنْ عَائِشَةَ بِنِ عَمْرٍو أَنَّ أَبَا سَفْيَانَ أَقَى عَلِيَّ سَلَمَانَ وَصُهَيْبَ وَبِلَالًا فِي تَغْرِ فُفَّاءَ  
وَاللَّهُ مَا أَخَذَتْ سَيُوفُ اللَّهِ مِنْ عُنُقِ عَبْدٍ إِلَّا مَا أَخَذَهَا قَالَ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ  
أَلْقُوا نُونَهُذَا لِشَيْخِي قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ فَأَقَى النَّبِيُّ ﷺ فَأَخْبَرَهُ فَقَالَ يَا أَبَا بَكْرٍ

لَعَلَّتْ أَغْضَبَتْهُمْ لَئِنْ كُنْتُ أَغْضَبْتَهُمْ لَفَقَدْ أَغْضَبْتُ رَبِّي فَاتَاهُمُ أَبُو بَكْرٍ  
فَقَالَ يَا إِخْوَتَاؤُهُ أَغْضَبْتُكُمْ قَالُوا لَا يَغْضِبُ اللَّهُ لَكَ يَا أَخِي ۝

یعنی "ایک دفعہ سلمان اور مصیب اور بلال وغیرہ جو آزاد شدہ غلام تھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے ان کے سامنے سے ابوسفیان گذرا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ: "یہ خدا کا دشمن خدائی تو اس سے بچ گیا ہے حضرت ابو بکرؓ نے ان کی یہ بات سنی تو انہیں فحاشی کی اور کہا کہ یہ تم قریش کے سردار کے متعلق ایسی بات کہتے ہو اس کے بعد ابو بکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے سارا ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ابو بکر! تم نے بلال وغیرہ کو کہیں ناراض تو نہیں کر دیا؟ اگر تم نے انہیں ناراض کیا ہے تو ان کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے۔ حضرت ابو بکر فوراً بلال وغیرہ کے پاس واپس آئے اور کہا۔ بھائیو! تم میری بات پر ناراض تو نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ نہیں بھائی ہم ناراض نہیں ہوئے فکر نہ کرو ۝

مسلمانوں نے غلاموں کی آزادی کی تعلیم پر کس طرح عمل کیا اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ان سفارشات اور ان کفارہ جات

اور جبری آزادیوں اور اس انتظامِ مکاتبت کے نتیجے میں غلاموں کی آزادی عملاً بھی وقوع میں آئی یا نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس زمانہ میں غلام نہایت کثرت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ جیٹی کہ بعض ممالک میں بعض اوقات غلاموں کی تعداد اصل آبادی سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ پس اس غیر متناہی وغیرہ کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ ہی یہ سارے غلام محدود اسلامی سلطنت اور حدود و مسلمان ممالک کے ماتحت تھے۔ پس لازماً یہ آزادی کی تحریک آہستہ آہستہ ہی چل سکتی تھی، لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاں تک صحابہ اور ان کے متبعین کی کوشش کا تعلق تھا انہوں نے غلاموں کے آزاد کرنے اور آزاد کرانے میں اپنی پوری توجہ اور پوری سعی سے کام لیا اور وہ نمونہ دکھایا جو یقیناً تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف اپنے ہاتھ میں آئے ہوئے غلاموں کو کثرت سے آزاد کرتے رہتے تھے بلکہ خاص اس نیت اور اس ارادے سے غلام خریدتے بھی تھے کہ انہیں خرید کر آزاد کر دیں اور اس طرح بے شمار غلام مسلمانوں کی مساعی جمیلہ سے داغِ غلامی سے نجات پا گئے؛ چنانچہ مندرجہ ذیل فہرست جو یقیناً مکمل نہیں ہے اور جس میں نمونہ کے طور پر صرف چند صحابیوں کا نام لیا گیا ہے ہمارے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے سُبُلُ السَّلَام میں روایت آئی ہے کہ :-

۱۔ مسلم باب فضائل سلمان و مصیب و بلال ۝

۲۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا بحث غلامی ۝ ۳۔ سُبُلُ السَّلَام شرح بلوغ المرام کتاب العتق ۝

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے	تریشٹھ	غلام آزاد کئے
حضرت عائشہؓ نے	ستر شٹھ	" " "
حضرت عباسؓ نے	ستر	" " "
حکیم بن حزام نے	یکصد	" " "
عبد اللہ بن عمرؓ نے	ایک ہزار	" " "
عبد الرحمن بن عوفؓ نے	تین ہزار	" " "
حضرت عثمان بن عفانؓ نے	۲۰۰۰۰	صرف ایک دن میں جو ان
	بیس ہزار	کی شہادت کا دن تھا اور آٹا
		انکی مجموعی تعداد بہت زیادہ تھی۔
ذوالکلاع الحمری نے	آٹھ ہزار	صرف ایک دن میں

### میزان ۳۲۳۲۰

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس روایت میں بطور نمونہ صرف چند صحابہ کا نام لیا گیا ہے اور اگر اسی نسبت سے دوسرے کثیر التعداد صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے متعلق قیاس کیا جاوے تو یہ تعداد یقیناً کروڑوں سے اوپر پہنچتی ہے لیکن حق یہ ہے کہ اس روایت میں جو تعداد مذکورہ بالا صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی بیان کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں بلکہ اصل تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ کے متعلق ایک روایت سے ثابت ہے کہ انھوں نے صرف ایک موقع پر چالیس غلام آزاد کئے تھے اور دوسری روایت سے پتہ لگتا ہے کہ ان کا یہ طریق تھا کہ وہ نہایت کثرت کے ساتھ غلام آزاد کیا کرتی تھیں پس ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انہوں نے ساری عمر میں صرف ستر شٹھ غلام آزاد کئے تھے یقیناً درست نہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو تعداد بتائی گئی ہے وہ گو آپؐ کی ذاتی حیثیت میں درست ہو کیونکہ آپؐ کی ذاتی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور آپؐ ان احکامات کے جاری ہونے کے بعد زندہ بھی بہت تھوڑا عرصہ رہے تھے لیکن یقیناً اس تعداد میں وہ غلام شامل نہیں ہیں جو آپؐ نے اسلامی حکومت کے ہیڈ ہونے کی حیثیت میں آزاد کئے اور جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے اور وہ یہ کہ آپؐ کے متعلق بہت سی روایات سے ثابت ہے کہ کبھی کوئی ایک غلام بھی آپؐ کے قبضہ میں



نہیں آیا کہ اُسے آپ نے آزاد نہ کر دیا ہو؛ چنانچہ مندرجہ ذیل روایت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ أَخِي جُوَيْرِيَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ قَالَ مَا تَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ مَوْتِهِ دَرَاهِمًا وَلَا دِينَارًا وَلَا عَبْدًا وَلَا أَمَةً ۚ

یعنی عمرو بن الحارث سے روایت ہے جو ام المؤمنین جویریہؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موت کے وقت کوئی درہم کوئی دینار کوئی غلام اور کوئی لونڈی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی ۛ

الغرض اسلام کی یہ تعلیم جو اس نے غلاموں کے متعلق دی صرف کاغذوں کی زمینت نہیں تھی بلکہ یہ تعلیم اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی طریق معاشرت کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی اور افراد و حکومت دونوں پورے شوق کے ساتھ اس پر عمل پیرا تھے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ غلاموں کو آزادی  
آزاد شدہ غلاموں کیلئے تمام ترقی کے دروازے کھلے تھے  
اس اطمینان کے بعد دی جاتی تھی کہ

وہ اخلاق و عادات اور روزی کمانے کی اہلیت کے لحاظ سے آزادی کے قابل ہو جائیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو غلام آزاد کئے جاتے تھے وہ واقعی مفید شہری بن جاتے تھے اور اسلامی سوسائٹی میں ویسے ہی معزز و محترم سمجھے جاتے تھے جیسے کہ دوسرے لوگ۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ لوگوں کے پرانے خیالات کی اصلاح کی غرض سے آپ غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں میں سے قابل لوگوں کی تعظیم و تکریم کا خیال دوسرے لوگوں کی نسبت بھی زیادہ رکھتے تھے چنانچہ آپ نے بہت سے موقعوں پر اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور ان کے لڑکے اسامہ بن زید کو جنگی مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے صاحب عزت و جلیل القدر صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا اور جب نابھ لوگوں نے اپنے پرانے خیالات کی بناء پر آپ کے اس فعل پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا ہے۔

إِنْ تَطْعَمُوا فِي أَمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَمُونَ فِي أَمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ مَا يَشْكُرُ اللَّهُ إِنْ كَانَ لَخَلِيفًا بَلَا مَارَةَ إِنْ كَانَ لَحِمِّنْ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَيَّ وَإِنْ هَذَا لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ بَعْدَهُ ۚ

یعنی تم لوگوں نے اسامہ کے امیر بنانے جانے پر اعتراض کیا ہے اور اس سے پہلے تم اس کے باپ زید کی امارت پر بھی طعن کر چکے ہو، مگر خدا کی قسم جس طرح زید امارت کا

مقدار اور اہل تھا اور میرے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اسی طرح اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ آپؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی کی لڑکی زینب بنت جحش کو زید بن حارثہ سے بیاہ دیا اور عجیب کمر شمشیر یہ ہے کہ سارے قرآن میں اگر کسی صحابی کا نام مذکور ہوا ہے تو وہ یہی زید بن حارثہ ہیں۔ پھر علم و فضل میں بھی بعض آزاد شدہ غلاموں نے بہت بڑا رتبہ حاصل کیا؛ چنانچہ سالم بن عقیل مولیٰ ابی حذیفہ خاص الخاص علماء صحابہ میں سے سمجھے جاتے تھے اور آنحضرت ﷺ نے قرآن شریف کی تعلیم کے لیے جن چار صحابیوں کو مقرر فرمایا تھا ان میں سے ایک سالم بھی تھے۔ اور تقویٰ و طہارت کی وجہ سے تعظیم و تکریم کا یہ حال تھا کہ حضرت عمرؓ بلالؓ کے متعلق اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ ہمارا سردار ہے۔ پھر صحابہ کے بعد بھی بعض آزاد شدہ غلاموں نے اسلامی سوسائٹی میں بہت بڑا رتبہ حاصل کیا؛ چنانچہ عطار بن ابی رباح، مجاہد بن جبر، نافع مولیٰ ابن عمر اور موسیٰ بن عقبہ بزرگ ترین تابعین میں سے سمجھے جاتے تھے۔ جن کے سامنے بڑے بڑے جلیل القدر لوگ زانوئے تلمذی طے کرتے تھے۔

تمام غلاموں کو یکجہت کیوں آزاد کر دیا گیا پیشتر اس کے کہ ہم اس بحث کو ختم کریں اس سوال کا

جواب دینا ضروری ہے کہ جب اسلام غلاموں کی آزادی اور رستگاری کا پیغام لیکر آیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ تمام حاضر الوقت غلاموں کو یکجہت حکماً آزاد کر دیا؟ سو اس کا مختصر اور سادہ جواب تو صرف اس قدر ہے کہ آپؐ نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ آپؐ غلاموں کے حقیقی دوست تھے اور آپؐ کا کام اصلاح کرنا تھا نہ کہ فائز۔ پس آپؐ نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو بظاہر تو دوستی کا رنگ رکھتا ہو، لیکن حقیقتہً وہ غلاموں کے لیے نقصان دہ اور ملک کی ترقی اور تمدن کے لیے ضرر رساں ہو۔ ہر اک عقل مند شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے ماتحت لاکھوں غلاموں کا ایک لخت آزاد ہو جانا غلاموں کو ایک ایسی بے سہارا اور غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیتا جو ان کے لیے کئی لحاظ سے خطرناک ہو سکتی تھی اور اس زمانہ کے حالات کے ماتحت اس فوری اور عالمگیر آزادی کا نتیجہ یقیناً یہ ہوتا کہ ان آزاد شدہ غلاموں میں سے اگر ایک حصہ غربت کی حالت میں فاقوں سے مرتا تو دوسرا حصہ بیکاری اور ارتکاب جرائم کی طرف مائل ہو کر اپنی اخلاقی تباہی اور ملک و قوم کی بے چینی اور بد امنی کا باعث بن جاتا۔ انقلابی تجاویز خواہ بعض اوقات جذباتی رنگ میں کیسی ہی دلخوش کن نظر آئیں مگر حقیقتہً وہ اکثر صورتوں میں نفع مند ثابت نہیں ہوتیں بلکہ بعض صورتوں میں تو ان سے افراد کے عادات و خصائل اور قوم کی اجتماعی زندگی اور تمدن پر خطرناک اثر پڑتا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ

جو ایک حقیقی مصلح تھے اور غلاموں کے لیے وہ کام کرنا چاہتے تھے جو ان کے لیے فی الواقع مفید اور بابرکت ہو۔  
ایسے رستہ پر قدم زن نہیں ہوئے جو عرب کی سوسائٹی میں ایک تباہ کن زلزلہ پیدا کرنے والا ثابت ہوتا۔ اور  
غلاموں کو اس سے بچانے فائدہ کے نقصان پہنچتا۔ خوب سوچ لو کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت  
لاکھوں غلاموں کو بغیر کسی دُور اندیشانہ انتظام کے ایک لخت آزاد کر دینے کے یقیناً یہ معنی تھے کہ ان غلاموں  
کی دُنیا بھی تباہ ہوتی اور دین بھی۔ یعنی دنیا کے لحاظ سے ان میں سے اکثر نہ صرف بالکل بے سہارا اور بے  
ذریعہ معاش رہ جاتے۔ بلکہ ان کے لیے کسب سیکھنے کے موقعے بھی میسر نہ رہتے اور دینی لحاظ سے اُن کی یہ  
فوری اور عالمگیر آزادی ان کے اخلاق و عادات پر ایک نہایت ضرر رساں اثر پیدا کرتی خصوصاً جبکہ ایک  
بہت لمبے عرصے کی ظالمانہ غلامی کے نتیجے میں اُن کے اندر ذنات اور سنگدلی اور اسی قسم کے دوسرے  
مذموم اخلاق پیدا ہو چکے تھے جو فوری آزادی کے نتیجے میں نہ معلوم کس رستے پر پڑ کر کیا کیا رنگ لاتے اور اس  
عالمگیر آزادی کے نتیجے میں جو دوسرے مضر اثرات سوسائٹی پر پڑ سکتے تھے وہ مزید براں تھے۔ پس اسلام نے  
کمال دانشمندی سے یہ تجویز اختیار فرمائی کہ ایک طرف تو آئندہ کے لیے غلامی کے ظالمانہ طریقوں کو بند کر کے  
اس حلقہ کی مزید وسعت کو روک دیا جیسا کہ آگے چل کر اس کی بحث آئیگی اور دوسری طرف دقتی حالات کو  
تدبیر نظر رکھتے ہوئے موجود الوقت غلاموں کی اخلاقی اور معاشرتی اور اقتصادی اصلاح و بہبودی کے لیے عملی  
تدابیر اختیار فرمائیں اور ساتھ ہی یہ انتظام فرمایا کہ جوں جوں یہ غلام آزاد زندگی کو مفید طور پر بسر کرنے کے قابل  
ہوتے جاتیں ٹول ٹول وہ لازماً آزاد بھی ہوتے جاتیں اور یہی وہ حقیقی اصلاح کا طریق تھا جو اس زمانے  
کے حالات کے ماتحت بہترین نتائج کی اُمید کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا تھا بلکہ اسی انتظام کا تفصیل مطالعہ  
اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہنے دیتا کہ یہ ایک عظیم المثال نظام تھا جس کی نظیر نہ تو اس سے پہلے کسی  
زمانہ میں نظر آتی ہے اور نہ اس کے بعد آج تک ایسا نمونہ کسی قوم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اگر اس جگہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ گذشتہ صدی کے دوران بہت سے یورپین اور امریکن مصلح ایسے  
گذرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو غلاموں کی آزادی کی تحریک میں گویا وقف کر دیا تھا اور ان کی کوششوں  
کے نتیجے میں دُنیا کے بیشتر ممالک میں غلامی کا سلسلہ یکلخت منسوخ ہو گیا تھا۔ مثلاً ابراہام لنکن نے جو اپنے  
وقت میں امریکہ کی جمہوری سلطنت کا صدر تھا۔ امریکہ کے لاکھوں حبشی غلاموں کو یکلخت آزادی دلا دی اور  
اس فوری اور عالمگیر آزادی کا کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا بلکہ ابراہام لنکن کی یہ خدمت انتہائی تحسین کی نظر سے  
دیکھی جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو آج سے چودہ سو سال قبل کے زمانہ اور آج کے زمانہ کے حالات  
میں زمین و آسمان کا اختلاف ہے اور چونکہ اسلام کی یہ تعلیم جو اس زمانہ کے غلاموں کی تدریجی آزادی کے  
متعلق دی گئی تھی اُس زمانہ کے حالات کے ماتحت تھی اور مستقل تعلیم اسلام کی اس بارے میں اور تھی  
جن کا ذکر آگے آتا ہے اس لیے عقلاً یہ مقابلہ کسی صورت میں درست نہیں سمجھا جاسکتا۔ پس اگر موجودہ زمانہ کے

حالات میں فوری اور عالمگیر آزادی مضرت ثابت نہیں ہوتی تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آج سے پہلے  
زمانوں اور آج کی نسبت دوسری قسم کے حالات میں بھی یہ طریق ضرور سال ثابت نہ ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کے زمانہ میں غلاموں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت نہایت درجہ پست تھی اور دوسری طرف دنیا  
کا تہذیب و تمدن بھی اس تہذیب و تمدن سے بالکل جدا تھا جو آج کل دنیا میں پایا جاتا ہے۔ پس اس  
زمانہ کے حالات کے ماتحت یہی مناسب تھا کہ بھائے فوری اور عالمگیر آزادی کے تدریجی آزادی کے طریق کو  
اختیار کیا جاتا اور نہ نتیجہ بھائے مفید ہونے کے یقیناً مضرت ہونا تھا۔ یہ ایک اصولی جواب ہے جو اس اعتراض کا  
دیا جاسکتا ہے۔ مگر حتیٰ یہ ہے کہ جو تجاویز اسلام نے اختیار کیں وہ بہر حال زیادہ مفید اور نفع مند تھیں اور ہر  
غیر متعصب شخص جو ٹھنڈے طور پر اس مسئلہ کے متعلق غور کرے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا جو ہم نے بیان کیا ہے۔  
حضرت مسیح ناصری کا ایک نہایت سچا مقولہ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس ہمیں دیکھنا  
چاہیے کہ ان دونوں قسم کے طریقوں میں سے کس طریق کے نتائج زیادہ مفید اور زیادہ نفع مند ثابت ہوتے ہیں  
آیا اس طریق کے جو اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل اختیار کیا تھا یا اس طریق کے جو موجودہ زمانہ  
میں بعض یورپین اور امریکن مصلحین نے اختیار کیا ہے؟ اس جگہ ہم کسی تفصیلی بحث میں داخل نہیں ہو سکتے،  
صرف موٹے طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان ہر دو طریقوں کے نتائج کی نسبتی خوبی کا دو طرح پر امتحان کیا جاسکتا  
ہے۔ اول اس پہلو سے کہ ان طریقوں میں سے کس طریقہ کے نتیجہ میں زیادہ حقیقی آزادی قائم ہوئی۔ دوسرے  
اس پہلو سے کہ ان میں سے کس طریقہ کے نتیجہ میں آزاد شدہ غلاموں نے زیادہ ترقی کی۔ اور ہم دعویٰ کے  
ساتھ کہتے ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے وہ طریقہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو  
برس قبل اختیار کیا تھا اس طریقہ سے بدرجہا بہتر تھا، جو بعض مغربی مصلحین نے اس زمانہ میں اختیار کیا ہے۔  
ظاہر ہے کہ صرف نام کے طور پر کسی غلام کو آزاد کر دینا مگر غلامی کی اصل روح کو نہ مازنا ہرگز حقیقی آزادی کا فعل  
نہیں سمجھا جاسکتا، لیکن غور سے دیکھا جائے تو جو اصلاح مغربی مصلحین نے کی ہے وہ کسی صورت میں بھی اس  
نام نہاد اصلاح سے بڑھ کر نہیں۔ بیشک انھوں نے لاکھوں غلاموں کو آزاد کیا اور سیکھت حکما آزاد کیا، مگر  
وہ غلامی کی روح کو نہیں مار سکے بلکہ اس آزادی کے بعد بھی آزاد کرنے والوں اور آئندہ آزاد ہونے والوں  
کے دل و دماغ میں غلام بنانے اور غلام بننے کی روح اسی طرح زندہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی طور پر  
غلامی بھی نہ مٹی اور آقاؤں اور غلاموں کے تعلقات بھی سخت کشیدہ ہو گئے۔ امریکہ کی ہی مثال لے لو  
بیشک ریاستہائے متحدہ میں بظاہر لاکھوں حبشی غلاموں نے سیکھت آزادی حاصل کر لی مگر قطع نظر اس کے  
کہ اس عالمگیر آزادی کی وجہ سے ملک ایک خطرناک خانہ جنگی کی آگ سے شعلہ بار ہو گیا تھا۔ کیا اس وقت  
امریکہ کا حبشی غلام واقعی آزاد ہو گیا تھا؟ بلکہ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت تک بھی ملک کا کوئی قانون  
امریکہ کے حبشی غلام کو حقیقی آزادی دلا سکا ہے؟ کیا امریکہ کا گورا آدمی اپنے آزاد کردہ حبشی غلام کو آج تک



دُنیا کے بدترین غلاموں سے غلام بدتر نہیں سمجھتا؟ پھر کیا یہ آزاد شدہ حبشی اپنے آپ کو حقیقی طور پر امریکہ میں آزاد سمجھتا ہے؟ یقیناً امریکہ میں آزاد کرنے والے گورے لوگوں اور آزاد ہونے والے کالے حبشیوں کے تعلقات بین الاقوام تعلقات کی بدترین مثال ہیں۔ جو اس وقت دُنیا میں پائی جاتی ہے اور یہ حالت اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان غلاموں کے آزاد کرنے میں وہ طریق اختیار کیا گیا ہے جس سے غلام لوگ نام کو تو بیشک آزاد ہو گئے مگر ان کو حقیقی آزادی نہیں مل سکی اور آزاد کرنے والوں اور آزاد ہونے والوں کی ذہنیاتوں میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی طریق پر جو لوگ آزاد کئے گئے وہ گو تدریجی طور پر آزاد ہوئے مگر آزاد ہونے کے بعد وہ حقیقتہً آزاد تھے۔ یعنی ان کے جسم بھی آزاد تھے، اُن کی رُو میں بھی آزاد تھیں، ان کے خیالات بھی آزاد تھے، اُن کی ذہنیاتیں بھی آزاد تھیں اور ان آزاد شدہ غلاموں اور ان کے آزاد کرنے والے لوگوں کے درمیان وہ محبت و اخلاص کے تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ آج کی حقیقی اخوت بھی ان کے سامنے شرماتی ہے۔ میں جب اس زمانہ کے امریکن حبشی امام اور آج سے چودہ سو سال قبل کے عربی حبشی بلالؓ کے حالات پر نگاہ کرتا ہوں تو ایک عجیب منظر نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ دونوں شخص حبشی ہیں اور دونوں آزاد شدہ غلام ہیں۔ عربی غلام (یعنی بلالؓ) جب بادشاہ وقت (یعنی عمر بن الخطاب) سے ملنے کے لیے جاتا ہے تو باوجود اس کے کہ اُس وقت بڑے بڑے روساء عرب بادشاہ کی ملاقات کے انتظار میں دروازے پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ بادشاہ وقت بلالؓ کی خبر پا کر ان روساء عرب کو جو وہ بھی مسلمان ہی تھے نہیں بلاتا اور بلالؓ کو فوراً بلالیتا ہے اور جب بلالؓ ملاقات سے فارغ ہو کر چلا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد ان روساء عرب کی باری آتی ہے اور جب اس بادشاہ کی مجلس میں بلالؓ کا ذکر آتا ہے تو بادشاہ کہتا ہے ”بلالؓ ہمارا سردار ہے“ لیکن اس کے مقابلہ میں امریکہ کے آزاد شدہ حبشی امام کی کیا حیثیت ہے؟ دُنیا جانتی ہے کہ وہ اپنے آزاد کرنے والوں کے پاؤں کی ٹھوکریں کھاتا اور مجلسوں میں ذلت کی جگہوں میں بٹھایا جاتا اور ہر قسم کے مظالم سہتا اور دم نہیں مار سکتا۔ یہ اختلاف کیوں ہے؟ یقیناً اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام نے جو طریق غلاموں کی آزادی کا اختیار کیا، وہ حقیقی اصلاح کا طریق تھا۔ پس اس کے نتیجہ میں حقیقی آزادی پیدا ہوئی، لیکن مغربی مصلحین کی اصلاح ناقص اور اُن کا طریق غلط تھا۔ پس اس کے نتیجہ میں بیشک نام کو تو آزادی مل گئی، مگر غلامی کی رُو پر موت نہیں آئی اور ذہنیاتیں وہی کی وہی رہیں۔

دوسرا طریق اس سوال پر غور کرنے کا یہ ہے کہ یہ دیکھا جاوے کہ ان طریقوں میں سے کس طریق کے نتیجہ میں آزاد شدہ غلاموں نے زیادہ ترقی کی۔ سو مذکورہ بالا بحث کے بعد اس سوال کا جواب بھی مشکل نہیں رہتا۔ کیونکہ طبعاً وہی رستہ غلاموں کی زیادہ ترقی کا ہونا چاہیے، جس میں انہیں زیادہ حقیقی آزادی حاصل ہو۔



اور وہ وہی تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔ مگر عملاً بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس جہت سے بھی اسلامی طریق زیادہ کامیاب اور زیادہ مفید نظر آتا ہے کیونکہ اسلامی طریق پر آزاد ہونے والے لوگوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نظر آتی ہے جو ہر قسم کے میدان میں ترقی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے ہیں اور جنہوں نے مختلف شعبوں میں مسلمانوں میں لیڈر ہونے کا مرتبہ حاصل کیا۔ مثلاً جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صحابہ میں زید بن حارثہ ایک آزاد شدہ غلام تھے مگر انہوں نے اتنی قابلیت پیدا کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قابلیت کی وجہ سے بہت سی اسلامی مہموں میں انہیں امیر العسکر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابی تھے کہ خالد بن ولید جیسے کامیاب جرنیل بھی ان کی ماتحتی میں رکھے۔ پھر سالم بن معقل تھے جو ابو حذیفہ بن عتبہ کے معمولی آزاد کردہ غلام تھے، مگر وہ اپنے علم و فضل میں اتنی ترقی کر گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار صحابیوں کو قرآن شریف کی تعلیم کے لیے مسلمانوں میں مقرر فرمایا تھا اور اس معاملہ میں گویا انہیں اپنا نائب بننے کے قابل سمجھا تھا، ان میں ایک سالم بھی تھے۔ اسی طرح صحابہ کے بعد نافع مولیٰ ابن عمر اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور محول بن عبداللہ اور عطا بن ابی رباح اور عبداللہ بن مبارک اور محمد بن سیرین حدیث اور فقہ کے امام مانے جاتے تھے جن کی شاگردی کو بڑے بڑے جلیل القدر لوگ فخر خیال کرتے تھے۔ پھر حسن بصری تصوف میں اور مجاہد بن جبر علم قرأت میں کیتائے زمانہ تھے اور موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق علم تاریخ میں اتنا ذرا لعل تھے جن کے علم کا لوہا دنیا مانتی تھی۔ مگر یہ سب لوگ معمولی غلام سے اس مرتبہ کو پہنچے تھے۔ پھر ہندوستان کا خاندان غلاماں بھی جس کے بعض ممبروں نے سیاست اور ملک داری میں کمال پیدا کیا کسی معر فی کا محتاج نہیں۔ یہ درخشندہ مثالیں جو صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں (دورنہ اسلام کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے) اسلامی طریق آزادی کا ثمرہ ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں مغربی مصلحین کی اصلاح کا ثمرہ کیا ہے؟ کیا سارے یورپ و امریکہ اور سارے افریقہ و آسٹریلیا میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نظر آتی ہے کہ کبھی کسی آزاد شدہ غلام نے کسی میدان میں ایسی لیڈری اور امانت کا مرتبہ حاصل کیا ہو کہ آزاد کرنے والی قوم بھی اسے اپنا مقتدر تسلیم کرنے لگ جاوے؟ یہیں اقوام کی تاریخ کے عبور کا دعویٰ نہیں ہے لیکن جہاں شک ہمارا علم ہے یہیں مسیحی اقوام کے آزاد کردہ غلاموں میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان غلاموں میں سے کبھی کسی نے کوئی خاص نمایاں امتیاز پیدا کیا ہو بلکہ یہی نظر آتا ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی یہ لوگ معمولی درجہ کے انسان رہے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی طریق آزادی یقیناً بہت زیادہ نفع مند اور بہت زیادہ بابرکت تھا۔ اندر میں حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے کسی مصلح کا نام لینا صداقت کی ہشک مکرنا ہے۔ بیشک ہم ان لوگوں کے کام کو بھی قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی کوششوں کے مدح میں

مگر ہر شخص کی کوشش کا ایک مرتبہ ہوتا ہے اور حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحات کا وہ مرتبہ ہے کہ اُس کے مقابلہ میں کسی شخص کی کوشش کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ آج سے چودہ سو سال قبل جبکہ دُنیا غلامی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے اور غلاموں کی حالت جانوروں سے بدتر ہو رہی تھی اس وقت آپ کا غلاموں کی حمایت میں آواز اُٹھانا اور آئندہ کے لیے غلامی کے ظالمانہ طریقوں کو قطعی طور پر منسوخ کر کے موجود وقت غلاموں کی حالت کی اصلاح کے لیے نہایت دانشمندانہ عملی تدابیر اختیار کرنا اور پھر ان غلاموں کی آزادی کے متعلق پُر زور سفارشات کرنے کے علاوہ ایک ایسا پُر حکمت انتظام جاری کر دینا کہ جس کے نتیجہ میں یہ غلام اپنی حالت کو بھی بہتر بناتے جائیں اور ساتھ ساتھ لازماً آزاد بھی ہوتے جائیں اور حکومت کا یہ فرض مقرر کرنا کہ وہ غلاموں کی حالت کی اصلاح امدان کی تدبیر بھی مگر لازمی آزادی کے عمل کی سختی کے ساتھ نگرانی کرے اور پھر اس انتظام کو اس خوبی کے ساتھ چلانا کہ جو غلام آزاد ہوتے اور ان کی تعداد کروڑوں تھی وہ نہ صرف حقیقی معنوں میں آزاد ہوتے بلکہ وہ ملک و قوم کے نہایت مفید شہری بھی بن گئے اور ان میں سے وہ لوگ پیدا ہوتے جنہوں نے مسلمانوں میں امارت و امامت کا مرتبہ حاصل کیا جن کے سامنے ان کے آزاد کرنے والوں کی گردنیں بھی جھک گئیں۔ یہ وہ کام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور یہ وہ کام ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی پس عامی لوگوں کی طرح یہ اعتراض اُٹھانا کہ ابراہیم یا دوسرے مغربی لوگوں کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام غلاموں کو یکھنت کیوں نہیں آزاد کر دیا جذبات انسانی کا ایک محض سطحی اُبال ہے جس کے اندر کوئی بھی گہرائی نہیں۔

**اسلامی ممالک میں غلامی کیوں قائم رہی؟** اس موقع پر یہ سوال بھی پیدا کیا گیا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیم کا اصل منشاء یہ تھا کہ غلام آہستہ آہستہ

آزاد ہو جائیں تو پھر اسلامی ممالک میں موجود زمانہ تک غلامی کا سلسلہ کیوں جاری رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک ایک طرف تو اسلامی حکومت ترقی کرتی گئی اور اس کے اثر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور دوسری طرف مسلمان اسلامی تعلیمات کی اصل رُوح کو سمجھتے رہے اور اس پر کار بند رہے اُس وقت تک غلاموں کی آزادی کی تحریک نہایت سرعت کے ساتھ جاری رہی اور مسلمانوں کی کوشش سے کروڑوں غلام داغ غلامی سے نجات پا گئے، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اس زمانہ میں دُنیا میں غلاموں کی تعداد بیشمار اور بے حساب تھی اور دُنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں تھا جہاں نہایت کثرت کے ساتھ غلام نہ پائے جاتے ہوں۔ پس پیشتر اس کے کہ یہ نہ ختم ہونے والا خزانہ ختم ہوتا۔ ایک طرف تو اسلامی فتوحات کی رُو آہستہ آہستہ کمزور ہو کر بالآخر بالکل رُک گئی۔ اور دوسری طرف زمانہ نبوی کے بعد کے نتیجہ میں وہ فُور نبوت کی روشنی جس سے یہ سارا داغ و بہار تھا مسلمانوں کے دلوں میں مدھم پڑنی شروع ہو گئی۔ اور اسلامی تعلیمات کی حقیقت کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا وہ دلولہ انگریز ستون جیسے صحابہ بے کراٹھے تھے اور

جو صحابہ نے اپنے پیچھے آنے والوں کو ورثہ میں دیا تھا وہ مسلمانوں کے دلوں سے آہستہ آہستہ مٹنا شروع ہو گیا۔ بلکہ اس بیچ احوال کے زمانہ میں وہ لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی جہالت یا دنیا داری کے نتیجہ میں دین کو بگاڑ کر اسے کچھ کا کچھ رنگ دیدیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قوموں کی طرح جو ابھی تک غلامی کی نہایت محروہ صورت پر کار بند تھیں مسلمان بھی اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کو چھوڑ کر غلامی کی اس ظالمانہ صورت کی طرف لوٹ گئے جس کے استیصال کے لیے اسلام کھڑا ہوا تھا اور گو اس کج خیالی اور کج روی کے زمانہ میں بھی اسلامی ممالک میں غلاموں کی حالت دوسرے ممالک کی نسبت بحیثیت مجموعی اچھی رہی ہے۔ اور مسلمان لوگ ظاہری طور پر غلام رکھتے ہوئے بھی کبھی غلامی کی اصل روح کے حامی نہیں بنے اور اس کے مقابلہ میں ابی سینیا کے عیسائی ملک میں تو اس وقت تک غلامی کی وہ بھیانک صورت قائم ہے جسے دیکھ کر انسانیت شرماتی ہے اور یورپ و امریکہ کے مذہب اور تمدن عیسائی ممالک میں بھی ابھی تک غلامی کی روح پر موت نہیں آئی، لیکن کسی ہمسایہ قوم کی خراب تر حالت ہماری خرابی کے داغ کو دھو نہیں سکتی اور اس بات کی فوری اور شدید ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور اسلامی سوسائٹیاں پوری توجہ اور پوری کوشش کے ساتھ غلامی کے ظالمانہ طریق کو مثالے میں لگ جائیں اور دنیا کو پھر اس مبارک نقطہ پر لے آئیں جس پر آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب اے قائم کرنا چاہتے تھے اور جس کا مقصد دنیا سے غلامی اور اس کی رُوح کو مٹانا اور حقیقی آزادی اور حقیقی مساوات کا قائم کرنا تھا۔

غلاموں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت

یہیں اس بحث کو ان نہایت درجہ پیارے الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو اس مادی دنیا میں مقدس بائبل اسلام کے آخری الفاظ تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور انس بن مالک روایت کرتے ہیں۔

كَانَ آخِرُ كَلَامٍ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ يُغْزِيهِمْ بِنَفْسِهِمُ الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

یعنی آخری الفاظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنے گئے اس حال میں کہ آپ پر موت کا غرغره طاری تھا یہ تھے کہ الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ یعنی اے مسلمانو! میری آخری وصیت تم کو یہ ہے کہ نماز اور غلاموں کے متعلق میری تعلیم کو نہ بھولنا۔

اُس وقت جبکہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔ آپ کی وہ رفیق حیات بیویاں جنہوں نے ہر تنگی و ترشی میں آپ کا ساتھ دیا تھا آپ کے پاس تھیں۔ آپ کی لخت جگر صاحبزادی اور اس کے بچے اور آپ کے

دوسرے عزیز و اقارب بھی سامنے تھے۔ وفادار مہاجرین کی غلصہانہ رفاقت میں آپ کی عمر گزری تھی وہ بھی موجود تھے۔ جان نثار انصار جنہوں نے اپنے خون کے پانی سے اسلام کے پودے کو سنبھالا تھا وہ بھی قریب تھے اور یہ وقت بھی وہ تھا جس کے بعد آپ کو کسی اور کو نصیحت کے کرنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا اور آپ اس بات کو بھی جانتے اور محسوس کرتے تھے کہ ایسے وقت کی نصیحت آپ کی ساری نصیحتوں سے زیادہ وزن رکھے گی مگر آپ کی نظر ان لوگوں میں سے کسی پر نہیں پڑی اور اگر دنیا میں سے آپ نے کسی کو یاد کیا اور اس کی یاد نے موت کے غرغره میں بھی آپ کو بے چین کر دیا تو وہ یہی مظلوم غلام تھے۔ اللہ! اللہ! غلاموں کا یہ کیسا سچا دوست۔ کیسا درد مند مخلص تھا جو خدا نے دنیا کو عطا کیا مگر افسوس کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔

آئندہ غلامی کو روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

اب ہم اس بحث کے دوسرے سوال کو لیتے ہیں اور جو اس امر

سے تعلق رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ غلامی کے متعلق اصولی طور پر کیا تعلیم دی ہے یعنی موجودہ وقت غلاموں کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے آپ نے آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلہ اور غلام بنانے جانے کے سوال کے متعلق کیا اصولی احکام صادر فرمائے ہیں لیکن چونکہ گزشتہ بحث نے ہمارے اندازہ سے بہت زیادہ جگہ لے لی ہے اس لیے اگلی بحث کو ہم نہایت مختصر طور پر بیان کریں گے۔ سو اس کے متعلق سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ یہ بحث دراصل دو حصوں پر منقسم ہے۔ اول حقیقی غلامی کا سوال یعنی کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے کلیتہً اور مستقل طور پر محروم کر دینا۔ یہ صورت غلام بنانے کے ان طریقوں سے تعلق رکھتی ہے جو مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑے جانے کے علاوہ ہیں۔ یعنی غلام بنانے کے بہت کچھ ظالمانہ طریقے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دنیا کے تمام ممالک میں کم و بیش رائج تھے اور اسلام کے بعد بھی مختلف غیر اسلامی ممالک میں رائج رہے۔ دوسرے مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑنے جانے کا سوال جسے اسلامی تعلیم کی روشنی میں گویا ایک قسم کی غیر حقیقی غلامی کہہ سکتے ہیں۔

پہلے ہم مقدمہ ذکر بحث کو لیتے ہیں۔ سو اس کے متعلق جاننا چاہیے کہ جیسا کہ گزشتہ بحث میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسلام نے حقیقی غلامی کو یعنی غلامی کے ان ظالمانہ طریقوں کو جو مذہبی جنگوں میں قیدی پکڑے جانے کے علاوہ ہیں یکدم اور قطعی طور پر منسوخ کر دیا تھا مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس بارے میں کوئی معین اور منصوص اسلامی احکام پیش کریں ہم اس کے متعلق دو منفی قسم کے دلائل ہدیہ ناظرین کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ ہم نے جو اس جگہ حقیقی اور غیر حقیقی غلامی کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ کوئی اسلامی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ہم نے خود اپنی طرف سے اسلامی تعلیم کی روشنی میں بحث کی سہولت کے لیے یہ اصطلاح قائم کی ہے۔ وَیَسْئَلُ أَنْ يُضْطَلَعَ



پہلی دلیل یہ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ اصولی طور پر اسلام بڑی سختی کے ساتھ ظلم و تعدی کے طریق سے منع فرماتا ہے اور انسانی آزادی اور انسانی مساوات کا نہایت زبردست حامی ہے اور یہ تمام باتیں حقیقی غلاموں کے طریق سے بعد المشرقین رکھتی ہیں وہ واضح اور پُر زور تعلیم جو اسلام نے حاضر اوقات غلاموں کے ساتھ عسنانہ اور مساویانہ سلوک کئے جانے اور ان کی آزادی کے متعلق دی ہے اور جس کا ایک خاکہ اوپر درج کیا جا چکا ہے وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اسلام غلامی کے ظالمانہ طریق کی تائید میں نہیں ہو سکتا۔ انسانی عقل ہرگز اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ کہ غلاموں کو اپنا بھائی سمجھو اور انہیں اپنے گھر کے آدمیوں کی طرح رکھو اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کرو اور پھر تجول تجول ان کی حالت بہتر ہوتی جاوے اور وہ دنیا میں آزاد زندگی گزارنے کے قابل بنتے جائیں انہیں آزاد کرتے جاؤ۔ اسلام میں یہ تعلیم بھی دی جا سکتی تھی کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے کلیتہً محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہے۔ ان دونوں قسم کی تعلیم میں بعد المشرقین ہے اور وہ کبھی بھی کسی ایک ہی شخص کی تعلیم کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ پس غور کیا جاوے تو دراصل وہ تعلیم ہی جس کا خاکہ اوپر دئے مضمون میں درج کیا گیا ہے اس بات کے ثبات کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں حقیقی غلامی کی تعلیم نہیں دی گئی۔

دوسری دلیل جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز نہیں سمجھا گیا یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کے کسی حصہ میں یہ حکم موجود نہیں کہ کسی آزاد شخص کو اس کی آزادی کے جائز حق سے محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنالینا جائز ہے یا یہ کہ اگر کسی آزاد شخص کو غلام بنانا ہو تو اس کا یہ یہ طریق ہے۔ حالانکہ غلامی کے دوسرے مسائل مثلاً غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے اور انہیں آزاد کرنے کے متعلق اسلامی شریعت میں نہایت تفصیلی احکام موجود ہیں۔ پس غلاموں کے بارے میں دوسرے ہر قسم کے مسائل کا پایا جانا، لیکن غلام بنانے کے سوال کے متعلق قطعاً کسی جواز کا پایا نہ جانا اس بات میں ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ دراصل اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز ہی نہیں سمجھا گیا۔ میں نے بہت تلاش کی ہے مگر مجھے کسی قرآنی آیت یا کسی روایت میں خدا یا اس کے رسول کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ کسی آزاد انسان کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہے یا یہ کہ کسی آزاد شخص کو غلام بنانا ہو تو اس کا یہ طریق ہے۔ حالانکہ اگر اسلام میں کسی آزاد انسان کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز ہوتا تو غلامی کے جملہ مسائل میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر اور سب سے زیادہ نازک مسئلہ جو توضیح و تفسیر کا محتاج تھا اور جس میں ایک نہایت واضح اور منصوص حکم دیئے جانے کی ضرورت تھی وہ یہی غلام بنانے کا مسئلہ تھا مگر تنصیص و توضیح تو الگ رہی قرآن و حدیث میں اس کا ذکر تک نہیں ہے جو اس بات کی ایک یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں کسی آزاد شخص کو حقیقی طور پر غلام بنانا جائز نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہمارے دعویٰ کی بنیاد صرف منہی قسم کے دلائل پر نہیں ہے بلکہ خدا کے فضل سے اسلامی شریعت میں نہایت واضح اور منصوص طور پر یہ حکم موجود ہے کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز



آزادی سے محروم کر کے غلام بنانا ایک سخت ممنوع اور حرام فعل ہے جس کے متعلق قیامت کے دن خدا کے حضور سخت مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى ثَلَاثَةٌ أَنَا خَمَمْتُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أَحَطَى بِثَمَّةٍ حَذَرُوا رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَيْكَلُ ثَمَنَهُ وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ يَجِيرًا فَأَسْتَوُوا فِي مَنَّهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ ۖ

یعنی ”ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جنگ کروں گا۔ اول وہ شخص جو میرا واسطہ دیکر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر غلامی کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی آزاد شخص کو غلام بناتا ہے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جاتا ہے اور تیسرے وہ جو کسی شخص کو کام پر لگا تا ہے اور پھر اس سے کام تو پورا لے لیتا ہے مگر اس کی مزدوری اُسے نہیں دیتا۔“

اور دوسری روایت میں یوں آتا ہے :-

عَنْ ابْنِ عُمَرَ ..... لَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ صَلَاةٌ وَرَجُلٌ اخْتَبَدَ مُعْتَدِرًا۔ الخ

یعنی ”ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا ہے کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی نماز میرے حضور ہرگز مقبول نہیں ہوگی اور میں ان سے قیامت کے دن لڑوں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر یہ عہدی کرتا ہے۔ دوسرے وہ جو اُسے غلام بناتا ہے جسے خدا نے آزاد رکھا ہے اور تیسرے وہ جو مزدور سے کام لیتا ہے اور پھر اس کی مزدوری نہیں دیتا۔“

ان حدیثوں میں جن وضاحت اور تعین کے ساتھ اور جن زوردار طریق پر حقیقی غلامی کو منسوخ کیا گیا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے اور پھر یہ حدیثیں بھی حدیث کی اس قسم میں داخل ہیں جو محدثین کی اصطلاح میں حدیث قدسی کہلاتی ہے یعنی جو ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہے مگر اس میں حکم اور الفاظ خدا کے ہوتے ہیں۔ اب اس واضح اور صریح تعلیم کے ہوتے ہوئے کسی کا یہ کہنا کہ اسلام میں حقیقی غلامی کو جائز رکھا گیا ہے یعنی اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی آزاد انسان کو اس کی جائز آزادی کے حق سے محروم کر کے حقیقی طور پر غلام بنالیا جائے ایک انتہائی درجہ کا ظلم ہے جس کے ارتکاب کی کوئی ریاست دار شخص جرات نہیں کر سکتا۔

## جنگی قیدیوں کا مسئلہ

اب ہم جنگی قیدیوں کے سوال کو لیتے ہیں اور درحقیقت اگر اسلام میں غلام بنانے کے جواز کی کوئی صورت سمجھی جاسکتی ہے تو وہ صرف اسی سوال کے ماتحت آتی ہے لیکن جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا غلامی کی یہ قسم دراصل حقیقی غلامی نہیں ہے بلکہ ایک محض جزوی مشابہت کی وجہ سے اسے یہ نام دیدیا گیا ہے اور پھر اس غیر حقیقی غلامی کو بھی اسلام نے ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ وہ ایک عالمگیر چیز نہیں رہتی بلکہ بعض خاص قسم کے حالات میں محدود ہو جاتی ہے اس بحث میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ جیسا کہ تاریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے غلامی کی ابتداء دُنیا میں جنگی قیدیوں سے ہی ہوئی تھی اور بعد میں آہستہ آہستہ دوسرے ظالمانہ طریق ایجاد ہوتے گئے جس کی وجہ سے بالآخر غلامی جو دراصل ابتدائی زمانہ کے حالات کا ایک لازمی نتیجہ تھی ایک بھیانک صورت اختیار کر گئی اور بھائے ظلم کو روکنے کا باعث بننے کے جو اس کی اصل غرض تھی وہ غلط ظلم و ستم کا ایک خطرناک آلہ بن گئی ابتداء یہ طریق تھا اگر بعد میں اس کے ساتھ اور اور ظالمانہ طریق شامل ہو گئے (جنہیں نہ صرف اسلام نے مٹا دیا بلکہ اس ابتدائی طریق کو بھی مزید پاک و صاف کر کے اُسے ایک نہایت پاکیزہ صورت دیدی) کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر حملہ آور ہو کر اُسے صفحہ دنیا سے مٹا دینے یا اس کی آزادی کو چھین کر اُسے بلا وجہ اپنے ماتحت کر لینے کے ذریعے ہوتی تھی تو مؤخر الذکر قوم غلبہ حاصل کرنے پر حملہ آور قوم کے آدمیوں کو قید کر کے اپنے پاس روک لیتی تھی کیونکہ اگر ظالم لوگوں کو اس طرح روک لینے کا طریق اختیار نہ کیا جاتا تو بین الاقوام جنگوں کا کبھی بھی خاتمہ نہ ہو سکتا اور ظالم لوگ اپنی دراز دستیوں اور امن شکن کارروائیوں سے باز نہ آتے اور ظلم و ستم کا میدان وسیع ہوتا چلا جاتا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس قسم کی غلامی کا طریق ابتدائی زمانہ میں تمام اقوام عالم میں کم و بیش پایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بنو اسرائیل میں بھی جو بیویوں کی اولاد تھے اور کثیر التعداد بیویوں کے تربیت یافتہ تھے یہ طریق کثرت کے ساتھ رائج تھا بلکہ اسرائیلی شریعت نے خود اس کا حکم دیا تھا اور اگر غور کیا جاوے تو اس ابتدائی زمانہ میں مذہبی جماعتوں کے لیے اس کی ضرورت دوسری قوموں کی نسبت بھی زیادہ تھی۔ کیونکہ جیسا کہ قاعدہ ہے مذہبی سلسلوں کی سخت مخالفت ہوتی تھی اور دوسری قوم میں انہیں تلوار کے زور سے شانے کے لیے کھڑی ہو جاتی تھیں پس انہیں بھی دفاع اور خود حفاظتی میں غلامی وغیرہ کے طریق اختیار کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح مسیحی قوم میں بھی جو دراصل بنو اسرائیل ہی کی ایک شاخ تھے غلامی کا سلسلہ جاری رہا بلکہ ایٹک بھی حبشہ کے عیسائی ملک میں جو اس وقت تک ابتدائی مسیحی روایات پر بڑی سختی

لے استنباط باب ۲۰ آیت ۱۳، ۱۴ پولوس ۱۶ و پطرس ۱۶ موجودہ ایڈیشنوں میں اس جگہ غلام کی جگہ نوکر کا لفظ ہے مگر جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے اصل مفہوم غلام ہی کا ہے۔

کے ساتھ قائم ہے غلامی کا رواج پایا جاتا ہے بلکہ شاید اس ملک کی غلامی دوسرے ممالک کی غلامی سے بھی سخت تر ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی قدیم آریہ قوم میں بھی غلامی کا رواج تھا۔ چنانچہ یہ شور و غبرہ جو آج تک ہندوستان میں پائے جاتے ہیں یہ اسی سلسلہ غلامی کا ایک ناگوار بقیہ ہیں۔ الغرض ابتدائی زمانوں میں غلامی کا رواج کم و بیش سب ممالک اور سب اقوام میں پایا جاتا تھا اور یہ ان زمانوں کے حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس کی غرض ظلم و ستم کا سد باب تھی اور پھر یہ کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت بلکہ حقیقی ضرورت صرف مذہبی جماعتوں کو تھی جو سب سے زیادہ مظالم کا تختہ مشق بنتی تھیں اور لوگ ان کے مذہب کو تباہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس رنگ کی غلامی جسے اسلام نے اور بھی پاک و صاف کر دیا حتیٰ کہ وہ حقیقتہً ایک محض قید کی صورت اختیار کر گئی کوئی نا انصافی نہیں تھی۔ کیونکہ جو قوم دوسروں کے مذہب کو تلوار کے زور سے مٹانا چاہتی ہے اور ظالم و سفاک ہے اور امن شکنی کا طریق اختیار کر کے ملک میں فتنہ و فساد اور قتل و غارت کا بیج بونی ہے، وہ ہرگز آزادی کی حقدار نہیں سمجھی جاسکتی۔ جیسے کہ ایک چور یا ٹھگ یا ڈاکو جیل خانہ سے باہر رہنے کا حقدار نہیں سمجھا جاتا اور یہ مظالم سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پیش آئے۔ ہمارے ناظرین بھولے نہیں ہوں گے کہ کفار نے مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے نہایت دردناک عذاب دیتے تھے ان کے دین و مذہب کو بزور مٹانے کے لیے مسلمانوں کے خلاف تلوار نکالی تھے اور ان کے محبوب آقا کے مقدس خون سے اپنے ناپاک ہاتھوں کو رنگنا چاہا۔ اور کمزور و مگر بے گناہ اور آزاد مسلمانوں کو غلاموں کی طرح اپنے پاس قید رکھا تاکہ اور بے گناہ مسلمانوں کو ذلیل ترین دھوکے کے ساتھ قید کر کے اپنا غلام بنایا اور پھر ان میں سے بعض کو نہایت ظالمانہ طریق پر تہ تیغ کیا۔ اور ان کی عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنانے کے لیے سازشیں کیں اور لڑائیاں لڑیں یہ اور ان کے معزز شہیدوں کا مثلہ کیا اور ان کے ناک کان کاٹ کر اپنے گلوں میں ہار پہنتے تھے اور ان کی معزز ستورت پر وحشیانہ حملے کر کے ان کے حمل گرائے تھے اور ان کی عصمت شعار بیبیوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں ہلاک کیا۔ ان حالات میں اگر ان ظالموں کو ان کی آزادی سے محروم کر کے مستقل طور پر غلام بنالیا جاتا تو یہ ہرگز نا انصافی نہیں تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سراسر احسان تھا کہ آپ نے

۱۔ زرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۶۶ تا ۲۷۰ ۲۔ سورۃ بقرہ ۲۲۱ ۳۔ سورۃ انفال ۲۱ ۴۔ سورۃ انفال ۱۱

۵۔ بخاری و کتب تاریخ حالات واقعہ ربیع و بئر معونہ

۶۔ البوداد و باب فی خبر النضیر و زرقانی حالات غزوہ ذی قرد

۷۔ کتب احادیث و تاریخ حالات غزوہ احد ۸۔ ابن ہشام حالات قیدیان بدر و ذکر الوالحام بن الزبج

۹۔ اسد الغابہ حالات ۱۰۔ و نیز زرقانی جلد ۱ صفحہ ۲۶۶

ایسے لوگوں میں سے بھی اکثر کو معاف فرما دیا۔ اور ان میں سے جو لوگ جنگ میں پکڑے جا کر قیدی بنے ان کی آزادی میں بھی سوائے وقتی حد بندی کے کوئی روک نہیں ڈالی اور اس وقتی حد بندی کے زمانہ میں بھی آپ نے قیدیوں کے آرام و آسائش کے متعلق ایسے تاکید کی احکام صادر فرمائے کہ ان سے متاثر ہو کر صحابہ نے اپنی قمیصیں اتار کر قیدیوں کو ہاں اپنے خون کے پیاسے قیدیوں کو دیدیں۔ خود خشک کھجوروں پر گزارہ کیا۔ اور انہیں پکا ہوا کھانا دیا۔ آپ پیدل چلے اور انہیں سوار کیا۔ کیا دنیا کی کسی قوم میں کسی زمانہ میں اس کی مثال ملتی ہے؟

جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ تین قرآنی آیتوں میں آجاتا ہے جن میں سے دو تو خاص جنگی قیدیوں کے متعلق ہیں اور ایک اصولی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَتَّخِذَ لَهٗ أَشْرَىٰ حَتَّىٰ يُخْلَصَ فِي الْأَرْضِ ثَرْيْدُ ذٰلِكَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيْدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ“

یعنی نبی کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ اس کے لیے جنگی قیدی پکڑے جائیں حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ کسی میدان میں اچھی طرح عملی جنگ نہ ہو۔ لے لے مسلمانو! تم قریب کے فوائد پر نگاہ رکھتے ہو (کہ قیدی پکڑنے میں جلدی کی جاوے تاکہ تم ان کے فدیہ کی رقم سے دشمن کے مقابلہ کی تیاری کر سکو) مگر اللہ تعالیٰ انجام کار کو دیکھتا ہے (اور چونکہ انجام کے لحاظ سے یہ طریق پسندیدہ نہیں اور اخلاقی طور پر اس کا اثر خراب ہے اس لیے وہ تمہیں اس طریق سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے) اور اگر تمہیں دشمن کی تعداد و طاقت کا خوف ہو تو جانو کہ اللہ تعالیٰ سب طاقتوں پر غالب ہے اور وہ حکیم یعنی تمہاری حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کمزوری اور دشمن کی طاقت کے خیال سے یا فدیہ کے ذریعہ اپنی مالی حالت کو مضبوط بنانے کی غرض سے دشمن کے قیدی پکڑنے کے معاملہ میں جلدی اور بے احتیاطی سے کام نہیں لینا چاہیے کہ جہاں بھی دشمن کو کمزور پایا قیدی پکڑنے شروع کر دیئے یا میدان جنگ میں عملی مقابلہ ہونے سے پہلے ہی قیدی پکڑ لیے۔ بلکہ مسلمانوں کو صرف اس صورت میں قیدی پکڑنے کی اجازت ہے کہ میدان جنگ میں عملاً دشمن کا مقابلہ ہو اور لڑائی کے بعد قیدی پکڑے جائیں۔ اس اسلامی تعلیم میں جو بین الاقوامی ضابطہ جنگ کی اعلیٰ ترین بنیاد پر قائم ہے۔ جنگی قیدیوں کی تعداد اور وسعت کو امکانی طور پر تنگ سے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا گیا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کا منشاء یہ تھا

۱۔ بخاری کتاب الجہاد باب المكسوة للانساری ۲۔ ابن ہشام حالات قیدیان بدر

۳۔ میور حالات قیدیان غزوہ بدر ۴۔ سورة الفال : ۶۸



کہ سوائے ان صورتوں کے جو لابدی اور اٹل ہوں حتیٰ الوسع جنگی قیدی نہیں پکڑنے چاہئیں۔  
پھر فرماتا ہے :-

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْبَثْتُمْهُمْ فَشْدَدُوا  
أَنُوفًا ۖ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ ۖ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الرَّحْدُ أَذْرَاهَا ۚ

یعنی "اے مسلمانو! جب کفار کے ساتھ تمہاری جنگ ہو تو خوب جم کر لڑو اور ظالموں کو قتل  
کرو اور جب اچھی طرح جنگ ہوئے تو اس کے بعد دشمن کے آدمیوں میں سے قیدی پکڑو۔  
پھر اگر اصلاح کی امید ہو اور حالات مناسب ہوں تو ان قیدیوں کو بعد میں یونہی احسان کے  
طور پر چھوڑ دو یا مناسب فدیہ لیکر انہیں رہا کر دو اور یا اگر ضروری ہو تو انہیں قید میں ہی رکھو  
حتیٰ کہ جنگ ختم ہو جاوے اور اس کے بوجھ تمہارے سروں سے اتر جاویں ۝

یہ آیت جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی شریعت میں بطور بنیادی پتھر کے ہے جس میں وہ مختلف  
صورتیں بتا دی گئی ہیں جو قیدیوں کے معاملہ میں مختلف حالات کے ماتحت اختیار کی جاسکتی ہیں۔  
اور وہ تین ہیں :-

اولیٰ: بطور احسان چھوڑ دینا۔ دوم: فدیہ لیکر چھوڑ دینا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے  
پتہ لگتا ہے کہ فدیہ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں (ا) نقد فدیہ خواہ وہ یکمشت اور فوری ادائیگی  
کی صورت میں ہو یا مکاتبت کے اصول پر جس کی مفصل بحث اوپر گذر چکی ہے (ب) مسلمان قیدیوں  
کے ساتھ تبادلہ (ج) کوئی مناسب خدمت لے لینا مثلاً اگر قیدیوں کو کوئی فن آتا ہو تو ان کے ساتھ یہ شرط  
کر لینا کہ اگر وہ بعض مسلمانوں کو یہ فن سکھادیں تو رہا کر دیئے جائیں گے۔

سوم: قید کی حالت کو ہی جنگ کے اختتام تک لبا کر دینا اور جنگ کے اختتام سے اس کا کامل اختتام  
مراد ہے جبکہ نہ صرف جنگی کارروائیوں کا سلسلہ عملاً ختم ہو جاوے بلکہ وہ بوجھ بھی جو اس کی وجہ سے ملک  
اور قوم پر پڑے ہوں اور جن کی ذمہ داری دشمن قوم پر بھی جاوے دور ہو جائیں۔ جیسا کہ قرآنی الفاظ ذہبیہ اور لاد  
میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ آخری صورت اس لیے تجویز کی گئی ہے کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ نہ تو کفار  
کے قیدیوں کو احسان کے طور پر چھوڑنا قرین مصلحت ہو اور نہ ہی وہ یا ان کے رشتہ دار اپنی ضیاع یا عیال  
کی وجہ سے فدیہ ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو پھر انہیں جنگ کے حقیقی اختتام تک قید رکھا جاسکے تاکہ ان  
کے رہا ہونے سے مسلمانوں کی مشکلات اور خطرات میں اضافہ نہ ہو۔ اور یہی وہ صورت ہے جسے اسلام میں  
غلامی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ مگر غور کیا جاوے تو دراصل



یہ غلامی نہیں بلکہ محض ایک قید ہے اور پھر اس قید یا غیر حقیقی غلامی کو بھی اسلام نے ایک اصولی قاعدہ کے ساتھ مشروط و محدود کر دیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوْذِقْتُمْ بِهِ وَلَيْسَ صَبْرُكُمْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّلْمُضَافِرِينَ ۝

یعنی "اے مسلمانو! اگر تم کفار کے مقابلہ میں انتقام اور سزا کے طریق پر کوئی سختی کرنا مناسب خیال کرو تو ضروری ہے کہ تمہاری سختی اس سختی سے تجاوز نہ کرے جو کفار تمہارے خلاف کرتے ہوں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ تم کوئی ایسی سختی نہ کرو جس میں کفار نے سبقت اور پہل نہ کی ہو اور اگر تمہارے لیے صبر کرنا ممکن ہو تو پھر صبر ہی سے کام لو کیونکہ صبر کرنا بہتر ہے"

اس اصولی آیت کے ماتحت جنگی قیدیوں کے متعلق وہ صورت جو قید کی حالت کے لمبا کے جانے سے تعلق رکھتی ہے مختلف رنگ اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کفار مسلمان قیدیوں سے خدمت لیتے ہوں تو مسلمان بھی کفار کے قیدیوں سے مناسب خدمت لے سکتے ہیں۔ مگر یہ خدمت بہر حال ان شرائط کے ماتحت ہوگی جو غلاموں وغیرہ سے خدمت لینے کے متعلق اسلام نے مقرر فرمائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ دیا جاوے اور ایسا کام نہ دیا جاوے جسے آقا خود کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسی طرح اگر کفار مسلمان قیدیوں کو بجائے قومی اور ملکی قید خانوں میں رکھنے کے اپنے افراد میں تقسیم کر دیتے ہوں تو مسلمان بھی کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد کی سپردگی میں دے سکتے ہیں۔ وغیرہ ذالک بہر حال یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی تفصیلات میں جو صورت بھی اختیار کی جاوے وہ کسی مخصوص اسلامی حکم کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ یہ ضروری ہے کہ قید کا سلسلہ جنگ کے اختتام پر لازماً ختم کر دیا جاوے یا یہ کہ قیدی محض دشمن کی فوج کا سپاہی ہونے کی وجہ سے قتل نہ کیا جاوے یا یہ کہ قیدیوں سے خدمت ان کی طاقت اور حیثیت کے مطابق لی جاوے یا یہ کہ قیدیوں کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھا جائے وغیرہ ذالک ۛ

یہ وہ تعلیم ہے جو جنگی قیدیوں کے متعلق اسلام دیتا ہے۔ اب ناظرین خود انصاف کے ساتھ غور کریں کہ خواہ نام کے لحاظ سے اے غلامی کہہ دیا جائے مگر کیا اس تعلیم میں کوئی حقیقت غلامی کی پائی جاتی ہے؟ کیا آج کل کی حکومتیں جنگی قیدی نہیں پکڑتیں؟ کیا آج کل کی حکومتیں جنگی قیدیوں سے خدمت

نہیں لیتیں؟ پھر کیا آجکل کی حکومتیں جنگی قیدیوں کی قید کے عرصہ کو جنگ کے لمبا ہو جانے کی صورت میں لمبا نہیں کر دیتیں؟ جب یہ سب کچھ ہر قوم میں ہوتا ہے اور اب بھی ہوتا ہے اور ہر زمانہ میں بین الاقوامی قانون اسے جائز قرار دیتا ہے تو پھر از روئے انصاف اس بنا پر اسلام اور بانی اسلام پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ اسلام کا ایک احسان ہے کہ اس نے اس جنگی ضابطہ میں نرمی اور شفقت کے عنصر کو نمایاں کر کے دنیا کے امن اور اتحاد بین الاقوام کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ باقی رہا انفرادی قبضہ کا سوال۔ سو یہ درست ہے کہ ابتداء میں کفار کے قیدی عام طور پر مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے اور دراصل یہی ایک بات ہے جو اس قانون کو غلامی کا رنگ دینے والی سمجھی جاسکتی ہے مگر غور کیا جاوے تو یہ بات ان حالات میں جن کے ماتحت اسے اختیار کیا جاتا رہا ہے ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے اور نہ اسے حقیقی غلامی سے یعنی غلامی کی اس اصطلاح سے جو غیر اسلامی دنیا میں رائج ہے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ اول تو یہ طریق اسلام میں بالذات اختیار نہیں کیا گیا اور نہ مخصوص تعلیم میں جو اسلام جنگی قیدیوں کے متعلق دیتا ہے اس کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک جوانی تدبیر تھی جو کفار کے غلامانہ رویہ کی وجہ سے اختیار کی گئی تھی۔ یعنی چونکہ کفار مسلمان قیدیوں کو غلام بنا کر اپنے افراد میں تقسیم کر دیتے تھے اس لیے انہیں ہوش میں لانے کی غرض سے اسلام میں بھی کفار کے قیدیوں کو مسلمانوں کی انفرادی حراست میں دے دینے کا طریق اختیار کیا گیا۔ مگر پھر بھی اسلام نے ان قیدیوں کو اس رنگ میں غلام بنانے کی اجازت نہیں دی جیسا کہ کفار بناتے تھے نیز یہ شرط کر دی کہ جنگ کے اختتام پر وہ لازماً آزاد کر دیئے جائیں۔ دوسری وجہ انفرادی حراست کے طریق اختیار کئے جانے کی یہ تھی کہ اس زمانہ میں شاہی قید خانوں کا دستور نہیں تھا بلکہ دشمن کے قیدی فوج قوم کے افراد میں تقسیم کر دیئے جاتے جو انہیں اپنی زیر نگرانی رکھتے تھے اور یہی طریق ابتداء میں اسلام میں رائج رہا۔ پس درحقیقت یہ غلامی نہیں تھی۔ بلکہ قیدیوں کے رکھنے کا ایک سسٹم تھا جو بعد میں آہستہ آہستہ بدل گیا اور اس کی جگہ شاہی قید خانوں کا طریق قائم ہو گیا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق تھا یہ طریق قیدیوں کے لیے ہرگز تکلیف نہیں تھا بلکہ یقیناً اس میں ان کو آجکل کے شاہی قیدیوں کی نسبت بھی زیادہ آرام ملتا تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُر زور تعلیم اور حکومت کی چوکس نگرانی کی وجہ سے کفار کے قیدی مسلمانوں کے جس خاندان میں رہتے تھے اس کے نوکر اور خادم بن کر نہیں رہتے تھے بلکہ خاندان کے ممبر سمجھے جاتے تھے اور ان کی خاطر تو واضح مہمانوں کی طرح ہوتی تھی، چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کو جو عموماً اسلام

کے بدترین دشمن تھے مسلمانوں نے اس آرام و آسائش کے ساتھ رکھا کہ وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور ان میں سے کئی محض اس خشن سلوک سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ الغرض اس نام نہاد غلامی میں بھی جس کی اسلام اجازت دیتا ہے اسلام نے احسان و مروت کا وہ اعلیٰ نمونہ قائم کیا جو آج کل کی آزادی کی برکات کو بھی شرماتا ہے، لیکن بہر حال چونکہ یہ طریق ایک محض جوانی رنگ رکھتا تھا اس لیے وہ ان خاص حالات کے ساتھ مخصوص سمجھا جائیگا جن کے جواب میں وہ اختیار کیا گیا۔ اور اسی لیے اب اس زمانہ میں یہی فتویٰ ہے کہ چونکہ آج کل شاہی قیدیوں کا دستور قائم ہو گیا ہے اور مسلمان قیدیوں کو کفار غلام نہیں بناتے اس لیے شریعت اسلامی کے اصولی حکم کے ماتحت اب مسلمانوں کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد میں تقسیم کر کے ایک رنگ غلامی کا پیدا کریں؛ چنانچہ مقدس بانی سلسلہ احمدیہ جن کا دعویٰ خدا کی طرف سے اس زمانہ کے لیے مأمور و مصلح ہونے کا تھا تحریر فرماتے ہیں:

”یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے زمانہ میں اسلام کے مقابل پر جو کافر کھلاتے ہیں انہوں نے یہ تعدی اور زیادتی کا طریق چھوڑ دیا ہے اس لیے اب مسلمانوں کے لیے بھی روا نہیں کہ ان کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنائیں کیونکہ خدا قرآن شریف میں فرماتا ہے جو تم جنگجو فرقہ کے مقابل پر صرف اس قدر زیادتی کرو جس میں پہلے انہوں نے سبقت کی ہو۔ پس جبکہ اب وہ زمانہ نہیں ہے اور اب کافروں کی حالت میں مسلمانوں کے ساتھ ایسی سختی اور زیادتی نہیں کرتے کہ ان کو اور ان کے مردوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بنادیں بلکہ وہ شاہی قیدی سمجھے جاتے ہیں اس لیے اب اس زمانہ میں مسلمانوں کو بھی ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔“

خلاصہ کلام یہ کہ جنگی قیدیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کے اصل الاصول صرف دو ہیں۔ یعنی اول یہ کہ حتی الوسع قیدی پکڑنے میں جلدی نہ کی جاوے اور صرف انتہائی حالات میں عملی جنگ ہونے کے بعد قیدی پکڑے جائیں۔ دوم یہ کہ قیدی پکڑنے کے بعد حالات کے ماتحت یا تو انہیں بلا فدیہ احسان کے طور پر چھوڑ دیا جاوے اور یہ سب زیادہ پسندیدہ صورت ہے اور یا مناسب فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جاوے اور یا اگر ضروری ہو تو اختتام جنگ تک ان کی قید کے سلسلہ کو لمبا کر دیا جاوے اس سے زیادہ جنگی قیدیوں کے متعلق کوئی منصوص تعلیم اسلامی شریعت میں پائی نہیں جاتی؛ البتہ ایک عام قاعدہ کے طور پر اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ اگر سیاسی اغراض کے ماتحت کفار کے متعلق کوئی سخت جوانی تدبیر اختیار کی جانی ضروری ہو تو وہ اس شرط کے ماتحت اختیار کی جاسکتی ہے کہ اول اس میں کوئی ایسی سختی نہ کی جاوے جس میں کفار نے خود پہل نہ کی ہو اور دوسرے وہ اسلام کی کسی دوسری منصوص تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ کفار

کے قیدیوں کا مسلمان افراد میں تقسیم کر دیا جانا اسی عام قاعدہ کے ماتحت تھا، لیکن چونکہ آجکل کفار مسلمانوں کے قیدیوں کو غلام نہیں بناتے اور شاہی قیدیوں کے طور پر رکھتے ہیں۔ اس لیے اس زمانہ میں مسلمانوں کے لیے بھی ناجائز ہے کہ وہ کفار کے قیدیوں کو مسلمان افراد میں تقسیم کر کے کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں۔

کیا قیدیوں کو قتل کیا جاسکتا ہے؟ یہ سوال کہ آیا قیدیوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مجمل جواب اوپر گزر چکا ہے کہ اسلام اس کی اجازت

نہیں دیتا، لیکن چونکہ اس معاملہ میں بعض مسلمان علماء نے بھی اختلاف کیا ہے اور مسیحی مؤرخین نے بھی اسے اعتراض کا نشانہ بنایا ہے اس لیے اس کے متعلق کسی قدر تشریح کے ساتھ لکھنا ضروری ہے سو سب سے پہلے تو جانا چاہیے کہ سورہ محمد کی آیت سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے نہایت واضح طور پر پتہ لگتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور قرآنی فیصلہ کے بعد کسی کو حق نہیں ہے کہ کوئی اور طریق تجویز کرے، لیکن ناظرین کی مزید تسلی کے لیے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآنی آیت کے جو معنی ہم نے کئے ہیں اس زمانہ کی اختراع نہیں ہے بلکہ یہی معنی صحابہ بھی کرتے تھے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ چنانچہ حدیثیں روایت آتی ہے کہ:-

عَنْ الْحَسَنِ أَنَّ الْحَجَّاجَ أَقْبَى بِأَسِيرٍ فَقَالَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قُمْ فَأَقْتُلْهُ  
فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ مَا بِهِذَا أَمْرُنَا لَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى حَتَّىٰ إِذَا نَحْنُ نَقْتُلُكُمْ وَهُمْ  
فَشَدُّوا أَلْوَتَانِي فَأَمَّا مَتَىٰ بَعْدُ وَإِنَّمَا فِدَاءُ لِي

یعنی "حسن روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حجاج کے سامنے ایک قیدی پیش ہوا اس وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی پاس تھے۔ حجاج نے ابن عمرؓ سے کہا "آپ اٹھیں اور اس قیدی کی گردن اڑا دیں" ابن عمرؓ نے جواب دیا۔ ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ جب جنگ میں قیدی پکڑے جائیں تو ان کو یا تو احسان کے طور پر چھوڑ دینا چاہیے یا فدیہ لے کر رہا کر دینا چاہیے۔ قتل کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے"

اسی طرح حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح سے روایت آتی ہے کہ:

لَا تَقْتُلُوا الْأَسْرَىٰ يُتَخَوَّرُ بَيْنَ الْمَقِ وَالْفِدَاءِ

یعنی "قیدی قتل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لیے یہی حکم ہے کہ یا تو اسے احسان کے طور پر چھوڑ دیا جاوے اور یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جاوے"



قرآن شریف کی محکمہ بالا واضح آیت کے ساتھ یہ واضح تشریح ملکر اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ قیدیوں کے قتل کے جواز کا مسئلہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اور اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی جنگی قیدی کو قتل کیا جاوے اور اگر اس جنگی یہ سوال ہو کہ پھر اس معاملہ میں بعض مسلمان علماء کو غلطی کیوں لگی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ تاریخ میں بظاہر ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض جنگی قیدیوں کو قتل کیا ہے لیکن ان مثالوں سے نتیجہ نکالنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جنگی قیدیوں کے قتل کا حکم دیا تھا وہ جنگی قیدی ہونے کی حیثیت میں قتل نہیں کیے گئے بلکہ ان کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ وہ بعض دوسرے جرائم کی وجہ سے واجب القتل تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی قیدی کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس کی سزا قتل ہے تو اس کا قیدی ہونا اسے اس سزا سے نہیں بچا سکتا۔ اگر ایک آزاد شخص کسی جرم کی سزا میں قتل کیا جاسکتا ہے تو ایک قیدی کیوں نہیں کیا جاسکتا پس جیسا کہ اپنے اپنے موقع پر ثابت کیا جائے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو قیدی بھی قتل کیا گیا وہ اس جرم کی بناء پر قتل نہیں کیا گیا کہ وہ ایک دشمن فوج کا سپاہی یا ایک جنگجو قوم کا فرد ہے بلکہ وہ اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو چکا تھا جس کی سزا قتل تھی لیکن بعض علماء نے صرف اس ظاہری حالت کو دیکھ کر کہ بعض قیدی قتل کر دیئے گئے تھے یہ نتیجہ نکال لیا کہ قیدی کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے حالانکہ یہ بات اسلامی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل ہر دو کے لحاظ سے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہ اس تعلیم کا ڈھانچہ ہے جو اسلام نے جنگی قیدیوں کے متعلق دی ہے اور ہر عقلمند شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک نہایت منصفانہ قانون ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا نے دنیا کو عطا کیا ہے اور موجودہ زمانہ کی ترقی یافتہ اور مذہب کسلانہ والی اقوام بھی اس سے بہتر قانون دنیا کو نہیں دے سکیں کہ جس میں اگر ایک طرف جنگ کے ناواجب طور پر طول پکڑ جانے اور بین الاقوامی مظالم کا سد باب کیا گیا ہے تو دوسری طرف احسان و مروت کے پہلو کو بھی بہترین صورت میں قائم رکھا گیا ہے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس قانون میں دشمن کے ساتھ نرمی اور احسان کا پہلو اپنی حفاظت کے پہلو سے بھی غالب ہے اور یقیناً آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس نے اپنے خونی دشمنوں کے ساتھ جو اسے ملیا میٹ کر دینے کے درپے ہو ایسے منصفانہ اور عسائہ سلوک کا حکم دیا ہو۔

اب ہم ایک لفظ لوندیوں یعنی غلام غورتوں کے متعلق کہہ کر لوندیوں کا مخصوص مسئلہ غلامی کی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوندیوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی عام اجازت دیکر نعوذ باللہ اپنے متبعین کے لیے تعیش کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے متعلق ہم سب سے پہلے اصولی طور پر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلام میں مرد و عورت کے مخصوص تعلق کی غرض و غایت کیا رکھی گئی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے



صحابہ کے اعمال کو حج کرنے اور ان کے پیچھے جو نیتیں مخفی تھیں ان کا پتہ لگانے کے لیے سب سے زیادہ صحیح ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جاوے کہ جس مذہب کے احکام کی تعمیل میں آپ اور آپ کے صحابہ یہ اعمال بجالاتے اور ان کی اجازت دیتے تھے وہ اس قسم کے اعمال کا حکم کس غرض و غایت کے ماتحت دیتا ہے۔ سو ہم قرآن شریف میں دیکھتے ہیں کہ نکاح کی اغراض میں سے جو غرض مرد و عورت کے مخصوص تعلق کے ضمن میں بیان کی گئی ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَجَلَ لَكُمْ مَا وَدَّاعَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَخُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۖ  
یعنی "اے مسلمانو! فلاں فلاں قریبی رشتہ دار عورتوں کو چھوڑ کر باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال اور جائز کی جاتی ہیں یہ کہ تم اپنے اموال میں سے ان کے ہنر مقرر کر کے ان کے ساتھ نکاح کرو مگر تمہارے نکاح کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ تم اس کے ذریعہ اپنے آپ کو بدلیں اور ہماروں سے محفوظ کرو اور یہ غرض ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ تم شہوت رانی کا طریق اختیار کرو۔"

اس تعلیم کا صحابہ کرام کی طبیعت پر اس قدر گہرا اثر تھا کہ اس انسان کی طرح جو ایک بات سے متاثر ہو کر اس کے انتہائی نقطہ کی طرف جھک جاتا ہے صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عورتوں سے بالکل ہی مجتنب ہو جانے کی اجازت چاہتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو فطرت صحیحہ کے مالک تھے اور اسلامی تعلیم کی اصل غرض و غایت کو سمجھتے ہوئے اپنے متبعین کو افراط و تفریط کی راہوں سے بچا کر اعتدال کے مقام پر قائم رکھنا چاہتے تھے انہیں اس طریق سے باز رکھتے تھے چنانچہ حدیث میں آتا ہے:-

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَاصٍ يَقُولُ رَدَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى عُثْمَانَ بْنِ مَطْعُونٍ النَّبْتَلُ وَلَوْ أِذْنٌ لَهُ لَأَخْتَصَمْتَنِي ۖ

یعنی "سعد بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن مظعون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں سے بالکل ہی علیحدہ ہو جانے کی اجازت چاہی مگر آپ نے اس کی اجازت نہیں دی اور اگر آپ اجازت دے دیتے تو ہم لوگ تیار تھے کہ اپنے آپ کو گویا بالکل خستہ ہی کر لیتے۔"

ان حالات میں تعیش و غیرہ کا سوال تو بالکل خارج از بحث ہے اور اس قسم کی بدلتی وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ سے قطعی طور پر ناواقف ہو اور یا وہ خود اس گند میں اس حد تک مبتلا ہو کہ اسے دوسروں کے اعمال میں بھی اس گندی نیت کے سوا کوئی اور نیت نظر نہ آتی ہو۔

مگر بہر حال یہ سوال قابل جواب ہے کہ لونڈیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کیا ہے؟ سو اس کے متعلق سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ غلامی کے عام احکام میں غلام اور لونڈی کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی جو حقوق غلاموں کے ہیں وہی لونڈیوں کے بھی ہیں؛ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ لونڈیوں کو اچھی تعلیم و تربیت دینے اور انہیں آزاد کر کے اپنے عقد میں لے لینے کے بارے میں اسلام نے زیادہ تاکید و سفارش کی ہے۔ اور جب تک لونڈیاں غلامی کی حالت میں رہیں اس وقت تک ان کیلئے بھی یہ پسند کیا گیا ہے کہ آزاد لوگ ان کے ساتھ رشتے کریں تاکہ اس رشتہ دارانہ اختلاط کے نتیجے میں غلاموں کے تمدن و معاشرت میں جلد تر اصلاح پیدا ہو سکے اور اسی غرض و غایت کے ماتحت لونڈیوں کا معاملہ تعدد از دواج کی انتہائی حد بندی سے سستہ رکھا گیا ہے۔ تاکہ غلاموں اور لونڈیوں کے تمدن و معاشرت میں اصلاح کے موقعے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھلے رہیں اور وہ جلد تر آزاد کئے جانے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے متعلق بعض قرآنی آیات اوپر والے مضمون میں درج کی جا چکی ہیں اس جگہ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یہ سوال کہ آیا لونڈیوں کے ساتھ باقاعدہ رسمی نکاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ اول جبکہ کسی لونڈی اور غلام کے آپس کے رشتہ کا سوال ہو۔ دوسرے جبکہ کسی لونڈی اور ایسے آزاد مرد کے رشتہ کا سوال ہو جو اس کا مالک و آقا نہیں ہے۔ سوہر جبکہ کسی غلام اور آزاد عورت کے رشتہ کا سوال ہو۔ چہاں دوسرے جبکہ کسی لونڈی اور اس کے اپنے آقا و مالک کے رشتہ کا سوال ہو۔ ان چاروں امکاناتی صورتوں میں سے پہلی تین صورتوں میں سلسلہ طور پر رسمی نکاح ضروری سمجھا گیا ہے اور اس کے بغیر رشتہ قائم نہیں ہو سکتا، لیکن چوتھی صورت میں اکثر علماء آقا و لونڈی کے رشتے کے معاملہ میں رسمی نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے اور ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ آقا کو لونڈی پر حقیقی ملکیت حاصل ہوتا ہے اس لیے قانونی رنگ میں یہی حقیقی نکاح کا قائم مقام سمجھا جانا چاہیے اور کسی الگ رسمی نکاح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اخلاقی اور تمدنی اور نسلی حفاظت جو رسمی نکاح میں ملحوظ ہے وہ اس رشتہ میں بھی جو حقیقی ملکیت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام نے ان عورتوں کے متعلق قیدی عورتوں کا سوال بھی جو کفار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیں

اور بطور قیدی کے پکڑی جائیں اس قسم کا ایک استثنائی انتظام جاری کیا ہے جس کے ماتحت ان قیدی عورتوں کے ساتھ جن کے مرد انہیں فدیہ دیکر چھڑانے کے لیے جلد نہ پہنچ جائیں یا جو قید ہونے پر خود مکاتبہ کے طریق پر آزاد کئے جانے کا مطالبہ نہ کریں مسلمانوں کا رشتہ نکاح قائم ہو سکتا ہے۔

اور اس انتظام کی غرض حفاظت اسلام نے یہ رکھی کہ تا قیدی عورتوں اور اُنکی وجہ سے اُن کے قید کرنے والوں کے اخلاق خراب ہونے سے محفوظ رہیں اور سوسائٹی میں بدی اور بدکاری پھیلنے نہ پائے۔ تارکِ سرخ سے پتہ لگتا ہے کہ عموماً جب کبھی کسی قوم کو کوئی بڑی جنگ پیش آتی ہے تو اس کے بعد اس قوم میں عموماً زنا اور بدکاری کا مرض پھیل گیا ہے۔ کیونکہ اول تو جنگ میں عموماً عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے جنگ کے مصائب کی وجہ سے مردوں کے اعصاب پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ جس کی وجہ سے اُن میں عموماً ضبطِ نفس کا مادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ پس چونکہ اسلام انفرادی اور قومی اخلاق کی حفاظت کے سوال کو باقی تمام تمدنی اور معاشرتی امور پر ترجیح دیتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اس قسم کے حالات کے لیے کوئی خاص احتیاطی احکام جاری کیے جاتے، چنانچہ ایسا کیا گیا کہ ایک طرف تو تعددِ ازدواج کی استثنائی اجازت دیدی گئی اور دوسری طرف ان عورتوں کے متعلق جو ایسے جنگوں میں قید ہو کر آئیں جن میں کوئی قوم مسلمانوں کے مذہب کو برباد کرنے کے لیے اُن پر حملہ آور ہوتی ہو یہ حکم دیا گیا کہ اگر اُن کے مرد اُن کے ساتھ قید نہ ہوں اور نہ ہی وہ انہیں چھڑانے کے لیے جلد پہنچیں اور نہ ہی یہ قیدی عورتیں خود مکاتبت کے طریق پر آزاد کئے جانے کا مطالبہ کریں تو ان کے ساتھ مسلمانوں کو استثنائی طور پر رشتہ قائم کرنے کی اجازت ہے تاکہ نہ تو ان قیدی عورتوں کے اخلاق خراب ہوں اور نہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی سوسائٹی میں بدکاری رونا ہونے پائے اور اس انتظام میں نسلی اختلاط و اشتباہ سے بچانے کے لیے یہ شرط لگا دی گئی کہ قیدی عورتوں کے ساتھ اس اطمینان کے بعد رشتہ ہونا چاہیے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔ یہ سسٹم شاید جدید تہذیب و تمدن کے دل وادگان کو اچنبھا نظر آئے گا، لیکن اگر ان حالات کو مد نظر رکھا جاوے جن کے لیے یہ انتظام مقصود ہے تو کم از کم وہ لوگ جو انفرادی اور قومی اخلاق کی حفاظت کے خیال پر دوسرے خیالات کو قربان کرنا جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات کے ماتحت جن میں یہ انتظام جاری کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت دانشمندانہ انتظام تھا جو بنی نوع انسان کی حقیقی بہتری کے لیے استثنائی حالات میں ضروری سمجھا گیا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب مکاتبت کا دروازہ ہر قیدی عورت کے لیے کھلا ہے تو جو عورت اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے سابقہ رشتوں کو قطع کر کے اسلامی سوسائٹی کا جز و بننا چاہتی ہے۔ پس اس حالت میں اس کے ساتھ کسی مسلمان کا رشتہ قائم ہونا قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو جنگوں میں پکڑا ہی کیوں جاتا تھا کہ اس قسم کے خطرات پیدا ہوتے اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں عرب میں یہ عام دستور تھا کہ عورتیں بھی کثرت کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتی تھیں اور بعض اوقات جنگ میں عملی حصہ بھی لیتی تھیں اور میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے کا

کام تو زیادہ تر عورتوں کے ہی سپرد ہوتا تھا۔ پس کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان حالات میں انہیں قید نہ کیا جاتا۔ اگر فوجی مقدمات میں عورت قید کی جاسکتی ہے اور ہر ایک ملک و قوم میں قید کی جاتی ہے تو کیوں جنگجو عورت میدان جنگ میں قید نہ کی جاتی؟ علاوہ ازیں چونکہ اس زمانہ میں کفار لوگ مسلمانوں کی عورتوں کو قید کرتے تھے بلکہ نوڈی تک بنا کر رکھتے تھے اور ان ابتدائی جنگوں میں تو ان بد باطنوں کی طرف سے یہ عام الٹی میٹم تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کو قید کر کے اپنی کونڈیاں بنائیں گے اور نوڈیوں کی طرح ان سے تعلقات قائم کریں گے۔ اس لیے خدائے اسلام نے جو اگر ایک طرف عیلم ہے تو دوسری طرف سب سے زیادہ غیرت مند بھی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اجازت دیدی کہ اگر ضرورت ہو تو وہ بھی کفار کے ساتھ اگر ویسا نہیں تو اسی قسم کا سلوک کر کے انہیں ہوش میں لائیں، تاکہ وہ اپنے مظالم میں زیادہ شوخ اور دلیر نہ ہوتے جائیں جی ضرورت سے واقف لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ بسا اوقات جنگوں میں انتہائی طریق اختیار کیے جانے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنگی قانون سول قانون سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔ پس یہ ایک ناگزیر حالات کی مجبوری تھی جس کے بغیر چارہ نہیں تھا اور جب یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ عورتیں قید میں آتی تھیں اور نیز یہ کہ کفار لوگ مسلمان عورتوں کے ساتھ ہر قسم کا سلوک روا رکھتے تھے تو اس کے لازمی اور خطرناک نتائج کے سبب اب کے لیے کوئی خاص قانون جاری کرنا بھی ضروری تھا البتہ چونکہ موجودہ زمانہ میں کفار لوگ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرتے اور اگر عورتیں قید بھی ہوں تو انہیں شاہی قیدی کے طور پر رکھا جاتا ہے اس لیے اصولی قرآنی حکم کے مطابق جو اوپر درج کیا گیا ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کے لیے بھی یہ ناجائز ہو گا کہ وہ کفار کی عورتوں کو بلا کسی حقیقی مجبوری کے قید کریں یا قید کرنے کے بعد انہیں مسلمانوں کی انفرادی حراست میں دے کر کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں گے۔

اس جگہ اگر کسی کو شبہ پیدا ہو کہ ایسا کیوں ہے کہ بعض حالات میں شریعت اسلامی کا فتویٰ اور ہوتا ہے اور بعض میں اور۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کوئی نقص کی بات نہیں بلکہ اگر خود کیا جاوے تو یہی بات اسلامی شریعت کے کمال اور عالمگیر ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں حالات کے اختلاف کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے اور جہاں بعض احکام جو اصل الاصول کے طور پر ہیں مٹوس اور غیر متبدل صورت میں رکھے گئے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں وہاں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں جن میں یا تو حالات کے اختلاف سے حکم کی صورت بدل جاتی ہے اور یا ان میں مختلف حالات کے ماتحت نئی مگر جائز تشریحات کی گنجائش ہوتی ہے۔ پچنانچہ



قرآن شریف خود فرماتا ہے :

هٰذَا الَّذِي اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَفِيهِ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَآخَرُ  
مُتَشَبِهَاتٍ

یعنی خدا نے یہ قرآن شریف اس صورت میں اُتارا ہے کہ اس کی بعض آیات تو  
محکم ہیں یعنی اصل الاصول کے طور پر ہیں جو سب حالات میں ایک سی چسپاں ہوتی ہیں  
اور بعض متشابہات ہیں یعنی ان میں ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ وہ مختلف حالات  
میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ غلامی کے متعلق اسلامی تعلیم و وجہوں میں منقسم ہے۔ اول وہ تعلیم جو ان لوگوں سے تعلق  
رکھتی ہے جو کسی وجہ سے ظالمانہ غلامی کے چکر میں آچکے تھے اور ان کے اخلاق و عادات میں عموماً نہایت  
درجہ پستی اور دنائیت پیدا ہو چکی تھی اور وہ جوہر جو انسان کو دنیا میں آزاد زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے  
ان میں مفقود ہو چکا تھا ایسے لوگوں کے متعلق اسلام نے یہ تجویز کی کہ پہلے ان کے اخلاق اور تمدن کو  
دُست کیا جاوے اور پھر ان کی اصلاح ہوتی جاوے وہ ساتھ ساتھ آزاد کیے جاتے رہیں اور  
ایسا انتظام کیا کہ آزاد ہونے کے بعد ایسے لوگوں کی آزادی حقیقی آزادی ہو نہ کہ محض رسمی اور نمائش کی آزادی۔  
اور اس انتظام کی نگرانی کا کام اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل کر دیا گیا تاکہ لوگ اس معاملہ میں کسی  
قسم کی سستی یا غفلت سے کام نہ لیں۔ دوم وہ تعلیم جو غلام بنانے کے سوال کے متعلق اسلام نے اصولی  
طور پر دی اور جس کی رُو سے غلامی کے تمام ظالمانہ طریق قطعاً طور پر منسوخ کر دیئے گئے۔ باقی رہا جنگی قیدیوں  
کا سوال سو اس میں بیشک بعض حالتوں میں انتظامی طریق پر غلامی کی اجازت دی گئی ہے مگر اس کی  
تفصیلات پر غور کیا جاوے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس رنگ کی غلامی نہیں ہے جو غیر اسلامی  
دنیا میں عام طور پر معروف ہے بلکہ حقیقتہً ایک نوع قید کی ہے اور یہ جوانی اور غیر حقیقی غلامی بھی جس کی  
اجازت دی گئی ہے موجودہ زمانہ میں ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اب شاہی قید خانوں کا سسٹم رائج ہو  
گیا ہے اور کفار مسلمانوں کے قیدیوں کو غلام نہیں بناتے بلکہ شاہی قیدیوں کے طور پر رکھتے ہیں۔  
اس لیے اب مسلمانوں کے لیے بھی ناجائز ہے کہ کفار کے قیدیوں کو مسلمانوں کی انفرادی حراست میں تقسیم  
کر کے کوئی رنگ غلامی کا پیدا کریں۔ باقی رہا غلاموں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کرنے کا معاملہ سو  
اس میں اسلام نے وہ منصفانہ اور محسنانہ تعلیم دی ہے کہ جس کی نظیر کوئی قوم کسی زمانہ میں پیش نہیں کر سکتی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ



# حضرت عائشہ کا رخصتانہ اور انکی عمر کی بحث

## تعدد ازدواج کا مسئلہ۔ دو فرضی واقعات

حضرت عائشہ کا رخصتانہ، ماہ شوال سنہ ۲۰  
کتاب کے حصہ اول میں یہ ذکر گذر چکا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہ کے ساتھ شادی فرمائی تھی یہ سنہ نبوی کا دسواں سال اور شوال کا مہینہ تھا۔ اور اسوقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال کی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا نشوونما اسوقت بھی غیر معمولی طور پر اچھا تھا، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ خولہ بنت حکیم کو جو اُن کے نکاح کی محرک بنی تھیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے لیے اُن کی طرف خیال جاتا لیکن بہر حال ابھی تک وہ بالغ نہیں ہوئی تھیں، اس لیے اسوقت نکاح تو ہو گیا مگر رخصتانہ نہیں ہوا اور وہ بدستور اپنے والدین کے پاس مقیم رہیں، لیکن اب ہجرت کے دوسرے سال جبکہ اُن کی شادی پر پانچ سال گذر چکے تھے اور ان کی عمر بارہ سال کی تھی وہ بالغ ہو چکی تھیں، چنانچہ خود حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر رخصتانہ کی تحریک کی جس پر آپؐ نے مہر کی ادائیگی کا انتظام کیا (اس زمانہ میں مہر کے نقد ادا کرنے کا دستور تھا۔) اور ماہ شوال سنہ ۲۱ میں حضرت عائشہ اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر حرم نبویؐ میں داخل ہو گئیں۔ یہ سوال کہ رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر کتنی تھی اس زمانہ میں ایک اختلافی سوال بن گیا ہے۔

عام کتب تاریخ اور کتب حدیث میں حضرت عائشہ کی عمر نو یا دس سال کی بیان ہوئی ہے حتیٰ کہ صحیح بخاری میں خود حضرت عائشہ سے بھی یہ روایت مروی ہے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر صرف نو سال تھی اور اسی بنا پر جمہور مؤرخین نے نو سال کی عمر بیان کی ہے مگر اس کے مقابلہ میں بعض جدید محققین نے مختلف قسم کے

۱۔ استیعاب صفحہ ۶۵، سطر ۸۰ ۲۔ ابن ہشام جلد ۲ ذکر ازواج النبیؐ

۳۔ طبرانی بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۳۱ ۴۔ عینی جلد ۱ صفحہ ۴۵

استدلالات سے چودہ سال بلکہ سولہ سال تک عمر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ ہم ان نو محققین کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے مگر حالات کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ نو سال کی عمر کا خیال بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر پورے بارہ سال یا قریباً بارہ سال کی ثابت ہوتی ہے۔ دراصل اس معاملہ میں متقدمین کو تو ساری غلطی اس وجہ سے لگی ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ کے نو سال والے اندازے کو جو صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے بالکل یقینی اور قطعی سمجھ کر کسی اور بات کی طرف توجہ نہیں کی؛ حالانکہ ہر عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ روایت کا صحیح ہونا اور بات ہے اور اندازے کا صحیح ہونا بالکل اور بات یعنی باوجود اس کے کہ یہ روایتیں جن میں حضرت عائشہ کا یہ اندازہ بیان ہوا ہے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر نو سال کی تھی۔ اصل روایت کے لحاظ سے بالکل صحیح ہوں حضرت عائشہ کا یہ اندازہ خود اپنی ذات میں غلط ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بسا اوقات لوگوں کے اندازے اپنی عمر کے متعلق غلط ہو جایا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں نے نو سال والے خیال کو غلط سمجھ کر آزادانہ تحقیق کرنی چاہی ہے انھوں نے یہ غلطی کی ہے کہ تحقیق کے سیدھے اور صاف راستہ کو ترک کر کے ایک ایسا پیچیدہ طریق اختیار کیا ہے کہ جودل کی تسلی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ہر فہمیدہ شخص ہمارے ساتھ اتفاق کرے گا کہ سب سے زیادہ پختہ اور سب سے زیادہ آسان ذریعہ حضرت عائشہ کی عمر کا پتہ لگانے کا یہ ہے کہ ہمیں ایک طرف تو انہی پیداؤں کی تاریخ اور دوسری طرف ان کے رخصتانہ کی تاریخ کا پتہ چل جاوے۔ کیونکہ ان دونوں تاریخوں کے معین ہوجانے کے بعد رخصتانہ کے وقت کی عمر کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ پہلے ہم پیداؤں کے سوال کو لیتے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت نقل کی ہے کہ کَانَتْ عَائِشَةُ ذَلَّتِ السَّنَةَ الثَّلَاثَةَ مِنَ النَّبُوَّةِ فِي أَثَلَيْهَا يَعْنِي "حضرت عائشہ سلسلہ نبوی کے ابتداء میں پیدا ہوئیں تھیں" حضرت عائشہ کی تاریخ پیداؤں کے متعلق اس روایت کے سوا کوئی اور معین روایت ابتدائی مؤرخین کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذری اور نہ ہی حدیث کی کسی کتاب میں اس کے متعلق کوئی روایت آتی ہے۔ پس پیداؤں کی تاریخ تو آسانی کے ساتھ معین ہو گئی۔ اور وہ ابتداء سلسلہ نبوی ہے۔

اب ہم دوسرے سوال کو لیتے ہیں جو رخصتانہ کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں بیشک روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں یہ تاریخ شوال سلسلہ ہجری بیان ہوتی ہے اور بعض میں شوال سلسلہ ہجری لیکن غور کیا جاوے تو مؤخر الذکر روایات زیادہ صحیح قرار پاتی ہیں۔ شوال سلسلہ ہجری والی روایت کا اصل منبع ابن سعد ہے جس نے ایک سلسلہ رواۃ کے ذریعہ اس روایت کو حضرت عائشہ تک پہنچایا

ہے اور اکثر مؤرخین نے ابن سعد والی روایت پر ہی بنا رکھ کر رخصتانہ کی تاریخ شوال سنہ ہجری قرار دی ہے، لیکن گو ابن سعد خود اپنی ذات میں ثقہ ہے مگر اس روایت میں اس کے راویوں میں ایک راوی واقدی ہے جس کے غیر ثقہ اور ناقابل اعتماد بلکہ جھوٹا ہونے کے متعلق محققین نے قریباً قرینا اجماع کیا ہے۔ پس محض اس واقدی والی روایت پر جبکہ وہ دوسری روایات کے خلاف ہو ایک تاریخی واقعہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی اس کے مقابلہ پر علامہ نودی علامہ عینی اور قسطلانی اور بعض دوسرے محققین نے شوال سنہ ہجری والی روایت کو صحیح اور قابل ترجیح قرار دیا ہے۔ اور علامہ نودی نے تو بڑی صراحت اور اصرار کے ساتھ لکھا ہے کہ اس روایت کے مقابلہ میں شوال سنہ ہجری والی روایت کمزور اور قابل رد ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صرف اس بنا پر کہ عام مؤرخین نے شوال سنہ ہجری والی روایت کی تقلید کی ہے ہم ایک زیادہ مضبوط خیال کو رد کر دیں اور دراصل عام مؤرخین نے بھی واقدی کی روایت کو محض اس خیال سے نوازا ہے کہ وہ نوسال والی عمر کے اندازے کے ساتھ جو صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے زیادہ مطابقت کھاتی ہے چنانچہ زرقانی جیسا محقق صاف لکھتا ہے کہ شوال سنہ ہجری والی روایت اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ اس طرح نوسال سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ جب خود عمر کا سوال اور عمر کی روایتیں ہی زیر بحث ہوں تو کسی خاص روایت کو صحیح فرض کر لینا درست نہیں ہے اور پھر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں نوسال والے اندازے کو غلط ماننے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نوسال والی روایتیں بھی غلط ہیں۔ اور پھر تعجب یہ ہے کہ خود علامہ زرقانی نے دوسری جگہ شوال سنہ والے قول کو مقدم کیا ہے۔ اندریں حالات شوال سنہ ہجری والی روایت شوال سنہ ہجری والی روایت کے مقابلہ میں قابل قبول نہیں سمجھی جاسکتی اور حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ کا رخصتانہ شوال سنہ ہجری میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم

اب جب پیدائش اور رخصتانہ کی تاریخوں کی تعیین ہو گئی تو عمر کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک مؤنا حسابی سوال رہ جاتا ہے جسے ایک بچہ بھی نکال سکتا ہے۔ حضرت عائشہ سنہ نبوی کے شروع میں پیدا ہوئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سنہ نبوی کے ربیع الاول میں ہوئی۔ اس طرح ہجرت تک حضرت عائشہ کی عمر کچھ ماہ اور دس سال بنتی ہے اور ہجرت کے بعد جو ربیع الاول سنہ

- ۱۔ طبقات جلد ۸ صفحہ ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳

میں ہوتی شوال سنہ ہجری تک جبکہ حضرت عائشہ کا رخصتانہ ہوا دو سال سے کچھ کم کا عرصہ ہوتا ہے اور ان دونوں عرصوں کو ملائے سے وہی بارہ سال حاصل ہوتے ہیں جو ہم نے ابتداء میں بیان کئے ہیں اور اگر ابن سعد کی روایت کے مطابق رخصتانہ کو ہجرت کے پہلے سال میں سمجھا جاوے تو پھر بھی یہ عرصہ گیارہ سال کا بنتا ہے نہ کہ نو یا دس سال کا۔ اور یہ ایک حسابی نتیجہ ہے جس کے مقابلہ میں کوئی تخمینی اندازہ قبول نہیں کیا جاسکتا۔

اب رہا یہ سوال کہ متعدد احادیث میں حضرت عائشہ نے خود اپنی عمر نو سال کی کیوں بیان کی ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ان روایتوں کو غلط نہیں کہتے یعنی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا یہی خیال تھا کہ رخصتانہ کے وقت ان کی عمر نو سال کی تھی، لیکن یقیناً ان کا یہ خیال محض تخمینی تھا اور درست نہیں تھا اور یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں کیونکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عمروں کے اندازوں میں لوگوں سے غلطی ہو جایا کرتی ہے۔ پس اگر پیدائش اور رخصتانہ کی تاریخوں کے حسابی مقابلہ سے حضرت عائشہ کی عمر نو سال نہیں بنتی تو محض حضرت عائشہ کے اس اندازے کی وجہ سے کہ رخصتانہ کے وقت میری عمر نو سال کی تھی نو سال والی روایت کو قبول نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ اگر کسی صحیح حدیث میں حضرت عائشہ کی پیدائش کی تاریخ اداتل سنہ نبوی کے علاوہ کوئی اور بیان کی گئی ہو یا رخصتانہ کی تاریخ شوال سنہ ہجری کے علاوہ کوئی اور ثابت ہو تو بیشک یہ روایتیں قابلِ قبول ہوں گی اور انہی پر عمر کے حساب کو مبنی قرار دیا جائے گا۔ لیکن ایک محض اندازے اور خیال کے مقابلہ میں خواہ وہ صحیح احادیث میں ہی بیان کیا گیا ہو ایک حسابی نتیجہ کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تو ایک اصولی بحث ہے جو ہم نے اس جگہ پیش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اندازے والی روایتوں کی چھان بین کی جائے تو ان سے بھی بالآخر وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی یہ کہ رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال کی تھی نہ کہ نو سال کی۔ اس کے سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ دراصل حضرت عائشہ نے صرف رخصتانہ کی عمر کا اندازہ ہی نہیں بتایا بلکہ ساتھ ہی نکاح کی عمر کا اندازہ بھی بتایا ہے اور حدیث و تاریخ کی کتابوں میں یہ دونوں اندازے ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں؛ چنانچہ حضرت عائشہ کا یہ قول کثرت کے ساتھ مروی ہوا ہے کہ جب میرا نکاح ہوا تو میری عمر چھ یا سات سال کی تھی اور جب میرا رخصتانہ ہوا تو میری عمر نو سال کی تھی اور بعض روایتوں میں رخصتانہ کی عمر دس سال بھی بیان ہوئی ہے۔ اب اصولی قاعدہ کے مطابق ہمیں ان دونوں اندازوں میں سے پہلے اندازے کو جو نکاح کے وقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اقرب بالصحت سمجھنا چاہیے کیونکہ اول تو یہ اندازہ زیادہ چھوٹی عمر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جبکہ غلطی کا امکان نسبتاً کم ہوتا ہے۔ دوسرے چونکہ وہ سب سے پہلا اندازہ ہے۔ وہی اصل اندازہ سمجھا جائے گا اور بعد کی عمر کے ساتھ تعلق رکھنے والے اندازے اس اندازے کی فرع سمجھے جائیں گے نہ کہ مستقل اندازے پس اندازوں کی بحث میں اصل بنیاد لازماً پہلے اندازے پر رکھی جائے گی جو نکاح



کے وقت کی عمر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور جس میں چھ یا سات سال کی عمر بیان کی گئی ہے۔ اب جب ہم اس انداز سے حساب شماری کر کے دھختانہ کی عمر کا پتہ لگاتے ہیں تو اس طرح بھی وہی بارہ سال کی عمر ثابت ہوتی ہے نہ کہ نو یا دس سال کی۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم یہ حساب پیش کریں چھ اور سات کے باہمی اختلاف کا حل ضروری ہے۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شادی کے وقت کی عمر بعض روایتوں میں چھ سال بیان ہوتی ہے اور بعض میں سات سال۔ اور یہ دونوں قسم کی روایتیں کتب حدیث اور کتب تاریخ ہر دو میں پائی جاتی ہیں۔ سات سال والی روایت خصوصیت کے ساتھ صحیح مسلم و نسائی اور ابن ہشام اور ابن سعد اور طبری وغیرہ میں بیان ہوئی ہے اور اس کے مقابلہ میں چھ سال والی روایت بھی ان سب کتب میں باسثناء سیرت ابن ہشام مروی ہوئی ہے اور علاوہ اس کے بخاری میں بھی چھ سال والی روایت پائی جاتی ہے۔ اب ہم نے دیکھا یہ ہے کہ ان دونوں کی روایتوں میں سے کونسی روایتیں قابل ترجیح ہیں۔ ہر شخص جو علم روایت سے تھوڑا بہت بھی متسلک رہتا ہے اس بات کو تسلیم کریگا کہ جہاں تک محض روایت کی صحت کا تعلق ہے کہ دونوں قسم کی روایتیں ہر طرح صحیح اور قابل اعتماد ہیں اور ہم ان میں سے کسی کو غلط کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔ پس ماننا پڑے گا کہ خود حضرت عائشہ نے ہی مختلف موقعوں پر یہ دو مختلف اندازے بیان کیے ہیں۔ یعنی کبھی تو انہوں نے اپنی عمر چھ سال کی بیان کی ہے اور کبھی سات سال کی اور کبھی ان دونوں کو ملا کر یہ کہہ دیا ہے کہ شادی کے وقت میری عمر چھ یا سات سال کی تھی پس روایت کے لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہے لیکن درایتہً غور کیا جاوے تو سات سال واسے اندازے کو ترجیح دینی پڑتی ہے اور وہ اس طرح پر کہ یہ ایک عام دستور ہے کہ جب تک عمر کا کوئی سال پورا نہیں ہو جاتا۔ اُس وقت تک صرف نیچے کے سال کا نام لیا جاتا ہے اور اوپر کی کسر کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اوپر کے سال کا نام صرف اسی وقت لیا جاتا ہے کہ جبکہ یا تو اوپر کا سال پورا ہو چکا ہو اور یا پورا ہونے کے اس قدر قریب ہو کہ عملاً اُسے پورا سمجھا جاسکے۔ پس حضرت عائشہ کی عمر کے متعلق بعض روایات میں چھ سال کا ذکر آنا اور بعض میں سات سال کا یقینی طور پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ سے گذر کر سات کے اس قدر قریب پہنچ چکی تھی کہ اس پر سات سال کا اطلاق عام محاورہ کی رُو سے جائز ہو گیا تھا اور صرف تھوڑی سی برائے نام نگی کی وجہ سے چھ سال کا لفظ استعمال کر لیا جاتا تھا ورنہ عملاً ان کی عمر سات سال کی ہی تھی اچنانچہ اسی خیال کے ماتحت بعض مؤرخین نے چھ سال کے ذکر کو بالکل ترک کر دیا ہے اور صرف سات سال کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ابن ہشام نے چھ سال کا ذکر تک نہیں کیا اور صرف سات سال کا ذکر کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں میری نظر سے کوئی ایسی مستند تاریخ کی کتاب نہیں گذری جس میں



صرف چھ سال کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہو۔ پھر صاحب سیرت حلبیہ نے بھی جہاں ازواج النبی کا ذکر کیا ہے، وہاں حضرت عائشہ کی عمر صرف سات سال بیان کی ہے اور چھ سال کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عائشہ کے نکاح کے بیان میں ذکر تو دونوں کا ہے مگر صراحتاً لکھا ہے کہ سات سال والی روایت اقرب بالصحت ہے۔ اندر میں حالات گو روایت دونوں قسم کی روایتیں صحیح ہیں مگر روایت کے طریق پر اس بات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں بھی جاسکتی کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال کے اس قدر قریب پہنچی ہوئی تھی کہ گویا عملاً وہ سات سال ہی تھی۔

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال کی تھی تو اگلا حساب کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت عائشہ کی شادی شوال سنہ نبوی میں ہوئی تھی۔ اور یہی تاریخ جمہور مؤرخین میں مستم ہے گویا شوال سنہ نبوی میں حضرت عائشہ کی عمر سات سال یا اس کے قریب تھی۔ اس کے بعد ربیع الاول سنہ نبوی میں ہجرت ہوئی۔ اس طرح شادی اور ہجرت درمیان کا عرصہ تین سال اور کچھ ماہ بنتا ہے اور ہجرت کے وقت حضرت عائشہ کی عمر دس سال اور کچھ ماہ کی قرار پاتی ہے اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہجرت اور رخصتانہ کے درمیان کا عرصہ کس قدر ہے یہ مستم ہے کہ ہجرت ربیع الاول میں ہوئی، اس لیے ہجرت کا پہلا سال ساڑھے نو ماہ کا ہوا اور پھر چونکہ رخصتانہ شوال سنہ ہجری میں ہوا اس لیے ساڑھے نو ماہ ہی دوسرے سال کے ہوتے اور یہ دونوں عرصے مل کر ہجرت اور رخصتانہ کے درمیان کا عرصہ انیس ماہ یعنی ایک سال اور سات ماہ کا ہوا۔ اب اگر اس عرصہ کے ساتھ ملائیں جو ہجرت سے قبل کا ہے تو اس کی میزان وہی بارہ سال ہوتی ہے جو ہم نے دوسری ہجرت سے قرار دی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ خواہ حضرت عائشہ کے اندازے سے حساب شماری کریں یا یہ کہ ان کی تاریخ پیدائش سے شمار کریں نتیجہ دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال کی تھی نہ کہ نو سال کی۔ اور یقیناً حضرت عائشہ کا یہ خیال کہ اُس وقت میری عمر نو سال کی تھی غلط اندازے یا غلط حساب شماری پر مبنی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انھوں نے ہینوں کی کسر چھوڑ کر اپنے نکاح کی عمر کا اندازہ چھ سال لگایا تو اس کے بعد انھوں نے حسابی طور پر درمیانی عرصہ کو شمار نہیں کیا بلکہ یونہی مولے طور پر اندازہ کر لیا کہ رخصتانہ کے وقت ان کی عمر نو سال کی ہوگی اور پھر یہی خیال ان کے دل میں قائم ہو گیا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ اُس وقت تک ابھی جنتری وغیرہ کا حساب مروج نہیں ہوا تھا اور ہجری کی تاریخ بھی ابھی ضبط و تدوین میں نہیں آئی تھی۔ اور پھر شادی اور رخصتانہ کے درمیان کی میعاد بھی دو مختلف سین (یعنی

سن نبوی (اور سن ہجری) کے حسابات سے تعلق رکھتی تھی اس لیے حضرت عائشہ سے حساب شماری میں سہواً غلطی ہو گئی ہو اور پھر یہ غلط خیال ان کے دل میں ایسا راسخ ہو گیا ہو کہ بعد میں کبھی اس حسابی غلطی کی طرف ان کا ذہن منتقل ہی نہ ہوا ہو لیکن بہر حال کچھ بھی ہو اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سات سال یا اس کے قریب تھی تو پھر رخصتانہ کے وقت نو سال کی عمر کا اندازہ کسی صورت میں بھی درست نہیں سمجھا جاسکتا اور یہ ایک حسابی سوال ہے جس کے مقابلہ میں کوئی اور دلیل نہیں بٹھہر سکتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ خواہ کسی بہت سے بھی دیکھا جادوے رخصتانہ کے وقت حضرت عائشہ کی عمر بارہ سال یا اس کے قریب قریب ہوتی ہے اور اگر رخصتانہ کی تاریخ شوال سنہ ہجری قرار دی جادوے تو پھر بھی ان کی عمر گیارہ سال کی بنتی ہے پس نو سال کا اندازہ بہر حال غلط اور نا درست ہے۔

لیکن اگر بالفرض نو سال کی عمر کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جادوے تو پھر بھی کوئی جائزے اعتراض نہیں ہے، کیونکہ عرب جیسے ملک میں نو یا دس سال کی لڑکی کا بالغ ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ خود ہمارے ہندوستان میں بھی بعض لڑکیاں جن میں نشوونما کا مادہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ دس سال کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔ دراصل بلوغ کا انحصار زیادہ تر آب دہوا اور خوراک اور گرد و پیش کے حالات پر ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ممالک میں اور خصوصاً ایسے ممالک میں جہاں کی خوراک میں گرم سالہ جات کا دخل کم ہوتا ہے، لڑکیاں عموماً بہت دیر میں بالغ ہوتی ہیں، چنانچہ انگلستان وغیرہ میں سن بلوغ اوسطاً اٹھارہ سال کا ہوتا ہے اور لڑکیوں کی شادی عموماً بیس سال بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ عمر میں ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں اگر کوئی لڑکی بیس سال کی عمر تک بغیر شادی کے بیٹھی رہے تو عموماً لوگوں میں انگشت نمائی شروع ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی نقص ہو گا تبھی اسے کوئی رشتہ نہیں ملا۔ کیونکہ یہاں بلوغ کی اوسط عمر تیرہ چودہ سال ہے۔ عرب کا ملک چونکہ ہندوستان کی نسبت بھی زیادہ گرم اور خشک ہے اس لیے وہاں کے سن بلوغ کی اوسط ہندوستان سے بھی گری ہوتی ہے اور کئی لڑکیاں ایسی ملتی ہیں جو نو دس سال کی عمر میں ہی سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں۔ اندر میں حالات حضرت عائشہ کا نو یا دس سال کی عمر میں بالغ ہو کر رخصتانہ کے قابل ہو جانا ہرگز قابل تعجب نہیں سمجھا جاسکتا۔ خصوصاً جبکہ اس امر کو مد نظر رکھا جادوے کہ حضرت عائشہ میں نشوونما کا مادہ غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔ جیسا کہ سر ولیم میور نے بھی اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے۔

بہر حال اب حضرت عائشہ پوری طرح بالغ تھیں اور ہجرت کے بعد شوال سنہ ہجری میں ان کا رخصتانہ ہوا۔ اس وقت حضرت عائشہ کی والدہ مدینہ کے مضافات میں ایک جگہ الشنچ نامی میں مقیم تھیں، چنانچہ انصار کی غورتوں نے وہاں جمع ہو کر حضرت عائشہ کو رخصتانہ کے لیے آراستہ کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم خود وہاں تشریف لے گئے اور اس کے بعد حضرت عائشہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر حرم نبوی میں داخل ہو گئیں۔ مہر یا پنجہ سود ہم یا بعض روایات کی رو سے چار سو درہم یعنی کم و بیش ایک صد روپیہ تھا، جو رخصتانہ کے وقت نقد ادا کر دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں سے صرف حضرت عائشہ ہی وہ بیوی تھیں جو باکرہ ہونے کی حالت میں آپ کے نکاح میں آئیں۔ باقی سب بیوہ یا مطلقہ تھیں اور اس خصوصیت کو حضرت عائشہ بعض اوقات اپنے امتیازات میں شمار کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کے رخصتانہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر قریباً پچیس سال کی تھی اور آپ حضرت عائشہ کی خورد سالی کا خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہت دلداری کا سلوک فرماتے اور ان کے جذبات کا خاص خیال رکھتے تھے؛ چنانچہ ایک دفعہ جب چند حبشی شمشیر زن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو نیزہ کے کرتب دکھانے لگے تو آپ نے انہیں مسجد نبوی کے صحن میں کرتب دکھانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ اور خود حضرت عائشہ کو سہارا دیکر مکان کی دیوار کے ساتھ اپنی ادٹ میں لیکر کھڑے ہو گئے تاکہ وہ بھی ان لوگوں کے کرتب دیکھ لیں۔ اور جب تک وہ اس فوجی تماشے سے خود سیر نہیں ہو گئیں آپ وہاں سے نہیں ہٹے۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کیا۔ پہلی دفعہ تو حضرت عائشہ آگے نکل گئیں، لیکن جب ایک عرصہ بعد آپ دوسری دفعہ اُن کے ساتھ دوڑے تو اس وقت وہ پیچھے رہ گئیں، جس پر آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ *ہذہ بیتلک*۔ یعنی ”لو عائشہ اب وہ بدلہ اُتر گیا ہے“ بعض اوقات حضرت عائشہ کی بعض سہیلیاں اُن کے گھر میں معصومانہ اشعار وغیرہ پڑھنے کا شغل کرتیں، تو آپ بالکل تعرض فرماتے بلکہ جب ایک دفعہ حضرت ابو بکر نے یہ نظارہ دیکھ کر لڑکیوں کو کچھ تنبیہ کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا اور کہا ابو بکر جانے دو۔ یہ عید کا دن ہے لڑکیاں اپنا شغل کرتی ہیں لیکن جب آپ دوسری طرف متوجہ ہوئے تو حضرت عائشہ نے خود ان لڑکیوں کو اشارہ کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ مگر باوجود اس صغریٰ کے حضرت عائشہ کا ذہن اور حافظہ غضب کا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے ماتحت انھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ اور دراصل اس چھوٹی عمر میں ان کو اپنے گھر میں سے آنے سے آپ کی غرض ہی یہ تھی کہ تا آپ بچپن سے ہی اپنے منشاء کے مطابق اُن کی تربیت کر سکیں اور تا انہیں آپ کی صحبت میں رہنے کا لمبے سے لمبا عرصہ مل سکے اور وہ اس نازک اور عظیم الشان کام کے اہل بنائی جاسکیں جو ایک شارع نبی کی بیوی پر عاید ہوتا ہے، چنانچہ آپ اس منشاء میں کامیاب ہوئے

۱۔ بخاری کتاب بدء الخلق ترویج النبی ﷺ ابن سعد ۲۔ ابن سعد  
۳۔ بخاری کتاب النکاح ۴۔ بخاری باب حسن المعاشرت ۵۔ ابوداؤد باب السبق  
۶۔ بخاری کتاب العیدین ۷۔

اور حضرت عائشہ نے مسلمان عورتیں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کا وہ کام سرانجام دیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ احادیث نبویؐ کا ایک بہت بڑا اور بہت ضروری حصہ حضرت عائشہ ہی کی روایات پر مبنی ہے حتیٰ کہ ان کی روایتوں کی کل تعداد دو ہزار دو سو دس تک پہنچتی ہے۔ ان کے علم و فضل اور تفقہ فی الدین کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ ان کا لوہا مانتے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کو کوئی علمی مشکل ایسی پیش نہیں آئی کہ اس کا حل حضرت عائشہ کے پاس نہ مل گیا ہو اور عروہ بن زبیر کا قول ہے کہ میں نے کوئی شخص علم قرآن اور علم میراث اور علم حلال و حرام اور علم فقہ اور علم شعر اور علم طب اور علم حدیث عرب اور علم انساب میں عائشہؓ سے زیادہ عالم نہیں دیکھا۔ زہد و قناعت میں ان کا یہ مرتبہ تھا کہ ایک دفعہ ان کے پاس کہیں سے ایک لاکھ درہم آئے انہوں نے شام ہونے سے پہلے پہلے سب خیرات کر دیئے، حالانکہ گھر میں شام کے کھانے تک کے لیے کچھ نہیں تھا۔ انہی اوصاف حمیدہ کی وجہ سے جن کی جھلک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی نظر آنے لگ گئی تھی۔ آپ انہیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے اور بعض اوقات فرماتے تھے کہ سب لوگوں میں عائشہ مجھے محبوب ترین ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل گذرے ہیں، لیکن عورتوں میں کاملات بہت کم ہوتی ہیں۔ پھر آپ نے آسیہ ابلیہ فرعون اور مریم بنت عمران کا نام لیا اور پھر فرمایا کہ عائشہ کو عورتوں پر وہ درجہ حاصل ہے جو عرب کے بہترین کھانے خرید کو دوسرے کھانوں پر ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بعض دوسری ازواج مطہرات نے کسی اہل امر میں حضرت عائشہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات کہی مگر آپ خاموش رہے، لیکن جب اصرار کے ساتھ کہا گیا تو آپ نے فرمایا "میں تمہاری ان شکایتوں کا کیا کروں میں تو یہ جانتا ہوں کہ کبھی کسی بیوی کے لحاف میں مجھ پر میرے خدا کی وحی نازل نہیں ہوتی، مگر عائشہ کے لحاف میں وہ ہمیشہ نازل ہوتی ہے۔ اللہ اللہ! کیا ہی مقدس وہ بیوی تھی جسے یہ خصوصیت حاصل ہوئی اور کیا ہی مقدس وہ خاوند تھا جس کی اہلی محبت کا معیار بھی تقدس و طہارت کے سوا کچھ نہیں تھا!!

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت عائشہ کا نکاح خاص خدائی تجویز کے ماتحت وقوع میں آیا تھا، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ان کے نکاح سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا

۱۔ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۳۴ ۲۔ ترمذی باب مناقب عائشہ ۳۔ حاکم و طبرانی بحوالہ زرقانی

جلد ۳ صفحہ ۲۳۴ ۴۔ ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۴۶ ۵۔ بخاری باب مناقب ابی بکر ۶۔

۷۔ بخاری باب فضل عائشہ ۸۔

۹۔ بخاری باب فضل عائشہ ۱۰۔



تھا کہ ایک فرشتہ آپ کے سامنے ایک ریشتی کچڑا پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آپ کی بیوی ہے آپ لے لے کھولتے ہیں تو اس میں حضرت عائشہ کی تصویر پاتے ہیں مگر آپ نے اس خواب کا کسی سے ذکر نہیں فرمایا اور سمجھ لیا کہ اگر اس خواب نے اپنی ظاہری صورت میں پورا ہوتا ہے تو خدا خود اس کا سامان کر دے گا؛ چنانچہ بالآخر خولہ بنت حکیم کی تحریک سے یہ رشتہ قائم ہو گیا۔ احادیث میں یہ ذکر بھی آتا ہے کہ آخری آیام میں حضرت سودہ بنت زمعہ نے اپنی باری حضرت عائشہ کو دیدی تھی اور اس طرح حضرت عائشہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مستفیض ہونے کا دوسرا موقعہ میسر آگیا تھا اور اس کی وجہ یہ بھی کہ چونکہ اس زمانہ میں شریعت کا نزول ہو رہا تھا اور ہر امر میں جدید دستور العمل کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس لیے جب حضرت سودہ بوڑھی ہو گئیں اور پورے طور پر حقوق زوجیت کی ادائیگی کے قابل نہ رہیں تو انہیں اپنی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں انہیں علیحدہ کر دیں اس لیے انھوں نے خود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کر کے کہ یا رسول اللہ مجھے اب باری کی ضرورت نہیں ہے اپنی باری حضرت عائشہ کو دیدی تھی ان کا یہ خیال تو سراسر غلط اور محض وہم پر مبنی تھا، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال تھا اور وہ اپنی عمر اور حالات کے لحاظ سے اس قابل تھیں کہ ان پر خاص توجہ صرف کی جاوے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باری کے متعلق سودہ کی تجویز منظور فرمائی۔ مگر اس کے بعد بھی آپ حضرت سودہ کے پاس باقاعدہ تشریف لے جایا کرتے تھے اور دوسری بیویوں کی طرح ان کی دلدادگی اور آرام کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ کے خواندہ ہونے کے متعلق اختلاف ہے مگر بخاری کی ایک روایت سے پتہ لگتا ہے کہ ان کے پاس ایک نسخہ قرآن شریف کا لکھا ہوا موجود تھا جس پر سے انہوں نے ایک عراقی مسلمان کو بعض آیات خود املا کرائی تھیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کم از کم خواندہ ضرور تھیں اور اغلب ہے کہ انھوں نے اپنے رُختانہ کے بعد ہی لکھنا سیکھا تھا، لیکن جیسا کہ بعض مؤرخین نے تصریح کی ہے وہ غالباً لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ حضرت عائشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کم و بیش اڑتالیس سال زندہ رہیں اور ۵۸ھ ہجری کے ماہ رمضان میں اپنے محبوب حقیقی سے جا ملیں۔ اُس وقت ان کی عمر قریباً اڑسٹھ سال کی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدد ازواج اور اسکی حکمتیں  
حضرت عائشہ کے رُختانہ کے ساتھ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم

۱۔ بخاری کتاب النکاح ۶

۲۔ ترمذی و ابوداؤد و بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۲۹ ۳۔ باب تالیف القرآن ۴۔ بلاذری باب امر الخطیۃ



میں تعدد ازدواج کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے اس موقع پر اس مسئلہ کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ درج کرنا مناسب نہ ہوگا، لیکن پیشتر اس کے کہ تعدد ازدواج کے متعلق کچھ بیان کیا جاوے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اغراض بیان کردہ جانتیں جو اسلامی شریعت میں نکاح کی مقرر کی گئی ہیں۔ کیونکہ منجملہ اور اغراض کے ان اغراض کے توسیعی مصالح پر ہی تعدد ازدواج کا ایک حد تک دار و مدار ہے۔ سو جاننا چاہیے کہ قرآن شریف سے نکاح کی اغراض چار معلوم ہوتی ہیں۔ اول انسان کا بعض جسمانی اور اخلاقی اور روحانی بیماریوں اور ان کے بد نتائج سے محفوظ ہو جانا۔ اس صورت کو عربی میں احصان کہتے ہیں۔ جس کے لفظی معنی کسی قلعہ کے اندر محفوظ ہو جانے کے ہیں۔ دوم بقائے نسل۔ سوم حصول رفیق حیات اور کینتِ قلب۔ چہارم محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع؛ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:-

وَاَحْلِلْ لَكُمْ مَا دَرَأَ ذَلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوا يَا مَعْزِلُكُمْ مُخَصِّنِينَ غَيْرُ مُسَانِفِينَ

”اور اے مسلمانو! جائز کی جاتی ہیں تمہارے لیے تمام عورتیں سوائے ان عورتوں کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ کہ تم ان کے مہر مقرر کر کے ان کے ساتھ نکاح کرو۔ مگر تمہارے نکاح کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ تم بیماریوں اور بدیوں سے محفوظ ہو جاؤ اور یہ غرض نہیں ہونی چاہیے کہ تم شہوت کے طریق پر عیش و عشرت میں پڑو“

اس آیت میں احصان والی غرض بیان کی گئی ہے یعنی (الف) یہ کہ نکاح کے ذریعہ انسان بعض ان خاص قسم کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہونے سے بچ جاوے جو تہجد کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں اور (ب) یہ کہ وہ بعض روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے محفوظ ہو جاوے، لیکن ناپاک خیالات اور ناپاک تعلقات میں مبتلا نہ ہو۔ اسی غرض و غایت کو ایک دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:-

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ذَا لَنْتُمْ لِبَاسٌ تَهْتَكُ

”اے مسلمان مردو! یاد رکھو کہ تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اپنی عورتوں کا لباس ہو“

یعنی تم ایک دوسرے کو بدیوں اور بیماریوں سے محفوظ کرنے کا ذریعہ ہو جیسا کہ لباس انسان کے لیے سرور و گرمی کی تکلیف سے بچنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس آیت میں چونکہ عورتوں کو بھی شامل کرنا تھا اس لیے طریق بیان زیادہ لطیف کر دیا گیا ہے۔ نیز اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے پردہ پوشی کا بھی ذریعہ ہیں جیسا کہ لباس بھی پردہ پوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:

نِسَاءَكُمْ حُرَّتٌ لَّكُمْ فَاَتُوا حَزَنُكُمْ اَنْ يَشْتُمُوا قَدْ مَوَالِ لَفْسِكُمْ

یعنی "اے مسلمانو! تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں جن سے تمہاری آئندہ نسل کی فصل نے پیدا ہونا ہے۔ پس اب تمہیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہو اپنی کھیتوں کے ساتھ معاملہ کرو اور جس قسم کی فصل اپنے لیے پیدا کرنا چاہو پس اکر لو۔"

اس آیت میں بقائے نسل کی غرض بیان کی گئی ہے یعنی یہ کہ انسانی نسل کا سلسلہ قائم رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے نہایت لطیف پیرایہ میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ جب بیویوں کے ذریعہ آئندہ نسل کا وجود قائم ہونا ہے تو پھر انسان کو چاہیے کہ اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات رکھنے میں ایسا طریق اختیار کرے کہ جس کے نتیجہ میں آئندہ نسل خراب نہ ہو بلکہ بہتر سے بہتر نسل پیدا ہو۔

پھر فرماتا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً  
وَرَحْمَةً لِي

یعنی "اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس میں سے ہی تمہارے لیے بیویاں بنائی ہیں تاکہ تم ان کے تعلق میں سکینتِ قلب حاصل کرو اور پھر اس تعلق کو خدا نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا ذریعہ بنایا ہے۔"

اس آیت میں نکاح کی تیسری اور چوتھی اغراض بیان کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کہ خاوند کو بیوی میں اور بیوی کو خاوند میں رفیقِ حیات میسر آجائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے تعلق میں تسکینِ قلب پائیں اور دوسرے یہ کہ نکاح کے ذریعہ سے خاوند اور بیوی کے متعلقین کے درمیان رشتہٴ دوداد و اتحاد قائم ہو جائے اور نسلی رشتہ داری کے تعلق کے علاوہ رجمی تعلق کے ذریعہ بھی مختلف خاندانوں اور مختلف قوموں کے درمیان محبت اور رحمت کی زنجیر سے منسلک ہو جانے کے موقعے میسر رہیں۔

الغرض اسلامی شریعت میں نکاح کی چار اغراض بیان کی گئی ہیں۔ اول احصان یعنی بعض جسمانی اور روحانی بیماریوں اور ان کے نتائج سے محفوظ ہو جانا۔ دوم بقائے نسل۔ سوم رفاقتِ حیات اور تسکینِ قلب۔ چہارم مختلف خاندانوں یا مختلف قوموں کا آپس میں محبت اور رحمت کے رشتہ کے ذریعہ سے مل جانا۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ ساری اغراض نہ صرف بالکل جائز اور مناسب ہیں بلکہ نہایت درجہ پاکیزہ اور فطرتِ انسانی اور ضروریاتِ بنی نوع انسان کے عین مطابقت ہیں اور ان سے خاوند بیوی کے تعلق کو ایک بہترین بنیاد پر قائم کر دیا گیا ہے اور اس تعلق سے بہترین ثمرہ پیدا کرنے کی صورت نکالی گئی ہے اور ان اغراض کے مقابلہ میں جس غرض کو قرآن شریف نے نام لے کر ناجائز قرار دیا اور اس سے مسلمانوں کو روکا

ہے وہ تعیش اور شہوت رانی کی غرض ہے۔

اب ہم وہ اغراض بیان کرتے ہیں جو تعدد ازدواج کی اجازت میں اسلام نے مد نظر رکھی ہیں سو اسلامی شریعت کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ اغراض دو قسم کی ہیں۔ اول وہی عام اغراض جو نکاح میں اسلام کے مد نظر ہیں اور جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ دوم وہ خاص اغراض جو مخصوص طور پر تعدد ازدواج کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مقدم الذکر اغراض کو تعدد ازدواج کے معاملہ میں اس لیے بحال رکھا گیا ہے کہ بعض اوقات ایک بیوی سے نکاح کی غرض پورے طور پر حاصل نہیں ہوتی اور اس لیے اسی غرض کے ماتحت دوسری بیوی کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نکاح کی ایک غرض احسان ہے یعنی یہ کہ اس ذریعہ سے انسان بعض بیماریوں اور بدیوں اور بدکاریوں سے بچ جاوے لیکن ہو سکتا ہے کہ انسان کے حالات ایسے ہوں کہ وہ ایک ہی عورت کے تعلق سے جس پر حین اور حمل اور وضع حمل اور رضاعت اور پھر مختلف قسم کی بیماریوں وغیرہ کی حالتیں آتی رہتی ہیں اپنے تقویٰ اور طہارت کو قائم نہ رکھ سکتا ہو۔ اور اگر وہ غیر معمولی کوشش کے ساتھ اپنے آپ کو عملی بدی سے بچائے بھی رکھے تو کم از کم اس کے خیالات میں ناپاکی کا عنصر غالب رہتا ہو اور یا اس طرح رُکے رہنے سے اُسے کسی جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کا صحیح علاج سوائے تعدد ازدواج کے اور کوئی نہیں۔ یعنی وہی غرض جو ایک نکاح کی محرک تھی اس صورت میں اس کے لیے دوسرے نکاح کی محرک ہو جائے گی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض بھائے نسل ہے لیکن اگر کسی شخص کے ہاں ایک بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو یا نہریمہ اولاد نہ ہو تو یہی غرض دوسرے نکاح کی جائز بنیاد بن جائے گی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض رفاقت حیات اور تسکین قلب ہے لیکن اگر کسی کی بیوی دائم المرین ہو اور اس کا مرض اس حالت کو پہنچا ہوا ہو کہ وہ بالکل صاحب فراش رہتی ہو یا وہ مجنون ہو جاوے تو اس صورت میں ایسے شخص کو رفاقت حیات اور تسکین قلب کی غرض کو پورا کرنے کے لیے دوسری بیوی کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح نکاح کی ایک غرض مختلف خاندانوں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کے لیے محبت و رحمت کے موقعے پیدا کرنا ہے لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے ابتداءً کسی ایسے خاندان میں شادی کی ہو جہاں اس کے لیے اس رشتہ محبت کا قائم ہونا ضروری تھا، مگر اس کے بعد اس کے لئے اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم موقعے پیش آجائیں جہاں اس کا تعلق قائم ہونا خاندانی یا قومی یا ملکی یا سیاسی یا دینی مصالح کے ماتحت نہایت ضروری اور پسندیدہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے تعدد ازدواج پر عمل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ الغرض وہ ساری اغراض جو اسلام نے نکاح کے متعلق بیان کی ہیں وہی خاص حالات میں تعدد ازدواج کی بنیاد بھی بن جاتی ہیں اور مندرجہ بالا صورتیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں اور نہ اور بعض صورتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کہ جب نکاح کی غرض ایک بیوی سے پورے طور پر یا حسن صورت میں حاصل نہیں ہوتی اور دوسری بیوی کی جائز طور پر ضرورت پیش آ جاتی ہے، لیکن ان اغراض کے علاوہ اسلام

نے تعدد ازدواج کی بعض خاص وجوہات بھی بیان کی ہیں اور وہ تین ہیں۔ اول حفاظت یتیمی۔ دوم انتظام بیوگان، سوم تکثیر نسل۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِسُوا مِلَّابَكُمْ مِمَّا الْيَتَامَىٰ مَثَلِي  
وَقُلْتُ وَرُبُّكُمْ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُعَدِلُوا فَوَاحِدَةً لَّي

اور ”اے مسلمانو! (ان جنگوں میں جو تمہیں درپیش ہیں لازماً یتیمی کی کثرت ہوگی اور تمہیں ان یتیمی کی حفاظت کے لیے تعدد ازدواج کی ضرورت پیش آئیگی پس) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ (ایک بیوی تک محدود رہتے ہوئے) تم یتیمی کی حفاظت اور ان کے حقوق کی خاطر خواہ ادائیگی سے قاصر رہو گے تو پھر اپنی پسند کے مطابق زیادہ عورتوں سے شادیاں کرو۔ دود کے ساتھ تین تین کے ساتھ اور چار چار کے ساتھ (مگر اس سے زیادہ نہیں کیونکہ خدا کی نظر میں یہ حد تمہاری استثنائی ضروریات کے لیے کافی ہے، لیکن اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ اپنی مالی یا جسمانی یا انتظامی کمزوری کی وجہ سے یا طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے) تم ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کر کے ان کے ساتھ عدل نہیں کر سکو گے تو پھر تمہیں لازماً ایک ہی بیوی سے شادی کرنی چاہیئے“

اس آیت کریمہ میں تعدد ازدواج کے حکم کو یتیمی کے ذکر کے ساتھ ملا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دراصل یتیمی کی کثرت بھی تعدد ازدواج کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ ہے اور چونکہ یتیمی کی کثرت ایک طرف تو بیوگان کی کثرت کو چاہتی ہے اور دوسری طرف وہ آئندہ کے لیے نسل کی قلت کا اندیشہ پیدا کرتی ہے اور ویسے بھی یہ تینوں حالتیں جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس لیے گویا اس آیت میں ہی خدا تعالیٰ نے نہایت لطیف پیرایہ میں تعدد ازدواج کی ساری زائد اغراض کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی حفاظت یتیمی انتظام بیوگان اور علاج قلت نسل۔ اور پھر مزید تشریح و توضیح کے لیے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر بھی کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَإِنْ كُنْتُمْ لَا تُمْكِنُوا فَمَا مَلَاحِي مِنْكُمْ لَي

یعنی ”اے مسلمانو! (اب جب ہم نے تمہارے لیے تعدد ازدواج کا استثنائی علاج تجویز کر دیا ہے تو) اب تمہیں ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ حتیٰ الوسع کوئی غیر شادی شدہ عورت خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ ہو بغیر شادی کے نہ رہے“

اس آیت میں غیر شادی شدہ عورتوں خصوصاً بیوگان کی شادی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

پھر حدیث میں آتا ہے :

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَافٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَزَوَّجُوا الْيَتَامَى وَالْأَتَامَى مَكَارِئِكُمْ الْأَتَامَ ۝

”یعنی معقل بن یسار روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے تھے کہ تمہیں چاہیے کہ محبت کرنے والی زیادہ بچے دینے والی عورتوں کے ساتھ شادیاں کیا کرو، تاکہ تمہاری تعداد ترقی کرے اور میں قیامت کے دن اپنی اُمت کی زیادتی پر فخر کر سکوں ۝“

اس حدیث میں تکثیر نسل والی غرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس طرح یہ کل سات اغراض ہوتی ہیں جو اسلام نے تعدد ازدواج کے متعلق بیان کی ہیں یعنی جسمانی اور روحانی بیماریوں سے حفاظت۔ بقائے نسل۔ رفاقت حیات اور تسکین قلب۔ محبت و رحمت کے تعلقات کی توسیع۔ انتظامِ یتامی۔ انتظامِ بیوگان اور ترقی نسل۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اغراض کو حاصل کس طرح کیا جاوے۔ یعنی کس اصل کے ماتحت بیوی کا انتخاب کیا جاوے کہ یہ اغراض احسن صورت میں حاصل ہو سکیں۔ سو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

تُنْتَكَمُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَا لَهَا وَلِمَا لَيْسَ بِهَا وَبِحَمَالِهَا وَلِدَيْهَا فَإِذَا خَلِفَتْ بِذَاتِ الدِّيْنِ مَرَّتْ بِذَاتِ الْيَدِ ۝

”یعنی نکاح میں عورت کا انتخاب چار قسم کے خیالات کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ عورت کی مالی حالت کی بناء پر بیوی کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض کو حسب و نسب کا خیال ہوتا ہے۔ بعض خوبصورتی اور حسن دیکھتے ہیں اور بعض لوگ عورت کی اخلاقی اور دینی حالت کو مد نظر رکھتے ہیں، لیکن اے مسلمانو! تمہیں چاہیے کہ تم ہمیشہ دینی پہلو کو ترجیح دیا کرو۔ یہی تمہاری کامیابی کا طریقہ اور یہی دین و دنیا کی خرابی سے بچنے کا طریقہ ہے ۝“

اس حدیث میں نکاح کی اغراض کے حصول کے لیے بیوی کے انتخاب کا اصول بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دینی پہلو کو ترجیح دی جاوے اور دین سے صرف عورت کی ذاتی و دینی یا اخلاقی حالت مراد نہیں ہے اور دین کا لفظ عربی زبان میں محض مذہب اور عقیدہ کے معنوں میں آتا ہے بلکہ جیسا کہ عربی کی مشہور لغت اقرب الموارد میں تشریح کی گئی ہے دین کا لفظ عربی زبان میں مندرجہ ذیل معانی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اول اخلاق و عادات، دوم روحانی پاکیزگی اور طہارت۔ سوم مذہب۔ چہارم قوم و ملت۔ پنجم سیاست و



حکومت۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ عورت کے انتخاب میں دینی پہلو کو ترجیح دی جاوے اس میں جہاں یہ مراد ہے کہ بیوی ایسی ہونی چاہیے جو ذاتی طور پر اخلاق و عادات اور تقویٰ و طہارت اور مذہب و عقیدہ میں اچھی ہو تاکہ خاوند اور بیوی کے تعلقات بھی اچھے رہیں اور آئندہ اولاد پر بھی اچھا اثر پڑے، وہاں یہ بھی مراد ہے کہ بیوی کے انتخاب میں وہ عام دینی پہلو بھی جو مصالح مذہب اور مصالح قوم و ملت اور مصالح سیاست و حکومت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مد نظر رہنے چاہئیں اور اگر اس جگہ کسی کو یہ شبہ گذرے کہ گو لغوی طور پر یہ سب معانی درست ہوں مگر یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہی لفظ میں ایک ہی وقت میں اتنے معانی مراد ہوں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک متقی نبی تھے۔ آپ کا کلام قانونی کلام کا رنگ رکھتا تھا جو ہمیشہ جامع المعانی اور وسیع المفہوم ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک لفظ میں کئی کئی پہلو مد نظر ہوتے ہیں اور اسی روشنی میں ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے معنی کرنے چاہئیں اور بہر حال جب لغوی طور پر یہ معانی درست ہیں تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے نکاح کی اغراض چار اور متعدد ازدواج کی اغراض سات بیان کی ہیں اور ان اغراض کے بہترین حصول کے لیے بیوی کے انتخاب کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ اس میں عورت کی ذاتی خوبی کے علاوہ مصالح مذہب اور مصالح قوم و ملت اور مصالح سیاست و حکومت کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اور خوبیوں کو نہ دیکھا جاوے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو عورت کی دوسری خوبیوں کے مد نظر رکھنے کی بھی اجازت دی ہے بلکہ بعض اوقات خود اس کی تحریک فرمائی ہے کہ دوسری باتوں کو بھی دیکھ لیا کرو؛ چنانچہ باوجود پردہ کے احکام کے آپ یہ تحریک فرماتے تھے کہ نکاح سے پہلے مرد کو چاہیے کہ عورت کو خود دیکھ لے تاکہ بعد میں شکل و صورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے اس کی طبیعت میں کسی قسم کا تکدر نہ پیدا ہو۔ اسی طرح مناسب حد تک مالی حالت کے مد نظر رکھنے کی بھی تحریک کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک حد تک عمر اور طبیعت کی مناسبت کو بھی ملحوظ رکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اور یہی اصول دوسرے حالات میں چسپاں ہوتا ہے مگر جس بات کی اسلام ہدایت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ان باتوں کو دینی پہلو کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ کیونکہ اگر دینی پہلو کی خوبیاں موجود نہ ہوں تو محض یہ خوبیاں حقیقی اور دائمی خوشی کی بنیاد نہیں بن سکتیں بلکہ بعض صورتوں میں مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ترمذی ابواب النکاح، ۲۔ مسلم کتاب الرضاغ باب المطلقة ثلاثا لا نفقة لها۔ ۳۔ مسلم کتاب الرضاغ باب استحباب نکاح البکر و بخاری کتاب النکاح باب الثیبات۔

اب ایک طرف تعددِ ازدواج کی اغراض اور دوسری طرف اس اصول کو جو بیویوں کے انتخاب کے لیے اسلام نے تجویز کیا ہے، تدبیر نظر رکھا جاوے تو ہر عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی بابرکت انتظام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے دنیا میں قائم کیا ہے اور اس میں بنی نوع انسان کے بڑے سے بڑے حصہ کی بڑی سے بڑی بھلائی تدبیر نظر ہے۔ دراصل جن لوگوں نے تعددِ ازدواج کے خلاف رائے ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنی نظر کو بہت ہی محدود رکھا ہے اور خاوند و بیوی کے جذباتی تعلقات کے سوا کسی اور بات کی طرف ان کی نظر نہیں اٹھی۔ اور نہ ان لوگوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے نکاح کی اغراض اور بنی نوع انسان کی ضروریات کے متعلق غور کیا ہے، ورنہ یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی فہمیدہ شخص اس کی خوبیوں سے انکار کی گنجائش پاتا۔ پھر یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ تعددِ ازدواج کا انتظام اسلام میں قاعدہ کے طور پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک استثنائے خاص ہے جو نکاح کی جائز اغراض کے حصول اور نسل انسانی کی جائز ضروریات کے پیدا کرنے کے لیے خاص خاص قسم کے حالات کو تدبیر نظر رکھتے ہوئے جاری کی گئی ہے۔ پس اس کے متعلق رائے لگاتے ہوئے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا دنیا میں انسان کو ایسے حالات پیش نہیں آسکتے کہ جن کے ماتحت تعددِ ازدواج ایک ضروری علاج قرار پاتا ہے اور انسان کی ذات یا اس کے خاندان یا اس کی قوم یا اس کے ملک کے مفاد اس بات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں کہ وہ دوسری بیوی سے شادی کرے۔ مجھے شہنشاہ پنولین کی زندگی کا وہ واقعہ نہیں بھولتا کہ جب اُس نے اپنے ملکی مفاد کے ماتحت حصولِ اولاد کی غرض سے دوسری بیوی کی ضرورت محسوس کی، مگر یہ ضرورت کس طرح پوری کی گئی؟ اس کے تصور سے میرے بدن پر ایک لرزہ آ جاتا ہے۔ شہنشاہ کی ملکہ جو زفین کی طلاق کا واقعہ تاریخ کے تاریک ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی تہہ میں ہی جھوٹا جذباتی خیال ہے کہ انسان کو کسی صورت میں بھی ایک سے زیادہ بیوی نہیں کرنی چاہیے۔ افسوس! اس جھوٹے جذباتی خیال نے کتنی کمزور لوگوں کے تقویٰ پر ڈاکہ ڈالا۔ کئی خاندانوں کو بے نسل کر کے دنیا سے مٹا دیا۔ کئی گھروں کی خوشیوں کو تباہ کیا۔ کئی گھرانوں اور کئی قوموں اور کئی ملکوں کے اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کئی یتیموں کو وارہ کیا۔ کئی بیوگان کو کپڑے کی حالت میں چھوڑا۔ کئی قوموں کی نسل کو منزل کے رستے پر ڈال کر ان کی تباہی کا بیج بویا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا کہ عورت ہر صورت میں اپنے خاوند کی توجہ کی اکیلی مالک بنی رہے؛ مگر یہ ایک عجیب قربانی ہے کہ بڑی چیز کو چھوٹی چیز پر قربان کیا جاتا ہے، حالانکہ حق یہ تھا کہ اخلاقی فوائد پر مادی فوائد قربان کئے جاتے دینی منافع پر دنیاوی منافع قربان کئے جاتے۔ خاندانی مصالح پر ذاتی مصالح قربان کئے جاتے۔ قومی مفاد پر انفرادی مفاد قربان کیے جاتے اور درحقیقت تعددِ ازدواج کا تو انتظام ہی ایک مجسم قربانی کا انتظام ہے اور اس میں خاوند اور بیوی دونوں کی ذاتی اور جسمانی قربانی کے ذریعہ اخلاقی اور دینی اور خاندانی اور قومی اور ملکی مصالح کے لیے راستہ کھولا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اسلام میں تعددِ ازدواج کا انتظام ایک استثنائی انتظام ہے جو انسانوں کی خاص ضروریات کو تدبیر نظر رکھ کر جاری

کیا گیا ہے اور یہ ایک قربانی ہے جو مرد اور عورت دونوں کو اپنے اخلاق اور دین اور خاندان اور قوم اور ملک کے لیے خاص حالات میں کرنی پڑتی ہے اور اسلام ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس قسم کے حالات کے پیدا ہونے پر جو تعدد ازدواج کے لیے ضروری ہیں اپنی خواہش اور اپنے جسمانی آرام کو زیادہ بڑے مفاد کے لیے قربان کر دینے میں تامل نہیں کریگا اور موقعہ پیش آنے پر یہ ثابت کر دے گا کہ اس کی زندگی صرف اس کی ذات یا اس کے گھرتک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ دنیا کی وسیع انسانیت کا ایک فرد ہے جس کی خاطر اسے اپنے شخصی مفاد کے قربان کرنے میں دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تعدد ازدواج کی جائز ضرورت کے پیدا ہونے پر بھی اسلام نے تعدد ازدواج کو لازمی نہیں قرار دیا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے کہ اگر انسان عدل کرنے کے قابل ہو تو تب تعدد ازدواج پر عمل کرے، اور نہ بہر حال صرف ایک بیوی پر ہی اکتفا کرے اور عدل سے اسجگہ صرف بیویوں کے درمیان عدل کرنا مراد نہیں بلکہ ان کے ہر قسم کے حقوق کا ادا کرنا مراد ہے جو تعدد ازدواج کی صورت میں انسان پر عائد ہوتے ہیں پس تعدد ازدواج کی دو شرطیں ہوں گی۔ اولے ان جائز اغراض میں سے کسی غرض کا پیدا ہو جانا جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کی ہیں۔ دوم انسان کا عدل کر سکنے کے قابل ہونا اور ان دونوں شرطوں کے پورا ہونے کے بغیر تعدد ازدواج پر عمل کرنے والا شخص اپنے وقت اپنی توجہ اپنے مال اپنے اپنے ظاہری سلوک غرضیکہ دل کی محبت کے سوا جس پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا باقی سب چیزوں میں اپنی بیویوں کے ساتھ بلا کم و کاست ایک سا معاملہ کرے۔ اور غور کیا جاوے تو یہ پابندی خود ایک عظیم الشان قربانی ہے جو غاوند کو کرنی پڑتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسے اپنی بیویوں میں سے ان کے ذاتی حالات اور ذاتی قابلیت کے فرق کی وجہ سے کسی سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی سے کم مگر پھر بھی وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہر چیز کو ترازو کی طرح تول کر اپنی بیویوں میں برابر برابر تقسیم کرے۔ اور یہ قربانی صرف خاندان ہی کی قربانی نہیں بلکہ اس قربانی میں اس کی بیویاں بھی برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ ان حالات میں ہر عقلمند شخص سمجھ سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اسلام نے تعدد ازدواج کے معاملہ میں تعیش کے خیال تک سے منع فرمایا ہے بلکہ اس نے اس کے لیے عملی طور پر شرطیں بھی ایسی لگا دی ہیں کہ کوئی شخص ان شرطوں پر کار بند ہوتا ہوا عیش و عشرت میں پڑ ہی نہیں سکتا۔

اس موقعہ پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں بلکہ دنیا کی کسی قوم میں بھی تعدد ازدواج کی کوئی حد بندی نہیں تھی اور ہر شخص جتنی بیویاں بھی چاہتا تھا رکھ سکتا تھا۔ مگر اسلام نے علاوہ دوسری شرائط عائد کرنے کے تعداد کے لحاظ سے بھی اسے زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دیا؛ چنانچہ

تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جن نو مسلموں کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں انہیں یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ باقیوں کو طلاق دیدیں۔ مثلاً غیلان بن سلمہ سقنی جب مسلمان ہونے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ جن میں سے چھ کو حکماً طلاق دلا دی گئی۔

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں میں کون سی اغراض مد نظر تھیں کیونکہ ہمارا اصل مضمون یہی ہے۔ سو جانا چاہیے کہ عام اغراض تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں میں وہی تھیں جو اسلام نے عام طور پر نکاح اور تعدد و ازدواج کی بیان کی ہیں اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور ان اغراض میں سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے مد نظر بقائے نسل محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع اور انتظام یتامی و یتوگان کی غرضیں تھیں۔ اور محبت اور رحمت کے تعلقات کی توسیع کی غرض کے ماتحت آپ کے پیش نظر ایسی عورتیں تھیں جو مصالح مذہب، مصالح قوم و ملت اور مصالح سیاست و حکومت کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھیں، لیکن ان عام اغراض کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص حالات کے ماتحت آپ کی شادیوں کی بعض خاص وجوہات بھی تھیں اور یہ اغراض دو تھیں۔ اولے آپ کے ذاتی مورد سے بعض جاہلانہ رسوم اور غلط عقائد کی عملی تردید۔ دوم بعض مناسب عورتوں کو آپ کی تربیت میں رکھ کر ان کے ذریعہ اسلامی شریعت کے اس حصہ کا استحکام جو مستورات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت اچانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

فَلَمَّا قَضَىٰ ذِي الْحِجَّةِ أَذْعَنُوا مِنْهَا وَأَذْعَنُوا مِنْهَا لَكُمْ لَا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۚ

یعنی ”اے رسول! جب تیرے منہ بنائے بیٹے زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دیدی تو ہم نے اُس کی شادی کی تجویز خود تیرے ساتھ کر دی تاکہ اس ذریعہ سے یہ جاہلانہ رسم مٹ جائے کہ منہ بلایا بیٹا اصل بیٹے کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کی مطلقہ بیوی یا بیوہ بیٹا بننے والے شخص کے لیے جائز نہیں ہوتی۔ اور آئندہ کے لیے مومنوں کے دلوں میں اس امر کے متعلق کوئی دبدبہ یا غلط فہمی باقی نہ رہے۔“

اس آیت میں پہلی غرض بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونہ کے ذریعہ سے بعض اُن جاہلانہ رسوم کا استیصال کیا جاوے جو عربوں کی طبیعت میں اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ ان کا حقیقی استیصال بغیر اس کے ناممکن تھا کہ آپ اس معاملہ میں خود ایک عملی نمونہ قائم کریں اچانچہ متنبی



بنانے کی رسم عرب میں بہت راسخ اور رائج تھی اور اس معاملہ میں الہی حکم نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو مشنتی بنایا ہوا تھا، اس لیے جب یہ حکم نازل ہوا کہ کسی شخص کو محض منہ بولا بیٹا بنالینے سے وہ اصل بیٹا نہیں ہو جاتا اور اس کے بعد یہ واقعہ پیش آ گیا کہ زید بن حارثہ نے اپنی بیوی زینب بنت جحش کو طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائی حکم کے ماتحت زینب کے ساتھ خود شادی فرمائی اور اس طرح اس جاہلانہ رسم کا استیصال کیا جو آپ کے عمل نمونہ کے بغیر پوری طرح مٹنی محال تھی۔ علاوہ ازیں آپ نے زینب کے ساتھ شادی کر کے اس بات میں بھی عملی نمونہ قائم فرمادیا کہ کسی طلاق شدہ عورت کے ساتھ شادی کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكُمْ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَرِيتُهَا فَنُتَعَالَيْنَ أُمَتِّعِكُنَّ  
وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۚ وَإِن كُنْتُمْ تُرِيدُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ  
أَعَدَّ لِلْمُعْسِلِينَ مِنْكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا ..... لِيُنْسَأَ النَّبِيُّ لَشَيْئٍ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ  
الْفَيْتَيْنِ ..... وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتَيْنِ الزَّكَاةَ وَآطَعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا  
يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۚ وَإِذْ كُنَّ  
مِمَّا يَشْتُلِي فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَعَلِيمًا خَبِيرًا ۚ

یعنی "اے نبی! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تمہیں یہ خواہش ہے کہ دنیا کی زندگی کا ساز و سامان تمہیں مل جاوے تو آؤ میں تمہیں دنیا کا مال و متاع دیتے دیتا ہوں، مگر اس صورت میں تم میری بیویاں نہیں رہ سکتیں بلکہ پھر میں احسان و مروت کے ساتھ تمہیں رخصت کر دوں گا۔ لیکن اگر تم خدا اور اس کے رسول کی خواہش رکھتی ہو اور آخرت کا اجر چاہتی ہو تو سن لو کہ تم میں سے ان نیکو کاروں کے لیے جو خدا کے منشاء کو پورا کریں خدا نے بہت بڑا اجر تیار کیا ہے۔ ..... اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور نفاق کو اس کی اصلی صورت میں قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ اور خدا اور اس کے رسول کی پوری پوری اطاعت کرو (کیونکہ خدا نے تمہیں ایک خاص کام کے لیے چنا ہے۔) اے نبی کے اہل بیت! اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی کمزوریوں اور نقصوں کو دور کر کے تمہیں خوب اچھی طرح پاک و صاف کر دے تاکہ تم ان آیات الہی اور ان حکمت کی باتوں کو لوگوں تک پہنچاؤ جو نبی کے ذریعہ سے تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں اور خدا تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے



یہ کام اس لیے لینا چاہتا ہے کہ وہ اگر بوجہ لطیف ہونے کے خود لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور مخفی ہے تو بوجہ خبیر ہونے کے وہ لوگوں کی ضروریات سے آگاہ بھی ہے پس ضروری ہے کہ وہ ہدایت خلق کا کام انسانوں کے واسطے سے سرانجام دے۔

اس آیت کریمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کی مخصوص غرض میں سے دوسری اور بڑی غرض بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ آپ کے ساتھ مناسب ستورات کو بطور بیویوں کے رکھ کر انہیں مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کیا جادے۔ یہ وہ خاص الخاص غرض ہے جس کے ماتحت آپ کی شادیاں وقوع میں آئیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی غرض ہے جو آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص تھی اور اسی لیے عام مسلمانوں کے لیے جو عہد بندی تعدد ازدواج کی مقرر کی گئی ہے اس سے آپ مستثنیٰ تھے۔ دراصل چونکہ آپ ایک شرعی نبی تھے اور آپ کے ذریعہ سے دنیا میں ایک نئے شرعی قانون اور نئے تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑنی تھی اس لیے صرف اس قدر کافی نہیں تھا کہ آپ کے ذریعہ نئے احکام کی اشاعت ہو جاتی بلکہ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ آپ خود اپنی نگرانی میں اس نئی شریعت کو تفصیلاً جاری فرماتے اور لوگوں کی زندگیوں کو اس جدید داغ بیل پر عملاً چلا دیتے جو اسلام نے قائم کی تھی۔ یہ کام ایک نہایت مشکل اور نازک کام تھا اور گو مردوں کے معاملہ میں بھی آپ کے رستے میں بہت سی مشکلات تھیں لیکن ستورات کے متعلق تو یہ ایک نہایت ہی مشکل کام تھا۔ کیونکہ اول تو بوجہ ان کے ٹوٹا پٹے گھروں میں رہنے اور اپنے خانگی مشاغل کی مصروفیت کے انہیں آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کے زیادہ موقعے نہیں تھے۔ دوسرے اس طبعی حیار کی وجہ سے جو عورتوں میں عورتی ہے وہ ان مخصوص مسائل کو جو عورتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں زیادہ آزادی کے ساتھ آپ سے دریافت نہیں کر سکتی تھیں اور اس کے مقابلہ میں عورتوں میں تعلیم کی نسبتا کی اور جاہلانہ رسوم کی پابندی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مقررہ طریق میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لیے جلد تیار نہیں ہوتیں ان حالات میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق خاص انتظام کی ضرورت تھی اور اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مناسب عورتوں کے ساتھ شادی کر کے انہیں اپنی تربیت میں اس کام کے قابل بنادیں اور پھر آپ کی یہ ازدواج مسلمان عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام سرانجام دیں، چنانچہ یہ تجویز کارگر ہوئی اور مسلمان عورتوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اور نہایت قلیل عرصہ میں اپنی زندگیوں کو جدید شریعت کے مطابق بنالیا۔ حتیٰ کہ دنیا کی کسی قوم میں یہ مثال نظر نہیں آتی کہ طبقہ نسواں نے ایسے قلیل عرصہ میں اور اس درجہ تکمیل کے ساتھ ایک بالکل نئے قانون اور نئے تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا ہو۔

اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں انسانی اغراض کے ماتحت نہیں تھیں بلکہ دینی اغراض کے ماتحت تھیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آپ نے بعض ایسی عورتوں کے ساتھ شادی فرمائی جو اتنی عمر کو پہنچ چکی تھیں کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ مثلاً حضرت ام سلمہؓ جن سے

آپؐ نے سُننے، بھری میں شادی فرمائی۔ ان کی عمر شادی کے وقت پیدائش اولاد وغیرہ کی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس بنا پر غدر بھی کیا، مگر چونکہ آپؐ کی غرض و غایت دینی تھی اور اس غرض کے لیے وہ بہت مناسب تھیں، اس لیے آپؐ نے ان کو باصرار و رضا مندر کر کے ان کے ساتھ شادی فرمائی۔

الغرض وہ اغراض جن کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں وقوع میں آئیں نہایت مبارک اور پاکیزہ تھیں اور ان میں غالب طور پر فرائض نبوت کی ادائیگی مد نظر تھی اور شادیوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا جاوے تو پتہ لگتا ہے کہ آپؐ جو کام بھی کرتے تھے خواہ وہ بظاہر دنیا کا ہو یا دین کا اس میں بلا واسطہ یا بالواسطہ آپؐ کی مقدم اور غالب غرض فرائض نبوت کی ادائیگی ہوتی تھی اور دُنیا کی نعمتوں سے آپؐ کو کبھی بھی شغف نہیں ہوا۔ اور مندرجہ ذیل حدیث یقیناً آپؐ کی زندگی کا بہترین نقشہ ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَامَ عَلَى خَيْصِيرٍ فَقَامَ وَقَدْ أَثَرُ فِي جَسَدِهِ  
فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَا لِي وَلِلدُّنْيَا  
وَمَا أَنَا وَاللُّدُنْيَا إِلَّا كَرَائِبٍ اسْتَنْقَلَتْ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا يَهِ

یعنی ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک موٹی اور کھداری چٹائی پر لیٹ کر سو گئے جب آپؐ اُٹھے تو اس چٹائی کا نشان آپؐ کے جسم پر نظر آتا تھا۔ اس پر آپؐ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپؐ پسند فرمائیں تو ہم آپؐ کے لیے آرام و آسائش کا سامان مہیا کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ابن مسعود مجھے دُنیا کی نعمتوں سے کیا کام ہے میری اور دُنیا کی مثال تو یہ ہے کہ ایک سوار راستہ پر چلا جاتا ہو اور وہ تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سایہ کے نیچے دم لینے کے لیے ٹھہر جاوے اور پھر اُٹھ کر اپنا راستہ لے لے۔

اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ دُنیا کی نعمتوں سے متمتع ہونا منع ہے کیونکہ اسلام کسی جائز نعمت سے جائز طور پر متمتع ہونے سے منع نہیں کرتا بلکہ خود قرآن شریف میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ۝

یعنی ”اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا کی نعمتوں سے بھی حصہ دے اور آخرت کی نعمتوں سے بھی حصہ دے۔“

پس حدیث مندرجہ بالا سے صرف مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا اصل مقصد دُنیا کی نعمتوں کا حصول

نہیں سمجھنا چاہیے اور نیز اس حدیث سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر دنیا کی نعمتوں سے قطعاً کوئی شغف نہیں تھا اور جہاں تک نعمتوں کا تعلق ہے آپ کی زندگی ایک محض مسافرانہ زندگی تھی۔

تعدد ازدواج کے متعلق اس نوٹ میں یہ ذکر بھی ہے کہ موقع نہ ہو گا کہ تعدد ازدواج کی اجازت دینے میں اسلام اکیلا نہیں ہے بلکہ دنیا کے اکثر مذاہب میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً موسوی شریعت میں اس کی اجازت ہے۔ اور بنو اسرائیل کے بہتے انبیاء اس پر عملاً کاربند رہے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔ اور کئی ہندو بزرگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے رہے ہیں۔ مثلاً کرشن جی تعدد ازدواج پر عملاً کاربند تھے۔ اور ہندو راجے مہاراجے تو اب تک تعدد ازدواج پر کاربند ہیں۔ اسی طرح حضرت مسیح ناصری کا بھی کوئی قول تعدد ازدواج کے خلاف مروی نہیں ہے اور چونکہ شریعت موسوی میں اس کی اجازت تھی اور عملاً بھی حضرت مسیح ناصری کے زمانہ میں تعدد ازدواج کا رواج تھا، اس لیے ان کی خاموشی سے یہی نتیجہ نکالا جائیگا کہ وہ اسے جائز سمجھتے تھے۔ پس اسلام نے اس میں کوئی جدت نہیں کی؛ البتہ اسلام نے یہ کیا کہ تعدد ازدواج کی حد بندی کر دی اور اسے ایسے شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ افراد اور اقوام کے استثنائی حالات کے لیے ایک مفید اور بابرکت نظام قائم ہو گیا۔

اس نوٹ کے خاتمہ پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ مخالفین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں پر بہت سخت سخت اعتراض کئے گئے ہیں اور ہر شخص نے اپنی فطرت اور اپنے خیالات کے مطابق آپ کے تعدد ازدواج کے مسئلہ کو دیکھا ہے مگر پھر بھی صداقت کبھی مخالفین کے قلم و زبان پر بھی غالب آگئی ہے اور انہیں اگر کلی طور پر نہیں تو کم از کم جزواً حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے؛ چنانچہ مشرک گولیس بھی جن کی آنکھ ٹوٹا ہر سیدھی بات کو اٹا دیکھنے کی عادی ہے اس معاملہ میں حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ”محمد“ میں لکھتے ہیں:-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہت سی شادیاں جو خدہ سجدہ کے بعد وقوع میں آئیں بیشتر یورپین مصنفین کی نظر میں نفسانی خواہشات پر مبنی قرار دی گئی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر اس جذبہ پر مبنی نہیں تھیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بہت سی شادیاں قومی اور سیاسی اغراض کے ماتحت تھیں کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہتے تھے کہ اپنے خاص خاص صحابیوں کو شادیوں کے ذریعہ سے اپنی

۱۔ استثناء باب ۲۱ آیت ۱۵ و سلاطین باب ۱۱ آیت ۳

۲۔ مثلاً دیکھو حالات حضرت ابراہیم و حضرت یعقوب و حضرت داؤد و حضرت سلیمان وغیرہم علیہم السلام۔

۳۔ منو ۹/۱۲۲، ۹/۱۲۹، ۹/۱۸۳

۴۔ سری کرشن مصنفہ لالہ لاجپت رائے صفحہ ۹۷، ۹۸

ذات کے ساتھ محبت کے تعلقات میں زیادہ پیوستہ کر لیں۔ ابو بکر و عمر کی لڑکیوں کی شادیاں یقیناً اسی خیال کے ماتحت کی گئی تھیں۔ اسی طرح سربراہ آوردہ دشمنوں اور مفتوح رنجیوں کی لڑکیوں کے ساتھ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیاں سیاسی اغراض کے ماتحت وقوع میں آئی تھیں..... باقی شادیاں اس نیت سے تھیں کہ تا آپ کو اولاد نرینہ حاصل ہو جاوے جس کی آپ کو بہت آرزو رہتی تھی۔<sup>۱</sup>

یہ اس شخص کی رائے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں میں عناد اور تعصب کے لحاظ سے غالباً صنفِ اول میں ہے اور گو مارگو لیس صاحب کی یہ رائے غلطی سے بالکل پاک نہیں ہے مگر اس سے یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ صداقت کس طرح ایک بنیدل کو بھی مغلوب کر سکتی ہے۔ والفضل ماشہدت بہ الاعداء۔

### دو فرضی واقعات

جنگ بدر کے حالات کے بعد واقعہ قادی اور بعض دوسرے مورخین نے ڈوا لیے واقعات درج کئے ہیں جن کا کتب حدیث اور صحیح تاریخی روایات میں نشان نہیں ملتا۔ اور درایتاً بھی غور کیا جائے تو وہ درست ثابت نہیں ہوتے مگر چونکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک ظاہری صورت اعتراض کی پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے بعض عیسائی مورخین نے حسبِ عادت نہایت ناگوار صورت میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرضی واقعات یوں بیان کئے گئے ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت عصماء نامی رہتی تھی جو اسلام کی سخت دشمن تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت زہر اُگلتی رہتی تھی اور اپنے اشتعال انگیز اشعار میں لوگوں کو آپ کے خلاف بہت اُکساتی تھی اور آپ کے قتل پر اُبھارتی تھی۔ آخر ایک نابینا صحابی عمیر بن عدی نے اشتعال میں آکر رات کے وقت اس کے گھر میں جبکہ وہ سوئی ہوئی تھی اُسے قتل کر دیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس صحابی کو ملامت نہیں فرمائی۔ بلکہ ایک گونہ اس کے فعل کی تعریف کی۔<sup>۲</sup> دوسرا واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک بڑھا بیہودی ابو عصفک نامی مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشتعال انگیز شعر کہتا تھا اور کفار کو آپ کے خلاف جنگ کرنے اور آپ کو قتل کر دینے کے لیے اُبھارتا تھا۔ آخر ایک دن اُسے بھی ایک صحابی سالم بن عیمر نے غصہ میں آکر رات کے وقت اُس کے صحن میں قتل کر دیا۔<sup>۳</sup> اور واقعہ قادی اور ابن ہشام نے بعض وہ اشتعال انگیز اشعار بھی نقل کئے ہیں جو عصماء اور ابو عصفک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کہے تھے۔ ان دو واقعات کو سرولیم میور وغیرہ نے نہایت ناگوار صورت میں اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے

<sup>۱</sup> مارگو لیس صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷

<sup>۲</sup> ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۸ و ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۱

<sup>۳</sup> ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹ و ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۰

<sup>۴</sup> ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۰، ۹۱ و مغازی الصادقہ لواقعی صفحہ ۱۲۳، ۱۲۵



مگر حقیقت یہ ہے کہ جرح اور تنقید کے سامنے یہ واقعات درست ثابت ہی نہیں ہوتے۔ پہلی دلیل جو ان کی صحت کے متعلق شبہ پیدا کرتی ہے یہ ہے کہ کتب احادیث میں ان واقعات کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ یعنی کسی حدیث میں قاتل یا مقتول کا نام بیکر اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا بلکہ حدیث تو الگ رہی بعض مؤرخین نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا؛ حالانکہ اگر اس قسم کے واقعات واقعی ہوئے ہوتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کتب حدیث اور بعض کتب تاریخ ان کے ذکر سے خالی ہوتیں۔ اس جگہ یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ ان واقعات سے بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے خلاف ایک گونا گونا اعتراض وارد ہوتا تھا اس لئے محدثین اور بعض مؤرخین نے ان کا ذکر ترک کر دیا ہو گا؛ کیونکہ اول تو یہ واقعات ان حالات کو برہنہ کرتے ہوئے جن میں وہ وقوع پذیر ہوئے قابل اعتراض نہیں ہیں۔ دوسرے جو شخص حدیث و تاریخ کا معمولی مطالعہ بھی رکھتا ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ مسلمان محدثین اور مؤرخین نے کبھی کسی روایت کے ذکر کو محض اس بنا پر ترک نہیں کیا کہ اس سے اسلام اور بانی اسلام پر بظاہر اعتراض وارد ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسئلہ طریقی تھا کہ جس بات کو بھی وہ از روئے روایت صحیح پاتے تھے اُسے نقل کرنے میں وہ اس کے مضمون کی وجہ سے قطعاً کوئی تاثر نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے بعض محدثین اور اکثر مؤرخین کا تو یہ طریقی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے متعلق جو بات بھی انہیں پہنچی تھی خواہ وہ روایت و روایت دونوں لحاظ سے کمزور اور ناقابل اعتماد ہو وہ اُسے دیانتداری کے ساتھ اپنے ذخیرہ میں جگہ دے دیتے تھے اور اس بات کا فیصلہ مجتہد علماء پر یا بعد میں آنے والے محققین پر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ اصول روایت و روایت کے مطابق صحیح و سقیم کا خود فیصلہ کریں اور ایسا کرنے میں ان کی نیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی طرف منسوب ہوتی ہے خواہ وہ درست نظر آئے یا غلط وہ جمع ہونے سے نہ رہ جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی ابستدائی کتابوں میں ہر قسم کے رطب و یابس کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سب قابل قبول ہیں بلکہ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان میں سے کمزور کو مضبوط سے جدا کر دیں۔ بہر حال اس بات میں ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں کہ کسی مسلمان محدث یا مؤرخ نے کبھی کسی روایت کو محض اس بنا پر رد نہیں کیا کہ وہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کی شان

۱۔ ابوداؤد کتاب الحدود باب الحکم فی من سب میں بیشک ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جو عصماء کے قتل کے واقعہ سے کچھ ملتا جلتا ہے، لیکن اول تو اس میں قاتل و مقتول کے نام بیان نہیں کئے گئے دوسرے اس کی بعض تفصیلات بھی اس واقعہ کی تفصیل سے نہیں ملتیں۔ علاوہ ازیں اسی باب کی اگلی حدیث میں واقعہ کو ایک بالکل ہی مختلف صورت میں بیان کیا گیا ہے جس سے روایت کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے ۛ



کے خلاف ہے یا یہ کہ اس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ کعب بن اشرف اور ابو رافع یہودی کے قتل کے واقعات جو عصمار اور ابو عفاک کے مزعومہ واقعات سے بالکل ملتے جلتے ہیں اور جن کا بیان آگے چل کر اپنے اپنے موقع پر آئیگا حدیث تاریخی کی تمام کتابوں میں پوری پوری صراحت اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور کسی مسلمان راوی یا محدث یا مؤرخ نے ان کے بیان کو ترک نہیں کیا۔ اندر میں حالات عصمار اور ابو عفاک یہودی کے قتل کا ذکر کسی حدیث میں نہ پایا جاتا، بلکہ ابتدائی مؤرخین میں سے بعض مؤرخین کا بھی اس کے متعلق خاموش ہونا اس بات کو قریباً یقینی طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یہ قصے بناوٹی ہیں اور کسی طرح بعض روایتوں میں راہ پاک تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ پھر اگر ان قصوں کی تفصیلات کا مطالعہ کیا جاوے تو ان کا بناوٹی ہونا اور بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ مثلاً عصمار کے قصہ میں ابن سعد وغیرہ کی روایت میں قاتل کا نام عمیر بن عدی بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ابن قریبہ کی روایت میں قاتل کا نام عمیر بن عدی نہیں بلکہ غنیمت ہے۔ سیسی ان دونوں ناموں کو غلط قرار دیکر یہ کہتا ہے کہ دراصل عصمار کو اس کے خاوند نے قتل کیا تھا جس کا نام روایتوں میں یزید بن یزید بیان ہوا ہے۔ اور پھر بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ مذکورہ بالا لوگوں میں سے کوئی بھی عصمار کا قاتل نہیں تھا بلکہ اس کا قاتل ایک نامعلوم الکم شخص تھا جو اسی کی قوم میں سے تھا۔ مقتولہ کا نام ابن سعد وغیرہ نے عصمار بنت مروان بیان کیا ہے، لیکن علامہ عبدالباقیہ قول ہے کہ وہ عصمار بنت مروان نہیں تھی بلکہ دراصل عمیر نے اپنی بہن بنت عدی کو قتل کیا تھا۔ قتل کا وقت ابن سعد نے رات کا درمیانی حصہ لکھا ہے لیکن زرقانی کی روایت سے دن یا زیادہ سے زیادہ رات کا ابتدائی حصہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مقتولہ اس وقت کھجوریں بیچ رہی تھی۔

دوسرا واقعہ ابو عفاک کے قتل کا ہے اس میں ابن سعد اور واقعی وغیرہ نے قاتل کا نام سالم بن عمیر لکھا ہے لیکن بعض روایتوں میں اس کا نام سالم بن عمرو بیان ہوا ہے اور ابن عقبہ نے سالم بن عبد اللہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابو عفاک مقتول کے متعلق ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ یہودی تھا لیکن واقعی اسے یہودی نہیں لکھتا۔ پھر ابن سعد اور واقعی دونوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ سالم نے خود جوش میں آکر ابو عفاک کو قتل کر دیا تھا، لیکن ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت

۱۔ زرقانی جلد ۱ ص ۴۵۲ ۲۔ الروض الالنف جلد ۲ ص ۳۹۲

۳۔ ابن ہشام جلد ۲ ص ۹۱ ۴۔ زرقانی جلد ۱ ص ۴۵۲

۵۔ استیعاب جلد ۲ ص ۴۴۲ ۶۔ زرقانی جلد ۱ ص ۴۵۲

۷۔ زرقانی جلد ۱ ص ۴۵۵ ۸۔ اصحابہ و استیعاب ذکر سالم بن عمیر ۹۔ مغازی الصادقہ ص ۱۲۵

سے قتل کیا گیا تھا یہ زمانہ قتل کے متعلق بھی ابن سعد اور واقدی اسے عصارہ کے قتل کے بعد رکھتے ہیں لیکن ابن اسحاق اور ابوالبریح اسے عصارہ کے قتل سے پہلے بیان کرتے ہیں یہ جملہ اختلافات اس بات کے متعلق قوی شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قتلے جعلی اور بناوٹی ہیں یا اگر ان میں کوئی حقیقت ہے تو وہ ایسی مستور ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔

ایک اور دلیل ان واقعات کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ ان دونوں قصوں کا زمانہ وہ بیان کیا گیا ہے جس کے متعلق جملہ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک ابھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی جھگڑا یا تنازعہ رونما نہیں ہوا تھا؛ چنانچہ تاریخ میں غزوہ بنی قینقاع کے متعلق یہ بات مسلم طور پر بیان ہوئی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یہ پہلی لڑائی تھی جو وقوع میں آئی اور یہ کہ بنو قینقاع وہ پہلے یہودی تھے جنہوں نے اسلام کی عداوت میں عملی کارروائی کی تھی پس یہ کس طرح قبول کیا جاسکتا ہے کہ اس غزوہ سے پہلے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا کشت و خون ہو چکا تھا اور پھر اگر غزوہ بنو قینقاع سے قبل ایسے واقعات ہو چکے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ اس غزوہ کے باعث وغیرہ کے بیان میں ان واقعات کا ذکر نہ آتا۔ کم از کم اتنا تو ضروری تھا کہ یہودی لوگ جو ان واقعات کی بنا پر مسلمانوں کے خلاف ایک ظاہری رنگ اعتراض کا پیدا کر سکتے تھے کہ انہوں نے ان کے ساتھ عملی چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل کی ہے ان واقعات کے متعلق داویلا کرتے۔ اگر کسی تاریخ میں حتیٰ کہ خود ان مؤرخین کی کتب میں بھی جنہوں نے یہ قتلے روایت کئے ہیں قطعاً یہ ذکر نہیں آتا کہ مدینہ کے یہود نے کبھی کوئی ایسا اعتراض کیا ہوا اور اگر کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ شاید انہوں نے اعتراض اٹھایا ہو مگر مسلمان مؤرخین نے اس کا ذکر نہ کیا ہو تو یہ ایک غلط اور بے بنیاد خیال ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کبھی کسی مسلمان محدث یا مؤرخ نے مخالفین کے کسی اعتراض پر پردہ نہیں ڈالا؛ چنانچہ مثلاً جب سر یہ غلطہ والے قتلے میں مشرکین مکہ نے مسلمانوں کے خلاف اشہر حرم کی بے حرمتی کا الزام لگایا تو مسلمان مؤرخین نے کمال حیانت داری سے ان کے اس اعتراض کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔ پس اگر اس موقع پر بھی یہودیوں کی طرف سے کوئی اعتراض ہوا ہوتا، تو تاریخ اس نکتے ذکر سے خالی نہ ہوتی۔ الغرض جس جہت بھی دیکھا جائے یہ قتلے صحیح ثابت نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی مخفی دشمن اسلام نے کسی مسلمان کی طرف منسوب کر کے یہ قتلے بیان کر دیئے تھے اور پھر وہ مسلمانوں کی روایتوں میں دخل پا گئے۔ اور یا کسی کمزور مسلمان نے اپنے قبیلہ کی طرف یہ جھوٹا فخر منسوب کرنے کے لیے کہ اس سے تعلق رکھنے والے آدمیوں نے بعض مؤذی کافروں کو قتل کیا تھا یہ روایتیں

تاریخ میں داخل کر دیں۔ واللہ اعلم۔

یہ تودہ اصل حقیقت ہے جو ان واقعات کی معلوم ہوتی ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اگر یہ واقعات درست بھی ہوں تو پھر بھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن کے ماتحت وہ وقوع پذیر ہونے وہ قابل اعتراض نہیں سمجھے جاسکتے۔ ان آیات میں جو نازک حالت مسلمانوں کی تھی اس کا ذکر اور کیا جا چکا ہے۔ ان کا حال بعینہ اس شخص کی طرح ہو رہا تھا جو ایک ایسی جگہ میں گھر ماسے جس کے چاروں طرف دُور دُور تک خطرناک آگ شعلہ زن ہو اور اس کے لیے کوئی راستہ باہر نکلنے کا نہ ہو اور پھر اس کے پاس بھی وہ لوگ کھڑے ہوں جو اس کے جانی دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی ایسی نازک حالت میں اگر کوئی مشرک اور فتنہ پرداز شخص ان کے آقا اور سردار کے خلاف اشتعال انگیز شعر کہہ کہہ کر لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا اور اس کے قتل پر دُشمنوں کو اُبھارتا تھا، تو اس زمانہ کے حالات کے ماتحت اس کا علاج سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایسے شخص کو قتل کر دیا جاتا اور پھر یہ قتل بھی مسلمانوں کی طرف سے انتہائی اشتعال کی حالت میں ہوا۔ جس حالت میں کہ معمولی قتل بھی قصاص کے قابل نہیں سمجھا جاتا، چنانچہ مسٹر مارگولیس جیسا شخص بھی جو عموماً ہمارے میں مخالفانہ پہلو لیتا ہے ان واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کو قابل ملامت نہیں قرار دیتا، چنانچہ مسٹر مارگولیس لکھتے ہیں :-

”چونکہ عصار نے اپنے اشعار میں اگر وہ اس کی طرف صحیح طور پر منسوب کئے گئے ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل پر ان کے دُشمنوں کو عذاباً اُبھارا تھا۔ اس لیے اس کا قتل خواہ اُسے دُنیائے کسی معیار کے مطابق ہی صحیح کیا جاوے ایک بے بنیاد اور ظالمانہ فعل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اشتعال انگیزی کا وہ طریق جو ہجو کے اشعار کی صورت میں اختیار کیا گیا وہ عرب جیسے ملک میں دُوسرے ممالک کی نسبت بہت زیادہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا..... اور یہ بات کہ صرف مجرموں کو ہی قتل کیا گیا عرب کے رائج الوقت دستور پر ایک بہت بڑی اصلاح تھی۔ کیونکہ عربوں میں اشتعال انگیز اشعار کی وجہ سے صرف افراد تک معاملہ محدود نہیں رہتا تھا بلکہ سالم کے سالم قبائل میں خطرناک جنگ کی آگ مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی جگہ اسلام میں یہ صحیح اصول قائم کیا گیا کہ جرم کی سزا صرف مجرم کو ہونی چاہیے نہ کہ اس کے عزیز و اقارب کو بھی“

مشرک مارگولیس کو اگر ان قتلوں کے متعلق کوئی اعتراض ہے، تو اس طریق کی وجہ سے ہے جو اختیار کیا گیا یعنی یہ کہ کیوں نہ ان کے جرم کا باقاعدہ اعلان کر کے انہیں باضابطہ طور پر قتل کی سزا دی گئی۔ سو اس کا پہلا جواب

تو یہ ہے کہ اگر ان واقعات کو درست بھی سمجھا جاوے تو وہ بعض مسلمانوں کے محض انفرادی فعل تھے جو ان سے سخت اشتعال کی حالت میں سرزد ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ ابن سعد کے بیان سے یقینی طور پر پایا جاتا ہے۔ دوسرے اگر بالفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہی سمجھا جاوے تو پھر بھی یقیناً اس زمانہ کے حالات ایسے تھے کہ اگر عصام اور ابو عصفک کے قتل کے متعلق باقاعدہ طور پر ضابطہ کا طریق اختیار کیا جاتا اور مقتولین کے متعلقین کو پیش از وقت اطلاع ہو جاتی کہ ہمارے آدمی قتل کئے جائیں گے، تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے تھے اور اس بات کا سخت اندیشہ تھا کہ یہ واقعات مسلمانوں اور یہودیوں اور نیز مسلمانوں اور مشرکین مدینہ کے درمیان ایک وسیع جنگ کی آگ مشتعل کر دیتے۔ تعجب ہے کہ مسلمانوں نے جہاں محض قتل کے فعل کو عرب کے مخصوص حالات کے ماتحت جائز قرار دیا ہے، وہاں طریقہ قتل کے متعلق ان کی نظر اس زمانہ کے مخصوص حالات تک کیوں نہیں پہنچی۔ اگر وہ اس پہلو میں بھی اس وقت کے حالات کو مد نظر رکھتے تو غالباً انہیں یقین ہو جاتا کہ جو طریق اختیار کیا گیا وہی اس وقت کے حالات اور امن عامہ کے مفاد کے لیے مناسب اور ضروری تھا، لیکن اس کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث ہم انشاء اللہ کعب بن اشرف کے قتل کے بیان میں ہدیہ ناظرین کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اول تو عصام اور ابو عصفک یہودی کے قتل کے واقعات روایتاً اور درایتاً درست ثابت ہی نہیں ہوتے اور اگر بالفرض انہیں درست سمجھا بھی جاوے تو وہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت قابل اعتراض نہیں سمجھے جاسکتے اور پھر یہ کہ جو بھی صورت ہو یہ واقعات قتل بہر حال بعض مسلمانوں کے انفرادی افعال تھے جو سخت اشتعال کی حالت میں ان سے سرزد ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق حکم نہیں دیا تھا۔

# قبائل نجد اور یہود کے ساتھ جنگ کا آغاز

## حضرت فاطمہؓ اور حفصہؓ کی شادی

### بعض متفرق واقعات

غزوہ قرقرۃ الکدر شوال ۲ سنہ ہجری یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہجرت کے بعد قریش مکہ نے مختلف قبائل عرب کا دورہ کر کے بہت سے قبائل کو مسلمانوں کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ ان قبائل میں طاقت اور جتنے کے لحاظ سے زیادہ اہم عرب کے وسطی علاقہ نجد کے رہنے والے دو قبیلے تھے۔ جن کا نام بنو تسیم اور بنو غطفان تھا اور قریش مکہ نے ان دو قبائل کو خصوصیت کے ساتھ اپنے ساتھ گانٹھ کر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا؛ چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:-

”قریش مکہ نے اب اپنی توجہ اس نجدی علاقہ کی طرف پھیری اور اس علاقہ کے قبائل کے ساتھ آگے سے بھی زیادہ گہرے تعلقات قائم کر لیے اور اس وقت کے بعد قبائل سلیم و غطفان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سخت دشمن ہو گئے اور ان کی اس دشمنی نے مسلمانوں کے خلاف عملی صورت اختیار کر لی؛ چنانچہ قریش کی اشتعال انگیزی اور ابوسفیان کے عملی نمونہ کے نتیجہ میں انہوں نے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تجویز پختہ کر لی۔“

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے واپس تشریف لائے تو ابھی آپ کو مدینہ میں پہنچے ہوئے صرف چند دن ہی ہوئے تھے کہ آپ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قبائل سلیم و غطفان کا ایک بڑا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کی نیت سے قرقرۃ الکدر میں جمع ہو رہا ہے۔ جنگ بدر کے اس قدر قریب اس اطلاع کا آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب قریش کا لشکر مسلمانوں کے خلاف حملہ آور ہونے کی نیت سے



کتے سے نکلا تھا تو رؤساء قریش نے اُسی وقت قبائل سلیم و غطفان کو یہ پیغام پہنچ دیا ہوگا کہ تم دوسری طرف سے مدینہ پر حملہ آور ہو جاؤ۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ جب ابوسفیان اپنے قافلہ کے ساتھ پنج کنوئل گیا، تو اس نے کسی قاصد وغیرہ کے ذریعہ ان قبائل کو مسلمانوں کے خلاف نکلنے کی تحریک کی ہو۔ بہر حال ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر سے فارغ ہو کر مدینہ میں پہنچے ہی تھے کہ یہ وحشتناک اطلاع موصول ہوئی کہ قبائل سلیم و غطفان مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ خبر شکر آپ فوراً صحابہ کی ایک جمعیت کو ساتھ لیکر پیشبندی کے طور نجد کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن جب آپ کئی دن کا تکلیف دہ سفر طے کر کے موضع الکدر کے قرقہ یعنی چٹل میدان میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بنو سلیم اور بنو غطفان کے لوگ لشکر اسلام کی آمد آمد کی خبر پا کر پاس کی سپاہیوں میں جا بچھپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں مسلمانوں کا ایک دستہ روانہ فرمایا اور خود بطین وادی کی طرف بڑھے، مگر ان کا کچھ سراغ نہیں ملا۔ البتہ ان کے اونٹوں کا ایک بڑا گتہ ایک وادی میں چرتا ہوا مل گیا، جس پر قوانین جنگ کے ماتحت صحابہ نے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو واپس لوٹ آئے۔ ان اونٹوں کا چرواہا ایک یسار نامی غلام تھا، جو اونٹوں کے ساتھ قید کر لیا گیا تھا۔ اس شخص پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایسا اثر ہوا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب عادت اسے بطور احسان کے آزاد کر دیا۔ مگر وہ مرتے دم تک آپ کی خدمت کے جدا نہیں ہوا۔

### غزوہ یثرب ذوالحجہ ۲ سنہ

بدر کے نتیجے میں جو ماتم مکہ میں پایا ہوا تھا اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ قریش سارے رؤساء قریش قتل ہو چکے تھے اور اب مکہ کی ریاست ابوسفیان بن حرب کے حصّہ میں آئی تھی، چنانچہ بدر کے بعد ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولین بدر کا انتقام نہ لے لے گا کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ جائے گا۔ اور نہ کبھی اپنے بالوں کو تیش لگانے کا خیال چنانچہ بدر کے دو تین ماہ بعد ذوالحجہ کے مہینہ میں ابوسفیان دو سو مسلح قریش کی جمعیت کو اپنے ساتھ لیکر مکہ سے نکلا اور نجدی راستہ کی طرف سے ہوتا ہوا مدینہ کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے اپنے لشکر کو تو مدینہ سے کچھ فاصلہ پر چھوڑا اور خود رات کی تاریکی کے پردہ میں چھپتا ہوا یہودی قبیلہ بنو نضیر کے رئیس حشیش بن اخطب کے مکان پر پہنچا اور اس سے امداد چاہی، مگر چونکہ اس کے دل میں اپنے عہد و پیمان کی کچھ یاد باقی تھی اس نے انکار کیا۔ پھر ابوسفیان اسی طرح چھپتا ہوا بنو نضیر کے دوسرے رئیس سلام بن مشکم کے مکان پر گیا اور اس سے مسلمانوں کے خلاف اعانت کا طلبگار ہوا۔ اس بد بخت نے کمال جرات کے ساتھ سارے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر ابوسفیان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور

اُسے اپنے پاس رات کو بہان رکھا اور اس سے مسلمانوں کے حالات کے متعلق مجزی کی لیے صبح ہونے سے قبل ابوسفیان وہاں سے نکلا اور اپنے لشکر میں پہنچ کر اس نے قریش کے ایک دستے کو مدینہ کے قریب عرین کی وادی میں چھاپہ مارنے کے لیے روانہ کر دیا یہ وہ وادی تھی جہاں ان ایام میں مسلمانوں کے جانور چرا کرتے تھے اور جو مدینہ سے صرف تین میل پر تھی اور غالباً اس کا حال ابوسفیان کو سلام بن مشکم سے معلوم ہوا ہوگا۔ جب قریش کا یہ دستہ وادی عرین میں پہنچا تو خوش قسمتی سے اس وقت مسلمانوں کے جانور وہاں موجود نہ تھے! البتہ ایک مسلمان انصاری اور اس کا ایک ساتھی اُس وقت وہاں موجود تھے۔ قریش نے ان دونوں کو کپڑے کا ٹکڑا لٹکانے پر قتل کر دیا۔ اور پھر صحوروں کے درختوں کو آگ لگا کر نگے اور وہاں کے مکانوں اور جھونپڑیوں کو جلا کر ابوسفیان کی قیام گاہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ ابوسفیان نے اس کامیابی کو اپنی قسم کے پورا ہونے کے لیے کافی سمجھ کر شکر کو واپسی کا حکم دیا۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوسفیان کے حملہ کی اطلاع ہوئی تو آپ صحابہ کی ایک جماعت ساتھ لے کر اُس کے تعاقب میں نکلے، مگر چونکہ ابوسفیان اپنی قسم کے ایفاء کو مشکوک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسی سرانگہی کے ساتھ بھاگا کہ مسلمان اس کے لشکر کو پہنچ نہیں سکے اور بالآخر حیدر دن کی غیر حاضری کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس لوٹ آئے۔ اُس غزوہ کو غزوہ سویلی کہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ جب ابوسفیان نکتہ کو واپس لوٹا تو تعاقب کے خیال کی وجہ سے کچھ تو گھبراہٹ میں اور کچھ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ اپنا سامان رُسد جو زیادہ تر سویلی یعنی سترو کے قبیلوں پر مشتمل تھا راستہ میں پھینکنا گیا تھا۔

**عید الاضحیٰ ذوالحجہ ۲ھ** عید الفطر کے ذکر میں اسلامی عیدوں کا فلسفہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی سال ماہ ذی الحجہ میں دوسری اسلامی عید یعنی عید الاضحیٰ شروع ہوئی جو ماہ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام اسلامی دنیا میں منائی جاتی ہے۔ اس عید میں علاوہ نماز کے جو ہر پختہ مسلمان کی حیثی عید ہے۔ ہر ذی استطاعت مسلمان کے لیے واجب ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کوئی چوپایہ جانور قربان کر کے اُس کا گوشت اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں اور مہیالوں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کرے اور خود بھی کھائے؛ چنانچہ عید الاضحیٰ کے دن اور اس کے بعد دو دن تک تمام اسلامی دنیا میں لاکھوں کروڑوں جانور فی سبیل اللہ قربان کئے جاتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کے اندر عملی طور پر اس عظیم الشان قربانی کی یاد زندہ رکھی جاتی ہے جو حضرت ابراہیم

۱۔ ابن ہشام و ابن سعد ۲۔ ابن ہشام و ابن سعد ۳۔ ابن ہشام  
۴۔ ابن سعد ۵۔ طبری صفحہ ۱۳۶۲

اور حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ نے پیش کی اور جس کی ایک بہترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی اور ہر ایک مسلمان کو ہوشیار کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے آقا و مالک کی راہ میں اپنی جان اور مال اور اپنی ہر ایک چیز قربان کر دینے کے واسطے تیار رہے۔ یہ عید بھی عید الفطر کی طرح ایک عظیم الشان اسلامی عبادت کی تکمیل پر منائی جاتی ہے اور وہ عبادت حج ہے۔ جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر آئے گا۔

### حضرت فاطمہؑ کا نکاح ذوالحجہ ۱۰ھ ہجری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے بیان میں حضرت فاطمہؑ کا ذکر گذر چکا ہے جو نور فہین کے قول کے مطابق حضرت فاطمہؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اولاد میں سب سے چھوٹی تھیں جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں اور آپؐ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ حضرت فاطمہؑ کو عزیز رکھتے تھے۔ اور اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے وہی اس امتیازی محبت کی سب سے زیادہ اہل تھیں۔ اب ان کی عمر کم و بیش پندرہ سال کی تھی اور شادی کے پیغامات آنے شروع ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے درخواست کی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر کر دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ مگر ان کی درخواست بھی منظور نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں بزرگوں نے یہ سمجھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ حضرت علیؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے حضرت علیؓ سے تحریک کی کہ تم فاطمہؑ کے متعلق درخواست کر دو۔ حضرت علیؓ نے جو غالباً پہلے سے خواہشمند تھے مگر بوجہ حیا خاموش تھے فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کر دی۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی وحی کے ذریعہ یہ اشارہ ہو چکا تھا کہ حضرت فاطمہؑ کی شادی حضرت علیؓ سے ہونی چاہیے، چنانچہ حضرت علیؓ نے درخواست پیش کی تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے تو اس کے متعلق پہلے سے خدائی اشارہ ہو چکا ہے۔ پھر آپؐ نے حضرت فاطمہؑ سے پوچھا کہ بوجہ حیا کے خاموش رہیں یہ ایک طرح سے اظہارِ رضا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصاریوں کی جماعت کو جمع کر کے حضرت علیؓ اور فاطمہؑ کا نکاح پڑھ دیا۔ یہ ۱۰ھ ہجری کی ابتداء یا وسط کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد جب جنگِ بدر ہو چکی تھی تو غالباً ۱۱ھ ذوالحجہ ۱۰ھ ہجری میں رخصتانہ کی تجویز ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر دریا فرمایا کہ تمہارے پاس مہر کی ادائیگی کے لیے کچھ ہے یا نہیں؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے

۱۔ اصحاب ۲۔ ترمذی باب فضل فاطمہ ۳۔ نسائی کتاب النکاح باب تزویج المرأة مثلاً

۴۔ ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۲، ۱۱ ۵۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۵۰، ۴ ۶۔ ابن سعد جلد ۸ صفحہ ۱۲ -

۷۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۵۰، ۴ ۸۔ اصحاب ۹۔ طبری صفحہ ۱۳۶





ہی آپ کی وفات کے بعد زندہ رہیں باقی سب بچے آپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے حضرت فاطمہ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد میں صرف انہی کی نسل کا سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سادات کی قوم انہی کی نسل سے ہے۔ حضرت فاطمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد وفات پائی گئی۔

**غزوہ بنو قینقاع اور آخر سلسلہ ہجری** **علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف**

لائے تھے اس وقت مدینہ میں یہود کے تین قبائل آباد تھے۔ ان کے نام بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آتے ہی ان قبائل کے ساتھ امن و امان کے معاہدے کر لیے اور آپس میں صلح اور امن کے ساتھ رہنے کی بنیاد ڈالی۔ معاہدہ کی رُو سے فریقین اس بات کے فائدہ اٹھاتے تھے کہ مدینہ میں امن و امان قائم رکھیں اور اگر کوئی بیرونی دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں۔ شروع شروع میں تو یہود اس معاہدہ کے پابند رہے اور کم از کم ظاہری طور پر انہوں نے

مسلمانوں کے ساتھ کوئی جھگڑا پیدا نہیں کیا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ میں زیادہ اقامت دار حاصل کرتے جاتے ہیں تو ان کے تیور بدلنے شروع ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو رد کرنے کا ہتھیار کر لیا اور اس غرض کے لیے انھوں نے ہر قسم کی جائز و ناجائز تدابیر اختیار کرنا شروع کیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس بات کی کوشش سے بھی دریغ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے اندر پھوٹ پیدا کر کے خانہ جنگی شروع کر دیں؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک موقع پر قبیلہ اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ اکٹھے بیٹھے ہوئے باہم محبت و اتفاق سے باتیں کر رہے تھے کہ بعض فتنہ پرداز یہود نے اس مجلس میں پہنچ کر جنگ بٹاعت کا تذکرہ شروع کر دیا۔ یہ وہ خطرناک جنگ تھی جو ان دو قبائل کے درمیان ہجرت سے چند سال قبل ہوئی تھی اور جس میں اوس اور خزرج کے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس جنگ کا ذکر آتے ہی بعض جوشیلے لوگوں کے دلوں میں پُرانی یاد تازہ ہو گئی اور گزشتہ عداوت کے منظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہم ٹوک جھونک اور طعن و تشنیع سے گزر کر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسی مجلس میں مسلمانوں کے اندر تلوار کھینچی گئی۔ مگر خیر گذری کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت اس کی اطلاع مل گئی اور آپ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ فوراً موقع پر تشریف لے آئے اور فریقین کو سمجھا بٹھا کر ٹھنڈا کیا اور مہر و ملاحت بھی فرمائی کہ تم میرے ہوتے ہوئے جاہلیت کا طریق اختیار کرتے ہو اور خدا کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے کہ اس نے اسلام کے ذریعہ تمہیں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ انصار پر آپ کی اس نصیحت کا ایسا اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ اپنی



اس حرکت سے متائب ہو کر ایک دوسرے سے بغلیگر ہو گئے۔

جب جنگ بدر ہو چکی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو باوجود ان کی قلت اور بے ہوشی کے قریش کے ایک بڑے قرار شکر پر نمایاں فتح دی اور مکہ کے بڑے بڑے عمائد خاک میں مل گئے تو مدینہ کے یہودیوں کی آتش خد بھڑک اٹھی اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ حکم کھلاؤںک بھونک شروع کر دی اور مجلسوں میں بر ملا طور پر کننا شروع کیا کہ قریش کے لشکر کو شکست دینا کونسی بڑی بات تھی ہمارے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ ہو تو ہم بتادیں کہ کس طرح لڑا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مجلس میں انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر اسی قسم کے الفاظ کہے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے ایک دن یہودیوں کو جمع کر کے ان کو نصیحت فرمائی اور اپنا دعویٰ پیش کر کے اسلام کی طرف دعوت دی۔ آپ کی اس پُر امن اور ہمدردانہ تقریر کا رد سامنے یہود نے ان الفاظ میں جواب دیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم شاید چند قریش کو قتل کر کے مغرور ہو گئے ہو وہ لوگ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر ہمارے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو تو تمہیں پتہ لگ جاوے کہ لڑنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ یہود نے صرف عام دھمکی پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے بھی منصوبے شروع کر دیئے تھے، کیونکہ روایت آتی ہے کہ جب ان دنوں میں طلحہ بن ہار جو ایک مخلص صحابی تھے فوت ہوئے لگے تو انہوں نے وصیت کی کہ اگر میں رات کو مروں تو نماز جنازہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دی جاوے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر یہود کی طرف سے کوئی حادثہ گذر جاوے۔ الغرض جنگ بدر کے بعد یہود نے حکم کھلا شہرت شروع کر دی اور چونکہ مدینہ کے یہود میں بنو قینقاع سب میں زیادہ طاقتور اور بہادر تھے اس لیے سب سے پہلے انہی کی طرف سے عہد شکنی شروع ہوئی، چنانچہ مورخین لکھتے ہیں کہ اِنَّ بَنِي قَيْنِقَاعَ كَانُوا اَوَّلَ يَهُودٍ نَقَضُوا مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ رَسُولِ اللَّهِ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ بَدْرٍ اظهروا اَلْبَغْيَ وَالْحَسَدَ وَنَبَذُوا الْعَهْدَ یعنی مدینہ کے یہودیوں میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے اس معاہدہ کو توڑا جو ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہوا تھا اور بدر کے بعد انھوں نے بہت سرکشی شروع کر دی اور بر ملا طور پر بغض و حسد کا اظہار کیا اور عہد و پیمان کو توڑ دیا۔

مگر باوجود اس قسم کی باتوں کے مسلمانوں نے اپنے آقا کی ہدایت کے ماتحت ہر طرح صبر سے کام لیا اور اپنی طرف سے کوئی پیش دستی نہیں ہونے دی، مگر حدیث میں آتا ہے کہ اسن معاہدہ کے بعد جو یہود کے ساتھ ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر یہود کی ولہاری کا خیال رکھتے تھے، چنانچہ ایک

لے تفسیر ابن جریر جلد ۲ ص ۱۹۷ طبری ص ۳۵۹ سطر ۱۱، ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ کے الفاظ کتاب الخراج باب کیف کان اخراج الیہود وطبری صفحہ ۱۳۶ و ابن ہشام ص ۱ ص ۱۱۰ ص ۱۱۱ ص ۱۱۲ ص ۱۱۳ ص ۱۱۴ ص ۱۱۵ ص ۱۱۶ ص ۱۱۷ ص ۱۱۸ ص ۱۱۹ ص ۱۲۰ ص ۱۲۱ ص ۱۲۲ ص ۱۲۳ ص ۱۲۴ ص ۱۲۵ ص ۱۲۶ ص ۱۲۷ ص ۱۲۸ ص ۱۲۹ ص ۱۳۰ ص ۱۳۱ ص ۱۳۲ ص ۱۳۳ ص ۱۳۴ ص ۱۳۵ ص ۱۳۶ ص ۱۳۷ ص ۱۳۸ ص ۱۳۹ ص ۱۴۰ ص ۱۴۱ ص ۱۴۲ ص ۱۴۳ ص ۱۴۴ ص ۱۴۵ ص ۱۴۶ ص ۱۴۷ ص ۱۴۸ ص ۱۴۹ ص ۱۵۰ ص ۱۵۱ ص ۱۵۲ ص ۱۵۳ ص ۱۵۴ ص ۱۵۵ ص ۱۵۶ ص ۱۵۷ ص ۱۵۸ ص ۱۵۹ ص ۱۶۰ ص ۱۶۱ ص ۱۶۲ ص ۱۶۳ ص ۱۶۴ ص ۱۶۵ ص ۱۶۶ ص ۱۶۷ ص ۱۶۸ ص ۱۶۹ ص ۱۷۰ ص ۱۷۱ ص ۱۷۲ ص ۱۷۳ ص ۱۷۴ ص ۱۷۵ ص ۱۷۶ ص ۱۷۷ ص ۱۷۸ ص ۱۷۹ ص ۱۸۰ ص ۱۸۱ ص ۱۸۲ ص ۱۸۳ ص ۱۸۴ ص ۱۸۵ ص ۱۸۶ ص ۱۸۷ ص ۱۸۸ ص ۱۸۹ ص ۱۹۰ ص ۱۹۱ ص ۱۹۲ ص ۱۹۳ ص ۱۹۴ ص ۱۹۵ ص ۱۹۶ ص ۱۹۷ ص ۱۹۸ ص ۱۹۹ ص ۲۰۰ ص ۲۰۱ ص ۲۰۲ ص ۲۰۳ ص ۲۰۴ ص ۲۰۵ ص ۲۰۶ ص ۲۰۷ ص ۲۰۸ ص ۲۰۹ ص ۲۱۰ ص ۲۱۱ ص ۲۱۲ ص ۲۱۳ ص ۲۱۴ ص ۲۱۵ ص ۲۱۶ ص ۲۱۷ ص ۲۱۸ ص ۲۱۹ ص ۲۲۰ ص ۲۲۱ ص ۲۲۲ ص ۲۲۳ ص ۲۲۴ ص ۲۲۵ ص ۲۲۶ ص ۲۲۷ ص ۲۲۸ ص ۲۲۹ ص ۲۳۰ ص ۲۳۱ ص ۲۳۲ ص ۲۳۳ ص ۲۳۴ ص ۲۳۵ ص ۲۳۶ ص ۲۳۷ ص ۲۳۸ ص ۲۳۹ ص ۲۴۰ ص ۲۴۱ ص ۲۴۲ ص ۲۴۳ ص ۲۴۴ ص ۲۴۵ ص ۲۴۶ ص ۲۴۷ ص ۲۴۸ ص ۲۴۹ ص ۲۵۰ ص ۲۵۱ ص ۲۵۲ ص ۲۵۳ ص ۲۵۴ ص ۲۵۵ ص ۲۵۶ ص ۲۵۷ ص ۲۵۸ ص ۲۵۹ ص ۲۶۰ ص ۲۶۱ ص ۲۶۲ ص ۲۶۳ ص ۲۶۴ ص ۲۶۵ ص ۲۶۶ ص ۲۶۷ ص ۲۶۸ ص ۲۶۹ ص ۲۷۰ ص ۲۷۱ ص ۲۷۲ ص ۲۷۳ ص ۲۷۴ ص ۲۷۵ ص ۲۷۶ ص ۲۷۷ ص ۲۷۸ ص ۲۷۹ ص ۲۸۰ ص ۲۸۱ ص ۲۸۲ ص ۲۸۳ ص ۲۸۴ ص ۲۸۵ ص ۲۸۶ ص ۲۸۷ ص ۲۸۸ ص ۲۸۹ ص ۲۹۰ ص ۲۹۱ ص ۲۹۲ ص ۲۹۳ ص ۲۹۴ ص ۲۹۵ ص ۲۹۶ ص ۲۹۷ ص ۲۹۸ ص ۲۹۹ ص ۳۰۰ ص ۳۰۱ ص ۳۰۲ ص ۳۰۳ ص ۳۰۴ ص ۳۰۵ ص ۳۰۶ ص ۳۰۷ ص ۳۰۸ ص ۳۰۹ ص ۳۱۰ ص ۳۱۱ ص ۳۱۲ ص ۳۱۳ ص ۳۱۴ ص ۳۱۵ ص ۳۱۶ ص ۳۱۷ ص ۳۱۸ ص ۳۱۹ ص ۳۲۰ ص ۳۲۱ ص ۳۲۲ ص ۳۲۳ ص ۳۲۴ ص ۳۲۵ ص ۳۲۶ ص ۳۲۷ ص ۳۲۸ ص ۳۲۹ ص ۳۳۰ ص ۳۳۱ ص ۳۳۲ ص ۳۳۳ ص ۳۳۴ ص ۳۳۵ ص ۳۳۶ ص ۳۳۷ ص ۳۳۸ ص ۳۳۹ ص ۳۴۰ ص ۳۴۱ ص ۳۴۲ ص ۳۴۳ ص ۳۴۴ ص ۳۴۵ ص ۳۴۶ ص ۳۴۷ ص ۳۴۸ ص ۳۴۹ ص ۳۵۰ ص ۳۵۱ ص ۳۵۲ ص ۳۵۳ ص ۳۵۴ ص ۳۵۵ ص ۳۵۶ ص ۳۵۷ ص ۳۵۸ ص ۳۵۹ ص ۳۶۰ ص ۳۶۱ ص ۳۶۲ ص ۳۶۳ ص ۳۶۴ ص ۳۶۵ ص ۳۶۶ ص ۳۶۷ ص ۳۶۸ ص ۳۶۹ ص ۳۷۰ ص ۳۷۱ ص ۳۷۲ ص ۳۷۳ ص ۳۷۴ ص ۳۷۵ ص ۳۷۶ ص ۳۷۷ ص ۳۷۸ ص ۳۷۹ ص ۳۸۰ ص ۳۸۱ ص ۳۸۲ ص ۳۸۳ ص ۳۸۴ ص ۳۸۵ ص ۳۸۶ ص ۳۸۷ ص ۳۸۸ ص ۳۸۹ ص ۳۹۰ ص ۳۹۱ ص ۳۹۲ ص ۳۹۳ ص ۳۹۴ ص ۳۹۵ ص ۳۹۶ ص ۳۹۷ ص ۳۹۸ ص ۳۹۹ ص ۴۰۰ ص ۴۰۱ ص ۴۰۲ ص ۴۰۳ ص ۴۰۴ ص ۴۰۵ ص ۴۰۶ ص ۴۰۷ ص ۴۰۸ ص ۴۰۹ ص ۴۱۰ ص ۴۱۱ ص ۴۱۲ ص ۴۱۳ ص ۴۱۴ ص ۴۱۵ ص ۴۱۶ ص ۴۱۷ ص ۴۱۸ ص ۴۱۹ ص ۴۲۰ ص ۴۲۱ ص ۴۲۲ ص ۴۲۳ ص ۴۲۴ ص ۴۲۵ ص ۴۲۶ ص ۴۲۷ ص ۴۲۸ ص ۴۲۹ ص ۴۳۰ ص ۴۳۱ ص ۴۳۲ ص ۴۳۳ ص ۴۳۴ ص ۴۳۵ ص ۴۳۶ ص ۴۳۷ ص ۴۳۸ ص ۴۳۹ ص ۴۴۰ ص ۴۴۱ ص ۴۴۲ ص ۴۴۳ ص ۴۴۴ ص ۴۴۵ ص ۴۴۶ ص ۴۴۷ ص ۴۴۸ ص ۴۴۹ ص ۴۵۰ ص ۴۵۱ ص ۴۵۲ ص ۴۵۳ ص ۴۵۴ ص ۴۵۵ ص ۴۵۶ ص ۴۵۷ ص ۴۵۸ ص ۴۵۹ ص ۴۶۰ ص ۴۶۱ ص ۴۶۲ ص ۴۶۳ ص ۴۶۴ ص ۴۶۵ ص ۴۶۶ ص ۴۶۷ ص ۴۶۸ ص ۴۶۹ ص ۴۷۰ ص ۴۷۱ ص ۴۷۲ ص ۴۷۳ ص ۴۷۴ ص ۴۷۵ ص ۴۷۶ ص ۴۷۷ ص ۴۷۸ ص ۴۷۹ ص ۴۸۰ ص ۴۸۱ ص ۴۸۲ ص ۴۸۳ ص ۴۸۴ ص ۴۸۵ ص ۴۸۶ ص ۴۸۷ ص ۴۸۸ ص ۴۸۹ ص ۴۹۰ ص ۴۹۱ ص ۴۹۲ ص ۴۹۳ ص ۴۹۴ ص ۴۹۵ ص ۴۹۶ ص ۴۹۷ ص ۴۹۸ ص ۴۹۹ ص ۵۰۰ ص ۵۰۱ ص ۵۰۲ ص ۵۰۳ ص ۵۰۴ ص ۵۰۵ ص ۵۰۶ ص ۵۰۷ ص ۵۰۸ ص ۵۰۹ ص ۵۱۰ ص ۵۱۱ ص ۵۱۲ ص ۵۱۳ ص ۵۱۴ ص ۵۱۵ ص ۵۱۶ ص ۵۱۷ ص ۵۱۸ ص ۵۱۹ ص ۵۲۰ ص ۵۲۱ ص ۵۲۲ ص ۵۲۳ ص ۵۲۴ ص ۵۲۵ ص ۵۲۶ ص ۵۲۷ ص ۵۲۸ ص ۵۲۹ ص ۵۳۰ ص ۵۳۱ ص ۵۳۲ ص ۵۳۳ ص ۵۳۴ ص ۵۳۵ ص ۵۳۶ ص ۵۳۷ ص ۵۳۸ ص ۵۳۹ ص ۵۴۰ ص ۵۴۱ ص ۵۴۲ ص ۵۴۳ ص ۵۴۴ ص ۵۴۵ ص ۵۴۶ ص ۵۴۷ ص ۵۴۸ ص ۵۴۹ ص ۵۵۰ ص ۵۵۱ ص ۵۵۲ ص ۵۵۳ ص ۵۵۴ ص ۵۵۵ ص ۵۵۶ ص ۵۵۷ ص ۵۵۸ ص ۵۵۹ ص ۵۶۰ ص ۵۶۱ ص ۵۶۲ ص ۵۶۳ ص ۵۶۴ ص ۵۶۵ ص ۵۶۶ ص ۵۶۷ ص ۵۶۸ ص ۵۶۹ ص ۵۷۰ ص ۵۷۱ ص ۵۷۲ ص ۵۷۳ ص ۵۷۴ ص ۵۷۵ ص ۵۷۶ ص ۵۷۷ ص ۵۷۸ ص ۵۷۹ ص ۵۸۰ ص ۵۸۱ ص ۵۸۲ ص ۵۸۳ ص ۵۸۴ ص ۵۸۵ ص ۵۸۶ ص ۵۸۷ ص ۵۸۸ ص ۵۸۹ ص ۵۹۰ ص ۵۹۱ ص ۵۹۲ ص ۵۹۳ ص ۵۹۴ ص ۵۹۵ ص ۵۹۶ ص ۵۹۷ ص ۵۹۸ ص ۵۹۹ ص ۶۰۰ ص ۶۰۱ ص ۶۰۲ ص ۶۰۳ ص ۶۰۴ ص ۶۰۵ ص ۶۰۶ ص ۶۰۷ ص ۶۰۸ ص ۶۰۹ ص ۶۱۰ ص ۶۱۱ ص ۶۱۲ ص ۶۱۳ ص ۶۱۴ ص ۶۱۵ ص ۶۱۶ ص ۶۱۷ ص ۶۱۸ ص ۶۱۹ ص ۶۲۰ ص ۶۲۱ ص ۶۲۲ ص ۶۲۳ ص ۶۲۴ ص ۶۲۵ ص ۶۲۶ ص ۶۲۷ ص ۶۲۸ ص ۶۲۹ ص ۶۳۰ ص ۶۳۱ ص ۶۳۲ ص ۶۳۳ ص ۶۳۴ ص ۶۳۵ ص ۶۳۶ ص ۶۳۷ ص ۶۳۸ ص ۶۳۹ ص ۶۴۰ ص ۶۴۱ ص ۶۴۲ ص ۶۴۳ ص ۶۴۴ ص ۶۴۵ ص ۶۴۶ ص ۶۴۷ ص ۶۴۸ ص ۶۴۹ ص ۶۵۰ ص ۶۵۱ ص ۶۵۲ ص ۶۵۳ ص ۶۵۴ ص ۶۵۵ ص ۶۵۶ ص ۶۵۷ ص ۶۵۸ ص ۶۵۹ ص ۶۶۰ ص ۶۶۱ ص ۶۶۲ ص ۶۶۳ ص ۶۶۴ ص ۶۶۵ ص ۶۶۶ ص ۶۶۷ ص ۶۶۸ ص ۶۶۹ ص ۶۷۰ ص ۶۷۱ ص ۶۷۲ ص ۶۷۳ ص ۶۷۴ ص ۶۷۵ ص ۶۷۶ ص ۶۷۷ ص ۶۷۸ ص ۶۷۹ ص ۶۸۰ ص ۶۸۱ ص ۶۸۲ ص ۶۸۳ ص ۶۸۴ ص ۶۸۵ ص ۶۸۶ ص ۶۸۷ ص ۶۸۸ ص ۶۸۹ ص ۶۹۰ ص ۶۹۱ ص ۶۹۲ ص ۶۹۳ ص ۶۹۴ ص ۶۹۵ ص ۶۹۶ ص ۶۹۷ ص ۶۹۸ ص ۶۹۹ ص ۷۰۰ ص ۷۰۱ ص ۷۰۲ ص ۷۰۳ ص ۷۰۴ ص ۷۰۵ ص ۷۰۶ ص ۷۰۷ ص ۷۰۸ ص ۷۰۹ ص ۷۱۰ ص ۷۱۱ ص ۷۱۲ ص ۷۱۳ ص ۷۱۴ ص ۷۱۵ ص ۷۱۶ ص ۷۱۷ ص ۷۱۸ ص ۷۱۹ ص ۷۲۰ ص ۷۲۱ ص ۷۲۲ ص ۷۲۳ ص ۷۲۴ ص ۷۲۵ ص ۷۲۶ ص ۷۲۷ ص ۷۲۸ ص ۷۲۹ ص ۷۳۰ ص ۷۳۱ ص ۷۳۲ ص ۷۳۳ ص ۷۳۴ ص ۷۳۵ ص ۷۳۶ ص ۷۳۷ ص ۷۳۸ ص ۷۳۹ ص ۷۴۰ ص ۷۴۱ ص ۷۴۲ ص ۷۴۳ ص ۷۴۴ ص ۷۴۵ ص ۷۴۶ ص ۷۴۷ ص ۷۴۸ ص ۷۴۹ ص ۷۵۰ ص ۷۵۱ ص ۷۵۲ ص ۷۵۳ ص ۷۵۴ ص ۷۵۵ ص ۷۵۶ ص ۷۵۷ ص ۷۵۸ ص ۷۵۹ ص ۷۶۰ ص ۷۶۱ ص ۷۶۲ ص ۷۶۳ ص ۷۶۴ ص ۷۶۵ ص ۷۶۶ ص ۷۶۷ ص ۷۶۸ ص ۷۶۹ ص ۷۷۰ ص ۷۷۱ ص ۷۷۲ ص ۷۷۳ ص ۷۷۴ ص ۷۷۵ ص ۷۷۶ ص ۷۷۷ ص ۷۷۸ ص ۷۷۹ ص ۷۸۰ ص ۷۸۱ ص ۷۸۲ ص ۷۸۳ ص ۷۸۴ ص ۷۸۵ ص ۷۸۶ ص ۷۸۷ ص ۷۸۸ ص ۷۸۹ ص ۷۹۰ ص ۷۹۱ ص ۷۹۲ ص ۷۹۳ ص ۷۹۴ ص ۷۹۵ ص ۷۹۶ ص ۷۹۷ ص ۷۹۸ ص ۷۹۹ ص ۸۰۰ ص ۸۰۱ ص ۸۰۲ ص ۸۰۳ ص ۸۰۴ ص ۸۰۵ ص ۸۰۶ ص ۸۰۷ ص ۸۰۸ ص ۸۰۹ ص ۸۱۰ ص ۸۱۱ ص ۸۱۲ ص ۸۱۳ ص ۸۱۴ ص ۸۱۵ ص ۸۱۶ ص ۸۱۷ ص ۸۱۸ ص ۸۱۹ ص ۸۲۰ ص ۸۲۱ ص ۸۲۲ ص ۸۲۳ ص ۸۲۴ ص ۸۲۵ ص ۸۲۶ ص ۸۲۷ ص ۸۲۸ ص ۸۲۹ ص ۸۳۰ ص ۸۳۱ ص ۸۳۲ ص ۸۳۳ ص ۸۳۴ ص ۸۳۵ ص ۸۳۶ ص ۸۳۷ ص ۸۳۸ ص ۸۳۹ ص ۸۴۰ ص ۸۴۱ ص ۸۴۲ ص ۸۴۳ ص ۸۴۴ ص ۸۴۵ ص ۸۴۶ ص ۸۴۷ ص ۸۴۸ ص ۸۴۹ ص ۸۵۰ ص ۸۵۱ ص ۸۵۲ ص ۸۵۳ ص ۸۵۴ ص ۸۵۵ ص ۸۵۶ ص ۸۵۷ ص ۸۵۸ ص ۸۵۹ ص ۸۶۰ ص ۸۶۱ ص ۸۶۲ ص ۸۶۳ ص ۸۶۴ ص ۸۶۵ ص ۸۶۶ ص ۸۶۷ ص ۸۶۸ ص ۸۶۹ ص ۸۷۰ ص ۸۷۱ ص ۸۷۲ ص ۸۷۳ ص ۸۷۴ ص ۸۷۵ ص ۸۷۶ ص ۸۷۷ ص ۸۷۸ ص ۸۷۹ ص ۸۸۰ ص ۸۸۱ ص ۸۸۲ ص ۸۸۳ ص ۸۸۴ ص ۸۸۵ ص ۸۸۶ ص ۸۸۷ ص ۸۸۸ ص ۸۸۹ ص ۸۹۰ ص ۸۹۱ ص ۸۹۲ ص ۸۹۳ ص ۸۹۴ ص ۸۹۵ ص ۸۹۶ ص ۸۹۷ ص ۸۹۸ ص ۸۹۹ ص ۹۰۰ ص ۹۰۱ ص ۹۰۲ ص ۹۰۳ ص ۹۰۴ ص ۹۰۵ ص ۹۰۶ ص ۹۰۷ ص ۹۰۸ ص ۹۰۹ ص ۹۱۰ ص ۹۱۱ ص ۹۱۲ ص ۹۱۳ ص ۹۱۴ ص ۹۱۵ ص ۹۱۶ ص ۹۱۷ ص ۹۱۸ ص ۹۱۹ ص ۹۲۰ ص ۹۲۱ ص ۹۲۲ ص ۹۲۳ ص ۹۲۴ ص ۹۲۵ ص ۹۲۶ ص ۹۲۷ ص ۹۲۸ ص ۹۲۹ ص ۹۳۰ ص ۹۳۱ ص ۹۳۲ ص ۹۳۳ ص ۹۳۴ ص ۹۳۵ ص ۹۳۶ ص ۹۳۷ ص ۹۳۸ ص ۹۳۹ ص ۹۴۰ ص ۹۴۱ ص ۹۴۲ ص ۹۴۳ ص ۹۴۴ ص ۹۴۵ ص ۹۴۶ ص ۹۴۷ ص ۹۴۸ ص ۹۴۹ ص ۹۵۰ ص ۹۵۱ ص ۹۵۲ ص ۹۵۳ ص ۹۵۴ ص ۹۵۵ ص ۹۵۶ ص ۹۵۷ ص ۹۵۸ ص ۹۵۹ ص ۹۶۰ ص ۹۶۱ ص ۹۶۲ ص ۹۶۳ ص ۹۶۴ ص ۹۶۵ ص ۹۶۶ ص ۹۶۷ ص ۹۶۸ ص ۹۶۹ ص ۹۷۰ ص ۹۷۱ ص ۹۷۲ ص ۹۷۳ ص ۹۷۴ ص ۹۷۵ ص ۹۷۶ ص ۹۷۷ ص ۹۷۸ ص ۹۷۹ ص ۹۸۰ ص ۹۸۱ ص ۹۸۲ ص ۹۸۳ ص ۹۸۴ ص ۹۸۵ ص ۹۸۶ ص ۹۸۷ ص ۹۸۸ ص ۹۸۹ ص ۹۹۰ ص ۹۹۱ ص ۹۹۲ ص ۹۹۳ ص ۹۹۴ ص ۹۹۵ ص ۹۹۶ ص ۹۹۷ ص ۹۹۸ ص ۹۹۹ ص ۱۰۰۰ ص

دفعہ ایک مسلمان اور ایک یہودی میں کچھ اختلاف ہو گیا۔ یہودی نے حضرت موسیٰ کی تمام انبیاء پر فضیلت بیان کی۔ صحابی کو اس پر غصہ آیا اور اُس نے اُس یہودی کے ساتھ کچھ سختی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل اُترسل بیان کیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ ناراض ہوئے اور اس صحابی کو ملامت فرمائی اور کہا کہ تمہارا یہ کام نہیں کہ تم خدا کے رسولوں کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کرتے پھر وہ "اور پھر آپ نے موسیٰ کی ایک جزوی فضیلت بیان کر کے اس یہودی کی ولداری فرمائی یہ مگر باوجود اس ولدانہ سلوک کے یہودی اپنی شرارت میں ترقی کرتے گئے اور بالآخر خود یہودی کی طرف سے ہی جنگ کا باعث پیدا ہوا اور ان کی قلبی عداوت ان کے سینوں میں سمائی ہو گئی اور یہ اس طرح ہوا کہ ایک مسلمان خاتون بازار میں ایک یہودی کی دکان پر کچھ سودا خریدنے کے لیے گئی۔ بعض شریر یہودیوں نے جو اُس وقت اُس دکان پر بیٹھے ہوئے تھے اسے نہایت ادباً شانہ طریق پر چھیڑا اور خود دوکاندار نے یہ شرارت کی کہ اس عورت کی تہ بند کے نچلے کونے کو اس کی بے خبری کی حالت میں کسی کانٹے وغیرہ سے اس کی پیٹھ کے کپڑے سے ٹانگ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ عورت اُن کے ادباً شانہ طریق کو دیکھ کر وہاں سے اٹھ کر لوٹنے لگی تو وہ تنگی ہو گئی اس پر اس یہودی دوکاندار اور اس کے ساتھیوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا اور ہنسنے لگ گئے۔ مسلمان خاتون نے شرم کے مارے ایک چیخ ماری اور مدوچا ہی۔ اتفاق سے ایک مسلمان اس وقت قریب موجود تھا۔ وہ لپک کر موقع پر پہنچا اور باہم لڑائی میں یہودی دوکاندار مارا گیا۔ جس پر چاروں طرف سے اس مسلمان پر تلواں برس پڑیں اور وہ غیور مسلمان وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مسلمانوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو غیرت قومی سے ان کی آنکھوں میں غول اُتر آیا اور دوسری طرف یہود جو اس واقعہ کو لڑائی کا بہانہ بنانا چاہتے تھے جو جم کر کے اکٹھے ہو گئے اور ایک بلوہ کی صورت پیدا ہو گئی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے رُوسائے بنو قینقاع کو جمع کر کے کہا کہ یہ طریق اچھا نہیں، تم ان شرارتوں سے باز آ جاؤ اور خدا سے ڈرو۔ انھوں نے بجائے اس کے کہ اظہارِ افسوس و ندامت کرتے اور معافی کے طالب بنتے سامنے سے نہایت مت ترددانہ جواب دیتے اور پھر وہی دھمکی دہرائی کہ بدر کی فتح پر غور نہ کرو، جب ہم سے مقابلہ ہو گا تو پتہ لگ جائے گا کہ لڑنے والے ایسے ہوتے ہیں یہ ناچار آپ صحابہ کی ایک جمیعت کو ساتھ لیکر بنو قینقاع کے قلعوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب یہ آخری موقع تھا کہ وہ اپنے افعال پر پشیمان ہوتے مگر وہ سامنے سے جنگ پر آمادہ تھے۔ الغرض جنگ کا اعلان ہو گیا اور اسلام اور یہودیت کی طاقتیں ایک دوسرے کے مقابل پر ٹکرائیں۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق جنگ کا ایک طریق یہ بھی ہوتا تھا کہ اپنے

قلعوں میں محفوظ ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور فرتی مخالف قلعوں کا محاصرہ کرتا تھا اور موقعہ موقعہ پر گاہے گاہے ایک دوسرے کے خلاف حملے ہوتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ یا تو محاصرہ کرنے والی فوج قلعہ پر قبضہ کرنے سے باز رہ کر محاصرہ اٹھا لیتی تھی اور یہ محصورین کی فتح سمجھی جاتی تھی اور یا محصورین مقابلہ کی تاب نہ لا کر قلعہ کا دروازہ کھول کر اپنے آپ کو فاتحین کے سپرد کر دیتے تھے اس موقعہ پر بھی بنو قینقاع نے یہی طریق اختیار کیا اور اپنے قلعوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا اور پندرہ دن تک برابر محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر جب بنو قینقاع کا سارا زور اور غرور ٹوٹ گیا تو انھوں نے اس شرط پر اپنے قلعوں کے دروازے کھول دیئے کہ ان کے اموال مسلمانوں کے ہو جائیں گے، مگر ان کی جانوں اور ان کے اہل و عیال پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو منظور فرمایا کیونکہ موسوی شریعت کی رو سے یہ سب لوگ واجب القتل تھے یہ اور معاہدہ کی رو سے ان لوگوں پر موسوی شریعت کا فیصلہ ہی جاری ہونا چاہیے تھا مگر اس قوم کا یہ پہلا جرم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحیم و کریم طبیعت انتہائی سزا کی طرف جو ایک آخری علاج ہوتا ہے ابتدائی قدم پر مائل نہیں ہو سکتی تھی، لیکن دوسری طرف ایسے بد عہد اور معاند قبیلہ کا مدینہ میں رہنا بھی ایک بار آستین کے پالنے سے کم نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ اس اور خزرج کا ایک منافی گروہ پہلے سے مدینہ میں موجود تھا اور یہودی جانب سے بھی تمام عرب کی مخالفت نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فیصلہ ہو سکتا تھا کہ بنو قینقاع مدینہ سے چلے جائیں۔ یہ سزا ان کے جرم کے مقابل میں اور نیز اس زمانہ کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک بہت نرم سزا تھی اور دراصل اس میں صرف خود حفاظتی کا پہلو ہی مد نظر تھا اور نہ عرب کی خانہ بدوش اقوام کے نزدیک نقل مکان کوئی بڑی بات نہ تھی خصوصاً جبکہ کسی قبیلہ کی جائیدادیں، زمینوں اور باغات کی صورت میں نہ ہوں۔ جیسا کہ بنو قینقاع کی نہیں تھیں۔ اور پھر سارے کے سارے قبیلہ کو بڑے امن و امان کے ساتھ ایک جگہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ آباد ہونے کا موقعہ مل جاوے؛ چنانچہ بنو قینقاع بڑے اطمینان کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر شام کی طرف چلے گئے۔ ان کی روانگی کے متعلق ضروری اہتمام اور نگرانی وغیرہ کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابی عبادة بن صامت کے سپرد فرمایا تھا جو ان کے خلفاء میں سے تھے؛ چنانچہ عبادة بن صامت چند منزل تک بنو قینقاع کے ساتھ گئے اور پھر انہیں حفاظت کے ساتھ آگے روانہ کر کے واپس لوٹ آئے یہ مال غنیمت جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا وہ صرف آلات حرب اور آلات پیشہ زدگری پر مشتمل تھا۔

بنو قینقاع کے متعلق بعض روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے قلعوں کے دروازے کھول کر اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تو ان کی بد عہدی اور بغاوت اور شرارتوں کی وجہ سے آپ کا ارادہ ان کے جنگجو مردوں کو قتل کر دینے کا تھا، مگر عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس منافقین کی سفارش پر آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا، لیکن محققین نے ان روایات کو صحیح تسلیم نہیں کیا کیونکہ جب دوسری روایات میں یہ مضمون مذکور ہے کہ بنو قینقاع نے اس شرط پر دروازے کھولے تھے کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی جان بخشی کی جائے گی۔ تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شرط کو قبول کر لینے کے بعد دوسرا طریق اختیار فرماتے، البتہ بنو قینقاع کی طرف سے جان بخشی کی شرط کا پیش ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود ہی سمجھتے تھے کہ ان کی اصل سزا قتل ہی ہے، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رحم کے طالب تھے اور یہ وعدہ لینے کے بعد اپنے قلعے کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے کہ ان کو قتل کی سزا نہیں دی جاوے گی، لیکن گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحیم النفسی سے انہیں معاف کر دیا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ لوگ اپنی بد اعمالی اور جرات کی وجہ سے اب دنیا کے پردے پر زندہ چھوڑے جانے کے قابل نہیں تھے، چنانچہ روایت آتی ہے کہ جس جگہ یہ لوگ جلا وطن ہو کر گئے تھے وہاں انہیں ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ ان میں کوئی ایسی بیماری وغیرہ پڑی کہ سارے کا سارا قبیلہ اس کا شکار ہو کر بیونہ خاک ہو گیا۔

غزوہ بنو قینقاع کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ واقعہ اور ابن سعد نے ثوال سنہ ہجری بیان کی ہے اور متاخرین نے زیادہ تر اسی کی اتباع کی ہے، لیکن ابن اسحاق اور ابن ہشام نے اسے غزوہ سویق کے بعد رکھا ہے جو مسلمہ طور پر ماہ ذی الحجہ سنہ ہجری کے شروع میں ہوا تھا اور حدیث کی ایک روایت میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ غزوہ بنو قینقاع حضرت فاطمہؓ کے رخصتانہ کے بعد ہوا تھا۔ کیونکہ اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے ولیمہ کی دعوت کا خرچ مہیا کرنے کے لیے یہ تجویز کی تھی کہ بنو قینقاع کے ایک یہودی زندہ کو ساتھ لیکر جنگل میں جائیں اور وہاں سے اذخر گھاس لاکر مدینہ کے زرگروں کے پاس فروخت کریں گے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے رخصتانہ کے وقت جو عام مؤرخین کے نزدیک ذوالحجہ سنہ ہجری میں ہوا تھا ابھی تک بنو قینقاع مدینہ میں ہی تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے غزوہ بنو قینقاع کو غزوہ سویق اور حضرت فاطمہؓ کے رخصتانہ کے بعد اور آخر سنہ ہجری میں رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔



اس موقع پر یہ ذکر بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ غزوہ بنو قینقاع کا سبب بیان کرتے ہوئے مسٹر مارگولیس نے اپنی طرف سے ایک عجیب و غریب بات بنا کر لکھی ہے جس کا قطعاً کسی روایت میں اشارہ تک نہیں آتا۔ بخاری میں ایک روایت آتی ہے کہ حضرت حمزہؓ نے شراب کے نشہ میں (اُس وقت تک ابھی شراب حرام نہیں ہوئی تھی) حضرت علیؓ کے دواؤں مار دیئے تھے جو انہیں جنگ بدر کی غنیمت میں حاصل ہوئے تھے۔ اس منفرد واقعہ کو بغیر کسی قسم کی تاریخی سند کے غزوہ بنو قینقاع کے ساتھ جوڑ کر مسٹر مارگولیس رقمطراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو قینقاع پر اس غرض سے چڑھائی کی تھی تا اس کی غنیمت سے حضرت علیؓ کے اس نقصان کی تلافی کریں۔ تاریخ نویسی میں یہ جرات غالباً اپنی مثال آپ ہی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ میں نے یہ بات اپنی طرف سے قیاس کر کے زائد کی ہے۔

”چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارو“

**جنت البقیع اور اسکا پہلا مدفون** اسی سال کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے لیے مدینہ میں ایک بقرہ تجویز فرمایا جسے جنت البقیع کہتے تھے اس کے بعد صحابہ عموماً اسی مقبرہ میں دفن ہوتے تھے۔ سب سے پہلے صحابی جو اس مقبرہ میں دفن ہوئے وہ عثمان بن مظعون تھے۔ عثمان بہت ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے اور نہایت نیک اور عابد اور صوفی منش آدمی تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد ایک دفعہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور مجھے اجازت مرحمت فرمائیں تو میں چاہتا ہوں کہ بالکل تارک الدنیا ہو کر اور بیوی بچوں سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی زندگی خالصتہ عبادت الہی کے لیے وقف کر دوں، مگر آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ جو لوگ ترک دنیا تو اختیار نہیں کرتے تھے لیکن روزہ اور نماز کی اس قدر کثرت کرتے تھے کہ اس سے ان کی متعلقین کے حقوق پر اثر پڑتا تھا، ان کے متعلق بھی آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں چاہیے کہ خدا کا حق خدا کو دو۔ بیوی بچوں کا حق بیوی بچوں کو دو۔ جہان کا حق جہان کو دو۔ اور اپنے نفس کا حق نفس کو دو۔ کیونکہ یہ سب حقوق خدا کے مقرر کردہ ہیں اور ان کی ادائیگی عبادت میں داخل ہے۔ الغرض آپؐ نے عثمان بن مظعون کو ترک دنیا کی اجازت نہیں دی اور اسلام میں بتل اور رہبانیت کو ناجائز قرار دیکر اپنی امت کے لیے افراط و تفریط کے درمیان ایک میاندروی کا رستہ قائم کر دیا۔ عثمان بن مظعون کی وفات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ ہوا اور روایت آتی ہے کہ وفات کے بعد آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس وقت آپؐ کی آنکھیں چرچم تھیں۔ ان کے دفنائے جانے کے بعد آپؐ نے ان کی قبر کے سر پر ایک پتھر بطور علامت نصب

۱۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ بدر : ۲۔ محمد مصنفہ مارگولیس صفحہ ۲۸۱ : ۳۔ اصحابہ

۴۔ بخاری کتاب النکاح ۵۔ بخاری کتاب الصوم : ۶۔ اصحابہ :



کر دایا اور پھر آپ کبھی کبھی جنت البقیع میں جا کر ان کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے۔ عثمان پہلے مہاجر تھے جو مدینہ میں فوت ہوئے۔

**غزوہ ذی امر محرم یا صفر سنہ ۳ھ** غزوہ قرقرہ الکدر کے بیان میں یہ ذکر گزر چکا ہے کہ کس طرح قریش کی انجنت پر نجد کے قبائل سلیم و غطفان نے مسلمانوں کے

غلات جارحانہ طریق اختیار کر کے اسلام اور بانی اسلام کو تباہ و برباد کر دینے کا تہمتہ کر لیا تھا۔ ابھی اس واقعہ پر کوئی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بنو غطفان کے بعض قبائل یعنی بنو ثعلبہ اور بنو محارب کے لوگ اپنے ایک نامور جنگجو دشور بن عارض کی تحریک پر پھر مدینہ پر اپنا ہلکا حملہ کر دینے کی نیت سے نجد کے ایک مقام ذی امر میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں کی حرکات و سکنات کا باقاعدہ علم رکھتے تھے آپ کو ان کے اس غوی ارادے کی بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ ایک بیدار مغز جنرل کی طرح پیش بندی کے طور پر سادھے چار سو صحابیوں کی جمیعت کو اپنے ساتھ لیکر محرم سنہ ۳ھ کے آخر یا صفر کے شروع میں مدینہ سے نکلے اور تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے ذی امر کے قریب پہنچ گئے۔ دشمن کو آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے جھٹ پٹ اس پاس کی پہاڑیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اور مسلمان ذی امر میں پہنچے تو میدان خالی تھا، البتہ بنو ثعلبہ کا ایک بدوی جس کا نام جبار تھا صحابہ کے قابو میں آگیا۔ جسے قید کر کے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ بنو ثعلبہ اور بنو محارب کے سارے لوگ پہاڑیوں میں محفوظ ہو گئے ہیں اور وہ کھلے میدان میں مسلمانوں کے سامنے نہیں آئیں گے۔ ناچار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپسی کا حکم دینا پڑا، مگر اس غزوہ کا اتنا فائدہ ضرور ہو گیا کہ اس وقت جو خطرہ بنو غطفان کی طرف سے پیدا ہوا تھا۔ وہ وقتی طور پر ٹل گیا۔ جبار جو مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوا تھا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے بخوشی مسلمان ہو گیا اور آپ نے اس کی تربیت کا کام بلالؓ کے سپرد فرمایا۔ اور تین دن کے قیام کے بعد آپ مدینہ کی طرف واپس تشریف لے آئے۔

بعض تاریخی روایات کی روش سے اسی غزوہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس میں ایک بدوی سردار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا اور غافل پا کر آپ پر تلوار کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ مگر پھر خود مرعوب ہو کر اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ لیکن حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ بشرطیکہ وہ دو دفعہ نہیں ہوا غزوہ ذات الرقاع میں پیش آیا تھا جو بردایت صحیح سنہ ۳ھ میں ہوا تھا۔

**نزوح تم کلثوم ربیع الاول سنہ ۴ھ** رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زوجہ حضرت عثمان بن عفان

کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری لڑکی اُمّ کلثوم کی شادی جو حضرت فاطمہ سے بڑی مگر رقیہ سے چھوٹی تھیں حضرت عثمانؓ سے کر دی۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورینؓ دو نوروں والا کہتے ہیں۔ اُمّ کلثوم کی یہ دوسری شادی تھی کیونکہ وہ اور ان کی بہن رقیہ شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے دو لڑکوں سے بیاہی گئی تھیں، مگر قبل اس کے کہ انکارِ خضمانہ ہو تا مذہبی مخالفت کی بناء پر یہ رشتہ منقطع ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حضرت عثمانؓ سے رقیہ کی شادی کی اور رقیہ کی وفات کے بعد اُمّ کلثوم کی شادی کر دی۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبزادیوں کی نسل کا سلسلہ نہیں چلا۔ کیونکہ اُمّ کلثوم کے تو کوئی بچہ ہوا ہی نہیں اور رقیہ کا صاحبزادہ عبد اللہ چھ سال کا ہو کر وفات پا گیا۔ اُمّ کلثوم کا نکاح ربیع الاول ۳ھ میں ہوا تھا۔

**غزوہ بھران ربیع الاول ۳ھ** بنو سلیم اور بنو غطفان کے دو حملوں کی تیاری کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فوری اور بروقت تدبیر نے خدا کے فضل سے اس وقت مسلمانوں کو ان خونخوار قبائل کے شر سے محفوظ رکھا تھا۔ مگر جس کے دل میں عداوت کی آگ سلگ رہی ہو وہ پچلا کس طرح بیٹھ سکتا تھا۔ ابھی غزوہ ذی امر پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا یعنی اواخر ربیع الاول ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وحشتناک اطلاع موصول ہوئی کہ بنو سلیم پھر موضع بھران میں مدینہ پر اچانک حملہ کرنے کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے ساتھ قریش کا بھی ایک جتھہ ہے۔ ناچار آپؐ پھر صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر مدینہ سے نکلے، لیکن حسبِ عادت عرب کے یہ وحشی دزدے جو اپنے شکار پر اچانک اور غفلت کی حالت میں حملہ کرنے کا موقعہ چاہتے تھے آپؐ کی آمد آمد کی خبر پا کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے واپس تشریف لے آئے۔ بنو سلیم اور بنو غطفان کا اس طرح بار بار مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے جمع ہونا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ صحرائے عرب کے یہ وحشی اور جنگجو قبائل اسلام کے سخت جانی دشمن تھے اور ان رات اس فکر میں رہتے تھے کہ کوئی موقع ملے تو مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ ذرا مسلمانوں کی اُس وقت کی نازک حالت کا اندازہ لگاؤ کہ ان پر اُس زمانہ میں کیسے دن گزر رہے تھے۔ ایک طرف مکہ کے قریش تھے جن کو اسلام کی عداوت اور جنگِ بدر کی انتقامی رُوح نے اندھا کر رکھا تھا اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ پیٹ پیٹ کر قمیص کھائی ہوئی تھیں کہ جب تک مسلمانوں کو ملیا میٹ

نہ کر لیں گے چین نہیں لیں گے۔ دوسری طرف صحرائے عرب کے یہ خونخوار درندے تھے جن کو قریش کی انجخت اور اسلام کی دشمنی نے مسلمانوں کے خون کی پیاس سے بے چین کر رکھا تھا، چنانچہ دیکھو کہ بدر کے بعد چند ماہ کے اندر اندر آپ کو کتنی دفعہ بذاتِ خود ان وحشی قبائل عرب کے خونی ارادوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے سفر کرنا پڑا۔ جیسا کہ سر ولیم مور نے تصریح کی ہے یہ دن بھی بہت سخت گرمیوں کے دن تھے اور گرمی بھی عرب کے صحرائے گرمی تھی۔ اگر خدا کی خاص نصرت شامل حال نہ ہوتی اور آنحضرت ﷺ کی بیدار مغزی مسلمانوں کو ہر وقت ہوشیار اور چوکس نہ رکھتی اور آپ دشمن کی جمعیت کو پھیلانے سے قبل ہی منتشر کر دینے کی تدبیر اختیار نہ کرتے تو ان دنوں میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کوئی شک نہیں تھا اور یہ صرف بیرونی خطرات تھے۔ باقی اندرونی خطرات بھی کسی طرح کم نہ تھے۔ خود مدینہ کے اندر مسلمانوں سے ملے جلے رہنے والے منافقین موجود تھے جن کو مابین کتنا یقیناً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ان کے علاوہ فجار اور خفیہ سازشوں کے عادی یہودی لوگ تھے جن کی عداوت کی گہرائی اور وسعت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اللہ اللہ ان ابتدائی مسلمانوں کے لیے یہ کیسی مصیبت کے دن تھے!! خود ان کی زبان سے سنئے۔ اُبی بن کعب ایک مشہور صحابی روایت کرتے ہیں:

كَانُوا لَا يُبَيِّتُونَ إِلَّا فِي السَّلَاحِ وَلَا يُصْبِحُونَ إِلَّا فِيهِ وَكَانُوا يَقُولُونَ لَا تَرَوْنَ  
أَنَا لَعِينُ حَتَّى يَبِيْتُ أَمِينِينَ مُطْمَئِنِّينَ لَا خِفَافٌ إِلَّا اللَّهُ ۖ

یعنی اس زمانہ میں صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ ڈر کے مارے راتوں کو ہتھیار لگا لگا کر سوتے تھے اور دن کو بھی ہر وقت مسلح رہتے تھے کہ کہیں ان پر کوئی اچانک حملہ نہ ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ہم اس وقت تک زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں کہ جب ہم آمن و اطمینان کی زندگی گذاریں گے اور خدا کے ہوا ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔

ان الفاظ میں کس مصیبت اور کس بے کسی کا اظہار ہے اور امن و اطمینان کی زندگی کی کتنی تڑپ مخفی ہے۔ اس کا اندازہ ہر انصاف پسند شخص خود کر سکتا ہے۔

سمریہ زید بن حارثہ بطرفِ قرہہ جمادی الآخرہ ۳ سنہ  
بنو سلیم اور بنو غطفان کے حملوں سے کچھ فرصت ملی تو مسلمانوں کو

ایک اور خطرہ کے سد باب کے لیے وطن سے نکلنا پڑا۔ اب تک قریش اپنی شمالی تجارت کیلئے عموماً حجاز کے ساحل راستے سے شام کی طرف جاتے تھے لیکن اب انھوں نے یہ راستہ ترک کر دیا

کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس علاقہ کے قبائل مسلمانوں کے حلیف بن چکے تھے اور قریش کے لیے شرارت کا موقع کم تھا بلکہ ایسے حالات میں وہ اس ساحلی راستے کو خود اپنے لیے موجب خطرہ سمجھتے تھے۔ بہر حال اب انہوں نے اس راستے کو ترک کر کے نجدی راستہ اختیار کر لیا جو عراق کو جاتا تھا۔ اور جس کے آس پاس قریش کے حلیف اور مسلمانوں کے جانی دشمن قبائل سلیم و غطفان آباد تھے۔ چنانچہ حمادی الآخرہ کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قریش تم کو ایک تجارتی قافلہ نجدی راستہ سے گزرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قریش کے قافلوں کا ساحلی راستے سے گزرنا مسلمانوں کے لیے موجب خطرہ تھا تو نجدی راستے سے ان کا گزرنا ویسا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اندیشہ ناک تھا۔ کیونکہ برخلاف ساحلی راستے کے اس راستے پر قریش کے حلیف آباد تھے جو قریش ہی کی طرح مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے ساتھ ملکر قریش بڑی آسانی کے ساتھ مدینہ پر خفیہ چھاپہ مار سکتے یا کوئی اور شرارت کر سکتے تھے اور پھر قریش کو کمزور کرنے اور انہیں صلح جوئی کی طرف مائل کرنے کی غرض کے ماتحت بھی ضروری تھا کہ اس راستہ پر بھی ان کے قافلوں کی روک تھام کی جادے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خبر کے ملتے ہی اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کی سرداری میں اپنے اصحاب کا ایک دستہ روانہ فرمادیا۔

قریش کے اس تجارتی قافلے میں ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ جیسے رؤسار بھی موجود تھے۔ زید نے نہایت چستی اور ہوشیاری سے اپنے فرض کو ادا کیا اور نجد کے مقام قرودہ میں ان دشمنان اسلام کو جاد بایا۔ اس اچانک حملہ سے گھبرا کر قریش کے لوگ قافلہ کے اموال و امتعہ کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور زید بن حارثہ اور ان کے ساتھی ایک کثیر مال غنیمت کے ساتھ مدینہ میں بائیل مرام واپس آ گئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قریش کے اس قافلہ کا رہبر ایک فرات نامی شخص تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا اور مسلمان ہونے پر رہا کر دیا گیا۔ لیکن دوسری روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین کا جاسوس تھا، مگر بعد میں مسلمان ہو کر مدینہ میں ہجرت کر کے آ گیا ہے۔

**قتل کعب بن اشرف حمادی الآخرہ سلمہ**  
ہمدانی کی دلی عداوت کو ظاہر کر دیا تھا

اس کا ذکر غزوہ بنو قینقاع کے بیان میں گذر چکا ہے، مگر انسوس ہے کہ بنو قینقاع کی جلاوطنی بھی دوسرے یہودیوں کو اصلاح کی طرف مائل نہ کر سکی اور وہ اپنی شرارتوں اور فتنہ پردازیوں میں ترقی کرتے گئے۔



چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کعب گوندہ بنی یہودی تھا لیکن اصل یہودی النسل نہ تھا، بلکہ عرب تھا۔ اس کا باپ اشرف بنو نہہان کا ایک ہوشیار اور چلتا پرزہ آدمی تھا جس نے مدینہ میں آکر بنو نضیر کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور ان کا حلیف بن گیا اور بالآخر اس نے اتنا اقتدار اور رُسوخ پیدا کر لیا کہ قبیلہ بنو نضیر کے رئیس اعظم ابورافع بن ابی الحقیق نے اپنی لڑکی اُسے رشتہ میں دیدی۔ اسی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا جس نے بڑے ہو کر اپنے باپ سے بھی بڑھ کر رتبہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ بالآخر اُسے یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ تمام عرب کے یہودی اُسے گویا اپنا سردار سمجھنے لگ گئے۔ کعب ایک وجیہ اور سیکل شخص ہونے کے علاوہ ایک قادر الکلام شاعر اور ایک نہایت دولت مند آدمی تھا اور ہمیشہ اپنی قوم کے علماء اور دوسرے ذی اثر لوگوں کو اپنی مالی فیاضی سے اپنے ہاتھ کے نیچے رکھتا تھا، مگر اخلاقی نقطہ نگاہ سے وہ ایک نہایت گندے اخلاق کا آدمی تھا اور خفیہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کے فن میں اُسے کمال حاصل تھا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف لائے تو کعب بن اشرف نے دوسرے یہودیوں کے ساتھ ملکر اس معاہدہ میں شرکت کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان باہمی دوستی اور امن و امان اور مشترکہ دفاع کے متعلق تحریر کیا گیا تھا۔ مگر اندر ہی اندر کعب کے دل میں بغض و عداوت کی آگ سلگنے لگ گئی اور اس نے خفیہ چالوں اور مخفی ساز باز سے اسلام اور بانی اسلام کی مخالفت شروع کر دی؛ چنانچہ لکھا ہے کہ کعب ہر سال یہودی علماء و مشائخ کو بہت سی خیرات دیا کرتا تھا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد یہ لوگ اپنے سالانہ وظائف لینے کے لیے اس کے پاس گئے تو اس نے باتوں باتوں میں اُن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شروع کر دیا اور اُن سے آپ کے متعلق مذہبی کُتب کی بناء پر رائے دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ بظاہر تو یہ وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا۔ کعب اس جواب پر بہت بگڑا اور انکو سخت شست کمہ کر دیا۔ اسے رخصت کر دیا۔ اور جو خیرات انہیں دیا کرتا وہ نہ دی۔ یہودی علماء کی جب روزی بند ہوئی تو کچھ عرصہ کے بعد پھر کعب کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں علامات کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔ ہم نے دوبارہ غور کیا ہے۔ دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ نبی نہیں ہے جس کا وعدہ دیا گیا تھا۔ اس جواب سے کعب کا مطلب حل ہو گیا اور اس نے خوش ہو کر ان کو سالانہ خیرات دیدی۔ خیر یہ تو ایک مذہبی مخالفت تھی جو گونا گوار صورت میں اختیار کی گئی، لیکن چندان قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتی تھی اور نہ اس بناء پر



کعب کو زیر الزام سمجھا جاسکتا تھا، مگر اس کے بعد کعب کی مخالفت زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتی ہے اور بالآخر جنگ بدر کے بعد تو اس نے ایسا رویہ اختیار کیا جو سخت مفیدانہ اور فتنہ انگیز تھا۔ اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک حالات پیدا ہو گئے۔ دراصل بدر سے پہلے کعب یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ جوش ایمان ایک عارضی چیز ہے اور آہستہ آہستہ یہ سب لوگ خود بخود منتشر ہو کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جائیں گے، لیکن جب بدر کے موقع پر مسلمانوں کو ایک غیر معمولی فتح نصیب ہوئی اور رسولِ قریش اکثر مارے گئے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ نیا دین یونہی مٹنا نظر نہیں آتا؛ چنانچہ بدر کے بعد اس نے اپنی پوری کوشش اسلام کے مٹانے اور تباہ و برباد کر دینے میں صرف کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے دلی بغض و حسد کا سب سے پہلا اظہار اس موقع پر ہوا جبکہ بدر کی فتح کی خبر مدینہ میں پہنچی۔ اس خبر کو سن کر کعب نے علیؑ و رسول اللہؐ کا یہ کہہ کر کہ یہ خبر بالکل جھوٹی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قریش کے ایسے بڑے لشکر پر فتح حاصل ہو اور مکہ کے اتنے نامور رئیس خاک میں مل جائیں اور اگر یہ خبر سچ ہے تو پھر اس زندگی سے مرزا بہتر ہے۔ جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی اور کعب کو یہ یقین ہو گیا کہ واقعی بدر کی فتح نے اسلام کو وہ استحکام دیدیا ہے جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا تو وہ غیض و غضب سے بھر گیا۔ اور فوراً سفر کی تیاری کر کے اس نے مکہ کی راہ لی اور وہاں جا کر اپنی چرب زبانی اور شعر گوئی کے زور سے قریش کے دلوں کی سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بار کر دیا۔ اور ان کے دل میں مسلمانوں کے خون کی نہ بجھنے والی پیاس پیدا کر دی اور ان کے سینے جذبات انتقام و عداوت سے بھر دیئے۔ اور جب کعب کی اشتعال انگیزی سے ان کے احساسات میں ایک انتہائی درجہ کی بجلی پیدا ہو گئی تو اس نے ان کو خانہ کعبہ کے صحن میں لے جا کر اور کعبہ کے پردے ان کے ہاتھوں میں دے دے کر ان سے تمہیں لیں کہ جب تک اسلام اور بانی اسلام کو صفحہ دنیا سے ملیا میٹ نہ کر دیں گے، اُس وقت تک چین نہ لیں گے یہ آتش فشاں فضا پیدا کر کے اس بد بخت کو دوسرے قبائل عرب کا رخ کیا اور قوم بقوم پھر کر مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ اور پھر مدینہ میں واپس آکر مسلمان خواتین پر تشبیب کہی یعنی اپنے جوش و لانے والے اشعار میں نہایت گندے اور فحش طریق پر مسلمان خواتین کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ خاندانِ نبوت کی مستورات کو بھی اپنے ان اوجا شانہ اشعار کا نشانہ بنانے سے دریغ نہیں کیا۔ اور ملک میں ان اشعار کا چرچا کر دیا۔ اور بالآخر اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش

۱۔ ابن ہشام و ابن سعد ۲۔ ابو داؤد و کتاب الخراج نیز ابن ہشام و ابن سعد ۳۔

فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۵۹ ۴۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۹ ۵۔

ابن ہشام ۶۔ طبری و الروض اللافت ۷۔

کی۔ اور آپ کو کسی دعوت وغیرہ کے بہانے سے اپنے مکان پر بلا کر چند نوجوان یہودیوں سے آپ کو قتل کروانے کا منصوبہ باندھا۔ مگر خدا کے فضل سے وقت پر اطلاع ہو گئی اور اُس کی یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور کعب کے خلاف عداوت، تحریک جنگ، فتنہ پڑا۔ فحش گوئی اور سازش قتل کے الزامات پائے ثبوت کو پہنچ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس بین الاقوام معاہدہ کی رو سے جو آپ کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد اہالیانِ مدینہ میں ہوا تھا۔ مدینہ کی جمہوری سلطنت کے صدر اور حاکم اعلیٰ تھے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ کعب بن اشرف اپنی کارروائیوں کی وجہ سے واجب القتل ہے اور اپنے بعض صحابیوں کو ارشاد فرمایا کہ اُسے قتل کر دیا جاوے۔ لیکن چونکہ اس وقت کعب کی فتنہ انگیزوں کی وجہ سے مدینہ کی فضا ایسی ہو رہی تھی کہ اگر اس کے خلاف باضابطہ طور پر اعلان کر کے اسے قتل کیا جاتا تو مدینہ میں ایک خطرناک خانہ جنگی شروع ہو جانے کا احتمال تھا۔ جس میں نہ معلوم کتنا کشت و خون ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ممکن اور جائز قربانی کر کے بین الاقوام کشت و خون کو روکنا چاہتے تھے۔ آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ کعب کو بر ملا طور پر قتل نہ کیا جاوے بلکہ چند لوگ خاموشی کے ساتھ کوئی مناسب موقع نکال کر اُسے قتل کر دیں اور یہ ڈیوٹی آپ نے قبیلہ اوس کے ایک مخلص صحابی محمد بن مسلمہ کے سپرد فرمائی اور انہیں تاکید فرمائی کہ جو طریق بھی اختیار کریں قبیلہ اوس کے رئیس سعد بن معاذ کے مشورہ سے کریں۔ محمد بن مسلمہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ خاموشی کے ساتھ قتل کرنے کے لیے تو کوئی بات کہنی ہوگی۔ یعنی کوئی عذر وغیرہ بنا کر پڑے گا۔ جس کی مدد سے کعب کو اس کے گھر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ میں قتل کیا جاسکے۔ آپ نے ان عظیم الشان اثرات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اس موقع پر ایک خاموش سزا کے طریق کو چھوڑنے سے پیدا ہو سکتے تھے فرمایا ”اچھا چنانچہ محمد بن مسلمہ نے سعد بن معاذ کے مشورہ سے ابو نائلہ اور دو تین اور صحابیوں کو اپنے ساتھ لیا اور کعب کے مکان پر پہنچے اور کعب کو اس کے اندرون خانہ سے بلا کر کہا کہ ”ہمارے صاحب (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ حال ہیں۔ کیا تم مہربانی کر کے ہمیں کچھ قرض دے سکتے ہو؟“ یہ بات سن کر کعب خوشی سے کود پڑا اور کہنے لگا۔ واللہ ابھی کیا ہے، وہ دن دور نہیں جب

۱۔ خمیس جلد ۴ ص ۴۷۷ و زرقانی جلد ۲ ص ۲۸۵ البوداؤد کتاب الخراج نیز بخاری باب قتل کعب بن اشرف ذہبی زرقانی جلد ۲ ص ۲۸۵  
۲۔ یہ بات کو اس موقع کے لیے اختیار کی گئی ہو گی کہ یہی جگہ درست تھی کیونکہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں سے قومی ضروریات کے لیے چندے اور زکوٰۃ کا مطالبہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ صحابہ عموماً نادار اور غریب تھے۔

تم اس شخص سے بیزار ہو کر اُسے چھوڑ دو گے۔ محمد نے جواب دیا: "خیر ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اختیار کر چکے ہیں اور اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلہ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے یا نہیں؟ کعب نے کہا: "ہاں! مگر کوئی چیز رہن رکھو" محمد نے پوچھا کیا چیز؟ اس بد بخت نے جواب دیا: "اپنی عورتیں رہن رکھ دو" محمد نے غصہ کو دبا کر کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے جیسے آدمی کے پاس ہم اپنی عورتیں رہن رکھ دیں۔ اُس نے کہا اچھا تو پھر بیٹے سہی۔ محمد نے جواب دیا کہ یہ بھی ناممکن ہے۔ ہم سارے عرب کا طعن اپنے سر پر نہیں لے سکتے، البتہ اگر تم مہربانی کرو تو ہم اپنے ہتھیار رہن رکھ دیتے ہیں۔ کعب راضی ہو گیا اور محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھی رات کو آنے کا وعدہ دیکر واپس چلے آئے۔ جب رات ہوئی تو یہ پارٹی ہتھیار وغیرہ ساتھ لیکر (کیونکہ اب وہ بڑا ملا طور پر ہتھیار اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے) کعب کے مکان پر پہنچے اور اُسے اس کے گھر سے نکال کر باتیں کرتے کرتے ایک طرف کو لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چلتے چلتے محمد بن مسلمہ یا اُن کے کسی ساتھی نے ٹھکی بہانے سے کعب کے سر پر ہاتھ ڈالا اور نہایت پھرتی کے ساتھ اس کے بالوں کو مضبوطی سے قابو کر کے اپنے ساتھیوں کو آواز دی "مارو" صحابہ نے جو پہلے سے تیار اور ہتھیار بند تھے فوراً تلواریں چلا دیں۔ اور بالآخر کعب قتل ہو کر گرا۔ اور محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھی وہاں سے رخصت ہو کر جلدی جلدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپ کو اس کے قتل کی اطلاع دی۔

جب کعب کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں ایک سنسنی پھیل گئی اور یہودی لوگ سخت جوش میں آ گئے اور دوسرے دن صبح کے وقت یہودیوں کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ ہمارا سردار کعب بن اشرف اس طرح قتل کر دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی باتیں سن کر فرمایا کہ کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کعب کس کس جرم کا مرتکب ہوا ہے؟ اور پھر آپ نے اجمالاً اُن کو کعب کی جہد شکنی اور تحریک جنگ اور فتنہ انگیزی اور فحش گوئی اور سازش قتل وغیرہ کی کارروائیاں یاد دلائیں جس پر یہ لوگ ڈر کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ تمہیں چاہیے کہ کم از کم آئندہ کے لیے ہی امن اور تعاون کے ساتھ رہو اور عداوت اور فتنہ فساد کا بیج نہ بونو؛ چنانچہ یہودی کی رضا مندی کے ساتھ آئندہ کے لیے ایک نیا معاہدہ لکھا گیا اور یہودی نے مسلمانوں کے ساتھ امن و امان کے ساتھ رہنے اور فتنہ و فساد کے طریقوں سے بچنے کا اذہر نو وعدہ کیا۔ اور یہ عہد نامہ حضرت علی کی سرورگی میں دیدیا گیا۔ اور تاریخ میں کسی جگہ مذکور نہیں کہ

۱۔ بخاری باب قتل کعب بن اشرفؓ ابو داؤد کتاب الخراج نیز ابن سعدؓ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۶۲ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۲ ابو داؤد کتاب الخراج باب کیف کان اخراج الیہود و نیز ابن سعدؓ ابن سعد

اس کے بعد یہودیوں نے کبھی کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر کر کے مسلمانوں پر الزام قائم کیا ہو۔ کیونکہ ان کے دل محسوس کرتے تھے کہ کعب اپنی مستحق سزا کو پہنچا ہے۔

کعب بن اشرف کے قتل پر بعض مغربی مؤرخین نے بڑی خامہ فرسائی کی ہے اور اس واقعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پر ایک بدنامی دھتے کے طور پر ظاہر کر کے اعتراضات جمائے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اول آیا یہ قتل فی ذاتہ ایک جائز فعل تھا یا نہیں؟ دوسرے آیا جو طریق اس قتل کے واسطے اختیار کیا گیا وہ جائز تھا یا نہیں؟ اسراؤل کے متعلق تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کعب بن اشرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقاعدہ امن و امان کا معاہدہ کر چکا تھا اور مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرنا تو ذکر کنار رہا اُس نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ ہر بیرونی دشمن کے خلاف مسلمانوں کی امداد کرے گا اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے گا۔ اُس نے اس معاہدہ کی رُو سے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ جو رنگ مدینہ میں جمہوری سلطنت کا قائم کیا گیا ہے اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدر ہوں گے اور ہر قسم کے تنازعات وغیرہ میں آپ کا فیصلہ سب کے لیے واجب القبول ہوگا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسی معاہدہ کے ماتحت یہودی لوگ اپنے مقدمات وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آپ ان میں احکام جاری فرماتے تھے؛ چنانچہ آپ نے ایک زنا کے مقدمہ میں ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کو توراہ کے حکم کے مطابق رجم کی سزا دی تھی۔ اب اگر ان حالات کے ہوتے ہوئے کعب نے تمام عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں سے بلکہ حتیٰ یہ ہے کہ حکومت وقت سے غداری کی اور مدینہ میں فتنہ و فساد کا بیج بویا اور ملک میں جنگ کی آگ مشتعل کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے خلاف قبائل عرب کو خطرناک طور پر ابھارا اور مسلمانوں کی عورتوں پر اپنے جوش دلانے والے اشعار میں تشبیہ کہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبے کیے۔ اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں کیا کہ مسلمان پہلے سے ہی چاروں طرف سے مصائب میں گھرے ہوئے تھے اور عرب کے خونخوار دزدے اُن کے خون کی پیاس میں مجنون ہو رہے تھے اور صحابہ کی ایسی حالت تھی کہ نہ دن آرام میں گذرنا تھا اور نہ رات۔ اور دشمن کے حملہ کے خطرہ میں اُن کی نیند تک حرام ہو رہی تھی۔ تو کیا ان حالات میں کعب کا جرم بلکہ بہت سے جرموں کا مجموعہ ایسا نہ تھا کہ اس کے خلاف کوئی تعزیری قدم اٹھایا جاتا؟ اور پھر کیا قتل سے کم کوئی اور سزا تھی جو یہودی کی اس فتنہ پردازی کے سلسلہ کو روک سکتی؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی غیر متعصب شخص کعب کے قتل کو ایک غیر منصفانہ فعل سمجھ سکتا ہے۔ کیا آج کل مہذب کھلانے والے ممالک میں بغاوت اور عہد شکنی اور اشتعال جنگ اور سازش قتل کے جرموں میں مجرم کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی؟



دوسرا سوال قتل کے طریق سے تعلق رکھتا ہے۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ عرب میں اس وقت کوئی باقاعدہ سلطنت نہ تھی، بلکہ ہر شخص اور ہر قبیلہ آزاد اور خود مختار تھا۔ ایسی صورت میں وہ کونسی عدالت تھی جہاں کعب کے خلاف مقدمہ دائر کر کے باقاعدہ قتل کا حکم حاصل کیا جاتا؟ کیا یہود کے پاس اس کی شکایت کی جاتی جن کا وہ سردار تھا اور جو خود مسلمانوں کے خلاف غداری کر چکے تھے اور آٹے دن فتنے کھڑے کرتے رہتے تھے؟ کیا مکہ کے قریش کے سامنے مقدمہ پیش کیا جاتا جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے؟ کیا قبائل سلیم و غطفان سے دادرسی چاہی جاتی جو گزشتہ چند ماہ میں تین چار دفعہ مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری کر چکے تھے؟ اس وقت کی عرب کی حالت پر غور کرو اور پھر سوچو کہ مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے وہ کونسا راستہ نکلا تھا کہ جب ایک شخص کی اشتعال انگیزی اور تحریک جنگ اور فتنہ پردازی اور سازش قتل کی وجہ سے اس کی زندگی کو اپنے لیے اور ملک کے امن کے لیے خطرناک پلاتے تو خود حفاظتی کے خیال سے موقع پا کر اُسے خود قتل کر دیتے کیونکہ یہ بہت بہتر ہے کہ ایک شرمیر اور مُفسد آدمی قتل ہو جاوے۔ بجائے اس کے کہ بہت پُر امن شہریوں کی جان خطرے میں پڑے اور ملک کا امن برباد ہو۔ پھر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس معاہدہ کی رو سے جو ہجرت کے بعد مسلمانوں اور یہود کے درمیان ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک معمولی شہری کی حیثیت حاصل نہ تھی، بلکہ آپ اس جمہوری سلطنت کے صدر قرار پائے تھے جو مدینہ میں قائم ہوتی تھی۔ اور آپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جملہ تنازعات اور امور سیاسی میں جو فیصلہ مناسب خیال کریں صادر فرمائیں۔ پس اگر آپ نے ملک کے امن کے مفاد میں کعب کی فتنہ پردازی کی وجہ سے اُسے واجب القتل قرار دیا تو آج تیرہ سو سال گزرنے پر جبکہ اس زمانہ کے بہت تفصیلی حالات بھی ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ کے فیصلہ پر عدالت اہل بن کر بیٹھے خصوصاً جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود یہود نے کعب کی اس سزا کو اس کے جرموں کی روشنی میں واجب سمجھ کر خاموشی اختیار کی اور اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ قتل کا حکم دینے سے پہلے یہود کو بلا کر ان کو کعب کے یہ جرم سنائے جاتے اور محبت پوری کرنے کے بعد اس کے قتل کا باقاعدہ اور بر ملا طور پر حکم دیا جاتا، تو اس کا جواب اُدھر گزر چکا ہے کہ اُس وقت حالات ایسے نازک ہو رہے تھے کہ ایسا طریق اختیار کرنے سے بین الاقوام پیچیدگیوں کے بڑھنے کا سخت خطرہ تھا اور کوئی تعجب نہ تھا کہ مدینہ میں ایک خطرناک سلسلہ کشت و خون اور خانہ جنگی کا شروع ہو جاتا۔ پس ان کاموں کی طرح جو جلد اور خاموشی کے ساتھ ہی گزر گزرنے سے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امن عامہ کے خیال سے یہی مناسب



بھکا کہ خاموشی کے ساتھ کعب کی سزا کا حکم جاری کر دیا جاوے مگر اس میں قطعاً کسی قسم کے دھوکے کا دخل نہ تھا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشاء تھا کہ یہ سزا ہمیشہ کے لیے بصیغہ راز رہے کیونکہ جو نہی کہ میوہ کا وفد دوسرے دن صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فوراً بلا توقف انہیں ساری سرگزشت سنا دی اور اس فعل کی پوری پوری ذمہ داری اپنے اوپر لیکر یہ ثابت کر دیا کہ اس میں کوئی دھوکے وغیرہ کا سوال نہیں ہے اور میوہ دیوں کو یہ بات واضح طور پر بتادی کہ فلاں فلاں خطرناک جرموں کی بنا پر کعب کے متعلق یہ سزا تجویز کی گئی تھی جو میرے حکم سے جاری کی گئی ہے اس وفد نے آپ کے اس بیان کی معقولیت کو تسلیم کیا اور کعب کے جرموں کو اس کی سزا کا کافی اور جائز باعث یقین کرتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جھوٹ اور فریب کی اجازت دی۔ سو یہ بالکل غلط ہے اور صحیح روایات اس کی مکتذب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً جھوٹ اور غلط بیانی کی اجازت نہیں دی بلکہ صحیح بخاری کی روایت کے بموجب جو اصح الروایات ہے جب محمد بن مسلمہ نے آپ سے یہ دریافت کیا کہ کعب کو خاموشی کے ساتھ قتل کرنے کے لیے تو کوئی بات کہنی پڑے گی تو آپ نے ان عظیم الشان فوائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو خاموشی سزا کے محرک تھے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ ”ہاں“ اور اس سے زیادہ اس موقع پر آپ کی طرف سے یا محمد بن مسلمہ کی طرف سے قطعاً کوئی تشریح یا توضیح نہیں ہوئی اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مطلب تھا کہ محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھی جو کعب کے مکان پر جا کر اُسے باہر نکال کر لائیں گے تو اس موقع پر انہیں لازماً کوئی ایسی بات کہنی ہوگی جس کے نتیجے میں کعب رضامندی اور خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل کر ان کے ساتھ آجاوے اور اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے آخر جنگ کے دوران میں جاسوس وغیرہ جو اپنے فرائض ادا کرتے ہیں تو ان کو بھی اسی قسم کی باتیں کہنی ہی پڑتی ہے جس پر کبھی کسی عقلمند کو اعتراض نہیں ہوا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تو بہر حال پاک ہے۔ باقی رہا محمد بن مسلمہ وغیرہ کا معاملہ جنہوں نے وہاں جا کر عملاً اس قسم کی باتیں کیں سو ان کی گفتگو میں بھی درحقیقت کوئی بات خلاف اخلاق نہیں ہے۔ انہوں نے حقیقتہً کوئی غلط بیانی نہیں کی؛ البتہ اپنے مشن کی غرض و غایت کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ دو متعین الفاظ ضرور کہے مگر ان کے بغیر چارہ نہیں تھا اور حالات جنگ میں ایک اچھی اور نیک غرض کے ماتحت سادہ اور صاف گوئی کے طریق سے اس قدر خفی الخراف ہرگز کسی عقلمند دیانت دار شخص کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ اور ان کے ساتھیوں کی یہ گفتگو اس نیک اثر کی ایک بہت عمدہ اور دلچسپ دلیل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے آپ کے صحابہ پر پیدا کیا تھا۔ عرب کے لوگوں کی اسلام سے قبل کیا حالت

تھی؟ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ ہر قسم کے گندروں میں مبتلا تھے اور دھوکا فریب جھوٹ تو گویا ان کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قلیل صحبت نے ان کے قلوب پر اس قدر گہرا اثر پیدا کیا کہ جھوٹ بولنا تو درکنار رہا وہ ایک نہایت اچھی اور نیک غرض کے ماتحت بھی سادہ اور صاف گوئی کے طریق سے ذرا بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہونا چاہتے تھے! چنانچہ اس خطرناک موقع پر بھی جو کعب بن اشرف کی شررا انگیزی نے پیدا کر دیا تھا۔ ان کو صاف گوئی کے راستے سے ایک نہایت خفی انحراف کرنے کے لیے بھی اپنے آقا کی اجازت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کے اس منونے کے مقابلہ میں اگر یہ دیکھا جاوے کہ آج کل دنیا میں ہر قوم و ملت میں اس جھوٹے اصول کے ماتحت کہ ایک نیک غرض کے لیے ہر کام کرنا جائز ہے کیا کچھ ظلم ڈھایا جاتا اور کیسے مظالم اور اکاذیب روار کھے جاتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک اور معجزہ نما اثر کی دل سے تعریف نکلتی ہے جو آپ کی تربیت نے عرب کے جاہل اور وحشی لوگوں میں ایسے قلیل عرصہ میں پیدا کیا۔

کیا جنگ میں جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا جائز ہے بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ **الْحَرْبُ خُدْعَةٌ** یعنی ”جنگ تو ایک دھوکا ہے“ اور اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جنگ میں دھوکے کی اجازت تھی، حالانکہ اول تو **الْحَرْبُ خُدْعَةٌ** کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جنگ میں دھوکا کرنا جائز ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ”جنگ خود ایک دھوکا ہے“ یعنی جنگ کے نتیجہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہوگا۔ یعنی جنگ کے نتیجہ پر اتنی مختلف باتیں اثر دلاتی ہیں کہ خواہ کیسے ہی حالات ہوں نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور ان معنوں کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حدیث میں یہ روایت دو طرح سے مروی ہوئی ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **الْحَرْبُ خُدْعَةٌ** یعنی ”جنگ ایک دھوکا ہے“ اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ **سَتَى الْحَرْبُ خُدْعَةٌ** یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کا نام دھوکا رکھا تھا“ اور دونوں کے ملانے سے یہ یقینی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا منشاء یہ نہیں تھا کہ جنگ میں دھوکا کرنا جائز ہے بلکہ یہ تھا کہ جنگ خود ایک دھوکا دینے والی چیز ہے، لیکن اگر ضرور اس کے یہی معنی کہتے جائیں کہ جنگ میں دھوکا جائز ہے تو پھر بھی یقیناً اس جگہ دھوکے سے جنگی تدبیر اور حیلہ مراد ہے جھوٹ اور فریب ہرگز مراد نہیں ہے کیونکہ اس جگہ **خُدْعَةٌ** کے معنی دافعیہ اور تدبیر جنگ کے ہیں جھوٹ اور فریب کے نہیں ہیں پس مطلب یہ ہے کہ جنگ میں اپنے دشمن کو کسی حیلہ اور تدبیر سے غافل کر کے قابو میں لے آنا یا

مغلوب کر لینا منع نہیں ہے اور اس قسم کے داؤ بیج کی صورت میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ہم میں نکلتے تھے تو عموماً اپنا منزل مقصود نظر میں نہیں فرماتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی کرتے تھے کہ جانا تو جنوب کی طرف ہوتا تھا، مگر شروع شروع میں شمال کی طرف رخ کر کے روانہ ہو جاتے تھے اور پھر پیکر کاٹ کر جنوب کی طرف گھوم جاتے تھے یا جب کبھی کوئی شخص پوچھتا تھا کہ کدھر سے آئے ہو تو بجائے مدینہ کا نام لینے کے قریب یا دوسرے پڑاؤ کا نام لے دیتے تھے یا اسی قسم کی کوئی اور جائز جنگی تدبیر اختیار فرماتے تھے یا جیسا کہ تکران شریف میں اشارہ کیا گیا ہے صحابہ بعض اوقات ایسا کرتے تھے کہ دشمن کو غافل کرنے کے لیے میدان جنگ سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے تھے اور جب دشمن غافل ہو جاتا تھا اور اس کی صفوں میں ابتری پیدا ہو جاتی تھی تو پھر اچانک حملہ کر دیتے تھے اور یہ ساری صورتیں اس خدعہ کی ہیں جسے حالات جنگ میں جائز قرار دیا گیا ہے اور اب بھی جائز سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کہ جھوٹ اور غداری وغیرہ سے کام لیا جاوے۔ اس سے اسلام نہایت سختی کے ساتھ منع کرتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں خدا کے ساتھ شریک کرنے اور والدین کے حقوق تلف کرنے کے بعد تیسرے نمبر پر جھوٹ بولنے کا گناہ سب سے بڑا ہے۔ نیز فرماتے تھے کہ ایمان اور بزدلی ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ ایمان اور بغل ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ مگر ایمان اور جھوٹ کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے یہ اور دھوکے اور غداری کے متعلق فرماتے تھے کہ جو شخص غداری کرتا ہے وہ قیامت کے دن خدا کے سخت عتاب کے نیچے ہو گا۔ الغرض جنگ میں جس قسم کے خدعہ کی اجازت دی گئی ہے وہ حقیقی دھوکا یا جھوٹ نہیں ہے بلکہ اس کے وہ جنگی تدابیر مراد ہیں جو جنگ میں دشمن کو غافل کرنے یا اسے مغلوب کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں اور جو بعض صورتوں میں ظاہری طور پر جھوٹ اور دھوکے کے مشابہ تو سمجھی جاسکتی ہیں مگر وہ حقیقتہً جھوٹ نہیں ہوتیں، چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث ہمارے اس خیال کی مصدق ہے:

عَنْ أُمِّ كَلثُومَ بِنْتِ عَقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ قَالَتْ لَسْتُ أَسْمِعُ النَّبِيَّ ﷺ يَرْحَمُ  
فِي شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ كَذِبًا إِلَّا فِي ثَلَاثٍ الْغَرْبِ وَالْإِسْلَاحِ بَيْنَ النَّاسِ  
وَحَدِيثِ الرَّجُلِ أَمْرًا وَحَدِيثِ الْمَرْأَةِ ذَوْجَهَا

یعنی "ام کلثوم بنت عقبہ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف تین موقعوں کے لیے ایسی باتوں کی اجازت دیتے سنا جو حقیقتہً تو جھوٹ نہیں

ہوتیں مگر عام لوگ انہیں غلطی سے جھوٹ سمجھ سکتے ہیں۔ اول جنگ۔ دوم لڑے ہوئے لوگوں کے درمیان صلح کمرانے کا موقع اور سوم جبکہ مرد اپنی عورت سے یا عورت اپنے مرد سے کوئی ایسی بات کرے جس میں ایک دوسرے کو راضی اور خوش کرنا مقصود ہو ۱۱

یہ حدیث اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتی کہ جس قسم کے خُذْعۃ کی جنگ میں اجازت دی گئی ہے، اس سے جھوٹ اور دھوکا مراد نہیں ہے بلکہ وہ باتیں مراد ہیں جو بعض اوقات جنگی تدابیر کے طور پر اختیار کرنی ضروری ہوتی ہیں اور جو ہر قوم اور ہر مذہب میں جائز سمجھی گئی ہیں۔

کعب بن اشرف کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد ابن ہشام نے یہ روایت نقل کی ہے کہ کعب کے قتل کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اب جس یہودی پر تم قابو پاؤ اُسے قتل کر دو چنانچہ ایک صحابی حبشہ نامی نے ایک یہودی پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا تھا اور یہی روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے اور دونوں روایتوں کا منبع ابن اسحاق ہے۔ علم روایت کی دوسری روایت کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہے کیونکہ ابن ہشام نے تو اسے بغیر کسی قسم کی سند کے لکھا ہے اور ابو داؤد نے جو سند دی ہے وہ کمزور اور ناقص ہے۔ اس سند میں ابن اسحاق یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ زید بن ثابت کے ایک آزاد کردہ غلام سے سنا تھا اور اس نامعلوم الاسم غلام نے حبشہ کی ایک نامعلوم الاسم لڑکی سے سنا تھا اور اس لڑکی نے اپنے باپ سے سنا تھا اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کی روایت جس کے دو راوی بالکل نامعلوم الاسم اور مجہول الحال ہوں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اور روایت کے لحاظ سے بھی غور کیا جاوے تو یہ قصہ درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقِ عمل اس بات کو قطعی طور پر جھٹلاتا ہے کہ آپ نے اس قسم کا عام حکم دیا ہو۔ علاوہ ازیں اگر کوئی عام حکم ہوتا تو یقیناً اس کے نتیجے میں کئی قتل واقع ہو جاتے مگر روایت میں صرف ایک قتل کا ذکر ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی عام حکم نہیں تھا اور پھر جب صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ دوسرے دن ہی یہود کے ساتھ نیا معاہدہ ہو گیا تھا تو اس صورت میں یہ ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا کہ اس معاہدہ کے ہوتے ہوئے اس قسم کا حکم دیا گیا ہو اور اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا تو یہودی لوگ اس کے متعلق ضرور واویلا کرتے، مگر کسی تاریخی روایت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہودیوں کی طرف سے کبھی کوئی اس قسم کی شکایت کی گئی ہو۔ پس روایت اور روایت دونوں طرح سے یہ قصہ غلط ثابت ہوتا ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت بھی جاسکتی ہے تو صرف اس قدر کہ جب کعب بن اشرف کے قتل کے بعد مدینہ میں ایک شور پیدا ہوا اور یہودی لوگ جو شش میں آگئے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی طرف سے خطرہ محسوس کر کے صحابہ سے یہ فرمایا ہو گا کہ جس یہودی کی طرف سے متین خطرہ



ہوا اور تم پر حملہ کرے تم اسے دفاع میں قتل کر سکتے ہو، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالت صرف چند گھنٹے رہی تھی۔  
 کیونکہ دوسرے دن ہی یہود کے ساتھ از سر نو معاہدہ ہو کر امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ واللہ اعلم  
 کعب بن اشرف کے قتل کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے۔ ابن سعد نے اسے ربیع الاول ۳۰ھ  
 ہجری میں بیان کیا ہے، لیکن ابن ہشام نے اسے سریر زید بن حارثہ کے بعد رکھا ہے جو مسلم طوز پر جمادی الآخرۃ  
 میں واقع ہوا تھا۔ میں نے ابجد ابن ہشام کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب کی ایک صاحبزادی تھیں  
 حفصہ بنت عمر کی شادی شعبان ۳۰ھ جن کا نام حفصہ تھا، وہ خنیس بن حذافہ کے عہد

میں تھیں جو ایک مخلص صحابی تھے اور جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ بدر کے بعد مدینہ واپس آنے پر  
 خنیس بیمار ہو گئے اور اس بیماری سے جا بھر نہ ہو سکے۔ ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمر کو حفصہ  
 کے نکاح ثانی کا فکر دامگیر ہوا۔ اس وقت حفصہ کی عمر بیس سال سے اوپر تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی فطرتی  
 سادگی میں خود عثمان بن عفان سے ملکر ان سے ذکر کیا کہ میری لڑکی حفصہ اب بیوہ ہے، آپ اگر پسند کریں  
 تو اس کے ساتھ شادی کر لیں، مگر حضرت عثمان نے ٹال دیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے  
 ذکر کیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بھی خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ کو بہت ملال ہوا  
 اور انھوں نے اسی ملال کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے ساری  
 سرگزشت عرض کر دی۔ آپ نے فرمایا۔ عمر کچھ فکر نہ کرو۔ خدا کو منظور ہوا تو حفصہ کو عثمان و ابوبکر کی نسبت  
 بہتر خاندان مل جائے گا اور عثمان کو حفصہ کی نسبت بہتر بیوی ملے گی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ آپ  
 حفصہ کے ساتھ شادی کر لینے اور اپنی لڑکی اُم کلثوم کو حضرت عثمان کے ساتھ بیاہ کر دینے کا ارادہ کر چکے  
 تھے جس سے حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان دونوں کو اطلاع تھی اور اسی لیے انھوں نے حضرت عمر کی تجویز  
 کو ٹال دیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان سے اپنی صاحبزادی اُم کلثوم  
 کی شادی فرمادی جس کا اوپر ذکر گذر چکا ہے اور اس کے بعد آپ نے خود اپنی طرف سے حضرت عمر کو  
 حفصہ کے لیے پیغام بھیجا۔ حضرت عمرؓ کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔ انھوں نے نہایت خوشی  
 سے اس رشتہ کو قبول کیا۔ اور شعبان ۳۰ھ میں حضرت حفصہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح  
 میں آکر حرم نبوی میں داخل ہو گئیں۔ جب یہ رشتہ ہو گیا تو حضرت ابوبکر نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ

۱۔ اصحابہ و زرقانی ۲۔ اصحابہ و زرقانی حالات حفصہؓ

۳۔ بخاری کتاب النکاح باب عرض الانسان ابنتہ ۴۔ زرقانی حالات حفصہؓ ۵۔ بخاری کتاب النکاح

۶۔ طبری حالات سلمہ ۷۔



شاید آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی ملال ہو۔ بات یہ ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے سے اطلاع تھی لیکن میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے راز کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر آپ کا یہ ارادہ نہ ہوتا تو میں بڑی خوشی سے حفصہ سے شادی کر لیتا۔

حفصہ کے نکاح میں ایک تو یہ خاص مصلحت تھی کہ وہ حضرت عمر کی صاحبزادی تھیں جو گویا حضرت ابوبکر کے بعد تمام صحابہ میں افضل ترین سمجھے جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربین خاص میں سے تھے۔ پس آپس کے تعلقات کو زیادہ مضبوط کرنے اور حضرت عمر اور حفصہ کے اس صدمہ کی تلافی کرنے کے واسطے جو خنیس بن حذافہ کی بے وقت موت سے ان کو پہنچا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ حفصہ سے خود شادی فرمائیں اور دوسری عام مصلحت یہ مد نظر تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی اتنا ہی عورتوں میں جو بنی نوع انسان کا نصف حصہ بلکہ بعض جہات سے نصف بہتر حصہ ہیں دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا کام زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ آسانی اور زیادہ خوبی کے ساتھ ہو سکے گا۔

تعدد ازواج کے مسئلہ کے متعلق اصولی بحث ہم حضرت عائشہ کی شادی کے بیان میں کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں لیکن اس قدر ذکر اس جگہ بے موقعہ نہ ہو گا کہ جو پابندیاں تعدد ازواج کے متعلق اسلام مانتا کرتا ہے اور جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عملاً کار بند تھے ان کے ماتحت ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ شادی کرنا ہرگز عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں بن سکتا بلکہ حق یہ ہے کہ ان شرائط کے ماتحت تعدد ازواج ایک بہت بڑی قربانی ہے جو مرد اور عورت دونوں کو اپنے ذاتی یا خانہ داری یا قومی یا ملکی یا دینی مصالح کے ماتحت اختیار کرنی پڑتی ہے اور اس قربانی کو اختیار کرنے والا شخص خانگی عیش و عشرت اور خانگی راحت و خوشی سے اس شخص کی نسبت بہت زیادہ دور ہوتا ہے جس کے مال اور جس کی توجہ اور جس کے وقت اور جس کی ظاہری محبت کی مالک صرف ایک عورت ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص عیش و عشرت کے خیال سے زیادہ شادیاں کرتا ہے، وہ لازماً اپنی بیویوں کی خوراک اور پوشش اور رہائش وغیرہ کا خاص خیال رکھتا ہے امداد ان کے لیے ہر طرح کا سامان عیش و عشرت مہیا کرتا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بالکل اس کے خلاف نظارہ نظر آتا ہے۔ دور نہ جائز قرآن ہی کو کھول کر دیکھو کہ جو مسلم طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح میں صحیح ترین صحیفہ ہے کہ ایک موقع پر جبکہ باہر سے اموال کی آمد آمد شروع ہو گئی تھی اور صحابہ کئی قدر خوشحال ہو رہے تھے آپ کی بیویوں نے آپ سے عرض کیا کہ اب اس فراخی سے کچھ حصہ ہمیں بھی ملنا چاہیے اور اب تک جو تنگی کے دن کاٹے ہیں ان کی

کچھ ازالہ ہونا چاہیے تو اس پر آپ نے فرمایا :

إِنْ كُنْتُمْ تُرَدُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَذِيْنَتَهَا فَتَخَالِفُونَ أَمْرَكُمْ وَاسْتَرْحَقْتُمْ سَكْرًا حَسًّا  
جَمِيعًا ۖ وَإِنْ كُنْتُمْ تُرَدُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُخِلِّينَ  
مِنْكُمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

یعنی ”اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کے مال و متاع کو پسند کرتی ہو تو آؤ میں تمہیں دنیا کے اموال دینے دیتا ہوں، مگر اس صورت میں تم میری بیویاں نہیں رہ سکتیں (کیونکہ میں اپنی زندگی کو دنیا کے اموال کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا ہوں) اور اگر میری بیویاں رہنا چاہتی ہو تو محض خدا کی خاطر اور میرے منصب رسالت کی خاطر اور آخرت کی خاطر میرے ساتھ رہو۔ اس صورت میں تم کو خدا کی طرف سے وہ عظیم الشان اجر ملے گا جو نیکو کاروں کے لیے مقدر ہے۔“

آپ کے اس فرمان کو سن کر سب ازواج نے بالاتفاق عرض کیا کہ ہمیں خدا اور اس کا رسول پس ہیں۔ دنیا کے اموال درکار نہیں۔ کیا اس زبردست تاریخی شہادت کے ہوتے ہوئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعدد ازواج نعوذ باللہ عیش و عشرت کا ذریعہ تھا؟ یقیناً یقیناً ہر نئی بیوی جو آپ کے گھر آتی تھی وہ آپ کی خانگی تنگی کو زیادہ کرنے والی ہوتی تھی اور یہ آپ کی عظیم الشان قربانی کی روح تھی جس کی وجہ سے آپ نے اپنے دین اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر ان تنگیوں کو خوشی کے ساتھ برداشت کیا اور اپنی زندگی کے امن اور قرار کو برباد کر کے ایک بالکل درویشانہ اور مسافرانہ زندگی اختیار کی۔

آپ کے پیش کردہ مسئلہ تعدد ازواج میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اس سے وہ علاقے کمزور ہو جائیں جو دنیا میں انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کے بہت سے تعلقات ہیں جنکو اسے نبھانا پڑتا ہے۔ مثلاً والدین ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ بیوی ہے۔ اولاد ہے۔ دوست ہیں۔ ہمسائے ہیں۔ وغیرہ۔ اور ان سارے علاقے میں سے جذباتی رنگ میں سب سے زیادہ گرم جوشی اور حدتِ حق کا رشتہ بیوی کا رشتہ ہے۔ مرد کی محبت اپنی بیوی سے بعض اوقات ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے جسے عرفِ عام میں عشق کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض اوقات جذبات کی تیزی اس عشق کو ایک گونہ جنون کی حد تک بھی پہنچا دیتی ہے اور پھر ایسی حالت میں انسان سوائے اس عشق کے مظاہرے میں زندگی گزارنے کے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ حالانکہ یہ ستم ہے کہ دنیا کی زندگی کے بہترین کام وہ ہیں جو انفرادی زندگی کے ساتھ نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کے اندر ان فرائض کے پورا کرنے کے

یہ بہترین قابلیت پیدا کرنا چاہتے تھے جو بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس لیے آپ نے بعض حالات میں خاص شرائط کے ماتحت تعدد ازدواج کی اجازت دیکر مرد اور عورت کے اس رشتے کو ایسی صورت دیدی کہ اس کے اندر محویت کا عالم نہ پیدا ہو سکے۔ اور اس اصل کے ماتحت آپ کا تعدد ازدواج پر عمل کرنا علاقائی خانگی کو کمزور کرنے کی غرض سے تھا نہ کہ انہیں مضبوط کرنے کے واسطے؛ چنانچہ آپ کا وہ جواب جو آپ نے اپنی بیویوں کو ان کی طرف سے مال کا مطالبہ ہونے پر دیا اس پر شاہد ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ آپ نہ صرف خود اپنی توجہ کو خدا کے لیے اور اپنے منصب رسالت کے لیے وقف رکھنا چاہتے تھے بلکہ اپنی بیویوں کے متعلق بھی آپ کے دل میں یہی خواہش تھی کہ ان کا آپ کے ساتھ تعلق محض خدا کے لیے اور آپ کے منصب رسالت کے لیے اور آخرت کے لیے ہو الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعدد ازدواج دینی اور قومی اور ملکی مفاد کے ماتحت تھا اور ان حالات میں یقیناً یہ ایک شخصی مفاد کی بہت بڑی قربانی تھی جو آپ نے اختیار کی کیونکہ آپ نے اپنی خانگی زندگی میں ایک سخت درجہ یعنی اور تنگی پیدا کر کے اپنے ان فرائض کے انجام دینے کے لیے آسانی پسند کی جو ایک شارع اور دینی مصلح اور لیڈر کی حیثیت میں آپ پر عائد ہوتے تھے اور اس لیے آپ کا یہ فعل ہر اس شخص کے شکریہ کا مستحق ہے جو جنگل کے وحشی جانوروں کی طرح صرف اپنی جسمانی خواہشات اور شخصی اور انفرادی مفاد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ اخلاقی اور روحانی اور قومی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح اور ترقی کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔

حضرت حفصہ کی عمر شادی کے وقت قریباً اکیس سال تھی اور بوجہ اس کے کہ حضرت عائشہ کے بعد وہ صحابہ میں سے ایک افضل ترین شخص کی صاحبزادی تھیں۔ ازدواج مطہرات میں ان کا ایک خاص درجہ سمجھا جاتا ہے اور حضرت عائشہ کے ساتھ بھی ان کا بہت جوڑ تھا اور سوائے کبھی کبھار کی کش مکش کے جو لیے رشتہ میں ہو جایا کرتی ہے وہ دونوں آپس میں بہت محبت کے ساتھ رہتی تھیں۔ حضرت حفصہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، چنانچہ حدیث میں ایک روایت آتی ہے کہ انھوں نے ایک صحابی عورت شفاء بنت عبد اللہ سے لکھنا سیکھا تھا۔ ان کی وفات شکمہ ہجری میں ہوئی جبکہ ان کی عمر کم و بیش تریسٹھ سال کی تھی۔

**ولادتِ امام حسنؑ و مصنانؑ** ۳؎

۳؎ ہجری کے واقعات میں حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہؑ کے نکاح کا ذکر گزر چکا ہے۔ ان کے ہاں رمضان ۳؎ ہجری میں یعنی

نکاح کے قریباً دس ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؑ رکھا۔ یہ وہی حسنؑ میں جو بعد میں مسلمانوں میں امام حسن علیہ الرحمۃ کے نام سے ملقب ہوئے جنؑ اپنی شکل و صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح اپنی اولاد حضرت فاطمہؑ سے بہت محبت تھی اسی

طرح حضرت فاطمہ کی اولاد سے بھی آپ کو خاص محبت تھی۔ کئی دفعہ فرماتے تھے۔ خدایا مجھے ان بچوں سے محبت ہے تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے محبت کر نیوالوں سے محبت کر۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ آپ نماز میں ہوتے تو حق آپ سے لپٹ جاتے۔ رکوع میں ہوتے تو آپ کی ٹانگوں میں سے راستہ بنا کر نکل جاتے بعض اوقات جب صحابہ انہیں روکتے تو آپ صحابہ کو منع فرما دیتے کہ روکو نہیں۔ دراصل چونکہ ان کا پٹنا آپ کی توجہ کو منتشر نہیں کرتا تھا۔ اس لیے آپ ان کی معصوم محبت کے طفلانہ مظاہرہ میں مزاحم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ امام حسن کے متعلق ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ میرا یہ بچہ سید یعنی سردار ہے اور ایک وقت آیا گا کہ خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا، چنانچہ اپنے وقت پر یہ پیش گوئی پوری ہوئی یہ

# ایک مصیبت کا دھکم۔ قانون ورثہ۔ حرمت شراب کفار کی غدارۃ۔ اور دو دردناک واقعات

جنگ اُحد۔ شوال ۳؎ مطابق مارچ ۶۲۴؎  
جنگ بدر کے نتیجے میں جو ماتم عظیم مکہ میں  
برپا ہوا تھا اس کا ذکر جنگ بدر کے

حالات میں کیا جا چکا ہے۔ سردارانِ قریش نے قسمیں کھائی تھیں کہ جب تک مقتولین بدر کا انتقام نہ لے  
لیں گے اس وقت تک چین نہ لیں گے۔ اُن کے اس جذبہ انتقام کو مدینہ کے بدعہد یہود کی خفیہ اشتعال انگیزوں  
نے اور بھی زیادہ بھڑکا دیا تھا، چنانچہ بدر کے بعد قریش مکہ نے دوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بہت  
سمت اکسا نا شروع کر دیا اور خود بھی برابر اس تاک میں رہے کہ جب بھی موقع ملے مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں  
کچل ڈالیں۔ بنو سلیم اور بنو غطفان کا مدینہ پر حملہ آور ہونے کی غرض سے بار بار جمع ہونا جس کا ذکر اوپر گذر  
چکا ہے زیادہ تر قریش مکہ ہی کی اشتعال انگیزوں کا نتیجہ تھا۔ غزوہ سویق بھی جس میں ابوسفیان نے مدینہ  
پر شبنون مارنے کی تجویز کی تھی اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی اور چونکہ خدا کے فضل سے اس غزوہ میں قریش کو  
ذلت کا منہ دیکھنا پڑا تھا، اس لیے اُن کا جوش انتقام اور بھی زیادہ ہو گیا تھا اور گواں وقت انہوں نے  
عرب کے سامنے اپنی عزت رکھنے کے لیے یہ کہہ دیا تھا کہ ہماری قسم پوری ہو گئی ہے، لیکن ان کے دل  
اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ غزوہ سویق نے ان کے ماتھے پر ذلت کا ایک اور دھبہ لگا دیا تھا۔ لہذا  
اس کے بعد انہوں نے آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کی، چنانچہ غزوہ  
اُحد جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں اسی تیاری کا نتیجہ تھا۔

جس تجارتی قافلہ کا ذکر جنگ بدر کے حالات میں گذر چکا ہے اس کے منافع کا روپیہ جس کی مالیت  
پچاس ہزار دینار تھی یہ روسائے مکہ کے فیصلہ کے مطابق ابھی تک دارالندوہ میں مسلمانوں کے خلاف حملہ



کرنے کی تیاری کے واسطے محفوظ پڑا تھا۔ اب اس روپے کو نکالا گیا اور بڑے زور شور سے جنگ کی تیاری شروع ہوئی۔ یہ مسلمانوں کو اس تیاری کا علم بھی نہ ہوتا اور لشکر کفار مسلمانوں کے دروازوں پر پہنچ جاتا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیدار مغزی نے تمام ضروری احتیاطیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یعنی آپؐ نے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کو جہول میں آپؐ کے ساتھ تھے کمرے میں بٹھرے رہنے کی تاکید کر رکھی تھی اور وہ قریش کی حرکات و سکنات سے آپؐ کو اطلاع دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ عباس بن عبدالمطلب نے اس موقع پر بھی قبیلہ بنو غفار کے ایک تیز رو سوار کو بڑے انعام کا وعدہ دیکر مدینہ کی طرف روانہ کیا اور ایک خط کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اس ارادے سے اطلاع دی۔ اور اس قاصد کو سخت تاکید کی کہ تین دن کے اندر اندر آپ کو یہ خط پہنچا دے۔ جب یہ قاصد مدینہ پہنچا تو اتفاق سے اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے حوالی قبا میں تشریف لے گئے ہوئے تھے؛ چنانچہ یہ قاصد آپؐ کے پیچھے وہیں قبا میں پہنچا۔ اور آپؐ کے سامنے یہ بند خط پیش کر دیا۔ آپؐ نے فوراً اپنے کاتب خاص ابی بن کعب انصاری کو یہ خط دیا اور فرمایا کہ اسے پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے ابیؓ نے خط پڑھ کر سنایا تو اس میں یہ وحشت ناک خبر درج تھی کہ قریش کا ایک جبار لشکر مکہ سے آرہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط سنکر ابی بن کعب کو تاکید فرمائی کہ اس کے مضمون سے کسی کو اطلاع نہ ہو۔ اور پھر آپؐ نے مدینہ میں واپس تشریف لا کر اپنے دو صحابیوں کو لشکر قریش کی خبر رسانی کے لیے مکہ کے راستہ کی طرف روانہ فرما دیا۔ غالباً اسی موقع پر آپؐ نے مسلمانوں کی تعداد و طاقت معلوم کرنے کے لیے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مدینہ کی تمام مسلمان آبادی کی مردم شماری کی جائے چنانچہ مردم شماری کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک کل پندرہ سو مسلمان متعین ہیں۔ اس وقت کے حالات کے ماتحت اسی تعداد کو بہت بڑی تعداد سمجھا گیا؛ چنانچہ بعض صحابہ نے تو اس وقت خوشی کے ہوش میں یہاں تک کہہ دیا کہ کیا اب بھی جبکہ ہماری تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی ہے ہیں کسی کا ڈر ہو سکتا ہے؟ مگر انہی میں سے ایک صحابی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم پر ایسے ایسے سخت وقت آنے کے بعض اوقات ہیں نماز بھی چھپ کر ادا کرنی پڑتی تھی۔ ایک موقع پر اس سے پہلے بھی آپؐ نے مسلمانوں کی مردم شماری کروائی تھی تو اس وقت چھ اور سات سو کے درمیان تعداد نکلی تھی۔

غالباً رمضان سنہ ۳ کے آخر یا شوال کے شروع میں قریش کا لشکر مکہ سے نکلا۔ لشکر میں دوسرے قبائل عرب کے بہت سے بہادر بھی شامل تھے۔ ابوسفیان سردار لشکر تھا۔ لشکر کی تعداد تین ہزار

۱۔ ابن سعد ۳ ابن سعد ابن ہشام ۳ ررقانی جلد ۱ صفحہ ۴۴۸ ۴۔ ابن سعد ۳ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۴۱  
۵۔ بخاری کتاب الجہاد باب کتابہ الامام وفتح الباری شرح حدیث مذکور ۶۔ مسلم کتاب الایمان باب جواز استسرا للخاصۃ۔ ۷۔ ابن ہشام۔



فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک مینڈھا ہے جس کی پیٹھ پر میں سوار ہوں۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! آپ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی ہے؟ آپ نے فرمایا: گائے کے ذبح ہونے سے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے صحابہ میں سے بعض کا شہید ہونا مراد ہے اور میری تلوار کے کنارے کے ٹوٹنے سے میرے عزیزوں میں سے کسی کی شہادت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید خود مجھے اس مہم میں کوئی تکلیف پہنچے۔ اور زہرہ کے اندر ہاتھ ڈالنے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس حملہ کے مقابلہ کے لیے ہمارا مدینہ کے اندر ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے۔ اور مینڈھے پر سوار ہونے والے خواب کی آپ نے یہ تاویل فرمائی کہ اس سے کفار کے لشکر کا سردار یعنی عکبر دار اور ہے جو انشاء اللہ مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا کہ موجود صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ بعض اکابر صحابہ نے حالات کے اُدبِ پنج کو سوچ کر اور شاید کسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب سے بھی متاثر ہو کر یہ رائے دی کہ مدینہ میں ہی ٹھہر کر مقابلہ کرنا مناسب ہے یہی راستے عبداللہ بن ابی بن مسلول رئیس المنافقین نے دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی رائے کو پسند فرمایا اور کہا کہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم مدینہ کے اندر رہ کر ان کا مقابلہ کریں، لیکن اکثر صحابہ نے اور خصوصاً ان نوجوانوں نے جو بدر کی جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور اپنی شہادت سے خدمتِ دین کا موقعہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوئے تھے بڑے اصرار کے ساتھ عرض کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان لوگوں نے اس قدر اصرار کے ساتھ اپنی رائے کو پیش کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوش کو دیکھ کر ان کی بات مان لی اور فیصلہ فرمایا کہ ہم کھلے میدان میں نکل کر کفار کا مقابلہ کریں گے اور پھر جمعہ کی نماز کے بعد آپ نے مسلمانوں میں عام تحریک فرمائی کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے اس غزوہ میں شامل ہو کر ثواب حاصل کریں۔ اس کے بعد آپ اندرون خانہ تشریف لے گئے جہاں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مدد سے آپ نے عمامہ باندھا اور لباس پہنا اور پھر ہتھیار لگا کر اللہ کا نام لیتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ لیکن اتنے عرصہ میں حضرت سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس اور دوسرے اکابر صحابہ کے سمجھانے سے نوجوان پائی کو اپنی غلطی محسوس ہونے لگی تھی کہ رسول خدا کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا اور اب اکثر ان میں سے پشیمانی کی طرف مائل تھے۔

جب ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہتھیار لگائے اور دھڑ دھڑ اور خود وغیرہ پہننے ہوئے تشریف لاتے دیکھا تو ان کی ندامت اور بھی زیادہ ہو گئی اور انھوں نے قریناً ایک زبان ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم نے آپ کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پر اصرار کیا۔ آپ جس طرح مناسب خیال فرماتے ہیں اسی طرح کارروائی فرمائیں۔ انشاء اللہ اسی میں برکت ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔

۱۔ ابن ہشام ۲۔ ابن سعد ۳۔ ابن ہشام ۴۔ ابن سعد

۵۔ زرقانی و ابن سعد ۶۔ ابن ہشام و ابن سعد ۷۔ ابن سعد و زرقانی

”خدا کے نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ہتھیار لگا کر پھر اُسے اُار دے قبل اس کے کہ خدا کوئی فیصلہ کرے۔“  
 پس اب اللہ کا نام لیکر چلو اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس  
 کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلامی کے تین جھنڈے تیار کروائے۔ قبیلہ اوس کا جھنڈا اسید بن  
 الحنفیر کے سپرد کیا گیا اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا احباب بن منذر کے ہاتھ میں دیا گیا اور ہاجرین کا جھنڈا حضرت علی  
 کو دیا گیا اور پھر مدینہ میں عبداللہ بن ام مکتوم کو امام الصلوٰۃ مقرر کر کے آپ صحابہ کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ  
 نماز عصر کے بعد مدینہ سے نکلے۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے رؤساء سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ آپ کی سواری  
 کے سامنے آہستہ آہستہ دوڑتے جاتے تھے اور باقی صحابہ آپ کے دائیں اور بائیں اور پیچھے چل رہے تھے یہ  
 اُحد کا پہاڑ مدینہ سے شمال کی طرف قریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے نصف میں پہنچ کر اس  
 مقام میں جسے یحنین کہتے ہیں آپ نے قیام فرمایا اور لشکرِ اسلامی کا جائزہ لے لے جانے کا حکم دیا۔ کم عمر بچے جو  
 جہاد کے شوق میں ساتھ آگئے تھے واپس کئے گئے تھے چنانچہ عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، ابوسعید خدری وغیرہ  
 سب واپس کئے گئے۔ رافع بن خدیج انہیں بچوں کے ہم عمر تھے مگر تیر اندازی میں اچھی مہارت رکھتے تھے انکی  
 اس خوبی کی وجہ سے اُن کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی سفارش کی کہ ان کو شریک  
 جہاد ہونے کی اجازت دی جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رافع کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ سپاہیوں  
 کی طرح خوب تن کر کھڑے ہو گئے تاکہ چُست اور بے نظر آئیں؛ چنانچہ اُن کا یہ داؤ چل گیا اور آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے ان کو ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اس پر ایک اور بچہ سمرة بن جندب نامی  
 جسے واپسی کا حکم مل چکا تھا اپنے باپ کے پاس گیا اور کہا کہ اگر رافع کو لیا گیا ہے تو مجھے بھی اجازت ملنی چاہیے۔  
 کیونکہ میں رافع سے مضبوط ہوں اور اُسے کشتی میں گرا لیتا ہوں۔ باپ کو بیٹے کے اس اخلاص پر بہت خوشی ہوئی  
 اور وہ اُسے ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے بیٹے کی خواہش بیان  
 کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اچھا رافع اور سمرة کی کشتی کھرواؤ تاکہ معلوم ہو کہ  
 کون زیادہ مضبوط ہے؛ چنانچہ مقابلہ ہوا اور واقع میں سمرة نے پل بھر میں رافع کو اٹھا کر دسے مارا جس پر  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرة کو بھی ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس معصوم بچے کا دل خوش ہو  
 گیا۔ اب چونکہ شام ہو چکی تھی اس لیے بلال نے اذان کہی اور سب صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی اقتدار میں نماز ادا کی اور پھر رات کے واسطے مسلمانوں نے سینیں ڈیرے ڈال دیئے اور آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے پھرے کے لئے محمد بن مسلمہ کو منتظم مقرر فرمایا جنہوں نے پچاس صحابہ کی جماعت کے



ساتھ رات بھر لشکرِ اسلامی کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے پہرہ دیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۵ شوال ۳۳ھ ہجری مطابق ۳۱ مارچ ۶۲۳ء بروز ہفتہ سحری کے وقت لشکرِ اسلامی آگے بڑھا اور راستے میں نماز ادا کرتے ہوئے صبح ہوتے ہی اُحد کے دامن میں پہنچ گیا۔ اس موقع پر بد بطن عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین نے غداری کی اور اپنے تین سوا تھیوں کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر سے ہٹ کر یہ کہتا ہوا مدینہ کی طرف واپس لوٹ گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بات نہیں مانی اور نا تجربہ کار نوجوانوں کے کہنے میں آکر باہر نکل آئے ہیں، اس لیے میں ان کے ساتھ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ بعض لوگوں نے بطور خود اُسے سمجھایا بھی کہ یہ غداری ٹھیک نہیں ہے، مگر اس نے ایک نہ سُنی اور یہی کہتا گیا کہ یہ کوئی لڑائی ہوتی تو میں بھی شامل ہوتا۔ مگر یہ کوئی لڑائی نہیں ہے بلکہ خود ہلاکت کے مُنہ میں جانا ہے۔ اب اسلامی لشکر کی تعداد صرف سات سو نفوس پر مشتمل تھی۔ جو کفار کے تین ہزار سپاہیوں کے مقابلہ میں ایک چارم سے بھی کم تھی اور سواری اور سامانِ حرب کے لحاظ سے بھی اسلامی لشکر قریش کے مقابلہ میں بالکل کمزور اور حقیر تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی فوج میں صرف ایک سوزہ پوش اور فقط دو گھوڑے تھے۔ اس کے مقابل کفار کے لشکر میں سات سو زہ پوش اور دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ اس کمزوری کی حالت میں جسے مسلمان خوب محسوس کرتے تھے عبداللہ بن ابی کے تین سوا دی کی غداری نے بعض کمزور دل مسلمانوں میں ایک بے چینی اور اضطراب کی حالت پیدا کر دی تھی اور ان میں سے بعض متزلزل ہونے لگ گئے، چنانچہ جیسا کہ قرآن شریف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے اسی گھبر ہٹ اور اضطراب کی حالت میں مسلمانوں کے دو قبائل بنو عارضہ اور بنو سلمہ نے مدینہ کی طرف واپس لوٹ جانے کا ارادہ بھی کر لیا، مگر چونکہ دل میں نور ایمان موجود تھا پھر سنبھل گئے اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی اپنے آقا کے پہلو کو نہ چھوڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھے اور اُحد کے دامن میں ڈیرہ ڈال دیا۔ ایسے طریق پر کہ اُحد کی پہاڑی مسلمانوں کے پیچھے کی طرف اُگتی اور مدینہ گویا سامنے رہا۔ اور اس طرح آپ نے لشکر کا عقب محفوظ کر لیا۔ عقب کی پہاڑی میں ایک درہ تھا جہاں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ اُس کی حفاظت کا آپ نے یہ انتظام فرمایا کہ عبداللہ بن جبیر کی سرکاری میں پچاس تیر انداز صحابی وہاں متعین فرما دیئے اور ان کو تاکید فرمائی کہ خواہ کچھ ہو جاوے وہ اس جگہ کو نہ چھوڑیں اور دشمن پر تیر برساتے جائیں۔ آپ کو اس درہ کی حفاظت کا اس قدر خیال تھا کہ آپ نے عبداللہ بن جبیر سے یہ حکم فرمایا کہ دیکھو یہ درہ کسی صورت میں خالی نہ رہے۔

۱ ابن سعد ۲ ابن ہشام ۳ توفیقات ۴ ابن ہشام وابن سعد  
۵ طبری ۶ سورۃ آل عمران ۱۲۱ ۷ بخاری حالات غزوہ اُحد ۸



حتیٰ کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں فتح ہو گئی ہے اور دشمن پسپا ہو کر بھاگ نکلا ہے، تو پھر بھی تم اس جگہ کو نہ چھوڑنا اور اگر تم دیکھو کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی ہے اور دشمن ہم پر غالب آ گیا ہے تو پھر بھی تم اس جگہ سے نہ ہٹنا یہ حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ ”اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمارا گوشت نوچ رہے ہیں تو پھر بھی تم یہاں سے نہ ہٹنا حتیٰ کہ تمہیں یہاں سے ہٹ آنے کا حکم جاوے لے اس طرح اپنے عقب کو پوری طرح مضبوط کر کے آپ نے لشکر اسلامی کی صف بندی کی اور مختلف دستوں کے جُدا جُدا امیر مقرر فرمائے۔ اس موقع پر آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ لشکر قریش کا جھنڈا طلحہ کے ہاتھ میں ہے۔ طلحہ اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو قریش کے مورث اعلیٰ قُصَی بن کلاب کے قائم کردہ انتظام کے ماتحت جنگوں میں قریش کی علمداری کا حق رکھتا تھا۔ یہ معلوم کر کے آپ نے فرمایا ”ہم قومی دفا داری دکھانے کے زیادہ حق دار ہیں چنانچہ آپ نے حضرت علی سے مہاجرین کا جھنڈا لے کر مصعب بن عمیر کے سپرد فرما دیا جو اسی خاندان کے ایک فرد تھا جس سے طلحہ تعلق رکھتا تھا“

دوسری طرف قریش کے لشکر میں بھی صف آرائی ہو چکی تھی۔ ابوسفیان امیر العسکر تھا۔ میمنہ پر خالد بن ولید کمانڈر تھا۔ اور میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ تیر انداز عبداللہ بن ربیعہ کی کمان میں تھے۔ عورتیں لشکر کے پیچھے دفن بجا بجا کر ادا شعار گا گا کر مردوں کو جوش دلاتی تھیں۔

سب سے پہلے لشکر قریش سے ابوعامر اور اس کے ساتھی آگے بڑھے۔ اس شخص کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کہ یہ قبیلہ اوس میں سے تھا اور مدینہ کا رہنے والا تھا اور راہب کے نام سے مشہور تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو اس کے کچھ عرصہ بعد یہ شخص بغض و حسد سے بھر گیا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مکہ چلا گیا اور قریش مکہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اکساتا رہا چنانچہ اب جنگ اُحد میں وہ قریش کا حمایتی بنکر مسلمانوں کے خلاف شریک جنگ ہوا۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ ابوعامر کا بیٹا حنظلہ ایک نہایت مخلص مسلمان تھا اور اس جنگ کے موقع پر اسلامی لشکر میں شامل تھا اور نہایت جانبازی کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ابوعامر چونکہ قبیلہ اوس کے ذمی اثر لوگوں میں سے تھا اس لئے اسے یہ پختہ امید تھی کہ اب جو میں اتنے عرصہ کی جدائی کے بعد مدینہ والوں کے سامنے ہوں گا تو وہ میری محبت میں فوراً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میرے ساتھ آ لیں گے اسی امید میں ابوعامر اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیکر سب سے پہلے آگے بڑھا اور بتدریج آواز سے پکار کر کہنے لگا ”اے قبیلہ اوس کے لوگو! میں ابوعامر ہوں“ انصار نے یک زبان ہو کر کہا ”دُور ہو جا اے فاسق! تیری آنکھ ٹھنڈی نہ ہو“ اور ساتھ ہی پتھروں

لے بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۴ لے بخاری کتاب الجہاد باب ما مکرہ من التنازع ۵

لے ابن سعد ۶ لے ابن ہشام وابن سعد لے ابن ہشام لے ابن سعد

کی ایک ایسی باڑ ماری کہ ابو عامر اور اس کے ساتھی بدحواس ہو کر پیچھے کی طرف بھاگ گئے۔ یہ اس نظارہ کو دیکھ کر قریش کا علمبردار طلحہ بڑے جوش کی حالت میں آگے بڑھا اور بڑے شکبرانہ لہجہ میں مبارز طلبی کی جھڑپ علی آگے بڑھے اور دو چار ہاتھ میں طلحہ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد طلحہ کا بھائی عثمان آگے آیا۔ اور ادھر سے اس کے مقابل پر حضرت حمزہ نکلے اور جاتے ہی اُسے مار گرایا۔ کفار نے یہ نظارہ دیکھا تو غضب میں آکر غام و صاوا کر دیا۔ مسلمان بھی تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے اور دونوں فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں غالباً اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لیکر فرمایا: "کون ہے جو اسے لیکر اس کا حق ادا کرے؟" بہت صحابہ نے اس فخر کی خواہش میں اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے جن میں حضرت عمر اور زبیرؓ کی بعض روایات کی نود سے حضرت ابوبکر و حضرت علیؓ بھی شامل تھے یہ مگر آپؐ نے اپنا ہاتھ روک رکھا اور یہی فرماتے گئے: "کوئی ہے جو اس کا حق ادا کرے؟" آخر ابو دجانہ انصاری نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھے عنایت فرمائیے" آپؐ نے یہ تلوار انہیں دے دی اور ابو دجانہ اُسے ہاتھ میں لیکر تختہ کی چال سے اکڑتے ہوئے کفار کی طرف آگے بڑھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا خدا کو یہ چال بہت ناپسند ہے، مگر ایسے موقع پر ناپسند نہیں کیے زبیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار لینے کے سبب زیادہ خواہشمند تھے اور قرب رشتہ کی وجہ سے اپنا حق بھی زیادہ سمجھتے تھے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے کہ کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ تلوار نہیں دی اور ابو دجانہ کو دیدی اور اپنی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے دل میں عہد کیا کہ میں اس میدان میں ابو دجانہ کے ساتھ ساتھ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ اس تلوار کے ساتھ کیا کرتا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ابو دجانہ نے اپنے سر پر ایک مٹرخ پکڑا باندھا اور اس تلوار کو لیکر حمد کے گیت گنگنا تا ہوا مشرکین کی صفوں میں گھس گیا اور میں نے دیکھا کہ جدھر جاتا تھا گویا موت بھیڑتا جاتا تھا اور میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جو اس کے سامنے آیا ہو اور پھر وہ بچا ہو۔ حتیٰ کہ وہ لشکر قریش میں سے اپنا راستہ کاٹتا ہوا لشکر کے دوسرے کنارے نکل گیا جہاں قریش کی عورتیں کھڑی تھیں۔ ہند زوجہ ابوسفیان جو بڑے زور شور سے اپنے مردوں کو جوش دلا رہی تھی اس کے سامنے آئی اور ابو دجانہ نے اپنی تلوار اُس کے اوپر اٹھائی۔ جس پر ہند نے بڑے زور سے چیخ ماری اور اپنے مردوں کو انداد کے لیے بلایا۔ مگر کوئی شخص اس کی مدد کو نہ آیا، لیکن میں نے دیکھا کہ ابو دجانہ نے خود بخود ہی اپنی تلوار نیچی کر لی اور وہاں سے ہٹ آیا۔ زبیر روایت کرتے ہیں کہ اس موقع پر میں نے ابو دجانہ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ پہلے تم نے تلوار اٹھائی

۱۔ ابن سعد ۲۔ مسلم باب فضائل ابو دجانہ و ابن ہشام ۳۔

۴۔ زرقانی ۵۔ ابن ہشام ۶۔

اور پھر نہی کر لی۔ اُس نے کہا میرا دل اس بات پر تیار نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار ایک عورت پر چلاؤں اور عورت بھی وہ جس کے ساتھ اس وقت کوئی مرد محافظ نہیں۔ زبیر کہتے ہیں۔ میں نے اُس وقت سمجھا کہ واقعی جو حق رسول اللہ کی تلوار کا ابودجانہ نے ادا کیا ہے وہ شاید میں نہ کر سکتا اور میرے دل کی غلش دور ہو گئی۔

الغرض قریش کے علمبردار کے مارے جانے کے بعد دونوں فوجیں آپس میں گھم گھما ہو گئیں اور سخت گھمسان کا رن پڑا اور ایک عرصہ تک دونوں طرف سے قتل و خون کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر آہستہ آہستہ اسلامی لشکر کے سامنے قریش کی فوج کے پاؤں اکھڑنے شروع ہوئے۔

چنانچہ مشہور انگریز مورخ سر ولیم میو لکھتے ہیں :-  
 ”مسلمانوں کے خطرناک حملوں کے سامنے بھی لشکر کے پاؤں اکھڑنے لگ گئے۔ قریش کے رسالے نے کئی دفعہ یہ کوشش کی کہ اسلامی فوج کے بائیں طرف عجب سے ہو کر حملہ کریں، مگر ہر دفعہ اُن کو ان پچاس تیر اندازوں کے تیر کھا کر پیچھے ہٹا پڑا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہاں خاص طور پر متعین کئے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے اُحد کے میدان میں بھی وہی شجاعت و مردانگی اور موت و خطر سے وہی بے پروائی دکھائی گئی جو بدر کے موقع پر انہوں نے دکھائی تھی۔ یکے کے لشکر کی میخیں پھٹ پھٹ جاتی تھیں۔ جب اپنی خود کے ساتھ سُرخ رومال باندھے ابودجانہ اُن پر حملہ کرتا تھا اور اُس تلوار کے ساتھ جو اُسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دی تھی چاروں طرف گویا موت بکھیرتا جاتا تھا۔ حمزہ اپنے سر پر شتر مرغ کے پردوں کی گھٹی لہراتا ہوا ہر جگہ نمایاں نظر آتا تھا۔ علی اپنے بسے اور سفید پیرے کے ساتھ اور زبیر اپنی شوخ رنگ کی چمکتی ہوتی زرد گچڑی کے ساتھ بہادرانِ اُہد کی طرح جہاں بھی جاتے تھے دشمن کے واسطے موت و پریشانی کا پیغام اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہ وہ نظارے ہیں جہاں بعد کی اسلامی فتوحات کے ہیرو ترمیم پذیر ہوئے۔“

غرض لڑائی ہوئی اور بہت سخت ہوئی اور کافی وقت تک غلبہ کا پہلو مشکوک رہا، لیکن آخر خدا کے فضل سے قریش کے پاؤں اکھڑنے لگے اور ان کے لشکر میں بد نظمی اور ابتری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ قریش کے علمبردار ایک ایک کر کے مارے گئے اور ان میں سے قریباً نو شخصوں نے باری باری اپنے قومی جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مگر سارے کے سارے باری باری مسلمانوں کے

ہاتھ سے قتل ہوئے بلکہ آخر طلحہ کے ایک حبشی غلام صواب نامی نے دلیری کے ساتھ بڑھ کر علم اپنے ہاتھ میں لے لیا، مگر اس پر بھی ایک مسلمان نے آگے بڑھ کر وار کیا اور ایک ہی ضرب میں اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر قریش کا جھنڈا خاک پر گرا دیا، لیکن صواب کی بہادری اور جوش کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر گرا اور جھنڈے کو اپنی چھاتی کے ساتھ لگا کر اسے پھر بلند کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس مسلمان نے جو جھنڈے کے سرنگوں ہونے کی قدر و قیمت کو جانتا تھا اور پر سے تلوار چلا کر صواب کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد پھر قریش میں سے کسی شخص کو یہ جرات اور بہت نہیں ہوئی کہ اپنے علم کو اٹھا کر دوسرے مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پا کر تکبیر کا نعرہ لگاتے ہوئے پھر زور سے حملہ کیا اور دشمن کی رہی سہی صفوں کو چیرنے اور منتشر کرتے ہوئے لشکر کے دوسرے پار قریش کی عورتوں تک پہنچ گئے اور مکہ کے لشکر میں سخت بھاگڑ پڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان قریبا صاف ہو گیا، حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے ایسی قابل اطمینان صورت حال پیدا ہو گئی کہ وہ مال غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جب عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اب تو فتح ہو چکی ہے تو انہوں نے اپنے امیر عبداللہ سے کہا کہ اب تو فتح ہو چکی ہے اور مسلمان غنیمت کا مال جمع کر رہے ہیں آپ ہم کو اجازت دیں کہ ہم بھی لشکر کے ساتھ جا کر شامل ہو جائیں۔ عبداللہ نے انہیں روکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید و ہدایت یاد دلائی، مگر وہ فتح کی خوشی میں غافل ہو رہے تھے اس لیے وہ باز نہ آئے شیخ اور یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مطلب تھا کہ جب تک پورا اطمینان نہ ہو لے ورنہ خالی نہ چھوڑا جائے اور اب چونکہ فتح ہو چکی ہے اس لیے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور سوائے عبداللہ بن جبیر اور ان کے پانچ سات ساتھیوں کے ورنہ کی حفاظت کے لیے کوئی نہ رہا شیخ خالد بن ولید کی تیز آنکھ نے ورنہ ورنہ کی طرف دیکھا تو میدان صاف پایا جس پر اس نے اپنے سواروں کو جلدی جلدی جمع کر کے فوراً ورنہ کا رخ کیا اور اس کے پیچھے پیچھے عکرمہ بن ابوجہل بھی رہے سے دستہ کو ساتھ لیکر تیزی کے ساتھ وہاں پہنچا اور یہ دونوں دستے عبداللہ بن جبیر اور ان کے چند ساتھیوں کو ایک آن کی آن میں شہید کر کے اسلامی لشکر کے عقب میں اچانک حملہ آور ہو گئے یہ مسلمان جو فتح کے اطمینان میں غافل اور منتشر ہو رہے تھے اس بلائے ناگہانی سے گھبرا گئے۔ مگر پھر بھی سنبھلے اور پلٹ کر کفار کے حملہ کو روکنا چاہا اس وقت کسی چالاک معاند نے یہ آواز دی کہ اے مسلمانو! دوسری طرف سے بھی کفار کا دھاوا ہو گیا ہے شیخ

۱۔ ابن سعد ۲۔ ابن ہشام ۳۔ طبری ۴۔ ابن سعد  
۵۔ بخاری حالات اُحد ۶۔ ابن سعد و زرقانی ۷۔ ابن سعد  
۸۔ زرقانی



مسلمانوں نے سرایسمہ ہو کر پھر پلٹا کھایا اور گھبراہٹ میں بے دیکھے سمجھے اپنے آدمیوں پر ہی تلوار چلائی شروع کر دی۔ دوسری طرف مکہ کی ایک بہادر عورت عمرہ بنت علقمہ نے جب یہ نظارہ دیکھا تو جھٹ آگے بڑھ کر قریش کا علم جو ابھی تک خاک میں پڑا تھا اٹھا کر بلند کر دیا جسے دیکھتے ہی قریش کا منتشر لشکر پھر جمع ہو گیا۔ اور اس طرح مسلمان حقیقتہ چاروں طرف سے دشمن کے نرغہ میں گھر گئے اور اسلامی فوج میں ایک خطرناک کھلبلی کی صورت پیدا ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک بلند جگہ پر کھڑے ہوئے یہ سب نظارہ دیکھ رہے تھے مسلمانوں کو آواز پر آواز دی، مگر اس شور شرابے میں آپ کی آواز دب دب کر رہ جاتی تھی۔ تو رخصین نکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اتنے قلیل عرصہ میں ہو گیا کہ اکثر مسلمان بالکل بدحواس ہو گئے۔ حتیٰ کہ اس بدحواسی میں بعض مسلمان ایک دوسرے پر وار کرنے لگ گئے اور اپنے پرانے میں امتیاز نہ رہا، چنانچہ خود مسلمانوں کے ہاتھ سے بعض مسلمان زخمی ہو گئے اور حذیفہ کے والدیمان کو تو مسلمانوں نے غلطی سے شہید ہی کر دیا۔ حذیفہ اس وقت قریب ہی تھے وہ چلاتے رہ گئے کہ اے مسلمانو! یہ میرے والد ہیں مگر اس وقت کون سُنا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں مسلمانوں کی طرف سے میان کا خون بہا ادا کرنا چاہا مگر حذیفہ نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے باپ کا خون مسلمانوں کو معاف کرتا ہوں۔

حضرت حمزہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہونے کے علاوہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے نہایت بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے اور چدھر جاتے تھے اُن کے سامنے قریش کی صفیں پھٹ پھٹ جاتی تھیں مگر دشمن بھی اُن کی تاک میں تھا اور جبیر بن مطعم اپنے ایک حبشی غلام وحشی نامی کو خاص طور پر آزادی کا وعدہ دیکر اپنے ساتھ لایا تھا کہ جس طرح بھی ہو حمزہ کو جتنوں نے جبیر کے چچا طہیم بن عدی کو بدر کے موقع پر تلوار کی گھاٹ اتارا تھا قتل کر کے اس کے انتقام کو پورا کرے، چنانچہ وحشی ایک جگہ پر چُپ کر اُن کی تاک میں بیٹھ گیا اور جب حمزہ کسی شخص پر حملہ کرتے ہوئے وہاں سے گزرے تو اُس نے خوب تاک کر اُن کی ناف کے نیچے اپنا چھوٹا سائیزہ مارا جو لگتے ہی بدن کے پار ہو گیا۔ حمزہ لڑکھڑاتے ہوئے گرے مگر پھر ہمت کر کے اُٹھے اور ایک جست کر کے وحشی کی طرف بڑھنا چاہا مگر پھر لڑکھڑا کر گرے اور جان دیدی اور اس طرح اسلامی لشکر کا ایک مضبوط بازو ٹوٹ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حمزہ کے قتل کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت صدمہ ہوا اور روایت آتی ہے کہ غزوہ طائف کے بعد جب حمزہ کا قاتل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ نے

۱۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد و نیز ابن سعد ۲۔ ابن ہشام ۳۔ سورۃ آل عمران ۱۵۲ تا ۱۵۶  
۴۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۵۔ ابن ہشام ۶۔ مسلم ابواب الرضاع ۷۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد



اُسے معاف تو فرما دیا، مگر حمزہ کی محبت کا احترام کرتے ہوئے فرمایا کہ وحشی میرے سامنے نہ آیا کرے۔ اُس وقت وحشی نے اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ جس ہاتھ سے میں نے رسول خدا کے چچا کو قتل کیا ہے۔ جب تک اُسی ہاتھ سے کسی بڑے دشمن اسلام کو تیرے تیغ نہ کر لوں گا چین نہ لوں گا! چنانچہ حضرت ابو بکر کے عہد خلافت میں اس نے جنگ یمامہ میں نبوت کے جھوٹے مدعی سیلمہ کذاب کو قتل کر کے اپنے عہد کو پورا کیا۔ اس گھمسان کے موقع پر وہ مسلمان عورتیں بھی جو اس غزوہ میں ساتھ تھیں پوری تہی اور جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف تھیں اور ادھر ادھر بھاگ کر صحابہ کو پانی پلانے اور زخمیوں کی خبر گیری کرنے اور اسی قسم کی دوسری خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ ان عواتین میں حضرت عائشہ اور اُمّ سلیم اور اُمّ سلیم کے اسرار صحابہ کو پانی لالا کر پلانے کی خدمت کی ضمن میں خاص طور پر مذکور ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یہ وقت مسلمانوں کے واسطے سخت پریشانی کا وقت تھا۔ قریش کے لشکر نے قریباً چاروں طرف گھیر ڈال رکھا تھا اور اپنے پے درپے حملوں سے ہر آن دبا دبا چلا آتا تھا۔ اس پر بھی مسلمان شاید تھوڑی دیر بعد سنبھل جاتے مگر غضب یہ ہوا کہ قریش کے ایک بہادر سپاہی عبداللہ بن قثم نے مسلمانوں کے علمبردار مصعب بن عمیر پر حملہ کیا اور اپنی تلوار کے وار سے اُن کا دایاں ہاتھ کاٹ گرایا۔ مصعب نے فوراً دوسرے ہاتھ میں جھنڈا اٹھام لیا اور ابن قثم کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھے مگر اس نے دوسرے دار میں ان کا دوسرا ہاتھ بھی قلم کر دیا۔ اس پر مصعب نے اپنے دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں کو جوڑ کر گرتے ہوئے اسلامی جھنڈے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اُسے چھاتی سے چٹالیا جس پر ابن قثم نے اُن پر تیسرا وار کیا اور اب کی دفعہ مصعب شدید ہو کر گر گئے یہ جھنڈا تو کسی دوسرے مسلمان نے فوراً آگے بڑھ کر مقام لیا۔ مگر چونکہ مصعب کا ڈیل ڈول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا ابن قثم نے سمجھا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مار لیا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی طرف سے یہ تجویز محض شہادت اور دھوکا دہی کے خیال سے ہو۔ بہر حال اس نے مصعب کے شدید ہو کر گرنے پر شور مچا دیا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار لیا ہے یہ اس خبر سے مسلمانوں کے رہے سے اوسان بھی جاتے ہے اور ان کی جمعیت بالکل منتشر ہو گئی اور بہت سی صحابی سراسیمہ ہو کر میدان سے بھاگ نکلے۔

اُس وقت مسلمان تین جھتوں میں مقسم تھے ایک گروہ وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُن کر میدان سے بھاگ گیا تھا، مگر یہ گروہ سب تھوڑا تھا۔ ان لوگوں میں حضرت عثمان بن عفان بھی شامل تھے مگر جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر آتا ہے اُس وقت کے خاص حالات

۱۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۲۔ بخاری حالات غزوہ اُحد ۳۔ زرقانی ۴۔ ابن ہشام ۵۔ زرقانی ۶۔ زرقانی ۷۔ بخاری حالات اُحد ۸۔

اور ان لوگوں کے دلی ایمان اور اخلاص کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا یہ ان لوگوں میں سے بعض مدینہ تک جا پہنچے اور اس طرح مدینہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی شہادت اور شکرِ اسلام کی ہزیمت کی خبر پہنچ گئی جس سے تمام شہر میں ایک کھرام مچ گیا اور مسلمان مرد و عورت بچے بوڑھے نہایت سراسیمگی کی حالت میں شہر سے باہر نکل آئے اور اُحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور بعض تو جلد جلد دوڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں پہنچے اور اللہ کا نام لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جو بھاگے تو نہیں تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سن کر یا تو بہت ہار بیٹھے تھے اور یا اب لڑنے کو بیکار سمجھتے تھے اور اس لیے میدان سے ایک طرف ہٹ کر سرنگوں ہو کر بیٹھ گئے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو برابر لڑ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ تو وہ لوگ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع تھے اور بے نظیر جان نثاری کے جوہر دکھا رہے تھے اور اکثر وہ تھے جو میدانِ جنگ میں منتشر طور پر لڑ رہے تھے۔ ان لوگوں اور نیز گروہ ثانی کے لوگوں کو جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ موجود ہونے کا پتہ لگتا جاتا تھا یہ لوگ دیوانوں کی طرح لڑتے بھڑتے آپ کے ارد گرد جمع ہوتے جاتے تھے۔ اس وقت جنگ کی حالت یہ تھی کہ قریش کا لشکر گویا سمندر کی مہیب لہروں کی طرح چاروں طرف سے بڑھا چلا آتا تھا اور میدانِ جنگ میں ہر طرف سے تیر اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ جاں نثاروں نے اس خطرہ کی حالت کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد گھیر ڈال کر آپ کے جسم مبارک کو اپنے بدنوں سے چھپایا، مگر پھر بھی جب کبھی حملہ کی روٹھکتی تھی تو یہ چند گنتی کے آدمی ادھر ادھر دھکیل دیئے جاتے تھے اور ایسی حالت میں بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریباً اکیلے رہ جاتے تھے۔ کسی ایسے ہی موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص کے مُشرک بھائی عتبہ بن ابی وقاص کا ایک پتھر آپ کے چہرہ مبارک پر لگا۔ جس سے آپ کا ایک دانت ٹوٹ گیا اور ہونٹ بھی زخمی ہوا۔ ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ایک اور پتھر جو عبداللہ بن شہاب نے پھینکا تھا اس نے آپ کی پیشانی کو زخمی کیا اور تھوڑی دیر کے بعد تیسرا پتھر جو ابن قثم نے پھینکا تھا آپ کے رخسار مبارک پر آکر لگا جس سے آپ کے مغزوہ خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں چبھ کر رہ گئیں۔ سعد بن ابی وقاص کو اپنے بھائی عتبہ کے اس فعل پر اس قدر غصہ تھا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے کبھی کسی دشمن کے قتل کے لیے اتنا جوش نہیں آیا جتنا مجھے اُحد کے دن عتبہ کے قتل کا جوش تھا۔ اس وقت نہایت خطرناک لڑائی ہو رہی تھی اور مسلمانوں کے واسطے ایک سخت ابتلا اور امتحان کا وقت تھا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سن کر

بہت سے صحابہ بہت ہار چکے تھے اور بہتیار پھینک کر میدان سے ایک طرف ہو گئے تھے۔ انہی میں حضرت عمرؓ بھی تھے، چنانچہ یہ لوگ اسی طرح میدان جنگ کے ایک طرف بیٹھے تھے کہ اوپر سے ایک صحابی انس بن نصر انصاری آگئے اور ان کو دیکھ کر کہنے لگے: ”تم لوگ یہاں کیا کرتے ہو؟“ انھوں نے جواب دیا: ”رسول اللہؐ نے شہادت پائی۔ اب لڑنے سے کیا حاصل ہے؟“ انس نے کہا: ”یہی تو لڑنے کا وقت ہے۔ آج موت رسول اللہؐ نے پائی وہ ہیں بھی نصیب ہو اور پھر آپؐ کے بعد زندگی کا بھی کیا نطفہ ہے؟ اور پھر ان کے سامنے سعد بن معاذ آئے تو انھوں نے کہا: ”سعد مجھے تو اس پہاڑی سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر انس دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ جنگ کے بعد دیکھا گیا تو ان کے بدن پر اتنی سے زیادہ زخم تھے۔ اور کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ کس کی لاش ہے۔ آخر ان کی بہن نے ان کی انگلی دیکھ کر شناخت کیا یہ

جو صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے انھوں نے جو جان نثاریاں دکھائیں تاریخ ان کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ یہ لوگ پروانوں کی طرح آپؐ کے ارد گرد گھومتے تھے اور آپؐ کی خاطر اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔ جو دار بھی پڑتا تھا صحابہ اپنے اوپر لیتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچاتے تھے اور ساتھ ہی دشمن پر بھی وار کرتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ اور زبیرؓ نے بے تحاشا دشمن پر حملے کئے اور ان کی صفوں کو دھکیل دیا۔ ابو طلحہ انصاری نے تیر چلاتے چلاتے تین کھائیں توڑیں اور دشمن کے تیروں کے مقابل پر سینہ سپر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کو اپنی ڈھال سے چھپا یا۔ سعد بن وقاصؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تیر بچاتے جاتے تھے اور سعدؓ یہ تیر دشمن پر بے تحاشا چلاتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے سعدؓ سے فرمایا: ”تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ برابر تیر چلا تے جاؤ۔“ سعدؓ اپنی آخری عمر تک آپؐ کے ان الفاظ کو نہایت فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ ابو دھانہؓ نے بڑی دیر تک آپؐ کے جسم کو اپنے جسم سے چھپائے رکھا اور جو تیر یا پتھر آتا تھا اُسے اپنے جسم پر لیتے تھے حتیٰ کہ ان کا بدن تیروں سے پھلنی ہو گیا، مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی تا ایسا نہ ہو کہ ان کے بدن میں حرکت پیدا ہونے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا کوئی حصہ تنگ ہو جاوے اور آپؐ کو کوئی تیر آگے سے طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لیے کئی وار اپنے بدن پر لیے اور اسی کوشش میں اُنکا ہاتھ شل ہو کر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ مگر یہ چند گنتی کے جاں نثار اس سیلابِ عظیم کے سامنے کب تک ٹھہر سکتے تھے جو ہر لمحہ مہیب موجوں کی طرح چاروں طرف سے بڑھتا چلا آتا تھا۔ دشمن کے

۱۔ ابن ہشام ۲۔ بخاری حالات غزوہ اُحد ۳۔ بخاری حالات اُحد

۴۔ بخاری حالات غزوہ اُحد ۵۔ ابن ہشام و ذرقانی ۶۔ بخاری حالات اُحد

ہر حملہ کی ہر ہر مسلمانوں کو کہیں کا کہیں بہا کر لے جاتی تھی مگر جب ذرا زور تھمتا تھا مسلمان بیچارے رٹتے بھڑتے پھر اپنے محبوب آقا کے گرد جمع ہو جاتے تھے بعض اوقات تو ایسا خطرناک حملہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عملاً اکیلے رہ جاتے تھے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ آپ کے ارد گرد صرف بارہ آدمی رہ گئے اور ایک وقت ایسا تھا کہ آپ کے ساتھ صرف دو آدمی ہی رہ گئے یہ ان جان نثاروں میں حضرت ابوبکرؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن وقاصؓ، ابو جہانہ انصاریؓ، سعد بن معاذؓ اور طلحہ انصاریؓ کے نام خاص طور پر مذکور ہوئے ہیں۔ ایک وقت جب قریش کے حملہ کی ایک غیر معمولی لہر اٹھی تو آپ نے فرمایا: "کوئی ہے جو اس وقت اپنی جان خدا کے رستے میں نثار کر دے؟" ایک انصاری کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ اور چھ اور انصاری صحابی دیوانہ وار آگے بڑھے اور ان میں سے ایک ایک نے آپ کے ارد گرد رٹتے ہوئے جان دیدی تھے اس پارٹی کے رئیس زیاد بن سکن تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دھادے کے بعد حکم دیا کہ زیادؓ کو اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا۔ اُس وقت زیادؓ میں کچھ کچھ جان تھی، مگر وہ دم توڑ رہے تھے۔ اس حالت میں انھوں نے بڑی کوشش کے ساتھ اپنا سر اٹھایا اور اپنا منہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دیدی۔ ایک مسلمان خاتون جس کا نام ام عمارہ تھا تلواریں ہاتھ میں لے کر باری کاٹتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اس وقت عبداللہ بن قیسؓ آپ پر وار کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسلمان خاتون نے جھٹ آگے بڑھ کر وہ وار اپنے اوپر لے لیا اور پھر تلوار تول کر اُس پر اپنا وار کیا، مگر وہ دوبہری زہر پہنے ہوئے مرد تھا۔ اور یہ ایک کمزور عورت۔ اس لیے وار کاری نہ پڑا۔ اور ابن قیسؓ ڈراتا ہوا اور مسلمانوں کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے آیا اور صحابہ کے روکتے روکتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا اور پہنچتے ہی اس زور اور بے دردی کے ساتھ آپ کے چہرہ مبارک پر وار کیا کہ صحابہ کے دل دل گئے۔ جاں نثار طلحہؓ نے پیک کر اپنے بنگے ہاتھ پر لیا، مگر ابن قیسؓ کی تلوار ان کے ہاتھ کو قلم کرتی ہوئی آپ کے سپلو پر پڑی۔ زخم تو خدا کے فضل سے نہ آیا کیونکہ آپ نے اوپر تلے دو زہریں پہنی ہوئی تھیں اور وار کا زور بھی طلحہؓ کی جاں نثاری سے کم ہو چکا تھا، مگر اس صدمہ سے آپ چکر کھا کر نیچے گرے اور ابن قیسؓ نے پھر خوشی کا نعرہ لگایا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار لیا ہے۔

ابن قیسؓ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وار کر کے خوشی کا نعرہ لگاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور اپنے زعم میں یہ سمجھا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مار لیا ہے، مگر جو نبی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گرے حضرت علیؓ اور طلحہؓ



نے فوراً آپ کو اوپر اٹھایا۔ اور یہ معلوم کر کے مسلمانوں کے پڑمردہ چہرے خوشی سے تھما اٹھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ سلامت ہیں۔ اب آہستہ آہستہ لڑائی کا زور بھی کم ہونا شروع ہو گیا۔ کیونکہ ایک تو کفار اس اطمینان کی وجہ سے کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے کہ محمد رسول اللہ شہید ہو چکے ہیں اور اس لیے انھوں نے لڑائی کی طرف سے توجہ ہٹا کر کچھ تو اپنے مقتولین کی دیکھ بھال اور کچھ مسلمان شہیدوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے کی طرف پھیر لی تھی۔ اور دوسری طرف مسلمان بھی اکثر منتشر ہو چکے تھے۔ جب قریش ذرا پیچھے ہٹ گئے اور جو مسلمان میدان میں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان کر آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے تو آپ اپنے ان صحابہ کی جمیعت میں آہستہ آہستہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر ایک محفوظ درہ میں پہنچ گئے۔ راستہ میں مکہ کے ایک رئیس ابی بن خلف کی نظر آپ پر پڑی اور وہ بغض و عداوت میں اندھا ہو کر یہ الفاظ پکارتا ہوا آپ کی طرف بھاگا کہ لَا تَجِدُ إِلَّا نَجَاءً اگر محمد (صلعم) بچ کر نکل گیا تو گویا میں تو نہ بچا۔ صحابہ نے اُسے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُسے چھوڑ دو اور میرے قریب آنے دو۔ اور جب وہ آپ پر حملہ کرنے کے خیال سے آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے ایک نیزہ لیکر اس پر ایک وار کیا جس سے وہ جگر کھا کر زمین پر گرا اور پھر اٹھ کر چیخا چلاتا ہوا واپس بھاگ گیا اور گول بظاہر زخم زیادہ نہیں تھا مگر مکہ پہنچنے سے پہلے وہ پیوند خاک ہو گیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درہ میں پہنچ گئے تو قریش کے ایک دستے نے خالد بن ولید کی کمان میں پہاڑ پر چڑھ کر حملہ کرنا چاہا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عمرؓ نے چند مہاجرین کو ساتھ لے کر اُس کا مقابلہ کیا اور اُسے پسپا کر دیا۔

درہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مدد سے اپنے زخم دھوئے اور جو دو کڑیاں آپ کے زخموں میں چھب کر رہ گئی تھیں وہ ابو عبیدہ بن الجراح نے بڑی مشکل سے اپنے دانتوں کے ساتھ پکھنچ پکھنچ کر باہر نکالیں۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں اُن کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے۔ اس وقت آپ کے زخموں سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ اور آپ اس خون کو دیکھ کر حسرت کے ساتھ فرماتے تھے کَيْفَ يَفْلَحُ قَوْمٌ خَصَبُوا وَخَبَهُ نَبِيَّهُمْ بِاللَّهِ وَهُوَ يَذْعُوهُمْ إِلَى رَيْبِهِمْ؟ کس طرح نجات پائے گی وہ قوم جس نے اپنے نبی کے منہ کو اس کے خون سے رنگ دیا۔ اس مجرم میں کہ وہ انہیں خدا کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور پھر فرمایا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی اے میرے اللہ! تو میری قوم کو معاف کر دے۔



کیونکہ ان سے یہ قصور جہالت اور لاعلمی میں ہوا ہے۔ روایت آتی ہے کہ اسی موقعہ پر یہ قرآنی آیت نازل ہوئی کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ۔ یعنی عذاب و عفو کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں خدا جسے چاہے گا معاف کرے گا اور جسے چاہے گا عذاب دیگا۔ فاطمہ الزہراءؑ جو آنحضرتؐ کے متعلق وحشتناک خبریں سنکر مدینہ سے نکل آئی تھیں وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد اُحد میں پہنچ گئیں اور آتے ہی آپؐ کے زخموں کو دھونا شروع کر دیا، مگر خون کسی طرح بند ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آخر حضرت فاطمہؑ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی خاک آپؐ کے زخم پر باندھی تب جا کر کہیں غون تھما۔ دوسری خواتین نے بھی اس موقعہ پر زخمی صحابیوں کی خدمت کے لیے کھانا لایا۔

ادھر مسلمان اپنی مریم پٹی میں مصروف تھے تو اُدھر دوسری طرف یعنی نیچے میدان جنگ میں مکہ کے قریش مسلمان شہیدوں کی نعشوں کی نہایت بے دردانہ طور پر بے حرمتی کر رہے تھے۔ مسئلہ کی وحشیانہ رسم پوری وحشت کے ساتھ ادا کی گئی اور مسلمان شہیدوں کی نعشوں کے ساتھ مکہ کے خوشخوار درندوں نے جو کچھ بھی ان کے دل میں آیا وہ کیا۔ قریش کی عورتوں نے مسلمانوں کے ناک کان کاٹ کر ان کے ہار پروٹے اور پہنے۔ ابوسفیانؑ کی بیوی ہند حضرت حمزہؑ کا جگر نکال کر چبا گئی۔ غرض بقول سرورِ عالمؐ مسلمانوں کی نعشوں کے ساتھ قریش نے نہایت وحشیانہ سلوک کیا۔ اور مکہ کے رؤساء ویر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش میدان میں تلاش کرتے رہے اور اس نظارے کے شوق میں ان کی آنکھیں ترس گئیں مگر جو چیز کہ نہ پانی تھی نہ پانی۔ اس تلاش سے بالوس ہو کر ابوسفیانؑ اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لیکر اس دزدہ کی طرف بڑھا جہاں مسلمان جمع تھے اور اس کے قریب کھڑے ہو کر پکار کر بولا۔ مسلمانو! کیا تم میں محمدؐ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کوئی جواب نہ دے، چنانچہ سب صحابہ خاموش رہے۔ پھر اُس نے ابوبکرؓ کو پوچھا، مگر اس پر بھی آپ کے ارشاد کے ماتحت کسی نے جواب نہ دیا۔ جس پر اُس نے بلند آواز سے فخر کے لہجہ میں کہا کہ یہ سب لوگ مارے گئے ہیں کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ اس وقت حضرت عمرؓ سے نذر آگیا اور وہ بے اختیار ہو کر بولے۔ اے خداوند اللہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں اور خدا ہمارے ہاتھوں سے تمہیں ذلیل کرے گا۔ ابوسفیانؑ نے حضرت عمرؓ کی آواز پہچان کر کہا۔ عمر! سچ بتاؤ کیا محمدؐ زندہ ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا۔ ہاں ہاں! خدا کے فضل سے وہ زندہ ہیں اور تمہاری یہ باتیں سُن رہے ہیں۔ ابوسفیانؑ نے کسی قدر دھیمی آواز میں کہا۔ تو پھر ابنِ قنیہؓ نے جھوٹ کہا ہے کیونکہ میں تمہیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ابوسفیانؑ نے نہایت بلند آواز سے پکار کر کہا۔ اُغْلُ حُبْلَی یعنی اے ہبل تیری بلندی ہو۔

۱۔ بخاری حالات غزوہ اُحد ۲۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد ۳۔ ابن ہشام مطبری ۴۔ لائف آف محمد ۵۔ بخاری کتاب المغازی حالات اُحد نیز کتاب الجہاد ۶۔ ابن ہشام ۷۔ قریش کا ایک بڑا بُت تھا۔

”صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خیال کر کے خاموش رہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے نام پر تو خاموش رہنے کا حکم دیتے تھے۔ اب خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ثبوت کا نام آنے پر بیتاب ہو گئے اور فرمایا: ”تم جواب کیوں نہیں دیتے؟“ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا: کہو اللّٰهُ اَعْلٰی وَاَحَبُّ یَعْنٰی ”بلندی اور بزرگی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے“ ابوسفیان نے کہا لَنَّا الْغُزٰی وَلَا غُزٰی لَکُمْ۔ ہمارے ساتھ غزوی ہے اور تمہارے ساتھ غزوی نہیں ہے“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہو اللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ غزوی کیا چیز ہے؟ ہمارے ساتھ اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارے ساتھ کوئی مددگار نہیں؟ اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: لِرِثَانِیْ اَیْکَ ذُوْلَیْ طَرَحٍ ہُوَ ہِیَ جو کبھی چڑھتا اور کبھی گرتا ہے۔ پس یہ دن بدر کے دن کا بدلہ سمجھو اور تم میدان جنگ میں ایسی لاشیں پاؤ گے جن کے ساتھ شہید کیا گیا ہے۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا، مگر جب مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے اپنے آدمیوں کا یہ فعل کچھ بُرا بھی نہیں لگا۔ اور ہمارے اور تمہارے درمیان آئندہ سال انہی ایام میں بدر کے مقام میں پھر جنگ کا وعدہ رہا۔ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے ماتحت جواب دیا کہ:

”بہت اچھا۔ یہ وعدہ رہا“

یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کو لیکر نیچے اتر گیا اور پھر جلد ہی لشکر قریش نے مکہ کی راہ لی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس کے کہ قریش کو اس موقع پر مسلمانوں کے خلاف غلبہ حاصل ہوا تھا اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے وہ اگر چاہتے تو اپنی اس فتح سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کا راستہ تو بہر حال اُن کے لیے کھلا تھا، مگر خدائی تصرف کچھ ایسا ہوا کہ قریش کے دل باوجود اس فتح کے اندر ہی اندر مرعوب تھے اور اُنہوں نے اسی غلبہ کو غنیمت جانتے ہوئے جو اُحد کے میدان میں ان کو حاصل ہوا تھا مکہ کو جلدی جلدی لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا، مگر بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید احتیاط کے خیال سے فوراً ستر صحابہ کی ایک جماعت جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے تیار کر کے لشکر قریش کے پیچھے روانہ کر دی یہ بخاری کی روایت ہے۔ عام مؤرخین یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت علیؓ یا بعض روایات کی رو سے سعد بن وقاص کو قریش کے پیچھے بھیجایا اور ان سے فرمایا کہ اس بات کا پتہ لاؤ کہ لشکر قریش مدینہ پر حملہ کرنے کی نیت تو نہیں رکھتا اور آپ نے اُن سے فرمایا اگر قریش اونٹوں پر سوار ہوں اور گھوڑوں کو خالی چلا رہے ہوں تو سمجھنا کہ وہ مکہ کی طرف واپس جا رہے ہیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوں تو سمجھنا ان کی نیت بخیر نہیں۔ اور آپ نے ان کو

۱۔ ایک اور ثبوت کا نام ہے: بخاری کتاب المغازی حالات اُحد: ۴۔ ابن ہشام  
۲۔ بخاری حالات غزوہ اُحد: ۴

سہمید فرمایا کہ اگر قریش کا لشکر مدینہ کا رخ کرے تو فوراً آپ کو اطلاع دی جاوے اور آپ نے بڑے جوش کی حالت میں فرمایا کہ اگر قریش نے اس وقت مدینہ پر حملہ کیا تو خدا کی قسم ہم اُن کا مقابلہ کر کے انہیں اس حملہ کا سزا چکھا دیں گے؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہوئے آدمی آپ کے ارشاد کے ماتحت گئے اور بہت جلد یہ خبر یکے والپس آگئے کہ قریش کا لشکر مکہ کی طرف جا رہا ہے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی میدان میں اُتر آئے ہوئے تھے اور شہداء کی نعشوں کی دیکھ بھال شروع تھی۔ جو نظارہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھا وہ خون کے آنسوؤں لانے والا تھا۔ ستر مسلمان خاکِ بخون میں بکھڑے ہوئے میدان میں پڑے تھے اور عرب کی وحشیانہ رسمِ مُثلہ کا ہیب نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ان مقتولین میں صرف چھ ہاجر تھے اور باقی سب انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش کے مقتولوں کی تعداد تینس تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا اور رضاعی بھائی حمزہ بن عبدالمطلب کی نعش کے پاس پہنچے تو بے خود ہو کر رہ گئے کیونکہ ظالم ہند زوجہ ابوسفیان نے اُن کی نعش کو بُری طرح بگاڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو آپ خاموشی سے کھڑے رہے اور آپ کے چہرہ سے غم و غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ ایک لمحہ کے لیے آپ کی طبیعت اس طرف بھی مائل ہوئی کہ مکہ کے ان وحشی درندوں کے ساتھ جب تک انہی کا سا سلوک نہ کیا جائے گا وہ غالباً ہوش میں نہیں آئیں گے مگر آپ اس خیال سے رُک گئے اور صبر کیا۔ بلکہ اس کے بعد آپ نے مُثلہ کی رسم کو اسلام میں ہمیشہ کے لیے منوع قرار دیدیا اور فرمایا کہ دشمن خواہ کچھ کرے تم اس قسم کے وحشیانہ طریق سے بہر حال باز رہو اور نیکی اور احسان کا طریق اختیار کرو۔ آپ کی پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب اپنے بھائی حمزہ سے بہت محبت رکھتی تھیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی ہزیمت کی خبر سن کر مدینہ سے نکل آئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے صاحبزادے زبیر بن العوام سے فرمایا کہ اپنی والدہ کو ماسوں کی نعش نہ دکھانا مگر بہن کی محبت کب چین لینے دیتی تھی۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ مجھے حمزہ کی نعش دکھا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ صبر کروں گی اور کوئی جزع فرزع کا کلمہ مُنہ سے نہیں نکالوں گی؛ چنانچہ وہ گئیں اور بھائی کی نعش کو دیکھ کر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ پڑھتی ہوئی خاموش ہو گئیں۔ قریش نے دوسرے صحابہ کی نعشوں کے ساتھ بھی کم و بیش یہی وحشیانہ سلوک کیا تھا؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی عبد اللہ بن جحش کی نعش کو بھی بُری طرح بگاڑا گیا تھا۔ جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نعش سے ہٹ کر دوسری نعش کی طرف جاتے تھے۔ آپ کے چہرہ پر غم و اَلَم کے آثار زیادہ ہوتے جاتے تھے۔ غالباً اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ کوئی جا کر دیکھے کہ سعد بن الزبیر انصار کا کیا حال ہے۔

۱۔ طبری دابن ہشام ۲۔ بخاری حالات اُحد ۳۔ زرقانی ۴۔ ابن سعد  
۵۔ ابن ہشام و طبری ۶۔ ابن ہشام

آیا وہ زندہ ہیں یا شہید ہو گئے؟ کیونکہ میں نے لڑائی کے وقت دیکھا تھا کہ وہ دشمن کے نیزوں میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ آپ کے فرمانے پر ایک انصاری صحابی اُبی بن کعب گئے اور میدان میں ادھر ادھر سعد کو تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر انھوں نے اونچی اونچی آوازیں دینی شروع کیں اور سعد کا نام لے لے کر پکارا مگر پھر بھی کوئی سہراغ نہ ملا۔ مایوس ہو کر وہ واپس جانے کو تھے کہ انہیں خیال آیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیکر تو پکاروں۔ شاید اس طرح کچھ پتہ چل جاوے اچنانچہ انھوں نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ سعد بن زبیع کہاں ہیں مجھے رسول اللہ نے ان کی طرف بھیجا ہے۔ اس آواز نے سعد کے نیم مردہ جسم میں ایک بجلی کی لہر دوڑادی اور انھوں نے چونک کر مگر نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا کون ہے۔ میں یہاں ہوں؟ اُبی بن کعب نے غور سے دیکھا تو تھوڑے فاصلہ پر مقتولین کے ایک ڈھیر میں سعد کو پایا جو اس وقت نزع کی حالت میں جان توڑ رہے تھے۔ اُبی بن کعب نے اُن سے کہا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمہاری حالت سے آپ کو اطلاع دوں۔ سعد نے جواب دیا کہ رسول اللہ سے میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ خدا کے رسولوں کو جو ان کے متبعین کی قربانی اور اخلاص کی وجہ سے ثواب ملا کرتا ہے خدا آپ کو وہ ثواب سارے نبیوں سے بڑھ چڑھ کر عطا فرمائے اور آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور میرے بھائی مسلمانوں کو بھی میرا سلام پہنچانا اور میری قوم سے کہنا کہ اگر تم میں زندگی کا دم ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو خدا کے سامنے تمہارا کوئی عذر نہیں ہوگا۔ یہ کہہ کر سعد نے جان دے دی۔

اُحد کے شہداء میں ایک صاحب مصعب بن عمیر تھے۔ یہ وہ سب سے پہلے مہاجر تھے جو مدینہ میں اسلام کے مبلغ بنکر آئے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں مصعب مکتہ کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ خوش پوش اور ہانکے کچھے جاتے تھے اور بڑے ناز و نعمت میں رہتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد اُن کی حالت بالکل بدل گئی۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اُن کے بدن پر ایک کپڑا دیکھا جس پر کئی پوند لگے ہوئے تھے۔ آپ کو ان کا وہ پہلا زمانہ یاد آگیا تو آپ چشم پُراب ہو گئے۔ اُحد میں جب مصعب شہید ہوئے تو اُن کے پاس اتنا کپڑا بھی نہیں تھا کہ جس سے ان کے بدن کو چھپایا جاسکتا۔ پاؤں ڈھانکتے تھے تو سرنگا ہو جاتا تھا اور سر ڈھانکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اچنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سر کو کپڑے سے ڈھانک کر پاؤں کو گھاس سے چھپا دیا گیا۔

نعتوں کی دیکھ بھال کے بعد تکفین کا کام شروع ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو



کپڑے شہداء کے بدن پر ہیں وہ اسی طرح رہنے دیتے جاتیں اور شہداء کو غسل نہ دیا جاوے، البتہ کسی کے پاس کفن کے لیے نانہ کپڑا ہو تو وہ پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر لپیٹ دیا جاوے۔ نماز جنازہ بھی اُس وقت ادا نہیں کی گئی، چنانچہ بغیر غسل دیتے اور بغیر نماز ادا کئے شہداء کو دفن دیا گیا۔ اور عموماً ایک ایک کپڑے میں دو صحابیوں کو اکٹھا کفنا کر ایک ہی قبر میں اکٹھا دفن کر دیا گیا جس صحابی کو قسطن شریف زیادہ آتا تھا اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت لحد میں اُتارتے ہوئے مقدم رکھا جاتا تھا یہ گو اس وقت نماز جنازہ ادا نہیں کی گئی، لیکن بعد میں زمانہ وفات کے قریب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر شہداء اُحد پر جنازہ کی نماز ادا کی اور بڑے دردِ دل سے اُن کے لیے دُعا فرمائی۔ آپ اُحد کے شہداء کو خاص محبت اور احترام سے دیکھتے تھے، ایک دفعہ آپ اُحد کے شہداء کی قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایمان کا میں شہاد ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا ہم ان کے بھائی نہیں ہیں؟ کیا ہم نے انہیں کی طرح اسلام قبول نہیں کیا؟ کیا ہم نے انہی کی طرح خدا کے رستے میں جہاد نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! لیکن مجھے کیا معلوم ہے کہ میرے بعد تم کیا کیا کام کرو گے؟ اس پر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور بہت روتے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بعد زندہ رہ سکیں گے؟ صحابہ بھی اُحد کے شہداء کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُحد کی یاد کو ایک مقدس چیز کے طور پر اپنے دلوں میں تازہ رکھتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف کے سامنے افطاری کا کھانا آیا جو غالباً کسی قدر پر تکلف تھا۔ اس پر انہیں اُحد کا زمانہ یاد آ گیا جب مسلمانوں کے پاس اپنے شہداء کو کفنا نہ کیلئے کپڑا تک نہیں تھا اور وہ ان کے بدنوں کو چھپانے کے لیے گھاس کاٹ کاٹ کر ان پر پٹیتے تھے اور اس یاد نے عبدالرحمن بن عوف کو ایسا بے چین کر دیا کہ وہ بے تاب ہو کر رونے لگ گئے اور کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے حالانکہ وہ روزے سے تھے۔

سارے انتظامات سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شام کے قریب مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں عقیدت کیش دُور دُور تک آگے آتے ہوئے تھے۔ ایک انصاری عورت سخت گھبراہٹ کی حالت میں گھر سے نکل کر اُحد کے راستہ پر آ رہی تھی کہ راستہ میں اُسے وہ صحابی ملے جو اُحد سے واپس آ رہے تھے اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ صحابہ نے اُسے اطلاع دی کہ تمہارا باپ اور بھائی اور خاندان سب اُحد میں شہید ہوئے۔ مخلص خاتون جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت سننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی بے چین ہو کر ہولی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ رسول خدا کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا۔ رسول اللہ

لے۔ بخاری حالات غزوہ اُحد و زرقانی لے۔ بخاری حالات اُحد لے۔ مؤطا امام مالک کتاب الجہاد  
لے۔ بخاری حالات غزوہ اُحد



تو خدا کے فضل سے بھیریت ہیں اور یہ تشریف لارہے ہیں۔ جب اس کی نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی، تو بے اختیار ہو کر بولی۔ کُلُّ مُصِیْبَةٍ بَعْدَ لَکَ جَلَدٌ! اگر آپ زندہ ہیں تو پھر سب مصیبتیں کیج ہیں! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں پہنچے اور انصار کے گھروں کے پاس سے گزرے تو گھر گھر سے رونے چلانے کی آواز آتی تھی اور عورتیں عرب کی قدیم رسم کے مطابق نوحہ کر رہی تھیں۔ آپ نے یہ نظارہ دیکھا تو مسلمانوں کی تکلیف کا خیال کر کے آپ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ پھر آپ نے ان کو تسلی دینے کے خیال سے فرمایا۔ لَکِن حَنْظُہُ فَلَا بَوَاقَیَ لَہُ یعنی ہمارے چچا اور رضاعی بھائی حمزہ بھی شہید ہوئے ہیں مگر کسی عورت نے اس طرح ان کا ماتم نہیں کیا۔ رؤسار انصار سمجھے کہ آپ شاید اس حسرت کا اظہار فرما رہے ہیں کہ اس غریب الوطنی کی حالت میں حمزہ کو کوئی رونے والا نہیں۔ وہ فوراً اپنی عورتوں کے پاس گئے اور کہا کہ بس اب اپنے مردوں پر رونابند کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حمزہ کا ماتم کرو (اللہ اللہ! اس غلط فہمی میں بھی کیا جذبہ اخلاص مخفی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکان پر ماتم کا شور سنا تو پوچھا یہ کیسا شور ہے؟ عرض کیا گیا۔ انصار کی عورتیں حمزہ کا نوحہ کرتی ہیں۔ آپ نے ان کی محبت کی قدر کرتے ہوئے ان کے واسطے دُعائے خیر فرمائی لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ اس طرح نوحہ کرنا اسلام میں منع ہے۔ اور آئندہ کے لیے نوحہ کی رسم یعنی بین کرنا یا پٹینا یا بال لوجنا وغیرہ ایک اسلام میں ممنوع قرار دیدی گئی یہ ایک نوجوان صحابی آپ کے سامنے آئے اور آپ نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اپنے باپ کی شہادت پر مغموم ہے۔ فرمایا جابر کیا ہیں تمہیں ایک خوشی کی خبر سناؤں؟ جابر نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ جب تمہارے والد شہید ہو کر اللہ کے حضور پیش ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے بے حجاب ہو کر کلام فرمایا اور فرمایا کہ جو مانگنا چاہتے ہو مانگو۔ تمہارے باپ نے عرض کیا۔ اے میرے اللہ! تیری کسی نعمت کی کمی نہیں ہے، لیکن خواہش ہے کہ پھر دنیا میں جاؤں اور تیرے دین کے رستہ میں پھر جان دوں۔ خدا نے فرمایا ہم تمہاری اس خواہش کو بھی ضرور پورا کر دیتے لیکن ہم یہ عہد کر چکے ہیں کہ اَنْتُمْ لَا یَزِجُفُوْنَ۔ یعنی کوئی مردہ پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آسکتا۔ جابر کے والد نے کہا تو پھر میرے بھائیوں کو میری اطلاع دے دی جاوے تاکہ ان کی جہاد کی رغبت ترقی کرے۔ اس پر یہ آیت اتری کہ جو لوگ خدا کے رستے میں شہید ہوتے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھا کر دبلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے خدا کے پاس خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس نے اپنی بوڑھی والدہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اُن سے ان کے لڑکے عمرو بن معاذ کی شہادت پر اظہار ہمدردی کیا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ

جب آپ سلامت ہیں تو ہمیں کیا غم ہے؟

### غزوہ حمرہ الاسد

یہ رات مدینہ میں ایک سخت خوف کی رات تھی کیونکہ باوجود اس کے کہ بظاہر لشکر قریش نے مکہ کی راہ سے لی تھی یہ اندیشہ تھا کہ ان کا یہ فعل مسلمانوں کو غافل کرنے کی نیت سے نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک لوٹ کر مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں لہذا اس رات کو مدینہ میں پہرہ کا انتظام کیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا خصوصیت سے تمام رات صحابہ نے پہرہ دیا۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ اندیشہ محض خیالی نہ تھا کیونکہ فجر کی نماز سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ قریش کا لشکر مدینہ سے چند میل جا کر ٹھہر گیا ہے اور رؤساء قریش میں یہ سرگرم بحث جاری ہے کہ اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں نہ مدینہ پر حملہ کر دیا جائے اور بعض قریش ایک دوسرے کو طعنہ دے رہے ہیں کہ نہ تم نے محمد کو قتل کیا اور نہ مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنایا اور نہ ان کے مال و متاع پر قابض ہوئے، بلکہ جب تم ان پر غالب آئے اور تمہیں یہ موقع ملا کہ تم ان کو یلٹا میٹ کر دو تو تم انہیں یونہی چھوڑ کر واپس چلے آئے تاکہ وہ پھر زور پکڑ جاویں۔ پس اب بھی موقع ہے واپس چلو اور مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کی جڑ کاٹ دو۔ اس کے مقابل میں دوسرے یہ کہتے تھے کہ تمہیں ایک فتح حاصل ہوتی ہے، اسے غنیمت جانو اور مکہ واپس لوٹ چلو ایسا نہ ہو کہ یہ شہرت بھی کھو بیٹھو۔ اور یہ فتح شکست کی صورت میں بدل جاوے کیونکہ اب اگر تم لوگ واپس لوٹ کر مدینہ پر حملہ آور ہو گے تو یقیناً مسلمان جان توڑ کر لڑیں گے اور جو لوگ اُحد میں شامل نہیں ہوئے تھے وہ بھی میدان میں نکل آئیں گے۔ مگر بالآخر جو شیعہ لوگوں کی رائے غالب آئی اور قریش مدینہ کی طرف لوٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً اعلان فرمایا کہ مسلمان تیار ہو جائیں مگر ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ سوائے ان لوگوں کے جو اُحد میں شریک ہوئے تھے اور کوئی شخص ہمارے ساتھ نہ نکلے۔ یہ چنانچہ اُحد کے مجاہدین جن میں سے اکثر زخمی تھے اپنے زخموں کو باندھ کر اپنے آقا کے ساتھ ہو لیے۔ اور لکھا ہے کہ اس موقع پر مسلمان ایسی خوشی اور جوش کے ساتھ نکلے کہ جیسے کوئی فاتح لشکر فتح کے بعد دشمن کے تعاقب میں نکلتا ہے۔ آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے آپ حمرہ الاسد میں پہنچے۔ جہاں دو مسلمانوں کی نعشیں میدان میں پڑی ہوئی پائی گئیں اور تحقیقات پر معلوم ہوا کہ یہ وہ جاسوس تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پیچھے روانہ کئے تھے، مگر جنہیں قریش نے موقع پا کر قتل کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہداء کو ایک قبر کھدوا کر اُس میں انکھا دفن کروا دیا۔ اور اب چونکہ شام ہو چکی

۱۔ تاریخ نجیس ۲۔ ابن سعد ۳۔ درقانی وغیرہ ۴۔ ابن ہشام

۵۔ ابن ہشام و ابن سعد ۶۔ ابن سعد

تھی آپ نے یہیں ڈیرا ڈالنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میدان میں مختلف مقامات پر آگ روشن کر دی جاوے، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے حمرہ الاسد کے میدان میں پانچ سو آگیں شعلہ زن ہو گئیں جو ہر دُور سے دیکھنے والے کے دل کو مرعوب کرتی تھیں۔ غالباً اسی موقع پر قبیلہ خزاعہ کا ایک مشرک رئیس معبد نامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اُحد کے مقتولین کے متعلق اظہارِ ہمدردی کی اور پھر اپنے راستہ پر روانہ ہو گیا۔ دُوسرے دن جب وہ مقامِ روماء میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ قریش کا لشکر وہاں ڈیرا ڈالے پڑا ہے۔ اور مدینہ کی طرف واپس چلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ معبد فوراً ابوسفیان کے پاس گیا اور اسے جا کر کہنے لگا کہ تم کی مکہ نہ گئے ہو۔ واللہ میں تو ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کو حمرہ الاسد میں چھوڑ کر آیا ہوں اور ایسا باعرب لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا اور اُحد کی ہزیمت کی ندامت میں اُن کو اتنا جوش ہے کہ کہیں دیکھتے ہی جسم کر جاتیں گے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں پر معبد کی ان باتوں سے ایسا رعب پڑا کہ وہ مدینہ کی طرف لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے فوراً مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکرِ قریش کے اس طرح بھاگ نکلنے کی اطلاع موصول ہوئی تو آپ نے خدا کا شکر کیا۔ اور فرمایا کہ یہ خدا کا رعب ہے جو اُس نے کفار کے دلوں پر مسلط کر دیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے حمرہ الاسد میں دو تین دن اور قیام فرمایا اور پھر پانچ دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس تشریف لے آئے۔ اس مہم میں قریش کے دو سپاہی جن میں سے ایک فدار اور دوسرا جاسوس تھا مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے اور چونکہ قوانین جنگ کے ماتحت اُن کی سزا قتل تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ اُن میں سے ایک مکہ کا مشہور شاعر ابو عترہ تھا جو بدھ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوا تھا اور پھر اس کے معافی مانگنے اور یہ وعدہ کرنے پر کہ وہ پھر کبھی مسلمانوں کے خلاف لڑائی کے لیے نہیں نکلے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بلا فدیہ چھوڑ دیا تھا، مگر وہ فداری کر کے پھر مسلمانوں کے خلاف شریک جنگ ہوا اور نہ صرف خود شریک ہوا بلکہ اُس نے اپنے اشتعال انگیز اشعار سے دُوسروں کو بھی اُبھارا۔ چونکہ ایسے آدمی کی فداری مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ پس اب جب وہ دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے قتل کئے جانے کا حکم دیا۔ ابو عترہ نے پھر پہلے کی طرح زبانی معافی سے رہائی حاصل کرنی چاہی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے انکار فرمادیا کہ لَا يُنْذَغُ الْغَوْمُ مِنْ جُعْجُرٍ وَاحِدٍ مُتَرَتِّبًا۔ یعنی مومن ایک سوراخ میں سے دُود فغہ نہیں کاٹا جاتا۔ دوسرا قیدی معاویہ بن مغیرہ تھا۔ یہ شخص حضرت عثمان بن عفان کے رشتہ داروں میں سے تھا، مگر سخت معاندِ اسلام تھا۔ جنگِ اُحد کے بعد وہ غنیہ غنیہ مدینہ کے گرد و لواح میں گھومتا رہا

مگر صحابہ نے اُسے دیکھ لیا اور پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے اسے حضرت عثمان کی سفارش پر یہ وعدہ لے کر چھوڑ دیا کہ تین دن کے اندر اندر وہاں سے رخصت ہو جائے والا اسے جاسوسی کی سزا میں قتل کر دیا جائے گا۔ معاویہ نے وعدہ کیا کہ میں تین دن تک چلا جاؤں گا۔ مگر جب یہ میعاد گزر گئی تو پھر بھی وہ وہیں خفیہ خفیہ پھرتا ہوا پایا گیا، جس پر اُسے قتل کر دیا گیا۔ تاریخ میں یہ تذکرہ نہیں ہوا کہ اس کی نیت کیا تھی۔ مگر اس طرح خفیہ خفیہ مدینہ کے علاقہ میں رہنا اور باوجود متنبہ کر دیئے جانے کے مقررہ میعاد کے بعد بھی پھرے رہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خطرناک ارادے سے وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اُحد کے میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پنج جانے پر بیچ و تاب کھاتا ہوا مدینہ میں آپ کے خلاف کوئی بد ارادہ لے کر آیا ہو اور یہودی منافقین مدینہ کی سازش سے کوئی مخفی وار کرنا چاہتا ہو، مگر خدا تعالیٰ نے حفاظت فرمائی اور اس کی تجویز کارگر نہ ہوئی۔

### جنگ اُحد کے نتائج

مستقل نتائج کے لحاظ سے تو جنگ اُحد کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اور بدر کے مقابل میں یہ جنگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن

دقیقی طور پر ضرور اس جنگ نے مسلمانوں کو بعض لحاظ سے نقصان پہنچایا۔ اول اُن کے شر آدمی اس جنگ میں شہید ہوئے جن میں سے بعض اکابر صحابہ میں سے تھے اور زخمیوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی۔ دوسرے مدینہ کے یہودی منافقین جو جنگ بدر کے نتیجہ میں کچھ موعوب ہو گئے تھے اب کچھ دلیر ہو گئے۔ بلکہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے تو کھلم کھلا تمسخر اڑایا اور طعنے دیتے تھے تیسرے قریش مکہ کو بہت جرات ہو گئی اور انہوں نے اپنے دل میں یہ سمجھ لیا کہ ہم نے نہ صرف بدر کا بدلہ اتار لیا ہے بلکہ آئندہ بھی جب کبھی ہتھ بنا کر حملہ کریں گے مسلمانوں کو زیر کر سکیں گے۔ چوتھے عام قبائل عرب نے بھی اُحد کے بعد زیادہ جرات سے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مگر باوجود ان نقصانات کے یہ ایک بین حقیقت ہے کہ جو نقصان قریش کو جنگ بدر نے پہنچایا تھا جنگ اُحد کی فتح اس کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ بدر میں مکہ کے تمام وہ رؤساء جو درحقیقت قریش کی قومی زندگی کی رُوح تھے ہلاک ہو گئے تھے اور جیسا کہ قرآن شریف بیان کرتا ہے اس قوم کی صحیح معنوں میں جرہ کاٹ دی گئی تھی اور یہ سب کچھ ایک ایسی قوم کے ہاتھوں ہوا تھا جو ظاہری سامان کے لحاظ سے ان کے مقابلہ میں بالکل حقیر تھی۔ اس کے مقابلہ میں بے شک مسلمانوں کو اُحد کے میدان میں نقصان پہنچا، لیکن وہ اس نقصان کے مقابلہ میں بالکل حقیر اور عارضی تھا جو بدر میں قریش کو پہنچا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلامی سوسائٹی کے مرکزی نقطہ تھے اور جو قریش کی معاندانہ کارروائیوں کا اصل نشانہ تھے خدا کے فضل سے زندہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ اکابر صحابہ بھی سولائے



ایک دوسرے کے سب کے سب سلامت تھے اور پھر مسلمانوں کی یہ ہزیمت ایسی فوج کے مقابلہ میں تھی جو ان سے تعداد میں کم گئے زیادہ اور سامان حرب میں کم گئے مضبوط تھی۔ پس مسلمانوں کے لیے بدر کی عظیم الشان فتح کے مقابلہ میں اُحد کی ہزیمت ایک معمولی چیز تھی اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کے لیے ایک لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ ان پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئی کہ رسول اللہ کے منشاء اور ہدایت کے خلاف قدم زن ہونا کبھی بھی موجب فلاح اور بہبودی نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ٹھہرنے کی رائے دی اور اس کی تائید میں اپنا ایک خواب بھی سنایا مگر انھوں نے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اُحد کے ایک درہ میں متعین فرمایا اور انتہائی تاکید فرمائی کہ خواہ کچھ ہو جاوے اس جگہ کو نہ چھوڑنا مگر وہ فہیمت کے خیال سے اس جگہ کو چھوڑ کر نیچے اتر آئے اور گویہ عملی کمزوری ایک محدود طبقہ کی طرف سے ظاہر ہوتی تھی مگر چونکہ انسانی تمدن سب کو ایک لڑی میں پرو کر رکھتا ہے اس لیے اس کمزوری کے نتیجہ میں نقصان سب نے اٹھایا جیسا کہ اگر کوئی فائدہ ہوتا تو وہ بھی سب اٹھاتے۔ پس اُحد کی ہزیمت اگر ایک لحاظ سے موجب تکلیف تھی تو دوسری جہت سے وہ مسلمانوں کے لیے ایک مفید سبق بھی بن گئی۔ اور تکلیف ہونے کے لحاظ سے بھی مسلمان اس سیلاب عظیم کی طرح جو کسی جگہ رُک کر اور ٹھوکر کھا کر زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ نہایت شُرعت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ قسطنطنیہ میں جنگ اُحد کا ذکر زیادہ تر سورۃ آل عمران میں آتا ہے جہاں اس جنگ کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کو آئندہ کے لیے بعض اصولی ہدایتیں دی گئی ہیں۔

**اسلامی قانون ورثہ** جنگ اُحد کے بیان میں سعد بن الزبیر کی شہادت کا ذکر گذر چکا ہے۔ سعد ایک متول آدمی تھے اور اپنے قبیلہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی کوئی نرمیہ اولاد نہ تھی صرف دو لڑکیاں تھیں اور بیوی تھی۔ چونکہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تقسیم ورثہ کے متعلق کوئی جدید احکام نازل نہیں ہوئے تھے اور صحابہ میں قدیم دستور عرب کے مطابق ورثہ تقسیم ہوتا تھا۔ یعنی متوفی کی نرمیہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں اس کے جدی اقرباء جائیداد پر قابض ہو جاتے تھے اور بیوہ اور لڑکیاں یونہی خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔ اس لیے سعد بن الزبیر کی شہادت پر ان کے بھائی نے سارے ترکہ پر قبضہ کر لیا اور ان کی بیوہ اور لڑکیاں بالکل بے سہارا رہ گئیں۔ اس تکلیف سے پریشان ہو کر سعد کی بیوہ اپنی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ساری سرگندہ شے سنا کر اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میح کو اس درد کے قفسہ نے ایک ٹھیس لگائی مگر چونکہ ابھی تک اس معاملہ میں خدا کی



طرف سے آپ پر کوئی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: تم انتظار کرو۔ پھر جو احکام خدا کی طرف سے نازل ہونگے ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، چنانچہ آپ نے اس بارہ میں توجہ فرمائی اور ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آپ پر ورثہ کے معاملہ میں بعض وہ آیات نازل ہوئیں جو قرآن شریف کی سورۃ نساء میں بیان ہوئی ہیں۔ اس پر آپ نے سعد کے بھائی کو بلایا اور اس سے فرمایا کہ سعد کے ترکہ میں سے دو ٹکٹ ان کی لڑکیوں اور ایک تین اپنی بھادرج کے سپرد کر دو اور جو باقی بچے وہ خود لے لو۔ اور اس وقت سے تقسیم ورثہ کے متعلق جدید احکام کی ابتداء قائم ہو گئی جس کی رُو سے بیوی اپنے صاحبِ اولاد خاوند کے ترکہ میں آٹھویں حصہ کی اور بے اولاد خاوند کے ترکہ میں چہارم حصہ کی اور لڑکی اپنے باپ کے ترکہ میں اپنے بھائی کے حصہ کی نسبت نصف حصہ کی اور اگر بھائی نہ ہو تو سارے ترکہ میں سے حالات کے اختلاف کے ساتھ دو ٹکٹ یا نصف کی اور ماں اپنے صاحبِ اولاد لڑکے کے ترکہ میں چھٹے حصہ کی۔ اور بے اولاد لڑکے کے ترکہ میں تیسرے حصہ کی حقدار قرار دی گئی اور اسی طرح دوسرے درجہ کے حصے مقرر ہو گئے تھے اور عورت کا وہ فطری حق جو اس سے چھینا جا چکا تھا اُسے واپس مل گیا۔

اس موقع پر یہ نوٹ کرنا غیر ضروری نہ ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے طبقہ نسواں کے تمام جائز اور واجبی حقوق کی پوری پوری حفاظت فرمائی ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں آپ سے پہلے یا آپ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جس نے عورت کے حقوق کی ایسی حفاظت کی ہو جیسی آپ نے کی ہے، چنانچہ ورثہ میں۔ بیاہ شادی میں۔ خاوند بیوی کے تعلقات میں، طلاق و خلع میں۔ اپنی ذاتی جائیداد پیدا کرنے کے حق میں۔ اپنی جائیداد کے استعمال کرنے کے حق میں۔ تعلیم کے حقوق میں۔ بچوں کی ولایت و تربیت کے حقوق میں۔ قومی اور ملکی معاملات میں حصہ لینے کے حق میں۔ شخصی آزادی کے معاملہ میں۔ دینی حقوق اور ذمہ داریوں میں۔ الغرض دین و دنیا کے ہر اس میدان میں جس میں عورت قدم رکھ سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تمام واجبی حقوق کو تسلیم کیا ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت کو اپنی امت کیلئے ایک مقدس امانت اور فرض کے طور پر قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کی عورت آپ کی بعثت کو اپنے لیے ایک نجات کا پیغام سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے رستہ سے ہٹنا پڑتا ہے ورنہ میں بتاتا کہ عورت کے معاملہ میں آپ کی تعلیم حقیقتہً اس اعلیٰ مقام پر قائم ہے جس تک دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں پہنچا اور یقیناً آپ کا یہ پیارا قول ایک گہری صداقت پر مبنی ہے کہ حَتَّيْبِ اَيُّ مَنْ دُنْيَاكُمْ اِلِىَّ النَّسَاءُ وَالطِّبْيُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ اے یعنی دنیا کی چیزیں

میں سے میری فطرت کو جن چیزوں کی محبت کا خیر دیا گیا ہے۔ وہ عورت اور خوشبو ہیں مگر میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز یعنی عبادتِ الہی میں رکھی گئی ہے۔

## شراب کی حرمت

یہ بیان گذر چکا ہے کہ عرب میں شراب کثرت کے ساتھ پی جاتی تھی بلکہ شراب نوشی عربوں کے قومی اخلاق کا ایک حصہ بن چکی تھی اور کوئی مجلس شراب کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ خاص فیشن کے لوگوں میں شراب نوشی کے لیے خاص خاص اوقات مقرر تھے۔ جب وہ مجلسیں جما کر بدستیاں کرتے تھے۔ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فطری سعادت کے ماتحت خود کبھی شراب نہیں پی اور نبوت کے قبل بھی اس بد عادت سے ہمیشہ مجتنب رہے اور بعض صحابہ بھی ابتداء سے ہی تارکِ شراب تھے، لیکن چونکہ اس وقت تک مذہبی طور پر شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے صحابہ میں بہت سے لوگ شراب پیتے تھے اور بعض اوقات شراب نوشی کے بد نتائج بھی صحابہ میں رونما ہو جاتے تھے، چنانچہ حدیث میں روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت حمزہؓ نے شراب کے نشہ میں حضرت علیؓ کے ادنت ذبح کر دیئے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سمجھانے کے لیے گئے تو انہوں نے آپؐ کو بھی نہیں پہچانا اور آپؐ سے بے اعتنائی کی لیے اسی طرح روایت آتی ہے کہ ایک دعوت میں ایک صحابی نے کسی قدر زیادہ شراب پی لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس کے بعد وہ نماز پڑھانے کے لیے اہل مجلس کے امام بنے تو قرأت میں اصل آیت کی بجائے کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ اس قسم کے واقعات کی وجہ سے بعض صحابہ جن میں حضرت عمرؓ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے۔ اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتے تھے کہ شراب نوشی کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہونا چاہیئے۔ لیکن گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اس عادت کو بہت مکروہ اور ضرر رساں سمجھتے تھے مگر چونکہ ابھی تک اس بارہ میں کوئی خدائی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے آپؐ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بالآخر غزوہ اُحد کے بعد سترہ ہجری کے آخر یا سترہ ہجری کے شروع میں خدائی وحی نازل ہوئی اور شراب نوشی اسلام میں قطعی طور پر حرام قرار دیدی گئی۔ یہ اس حرمت کے حکم کو صحابہ کرام نے جس انشراح اور رضا کے ساتھ قبول کیا وہ اس روحانی اثر کی ایک بہت دلچسپ مثال ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک صحبت نے اُن کے دلوں میں پیدا کیا تھا۔ حدیث میں انس بن مالک سے ایک روایت آتی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان فرمایا اور پھر آپؐ نے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا کہ وہ مدینہ کی گلی کو چوں میں چکر لگا کر اس کی منادی کر دیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ اس

وقت میں ایک مکان میں ابو طلحہ انصاری اور بعض دوسرے صحابیوں کو شراب پلار ہاتھا۔ ہم نے اس منادی کی آواز سنی تو ابو طلحہ نے مجھ سے کہا کہ دیکھو یہ شخص کیا منادی کر رہا ہے میں نے پتہ لیا تو معلوم ہوا کہ شراب حرام کر دی گئی ہے۔ جب میں نے واپس آکر اہل مجلس کو اس کی اطلاع دی تو اُسے سنتے ہی ابو طلحہ نے مجھ سے کہا اُٹھو اور شراب کے شے زمین پر بہا دو لیہ انسؓ کہتے ہیں کہ اس دن مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور اسی باب کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اُس شخص کی منادی سنکر کسی نے یہ نہیں کہا کہ پہلے تحقیق تو کرو کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔ بلکہ فوراً سب نے اپنے ہاتھ پھینچ لیے اور شراب نوشی سے دفعۃً رک گئے۔ شراب نوشی کی سی عادت کو اور عادت بھی وہ جو گویا عرب کی گھٹی میں تھی یکلفت ترک کر دینا اور ترک بھی ایسی حالت میں کرنا کہ شراب کا ذور عملہ چل رہا ہو اور پیئے دانے اُس کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہوں ضبط نفس کی ایک ایسی شاندار مثال ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گویا کہ بخاری کی بعض روایات میں اشارہ پایا جاتا ہے شراب کی قطعی حرمت کا حکم غزوہ اُحد کے بعد نازل ہوا۔ مگر اس سے پہلے بھی بعض قسراتی آیات اس مضمون کی نازل ہو چکی تھیں جن میں شراب کی برائی بیان کی گئی تھی؛ چنانچہ روایت آتی ہے کہ سب سے پہلے جو آیت شراب کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہ تھی کہ بیشک شراب میں بعض فوائد ہیں مگر اس کے نقصانات اس کے فوائد پر غالب ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے جنھیں شراب کے خلاف غالباً سارے صحابہ میں سے زیادہ جوش تھا دُعا کی کہ اے خدا! ہمیں شراب کے معاملہ میں کوئی زیادہ کھلا حکم عطا کر۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مومنو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز میں شامل نہ ہوا کرو۔ اس پر حضرت عمرؓ نے پھر یہی دُعا کی کہ خدایا کوئی قطعی حکم نازل فرما۔ جس پر بالآخر یہ آیت اُتری کہ ”اے مسلمانو! شراب اور خمر ناپاک اور فساد رساں افعال ہیں جن سے شیطان تمہارے اندر عداوت اور دشمنی پیدا کرنا چاہتا اور ان کے ذریعہ تمہیں خدا کے ذکر اور نماز سے غافل کرتا ہے پس تم ان چیزوں سے محنت رہو۔“ جب یہ آیت اُتری تو مسلمانوں کی تسلی ہو گئی اور وہ شراب کو قطعی طور پر حرام سمجھ کر اس سے باز آ گئے۔ بلکہ اس کے بعد انہیں شراب سے ایسی دُوری پیدا ہو گئی کہ جو مسلمان ایسی حالت میں غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے کہ انھوں نے شراب پی ہوئی تھی انہیں ان شہداء کے متعلق بے چینی پیدا ہونے لگی کہ اُن کا کیا حشر ہوگا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حرمت پہلے پہلے لوگوں نے جو کچھ کھایا پیا ہے اُس کی وجہ سے اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ الغرض سب نے ہجری کے آخر یا سب سے ہجری

۱۔ بخاری تفسیر سورۃ مادہ و مسلم کتاب الاشریہ ۲۔ بخاری تفسیر سورۃ مادہ ۳۔ بخاری کتاب التفسیر سورۃ مادہ  
 ۴۔ سورۃ بقرہ ۲۲۰ ۵۔ سورۃ نساء ۲۵ ۶۔ سورۃ مادہ ۹۱ ۷۔ الإوداد کتاب الاشریہ  
 ۸۔ بخاری تفسیر سورۃ مادہ

کے شروع میں مگر بہر حال غزوہ اُحد کے بعد شراب نوشی اسلام میں قطعی طور پر حرام ہو گئی اور شراب کی تعریف میں ہر وہ چیز شامل قرار دی گئی جو نشہ پیدا کرتی اور انسان کی عقل پر پرودہ ڈال دیتی ہے۔ اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی جڑ پر تیر رکھ دیا جو صحیح طور پر بدیوں کی ماں کہلاتی ہے۔

اس جگہ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ از روئے عقل شراب نوشی کیسی ہے۔ قرآن نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ شراب میں بعض فوائد بھی ہیں، مگر یہ کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہیں اور اصولی طور پر انسانی عقل اس مسئلہ پر اس سے زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتی۔ اور یہ ایک خوشی کا مقام ہے کہ ہزاروں سالوں کے تلخ تجربات کے بعد آج دنیا اسی حقیقت کی طرف آرہی ہے جو اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے آشکارا کی تھی اور ہر ملک میں شراب نوشی کے سد باب کے لیے سوسائٹیاں بن رہی ہیں، بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو شراب کے خلاف ایک قانون بھی نافذ ہو چکا ہے جس کی تقلید میں بعض دوسرے ممالک میں بھی تحریک شروع ہے۔

### بنو اسد کی شرارت اور سر یہ ابو سلمہ محرم سنہ ہجری ۳۱

قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف سر اٹھانے پر آگے سے بھی زیادہ دلیر کر دیا، چنانچہ ابھی جنگ اُحد پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور صحابہ ابھی اپنے زخموں کے علاج سے بھی پوری طرح فارغ نہ ہوئے تھے کہ محرم سنہ ہجری میں اپنا مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں یہ اطلاع پہنچی کہ قبیلہ اسد کا رئیس طلحہ بن خویلد اور اس کا بھائی سلمہ بن خویلد اپنے علاقہ کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ اس خبر کے ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے ملک کے حالات کے ماتحت اس قسم کی خبروں کے خطرات کو خوب سمجھتے تھے فوراً ڈیڑھ سو صحابیوں کا ایک تیز رو دستہ تیار کر کے اس پر ابو سلمہ بن عبد اللہ کو امیر مقرر فرمایا اور انہیں تاکید کی کہ لیغا کر کے ہوتے پہنچیں اور پیشتر اس کے کہ بنو اسد اپنی عداوت کو عملی جامہ پہنا سکیں انہیں منتشر کر دیں، چنانچہ ابو سلمہ نے تیزی مگر خاموشی کیساتھ بڑھتے ہوئے وسط عرب کے مقام قطن میں بنو اسد کو جا بیا، لیکن کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ بنو اسد کے لوگ مسلمانوں کو دیکھتے ہی ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ اور ابولکر چند دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس پہنچ گئے۔ اس سفر کی غیر معمولی مشقت سے ابو سلمہ کا وہ زخم جو انہیں اُحد میں آیا تھا اور اب بظاہر منہل ہو چکا تھا پھر خراب ہو گیا اور باوجود علاج معالجہ کے بگڑتا ہی گیا اور بالآخر اسی بیماری میں اس مخلص اور پرانے صحابی نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضائی بھائی بھی تھے وفات پائی یہ بنو اسد کا رئیس طلحہ جس کا ذکر



اوپر کیا گیا ہے بعد میں مسلمان ہو گیا، لیکن پھر مرتد ہو گیا بلکہ نبوت کا جھوٹا مدعی بن کر فتنہ و فساد کا موجب بنا کر بالآخر شکست کھا کر غرب سے بھاگ گیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ تائب ہوا اور آخر کئی اسلامی جنگوں میں حصہ لیکر اسلام پر وفات پا گیا۔

## بنو لحيان کی شرارت اور سفیان کا قتل۔ محرم سنہ ہجری

قریش کی اشتعال انگیزی اور  
اعداء میں مسلمانوں کی وقتی

ہزیمت اب نہایت سرعت کے ساتھ اپنے خطرناک نتائج ظاہر کر رہی تھی، چنانچہ انہی ایام میں جن میں بنو اسد نے مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تیاری کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قبیلہ بنو لحيان کے لوگ اپنے سردار سفیان بن خالد کی انجمن پر اپنے وطن عرنہ میں جو مکہ سے قریب ایک مقام تھا ایک بہت بڑا شکر جمع کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہایت موقع شناس اور مختلف قبائل عرب کی حالت اور ان کے رد و ساز کی طاقت و اثر سے خوب واقف تھے اس خبر کے موصول ہوتے ہی سمجھ لیا کہ یہ ساری شرارت اور فتنہ انگیزی بنو لحيان کے رئیس سفیان بن خالد کی ہے اور اگر اس کا وجود درمیان میں نہ رہے تو بنو لحيان مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے اور یہ بھی آپ جانتے تھے کہ سفیان کے بغیر اس قبیلہ میں فی الحال کوئی ایسا صاحب اثر شخص نہیں ہے جو اس قسم کی تحریک کا لیڈر بن سکے۔ لہذا یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر بنو لحيان کے خلاف کوئی فوجی دستہ روانہ کیا گیا تو غریب مسلمانوں کے واسطے موجب تکلیف ہونے کے علاوہ ممکن ہے کہ یہ طریق ملک میں زیادہ گشت و خون کا دروازہ کھول دے۔ آپ نے یہ تجویز فرمائی کہ کوئی ایک شخص چلا جائے اور موقعہ پا کر اس فتنہ کے بانی مبنی اور اس شرارت کی جڑ سفیان بن خالد کو قتل کر دے، چنانچہ آپ نے اس غرض سے عبداللہ بن ائیس انصاری کو روانہ فرمایا۔ اور چونکہ عبداللہ نے کبھی سفیان کو دیکھا نہیں تھا اس لیے آپ نے خود ان کو سفیان کا سارا حلیہ وغیرہ سمجھا دیا اور آخر میں فرمایا کہ ہوشیار رہنا، سفیان ایک مجتم شیطانی ہے، چنانچہ عبداللہ بن ائیس نہایت ہوشیاری کے ساتھ بنو لحيان کے کیمپ میں پہنچے (جو واقعی مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں سرگرمی سے مصروف تھے) اور رات کے وقت موقعہ پا کر سفیان کا خاتمہ کر دیا۔ بنو لحيان کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے عبداللہ کا تعاقب کیا مگر وہ پھپھتے پھپھاتے ہوئے بچ کر نکل آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب عبداللہ بن ائیس آئے تو آپ نے ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ کامیاب ہو کر آئے ہیں، چنانچہ آپ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا اَفْلَحَ النُّوحَةُ یہ چہرہ تو بامراد نظر آتا ہے۔ عبداللہ نے عرض کیا اور کیا خوب عرض کیا "اَفْلَحَ وَجْهَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ"



سب کا میابی آپ کی ہے۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کا عصا عبداللہ کو بطور انعام کے عطا فرمایا اور فرمایا: یہ عصا تمہیں جنت میں ٹیک لگانے کا کام دے گا۔ عبداللہ نے یہ مبارک عصا نہایت محبت و اخلاص کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور مرتے ہوئے وصیت کی کہ اُس کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشی سے جس کا اظہار آپ نے عبداللہ کی پامراد واپسی پر فرمایا اور اس انعام سے جو انہیں غیر معمولی طور پر عطا فرمایا۔ پتہ لگتا ہے کہ آپ سفیان بن خالد کی فتنہ انگیزی کو نہایت خطرناک خیال فرماتے تھے اور اس کے قتل کو امن عامہ کے لیے ایک موجب رحمت سمجھتے تھے۔

**کفار کی فزاری اور واقعہ رجب صفر ۳۰ھ** یہ دن مسلمانوں کے لیے سخت خطرہ کے دن تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو چاروں طرف سے متوحش خبریں آرہی تھیں، لیکن سب سے زیادہ خطرہ آپ کو قریش مکہ کی طرف سے تھا جو جنگ اُحد کی وجہ سے بہت دلیر اور شوخ ہو رہے تھے اس خطرہ کو محسوس کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ صفر ۳۰ھ ہجری میں اپنے دشمن صحابیوں کی ایک پارٹی تیار کی اور اُن پر عاصم بن ثابت کو امیر مقرر فرمایا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ خینہ خفیفہ مکہ کے قریب جا کر قریش کے حالات دریافت کریں اور ان کی کارروائیوں اور ارادوں سے آپ کو اطلاع دیں۔ لیکن ابھی یہ پارٹی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ قبائل عضل اور قارۃ کے چند لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے قبائل میں بہت آدمی اسلام کی طرف مائل ہیں آپ چند آدمی ہمارے ساتھ روانہ فرمائیں جو ہمیں مسلمان بنائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ خواہش معلوم کر کے خوش ہوئے اور وہی پارٹی جو خبر رسانی کے لیے تیار کی گئی تھی ان کے ساتھ روانہ فرمادی۔ لیکن دراصل جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ لوگ جھوٹے تھے اور بنو لحيان کی ایک خدمت پر مدینہ میں آئے تھے۔ جنھوں نے اپنے رئیس سفیان بن خالد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ چال چلی تھی کہ اس بہانہ سے مسلمان مدینہ سے نکلیں تو اُن پر حملہ کر دیا جاوے اور بنو لحيان نے اس خدمت کے معاوضہ میں عضل اور

۱۔ ابن سعد و زرقانی ۲۔ سفیان بن خالد کے قتل کا واقعہ ابن ہشام میں بھی ہے، مگر ابن ہشام نے اسے تاریخ کی تعبیر کے بغیر اپنی سیرۃ کے آخر میں بیان کیا ہے نیز ابن ہشام نے مقتول کا نام بجلتے سفیان بن خالد کے خالد بن سفیان لکھا ہے باقی تفصیل عملاً وہی ہے دیکھو ابن ہشام جلد ۳ ص ۸۳۔

۳۔ بخاری کتاب الجہاد باب هل یستأمر الرجل و کتاب المغازی حالات رجب و فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۹۱۔ ۴۔ ابن ہشام و ابن سعد

۵۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۶۵

قارہ کے لوگوں کے لیے بہت سے اونٹ انعام کے طور پر مقرر کئے تھے۔ جب عضل اور قارہ کے یہ غدار لوگ صفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو انھوں نے بنو لیثان کو غصہ خفیہ اطلاع بھجوا دی کہ مسلمان ہمارے ساتھ آ رہے ہیں تم آ جاؤ جس پر قبیلہ بنو لیثان کے دو سو نوجوان جن میں سے ایک سو تیرا انداز تھے مسلمانوں کے تعاقب میں نکل پڑے ہوئے اور مقام رجب میں ان کو آدیا۔ دشمن آدمی دو سو سپاہیوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کو ہتھیار ڈالنے کی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ فوراً یہ صحابی ایک قریب کے ٹیلہ پر چڑھ کر مقابلہ کے واسطے تیار ہو گئے۔ کفار نے جن کے نزدیک دھوکا دینا کوئی معیوب فعل نہیں تھا ان کو آواز دی کہ تم پہاڑی پر سے نیچے اتر آؤ ہم تم سے پختہ عہد کرتے ہیں کہ تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ عامم نے جواب دیا کہ ”ہمیں تمہارے عہد پر میان کا کوئی اعتبار نہیں ہے ہم تمہاری اس ذمہ داری پر نہیں اتر سکتے“ اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا: ”لے خدا! تو ہماری حالت کو دیکھ رہا ہے۔ اپنے رسول کو ہماری اس حالت کے اطلاع پہنچا دے“ غرض عامم اور اس کے ساتھیوں نے مقابلہ کیا بالآخر رستے رستے شہید ہوئے۔

جب سات صحابہ مارے گئے اور صرف خبیث بن عدی اور زید بن دشنہ اور ایک اور صحابی باقی رہ گئے تو کفار نے جن کی اصل خواہش ان لوگوں کو زندہ پکڑنے کی تھی۔ پھر آواز دیکر کہا کہ اب بھی نیچے اتر آؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ اب کی دفعہ یہ سادہ لوح مسلمان ان کے پھندے میں آکر نیچے اتر آئے، مگر نیچے اترتے ہی کفار نے ان کو اپنی تیر کھانوں کی تندیلوں سے جکڑ کر باندھ لیا۔ اس پر خبیث اور زید کے ساتھی سے جن کا نام تانتخ میں عبد اللہ بن طارق مذکور ہوا صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے پکار کر کہا: ”یہ تمہاری پہلی بد عہدی ہے“ اور نہ معلوم تم آگے چل کر کیا کرو گے اور عبد اللہ نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ جس پر کفار تھوڑی دُور تک تو عبد اللہ کو گھسیٹتے ہوئے اور زرد کو ب کرتے ہوئے لے گئے اور پھر انہیں قتل کر کے وہیں پھینک دیا اور چونکہ اب ان کا انتقام پُورا ہو چکا تھا۔ وہ قریش کو خوش کرنے کے لیے نیز روپے کی لالچ سے خبیث اور زید کو ساتھ لیکر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہیں قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چنانچہ خبیث کو تو عمارت بن عامر بن نوفل کے لڑکوں نے خرید لیا۔ کیونکہ خبیث نے بدر کی جنگ میں عمارت کو قتل کیا تھا۔ اور زید کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا۔

ابھی یہ دونوں صحابی قریش کے پاس غلامی کی حالت میں قید تھے کہ ایک دن خبیث نے عمارت کی لڑکی سے اپنی ضرورت کے لیے ایک اُسترا مانگا اور اُس نے دیدیا۔ جب یہ اُسترا خبیث کے ہاتھ میں تھا تو بنت عمارت کا ایک غور و سالہ بچہ کھیلتا ہوا خبیث کے پاس آگیا اور خبیث نے اُسے اپنی ران پر

بٹھایا۔ ماں نے جب دیکھا کہ خبیث کے ہاتھ میں اُسترا ہے اور ران پر اس کا بچہ بیٹھا ہے تو وہ کانپ اُٹھی اور اس کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ خبیث نے اُسے دیکھا تو اس کے خوف کو سمجھتے ہوئے کہا "کیا تم یہ خیال کرتی ہو کہ میں اس بچے کو قتل کر دوں گا؟ یہ خیال نہ کرو۔ میں انشاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔" ماں کا کملا یا ہوا چہرہ خبیث کے ان الفاظ سے شگفتہ ہو گیا۔ یہ عورت خبیث کے اعلیٰ اخلاق سے اس قدر متاثر تھی کہ وہ بعد میں ہمیشہ کہا کرتی کہ میں نے خبیث کا سا اچھا قیدی کوئی نہیں دیکھا۔ وہ یہ بھی کہا کرتی تھی کہ "میں نے ایک دفعہ خبیث کے ہاتھ میں ایک انگور کا خوشہ دیکھا تھا جس سے وہ انگور کے دانے توڑ توڑ کر کھاتا تھا؛ حالانکہ ان دنوں میں مکہ میں انگوروں کا نام و نشان نہیں تھا اور خبیث آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ خدائی رزق تھا جو خبیث کے پاس آتا تھا۔"

مگر رُوسا قریش کی قلبی عداوت کے سامنے رحم و انصاف کا جذبہ خارج از سوال تھا؛ چنانچہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بنو الحارث کے لوگ اور دوسرے رُوسا قریش خبیث کو قتل کرنے اور اس کے قتل پر جشن منانے کے لیے اسے ایک کھلے میدان میں لے گئے۔ خبیث نے شہادت کی بُو پائی تو قریش سے الحاح کے ساتھ کہا کہ مرنے سے پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ قریش نے جو غالباً اسلامی نماز کے منظر کو بھی اس تماشہ کا حصہ بنانا چاہتے تھے اجازت دیدی اور خبیث نے بڑی توجہ اور حسنِ قلب کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کی اور پھر نماز سے فارغ ہو کر قریش سے کہا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنی نماز کو ادا کر لیا کروں، لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ میں موت کو چیلھے ڈالنے کے لیے نماز کو لبا کر رہا ہوں؟ اور پھر خبیث یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے جھک گئے۔

وَمَا أَن أَبَايَ حِينَ أُقْتَلَ مُسْلِمًا؛ عَلَيَّ آتِي شَيْقَ كَانَ لِلَّهِ مَضُوعِي

فَذَالِكَ فِي ذَاتِ اللَّهِ وَإِنْ يَشَاءُ؛ يُمَارِلُ عَلَيَّ أَذْصَالِ شَلْوٍ مُنْذَرِ

یعنی "جبکہ میں اسلام کی راہ میں اور مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے یہ پروا نہیں ہے کہ میں کس پہلو پر قتل ہو کر گر دوں۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے ہے۔ اور اگر میرا خدا چاہے گا تو میرے جسم کے پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکات نازل فرمائے گا۔" غالباً ابھی خبیث کی زبان پر ان اشعار کے آخری الفاظ گونج ہی رہے تھے کہ عقبہ بن حارث نے آگے بڑھ کر وار کیا اور یہ عاشقِ رسول خاک پر تھائے دوسری روایت میں یہ ہے کہ قریش نے خبیث کو ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تھا اور پھر بیڑوں کی چوکیں دے دے کر قتل کیا۔ اس مجمع میں ایک شخص سعید بن عامر بھی شریک تھا۔ یہ شخص بعد میں مسلمان ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک اس کا یہ حال تھا کہ جب کبھی اسے خبیث کا واقعہ یاد آتا تھا تو اس پر غشی کی حالت

طاری ہو جاتی تھی یہ

دوسری طرف صفوان بن اُمیہ اپنے قیدی زید بن دثنہ کو ساتھ لیکر حرم سے باہر گیا۔ دوسرا قریش کا ایک مجمع ساتھ تھا۔ باہر پہنچ کر صفوان نے اپنے غلام نسطاس کو حکم دیا کہ زید کو قتل کر دو۔ نسطاس نے آگے بڑھ کر تلوار اٹھائی۔ اس وقت ابوسفیان بن حرب رئیس مکہ نے جو تماشاخیوں میں موجود تھا آگے بڑھ کر زید سے کہا: "سبح کو کیا تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت تمہاری جگہ ہمارے ہاتھوں میں محمدؐ ہوتا جسے ہم قتل کرتے اور تم بچ جاتے اور اپنے اہل و عیال میں خوشی کے دن گزارتے؟ زید کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ غصہ میں بولے: "ابوسفیان تم یہ کیا کہتے ہو۔ خدا کی قسم میں تو یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ میرے بچنے کے عوض رسول اللہؐ کے پاؤں میں ایک کانٹا لٹک جائے" ابوسفیان بے اختیار ہو کر بولا: "واللہ میں نے کسی شخص کو کسی شخص کے ساتھ ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی کہ اصحابِ محمدؐ کو محمدؐ سے ہے" اسکے بعد نسطاس نے زید کو شہید کر دیا۔

اسی واقعہ رجیع کی ضمن میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ جب قریش مکہ کو یہ اطلاع ملی کہ جو لوگ بنو لحيان کے ہاتھ سے رجیع میں شہید ہوئے تھے ان میں عامر بن ثابت بھی تھے۔ تو چونکہ عامر نے بدر کے موقع پر قریش کے ایک بڑے رئیس کو قتل کیا تھا، اس لیے انھوں نے رجیع کی طرف خاص آدمی روانہ کئے اور ان آدمیوں کو تاکید کی کہ عامر کا سر یا جسم کا کوئی عضو کاٹ کر اپنے ساتھ لائیں تاکہ انہیں تسلی ہو اور ان کا جذبہ انتقام تسکین پائے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جس شخص کو عامر نے قتل کیا تھا اس کی ماں نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے قاتل کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پئے گی یہ لیکن خدائی تصرف ایسا ہوا کہ یہ لوگ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زبوروں اور شہد کی فرمکیوں کے ٹھنڈ کے ٹھنڈ عامر کی لاش پر ڈبرہ ڈالے بیٹھے ہیں اور کسی طرح وہاں سے اٹھنے میں نہیں آتے۔ ان لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ یہ زبور اور مکیاں وہاں سے اڑ جائیں مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر یہ لوگ غائب و خامر واپس لوٹ گئے یہ اس کے بعد جلد ہی بارش کا ایک طوفان آیا اور عامر کی لاش کو وہاں سے بہا کر کہیں کا کہیں لے گیا۔ لکھا ہے کہ عامر نے مسلمان ہونے پر یہ عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ ہر قسم کی مشرکانہ چیز سے قطعی پرہیز کریں گے حتیٰ کہ مشرک کے ساتھ چھوئیں گے بھی نہیں۔ حضرت عمرؓ کو جب ان کی شہادت اور اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو کہنے لگے: "خدا بھی اپنے بندوں کے جذبات کی کتنی پاسداری فرماتا ہے موت کے بعد بھی اس نے عامر کے عہد کو پورا کر دیا اور مشرکین کے مس سے انہیں محفوظ رکھا۔"

۱۔ ابن ہشام ۲۔ ابن ہشام و ابن سعد ۳۔ بخاری حالات رجیع ۴۔ فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۲۹۵

۵۔ بخاری حالات رجیع و فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ ۶۔ ابن ہشام



واقعہ رجیع کی خبر سے جو صد مہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو پہنچ سکتا تھا وہ ظاہر ہے مگر پیشتر اس کے کہ یہ المناک خبر مدینہ میں پہنچتی ایک اور خطرناک واقعہ پیش آگیا۔ اس لیے قبل اس کے کہ ہم واقعہ رجیع کے متعلق کوئی تبصرہ کریں اس واقعہ کا بیان کر دینا ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں واقعات ایک ہی نوعیت کے تھے اور ان کی اطلاع بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہی وقت میں موصول ہوئی تھی۔

**واقعہ بدر معونہ صفر ۳**  
 قبائل سلیم و غطفان وغیرہ کی شرارتوں اور فتنہ انگیزوں کا ذکر اور پر گزر چکا ہے یہ قبائل عرب کے وسط میں سطح مرتفع نجد پر آباد تھے اور مسلمانوں کے خلاف قریش مکہ کے ساتھ ساز باز رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ ان شریہ قبائل کی شرارت بڑھتی جاتی تھی اور سارا سطح مرتفع نجد اسلام کی عداوت کے زہر سے مسموم ہوتا چلا جا رہا تھا؛ چنانچہ ان آیام میں جن کا ہم اس وقت ذکر کر رہے ہیں ایک شخص ابوبراء عامری جو وسط عرب کے قبیلہ بنو عامر کا ایک رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا آپ نے بڑی نرمی اور شفقت کے ساتھ اُسے اسلام کی تبلیغ فرمائی اور اس نے بھی بظاہر شوق اور توجہ کے ساتھ آپ کی تقریر کو سنا، مگر مسلمان نہیں ہوا؛ البتہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ اپنے چند اصحاب نجد کی طرف روانہ فرمائیں جو وہاں جا کر اہل نجد میں اسلام کی تبلیغ کریں اور مجھے اُمید ہے کہ نجدی لوگ آپ کی دعوت کو رد نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا مجھے تو اہل نجد پر اعتماد نہیں ہے۔ ابوبراء نے کہا کہ آپ ہرگز فکر نہ کریں۔ میں ان کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہوں۔ چونکہ ابوبراء ایک قبیلہ کا رئیس اور صاحب اثر آدمی تھا آپ نے اُس کے اطمینان دلانے پر یقین کر لیا اور صحابہ کی ایک جماعت نجد کی طرف روانہ فرمادی۔

یہ تاریخ کی روایت ہے۔ بخاری میں آتا ہے کہ قبائل رعل اور ذکوان وغیرہ (جو مشہور قبیلہ بنو سلیم کی شاخ تھے) اُن کے چند لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کا اظہار کر کے درخواست کی کہ ہماری قوم میں سے جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں ان کے خلاف ہماری امداد کے لیے (یہ تشریح نہیں کی کہ کس قسم کی امداد، آیا تبلیغی یا فوجی) چند آدمی روانہ کیے جائیں جس پر آپ نے یہ دستہ روانہ فرمایا۔ اور اسی کی تائید میں ابن سعد نے بھی ایک روایت نقل کی ہے کہ اُسے دوسری روایت کے مقابل میں ترجیح نہیں دی گئی مگر بد قسمتی سے بدر معونہ کی تفصیلات میں بخاری کی روایات

۱۔ زرقانی جلد ۲ ص ۴۹۰ آخر حالات بدر معونہ ۲۔ ابن ہشام وابن سعد

۳۔ بخاری کتاب الجہاد باب العون بالمدد و کتاب المغازی ابواب رجیع و بدر معونہ روایت عن قتادہ عن

النسائی ۴۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۳۸



میں بھی کچھ غلط واقع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے حقیقت پوری طرح معین نہیں ہو سکتی بلکہ مگر بہر حال اس قدر یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قبائل رعل اور ذکوان وغیرہ کے لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے اور انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ چند صحابہ ان کے ساتھ بھجھ

ان دونوں روایتوں کی مطابقت کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ رعل اور ذکوان کے لوگوں کے ساتھ ابوہریرہ عامری نہیں قبیلہ عامر بھی آیا ہوا اور اس نے ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات کی ہو۔ چنانچہ تاریخی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے اطمینان نہیں ہے اور پھر اس کا یہ جواب دینا کہ آپ کوئی فکر نہ کریں میں اس کا ضمان ہوتا ہوں کہ آپ کے صحابہ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابوہریرہ کے ساتھ رعل اور ذکوان کے لوگ بھی آئے تھے جن کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فکر مند تھے۔ واللہ اعلم

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفر ۳۲ ہجری میں منذر بن عمرو انصاری کی امارت میں صحابہ کی ایک پارٹی روانہ فرمائی یہ لوگ عموا انصار میں سے تھے اور تعداد میں ستر تھے اور قریشا سارے کے سارے قاری یعنی قرآن خوان تھے۔ جو دن کے وقت جنگل سے لکڑیاں جمع کر کے ان کی قیمت پر اپنا پیٹ پالتے اور رات کا بہت سا حقہ عبادت میں گزار دیتے تھے یہ جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچے جو ایک کنوئیں کی وجہ سے بڑے معونہ کے نام سے مشہور تھا تو ان میں سے ایک شخص حرام بن لھان جو انس بن مالک کے ناموں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دعوت اسلام کا پیغام لے کر قبیلہ عامر کے رئیس اور ابوہریرہ عامری کے بھتیجے عامر بن طفیل کے پاس آگے گئے اور باقی صحابہ پیچھے رہے جب حرام بن لھان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے طور پر عامر بن طفیل اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے شروع میں تو منافقانہ طور پر آؤ بھگت کی لیکن جب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور اسلام کی تبلیغ کرنے لگے تو ان میں سے بعض شریروں نے کسی آدمی کو اشارہ کر کے اس بے گناہ ایلچی کو پیچھے کی طرف سے نیزہ کا وار کر کے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس وقت حرام بن لھان کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ اللہ اکبر فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ یعنی اللہ اکبر کعبہ کے رب کی قسم! میں تو اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ عامر بن طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے قتل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے بعد اپنے قبیلہ بنو عامر کے لوگوں کو اکسایا

۱۔ فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۹۶ و ۳۰۱ شرح حالات بڑے معونہ

۲۔ ابن سعد و ابن ہشام ۳۔ بخاری کتاب الجہاد باب العون بالمدد

۴۔ بخاری کتاب الجہاد باب من ینکب او یطعن و کتاب المغازی ابواب ریح و بڑے معونہ روایت

ابن طلحہ عن انس دروایت عبداللہ بن انس دروایت عروہ مفلوطاً

کہ وہ مسلمانوں کی بقیۃ جماعت پر حملہ آور ہو جائیں مگر انھوں نے اس بات سے انکار کیا اور کہا کہ ہم ابوبراء کی ذمہ داری کے ہوتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس پر عامر نے قبیلہ سلیم میں سے بنو رعل اور گوان اور عقیہ وغیرہ کو وہی جو بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد بکر آئے تھے اپنے ساتھ لیا اور یہ سب لوگ مسلمانوں کی اس لکھیل اور بے بس جماعت پر حملہ آور ہو گئے یہ مسلمانوں نے جب ان وحشی درندوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ان سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی تعرض نہیں ہے ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک کام کے لیے آئے ہیں اور ہم تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئے مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور سب کو تلوار کے گھاٹے آ کر دیا یہ ان صحابیوں میں سے جو اس وقت وہاں موجود تھے صرف ایک شخص بچا جو پاؤں سے لنگڑا تھا اور پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا ہوا تھا یہ اس صحابی کا نام کعب بن زید تھا اور بعض روایات سے پتہ لگتا ہے کہ کفار نے اس پر بھی حملہ کیا تھا جس سے وہ زخمی ہوا اور کفار نے اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے مگر دراصل اس میں جان باقی تھی اور وہ بچ گیا۔

صحابہ کی اس جماعت میں سے دو شخص یعنی عمرو بن امیہ ضمری اور منذر بن محمد اس وقت اونٹوں وغیرہ کے چرانے کے لیے اپنی جماعت الگ ہو کر ادھر ادھر گئے ہوتے تھے انھوں نے دور سے اپنے ذیرہ کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ وہ ان صحرائی اشاروں کو خوب سمجھتے تھے، فوراً تاثر گئے کہ کوئی لڑائی ہوئی ہے۔ واپس آئے تو ظالم کفار کے کشت و خون کا کارنامہ انھوں کے سامنے تھا۔ دور سے ہی یہ نظارہ دیکھ کر انھوں نے فوراً آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک نے کہا کہ ہمیں یہاں سے فوراً بھاگ نکلنا چاہیے اور مدینہ میں پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینی چاہیے۔ مگر دوسرے نے اس رائے کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں تو اس جگہ سے بھاگ کر نہیں جاؤں گا جہاں ہمارا امیر منذر بن عمرو شہید ہوا ہے؛ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر لڑا اور شہید ہوا یہ اور دوسرے کو جن کا نام عمرو بن امیہ ضمری تھا کفار نے پکڑ کر قید کر لیا۔ اور غالباً اسے بھی قتل کر دیتے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ قبیلہ مضر سے ہے تو عامر بن طفیل نے عرب کے دستور کے مطابق اس کے ماتھے کے چند بال کاٹ کر اسے رہا کر دیا اور کہا کہ میری ماں نے قبیلہ مضر کے ایک غلام کے آزاد کرنے کی منت مانی ہوئی ہے میں تجھے اس کے بدلے میں چھوڑتا ہوں۔ گویا ان ستر صحابہ میں صرف

۱۔ ابن ہشام و ابن سعد ۲۔ بخاری ابواب حالات بزم معونہ روایت عبد العزیز عن انسؓ

۳۔ بخاری ابواب بزم معونہ روایت ابو طلحہ عن انسؓ ۴۔ ابن ہشام و ابن سعد

۵۔ ابن ہشام ۶۔ بخاری حالات بزم معونہ روایت ہشام بن عروہ عن عروہ

وہ شخص پہنچے۔ ایک ہی عمرو بن امیہ ضمری اور دوسرے کعب بن زید جسے کفار نے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا یہ  
بہر معونہ کے موقع پر شہید ہونے والے صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام اور اسلام کے دیرینہ  
خدائی عاصر بن فہیرہ بھی تھے یہ انہیں ایک شخص جبار بن سلمیٰ نے قتل کیا تھا یہ جبار بعد میں مسلمان ہو گیا اور  
وہ اپنے مسلمان ہونے کی وجہ یہ بیان کرتا تھا کہ جب میں نے عمرو بن فہیرہ کو شہید کیا تو ان کے منہ سے  
بے اختیار نکلا کُذْتُ دَالِیْہِ۔ یعنی "خدا کی قسم میں تو اپنی مراد کو پہنچ گیا ہوں" جبار کہتے ہیں کہ میں یہ الفاظ  
شکر متعجب ہوا کہ میں نے تو اس شخص کو قتل کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں مراد کو پہنچ گیا ہوں۔ یہ کیا  
بات ہے؛ چنانچہ میں نے بعد میں لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان لوگ خدا کے  
رستے میں جان دینے کو سب سے بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں اور اس بات کا میری طبیعت پر ایسا اثر  
ہوا کہ آخر اسی اثر کے ماتحت میں مسلمان ہو گیا یہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو واقعہ ربیع اور واقعہ بہر معونہ کی اطلاع قریباً ایک ہی  
وقت میں ملی تھی اور آپ کو اس کا سخت صدمہ ہوا۔ حتیٰ کہ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ ایسا صدمہ نہ  
اس سے پہلے آپ کو کبھی ہوا تھا اور نہ بعد میں کبھی ہوا تھا واقعی قریباً آستی صحابیوں کا اس طرح دھوکے  
کے ساتھ اچانک مارا جانا اور صحابی بھی وہ جو اکثر حفاظِ قرآن میں سے تھے اور ایک غریب بے نفس طبقہ سے  
تعلق رکھتے تھے۔ عرب کے دشنام و رسم و رواج کو بے نظر رکھتے ہوئے بھی کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور خود  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو یہ خبر گویا آستی بیٹوں کی وفات کی خبر کے مترادف تھی بلکہ اس سے بھی  
بڑھ کر؛ کیونکہ ایک روحانی انسان کے لیے روحانی رشتہ یقیناً اس سے بہت زیادہ عزیز ہوتا ہے  
جتنا کہ ایک دنیا دار شخص کو دنیاوی رشتہ عزیز ہوتا ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حادثات  
کا سخت صدمہ ہوا، مگر اسلام میں بہر صورت صبر کا حکم ہے آپ نے یہ خبر سن کر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ  
رَاجِعُونَ پڑھا اور پھر یہ الفاظ فرماتے ہوئے خاموش ہو گئے کہ هٰذَا عَمَلُ اٰیْحِنَا بَرَاءٌ وَقَدْ  
کُنْتُ لِهٰذَا نَحَارُهَا مُتَخَوِّفًا۔ یعنی یہ ابوبکر کے کام کا ثمرہ ہے ورنہ میں تو ان لوگوں کے بھوانے  
کو پسند نہیں کرتا تھا اور اہل نجد کی طرف سے ڈرتا تھا

واقعات بہر معونہ اور ربیع سے قبائل عرب کے اس انتہائی درجہ کے بغض و عداوت کا پتہ چلتا ہے  
جو وہ اسلام اور متبعین اسلام کے متعلق اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کو اسلام کے خلاف

۱۔ ابن ہشام ۲۔ بخاری حالات بہر معونہ روایت عائشہ ۳۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸۸ ۴۔ ابن ہشام حالات

بہر معونہ واسد الغابہ حالات جبار بن سلمیٰ ۵۔ زرقانی ۶۔ بخاری کتاب الجہاد باب دعاء الامام علی بن ابی طالب

۷۔ دشل ربیع کے اور ستر بہر معونہ کے ۸۔ ابن ہشام

ذیل ترین قسم کے جھوٹ اور دغا اور فریب سے بھی کوئی پرہیز نہیں تھا اور مسلمان باوجود اپنی کمال ہوشیاری اور بیدار مغزی کے بعض اوقات اپنی مومنانہ حسن فطرت میں ان کے دام کا شکار ہو جاتے تھے۔ حفاظ قرآن۔ نماز گزار تہجد خوان مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ کا نام لینے والے اور پھر غریب مفلس فاقوں کے مائے ہونے یہ وہ لوگ تھے جن کو ان ظالموں نے دین سیکھنے کے بہانے سے اپنے وطن میں بلایا اور پھر جب مکان کی حیثیت میں وہ ان کے وطن میں پہنچے تو انکو نہایت بے رحمی کے ساتھ تہ تیغ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا جتنا بھی صدمہ ہوتا کم تھا مگر اُس وقت آپ نے رنج و غم اور بے مہمونی کے غمگینی قاتلوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں فرمائی، البتہ اس خبر کے آنے کی تاریخ سے لے کر برابر تیس دن تک آپ نے ہر روز صبح کی نماز کے قیام میں نہایت گریہ و زاری کے ساتھ قبائل رعل اور ذکوان اور عیسہ اور بنو لیحان کا نام لے لے کر خدا تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی اے میرے آقا تو ہماری حالت پر رحم فرما اور دشمنان اسلام کے ہاتھ کو روک جو تیرے دین کو مٹانے کے لیے اس بے رحمی اور سنگدل کے ساتھ بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔

# یہود کی دوسری غداری۔ جمع و ترتیب قرآن حضرت زینبؓ کی شادی۔ واقعہ افک اور منافقین کی فتنہ پر دازی

اخراج بنو نضیر۔ ربیع اول ۳۸ھ

جب کسی قوم کے بڑے دن آتے ہیں تو پھر اس کی  
بینائی کم ہو جاتی ہے اور واقعات سے سبق اور عبرت

ماصل کرنے کی طرف وہ توجہ نہیں کرتی، چنانچہ بنو قینقاع کے جلا وطن کئے جانے پر بھاتے اس کے کہ یہود  
کے باقی ماندہ دو قبیلے عبرت حاصل کرتے اور اپنی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں سے باز آ جاتے اور مسلمانوں کو  
امن کی زندگی بسر کرنے دیتے اور خود بھی امن کے ساتھ رہتے، انھوں نے اپنا رقیہ تبدیل نہ کیا اور مسلمانوں  
کے خلاف اندر ہی اندر فتنے کے شرار سے پیدا کرتے رہے اور قریش مکہ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے برابر  
ساز باز جاری رکھی۔ بلکہ بنو قینقاع کے بعد ان کی عداوت اور بھی ترقی کر گئی اور ان کے منصوبے دن بدن  
زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتے گئے، چنانچہ ابھی واقعات ربیع اور بصر معونہ پر زیادہ دن نہیں گزرے  
تھے کہ حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حفاظتی کے خیال سے  
مجبور ہو کر بنو نضیر کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی جس کے نتیجہ میں بالآخر یہ قبیلہ بھی مدینہ سے جلا وطن ہو گیا۔  
اس غزوہ کا سبب بیان کرتے ہوئے ارباب حدیث دسیر مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں اور اس  
اختلاف کی وجہ سے اس غزوہ کے زمانہ کے متعلق بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ابن اسحاق اور ابن  
سعد جن کی اتباع میں نے اس جگہ بلا کسی خاص تحقیق کے اختیار کی ہے۔ غزوہ بنو نضیر کو غزوہ اُحد  
اور واقعہ بصر معونہ کے بعد بیان کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ لکھتے ہیں کہ عمرو بن امیہ صغریٰ جنہیں کفار نے  
بصر معونہ کے موقع پر قید کر کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ جب واپس مدینہ کی طرف آرہے تھے تو انہیں راستہ میں  
قبیلہ بنو عامر کے دو آدمی ملے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کر چکے تھے، چونکہ عمرو کو اس



عہد و پیمان کا علم نہیں تھا اس لیے اُس نے موقع پا کر ان دو آدمیوں کو شہداء بے رحمی کے بدلے میں قتل کر دیا جن کے قتل کا باعث قبیلہ بنو عامر کا ایک رئیس عامر بن طفیل ہوا تھا۔ گویا کہ بیان کیا جا چکا ہے خود قبیلہ بنو عامر کے لوگ اس قتل و غارت سے دست کش رہے تھے۔ جب عمرو بن اُمیہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سارا ماجرا عرض کیا اور ان دو آدمیوں کے قتل کا واقعہ بھی سنایا۔ آپ کو جب ان دو آدمیوں کے قتل کی اطلاع ہوئی تو آپ عمرو بن اُمیہ کے اس فعل پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ وہ تو ہمارے معاہدہ تھے۔ اور آپ نے فوراً ان ہر دو مقتولین کا خون بہا ان کے ورثاء کو بھجوا دیا، لیکن چونکہ قبیلہ بنو عامر کے لوگ بنو نضیر کے بھی حلیف تھے اور بنو نضیر مسلمانوں کے حلیف تھے اس لیے معاہدہ کی رُو سے اس خون بہا کا بار حصہ رسی بنو نضیر پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ آپ اپنے چند صحابیوں کو ساتھ لیکر بنو نضیر کی آبادی میں پہنچے اور ان سے یہ سارا واقعہ بیان کر کے خون بہا کا حصہ مانگا۔ انھوں نے بظاہر آپ کے تشریف لانے پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ تشریف رکھیں ہم ابھی اپنے حصہ کا روپیہ ادا کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ مع اپنے چند اصحاب کے ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے اور بنو نضیر باہم مشورہ کے لیے ایک طرف ہو گئے اور ظاہر یہ کیا کہ ہم روپے کی فراہمی کا انتظام کر رہے ہیں لیکن بجائے روپے کا انتظام کرنے کے انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ یہ ایک بہت ہی اچھا موقع ہے۔ محمد (ﷺ) مکان کے سایہ میں دیوار کے ساتھ بگے بیٹھے ہیں کوئی شخص دوسری طرف مکان پر چڑھ جاوے اور پھر ایک بڑا پتھر آپ کے اوپر گرا کر آپ کا کام تمام کر دے۔ یہودیوں سے ایک شخص سلام بن مشکم نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اور کہا کہ یہ ایک فحاشی کا فعل ہے اور اس عہد کے خلاف ہے جو ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر چکے ہیں، مگر ان لوگوں نے نہ مانا۔ اہل بالآخر عمرو بن جحاش نامی ایک یہودی ایک بہت بھاری پتھر لے کر مکان کے اوپر چڑھ گیا اور قریب تھا کہ وہ اس پتھر کو اوپر سے لڑھکا دیتا۔ مگر روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے یہود کے اس بد ارادے سے بذریعہ وحی اطلاع دے دی۔ اور آپ جلدی سے وہاں سے اٹھ آئے اور ایسی جلدی میں اُٹھے کہ آپ کے اصحاب نے بھی اور یہود نے بھی یہ سمجھا کہ شاید آپ کسی حاجت کے خیال سے اُٹھ گئے ہیں، چنانچہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے آپ کا انتظار کرتے رہے، لیکن آپ وہاں سے اُٹھ کر سیدھے مدینہ میں تشریف لے آئے۔ صحابہ نے تھوڑی دیر آپ کا انتظار کیا، لیکن جب آپ واپس تشریف نہ لائے تو وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور آپ کو ادھر ادھر تلاش کرتے ہوئے بالآخر خود بھی مدینہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہود کی اس خطرناک سازش کی اطلاع دی، یہودی اور پھر قبیلہ ادس کے ایک رئیس محمد بن مسلمہ کو

بلا کر فرمایا کہ تم بنو نضیر کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ اس معاملہ کے متعلق بات چیت کرو اور ان سے کہو کہ چونکہ وہ اپنی شہر اتوں میں بہت بڑھ گئے ہیں اور ان کی غداری انتہا کو پہنچ گئی ہے اس لیے اب انکا مدینہ میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ وہ مدینہ کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر آباد ہو جائیں اور آپ نے انکے لیے دس دن کی معیاد مقرر فرمائی۔

محمد بن مسلمہ جب ان کے پاس گئے تو وہ سامنے سے بڑے تیز سے پیش آئے اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دو کہ ہم مدینہ سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تم نے جو کرنا ہو کر لو۔ جب ان کا یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تو آپ نے بے ساختہ فرمایا: اللہ اکبر یہود تو جنگ کے لیے تیار بیٹھے ہیں اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا اور صحابہ کی ایک جمیعت کو ساتھ لیکر بنو نضیر کے خلاف میدان میں نکل آئے یہ

یہ وہ روایت ہے جس کی اکثر مؤرخین نے اتباع کی ہے۔ حتیٰ کہ یہی روایت تاریخ میں عام طور پر شائع اور متعارف ہو گئی ہے، لیکن اس کے مقابل پر امام زہری کی یہ روایت صحیح احادیث میں مروی ہوئی ہے کہ جنگ بدر کے بعد مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خاص طور پر کس سال اور کس ماہ میں مکہ کے رؤسار نے بنو نضیر کو یہ خط لکھا تھا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرو؛ ورنہ ہم تمہارے خلاف جنگ کریں گے اس پر بنو نضیر نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ کسی حکمت عملی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے اور اس کے لیے انھوں نے یہ تجویز کی کہ آپ کو کسی بہانہ سے اپنے پاس بلائیں اور وہاں موقعہ پا کر آپ کو قتل کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کے ساتھ اپنے علماء کا مذہبی تبادلہ خیالات کر دانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم پر آپ کی صداقت ظاہر ہو گئی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ پس آپ مہربانی کر کے اپنے کوئی سے تیس اصحاب کو ساتھ لے کر تشریف لے آئیں۔ ہماری طرف سے بھی تیس علماء ہوں گے اور پھر باہم تبادلہ خیالات ہو جائیگا۔ ایک طرف تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھیجا اور دوسری طرف یہ تجویز پختہ کر کے اس کے مطابق پوری پوری تیاری کر لی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو یہی یہودی "علماء" جن کے پاس خنجر پس پوشیدہ ہوں موقعہ پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں مگر قبیلہ بنو نضیر کی ایک عورت نے ایک انصاری شخص کو جو رشتہ میں اس کا بھائی لگتا تھا اپنے قبیلہ والوں کے اس بد ارادے سے بروقت اطلاع دیدی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ابھی گھر سے نکلے ہی تھے یہ اطلاع پا کر واپس تشریف لے آئے یہ اور فوراً تیاری

لے ابن سعد و ابن ہشام نے وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت دینے

کے لیے سب سے زیادہ آسان اور پختہ ذریعہ مذہبی تبلیغ کا بہانہ ہو سکتا ہے۔

ابو داؤد کتاب الخراج باب النضیر ابن مردودہ بحوالہ زرقانی حالات بنو نضیر

کا حکم دیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر بنو نضیر کے قلعوں کی طرف روانہ ہو گئے اور جاتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور پھر ان کے رؤسا کو پیغام بھیجا کہ جو حالات ظاہر ہوتے ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں تمہیں مدینہ میں رہنے نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ تم از سر نو میرے ساتھ معاہدہ کر کے مجھے یقین نہ دلاؤ کہ آئندہ تم بدعہدی اور غداری نہیں کرو گے۔ مگر یہود نے معاہدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح جنگ کی ابتداء ہو گئی اور بنو نضیر نہایت متروانہ طریق پر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ دوسرے دن آپ کو یہ اطلاع ملی یا آپ نے قرآن سے خود معلوم کر لیا کہ یہود کا دوسرا قبیلہ بنو قریظہ بھی کچھ بگڑ بیٹھا ہے؛ چنانچہ آپ صحابہ کے ایک دستہ کو ساتھ لیکر بنو قریظہ کے قلعوں کی طرف روانہ ہوئے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ نے جب دیکھا کہ راز کھل گیا ہے تو وہ ڈر گئے اور معافی کے خواستگار ہو کر از سر نو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن و امان اور باہمی اعانت کا معاہدہ کر لیا جس پر آپ نے ان کا محاصرہ اٹھا لیا اور پھر بنو نضیر کے قلعوں کی طرف تشریف لے آئے، لیکن بنو نضیر بدستور اپنی ضد اور عداوت پر اڑے رہے اور ایک باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔

یہ وہ دو مختلف روایتیں ہیں جو غزوہ بنو نضیر کے باعث کے متعلق بیان کی گئی ہیں اور گو تاریخی لحاظ سے مؤخر الذکر روایت زیادہ درست اور صحیح ہے اور دوسری احادیث میں بھی زیادہ تر اسی روایت کی تائید پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ پہلی روایت کو مؤرخین نے زیادہ کثرت کے ساتھ قبول کیا ہے اور بعض صحیح احادیث میں بھی اس کی صحت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے؛ چنانچہ امام بخاری نے باوجود زہری کے قول کو ترجیح دینے کے قبیلہ عامر کے دو مقتولوں کی دیت کا بھی ذکر کیا ہے یہ اس لیے ہماری رائے میں اگر دونوں روایتوں کو صحیح سمجھ کر ملا لیا جاوے تو کوئی ہرج لازم نہیں آتا؛ البتہ اس غزوہ کے زمانہ کے متعلق ان روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینی پڑے گی۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے ہر دو روایات کو صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر کی طرف مختلف مواقع پر مختلف اسباب جنگ کے پیدا ہوتے رہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ڈھیل دیتے رہے اور درگزر سے کام فرمایا۔ لیکن جب آخری سبب بمرعونہ کے واقعہ کے بعد ہوا، تو آپ نے انہیں ان کی ساری کارروائیاں بچھڑا کر ان کے خلاف فوج کشی فرمائی۔ گویا یہ جتنے مختلف اسباب بیان ہوتے ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہ درست تھے مگر آخری تحریر سبب وہ تھا جو بنو عامر کے دو مقتولوں کی دیت کے مطالبہ کے وقت پیش آیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کعب بن اشرف جس کے قتل کا ذکر اوپر گزر چکا ہے

اور جس نے مسلمانوں کے خلاف گویا ایک آگ بھڑکار کھی تھی وہ بھی بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا۔

بہر حال یہود کے قبیلہ بنو نضیر نے خلافت ہمدی اور غداری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ باندھا اور جب ان سے یہ کہا گیا کہ ان حالات میں تمہارا مدینہ میں رہنا ٹھیک نہیں ہے تم یہاں سے چلے جاؤ تو انھوں نے تردد اور سرکشی سے کام لیا اور تجدید معاہدہ سے انکار کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اس لیے مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے خلاف میدان میں نکلنا پڑا؛ چنانچہ آپ نے اپنے پیچھے مدینہ کی آبادی میں ابن مکتوم کو امام صلوٰۃ مقرر فرمایا اور خود صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ سے نکل کر بنو نضیر کی بستی کا محاصرہ کر لیا اور بنو نضیر اس زمانہ کے طریقی جنگ کے مطابق قلعہ بند ہو گئے۔ غالباً اسی موقع پر عبداللہ بن ابی بن سلول اور دوسرے منافقین مدینہ نے بنو نضیر کے روسار کو یہ کہلا بھیجا کہ تم مسلمانوں سے ہرگز نہ دبا، ہم تمہارا ساتھ دینگے اور تمہاری طرف سے لڑینگے لیکن جب عملاً جنگ شروع ہوتی تو بنو نضیر کی توقعات کے خلاف ان منافقین کو یہ جرات نہ ہوتی کہ حکم کھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف میدان میں آئیں۔ اور نہ بنو قریظہ کو یہ ہمت پڑی کہ مسلمانوں کے خلاف میدان میں آکر بنو نضیر کی بر ملا مدد کریں۔ گودل میں وہ ان کے ساتھ تھے اور دہر پردہ ان کی امداد بھی کرتے تھے جس کا مسلمانوں کو علم ہو گیا تھا۔ یہ بہر حال بنو نضیر کھلے میدان میں مسلمانوں کے مقابل پر نہیں نکلے اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، لیکن چونکہ ان کے قلعے اس زمانہ کے لحاظ سے بہت مضبوط تھے اس لیے ان کو اطمینان تھا کہ مسلمان ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے اور آخر خود تنگ آکر محاصرہ چھوڑ جائیں گے اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت ایسے قلعوں کا فتح کرنا واقعی ایک بہت مشکل اور پُر از مشقت کام تھا اور ایک بڑا طویل محاصرہ چاہتا تھا؛ چنانچہ کئی دن تک مسلمان برابر محاصرہ کئے رہے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جب محاصرہ پر چند دن گذر گئے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بنو نضیر بدستور مقابلہ پر ڈٹے رہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ بنو نضیر کے ان کھجوروں کے درختوں میں سے جو قلعوں کے باہر تھے بعض درخت کاٹ دیئے جائیں۔ یہ درخت جو کانٹے گئے لینہ قسم کی کھجور کے درخت تھے کہ جو ایک ادنیٰ قسم کی کھجور تھی جس کا پھل عموماً انسانوں کے کھانے کے کام نہیں آتا تھا۔ اور اس حکم میں منشاء یہ تھا کہ تا ان درختوں کو کٹا دیکھ کر بنو نضیر مرعوب ہو جائیں۔ اور اپنے قلعوں کے دروازے کھول دیں۔ اور اس طرح چند درختوں کے نقصان سے بہت سی انسانی جانوں کا نقصان اور ملک کا فتنہ و فساد ترک جائے؛ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور

۱۔ ابن ہشام ۲۔ بخاری حدیث بنی النضیر و مسلم باب اخراج الیہود

۳۔ ابن ہشام و ابن سعد ۴۔ قرآن شریف سورۃ حشر: ۶

۵۔ الروض الائف شرح سیرۃ ابن ہشام



ابھی صرف چھ درخت ہی کاٹے گئے تھے کہ بنو نضیر نے غائبانہ خیال کر کے کہ شاید مسلمان ان کے سارے درخت ہی جن میں پھلدار درخت بھی شامل تھے، کاٹ ڈالیں گے آہ و بیکار شروع کر دی۔ حالانکہ جیسا کہ قرآن شریف میں تشریح کی گئی ہے صرف بعض درخت اور وہ بھی لینہ قسم کے درخت کاٹنے کی اجازت تھی اور باقی درختوں کے محفوظ رکھنے کا حکم تھا اور ویسے بھی عام حالات میں مسلمانوں کو دشمن کے پھلدار درخت کاٹنے کی اجازت نہیں تھی یہ بہر حال یہ تدبیر کارگر ہوئی اور بنو نضیر نے مرعوب ہو کر پندہ دن کے محاصرہ کے بعد اس شرط پر قلعہ کے دروازے کھول دیئے کہ ہمیں یہاں سے اپنا ساز و سامان لے کر امن و امان کے ساتھ جانے دیا جائے یہ وہی شرط تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پہلے پیش کر چکے تھے اور چونکہ آپ کی نیت محض قیام امن تھی آپ نے مسلمانوں کی اس تکلیف اور ان اخراجات کو نظر انداز کرتے ہوئے جو اس مہم میں ان کو برداشت کرنے پڑے تھے اب بھی بنو نضیر کی اس شرط کو مان لیا اور محمد بن مسلمہ صحابی کو مقرر فرمایا کہ وہ اپنی نگرانی میں بنو نضیر کو امن و امان کے ساتھ مدینہ سے روانہ کر دیں چنانچہ بنو نضیر بڑے ٹھانڈے اور شان و شوکت سے اپنا ساز و سامان سچی کد خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانوں کو سمار کر کے ان کے دروازے اور چوکھٹیں اور لکڑی تک اکھیر کر اپنے ساتھ لے گئے یہ اور کچھ ہے کہ یہ لوگ مدینہ سے اس جشن اور دھوم دھام کے ساتھ گاتے بجاتے ہوئے نکلے کہ جیسے ایک برات نکلتی ہے البتہ ان کا سامان حرب اور جائیداد وغیرہ منقولہ یعنی باقی وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور چونکہ یہ مال بغیر کسی عملی جنگ کے ملا تھا اس لیے شریعت اسلامی کی رو سے اس کی تقسیم کا اختیار خالصتہ رسول اللہ کے ہاتھ میں تھا اور آپ نے یہ اموال زیادہ تر ان غریب مہاجرین میں تقسیم فرمادیئے جن کے گزارہ جات کا بوجھ ابھی تک اس ابتدائی سلسلہ مواخاسات کے تحت انصار کی جائیداد پر تھا اور اس طرح بالواسطہ انصار بھی اس مالِ فقیمت کے حصہ دار بن گئے!

جب بنو نضیر محمد بن مسلمہ صحابی کی نگرانی میں مدینہ سے کوچ کر رہے تھے تو بعض انصار نے ان لوگوں کو ان کے ساتھ جانے سے روکنا چاہا جو درحقیقت انصار کی اولاد سے تھے مگر ان کے منت ماننے کے نتیجہ میں یہودی ہو چکے تھے اور بنو نضیر ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، لیکن چونکہ انصار کا یہ مطالبہ اسلامی حکم لاکہ فی الدین یعنی (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہ ہونا چاہیے) کے خلاف تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے خلاف اور یہود کے حق میں فیصلہ کیا

۱۔ زرقانی ۲۔ تفسران شریف سورۃ حشر: ۶ ۳۔ موطا امام مالک کتاب الجہاد  
 ۴۔ ابن ہشام و ابن سعد ۵۔ ابن سعد ۶۔ زرین کمالہ تلخیص الصحاح جلد ۱ سورۃ حشر ۷۔ طبری  
 ۸۔ ابوداؤد باب خبر النضیر ۹۔ ابن ہشام  
 ۱۰۔ تفسران شریف سورۃ بقرہ: ۲۵۷



اور فرمایا کہ جو شخص بھی یہودی ہے اور جانا چاہتا ہے ہم اُسے نہیں روک سکتے یہ البتہ بنو نضیر میں سے دُوداؤی خود اپنی خوشی سے مسلمان ہو کر مدینہ میں ٹھہر گئے یہ

ایک روایت آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ شام کی طرف چلے جائیں۔ یعنی عرب میں نہ ٹھہریں، لیکن باوجود اس کے اُن کے بعض سردار مثلاً سلام بن ابی الحقیق اور کنانہ بن ربیع اور جُشی بن اخطب وغیرہ اور ایک حصہ عوام کا بھی حجاز کے شمال میں یہودیوں کی مشورہ پر خیبر میں جا کر مقیم ہو گیا اور خیبر والوں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی تیر اور جیسا کہ آگے چل کر اپنے موقع پر بیان ہو گا یہ لوگ بالآخر مسلمانوں کے خلاف خطرناک فتنہ انگیزی اور اشتعال جنگ کا باعث بنے۔ بنو قریظہ جنہوں نے اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غداری کر کے اور اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر بنو نضیر کی اعانت کی تھی اُن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کیا اور معاف فرما دیا تیر گران بد بخوتوں نے اس احسان کا جو بدلہ دیا اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غزوہ بنو نضیر کا واقعہ قرآن کریم کی سورۃ حشر میں بیان ہوا ہے جو قریباً ساری کی ساری سورۃ اسی غزوہ کے متعلق ہے۔

**حضرت اُمّ المؤمنین زینب بنت خزیمہ** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چھوٹی زاد بھائی تھے جنکا نام عبد اللہ بن جحش تھا۔ وہ

جنگ اُحد میں شہید ہو گئے اور ان کی بیوی زینب بنت خزیمہ بیوگی کی حالت میں بے سہارا رہ گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلہ رحمی میں ایک بے نظیر نمونہ رکھتے تھے خود اپنی طرف سے زینب بنت خزیمہ کو نکاح کا پیغام بھیجا اور ان کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر ان کو اپنے عقد میں لے لیا۔ اس وقت زینب بنت خزیمہ کی عمر کم و بیش تینس سال کی تھی، مگر ان کی شادی پر ابھی صرف چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ربیع الآخر سنہ ۳ میں وہ انتقال کر گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت البقیع میں دفن فرمایا۔ زینب بنت خزیمہ ایک بہت نیک اور پارسا بی بی تھیں اور اپنے صدقہ و خیرات اور غرباء پروری کی وجہ سے عام طور پر اُمّ المساکین کے نام سے مشہور تھیں۔

**ولادت حسینؑ شعبان سنہ ۴** اسی سال ماہ شعبان میں حضرت فاطمہؑ کے ہاں دُوداؤی پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین رکھا۔

حسین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح عزیز تھے جیسا کہ ان کے بھائی حسن تھے۔ چنانچہ بعض اوقات

۱۔ ابوداؤد کتاب الجہاد ۱۷ ابن ہشام ۱۷ طبری ۱۷ بخاری حدیث بنی النضیر و مسلم باب اہل ماہ الیہود

۲۔ زرقانی جلد ۳ حالات زینب بنت خزیمہ نیز اصحابہ فی معرفۃ الصحابہ

آپ محبت میں ان دونوں کو اپنے دُ پھول کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے یہ وہی امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں جو یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کے زمانہ میں ۳۱ھ کے ماہ محرم کی دسویں تاریخ کو ایک مظلوم حالت میں شہید ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ اور جن کی شہادت کی یاد میں شیعہ لوگ آج تک ماتم کرتے اور تعزیتے نکالتے ہیں۔

**غزوہ بدر الموعود ووقعہ** جنگ اُحد کے حالات میں یہ ذکر گزر چکا ہے کہ میدان سے لوٹتے ہوئے ابوسفیان نے مسلمانوں کو یہ چیلنج دیا تھا کہ آئندہ

سال بدر کے مقام پر ہماری تمہاری جنگ ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیلنج کو قبول کرنے کا اعلان فرمایا تھا۔ اس لیے دوسرے سال یعنی ۳۲ھ ہجری میں جب شوال کے مہینہ کا آخر آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کی جمیعت کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے اور آپ نے اپنے پیچھے عبداللہ بن عبد اللہ بن ابی کو امیر مقرر فرمایا۔

دوسری طرف ابوسفیان بن حرب بھی دُ ہزار قریش کے لشکر کے ساتھ مکہ سے نکلا مگر باوجود اُحد کی فتح اور اتنی بڑی جمیعت کے ساتھ ہونے کے اس کا دل خائف تھا اور اسلام کی تباہی کے درپے ہونے کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ جب تک بہت زیادہ جمیعت کا انتظام نہ ہو جاوے وہ مسلمانوں کے سامنے نہ ہو۔ چنانچہ ابھی وہ مکہ میں ہی تھا کہ اُس نے ایک شخص نعیم نامی کو جو ایک غیر جانبدار قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، مدینہ کی طرف روانہ کر دیا اور اُسے تاکید کی کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر اور جھوٹ پر سچ باتیں بنا کر جنگ سے نکلنے کے لیے باز رکھے، چنانچہ یہ شخص مدینہ میں آیا اور قریش کی تیاری اور طاقت اور انکے جوش و خروش کے جھوٹے قصے سنا سنا کر اُس نے مدینہ میں ایک بے چینی کی حالت پیدا کر دی جتنی کہ بعض کمزور طبیعت لوگ اس غزوہ میں شامل ہونے سے خائف ہونے لگے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلنے کی تحریک فرمائی اور آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہم نے کفار کے چیلنج کو قبول کر کے اس موقع پر نکلنے کا وعدہ کیا ہے، اس لیے ہم اس سے مختلف نہیں کر سکتے اور خواہ مجھے اکیلا جانا پڑے میں جاؤں گا اور دشمن کے مقابل پر اکیلا سینہ سپر ہوں گا، تو لوگوں کا خوف جاتا رہا اور وہ بڑے جوش اور اخلاص کے ساتھ آپ کے ساتھ نکلنے کو تیار ہو گئے۔

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور دوسری طرف ابوسفیان اپنے دُ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ مکہ سے نکلا، لیکن خدائی تصرف کچھ ایسا ہوا کہ مسلمان تو بدر میں

لپٹے وعدہ پر پہنچ گئے مگر قریش کا لشکر تھوڑی دُور آکر پھر مکہ کو واپس لوٹ گیا۔ اور اس کا قصہ یوں ہوا کہ جب ابوسفیان کو نعیم کی ناکامی کا علم ہوا تو وہ دل میں خائف ہوا اور اپنے لشکر کو یہ تلقین کرتا ہوا راستہ سے لوٹا کہ واپس لے گیا کہ اس سال قحط بہت ہے اور لوگوں کو تنگی ہے اس لیے اس وقت لڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب کشائش ہوگی تو زیادہ تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کریں گے۔

اسلامی لشکر آٹھ دن تک بدر میں ٹھہرا اور چونکہ وہاں ماہ ذوقعدہ کے شروع میں ہر سال میلہ لگاتا تھا۔ ان آیام میں بہت صحابیوں نے اس میلہ میں تجارت کر کے کافی نفع کمایا۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس آٹھ روزہ تجارت میں اپنے اس المال کو دوگنا کر لیا۔ جب میلے کا اختتام ہو گیا اور لشکر قریش نہ آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے کوچ کر کے مدینہ میں واپس تشریف لے آئے اور قریش نے مکہ میں واپس ہٹ چکے۔ مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں یہ غزوہ بدر الموعود کہلاتا ہے۔

### تزوج اُم سلمہ شوال سنہ

اسی سال ماہ شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم سلمہ سے شادی فرمائی یہ اُم سلمہ قریش کے

ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور اس سے پہلے ابوسلمہ بن عبدالاسد کے عقد میں تھیں جو ایک نہایت مخلص اور پُرانے صحابی تھے اور اسی سال فوت ہوئے تھے۔ جب اُم سلمہ کی عدت (یعنی وہ میعاد جو اسلامی شریعت کی رو سے ایک بیوہ یا مطلقہ عورت پر گذرنی ضروری ہوتی ہے) پشیر اس کے کہ وہ نکاح ثانی کرے) گذر گئی تو چونکہ اُم سلمہ ایک نہایت بھلاہر باسیلہ اور قابل خاتون تھیں اس لیے حضرت ابو بکر کو ان کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش پیدا ہوئی یہ مگر اُم سلمہ نے انکار کیا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے لیے اُن کا خیال آیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُم سلمہ کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ جن کی وجہ سے وہ ایک شاعر نبی کی بیوی بننے کی اہل تھیں وہ ایک بہت بڑے پائے کے قدیم صحابی کی بیوہ تھیں اور پھر صاحب اولاد بھی تھیں جس کی وجہ سے ان کا کوئی خاص انتظام ہونا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ ابوسلمہ بن عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پسندگان کا خاص خیال تھا۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم سلمہ کو اپنی طرف سے شادی کا پیغام بھیجا۔ پہلے تو اُم سلمہ نے اپنی بعض معذوریوں کی وجہ سے کچھ تاہل کیا اور یہ عذر بھی پیش کیا کہ میری عمر اب بہت زیادہ ہو گئی ہے اور میں اولاد کے قابل نہیں رہی یہ لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عرض

۱۔ ابن ہشام وابن سعد ۲۔ ابن سعد ۳۔ طبری و زرقانی جلد ۳ حالات اُم سلمہ

۴۔ نسائی کتاب النکاح باب النکاح الابن امہ بخاری کتاب النکاح باب وان تجمعا بین الاختین

۵۔ نسائی بحوالہ اصابہ و زرقانی جلد ۳ وابن سعد جلد ۲ حالات اُم سلمہ

اور تھی اس لیے بالآخر وہ رضامند ہو گئیں اور اُن کی طرف سے اُن کے روکے نے ماں کا ولی ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُن کی شادی کر دی۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اُمّ سلمہ ایک خاص پائے کی خاتون تھیں اور نہایت فہیم اور ذکی ہونے کے علاوہ اخلاص و ایمان میں بھی ایک اعلیٰ مرتبہ رکھتی تھیں اور ان لوگوں میں سے تھیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابتداءً حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ مدینہ کی ہجرت میں بھی وہ سب مستورات سے اقل نمبر پر تھیں اُمّ سلمہ حضرت اُمّ سلمہ پڑھنا بھی جانتی تھیں۔ اور مسلمان مستورات کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے خاصہ حصہ لیا؛ چنانچہ کتب حدیث میں بہت سی روایات اور احادیث ان سے مروی ہیں اور اس جہت سے ان کا درجہ ازواج النبی میں دوسرے نمبر پر اور کُل صحابہ (مرد و زن) میں بارہویں نمبر پر ہے۔ حضرت اُمّ سلمہ نے بہت لمبی عمر پائی اور یزید بن معاویہ کے زمانہ میں ۸۴ سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ اور وہ اصحاب المؤمنین میں سب سے آخری فوت ہونے والی تھیں۔ چونکہ حضرت اُمّ سلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سب سے بڑی عمر کی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ شادی کی وقت اولاد پیدا کرنے کے بھی ناقابل ہو چکی تھیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جو دورہ آپ اپنی بیویوں کے گھروں میں دریافت خیریت کے لیے روزانہ عصر کی نماز کے بعد فرمایا کرتے تھے اس میں سب سے پہلے آپ حضرت اُمّ سلمہ کے پاس تشریف لے جاتے اور سب سے آخر میں حضرت عائشہ کے گھر میں جاتے تھے جو عمر میں سب سے چھوٹی تھیں اور پھر اس کے بعد جس بیوی کی باری ہوتی تھی اسکے گھر تشریف لے جاتے تھے۔

### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب خاص اور عبرانی کی تعلیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت کا سلسلہ اب وسیع ہو رہا تھا اور اس

بات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ آپ کا کوئی مخلص صحابی عبرانی سے بھی واقفیت پیدا کرے تاکہ یہود کے ساتھ خط و کتابت اور معاہدات وغیرہ کی تکمیل میں آسانی ہو اور دھوکے وغیرہ کا احتمال نہ رہے چنانچہ اس غرض سے آپ نے اپنے ایک نوجوان صحابی زید بن ثابت انصاری سے جنہوں نے جنگ بدر کے قیدیوں سے عربی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا اور جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب خاص یا پرائیویٹ سیکرٹری کا کام کرتے تھے، ارشاد فرمایا کہ وہ عبرانی کا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیں۔ چنانچہ زید نے جو خاص طور پر ذہین واقع ہوئے تھے صرف پندرہ دن کی محنت سے عبرانی سیکھ لی۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ وہی زید بن ثابت ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ان کے حکم کے ماتحت قرآن شریف کو



ایک مصحف یعنی کتاب کی صورت میں جمع کر کے لکھا ہے

## جمع قرآن

ہم نے جو اوپر یہ لکھا ہے کہ زید بن ثابت انصاری نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن کریم کو مصحف کی صورت میں جمع کر کے لکھا تھا۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن مجید جمع نہیں تھا بلکہ حق یہ ہے کہ قرآن کریم جوں جوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا جاتا تھا، آپؐ الہی تقسیم کے ماتحت اُسے ترتیب دیکر نہ صرف خود اُسے یاد کرتے جاتے تھے بلکہ بہت دوسرے صحابہ کو بھی یاد کرا دیتے تھے اور جو صحابہ اس معاملہ میں زیادہ ماہر تھے اُن کا آپؐ نے یہ فرض مقرر کیا تھا کہ وہ دوسروں کو سکھائیں گے اور مزید احتیاط کے طور پر آپؐ اُسے ساتھ ساتھ لکھواتے بھی جاتے تھے، چنانچہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ یہی زید بن ثابت جنہوں نے بعد میں قرآن شریف کو ایک جلد کی صورت میں اکٹھا کر کے لکھا اور جو ایک غیر معمولی طور پر ذہین آدمی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآنی وحی کے قلمبند کرنے پر مامور تھے۔ اور اُن کے علاوہ بعض اور اصحاب بھی اس خدمت کو سرانجام دیتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ بن العوامؓ، شریکؓ بن حسنہؓ، عبداللہ بن سعدؓ بن ابی سرحؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن رواحہؓ وغیرہ۔ غرض قرآن مجید کے جمع و ترتیب کا حقیقی کام سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی آپؐ کی ہدایت کے ماتحت ہو گیا تھا۔ اور یہ صرف ایک قیاس ہی نہیں ہے بلکہ حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت آتی ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفانؓ خلیفہ ثالث فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ جب آپؐ پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ اپنے کاتب وحی کو بلوا کر اُسے وحی لکھوا دیتے تھے اور ساتھ ہی یہ فرما دیتے تھے کہ اُسے فلاں سورۃ میں فلاں موقعہ پر رکھو۔ اسی طرح

۱۔ بخاری باب جمع القرآن ۲۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف کا نزول قریباً تیس سال زیادہ صحیح طور پر ساڑھے تیس سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ ہوا تھا۔ اور گو درمیان میں بعض نامے ہو جاتے تھے اور بعض ایام میں زیادہ جستہ اکٹھا نازل ہو جاتا تھا، لیکن اگر حسابی طور پر قرآن شریف کی مجموعی آیات کو جو قریباً چھ ہزار دو سو چونتیس (۶۲۳۴) ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوت کے دنوں پر جو قمری حساب کے قریباً سات ہزار نو سو ستر (۷۹۰۰) بنتے ہیں پھیلا کر دیکھا جاوے تو فی یوم صرف ۷۸ یعنی ایک آیت سے بھی کم کا حساب نکلتا ہے اور یہی اس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہے کہ وَتَقْلُتُهُ مَرَّتَيْنِ لَا (سورۃ فرقان: ۳۲) یعنی ہم نے قرآن کو یکجہت نہیں اُتارا بلکہ بہت آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُتارا ہے۔

۳۔ بخاری فضائل القرآن ۴۔ بخاری کتاب فضائل القرآن باب کتاب البنی صلعم۔

۵۔ نسخ الباری جلد ۹ ص ۱۹، زرقانی جلد ۲ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۲۶



آپ خود ہی سورتوں کی ترتیب بھی فرمادیتے تھے بلکہ اور یہ طریق آپ کا ابتداء دعویٰ نبوت سے تھا؛ چنانچہ کتاب کے حصہ اول میں ہم لکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے ابتدائی سالوں میں حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے تو انہیں اسلام کی تحریک قرآن کی تلاوت سے ہی ہوئی تھی جو خباب بن الارت ایک لکھے ہوئے صحیفے سے حضرت عمرؓ کی بہن اور بیہوئی کو پڑھ کر سنا رہے تھے۔ یہ الغرض قرآن شریف شروع سے ہی ساتھ ساتھ ضبط تحریر میں آکر مرتب ہوتا اور جمع ہوتا گیا تھا۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ اپنی نمازوں میں فترآن شریف کی باقاعدہ تلاوت فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات نمازوں میں لمبی لمبی فتراتیں پڑھتے تھے؛ چنانچہ ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ آپ نے ایک ہی مسجد یعنی نصف شب کی نماز میں قرآن شریف کی پہلی پانچ سورتوں کی جو مجموعی طور پر قرآن کریم کے پنجم حصہ کے برابر بنتی ہیں اکٹھی اور بالترتیب قرأت فرمائی تھی۔ اور یہی وہ لمبے قیام ہیں جن کی وجہ سے بسا اوقات آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔ اور بعض روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ آپ ہر سال ماہ رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن شریف کا دور فرمایا کرتے تھے اور آخری سال دو دفعہ مکمل دور فرمایا۔ یہ سب باتیں اس بات کو یقینی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن شریف کی ترتیب اور جمع کا حقیقی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ پس زید بن ثابت کے جمع کرنے سے صرف یہ مراد ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کے حکم اور ان کی نگرانی کے ماتحت قرآن مجید کو ایک مصحف یعنی جلد یا کتاب کی صورت میں اکٹھا کر کے لکھا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کردہ قرآن کی ایک مستند اور یحجائی کاپی ضبط میں آ جاوے اور روایات سے پتہ لگتا ہے کہ پھر اسی مصحف بعد میں حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ثالث نے متعدد معتد نقلیں تیار کرا کے انہیں اس وقت کی اسلامی دنیا کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیا اور پھر انہی مصدقہ نقول سے آگے مزید اشاعت ہوتی گئی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں حفاظ نے قرآن کریم کو اپنے سینوں میں لفظ بلفظ محفوظ کر کے اس کی حفاظت کا ایک مزید ظاہری سبب مہیا کیا۔ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ مسلمانوں کو قرآن شریف کے حفظ کرنے کا کس قدر شوق رہا ہے صرف یہ روایت کافی ہے کہ جب ایک دفعہ کسی غرض سے حضرت عمرؓ کو قرآن کے حفاظ کے پتہ لینے کی ضرورت پیش آئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت کی اسلامی افواج کے صرف ایک دستہ میں تین سو سے زائد حفاظ قرآن تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ لوگوں میں دین کا شوق بہت کم ہو گیا ہے اسلامی دنیا میں حفاظ قرآن کی تعداد یقیناً لاکھوں سے کم نہیں ہوگی۔

۱۔ ابوداؤد و ترمذی و سنن احمد بحوالہ مشکوٰۃ کتب فضائل القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۱۹، ۲۰ و صفحہ ۳۹ ۲۔ ابن ہشام جلد ۱

صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ و زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴ ۳۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یقول الرجل فی رکوعہ

۴۔ بخاری ابواب التہجد ۵۔ بخاری کتاب فضائل قرآن باب کان جبوید یعرض القرآن

۶۔ بخاری کتاب فضائل قرآن باب جمع القرآن و فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۸۱ ۷۔ کنز العمال ج ۱۱ القرآن فضل فی فضائل القرآن۔

## ترتیب قرآن

یہ سوال کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب کسی اصول پر قائم ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس پر؟ تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی ایک تاریخی تصنیف میں اس قسم کے سوال کا تشریحی جواب دیا جاسکتا ہے مگر اس جگہ اس کے متعلق ایک مختصر اشارہ کر دینا غالباً بیسود نہ ہوگا۔ سو جاننا چاہیے کہ جیسا کہ دوست و دشمن میں مسلم ہے اور تاریخ و حدیث اس کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب اس کے نزول کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے بلکہ وہ ایک جداگانہ ترتیب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدائی تفہیم کے مطابق مقرر فرمائی تھی، چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ لِیْ عِلْمِنَا قُرْآنَ کَاجَمْعِ کَرْنَا خُود ہمارے ذمہ ہے اور ہم ہی اس کام کو سرانجام دینگے اور ظاہر ہے کہ جمع قرآن کا کام خصوصاً جبکہ اُسے نزول کی ترتیب سے ہٹا کر دوسری ترتیب میں جمع کیا گیا ہو ترتیب کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں تو صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر آیت کے نزول پر اور ہر سورۃ کے مکمل ہونے پر خود ہدایت فرماتے تھے کہ اس آیت یا سورۃ کو فلاں جگہ رکھو، اندریں حالات خواہ کسی شخص کو موجودہ قرآنی ترتیب سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن میں کوئی نہ کوئی اصول ترتیب ضرور مقصود ہے۔ دراصل غور کیا جاوے تو اصل نزول کی ترتیب کو چھوڑنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ نئی ترتیب میں کوئی نہ کوئی اصول ضرور مد نظر رکھا گیا ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ نزول کی ترتیب کو ترک کر کے کوئی اور ترتیب اختیار کی جاتی۔ مثلاً ایک ہال میں چند آدمی یکے بعد دیگرے داخل ہوتے ہیں۔ اب اگر ہال کا منتظم ان آدمیوں کے متعلق خاص اہتمام کے ساتھ یہ انتظام کرتا ہے کہ وہ داخل ہونے کی ترتیب سے بیٹھیں بلکہ انہیں کسی اور ترتیب کے ساتھ بٹھاتا ہے تو اس کا یہی فعل اس بات کی دلیل ہوگا کہ خواہ اس کا اصول ترتیب کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، مگر اس کے مد نظر کوئی نہ کوئی اصول ضرور ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ داخلہ کی ترتیب کو تبدیل کیا جاتا۔ کیونکہ کوئی ہوش و حواس رکھنے والا انسان یونہی لغو طور پر بلا وجہ کوئی کام نہیں کرتا۔

اس موقع پر اکثر یورپین محققین یہ کہا کرتے ہیں کہ ہال کے منتظم نے داخلہ کی ترتیب کو بدل کر سائزنگ کے اصول پر لوگوں کو بٹھا دیا ہے۔ یعنی قرآنی سورتوں کو ان کی لمبائی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر یہ ایک سراسر بے بنیاد اور غلط خیال ہے۔ کیونکہ اول تو ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ جمع و ترتیب کا کام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائی تفہیم کے ماتحت سرانجام دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کی طرف اس قسم کا عبث فعل کبھی بھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا فعل وہی شخص کر سکتا ہے جو عقل و خرد سے

بالکل عاری ہو۔ نزول کی ترتیب جس سے کم از کم بعض تاریخی فوائد کے حصول میں آسانی ہو سکتی تھی اسے محض اس وجہ سے ترک کرنا کہ قرآنی سورتیں لمبے اور چھوٹے ہونے کے لحاظ سے ترتیب دی جائیں جس میں کوئی بھی علمی فائدہ متصور نہیں ہے، ایک ایسا فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار ایک معمولی عقل کا آدمی بھی اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو اس سے بہت ہی بالا و ارفع ہے۔ دوسرے سورتوں کا وجود ہی جس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کسی ترتیب کا نتیجہ ہے کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں قرآن شریف سورتوں کی صورت میں نازل نہیں ہوا بلکہ آیات کی صورت میں بہت آہستہ آہستہ نازل ہوا ہے اور سورتیں آیات کے جمع ہونے سے عالم وجود میں آئی ہیں۔ علاوہ انہیں یہ بات علماً بھی بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ کس آں میں سورتوں کے لمبا چھوٹا ہونے کی ترتیب تدنظر رکھی گئی ہے اور قرآنی سورتوں کی آیات کی تعداد کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ بیسیوں شاہیں ایسی ہیں کہ بعض لمبی سورتیں ہیں جو پیچھے رکھی گئی ہیں اور بعض چھوٹی سورتیں ہیں جو پہلے آگئی ہیں اور نہ معلوم مغربی محققین اس معاملہ میں اس قدر کوتاہ نظری اور فاش غلطی کے مرتکب کس طرح ہوتے ہیں۔

الغرض اس بات میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اول قرآن شریف کی موجودہ ترتیب اس کے نزول کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ دوم۔ نہ ہی یہ ترتیب سورتوں کے طول و قصر کے لحاظ سے ہے بلکہ سوم۔ یہ کوئی اور ہی ترتیب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خدائی ارشاد کے ماتحت مقرر فرمائی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ترتیب کیا ہے؟ اس کے جواب میں اس جگہ صرف اس قدر اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن شریف جو خدا کا قول ہے اس میں اسی قسم کا اصول ترتیب تدنظر رکھا گیا ہے جو خدا کے فعل یعنی صحیفہ قدرت میں پایا جاتا ہے یعنی جس طرح اس جسمانی عالم میں دنیا کی مادی زندگی اور ترقی و بہبودی کے سامان و ذرائع مہیا کئے جا کر اس میں ایک ترتیب رکھی گئی ہے اسی طرح کی خدا کے قول یعنی قرآن شریف میں ایک ترتیب ہے جو علم النفس کے ان ابدی اصول کے ماتحت قائم کی گئی ہے جو دنیا کی اخلاقی اور تمدنی اور روحانی زندگی اور اصلاح و ترقی کے لیے بہترین اثر رکھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگوں کو اس عالم جسمانی میں کوئی ترتیب نظر نہیں آتی اسی طرح روحانی بینائی سے محروم لوگوں کو قرآنی ترتیب بھی نظر نہیں آتی۔ مگر جو لوگ گہرے مطالعہ کے عادی ہیں اور روحانی کلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے اندر ضروری بینائی اور تقدس و طہارت رکھتے ہیں وہ اس ترتیب کو علی قدر مراتب سمجھتے اور اس کے اثر کو اپنے نفوس میں محسوس کرتے ہیں۔

اس جگہ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر موجودہ ترتیب ہی اصلاح و تربیت اور روحانی تاثیر کے لحاظ سے بہترین تھی تو پھر اسی کے مطابق قرآن کا نزول کیوں نہ ہوا تا کہ صحابہ کی جماعت بھی جو قرآنی تعلیم کی سب سے پہلی حامل بنتی تھی ان اثرات سے مستفیض ہوتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے حالات اور بعد میں آنیوالے

مسلمانوں کے حالات میں اختلاف ہے صحابہ کے لیے وہی ترتیب بہترین تھی جس کے مطابق قرآن شریف نازل ہوا۔ مگر جب ایک ابتدائی جماعت قائم ہو گئی تو پھر آئندہ کے لیے مستقل طور پر وہ ترتیب بہترین تھی جو موجودہ قرآن میں پائی جاتی ہے اور یہ اختلاف دو اصول کے ماتحت ہے۔

اول تو بوجہ اس کے کہ صحابہ کی جماعت وہ پہلی جماعت تھی جو اسلامی شریعت کے مطابق قائم ہوئی اور اس سے پہلے کوئی جماعت اسلامی شریعت کی حامل نہیں تھی اور نہ ہی دنیا میں اسلامی شریعت کا وجود تھا۔ اور قرآن کے ذریعہ سے پہلے طریق تمدن کو مٹا کر ایک بالکل ہی نئے طریق تمدن کی بنیاد پڑنی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ اس وقت کے لوگوں کے سامنے ان کی ذہنیت اور ماحول کے مناسب حال قرآنی احکامات کا نزول ہوتا تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو بدلنے اور نئی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے میں آسانی پاتے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہترین صورت یہ تھی کہ سب سے پہلے اس قسم کی آیات کا نزول ہو تا جن میں صرف عقیدہ کی درستی پر نظر ہے اور مشرکانہ خیالات کو مٹا کر توحید کو قائم کیا گیا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اسلامی طریق عبادات اور اسلامی طریق معاملات اور اسلامی طریق تمدن اور اسلامی طریق سیاست کے متعلق اُدام و نواہی نازل ہوتے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے لیکن جب ایک جماعت اسلامی شریعت کی حامل تیار ہو گئی اور آئندہ پھیلاؤ اور ترقی کے لیے ایک وجود بطور تخم کے یعنی ایک نیوکلئس (NUCLEUS) تیار ہو گیا تو اب اس تخم یا نیوکلئس کی آئندہ ترقی کے لیے وہ ابتدائی ترتیب نزول غیر طبعی اور ناموزوں تھی۔ اس لیے اسے بدل کر وہ ترتیب دے دی گئی جو اس کیلئے مناسب تھی، چنانچہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب بالکل اس اصول کے ماتحت ہے جو ایک تیار شدہ جماعت کے استحکام۔ اس کے پھیلاؤ اور ترقی کے لیے موزوں ترین ہے۔

دوسرا اصول نزول کی ترتیب کو بدل کر دوسری ترتیب کے اختیار کرنے میں یہ مد نظر تھا کہ نزول کی ترتیب زیادہ تر ان حالات کے مطابق چلتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو پیش آتے تھے۔ مثلاً چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکتی زندگی میں ابھی کفار پر اتمام حجت ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو صبر و شکیب کے سانچے میں ڈھال کر نکالنا مقصود تھا۔ اس لیے مکتی آیات میں جہاد کی تسلیم نہیں دی گئی بلکہ صبر و برداشت کی تسلیم پر زور ہے۔ لیکن جب اتمام حجت ہو چکا اور صحابہ بھی صبر و برداشت کے سانچے میں ڈھل چکے اور کفار کے مظالم سے مسلمانوں کو اپنا وطن تک چھوڑنا پڑا اور ظالم کی سزا کا وقت آگیا تو اس وقت جہاد کی آیات نازل ہوئیں اسی طرح مکہ میں چونکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بصورت جمعیت نہیں تھی اور کفار کے مظالم نے انہیں بالکل منتشر کر رکھا تھا۔ یعنی ان کی کوئی اجتماعی زندگی نہیں تھی اس لیے مکہ میں اسلامی طریق تمدن و معاملات کے متعلق آیات نازل نہیں ہوئیں لیکن جب



مدینہ میں مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی نصیب ہوئی تو اس کے مناسب حال آیات کا نزول ہوا اگر اس نزول میں حالات کی مناسبت اور مطابقت کو ملحوظ نہ رکھا جاتا، تو یقیناً ابتدائی مسلمانوں کے لیے نئی شریعت کو اپنے اندر جذب کرنا اور اس پر صحیح طور پر عامل ہونا سخت مشکل ہو جاتا۔ لہذا قرآن کے نزول کو حتیٰ الوسع حالات پیش آمدہ کے ساتھ ساتھ چلایا گیا تھا تا کہ اس کی تعلیم صحابہ میں جذب ہوتی جاوے، لیکن جب سب نزول ہو چکا اور ایک جماعت قرآنی شریعت کی حامل وجود میں آگئی تو پھر اس ترتیب کو قائم رکھنا ضروری نہ تھا، بلکہ پھر اس بات کی ضرورت تھی کہ آئندہ کی مستقل ضروریات کے مطابق اُسے ترتیب دی جاوے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اگر اس جگہ کسی کو یہ اعتراض پیدا ہو کہ نزول کی ترتیب بدلنے سے قرآن کی تاریخی حیثیت ضائع ہو گئی ہے تو یہ ایک بودا اور فضول اعتراض ہو گا کیونکہ اول تو جب حدیث و تاریخ میں قرآنی آیات کی نزول کی ترتیب بیشتر طور پر محفوظ ہے اور ذرا سی محنت اور توجہ کے ساتھ اس بات کا پتہ لگ سکتا ہے کہ کوئی آیت یا سورۃ کب نازل ہوئی تھی تو اس صورت میں ہرگز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کی تاریخی حیثیت ضائع ہو گئی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے اور دوست و دشمن نے اُسے تسلیم کیا ہے صرف فرق یہ پیدا ہوا ہے کہ اگر قرآن کو اُس کے نزول کے مطابق ترتیب دیا جاتا، تو اس کی تاریخی حیثیت بدیہی اور عیاں ہوتی اور اب وہ محنت اور توجہ کے ساتھ نکالنی پڑتی ہے۔

دوسرے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن شریف کی اصل غرض و غایت تاریخ کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اس قانون کا بہترین صورت میں مہیا کرنا ہے جو لوگوں کی تمدنی اور اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے اور جو بندہ کو خدا تک پہنچا سکتا ہے۔ پس اس کی ترتیب میں بھی انہی اصول کا مد نظر رکھا جانا ضروری تھا جو ان اغراض کو بہترین صورت میں پورا کر سکتے تھے اور اگر اس کی ترتیب میں ان اصولوں کو قربان کر کے تاریخی پہلو کو ترجیح دی جاتی تو یہ ایک نہایت غیر حکیمانہ فعل ہوتا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن شریف کی موجودہ ترتیب بھی اس رنگ کی ترتیب نہیں ہے جس میں عام کتب کی طرح بابوں اور فصلوں اور پیروں وغیرہ میں مضمون کو تقسیم کیا گیا ہو۔ کیونکہ اس قسم کی ترتیب قرآن کی غرض و غایت کے منافی تھی۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ سب اقوام اور سب زمانوں کے لیے ایک شریعت لایا ہے اور اس میں علوم کے خزانے مخفی ہیں جو بقدر ضرورت ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ قرآن کی تحقیق سے علماء کبھی سیر نہیں ہوں گے اور نہ اس کے عجائب کبھی ختم ہوں گے۔ اور ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ قرآنی آیات کے صرف ظاہری معانی پر ہی



حصر نہیں ہے بلکہ اس کی ہر اہمیت کے نیچے متعدد بطون ہیں اور ہر بطن آگے متعدد شاخیں رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام قرآن شریف کو ایک روحانی عالم کے طور پر پیش کرتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ دنیا ایک جسمانی عالم ہے پس اس کی ترتیب کے اصول کو سمجھنے کے لیے بھی بہترین مثال اس دنیا کی ہو سکتی ہے جس طرح اور جس رنگ میں اس دنیا میں ترتیب پائی جاتی ہے کہ ہر چیز باوجود ایک دوسرے سے بظاہر جدا اور لاتعلق نظر آنے کے دراصل اپنی گہرائیوں میں ایک دوسرے سے پیوست اور مربوط ہے اور ایک مخفی زنجیر بلکہ مختلف جہات سے کسی مخفی زنجیر میں اس کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے منسلک کئے ہوئے ہیں اسی طرح قرآن کی گہرائیوں میں ربط و اتحاد کی کڑیاں چلتی ہیں۔ اور ٹھیک جس طرح اس جسمانی عالم میں محققین اور سائنس دان اپنی اپنی اہمیت اور اپنی اپنی تحقیق کے مطابق علوم کے جواہر نکالتے رہتے ہیں اسی طرح قرآن کے روحانی عالم کے سمندر میں غوطہ لگانے والوں کے لیے بھی کسی زمانہ میں روحانی موتیوں کی کمی نہیں رہی اور نہ آئندہ ہوگی۔ اور یہ بات قرآن کریم کے سب سے بڑے معجزوں میں سے بڑا معجزہ ہے کہ اس کے الفاظ اور اس کی ترتیب کو ایسے طور پر رکھا گیا ہے کہ وہ باوجود حجم میں ساری آسمانی کتابوں میں سے چھوٹا ہونے کے اپنے اندر روحانی علوم کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ رکھتا ہے جو حسب تحقیق محققین اور حسب ضرورت زمانہ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی ترتیب کو ماکتب کی طرح معین مضمون کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بالوں اور فصلوں اور پیروں وغیرہ کی صورت میں نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اس کے معانی کی ساری وسعت کھو جاتی۔ اور اس کا مفہوم ایک محدود اور معین صورت اختیار کر کے اپنی ظاہری اور بدیہی صورت میں بالکل مقید ہو جاتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ قرآن شریف اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے اندر علوم کے بے انتہا خزانے مخفی ہیں جو ہمیشہ بقدر ضرورت ظاہر ہوتے رہیں گے اور اس کی تحقیق کا میدان کبھی ختم نہیں ہوگا اور قرآن کی یہ حیثیت اور اس کے نزول کی یہ غرض یقیناً فوت ہو جاتی اگر اس کی ترتیب کو عام کتب کی طرح بالوں اور فصلوں وغیرہ میں مضمون وار تقسیم کر کے ایک ٹھوس صورت میں جکڑ دیا جاتا پس جہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن ایک نہایت مرتب اور منظم کتاب ہے اور یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ترتیب نہیں ہے وہاں یہ بات بھی کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کی ترتیب عام کتب کی طرح نہیں ہے بلکہ اس جسمانی عالم کے اصول پر ہے جس میں معانی کی بے شمار گہرائیاں مخفی ہیں اور ان گہرائیوں میں ربط و اتحاد کی لاتعداد زنجیریں ایک جال کے طور پر پھیلی ہوئی ہیں جن سے ہر شخص اور ہر زمانہ اپنی کوشش اور اپنی استعداد اور اپنی ضرورت اور اپنے حالات کے مطابق فائدہ اٹھاتا اور اٹھا سکتا ہے۔ ہمارے مختصر نوٹ اس جگہ بے شک ایک دعویٰ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس تاریخی تصنیف میں اس

وسیع اور علمی مضمون کے لیے اس مختصر اشارے سے زیادہ کی گنجائش نہیں ورنہ اس دعویٰ کے ثبوت میں دلائل کا ایک سورت چڑھایا جاسکتا ہے۔ اب ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ ایک بن الاقوام قاضی کی حیثیت میں

اس بن الاقوام معاہدہ نے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوا تھا آنحضرت ﷺ کو ایک طرح کی مختلف اقوام میں ایک پولیٹیکل لیڈر اور انتظامی حاکم کی حیثیت دے دی تھی۔ اور آپ اس بن الاقوام جمہوری سلطنت کے گویا صدر قرار پاتے تھے جو مدینہ میں ہجرت کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس پوزیشن میں اہم مقدمات بھی آپ ہی کے سامنے پیش ہونے لگ گئے تھے۔ اور آپ ہر قوم کے ضابطہ عدالت کے ماتحت ان کا فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ سکنہ بھری کے آخر میں آپ کے سامنے ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ان کے خلاف زنا کا الزام ثابت کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے یہودی علماء سے پوچھا کہ اس بارہ میں موسوی شریعت کیا فتویٰ دیتی ہے۔ انہوں نے دھوکے اور انفرادی طریق پر یہ جواب دیا کہ جو شخص زنا کرے اسے ہمارے ہاں سزا کا لاکر کے اور سواری پر اٹا سوار کر کے پھرایا جاتا ہے۔ اس وقت عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے پاس ہی بیٹھے تھے انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ تورات میں زنا کی سزا سنگسار کرنا لکھی ہے۔ چنانچہ تورات منکوائی گئی۔ اور گویہودیوں نے بہت پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ بہانے بہانے سے اس آیت پر ہاتھ رکھ کر اسے چھپانا بھی چاہا۔ مگر عبداللہ بن سلام نے یہ صاف طور پر دکھا دیا کہ اذروئے تورات زنا کی سزا رجم ہے اور ان کو شرمندہ ہونا پڑا اور چونکہ یہ معاہدہ تھا کہ ہر قوم کے مقدمات اس کے اپنے قانون کے مطابق فیصلہ کئے جاتے گئے اور اسلام میں تو ابھی تک زنا وغیرہ کی حدود کے متعلق احکام بھی نازل نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہودی شریعت کے مطابق ان دونوں کو سنگسار کر دیا جاوے چنانچہ وہ دونوں مرد و عورت سنگسار کر دیئے گئے۔ یہ سکنہ بھری کے آخر کا واقعہ ہے۔

حضرت علیؑ کی والدہ کی وفات

اسی سال سکنہ بھری کے آخر میں حضرت علیؑ کی عمر رسیدہ والدہ نے جن کا نام فاطمہ بنت اسد تھا مدینہ میں انتقال کیا۔ یہ بزرگ خاتون گویا آنحضرت ﷺ کی ماں کی قائم مقام تھیں۔ کیونکہ آپ کے دادا عبدالطلب کی وفات کے بعد انہوں نے ہی آپ کو اپنے گھر میں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا اور ویسے بھی وہ آنحضرت ﷺ سے بہت محبت رکھتی تھیں اس لیے ان کی وفات کا آپ کو بہت صدمہ ہوا اور ان کی نعش کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ وفور محبت میں آپ نے اپنی قمیص اُتار کر انہیں پہنائی اور خود ان کی قبر میں اترے اور سب تکفین و تدفین کا

انظام خود کیا۔ اور جب وہ قبر میں اتاری گئیں تو آپؐ نے رقت بھری آواز میں فرمایا: "جَزَا لَہُ اللہُ مِنْ اَمْرِ خَیْرًا لَقَدْ کُنْتَ خَیْرًا اُمَّةً" خدا تعالیٰ تمہیں میری طرف سے میری ایک بہت اچھی ماں بننے کی بہترین جزا دے تم حقیقتہً ایک نہایت ہی اچھی ماں تھیں۔" کتاب کے حصہ اول میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ فاطمہ بنت اسد اور ابوطالب کی نرینہ اولاد چاروں لڑکوں یعنی طالب، عقیل، جعفر اور حضرت علیؑ پر مشتمل تھی اور ایک لڑکی تھی جس کا نام اُمّ ہانی تھا۔

غزوہ دومتہ الجندل اور اسلامی جنگوں میں ایک نیا اضافہ ربیع الاول ۳ھ

اب تک جو جنگی کارروائیاں کی گئی تھیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ محض دفاع کے طور پر تھیں۔ اسی دفاع کا حصہ وہ تھیں تھیں جو بعض قبائل عرب کے ساتھ امن وامان کے معاہدے

کرنے کے لیے اختیار کی گئیں۔ نیز اس وقت تک جو سفر اختیار کئے گئے تھے وہ سب مرکزی حجاز اور نجد کے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اب یہ میدان وسیع ہونے لگا چنانچہ دومتہ الجندل جس کے غزوہ کا ہم اس وقت ذکر کرنے لگے ہیں۔ وہ شام کی سرحد کے قریب واقع تھا اور مدینہ سے اس کا فاصلہ پندرہ سولہ دن کی مسافت سے کم نہ تھا۔

اس غزوہ کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرتؐ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ دومتہ الجندل میں بہت سے لوگ جمع ہو کر لوٹ مار کر رہے ہیں اور جو مسافر یا قافلہ وغیرہ وہاں سے گذرتا ہے اس پر حملہ کر کے اُسے تنگ کرتے اور اس کا مال و متاع لوٹ لیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہ لوگ مدینہ کا رخ کر کے مسلمانوں کے لیے موجب پریشانی نہ ہوں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی جنگی کارروائیوں کی ایک اہم غرض قیام امن بھی تھی اس لئے باوجود اس کے کہ ان لوگوں کی اس لوٹ مار سے مدینہ کے مسلمانوں کو حقیقتہً کوئی زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ آپؐ نے صحابہ میں تحریک فرمائی کہ اس ڈاکر زنی اور ظلم کے سلسلہ کو روکنے کے لیے وہاں چلنا چاہیے چنانچہ آپؐ کی تحریک پر ایک ہزار صحابی اس دور و دراز کے تکلیف دہ سفر کو اختیار کر کے آپؐ کے ساتھ ہولتے پلکے اور آپؐ ہجرت کے پانچویں سال ماہ ربیع الاول میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اور پندرہ سولہ دن کی طویل اور پُر از مشقت مسافت طے کرنے کے بعد دومتہ الجندل کے قریب پہنچے۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں کی خبر پا کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے اور گو آنحضرتؐ وہاں چند دن تک ٹھہرے اور آپؐ نے چھوٹے چھوٹے دستے بھی ادھر ادھر روانہ فرمائے تاکہ ان مفسدین کا کچھ پتہ چلے مگر وہ کچھ ایسے لاپتہ ہوئے کہ ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ ان کا ایک چرواہا مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو کر آنحضرتؐ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گیا۔ اور آپؐ چند دن کے قیام کے بعد مدینہ کی

طرف واپس تشریف لے آتے لیے

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ غزوہ اس رنگ میں پہلا غزوہ تھا کہ اس کی غرض یا کم از کم بڑی غرض ملک میں امن کا قیام تھی۔ اہل دومہ کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا وہ مدینہ سے اتنی دور تھے کہ ان کی طرف سے بظاہر یہ اندیشہ کسی حقیقی خطرہ کا موجب نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اتنے لمبے سفر کی صعوبت برداشت کر کے مدینہ میں مسلمانوں کی پریشانی کا موجب ہونگے۔ پس ان کے مقابلہ کیلئے پندرہ سولہ دن کا تکلیف دہ سفر اختیار کرنا حقیقتاً سوائے اس کے اور کسی غرض سے نہیں تھا کہ انہوں نے جو اپنے علاقہ میں لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور بے گناہ قافلوں اور مسافروں کو تنگ کرتے تھے اس کا سد باب کیا جاوے۔ پس مسلمانوں کا یہ سفر محض رفاه عام اور ملک کی مجموعی بہبودی کے لیے تھا جس میں ان کی اپنی کوئی غرض مد نظر نہیں تھی۔ اور یہ ایک عملی جواب ہے، ان لوگوں کا جنہوں نے سراسر ظلم اور بے انصافی کے ساتھ مسلمانوں کی ابتدائی جنگی کارروائیوں کو جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے حکم کے ماتحت اختیار کیا تھا جارحانہ یا خود غرضانہ قرار دیا ہے۔

اس غزوہ کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ اہل دومہ مرعوب ہو کر اپنی ان مفسدانہ کارروائیوں سے باز آگئے اور مظلوم مسافروں کو اس ظلم سے نجات مل گئی اور دوسرے شام کی سرحد میں جہاں ابھی تک مسلمانوں کا صرف نام ہی پہنچا تھا اور لوگ اسلام کی حقیقت سے بالکل نا آشنا تھے اسلام کا ایک گونہ انٹروڈکشن ہو گیا اور اس علاقہ کے لوگ مسلمانوں کے طریق و تمدن سے ایک حد تک واقف ہو گئے۔

دوئمہ الجندل کے قرب و جوار میں بعض عیسائی بھی آباد تھے مگر روایات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ آیا یہ مفسدین جن کے خلاف یہ مهم اختیار کی گئی۔ عیسائی تھے یا کہ بُت پرست مشرک۔ مگر حالات سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً یہ لوگ مشرک ہونگے۔ کیونکہ اگر یہ مهم عیسائیوں کے خلاف ہوتی تو مورخین ضرور اس کا ذکر کرتے۔ واللہ اعلم

ابھی آپ واپس نہیں پہنچے تھے کہ آپ کے پیچھے مدینہ میں سعد بن عبادۃ رئیس قبیلہ خزرج کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ جب آپ واپس آتے تو آپ نے ان کی قبر پر جا کر دعا فرمائی اور جب سعد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری ماں اچانک بیہوشی کی حالت میں فوت ہو گئی ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر انہیں بولنے کا موقع ملتا تو وہ ضرور کچھ صدقہ و خیرات کرتیں۔ کیا اس صورت میں اب ان کی طرف سے میں صدقہ کر سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ "ہاں بیشک ان کی طرف سے صدقہ کر دو۔" اور سعد کے دریافت کرنے پر کہ کونسا صدقہ بہتر ہوگا آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے آرام کے لیے کوئی کنواں لگوا دو۔ چنانچہ سعد نے ایک کنواں لگوا کر اسے رفاه عام



کے لیے وقف کر دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ سعد کی والدہ بیہوشی کی حالت میں تو فوت نہیں ہوئی تھیں مگر چونکہ سعد خود مدینہ سے غیر حاضر تھے اور تمام جائیداد سعد کی تھی اس لیے سعد کی والدہ باوجود خواہش کے صدقہ نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے بعد جب سعد واپس آئے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی اجازت سے اپنی مال کی طرف سے ایک باغیچہ خدا کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

مدینہ میں خسوفِ قمر اور صلوٰۃ خسوف

اسی سال ماہ جمادی الآخر میں مدینہ میں چاند کو گرہن لگا۔ اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ چنانچہ آپ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اُس وقت تک نماز میں مصروف رہے کہ چاند کھل گیا اور اس وقت سے اسلام میں چاند گرہن کی نماز باقاعدہ شروع ہو گئی۔ جب ایک طرف مسلمان نماز میں مصروف تھے تو دوسری طرف یہودی یہود یہ سمجھ کر اپنے برتن وغیرہ بجا رہے تھے کہ چاند کو کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح شور کرنے سے جاتا رہے گا۔

اس موقع پر یہ ذکر نامناسب نہ ہو گا کہ اسلام کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس نے نہ صرف بے جا توہمات کو مٹایا ہے بلکہ ہر ایسے موقع پر جہاں بیجا توہمات کا دروازہ کھل سکتا تھا ایسی عبادات مقرر کر دی ہیں جو فوراً انسان کو خدا کی طرف متوجہ کر کے شرک و خیالات کا سدباب کر دیتی ہیں۔ چنانچہ خسوف وغیرہ کے موقع پر عبادت مقرر کرنے میں بڑی حکمت یہی ہے کہ تا مسلمانوں کو اس بات کی طرف توجہ پیدا ہو کہ دنیا کی زندگی میں جو نور اور روشنی بھی انسان کو پہنچتی ہے اس کا ظاہری آلہ خواہ کوئی چیز ہو مگر دراصل اس کا منبع ذات باری تعالیٰ ہی ہے اور اس لیے اگر کسی وجہ سے اس روشنی میں کوئی روک پیدا ہو جاوے تو خواہ یہ روک عام طبعی قوانین کے ماتحت ہی ہو اسے اس موقع پر خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ دراصل اسلام نے انسان کی زندگی کے ہر حرکت و سکون اور اس کے ماحول کے ہر تغیر کے ساتھ ذکر الہی کو وابستہ کر دیا ہے تاکہ کوئی گھڑی اس پر غفلت کی نہ آئے۔ مگر یہ ایک الگ مذہبی بحث ہے جس میں پڑنا ایک موردِ خ کا کام نہیں۔ غزوۂ بدر المود کے بیان میں مکہ کے قحط کا بھی ذکر گزر چکا ہے یہ قحط ابھی تک جاری تھا۔ قریش مکہ اس قحط سے بہت تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور غرابہ کو تو سخت مصیبت کا سامنا ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی ہمدردی

قریش کی اس تکلیف کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ازراہ ہمدردی مکہ کے غرابہ کے لیے اپنی طرف سے کچھ چاندی بھجوائی۔ اور اس طرح آپ نے اس بات کا ایک عملی ثبوت دیا کہ آپ کا دل آپ کے سخت ترین



دشمنوں کے ساتھ بھی ایک گہری اور حقیقی ہمدردی رکھتا ہے۔ اور یہ کہ آپ کی مخالفت صرف عقائد و خیالات کے ساتھ تھی نہ کسی انسان کے ساتھ۔

بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقع پر بھی مکہ والے قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو انکی طرف سے ابوسفیان بن حربؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا تھا اور رشتہ داری اور قرابت کا واسطہ دیکر تحریک کی تھی کہ ان کے لیے اس قحط کے دور ہونے کی دعا کی جاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کے جذبات آنحضرتؐ کے متعلق مخلوط قسم کے تھے۔ یعنی وہ آپ کی ذاتی نیکی اور تقویٰ و طہارت کے بھی قائل تھے۔ مگر آپ کی تعلیم کو اپنے قدیم طریق عمل اور مشرکانہ خیالات کے خلاف پاتے ہوئے اُسے مٹانے کے بھی پیلے تھے۔ خیالات میں اس قسم کا خلط علم النفس کے اصول کے ماتحت ناممکن نہیں ہے۔

زینب بنت جحش کی شادی شہنہ ہجری

اسی سال یعنی ہجرت کے پانچویں سال میں غزوہ بنی مصطلق سے کچھ عرصہ پہلے جو شعبان شہنہ ہجری میں واقع ہوا

آنحضرتؐ نے زینب بنت جحش سے شادی فرمائی۔ بعض مؤرخین مثلاً ابن اثیر اور صاحب خمیس وغیرہ نے زینب بنت جحش کی شادی کو غزوہ بنی مصطلق کے بعد رکھا ہے مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ کیونکہ یہ بات صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ جس وقت حضرت عائشہؓ پر اتھام لگایا گیا تھا اس وقت زینب بنت جحش کی شادی ہو چکی تھی اور حضرت عائشہؓ کے خلاف الزام لگانے جانے کا واقعہ مسلمہ طور پر غزوہ بنی مصطلق کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ حضرت زینبؓ آنحضرتؐ کی پھوپھی امیہ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں اور باوجود نہایت درجہ نیک اور متقی ہونے کے ان کی طبیعت میں اپنے خاندان کی بڑائی کا احساس بھی کسی قدر پایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرتؐ کی طبیعت اس قسم کے خیالات سے بالکل پاک تھی اور گو آپ خاندانی حالات کو تمدنی رنگ میں قابل لحاظ سمجھتے تھے مگر آپ کے نزدیک بزرگی کا حقیقی معیار ذاتی خوبی اور ذاتی تقویٰ و طہارت پر مبنی تھا۔ جیسا کہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ **إِنَّ أَكْرَمَ مَعْرُوفٍ عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَصِفُوهُ** یعنی "اے لوگو! تم میں سے جو شخص زیادہ متقی ہے وہی زیادہ بڑا صاحب عزت ہے۔" پس آپ نے ہلا کسی تامل کے اپنی اس عزیزہ یعنی زینب بنت جحش کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام اور مثنیٰ زید بن حارثہ کے ساتھ تجویز فرمادی۔ پہلے تو زینب نے اپنی خاندانی بڑائی کا خیال کرتے ہوئے اسے ناپسند کیا۔ لیکن آخر کار آنحضرتؐ کی پُر زور خواہش کو دیکھ کر رضامند ہو گئیں۔ بہر حال آنحضرتؐ کی خواہش اور تجویز کے مطابق زینب اور زید کی شادی ہو گئی۔ اور گو زینب نے ہر طرح شرافت سے نبھاؤ کیا۔ مگر زید نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ زینب کے دل میں ابھی تک خیمش مخفی ہے کہ میں ایک معزز خاندان کی لڑکی اور آنحضرتؐ کی قریبی

۱۔ بخاری ابواب الاستقار۔ ۲۔ کتاب المغازی حدیث انفک۔ سورۃ ہجرات ۱۳۱

۳۔ ابن جریر و طبرانی بحوالہ ذرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۴۵ نیز ابن سعد جلد ۸ حالات زینب بنت جحش



خواہ خواہ ابتلا کی صورت پیدا ہوگی۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَتَخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ

یعنی "اے نبی! تو اپنے دل میں چھپاتے ہوئے تھا وہ بات جسے خدا نے آخر ظاہر کرنا تھا۔ اور تو لوگوں کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ اور یقیناً خدا اس بات کا بہت زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جاوے"۔

بہر حال آنحضرت ﷺ نے زید کو تقوی اللہ کی نصیحت کر کے طلاق دینے سے منع فرمایا اور آپ کی اس نصیحت کے سامنے تسلیم خم کرتے ہوئے زید خاموش ہو کر واپس آگئے مگر اکھڑی ہوئی طبیعتوں کا ملنا مشکل تھا اور جو بات نہ بنی تھی نہ بنی اور کچھ عرصہ کے بعد زید نے طلاق دیدی۔ جب زینب کی عدت ختم ہو چکی تو ان کی شادی کے متعلق آنحضرت ﷺ پر پھر وحی نازل ہوئی کہ آپ کو انہیں خود اپنے عقد میں لے لینا چاہیے۔ اور اس خدائی حکم میں علاوہ اس حکمت کے کہ اس سے زینب کی دلداری ہو جاتے گی اور مطلقہ عورت کے ساتھ شادی کرنا مسلمانوں میں عیب نہ سمجھا جائیگا یہ حکمت مد نظر تھی کہ چونکہ زید آنحضرت ﷺ کا تنہا بیٹا تھا اور آپ کا بیٹا کہلاتا تھا۔ اس لیے جب آپ خود اس کی مطلقہ سے شادی فرمائیں گے تو اس بات کا مسلمانوں میں ایک عملی اثر ہوگا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا اور نہ اس پر حقیقی بیٹوں والے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اور آئندہ کے لیے عرب کی جاہلانہ رسم مسلمانوں میں پورے طور پر مٹ جائے گی۔ چنانچہ اس بارہ میں قرآن شریف جو تاریخ اسلامی کا سب سے زیادہ صحیح ریکارڈ ہے یوں فرماتا ہے:-

فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا بِسَمِيِّ لَّا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيْ اَزْوَاجِ اَدْعِيَائِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ۝

یعنی "جب زید نے زینب سے قطع تعلق کر لیا تو ہم نے زینب کی شادی تیرے ساتھ کر دی۔ تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی روک نہ رہے۔ بعد اس کے کہ وہ منہ بولے بیٹے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کر لیں اور خدا کا یہ حکم اسی طرح پورا ہوتا تھا"۔

الغرض اس خدائی وحی کے نازل ہونے کے بعد جن میں آنحضرت ﷺ کی اپنی خواہش اور خیال کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ آپ نے زینب کے ساتھ شادی کا فیصلہ فرمایا اور پھر زید کے ہاتھ ہی زینب کو شادی کا پیغام بھیجا۔ اور زینب کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر ان کے بھائی ابوالاحد بن جحش نے ان کی طرف سے ولی ہو کر چار سو درہم میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ اور اس طرح وہ قدیم رسم جو عرب کی سرزمین میں رائج

ہو چکی تھی آنحضرت ﷺ کے ذاتی نمونہ کے نتیجہ میں اسلام میں یخ و بن سے اکھڑ کر پھینک دی گئی۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ عام مورخین و محدثین کا یہ خیال ہے کہ چونکہ زینب کی شادی کے متعلق خدائی وحی نازل ہوئی تھی اور خدا کے خاص حکم سے شادی وقوع میں آئی اس لیے ظاہری طور پر ان کے نکاح کی رسم ادا نہیں کی گئی۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔ بے شک خدا کے حکم سے یہ شادی ہوئی اور کہا جاسکتا ہے کہ آسمان پر نکاح پڑھا گیا۔ مگر اس وجہ سے شریعت کی ظاہری رسم سے جو وہ بھی خدا ہی کی مقرر کردہ ہے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ابن ہشام کی روایت جس کا حوالہ اوپر درج کیا گیا ہے اور جس میں ظاہری رسم نکاح کا واقعہ ہونا بتایا گیا ہے اس معاملہ میں واضح ہے اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہنے دیتی۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ دوسری اہمات المؤمنین کے مقابلہ میں زینب یہ فخر کیا کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح تمہارے دیوں نے زمین پر پڑھا ہے ہیں اور میرا نکاح آسمان پر ہوا ہے اس سے بھی یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ زینب کے نکاح کی ظاہری رسم ادا نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوجود ظاہری رسم کی ادائیگی کے ان کا یہ فخر قائم رہتا ہے کہ ان کا نکاح خدا کے خاص حکم سے آسمان پر ہوا مگر اس کے مقابل پر دوسری اہمات المؤمنین کی شادیاں عام اسباب کے ماتحت محض ظاہری رسم کی ادائیگی کے ساتھ وقوع میں آئیں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بغیر اذن کے زینب کے پاس تشریف لے گئے تھے اور اس سے بھی یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ان کے نکاح کی ظاہری رسم ادا نہیں ہوئی۔ مگر غور کیا جاوے تو اس بات کو بھی ظاہری رسم کے ادا ہونے یا نہ ہونے کے سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ آنحضرت ﷺ زینب کے گھر بغیر اجازت چلے گئے تھے تو یہ غلط اور خلاف واقعہ ہے کیونکہ بخاری کی صریح روایت میں یہ ذکر ہے کہ شادی کے بعد زینب آنحضرت ﷺ کے گھر میں رخصت ہو کر آئی تھیں نہ آپ ان کے گھر گئے تھے۔ اور اگر اس روایت سے یہ مراد ہے کہ جب وہ رخصت ہو کر آپ کے گھر آ گئیں تو اس کے بعد آپ ان کے پاس بغیر اذن کے تشریف لے گئے تو یہ کوئی غیر معمولی اور خلاف دستور بات نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ آپ کی بیوی بن کر آپ کے گھر آ گئی تھیں تو پھر آپ نے بہر حال ان کے پاس جانا ہی تھا اور آپ کو اذن کی ضرورت نہیں تھی پس اذن نہ لینے والی روایت کا قطعاً کوئی تعلق اس سوال سے نہیں ہے کہ آپ کے اس نکاح کی ظاہری رسم ادا کی گئی یا نہیں اور حق یہی ہے کہ جیسا کہ ابن ہشام کی روایت میں تصریح کی گئی ہے باوجود خدائی حکم کے اس نکاح کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی تھی اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہوا ہو کیونکہ اول تو عام قاعدہ میں استثناء کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور دوسرے جبکہ اس نکاح میں ایک رسم کا توڑنا اور اس کے اثر کو زائل کرنا مقصود تھا تو اس بات کی بدرجہ اولیٰ ضرورت تھی کہ یہ نکاح بڑے اعلان کے ساتھ علی رؤس الاشهاد وقوع میں آتا۔





## پردے کے احکام کا نزول

نکاح کے دوسرے یا تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے اپنے مکان میں صحابہ کی دعوت ولیمہ فرمائی۔ اور چونکہ اس نکاح میں خاص طور پر اعلان

مقصود تھا اس لیے آپ نے اپنی ساری بیویوں میں حضرت زینب کا ولیمہ زیادہ بڑے پیمانہ پر کیا۔ اس وقت تک چونکہ پردے کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے صحابہ بے تکلف آپ کے گھر کے اندر ہی آگئے اور ان میں بعض لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بھی ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو کر دیں بیٹھے رہے جس سے آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہوئی۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت میں حیا کا مادہ بہت تھا آپ شرم کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اور ان صحابہ کو باتوں کی مصروفیت میں خود خیال نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دیر ہو گئی اور آنحضرت ﷺ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا۔ آخر آپ خود اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کو اٹھتے دیکھ کر اکثر صحابہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آپ سے رخصت ہو کر مکان سے نکل گئے لیکن تین شخص پھر بھی بیٹھے ہوئے باقی کرتے رہے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ کے حجرے کی طرف تشریف لے گئے لیکن جب تھوڑی دیر کے بعد آپ واپس تشریف لاتے تو ابھی تک یہ لوگ وہیں بیٹھے تھے اسی طرح آپ کو دو تین دفعہ آنا جانا پڑا۔ اور آخر کار جب یہ لوگ آپ کے مکان سے چلے گئے تو آپ واپس تشریف لے آئے۔ بعض اوقات الٰہی احکام کے نزول کے لیے بھی محرکات پیدا ہو جاتے ہیں یعنی حکم نے تو بہر حال نازل ہونا ہوتا ہے مگر کوئی واقعہ اس کا وقتی محرک بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ پردے کے ابتدائی احکامات کے نزول کا تحرکی سبب بن گیا اور پردے کے متعلق وہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر پردے کی پابندی عائد کی گئی اور آنحضرت ﷺ کے گھروں میں غیر محرم لوگوں کی آذوائے آمد و رفت رُک گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پردے کے متعلق مزید احکامات نازل ہوتے رہے حتیٰ کہ بالآخر اس نے وہ صورت اختیار کر لی جو اس وقت قرآن شریف وحدیث میں موجود ہے۔ اور جس کی رو سے مسلمان عورت کی جائز اور ضروری آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے عورت کو غیر محرم مردوں کے سامنے اپنے بدن اور لباس کی زینت کے بر ملا اظہار سے منع فرمایا گیا ہے۔ نیز غیر محرم مرد و عورت کا ایک دوسرے کے ساتھ خلوت میں اکیلے ملاقات کرنا ناجائز قرار دے دیا گیا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ وہ قیود ہیں جو ایک طرف تو عورت کی صحت اور اس کی علمی ترقی اور قومی اور ملکی کاموں میں اس کے حصہ لینے اور دوسرے معاملات میں اس کی جائز آزادی میں کوئی روک نہیں بنتیں اور دوسری طرف غیر محرم مرد و عورت کے بالکل آذوائے آمد و رفت اور بے حجابانہ میل جول سے جو خلاف اخلاق اور مضرت رسالہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اور جو بے پردہ ملکوں میں عموماً پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کا ان قیود سے سدباب ہو جاتا ہے۔

۱۔ بخاری کتاب النکاح باب الولیۃ حق۔ ۲۔ بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ احزاب۔ ۳۔ قرآن شریف سورۃ نور ۲۲ سورۃ احزاب

۳۲ و ۳۹ بخاری تفسیر سورۃ نور و تفسیر سورۃ احزاب و تفسیر سورۃ متحنہ و کتاب النکاح



اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو صورت پردے کی مسلمانوں میں رائج ہے وہ بالعموم صحیح اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کہیں نا واجب سختی سے کام لے کر بیچاری عورت کو اسکے گھر کی چار دیواری میں قریباً قریباً ایک قیدی کی طرح بند رکھا جاتا ہے جس سے اس کی صحت اور تعلیم و تربیت اور اس کا تمدن وغیرہ تباہ ہو رہے ہیں تو کہیں مغرب کی کورانہ تقلید میں اُسے نا واجب آزادی دے دی گئی ہے جس سے سوسائٹی کے اخلاق و عادات پر ضرر رساں اثر پڑ رہا ہے۔ اور یہ ہر دو رستے افراط و تفریط کے رستے ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیم کی رُو سے عورت اپنی زینت کے بر ملا اظہار سے رکتے ہوئے تمام قسم کی جائز تفریحات اور جائز کاموں میں حصہ لے سکتی ہے مگر اُسے بالکل گھلے منہ پھرنے اور غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت میں ایسے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ طریق اپنے اندر فتنے کے احتمالات رکھتا ہے جس کا سد باب ضروری ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں بھی جہاں پردے کی حدود کو بالکل توڑ دیا گیا ہے اعلیٰ طبقہ کے شرفاء کے گھروں میں اس قدر احتیاط ضرور برتی جاتی ہے کہ عام طور پر جوان لڑکیاں بغیر کسی محرم مرد یا معتز رفیق عورت کے بالکل آزادانہ طور پر ادھر ادھر نہیں آتی جاتیں۔ اور نہ غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت میں آزادانہ ملاقات کرتی ہیں۔ اور جو لڑکیاں اس معاملہ میں زیادہ آزادی دکھاتی ہیں انہیں عموماً شریف سوسائٹی میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی بالکل غیر مقتید اور بے حجابانہ آزادی کو یورپ جیسی بے حجاب سرزمین میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا اور یہی وہ اصول ہے جسے اسلام نے زیادہ جامعیت اور زیادہ خوبی کے ساتھ اختیار کر کے اور اس کے ساتھ زینت کے چھپانے کے اصول کو شامل کر کے پردے کے احکام جاری کئے ہیں اور اس معاملہ میں افراط و تفریط کے رستوں سے بچ کر ایک میانہ روی کا طریق قائم کر دیا ہے۔

در اصل اگر غور کیا جاوے تو پردہ پر سارا اعتراض اس عملی طریق کی وجہ سے ہے جو آجکل اسلامی ممالک اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہے اور جو زیادہ تر اسلامی سلطنتوں کی کمزوری کے زمانہ میں سیاسی حالات کے ماتحت مجبوراً مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑا تھا۔ مگر بعد میں ایک رسم کے طور پر ایک مستقل اور زیادہ سخت صورت اختیار کر گیا۔ ورنہ اس معاملہ میں اصل اسلامی حکم جو قرآن و حدیث سے پتہ لگتا ہے اور ابتدائی مسلمانوں کا اصل تعامل جو تاریخ و حدیث سے ثابت ہوتا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کہ اس پر کوئی معقول اعتراض ہو سکے بلکہ ہر شخص جو ٹھنڈے طوں پر غور کرنے کا عادی ہے اس کی خوبی کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلامی پردہ کالباب صرف یہ ہے کہ: اول غیر محرم مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے اپنی نظروں کو نہ بچا رکھیں اور عورت اپنے چہرہ اور بدن اور لباس کی زینت کو کسی غیر محرم مرد پر نظر پالیں وغیرہ کے ذریعہ ظاہر نہ کرے۔ دوم یہ کہ غیر محرم مرد و عورت کسی ایسی جگہ میں جو دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو خلوت میں ایسے ملاقات نہ کریں۔ ان دو عد بندیوں کو ملحوظ رکھتے

۱۔ قرآن شریف سورۃ نور: ۳۲ و بخاری تفسیر سورۃ ممتحنہ

۲۔ بخاری کتاب النکاح باب لا یخْلُون رَجُلٌ وَبَابُ مَا یَجُوزُ اَنْ یَخْلُو

ہوئے جن میں سراسر سوسائٹی کی بہبودی اور اخلاق کی حفاظت مد نظر ہے۔ ایک مسلمان عورت پردہ کے معاملہ میں ہر طرح آزاد ہے۔ وہ درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور تعلیم دے سکتی ہے۔ وہ ورزش اور سیر و تفریح کے لیے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ وہ خرید و فروخت کر سکتی ہے وہ پبلک جلسوں وغیرہ میں شریک ہو سکتی ہے۔ وہ غیر محرم مردوں سے ملاقات کر سکتی ہے اور ان کی بات سن سکتی ہے اور ان کو اپنی بات سننا سکتی ہے۔ وہ محنت و مزدوری کر سکتی ہے۔ وہ دفاتر اور محکموں اور شفا خانوں اور کارخانوں میں کام کر سکتی ہے۔ وہ قومی اور ملکی کاموں میں حصہ لے سکتی ہے۔ وہ جنگوں میں مناسب خدمت سرانجام دینے کیلئے شریک ہو سکتی ہے۔ غرض اسلامی پردہ عورت کی تعلیم و تربیت۔ اس کی نشو و نما۔ اس کے ضروری مشاغل۔ اس کی جائز تفریحات میں ہرگز کوئی روک نہیں ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے زمانہ میں مسلمان عورتیں تمام ان جائز کاموں میں حصہ لیتی تھیں جو اس زمانہ میں پیش آتے تھے۔ وہ تعلیم حاصل کرتی اور تعلیم دیتی تھیں۔ وہ نمازوں میں مسلمان مردوں کے ساتھ شامل ہوتی تھیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کی تقریریں اور خطبات سنتی تھیں۔ وہ قومی کاموں میں مشورہ دیتی تھیں وہ حج میں مردوں کے پہلو بہ پہلو مراسم حج ادا کرتی تھیں۔ وہ سفروں میں مردوں کے ساتھ جاتی تھیں۔ وہ غیر محرم مردوں کے ساتھ ضرورت پیش آنے پر ملاقات کرتی اور ان کی بات سنتیں اور اپنی بات سناتی تھیں۔ وہ سواری کرتی تھیں۔ وہ تفریحی تماشے دیکھتی تھیں۔ وہ جنگوں میں شریک ہوتی اور زخمیوں کی تیمارداری اور زینسنگ کی خدمت سرانجام دیتی تھیں اور ضرورت پڑتی تو میدان جنگ میں تلوار بھی چلا لیتی تھیں۔ پس پردہ پر جتنے بھی اعتراض ہوتے ہیں وہ درحقیقت اصل اسلامی پردہ پر نہیں ہیں۔ بلکہ موجودہ زمانہ کے بگڑے ہوئے پردہ پر ہیں جس نے عورت کو گھر کی چار دیواری میں قریباً ایک حیوان کی طرح قید کر رکھا ہے۔ مگر اس نقص کے دور کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک انتہا سے ہٹ کر دوسری انتہا کو اختیار کر لیا جاوے کیونکہ یہ دونوں ضلالت و ہلاکت کی راہیں ہیں اور سلامت رومی کا دہی رستہ ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور جو انسانی فطرت کی سچی آواز ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عورت کے کام کی اصل جگہ گھر ہے جہاں اس کے ہاتھوں میں قوم کے نونال پلتے ہیں جن پر آئندہ چل کر قومی اور ملکی کاموں کا بوجھ پڑنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا نازک اور وسیع اور عظیم الشان کام ہے کہ اگر عورت صرف اسی کام کو خیر و خوبی کے ساتھ سرانجام دے اور اس کے لیے اپنے آپ کو اہل بنائے تو اس کی توجہ کی مصروفیت کے لیے یہی کافی ہے اور اسی سے وہ ملک و قوم کی بہترین محسنہ بن سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے اسلامی پردہ مذہب سے نہ کہ خلاف۔

حضرت زینب کی شادی کے بقیہ حالات      حضرت زینب بنت جحش کی عمر شادی کے وقت

پینتیس سال کی تھی۔ اور عرب کے حالات کے لحاظ سے یہ عمر ایسی تھی جسے گویا ادھیر کنا چاہیے۔ حضرت زینب ایک نہایت متقی اور پرہیزگار اور مخیر خاتون تھیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی تمام بیویوں میں صرف زینب ہی وہ بیوی تھیں جو حضرت عائشہ کے ساتھ مقابلہ کرتی اور ان کی ہمسری کا دم بھرتی تھیں۔ حضرت عائشہ ان کے ذاتی تقویٰ و طہارت کی بہت مداح تھیں۔ اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ میں نے زینب سے زیادہ نیک عورت نہیں دیکھی۔ وہ بہت متقی بہت راست گو بہت صلہ رحمی کرنے والی بہت صدقہ و خیرات کرنے والی اور نیک اور تقرب الہی کے اعمال میں نہایت سرگرم تھیں۔ بس اتنی بات تھی کہ ان کی طبیعت ذرا تیز تھی مگر تیزی کے بعد وہ جلد ہی خود نادام ہو جایا کرتی تھیں۔ "صدقہ و خیرات میں تو ان کا یہ مرتبہ تھا کہ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ہم سے فرمایا۔ اَسْرَعُ صَعْقٍ لِحَاقًا نِیْ اَطْوَالَ صَعْقٍ یَّئِدًا۔ یعنی تم میں سے جو سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی ہے وہ میری وفات کے بعد سب سے پہلے فوت ہو کر میرے پاس پہنچے گی۔" حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ہم نے اس سے ظاہری ہاتھ سجھے اور آپس میں اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں لیکن جب آنحضرت ﷺ کے بعد سب سے پہلے زینب بنت جحش کا انتقال ہوا تو تب جا کر ہم پر یہ راز کھلا کہ ہاتھ سے مراد صدقہ و خیرات کا ہاتھ تھا نہ کہ ظاہری ہاتھ۔

جیسا کہ اندیشہ کیا جاتا تھا حضرت زینب کی شادی پر منافقین مدینہ کی طرف سے بہت اعتراضات ہوتے اور انہوں نے برملا طور پر طعن کئے کہ محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کر کے گویا اپنی بہو کو اپنے اوپر حلال کر لیا ہے۔ لیکن جبکہ اس شادی کی غرض ہی عرب کی اس جاہلانہ رسم کو مٹانا تھی تو ان مطاعن کا سننا بھی ناگزیر تھا۔

اس جگہ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ابن سعد اور طبری وغیرہ نے حضرت زینب بنت جحش کی شادی کے متعلق ایک سراسر غلط اور بے بنیاد روایت نقل کی ہے اور چونکہ اس سے آنحضرت ﷺ کی ذات والا صفات کے خلاف اعتراض کا موقع ملتا ہے اس لیے بعض سخی مؤرخین نے اس روایت کو نہایت ناگوار صورت دیکر اپنی کتب کی زینت بنا پایا ہے۔ روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے زینب بنت جحش کی شادی زید کے ساتھ کر دی تو اس کے بعد آپ کی موقعہ پر زید کی تلاش میں ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس وقت اتفاق سے زید اپنے مکان پر نہیں تھے۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر زید کو آواز دی تو زینب نے اندر سے جواب دیا کہ وہ مکان پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی آواز پہچان کر وہ لپک کر اٹھیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اندر تشریف لے آئیں، لیکن آنحضرت

ﷺ نے انکار فرمایا اور واپس لوٹنے لگے مگر چونکہ حضرت زینب گھبرا کر ایسی حالت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ ان کے بدن پر اوڑھنی نہیں تھی اور مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نظر اُن پر پڑ گئی اور آپ ﷺ نے ان کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر یہ الفاظ گنگنا تے ہوئے واپس لوٹ گئے کہ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ سُبْحَانَ اللَّهِ مُصْطَرَفِ الْقُلُوبِ۔ پاک ہے وہ اللہ جو سب بڑائی والا ہے اور پاک ہے وہ اللہ جس کے ہاتھ میں لوگوں کے دل ہیں جدھر چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ جب زید بن حارثہ واپس آئے۔ تو زینب نے اُن سے آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے کا قصہ بیان کیا۔ اور زید کے دریافت کرنے پر کہ آپ کیا فرماتے تھے انہوں نے آپ کے یہ الفاظ بھی بیان کئے۔ اور کہائیں نے تو عرض کیا تھا کہ آپ اندر تشریف لے آئیں مگر آپ نے انکار فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔ یہ سن کر زید آنحضرت صلعم کی خدمت میں گئے اور کہا یا رسول اللہ! شاید آپ کو زینب پسند آگئی ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اُسے طلاق دیتے دیتا ہوں اور پھر آپ اس کیساتھ شادی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا ”زید خدا کا تقویٰ کرو اور زینب کو طلاق نہ دو۔“ مگر اس کے بعد زید نے زینب کو طلاق دیدی۔ یہ وہ روایت ہے جو ابن سعد اور طبری وغیرہ نے اس موقع پر بیان کی ہے اور گو اس روایت کی ایسی تشریح کی جاسکتی ہے جو چنداں قابلِ اعتراض نہیں رہتی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قصہ ازسرتا پامحض غلط اور جھوٹ ہے اور روایت و درایت ہر دو طرح سے اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہے۔ روایت تو اس قدر جانتا کافی ہے کہ اس قصہ کے راویوں میں زیادہ تر واقدی اور عبداللہ بن عامر اسلمی کا واسطہ آتا ہے اور یہ دونوں شخص محققین کے نزدیک بالکل ضعیف اور ناقابلِ اعتماد ہیں یہ حتیٰ کہ واقدی تو اپنی کذب بیانی اور دروغ بانی میں ایسی شہرت رکھتا ہے کہ غالباً مسلمان کہلانے والے راویوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور اس کے مقابلہ میں وہ روایت جو ہم نے اختیار کی ہے جس میں زید کا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر زینب کی بدسلوکی کی شکایت کرنا بیان کیا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ذکر کیا گیا ہے کہ تم خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور طلاق نہ دو۔ وہ بخاری کی روایت ہے جو دوست اور دشمن کے نزدیک قرآن شریف کے بعد اسلامی تاریخ کا صحیح ترین ریکارڈ سمجھی گئی ہے اور جس کے خلاف کبھی کسی حرف گیر کو انگشت نمانی کی جرات نہیں ہوتی۔ پس اصول روایت کی رو سے دونوں روایتوں کی قدر و قیمت ظاہر ہے اسی طرح عقلاً بھی غور کیا جاوے تو ابن سعد وغیرہ کی روایت کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا کیونکہ جب یہ بات مسلم ہے کہ زینب آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں حتیٰ کہ آپ ہی نے اُن کے ولی بن کر زید بن حارثہ سے اُن کی شادی کی تھی۔ اور دوسری طرف اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اب تک مسلمان عورتیں



پردہ نہیں کرتی تھیں بلکہ پردہ کے متعلق ابتدائی احکام حضرت زینب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے بعد نازل ہوتے تھے تو اس صورت میں یہ خیال کرنا کہ زینب کو آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا صرف اس وقت اتفاقی نظر پڑ گئی اور آپ ان پر فریفتہ ہو گئے ایک صریح اور بدیہی البطلان جھوٹ سے زیادہ حثیت نہیں رکھتا لیکن اس سے پہلے آپ نے ہزاروں دفعہ زینب کو دیکھا ہوگا اور ان کے جسم کا حسن و قبح جو کچھ بھی تھا آپ پر عیاں تھا اور گواہی کیسا تھا دیکھنا اور اڑھنی کے بغیر دیکھنا کوئی فرق نہیں رکھتا، لیکن جب رشتہ استغدر قریب تھا اور پردہ کی رسم بھی نہیں تھی اور ہر وقت کی میل ملاقات تھی تو اغلب یہ ہے کہ آپ کو کئی دفعہ انہیں بغیر اڑھنی کے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہوگا۔ اور زینب کا آپ کو اندر تشریف لانے کے لیے عرض کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت ان کے بدن پر اتنے کپڑے ضرور تھے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہونے کے لیے تیار تھیں۔ پس جس جہت سے بھی دیکھا جاوے یہ قصہ ایک محض جھوٹا اور بناوٹی قصہ قرار پاتا ہے جس کے اندر کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اور اگر ان دلائل کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی اس کامل و درجہ مقدس اور زاہدانہ زندگی کو بھی مد نظر رکھا جاوے جو آپ کی ہر حرکت و سکون سے عیاں تھی تو پھر تو اس واہیات اور فضول روایت کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ محققین نے اس قصہ کو قطعی طور پر جھوٹا اور بناوٹی قرار دیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں۔ علامہ زرقانی نے شرح مواہب میں وضاحت کے ساتھ اس روایت کو سراسر جھوٹا قرار دے کر اس کے ذکر تک کو صداقت کی ہتک سمجھا ہے اور یہی حال دوسرے محققین کا ہے۔ اور محققین پر یہی پس نہیں بلکہ ہر شخص جسے تعصب نے اندھا نہیں کر رکھا ہمارے اس بیان کو جو ہم نے قرآن شریف اور احادیث صحیحہ کی بنا پر مرتب کر کے ہدیہ ناظرین کیا ہے اس لہجہ اور ناقابل انتفات قصہ پر ترجیح دے گا جسے بعض منافقین نے اپنے پاس سے گھڑ کر روایت کیا۔ اور مسلمان مورخین نے جن کا کام صرف ہر قسم کی روایات کو جمع کرنا تھا اسے بغیر کسی تحقیق کے اپنی تاریخ میں جگہ دیدی اور پھر بعض غیر مسلم مورخین نے مذہبی تعصب سے اندھا ہو کر اسے اپنی کتب کی زینت بنایا ہے۔

اس بناوٹی قصہ کے ضمن میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ اسلامی تاریخ کا وہ زمانہ تھا جبکہ منافقین مدینہ اپنے پورے زور میں تھے اور عبداللہ بن ابی بن سلول کی سرکردگی میں ان کی طرف سے ایک باقاعدہ سازش اسلام اور بانی اسلام کو بدنام کرنے کی جاری تھی۔ اور ان کا یہ طریق تھا کہ جھوٹے اور بناوٹی قصے گھڑ گھڑ کر خفیہ خفیہ پھیلاتے رہتے تھے۔ یا اصل بات تو کچھ ہوتی تھی اور وہ اسے کچھ کا کچھ رنگ دے کر اور اس کے ساتھ سو قسم کے جھوٹ شامل کر کے اس کی درپردہ اشاعت شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن شریف کی سورۃ احزاب میں جس جگہ حضرت زینب کی شادی کا ذکر ہے اس کے ساتھ ساتھ منافقین مدینہ کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور ان کی شرارتوں کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ



بِسْمِ اللَّهِ لَا يُجَاوِزُكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۖ یعنی اگر منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں جھوٹی اور فتنہ انگیز خبروں کی اشاعت کرنے والے لوگ اپنی کارروائیوں سے باز نہ آتے تو پھر اسے نبی! ہم تمہیں ان کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی اجازت دینگے اور پھر یہ لوگ مدینہ میں نہیں ٹھہریں گے مگر تھوڑا! اس آیت میں صریح طور پر اس قصہ کے جھوٹا ہونے کی طرف اصولی اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر جیسا کہ آگے چل کر ذکر آتا ہے اسی زمانہ کے قریب قریب حضرت عائشہ کے خلاف بہتان لگاتے جانے کا خطرناک واقعہ بھی پیش آیا اور عبداللہ بن ابی اور اس کے بد باطن ساتھیوں نے اس افتراء کا اس قدر چرچا کیا اور ایسے ایسے رنگ دے کر اس کی اشاعت کی کہ مسلمانوں پر ان کا عرصہ عاقبت تنگ ہو گیا۔ اور بعض کمزور طبیعت اور ناواقف مسلمان بھی ان کے اس گندے پروپیگنڈا کا شکار ہو گئے۔ الغرض یہ زمانہ منافقوں کے خاص زور کا زمانہ تھا اور ان کا سب سے زیادہ دل پسند حربہ یہ تھا کہ جھوٹی اور گندی خبریں اڑا اڑا کر آنحضرت ﷺ اور آپ کے متعلقین کو بدنام کریں۔ یہ خبریں ایسی ہوشیاری کے ساتھ پھیلاتی جاتی تھیں کہ بعض اوقات آنحضرت ﷺ اور آپ کے اکابر صحابہ کو تفصیلی علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تردید کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور اندر ہی اندر ان کا ذہن پھیلتا جاتا تھا۔ ایسی صورتوں میں بعد میں آنے والے مسلمان جو زیادہ تحقیق و تدقیق کے عادی نہیں تھے انہیں سچا سمجھ کر ان کی روایت شروع کر دیتے تھے۔ اور اس طرح یہ روایتیں واقدی وغیرہ کے ثواب کے مسلمانوں کے مجموعہ میں راہ پاگئیں مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے صحیح احادیث میں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا اور نہ محققین نے انہیں قبول کیا ہے۔

حضرت زینب بنت جحش کے قصہ میں سرولیم میور صاحب نے جن سے یقیناً ایک بہتر ذہنیت کی اُمید کی جاتی تھی واقدی کی غلط اور بناوٹی روایت کو قبول کرنے کے علاوہ اس موقع پر یہ دلائل اڑا طعن بھی کیا ہے کہ گویا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی نفسانی خواہشات بھی ترقی کرتی جاتی تھیں اور آپ کے حرم کی توسیع کو میور صاحب اسی جذبہ پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ میں یہ حیثیت ایک مورخ کے کسی مذہبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر تاریخی واقعات کو ایک غلط راستے پر ڈالا جاتا دیکھ کر اس ناگوار اور غیر منصفانہ طرے کے خلاف آواز بلند کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ بیشک یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک نئے بارہ شادیاں کیں اور یہ بات بھی مسلمہ تاریخ کا حصہ ہے کہ علاوہ حضرت خدیجہ کے آپ کی ساری شادیاں اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جسے بڑھاپے کا زمانہ کہا جاسکتا ہے مگر بغیر کسی تاریخی شہادت کے بلکہ صریح تاریخی شہادت کے خلاف یہ خیال کرنا کہ آپ کی یہ شادیاں نعوذ باللہ جہانی خواہشات کے جذبہ کے ماتحت تھیں ایک مورخ کی شان سے بہت بعید ہے اور ایک شریف انسان کی شان سے بعید تر۔ میور صاحب اس حقیقت سے

بے خبر نہیں تھے کہ آنحضرت ﷺ نے پچیس سال کی عمر میں ایک چالیس سالہ ادھیڑ عمر کی بیوہ عورت (حضرت خدیجہ) سے شادی کی اور پھر پچاس سال کی عمر تک اس رشتہ کو اس خوبی اور وفاداری کے ساتھ نبایا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی یہ اور اس کے بعد بھی آپ نے پچپن سال کی عمر تک عملاً صرف ایک بیوی رکھی۔ اور یہ بیوی (حضرت سودہ) بھی حسن اتفاق سے ایک بیوہ اور ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں۔ اور اس تمام عرصہ میں جو جذبات نفسانی کے ہیجان کا مخصوص زمانہ ہے آپ کو کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا۔ میور صاحب اس تاریخی واقعہ سے بھی ہرگز ناواقف نہیں تھے کہ جب مکہ والوں نے آپ کی تبلیغی مساعی سے تنگ آکر اور ان کو اپنے قومی دین کا ضرب خیال کر کے آپ کے پاس غتبہ بن ربیعہ کو بطور ایک وفد کے بھیجا اور آپ سے پُر زور استدعا کی کہ آپ اپنی ان کوششوں سے رُک جائیں اور دولت اور ریاست کی ملح دینے کے علاوہ ایک یہ درخواست بھی پیش کی کہ اگر آپ کسی اچھی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے ہم سے خوش ہو سکتے ہیں اور ہمارے دین کو بُرا بھلا کئے اور اس نئے دین کی تبلیغ سے باز رہ سکتے ہیں تو آپ جس لڑکی کو پسند کریں ہم آپ کے ساتھ اس کی شادی کئے دیتے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پھر جسمانی طاقت بھی بعد کے زمانہ کی نسبت یقیناً بہتر حالت میں تھی۔ مگر جو جواب آپ نے ردِ مبارکہ کے نامیہ کو دیا وہ تاریخ کا ایک کھلا ہوا ورق ہے جس کے دوہرانے کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ یہ تاریخی واقعہ بھی میور صاحب کی نظر سے اوجھل نہیں تھا کہ مکہ کے لوگ آپ کو آپ کی بعثت سے قبل یعنی چالیس سال کی عمر تک ایک بہترین اخلاق والا انسان سمجھتے تھے مگر باوجود ان سب شہادات کے میور صاحب کا یہ گفتار پچپن سال کی عمر کے بعد جب ایک طرف آپ کی جسمانی طاقتوں میں طبعاً انحطاط رونما ہونے لگا اور دوسری طرف آپ کے مشاغل اور ذمہ داریاں اس قدر بڑھ گئیں جو ایک مصروف سے مصروف انسان کے مشاغل کو شرماتی ہیں تو آپ عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے ہرگز کوئی غیر متعصبانہ ریمارک نہیں سمجھا جاسکتا کہنے کو تو کوئی شخص جو کچھ بھی کہنا چاہے کہہ سکتا ہے اور اس کی زبان اور قلم کو روکنے کی دوسروں میں طاقت نہیں ہوتی۔ مگر عقلمند آدمی کو چاہیے کہ کم از کم ایسی بات نہ کہے جسے دوسروں کی عقل سلیم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ میور صاحب اور ان کے ہم خیال لوگ اگر اپنی آنکھوں سے تعصب کی ٹی اُتار کر دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ محض یہ بات ہی کہ آنحضرت ﷺ کی یہ شادیاں آپ کے بڑھاپے کی عمر کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جسمانی اغراض کے ماتحت نہ تھیں بلکہ ان کی تہ میں کوئی دوسری اغراض مخفی تھیں۔ خصوصاً جبکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے اپنی جوانی کے ایام ایک ایسی حالت میں گزارے جس کی وجہ سے آپ نے اپنوں اور بیگانوں سے امین کا خطاب حاصل کیا۔ مجھے اس

بات کے مطالعہ سے ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے کہ آپ کی عمر کے جس زمانہ میں آپ کی یہ شادیاں ہوئیں وہ وہ زمانہ ہے جب کہ آپ پر آپ کے فرائض نبوت کا سب سے زیادہ بار تھا اور اپنی ان لاتعداد اور بھاری ذمہ داریوں کی ادائیگی میں آپ بالکل محو ہو رہے تھے۔ اور میرے نزدیک اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر انصاف پسند شریف انسان کے نزدیک محض یہ منظر ہی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ آپ کی یہ شادیاں آپ کے فرائض نبوت کا حقہ تھیں جو آپ نے اپنی خانگی خوشی کو برباد کرتے ہوئے تبلیغ و تربیت کی اغراض کے ماتحت کیں۔ ایک بُرا آدمی دوسرے کے افعال میں بُری نیت تلاش کرتا ہے اور اپنی گندی حالت کی وجہ سے بسا اوقات دوسرے کی نیک نیت کو سمجھ بھی نہیں سکتا مگر ایک شریف انسان اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے کہ بسا اوقات ایک ہی فعل ہوتا ہے جسے ایک گندہ آدمی بُری نیت سے کرتا ہے مگر اسی کو ایک نیک آدمی نیک اور پاک نیت سے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ میں اس موقع پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں شادی کی غرض یہ نہیں ہے کہ مرد اور عورت اپنی انسانی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے اکٹھے ہو سکیں۔ بلکہ گنسل انسانی کے بقا کے لیے مرد و عورت کا اکٹھا ہونا نکاح کی ایک جائز غرض ہے مگر اس میں بہت سی اور پاکیزہ اغراض بھی مد نظر ہیں۔ پس ایک ایسے انسان کی شادیوں کی وجہ تلاش کرتے ہوئے جس کی زندگی کا ہر حرکت و سکون اس کی بے نفسی اور پاکیزگی پر ایک دلیل ہے گندے آدمیوں کی طرح گندے خیالات کی طرف مائل ہونے لگا اس شخص کو تو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جس کے متعلق راستے لگائی جاتی ہے مگر راستے لگانے والے کے اپنے اندرون کا آئینہ ضرور سمجھا جاسکتا ہے پس اس سے زیادہ میں اس اعتراض کے جواب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا يَصِفُونَ۔

کیا آنحضرت ﷺ اپنے مفید مطلب وحی اُتار لیا کرتے تھے؟  
میور صاحب اور مارگولیس صاحب نے  
اس موقع پر یہ طعن بھی کیا ہے کہ آنحضرت

ﷺ نے اس موقع پر اپنے مفید مطلب وحی اُتار لی۔ یعنی جب زینب کے ساتھ شادی کی خواہش پیدا ہوئی تو اُسے جائز کرنے اور لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لیے الہام کی آڑ لے لی اور اس میں ان کا اشارہ یہ ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ کو خدا کی طرف سے وحی والہام وغیرہ نہیں ہوتے تھے بلکہ نوحہ باللہ آپ خود ہی اپنی طرف سے الہام بنا کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ اس سوال کے مذہبی پہلو سے تو بحیثیت مؤرخ ہونے کے میرا کوئی سروکار نہیں ہے مگر یہ خیال تاریخی طور پر غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ہمیشہ اپنے مفید مطلب وحی ہو جایا کرتی تھی۔ آپ کی زندگی اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بسا اوقات آپ کی ذاتی خواہش کے خلاف وحی نازل ہوتی تھی۔ چنانچہ یہی قصہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔ قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ آنحضرت ﷺ زینب کے ساتھ شادی کرنے سے خائف تھے اور اسے حتیٰ الوسع ٹالنا چاہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے حکماً آپ کو اس طرف مائل کیا بلکہ ایک گوند تادیب بھی فرمائی کہ تَخَشَّى النَّاسَ وَاللّٰهُ

أَحَقُّ أَنْ تَخْشَهُ لِيَعْنِي "اے نبی! تم لوگوں کی وجہ سے خائف ہو حالانکہ صرف ہم ہی اس بات کے حقدار ہیں کہ ہم سے ڈرا جاوے" پس غور کیا جاوے تو جس قصہ کے ضمن میں میور صاحب نے ایک جھوٹی روایت پر بناء رکھ کر یہ اعتراض اٹھایا ہے وہی اُسے جھوٹا ثابت کر رہا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب غزوہ تبوک کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض منافقوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دیدی تو اس پر یہ وحی الہی نازل ہوئی کہ عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ لِيَعْنِي "اے نبی! خدا تمہیں معاف فرمائے تم نے انہیں کیوں اجازت دی ہم تو اس موقع پر مومن و منافق میں امتیاز پیدا کرنا چاہتے تھے" اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین کا جنازہ پڑھ دیا اور آپ کی رائے تھی کہ اس میں کوئی حرج نہیں تو اس پر یہ وحی الہی نازل ہوئی کہ لَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ لِيَعْنِي "آئندہ ان منافقوں میں کسی کا جنازہ نہ پڑھو۔ اور نہ کسی کی قبر پر دُعا مانگو۔ کیونکہ دراصل وہ کافر ہیں اور خدا کی نافرمانی کی حالت میں مرتے ہیں" اسی طرح بخاری میں آتا ہے کہ جب آپ نے غزوہ احد میں زخمی ہونے پر ایسے طریق پر دُعا کی جو قریش کے خلاف ایک گونہ بد دُعا کا رنگ رکھتا تھا تو اس پر یہ قرآنی آیت اتری کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ لِيَعْنِي تمہیں اس معاملہ میں سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کسے چھوڑتے اور کسے عذاب دیتے ہیں" اسی طرح جب آپ کی بیویوں کی تعداد اس حد کو پہنچ گئی جو خدائی علم میں ضروری تھی تو آپ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ اب اس کے بعد تمہیں کسی اور شادی کی اجازت نہیں ہے۔ الغرض یہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق وحی اُتار لیا کرتے تھے اور یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو تاریخ اسلامی سے قطعاً نااہل ہے۔ پھر زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ میور صاحب اور مارگولیس صاحب تو زینب کی شادی کے موقع پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مفید مطلب وحی اُتار لی مگر حدیث میں یہ آتا ہے کہ چونکہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء اور ارادے کے بالکل خلاف وحی نازل ہوئی تھی اس لیے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کوئی وحی چھپائی ہوئی تو ضرور اس وحی کو چھپاتے جو آپ کی مرضی کے خلاف ہونے کے علاوہ ایک گونہ عتاب کا بھی رنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں لَوْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَاتِمًا شَيْئًا لَكُنْتُمْ بِهِ لَعْنَةً لِيَعْنِي اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی وحی کو چھپانے والے ہوتے تو ضرور اس وحی کو چھپاتے۔ پس اپنے مفید مطلب وحی اُتار لینے کا اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کے مطابق وحی نازل ہو جاتی تھی۔ سو یہ درست ہے۔ مگر یہ ہرگز جانتے اعتراض نہیں بلکہ یہی بات آپ کی صداقت



اور کمال کی دلیل ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ يَعْنِي "اے نبی! تو اس خدائی دین اسلام پر راستی اور سدا کے ساتھ قائم ہو جا جس کی بناوٹ، انسانی فطرت کے مطابق بنائی گئی ہے" اور عقلاً بھی غور کیا جاوے تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ فطرت انسانی شریعت کے مطابق بنائی جاتی۔ یا بالفاظ دیگر شریعت کو فطرت انسانی کے مطابق اُتارا جاتا۔ پس فطرت صحیحہ اور شریعت اسلامی کا توارد تو ضروری ہے اور جتنی جتنی کسی شخص کی فطرت زیادہ صاف اور بیرونی اثرات سے زیادہ پاک ہوتی ہے اتنا ہی وہ شریعت کی روح کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہذا یہ ضرور تھا کہ دوسرے انسانوں کی نسبت آنحضرت ﷺ کے طبعی میلانات شریعت اسلامی کے زیادہ قریب ہوتے۔ اور عام حالات میں آپ کی رائے اسی رستے پر چلتی جس رستے پر شریعت کا نزول ہونا تھا۔ مگر یہ بالکل درست نہیں کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا کیونکہ بہر حال آنحضرت ﷺ انسان تھے اور بشری لوازمات کے ماتحت ضروری تھا کہ کبیں کبیں اختلاف بھی ہو جاتا۔ علاوہ ازیں چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات واضح کرنا منظور تھی کہ جو وحی آپ پر نازل ہوتی ہے وہ آپ کے دل و دماغ سے ایک بالامنع رکھتی ہے اور ایک ورامہ الوہاستی کی طرف سے آتی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے حکیمانہ تصرف کے ماتحت ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں رہنے دی کہ آنحضرت ﷺ کا خیال کچھ تھا اور وحی کچھ اور نازل ہوئی یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کی خواہش کچھ تھی اور وحی کچھ اور نازل ہوئی۔ پس میور صاحب اور مارگولیس صاحب کا اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

غزوہ بنو مصطلق اور واقعہ افک شعبان ۵ھ

قریش کی مخالفت دن بدن زیادہ خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی وہ اپنی ریشہ دوانی سے عرب کے بہت سے قبائل کو اسلام اور باقی اسلام کے خلاف کھڑا کر چکے تھے لیکن اب ان کی عداوت نے ایک نیا خطرہ پیدا کر دیا اور وہ یہ کہ حجاز کے وہ قبائل جو مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے تھے اب وہ بھی قریش کی فتنہ انگیزی سے مسلمانوں کے خلاف اٹھنے شروع ہو گئے۔ اس معاملہ میں پہل کرنے والا مشہور قبیلہ بنو خزاعہ تھا جنکی ایک شاخ بنو مصطلق نے مدینہ کے خلاف حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی تھی اور ان کے رئیس حرث بن ابی ضرار نے اس علاقہ کے دوسرے قبائل میں دورہ کر کے بعض اور قبائل کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ یہ آنحضرت ﷺ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے مزید احتیاط کے طور پر اپنے ایک صحابی بریدہ بن حصیب نامی کو دریافت حالات کے لیے بنو مصطلق کی طرف روانہ فرمایا اور ان کو تاکید فرمائی کہ بہت جلد واپس آکر حقیقتہ الامر سے آپ کو اطلاع دیں۔ بریدہ گئے تو دیکھا کہ واقعی ایک بہت بڑا اجتماع ہے اور نہایت زور شور سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے فوراً واپس آکر آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی۔ اور آپ نے





میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے مگر مسلمانوں نے ایسی ہوشیاری کے ساتھ ان کا گھیرا ڈالا کہ ساری کی ساری قوم محصور ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ اور صرف دس کفار اور ایک مسلمان کے قتل پر اس جنگ کا جو ایک خطرناک صورت اختیار کر سکتا تھا خاتمہ ہو گیا۔

اس موقع پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسی غزوہ کے متعلق صحیح بخاری میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنو مصطلق پر ایسے وقت میں حملہ کیا تھا کہ وہ غفلت کی حالت میں اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے بلکہ غور سے دیکھا جاوے تو یہ روایت مؤرخین کی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ درحقیقت دو روایتیں دو مختلف وقتوں سے تعلق رکھتی ہیں یعنی واقعہ یوں ہے کہ جب اسلامی لشکر بنو مصطلق کے قریب پہنچا تو اس وقت چونکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مسلمان بالکل قریب آگئے ہیں لہذا انہیں اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع ضرور ہو چکی تھی وہ اطمینان کے ساتھ ایک بے ترتیبی کی حالت میں پڑے تھے اور اسی حالت کی طرف بخاری کی روایت میں اشارہ ہے، لیکن جب ان کو مسلمانوں کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی مستقل سابقہ تیاری کے مطابق فوراً صف بند ہو کر مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اور یہ وہ حالت ہے جس کا ذکر مؤرخین نے کیا ہے۔ اس اختلاف کی یہی تشریح علامہ ابن حجر اور بعض دوسرے محققین نے کی ہے اور یہی درست معلوم ہوتی ہے۔

جنگ کے اختتام کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند دن تک مریض میں قیام فرمایا مگر اس قیام کے دوران منافقین کی طرف سے ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آیا جس سے قریب تھا کہ کمزور مسلمانوں میں خانہ جنگی تک نوبت پہنچ جاتی مگر آنحضرت ﷺ کی موقع شناسی اور مقناطیسی اثر نے اس فتنہ کے خطرناک نتائج سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر کا ایک نوکر جبہ نامی مریض کے مقامی چشمہ پر سے پانی لینے کے لیے گیا اتفاقاً اسی وقت ایک دوسرا شخص سنان نامی بھی جو انصار کے حلیفوں میں سے تھا پانی لینے کے لیے وہاں پہنچا۔ یہ دونوں شخص جاہل اور عامی لوگوں میں سے تھے۔ چشمہ پر یہ دونوں شخص آپس میں جھگڑ پڑے اور جبہ نے سنان کو ایک ضرب لگادی۔ بس پھر کیا تھا سنان نے زور زور سے چلاتا شروع کر دیا کہ اے انصار کے گروہ! میری مدد کو پہنچو کہ میں پڑ گیا۔ جب جبہ نے دیکھا کہ سنان نے اپنی قوم کو بلایا ہے تو اس نے بھی اپنی قوم کے لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا کہ اے مہاجرین بھاگیو دوڑو لیکن جن انصار و مہاجرین کے کانوں میں یہ آواز پہنچی وہ اپنی تلواریں لے کر بے تحاشا اس چشمہ کی طرف لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک اچھا خاصہ جمع ہو گیا اور قریب تھا کہ بعض جاہل نوجوان ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے مگر اتنے میں بعض سمجھدار اور مخلص مہاجرین و انصار بھی موقع پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے فوراً لوگوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے صلح صفائی کروادی۔ آنحضرت ﷺ

کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا: "یہ ایک جاہلیت کا مظاہرہ ہے اور اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور اس طرح معاملہ دفع دفع ہو گیا، لیکن جب منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کو جو اس غزوہ میں شامل تھا اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو اس بد بخت نے اس فتنہ کو پھر جگانا چاہا۔ اور اپنے ساتھیوں کو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ اکسایا۔ اور کہا یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے کہ تم نے ان بے خانماں مسلمانوں کو پناہ دیکر ان کو سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب بھی تمہیں چاہیے کہ ان کی اعانت سے دست بردار ہو جاؤ پھر یہ خود بخود چھوڑ چھاڑ کر چلے جائیں گے اور بالآخر اس بد بخت نے یہاں تک کہہ دیا کہ لَسْتُ بِمَدِينَةٍ رَّجَحْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَنُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِمَّا الْأَذَلَّ - یعنی "دیکھو تو اب مدینہ میں جا کر عزت والا شخص یا گروہ وہ ذلیل شخص یا گروہ کو اپنے شہر سے باہر نکال دیتا ہے یا نہیں؟" اُس وقت ایک مخلص مسلمان بچہ زید بن ارقم بھی وہاں بیٹھا تھا اُس نے عبداللہ کے منہ سے آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ الفاظ سنے تو بے تاب ہو گیا۔ اور فوراً اپنے چچا کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اُس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس حضرت عمرؓ بھی بیٹھے تھے۔ وہ یہ الفاظ سن کر غصہ و غیرت سے بھر گئے۔ اور آنحضرت ﷺ سے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق فتنہ پرداز کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا: "عمر! جانے دو۔ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ لوگوں میں یہ چرچا ہو کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کروانا پھرتا ہے؟" پھر آپ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلوا بھیجا اور اُن سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ سب قسمیں کھا گئے کہ ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی بعض انصار نے بھی بطریق سفارش عرض کیا کہ زید بن ارقم کو غلطی لگی ہوگی۔ آپ نے اس وقت عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بیان کو قبول فرمایا۔ اور زید کی بات رد کر دی جس سے زید کو سخت صدمہ ہوا مگر بعد میں قرآنی وحی نے زید کی تصدیق فرمائی اور منافقین کو جھوٹا قرار دیا۔ ادھر تو آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی وغیرہ کو بلا کر اس بات کی تصدیق شروع فرمادی اور ادھر آپ نے حضرت عمرؓ سے ارشاد فرمایا کہ اسی وقت لوگوں کو کوچ کا حکم دیدو۔ یہ وقت دوپہر کا تھا جبکہ آنحضرتؐ عموماً کوچ نہیں فرمایا کرتے تھے کیونکہ عرب کے موسم کے لحاظ سے یہ وقت سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے اور اس میں سفر کرنا نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے مگر آپ نے اس وقت کے حالات کے مطابق یہی مناسب خیال فرمایا کہ ابھی کوچ ہو جاوے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے ماتحت فوراً سارا اسلامی لشکر واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔ غالباً اسی موقع پر اسید بن حضیر انصاری جو قبیلہ اوس کے نہایت نامور رہتے تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ تو عموماً ایسے وقت میں سفر نہیں فرمایا کرتے۔ آج کیا معاملہ ہے؟

آپ نے فرمایا: "اسید! کیا تم نے نہیں سنا کہ عبداللہ بن ابی نے کیا الفاظ کہے ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ہم مدینہ چلے گئے ہیں۔ وہاں پہنچ کر عزت والا شخص ذلیل شخص کو باہر نکال دیگا۔" اسید نے بے ساختہ عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ! آپ چاہیں تو بے شک عبداللہ کو مدینہ سے باہر نکال سکتے ہیں کیونکہ واللہ عزت والے آپ ہیں اور وہی ذلیل ہے۔" پھر اسید بن حضیر نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ آپ کے تشریف لانے سے قبل عبداللہ بن ابی اپنی قوم میں بہت معزز تھا اور اس کی قوم اس کو اپنا بادشاہ بنانے کی تجویز میں تھی جو آپ کے تشریف لانے سے خاک میں مل گئی۔ پس اس وجہ سے اس کے دل میں آپ کے متعلق حسد بیٹھ گیا ہوا ہے اس لیے آپ اس کی اس بکواس کی کچھ پروا نہ کریں اور اس سے درگزر فرماویں۔" تھوڑی دیر میں عبداللہ بن ابی کا روٹکا جس کا نام جباب تھا مگر آنحضرت ﷺ نے اُسے بدل کر عبداللہ کر دیا تھا اور وہ ایک بہت خصلت صحابی تھا گھبراہوا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آپ میرے باپ کی گستاخی اور فتنہ انگیزی کی وجہ سے اس کے قتل کا حکم دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو آپ مجھے حکم فرماتے ہیں ابھی اپنے باپ کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا داتا ہوں مگر آپ کسی اور کو ایسا ارشاد نہ فرمائیں۔ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کوئی جاہلیت کی رگ میرے بدن میں جوش مارے اور میں اپنے باپ کے قاتل کو کسی وقت کوئی نقصان پہنچا بیٹھوں اور خدا کی رضا چاہتا ہوں بھی جہنم میں جاگروں؟" آپ نے اسے تسلی دی اور فرمایا کہ ہمارا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے بلکہ ہم بہر حال تمہارے والد کے ساتھ نرمی اور احسان کا معاملہ کریں گے مگر عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کو اپنے باپ کے خلاف اتنا جوش تھا کہ جب لشکر اسلامی مدینہ کی طرف لوٹا تو عبداللہ اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا جب تک تم اپنے منہ سے یہ اقرار نہ کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معزز ہیں اور تم ذلیل ہو اور عبداللہ نے اس اصرار سے اپنے باپ پر زور ڈالا کہ آخر اُس نے مجبور ہو کر یہ الفاظ کہہ دیئے جس پر عبداللہ نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔

جب واپسی کا کوچ شروع ہوا تو اس دن کا بقیہ حصہ اور ساری رات اور اگلے دن کا ابتدائی حصہ لشکر اسلامی برابر لگا تار چلتا رہا۔ اور جب بالآخر ڈیرہ ڈالا گیا تو لوگ اس قدر تھک کر چور ہو چکے تھے کہ مقام کرتے ہی ان میں سے اکثر گھری نیند سو گئے تھے اور اس طرح آنحضرت ﷺ کی بیدار مغزی سے لوگوں کی توجہ اس ناگوار واقعہ کی طرف سے ہٹ کر ایک لمبے وقفہ تک دوسری طرف لگی رہی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو منافقین کی فتنہ انگیزی سے بچالیا۔ دراصل منافقین مدینہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے مسلمانوں میں خانہ جنگی اور باہمی انشقاق کی صورت پیدا کر دیں۔ نیز اگر ممکن ہو تو ان کی نظر میں آنحضرت ﷺ کی عزت کو کم کر دیں۔ مگر اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مقناطیسی شخصیت نے مسلمانوں میں ایسا رشتہ اتحاد پیدا کر دیا تھا کہ کوئی



سازش اس میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی ذات کے متعلق تو مسلمانوں کے دلوں میں عزت و احترام اخلاص و ایمان اور محبت و عشق کے وہ جذبات راسخ ہو چکے تھے کہ انہیں مترنزل کرنا کسی بشر کی طاقت میں نہیں تھا۔ چنانچہ اسی موقعہ پر دیکھ لو کہ عبداللہ بن ابی ریس المنافقین نے دو عامی مسلمانوں کے ایک وقتی جھگڑے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کس طرح صحابہ میں اختلاف و انشقاق کا بیج بونے اور آنحضرت ﷺ کی محبت و رعب کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کیسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور خدا نے اُسے خود اس کے بیٹے کے ہاتھوں سے وہ ذلت کا پیالہ پلایا جو اُسے غالباً مرتے دم تک نہ بھولا ہوگا۔

### واقعہ افک

مگر نہ معلوم منافقین مدینہ کی مٹی میں کس فتنہ کا خمیر تھا کہ کوئی واقعہ ان کی آنکھوں کو نہ کھوتا تھا۔ بلکہ ہر ناکامی ان کی شرارت اور فتنہ پر داری کو اور بھی زیادہ کردیتی تھی چنانچہ اسی سفر کی واپسی میں ان کی طرف سے ایک اور خطرناک فتنہ کھڑا کیا گیا جو اپنی نوعیت اور مفسدانہ اثر کے لحاظ سے اس فتنہ سے بھی بہت زیادہ خطرناک تھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہ واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت لگاتے جانے کا واقعہ ہے جو اسی غزوہ کے سفر واپسی میں پیش آیا۔ یہ تہمت اسی نوعیت کی تھی جیسی کہ حضرت علیؓ کی والدہ حضرت مریم اور راجندر جی کی بیوی سیتا پر بد باطن لوگوں نے لگائی اور بہتر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کے اپنے الفاظ میں اسے بیان کیا جاوے کیونکہ وہ ایک بہت مفصل اور دلچسپ بیان ہے جس سے اصل واقعہ کے متعلق یقینی علم حاصل ہونے کے علاوہ اس زمانہ کے تمدن اور طریق و اطوار پر بھی بہت روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ کی طرف سے جو روایت بیان ہوئی ہے اس کے ضروری ضروری اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ:-

”آنحضرت ﷺ کا یہ طریق تھا کہ جب آپ کسی سفر پر جانے لگتے تھے تو اپنی ازواج میں قرعہ ڈالتے تھے پھر جس کا نام نکلتا تھا اُسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک غزوہ کے موقعہ پر اسی طرح قرعہ ڈالا تو میرا نام نکلا۔ چنانچہ مجھے آپ اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ جب یہ رودہ کے احکام نازل ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس سفر میں میں ہودہ کے اندر بیٹھی تھی اور لوگ میرے ہودہ کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے اور جہاں قیام کرنا ہوتا تھا وہاں میرے ہودہ کو اتار کر نیچے رکھ دیتے۔ جب آنحضرت ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہو کر واپس لوٹے اور ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک دن آپ نے رات کے وقت کوچ کا حکم دیا جب میں نے یہ اعلان سنا تو میں حواجج انسانی سے فارغ ہونے کے لیے شکر سے باہر نکل کر ایک طرف کو گئی اور فارغ ہو کر واپس لوٹ آئی۔ جب میں اپنے اونٹ کے قریب پہنچی



تو میں نے معلوم کیا کہ میرے گلے کا ہار نثار رہے۔ اُس کی تلاش میں میں پھر واپس گئی اور اس تلاش میں مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اس اثناء میں وہ لوگ جو میرا ہودہ اٹھانے پر متعین تھے آئے اور یہ خیال کر کے کہ میں ہودہ کے اندر ہوں انہوں نے میرا ہودہ اٹھا کر اونٹ کے اوپر رکھ دیا اور لشکر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چونکہ اس زمانہ میں بوجہ کم خوری اور تنگی معیشت کے عورتیں بہت دُلی پتلی ہوتی تھیں اور ان کے بدنوں پر گوشت نہیں آتا تھا اس لیے ہودہ اٹھانے والوں کو ہودہ کے ہلکا ہونے کا شبہ نہیں گذرا۔ اور پھر میری عمر بھی اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ بہر حال جب میں ہار کی تلاش کر لینے کے بعد واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ لشکر جا چکا ہے اور میدان خالی پڑا ہے۔ میں سخت پریشان ہوئی مگر میں نے دل میں سوچا کہ مجھے اپنی جگہ پر ٹھہرے رہنا چاہیے کیونکہ جب لوگوں کو میرے پیچھے رہ جانے کا علم ہوگا تو وہ ضرور واپس آئیں گے۔ پس میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آ گئی۔ اب واقعہ یوں ہوا کہ صفوں بن معطل ایک صحابی تھا جس کی ڈیوٹی یہ مقرر تھی کہ وہ لشکر اسلامی کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ (تاکہ گری پڑی چیز وغیرہ کی حفاظت ہو سکے) وہ جب پیچھے سے آیا اور صبح کے قریب میری جگہ پر پہنچا تو اس نے مجھے وہاں اکیلے سوتے ہوئے دیکھا۔ اور چونکہ وہ پردہ کے احکام کے نازل ہونے سے قبل مجھے دیکھ چکا تھا اُس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ جس پر اس نے گھبرا کر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعُوْنَ کہا۔ اس کی اس آواز سے میں جاگ اُٹھی اور میں نے اُسے دیکھتے ہی جھٹ اپنا منہ اپنی اور صفی سے ڈھا تک لیا۔ اور خدا کی قسم اُس نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اس کلمہ کے سوا اس کے منہ سے کوئی اور الفاظ سنے۔ اس کے بعد وہ اپنے اونٹ کو آگے لایا۔ اور میرے قریب اُسے بٹھا دیا۔ اور اس نے اونٹ کے دونوں گھٹنوں پر اپنا پاؤں رکھ دیا (تاکہ وہ اچانک نہ اُٹھ سکے) چنانچہ میں اونٹ کے اوپر سوار ہو گئی اور صفوں اس کے آگے آگے اُس کی ہمارے ساتھ ہوتے چلنے لگ گیا۔ حتیٰ کہ ہم چلتے چلتے اس جگہ آپہنچے جہاں لشکر اسلامی ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ پس یہ وہ قصہ ہے جس پر ہلاک ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے ہلاک ہونا تھا۔ اور اس بُہتان کا بانی مہابی عبداللہ بن ابی بن سلول (رتیس المنافقین) تھا۔

اس کے بعد ہم لوگ مدینہ میں پہنچ گئے اور اتفاق ایسا ہوا کہ میں وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئی اور برابر ایک ماہ تک بیمار رہی۔ اور اس عرصہ میں لوگوں میں بہتان لگانے والوں کی باتوں کے متعلق بہت چرچا رہا۔ اور ہر طرح کی چہ میگوئی ہوتی رہی۔ مگر اس وقت تک مجھے اس تہمت کے متعلق قطعاً کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ مجھے اپنی اس بیماری کے ایام میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وہ شفقت و مہربانی نظر نہیں آتی تھی جو آپ عموماً مجھ پر فرمایا کرتے تھے اور اس کا مجھے سخت قلق تھا۔ رسول اللہ ﷺ

میرے پاس آتے تھے تو بس سلام کہہ کر صرف اتنی بات فرماتے تھے کہ اب کیا حال ہے؟ اور پھر لوٹ جلتے تھے اور آپ کے اس طریق سے مجھے دل ہی دل میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں اسی بے خبری کی حالت میں پڑی رہی حتیٰ کہ میری بیماری نے مجھے سخت نڈھال اور کمزور کر دیا۔ انہی ایام میں مجھے ایک دن ایک عورت اُمّ مسطح سے جو دُور سے ہماری رشتہ دار بھی تھی اتفاقاً طور پر ہتھان لگانے والوں کا قصہ معلوم ہوا اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان الزام لگانے والوں میں اُمّ مسطح کا لڑکا مسطح بھی شامل تھا۔ جب میں نے یہ باتیں سنیں تو مجھے تو گویا اپنی اصل بیماری بھول کر ایک نئی بیماری لگ گئی۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ عادت تشریف لا کر یہ دریافت فرمایا کہ اب کیا حال ہے؟ تو میں نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ اجازت دیں تو میں چند دن کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں آپ نے اجازت دے دی اور میں اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ اس سے دراصل میرا منشاء یہ تھا کہ والدین کے گھر جا کر میں اس خبر کے متعلق تحقیق کرونگی کہ کیا واقعی میرے متعلق اس قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں چنانچہ میں نے وہاں جا کر اپنی والدہ سے دریافت کیا۔ میری ماں نے کہا: بیٹی! تو پریشان نہ ہو۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں اور وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زیادہ محبت کرتا ہے تو ایسی عورت کے متعلق دوسری عورتیں خواہ خواہ باتیں بنانے لگ جاتی ہیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا لوگ میرے متعلق واقعی یہ باتیں کر رہے ہیں؟ پھر میں رونے لگ گئی اور ساری رات میرے آنسو نہیں تھے اور نہ میں سوئی۔ اور جب صبح ہوئی تو اس وقت بھی میرے آنسو جاری تھے۔

اس دن رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید کو مشورہ کے لیے بلایا۔ کیونکہ وحی کے نزول میں بہت وقفہ پڑ گیا تھا (اور آپ اس معاملہ میں بہت فکر مند تھے) آپ نے ان دونوں سے میرے متعلق مشورہ پوچھا کہ ان حالات میں کہ اس قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آیاتیں عالتشہ سے قطع تعلق کر لوں؟ اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! عالتشہ آپ کی بیوی ہیں (یعنی خدا تعالیٰ نے جو عالتشہ کو آپ کی بیوی بننے کے لیے چنا ہے تو انہیں اس کا اہل جان کر چنا ہے) اور خدا کی قسم ہم تو عالتشہ کے متعلق سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں جانتے مگر علیؑ نے (آنحضرت ﷺ کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے) یہ جواب دیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ پر کوئی تلخی نہیں فرمائی اور عالتشہ کے سوا عورتوں کی کمی بھی نہیں ہے (مگر میں اصل واقعہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا) آپ گھر کی خادمہ سے دریافت فرمائیں شاید اُسے کچھ علم ہو۔ اور وہ صحیح صحیح بات بتا سکے۔ اس پر آپ نے اپنی خادمہ بریرہ کو بلایا۔ اور اس سے پوچھا کہ کیا تم نے عالتشہ میں کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے کسی قسم کا شبہ پیدا ہوتا ہو؟ بریرہ نے جواب دیا کہ مجھے خدا کی قسم ہے جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ میں نے اپنی بی بی میں کوئی بُری بات نہیں دیکھی سوائے اس کے کہ خور و سال کی وجہ سے وہ کسی قدر بے پروا ضرور ہیں۔ چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اُٹا گوندھا ہوا کھلا

چھوڑ کر سو جاتی ہیں اور بکری آتی ہے اور آٹا کھا جاتی ہے۔

پھر اُسی دن آنحضرت ﷺ نے مسجد میں ایک تقریر کی اور فرمایا کہ مجھے میرے اہل کے بارے میں بہت دکھ دیگیا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس کا سدباب کرے؟ اور خدا کی قسم مجھے تو اپنی بیوی کے متعلق سوائے خیر و نیکی کے اور کوئی علم نہیں ہے۔ اور جس شخص کا اس معاملہ میں نام لیا جاتا ہے اُسے بھی میں اپنے علم میں نیک خیال کرتا ہوں۔ اور وہ کبھی میرے گھر میں میری غیر حاضری میں نہیں آیا۔ آپ کی اس تقریر کو سُنکر سعد بن معاذ رتیس قبیلہ اوس کھڑے ہو گئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اس کا سدباب کرتا ہوں۔ اگر تو یہ شخص ہمارے قبیلہ میں سے ہے تو ہمارے نزدیک وہ واجبِ اقتل ہے۔ ہم ابھی اس کی گردن اڑائے دیتے ہیں اور اگر وہ ہمارے بھائیوں یعنی قبیلہ خزرج میں سے ہے تو پھر بھی جس طرح آپ حکم فرماتے ہیں ہم کرنے کو تیار ہیں۔ اس پر قبیلہ خزرج کے رتیس سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور وہ ایک صالح آدمی تھے مگر اس وقت انہیں جاہلانہ غیرت آگئی۔ اور وہ سعد بن معاذ کو مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ تم نے جھوٹ کہا ہے۔ خدا کی قسم! تم ہرگز ہمارے کسی آدمی کو قتل نہیں کر سکو گے اور نہ تم میں یہ طاقت ہے کہ ایسا کرو۔ اور اگر وہ ہمارے قبیلہ میں سے ہوتا تو تم ایسی بات نہ کہتے۔ اس پر اُسید بن حضیر رتیس اوس جو سعد بن معاذ کے چچا زاد بھائی تھے اُٹھے اور سعد بن عبادہ سے کہنے لگے کہ سعد بن معاذ جھوٹا نہیں ہے بلکہ تم جھوٹے ہو اور تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے ہو کر لڑتے ہو۔ ان باتوں سے اوس و خزرج کے بعض لوگوں کو جوش آگیا اور قریب تھا کہ لڑائی ہو جاتی مگر آنحضرت ﷺ نے جو ابھی تک منبر پر ہی تشریف رکھتے تھے سبھاٹھا کر سب کو ٹھنڈا کیا اور پھر آپ منبر سے اُتر کر گھر تشریف لے گئے۔ اور میرا بدستور وہی حال تھا کہ آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ اور نیند حرام ہو رہی تھی اور برابر دو رات اور ایک دن میرا یہی حال رہا۔ اور میں سمجھتی تھی کہ میرا جگر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔

اسی حالت میں میں اپنے والدین کے پاس بیٹھی رو رہی تھی کہ ایک انصاری عورت اجازت لے کر اندر آئی اور میرے پاس بیٹھ کر ہمدردی کے طریق پر وہ بھی رونے لگ گئی۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور یہ پہلا دن تھا کہ آپ اس اثناء کے بعد میرے پاس بیٹھے تھے اور ایک مہینہ ہو گیا تھا کہ میرے متعلق خدائی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھے ہوئے کلمہ تشہد پڑھا۔ اور خدا کو یاد کیا۔ پھر مجھے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ عائشہ! مجھے تمہارے متعلق اس قسم کی باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تو تم بے گناہ ہو تو مجھے اُمید ہے کہ خدا ضرور تمہاری بریت ظاہر فرمائے گا اور اگر تم سے کوئی لغزش ہو گئی ہے تو تمہیں چاہیے کہ خدا سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف جھکو کیونکہ جب بندہ خدا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوا جھک جاتا ہے تو خدا اس کی توبہ کو قبول کرتا اور اس پر رحم فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ نے یہ تقریر فرمائی تو میں نے دیکھا کہ میرے آنسو بالکل خشک ہو گئے اور

اُن کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس وقت میں نے اپنے والد اور والدہ سے کہا کہ آپ رسول اللہ سے اس بات کا جواب عرض کریں۔ انہوں نے کہا ”خدا کی قسم ہمیں تو کچھ نہیں سوچتا کہ ہم کیا جواب دیں۔“ اس وقت میں ایک کم عمر لڑکی تھی اور مجھے قرآن بھی زیادہ نہیں آتا تھا مگر والدین کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے خود آپ سے عرض کیا کہ خدا کی قسم میں جانتی ہوں کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں پہنچی ہیں جو بعض لوگ میرے متعلق کر رہے ہیں اور آپ کے دل پر ان باتوں کا اثر ہے پس اگر میں یہ کہوں کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ میری بات میں شک کریں گے۔ اور اگر میں اپنے آپ کو اس معاملہ میں گناہ گار مان لوں حالانکہ میرا خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ مجھے سچا جانیں گے خدا کی قسم مجھے تو اپنا معاملہ یوسف کے باپ کا سا نظر آتا ہے جس نے یہ کہا تھا کہ صَبْرٌ جَبِيلٌ ۚ قَالَ اللَّهُ اَلْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۔ پس میرے لیے بھی صبر ہی بہتر ہے اور میں صرف خدا ہی کی مدد چاہتی ہوں ان باتوں کے متعلق جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ لکھ کر میں اپنی جگہ پر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی اور اس وقت میرے دل میں یہ یقین تھا کہ میں چونکہ بے گناہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور جلد میری بریت ظاہر فرمائے گا۔ مگر مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ میری بریت میں کوئی قرآنی وحی نازل ہوگی اور خدا تعالیٰ اپنے صریح کلام میں میرے بے گناہ ہونے کو ظاہر فرمائے گا بلکہ میں سمجھتی تھی کہ شاید اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ کو کوئی رؤیا وغیرہ دکھائی جاوے مگر خدا کی قسم آپ ابھی اس مجلس سے اٹھنے نہیں پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی اور شخص اٹھ کر باہر گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وہ حالت طاری ہوگئی جو وحی کے وقت ہوا کرتی تھی اور باوجود سردی کے آپ کے چہرہ سے پسینہ کے قطرے ٹپکنے لگ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ حالت جاتی رہی اور آپ نے ہنسنے فرماتے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ عائشہ! خدا نے تمہاری بریت ظاہر فرمادی ہے جس پر میری ماں بے اختیار ہو کر بولیں۔ عائشہ! اٹھو! اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو۔ (میرا دل چونکہ اس وقت خدا کے شکر سے لبریز تھا) میں نے کہا۔ میں کیوں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں تو صرف اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس نے میری بریت ظاہر فرمائی ہے۔ اُس وقت سورۃ نور کی وہ دس آیات نازل ہوئی تھیں جو اِنَّ الَّذِیْنَ جَاؤْا بِاِلٰہِ فِتْنٍ سے شروع ہوتی ہیں۔

جب میری بریت ظاہر ہوگئی تو میرے والد ابو بکرؓ نے جو بوجہ غربت اور رشتہ داری کے مسطح بن اثاثہ کی باقاعدہ امداد کیا کرتے تھے قسم کھائی کہ جب مسطح نے عائشہ پر جھوٹا اتہام باندھنے میں حصہ لیا ہے تو میں آئندہ اس کی مدد نہیں کروں گا۔ مگر اس پر جلد ہی یہ خدائی وحی نازل ہوئی کہ ایسا کرنا بالکل پسندیدہ نہیں ہے جس پر ابو بکرؓ نے وہ وظیفہ پھر جاری کر دیا بلکہ یہ عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی یہ وظیفہ بند نہیں کروں گا۔ نیز جبکہ ابھی تک میری بریت ظاہر نہیں ہوئی تھی آنحضرت ﷺ نے میرے متعلق زینب بنت جحش کی رائے بھی دریافت کی تھی اور زینبؓ نے یہ جواب دیا تھا کہ ”یا رسول اللہ! میں تو عائشہ کو ایک نیک اور متقی عورت سمجھتی ہوں۔“ حالانکہ رسول اللہ کی تمام بیویوں میں سے زینبؓ ہی وہ بیوی تھیں جو میرا مقابلہ کرتی اور مجھ سے رقابت سے پیش



آتی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بوجہ ان کی پرہیزگاری کے اس گناہ کے گڑھے میں گرنے سے بچایا۔  
 میں نے حضرت عائشہ صدیقہ کی یہ طویل روایت اس خیال سے درج کی ہے کہ اول تو اس معاملہ میں یہ روایت  
 ساری روایتوں سے مفصل اور مربوط ہے اور جو باتیں دوسرے راویوں کی روایات سے الگ الگ ٹکڑوں کی  
 صورت میں ملتی ہیں وہ اس روایت میں یکجا طور پر جمع ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت سے آنحضرت ﷺ کی غائی  
 زندگی پر ایک ایسی بصیرت افزا روشنی پڑتی ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور صحت کے  
 لحاظ سے بھی یہ روایت ایسے اعلیٰ ترین مقام پر واقع ہوتی ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں سمجھی جاسکتی  
 اب غور کا مقام ہے کہ یہ قدر خطرناک فتنہ تھا جو منافقین کی طرف سے کھڑا کیا گیا۔ اس میں صرف ایک  
 پاک دامن اور نہایت درجہ متقی اور پرہیزگار عورت کی عصمت پر ہی حملہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ بڑی غرض  
 بالواسطہ مقدس باقی اسلام کی عزت کو برباد کرنا اور اسلامی سوسائٹی پر ایک خطرناک زلزلہ وارد کرنا تھی۔ اور منافقین  
 نے اس گندے اور کینے پر اپنی گنڈا کو اس طرح پر چڑھا دیا تھا کہ بعض سادہ لوح مگر سچے مسلمان بھی ان کے  
 دام ترور میں الجھ کر ٹھوکر کھا گئے۔ ان لوگوں میں حسان بن ثابت شاعر اور حمہ بنت محش ہمیشہ زینب بنت محش  
 اور مسطح بن اثاثہ کا نام خاص طور پر مذکور ہوا ہے بلکہ مگر حضرت عائشہؓ کا یہ کمال اخلاق ہے کہ انہوں نے ان  
 سب کو معاف کر دیا اور ان کی طرف سے اپنے دل میں کوئی رنجش نہیں رکھی۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ اس کے  
 بعد جب کبھی حسان بن ثابتؓ حضرت عائشہؓ سے ملنے آتے تھے تو وہ بڑی کشادہ پیشانی سے ان سے ملتی تھیں۔  
 ایک دفعہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت ایک مسلمان مسروق نامی بھی وہاں موجود تھے  
 مسروق نے حیران ہو کر کہا کہ ہیں! آپ حسان کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دیتی ہیں! حضرت  
 عائشہؓ نے جواب دیا "جانے دو بیچارہ آنکھوں کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ کیا کم عذاب ہے۔ پھر میں اس  
 بات کو نہیں بھول سکتی کہ حسان آنحضرت ﷺ کی تائید میں اور کفار کے خلاف شعر کہا کرتا تھا "چنانچہ حسان کو اجازت  
 دی گئی اور وہ اندر آ کر بیٹھ گئے۔ اور حضرت عائشہؓ کی تعریف میں یہ شعر کہا۔

حَصَانٌ رَذَاؤُ مَا تَزْنُ بِسَرِيْبَةٍ ۝ وَتُصْبِحُ غَزَاوِي مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

یعنی وہ ایک پاک دامن عقیفہ خاتون ہیں اور صاحب عقل و دانش ہیں اور ان کی پوزیشن شک و  
 شبہ کے مقام سے بالا ہے۔ اور وہ غافل بے گناہ عورتوں کا گوشت نہیں کھاتیں یعنی ان پر اہتمام  
 نہیں لگاتیں اور نہ ان کی فحشیت فرماتی ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے یہ شعر سنا تو فرمایا۔ وَلَٰكِنْ اَنْتَ۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ کُنْتَ كَذَّابًا یعنی



”تمارا اپنا کیا حال ہے تم تو اس خوبی کے مالک ثابت نہیں ہوتے۔“ یعنی تم نے تو مجھ بے گناہ کے خلاف الزام لگانے میں شمولیت اختیار کی یہ میور صاحب کی عربی دانی یا تعصب کی مثال ملاحظہ ہو کہ اس شعر کے بالکل غلط اور خلاف قواعد عربی معنی کر کے لکھتے ہیں کہ حسان نے عائشہؓ کے نازک بدن کی تعریف کی تھی جس پر عائشہؓ نے شوخی کے ساتھ ان کی فزہی پر طعن کیا۔

بریں عقل و دانش بیا بد گسیت!

میور صاحب نے اس فقرہ کے بیان کرنے میں اور بھی فاش غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ صفوانؓ اور عائشہؓ راستے میں فوج کو نہ پہنچ سکے اور پھر بعد میں برسر منظر عام مدینہ میں داخل ہوئے تھے حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور قطعاً بے بنیاد ہے۔ کیونکہ حدیث و تاریخ سے متفقہ طور پر ثابت ہے کہ صفوانؓ اور حضرت عائشہؓ چند گھنٹے کے بعد راستہ میں ہی اسلامی لشکر میں آئے تھے یہ مگر اس قدر غنیمت ہے کہ اصل اتہام کے متعلق میور صاحب نے حضرت عائشہؓ کی معصومیت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

”عائشہؓ کی قبل اور بعد کی زندگی بتاتی ہے کہ وہ اس اتہام سے بری تھیں۔“

گو عقلی اور نقلی طور پر یہ اتہام بالکل غلط اور جھوٹ قرار پاتا ہے کیونکہ سوائے اس سراسر اتفاقی واقعہ کے کہ حضرت عائشہؓ شکر اسلامی کے پیچھے رہ گئی تھیں اور پھر صفوانؓ کے ساتھ بعد میں پہنچیں اتہام لگانے والوں کے ہاتھ میں قطعاً کوئی بات نہیں تھی یعنی نہ کوئی شہادت تھی اور نہ ہی کوئی اور ثبوت تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی الزام ثابت نہ ہو اسے ہرگز سچا نہیں سمجھا جاسکتا خصوصاً ایسے لوگوں کے متعلق جن کی زندگی ان کی طہارت نفس پر شاہد ہو مگر مسلمانوں کے مزید اطمینان کے لیے اور نیز اس غرض سے کہ آئندہ کے لیے ایسے معاملات میں ایک اصولی قاعدہ مقرر ہو جاوے خدائی وحی نازل ہوئی جس نے نہ صرف اس اتہام کو سراسر جھوٹا قرار دیکر حضرت عائشہؓ اور صفوان بن مہطل کی بریت ظاہر فرمائی بلکہ آئندہ کے لیے اس قسم کے واقعات کے متعلق ایک ایسا اصولی قانون دنیا کے سامنے پیش فرمایا جس پر افراد کی عزت و آبرو اور سوسائٹی کے امن و امان اور ملت کے اخلاق کی حفاظت کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ اس قانون کی بناء ان اصول پر ہے کہ:-

اول ہر انسان کے متعلق اصل قیاس عصمت و عفت کا ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ ہر انسان عقیف سمجھا جانا چاہیے جب تک اس کی عصمت و عفت کے خلاف کوئی یقینی اور قطعی ثبوت موجود نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ انسان کی عزت و آبرو ایک نہایت ہی قیمتی چیز ہے جس کی حفاظت دنیا کی تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔

تیسرے یہ کہ فحشاء کا چرچا بدی کے رعب کو مٹاتا اور سوسائٹی کے اخلاق کو تباہ کر دیتا ہے اس لیے اس کا سد باب ہونا ضروری ہے۔

چوتھے یہ کہ جہاں یہ نہایت ضروری ہے کہ زنا کا مجرم عبرتناک سزا پاتے وہاں یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ جھوٹا الزام لگانے والا بغیر سخت سزا کے نہ چھوڑا جاوے۔

ان اصول کے ماتحت قرآن شریف مندرجہ ذیل قانون پیش فرماتا ہے:-

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْ كُفْرَهُمَا رَأْفَةً فِي دِينِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَلَيْشَهِدَ عَدَاؤُهُمَا حَاضِرَةً مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ -----

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ  
ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ  
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

یعنی جو شخص کسی دوسرے پر زنا کا الزام لگائے اس کا فرض ہے کہ اس الزام کے ثبوت میں کم از کم چار معتبر چشم دید گواہ پیش کرے۔ اگر وہ ایسے گواہ پیش کر دے تو جرم ثابت سمجھا جاوے اور مجرم کو ایک سو دس دھڑوں کی سزا دی جاوے اور اس سزا میں ہرگز کوئی نرمی اور رعایت نہ کی جاوے اور نیز یہ سزا علی الاعلان پبلک کے سامنے دی جاوے تاکہ دوسروں کے لیے موجب عبرت ہو، لیکن اگر الزام لگانے والا اپنے الزام کو مذکورہ بالا طریق پر ثابت نہ کر سکے تو ملزم کو بے گناہ سمجھا جاوے اور الزام لگانے والے کو جھوٹا الزام لگانے کی سزا میں اتنی دھڑوں کی سزا دی جاوے۔ اور آئندہ جب تک ایسے لوگ اپنی اصلاح نہ کریں کسی معاملہ میں ان کی شہادت قبول نہ کی جاوے۔

اس آیت کریمہ میں جو سزائانہ کی مقرر کی گئی ہے اس کا استحقاق تو ظاہر ہی ہے اور اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جھوٹا الزام لگانے والے کی سزا کا سوال بعض سادہ مزاج انسانوں کے لیے قابل اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایسی سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں جو اس کی حقیقت یہ ہے کہ دراصل اس معاملہ میں کسی پر جھوٹا اہتمام باندھنا ایک نہایت خطرناک اور ضرر رسان فعل ہے کیونکہ اس میں ایک بے گناہ انسان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز پر زنا جائز اور مفتریانہ حملہ ہونے کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق پر بھی ایک نہایت گندہ اثر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس طرح پر کہ جب اس قسم کی باتوں کے متعلق کسی سوسائٹی میں آزادانہ چرچا ہوگا تو

لازمًا زنا کی بدی کا رعب طابع سے کم ہونے لگے گا اور کمزور طبیعتیں گندے خیالات کی طرف مائل ہونے لگیں گی اور ملک اور قوم کی اخلاقی فضا زہر آلود ہو جائیگی۔ پس ضروری تھا کہ اس معاملہ میں جھوٹے الزام لگانے والوں کے واسطے سخت سزا تجویز کی جاتی تاکہ سوائے سچے آدمی کے کسی کو اس قسم کے الزام لگانے کی جرأت نہ پیدا ہو اور صرف وہی شخص اتنا مہلک لگانے میں آگے آ سکے جو واقعی اپنے پاس یقینی ثبوت رکھتا ہو۔ اور اگر کسی کو یہ شبہ گذرے کہ اسلام نے اس معاملہ میں ثبوت کے متعلق نا واجب سختی سے کام لیا ہے یعنی چار چشم دید گواہوں کو ضروری قرار دیکر ثبوت کے قیام کو بہت ہی مشکل بنا دیا ہے تو یہ ایک عامیانه شبہ ہو گا۔ جب ہر جرم کے ثبوت کے لیے کوئی نہ کوئی تنگی بخش طریق ثبوت مقرر کیا جانا ضروری ہوتا ہے تو پھر ایک ایسے الزام کے ثبوت کے لیے جس میں انسان کی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہر حملہ ہو اور جس کے غلط اور جھوٹے استعمال سے سوسائٹی کے امن و امان اور قوم کے اخلاق و عادات پر ایک سخت خطرناک اور گندہ اثر پڑتا ہو ایک نہایت زبردست اور یقینی طریق ثبوت کیوں نہ مقرر کیا جاتا۔ خصوصاً جبکہ دنیا بھر میں قانون سازی کا یہ ایک مسلم اصول ہے کہ کسی بے گناہ کے مجرم قرار پا جانے سے یہ بہت بہتر ہوتا ہے کہ ایک مجرم بے گناہ سمجھا جاوے۔

اس جگہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ زنا کے مجرم کے لیے بدنی سزائیوں تجویز کی گئی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں سزائوں کا فلسفہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جس نوعیت کا جرم ہو اسی نوعیت کی سزا ہونی چاہیے تاکہ سزا کی بڑی غرض جو اصلاح ہے پوری ہو سکے۔ پس چونکہ زنا کا جرم خاص طور پر بدنی شہوات کے غلبہ اور ان کے بے قابو ہو جانے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ اس جرم میں بدنی سزا مقرر کی جاتی تاکہ بدنی طاقتوں کو صدمہ پہنچنے سے مجرم کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ پیدا ہو اور الزام لگانے والوں کے لیے بدنی سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ جو شخص دوسرے پر زنا کا جھوٹا الزام لگا کر اسے ذلیل کرنا چاہتا ہے اور بدنی سزا دلوانا چاہتا ہے اسے اسی قسم کی سزا دے کر وہ جو ایک بے گناہ کو دلوانا چاہتا تھا ہوش میں لایا جاوے اور نیز اس قسم کی سزا دوسروں کے لیے موجب عبرت ہو اور ملک و قوم گندے اثرات سے محفوظ رہیں۔ واللہ اعلم جو یہ بنت حارث کی شادی

قبیلہ بنو مصطلق کے جو قیدی گرفتار ہوئے تھے ان میں اس قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی برہ بھی تھی جو مسافع بن صفوان کے عقد میں تھی جو غزوہ مریض میں مارا گیا تھا۔ ان قیدیوں کو آنحضرت ﷺ نے حسب دستور مسلمان سپاہیوں میں تقسیم فرما دیا تھا اور اس تقسیم کی رو سے برہ بنت حارث ایک انصاری صحابی ثابت بن قیس کی سپردگی میں دی گئی تھی۔ برہ نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ثابت بن قیس کے ساتھ مکہ تبت کے طریق پر یہ سمجھوتہ کیا کہ وہ اگر اسے اس قدر رقم فدیہ کے طور پر ادا کر دے تو آزاد سمجھی جاوے۔ اس سمجھوتہ کے بعد برہ آنحضرت ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوئی اور سارے حالات سنائے۔ اور یہ جتلا کر کہ میں بنو مصطلق کے سردار کی لڑکی ہوں فدیہ کی رقم کی ادائیگی میں آپ کی اعانت چاہی۔ اس کی کہانی سے آنحضرت ﷺ بہت متاثر ہوئے اور غالباً یہ خیال کر کے کہ چونکہ وہ ایک مشہور قبیلہ کے سردار کی لڑکی ہے۔ شاید اس کے تعلق سے اس قبیلہ میں تبلیغی آسانیاں پیدا ہو جائیں آپ نے ارادہ فرمایا کہ اسے آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے اسے خود اپنی طرف سے پیغام دیا۔ اور اس کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہونے پر آپ نے اپنے پاس سے اس کے فدیہ کی رقم ادا فرما کر اس کے ساتھ شادی کر لی۔ صحابہ نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے آقا نے بنو مصطلق کی رتیں زادی کو شرف ازدواجی عطا فرمایا ہے تو انہوں نے اس بات کو خلاف شان نبوی سمجھا کہ آنحضرت ﷺ کے سسرال والوں کو اپنے ہاتھ میں قید رکھیں۔ اور اس طرح ایک سو گھرانے یعنی سینکڑوں قیدی بلا فدیہ یک نخت آزاد کر دیتے گئے۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ فرمایا کرتی تھیں کہ جویریہ را آنحضرت صلعم نے برہ کا نام بدل کر جویریہ کر دیا تھا، اپنی قوم کے لیے نہایت مبارک وجود ثابت ہوتی ہے۔ اس رشتہ اور اس احسان کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنو مصطلق کے لوگ بہت جلد اسلام کی تعلیم سے متاثر ہو کر آنحضرت ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے۔

برہ کا نام بدلنے میں یہ حکمت تھی کہ چونکہ برہ کے معنی نیکی کے ہیں آنحضرت ﷺ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ کبھی جب برہ گھر میں نہ ہوں اور کوئی شخص ان کے متعلق یہ دریافت کرے کہ آیا برہ گھر میں ہیں یا نہیں تو اسے یہ جواب ملے کہ برہ گھر میں نہیں ہے جس کے بظاہر یہ معنی ہیں کہ گویا نیکی اور برکت گھر سے اٹھ گئی ہے۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے اس محبت پر بہت روشنی پڑتی ہے جو نیکی اور طہارت کیلئے آنحضرت ﷺ اپنے قلب میں رکھتے تھے۔

حضرت جویریہ کی شادی کے متعلق ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب ان کے والد انہیں چھڑانے کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے فیض صحبت سے مسلمان ہو گئے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی طرف سے پیغام ملنے پر انہوں نے خود برفضاء و رغبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جویریہ کے والد حارث نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں سردار قوم ہوں میری لڑکی اس طرح قید میں نہیں رکھی جاسکتی۔ آپ نے فرمایا کہ جویریہ سے پوچھا جاوے اگر وہ آزاد ہو کر واپس جانا چاہے تو ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اگر ہمارے پاس ٹھہرنا چاہے تو ہمارے پاس ٹھہرے۔ جویریہ سے پوچھا گیا تو اس نے مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کیا جس پر آپ نے اسے آزاد کر کے اس کے

ساتھ شادی فرمالیے

## عزل یعنی برتھ کنٹرول کی اجازت

اس غزوہ یعنی غزوہ بنو مصلطلق میں آنحضرت ﷺ نے بعض

صحابہ کے دریافت کرنے پر عزل یعنی برتھ کنٹرول کے

متعلق فرمایا کہ میں اسے ناجائز نہیں کہتا یعنی بالفاظ دیگر آپ نے اس بات کو جائز قرار دیا کہ کوئی شخص کسی ضرورت و مصلحت سے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے کہ اس کی بیوی کو اس کی مجامعت سے حمل نہ ٹھہرے۔

اس فتویٰ کی رو سے ایک مسلمان کے لیے جائز ہو گا کہ اپنی بیوی کی صحت و تندرستی یا اولاد کی صحت و

تندرستی یا کسی اور جائز مصلحت سے برتھ کنٹرول کے اصول پر عمل پیرا ہو۔ مگر جیسا کہ ایک قرآنی آیت سے

استدلال ہوتا ہے اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ غربت اور مالی تنگی کے اندیشہ سے برتھ کنٹرول

کا طریق اختیار کیا جاوے۔ اور نہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ بیوی کی رضامندی کے بغیر یہ طریق اختیار

کیا جاوے۔ یہ مسئلہ گو اُس زمانہ کے لحاظ سے ایک بالکل غیر اہم مسئلہ تھا مگر موجودہ زمانہ میں اس نے

خاص اہمیت اور دلچسپی اختیار کر لی ہے۔

۱۔ اصحاب جلد ۱۰ حالات جویریہ ۲۔ بخاری حالات غزوہ بنو مصلطلق و موطا امام مالک و ترمذی باب ما جاء فی العزل

۳۔ قرآن مجید سورۃ بنی اسرائیل ۳۲ ۴۔ ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح باب المباشرة فعلن

نالت



# مدینہ کا محاصرہ اور مسلمانوں کی نازک حالت

## گُفّار کی نامرادی - حقیقتِ معجزہ

جنگِ احزاب یعنی غزوہ خندق سوالِ ششم مطابق فروری و مارچ ۶۲۷ء

اب ہم تاریخِ اسلامی کے اس حصہ میں داخل ہوتے ہیں جبکہ اسلام کے خلاف قبائلِ عرب کی دشمنی نہ صرف انتہاء کو پہنچ گئی بلکہ انہوں نے ایک متحدہ تدبیر کے ماتحت اپنی طاقتوں کو جمع کر کے اسلام کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا۔ مگر قدرتِ الہی کا ایسا تصرف ہوا کہ ان کے اس اتحاد میں ہی ناکامی کا تخم پیدا ہو گیا۔ اور ابھی یہ عمارت پوری طرح کھڑی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو کر گر گئی شروع ہو گئیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مکہ کے قریش اور نجد کے قبائلِ غطفان و سلیم گو پہلے سے ہی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور آئے دن مدینہ کے خلاف حملہ آوری کی فکر میں رہتے تھے مگر ابھی تک انہوں نے اپنی طاقتوں کو اسلام کے خلاف ایک میدان میں مجتمع نہیں کیا تھا۔ لیکن جب یہود کے قبیلہ بنو نضیر کے لوگ اپنی غدارِی اور فتنہ انگیزی کی وجہ سے مدینہ سے جلا وطن کئے گئے تو ان کے رؤساء نے اس شریفانہ بلکہ محسانہ سلوک کو فراموش کرتے ہوئے جو آنحضرت ﷺ نے اُن سے فرمایا تھا آپس میں یہ تجویز کی کہ عرب کی تمام منتشر طاقتوں کو ایک جا جمع کر کے اسلام کو میا میٹ کرنے کی کوشش کی جاوے۔ اور چونکہ یہودی لوگ بڑے ہوشیار و چالاک تھے اور اس قسم کے سازشی کاموں میں خوب مہارت رکھتے تھے اس لیے ان کی مفسدانہ کوششیں بار آور ہوئیں اور قبائلِ عرب ایک جان ہو کر مسلمانوں کے خلاف میدان میں نکل آئے۔

یہودی رؤساء میں سے سلام بن ابی الحقیق - حی بن اخطب اور کنانہ بن الرزیع نے اس اشتعال انگیزی میں خاص طور پر حصہ لیا۔ چنانچہ ان فتنہ پردازوں نے اپنے نئے وطن خیبر سے نکل کر حجاز اور نجد کے قبائل کا دورہ کیا اور سب سے پہلے مکہ میں پہنچ کر قریش کو اپنے ساتھ گانٹھا لگایا اور رؤساء قریش کو خوش کرنے کے لیے اس بات تک کہنے سے دریغ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے دین سے تمہارا دین رنرک و بُت پرستی اچھا ہے لگے اس کے بعد انہوں نے نجد میں جا کر قبیلہ غطفان کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور اس قبیلہ کی شاخواتے

فرارہ اور مرہ اور اشجع وغیرہ کو اپنے ساتھ نکلنے کے لیے تیار کر لیا۔ پھر قریش اور غطفان کی انگیخت سے قبائل بنو سلیم اور بنو اسد بھی اس مخالف اسلام اتحاد کی کڑی میں منسلک ہو گئے۔ یہ اور دوسری طرف یہود نے اپنے حلیف قبیلہ بنو سعد کو پیغام بھیج کر اپنی اعانت کے لیے کھڑا کر لیا۔ اس زبردست اتحاد کے علاوہ قریش نے اپنے گرد و نواح کے قبائل میں سے بھی بہت سے لوگوں کو جو ان کے توابع میں سے تھے اپنے ساتھ لایا۔ پھر پوری تیاری کے بعد صحرائے عرب کے یہ خونخوار قبائل مسلمانوں کو ہلایا میٹ کرنے کے ارادے سے ایک سیل عظیم کی طرح مدینہ پر اُمڈ آئے۔ اور یہ عزم کیا کہ جب تک اسلام کو صفحہ دنیا سے مٹا نہیں لیں گے واپس نہیں لوٹیں گے۔

کفار کے اس عظیم الشان لشکر کا اندازہ دس ہزار نفوس سے لے کر پندرہ ہزار بلکہ بعض روایات کی رو سے چوبیس ہزار تک لگایا گیا ہے۔ اگر دس ہزار کے اندازے کو ہی صحیح تسلیم کیا جاوے تو پھر بھی اس زمانہ کے لحاظ سے یہ تعداد اتنی بڑی تھی کہ غالباً اس سے پہلے عرب کے قبائلی جنگوں میں اتنی بڑی تعداد کبھی کسی جنگ میں شامل نہیں ہوتی ہوگی۔ جنگ کی کمان کا انتظام یہ تھا کہ سارے لشکر کا قائد اعظم یعنی سپہ سالار ابوسفیان بن حرب تھا۔ جو سپہ سالار ہونے کے علاوہ اپنے قبیلہ قریش کا امیر العسکر بھی تھا۔ قبائل غطفان کی مجموعی کمان عیینہ بن حصن فزاری کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ماتحت ہر قبیلہ کا الگ الگ کمانڈر تھا۔ بنو سلیم کا کمانڈر سفیان بن عبد شمس تھا اور بنو اسد اپنے رئیس طلحہ بن خویلد کی کمان میں تھے۔ یہ سامان خورد و نوش اور سامان جنگ بھی ہر طرح کافی و شافی تھا۔ اس طرح یہ لشکر شوال ۶۲۵ھ ہجری مطابق فروری و مارچ ۶۲۵ء میں مدینہ کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔

اتنے بڑے لشکر کی نقل و حرکت کا مخفی رکھنا کفار کے لیے مشکل تھا اور پھر آنحضرت ﷺ کا جاسوسی کا انتظام بھی نہایت پختہ تھا۔ چنانچہ ابھی قریش کا لشکر مکہ سے نکلا ہی تھا کہ آنحضرت ﷺ کو ان کی خبر پہنچ گئی۔ جس پر آپ نے صحابہ کو جمع کر کے اس کے متعلق مشورہ فرمایا۔ اس مشورہ میں ایران کے ایک مخلص صحابی سلمان فارسی بھی شریک تھے جن کے اسلام لانے کا ذکر ادھر گزر چکا ہے۔ چونکہ سلمان فارسی بھی طریقی جنگ سے واقف تھے انہوں نے یہ مشورہ پیش کیا کہ مدینہ کے غیر محفوظ حصہ کے سامنے ایک لمبی اور گہری خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا جاوے۔ خندق کا خیال عربوں کے لیے بالکل نیا تھا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ یہ طریقی جنگ دیارِ عجم میں عام طور پر کامیابی کے ساتھ رائج ہے آنحضرت ﷺ نے اس تجویز کو منظور فرمایا۔ اور چونکہ مدینہ کا شہر

۱۔ ابن ہشام : ۲۔ ابن سعد و عیس : ۳۔ عیس : ۴۔ ابن سعد : ۵۔ ابن ہشام و ابن سعد : ۶۔ زرقانی

۷۔ فتح الباری بحوالہ سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۳۸۶ : ۸۔ ابن سعد : ۹۔ ابن ہشام : ۱۰۔ ابن سعد : ۱۱۔ ابن ہشام

۱۲۔ طبری و ابن سعد و روض الانف۔

تین طرف سے ایک حد تک محفوظ تھا یعنی مکانات کی مسلسل دیواروں اور گھنے درختوں اور چٹانوں کے سلسلے کی وجہ سے یہ اطراف لشکر کفار کے اچانک حملہ سے محفوظ تھیں اور صرف شامی طرف ایسی تھی جہاں دشمن ہجوم کر کے مدینہ پر حملہ آور ہو سکتا تھا اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس غیر محفوظ طرف میں خندق کے کھودے جانے کا حکم دیا یہ اور آپ نے خود اپنی نگرانی میں موقعہ پر نشان لگا کر تقسیم کار کے اصول کے ماتحت خندق کو دس دس ہاتھ یعنی پندرہ پندرہ فٹ کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ٹکڑہ دس دس صحابیوں کے سپرد فرما دیا یہ

ان پارٹیوں کی تقسیم میں یہ خوشگوار اختلاف رونما ہوا کہ سلمان فارسی کس گروہ میں شمار ہوں آیا وہ مہاجر سمجھے جائیں یا بوجہ اس کے کہ وہ اسلام کی آمد سے پہلے ہی مدینہ میں آئے ہوئے تھے انصار میں شمار ہوں بوجہ اس کے کہ سلمان اس طریق جنگ کے محرک تھے اور ویسے بھی ایک مستعد اور باوجود بوڑھے ہونے کے مضبوط آدمی تھے ہر فرقہ ان کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ آخر یہ اختلاف آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے فریقین کے دعاوی شکر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ سلمان دونوں میں سے نہیں ہے بلکہ سُلَمَانٌ مِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ یعنی "سلمان میرے اہل بیت میں شمار کئے جائیں"۔ اس وقت سے سلمان کو بہ شرف حاصل ہو گیا کہ وہ گویا آنحضرت ﷺ کے گھر کے آدمی سمجھے جانے لگے۔

الغرض خندق کی تجویز پختہ ہونے کے بعد صحابہ کی جماعت مزدوروں کے لباس میں ملبوس ہو کر میدان کارزار میں نکل آئی۔ کھدائی کا کام کوئی آسان کام نہیں تھا اور پھر یہ موسم بھی سردی کا تھا جس کی وجہ سے ان ایام میں صحابہ نے سخت تکالیف اٹھائیں۔ اور چونکہ دوسرے کاروبار بالکل بند ہو گئے تھے اس لیے وہ لوگ جن کا کام روز کی روٹی روز کمانا تھا اور صحابہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی ان کو تو ان دنوں میں بھوک اور فاقہ کشی کی مصیبت بھی برداشت کرنی پڑی اور چونکہ صحابہ کے پاس نوکر اور غلام بھی نہ تھے اس لیے سب صحابہ کو خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا یہ

جو دس دس کی ٹولیاں مقرر ہوتی تھیں انہوں نے اپنے کام کی اندرونی تقسیم اس طرح کی تھی کہ کچھ آدمی کھدائی کرتے تھے اور کچھ کھدی ہوئی مٹی اور پتھروں کو ٹوکریوں میں بھر بھر کر اپنے کندھوں پر لاد کر باہر پھینکتے جاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی بیشتر حصہ اپنے وقت کا خندق کے پاس گزارتے تھے اور لمبا اوقات خود بھی صحابہ کے ساتھ ملکر کھدائی اور مٹی کی ڈھلائی کا کام کرتے تھے اور ان کی طبیعتوں میں شگفتگی قائم رکھنے کے لیے بعض اوقات آپ کام کرتے ہوئے شعر پڑھنے لگ جاتے تھے جس پر صحابہ بھی آپ کے ساتھ سر ملا کر وہی شعر دہراتے تھے۔ چنانچہ روایات میں آنحضرت ﷺ کا اس موقعہ پر مندرجہ ذیل شعر پڑھنا خصوصیت کے

کے ساتھ مذکور ہوا ہے ۔

اللَّهُمَّ إِنَّ الْحَيَاةَ عَيْشُ الْآخِرَةِ فَأَعِزَّنَا لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرِينَ

یعنی اے ہمارے مولا ! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے پس تو اپنے فضل سے ایسا سامان کر کہ انصار و مہاجرین کو آخرت کی زندگی میں تیری بخشش اور عطا نصیب ہو جاوے ۔

اس شعر کے جواب میں بعض اوقات صحابہ یہ شعر پڑھتے تھے کہ ۔

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

یعنی ہم وہ ہیں کہ ہم نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر یہ عہد کیا ہے کہ ہم ہمیشہ جب تک کہ ہماری جان میں جان ہے خدا کے رستے میں جہاد کرتے رہیں گے ؟

اور کبھی آپ اور صحابہ عبداللہ بن رواحہ انصاری کے یہ اشعار پڑھتے تھے ۔

اللَّهُمَّ كَوَلَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

فَانْزِلْ سَكِينَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْقُدَامَ إِنْ لَاقَيْنَا

إِنَّ الْأُولَى قَدْ بَخَّوْا عَلَيْنَا إِذَا أَرَادُوا فِتْنَةً أَبَيْنَا

یعنی اے ہمارے مولا ! اگر تیرا فضل نہ ہوتا تو ہمیں ہدایت نصیب نہ ہوتی اور ہم صدقہ و خیرات کرنے

اور تیری عبادت کرنے کے قابل نہ بنتے ۔ پس اے خدا ! جب تو نے ہمیں اس حد تک پہنچایا

ہے تو اب اس مصیبت کے وقت میں ہمارے دلوں کو سکینت عطا کر ۔ اور اگر دشمن سے مقابلہ

ہو تو ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ ۔ تو جانتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے خلاف ظلم اور تعدی کے رنگ

میں حملہ آور ہو رہے ہیں اور ان کی نیت ہمیں اپنے دین سے بے دین کرنا ہے مگر اے ہمارے

خدا ! تیرے فضل سے ہمارا یہ حال ہے کہ جب وہ ہمیں بے دین کرنے کے لیے کوئی تدبیر اختیار

کرتے ہیں تو ہم ان کی تدبیر کو دُور سے ہی ٹھکرا دیتے ہیں اور ان کے فتنہ میں پڑنے سے

انکار کرتے ہیں ۔

آنحضرت ﷺ جب آخری مصرعہ پڑھتے تھے تو اپنی آواز کو بلند فرما دیتے تھے ۔ ایک صحابی کی روایت

ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو ایسے وقت میں یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا کہ آپ کا جسم مبارک مٹی اٹھانے کی

وجہ سے گرد و غبار سے بالکل ڈھکا ہوا تھا مجھے بھوک اور فاقہ کشی کا یہ عالم تھا کہ اور صحابیوں کا کیا کہنا ہے

خود سرد ویر کائنات پر کئی کئی وقت کا فاقہ آ جاتا تھا اور آپ اس کی تکلیف سے بچنے کیلئے پیٹ پر



پتھر باندھے پھرتے تھے یہ

اسی تنگی اور شدت کی حالت میں خندق کھودتے کھودتے ایک جگہ سے ایک پتھر نکلا جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہ آتا تھا اور صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ تین دن کے مسلسل فاقہ سے سخت نڈھال ہو رہے تھے۔ آخر تنگ آکر وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ایک پتھر ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ اس وقت آپ کا بھی یہ حال تھا کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا مگر آپ فوراً وہاں تشریف لے گئے اور ایک کدال لے کر اللہ کا نام لیتے ہوئے اس پتھر پر ماری۔ لوہے کے گنے سے پتھر میں سے ایک شعلہ نکلا جس پر آپ نے زور کے ساتھ اللہ اُخْبِرُ کہا۔ اور فرمایا کہ مجھے ملکوتِ شام کی گنجیاں دی گئی ہیں۔ اور خدا کی قسم اس وقت شام کے سُرخ محلات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس ضرب سے وہ پتھر کسی قدر شکستہ ہو گیا۔ دوسری دفعہ آپ نے پھر اللہ کا نام لے کر کدال چلائی اور پھر ایک شعلہ نکلا جس پر آپ نے پھر اللہ اُخْبِرُ کہا۔ اور فرمایا۔ اس دفعہ مجھے فارس کی گنجیاں دی گئی ہیں اور مدائن کے سفید محلات مجھے نظر آرہے ہیں۔ اس دفعہ پتھر کسی قدر زیادہ شکستہ ہو گیا۔ تیسری دفعہ آپ نے پھر کدال ماری جس کے نتیجہ میں پھر ایک شعلہ نکلا اور آپ نے پھر اللہ اُخْبِرُ کہا اور فرمایا۔ اب مجھے مین کی گنجیاں دی گئی ہیں اور خدا کی قسم صنعاء کے دروازے مجھے اس وقت دکھاتے جا رہے ہیں۔ اس دفعہ وہ پتھر بالکل شکستہ ہو کر اپنی جگہ سے گر گیا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر بلند آواز سے تکبیر کی اور پھر بعد میں صحابہ کے دریافت کرنے پر آپ نے یہ کثوف بیان فرماتے یہ اور مسلمان اس عارضی روک کو دُور کر کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ کے یہ نظارے عالم کشف سے تعلق رکھتے تھے گویا اس تنگی کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کی آئندہ فتوحات اور فرائیوں کے مناظر دکھا کر صحابہ میں امید و شگفتگی کی روح پیدا فرمائی مگر بظاہر حالات یہ وقت ایسا تنگی اور تکلیف کا وقت تھا کہ منافقین مدینہ نے ان وعدوں کو سن کر مسلمانوں پر پھبتیاں اڑائیں کہ گھر سے باہر قدم رکھنے کی طاقت نہیں اور قیصر و کسریٰ کی ملکوتوں کے خواب دیکھے جا رہے ہیں یہ مگر خدا کے علم میں یہ ساری نعمتیں مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی تھیں چنانچہ

۱۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ بھوک کی سخت شدت کے وقت جبکہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا پیٹ پر حجر یعنی پتھر باندھ لیتے تھے جس سے جسم ضعف کی وجہ سے ٹھکنے سے محفوظ رہتا تھا اور غالباً اسی رسم سے اردو میں بھی یہ محاورہ قائم ہو گیا ہے کہ نفل شخص پیٹ پر پتھر باندھے پھرتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ حجر سے مراد کرا کا پٹکا ہو کیونکہ عربی میں حجر کپڑے کو بھی کہتے ہیں دیکھو مجمع البحار۔ واللہ اعلم

۲۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خندق ۴۔ احمد و نسائی و طبرانی و ہیثمی بحوالہ فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۴ و ۳۰۵

و نیز زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰ ۵۔ ابن ہشام



یہ وعدے اپنے اپنے وقت پر یعنی کچھ تو آنحضرت ﷺ کے آخری ایام میں اور زیادہ تر آپ کے خلفاء کے زمانہ میں پورے ہو کر مسلمانوں کے ازدیاد ایمان و امتنان کا باعث ہوتے۔

اسی موقع پر ایک مخلص صحابی جابر بن عبد اللہ نے آپ کے چہرہ پر بھوک کی وجہ سے کمزوری اور لقا<sup>میت</sup> کے آثار دیکھ کر آپ سے اپنے گھر جانے کی اجازت لی۔ اور گھر آکر اپنی بیوی سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کو بھوک کی شدت کی وجہ سے سخت تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں کچھ جو کا آٹا ہے اور ایک بکری ہے۔ جابر کہتے ہیں کہ اس پر میں نے بکری کو ذبح کیا اور آٹے کو گوندھا اور پھر اپنی بیوی سے کہا کہ تم کھانا تیار کرو۔ میں رسول اللہ کی خدمت میں جا کر عرض کرتا ہوں کہ تشریف لے آئیں۔ میری بیوی نے کہا۔ دیکھنا مجھے ذلیل نہ کرنا۔ کھانا تھوڑا ہے۔ رسول اللہ کے ساتھ زیادہ لوگ نہ آئیں۔ جابر کہتے ہیں کہ میں گیا اور میں نے آہستگی کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس کچھ گوشت اور جو کا آٹا ہے جن کے پکانے کے لیے میں اپنی بیوی سے کہہ آیا ہوں آپ اپنے چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلیں اور کھانا تناول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ کھانا کتنا ہے میں نے عرض کیا کہ اس قدر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بہت ہے۔ پھر آپ نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈال کر بلند آواز سے فرمایا۔ اے انصار و مہاجرین کی جماعت! چلو جابر نے ہماری دعوت کی ہے چل کر کھانا کھاؤ۔ اس آواز پر کوئی ایک ہزار فاقہ مست صحابی آپ کے ساتھ ہولتے۔ آپ نے جابر سے فرمایا کہ تم جلدی جلدی جاؤ اور اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آؤں ہنڈیا کو چومے پر سے نہ اُتارے۔ اور نہ ہی روٹیاں پکانا شروع کرے۔ جابر نے جلدی سے جا کر اپنی بیوی کو اطلاع دی اور وہ بیچاری سخت گھبراتی کہ کھانا تو صرف چند آدمیوں کے اندازہ کا ہے اور آ رہے ہیں اتنے لوگ! اب کیا ہو گا مگر آنحضرت ﷺ نے وہاں پہنچتے ہی بڑے اطمینان کے ساتھ ہنڈیا اور آٹے کے برتن پر دُعا فرمائی اور پھر فرمایا۔ اب روٹیاں پکانا شروع کر دو۔ اس کے بعد آپ نے آہستہ آہستہ کھانا تقسیم کرنا شروع فرما دیا۔ جابر روایت کرتے ہیں کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی کھانے میں سب لوگ سیر ہو کر اٹھ گئے اور ابھی ہماری ہنڈیا اسی طرح اُبل رہی تھی۔ اور آٹا اسی طرح پک رہا تھا۔

معجزہ کی حقیقت  
یہ واقعہ بخاری کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب حدیث اور کتب تاریخ میں بیان ہوا ہے اور چونکہ اصول شہادت و روایت کے لحاظ سے یہ واقعہ بالکل صحیح قرار پاتا ہے اور اس کے تمام راوی ہر طرح قابل اعتماد ہیں اور ابتدائی راوی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اس لیے باوجود اس کے کہ اس روایت میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو عام اور معروف قانون قدرت کے خلاف ہے

میں نے اسے اپنے اس تاریخی بیان میں درج کرنے میں تامل محسوس نہیں کیا۔ دراصل اس قسم کے واقعات کے متعلق عقلاً اور شرعاً اصل قابل تحقیق باتیں چار ہوتی ہیں :-

اول یہ کہ واقعہ کا وقوع معتبر اور چشم دید شہادت سے پوری طرح ثابت ہو یعنی یہ کہ اس کے وقوع کے متعلق اصول شہادت کے لحاظ سے کوئی معقول شبہ نہ کیا جاسکے۔

دوسرے یہ کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جو خدا تعالیٰ کی کسی بیان کردہ سنت یا اس کے کسی غیر مشروط وعدے یا کسی مسلمہ صفت کے خلاف ہو کیونکہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خدا کی طرف سے ایسے معجزات و خوارق ظاہر ہوں جن کی وجہ سے کسی نہ کسی رنگ میں خود اسی کی ذات پر اعتراض وارد ہوتا ہو۔

تیسرے یہ کہ اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں کسی نہ کسی جہت سے انسانی علم اور انسانی قدرت کوئی بالا چیز پائی جاتی ہو تاکہ وہ اس بات کی علامت سمجھی جاسکے کہ اس کا منبع انسانی دل و دماغ نہیں ہے بلکہ کوئی بالابستی ہے۔

چوتھے یہ کہ اس میں ایک حد تک اخفاء کا رنگ بھی پایا جاتا ہو۔ یعنی ایسی صورت نہ ہو جو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے مرسلین کی صداقت وغیرہ کے متعلق گویا مشاہدہ کا مرتبہ پیدا کر دے اور حقیقت ایسی کھل جائے کہ اس میں امکانی طور پر بھی کسی قسم کے شک پیدا کرنے کی گنجائش نہ رہے جیسا کہ مثلاً سورج کے وجود کے متعلق کسی انسان کے لیے شک کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اگر ایسے معجزات ظاہر ہوں تو اس سے ایمان کی غرض فوت ہو جاتی ہے اور ایمان لانا کارِ ثواب نہیں رہتا۔

آخر الذکر امر کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ معجزات میں جو اخفاء کا پردہ رکھا جاتا ہے۔ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یعنی بعض معجزات میں اخفاء کا پردہ زیادہ ہوتا ہے اور بعض میں نسبتاً کم ہوتا ہے اور اس جہت سے معجزات کی قسمیں موٹے طور پر دو سمجھی جاسکتی ہیں۔

اول وہ معجزات جو غیر مومنین کی ہدایت اور ان پر اتمام حجت کرنے کیلئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ان میں جیسا کہ خدا تعالیٰ کی سنت سے پتہ لگتا ہے اور عقل بھی یہی چاہتی ہے اخفاء کا پردہ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ یعنی اس قسم کے معجزات میں صرف اس قدر روشنی دکھائی جاتی ہے جو محض ایک دُھندلے طریق پر راستہ دکھانے کے چنانچہ محققین نے لکھا ہے کہ عام طور پر معجزہ کی مثال ایسی ہے جیسے چاندنی رات کی روشنی جس کے کچھ حصہ میں بادل بھی ہو۔ اس قسم کی روشنی پیدا ہونے پر وہ لوگ جن کی آنکھوں میں بینائی کا نور باقی ہوتا ہے راستہ

۱۔ سورۃ حجرات ۱، سورۃ تحریم ۴۱، سورۃ توبہ ۱۲۰، سورۃ بنی اسرائیل ۸۱، سورۃ احزاب ۶۳،

سورۃ دوم ۱، سورۃ ہود ۶۲، سورۃ حشر ۲۵، سورۃ اعراف ۱۸۱، سورۃ فصلت ۱۲، سورۃ شوریٰ ۲۱،

سورۃ بقرہ ۴۱، سورۃ حدید ۲۶، سورۃ نساء ۱۶، سورۃ یونس ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸

دیکھ لیتے ہیں مگر وہ لوگ جن کی آنکھوں میں بینائی کا نور مرچکا ہوتا ہے یا شب کو رہتے ہیں یا جنہوں نے تعصبات کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھی ہوتی ہے وہ راستہ کی طرف ہدایت نہیں پاتے۔ اس لیے باوجود اس قسم کے معجزات دکھاتے جانے کے سعید اور شقی میں امتیاز قائم رہتا ہے اور ایمان کا ثواب ضائع نہیں جاتا۔ دوم وہ معجزات جو مومنین کے لیے دکھاتے جاتے ہیں جو قسم اول کے معجزات سے روشنی پا کر صحیح راستہ اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے طبعاً اخفاء کے پردے کم کر دیے جاتے ہیں۔ اور لمبا اوقات انہیں ایسے معجزات دکھاتے جاتے ہیں جو حقیقی مشاہدہ کا رنگ تو نہیں رکھتے مگر ان میں اخفاء کا پردہ صورت اول کی نسبت بہت کم ہوتا ہے اور اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تاہر لوگ ایمان و عرفان کے اعلیٰ مراتب کی طرف ترقی کر سکیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان کی ابتداء غیب سے شروع ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ انسان حسب استعداد صلاحیت اور شہیدیت اور صدقیت اور نبوت کے مراتب کی طرف ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور لازماً جوں جوں ایمان کا مرتبہ ترقی کرتا ہے۔ معجزات کی نوعیت بھی ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے اور اخفاء کے پردے کم ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ شہید تو کہتے ہی اُسے ہیں جس کے لیے اخفاء کے پردے کم کر دیے گئے ہوں۔

اب اگر اس اصولی قاعدہ کے ماتحت اوپر والے واقعہ کے متعلق غور کیا جاوے تو کوئی حقیقی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ اصولی شہادت و روایت کے لحاظ سے اس واقعہ کا وقوع پوری طرح ثابت ہے اور کسی معقول شبہ کی گنجائش نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ خدا کی کسی بیان کردہ سنت یا کسی غیر مشروط وعدے یا کسی مسلمہ صفت کے بھی خلاف نہیں ہے اور پھر اگر ایک طرف اُس میں انسانی طاقت سے بالا قدرت کا مظاہرہ پایا جاتا ہے تو دوسری طرف گو اس وجہ سے کہ یہ واقعہ صرف مومنین کے سامنے وقوع میں آیا اور انہی کے ایمان کی زیادتی اس کی غرض و غایت تھی اس میں اخفاء کا پردہ کم نظر آتا ہے۔ مگر بہر حال وہ ایسے مشاہدہ کا مرتبہ پیدا نہیں کرتا جس میں امکانی طور پر بھی کوئی جہت تاویل کی باقی نہ رہے اور نصف النہار کے سورج کی طرح حقیقت ظاہر ہو جاوے۔ کیونکہ مثلاً امکانی طور پر ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی مخفی تغیر کے ماتحت انسانی معدہ پر کسی وقت ایسا غیر معمولی تصرف ہو کہ وہ اپنے معمول کی نسبت بہت تھوڑی غذا کھانے سے ہی شکم سیری محسوس کرنے لگے۔ وغیرہ ذالک۔

اب رہا یہ امر کہ اس حدیث میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو ہمارے عام مشاہدہ اور معروف قانون قدرت کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو قانون قدرت کی مد بندی ایک نہایت ہی مشکل چیز ہے بلکہ حقیقتاً ناممکن ہے اور یقینی اور قطعی طور پر یہ قرار دے دینا کہ یہ بات قانون قدرت میں

شامل ہے اور یہ بات شامل نہیں ہے ایک بہت ہی بڑا دعویٰ ہے جس کی کوئی عقل مند شخص جرات نہیں کر سکتا اور حتیٰ یہ ہے کہ جب ایک بات عملاً وقوع پذیر ہو جاوے اور سمجھدار اور صادق القول لوگوں کی ایک جماعت اس کی شاہد ہو تو پھر وہی بات قانون قدرت کا حصہ سمجھی جانی چاہیے اور ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ گو عام طور پر قانون قدرت اس اس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی کسی ایسے مخفی تغیر کی وجہ سے جسے ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے اس میں اس اس رنگ میں استثناء بھی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ معجزات کی بڑی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ تا خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے مرسلین کی صداقت کے متعلق ایسے نشانات قائم کئے جاتیں جن سے سعید لوگ حق کی طرف یقینی راہ پانے اور پھر اس راہ پر ترقی کرنے میں آسانی محسوس کریں اور دنیا کی تاریکیوں میں ان کے لیے روشنی کی چمک پیدا ہو جاوے اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی رنگ میں معجزات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جو انسانی قدرت و علم سے بالاسمجھی جاسکے۔ پس جہاں ایک طرف ایمان کی غرض و غایت کا یہ تقاضا ہے کہ کم از کم ابتداء میں مشاہدہ کا رنگ نہ پیدا ہو اور اخفاء کا پردہ قائم رہے وہاں دوسری طرف زندہ ایمان پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اخفاء کے پردوں کو ایک حد تک کم کر کے کبھی کبھی حقیقت کی جھلک بھی دکھا دی جاوے اور انہی دو نقطوں کی وسطی حالت کے مظاہرہ کا نام معجزہ ہے جسے اس کی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی محاورہ میں آیت یعنی نشان اور علامت کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

دراصل خدا کی ہستی ایسی وراہ الوراہ ہے (اور اپنے مقام کے لحاظ سے وہ وراہ الوراہ ہی ہونی چاہیے) کہ اس پر ایمان لانے اور اسے پہچاننے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے محض ذہنی اور قیاسی استدلالات ہرگز انسان کے دل میں وہ یقین پیدا نہیں کر سکتے جو زندہ ایمان کی بنیاد بننے کے لیے ضروری ہے جس کے نتیجہ میں خدا کا وجود ایک محض خیالی فلسفے کا حصہ نہیں رہتا بلکہ اسی طرح محسوس و مشہود ہو جاتا ہے جیسا کہ اس دنیا کی چیزیں محسوس و مشہود ہیں گو نوعیت میں اس سے بہت مختلف۔ اور انسان خدا کے ساتھ ایک ذاتی تعلق پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو اس کی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہے۔ پس ضروری تھا کہ خدا کی طرف سے ایسے سامان مہیا کئے جاتے جو انسان کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا کر سکیں اور انہیں سامانوں کا ایک حصہ آیات و معجزات و خوارق ہیں جو خدا کے انبیاء و صلحاء کے ذریعہ ہر زمانہ میں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور جس کی مثالیں ہر قوم و ملت میں پائی جاتی ہیں۔

اس جگہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یکس طرح ہو سکتا ہے کہ عام معروف قانون قدرت کے خلاف کوئی امر ظاہر ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ ایک امر واقع ہے کہ اس قسم کے امور ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور کثیر التعداد عقلمند معتبر لوگوں کی شہادت اسے سچا ثابت کرتی ہے اور یہ شہادت ہر زمانہ اور ہر قوم میں پائی جاتی ہے تو کوئی عقلمند اس قسم کے واقعات کی سچائی کے متعلق شبہ نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں



کم از کم ان لوگوں کیلئے جو فی الجملہ اس دنیا کا کوئی خالق مانتے ہیں اور اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا خود بخود اپنے آپ سے نہیں ہے بلکہ ایک بالا ہستی کی قدرت خلق سے عالم وجود میں آئی ہے۔ اور یہ کہ وہی بالا ہستی اب اس کارخانہ عالم کو چلا رہی ہے اور تمام خواص الاشیاء اور قوانین قدرت اسی وراء الوراء ہستی کے حکم کے ماتحت جاری ہیں اس بات کے سمجھنے میں کوئی روک نہیں ہو سکتی کہ وہی بالا و قادر ہستی اپنے عام قانون میں کسی خاص وقت میں کسی خاص مصلحت کے ماتحت کوئی تبدیلی یا استثناء بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے **وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهِ** وَلَیَحْزَنَّ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ بِیَعْنٰی اللہ اپنے حکم پر بھی غالب اور حکمران ہے مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں یعنی یہ نہ سمجھو کہ ہم نے دنیا کا قانون بنا دیا تو بس اب ہمارے ہاتھ بندھ گئے بلکہ ہم اپنے قانون پر بھی حکمران اور غالب ہیں اور جب مناسب سمجھیں اس میں تبدیلی یا استثناء کر سکتے ہیں۔ اسی لیے محققین نے لکھا ہے کہ دراصل خدا کی طرف سے دنیا میں دو تقدیریں جاری ہیں ایک تو یہی عام معروف قانون قدرت ہے جسے تقدیر عام کہتے ہیں اور جس کے ماتحت یہ کارخانہ عالم اپنے عام حالات میں جاری نظر آتا ہے۔ دوسرے وہ خاص قانون ہے جو خاص اوقات میں خاص مصالح کے لیے جاری ہوتا ہے جسے تقدیر خاص کہتے ہیں جو آیات و معجزات کے طریق پر رونما ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ خدا کا وجود تقدیر عام کی نسبت بہت زیادہ روشن صورت میں انسان کے سامنے آ جاتا ہے یہ

مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ آیات و معجزات کا ظہور صرف تقدیر خاص کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے اور تقدیر عام کے ذریعہ سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ بسا اوقات آیات کا ظہور اس رنگ میں بھی ہوتا ہے کہ چند تقدیر عام غیر معمولی طور پر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں یا چند تقدیر عام ایک غیر معمولی ترتیب کے ساتھ رونما ہوتی ہیں اور اس غیر معمولی اجتماع یا غیر معمولی ترتیب کے نتیجہ میں ایک رنگ آیت و معجزہ کا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ایک وسیع اور نازک مضمون ہے جس کے تفصیلی بیان کی اس جگہ گنجائش نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیات و معجزات کا سلسلہ برحق ہے اور ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور جابر بن عبد اللہ کی دعوت کا واقعہ اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور چونکہ یہ معجزہ صرف مومنین کو دکھایا گیا تھا اس لیے سنت اللہ کے ماتحت اس میں اخفاء کا پردہ نسبتاً کم تھا اور آنحضرت ﷺ کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ واقعہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہے بلکہ آپ کی زندگی میں اس قسم کے بہت سے واقعات پاتے جاتے ہیں جو صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ اور انشاء اللہ ان میں سے بعض آگے چل کر اپنے موقع پر بیان کئے جاتیں گے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جیسا کہ معجزات کی غرض و غایت سے ظاہر ہے اور جیسا کہ قرآن شریف



کی متعدد آیات سے بھی ثبوت ملتا ہے معجزات میں رسول کی ذات صرف ایک ذریعہ اور واسطہ ہوتی ہے اور اصل متصرف ہستی خدا کی ہوتی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک رسول جب اور جس طرح چاہے اپنی مرضی سے کوئی معجزہ دکھاوے بلکہ معجزات کا معاملہ صرف خدا کی مرضی اور مصلحت پر موقوف ہوتا ہے۔ وہ جب اور جس طرح چاہتا ہے اپنے کسی رسول کے ذریعہ سے معجزات کا اظہار فرماتا ہے اور گویا رسول کی توجہ اور دعا معجزات کی جاذب اور محرک ضرور ہوتی ہے مگر حکم خدا کی طرف سے آتا ہے اور اس کی مخفی قدرت رسول کے اندر سے ہو کر اپنا کام کرتی ہے۔ اور جب خدا کا حکم نہ ہو تو رسول کی ذاتی طاقت کوئی معجزہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا حکم بھی ہوتا ہے جب کوئی حقیقی ضرورت اور حقیقی مصلحت اس کی متقاضی ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ چونکہ معجزات کے متعلق عموماً جھوٹی اور بناوٹی روایات یا بالغہ آمیز باتیں بھی کثرت کے ساتھ مشہور ہو جایا کرتی ہیں۔ اس لیے اس معاملہ میں روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اور صرف ان روایات کو قبول کرنا چاہیے جو اصول روایت و درایت کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ اور ان اصولی شرائط کے مطابق پوری اتریں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ یعنی اصول شہادت کے لحاظ سے وہ قابل اعتماد ہوں وہ خدا کی کسی سنت یا وعدے یا صفت کے خلاف نہ ہوں۔ اُن میں انسانی علم اور انسانی قدرت سے کوئی بالا چیز پائی جاتی ہو۔ اور اُن میں اخفا کا پردہ اس قدر کم نہ ہو کہ جو ایمان بالغیب کے اصول کے خلاف سمجھا جاسکے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط اور بناوٹی قصے صحیح تاریخ کا حصہ قرار پا کر حقیقت کو بالکل مستور کر دیں گے اور دنیا میں معجزات و خوارق کا ایک غلط مفہوم قائم ہو جائیگا جو بجائے ہدایت کا باعث ہونے کے ضلالت و گمراہی کا موجب بن جائیگا۔ اس مختصر اور ضمنی نوٹ کے بعد ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

غزوہ خندق کے بقیہ حالات کم و بیش بیس آیات یا ایک روایت کی رو سے چھ شبانہ روز کی مسلسل محنت سے یہ طویل خندق تکمیل کو پہنچی۔ اور اس غیر معمولی محنت و مشقت نے صحابہ کو بالکل نڈھال کر دیا۔ مگر ادھر یہ کام اختتام کو پہنچا اور ادھر یہود اور مشرکین عرب کا لاؤشکر اپنی تعداد اور طاقت کے نشہ میں غمور اُفتی مدینہ میں نمودار ہو گیا۔ سب سے پہلے ابوسفیان نے اُحد کی پہاڑی کی طرف رخ کیا۔ مگر اس جگہ کو دیران و سنسان پاکر وہ مدینہ کی اس سمت کو بڑھا جو شہر پر حملہ کرنے کے لیے موزوں تھی مگر جس کے سامنے اب خندق کھود دی گئی تھی۔ جب کفار کا لشکر اس جگہ پہنچا تو خندق کو اپنے رستہ میں حائل پاکر سب لوگ حیران و پریشان ہو گئے اور اس بات پر مجبور ہوئے کہ خندق کے پار کھلے

میدان میں ڈیرے ڈال دیں۔ دوسری طرف لشکر کفار کی آمد آمد کی خبر پا کر آنحضرت ﷺ بھی تین ہزار مسلمانوں کو ساتھ لے کر شہر سے نکلے اور خندق کے پاس پہنچ کر شہر اور خندق کے درمیان سلع پہاڑی کو اپنے عقب میں رکھتے ہوئے ڈیرے ڈال دیتے۔ اور چونکہ خندق زیادہ فراخ نہیں تھی اور بعض حصے یقیناً ایسے تھے کہ مضبوط اور ہوشیار سوار انہیں پھاند کر شہر کی طرف آسکتے تھے۔ اور پھر مدینہ کے وہ اطراف جہاں خندق نہیں تھی اور صرف مکانات اور باغات اور بے ترتیب چٹانوں کی روک تھی ان کی حفاظت بھی ضروری تھی تاکہ دشمن اس طرف سے مکانوں کو نقصان پہنچا کر یا کسی اور حکمت سے تھوڑے تھوڑے آدمیوں کی لائنوں میں ہو کر شہر پر حملہ آور نہ ہو جاوے اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو مختلف دشتوں میں منقسم کر کے خندق کے مختلف حصوں پر اور مدینہ کی دوسری اطراف میں مناسب جگہوں پر ہر کی چوکیاں مقرر فرمادیں اور تاکید فرمائی کہ دن ہو یا رات کسی وقت میں یہ پہرہ سست یا غافل نہ ہونے پائے یہ دوسری طرف جب کفار نے یہ دیکھا کہ بوجہ خندق کی روک کے کھلے میدان کی باقاعدہ لڑائی یا شہر پر عام دھاوے کا حملہ ناممکن ہو گئے ہیں تو انہوں نے بھی محاصرہ کے رنگ میں مدینہ کا گھیرا ڈال لیا اور خندق کے کمزور حصوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع تلاش کرنے لگ گئے۔

اس کے علاوہ ابوسفیان نے یہ چال چلی کہ قبیلہ بنو نضیر کے یہودی رئیس جی بن اخطب کو یہ ہدایت دی کہ وہ رات کی تاریکی کے پردے میں بنو قریظہ کے قلعہ کی طرف جاوے اور ان کے رئیس کعب بن اسد کے ساتھ ملکر بنو قریظہ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ جی بن اخطب موقع لگا کر کعب کے مکان پر پہنچا۔ شروع شروع میں تو کعب نے اس کی بات سننے سے انکار کیا اور کہا کہ محمد (ﷺ) کے ساتھ ہمارے عہد و پیمان ہیں اور محمد (ﷺ) نے ہمیشہ اپنے عہد و پیمان کو وفاداری کے ساتھ نبھایا ہے اسلئے میں اس سے غداری نہیں کر سکتا۔ مگر جی نے اسے ایسے سبز باغ دکھائے اور اسلام کی عنقریب تباہی کا ایسا یقین دلایا اور اپنے اس عہد کو جب تک ہم اسلام کو مٹا نہیں گئے مدینہ سے واپس نہیں جائینگے اس شد و مد سے بیان کیا کہ بالآخر وہ راضی ہو گیا بلکہ اور اس طرح بنو قریظہ کی طاقت کا وزن بھی اس پلے کے وزن میں آکر شامل ہو گیا جو پہلے سے ہی بہت ٹھیک ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو جب بنو قریظہ کی اس خطرناک غداری کا علم ہوا تو آپ نے پہلے تو دو تین دفعہ خفیہ خفیہ زبیر بن العوام کو دریافت حالات کے لیے بھیجا۔ اور پھر باضابطہ طور پر قبیلہ اوس و خزرج کے رئیس سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اور بعض دوسرے با اثر صحابہ کو ایک وفد کے طور پر بنو قریظہ کی طرف روانہ فرمایا اور ان کو یہ تاکید فرمائی کہ اگر کوئی تشویشناک خبر ہو تو واپس آکر اس کا بر ملا اظہار نہ کریں بلکہ اشارہ کنایہ سے کام لیں تاکہ لوگوں میں تشویش نہ پیدا

ہو۔ جب یہ لوگ بنو قریظہ کے مساکن میں پہنچے اور ان کے رئیس کعب بن اسد کے پاس گئے تو وہ بد بخت ان کو نہایت مغرورانہ انداز سے ملا۔ اور سعد بن کی طرف سے معاہدہ کا ذکر ہونے پر وہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ بگڑ کر بولے کہ "جاؤ محمد ﷺ اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے۔" یہ الفاظ سن کر صحابہ کا یہ وفد وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اور سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مناسب طریق پر آنحضرت ﷺ کو حالات سے اطلاع دی۔

اس وقت مدینہ کا مطلع ظاہری اسباب کے لحاظ سے سخت تاریک و تاریک تھا۔ شہر کے چاروں طرف ہزار ہا خونخوار دشمن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے جو ہر وقت اس تاک میں تھے کہ کوئی موقع ملے تو مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر ان کو ملیا میٹ کر دیں۔ شہر میں مسلمانوں کے پہلو میں غدار بنو قریظہ تھے جن کے سینکڑوں مسلح نوجوان اپنی ذات میں ایک جبری شکر سے کم نہ تھے اور جو جس وقت چاہتے یا موقع پاتے عقب کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اور مسلمان خواتین اور بچے جو شہر میں تھے وہ تو گویا ہر وقت ان کا شکار ہی تھے۔ اس صورت حال نے جس کی حقیقت کسی سمجھدار شخص پر غصی نہیں رہ سکتی تھی کمزور مسلمانوں میں سخت پریشانی اور سراسیمگی پیدا کر دی اور منافق طبع لوگ تو بڑھلا گئے کہ "مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا۔" یعنی "معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے وعدے مسلمانوں کی فتح و کامرانی کے متعلق یوں ہی جھوٹے ہی تھے۔" بعض منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ یا رسول اللہ! شہر میں ہمارے مکانات بالکل غیر محفوظ ہیں آپ اجازت دیں تو ہم اپنے گھروں میں ٹھہر کر ان کی حفاظت کریں۔ جس کے جواب میں خدائی وحی نازل ہوئی کہ "وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا" یعنی یہ غلط ہے کہ ان لوگوں کو اپنے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا خیال ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وہ میدان کارزار سے بھاگنے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر یہی وقت نخلص مسلمانوں کے ایمان کے اظہار کا تھا۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ "وَمَا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ إِلَّا حُزَابٌ" قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَاوَاهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا" جب مومنوں نے کفار کے اس لاؤ لشکر کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو سب کچھ خدا اور اس کے رسول کے وعدوں کے مطابق ہے اور خدا اور رسول ضرور سچے ہیں۔ پس اس حملہ سے بھی ان کے ایمان و تسلیم میں زیادتی ہی ہوئی۔ مگر موقع کی نزاکت اور حالات کے خطرناک پہلو کا سب کو کیساں احساس تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظَّنَّ نَا هُنَالِكَ الْبُشَى الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا" یعنی یا کرو

جبکہ کفار کا لشکر تمہارے اوپر اور تمہارے نیچے کی طرف سے ہجوم کر کے تم پر آگیا۔ جبکہ گھبراہٹ میں تمہاری آنکھیں پتھر آنے لگیں اور کیچے منہ کو آنے لگے اور تم لوگ اپنے اپنے رنگ میں یعنی کوئی کسی رنگ میں اور کوئی کسی رنگ میں، خدا کے متعلق مختلف خیالات میں پڑ گئے۔ وہ وقت واقعی مومنوں کے لیے ایک سخت امتحان کا وقت تھا اور مسلمانوں پر ایک نہایت شدید زلزلہ وارد ہوا تھا۔

ایسے خطرناک وقت میں مسلمانوں کی قلیل جمعیت جن میں بعض کمزور طبیعت لوگ اور بعض منافق بھی شامل تھے کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ ان کے پاس تو اتنے آدمی بھی نہ تھے کہ کمزور مواقع پر خاطر خواہ پرے کا انتظام کر سکیں۔ چنانچہ دن رات کی سخت ڈیوٹی نے مسلمانوں کو چور کر رکھا تھا۔ دوسری طرف بنو قریظہ کی غداری کی وجہ سے شہر کی گلی کو چوں کے پرے کو زیادہ مضبوط کرنا بھی ضروری تھا تاکہ مستورات اور بچے محفوظ رہ سکیں۔ کفار کے سپاہی مسلمانوں کو ہر رنگ میں پریشان کرنے کی کوشش کرتے تھے کبھی وہ کسی کمزور جگہ پر یورش کر کے جمع ہو جاتے اور مسلمان اس کی حفاظت کے لیے وہاں اکٹھے ہونے لگتے جس پر وہ فوراً رخ پلٹ کر کسی دوسرے موقعہ پر زور ڈال دیتے اور مسلمان بیچارے بھاگتے ہوئے وہاں پہنچتے کبھی وہ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر دھاوا کر کے پہنچتے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جمعیت منتشر ہو کر ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی اور بعض اوقات حالات بہت نازک صورت اختیار کر لیتے۔ اور قریب ہوتا کہ کسی کمزور موقعہ سے فائدہ اٹھا کر لشکر کفار حد و دہشہر کے اندر داخل ہو جاوے۔ ان دھاوؤں کا مقابلہ مسلمانوں کی طرف سے عموماً تیروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا مگر بعض اوقات کفار کے سپاہی یہ طریق اختیار کرتے کہ ایک دستہ تو مسلمانوں پر تیروں کی بار بار مار کر انہیں پیچھے رکھتا اور دوسرا دستہ یورش کر کے خندق کے کسی کمزور حصہ پر دھاوا کر کے آجاتا اور اسے گود کر عبور کرنا چاہتا۔ یہ طریق جنگ صبح سے یک شام تک بلکہ بعض اوقات رات کے حصوں میں بھی جاری رہتا تھا۔ چنانچہ سر ولیم میور اس جنگ کے دو دن کے واقعات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں سپرد قلم کرتے ہیں:-

”مسلمانوں کے پرے کی ہوشیاری اتحادیوں کی فوج کے حلوں کو روکے ہوئے تھی۔۔۔۔۔ اتحادی فوج نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو خندق پر دھاوا کر کے اسے عبور کر جائیں اور اس غرض سے انہوں نے خندق کے ایک کمزور اور تنگ حصہ کو منتخب کر کے اس پر ایک عائد دھاوا کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض جانباہر سپاہی حکمر بن ابوہل کی کمان کے ماتحت اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے خندق کے اس حصہ پر یورش کر کے آئے اور اپنے تیز گھوڑوں کو اڑاتے ہوئے خندق کے اوپر سے گود کر مسلمانوں کے سامنے آ گئے۔ ادھر سے علیؑ اپنے ایک دستہ کو



ساتھ لے کر ان کی طرف پکے اور اس پارٹی نے بڑی ہوشیاری سے عکرمہ کے دستے کا چکر کاٹ کر ان کے پیچھے ہٹنے کا راستہ بند کر دیا۔ اس موقع پر عکرمہ کا ایک جہاں دیدہ سپاہی عمرو بن عبدود اپنی پارٹی سے آگے نکل کر انفرادی جنگ کا طالب ہوا۔ حضرت علیؓ فوراً اس کے مقابلہ میں نکلے اور تھوڑی دیر کے لئے یہ دونوں جنگجو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر عمرو اپنے گھوڑے سے اُترا اور اس کی کونچیں کاٹ کر اسے نیچے گرا دیا اور اس عزم کے ساتھ علیؓ کی طرف بڑھا کہ یا تو فتح پاتے گا یا مارا جاتے گا۔ پھر دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور ان کے قدموں کی گردنے ان کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا، لیکن ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس گرد کے بادل میں سے اَللّٰهُ اَخْبَرُکِی گرج نکلی اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ علیؓ نے عمرو کو مار لیا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی توجہ کو دوسری طرف مصروف پاکر عکرمہ اور اس کے ساتھی اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کر پھر دوسرے پار کو دو گئے۔ سواختے نفل کے جو کو دنے کی کوشش میں گر گیا اور زہیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ قریش نے عمرو کی لاش حاصل کرنے کے لیے بہت سارے مسلمانوں کو دینا چاہا۔ مگر آنحضرت ﷺ نے نفرت کے ساتھ اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ اور عمرو کی لاش اتحادیوں کے یونہی مفت حوالہ کر دی۔

”اس دن اس کے سوا اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی، لیکن یہ رات بڑی تیاریوں میں گزری اور دوسرے دن صبح کو محمد ﷺ نے تمام اتحادی لشکر کو اپنے سامنے صف آرا پایا اتحادیوں کے ہوشیاری کے حملوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو ہر وقت چوکس رہنا پڑتا تھا کسی وقت تو وہ ایک عام دھاوے کی صورت بنا کر حملہ آور ہونے لگتے۔ اور کسی وقت مختلف دستوں میں تقسیم ہو کر ایک ہی وقت میں مختلف موقعوں پر زور ڈال دیتے اور پھر ایک جگہ سے ہٹ کر یقوت دوسری جگہ پر جا کودتے اور بالآخر اپنی تمام طاقت کو جمع کر کے کمزور ترین مقام پر حملہ آور ہو جاتے اور تیروں کی خطرناک بوچھاڑ کی آڑ میں خندق کو عبور کرنے کی کوشش کرتے۔ کئی دفعہ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص جیسے نامور لیڈروں نے شہر پر حملہ آور ہونے کے لیے اسی طرح زور شور سے دھاوا کیا۔ اور ایک دفعہ تو خود محمد ﷺ کا خیمہ بھی خطرہ کی حالت میں ہو گیا تھا لیکن مسلمانوں کے بہادرانہ مقابلہ اور تیروں کی بارش نے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ یہ حالت سارا

۱۔ یہ روایت درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ نفل بن عبد اللہ کی لاش کے متعلق گذرا تھا جو آنحضرت ﷺ کے قتل کیلئے آگے بڑھا تھا مگر زہیر بن امیام کے ہاتھ سے خود قتل ہو کر گرا کفار نے اس کی لاش کے معاوضہ میں دس ہزار درہم مسلمانوں کو دینا چاہے مگر آنحضرت ﷺ نے روپیہ لینے سے انکار فرما دیا اور لاش یونہی واپس فرمادی۔ دیکھو زرقانی جلد ۲ ص ۱۱۷۔



دن جاری رہی اور چونکہ محمد (ﷺ) کی فوج تعداد میں ایسی قلیل تھی کہ شہر کی حفاظت کے واسطے بشکل کافی ہو سکتی تھی اس لیے مسلمانوں کو یہ سارا دن مسلسل طور پر مصروف رہنا پڑا۔ بلکہ رات پڑنے پر بھی خالد کے دستے نے اس خطرہ کو جاری رکھا اور مسلمان اپنی ڈیوٹی سے فارغ نہیں ہو سکے، لیکن دشمن کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی وہ اس بات پر قادر نہیں ہو سکا کہ کسی بڑی تعداد میں خندق کو عبور کر سکے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے پانچ آدمی مارے گئے اور اسی دن سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس کو بھی ابن العرقہ کے تیر نے ہلک طور پر کلائی میں زخمی کیا۔۔۔۔۔ اس کے مقابلہ میں اتحادیوں کے صرف تین آدمی قتل ہوئے۔ اس دن کے مقابلہ کی سختی اور مسلسل مصروفیت کی وجہ سے مسلمان اپنی نمازیں بھی وقت پر ادا نہیں کر سکے۔ چنانچہ جب رات کا ایک حصہ گزر چکا اور دشمن کا بیشتر حصہ آرام کرنے کے لیے اپنے کیمپ کی طرف لوٹ گیا۔ اُس وقت مسلمانوں نے جمع ہو کر سارے دن کی نمازیں اکٹھی ادا کیں۔ اور اس وقت محمد (ﷺ) نے کفار پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہمیں نمازوں سے روکا ہے خدا ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو جہنم کی آگ سے بھرے لیے۔“

میور صاحب کے اس دلچسپ نوٹ میں جو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اُس دن مسلمانوں کی ساری نمازیں وقت پر ادا نہیں ہو سکیں یہ درست نہیں ہے بلکہ جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے بات صرف یہ ہوتی تھی کہ چونکہ اس وقت تک صلوٰۃ خوف شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے بوجہ مسلسل خطرے اور مصروفیت کے صرف ایک نماز یعنی عصر بے وقت ہو گئی تھی جو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھی گئی تھی اور بعض روایات کی رو سے صرف ظہر و عصر کی نماز بے وقت ادا ہوئی تھی۔

علاوہ ازیں حضرت علیؓ اور عمرو بن عبدودؓ کے مقابلہ کے متعلق میور صاحب کا بیان بہت مختصر ہے تاریخ میں یہ لڑائی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس کے بعض حصے نہایت دلچسپ ہیں۔ دراصل عمرو ایک نہایت نامور شمشیر زن تھا اور اپنی بہادری کی وجہ سے اکیلا ہی ایک ہزار سپاہی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اور چونکہ وہ بدر کے موقع پر خائب و خاسر ہو کر واپس گیا تھا۔ اس لیے اس کا سینہ مسلمانوں کے خلاف بغض و انتقام کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے میدان میں آتے ہی نہایت مغرورانہ لہجے میں مبارز طلبی کی۔ بعض صحابہ اس کے مقابلہ سے کتراتے تھے مگر آنحضرت ﷺ کی اجازت سے حضرت علیؓ اس کے مقابلہ کے لیے آگے نکلے۔

۱۔ لائف آف محمد مصنف سر ولیم میور صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱ ۲۔ صحیح بخاری حالات غزوہ خندق و نیز مسلم و ترمذی و ابوداؤد و نسائی

۳۔ بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۳ ۴۔ موطا و احمد و نسائی بحوالہ زرقانی ۵۔ خمس جلد ۱ صفحہ ۵۴

اور آنحضرت صلعم نے اپنی تلوار ان کو عنایت فرمائی اور ان کے واسطے دعا کی یہ  
 حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر عمرو سے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے یہ عہد کیا ہوا ہے کہ اگر قریش میں سے  
 کوئی شخص تم سے دو باتوں کی درخواست کرے گا تو تم ان میں سے ایک بات ضرور مان لو گے۔ عمرو نے کہا۔ ہاں  
 حضرت علیؑ نے کہا تو پھر میں پہلی بات تم سے یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اور آنحضرت ﷺ کو مان کر خدائی  
 انعامات کے وارث بنو۔ عمرو نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؑ نے کہا۔ اگر یہ بات منظور نہیں ہے تو پھر آؤ۔  
 میرے ساتھ لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔ اس پر عمرو ہنسنے لگ گیا۔ اور کہنے لگا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص مجھ سے  
 یہ الفاظ کہہ سکتا ہے یہ پھر اس نے حضرت علیؑ کا نام و نسب پوچھا اور ان کے بتانے پر کہنے لگا۔ "بھئیجیہ !  
 تم ابھی بچتے ہو۔ میں تمہارا خون نہیں گرانا چاہتا اپنے بڑوں میں سے کسی کو بھیجو یہ حضرت علیؑ نے کہا تم میرا  
 خون نہیں گرانا چاہتے مگر مجھے تمہارا خون گرانے میں تامل نہیں ہے۔ اس پر عمرو جوش میں اندھا ہو کر اپنے گھوڑے  
 سے کود پڑا اور اس کی کونچیں کاٹ کر اسے نیچے گرا دیا۔ اور پھر ایک آگ کے شعلہ کی طرح دیوانہ وار حضرت علیؑ کی  
 طرف بڑھا اور اس زور سے حضرت علیؑ پر تلوار چلائی کہ وہ ان کی ڈھال کو قلم کرتی ہوئی ان کی پیشانی پر لگی۔  
 اور انہیں کسی قدر زخمی کیا مگر ساتھ ہی حضرت علیؑ نے اللہ اُخْبِرْ کا نعرہ لگاتے ہوئے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے  
 آپ کو بچا تارہ گیا اور حضرت علیؑ کی تلوار اُسے شانے پر سے کاٹتی ہوئی نیچے اتر گئی اور عمرو تڑپتا ہوا گرا  
 اور جان دے دی یہ

لیکن اس جزوی اور وقتی غلبہ کا عام لڑائی پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اور یہ دن مسلمانوں کے لیے نہایت  
 تکلیف اور پریشانی اور خطرے کے دن تھے اور جوں جوں یہ محاصرہ لمبا ہوتا جاتا تھا مسلمانوں کی طاقت  
 مقابلہ لازماً کمزور ہوتی جاتی تھی اور گوان کے دل ایمان و اخلاص سے پڑتے مگر جسم جو مادی قانون اسباب  
 کے ماتحت چلتا ہے مضحل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان حالات کو دیکھا تو آپؐ نے انصار کے  
 رؤساء سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو بلا کر انہیں سارے حالات بتلاتے اور مشورہ مانگا کہ ان حالات  
 میں ہمیں کیا کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اپنی طرف سے یہ ذکر فرمایا کہ اگر تم لوگ چاہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبیلہ  
 غطفان کو مدینہ کے محاصرے میں سے کچھ حصہ دینا کہ اس جنگ کو ٹال دیا جاوے۔ سعد بن معاذ اور سعد  
 بن عبادہ نے یک زبان ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اگر آپ کو اس بارہ میں کوئی خدائی وحی ہوئی ہے تو  
 سر تسلیم خم ہے اس صورت میں آپ بے شک خوشی سے اس تجویز کے مطابق کارروائی فرمائیں۔" آپ نے  
 فرمایا۔ "نہیں نہیں مجھے اس معاملہ میں وحی کوئی نہیں ہوتی میں تو صرف آپ لوگوں کی تکلیف کی وجہ سے

مشورہ کے طریق پر پوچھتا ہوں۔“ سخیین نے جواب دیا کہ پھر ہمارا یہ مشورہ ہے کہ جب ہم نے شرک کی حالت میں کبھی کسی دشمن کو کچھ نہیں دیا تو اب مسلمان ہو کر کیوں دیں۔ واللہ ہم انہیں تلوار کی دھار کے سوا کچھ نہیں دینگے چونکہ آنحضرت ﷺ کو انصار ہی کی وجہ سے نکر تھا جو مدینہ کے اصل باشندہ تھے اور غالباً اس مشورہ میں آپ کا مقصد بھی صرف یہی تھا کہ انصار کی ذہنی کیفیت کا پتہ لگائیں کہ کیا وہ ان مصائب میں پریشان تو نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پریشان ہوں تو ان کی دلجوئی فرمائیں۔ اس لیے آپ نے پوری خوشی کے ساتھ ان کے اس مشورہ کو قبول فرمایا۔ اور جنگ جاری رہی۔

جنگ کے دوران میں مسلسل مصروفیت اور پریشانی کی وجہ سے صحابہ اور آنحضرت ﷺ کو کئی کئی دقت کا فائدہ بھی ہو جاتا تھا چنانچہ ایک دن بعض صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے فائدہ کشی کی شکایت کی اور عرض کیا کہ ہم کئی دن سے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے پھرتے ہیں۔ اس پر آپ نے اپنے شکم مبارک پر سے کپڑا ہٹا کر دکھایا تو دو پتھر باندھے ہوئے تھے بلکہ ان فائدہ کشیوں کے ساتھ جنگ کے دوسرے مصائب نے مل کر مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف دہ حالات پیدا کر رکھے تھے اور ہر وقت کے خطرے کے اندیشے کی وجہ سے جو اثران کے دل و دماغ اور اعصاب پر پڑتا تھا وہ مزید براں تھا۔ اور طبعاً اس مصیبت کا سب سے زیادہ بوجھ آنحضرت ﷺ پر تھا۔ چنانچہ ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ بہت سے غزوات میں رہی ہوں، لیکن آنحضرت ﷺ کے لیے جس قدر سخت غزوہ خندق تھا ایسا کوئی اور غزوہ نہیں گذرا۔ اس غزوہ میں آپ کو بے انتہا تکلیف اور پریشانی برداشت کرنی پڑی اور صحابہ کی جماعت کو بھی سخت مصائب کا سامنا ہوا۔ اور یہ دن بھی سخت سردی اور مالی تنگی کے دن تھے بلکہ

دوسری طرف شہر میں مستورات اور بچوں کا یہ حال تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو عموماً شہر کے ایک خاص حصہ میں جو ایک گود قلعہ کا رنگ رکھتا تھا جمع کروادیا مگر ان کی خاطر خواہ حفاظت کے لیے کافی مسلمان فارغ نہیں کئے جاسکتے تھے اور خصوصاً ایسے اوقات میں جبکہ میدان جنگ میں دشمن کے حملوں کا زیادہ زور ہوتا تھا مسلمان خواتین اور بچے قریباً بالکل غیر محفوظ حالت میں رہ جاتے تھے اور ان کی حفاظت کے لیے صرف ایسے مردہ جاتے تھے جو کسی وجہ سے میدان جنگ کے قابل نہ ہوں۔ چنانچہ کسی ایسے ہی موقع سے فائدہ اٹھا کر یہودیوں نے شہر کے اس حصہ پر حملہ آور ہو جانے کی تجویز کی جس میں مستورات اور بچے جمع تھے اور جاسوسی کی غرض سے انہوں نے اپنا ایک آدمی اپنے آگے آگے اس محلہ میں بھیجا۔ اس وقت اتفاق سے عورتوں کے قریب صرف ایک صحابی حسان بن ثابت شاعر موجود تھے جو شہر کی غیر معمولی کمزوری

کی وجہ سے میدان جنگ میں جانے کے قابل نہیں تھے۔ عورتوں نے جب اس دشمن یہودی کو ایسے مشتبہ حالات میں اپنے جاتے قیام کے آس پاس چکر لگاتے دیکھا تو صفیہ بنت عبدالمطلب نے جو آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ حسان سے کہا کہ یہ شخص معاند یہودی ہے اور یہاں جاسوسی اور شرارت کے لیے چکر لگا رہا ہے اسے قتل کر دو تاکہ واپس جا کر وہ کسی فتنہ کا موجب نہ بنے۔ مگر حسان کو اس کی ہمت نہ ہوئی جس پر حضرت صفیہ نے خود آگے نکل کر اس یہودی کا مقابلہ کیا اور اسے مار کر گر دیا۔ اور پھر انہی کی تحریز سے یہ قرار پایا کہ اس یہودی جاسوس کا سر کاٹ کر قلعہ کی اس سمت میں گرادیا جاوے جہاں یہودی جمع تھے تاکہ یہودیوں کو مسلمان عورتوں پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ پڑے اور وہ یہ بھیس کر ان کی حفاظت کے لیے اس جگہ کافی مرد موجود ہیں۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس موقع پر یہودی لوگ مرعوب ہو کر واپس چلے گئے۔

یہ وقت مسلمانوں پر ایک سخت مصیبت کا وقت تھا۔ چنانچہ اس مصیبت کی سختی سے گہرا کرچہ صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو صورت حال ہے وہ آپ پر عیاں ہے ہمارا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ آپ خدا سے خاص طور پر دعا فرمائیں کہ وہ اس مصیبت کو دور فرمائے اور ہمیں بھی کوئی دعا سکھائیں جو ہم اس موقع پر خدا سے مانگیں۔ آپ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا کہ تم خدا سے یہ دعا کیا کرو کہ وہ تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈالے۔ اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمہاری گہراہٹ کو دور فرمائے۔ اور پھر آپ نے خود یہ دعا فرمائی کہ اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيحِ الْحِسَابِ اهْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ وَذَكِّرْ لَهُمْ اور ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ آپ نے یہ دعا فرمائی کہ يَا صَرِيحَ الْمَعْرُوفَيْنِ يَا مُحْجِبِ الْمُضْطَرِّينِ الْكِشْفَ هَبْنِي وَغَمِّي وَكُرْبِي قَاتِلِكَ تَرَى مَا نَزَلَ بِي وَيَا صَحَابِي هَبْنِي اے دنیا میں اپنے احکام کو جاری کرنے والے خدا! اور اے حساب لینے میں دیر نہ کرنے والے! تو اپنے فضل سے کفار کے ان احزاب کو پسپا فرما۔ اے میرے قادر! تو ضرور ایسا ہی کر اور کفار کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ان کی طاقت پر زلزلہ وارد کر۔ اے تکلیف میں مبتلا لوگوں کی آہ و پکار کو سننے والے! اے مضطر لوگوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والے! تو ہمارے غم اور فکر اور بے چینی کو دور فرما کیونکہ جو مجھ پر اور میرے اصحاب پر اس وقت مصیبت وارد ہے وہ تیرے سامنے ہے۔

حسن اتفاق سے اسی وقت یا اس کے قریب قریب ایک شخص نعیم بن مسعود جو قبائل غطفان کی



شاخ قبیلہ اشج سے تعلق رکھتا تھا جو اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہے تھے مدینہ میں پہنچ گیا۔ یہ شخص دل میں مسلمان ہو چکا تھا مگر ابھی تک کفار کو اس کے مسلمان ہونے کی اطلاع نہیں تھی۔ اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کمال ہوشیاری سے ایسی تدبیر اختیار کی جس سے کفار میں پھوٹ پیدا ہو گئی۔

سب سے پہلے نعیم بن مسعود قبیلہ بنو قریظہ کے پاس گیا۔ اور چونکہ ان کے ساتھ اس کے پرانے تعلق تھے وہ ان کے رؤساء سے مل کر کہنے لگا کہ میرے خیال میں تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ کہ محمد ﷺ کے ساتھ بدعہدی کر کے قریش و غطفان کے ساتھ مل گئے ہو۔ قریش و غطفان تو یہاں مدینہ میں صرف چند دن کے مہمان ہیں۔ مگر تم لوگوں نے ہر حال یہاں رہنا ہے کیونکہ تمہارا یہ وطن ہے اور یہاں مسلمانوں کے ساتھ ہی تمہارا واسطہ پڑنا ہے۔ اور تم یہ یاد رکھو کہ قریش وغیرہ یہاں سے جاتے ہوئے تمہارا کوئی خیال نہیں کریں گے اور تمہیں یونہی مسلمانوں کے رحم پر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پس تم کم از کم ایسا کرو کہ قریش و غطفان سے کہو کہ بطور یرغمال کے اپنے کچھ آدمی تمہارے حوالے کر دیں تاکہ تمہیں اطمینان رہے کہ تمہارے ساتھ کوئی غداری نہیں ہوگی۔ رؤساء بنو قریظہ کو نعیم کی یہ بات سمجھ آ گئی اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ قریش سے یرغمالوں کا مطالبہ کریں تاکہ بعد میں انہیں کسی مصیبت کا سامنا نہ ہو۔ اس کے بعد نعیم بن مسعود قریش کے رؤساء کی طرف گیا اور جا کر کہنے لگا کہ بنو قریظہ خائف ہیں کہ کہیں تمہارے چلے جانے کے بعد انہیں کسی مصیبت کا سامنا نہ ہو اس لیے وہ تمہارے اس اتحاد میں متزلزل ہو رہے ہیں اور یہ ارادہ کر رہے ہیں کہ بطور ضمانت کے تم سے چند یرغمالوں کا مطالبہ کریں۔ مگر تم ان کو ہرگز یرغمال نہ دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے غداری کر کے تمہارے یرغمال مسلمانوں کے حوالہ کر دیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اس نے اپنے قبیلہ غطفان کے پاس جا کر اسی قسم کی باتیں کہیں۔ اب خدا کی طرف سے اتفاق ایسا ہوا کہ قریش و غطفان پہلے سے ہی یہ تجویز کر رہے تھے کہ مسلمانوں پر پھر ایک متحدہ حملہ کیا جاوے اور یہ حملہ شہر کے چاروں اطراف میں ایک ہی وقت میں

۱۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۹۵ و ۵۲۰۔ اس موقع پر ابن ہشام نے یہ روایت کی ہے کہ نعیم بن مسعود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور پھر خود آپ نے اسے اس ڈیوٹی پر لگایا تھا کہ کسی طرح حسن تدبیر سے کفار کو واپس لوٹا دے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو اصولاً یہ تسابیل اعتراض نہیں ہے۔ مگر اصول روایت کی رو سے یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اول تو ابن ہشام نے اس واقعہ کو بغیر سند کے بیان کیا ہے مگر اس کے مقابلہ میں ابن سعد نے اپنی روایت کی سند دی ہے (دیکھو ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۳) علاوہ ازیں ابن ہشام والی روایت کو جسے محدث شیرازی نے القاب میں نقل کیا ہے محققین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (دیکھو الجامع الصغیر للسیوطی جلد ۲ ص ۷) پس صحیح واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نعیم نے بطور خودیہ تدبیر کی تھی۔ واللہ اعلم



کیا جاوے تاکہ مسلمان اپنی قلت تعداد کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہ کر سکیں اور کسی نہ کسی جگہ سے ان کی لائن ٹوٹ کر حملہ آوروں کو راستہ دے دے۔ اس ارادے کے ماتحت انہوں نے بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ "محاصرہ لمبا ہو رہا ہے اور لوگ تنگ آرہے ہیں۔ پس ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ سب قبائل مل کر کل کے دن ایک متحدہ حملہ مسلمانوں پر کریں اس لیے تم بھی کل کے حملہ کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ بنو قریظہ نے جن کے ساتھ نعیم بن مسعود کی پہلے سے بات ہو چکی تھی یہ جواب دیا کہ کل تو ہمارا سبت کا دن ہے اس لیے ہم معذور ہیں اور ویسے بھی جب تک آپ لوگ اس ضمانت کے طور پر کہ آپ کی طرف سے بعد میں ہمارے ساتھ غداری نہیں ہوگی اپنے کچھ آدمی ہمارے حوالے نہ کر دیں ہم اس حملہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جب قریش و غطفان کو بنو قریظہ کا یہ جواب گیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اور کہنے لگے کہ واقعی نعیم نے سچ کہا ہے کہ بنو قریظہ ہماری غداری بدلتے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جب بنو قریظہ کو قریش و غطفان کا یہ جواب گیا کہ ہم برغال نہیں دیتے۔ تم نے مدد کو آنا ہے تو ویسے آؤ۔ تو بنو قریظہ نے کہا کہ واقعی نعیم نے ہیں ٹھیک مشورہ دیا تھا کہ قریش و غطفان کی نیت بخیر نہیں ہے اور اس طرح نعیم کی حسن تدبیر سے کفار کے کیمپ میں اشتقاق و اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی یہ

یہ وہ تدبیر ہے جو نعیم نے اختیار کی مگر نعیم کا یہ کہاں ہے کہ اس نے ایسے نازک مشن کی ادائیگی میں بھی حتی الوسع کوئی ایسی بات اپنے منہ سے نہیں نکالی جو معین طور پر کذب بیانی کے نام سے موسوم کی جا سکے باقی لطائف الجمل کے طریق پر کوئی تدبیر اختیار کرنا یا کوئی ایسا داؤ چلنا جس سے انسان دشمن کے شر سے محفوظ ہو سکے سو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے بلکہ جنگی فن کا ایک نہایت مفید حصہ ہے جس سے ظالم دشمن کو خائب و خاسر کرنے اور بے جا کشت و خون کے سلسلے کو روکنے میں بہت مدد ملی جا سکتی ہے۔

ممکن ہے کہ نعیم بن مسعود کی اس امن پسند کوشش کا نتیجہ ضائع چلا جاتا اور ایک عارضی لغزش و تنزل کے بعد کفار میں پھر اتحاد و ثبات کی رُوح پیدا ہو جاتی مگر خدا کی طرف سے ایسا اتفاق ہوا کہ ان واقعات کے بعد رات کو ایک نہایت سخت آندھی چلی آئی جس نے کفار کے وسیع کیمپ میں جو ایک کھلی جگہ میں واقع تھا ایک خطرناک طوفان بے تیزی برپا کر دیا۔ خیمے اکھڑ گئے۔ قناتوں کے پردے ٹوٹ ٹوٹ کر اڑ گئے۔ ہنڈیاں اُلٹ اُلٹ کر چوڑھوں میں گر گئیں۔ اور ریت اور کنکر کی بارش نے لوگوں کے کانوں اور آنکھوں اور تھنوں کو بھر دیا اور پھر سب سے بڑھ کر غضب یہ ہوا کہ وہ قومی آگیاں جو عرب کے قدیم دستور کے مطابق رات کے وقت نہایت التزام کے ساتھ روشن رکھی جاتی تھیں ادھر ادھر خس و خاشاک

کی طرح اُڑ کر بچنے لگ گئیں۔ ان مناظر نے کفار کے دہم پر مست قلوب کو جو پہلے ہی محاصرہ کے تکلیف دہ طول اور اتحادیوں کی باہمی بے اعتمادی کے تلخ تجربے سے متزلزل ہو رہے تھے ایک ایسا دھکا لگایا کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ اور صبح سے پہلے پہلے مدینہ کا اُفتی لشکر کفار کے گرد و غبار سے صاف ہو گیا۔

چنانچہ ایسا ہوا کہ جب اس آندھی کا زور ہوا تو ابوسفیان نے اپنے اُس پاس کے قریشی روماء کو بلا کر کہا کہ ہماری مشکلات بہت بڑھ رہی ہیں۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم واپس چلے جائیں اور میں تو بہر حال جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا اور پھر اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا مگر گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اونٹ کے پاؤں تک کھولنے یا نہ رہے اور سوار ہونے کے بعد اونٹ کے حرکت نہ کرنے سے یہ یاد آیا کہ اونٹ کے پاؤں ابھی تک نہیں کھولے گئے۔ اس وقت عکرمہ بن ابوجہل ابوسفیان کے پاس کھڑا تھا اُس نے کسی قدر تمنی سے کہا کہ ابوسفیان! تم امیر العسکر ہو کر لشکر کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو اور تمہیں دوسروں کا خیال تک نہیں ہے۔ اس پر ابوسفیان شرمندہ ہوا اور اونٹ سے اتر کر کہنے لگا لو میں ابھی نہیں جاتا مگر تم لوگ جلدی تیاری کرو اور جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے نکل چلو۔ چنانچہ لوگ جلد جلد تیاری میں لگ گئے۔ اور ابوسفیان تھوڑی دیر کے بعد اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک بنو غطفان اور دوسرے قبائل کو قریش کے اس فرار کا علم تک نہیں تھا۔ مگر جب قریش کا کیمپ سرعت کے ساتھ خالی ہونا شروع ہوا تو دوسروں کو بھی اس کی اطلاع ہوئی جس پر انہوں نے بھی گھبرا کر کوچ کا اعلان کر دیا۔ اور بنو قریظہ بھی اپنے قلعوں کے اندر چلے گئے۔ اور بنو قریظہ کے ساتھ بنو نضیر کا رئیس حُی بن اخطب بھی اُن کے قلعوں میں چلا آیا۔ اور اس طرح صبح کی سفیدی نمودار ہونے سے پہلے پہلے سارا میدان خالی ہو گیا۔ اور ایک فوری اور محیر العقول تغیر کے طور پر مسلمان مفتوح ہوتے ہوتے فاتح بن گئے۔

اسی رات جبکہ کفار اس طرح خود بخود میدان جنگ سے بھاگ رہے تھے آنحضرت ﷺ نے اپنے ارد گرد کے صحابہ کو مخاطب فرما کر آواز دی کہ تم میں سے کوئی ہے جو اس وقت جائے اور لشکر کفار کا حال معلوم کرے؟ لیکن صحابہ روایت کرتے ہیں کہ اس وقت سردی کی اس قدر شدت تھی اور پھر خوف اور تھکان اور بھوک کا یہ عالم تھا کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے اندر یہ طاقت نہیں پاتا تھا کہ جواب میں کچھ عرض کر کے یا اپنی جگہ سے حرکت کرے۔ آخر آنحضرت ﷺ نے خود نام لے کر حذیفہ بن یمان کو بلایا جس پر وہ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اُٹھے اور آنحضرت ﷺ کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ آپ نے کمال شفقت

سے اُن کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اُن کے لیے دُعا تے خیر فرمائی اور فرمایا تم بالکل ڈرو نہیں اور اطمینان رکھو انشاء اللہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی لیکن تم چپکے چپکے کفار کے کیمپ میں چلے جاؤ اور کسی سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ اور نہ اپنے آپ کو ظاہر ہونے دو۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ جب میں روانہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے بدن میں سردی کا نام و نشان تک نہیں تھا بلکہ میں نے یوں محسوس کیا کہ گویا ایک گرم حمام میں سے گذر رہا ہوں تھے اور میری گھبراہٹ بالکل جاتی رہی تھی اس وقت رات کی تاریکی پورے طور پر اپنی حکومت جماتے ہوئے تھی۔ میں بالکل نڈر ہو کر گر چپکے چپکے کفار کے اندر پہنچ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ابوسفیان ایک جگہ کھڑا ہوا آگ سینک رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر جھٹ اپنی تیرکمان سیدھی کر لی اور قریب تھا کہ میں اپنا تیر چلا دیتا مگر پھر مجھے آنحضرت ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا اور تیر چلانے سے رُک گیا اور اگر اس وقت میں تیر چلا دیتا تو ابوسفیان اس قدر قریب تھا کہ وہ یقیناً بیچ نہ سکتا۔ اس وقت ابوسفیان اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دے رہا تھا اور پھر وہ میرے سامنے ہی اونٹ پر سوار ہو گیا مگر گھبراہٹ کی وجہ سے اسے اپنے اونٹ کے پاؤں تک کھولنے یاد نہیں رہے۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔

جب میں اپنے کیمپ میں پہنچا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے میں نے آپ کے فارغ ہونے تک انتظار کیا اور پھر آپ کو سارے واقعہ کی اطلاع دی جس پر آپ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور فرمایا کہ یہ ہماری کسی کوشش یا طاقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خدا کے فضل کی وجہ سے ہے جس نے اپنے دم سے احزاب کو پسپا کر دیا۔ اس کے بعد کفار کے فرار ہونے کی خبر فوراً سارے مسلمان کیمپ میں مشہور ہو گئی تھی غالباً اسی موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اَلَا نَ نَعْرُزُهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَا يَہ یعنی "آئندہ ہم قریش کے خلاف نکلیں گے مگر انہیں ہمارے خلاف نکلنے کی ہمت نہیں ہوگی۔"

الغرض کم و بیش بیس دن کے محاصرہ کے بعد کفار کا لشکر مدینہ سے بے نیل و مرام واپس چلا گیا اور بنو قریظہ جو ان کی مدد کے لیے نکلے تھے وہ بھی اپنے قلعہ میں واپس آ گئے تھے اس لڑائی میں مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا۔ یعنی صرف پانچ چھ آدمی شہید ہوئے مگر قبیلہ اوس کے رئیس اعظم سعد بن معاذ کو ایسا کاری زخم آیا کہ وہ بالآخر اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور یہ نقصان مسلمانوں کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ کفار کے لشکر میں سے صرف تین آدمی قتل ہوئے، لیکن اس جنگ میں قریش کو کچھ ایسا دھکا لگا کہ اس کے بعد ان کو پھر کبھی مسلمانوں کے خلاف اس طرح جتھہ بنا کر نکلنے یا مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہیں ہوئی اور آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔

۱۔ زرقانی جلد ۱۸، خمس جلد ۵۵۲ ۲۔ ابن ہشام ۳۔ مسلم حالات غزوہ خندق ۴۔ زرقانی ۵۔ مسلم حالات غزوہ خندق

۶۔ ابن ہشام وطبری و زرقانی ۷۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خندق ۸۔ خمس جلد ۵۵۳

شکر کفار کے چلے جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے بھی صحابہ کو واپسی کا حکم دیا اور مسلمان میدان کا رزار سے اٹھ کر مدینہ میں داخل ہو گئے، لیکن ابھی آپ اپنے گھر میں پہنچے ہی تھے کہ بنو قریظہ کے ساتھ لڑائی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور بغیر اس کے کہ آپ مدینہ میں ایک رات بھی آرام کی گذار سکیں آپ کو ان کے مقابلہ کے لیے گھر سے نکلنا پڑا مگر اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

جنگ خندق یا احزاب جو اس طرح غیر متوقع اور ناگہانی طور پر اختتام کو پہنچی ایک نہایت ہی خطرناک جنگ تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی ہنگامی مصیبت اس وقت تک مسلمانوں پر نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی زندگی میں کوئی اتنی بڑی مصیبت ان پر آئی۔ یہ ایک خطرناک زلزلہ تھا جس نے اسلام کی عمارت کو جڑ سے ہلا دیا اور جس کے مسبب مناظر کو دیکھ کر مسلمانوں کی آنکھیں پتھر اگتیں اور ان کے پیچھے منہ کو آنے لگ گئے اور کمزور لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس اب خاتمہ ہے۔ اور اس خطرناک زلزلے کے دھکے کم و بیش ایک ماہ تک ان پر آتے رہے اور کئی ہزار خونخوار درندوں نے ان کے گھروں کا محاصرہ کر کے ان کی زندگیوں کو تلخ کتے رکھا اور اس مصیبت کی تلخی کو بنو قریظہ کی غداری نے دگنا کر دیا اور اس سارے فتنہ کی تہ میں بنو نضیر کے وہ محسن کش یہودی تھے جن پر آنحضرت ﷺ نے احسان کر کے ان کو مدینہ سے امن و امان کے ساتھ نکل جانے کی اجازت دیدی تھی۔ یہ انہی یہودی رؤساء کی اشتعال انگیزی تھی جس سے صحراے عرب کے تمام نامور قبیلے عداوت اسلام کے نشے میں غمور ہو کر مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے لیے مدینہ پر جمع ہو گئے تھے اور یہ قطعی طور پر یقینی ہے کہ اگر اس وقت ان وحشی درندوں کو شہر میں داخل ہو جانے کا موقع مل جاتا تو ایک واحد مسلمان بھی زندہ نہ بچتا اور کسی پاکباز مسلم خاتون کی عزت ان لوگوں کے ناپاک حملوں سے محفوظ نہ رہتی۔ مگر یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی قدرت کا غیبی ہاتھ تھا کہ اس ٹڈی دل کو بے نیل مرام واپس ہونا پڑا اور مسلمان شکر و امتنان کے ساتھ امن و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ مگر بنو قریظہ کا خطرہ ابھی تک اسی طرح قائم تھا۔ یہ لوگ نہایت خطرناک صورت میں اپنی غداری کا مظاہرہ کر کے اب امن و امان کے ساتھ اپنے قلعوں میں محفوظ ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اب کوئی شخص ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لیکن ہر حال ان کے فتنہ کا سد باب ضروری تھا کیونکہ ان کا وجود مدینہ میں مسلمانوں کے لیے ہرگز ایک مارِ آستین سے کم نہ تھا۔ اور دوسری طرف بنو نضیر کا تجربہ بتاتا تھا کہ یہ سانپ ایسا ہے کہ اسے گھر سے باہر نکالنا بھی ایسا ہی خطرناک ہے جیسا کہ اسے اپنے گھر میں رہنے دینا۔



# بنو قریظہ کی غداری اور مدینہ میں یہود کا خاتمہ

## قانون شادی و طلاق



غزوہ بنو قریظہ ذوقعدہ ۳ھ مطابق مارچ و اپریل ۶۲۷ء

جب آنحضرت ﷺ غزوہ خندق سے فارغ ہو کر شرمی واپس تشریف لاتے تو ابھی آپ بمشکل ہتھیار وغیرہ اتار کر نہانے دھونے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آپ کو خدا کی طرف سے کشفی رنگ

میں یہ بتایا گیا کہ جب تک بنو قریظہ کی غداری اور بغاوت کا فیصلہ نہ ہو جاتا آپ کو ہتھیار نہیں اتارنے چاہیے تھے۔ اور پھر آپ کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ بلا توقف بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اس پر آپ نے صحابہ میں عام اعلان کروا دیا کہ سب لوگ بنو قریظہ کے قلعوں کی طرف روانہ ہو جائیں اور نماز عصر وہیں پہنچ کر ادا کی جاوے۔ اور آپ نے حضرت علیؓ کو صحابہ کے ایک دستے کے ساتھ فوراً آگے روانہ کر دیا۔

جب حضرت علیؓ وہاں پہنچے تو بجائے اس کے کہ بنو قریظہ دھن میں غزوہ خندق کے بعد بنو نضیر کا رتیس اعظم اور فتنہ کا بانی میانہ جیتی بنی بنی خطبہ بھی اپنے وعدہ کے مطابق آکر شامل ہو گیا تھا، اپنی غداری و بغاوت پر اظہارِ ندامت کر کے عفو و رحم کے طالب بنتے انہوں نے برعکس بنو قریظہ کو گالیاں دیں۔ اور کمال بے حیائی اور کینگی کے طریق پر ازواجِ مطہرات کے متعلق بھی نہایت ناگوار بدزبانی کی۔

حضرت علیؓ اور ان کے دستے کے روانہ ہو چکنے کے تھوڑی دیر بعد آنحضرت ﷺ بھی مسلح ہو کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ ایک گھوڑے پر سوار تھے اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ جب آپ بنو قریظہ کے قلعوں کے قریب پہنچے تو حضرت علیؓ نے جو تھوڑی دُور تک آپ کے استقبال کے لیے واپس آگئے تھے آپ سے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! میرے خیال میں آپ کو خود آگے تشریف لے جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ انشاء اللہ کافی ہونگے۔“ آپ سمجھ گئے اور فرمانے لگے ”کیا بنو قریظہ نے میرے متعلق کوئی بدزبانی کی ہے؟“ حضرت علیؓ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ خیر ہے چلو قَدْ اَوْذَى مُؤْمِنِی

۱۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ قریظہ ۲۔ ابن ہشام وطبری ۳۔ سیرۃ حلبیہ

۴۔ حضرت علیؓ کا منشاء یہ تھا کہ آپ کو بنو قریظہ کی گالیاں سُکر خواہ نخواہ حلال ہوگا اس لیے آپ نہ جاتیں تو بہتر ہے۔



بِأَكْثَرٍ مِنْ هَذَا - یعنی "موسیٰ کو ان لوگوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکالیف پہنچی تھیں۔" غرض آپ آگے بڑھے اور بنو قریظہ کے ایک کنوئیں پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا۔

شروع شروع میں تو یہودی لوگ سخت تہمت زد اور غرور ظاہر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ چند مسلمان جو ان کے قلعہ کی دیوار کے پاس ہو کر ذرا آرام کرنے بیٹھے تھے اُن پر ایک یہودی عورت بناتہ نامی نے قلعہ کے اوپر سے ایک بھاری پتھر پھینک کر ان میں سے ایک آدمی خلد نامی کو شہید کر دیا اور باقی مسلمان بچ گئے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا انکو محاصرہ کی سختی اور اپنی بے بسی کا احساس ہونا شروع ہوا اور بالآخر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس مشورہ میں اُن کے رئیس کعب بن اسد نے ان کے سامنے تین تجاویز پیش کیں۔ اور کہا کہ "ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو اُسے اختیار کر لو۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ ہم محمدؐ پر ایمان لا کر مسلمان ہو جائیں کیونکہ اگر سچ پوچھا جاوے تو محمدؐ کی صداقت عیاں ہو چکی ہے اور ہماری کتب میں بھی اس کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ اور جب ہم مسلمان ہو جائیں گے تو لازماً یہ جنگ رُک جائیگی۔" مگر لوگوں نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور کہا ہم ایسا کبھی نہیں کریں گے جس پر کعب نے کہا کہ پھر میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں اور پھر عواقب کی طرف سے بے فکر ہو کر تلواریں لیں اور میدان میں نکل جائیں اور پھر جو ہو سو ہو۔ لوگوں نے کہا یہ بھی نہیں منظور نہیں کیونکہ بچوں اور عورتوں کو مار کر ہماری زندگی کیا رہے گی۔ کعب نے جواب دیا کہ "اچھا اگر یہ بھی منظور نہیں تو میری آخری تجویز یہ ہے کہ آج سبت کی رات ہے اور محمدؐ اور اس کے اصحاب آج اپنے آپ کو ہماری طرف سے امن میں سمجھتے ہوں گے پس آج رات ہم قلعہ سے نکل کر محمدؐ اور اس کے ساتھیوں پر شہ خون ماریں اور بعید نہیں کہ ان کی غفلت کی وجہ سے ہم انہیں مغلوب کر لیں۔" مگر بنو قریظہ نے اس تجویز کے ماننے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ آگے ہی ہماری قوم سبت کی بے حرمتی کی وجہ سے مسح کی جا چکی ہے۔ پس اب ہم مزید بے حرمتی کر کے اپنی تباہی کا خود بیج نہیں بو سکتے۔ اس طرح کعب کی ساری تجاویز رد ہو گئیں۔ اور معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔

آخر جب بنو قریظہ محاصرہ کی سختی سے تنگ آ گئے تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ کسی ایسے مسلمان کو جو ان سے تعلقات رکھتا ہو اور اپنی سادگی کی وجہ سے ان کے واقف ہو سکتا ہو اپنے قلعہ میں بلا لیں اور اس سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ آنحضرت ﷺ کا ان کے متعلق کیا ارادہ ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں آئندہ طریق عمل تجویز کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ایچی روانہ کر کے یہ درخواست کی کہ ابو لبابہ بن منذر انصاری کو ان کے قلعہ میں بھجوا دیا جائے تاکہ وہ اس سے مشورہ کر سکیں۔ آپ نے ابو لبابہ کو اجازت دی اور وہ ان کے قلعہ میں چلے گئے۔ اب روماء بنو قریظہ نے یہ تجویز کی ہوتی تھی کہ جوئی کہ

ابولبابہ قلعہ کے اندر داخل ہو سب یہودی عورتیں اور بچے روتے اور چلاتے ہوتے ان کے ارد گرد جمع ہو جاتیں اور اپنی مصیبت اور تکلیف کا اُن کے دل پر پورا پورا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتے چنانچہ ابولبابہ پر یہ داؤ چل گیا اور وہ قلعہ میں جاتے ہی ان کی مصیبت کا شکار ہو گئے اور بنو قریظہ کے اس سوال پر کہ اے ابولبابہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے کیا ہم محمدؐ کے فیصلہ پر اپنے قلعوں سے اُتر آویں۔ ابولبابہ نے بے ساختہ جواب دیا ”ہاں“ مگر ساتھ ہی اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ آنحضرتؐ تمہارے قتل کا حکم دیگے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط تھا اور آنحضرتؐ نے قطعاً کوئی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا مگر انکی مصیبت کے مظاہرہ سے متاثر ہو کر ابولبابہ کا خیال آلام و مصائب کی رُو میں ایسا بہا کہ موت سے ورے ورے نہیں ٹھنرا۔ اور ابولبابہ کی یہ غلط ہمدردی جس کی وجہ سے وہ بعد میں خود بھی مادم ہوتے اور اس ندامت میں انہوں نے اپنے آپ کو جاکر مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ حتیٰ کہ آنحضرتؐ نے انہیں معاف کرتے ہوئے خود جاکر انہیں کھولا، بنو قریظہ کی تباہی کا باعث بن گئی۔ اور وہ اس بات پر ضد کر کے جم گئے کہ ہم محمدؐ کے فیصلہ پر نہیں اُتریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ جاری رہی اور آخر کم و بیش بیس دن کے محاصرہ کے بعد یہ بدبخت یہود ایک ایسے شخص کو حکم مان کر اپنے قلعوں سے اُترنے پر رضامند ہوتے جو باوجود ان کا حلیف ہونے کے ان کی کارروائیوں کی وجہ سے ان کے لیے اپنے دل میں کوئی رحم نہیں پاتا تھا اور جو گو عدل و انصاف کا مجتہد تھا مگر اس کے قلب میں رحمۃ للعالمین کی سی شفقت اور رافت نہیں تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قبیلہ اوس بنو قریظہ کا قدیم حلیف تھا اور اس زمانہ میں اس قبیلہ کے رئیس سعد بن معاذ تھے جو غزوہ خندق میں زخمی ہو کر اب مسجد کے صحن میں زیر علاج تھے۔ اس قدیم جتھہ داری کا خیال کرتے ہوئے بنو قریظہ نے کہا کہ ہم سعد بن معاذ کو اپنا حکم مانتے ہیں۔ جو فیصلہ بھی وہ ہمارے متعلق کریں وہ ہمیں منظور ہوگا۔

لیکن یہودیوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے اس قومی فیصلہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو مجرم بائین کرتے تھے اور دل میں اسلام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض آدمی جن کی تعداد تاریخی روایات میں تین بیان ہوتی ہے بطیب خاطر اسلام قبول کر کے آنحضرتؐ کے حلقہ مگوشوں میں داخل ہو گئے۔ ایک اور شخص تھا وہ مسلمان تو نہیں ہوا مگر وہ اپنی قوم کی غداری پر اس قدر شرمندہ تھا کہ جب بنو قریظہ نے آنحضرتؐ کے ساتھ جنگ کرنے کی ٹھانی تو وہ یہ کہتا ہوا کہ ”میری قوم نے محمدؐ سے سخت غداری کی ہے میں اس غداری میں شامل نہیں ہو سکتا“ مدینہ چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا تھا۔ مگر باقی قوم آخر تک اپنی ضد پر

قائم رہی اور سعد کو اپنا ثالث بنانے پر اصرار کیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اسے منظور فرمایا۔ اور اس کے بعد آپ نے چند انصاری صحابیوں کو سعد کے لانے کے لیے روانہ فرمایا سعد سوار ہو کر آئے اور راستہ میں قبیلہ اوس کے بعض لوگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ اور بار بار یہ درخواست کی کہ قریظہ ہمارے حلیف ہیں جس طرح خزرج نے اپنے حلیف قبیلہ بنو قینقاع کے ساتھ نرمی کی تھی تم بھی قریظہ سے رعایت کا معاملہ کرنا اور انہیں سخت سزا نہ دینا۔ سعد بن معاذ پہلے تو خاموشی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے۔ لیکن جب ان کی طرف سے زیادہ اصرار ہونے لگا تو سعد نے کہا کہ "یہ وہ وقت ہے کہ سعد اس وقت حق و انصاف کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کر سکتا۔" یہ جواب سن کر لوگ خاموش ہو گئے۔

جب سعد آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچے تو آپ نے صحابہ سے فرمایا قَوْمُوا اِلٰی سَيِّدِكُمْ یعنی اپنے رئیس کے لیے اٹھو اور سواری سے نیچے اترنے میں انہیں مدد دو۔ جب سعد سواری سے اتر کر آنحضرت ﷺ کی طرف آگے بڑھے تو آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "سعد بنو قریظہ نے تمہیں حکم مانا ہے اور ان کے متعلق جو تم فیصلہ کرو انہیں منظور ہوگا۔" اس پر سعد نے اپنے قبیلہ اوس کے لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر کہا عَدَيْكُمْ بِذَٰلِكَ عَهْدُ اللّٰهِ وَ مِيثَاقُهُ اِنَّ الْحُكْمَ فِيْهِمْ بِمَا حَكَمْتُ کیا تم خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ پختہ عہد کرتے ہو کہ تم بہر حال اس فیصلہ پر عمل کرنے کے پابند ہو گے جو میں بنو قریظہ کے متعلق کروں؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں ہم وعدہ کرتے ہیں۔ پھر سعد نے اس جہت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں آنحضرت ﷺ تشریف رکھتے تھے کہا۔ وَعَلٰی مَنْ هُمْنَا۔ یعنی "وہ صاحب جو یہاں تشریف رکھتے ہیں کیا وہ بھی ایسا ہی وعدہ کرتے ہیں کہ وہ بہر حال میرے فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کے پابند ہوں گے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔

اس عہد و پیمان کے بعد سعد نے اپنا فیصلہ سنایا جو یہ تھا کہ "بنو قریظہ کے مقاتل یعنی جنگجو لوگ قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر لیے جائیں اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔" آنحضرت ﷺ نے یہ فیصلہ سنا تو بے ساختہ فرمایا۔ لَقَدْ حَكَمْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ یعنی "تمہارا یہ فیصلہ ایک خدائی تقدیر ہے۔" جو ٹل نہیں سکتی۔ اور ان الفاظ سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ بنو قریظہ کے متعلق یہ فیصلہ ایسے حالات میں ہوا ہے کہ اس میں صاف طور پر خدائی تصرف کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس لیے آپ کا جذبہ رحم اسے روک نہیں سکتا۔ اور یہ واقعی درست تھا کیونکہ بنو قریظہ کا البولبابہ کو اپنے مشورہ کے لیے بلانا اور البولبابہ کے

۱۔ طبری صفحہ ۱۲۹۲ ۲۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ بنو قریظہ عن ابی سعید خدری

۳۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے یہ وعدہ لیتے ہوئے سعد کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں یا آپ سے مخاطب ہو کر دریافت کریں۔ ۴۔ ابن ہشام و طبری و کتاب الفرائج ابو یوسف ۵۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ قریظہ

منہ سے ایک ایسی بات نکل جانا جو سراسر بے بنیاد تھی اور پھر بنو قریظہ کا آنحضرت ﷺ کو حکم ماننے سے انکار کرنا اور اس خیال سے کہ قبیلہ اوس کے لوگ ہمارے حلیف ہیں اور ہم سے رعایت کا معاملہ کریں گے سعد بن معاذ رئیس اوس کو اپنا حکم مقرر کرنا۔ پھر سعد کا حق و انصاف کے رستے میں اس قدر نیچے ہو جانا کہ عصبیت اور جھٹھ داری کا احساس دل سے بالکل محو ہو جاوے اور بالآخر سعد کا اپنے فیصلہ کے اعلان سے قبل آنحضرت ﷺ سے اس بات کا پختہ عہد لے لینا کہ بہر حال اس فیصلہ کے مطابق عمل ہوگا۔ یہ ساری باتیں اتفاقی نہیں ہو سکتیں اور یقیناً ان کی تہ میں خدائی تقدیر اپنا کام کر رہی تھی اور یہ فیصلہ خدا کا تھا نہ کہ سعد کا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کی بد عہدی اور غداری اور بغاوت اور فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی وجہ سے خدائی عدالت سے یہ فیصلہ صادر ہو چکا تھا کہ ان کے جنگجو لوگوں کو دنیا سے مٹا دیا جاوے۔ چنانچہ ابتداءً آنحضرت ﷺ کو اس غزوہ کے متعلق غیبی تحریک ہونا بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک خدائی تقدیر تھی۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کے رسول کے ذریعہ سے یہ فیصلہ جاری ہو۔ اور اس لیے اس نے نہایت ہیچ و ذلیل غیبی تصرفات سے آنحضرت ﷺ کو بالکل الگ رکھا۔ اور سعد بن معاذ کے ذریعہ اس فیصلہ کا اعلان کروایا اور فیصلہ بھی ایسے رنگ میں کروایا کہ اب آنحضرت ﷺ اس میں بالکل دخل نہیں دے سکتے تھے کیونکہ آپ وعدہ فرما چکے تھے کہ آپ بہر حال اس فیصلہ کے پابند رہیں گے۔ اور پھر چونکہ اس فیصلہ کا اثر بھی صرف آپ کی ذات پر نہیں پڑتا تھا بلکہ تمام مسلمانوں پر پڑتا تھا اس لیے آپ اپنا یہ حق نہیں سمجھتے تھے کہ اپنی رائے سے خواہ وہ کسی ہی عفو و رحم کی طرف مائل ہو اس فیصلہ کو بدل دیں یہی خدائی تصرف تھا جس کی طاقت سے متاثر ہو کر آپ کے منہ سے بے اختیار طور پر یہ الفاظ نکلے کہ قَدْ حَكَمْتُ بِحُكْمِ اللَّهِ یعنی "اے سعد! تمہارا یہ فیصلہ تو خدائی تقدیر معلوم ہوتی ہے۔" جس کے بدلنے کی کسی کو طاقت نہیں۔

یہ الفاظ کبکر آپ خاموشی سے وہاں سے اٹھے اور شہر کی طرف چلے آئے اور اس وقت آپ کا دل اس خیال سے درد مند ہو رہا تھا کہ ایک قوم جس کے ایمان لانے کی آپ کے دل میں بڑی خواہش تھی اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے ایمان سے محروم رہ کر خدائی قہر و عذاب کا نشانہ بن رہی ہے اور غالباً اسی موقع پر آپ نے یہ حسرت بھرے الفاظ فرمائے کہ لَوْ اَمَنَ بَنِي عَشْرَةَ مِنَ الْيَهُودِ لَآ مَنَّتْ بَنِي الْيَهُودِ یعنی "اگر یہود میں سے مجھ پر دس آدمی (یعنی دس بار سو بخ آدمی بھی ایمان لے آتے۔ تو میں خدا سے امید رکھتا تھا کہ یہ ساری قوم مجھے مان لیتی۔" اور خدائی عذاب سے بچ جاتی یہ

وہاں سے اٹھتے ہوئے آپ نے یہ حکم دیا کہ بنو قریظہ کے مردوں اور عورتوں اور بچوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جاوے۔ چنانچہ دونوں گروہوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے مدینہ میں لایا گیا اور شہر میں دو الگ الگ مکانات میں جمع کر دیا گیا اور آنحضرت ﷺ کے حکم کے ماتحت صحابہ نے (جن میں سے غالباً کئی لوگ خود بھوکے رہے ہونگے)



بنو قریظہ کے کھانے کے لیے ڈھیروں ڈھیر پھل مٹا کیا اور لکھا ہے کہ یہودی لوگ رات بھر پھل نوشی میں مصروف رہے۔

دوسرے دن صبح کو سعد بن معاذ کے فیصلہ کا اجراء ہونا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے چند مستعد آدمی اس کام کی سرانجام دہی کے لیے مقرر فرما دیئے اور خود بھی قریب ہی ایک جگہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ تاکہ اگر فیصلہ کے اجراء کے دوران میں کوئی بات ایسی پیدا ہو جس میں آپ کی ہدایت کی ضرورت ہو تو آپ بلا توقف ہدایت دے سکیں۔ نیز یہ کہ اگر کسی مجرم کے متعلق کسی شخص کی طرف سے رحم کی اپیل ہو تو اس میں آپ فوراً فیصلہ صادر فرما سکیں۔ کیونکہ گو سعد کے فیصلہ کی اپیل عدالتی رنگ میں آپ کے سامنے پیش نہیں ہو سکتی تھی مگر ایک بادشاہ یا صدر جمہوریت کی حیثیت میں آپ کسی فرد کے متعلق کسی خاص وجہ کی بنا پر رحم کی اپیل ضرور سن سکتے تھے۔ آپ نے بتقاضائے رحم یہ بھی حکم صادر فرمایا کہ مجرموں کو ایک ایک کر کے علیحدہ علیحدہ قتل کیا جاوے۔ یعنی ایک کے قتل کے وقت دوسرے مجرم پاس موجود نہ ہوں۔ چنانچہ ایک ایک مجرم کو الگ الگ لایا گیا۔ اور بموجب فیصلہ سعد بن معاذ قتل کیا گیا۔

جب جیحی بن اخطب رتیس بنونضیر آیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ "اے محمد مجھے یہ افسوس نہیں ہے کہ میں نے تمہاری مخالفت کیوں کی لیکن بات یہ ہے کہ جو خدا کو چھوڑتا ہے خدا بھی اُسے چھوڑ دیتا ہے۔" پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "خدا کے حکم کے آگے کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ اسی کا حکم اور اسی کی تقدیر ہے۔" جب کعب بن اسد رتیس قریظہ کو میدان قتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اشارۃً مسلمان ہو جانے کی تحریک کی۔ اُس نے کہا۔ "اے ابوالقاسم! میں مسلمان تو ہو جاتا مگر لوگ کہیں گے موت سے ڈر گیا۔ پس مجھے یہودی مذہب پر ہی مرنے دو۔"

ایک شخص زبیر بن باطیار و سائے قریظہ میں سے تھا۔ اس نے ایک مسلمان ثابت بن قیس نامی پر کسی زمانہ میں کوئی احسان کیا تھا۔ ثابت نے اس کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سفارش کی کہ اسے چھوڑ دیا جاوے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بہت اچھا! اسے چھوڑ دو۔ ثابت نے جاکر زبیر کو خوشخبری دی کہ تجھے آنحضرت ﷺ نے میری سفارش پر چھوڑ دیا ہے۔ زبیر نے کہا۔ میرے بیوی بچے تو قید میں ہیں میں قتل سے بچ کر کیا کروں گا۔ ثابت پھر آنحضرت ﷺ کے پاس گیا اور کہا کہ زبیر یوں کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کے بیوی بچوں کو بھی آزاد کر دو۔ ثابت نے جاکر زبیر کو پھر خوشخبری دی۔ جس پر اُس نے کہا۔ میرا مال تو مسلمانوں کے قبضہ میں جا چکا ہے میں صرف بیوی بچوں کو لے کر کیا کروں گا۔ ثابت نے پھر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا



اور آپ نے زبیر کے مال کے بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیدیا۔ اب ثابت بہت خوش خوش زبیر کے پاس گیا کہ لو اب تمہارا مال بھی تمہیں واپس مل جائے گا۔ اس نے کہا۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے سردار کعب بن اسد اور یہودان عرب کے رئیس خنی بن اخطب کا کیا حال ہے۔ ثابت نے کہا وہ تو قتل کئے جا چکے۔ اس نے کہا۔ جب یہ لوگ قتل ہو گئے تو پھر میں نے زندہ رہ کر کیا کرنا ہے۔ چنانچہ مقتل میں گیا اور تلوار کے سامنے اپنی گردن رکھ دی۔

ایک اور یہودی رفاعہ نامی تھا اس نے ایک رحم دل مسلمان خاتون کی منت سماجت کر کے اُسے اپنی سفارش میں کھڑا کر لیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے اس مسلمان خاتون کی سفارش پر رفاعہ کو بھی معاف فرما دیا۔ غرض اس وقت جس شخص کی بھی سفارش آپ کے پاس کی گئی آپ نے اُسے فوراً معاف کر دیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سعد کے فیصلہ کی وجہ سے مجبور تھے ورنہ آپ کا قلبی میلان ان کے قتل کئے جانے کی طرف نہیں تھا۔

مقتولین میں ایک یہودی عورت بھی تھی۔ جس نے محاصرہ کے وقت قلعہ پر سے ایک پتھر گر کر ایک مسلمان کو شہید کیا تھا۔ پس چونکہ اس نے اس باغیانہ جنگ میں عملی حصہ لیا تھا اور سعد کا یہ فیصلہ تھا کہ جنگ میں حصہ لینے والوں کو قتل کیا جاوے گا اور چونکہ اس عورت کی طرف سے اپنی غداری اور بغاوت اور فعل قتل کے متعلق اظہارِ ندامت بھی نہیں ہوا اور نہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کوئی رحم کی اپیل ہوئی اس لیے اُسے بھی سعد کے حکم کے مطابق مقتل میں لا کر قتل کیا گیا۔ غرض اس طرح کم و بیش چار سو آدمی اس دن سعد کے فیصلہ کے مطابق قتل کئے گئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو حکم دے کر ان مقتولین کو اپنے انتظام میں دفن کروا دیا۔

بچے اور عورتیں جو سعد کے فیصلہ کے مطابق قید کرتے گئے تھے ان کے متعلق بعض روایات سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو نجد کی طرف بھجوا دیا تھا جہاں بعض نجدی قبائل نے ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیا تھا اور اس رقم سے مسلمانوں نے اپنی جنگی ضروریات کے لیے گھوڑے اور ہتھیار خریدے تھے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو کوئی بعید نہیں کیونکہ نجدی قبائل اور بنو قریظہ آپس میں حلیف تھے اور غزوہ قریظہ سے صرف چند دن قبل ہی وہ غزوہ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف اکٹھے لڑ چکے تھے اور دراصل اہل نجد ہی کی انگیخت پر بنو قریظہ نے آنحضرت ﷺ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ پس اگر نجد والوں نے اپنے حلیف

۱۔ طبری وابن ہشام ۲۔ ابن ہشام ۳۔ دیکھو صحیح بخاری حالات بنو قریظہ جہاں سعد کے فیصلہ میں مقاتل یعنی جنگ میں حصہ لینے والے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ۴۔ طبری وابن ہشام ۵۔ ترمذی ابواب الجہاد والسیرو ابن ہشام فی ذکر امر مہینہ وحویتہ ۶۔ طبری وابن ہشام

بنو قریظہ کے قیدیوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑا لیا ہو تو جاتے تعجب نہیں۔ لیکن صحیح روایات سے پتہ لگتا ہے کہ یہ قیدی مدینہ میں ہی رہے تھے اور آنحضرت ﷺ نے انہیں حسب دستور مختلف صحابیوں کی نگرانی میں تقسیم فرما دیا تھا بلکہ اور پھر ان میں سے بعض نے اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لی تھی۔ اور بعض کو آنحضرت ﷺ نے یونہی بطور احسان کے چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر یہ لوگ بعد میں آہستہ آہستہ بطیب خاطر خود مسلمان ہو گئے چنانچہ ان میں سے عطیہ قرظی اور عبدالرحمن بن زبیر بن باطیا اور کعب بن سلیم اور محمد بن کعب کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور یہ سب مسلمان ہو گئے تھے۔ اور ان میں تو خرا ذکر شخص تو ایک بڑے پایہ کا مسلمان گذرا ہے یہ

### ریحانہ کا غلط واقعہ

بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ بنو قریظہ کے قیدیوں میں ایک عورت ریحانہ تھی جسے آنحضرت ﷺ نے لونڈی کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اسی روایت کی بناء پر سرولیم میور نے اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے خلاف نہایت دلائل ارجح کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اول تو صحیح بخاری کی محولہ بالا روایت جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ کے قیدیوں کو صحابہ میں تقسیم فرما دیا تھا اس روایت کو غلط ثابت کرتی ہے اگر آنحضرت ﷺ نے کوئی قیدی عورت اپنے گھر کے لیے الگ کر لی تھی تو طبعاً اس موقع پر بخاری کی روایت میں اس کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ مگر بخاری میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ علاوہ ازیں دوسری صحیح روایات سے معین طور پر ثابت ہے کہ ریحانہ ان قیدیوں میں سے تھی جنہیں آنحضرت ﷺ نے بطور احسان کے چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ریحانہ مدینہ سے رخصت ہو کر اپنے میکے کے خاندان (بنو نضیر) میں چلی گئی تھی اور پھر وہیں رہی اور علامہ ابن حجر نے جو اسلام کے چوٹی کے محققین میں سے ہیں اسی روایت کو صحیح قرار دیا ہے یہ لیکن اگر یہ تسلیم بھی کیا جاوے کہ ریحانہ کو آنحضرت ﷺ نے خود اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا تو تب بھی یقیناً وہ آپ کی بیوی تھی نہ کہ لونڈی۔ چنانچہ جن مؤرخین نے ریحانہ کے متعلق یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا ان میں سے اکثر نے ساتھ ہی یہ صراحت کی ہے کہ آپ نے اسے آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ چنانچہ ابن سعد نے ایک روایت خود ریحانہ کی زبانی نقل کی ہے جس میں وہ بیان کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور پھر میرے مسلمان ہو جانے پر میرے ساتھ شادی فرمائی تھی اور میرا مہر بارہ اوقیہ مقرر ہوا تھا اور ابن سعد نے اس روایت کے مقابلہ میں اس دوری

۱۔ بخاری کتاب النکاح باب حدیث بنی النضیر خمس جلد ۵ ص ۵۷۰ ۲۔ سیرۃ علیہ جلد ۲ صفحہ ۳۷۱

۳۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۴ ۴۔ دیکھو تہذیب التہذیب - اصحاب - اسد الغابہ و استیعاب حالات اشخاص مذکورہ

۵۔ بخاری کتاب النکاح باب حدیث بنی النضیر ۱۰ ص ۵۹۳ ذکر ریحانہ

روایت کو جس پر سرولیم میور نے بنیاد رکھی ہے مراجعت کے ساتھ غلط اور خلاف واقعہ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہی اہل علم کی تحقیق ہے یہ

الغرض اوّل تو جیسا کہ بخاری کی روایت سے استدلال ہوتا ہے اور اصابع میں تصریح کی گئی ہے آنحضرت ﷺ نے ریحانہ کو اپنی سرپرستی میں لیا ہی نہیں بلکہ اسے آزاد کر دیا تھا جس کے بعد وہ اپنے خاندان میں جا کر آباد ہو گئی تھی۔ دوسرے اگر اس روایت کو تسلیم بھی کیا جاوے کہ آنحضرت ﷺ نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا تو تب بھی آنحضرت ﷺ نے اسے آزاد کر کے اس کے ساتھ شادی فرمائی تھی اور اسے لونڈی کے طور پر نہیں رکھا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ریحانہ کے نام اور حسب نسب اور قبیلہ وغیرہ کے متعلق روایات میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس کے وجود ہی کے متعلق شبہ کرنا غالباً غیر معقول نہیں سمجھا جاسکتا۔ خصوصاً جبکہ اس بات کو مد نظر رکھا جاوے کہ اسے ایک ایسے شخص کی بیوی کہا جاتا ہے جو دنیا میں یقیناً سب سے زیادہ تاریخی شخص ہے۔ واللہ اعلم

بنو قریظہ کا واقعہ اور غیر مسلم مورخین  
بنو قریظہ کے واقعہ کے متعلق بعض غیر مسلم مورخین نے نہایت ناگوار طریقے پر آنحضرت ﷺ کے خلاف حملے کئے ہیں

اور ان کم و بیش چار سو بیودیوں کی سزائے قتل کی وجہ سے آپ کو ایک نعوذ باللہ ظالم و سفاک فرمانروا کے رنگ میں پیش کیا ہے اس اعتراض کی بناء محض مذہبی تعصب پر واقع ہے جس سے جہاں تک کم از کم اسلام اور بانی اسلام کا تعلق ہے بہت سے مغربی روشنی میں تربیت یافتہ مورخ بھی آزاد نہیں ہو سکے۔

اس اعتراض کے جواب میں اوّل تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بنو قریظہ کے متعلق جس فیصلہ کو ظالمانہ کہا جاتا ہے وہ سعد بن معاذ کا فیصلہ تھا آنحضرت ﷺ کا ہرگز نہیں تھا۔ اور جب وہ آپ کا فیصلہ ہی نہیں تھا تو اس کی وجہ سے آپ پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ دوم یہ فیصلہ حالات پیش آمدہ کے ماتحت ہرگز غلط اور ظالمانہ نہیں تھا جیسا کہ ابھی ثابت کیا جائے گا۔ سوم یہ کہ اس عہد کی وجہ سے جو سعد نے فیصلہ کے اعلان سے قبل آپ سے لیا تھا آپ اس بات کے پابند تھے کہ ہر حال اس کے مطابق عمل کرتے۔ چہارم یہ کہ جب خود مجرموں نے اس فیصلہ کو قبول کیا اور اس پر اعتراض نہیں اٹھایا اور اسے اپنے لیے ایک خدائی تقدیر سمجھا جیسا کہ خبیب بن الخطیب کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے جو اس نے قتل کئے جانے کے وقت کہے تو اس صورت میں آپ کا یہ کام نہیں تھا کہ خواہ مخواہ اس میں دخل دینے کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ سعد کے فیصلہ کے بعد اس معاملہ کے ساتھ آپ کا تعلق صرف اس قدر تھا کہ آپ اپنی حکومت

کے نظام کے ماتحت اس فیصلہ کو بصورت احسن جاری فرماویں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے اُسے ایسے رنگ میں جاری فرمایا کہ جو رحمت و شفقت کا بہترین نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی جب تک تو یہ لوگ فیصلہ کے اجراء سے قبل قید میں رہے آپ نے ان کی رہائش اور خوراک کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا۔ اور جب ان پر سعد کا فیصلہ جاری کیا جانے لگا تو آپ نے اسے ایسے رنگ میں جاری کیا جو مجرموں کے لیے کم سے کم موجب تکلیف تھا۔ یعنی اول تو ان کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے آپ نے یہ حکم دیا کہ ایک مجرم کے قتل کے وقت کوئی دوسرا مجرم سامنے نہ ہو۔ بلکہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جن لوگوں کو قتل میں لایا جاتا تھا ان کو اس وقت تک علم نہیں ہوتا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں جب تک وہ عین قتل میں نہ پہنچ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جس شخص کے متعلق بھی آپ کے سامنے رحم کی اپیل پیش ہوئی آپ نے اسے فوراً قبول کر لیا اور نہ صرف ایسے لوگوں کی جان بخشی کی بلکہ ان کے بیوی بچوں اور اموال وغیرہ کے متعلق بھی حکم دے دیا کہ انہیں واپس دیتے جاتیں۔ اس سے بڑھ کر ایک مجرم کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک کیا ہو سکتا ہے؟ پس نہ صرف یہ کہ بنو قریظہ کے واقعہ کے متعلق آنحضرت ﷺ پر قطعاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حتیٰ یہ ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اخلاق فاضلہ اور حسن انتظام اور آپ کے فطری رحم و کرم کا ایک نہایت تین ثبوت ہے۔

اب رہا اصل فیصلہ کا سوال۔ سو اس کے متعلق بھی ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ہرگز کسی قسم کے ظلم و تعدی کا دخل نہیں تھا بلکہ وہ عین عدل و انصاف پر مبنی تھا اس کے لیے سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ بنو قریظہ کا جرم کیا تھا اور وہ جرم کن حالات میں کیا گیا۔ سو تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جب شروع شروع میں آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لاتے تو اُس وقت مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے یعنی بنو قینقاع، قبیلہ بنو نضیر اور قبیلہ بنو قریظہ۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد جو پہلا سیاسی کام کیا وہ یہ تھا کہ ان تینوں قبیلوں کے رؤساء کو بلا کر ان کے ساتھ امن و امان کا ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی شرائط یہ تھیں کہ مسلمان اور یہودی امن و امان کے ساتھ مدینہ میں رہیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دیں گے اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کے ساتھ کوئی تعلق رکھیں گے۔ اور اگر کسی بیرونی قبیلہ یا قبائل کی طرف سے مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اگر معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص یا کوئی گروہ اس معاہدہ کو توڑے گا یا فتنہ و فساد کا باعث بنے گا تو دوسروں کو اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے کا حق ہوگا۔ اور تمام اختلافات اور تنازعات محمد ﷺ کے سامنے پیش ہونگے اور



آپ کا فیصلہ سب کے لیے واجب التحیل ہو گا۔ مگر یہ ضروری ہو گا کہ ہر شخص یا قوم کے متعلق اسی کے مذہب اور اسی کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جاوے۔

اس معاہدہ پر یہود نے کس طرح عمل کیا؟ اس سوال کا جواب گزشتہ اوراق میں تفصیل کیساتھ گذر چکا ہے۔ سب سے پہلے قبیلہ بنو قینقاع نے بد عہدی کی اور دوستانہ تعلقات کو قطع کر کے مسلمانوں سے جنگ کی طرح ڈالی۔ اور مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کا کینہہ طرہی اختیار کیا اور پھر آنحضرت ﷺ کی اس صدارتی پوزیشن کو جو بین الاقوام معاہدہ کی رو سے آپ کو حاصل تھی نہایت متروانہ انداز میں ٹھکرا دیا۔ مگر جب وہ مسلمانوں کے سامنے مغلوب ہوتے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں معاف فرما دیا اور صرف اس قدر احتیاطی تدبیر پر اکتفا کی کہ بنو قینقاع مدینہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ جا کر آباد ہو جائیں تاکہ شہر کا امن برباد نہ ہو اور مسلمان ایک مار آستین کے شر سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ قبیلہ بنو قینقاع کے لوگ بڑے امن وامان کے ساتھ اپنے اموال اور بیوی بچوں کو اپنے ہمراہ لے کر مدینہ سے نکل کر دوسری جگہ آباد ہو گئے۔

مگر اس واقعہ سے یہود کے باقی دو قبائل نے سبق حاصل نہ کیا بلکہ آپ کے رحم نے ان کو اور بھی نا واجب جرأت دلادی اور ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یہود کے دوسرے قبیلہ بنو نضیر نے بھی سر اٹھایا اور سب سے پہلے ان کے ایک رئیس کعب بن اشرف نے معاہدہ کو توڑ کر قریش اور دوسرے قبائل عرب کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف ساز باز شروع کی اور عرب کے ان وحشی درندوں کو آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف خطرناک طور پر ابھارا اور مسلمانوں کے خلاف ایسے ایسے شتعال انگیز شعر کہے کہ جس سے ملک میں مسلمانوں کے لیے ایک نہایت خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی اور پھر اس بد بخت نے معزز مسلمان عورتوں کا نام لے لیکر اپنے اشعار میں ان پر پھبتیاں اڑائیں اور بالآخر آنحضرت ﷺ کے قتل کی سازش کی اور جب آنحضرت صلعم کے حکم سے یہ شخص اپنے کبیر کردار کو پہنچا تو اس کا قبیلہ یک جان ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور اس دن سے بنو نضیر نے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے خلاف ساز باز شروع کر دی اور بالآخر سارے قبیلہ نے مل کر آنحضرت ﷺ کے قتل کا منصوبہ باندھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو آپ کو زندہ نہ چھوڑا جاوے۔ اور جب ان کے ان خونی ارادوں کا علم ہونے پر آنحضرت ﷺ نے ان کی تنبیہ اور سنرا کا طرہی اختیار کیا تو وہ نہایت مغرورانہ انداز میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہو گئے اور اس جنگ میں بنو قریظہ نے ان کی اعانت کی یہ مگر جب بنو نضیر مغلوب ہوتے تو آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ کو تو بالکل ہی معاف فرما دیا۔ اور بنو نضیر کو بھی مدینہ سے امن وامان کے ساتھ چلے جانے کی اجازت دیدی البتہ اس قدر کیا کہ انہیں ان کے اسلحہ ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ مگر اس احسان کا



بدلہ بنو نضیر نے یہ دیا کہ مدینہ سے باہر جا کر ان کے رؤساء نے تمام عرب کا چکر لگایا اور مختلف قبائل عرب کو خطرناک طور پر اشتعال دیکر ایک بڑی دل شکرہ مدینہ پر چڑھالائے اور سب سے یہ پختہ عہد لیا کہ اب جب تک اسلام کو نیست و نابود نہ کر لیں گے واپس نہیں جائیں گے۔

ایسے خطرناک وقت میں جس کا ایک مختصر خاکہ اوپر گزر چکا ہے۔ یہود کے نمبرے قبیلہ بنو قریظہ نے کیا کیا؟ اور یہ قبیلہ وہ تھا جس پر آنحضرت ﷺ نے غزوہ بنو نضیر کے موقع پر ان کی غداری کو معاف کر کے خاص احسان کیا تھا۔ اور پھر دوسرا احسان ان پر آنحضرت ﷺ کا یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت صلم کی ہجرت سے قبل بنو نضیر سے مرتبہ اور حقوق میں ادنیٰ سمجھے جاتے تھے یعنی اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا تھا، لیکن اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو محض دیت کی ادائیگی کافی سمجھی جاتی تھی، لیکن آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ کو دوسرے شہریوں کے ساتھ برابری کے حقوق عطا کئے بلکہ باوجود ان عظیم الشان احسانوں کے بنو قریظہ نے پھر بھی غداری کی۔ اور غداری بھی ایسے نازک وقت میں کی جس سے زیادہ نازک وقت مسلمانوں پر کبھی نہیں آیا۔ بنو قینقاع کی مثال ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بنو نضیر کا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ انہوں نے اس سے سبق حاصل نہیں کیا اور کیا تو کیا کیا؟ یہ کیا کہ اپنے معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر اور آنحضرت ﷺ کے احسانات کو فراموش کر کے عین اس وقت جبکہ تین ہزار مسلمان نہایت بے سرو سامانی اور بے بسی کی حالت میں کفار کے دس ہند رہ ہزار ہزار اور خونخوار لشکر سے گھرے ہوئے بیٹھے تھے اور اپنی بیچارگی کو دیکھ کر ان کے کلیجے منہ کو آرہے تھے اور موت انہیں اپنے سامنے دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے قلعوں میں سے نکلے اور مسلمان مستورات اور بچوں پر عقب سے حملہ آور ہو گئے اور مسلمانوں کے اتحاد سے منحرف ہو کر اس خونی اتحاد کی شمولیت اختیار کی جس کا اصل الاصول اسلام اور بانی اسلام کو نیست و نابود کرنا تھا یاں اس بانی اسلام کو جس کا مدینہ میں آنے کے بعد پہلا کام یہ تھا کہ اس نے ان یہود کو اپنا دوست اور معاہدہ بنایا اور یہود کا پہلا کام یہ تھا کہ انہوں نے اسے اپنا دوست اور معاہدہ مان کر اسے اپنی جمہوریت کا صدر تسلیم کیا۔ اندریں حالات بنو قریظہ کا یہ فعل صرف ایک بد عہدی اور غداری ہی نہیں تھا بلکہ ایک خطرناک بغاوت کا بھی رنگ رکھتا تھا اور بغاوت بھی ایسی کہ اگر ان کی تدبیر کامیاب ہو جاتی تو مسلمانوں کی جانوں اور ان کی عزت و آبرو اور ان کے دین و مذہب کا یقیناً خاتمہ تھا۔ پس بنو قریظہ کسی ایک جرم کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ وہ بے وفائی اور احسان فراموشی کے مرتکب ہوئے۔ بد عہدی اور غداری کے مرتکب ہوئے۔ بغاوت اور اقدام قتل کے مرتکب ہوئے۔ اور ان جرموں کا ارتکاب انہوں نے ایسے

حالات میں کیا جو ایک جرم کو بھیانک سے بھیانک صورت دے سکتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی غیر متعصب عدالت ان کے مقدمہ میں موجبات رعایت کا عنصر نہیں پاسکتی۔

ایسے حالات میں ان کی سزا سوائے اس کے کیا ہو سکتی تھی جو دی گئی۔ ظاہر ہے کہ امکانی طور پر صرف تین سزائیں ہی دی جاسکتی تھیں۔ اول مدینہ میں ہی قید یا نظر بندی۔ دوسرے جلا وطنی جیسا کہ بنو قنیقاع اور بنو نضیر کے معاملہ میں ہوا۔ تیسرے جنگجو آدمیوں کا قتل اور باقیوں کی قید یا نظر بندی۔ اب انصاف کے ساتھ غور کرو کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت مسلمانوں کے لیے کونسا طریق کھلا تھا۔ ایک دشمن قوم کا اپنے شہر میں قید رکھنا اس زمانہ کے لحاظ سے بالکل بیرون از سوال تھا۔ کیونکہ اول تو قید کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائش اور خوراک کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی جس کے برداشت کرنے کی ان میں ہرگز طاقت نہیں تھی۔ دوسرے اس زمانہ میں کوئی جیل خانے وغیرہ بھی نہیں ہوتے تھے اور قیدیوں کے متعلق یہی دستور تھا کہ وہ فاتح قوم کے آدمیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ جہاں وہ عملاً بالکل آزاد رہتے تھے۔ ایسے حالات میں ایک پرلے درجہ کے معاند اور سازشی گروہ کا مدینہ میں رہنا اپنے اندر نہایت خطرناک احتمالات رکھتا تھا اور اگر بنو قریظہ پر یہ فیصلہ جاری کیا جاتا تو یقیناً اس کے معنی یہ ہوتے کہ فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازی اور شرارت اور خفیہ ساز باز کے لیے تو ان کو وہی آزادی حاصل رہتی جو پہلے تھی البتہ ان کے اخراجات کی ذمہ داری مسلمانوں پر آجاتی یعنی پہلے اگر وہ اپنا کھاتے تھے اور مسلمانوں کا گلا کاٹتے تھے تو آئندہ وہ کھاتے بھی مسلمانوں کا (جن کے پاس اس وقت اپنے کھانے کے لیے بھی نہیں تھا) اور گلا بھی مسلمانوں کا کاٹتے۔ اور مسلمانوں کے گھروں میں اور ان کے ساتھ مخلوط ہو کر رہنے سننے کی وجہ سے جو دوسرے خطرات ہو سکتے تھے وہ مزید برآں تھے۔ اندر ہی حالات میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی عقلمند شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ بنو قریظہ کو یہ سزا دی جاسکتی تھی۔

اب رہی دوسری سزا یعنی جلا وطنی۔ سو یہ سزا بے شک اس زمانہ کے لحاظ سے دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ایک عمدہ طریق سمجھی جاتی تھی مگر بنو نضیر کی جلا وطنی کا تجربہ بتاتا تھا کہ کم از کم جہاں تک یہود کا تعلق تھا یہ طریق کسی صورت میں پہلے طریق سے کم خطرناک نہیں تھا۔ یعنی یہود کو مدینہ سے باہر نکل جانے کی اجازت دیدینا سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا کہ نہ صرف یہ کہ عملی اور جنگجو معاندین اسلام کی تعداد میں اضافہ ہو جاوے بلکہ دشمنان اسلام کی صف میں ایسے لوگ جا ملیں جو اپنی خطرناک اشتعال انگیزی اور معاندانہ پراپیگنڈا اور خفیہ اور سازشی کارروائیوں کی وجہ سے ہر مخالف اسلام تحریک کے لیڈر بننے کیلئے بے چین تھے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ یہود کے سارے قبائل میں سے بنو قریظہ اپنی عداوت میں بڑھے ہوئے تھے۔ پس

یقیناً بنو قریظہ کی جلا وطنی اس سے بہت زیادہ خطرات کا موجب ہو سکتی تھی جو بنو نضیر نے غزوہ احزاب کو برپا کر کے مسلمانوں کے لیے پیدا کئے اور اگر مسلمان ایسا کرتے تو اس زمانہ کے حالات کے ماتحت ان کا یہ فعل ہرگز خودکشی سے کم نہ ہوتا۔ مگر کیا دنیا کے پردے پر کوئی ایسی قوم ہے جو دشمن کو زندہ رکھنے کے لیے آپ خودکشی پر آمادہ ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو یقیناً مسلمان بھی اس وجہ سے زیر الزام نہیں سمجھے جاسکتے کہ انہوں نے بنو قریظہ کو زندہ رکھنے کے لیے خودکشی کیوں نہیں کی۔

پس یہ ہر دو سزائیں ناممکن تھیں اور ان میں سے کسی کو اختیار کرنا اپنے آپ کو یقینی تباہی میں ڈالتا تھا۔ اور ان دو سزائوں کو چھوڑ کر صرف وہی رستہ کھلا تھا جو اختیار کیا گیا۔ بیشک اپنی ذات میں سعد کا فیصلہ ایک سخت فیصلہ تھا اور فطرت انسانی بظاہر اس سے ایک صدمہ محسوس کرتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بغیر کوئی اور راستہ کھلا تھا جسے اختیار کیا جاتا۔ جب ایک سرجن اپنے کسی بیمار کا جس کے لیے وہ اس قسم کا اپریشن ضروری خیال کرے ہاتھ کاٹ دیتا ہے یا ٹانگ جدا کر دیتا ہے یا کسی اور عضو کو جسم سے علیحدہ کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے تو ہر شریف انسان کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا یعنی اگر حالات کی مجبوری اُسے ضروری نہ قرار دیتی تو اچھا تھا مگر حالات کی مجبوری کے سامنے جھکنا پڑتا ہے بلکہ ایسے حالات میں سرجن کا یہ فعل قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے کہ اس نے تھوڑے یا کم قیمتی حصہ کی قربانی سے زیادہ قیمتی چیز کو بچا لیا۔ اسی طرح بنو قریظہ کے متعلق سعد کا فیصلہ گو اپنی ذات میں سخت تھا مگر وہ حالات کی مجبوری کا ایک لازمی نتیجہ تھا جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مار گولیس جیسا مورخ بھی جو ہرگز اسلام کے دوستوں میں سے نہیں ہے اس موقع پر اس اعتراف پر مجبور ہوا ہے کہ سعد کا فیصلہ حالات کی مجبوری پر مبنی تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ مسٹر مار گولیس صاحب لکھتے ہیں کہ :-

”غزوہ احزاب کا حملہ جس کے متعلق محمد صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ محض خدائی تفرقات کے ماتحت پسپا ہوا وہ بنو نضیر ہی کی اشتعال انگیز کوششوں کا نتیجہ تھا یا کم از کم یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور بنو نضیر وہ تھے جنہیں محمد صاحب نے صرف جلا وطن کر دینے پر اکتفا کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا محمد صاحب بنو قریظہ کو بھی جلا وطن کر کے اپنے خلاف اشتعال انگیز کوششیں کرنے والوں کی تعداد اور طاقت میں اضافہ کر دیں؟ دوسری طرف وہ قوم مدینہ میں بھی نہیں رہنے دی جاسکتی تھی جس نے اس طرح بر ملا طور پر حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کا جلا وطن کرنا غیر محفوظ تھا مگر ان کا مدینہ میں رہنا بھی کم خطر ناک نہ تھا۔ پس اس فیصلہ کے بغیر چارہ نہ تھا کہ ان کے قتل کا حکم دیا جاتا ہے“

پھر یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ مد نظر رکھنی چاہیے کہ بنو قریظہ آنحضرت ﷺ کے صرف حلیف اور معاہدہ ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے ابتدائی معاہدہ کی رو سے مدینہ میں آپ کی حکومت کو تسلیم کر چکے تھے یا کم از کم آپ کی سوڈنیٹی کو انہوں نے قبول کیا تھا پس ان کی حیثیت صرف ایک غدار حلیف یا معمول دشمن کی نہیں تھی بلکہ وہ یقیناً باغی بھی تھے اور باغی بھی نہایت خطرناک قسم کے باغی۔ اور باغی کی سزا خصوصاً جنگ کے ایام میں سوائے قتل کے کوئی اور نہیں سمجھی گئی۔ اگر باغی کو بھی انتہائی سزا نہ دی جاوے تو نظام حکومت بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور شر بر اور مفسدہ پرداز لوگوں کو ایسی جرات حاصل ہو جاتی ہے جو امن عامہ اور رفاہ عام کے لیے سخت ٹھسکا ثابت ہوتی ہے اور یقیناً ایسے حالات میں باغی پر رحم کرنا دراصل ملک پر اور ملک کے امن پسند لوگوں پر ظلم کے ہم معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام متمدن حکومتیں اس وقت تک ایسے باغیوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت قتل کی سزا دیتی چلی آتی ہیں۔ اور کسی عقلمند انسان نے کبھی ان پر اعتراض نہیں کیا۔ پس سعد کا فیصلہ بالکل منصفانہ اور عدل و انصاف کے قواعد کے بالکل مطابق تھا اور آنحضرت ﷺ بوجہ اپنے عہد کے اس فیصلہ کے متعلق رحم کے پہلو کو کام میں نہیں لاسکتے تھے سوائے افراد کے اور اس کے لیے آپ نے ہر ممکن کوشش کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اس شرم سے کہ انہوں نے آپ کو بیچ ماننے سے انکار کر دیا تھا آپ کی طرف رحم کی اپیل کی صورت میں زیادہ رجوع نہیں کیا۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر اپیل ہونے کے آپ رحم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جو باغی اپنے جرم پر ندامت کا اظہار بھی نہیں کرتا اُسے خود بخود چھوڑ دینا سیاسی طور پر نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

ایک اور بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ جو معاہدہ آنحضرت ﷺ اور یہود کے درمیان ابتداء میں ہوا تھا اس کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر یہود کے متعلق کوئی امر قابل تصفیہ پیدا ہوگا تو اس کا فیصلہ خود انہیں کی شریعت کے ماتحت کیا جائے گا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اس معاہدہ کے ماتحت آنحضرت ﷺ ہمیشہ یہود کے متعلق شریعت موسوی کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ اب ہم تورات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں اس قسم کے جرم کی سزا جس کے مرتکب بنو قریظہ ہوتے بعینہ وہی لکھی ہوئی پاتے ہیں جو سعد بن معاذ نے بنو قریظہ پر جاری کی۔

چنانچہ بائبل میں یہ خدائی حکم درج ہے کہ:-

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اُس سے لڑنے کے لیے آہنچے تو پہلے اُس سے صلح کا پیغام کر۔ تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازہ تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جاوے تیری خراج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضے میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں







فیصلہ ہوتا اور پھر یہ فیصلہ بھی یہودی شریعت کے عین مطابق تھا بلکہ اس ابتدائی معاہدہ کے لحاظ سے ضرور تھا کہ ایسا ہی ہوتا کیونکہ اس کی رو سے مسلمان اس بات کے پابند تھے کہ یہود کے متعلق انہی کی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ مگر جو کچھ بھی تھا یہ فیصلہ سعد بن معاذ کا تھا آنحضرت ﷺ کا نہیں تھا۔ اور سعد پر ہی اس کی پہلی اور آخری ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور آنحضرت ﷺ کا تعلق بحیثیت صدر حکومت کے اس سے، صرف اس قدر تھا کہ آپ اس فیصلہ کو اپنی حکومت کے انتظام کے ماتحت جاری فرما دیں۔ اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ نے اسے ایسے رنگ میں جاری فرمایا جو موجودہ زمانہ کی مہذب سے مہذب اور رحم دل سے رحم دل حکومت کے لیے بھی ایک بہترین نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔

انصار کے رئیس اعظم کی وفات  
اور نعمانہ جنت کی حقیقت

حضرت سعد بن معاذ رئیس قبیلہ اوس کی کلائی میں جو زخم غزوہ خندق کے موقع پر آیا تھا وہ باوجود بہت علاج معالجہ کے اچھا ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اور مندمل ہو ہو کر پھر کھل کھل جاتا تھا۔ چونکہ وہ ایک بہت مخلص صحابی تھے اور آنحضرت ﷺ کو ان کی تیمارداری کا خاص خیال تھا اس لیے آپ نے غزوہ خندق کی واپسی پر ان کے متعلق ہدایت فرمائی تھی کہ انہیں مسجد کے صحن میں ایک خیمہ میں رکھا جاوے تا آپ آسانی کے ساتھ ان کی تیمارداری فرما سکیں۔ چنانچہ انہیں ایک مسلمان عورت رفیدہ نامی کے خیمہ میں رکھا گیا جو بیماروں کی تیمارداری اور نرسنگ میں مہارت رکھتی تھی اور عموماً مسجد کے صحن میں خیمہ لگا کر مسلمان زخمیوں کا علاج کیا کرتی تھی یہ مگر باوجود اس غیر معمولی توجہ کے سعد کی حالت رو بہ اصلاح نہ ہوتی اور اسی دوران میں بنو قریظہ کا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے سعد کو غیر معمولی مشقت اور کوفت برداشت کرنی پڑی اور ان کی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ انہی ایام میں ایک رات سعد نے نہایت گریہ وزاری سے یہ دعا کی کہ ”اے میرے مولا تو جانتا ہے کہ میرے دل میں یہ خواہش کس طرح بھری ہوئی ہے کہ میں اس قوم کے مقابل میں تیرے دین کی حفاظت کے لیے جہاد کروں جس نے تیرے رسول کی تکذیب کی اور اُسے اس کے وطن سے نکال دیا۔ اے میرے آقا! میرے خیال میں اب ہمارے اور قریش کے درمیان لڑائی کا خاتمہ ہو چکا ہے، لیکن اگر تیرے علم میں کوئی جنگ ابھی باقی ہے تو مجھے اتنی مہلت دے کہ میں تیرے رستے میں اُن کے ساتھ جہاد کروں، لیکن اگر اُن کے ساتھ ہماری جنگ ختم ہو چکی ہے تو مجھے اب زندگی کی تنہا نہیں ہے مجھے اس شہادت کی موت مرنے دے۔“ لکھا ہے کہ اُسی رات سعد کا زخم کھل گیا اور اس قدر خون بہا کہ خیمے سے باہر نکل آیا اور لوگ گھبرا کر خیمہ کے اندر گئے تو سعد کی حالت دگرگوں تھی آخر اسی حالت میں سعد نے جان دیدی۔

آنحضرت ﷺ کو سعد کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور واقعی اس وقت کے حالات کے ماتحت سعد کی وفات مسلمانوں کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھی۔ سعد کو انصار میں قریباً قریباً وہی حیثیت حاصل تھی جو مہاجرین میں ابوبکر صدیق کو حاصل تھی۔ اخلاص میں قربانی میں خدمت اسلام میں عشق رسول میں یہ شخص ایسا بلند مرتبہ رکھتا تھا جو کم ہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتا ہے۔ اور اس کے ہر حرکت و سکون سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسلام اور بانی اسلام کی محبت اس کی روح کی غذا ہے اور بوجہ اس کے کہ وہ اپنے قبیلہ کا رئیس تھا اس کا نمونہ انصار میں ایک نہایت گہرا عملی اثر رکھتا تھا۔ ایسے قابل روحانی فرزند کی وفات پر آنحضرت ﷺ کا صدمہ ایک فطری امر تھا مگر آپ نے کمال صبر سے کام لیا اور خدائی مشیت کے سامنے تسلیم و رضا کا سر جھکا دیا۔

جب سعد کا جنازہ اٹھا تو سعد کی بوڑھی والدہ نے بتقاضا سے محبت کسی قدر بلند آواز سے اُن کا نوحہ کیا اور اس نوحہ میں زمانہ کے دستور کے مطابق سعد کی بعض خوبیاں بیان کیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس نوحہ کی آواز سُنی تو گو آپ نے اصولاً نوحہ کرنے کو پسند نہیں کیا مگر فرمایا کہ نوحہ کرنے والیاں بہت جھوٹ بولا کرتی ہیں لیکن اس وقت سعد کی ماں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ کہا ہے۔ یعنی جو خوبیاں سعد میں بیان کی گئی ہیں وہ سب درست ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور دفنانے کے لیے خود ساتھ تشریف لے گئے اور قبر کی تیاری تک وہیں ٹھہرے رہے اور آخر وہاں سے دعا کرنے کے بعد تشریف لاتے تھے۔

غالباً اسی دوران میں کسی موقع پر آپ نے فرمایا: اِهْتَرَعَرَشُ الرَّحْمَنِ بِمَوْتِ سَعْدٍ۔ یعنی سعد کی موت پر خدا نے رحمان کا عرش جھوننے لگ گیا ہے۔ یعنی عالم آخرت میں خدا کی رحمت نے غوشی کے ساتھ سعد کی روح کا استقبال کیا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد جب آپ کو کسی جگہ سے کچھ ریشمی پارچات ہدیہ آئے تو بعض صحابہ نے انہیں دیکھ کر ان کی نرمی اور ملائمت کا بڑے تعجب کے ساتھ ذکر کیا اور اسے ایک غیر معمولی چیز جانا۔ آپ نے فرمایا: ”کیا تم ان کی نرمی پر تعجب کرتے ہو۔ خدا کی قسم جنت میں سعد کی چادریں ان سے بہت زیادہ نرم اور بہت زیادہ اچھی ہیں۔“

لعمائے جنت کی حقیقت آپ کا یہ کلام ایک استعارے کے رنگ میں تھا جس میں سعد کے اس راحت کے مقام کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جو انہیں جنت میں حاصل ہوا تھا۔ ورنہ جیسا کہ قرآن شریف اور احادیث سے اصولی طور پر پتہ لگتا ہے جنت کی نعمتوں کا اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں ہو سکتا اور نہ جنت کی نعمتیں ہماری اصطلاح کے لحاظ سے مادی کہلا سکتی

میں اور حق یہی ہے کہ جو الفاظ قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں ان میں صرف استعارہ اور تشبیہ کے طور پر نعمتوں کے کمال کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ اصولی طور پر فرماتا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةٍ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ یہ یعنی کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا کہ نیک لوگوں کے اعمال کے بدلے میں اُن کے لیے جنت میں کس قسم کا آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ اور اس کی تفسیر میں حدیث میں آتا ہے لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ یعنی جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ کبھی کسی انسان کی آنکھ نے انہیں نہیں دیکھا اور کبھی کسی انسان کے کان نے انہیں نہیں سنا اور نہ ان کا تصور کبھی کسی بشر کے دل میں گذرا ہے۔ پس لازماً ماننا پڑے گا کہ جنت کی نعمتیں وہ نعمتیں نہیں جو ہم اس دُنیا میں دیکھتے ہیں۔ یعنی جنت کے پھل وہ پھل نہیں جو ہم اس دُنیا میں کھاتے ہیں اور جنت کے دودھ اور شہد وہ دودھ اور شہد نہیں جو ہم اس دُنیا میں پیتے ہیں۔ اور جنت کی حوریں وہ حوریں نہیں جو ہم اس دُنیا میں خوبصورت عورت کے معنوں میں سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ کچھ اور ہی چیزیں ہیں جن کو بطریق استعارہ اس دنیا کی چیزوں کا نام دے دیا گیا ہے مگر جن کا وہم و تصور بھی ہمارے خیال میں نہیں آ سکتا۔ لیکن اس قدر بہر حال یقینی ہے کہ جنت کی سب نعمتیں خواہ وہ انسانی رُوح کے واسطے ہوں یا جسم کے لیے وہ خالص پاکیزگی اور طہارت پر مبنی ہیں اور ہر قسم کی بدی اور ناپاکی کے عنصر سے کلیتہً پاک ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف فرماتا ہے لَا تَخَوُّ فِيْهَا وَلَا نَأْسٌ تَهُ يٰعْنِي جَنّت و ہ مقام ہے کہ اس میں کوئی عنصر بے ہودگی اور بدی اور ناپاکی کا نہیں ہوگا۔

**شہ ہجری کے بعض متفرق واقعات** اس سال میں بعض متفرق واقعات بھی ہوئے جن کی معتین تاریخ روایات میں مذکور نہیں ہوئی۔ ان

میں سے ایک واقعہ ایک زلزلہ کا آنا ہے۔ جب یہ دھکا مدینہ میں محسوس ہوا تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو نصیحت فرمائی کہ یہ قدرت کے واقعات ہیں جن سے ایک مومن کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ بعض اوقات اس قسم کے واقعات لوگوں کے بیدار کرنے کے لیے پیدا کر دیتا ہے اور ان کو ہوشیار و چوکس رکھنا چاہتا ہے۔

بعض روایات کے مطابق اسی سال حج فرض ہوا لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ روایات درست نہیں ہیں بلکہ حج کی باقاعدہ مشروعیت کا زمانہ بعد کا ہے۔ گو جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے عید اضحیٰ جو حج کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر ہے شہ ہجری میں ہی مشروع ہو گئی تھی اور صحیح روایات سے یہ بھی پتہ چلتا





## اسلامی قانون شادی و طلاق

شادی اور طلاق وغیرہ کے مسائل کے متعلق بھی بہت سے اسلامی احکام اسی سال نازل ہوئے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

اس موقع پر ایک مختصر سا خاکہ شادی اور طلاق کے مسائل کے متعلق اسلامی تعلیم کا پیش کر دیا جاوے۔  
سوسب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ اسلام سے قبل عربوں میں کوئی خاص قانون شادی و طلاق مقرر نہیں تھا بلکہ محض ایک رسم یا طریقی عمل کی صورت تھی اور اس کی پابندی بھی ہر شخص کی اپنی مرضی پر موقوف تھی۔ اور اسی لیے ملک کے مختلف حصوں اور مختلف قبائل میں یہ طریق عمل مختلف صورتیں رکھتا تھا۔

عام طور پر یہ سمجھنا چاہیے کہ عرب میں جائز و ناجائز رشتوں میں زیادہ حد بندی نہیں تھی جتنی کہ سوئلی ماں بہک سے شادی کرنے میں پرہیز نہیں تھا بلکہ قریبی رشتہ دار کی بیوہ پر بغیر اس کی مرضی کے زبردستی قبضہ کر لینے کی رسم بھی پائی جاتی تھی۔ نکاح کے طریق مختلف تھے اور ان میں سے چار زیادہ شائع و متعارف تھے۔ ان میں سے ایک تو یہی رسمی نکاح تھا جو بعد میں زیادہ پاک و صاف ہو کر اسلام میں قائم ہوا لیکن باقی تین ایسے گندے اور ناپاک تھے کہ ان کے ذکر تک سے انسانی طبیعت رکتی ہے۔ تعدد ازواج کی کوئی حد بندی نہیں تھی بلکہ بیویوں کی تعداد ہر شخص کی ذاتی ضرورت، دولت اور شوق پر منحصر تھی۔ بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کا کوئی ضابطہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے متعلق خاوند پر کوئی پابندی تھی۔ مرد کے عورت پر اور عورت کے مرد پر کوئی مقررہ حقوق نہیں تھے بلکہ سارا دار و مدار مرد کی مرضی پر تھا۔ طلاق کا کوئی قانون نہیں تھا۔ مرد جب اور جس طرح چاہتا تھا عورت کو طلاق دیکر الگ کر دیتا تھا۔ اگر مرد کی مرضی نہ ہو تو عورت کے لیے طلاق حاصل کرنے کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ طلاق کے بعد بھی جابر لوگ اپنی مطلقہ عورت پر حکومت رکھتے تھے اور اسے دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ عدت کا قانون بھی کوئی نہیں تھا بلکہ ادھر جدائی ہوتی تھی اور ادھر عورت دوسرے شخص کے ساتھ شادی کے لیے آزاد بھی جاتی تھی۔ الغرض شادی و طلاق کے معاملہ میں عرب میں کوئی قانون نہیں تھا بلکہ سارا دار و مدار مرد کی مرضی پر تھا۔ اور مرد عموماً اپنی بیویوں کے ساتھ نہایت جابرانہ سلوک کرتے تھے اور عورت کے لیے کوئی دادرسی کی جگہ نہیں تھی۔ اسلام آیا تو اس نے گویا ایک نیا عالم پیدا کر دیا۔ اور محض انتظامی فرق کے سوا کہ جو لادبی تھا اصولاً عورت اور مرد کے مساویانہ حقوق تسلیم کئے گئے اور ان حقوق کی حفاظت و نگہداشت کا کام مرد پر نہیں

۱۔ قرآن شریف سورۃ نساء: ۲۳ لے سورۃ نساء: ۲۰ لے بخاری کتاب النکاح باب مَنْ قَالَ لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّی لے ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَسْلِمُ وَعِنْدَهَا عَشْرُ نِسْوَةٍ

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۲۳۳ لے مولا امام مالک کتاب النکاح باب جَمَاعَةٌ مَالًا يَجُوزُ مِنَ النِّكَاحِ

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۲۲۹ لے



چھوڑا بلکہ حکومت کے ہاتھ میں دیا۔ اور حکومت کا یہ فرض مقرر کیا کہ وہ خاوند و بیوی کے حقوق میں ایک دوسرے کی دست درازی کو روکے اور خصوصاً ضعیف طبقہ نسائے کی حفاظت کرے۔ اور دوسری طرف اسلام نے اپنے روحانی اور اخلاقی اثر کے ماتحت مردوں کو یہ پُر زور سفارش کی کہ وہ عورتوں کے ساتھ نہ صرف عدل و انصاف بلکہ شفقت و احسان کا معاملہ کریں۔ اور اس معاملہ میں اسلام نے اتنا زور دیا کہ بعض صحابہ میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اسلام نے تو گویا عورت کو آزاد کر دیا ہے۔<sup>۱</sup>

اسلامی قانون شادی و طلاق کا اصل الاصول یہ ہے کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک سَوَل معاہدہ کا رنگ رکھتا ہے جسے گویا عام معاہدات کی نسبت بہت زیادہ محبت اور وفاداری اور تقدس اور دوام کا عنصر دیا گیا ہے۔ مگر انتہائی حالات میں وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اور اسی ٹوٹنے کا نام اسلامی اصطلاح میں طلاق یا خلع یا فسخ نکاح ہے۔ یہ سَوَل معاہدہ کس طرح قائم ہو سکتا اور کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اس کے متعلق اسلامی قانون کا ڈھانچہ حسب ذیل ہے۔ پہلے ہم قانون شادی کو لیتے ہیں :-  
۱۔ نکاح کرنا اسلام میں ہر اس مسلمان پر جو اس کی طاقت رکھتا ہو فرض ہے اور تہیل سے منع کیا گیا ہے۔<sup>۲</sup>

۲۔ نکاح کی اغراض تعدد و ازدواج کی بحث میں دوسری جگہ مفصل بیان کی جا چکی ہیں اس جگہ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ جن جگہوں میں رشتہ منع ہے ان کا اسلام نے صراحت و تعیین کے ساتھ ذکر کر دیا ہے باقی سب کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ کوئی قوی یا نسلی حد بندی نہیں ہے۔ ممنوع رشتے اعمولاً یہ ہیں۔ باپ کی بیوی۔ ماں۔ رضاعی ماں۔ بیٹی۔ بیوی کی بیٹی۔ بہن۔ رضاعی بہن۔ خالہ۔ چھوٹی۔ بھتیجی۔ بھانجی۔ ساس۔ بہو۔ پر خاوند والی عورت۔ اور دو بہنوں کا ایک وقت میں جمع کرنا۔<sup>۳</sup> اس حکم کی مزید تشریح حدیث میں کر دی گئی ہے۔<sup>۴</sup>

۴۔ نکاح چونکہ مرد و عورت کے ایک معاہدہ کا نام ہے اور انہوں نے ہی اسے ناپاہنا ہوتا ہے۔ اس لیے

۱۔ مسلم کتاب النکاح باب فی الایلاء و البواہ و کتاب النکاح باب فی ضروب النکاح ۷ سورۃ بقرہ ۲۳۳ و ۲۳۸ و سورۃ نساء ۲۲ و ۲۱۔ نیز بخاری کتاب النکاح باب الشرط فی النکاح ۷ بخاری کتاب النکاح باب الشرط فی النکاح ۷ سورۃ طلاق ۷ البواہ و کتاب الطلاق ۷ سورۃ نساء ۲۱ سورۃ نور ۳۱ و ۳۲ و بخاری کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح و باب من اشتد علیکم الباءۃ و باب ما یکرہ من القبتل ۷ دیکھو کتاب ہذا بحث تعدد ازدواج و اقعات سند بھری ۷ سورۃ نساء ۲۴ و ۲۵ و ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ و ۲۹ و ۳۰ و ۳۱ و ۳۲ و ۳۳ و ۳۴ و ۳۵ و ۳۶ و ۳۷ و ۳۸ و ۳۹ و ۴۰ و ۴۱ و ۴۲ و ۴۳ و ۴۴ و ۴۵ و ۴۶ و ۴۷ و ۴۸ و ۴۹ و ۵۰ و ۵۱ و ۵۲ و ۵۳ و ۵۴ و ۵۵ و ۵۶ و ۵۷ و ۵۸ و ۵۹ و ۶۰ و ۶۱ و ۶۲ و ۶۳ و ۶۴ و ۶۵ و ۶۶ و ۶۷ و ۶۸ و ۶۹ و ۷۰ و ۷۱ و ۷۲ و ۷۳ و ۷۴ و ۷۵ و ۷۶ و ۷۷ و ۷۸ و ۷۹ و ۸۰ و ۸۱ و ۸۲ و ۸۳ و ۸۴ و ۸۵ و ۸۶ و ۸۷ و ۸۸ و ۸۹ و ۹۰ و ۹۱ و ۹۲ و ۹۳ و ۹۴ و ۹۵ و ۹۶ و ۹۷ و ۹۸ و ۹۹ و ۱۰۰ و ۱۰۱ و ۱۰۲ و ۱۰۳ و ۱۰۴ و ۱۰۵ و ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ و ۱۰۹ و ۱۱۰ و ۱۱۱ و ۱۱۲ و ۱۱۳ و ۱۱۴ و ۱۱۵ و ۱۱۶ و ۱۱۷ و ۱۱۸ و ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۱ و ۱۲۲ و ۱۲۳ و ۱۲۴ و ۱۲۵ و ۱۲۶ و ۱۲۷ و ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۳۰ و ۱۳۱ و ۱۳۲ و ۱۳۳ و ۱۳۴ و ۱۳۵ و ۱۳۶ و ۱۳۷ و ۱۳۸ و ۱۳۹ و ۱۴۰ و ۱۴۱ و ۱۴۲ و ۱۴۳ و ۱۴۴ و ۱۴۵ و ۱۴۶ و ۱۴۷ و ۱۴۸ و ۱۴۹ و ۱۵۰ و ۱۵۱ و ۱۵۲ و ۱۵۳ و ۱۵۴ و ۱۵۵ و ۱۵۶ و ۱۵۷ و ۱۵۸ و ۱۵۹ و ۱۶۰ و ۱۶۱ و ۱۶۲ و ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۵ و ۱۶۶ و ۱۶۷ و ۱۶۸ و ۱۶۹ و ۱۷۰ و ۱۷۱ و ۱۷۲ و ۱۷۳ و ۱۷۴ و ۱۷۵ و ۱۷۶ و ۱۷۷ و ۱۷۸ و ۱۷۹ و ۱۸۰ و ۱۸۱ و ۱۸۲ و ۱۸۳ و ۱۸۴ و ۱۸۵ و ۱۸۶ و ۱۸۷ و ۱۸۸ و ۱۸۹ و ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۲ و ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۱۹۵ و ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ و ۱۹۹ و ۲۰۰ و ۲۰۱ و ۲۰۲ و ۲۰۳ و ۲۰۴ و ۲۰۵ و ۲۰۶ و ۲۰۷ و ۲۰۸ و ۲۰۹ و ۲۱۰ و ۲۱۱ و ۲۱۲ و ۲۱۳ و ۲۱۴ و ۲۱۵ و ۲۱۶ و ۲۱۷ و ۲۱۸ و ۲۱۹ و ۲۲۰ و ۲۲۱ و ۲۲۲ و ۲۲۳ و ۲۲۴ و ۲۲۵ و ۲۲۶ و ۲۲۷ و ۲۲۸ و ۲۲۹ و ۲۳۰ و ۲۳۱ و ۲۳۲ و ۲۳۳ و ۲۳۴ و ۲۳۵ و ۲۳۶ و ۲۳۷ و ۲۳۸ و ۲۳۹ و ۲۴۰ و ۲۴۱ و ۲۴۲ و ۲۴۳ و ۲۴۴ و ۲۴۵ و ۲۴۶ و ۲۴۷ و ۲۴۸ و ۲۴۹ و ۲۵۰ و ۲۵۱ و ۲۵۲ و ۲۵۳ و ۲۵۴ و ۲۵۵ و ۲۵۶ و ۲۵۷ و ۲۵۸ و ۲۵۹ و ۲۶۰ و ۲۶۱ و ۲۶۲ و ۲۶۳ و ۲۶۴ و ۲۶۵ و ۲۶۶ و ۲۶۷ و ۲۶۸ و ۲۶۹ و ۲۷۰ و ۲۷۱ و ۲۷۲ و ۲۷۳ و ۲۷۴ و ۲۷۵ و ۲۷۶ و ۲۷۷ و ۲۷۸ و ۲۷۹ و ۲۸۰ و ۲۸۱ و ۲۸۲ و ۲۸۳ و ۲۸۴ و ۲۸۵ و ۲۸۶ و ۲۸۷ و ۲۸۸ و ۲۸۹ و ۲۹۰ و ۲۹۱ و ۲۹۲ و ۲۹۳ و ۲۹۴ و ۲۹۵ و ۲۹۶ و ۲۹۷ و ۲۹۸ و ۲۹۹ و ۳۰۰ و ۳۰۱ و ۳۰۲ و ۳۰۳ و ۳۰۴ و ۳۰۵ و ۳۰۶ و ۳۰۷ و ۳۰۸ و ۳۰۹ و ۳۱۰ و ۳۱۱ و ۳۱۲ و ۳۱۳ و ۳۱۴ و ۳۱۵ و ۳۱۶ و ۳۱۷ و ۳۱۸ و ۳۱۹ و ۳۲۰ و ۳۲۱ و ۳۲۲ و ۳۲۳ و ۳۲۴ و ۳۲۵ و ۳۲۶ و ۳۲۷ و ۳۲۸ و ۳۲۹ و ۳۳۰ و ۳۳۱ و ۳۳۲ و ۳۳۳ و ۳۳۴ و ۳۳۵ و ۳۳۶ و ۳۳۷ و ۳۳۸ و ۳۳۹ و ۳۴۰ و ۳۴۱ و ۳۴۲ و ۳۴۳ و ۳۴۴ و ۳۴۵ و ۳۴۶ و ۳۴۷ و ۳۴۸ و ۳۴۹ و ۳۵۰ و ۳۵۱ و ۳۵۲ و ۳۵۳ و ۳۵۴ و ۳۵۵ و ۳۵۶ و ۳۵۷ و ۳۵۸ و ۳۵۹ و ۳۶۰ و ۳۶۱ و ۳۶۲ و ۳۶۳ و ۳۶۴ و ۳۶۵ و ۳۶۶ و ۳۶۷ و ۳۶۸ و ۳۶۹ و ۳۷۰ و ۳۷۱ و ۳۷۲ و ۳۷۳ و ۳۷۴ و ۳۷۵ و ۳۷۶ و ۳۷۷ و ۳۷۸ و ۳۷۹ و ۳۸۰ و ۳۸۱ و ۳۸۲ و ۳۸۳ و ۳۸۴ و ۳۸۵ و ۳۸۶ و ۳۸۷ و ۳۸۸ و ۳۸۹ و ۳۹۰ و ۳۹۱ و ۳۹۲ و ۳۹۳ و ۳۹۴ و ۳۹۵ و ۳۹۶ و ۳۹۷ و ۳۹۸ و ۳۹۹ و ۴۰۰ و ۴۰۱ و ۴۰۲ و ۴۰۳ و ۴۰۴ و ۴۰۵ و ۴۰۶ و ۴۰۷ و ۴۰۸ و ۴۰۹ و ۴۱۰ و ۴۱۱ و ۴۱۲ و ۴۱۳ و ۴۱۴ و ۴۱۵ و ۴۱۶ و ۴۱۷ و ۴۱۸ و ۴۱۹ و ۴۲۰ و ۴۲۱ و ۴۲۲ و ۴۲۳ و ۴۲۴ و ۴۲۵ و ۴۲۶ و ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹ و ۴۳۰ و ۴۳۱ و ۴۳۲ و ۴۳۳ و ۴۳۴ و ۴۳۵ و ۴۳۶ و ۴۳۷ و ۴۳۸ و ۴۳۹ و ۴۴۰ و ۴۴۱ و ۴۴۲ و ۴۴۳ و ۴۴۴ و ۴۴۵ و ۴۴۶ و ۴۴۷ و ۴۴۸ و ۴۴۹ و ۴۵۰ و ۴۵۱ و ۴۵۲ و ۴۵۳ و ۴۵۴ و ۴۵۵ و ۴۵۶ و ۴۵۷ و ۴۵۸ و ۴۵۹ و ۴۶۰ و ۴۶۱ و ۴۶۲ و ۴۶۳ و ۴۶۴ و ۴۶۵ و ۴۶۶ و ۴۶۷ و ۴۶۸ و ۴۶۹ و ۴۷۰ و ۴۷۱ و ۴۷۲ و ۴۷۳ و ۴۷۴ و ۴۷۵ و ۴۷۶ و ۴۷۷ و ۴۷۸ و ۴۷۹ و ۴۸۰ و ۴۸۱ و ۴۸۲ و ۴۸۳ و ۴۸۴ و ۴۸۵ و ۴۸۶ و ۴۸۷ و ۴۸۸ و ۴۸۹ و ۴۹۰ و ۴۹۱ و ۴۹۲ و ۴۹۳ و ۴۹۴ و ۴۹۵ و ۴۹۶ و ۴۹۷ و ۴۹۸ و ۴۹۹ و ۵۰۰ و ۵۰۱ و ۵۰۲ و ۵۰۳ و ۵۰۴ و ۵۰۵ و ۵۰۶ و ۵۰۷ و ۵۰۸ و ۵۰۹ و ۵۱۰ و ۵۱۱ و ۵۱۲ و ۵۱۳ و ۵۱۴ و ۵۱۵ و ۵۱۶ و ۵۱۷ و ۵۱۸ و ۵۱۹ و ۵۲۰ و ۵۲۱ و ۵۲۲ و ۵۲۳ و ۵۲۴ و ۵۲۵ و ۵۲۶ و ۵۲۷ و ۵۲۸ و ۵۲۹ و ۵۳۰ و ۵۳۱ و ۵۳۲ و ۵۳۳ و ۵۳۴ و ۵۳۵ و ۵۳۶ و ۵۳۷ و ۵۳۸ و ۵۳۹ و ۵۴۰ و ۵۴۱ و ۵۴۲ و ۵۴۳ و ۵۴۴ و ۵۴۵ و ۵۴۶ و ۵۴۷ و ۵۴۸ و ۵۴۹ و ۵۵۰ و ۵۵۱ و ۵۵۲ و ۵۵۳ و ۵۵۴ و ۵۵۵ و ۵۵۶ و ۵۵۷ و ۵۵۸ و ۵۵۹ و ۵۶۰ و ۵۶۱ و ۵۶۲ و ۵۶۳ و ۵۶۴ و ۵۶۵ و ۵۶۶ و ۵۶۷ و ۵۶۸ و ۵۶۹ و ۵۷۰ و ۵۷۱ و ۵۷۲ و ۵۷۳ و ۵۷۴ و ۵۷۵ و ۵۷۶ و ۵۷۷ و ۵۷۸ و ۵۷۹ و ۵۸۰ و ۵۸۱ و ۵۸۲ و ۵۸۳ و ۵۸۴ و ۵۸۵ و ۵۸۶ و ۵۸۷ و ۵۸۸ و ۵۸۹ و ۵۹۰ و ۵۹۱ و ۵۹۲ و ۵۹۳ و ۵۹۴ و ۵۹۵ و ۵۹۶ و ۵۹۷ و ۵۹۸ و ۵۹۹ و ۶۰۰ و ۶۰۱ و ۶۰۲ و ۶۰۳ و ۶۰۴ و ۶۰۵ و ۶۰۶ و ۶۰۷ و ۶۰۸ و ۶۰۹ و ۶۱۰ و ۶۱۱ و ۶۱۲ و ۶۱۳ و ۶۱۴ و ۶۱۵ و ۶۱۶ و ۶۱۷ و ۶۱۸ و ۶۱۹ و ۶۲۰ و ۶۲۱ و ۶۲۲ و ۶۲۳ و ۶۲۴ و ۶۲۵ و ۶۲۶ و ۶۲۷ و ۶۲۸ و ۶۲۹ و ۶۳۰ و ۶۳۱ و ۶۳۲ و ۶۳۳ و ۶۳۴ و ۶۳۵ و ۶۳۶ و ۶۳۷ و ۶۳۸ و ۶۳۹ و ۶۴۰ و ۶۴۱ و ۶۴۲ و ۶۴۳ و ۶۴۴ و ۶۴۵ و ۶۴۶ و ۶۴۷ و ۶۴۸ و ۶۴۹ و ۶۵۰ و ۶۵۱ و ۶۵۲ و ۶۵۳ و ۶۵۴ و ۶۵۵ و ۶۵۶ و ۶۵۷ و ۶۵۸ و ۶۵۹ و ۶۶۰ و ۶۶۱ و ۶۶۲ و ۶۶۳ و ۶۶۴ و ۶۶۵ و ۶۶۶ و ۶۶۷ و ۶۶۸ و ۶۶۹ و ۶۷۰ و ۶۷۱ و ۶۷۲ و ۶۷۳ و ۶۷۴ و ۶۷۵ و ۶۷۶ و ۶۷۷ و ۶۷۸ و ۶۷۹ و ۶۸۰ و ۶۸۱ و ۶۸۲ و ۶۸۳ و ۶۸۴ و ۶۸۵ و ۶۸۶ و ۶۸۷ و ۶۸۸ و ۶۸۹ و ۶۹۰ و ۶۹۱ و ۶۹۲ و ۶۹۳ و ۶۹۴ و ۶۹۵ و ۶۹۶ و ۶۹۷ و ۶۹۸ و ۶۹۹ و ۷۰۰ و ۷۰۱ و ۷۰۲ و ۷۰۳ و ۷۰۴ و ۷۰۵ و ۷۰۶ و ۷۰۷ و ۷۰۸ و ۷۰۹ و ۷۱۰ و ۷۱۱ و ۷۱۲ و ۷۱۳ و ۷۱۴ و ۷۱۵ و ۷۱۶ و ۷۱۷ و ۷۱۸ و ۷۱۹ و ۷۲۰ و ۷۲۱ و ۷۲۲ و ۷۲۳ و ۷۲۴ و ۷۲۵ و ۷۲۶ و ۷۲۷ و ۷۲۸ و ۷۲۹ و ۷۳۰ و ۷۳۱ و ۷۳۲ و ۷۳۳ و ۷۳۴ و ۷۳۵ و ۷۳۶ و ۷۳۷ و ۷۳۸ و ۷۳۹ و ۷۴۰ و ۷۴۱ و ۷۴۲ و ۷۴۳ و ۷۴۴ و ۷۴۵ و ۷۴۶ و ۷۴۷ و ۷۴۸ و ۷۴۹ و ۷۵۰ و ۷۵۱ و ۷۵۲ و ۷۵۳ و ۷۵۴ و ۷۵۵ و ۷۵۶ و ۷۵۷ و ۷۵۸ و ۷۵۹ و ۷۶۰ و ۷۶۱ و ۷۶۲ و ۷۶۳ و ۷۶۴ و ۷۶۵ و ۷۶۶ و ۷۶۷ و ۷۶۸ و ۷۶۹ و ۷۷۰ و ۷۷۱ و ۷۷۲ و ۷۷۳ و ۷۷۴ و ۷۷۵ و ۷۷۶ و ۷۷۷ و ۷۷۸ و ۷۷۹ و ۷۸۰ و ۷۸۱ و ۷۸۲ و ۷۸۳ و ۷۸۴ و ۷۸۵ و ۷۸۶ و ۷۸۷ و ۷۸۸ و ۷۸۹ و ۷۹۰ و ۷۹۱ و ۷۹۲ و ۷۹۳ و ۷۹۴ و ۷۹۵ و ۷۹۶ و ۷۹۷ و ۷۹۸ و ۷۹۹ و ۸۰۰ و ۸۰۱ و ۸۰۲ و ۸۰۳ و ۸۰۴ و ۸۰۵ و ۸۰۶ و ۸۰۷ و ۸۰۸ و ۸۰۹ و ۸۱۰ و ۸۱۱ و ۸۱۲ و ۸۱۳ و ۸۱۴ و ۸۱۵ و ۸۱۶ و ۸۱۷ و ۸۱۸ و ۸۱۹ و ۸۲۰ و ۸۲۱ و ۸۲۲ و ۸۲۳ و ۸۲۴ و ۸۲۵ و ۸۲۶ و ۸۲۷ و ۸۲۸ و ۸۲۹ و ۸۳۰ و ۸۳۱ و ۸۳۲ و ۸۳۳ و ۸۳۴ و ۸۳۵ و ۸۳۶ و ۸۳۷ و ۸۳۸ و ۸۳۹ و ۸۴۰ و ۸۴۱ و ۸۴۲ و ۸۴۳ و ۸۴۴ و ۸۴۵ و ۸۴۶ و ۸۴۷ و ۸۴۸ و ۸۴۹ و ۸۵۰ و ۸۵۱ و ۸۵۲ و ۸۵۳ و ۸۵۴ و ۸۵۵ و ۸۵۶ و ۸۵۷ و ۸۵۸ و ۸۵۹ و ۸۶۰ و ۸۶۱ و ۸۶۲ و ۸۶۳ و ۸۶۴ و ۸۶۵ و ۸۶۶ و ۸۶۷ و ۸۶۸ و ۸۶۹ و ۸۷۰ و ۸۷۱ و ۸۷۲ و ۸۷۳ و ۸۷۴ و ۸۷۵ و ۸۷۶ و ۸۷۷ و ۸۷۸ و ۸۷۹ و ۸۸۰ و ۸۸۱ و ۸۸۲ و ۸۸۳ و ۸۸۴ و ۸۸۵ و ۸۸۶ و ۸۸۷ و ۸۸۸ و ۸۸۹ و ۸۹۰ و ۸۹۱ و ۸۹۲ و ۸۹۳ و ۸۹۴ و ۸۹۵ و ۸۹۶ و ۸۹۷ و ۸۹۸ و ۸۹۹ و ۹۰۰ و ۹۰۱ و ۹۰۲ و ۹۰۳ و ۹۰۴ و ۹۰۵ و ۹۰۶ و ۹۰۷ و ۹۰۸ و ۹۰۹ و ۹۱۰ و ۹۱۱ و ۹۱۲ و ۹۱۳ و ۹۱۴ و ۹۱۵ و ۹۱۶ و ۹۱۷ و ۹۱۸ و ۹۱۹ و ۹۲۰ و ۹۲۱ و ۹۲۲ و ۹۲۳ و ۹۲۴ و ۹۲۵ و ۹۲۶ و ۹۲۷ و ۹۲۸ و ۹۲۹ و ۹۳۰ و ۹۳۱ و ۹۳۲ و ۹۳۳ و ۹۳۴ و ۹۳۵ و ۹۳۶ و ۹۳۷ و ۹۳۸ و ۹۳۹ و ۹۴۰ و ۹۴۱ و ۹۴۲ و ۹۴۳ و ۹۴۴ و ۹۴۵ و ۹۴۶ و ۹۴۷ و ۹۴۸ و ۹۴۹ و ۹۵۰ و ۹۵۱ و ۹۵۲ و ۹۵۳ و ۹۵۴ و ۹۵۵ و ۹۵۶ و ۹۵۷ و ۹۵۸ و ۹۵۹ و ۹۶۰ و ۹۶۱ و ۹۶۲ و ۹۶۳ و ۹۶۴ و ۹۶۵ و ۹۶۶ و ۹۶۷ و ۹۶۸ و ۹۶۹ و ۹۷۰ و ۹۷۱ و ۹۷۲ و ۹۷۳ و ۹۷۴ و ۹۷۵ و ۹۷۶ و ۹۷۷ و ۹۷۸ و ۹۷۹ و ۹۸۰ و ۹۸۱ و ۹۸۲ و ۹۸۳ و ۹۸۴ و ۹۸۵ و ۹۸۶ و ۹۸۷ و ۹۸۸ و ۹۸۹ و ۹۹۰ و ۹۹۱ و ۹۹۲ و ۹۹۳ و ۹۹۴ و ۹۹۵ و ۹۹۶ و ۹۹۷ و ۹۹۸ و ۹۹۹ و ۱۰۰۰ و ۱۰۰۱ و ۱۰۰۲ و ۱۰۰۳ و ۱۰۰۴ و ۱۰۰۵ و ۱۰۰۶ و ۱۰۰۷ و ۱۰۰۸ و ۱۰۰۹ و ۱۰۱۰ و ۱۰۱۱ و ۱۰۱۲ و ۱۰۱۳ و ۱۰۱۴ و ۱۰۱۵ و ۱۰۱۶ و ۱۰۱۷ و ۱۰۱۸ و ۱۰۱۹ و ۱۰۲۰ و ۱۰۲۱ و ۱۰۲۲ و ۱۰۲۳ و ۱۰۲۴ و ۱۰۲۵ و ۱۰۲۶ و ۱۰۲۷ و ۱۰۲۸ و ۱۰۲۹ و ۱۰۳۰ و ۱۰۳۱ و ۱۰۳۲ و ۱۰۳۳ و ۱۰۳۴ و ۱۰۳۵ و ۱۰۳۶ و ۱۰۳۷ و ۱۰۳۸ و ۱۰۳۹ و ۱۰۴۰ و ۱۰۴۱ و ۱۰۴۲ و ۱۰۴۳ و ۱۰۴۴ و ۱۰۴۵ و ۱۰۴۶ و ۱۰۴۷ و ۱۰۴۸ و ۱۰۴۹ و ۱۰۵۰ و ۱۰۵۱ و ۱۰۵۲ و ۱۰۵۳ و ۱۰۵۴ و ۱۰۵۵ و ۱۰۵۶ و ۱۰۵۷ و ۱۰۵۸ و ۱۰۵۹ و ۱۰۶۰ و ۱۰۶۱ و ۱۰۶۲ و ۱۰۶۳ و ۱۰۶۴ و ۱۰۶۵ و ۱۰۶۶ و ۱۰۶۷ و ۱۰۶۸ و ۱۰۶۹ و ۱۰۷۰ و ۱۰۷۱ و ۱۰۷۲ و ۱۰۷۳ و ۱۰۷۴ و ۱۰۷۵ و ۱۰۷۶ و ۱۰۷۷ و ۱۰۷۸ و ۱۰۷۹ و ۱۰۸۰ و ۱۰۸۱ و ۱۰۸۲ و ۱۰۸۳ و ۱۰۸۴ و ۱۰۸۵ و ۱۰۸۶ و ۱۰۸۷ و ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ و ۱۰۹۰ و ۱۰۹۱ و ۱۰۹۲ و ۱۰۹۳ و ۱۰۹۴ و ۱۰۹۵ و ۱۰۹۶ و ۱۰۹۷ و ۱۰۹۸ و ۱۰۹۹ و ۱۱۰۰ و ۱۱۰۱ و ۱۱۰۲ و ۱۱۰۳ و ۱۱۰۴ و ۱۱۰۵ و ۱۱۰۶ و ۱۱۰۷ و ۱۱۰۸ و ۱۱۰۹ و ۱۱۱۰ و ۱۱۱۱ و ۱۱۱۲ و ۱۱۱۳ و ۱۱۱۴ و ۱۱۱۵ و ۱۱۱۶ و ۱۱۱۷ و ۱۱۱۸ و ۱۱۱۹ و ۱۱۲۰ و ۱۱۲۱ و ۱۱۲۲ و ۱۱۲۳ و ۱۱۲۴ و ۱۱۲۵ و ۱۱۲۶ و ۱۱۲۷ و ۱۱۲۸ و ۱۱۲۹ و ۱۱۳۰ و ۱۱۳۱ و ۱۱۳۲ و ۱۱۳۳ و ۱۱۳۴ و ۱۱۳۵ و ۱۱۳۶ و ۱۱۳۷ و ۱۱۳۸ و ۱۱۳۹ و ۱۱۴۰ و ۱۱۴۱ و ۱۱۴۲ و ۱۱۴۳ و ۱۱۴۴ و ۱۱۴۵ و ۱۱۴۶ و ۱۱۴۷ و ۱۱۴۸ و ۱۱۴۹ و ۱۱۵۰ و ۱۱۵۱ و ۱۱۵۲ و ۱۱۵۳ و ۱۱۵۴ و ۱۱۵۵ و ۱۱۵۶ و ۱۱۵۷ و ۱۱۵۸ و ۱۱۵۹ و ۱۱۶۰ و ۱۱۶۱ و ۱۱۶۲ و ۱۱۶۳ و ۱۱۶۴ و ۱۱۶۵ و ۱۱۶۶ و ۱۱۶۷ و ۱۱۶۸ و ۱۱۶۹ و ۱۱۷۰ و ۱۱۷۱ و ۱۱۷۲ و ۱۱۷۳ و ۱۱۷۴ و ۱۱۷۵ و ۱۱۷۶ و ۱۱۷۷ و ۱۱۷۸ و ۱۱۷۹ و ۱۱۸۰ و ۱۱۸۱ و ۱۱۸۲ و ۱۱۸۳ و ۱۱۸۴ و ۱۱۸۵ و ۱۱۸۶ و ۱۱۸۷ و ۱۱۸۸ و ۱۱۸۹ و ۱۱۹۰ و ۱۱۹۱ و ۱۱۹۲ و ۱۱۹۳ و ۱۱۹۴ و ۱۱۹۵ و ۱۱۹۶ و ۱۱۹۷ و ۱۱۹۸ و ۱۱۹۹ و ۱۲۰۰ و ۱۲۰۱ و ۱۲۰۲ و ۱۲۰۳ و ۱۲۰۴ و ۱۲۰۵ و ۱۲۰۶ و ۱۲۰۷ و ۱۲۰۸ و ۱۲۰۹ و ۱۲۱۰ و ۱۲۱۱ و ۱۲۱۲ و ۱۲۱۳ و ۱۲۱۴ و ۱۲۱۵ و ۱۲۱۶ و ۱۲۱۷ و ۱۲۱۸ و ۱۲۱۹ و ۱۲۲۰ و ۱۲۲۱ و ۱۲۲۲ و ۱۲۲۳ و ۱۲۲۴ و ۱۲۲۵ و ۱۲۲۶ و ۱۲۲۷ و ۱۲۲۸ و ۱۲۲۹ و ۱۲۳۰ و ۱۲۳۱ و ۱۲۳۲ و ۱۲۳۳ و ۱۲۳۴ و ۱۲۳۵ و ۱۲۳۶ و ۱۲۳۷ و ۱۲۳۸ و ۱۲۳۹ و ۱۲۴۰ و ۱۲۴۱ و ۱۲۴۲ و ۱۲۴۳ و ۱۲۴۴ و ۱۲۴۵ و ۱۲۴۶ و ۱۲۴۷ و ۱۲۴۸ و ۱۲۴۹ و ۱۲۵۰ و ۱۲۵۱ و ۱۲۵۲ و ۱۲۵۳ و ۱۲۵۴ و ۱۲۵۵ و ۱۲۵۶ و ۱۲۵۷ و ۱۲۵۸ و ۱۲۵۹ و ۱۲۶۰ و ۱۲۶۱ و ۱۲۶۲ و ۱۲۶۳ و ۱۲۶۴ و ۱۲۶۵ و ۱۲۶۶ و ۱۲۶۷ و ۱۲۶۸ و ۱۲۶۹ و ۱۲۷۰ و ۱۲۷۱ و ۱۲۷۲ و ۱۲۷۳ و ۱۲۷۴ و ۱۲۷۵ و ۱۲۷۶ و ۱۲۷۷ و ۱۲۷۸ و ۱۲۷۹ و ۱۲۸۰ و ۱۲۸۱ و ۱۲۸۲ و ۱۲۸۳ و ۱۲۸۴ و ۱۲۸۵ و ۱۲۸۶ و ۱۲۸۷ و ۱۲۸۸ و ۱۲۸۹ و ۱۲۹۰ و ۱۲۹۱ و ۱۲۹۲ و ۱۲۹۳ و ۱۲۹۴ و ۱۲۹۵ و ۱۲۹۶ و ۱۲۹۷ و ۱۲۹۸ و ۱۲۹۹ و ۱۳۰۰ و ۱۳۰۱ و ۱۳۰۲ و ۱۳۰۳ و ۱۳۰۴ و ۱۳۰۵ و ۱۳۰۶ و ۱۳۰۷ و ۱۳۰۸ و ۱۳۰۹ و ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ و ۱۳۱۲ و ۱۳۱۳ و ۱۳۱۴ و ۱۳۱۵ و ۱۳۱۶ و ۱۳۱۷ و ۱۳۱۸ و ۱۳۱۹ و ۱۳۲۰ و ۱۳۲۱ و ۱۳۲۲ و ۱۳۲۳ و ۱۳۲۴ و ۱۳۲۵ و ۱۳۲۶ و ۱۳۲۷ و ۱۳۲۸ و ۱۳۲۹ و ۱۳۳۰ و ۱۳۳۱ و ۱۳۳۲ و ۱۳۳۳ و ۱۳۳۴ و ۱۳۳۵ و ۱۳۳۶ و ۱۳۳۷ و ۱۳۳۸ و ۱۳۳۹ و ۱۳۴۰ و ۱۳۴۱ و ۱۳۴۲ و ۱۳۴۳ و ۱۳۴۴ و ۱۳۴۵ و ۱۳۴۶ و ۱۳۴۷ و ۱۳۴۸ و ۱۳۴۹ و ۱۳۵۰ و ۱۳۵۱ و ۱۳۵۲ و ۱۳۵۳ و ۱۳۵۴ و ۱۳۵۵ و ۱۳۵۶ و ۱۳۵۷ و ۱۳۵۸ و ۱۳۵۹ و ۱۳۶۰ و

نکاح میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے یعنی لڑکا اور لڑکی یا مرد و عورت دونوں اس تعلق کے قائم کرنے پر رضامند ہونے چاہئیں۔ اور ان کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔  
 ۵۔ باوجود پردہ کی حد بندیوں کے اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی تحریک کرتا ہے کہ نکاح سے پہلے مرد و عورت ایک دوسرے پر نظر ڈالیں تاکہ شکل و غیرہ کا سوال بعد میں موجب خلش نہ بنے۔

۶۔ اسلام میں نکاح اعلان کے ساتھ علی رؤس الاشهاد ہونا ضروری ہے اور خفیہ نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ اسی اعلان کی غرض سے اسلام میں یہ طریق مقرر کیا گیا ہے کہ جب خاوند بیوی اکٹھے ہوں تو اس خوشی میں خاوند ایک دعوت دے جس میں حسب توفیق اعزہ واجاب اور ہمسائے وغیرہ بلائے جاتیں۔ اس دعوت کو اصطلاحی طور پر ولیمہ کہتے ہیں۔

۷۔ اگر کسی مصلحت کے ماتحت کسی لڑکے یا لڑکی کا ولی یعنی گارڈین اس کے بچپن کی حالت میں ہی یعنی اس کے بالغ ہونے سے پہلے اس کی شادی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات استثنائی صورتوں میں خاص مصالح کے ماتحت ایسا کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے جس کے لیے قانونی طور پر دروازہ کھلا رہنا چاہیے۔ مگر ایسی صورت میں لڑکے کو تو حق ہے ہی۔ لڑکی کو بھی لازماً بالغ ہونے پر حاکم کے ذریعہ اس رشتہ سے منقطع کرنے کا حق ہوگا اور اس کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس حق کو اسلامی اصطلاح میں خیاز البلوغ کہتے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ استثنائی حالات میں نابالغی کے زمانہ میں بھی رشتہ ہو سکتا ہے اس سے مراد صرف عقد نکاح ہے۔ زنا شوائی کے تعلقات مراد نہیں

۱۔ سورۃ نساء: ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ نیز بخاری کتاب النکاح باب لَا يَنْكِحُ الْأَبُ وَغَيْرُهُ الْبِكْرَ وَالْثَيِّبَ إِلَّا بِرِضَا هَا وَمِنْ كِتَابِ النِّكَاحِ بَابُ اسْتِئْذَانِ الثَّيِّبِ فِي النِّكَاحِ بِالنَّطْقِ وَالْبِكْرِ بِالسَّكُوتِ - ۲۔ سورۃ نساء: ۲۱ و ۲۲ نیز بخاری کتاب النکاح باب اسْتَفْرَإِ الْمَرْأَةِ قَبْلَ التَّزْوِيجِ وَتَرْذِي الْبَوَابِ النِّكَاحِ بَابُ مَا جَاءَ فِي السَّفَرِ إِلَى الْمَخْطُوبَةِ -

۳۔ ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي أَهْلَانِ النِّكَاحِ وَمَوْطِئِ امَامِ مَالِكِ كِتَابِ النِّكَاحِ بَابُ جَامِعِ مَا لَا يَخْوُزُ مِنَ النِّكَاحِ - ۴۔ بخاری کتاب النکاح از باب اَوْلِيَّتُهُ حَقُّ تَابِ ابِ اجَابَةِ الدَّاعِي فِي الْعُرْسِ -

۵۔ سورۃ طلاق: ۱ و بخاری کتاب النکاح باب النِّكَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَا الصِّغَارِ

۶۔ اس حق کا اصل الاصل تو قرآن شریف میں ہے جہاں یہ تصریح کی گئی ہے کہ نکاح میں عورت اپنے خاوند سے ایک پختہ عدلیتی ہے دیکھو سورۃ نساء: ۲۰ تا ۲۲ اور یہ منشاء پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ بچپن کی شادی کی صورت میں لڑکی کو بالغ ہونے پر عقد نکاح کے قائم رکھنے یا فسخ کرنے کا حق نہ ہو۔ نیز دیکھو ترمذی ابواب النکاح باب مَا جَاءَ فِي الْكُرَاهِ اسْتِئْذَانِ عَلَى التَّزْوِيجِ



ہیں کہ شاطر لوگ بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنی چرب زبانی اور شہوانی محبت کے مظاہروں سے متاثر کر کے ان کے گارڈینوں کی مرضی اور اطلاع کے بغیر ان کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور جب وہ ان کے دام میں آجاتی ہیں تو پھر دھوکے کا چولہ اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور شہوانی محبت بھی آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگ جاتی ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وہ گھر جس کے اندر ان لڑکیوں نے جنت سمجھ کر قدم رکھا تھا ان کے لیے ایک دوزخ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ابتداءً بے اتفاقی اور پھر بے اتفاقی اور پھر لڑائی اور اس کے بعد جدائی اور بالآخر طلاق تک نوبت پہنچتی ہے۔

علامہ ازیں اس ولایت کے انتظام میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس طرح نکاح کی بنیاد صرف جذبات پر قائم نہیں ہوتی بلکہ دوسرے امور بھی جو رشتہ نکاح میں دیکھنے نہایت ضروری ہوتے ہیں مد نظر رہتے ہیں مثلاً اخلاقی اور دینی حالت - خاندانی حالت - مالی حالت - تمدنی مناسبت - طبائع کی موافقت - عمر - صحت وغیرہ - ظاہر ہے کہ اگر دونوں جوانوں کو بغیر کسی قسم کے مشورہ اور ولایت کے سہارے کے یونہی اکیلا چھوڑ دیا جاوے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے طور پر شادی کر لیں تو چونکہ نوجوانوں میں عموماً جذبات کا زور ہوتا ہے اور مستثنیات کو الگ رکھتے ہوئے یہ جذبات بھی زیادہ تر شہوانی محبت کا رنگ رکھتے ہیں اس لیے دوسرے امور کا نظر انداز ہو جانا بالکل اغلب ہوتا ہے اور عملاً سارا معیار صرف وقتی جذبات پر آ جاتا ہے جس کا نتیجہ اکثر خطرناک نکلتا ہے۔ لیکن ولایت کے انتظام میں یہ خطرہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ کیونکہ لڑکی کے جذبات کے ساتھ ساتھ دلی کے عقل و تجربہ کی شمع بھی اپنا کام کرتی ہے پس ولایت کا انتظام ایک نہایت ہی مبارک انتظام ہے جس میں ایک طرف تو عورت کی جائز آزادی اور اس کا حق انتخاب قائم رہتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ شریعہ اور شاطر لوگوں کے دام تزدیر میں پھنسنے یا محض جذباتی رُو میں بہ کر عقل و تجربہ کے مشورے کو خیر باد کہہ دینے کے بد نتائج سے بچ جاتی ہے۔

۹۔ اسلامی نکاح میں ہر ایک ضروری شرط ہے یعنی مرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی رقم یا جائیداد یا چیز جس کا فیصلہ فریقین کی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے عورت کو دے۔ یہ مہر خاوند کے ذمہ ایک قانونی قرض کا رنگ رکھتا ہے اور اس کی مالک اور متصرف کلید عورت ہوتی ہے۔ نیز یہ مہر اس حق کے علاوہ ہوتا ہے جو عورت کو اس کے خاوند کی وفات پر بطور ورثہ کے ملتا ہے۔ گویا اسلام میں عورت کو تین مختلف ذریعوں سے مال پہنچتا ہے۔ اول اس کے والدین وغیرہ کی طرف سے بطور ورثہ کے۔ یہ دوسرے اس کے خاوند کی طرف سے بطور ورثہ کے۔ تیسرے مہر کے ذریعہ سے اور اس پر لطف یہ ہے



کہ عورت کے ذمہ خرچ کوئی نہیں ہوتا۔

۱۰۔ خاوند اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیوی کے ضروری اخراجات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور یہ خرچ مہر وغیرہ کے علاوہ ہوتا ہے۔

۱۱۔ اگر عورت و مرد نکاح کے وقت آپس میں کوئی خاص معاہدہ یا شرائط کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور اس کی پابندی دونوں پر واجب ہوگی مگر وہ کوئی ایسی شرائط نہیں کر سکتے جن سے شریعت کے کسی حکم کا بطلان لازم آئے۔ اور نہ کوئی ایسی شرط کر سکتے ہیں جو اخلاقاً قابل اعتراض ہو یا جس کے نتیجے میں کسی تیسرے فریق پر سختی لازم آتی ہو۔ اس اصل کے ماتحت اسلام میں اس بات کی اجازت سمجھی جاتی ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے لیے سوکن کے وجود کو ناقابل برداشت یقین کرتی ہے تو وہ نکاح کے وقت خاوند کے ساتھ یہ شرط کرے کہ اس کے ہوتے ہوئے خاوند دوسری شادی نہیں کرے گا۔ یعنی یا تو وہ دوسری شادی بالکل ہی نہیں کرے گا یا پہلے اسے طلاق دے کر جدا کرے گا تو پھر دوسری شادی کریگا۔ اور چونکہ اسلام میں تعدد از دواج کا حکم نہیں ہے بلکہ صرف خاص حالات کے لیے اجازت ہے اور ایسی شرط سے کسی تیسرے شخص پر بھی کوئی نا واجب اثر نہیں پڑتا اس لیے ایسا معاہدہ ناجائز نہ ہوگا۔

۱۲۔ اس انتظامی فرق کے سوا کہ خاوند نظام اہلی کا امیر ہوتا ہے۔ اسلام میں عورت و مرد کے مساویانہ حقوق تسلیم کئے گئے ہیں اور اس اہلی امارت میں بھی خاوند بالکل آزاد نہیں ہے بلکہ اسے حکم ہے کہ اپنی بیوی کیساتھ محبت اور خوش اخلاقی اور ولداری اور عفو کا سلوک کرے۔ اور گویا اسے گھر کا امیر ہونے کی حیثیت میں تادیب کا بھی حق ہے۔ مگر یہ تادیب مناسب اور واجب ہونی چاہیے۔ بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا اس قدر تاکید حکم ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيهِ یعنی "اے مسلمانو! تم میں سے سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سلوک کرنے میں سب سے اچھا ہے۔" اور آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت کی مثال پسلی کی ہڈی کی ہے جو غلطاً خمدار ہوتی ہے اور جسے اگر کوئی انسان سیدھا کرنے

۱۔ سورۃ بقرہ ۲۳۴ و سورۃ نساء ۳۵ و سورۃ طلاق ۷۰ نیز بخاری ابواب النفقات و مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی صلعم والوداؤد کتاب النکاح باب فی حق النکاح علی زوجہا۔ ۲۔ بخاری کتاب النکاح باب الشروط فی النکاح و باب الشروط الکی لا تحل۔ نیز ترمذی ابواب النکاح باب ما جاء فی الشرط عند عقدہ النکاح۔ ۳۔ بخاری کتاب البیوع باب اذا شرط شروطاً فی البیع لا تحل۔ ۴۔ بخاری کتاب النکاح باب الشروط الکی لا تحل۔ ۵۔ مؤلف کتاب النکاح ما لا یجوز من الشرط فی النکاح نیز چشمہ معرفت مصنف مقدس بابی سلسلہ احمدیہ صفحہ ۲۳۷ و ۲۳۸ لے سورۃ بقرہ ۲۲۲ تا ۲۴۰ لے سورۃ نساء ۲۱ تا ۲۱۰ نیز بخاری کتاب النکاح باب حسن المعاشرة مع الابل لے سورۃ نساء ۳۵ و بخاری کتاب النکاح باب ما یکرہ من ضرب النساء والوداؤد کتاب النکاح باب فی حق المرأة علی زوجها ۶۔ ترمذی و ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرة النساء فعل ثانی



کی کوشش کرے تو وہ اپنا کام نہیں دے سیکگی جو اس کے خمدار ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ وہ ٹوٹ جائیگی۔ اسی طرح عورت بھی فطرتاً خمدار ہے یعنی اسکی طبیعت میں بعض خاص ادا تیں رکھی گئی ہیں جو ہیں تو بظاہر کجیاں مگر حقیقتاً انشیت کی جان ہیں۔ اگر اس کے اس فطری خم کو کوئی شخص سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ اُسے سیدھا تو نہیں کر سکے گا مگر یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ پہلی کی ہڈی کی طرح عورت ٹوٹ جائے گی یعنی یا تو وہ اپنے خاوند کے گھر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جائے گی اور یا جدائی اور طلاق تک نوبت آئے گی۔ پس انسان کو چاہیے کہ عورت کے اس فطری خم کو جو اس کی انشیت کے ساتھ لازم و ملزوم کے طور پر ہے سیدھا کرنے کی بے سود کوشش نہ کرے بلکہ اسی خم کے ساتھ اس کے ساتھ نبھاؤ کرے۔ اور آپ نے فرمایا اِنَّ اَخْوَجَ شَيْءٍ فِي الْبَيْتِ اَعْلَاكَ اَلْهَیْطَلِیْ کا سب سے ٹیڑھا حصہ ہی سب سے اونچا ہوتا ہے۔ یعنی حقیقتاً عورت کا یہ فطری خم ہی اس کی نوع کا کمال ہے اور ایک عورت اپنی انشیت میں جتنی کامل ہوگی اتنا ہی اس میں یہ فطری خم زیادہ ہوگا کیونکہ یہ اس کی مخصوص نوعیت کی جان ہے اس نہایت درجہ حکیمانہ ارشاد سے آنحضرت ﷺ نے مرد کی ذہنیت کو عورت کے ساتھ سلوک کرنے کے معاملہ میں ایک نہایت صحیح اور فطری بنیاد پر قائم فرمادیا ہے۔ اور یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین فرمائی ہے کہ اگر عورت کے بعض مخصوص انداز غلط استعمال یا غلط اظہار کی وجہ سے بعض اوقات ہمارے لیے تکلیف و پریشانی کا موجب ہو جائیں تو ان کی مناسب اصلاح تو کرو مگر ان کی وجہ سے گھبرا کر ان کو بالکل مٹا دینے کی کوشش نہ کرو کیونکہ وہ عورت کی فطرت کا حصہ ہیں اور اگر وہ صحیح حدود کے اندر رہیں گے تو وہی تمہاری اہلی خوشی کی بنیاد بن جائیں گے۔

۱۳۔ عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام جائز امور میں خاوند کی اطاعت کرے اس کے ساتھ محبت و امتنان اور وفاداری کا نبھاؤ کرے۔ اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اس کے بچوں کی تربیت کرے اور اس کے خانگی امور کا انتظام کرے۔

۱۴۔ چونکہ عورت کے حقوق مرد پر اور مرد کے حقوق عورت پر اسلام میں ایک قانونی رنگ رکھتے ہیں اس لیے ان کے باہمی تنازعات عدالت میں جاسکتے ہیں۔ چنانچہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس مسلمان عورتیں اپنے خاوندوں کی شکایتیں لایا کرتی تھیں اور آپ ان میں فیصلہ فرماتے تھے۔ اور

۱۔ مسلم کتاب الرضاع باب الوصیۃ بالنساء۔ ۲۔ بخاری کتاب النکاح باب الوصایۃ بالنساء۔ ۳۔ سورۃ النساء۔ ۴۔ نیز بخاری کتاب النکاح باب الیمن بیک وای النسا۔ خیر باب کفران العشیر و باب المرأة راعیۃ فی بیت زوجها و باب لا تطیع المرأة زوجها فی معصیۃ نیز دیکھو مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عسرۃ النساء۔ ۵۔ سورۃ بقرہ ۲۳۰ تا ۲۳۲۔ ۶۔ دیکھو مشکوٰۃ کتاب النکاح

ان کے حقوق ان کو دلوانے اور ہر طرح ان کی دلداری فرماتے تھے جی کہ ان حقوق اور اس قسم کے مرتبہ سلوک کی وجہ سے صحابہ میں یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ اسلام نے تو گویا عورتوں کو آزاد کر دیا ہے۔  
 ۱۵۔ تعدد ازدواج اور دیگر متعلقہ مسائل کے متعلق چونکہ دوسرے موقع پر مفصل بحث گزر چکی ہے اس لیے اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔  
 طلاق کے قانون کا ڈھانچہ اس طرح پر سمجھنا چاہیے کہ:-

۱۔ چونکہ نکاح ایک بول معاہدہ ہے اس لیے وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے مگر اسلام نے صرف انتہائی حالات میں اس کے توڑنے کی اجازت دی ہے جبکہ کوئی اور چارہ نہ رہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ **أَبْغَضُ الْحَلَائِلِ إِلَى اللَّهِ الطَّلَاقُ** یعنی جن باتوں کو خاص مصالح کے ماتحت خدائی شریعت میں جائز اور حلال قرار دیا گیا ہے ان میں طلاق خدا کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ اس اصل کے ماتحت اسلام نے ازدواجی رشتہ کو گویا ایک گونہ تقدس اور دوام کا رنگ دیدیا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ رشتہ نکاح کے منقطع کرنے میں کبھی بھی جلدی نہ کریں بلکہ انتہائی احتیاط سے کام لیں۔ مگر ایک جامع اور عالمگیر شریعت کی حیثیت میں اسلام نے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ مرد و عورت کے تعلقات میں ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس رشتہ کا خوشگوار صورت میں قائم رہنا محال ہو جاتا ہے۔ اور نہ صرف خاوند و بیوی دونوں کی خانگی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس تلخی کا اثر لازماً ان کے دوسرے کاموں پر بھی پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ایک انہوس کرتے ہوئے دل کے ساتھ اس رشتہ کو منقطع کر دیا جاوے۔ چنانچہ اسی قسم کے انتہائی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ نے اسلام میں طلاق کا قانون جاری فرمایا ہے۔

۲۔ اس قانون طلاق کو خلاف شریعت اور ناجائز نکاح کی صورتوں کو الگ رکھتے ہیں جنہیں اصطلاحاً نکاح باطل یا نکاح فاسد کہتے ہیں) موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم شدہ سمجھنا چاہیے۔ اول فسخ نکاح کی صورت جس کے اندر میں فقہ کی اصطلاح سے کسی قدر ہٹ کر لجان وغیرہ کی صورت کو بھی شامل کرتا ہوں۔ یعنی تمام وہ صورتیں جبکہ عقد نکاح کا قائم رہنا ناجائز ہو جاوے۔ دوم طلاق یعنی وہ صورت جبکہ علیحدگی کی خواہش اور جدائی کی تحریک خاوند کی طرف سے ہو۔ سوم خلع یعنی وہ صورت جبکہ علیحدگی کی خواہش اور جدائی کی تحریک بیوی کی طرف سے ہو۔ ان تینوں صورتوں کے لیے اسلام نے الگ الگ ضابطہ مقرر فرمایا ہے۔

۱۔ سلم کتاب الرضا باب فی الإیلاء عن عباس۔ والردود کتاب النکاح باب فی ضرب النساء

۲۔ دیکھئے کتاب ہذا حالات ستمہ ہجری ۱۰۰۰ الودود الباب الطلاق باب فی کراهیة الطلاق

۳۔ دیکھئے مشکوٰۃ کتاب النکاح و کتاب الطلاق وغیرہ۔ نیز دیکھئے زاد المعاد فصول متعلقہ

۳۔ فسخ نکاح کی صورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ نکاح کا قائم رہنا ناجائز ہو جاوے مثلاً لڑکی اپنا حق خیار البلوغ استعمال کرے یا جس کی کسی قدر تشریح اور گزر چکی ہے۔ یا مثلاً خاوند کو اپنی بیوی کی عصمت کے خلاف یقین ہو جاوے مگر وہ اُسے شرعی طور پر ثابت نہ کر سکے جس صورت میں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے خلاف متوکلہ بگذار حلف اٹھائیں اور پھر ان میں علیحدگی کرا دی جاوے۔ اس صورت کو اسلامی اصطلاح میں رعان کہتے ہیں۔

۴۔ طلاق کی صورت میں اسلامی حکم یہ ہے کہ جب مرد و عورت میں ایسے حالات پیدا ہو جاویں کہ خاوند اپنی بیوی کو علیحدہ کرنے کی طرف مائل ہو جاوے تو پیشتر اس کے کہ وہ طلاق دے فریقین کے متعلقین کو ایک موقع مصالحت کی کوشش کا ملنا چاہیے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاوے تو فہرنا لیکن اگر وہ کامیاب نہ ہو تو اس صورت میں خاوند کو خود اپنے اختیار سے بغیر عدالت میں جانے کے طلاق دینے کا حق ہے مگر یہ طلاق ایسے طہر میں ہونی چاہیے جس میں خاوند بیوی اکٹھے نہ ہوتے ہوں۔ تاکہ یہ کام جلد بازی کے طریق پر نہ ہو کہ جب جی میں آیا طلاق دیدی اور تا عورت کی مخصوص کشتش خاوند کو اس کے اس ارادے سے روکنے کے لیے آزاد رہے۔

۵۔ گو خاوند بیوی کی جدائی ایک طلاق سے بھی ہو سکتی ہے مگر دو طلاقیوں تک خاوند کو رجوع کا حق رہتا ہے اور کامل جدائی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ طلاق تین دفعہ تین مختلف وقتوں میں دی جاوے تاکہ مکمل علیحدگی کے لیے کسی عارضی ناراضگی میں قدم نہ اٹھایا جاسکے اور خاوند کو اپنے ٹھنڈے لمحات میں اونچی نیچی کے سوچنے کا موقع مل جاوے۔ اگر کوئی شخص جوش میں آکر ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیتا ہے تو وہ ناجائز ہوگا اور صرف ایک طلاق شمار ہوگی۔

۶۔ طلاق کی صورت میں خاوند کا فرض ہے کہ اگر وہ اپنی بیوی کا مرہیلے نہیں ادا کر چکا تو طلاق کے وقت اسے ادا کرے اور اگر کوئی اور مال اُس نے اپنی بیوی کو دے رکھا ہے تو وہ بھی واپس نہ لے بلکہ ممکن ہو تو اپنے پاس سے کچھ اور بھی دیدے اور بڑی خوش معاملگی اور احسان کے طریق پر اس کام کو سرانجام دے۔

۱۔ ہدایۃ المبتدئ و زاد العاد فصل متعلقہ۔ ۲۔ سورۃ نور: ۹ تا ۱۰ نیز بخاری کتاب الطلاق الباب اللعان

۲۔ سورۃ نساء: ۳۶۔ ۳۔ سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲ و سورۃ نساء: ۲۶ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۵

۴۔ بخاری کتاب الطلاق باب اول۔ نیز بخاری کتاب التفسیر سورۃ طلاق ۱۵ سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۲ نیز البدایہ و النہایہ

۵۔ نکاح باب فی البتہ و بخاری کتاب الطلاق باب و بَعَثَ لَتَشْهَنَ اَحْسَنُ بَرَقَ هِنَ و نسائی عن محمود بن لبید۔ بحوالہ مشکوٰۃ باب

الخلع و الطلاق فصل ثانی ۱۵ سورۃ بقرہ: ۲۳۰ تا ۲۳۶ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۸

۷۔ طلاق کے بعد بھی جب تک عورت دوسری شادی کے لیے آزاد نہ ہو جاوے خاوند اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی مطلقہ بیوی کے ضروری اخراجات کا بوجھ اٹھاتے ہے اور اگر کوئی خور و سالہ اولاد ہے جو ماں سے جدا نہیں ہو سکتی تو وہ بھی ماں کے پاس رہے گی۔ اور اس کے ضروری اخراجات کا ذمہ دار باپ ہو گا۔

۸۔ خلع کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ چونکہ خانگی نظام کی امارت خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی از روئے شریعت اور از روئے عقل وہ نہ صرف بیوی کے اخراجات کا ذمہ دار ہے بلکہ فیملی کا ہیڈ بھی وہی ہے اور پھر دوسری طرف عورت ہوتی بھی نسبتاً سادہ مزاج ہے اور چالاک لوگوں کے دھوکے میں زیادہ آسانی کے ساتھ آ سکتی ہے۔ اس لیے بیوی کو خود بخود علیحدہ ہو جانے کا حق نہیں ہے بلکہ اس صورت میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے عورت اپنے خاوند کے ساتھ نبھاؤ کو ناممکن خیال کرے اور دوسری طرف خاوند اسے الگ کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو وہ حاکم کے ذریعہ علیحدگی حاصل کر سکتی ہے اور حاکم کا یہ کام مقرر کیا گیا ہے کہ اگر عورت کی طرف سے حقیقی خواہش علیحدگی کی موجود ہو اور وہ کسی دھوکے اور شرارت کا شکار نہ ہو رہی ہو تو علیحدگی کا حکم دیدے اور اس سوال میں زیادہ نہ پڑے کہ عورت کی علیحدگی کی خواہش مناسب یا پسندیدہ ہے یا نہیں یہ اس اصل کے ماتحت اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی دوسری شادی کو اپنے لیے واقعی ناقابل برداشت پاتی ہے تو وہ محض اسی نام پر خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

۹۔ اگر خاوند اپنی بیوی کو کوئی مال یا جائیداد علاوہ از اخراجات زندگی دے چکا ہو اور وہ اس کی واپسی کا مطالبہ کرے تو خلع کی صورت میں عدالت اس کی واپسی کا بوجھ مناسب حد تک عورت پر ڈال سکتی ہے۔

۱۰۔ فسخ نکاح اور طلاق اور خلع کی ان صورتوں میں جن میں خاوند اور بیوی کے اکٹھے ہونے کے بعد علیحدگی ہوئی ہو عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ اس کی علیحدگی پر ایک مقررہ میعاد

۱۔ سورۃ بقرہ: ۲۲۲ و سورۃ طلاق: ۱ تا ۸۔ نیز دیکھو بخاری کتاب الطلاق باب قصۃ فاطمۃ و ہدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ ۲۔ سورۃ بقرہ: ۲۳۴ نیز موتا و الوداؤد باب من احق بالولد و ہدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ ۳۔ سورۃ بقرہ: ۲۳۰، ۲۳۱ نیز بخاری کتاب النکاح باب الخلع و مشکوٰۃ باب الخلع و باب المولیٰ فی النکاح نیز دیکھو ہدایۃ المجتہد و زاد المعاد فصول متعلقہ ۴۔ بخاری کتاب الطلاق باب الخلع و الوداؤد الباب الطلاق باب الخلع ۵۔ چشمہ معرفت صفحہ ۲۳۸ و کشتی نوح صفحہ ۷۶ ۶۔ سورۃ بقرہ: ۲۳۰، ۲۳۱ نیز بخاری کتاب النکاح باب الخلع نیز دیکھو مشکوٰۃ باب الخلع



جسے موٹے طور پر تین ماہ کہہ سکتے ہیں نہ گذر جاوے یا حمل کی صورت میں وضع حمل نہ ہو جائے۔ اس ميعاد کو شریعت کی اصطلاح میں عدت کہتے ہیں یہ

یہ اس قانون شادی و طلاق کا ڈھانچہ ہے جو آنحضرت ﷺ نے خدائی حکم کے ماتحت مسلمانوں کے واسطے مقرر فرمایا۔ اس نظام میں اسلامی قانون شادی کی خوبی تو ہمیشہ ہی اہل عقل و خرد کے نزدیک مسلم رہی ہے مگر یہ ایک شکر کا مقام ہے کہ صدیوں کی ٹھوکروں کے بعد اب دنیا آہستہ آہستہ اسلامی قانون طلاق کی طرف بھی آ رہی ہے۔ چنانچہ مختلف مسیحی ممالک میں کم و بیش اسی لائن پر طلاق کا قانون بننا چلا جا رہا ہے جو اسلام نے پیش کی ہے گو مغربی ممالک کی روش میں یہ اندیشہ بھی ضرور پایا جاتا ہے کہ کہیں طلاق زیادہ عام نہ ہو جائے یعنی اس معاملہ میں لوگوں کے لیے حد اعتدال سے زیادہ آزادی کا دروازہ نہ کھول دیا جاوے کیونکہ جہاں ایک طرف طلاق کے دروازے کو بالکل بند کر دینا یا ایسی نا واجب شرائط کے ساتھ مشروط کر دینا جو عملاً بند کر دینے کے مساوی ہو سخت نقصان دہ ہے وہاں اسے نا واجب طور پر زیادہ کھول دینا بھی کم ضرر رساں نہیں اور یقیناً اصلاح کا رستہ وہی ہے جو اسلام نے اعتدال پر قائم رہتے ہوئے پیش کیا ہے۔

اس جگہ یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہو گا کہ میور صاحب نے اسلامی قانون طلاق پر یہ دلائل اٹھائے ہیں کہ اس کی رو سے دو طلاقیں تک تو خاوند کو اپنی بیوی کی طرف رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے لیکن تیسری طلاق ہو چکنے کے بعد اُسے یہ حق صرف اس صورت میں ہے کہ عورت کسی اور شخص کے نکاح میں آکر پھر اس سے علیحدگی حاصل کرے اور اس کے بعد میور صاحب نہایت جرأت کے انداز میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں اس بات کو جائز رکھا گیا ہے کہ ایک کرایہ دار مرد کی خدمات حاصل کر کے اس کے ساتھ ایسی عورت کو اس شرط کے ساتھ بیاہ دیا جاوے کہ وہ اُسے نکاح کے بعد طلاق دے دیگا تاکہ وہ عورت اپنے اصل خاوند کی طرف لوٹ سکے۔ یہ اعتراض میور صاحب کے پرلے درجہ کے تعصب اور اگر تعصب نہیں تو پرلے درجہ کی لاعلمی پر مبنی ہے۔ اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ سابق خاوند کے واسطے عورت کو جائز کرنے کے لیے یہ حیلہ کیا جاوے کہ عورت کو کسی اور آدمی سے بیاہ کر پھر اس سے علیحدگی حاصل کی جاوے بلکہ حق یہ ہے کہ اسلام اس قسم کے حیلہ کو ایک سخت ناپاک اور لعنتی فعل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ لَعَنَ اللَّهُ الْمُحْضِلَّ وَالْمُحْضِلَ لَهُ ۖ یعنی وہ شخص خدا کی لعنت کے نیچے ہے جو کسی عورت کے ساتھ اس نیت سے نکاح کرتا ہے کہ تا بعد میں اسے طلاق دیکر اس کے سابق خاوند کے لیے اُسے جائز کرے



اور اسی طرح وہ شخص بھی خدا کی لعنت کے نیچے ہے جو کسی دوسرے شخص سے اپنی سابقہ بیوی کا اس غرض سے نکاح کرواتا ہے کہ تا وہ شخص اس سے طلاق حاصل کرے پھر اس کے نکاح میں آسکے۔ اور حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کا نفل کرے گا تو میں اُسے زنا کی سزا دوں گا۔ اندر ہی حالات اس سے بڑھ کر دیدہ دلیری کیا ہوگی کہ اسلام کی طرف اس ناپاک طریق کو منسوب کیا جاوے۔ اسلامی تعلیم کا منشاء جسے میور صاحب نے نہیں سمجھا یا نہیں سمجھنا چاہا صرف یہ ہے کہ جب تین طلاقیں ہو چکیں تو اس کے بعد مرد و عورت اکٹھے نہیں ہو سکتے سوائے اس کے کہ عورت اپنی جائز ضرورت و غرض کے ماتحت کسی اور آدمی کے نکاح میں آئے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے نئے خاوند کی وفات یا کسی حقیقی اختلاف کی بناء پر طلاق کی وجہ سے نسا اس غرض سے کہ وہ اپنے پہلے خاوند کی طرف لوٹ سکے پھر شادی کے لیے آزاد ہو جاوے تو اس صورت میں باہم رضامندی کے ساتھ پہلا خاوند اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے۔ اور اس قانون میں حکمت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو یکے بعد دیگرے تین دفعہ طلاق دے چکتا ہے تو اس لیے تجربہ کے بعد یہی سمجھا جائے گا کہ اب ان کی اپنی زندگی کسی صورت میں خوشگوار نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اب انہیں پھر اکٹھے ہو کر ایک مزید تلخ تجربہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ کامل طور پر علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہونے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے، لیکن اگر اس کے بعد عورت کسی اور مرد کے نکاح میں آئے اور اس کے ساتھ متلاہانہ زندگی گزارے اور پھر کسی حقیقی اور جائز وجہ سے اس نئے خاوند سے اس کی علیحدگی ہو جائے یا اس کا نیا خاوند فوت ہو جائے اور اس کے بعد وہ اور اس کا سابقہ خاوند باہم رضامندی کے ساتھ پھر اکٹھے ہونا چاہیں تو ان کے رستے میں کوئی روک نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ ان کی شادی میں کوئی امر اصولاً مانع نہیں ہے ایسی صورت میں یہ اُمید کرنا ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ اب وہ ایک دوسرے کے ساتھ نبھاؤ کر سکیں گے کیونکہ ایک عرصہ تک ایک دوسرے سے الگ رہنے اور اس عرصہ میں ایک تیسرے شخص کے ساتھ معاملہ پڑنے کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر پیدا ہو جانا بالکل ممکن اور قرین قیاس ہے اور یہ مسئلہ بھی دراصل اسلام نے اس غرض سے خاص طور پر بیان کیا ہے کہ اگر ایک طرف اپنی زندگی کے تلخ تجربات کے سلسلہ کو محدود کیا جاوے تو دوسری طرف لوگوں میں اس خیال کا بھی سد باب کیا جاوے کہ گویا تین طلاقیں کا وجود اپنی ذات میں کوئی حرمت کی وجہ ہے اور یہ کہ تین طلاقیں کے بعد خاوند بیوی کے اکٹھے ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔

علاوہ ان تین طلاقیں کے بعد بھی تجدید نکاح کا دروازہ کھلا رکھنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ تا اس سے لوگوں میں نکاح کے تقدس اور دوام کا احساس پیدا کیا جاوے اور یہ خیال قائم کیا جاوے کہ

جب دومر دو عورت کا ایک دفعہ آپس میں ازدواجی تعلق قائم ہو جاوے تو پھر انتہائی کوشش اس تعلق کے نبھانے کی ہونی چاہیے اور اگر کسی وجہ سے درمیان میں یہ تعلق ٹوٹ بھی جاوے اور اس کا پھر قائم ہونا محال بھی ہو جاوے تو پھر بھی آئندہ چل کر کوئی ایسا موقعہ جبکہ جائز طور پر اس تعلق کے دوبارہ جوڑے جانے کی امید ہو سکے ضائع نہیں جانے دینا چاہیے۔ پس میسر صاحب نے جس مسئلہ کو ایک غلط اور ناپاک صورت دے کر اس پر اعتراض کیا ہے وہ دراصل اپنی حقیقی صورت میں اسلامی تعلیم کی ایک بہت بڑی خوبی ہے جسے افسوس ہے کہ سرولیم کی آنکھ دیکھ نہیں سکی۔



# مدنی زندگی کے پہلے دور کا خاتمہ

## اور اسلامی طریق حکومت

ایک نئے دور کا آغاز غزوہ بنو قریظہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کے پہلے دور اور ہماری کتاب کی دوسری جلد کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ دور کن حالات میں گذرا؟ اسلام کی حفاظت کے لیے آنحضرت ﷺ کو کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا؟ مسلمانوں پر کیسی کیسی نازک گھڑیاں آئیں؟ اندرونی اور بیرونی خطرات نے کیا کیا مہیب صورتیں اختیار کیں؟ ان سوالات کا کسی قدر مفصل جواب اوپر گزر چکا ہے۔ یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کا پہلا دور ایک مسلسل زلزلہ کا رنگ رکھتا تھا جو پانچ سال کے طویل عرصہ میں جسے مصائب نے احساسی طور پر اور بھی لمبا کر دیا تھا مدینہ کی سرزمین کو خطرناک طور پر جنبش دیتا رہا اور اس زلزلہ کے بعض دھکے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسے تباہ کن تھے کہ اگر خدا کی خاص نصرت شامل حال نہ ہوتی تو یقیناً یہ دھکے مدینہ کی سرزمین کو بالکل تہ و بالا کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے خاک میں مٹا دیتے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس زلزلہ کے آتش فشاں منبع کی ایک شاخ یہود کے قلعوں میں ہو کر عین مدینہ کی دیواروں کے نیچے پہنچی ہوتی تھی۔ اس زلزلہ کا سب سے بڑا دھکا غزوہ احزاب میں پیش آیا جبکہ خونخوار اتحادیوں کے ہنگامی نعروں اور ان کے عربی گھوڑوں کی ٹاپلوں کی آواز سے مدینہ کی زمین گویا لفظاً لرزہ کھا گئی تھی اور مسلمانوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور اس زلزلہ کو بدعہد یہود کی قناری نے اور بھی زیادہ خطرناک صورت دے دی تھی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ حملہ کفار مکہ کی عداوت کا آخری نقطہ ثابت ہوا جس کے بعد گو ان کی دلی عداوت اور فتنہ انگیزی تو اسی طرح قائم رہی مگر انہیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کی توفیق نہیں ملی۔ اور آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی کہ **اَلَا اَنْ نَّغْزُوَهُمْ وَلَا يَخْزَوْنَا** (یعنی ان لوگوں کی فتنہ انگیزی اور دشمنی کی وجہ سے آئندہ ہمیں تو ان کے خلاف فوج کشی کے موقعے ملتے رہیں گے مگر انہیں ہمارے خلاف مدینہ پر چڑھائی کرنے کی توفیق نہیں ملے گی) حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور اس طرح مدنی زندگی کے پہلے اور دوسرے دور میں ایک مابہ الامتیاز قائم ہو گیا۔ علاوہ ازیں چونکہ بنو قریظہ کے خاتمہ کے ساتھ مدینہ میں

یہودی آبادی کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا اور اس کے بعد مدینہ کے شہر میں سوائے مسلمانوں یا مسلمان کھلانے والے منافقوں یا مسلمانوں کے توابع کے اور کوئی قوم باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے مقابل پر کھڑی ہو سکتی یا آنحضرت ﷺ کے حکم سے بر ملا سرتابی کرنے کی جرات کرتی۔ اس لیے اس وقت سے مدینہ میں ایک خالص اسلامی حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو گئی۔ گویا اس نئے دور کی جو غزوہ بنو قریظہ کے بعد سے شروع ہوا، دو نمایاں خصوصیات تھیں۔ اول کفار کے ان حملوں کا جو مدینہ کے خلاف ہوتے تھے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے نتیجے میں میدان کارزار مدینہ کے قرب و جوار سے ہٹ کر دور دراز کے علاقوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ دوم مدینہ کا شہر سیاست و حکومت کے لحاظ سے ایک خالص اسلامی سلطنت کی صورت اختیار کر گیا۔ جس میں کسی غیر حکومت یا غیر قوم یا غیر مذہب کا دخل نہیں تھا۔ اور پھر یہی مرکزی حکومت آہستہ آہستہ وسعت اختیار کر کے بالآخر دُنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا گئی۔

یہ محیر العقول تغیر پانچ سال کے قلیل عرصہ میں کس طرح ممکن ہو گیا؟ اس سوال کا حقیقی جواب اس دُنیا کے مادی علوم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا اور اسے پوری طرح وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو روحانی تہذیب کا علم رکھتا ہو اور اس خُدادادی سنت سے واقف ہو جو قدیم سے نبیوں کے ساتھ رہی ہے مگر یہ امور تاریخ کا حصہ نہیں ہیں۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے جو باتیں مسلمانوں کی اس بے نظیر کامیابی کا باعث سمجھی جا سکتی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل باتیں خاص طور پر نمایاں اثر رکھتی تھیں: مسلمانوں کا اتحاد۔ انکی تنظیم۔ اُن کا اپنے مقصد کے لیے بے نظیر استقلال۔ اُن کی قربانی کی رُوح۔ اُن کا یہ کامل یقین کہ ہم حق و صداقت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ اُن کا یہ گہرا احساس کہ ہم اس قدر بے سرو سامان ہیں کہ جب تک ہم اپنی انتہائی طاقت کو بے دریغ صرف کر دینے کے لیے تیار نہیں ہونگے ہماری حفاظت کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی بے نظیر مقناطیسی شخصیت اور اعلیٰ درجہ کی جنگی تدابیر وغیر ذالک۔ ان تاثیرات نے مسلمانوں کی ٹٹھی بھر جماعت میں وہ طاقت بھر دی تھی جسے عرب کی لاتعداد افواج کا نہایت وحشیانہ مظاہرہ بھی مغلوب نہیں کر سکا اور اس پانچ سالہ جنگ کے نتیجے میں کفار عرب نے اس بات کو یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اب مدینہ پر حملہ آور ہو کر اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو ملیا میٹ کر دینے کا خیال ایک خیالِ باطل ہے جو کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ اب انہیں مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لیے اور تدابیر سے کام لینا چاہیے۔ کفار کی یہ ذہنی تبدیلی اسلام کے لیے ایک نئے دور کے آغاز کا نشان تھی۔

اسلامی طریق حکومت چونکہ اس نئے دور کی دو نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت مدینہ میں خالص اسلامی حکومت کا قیام تھی اس لیے اس موقع پر اس اصولی تعلیم کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا جو بانی اسلام نے حکومت کے طریق کے متعلق پیش فرمائی ہے۔ اس کے متعلق سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ جیسا کہ دوسرے دُنیاوی امور میں اسلام کا طریق ہے اس معاملہ میں اسلام

نے صرف ایک اصولی تعلیم دی ہے اور تفصیلات کے تصفیہ کو ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر قوم کے حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ اور دراصل اس قسم کے معاملات میں یہی طریق عقلمندی اور میانہ روی کا طریق ہے کہ صرف اصولی ہدایت پر اکتفا کی جاوے اور تفصیلات میں دخل نہ دیا جاوے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو اور حالات کے اختلاف کا لحاظ رکھنے کے بغیر ہر زمانہ میں ہر قوم پر ایک ہی ٹھوس غیر متبدل اور تفصیلی قانون جاری کر دیا جاوے تو ظاہر ہے کہ قاکون شریعت رحمت کی بجائے ایک زحمت ہو جاوے اور ہدایت کی بجائے ضلالت کا سامان پیدا کر دے۔ پس اسلام نے کمال دانشمندی کے ساتھ اس معاملہ میں صرف ایک اصولی ہدایت دی ہے جو تفصیلات کے مناسب اختلاف کے ساتھ سب قسم کے حالات پر یکساں چسپاں ہوتی ہے۔

حکومت کا اصل حق صرف جمہور کو حاصل ہے  
وہ اصولی ہدایت یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کے  
اور جمہور کی طرف سے افراد کو پہنچتا ہے  
معاملہ کو الگ رکھتے ہوئے جنہیں خدا کی  
طرف سے اس کے ازل حق میں سے حکومت

کا حق پہنچتا ہے۔ سب لوگ حکومت کے حق میں برابر ہیں یعنی اصل حکومت جمہور کی ہے اور اس حق میں کسی شخص کو دوسروں کی نسبت فائق حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن چونکہ نظام حکومت کے چلانے کے لیے ایک محدود انتظامی حکومت کا ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی انتہائی باگ ڈور ایک حاکم اعلیٰ یعنی صدر حکومت کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ باہم مشورہ کے ساتھ جس شخص کو حکومت کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھیں اُسے اپنا امیر مقرر کر لیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعْلَمُ السَّاعِدِينَ ۚ  
اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ حکومت کی امانت تم اس کے اہل لوگوں کے سپرد کیا کرو۔ اور پھر جو لوگ اس طرح حاکم منتخب ہوں انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ وہ لوگوں میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کریں۔ اس اصولی آیت میں حکومت کے حق کو امانت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دراصل حکومت کا حق سب لوگوں کا مشترک حق ہے۔ اور خاص افراد کو جمہور کی طرف سے ایک امانت کے طور پر ملتا ہے پس جس شخص کو حکومت ملے اُسے سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک امانت ہے جو لوگوں کی طرف سے اسے ملی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ابوذر صحابی نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے کسی علاقہ کا امیر مقرر فرماویں۔ اس پر آپ



نے فرمایا:-

يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَآذَى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا يَلْ يَعْنِي "اے ابو ذر! تم ایک ضعیف انسان ہو اور حکومت ایک امانت ہے اور قیامت کے دن وہ ذلت و ندامت کا موجب ہوگی۔ سوائے اس شخص کے جو اس کے پورے پورے حقوق ادا کرے" اس حدیث میں حکومت کو امانت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ حکومت کا حق صرف جمہور کو حاصل ہے اور کسی خاص فرد کو اس کا حق جمہور کی طرف سے صرف ایک امانت کے طور پر ملتا ہے۔

چونکہ حکومت ایک امانت ہے اس لیے حاکم اعلیٰ کا تقرر تو الگ رہا ماتحت حاکم کے تقرر میں بھی اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر نہ کیا جاوے جو خود حکومت کا خواہشمند ہو چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:-

إِنَّا وَاللَّهِ لَا نَتَوَلَّى هَذَا النِّعَمَ أَحَدًا سَأَلَهُ وَلَا أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ. یعنی "خدا کی قسم ہم کبھی کسی ایسے شخص کو حکومت کا کوئی عہدہ نہیں دینگے جو خود اس عہدہ کو طلب کرے یا اس کا خواہشمند ہو"

حکومت کے لیے مشورہ ضروری ہے جو لوگ لوگوں کے مشورہ سے حاکم منتخب ہوں انہی ہدایت کے لیے اسلام یہ اصولی تعلیم ارشاد فرماتا ہے:-

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ. یعنی "مومنوں کا یہ کام ہے کہ وہ خدا کی پوری پوری فرمانبرداری اختیار کریں اور اس کی عبادت پر قائم رہیں۔ اور حکومت کے امور باہم مشورہ کے ساتھ طے کریں اور جو اموال خدا نے انہیں دیتے ہیں انہیں لوگوں پر خرچ کریں" اس آیت میں حاکم کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ امیر منتخب ہونے کے بعد خود مختار نہ اور جابرانہ طریق اختیار نہ کرے بلکہ اس اصول کو یاد رکھتے ہوتے کہ اس کی حکومت اس کے پاس محض ایک امانت کے طور پر ہے راستے عامہ کو معلوم کرتا رہے اور لوگوں کے مشورہ کے ساتھ حکومت کے فرائض سرانجام دے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ سے بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَحَّلْ عَلَى اللَّهِ يَحْيٰى یعنی "اے نبی! تم حکومت کے معاملات میں لوگوں سے مشورہ لیا کرو۔ مگر مشورہ کے بعد جب تم کوئی راستے قائم کرلو تو پھر اللہ پر توکل

کرو۔ یہ ہدایت قرآنی محاورہ کے مطابق صرف آپ ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے خلفاء اور متبعین کے لیے بھی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ طریقی حکومت کے معاملہ میں اسلام صرف دو اصولی ہدایتیں دیتا ہے۔ اول یہ کہ حکومت کا حق سب لوگوں کا مشترک حق ہے اور ایسی صورت میں لوگوں کو چاہیے کہ اپنے میں سے بہترین شخص کو باہم مشورہ کے ساتھ امیر منتخب کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ جو شخص امیر بنے اور حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آئے اس کا فرض ہے کہ اس امانت کو حق و انصاف کے ساتھ ادا کرے اور سیاست و حکومت کے جملہ اہم امور لوگوں کے مشورہ کے ساتھ سرانجام دے۔ گویا حکومت کے معاملہ میں اسلام نے ورثہ کے حق کو قطعاً تسلیم نہیں کیا اور نہ اس بات کو جائز رکھا ہے کہ کوئی حاکم رائے عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اور مشورہ کے طریق کو چھوڑ کر حکومت میں استبدادی اور خود مختارانہ طریقی اختیار کرے۔ لیکن جیسا کہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ اصول دیو وغیرہ کی صورت میں عام طور پر مسلم ہے۔ اسلام نے استثنائی حالات میں امیر کے لیے یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ اگر ضروری سمجھے تو کثرت رائے کے مشورہ کو رد کر دے۔ مگر اسلامی شریعت کی رو سے امیر بہر حال اس بات کا پابند قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اہم معاملہ مشورہ لینے کے بغیر طے نہ کرے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے جو اسلامی سیاسیات میں نہایت ماہر سمجھے گئے ہیں یہاں تک فرمایا ہے کہ :-

لَا خِلَافَةَ إِلَّا بِالْمَشُورَةِ یعنی کوئی اسلامی حکومت مشورہ کے انتظام کے بغیر جائز تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

یہ وہ اصولی ہدایتیں ہیں جو اسلام نے حکومت کے طریق کے متعلق جاری فرمائی ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسلام نے ان اصولی ہدایات کے سوا اس مسئلہ کی تفصیلات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ مثلاً اس قسم کے سوالات کے متعلق اسلام نے کوئی معین ہدایات نہیں دیں کہ امیر یعنی صدر حکومت کے انتخاب کے متعلق کس طریق پر مشورہ ہونا چاہیے اور مجلس شوریٰ کی تقویم کو نئے اصول پر مبنی ہو۔ اور جب کوئی امیر منتخب ہو جاوے تو وہ امور مملکت میں پبلک سے مشورہ لینے کے متعلق کیا طریقی اختیار کرے اور مشورہ میں کس قسم کے امور پیش ہوں۔ اور نظام حکومت کی جزئیات کیا ہوں وغیرہ ذالک۔ یہ باتیں اور اسی قسم کی دوسری تفصیلات ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے حالات پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کس طرح قائم ہوئی؟  
اس جگہ بعض لوگوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی تعلیم کی

رُوسے امیر یا خلیفہ کا تقرر مشورہ اور انتخاب کے طریق پر ہونا ضروری ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا تقرر اس طریق پر نہیں ہوا؟ بلکہ انہیں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول نے خود مقرر کر دیا تھا۔ اور پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث کا تقرر بھی راستے عامہ کے ساتھ نہیں ہوا؟ بلکہ حضرت عمرؓ نے اس حق کو چھ سات صحابہؓ تک محدود کر دیا تھا اور بالآخر کیا وجہ ہے کہ امراء بنی اُمیہ اور بنی عباس وغیرہ ہمیشہ اپنا ولی عہد خود مقرر کر دیتے تھے جو عموماً کوئی بیٹا یا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات یہ فیصلہ کر جاتے تھے کہ ہمارے بعد فلاں شخص امیر ہو اور اس کے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں ! اور ان کے زمانہ میں کبھی بھی مشورہ اور انتخاب کے طریق پر امیر کا تقرر نہیں ہوا؟

اس شبہ کے جواب میں پہلے ہم حضرت عمرؓ کی خلافت کے سوال کو لیتے ہیں۔ سو جانتا چاہیے کہ بیشک اسلام میں خلافت و امارت کے قیام کے لیے مشورہ اور انتخاب کا طریق ضروری ہے مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مشورہ اور انتخاب کے طریق کی نوعیت اور اس کی تفصیل کے متعلق اسلام نے کوئی خاص شرط یا حد بندی مقرر نہیں کی بلکہ اس قسم کے فردعی سوالات کو وقتی حالات پر چھوڑ دیا ہے اور ظاہر ہے کہ مختلف قسم کے حالات میں مشورہ اور انتخاب کی صورت مختلف ہو سکتی ہے اور اس اصل کے ماتحت اگر نظر غور سے دیکھا جاوے تو حضرت عمرؓ کی خلافت کا قیام بھی درحقیقت مشورہ اور انتخاب کے اصول کے ماتحت ہی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا معاملہ یوں طے ہوا تھا کہ جب حضرت ابوبکرؓ جو ایک منتخب شدہ خلیفہ تھے فوت ہونے لگے تو چونکہ اس وقت تک ابھی فتنہ ارتداد کے اثرات پوری طرح نہیں مٹے تھے اور خلافت کا نظام بھی ابھی ابتدائی حالت میں تھا حضرت ابوبکرؓ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ آئندہ خلافت کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اہل شخص حضرت عمرؓ ہیں اور یہ کہ اگر خلیفہ کے انتخاب کو راستے عامہ پر چھوڑ دیا گیا۔ تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی طبیعت کی ظاہری سختی کی وجہ سے انتخاب میں نہ آسکیں۔ اور اُمت محمدیہ میں کسی فتنہ کا دروازہ کھل جاوے، اہل الرائے صحابہ کو بلا کر ان سے مشورہ لیا اور اس مشورہ کے بعد حضرت عمرؓ کو جن کا حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ قبیلہ تک جدا تھا اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ حالانکہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے اپنے صاحبزادے اور دیگر اعزہ و اقارب کثرت کے ساتھ موجود تھے۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ صورت ایسی ہے کہ اسے ہرگز مشورہ اور انتخاب کی رُوح کے منافی نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ اول تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ فیصلہ خود بخود نہیں کیا بلکہ اہل الرائے صحابہ کے مشورہ کے بعد کیا تھا۔ دوسرے حضرت ابوبکرؓ خود ایک منتخب شدہ خلیفہ تھے جس کی وجہ سے گویا ان کا ہر فیصلہ قوم کی آواز کا رنگ رکھتا تھا۔ اور پھر انہوں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ





جنت نہیں ہے۔ تاریخ و حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ جب امیر معاویہ نے بعض غلط مشورہ میں آکر پہلی دفعہ اسلام میں یہ بدعت جاری کرنی چاہی یعنی جمہور سے حق انتخاب عملاً چھین کر اپنے بیٹے یزید کو اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہا تو ان کبار صحابہ میں سے اکثر نے جو اس وقت زندہ تھے ان کی مخالفت کی۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ طریق اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کہ خلیفہ کی زندگی میں ہی اس کے بیٹے کے لیے بیعت کا عہد لیا جا رہا ہے لہٰذا مگر امیر معاویہ نے نہ مانا اور عوام کا سہارا ڈھونڈ کر یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب امیر معاویہ فوت ہو گئے تو جو عورتیں بہت صحابہ اس وقت بقید حیات تھیں وہ گو فتنہ کے خیال سے خاموش رہے مگر جیسا کہ تاریخ و حدیث میں اشارے ملتے ہیں انہوں نے دل میں یزید کی امارت کو قبول نہیں کیا بلکہ حضرت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے تو اس طریق کو اسلامی تعلیم کے اس قدر خلاف سمجھا کہ باوجود نہایت درجہ کمزوری کی حالت میں ہونے کے وہ یزید کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر اسی جنگ میں امام حسینؑ تو یزید کے زمانہ میں ہی اور عبداللہ بن زبیرؓ کچھ عرصہ بعد شہید ہو گئے لہٰذا مگر انہوں نے اس استبدادی حکومت کے سامنے جسے وہ اسلامی طریق کے خلاف سمجھتے تھے گردن نہیں جھکائی۔ لیکن امیر معاویہ کی غلطی بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثال بن گئی اور اس وقت سے بادشاہی رنگ میں ولی عہد کی طرقت جاری ہو گیا۔

اس بات کا ثبوت کہ امیر معاویہ اور ان کے بعد آنے والے امراء کی امارت صحیح اسلامی خلافت نہیں تھی بلکہ صرف ایک بادشاہت تھی اس بات سے بھی ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد صحیح اسلامی خلافت صرف تیس سال رہے گی اور اس کے بعد بادشاہت کا طریق جاری ہو جائے گا۔ اور اگر حساب کیا جاوے تو حضرت علیؑ یا امام حسنؑ کی خلافت تک یہ تیس سالہ میعاد پوری ہو جاتی ہے اور امیر معاویہ کے زمانہ سے وہ میعاد شروع ہوتی ہے جسے بادشاہت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

**جانشین مقرر کرنے کی شرائط**  
خلاصہ کلام یہ کہ اصل اسلامی تعلیم اور صحیح اسلامی تعامل یہی ہے کہ خلافت و امارت کا قیام لوگوں کے مشورہ سے ہونا چاہیے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کے پہلے خلیفہ کے معاملہ میں ہوا لہٰذا لیکن اگر کوئی خلیفہ اپنا جانشین خود مقرر کر جانے کی ضرورت محسوس کرے تو بعض حالات میں اس طریق کے اختیار کرنے کی اجازت تو ہے مگر

۱۔ بخاری تفسیر سورة احقاف و فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۴۳۲ و ۴۳۳ نیز تاریخ کامل جلد ۲ صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۸ و طبری حالات مشہور

۲۔ طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات مشہور و نیز حالات خلافت ابن زبیر۔

۳۔ ترمذی و البرداء و دہ بوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن فصل ثانی عن سفینۃ۔

۴۔ بخاری و مسلم و غیرہ عن ابن عمر بوالہ تفسیر باب فی ذکر خلفاء الراشدین



جیسا کہ اسلامی تعلیم کی روح اور خلفاء اربعہ کی سنت سے ثابت ہوتا ہے اس کے لیے پانچ شرطیں ضروری ہیں  
 اول یہ کہ اس وقت کوئی ایسے خاص حالات موجود ہونے چاہئیں جن کی وجہ سے عام طریق کو چھوڑ کر اس  
 طریق کا اختیار کرنا مناسب ہو۔ دوم یہ کہ جانشین کا تقرر لوگوں کے مشورہ کے ساتھ کیا جاوے۔ سوم  
 یہ کہ یہ تقرر صرف آئندہ خلیفہ یا امیر تک محدود رہے۔ یہ نہیں کہ کوئی خلیفہ یہ حکم دے جاوے کہ میرے بعد  
 فلاں شخص امیر ہو اور اس کے بعد فلاں اور اس کے بعد فلاں۔ کیونکہ یہ طریق آئندہ آنے والی نسلوں سے  
 حق انتخاب پھین لینے کے مترادف ہے۔ چہاں یہ کہ یہ جانشین خلیفہ وقت کے قریبی رشتہ داروں میں  
 سے نہ ہو نہ چم یہ کہ جانشین مقرر کرنے والا خلیفہ خود منتخب شدہ خلیفہ ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم

یہ سوال کہ کوئی خلیفہ یا امیر باقاعدہ طور پر منتخب  
 کیا امارت سے دستبرداری کی جاسکتی ہے ؟  
 یا مقرر ہونے کے بعد خود بعد میں کسی مصلحت

کی بناء پر خلافت سے دست بردار ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق اسلامی شریعت  
 میں کوئی نص نہیں پائی جاتی مگر ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں دنیوی امراء کے متعلق تو کوئی امر مانع نہیں سمجھا  
 جاسکتا۔ البتہ دینی خلفاء کا سوال قابل غور ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ثالث  
 سے اُن کے زمانہ کے باغیوں نے یہ درخواست کی کہ آپ خود بخود خلافت سے دست بردار ہو جائیں ورنہ  
 ہم آپ کو جبراً الگ کر دیں گے یا قتل کر دیں گے تو اس پر حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دیا کہ جو عزت کی قمیص  
 خدا نے مجھے پہنائی ہے میں اسے خود اپنی مرضی سے کبھی نہیں اتاروں گا۔ جس میں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد  
 کی طرف اشارہ تھا جو آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا تھا کہ خدا تمہیں ایک قمیص پہنائے گا اور لوگ اسے اتارنا  
 چاہیں گے مگر تم اسے نہ اتارنا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت امام حسنؓ کا فیصل ہے کہ انہوں نے اُمت  
 محمدیہ کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی۔ اور روایت  
 آتی ہے کہ اس سے آنحضرت ﷺ کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ میرے اس نواسے کے ذریعہ خدا دو مسلمان  
 گروہوں میں صلح کروائے گا۔ گویا امام حسنؓ کے اس فعل کو مقام مدح میں سمجھا گیا ہے کہ اُن کی اس دستبرداری  
 کے نتیجہ میں آنحضرت ﷺ کی وہ پیشگوئی پوری ہوئی جس میں آپ نے امام حسنؓ کی ایک اعیازی خوبی بیان کی  
 تھی۔ اور اُمت محمدیہ پھر ایک نقطہ پر جمع ہو گئی۔ ان دو مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دستبرداری کا سوال  
 حالات پر چھوڑا گیا ہے یعنی یہ کہ اگر خلافت کا استحکام ہو چکا ہو جیسا کہ حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں ہو چکا

۱۔ طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات قتل حضرت عثمانؓ۔ نیز زبدین عن عبد اللہ بن سلام بحوالہ تلخیص الصحاح باب فی ذکر الخلفاء الراشین

۲۔ ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ باب مناقب عثمانؓ۔ ۳۔ بخاری عن حسن بصری کتاب الصلح نیز طبری و تاریخ کامل ابن اثیر حالات سلمہ ہجری

۴۔ بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب مناقب اہل بیت و فیج الباری شرح حدیث مذکور

تھا یا یہ کہ اگر دست برداری کے متعلق لوگوں کی طرف سے خواہش یا مطالبہ ہو تو وہ ناپسندیدہ بلکہ ناجائز ہے۔ لیکن اگر قبل استحکام خلافت جیسا کہ اہام حسن کے معاملہ میں پایا جاتا ہے کسی اعلیٰ غرض کے حصول کے لیے خود خلیفہ اپنی خوشی سے اپنی خلافت سے دست بردار ہو جانا مناسب خیال کرے تو اس کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس جگہ یہ ذکر ضروری ہے کہ یہ خیال جو ہم نے یہاں ظاہر کیا ہے یہ اسلام کا کوئی فیصلہ شدہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ محض ایک رائے ہے جو واقعات سے نتیجہ نکال کر قائم کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

عزل اور میعاد کی انتخاب کا سوال یہ سوال کہ آیا امیر یا خلیفہ کا انتخاب میعاد ہی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا کوئی شخص امیر یا خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کسی نقص یا کمزوری کی وجہ سے اپنے عہدہ سے معزول بھی

اور دینی اور دنیوی امراء میں فرق

ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ایک نہایت قابل غور سوال ہے۔ اس معاملہ میں اسلام نے دینی اور دنیاوی امراء میں ایک امتیاز رکھا ہے۔ دینی امراء سے مراد وہ امراء ہیں جن کے ہاتھ میں دینی سیاست یا دینی اور دنیوی سیاست مخلوط طور پر ہو اور دنیوی امراء سے وہ امراء مراد ہیں جن کا تعلق محض دنیوی سیاست کے ساتھ ہو۔ اول الذکر امراء کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ

یعنی "اے مومنو! اللہ تعالیٰ وعدہ کرتا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے (اعلیٰ، ایمان لائیں اور) اعلیٰ قسم کے، نیک اعمال کریں کہ ضرور انہیں دنیا میں خلیفہ مقرر کرے گا جیسا کہ اس نے تم سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور اللہ ان خلفاء کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے ان کے ذریعہ سے طاقت و قوت عطا کرے گا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دیگا یہ لوگ ہمیشہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں گے اور جو لوگ ان خلفاء کی اطاعت سے منحرف ہوں گے وہ بد عہد اور باغی مجھے جائیں گے۔" اس آیت کریمہ سے پتہ لگتا ہے کہ دینی خلفاء کی خلافت خدا تعالیٰ کے خاص تصرف اور خاص منشاء کے ماتحت قائم ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت ان کے شامل حال رہتی ہے اور ان کے ذریعہ سے دینی سیاست کی تقویت اور مضبوطی مقصود ہوتی ہے اور اسی لیے ان کی اطاعت سے خارج ہونے والا شخص خدا کی نظر میں فاسق و باغی سمجھا جاتا ہے۔ اس آیت کی عملی تشریح میں ایک حدیث آتی ہے کہ:-

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أُرْسِلَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَأَبْنِهِ حَتَّى أَكْتُبَ بَعْثًا بَأْوَاعَهُمْ أَنْ يَتِمَّتْهُمُ الْمُتَمَتُّونَ وَيَقُولُوا قَائِلٌ أَنَا أَوْلَى شَيْءٍ قُلْتُ يَا بَنِي اللَّهِ وَيَدْفَعُ الْمُؤْمِنُونَ أَوْ يَدْفَعُ اللَّهُ وَيَأْتِي الْمُؤْمِنُونَ

یعنی حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جس مرض میں آنحضرت ﷺ فوت ہوئے اس کے ابتدائیں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ تمہارے باپ اور بھائی کو بلا کر ابو بکرؓ کی خلافت کے متعلق وصیت کر جاؤں تاکہ میرے بعد کوئی دوسرا شخص خلافت کی تمنا میں کھڑا نہ ہو جاوے اور یہ دعویٰ نہ کر دے کہ میں ابو بکرؓ کی نسبت خلافت کا زیادہ حقدار ہوں مگر پھر میں نے اس خیال سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ مومنوں کی جماعت ابو بکرؓ کے سوا کسی اور شخص کی خلافت پر رضامند نہ ہوگی اور نہ ہی خدا کسی اور شخص کی خلافت کو قائم ہونے دے گا۔ اس حدیث سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ گو دینی خلفاء کا انتخاب بظاہر لوگوں کے مشورہ سے ہوتا ہے مگر درحقیقت ان کے انتخاب میں خدا کا دست غیبی کام کرتا ہے اور یہی اسلامی خلافت کا سچا فلسفہ ہے کہ بظاہر انتخاب مومن کرتے ہیں مگر حقیقتاً تعریف خدا کا ہوتا ہے یعنی ایک مرسل و مامور کی بعثت کے زمانہ کی طرح خدا خود تو سامنے نہیں آتا مگر اس کی مٹھی تاریں لوگوں کے قلوب کو کھینچ کھینچ کر خلافت کے اہل شخص کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔ اندریں حالات دینی خلفاء کے متعلق خواہ ان کا انتخاب بظاہر مشورہ ہی کے طریق پر ہوتا ہے میعادِ انتخاب کا سوال یا انتخاب کے بعد عزل کا سوال بالکل خارج از بحث ہے اور اسی لئے خدا نے ایسے خلفاء کی اطاعت میں داخل نہ ہوئیوں یا داخل ہو کر اطاعت سے خارج ہوئیوں کو باقی قرار دیا ہے اور عقلاً بھی غور کیا جاوے تو دینی خلفاء کا انتخاب میعادِ نہیں ہونا چاہیے اور نہ انتخاب کے بعد ان کے عزل کا سوال اٹھنا چاہیے کیونکہ دینی تعلق کی بنیاد عقیدت اور اخلاص پر ہوتی ہے۔ اور دینی خلیفہ امام کا مرتبہ رکھتا ہے اور گو وہ احکام شریعت کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کی کمی بیشی کرنے کا حق نہیں رکھتا مگر شریعت کی تشریح اور نفاذ کا کام اسی سے تعلق رکھتا ہے اور دینی سیاست کلیتہً اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اعمال میں بھی وہ اُمت کے لیے گویا ایک نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ پس اس قسم کے روحانی تعلق کو میعادِ قرار دینا یا لوگوں کے لیے ایسے تعلق کے قطع کر دینے کو جائز کر دینا مذہب کی رُوح کے بالکل منافی ہے اور اس کے نتیجہ میں روحانی تعلق اور صلحاء کی بیعت و صحبت کی غرض و غایت بالکل فوت ہو جاتی ہے اور مذہب میں ایک ایسی ناجائز آزادی کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کا آخری نتیجہ سوائے لاندہی اور بے دینی کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں دنیوی امراء کا معاملہ بالکل جدا گانہ ہے ان کے تعلق کی بنیاد عقیدت و اخلاص پر نہیں ہوتی بلکہ محض سیاسی مصالح پر ہوتی ہے اور نہ ان کے میعادِ انتخاب یا عزل سے کوئی

لے بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف و سلم باب من فشا ان ابی بکر مغلوطاً ہے آجکل کی سیاسی اصطلاحات کی رو سے کہ

کہتے ہیں کہ گویا اس معاملہ میں خدا تعالیٰ وائر پلر (WIREPULLER) کا کام دیتا ہے۔

براہ راست دینی فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے محض سیاسی حکام کے متعلق اسلام نے کوئی خاص پابندی عائد نہیں کی یعنی اس معاملہ میں لوگ آزاد رکھے گئے ہیں کہ اگر وہ اپنے حالات کے ماتحت ضروری خیال کریں تو سیاسی حکام کے انتخاب کو میعاد دی کر دیں یا اگر انتہائی حالات کے پیدا ہو جانے پر ضروری سمجھیں تو مناسب طریق پر ان کے عزل کے لیے ساعی ہوں۔

اسلامی اطاعت کا معیار لیکن چونکہ اسلام فتنوں کے سد باب اور امن کے قیام کا نہایت زبردست حامی ہے آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی تعلیم میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ خروج عن الطاعت اور عزل کا سوال سوائے انتہائی حالات کے نہیں اٹھنا چاہیئے اور لوگوں کے لیے لازم ہے کہ حتی الوسع اپنے امیر کی فرمانبرداری اور اطاعت کے طریق سے خارج ہونے کا خیال دل میں نہ لائیں بلکہ اس معاملہ میں یہاں تک تاکید کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے حقوق کو غضب ہوتا دیکھ کر بھی صبر سے کام لیں۔ اور اپنے امراء کی طرف سے ظلم اور تعدی تک برداشت کریں مگر بغاوت اور تفرقہ کے راستے پر قدم زن نہ ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں :-

سَتَرُونَ بَعْدِي آثَرَةً وَأُمُورًا تُنْكَرُ وَنَهَا قَالُوا فَمَا تَأْمُرُنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ أَذُوا إِلَيْهِمْ حَقُّهُمْ وَسَلُّوا اللَّهَ حَقَّ حَقِّهِ یعنی اے مسلمانو! میرے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ تم پر ایسے ایسے لوگ ایمر نہیں گے جو تمہارے حقوق غضب کریں گے اور ایسی ایسی باتیں کریں گے جو بہت ناپسندیدہ ہوں گی اور تمہیں اوہری لگیں گی صحابہ نے عرض کیا۔ تو پھر یا رسول اللہ! ایسے حالات میں آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تم اپنے امیروں کے حقوق انہیں ادا کرو اور اپنے حقوق خدا سے مانگو۔ پھر فرماتے ہیں :-

مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً یعنی جو شخص امیر کی اطاعت سے خروج کرتا ہے اور جماعت کے اتحاد سے علیحدگی اختیار کر کے تفرقہ کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ وہ اگر بغیر توبہ کے اسی حالت میں مر جاوے تو اُس کی موت غیر اسلامی موت ہوگی۔ مگر ساتھ ہی رعایا کو یہ تحریک کی گئی ہے کہ اگر امیر کا رویہ ظالمانہ اور غاصبانہ ہو تو وہ اسے نیک مشورہ دیکر اصلاح کی کوشش کرے اور اس کوشش کو اسلام میں ایک بہت بڑا جہاد اور نیکی کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا :-

أَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةً حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ یعنی جب کوئی امیر ظلم و تعدی کا



طریق اختیار کرے تو اس حالت میں سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ انسان اس امیر کو حق و انصاف کا مشورہ دیکر اسے اس کی ناجائز اور ظالمانہ کارروائیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

لیکن اگر اس پر بھی امیر کی اصلاح نہ ہو اور وہ اپنی نا واجب کارروائیوں پر مہر رہے اور صریح طور پر خدائی احکام کے خلاف حکم دے تو رعایا کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ نیک اور جائز باتوں میں تو بدستور امیر کی اطاعت کرتی رہے مگر ناجائز حصہ میں اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ چنانچہ فرمایا:۔  
 السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَوْلَى الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ وَمَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا أَمْرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ إِلَيْهِ یعنی "ہر مسلمان پر اپنے امیر کا حکم ماننا فرض ہے۔ خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ لیکن اگر اسے کوئی ایسا حکم دیا جاوے جس میں خدائی قانون کی صریح نافرمانی لازم آتی ہو تو ایسے حکم کا سننا اور ماننا اس پر فرض نہیں ہوگا۔"

اگر باوجود رعایا کے اس نیک مشورہ اور اس جزوی عدم اطاعت کے کسی امیر کے ناجائز احکام کا سلسلہ ترقی کرتا جاوے اور وہ بر ملا طور پر خدائی قانون سیاست اور خدائی قانون شریعت کے خلاف قدم زن ہونا شروع کر دے حتیٰ کہ اس کی امارت اس حد تک ضرر رساں صورت اختیار کر لے کہ اسے توڑنے کے لیے ملک کے امن اور جماعت کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا مناسب ہو جاوے تو اس قسم کے انتہائی حالات میں لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس امیر کی اطاعت سے خروج کر کے اس کے عزل کے لیے ساعی ہوں۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ بَايَعَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَلَيْسِنَا وَعَلَى الْأَنْتَازِعِ الْأَمْرَ هَلْهُ إِلَّا أَنْ تَرَوْا الْكُفْرَ بَوَاحًا عِنْدَ كُفْرٍ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ يَهْدِي إِلَى أَنْخَرَتِ ﷺ یعنی آنحضرت ﷺ کے مشہور صحابی عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے بیعت میں یہ اقرار لیا کرتے تھے کہ ہم ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کریں گے۔ عُسْر میں اور لَيْسَر میں۔ پسندیدگی کی حالت میں اور نا پسندیدگی کی حالت میں۔ خواہ ہمارے حقوق ہمیں ملیں یا ہم سے چھینے جائیں۔ اور یہ کہ ہم کسی حالت میں بھی اپنے امیروں کے ساتھ امارت کے معاملہ میں تنازعہ نہیں کریں گے۔ مگر آپ نے فرمایا۔ ہاں اگر تم اپنے امیر کے رویہ میں کوئی ایسا کھلا کھلا کفر پاؤ۔ یعنی خدا کے کسی اصولی قانون کی ایسی صریح نافرمانی دیکھو جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی روشن اور قطعی دلیل موجود ہو تو پھر تمہیں اس کے ساتھ امارت کے معاملہ میں تنازعہ کرنے کا حق ہے۔ اس حدیث میں جو کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے صرف عقیدہ



کافر مارد نہیں ہے بلکہ قانون سیاست اور قانون شریعت کے کسی اصل الاصول کا توڑنا مراد ہے چنانچہ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ کسی بے گناہ مسلمان کا ناجائز قتل بھی گفیر میں داخل ہے۔ اور محقق صحابہ نے ان خلاف شریعت کارروائیوں کو بھی جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتنہ پردازوں کی طرف سے شروع ہو گئی تھیں کفر قرار دیا ہے۔ مگر امیر کے خلاف سر اٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ کفر بالکل صریح اور کھلا کھلا ہو اور کسی اجتہادی غلطی یا مشتبہ حالات کا نتیجہ نہ ہو جیسا کہ امیر کی بریت کے لیے امکانی طور پر بھی تاویل کا کوئی دروازہ کھلا نہ رہے۔ اور اس کی امارت اس حد تک خطرناک صورت اختیار کر لے کہ اس کے توڑنے کے لیے ملک کے امن اور قوم کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا ضروری ہو جاوے۔

عزل کی کوشش حکومت کے اندر رہتے ہوئے جائز نہیں لیکن اس حالت میں بھی اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ امیر کی مملکت میں رہتے

ہوتے اور اس کی اطاعت کا جو اپنی گردن پر رکھتے ہوتے اس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا جاوے اور اس میں غرض یہ مد نظر ہے کہ تاملک کے اندر رسول واری یعنی خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ ہو اور یہ خطرناک منظر نظر نہ آوے کہ ایک امیر کے ماتحت رہتے ہوئے لوگ اس کے خلاف سر اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے انتہائی حالات میں اسلامی طریق یہ ہے کہ جو لوگ امیر کی حکومت کو از بس خطرناک سمجھیں انہیں چاہیے کہ اس کی مملکت سے نکل جائیں اور مملکت سے نکل جانے کے بعد اگر ضروری اور مناسب خیال کریں تو اس کے عزل کے لیے سامعی ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی ہجرت بھی اسی اصل کے ماتحت وقوع میں آئی تھی کہ آپ نے مکہ کی حکومت کے مظالم اور مذہبی دست درازیوں سے تنگ آکر بالآخر روماء قریش کی حکومت سے خروج کا طریق اختیار کیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد خدا نے آپ کے ذریعہ قریش کی اس ظالمانہ حکومت کے توڑنے کی تدبیر فرمائی تھی اور قریباً یہی صورت خدائی حکم کے ماتحت بنو اسرائیل نے فرعون کے مظالم پر اختیار کی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہو کر فرعون کی حکومت سے نکل گئے تھے۔ اور اسی صورت سے ملتی جلتی صورت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے یزید بن معاویہ بن ابی سفیانؓ کی امارت کے موقعہ پر اختیار کی تھی۔ یعنی جب امیر معاویہ نے بعض غلط مشوروں میں آکر خلافت تعلیم اسلام اور خلافت سنت خلفاء الراشدین اپنی زندگی میں ہی اپنے لڑکے یزید کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا۔ تو ان اصحاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ طریق خلافت تعلیم اسلام ہے، لیکن جب امیر معاویہ نے ان کی رائے نہ مانی اور عوام کا سہارا ڈھونڈ کر یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو

انہوں نے ناچار خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ اس وقت امیر معاویہ برسر حکومت تھے اور یہ اصحاب انکی بیعت اطاعت میں داخل تھے اس لیے ان کے لیے امیر معاویہ کی حکومت کے اندر رہتے ہوئے انکے خلاف سر اٹھانا جائز نہیں تھا اور دوسری طرف اس وقت امیر معاویہ کی حکومت سے باہر نکل جانے کی بھی کوئی عملی صورت نہیں تھی لیکن جب امیر معاویہ فوت ہو گئے۔ اور یزید نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو اس وقت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؑ اس کی بیعت میں داخل نہیں ہوئے بلکہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ ابھی تک یزید کی اطاعت ان پر فرض نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت میں گویا یزید کے خلاف اٹھنا یزید کی مملکت سے باہر ہو کر مقابلہ کرنے کے مترادف تھا مگر امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؑ کی کوشش کوئی مستقل نتیجہ نہیں پیدا کر سکی اور بنو امیہ کی استبدادی حکومت کو فروغ حاصل ہو گیا۔ بہر حال اسلام میں کسی امیر کے ماتحت رہتے ہوئے اس کے خلاف سر اٹھانے اور اس کے عزل کی کوشش کرنے کو پسند نہیں کیا گیا بلکہ اس صورت میں اسلامی طریق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص امیر کے رویہ کو صریح طور پر خلاف اصول سیاست پائے اور اس کی امارت کو اس حد تک ضرر رساں سمجھے کہ اس کے توڑنے کے لیے ملک کے امن اور جماعت کے اتحاد تک کو خطرے میں ڈالنا ضروری خیال کرے تو اسے چاہیے کہ ایسے امیر کی مملکت سے باہر نکل جاوے اور پھر جس طرح مناسب ہو اس کے عزل کے لیے سعی ہو۔

اس جگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی امیر لوگوں کو باہر نکل جانے سے جبراً روکے تو پھر کیا طریق اختیار کیا جاوے تو اس کا یہ جواب ہے کہ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ اصولی طور پر فرماتا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی انسان صرف اس حد تک مکلف ہے جس حد تک کہ اسکی طاقت ہے۔ اور جیسا کہ بنی اسرائیل کے واقعہ میں خدائی اشارہ پایا جاتا ہے جہاں خدا فرماتا ہے کہ فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جا کر ان کو خروج سے جبراً روکنے کی کوشش کرنا جائز اور خدائی قانون سے بغاوت کے ہم معنی تھا۔ اس قسم کی صورت میں جو خود امیر کی طرف سے پیدا کی جاوے ملک کے اندر رہتے ہوئے بھی ظالم امیر کے خلاف سر اٹھانا جائز سمجھا جاتا تھا۔

کیا امارت کا حق صرف اسلامی اصول حکومت کی بحث کی ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلامی تعلیم کی رو سے خلیفہ یا امیر کے لیے کسی خاص قوم میں سے ہونا تو ضروری نہیں ہے؟ یہ سوال خصوصیت سے اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بعض احادیث میں یہ مذکور ہوا ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہونگے جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ گویا خلیفہ یا امیر کے لیے قریشی ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ پہلی

دلیل جو اس خیال کو غلط ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ اسلام میں اصولاً قومی یا نسلی خصوصیات کو دینی یا سیاسی حقوق کی بنیاد نہیں تسلیم کیا گیا۔ بالفاظ دیگر اسلام میں ان معنوں کے لحاظ سے کوئی ذاتیں نہیں کہ فلاں ذات کو یہ حقوق حاصل ہونگے اور فلاں کو یہ بلکہ اس میں ذاتوں اور قوموں کو صرف تعارف اور شناخت کا ایک ذریعہ رکھا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ ..... وَجَعَلْنَاهُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر اپنی بڑائی بیان کرے یا دوسری قوم کو اپنے سے نیچا سمجھے۔ کیونکہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ خدا کی نظروں میں کون بڑا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہم نے جو تمہیں دنیا میں قوموں اور قبائل کی صورت میں بنایا ہے تو اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تم آپس کی شناخت اور تمیز میں آسانی پاؤ۔ یہ نہیں کہ تم اس تفریق پر کسی قسم کی بڑائی یا خاص حقوق کی بنیاد سمجھو۔ کیونکہ خدا کی نظر میں تم میں سے بڑا وہ ہے جو خدائی قانون کی زیادہ اطاعت اختیار کرتا ہے خواہ وہ کوئی ہو۔"

اس واضح اور غیر مشکوک اصولی تعلیم کے علاوہ قرآن شریف خاص خلافت و امارت کے سوال میں بھی قومی یا خاندانی حق کے خیال کو رد کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:-

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ يَعْنِي "خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور صرف اہل لوگوں کے سپرد کیا کرو (خواہ وہ کوئی ہوں) اور جو لوگ امیر منتخب ہوں انہیں چاہیے کہ اپنی حکومت کو عدل و انصاف کے ساتھ چلائیں۔" اس آیت میں خلیفہ یا امیر کے لیے صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ وہ حکومت کا اہل ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور شرط نہیں لگائی گئی جو اس بات کی یقینی دلیل ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا امیر کے لیے اہلیت کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔ اسی طرح حدیث میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:-

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَإِنْ اسْتَعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ ۖ يَعْنِي "حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے مسلمانو! اگر تم پر ایک حبشی غلام بھی امیر بنایا جاوے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرو۔ اگر اسلام میں امیر کا قریشی ہو یا ضروری تھا تو آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بے معنی قرار پاتا ہے بلکہ اس صورت میں آپ کو یہ

فرمانا چاہیے تھا کہ تم ہر قریشی امیر کی فرمانبرداری کرو خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ الغرض کیا بلحاظ اصول کے اور کیا بلحاظ تخصیص کے یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ اسلام میں حکومت اور خلافت کو کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور اسلامی تعلیم کی روح اس خیال کو دُور سے دھکے دیتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خلفاء اور ائمہ قریش میں سے ہونگے۔ سوال احادیث پر ایک ادنیٰ تدبیر بھی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک پیشگوئی تھی نہ کہ حکم یا سفارش۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اور بہت سی باتوں کا اظہار فرمایا تھا جو آئندہ ہونے والی تھیں اسی طرح جو خلفاء آپ کے بعد ہونے والے تھے ان کے متعلق آپ کو یہ علم دیا گیا تھا کہ وہ قبیلہ قریش میں سے ہونگے اور پیشگوئی کی صورت میں قطعاً کوئی اعتراض نہیں رہتا کیونکہ بہر حال خلفاء نے کسی نہ کسی قوم یا قبیلہ میں سے ہونا تھا اور اگر اس وقت کے حالات کے ماتحت وہ سب کے سب قریش میں سے ہوتے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانہ کے حالات کے ماتحت قریش ہی وہ قبیلہ تھا جو حکومت کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اول تو وہ آنحضرت ﷺ کا اپنا قبیلہ تھا جس کی وجہ سے طبعاً اُسے مسلمانوں میں ایک جائز عزت حاصل تھی اور لوگ اس کے اثر کو قبول کرتے تھے۔ دوم قریش کا قبیلہ عرب کے سب سے زیادہ مرکزی شہر کا رہنے والا اور وہی کعبۃ اللہ کا بھی متولی تھا جس کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی وہ سارے ملک میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور دوسرے قبائل عرب عموماً ہر معاملہ میں قریش کی طرف دیکھتے تھے اور ان کی رہبری کو قبول کرتے تھے۔ سوم قریش کے لوگ بوجہ اس نظام کے جو ان کے جدِ اعلیٰ قصی بن کلاب نے مکہ میں جاری کیا تھا حکومت کے نظام و طریق سے ایک حد تک واقف ہو چکے تھے۔ اور ان کے سوا کوئی دوسرا قبیلہ امور حکومت سے آشنا نہیں تھا۔ چہارم بوجہ اسکے کہ اسلام میں سابقین الاولین سب قریش میں سے تھے اور انہیں کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے اور آپ کی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کا سب سے زیادہ موقع ملا تھا اس لیے وہ لازماً اسلامی طریق حکومت میں بھی دوسروں کی نسبت بہت زیادہ اہلیت رکھتے تھے ان وجوہات کی بناء پر اس زمانہ میں قریش کو دوسرے قبائل عرب پر ایک حقیقی اور یقینی فوقیت حاصل تھی اور انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلہ میں عنان حکومت کا جانا ملک کے لیے سخت ضرر رساں تھا اور یقیناً کوئی دوسرا قبیلہ اس خیر و خوبی کے ساتھ نظام حکومت کو چلانہ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کے ابتدائی خلفاء نے چلایا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسلام نے قریش کو ہمیشہ کے لیے حکومت کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ چنانچہ اگر ایک طرف آنحضرت ﷺ کا یہ قول مروی ہوا ہے کہ میرے بعد خلفاء و ائمہ اسلام قریش میں سے ہونگے تو دوسری طرف آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بالآخر قریش حکومت کی اہلیت کو کھو بیٹھیں گے اور اسلام کی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کا موجب بن جائیں گے چنانچہ حدیث میں آتا ہے:-



عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هَلَكَةُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيِ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ  
 یعنی ”ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میری اُمت کی تباہی بالآخر قریش کے  
 نوجوانوں کے ہاتھوں سے ہوگی۔“ یعنی جب قریش کی حالت خراب ہو جائیگی اور وہ حکومت کے اہل نہیں  
 رہیں گے تو پھر اس کے بعد ان کے ہاتھ میں حکومت کا رہنا بجائے رحمت کے زحمت ہو جائے گا اور  
 بالآخر قریش ہی کے ہاتھوں سے اسلامی حکومت کی تباہی کا سامان پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔  
 اور یہ جو بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ قریش کی امارت قیامت تک رہے  
 گی۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ اُمت اسلامی کی تباہی تک قریش برسر حکومت رہیں گے۔ اور پھر بالآخر انہیں کے  
 ہاتھوں سے تباہی کا بیج بویا جا کر اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ قرآن و  
 احادیث کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قریش کی امارت و خلافت کے متعلق جو  
 آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے اس سے محض پیشگوئی مراد ہے، حکم یا سفارش مراد نہیں اور پھر یہ پیشگوئی بھی  
 مبعادی اثر رکھتی تھی یعنی اسلام کے دورِ اول کے ساتھ مخصوص تھی اور آپ کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ اس وقت  
 حکومت کی اہلیت سب سے زیادہ قریش میں ہے اس لیے آپ کے بعد وہی برسر حکومت و اقتدار رہیں  
 گے، لیکن جب ایک عرصہ کے بعد وہ اس اہلیت کو کھو بیٹھیں گے تو پھر اس وقت اُمتِ محمدیہ پر ایک انقلاب  
 آئے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئے دور کی داغ بیل قائم ہو جائے گی۔ الغرض یہ بات درست نہیں ہے  
 کہ اسلام نے حکومت کے حق کو کسی خاص خاندان یا قوم کے ساتھ محدود کر دیا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اسلام  
 میں حکومت انتخاب سے قائم ہوتی ہے اور انتخاب میں ہر شخص کے لیے دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔  
 یہ وہ مختصر ڈھانچہ حکومت کے طریق کا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور ہر عقلمند اور غیر متعصب  
 شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک بہترین ہدایت ہے جو اس معاملہ میں دی جاسکتی تھی۔ کیونکہ اصولِ سیاست  
 کے لحاظ سے کامل ہونے کے علاوہ تعلیم ایک ایسا جامع رنگ رکھتی ہے کہ تفصیل کے مناسب اختلاف  
 کے ساتھ وہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے ایک شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ اور اس زمانہ کے ترقی  
 یافتہ مغربی ممالک کے سیاست دان بھی ابھی تک اصولِ سیاست میں اس سے بہتر طریق دنیا کے  
 سامنے پیش نہیں کر سکے۔ ظاہر ہے کہ سیاست کے بنیادی اصول چار ہیں :- اول یہ کہ امیر یعنی صدر  
 حکومت کا تقرر کس اصول پر مبنی ہو۔ آیا ورثہ کے حق کی بناء پر یا کسی خاندانی حق کی بناء پر یا بعض خاص  
 لوگوں کی راستے سے یا جمہور اور عامۃ الناس کے مشورہ کے ساتھ۔ دوم یہ کہ جب کوئی شخص امارت  
 کے عہدہ پر قائم ہو جاوے تو اس کا طریق حکومت کیا ہونا چاہیے آیا خود مختارانہ اور استبدادی یا کسی



قانون کے ماتحت اور لوگوں کی راستے اور مشورہ کے ساتھ تیسرے یہ کہ لوگوں کا امیر کے متعلق کیا رویہ ہو آیا وہ اس کے ساتھ انتہائی حد تک تعاون اور اطاعت کا طریق اختیار کریں یا کہ ہر بات پر جو ان کی مرضی کے خلاف ہو بگڑیں۔ اور اس کے رستے میں روکیں ڈالیں اور بڑے غم خود جب بھی اپنے حقوق خطرہ میں لگیں یا امیر کا کوئی کام قابل اعتراض سمجھیں تو شور مچاتے ہوئے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ چوتھے یہ کہ اگر واقعی امیر کا رویہ صریح طور پر ناجائز اور قابل اعتراض ہو اور وہ اپنے اس رویہ میں ناقابل برداشت انتہا کو پہنچ جاوے اور اسے اپنے ظالمانہ طریق پر اصرار ہو تو پھر اس کے متعلق کیا طریق اختیار کیا جاوے۔ ان چاروں اصولی مسائل میں اسلام نے وہ تعلیم پیش کی ہے جو بہترین سیاست کی جان ہے۔ اور اس میں بنی نوع انسان کی بے سودی اور دنیا کے امن و امان کے لیے ایک ایسی بنیاد قائم کر دی گئی ہے جس پر قائم رہتے ہوئے اول تو حاکم و محکوم کے تعلقات بگڑ ہی نہیں سکتے اور کبھی بگڑیں بھی تو ان کے خطرناک اور ضرر رساں نتائج سے ملک محفوظ رہتا ہے اور یہ تعلیم آنحضرت ﷺ نے اس وقت دی جبکہ دنیا میں بیشتر طور پر نسلی اور استبدادی حکومت کا دور دورہ تھا اور اکثر ممالک نیابتی اور مشورہ کی حکومت کے خیال تک سے نا آشنا تھے۔

### غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

اس نوٹ کو ختم کرنے سے قبل اس تعلیم کا ذکر کرنا بھی بے موقعہ نہ ہو گا جو اسلام نے غیر مسلم حکومتوں یا اسلامی حکومت کے اندر کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ معاملہ کرنے کے بارے میں دی ہے۔ سو اس معاملہ میں اسلام سب سے پہلے تو یہ اصول بیان کرتا ہے کہ عدل و انصاف کا معیار سب قوموں کے ساتھ ایک سا ہونا چاہیے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ انہوں کے ساتھ تو عدل و انصاف کا معاملہ کیا جاوے اور جب دوسروں کا سوال ہو تو اس اصول کو بھلا دیا جاوے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هَوَاقِرُ الْمُنَافِقِينَ  
اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

یعنی "اے مسلمانو! تم خدا کی خاطر دنیا میں نیکی اور عدل کے قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور چاہیے کہ کسی قوم کی مخالفت تمہیں عدل و انصاف کے رستے سے نہ ہٹاتے بلکہ تم سب کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو۔ کیونکہ یہی طریق تقویٰ کا تقاضا ہے پس تم متقی بنو اور یاد رکھو کہ خدا تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔"

یہ آیت غیر حکومتوں اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے لیے بطور ایک بنیادی پتھر کے ہے کیونکہ اس میں وہ اصل الاصول بتایا گیا ہے جس پر بین الاقوام اور بین الدول تعلقات قائم ہونے چاہئیں اور غور کیا جائے تو یہ اصول ایسا ترین ہے کہ اگر فریقین کی طرف سے اس پر پورا پورا عمل ہو تو نہ صرف یہ کہ بین الاقوام تعلقات کبھی بگڑ نہیں سکتے بلکہ وہ ایسی خوشگوار صورت میں قائم رہ سکتے ہیں کہ جس میں بگڑنے کا کوئی امکان ہی نہ ہو مگر افسوس کہ اکثر لوگ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اس اصول کو عملاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس جامع و مانع اصول کے بعد اسلام معاہدہ کے سوال کو لیتا ہے کیونکہ بین الاقوام تعلقات میں یہی سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

أَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ صَكٌّ مَسْتُورٌ ۚ یعنی "اے مسلمانو! تم اپنے تمام عہدوں کو پورا کرو۔ کیونکہ خدا کے حضور تمہیں اپنے عہدوں کے متعلق جواب دہ ہونا پڑے گا۔" اس حکم کے ماتحت مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاہدات کو نہایت وفاداری اور دیانت کے ساتھ نبھائیں۔ اور کسی ایسے فعل کے مرتکب نہ ہوں جو ان کے عہد و پیمان کی رُوح یا الفاظ کے خلاف ہو۔

اسلام میں معاہدہ کی پابندی کا اس قدر تاکید حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر کسی مسلمان قوم کا کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اور پھر اس غیر مسلم قوم کے خلاف کوئی دوسری مسلمان قوم اس مسلمان قوم کو اپنی مدد کے لیے بلائے تو اسے چاہیے کہ ہرگز اس کی مدد نہ کرے بلکہ بہر حال اپنے عہد پر قائم رہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُمْهِجُوا ۖ مَا لَكُمْ مِّنْ وَلَا يَتِيهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۖ  
حَتَّىٰ يُمِجُّوا ۖ وَإِنْ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا  
عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّمْلَاقٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۰

یعنی "جو لوگ مسلمان تو ہو گئے ہیں مگر وہ ہجرت کر کے اسلامی حکومت میں منسلک نہیں ہوئے ان کے متعلق اے مسلمانو! تم پر کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہے یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ ایک نہ ہو جائیں۔ ہاں اگر ایسے مسلمان تم سے کسی دینی معاملہ میں مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ انکی مدد کرو۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کے خلاف تم سے مدد مانگیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو پھر تم ہرگز انکی مدد نہ کرو اور بہر حال اپنے عہد پر قائم رہو۔ اور جانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے" کیا اس سے بڑھ کر ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی کوئی تعلیم ہوگی؟

اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔  
 مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرَحْ رَاحَةَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی "جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم کے قتل کا  
 مرتکب ہوگا جو کسی (لفظی یا عملی) معاہدہ کے نتیجہ میں اسلامی حکومت میں داخل ہو چکا ہے وہ (علاوہ اس دنیا  
 کی سزا کے) قیامت میں جنت کی ہوا سے محروم رہے گا۔"  
 پھر فرماتے ہیں :-

مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ نَقَضَ أَوْ خَلَفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ  
 طَيْبِ نَفْسِهِ فَإِنَّا حَاجِبُجْهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی "جو مسلمان کسی ایسے غیر مسلم پر جس کے ساتھ  
 اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے کوئی ظلم کرے گا یا اسے کسی قسم کا نقصان پہنچاتے گا یا اس پر کوئی ایسی  
 ذمہ داری یا ایسا کام ڈالے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی خوشی  
 اور رضامندی کے لے گا تو اسے مسلمانوں کو کہ میں قیامت کے دن اس غیر مسلم کی طرف سے ہو کر اس  
 مسلمان کے خلاف خدا سے انصاف چاہوں گا۔"

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام صرف منفی قسم کے سلوک تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا یعنی وہ  
 صرف یہ نہیں کہتا کہ کسی غیر مسلم کی حق تلفی نہ کرو اور بس۔ بلکہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور احسان کا بھی  
 حکم دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَكَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ  
 أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ یعنی "اے مسلمانو! خدا نے  
 جو تمہیں ان ظالم کافروں کے ساتھ دوستی لگانے سے منع فرمایا ہے جو تمہارے دین کو مٹانے کیلئے تمہارے  
 ساتھ لڑ رہے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان غیر مسلموں کے ساتھ جو تمہارے دین کو جبراً مٹانے  
 کے درپے نہیں اور تم پر ظلم نہیں کرتے، تعلق نہ رکھو۔ بلکہ تمہیں چاہیے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدل و  
 احسان کا معاملہ کرو کیونکہ عدل و احسان کرنے والوں کو خدا پسند کرتا ہے۔"

مذہبی رواداری مذہبی آزادی اور دینی رواداری کے متعلق اسلامی تعلیم کا نمونہ جہاد کی بحث میں  
 گزر چکا ہے۔ قرآن شریف نے اپنی متعدد آیات میں اس بات پر خاص زور دیا  
 ہے کہ دین کا معاملہ ہر شخص کی ضمیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے پس دین میں قطعاً کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہونا  
 چاہیے۔ اور یہ تعلیم صرف کافروں کی زینت یا منبروں کی سجاوٹ نہیں تھی بلکہ اس پر نہایت دیانتداری

کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلا معاہدہ جو اسلام میں کیا یعنی وہ معاہدہ جو ہجرت کے بعد مدینہ کی یہودی آبادی کے ساتھ کیا گیا اس کی بنیاد مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کے اصول پر ہی قائم کی گئی تھی۔ ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ جب بنو نضیر کو ان کی غداری اور فتنہ انگیزی کی سزائیں مدینہ سے جلا وطن کیا گیا اور اس وقت انہوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے جانا چاہا جو انصار کی اولاد تھے مگر انصار کے منت ماننے کے نتیجے میں یہودی بنادیتے گئے تھے تو انصار نے انہیں مدینہ میں روک لینا چاہا، لیکن جب آنحضرت ﷺ کے سامنے یہ اختلاف پیش ہوا تو آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہو سکتا انصار کے خلاف فیصلہ فرمایا اور بنو نضیر کو اجازت دی کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی آگے چل کر یہ واقعات بھی ہمارے سامنے آئیں گے کہ جب خیبر کے یہودی اور نجران کے عیسائی حکومت میں داخل ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے عقیدہ اور عمل دونوں میں انہیں کامل آزادی عطا کی تھی بلکہ روایت آتی ہے کہ جب نجران کے عیسائی مدینہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں مسجد نبوی کے اندر اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور جب بعض صحابہ نے انہیں روکنا چاہا تو آپ نے ان صحابہ کو منع فرما دیا۔ چنانچہ ان عیسائیوں نے مشرق رو ہو کر عین مسجد نبوی میں اپنی عبادت کے مراسم ادا کئے یہ

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی خلفاء اربعہ نے مذہبی رواداری کا ایک کامل نمونہ قائم کیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے متعلق روایت آتی ہے کہ وہ جب کبھی بھی کوئی اسلامی فوج روانہ فرماتے تھے تو اس کے امیر کو خاص طور پر یہ ہدایت فرماتے تھے کہ غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہوں اور ان کے مذہبی بزرگوں کا پورا پورا احترام کیا جاوے۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام کا ملک فتح ہوا تو جو معاہدہ وہاں کی عیسائی آبادی کے ساتھ مسلمانوں کا قرار پایا۔ اس میں مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کی روح ساگر امور پر غالب تھی۔

جزیرہ کا مسئلہ بعض لوگوں کو قابل اعتراض نظر آتا ہے حالانکہ وہ محض ایک ٹکس تھا جو نظام حکومت کے چلانے کے لیے غیر مسلم رعایا سے لیا جاتا تھا اور جس کا فائدہ بالواسطہ خود ٹیکس دینے والوں کو ہی پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس روپے سے حکومت ان کے حقوق کی حفاظت ان

۱۔ سیرۃ ابن ہشام معاہدہ یہود بعد ہجرت ۷۷۱۔ البوداؤد کتاب الجہاد ۷۷۱۔ بخاری کتاب المغازی حالات غزوہ خیبر و قصہ اہل نجران۔ ۲۔ البوداؤد کتاب الجہاد باب فی اخذ الجزیۃ و کتاب الفرائض ابو یوسف فصل قصہ نجران و زرقانی جلد ۲ حالات غزوہ خیبر و جلد ۴ حالات و قصہ نجران ۳۔ زرقانی جلد ۴ حالات و قصہ نجران ۴۔ مولانا امام مالک کتاب الجہاد ۷۷۱۔ دیکھو تاریخ طبری۔ ابن جریر و تاریخ کمال ابن اثیر و فتوح البلدان بلاذری و کتاب الفرائض ابو یوسف و فتوح الشام و اقدی حالات فتح شام



کے آرام و آسائش اور ان کی بہبودی کا انتظام کرتی تھی اور ان کے جان و مال کی حفاظت کے لیے افواج مہیا کرتی تھی اور اگر یہ اعتراض ہو کہ یہ ٹیکس غیر مسلم رعایا کے ساتھ مخصوص کیوں تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ ٹیکس فوجی خدمت کا معاوضہ سمجھا جاتا تھا جو مسلمان سپاہی سرانجام دیتے تھے مگر جس سے غیر مسلم رعایا آزاد رکھی گئی تھی یعنی جہاں ہر مسلمان گویا جبری بھرتی کے قانون کے ماتحت تھا وہاں غیر مسلم رعایا اس پابندی سے آزاد تھی۔ اس صورت میں یہ انصاف کا تقاضا تھا کہ اسلامی حکومت کے فوجی اخراجات کا بوجھ ایک حد تک غیر مسلم رعایا پر بھی ڈالا جاتا اور یہی جزیرہ تھا۔ علاوہ ازیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اسلام میں ٹیکس کے معاملہ کو تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

اول وہ ٹیکس جو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص تھے مثلاً زکوٰۃ - دوم وہ ٹیکس جو صرف غیر مسلموں کے ساتھ خاص تھے مثلاً جزیرہ - سوم مشترک ٹیکس جو حسب حالات سب پر لگائے جاسکتے تھے مثلاً زمین کا مالیہ۔ اس تقسیم و تفریق کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی حکومت کو بعض ایسے کام بھی کرنے پڑتے تھے جو مسلمانوں کے دینی مصالح کے ساتھ خاص تھے اور یہ انصاف سے بعید تھا کہ ان کا بوجھ غیر مسلم رعایا پر ڈالا جاتا لہذا اکمال دیانت داری کے ساتھ اسلام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے بعض ٹیکس جدا کر دیئے۔ چنانچہ جہاں مسلمانوں کے مخصوص ٹیکس یعنی زکوٰۃ میں دینی اور سیاسی اغراض ہر دو مخلوط طور پر شامل کر دی گئیں وہاں غیر مسلموں کے مخصوص ٹیکس یعنی جزیرہ کے مصارف میں کوئی دینی غرض شامل نہیں کی گئی بلکہ اسے عام رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں زکوٰۃ کا ٹیکس جو مسلمانوں کے لیے خاص ہے جزیرہ کے ٹیکس سے بھاری ہوتا ہے کیونکہ اس کے مصارف زیادہ ہیں پس غور کیا جائے تو جزیرہ کے ٹیکس کا غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص کر دیا جانا اسلام اور بانی اسلام کی اعلیٰ درجہ کی دیانت کا ثبوت ہے مگر افسوس ہے کہ نادان لوگوں نے اسی کو ایک اعتراض کی بنیاد بنا لیا ہے۔

اب رہا جزیرہ کی تشخیص و تحصیل کا سوال۔ سو اس معاملہ میں بھی اسلام نے ایک ایسا اعلیٰ نمونہ قائم کیا ہے جس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس کے متعلق سب سے پہلی بات تو یہ جانتی چاہیے کہ اسلام نے جزیرہ کے ٹیکس کی کوئی شرح معین نہیں کی بلکہ اسے ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے عرب کے مختلف قبائل کے ساتھ جزیرہ کے متعلق مختلف صورتیں اور مختلف شرحیں اختیار کی تھیں چنانچہ مثلاً نجران کے عیسائیوں سے آنحضرت ﷺ نے مجموعی طور پر دو ہزار چادریں اور بعض ضروری چیزیں سالانہ مقرر کی تھیں۔ مگر اس کے مقابل پر یمن کے لوگوں کے



اوسطاً ایک دینار فی کس سالانہ مقرر ہوا تھا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء نے بھی یہی طریق جاری رکھا کہ ہر قوم کے مناسب حال ان سے جزیہ کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اور افراد پر اس ٹیکس کی تقسیم ایسے رنگ میں کی جاتی تھی کہ ہر شخص پر اس کی مالی طاقت کے مطابق بوجھ پڑتا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ خلفاء اربعہ کے زمانہ میں جزیہ کے ٹیکس کی صورت عموماً یہ تھی کہ خوشحال لوگوں سے اڑتالیس درہم سالانہ لیا جاتا تھا۔ اور متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم سالانہ اور ان سے کم حیثیت لوگوں سے صرف بارہ درہم سالانہ لیا جاتا تھا۔

یہ حقیقت ٹیکس بھی ساری غیر مسلم آبادی پر نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ مندرجہ ذیل اقسام کے لوگ اس سے مستثنیٰ تھے۔

۱۔ تمام وہ لوگ جو مذہب کے لیے اپنی زندگی وقف رکھتے تھے۔

۲۔ تمام عورتیں اور بچے۔

۳۔ تمام بوڑھے اور معمر لوگ جو کام کے ناقابل تھے۔

۴۔ تمام نابینا لوگ اور اسی قسم کے دوسرے معذور لوگ جو کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔

۵۔ تمام مساکین اور غرباء جن کی مالی حالت جزیہ کی ادائیگی کے قابل نہ تھی۔

جزیہ کی تحصیل میں یہ اصول مد نظر رکھے جاتے تھے :-

(الف) جزیہ دینے والے کو اختیار تھا کہ خواہ نقد ادا کرے یا اس کی قیمت کے اندازے پر کوئی چیز

دے دے۔

(ب) جزیہ کی وصولی کے متعلق تاکید حکم تھا کہ اس معاملہ میں کسی قسم کی سختی سے کام نہ لیا جاوے اور

بالخصوص بدنی سزا سے منع کیا گیا تھا۔

(ج) اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مر جاتا تھا کہ اس کے ذمہ جزیہ کی کوئی رقم واجب الادا نہ ہوتی تھی

تو وہ معاف کر دی جاتی تھی اور مرنے والے کے ورثاء اور ترکہ کو اس کا ذمہ وار نہیں قرار دیا جاتا تھا۔

کیا یہ مراعات آج کوئی قوم کسی دوسری قوم سے کرتی ہے؟ پھر یہی نہیں کہ جزیہ کی شخص میں نرمی سے

کام لیا جاتا تھا بلکہ اگر جزیہ واجب ہو جانے کے بعد بھی کسی شخص کی مالی حالت جزیہ ادا کرنے کے

قابل نہ رہتی تھی تو اسے جزیہ کی رقم معاف کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ ذیل کا تاریخی واقعہ اس کی ایک دلچسپ

۱۔ عرب کا ایک معمولی سونے کا سکہ تھا۔ ابو داؤد کتاب الخراج باب فی اخذ الجزیۃ ۲۔ عرب کا ایک معمولی چاندی کا سکہ تھا۔

۳۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف فصل فی من یحب علیہ الجزیۃ ۴۔ یہ کتاب الخراج فصل فی من یحب

علیہ الجزیۃ ۵۔ ایضاً

مثال ہے۔ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں بعض غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرنے میں کچھ سختی کی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ فوراً رُک گئے اور غصہ کی حالت میں دریافت فرمایا کہ ”یہ معاملہ کیا ہے؟“ عرض کیا گیا کہ ”یہ لوگ جزیہ ادا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی طاقت نہیں ہے۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان پر وہ بوجھ ڈالا جاوے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں چھوڑ دو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتا ہے وہ قیامت کے دن خدا کے عذاب کے نیچے ہو گا۔ چنانچہ ان لوگوں کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔“

حضرت عمرؓ کو آنحضرت ﷺ کے تاکید و ارشادات کے ماتحت اپنی غیر مسلم رعایا کا اس قدر خیال تھا کہ انہوں نے فوت ہوتے ہوئے خاص طور پر ایک وصیت کی جس کے الفاظ یہ تھے: ”میں اپنے بعد میں آنے والے خلیفہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا سے بہت نرمی اور شفقت کا معاملہ کرے۔ ان کے معاہدات کو پورا کرے ان کی حفاظت کرے۔ ان کے لیے ان کے دشمنوں سے لڑے اور ان پر قطعاً کوئی ایسا بوجھ یا ذمہ داری نہ ڈالے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔“

### عام سلوک اور سیاسی تعلقات

عام سلوک اور سیاسی تعلقات کے معاملہ میں بھی اسلام نے ایسا نمونہ قائم کیا جس کی مثال کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔

خیبر کے یہودیوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے معاہدہ کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ آنحضرت ﷺ ان سے محاصل کی بٹائی کے لیے اپنے صحابی عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجا کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم کے ماتحت عبداللہ بن رواحہؓ فصل کی بٹائی میں اس قدر نرمی سے کام لیتے تھے کہ فصل کے دو حصے کر کے یہودیوں کو اختیار دے دیتے تھے کہ اب ان حصوں میں سے جو حصہ بھی تم پسند کرو لے لو اور پھر جو حصہ چاہیے رہ جاتا تھا وہ خود لے لیتے تھے۔ یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام فتح ہوا تو معاہدہ کی رو سے مسلمانوں نے شام کی عیسائی آبادی سے ٹیکس وغیرہ وصول کیا لیکن اس کے تھوڑے عرصہ بعد رومی سلطنت کی طرف سے پھر جنگ کا اندیشہ پیدا ہو گیا جس پر شام کے اسلامی امیر حضرت ابو عبیدہؓ نے تمام وصول شدہ ٹیکس عیسائی آبادی کو واپس کر دیا اور کہا کہ جب جنگ کی وجہ سے ہم تمہارے حقوق ادا نہیں کر سکتے تو ہمارے لیے جائز نہیں کہ یہ ٹیکس اپنے پاس رکھیں۔ عیسائیوں نے یہ دیکھ کر بے اختیار مسلمانوں کو دُعا دی اور کہا ”خدا کرے تم رومیوں پر فتح پاؤ اور پھر اس ملک کے حاکم بنو۔“ چنانچہ جب مسلمانوں نے دوبارہ فتح حاصل کی

تو علاقہ کی عیسائی آبادی نے بڑی خوشی منائی اور واپس شدہ نیکیں پھر مسلمانوں کو ادا کئے۔ یہ اسی قسم کے حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی شام میں تشریف لے گئے تو وہاں کے عیسائی لوگ گاتے اور بجاتے ہوئے ان کے استقبال کے لیے نکلے اور ان پر تلواروں کا سایہ کیا اور پھولوں کی بارش برساتی۔ ملکی عہدوں کے معاملہ میں بھی غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی البوزید نامی کو ایک جگہ کا عامل مقرر فرمایا تھا۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور تعامل کے ماتحت حضرت عمرؓ کو اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے حقوق اور ان کے آرام و آسائش کا اتنا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنے گورنروں کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ ذمیوں کا خاص خیال رکھیں اور خود بھی ان سے پوچھتے رہتے تھے کہ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ذمیوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو حضرت عمرؓ نے ان سے پہلا سوال ہی کیا کہ مسلمانوں کی طرف سے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا مَا نَحْنُ إِلَّا وُفَاءٌ وَحَسَنَ مِّلْكَةٍ یعنی "ہم نے مسلمانوں کی طرف سے حسن و فاء اور حسن سلوک کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔"

محکمہ قضا و عدالت میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق قانونی رنگ میں تو مساوی عدل و انصاف تھے ہی مگر عملاً بھی انصاف کا ترازو کسی طرف جھکنے نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب بنو نصیر کی جلا وطنی کے موقع پر انصار اور یہود کے درمیان اختلاف پیدا ہوا یعنی یہودی لوگ انصار کی اولاد کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور انصار انہیں روکتے تھے تو اس پر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے خلاف اور یہود کے حق میں فیصلہ فرمایا۔ اسی طرح روایت آتی ہے کہ جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک یہودی اور مسلمان کا مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے یہ دیکھا کہ یہودی کے ساتھ ہے مسلمان کا مقدمہ خارج کر کے یہودی کے حق میں ڈگری دی۔ انہی کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک یہودی قتل ہو گیا اور اس کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں چلتا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ گھبرا کر گھر سے نکل آئے اور صحابہ کو مسجد میں جمع کر کے منبر پر چڑھ گئے اور ایک نہایت زوردار خطبہ دیا جس میں کہا کہ "خدا نے مجھے خلیفہ بنایا اور حکومت اسلامی کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دی۔ اب کیا میرے ہوتے ہوئے مخلوق خدا کا اس طرح خون ہوگا۔ تم لوگوں کو خدا کی قسم ہے کہ جسے اس واقعہ کے متعلق کچھ علم ہو وہ مجھے بتائے" اس پر ایک صحابی بکمرن شداخ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "یا امیر المؤمنین! یہ قتل مجھ سے سرزد ہوا ہے" حضرت

لے کتاب الخراج ابو یوسف صفحہ ۸۰، ۸۱، ۸۲ لے فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۴۶ لے اصحابہ جلد ۹ صفحہ ۱۴۷ حالات

البوزید الطائی الشاعر لے طبری جلد ۵ صفحہ ۲۵۹۰ لے البداء و کتاب الجہاد باب فی الاسیر کیر علی الاسلام

لے موطا امام مالک کتاب الاقضیۃ باب الترغیب فی القضاء بالحق

عمرؓ نے جواب دیا۔ ”اللہ اکبر! تم اس کے قاتل ہو! تم سے قصاص لیا جائیگا۔ ورنہ کوئی بریت ہے تو پیش کرو۔“  
 اسلامی حکومت میں غریب اور نادار غیر مسلم رعایا کی مالی امداد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ اُس نے کہا۔ بوڑھا ہو گیا ہوں اور نظر کمزور ہے۔ کام ہونے نہیں سکتا اور جزیہ کی رقم بھی ابھی مجھ پر لگی ہوتی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے چین ہو گئے۔ فوراً اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنے گھرا کر مناسب امداد دی اور پھر بیت المال کے افسر کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بے انصافی ہے کہ ایسے لوگوں پر جزیہ لگایا جاتا ہے! ہمیں تو حکم ہے کہ غریب کی امداد کریں نہ کہ اُنہا ان پر ٹیکس لگائیں۔ اس کے بعد ایک عام حکم جاری فرمایا کہ ایسے لوگوں پر جزیہ نہ لگایا جاوے بلکہ اس قسم کے مستحق لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاوے۔ ذمیوں کی امداد تو الگ رہی اسلام میں حربی دشمنوں کی امداد کی مثالیں بھی مفقود نہیں ہیں چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب شہہ ہجری میں مکہ میں قحط پڑا تو آنحضرت ﷺ نے اپنے پاس سے مکہ والوں کی امداد کے لیے کچھ چاندی بھجوائی حالانکہ ابھی تک قریش مکہ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔

**احساسات کا احترام**  
 جذبات و احساسات کا رشتہ نہایت نازک ہوتا ہے اور فاتح اور غالب اقوام عموماً اس معاملہ میں بہت بے اعتنائی دکھاتی ہیں کیونکہ اس کا دار و مدار کسی قانون پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس رُوح پر ہوتا ہے جو قلوب میں غنچی ہوتی ہے اور جس پر کوئی مادی قانون حکومت نہیں کر سکتا۔ مگر آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ اپنے غلبہ اور حکومت کے زمانہ میں بھی غیر مسلموں کے احساسات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مدینہ میں ایک یہودی نوجوان بیمار ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اور اُس کی حالت کو نازک پا کر آپ نے اسے اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ وہ آپ کی تبلیغ سے متاثر ہوا مگر چونکہ اس کا باپ زندہ تھا اور اس وقت پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ ایک سوال کی ہیئت بنا کر باپ کی طرف دیکھنے لگ گیا۔ باپ نے کہا۔ ”بیٹے! اگر تمہیں تسلی ہے تو بیشک، ابوالقاسمؓ کی بات مان لو۔“ لڑکے نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا جس پر آنحضرت ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ”خدا کا شکر ہے کہ ایک رُوح آگ کے عذاب سے نجات پا گئی ہے۔“

جب شام کا ملک فتح ہوا اور وہاں کی عیسائی آبادی اسلامی حکومت کے ماتحت آگئی تو ایک دن جبکہ آنحضرت ﷺ کے صحابی سہل بن حنیف اور قیس بن سعد قادیسیہ کے شہر میں کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے

۱۔ اسد الغابہ و ذکر بکر بن شراح نیز اس غلط خیال کی تردید کے لیے کہ ایک مسلمان کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا دیکھو طحاوی باب المؤمن

یقتل الکافر متعداً۔ ۲۔ کتاب الخراج قاضی ابویوسف فصل فی من تجب علیہ الجزیہ صفحہ ۷۴۔ ۳۔ تاریخ الخلفاء جلد ۲ صفحہ ۵۲۸

۴۔ آنحضرت ﷺ کی کنیت تھی۔ ۵۔ بخاری ابواب الجنائز باب اذا اسلم العبی



ان کے پاس سے ایک عیسائی کا جنازہ گزرا یہ دونوں اصحاب اسے دیکھ کر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک مسلمان نے جو آنحضرت ﷺ کا صحبت یافتہ نہیں تھا اور ان اخلاق سے نا آشنا تھا جو اسلام سکھاتا ہے یہ دیکھ کر بہت تعجب کیا اور حیران ہو کر سہل اور قیس سے کہا کہ یہ تو ایک ذمی کا جنازہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! ہم جانتے ہیں مگر آنحضرت ﷺ کا یہی طریق تھا کہ آپ غیر مسلموں کے جنازہ کو دیکھ کر بھی کھڑے ہو جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کیا ان میں خدا کی پیدا کی ہوئی جان نہیں ہے؟

دوسری اقوام کے مذہبی بزرگوں کا احترام  
 بین الاقوام مناقشات کی تہ میں بیشتر طور پر یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مذہبی پیشواؤں کا احترام نہیں کرتی اور اپنے بزرگوں کے سوا باقی سب کو جھوٹا اور مفتری اور مفسد فی الارض قرار دیتی ہے اس معاملہ میں اسلام تعلیم پیش کرتا ہے کہ خدا کسی ایک قوم یا ایک ملک کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ساری دنیا کا خدا ہے پس جس طرح اُس نے دنیا کی جسمانی زندگی کے لیے ایسے سامان پیدا کئے ہیں جو کسی ایک قوم کے ساتھ خاص نہیں۔ اسی طرح اس کی ازلی رحمت نے دنیا کی روحانی زندگی کے لیے بھی سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ إِنَّ مِنْ أُمَمٍ إِلَّا خَلَقْنَا فِيهَا نَذِيرًا یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنا رسول بھیج کر لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ صرف خدا کی پرستش کرو اور شیطانی رستوں کے قریب نہ جاؤ، لیکن افسوس کہ صرف بعض نے ہماری نصیحت کو مانا اور بعض نے مگر ابھی کا رستہ اختیار کر لیا مگر ہم نے اپنی طرف سے سب کے ساتھ ایک سا سلوک کیا کیونکہ دنیا کی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس کی طرف ہم نے کوئی نصیحت کرنے والا بھیج کر اس کے لیے ہدایت کا سامان نہ پیدا کیا ہو۔ اس آیت کریمہ کے ماتحت ایک مسلمان کے لیے دنیا کی ہر قوم کا مذہبی بانی ایک مقدس ہستی بن جاتا ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہر قوم کے مذہبی پیشوا کو خدا کے ایک نبی اور رسول کی حیثیت میں قبول کرے۔ اس کے لیے ہندوؤں کے کرشن۔ بدھ مذہب والوں کے گوتم بدھ۔ چینیوں کے کنفوشس۔ پارسیوں کے زرتشت۔ یہودیوں کے موسیٰ اور عیسائیوں کے مسیح علیہم السلام سب ایک ہی واحد آسمانی خدا کے مقدس پیغمبر ہیں۔ جن کے ذریعہ سے دُنیا نے اپنے اپنے وقت میں ہدایت کا نور پایا۔ اس مبارک تعلیم کے ماتحت آنحضرت ﷺ کو دوسری اقوام کے مذہبی پیشواؤں کی عزت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ جب ایک صحابی نے کسی یہودی کے سامنے آنحضرت ﷺ کی حضرت موسیٰ پر ایسے رنگ



میں فضیلت بیان کی جس سے اس یہودی کے دل کو صدمہ پہنچا تو آپ نے اس صحابی کو ملامت فرمائی اور فرمایا کہ تمہارا یہ کام نہیں کہ خدا کے نبیوں میں اس طرح بعض کو بعض سے افضل بیان کرتے پھرو اور پھر آپ نے حضرت موسیٰ کی ایک جزوی فضیلت بیان کر کے اس یہودی کی دلزداری فرمائی: ایک دوسرے موقع پر جبکہ آپ طائف سے مکہ کو واپس آرہے تھے آپ کو ایک عدا اس نامی شخص ملا جس نے آپ سے ذکر کیا کہ میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا: "نینوا! یونس بن متی کا شہر! یونس میرے بھائی تھے۔ میں اُسی خدا کا رسول ہوں جس نے یونس کو مبعوث کیا تھا۔" یہ ذہنیت کیسی مبارک کیسی دلکش اور اخوت اور امن کے جذبات سے کیسی معمور ہے! مگر افسوس کہ دنیا نے اس کی قدر نہیں کی۔

یہ اس ضابطہ اخلاق کا مختصر نقشہ ہے جو غیر قوموں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے متعلق مقدس باقی اسلام نے پیش کیا اور جس پر آپ کے صحابہ اور آپ کے خلفاء نے عملاً کاربند ہو کر یہ بتا دیا کہ یہ تعلیم صرف کاغذوں کی زینت یا منبروں کی سجاوٹ نہیں بلکہ سیاست اسلامی کا ایک ضروری اور عملی حصہ ہے جس کے بغیر کوئی حکومت جو اسلام کی طرف منسوب ہوتی ہے صحیح معنوں میں اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

اس جگہ سیرۂ خاتم النبیین ﷺ کا حصہ دوم ختم ہوا۔



# سیرت خاتم النبیین ﷺ

حصہ سوم

## عرض حال

سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ سوم کا پہلا جزو ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے میری طبیعت میں اس وجہ سے کافی تامل ہے کہ یہ حصہ اس احتیاط کے ساتھ نہیں لکھا گیا جس احتیاط سے کہ سابقہ حصے لکھے گئے تھے اور اس کا آخری حصہ تو گویا بالکل قلم برداشت ہی لکھا گیا اور یہ انداز ایک تاریخی تحقیق کے لئے یقیناً مناسب نہیں۔ اسی طرح اس حصہ کی نظر ثانی بھی ایسے حالات میں ہوئی ہے کہ میں اس کے متعلق کسی طرح تسلی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ قادیان سے باہر آنے کے بعد کتابوں کا بہت سا ذخیرہ تو قادیان میں ہی رہ گیا اور جو حصہ پاکستان میں پہنچا وہ لاہور اور پٹیوٹ اور ربوہ اور احمد نگر وغیرہ میں منتشر ہوا ہے اس لئے حوالوں کی آخری چھان بین بلکہ بعض صورتوں میں تو ابتدائی چھان بین بھی تسلی بخش صورت میں نہیں ہو سکتی اور مجھے اکثر جگہ حوالہ در حوالہ پر اکتفا کرنی پڑی ہے۔ مثلاً اگر زر قانی نے یہ لکھا ہے کہ ابن سعد نے فلاں بات یوں بیان کی ہے تو میں اسے موجودہ تصنیف میں قبول کر لیتا رہا ہوں حالانکہ اس سے پہلے اصل ماخذ کی طرف رجوع کر کے ذاتی پڑتال کے بعد اندراج کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ آخری حصہ لاہور میں آکر بہت جلدی میں لکھنا پڑا ہے اس لئے دلجمعی کی نظر ثانی کے نتیجہ میں جو اصلاح اور تصحیح ممکن ہو سکتی ہے وہ اسے میسر نہیں آئی۔ مگر بہر حال جو کچھ بھی موجودہ حالات کی مجبوریوں کے ماتحت لکھا جاسکا ہے وہ دوستوں کے اس معذورہ کے نتیجہ میں کہ موجودہ مواد بہر حال شائع ہو جانا چاہئے ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی تو انشاء اللہ طبع ثانی کے وقت ضروری اصلاح کی جاسکے گی۔

جیسا کہ میں الفضل میں اعلان کر چکا ہوں یہ حصہ مکمل نہیں ہے بلکہ صرف غزوہ بنو قریظہ کے بعد کے حالات سے لے کر آنحضرت ﷺ کے تبلیغی خطوط کے زمانہ تک محدود ہے اسی لئے میں نے اس کا نام ”سیرۃ خاتم النبیین حصہ سوم جزو اول“ رکھا ہے۔ جب بقیہ جزو شائع ہوگی تو انشاء اللہ حصہ سوم مکمل ہو جائے گا۔ اس حصہ میں آنحضرت ﷺ و سلم (قد اہ نفسی) کے اس خط کا بلاک فوٹو بھی درج کیا جا رہا ہے جو آنحضرت ﷺ نے مصر کے بادشاہ مقوقس کو لکھا تھا۔ اگرچہ ان ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں عربی کے رسم الخط میں کافی تبدیلی آچکی ہے لیکن غور کرنے سے بیشتر الفاظ پڑھے جاسکتے ہیں اور یہ الفاظ بعینہ وہی ہیں جو اسلامی روایتوں سے اس خط کے ثابت ہوتے ہیں۔ پس میں نے نہ صرف تبرک کے خیال سے بلکہ اس خیال سے بھی کہ اس خط کی دریافت احادیث اور تاریخ اسلام کی صحت کا ایک زندہ ثبوت ہے اس خط کا فوٹو کتاب میں درج کر دیا ہے اور میرا دل اس نقشہ کو تصور میں لا کر خاص روحانی سرور حاصل کرتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اپنے منتخب صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے یہ مبارک الفاظ الماء فرما رہے ہوں گے اور صحابہ کے دل اس مقدس انتظار کی کیفیت سے معمور ہوں گے کہ دیکھئے ان روحانی آبشاروں کے چھینٹوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

دوست دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کتاب کے بقیہ حصہ یا حصوں کی تکمیل کی بھی توفیق عطا کرے اور اسے دنیا کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ واللہ التولیع وهو المستعان۔

خاکسار

مرزا بشیر احمد آف قادیان حال رتن باغ۔ لاہور۔ ۲/ اپریل ۱۹۴۹ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

## مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز

صلح حدیبیہ سے پہلے کا زمانہ



جیسا کہ اس کتاب کے حصہ دوم کے آخر میں بیان کیا جا چکا ہے سنہ ۶ کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نئے دور کی نمایاں خصوصیات تین تھیں:-  
اول یہ کہ اب مدینہ کا شہر غیر مسلم عنصر سے عملاً پاک ہو چکا تھا اور گونا گونا فقین کا گروہ اب تک مدینہ میں موجود تھا اور یہ لوگ اپنی قبیعی عداوت اور مخفی چال بازیوں میں اس وقت غالباً آگے سے بھی زیادہ جوش و خروش میں تھے مگر بہر حال وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور جہاں تک ظاہری نظام کا تعلق ہے وہ اسلامی سوسائٹی کا حصہ تھے۔

دوم۔ گو قریش مکہ ابھی تک اسلام کے خلاف میدانِ عمل میں تھے مگر غزوہ احزاب کی ناکامی سے انہیں ایسا دھکا لگ چکا تھا کہ اب وہ اسلام کی عداوت کا مرکزی نقطہ نہیں رہے تھے۔

سوم۔ میدانِ کارزار اب مدینہ سے ہٹ کر عرب کے مختلف اطراف میں پھیل گیا تھا۔ اس متوخر الذکر تبدیلی کی وجہ سے مسلمانوں کی بیرونی مقیم بھی لازماً زیادہ کثرت اور زیادہ تنوع اختیار کر گئی تھیں۔ اور ان کا حلقہ آگے سے بہت زیادہ وسیع ہو کر گونا گوں معرکوں کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ ہجرت کا چھٹا سال جس میں ہم اب داخل ہو رہے ہیں مسلمانوں کے لیے غیر معمولی نقل و حرکت کا سال تھا۔ جس میں انہیں کم و بیش اٹھارہ

مرتبہ مدینہ سے نکلنا پڑا اور ان مہمات میں سے ایک مہم (یعنی غزوہ حُدیبیہ) تو خاص طور پر نہایت اہم اور نہایت وسیع الاثر تھی۔

دراصل گو عرب کے قبائل غزوۂ احزاب میں جو اواخرِ شہذہ میں ہوا اپنا انتہائی زور لگا دینے کے بعد اس خیال سے تو عملاً مایوس ہو چکے تھے کہ مدینہ پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو اُن کے گھر میں ہی علیا میٹ کیا جاسکتا ہے مگر ابھی تک عداوتِ اسلام کی آگ اُن کے سینوں میں اُسی طرح شعلہ زن تھی۔ بلکہ غزوۂ احزاب کی ذلت بھری ناکامی نے اُن کی دلی عداوت کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ اس لیے اب اگر ایک طرف عرب کے وحشی اور خونخوار قبائل نے مدینہ پر باقاعدہ حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی پوری ہو گئی تھی کہ غزوۂ احزاب کے بعد یہ لوگ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہوں گے تو دوسری طرف وہ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں نکل رہے تھے چنانچہ اس زمانہ میں اُنہوں نے تین تدابیر اختیار کیں۔

اول اُنہوں نے یہ تجویز کی کہ مدینہ سے باہر جن جن قبائل میں اسلام کا اثر پہنچ رہا تھا یا جن میں اثر پہنچنے کا احتمال تھا وہاں اسلام کی اشاعت کو جبراً روک دیا جاوے تاکہ کوئی نیا شخص مسلمان ہو کر اور مدینہ کی طرف ہجرت کر کے مسلمانوں کی تقویت کا باعث نہ بنے۔

دوسرے یہ کہ مدینہ کے مضافات پر خفیہ خفیہ چھاپے مار کر مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان پہنچایا جاوے۔ تیسرے یہ کہ کسی مخفی تدبیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نظامِ اسلام کا مرکزی نقطہ تھے قتل کروا دیا جاوے۔

ہر چند کہ یہ تینوں تجاویز ایک حد تک پہلے سے کفار کے مد نظر تھیں اور وہ عملاً ان کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے مگر اب اُنہوں نے دوسری طرف سے خیال ہٹا کر گویا اپنا سارا زور انہی تجاویز کے کامیاب بنانے میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ مہمات جن کا ذکر اب شروع ہوتا ہے اُن کا باعث زیادہ تر کفارِ عرب کی یہی تدابیر تھیں ہم ان میں سے خاص خاص غزوات و سرایا کا ذکر کسی قدر تفصیلاً اور باقی کا مجملہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

سربہ قرظا

ابھی سنہ شروع ہی ہوا تھا اور قمری سال کے پہلے

مہینہ یعنی محرم کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل نجد کی طرف سے خطرہ کی اطلاعات پہنچیں۔

محرم سنہ مطابق مئی جون سنہ ۶۲ھ

یہ اندیشہ قبیلہ قرظا کی طرف سے تھا جو قبیلہ بنو بکر کی ایک شاخ تھا اور نجد کے علاقہ میں بمقام صرہ آباد تھا



جو مدینہ سے سات یوم کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ خبر پا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تیس سواروں کا ایک ہلکا سادہ سدا اپنے ایک صحابی محمد بن مسلمہ انصاری کی کمان میں نجد کی طرف روانہ فرما دیا مگر اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں کچھ ایسا رعب پیدا کر دیا کہ وہ معمولی سے مقابلہ کے بعد ہی بھاگ نکلے اور گو اس زمانہ کے طریق جنگ کے مطابق مسلمانوں کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ دشمن کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیتے کیونکہ دشمن انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا مگر محمد بن مسلمہ نے عورتوں اور بچوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور عام سامان غنیمت لے کر جو اونٹوں اور بکریوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

ثمامہ بن اُثال رئیس یمامہ  
اس مہم کی واپسی پر ثمامہ بن اُثال کے قید کئے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ یہ شخص یمامہ کا رہنے والا تھا اور قبیلہ بنو حنیفہ کا ایک بہت با اثر رئیس تھا اور اسلام کی مداوت میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہمیشہ

کا اسلام لانا محرم

بے گناہ مسلمانوں کے قتل کے درپے رہتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اچھی اُس کے علاقہ میں گیا تو اُس نے تمام قوانین جنگ کو بالائے طاق رکھ کر اُس کے قتل کی سازش کی۔ بلکہ ایک دفعہ اُس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا بھی ارادہ کیا تھا۔ جب محمد بن مسلمہ کی پارٹی ثمامہ کو قید کر کے لاتی تو انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ کون شخص ہے بلکہ انہوں نے اُسے محض شبہ کی بنا پر قید کر لیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ثمامہ نے بھی کمال ہوشیاری کے ساتھ اُن پر اپنی حقیقت ظاہر نہیں ہونے دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یس اسلام کے خلاف خطرناک جرائم کا مرتکب ہو چکا ہوں اور اگر اسلام کے ان غیرت مند سپاہیوں کو یہ پتہ چل گیا کہ میں کون ہوں تو وہ شاید مجھ پر سختی کریں یا قتل ہی کر دیں مگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ بہتر سلوک کی توقع رکھتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کی واپسی تک محمد بن مسلمہ کی پارٹی پر ثمامہ کی شخصیت مخفی رہی۔

مدینہ پہنچ کر جب ثمامہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھیوں سے فرمایا۔ جانتے ہو یہ کون شخص ہے؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا جس پر آپ نے اُن پر حقیقت حال ظاہر کی۔ اس کے بعد آپ نے حسبِ عادت ثمامہ کے ساتھ نیک سلوک کئے جانے کا حکم دیا اور پھر اندرونِ خانہ تشریف لے جا کر گھر میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ کھانے کے لیے تیار ہو ثمامہ کے لیے باہر بھجوا دو۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے صحابہ سے یہ ارشاد فرمایا کہ ثمامہ کو کسی دوسرے مکان میں رکھنے کی بجائے مسجد نبوی کے صحن میں ہی کسی ستون کے ساتھ باندھ کر قید رکھا جائے جس سے

۱۔ اس زمانہ کے طریق سفر کے لحاظ سے یہ فاصلہ قریباً ڈیڑھ سو میل سمجھنا چاہیئے۔ ۲۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۵۶ و

زرقانی جلد ۲ حالات سر یہ قرط۔ ۳۔ زرقانی حالات سر یہ قرط۔ ۴۔ ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۴۰۱

۵۔ اصابہ جلد ۱ صفحہ ۴۱۲۔ ۶۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۱۔

آپ کی غرض یہ تھی کہ تا آپ کی مجالس اور مسلمانوں کی نمازیں ثمامہ کی آنکھوں کے سامنے منعقد ہوں اور اس کا دل ان روحانی نظاروں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جائے۔

ان ایام میں آنحضرت ﷺ ہر روز صبح کے وقت ثمامہ کے قریب تشریف لے جاتے اور حال پوچھ کر دینا فرماتے کہ ثمامہ! بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟ ثمامہ جواب دیتا "اے محمد! (ﷺ) اگر آپ مجھے قتل کر دیں تو آپ کو اس کا حق ہے کیونکہ میرے خلاف خون کا الزام ہے لیکن اگر آپ احسان کریں تو آپ مجھے شکر گزار پائیں گے۔ اور اگر آپ فدیہ لینا چاہیں تو میں فدیہ دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔" تین دن تک یہی سوال و جواب ہوتا رہا۔ آخر تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ "ثمامہ کو کھول کر آزاد کر دو۔" صحابہ نے فوراً آزاد کر دیا اور ثمامہ جلدی جلدی مسجد سے نکل کر باہر چلا گیا۔ غالباً صحابہ یہ سمجھے ہوں گے کہ اب وہ اپنے وطن کی طرف واپس لوٹ جائے گا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ چکے تھے کہ ثمامہ کا دل مضطرب ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ ایک قریب کے باغ میں گیا اور وہاں سے نہادھو کر واپس آیا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "یا رسول اللہ ایک وقت تھا کہ مجھے تمام دنیا میں آپ کی ذات سے اور آپ کے دین سے اور آپ کے شہر سے سب سے زیادہ دشمنی تھی، لیکن اب مجھے آپ کی ذات اور آپ کا دین اور آپ کا شہر سب سے زیادہ محبوب ہیں۔" ۱

اس دن شام کو جب حسب دستور ثمامہ کے لیے کھانا آیا تو اُس نے تھوڑا سا کھانا کھا کر چھوڑ دیا۔ جس پر صحابہ نے تعجب کیا کہ آج صبح تک تو ثمامہ بہت زیادہ کھاتا رہا ہے اور گویا بیٹھو تھا، لیکن اب اُس نے بہت تھوڑا کھانا کھا یا ہے۔ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا "صبح تک ثمامہ کافروں کی طرح کھانا کھاتا تھا اور اب اُس نے ایک مسلمان کی طرح کھایا ہے۔" اور آپ نے اس کی تشریح یوں فرمائی کہ "کافرات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے مگر مسلمان صرف ایک آنت میں کھاتا ہے۔" اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ جہاں ایک کافر کو دنیوی لذات میں انہماک ہوتا ہے اور گویا وہ اسی میں غرق رہتا ہے وہاں ایک سچا مسلمان اپنی جسمانی ضروریات کو صرف اُس حد تک محدود رکھتا ہے جو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہے کیونکہ اُسے حقیقی لذت صرف دین میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ سات کے عدد سے حسابی عدد مراد نہیں ہے بلکہ عربی محاورہ کی رُو سے سات کا عدد کثرت اور تکمیل کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے یہ گویا مراد یہ ہے کہ ایک کافر دنیوی لذات میں غرق رہتا ہے اور اس کی ساری توجہ

۱۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۵۔ ۲۔ بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ و مسلم کتاب الجہاد باب ربط الاسیر۔

۳۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ ۴۔ تاج العروس

دنیا میں صرف ہوتی ہے مگر ایک مومن اپنے آپ کو دنیوی لذات سے روک کر رکھتا ہے اور ضرورتِ حق کی حد سے آگے نہیں گذرتا۔ کیونکہ اُس کی حقیقی لذات کا میدان اور ہے۔ یہ تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فطری میلان اور آپ کے ذاتی خلق کا ایک نہایت سچا آئینہ ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد ثمامہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب آپ کے آدمیوں نے مجھے قید کیا تھا تو اس وقت میں خانہ کعبہ کے عمرہ کے لیے جا رہا تھا اب مجھے کیا ارشاد ہے؟ آپ نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی اور دعا کی اور ثمامہ مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر ثمامہ نے جوش ایمان میں قریش کے اندر بر ملا تبلیغ شروع کر دی۔ قریش نے یہ نظارہ دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور انہوں نے ثمامہ کو پکڑ کر ارادہ کیا کہ اُسے قتل کر دیں مگر پھر یہ سوچ کر کہ وہ پیام کے علاقہ کا رئیس ہے اور پیام کے ساتھ مکہ کے گھر سے تجارتی تعلقات ہیں وہ اس ارادہ سے باز آ گئے اور ثمامہ کو بُرا بھلا کہہ کر چھوڑ دیا۔ مگر ثمامہ کی طبیعت میں سخت جوش تھا اور قریش کے وہ مظالم جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر کرتے رہے تھے وہ سب ثمامہ کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اُس نے مکہ سے رخصت ہوتے ہوئے قریش سے کہا: "خدا کی قسم آئندہ پیام کے علاقہ سے تمہیں غلہ کا ایک دانہ نہیں آتے گا۔ جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت نہ دیں گے۔"

اپنے وطن میں پہنچ کر ثمامہ نے واقعی مکہ کی طرف پیام کے قافلوں کی آمد و رفت روک دی اور چونکہ مکہ کی خوراک کا بڑا حصہ پیام کی طرف سے آتا تھا اس لیے اس تجارت کے بند ہو جانے سے قریش مکہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ انہوں نے گھبرا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ ہمیشہ صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں اور ہم آپ کے بھائی بند ہیں۔ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ اس وقت قریش مکہ اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ انہوں نے صرف اس خط پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے رئیس ابوسفیان بن حرب کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھجوا یا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زبانی بھی بہت آہ و بیکار کی اور اپنی مصیبت کا اظہار کر کے رحم کا طالب ہوا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ بن اُثال کو ہدایت بھجوا دی کہ قریش کے ان قافلوں کی جن میں اہل مکہ کی خوراک کا سامان ہو روک تمام نہ کی جاوے۔ چنانچہ اس تجارت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا اور مکہ والوں کو اس مصیبت سے نجات ملی۔

۱۔ عمرہ حج کی ایک قسم ہے جس میں حج کے بعض مراسم اور شرائط کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک نفلی عبادت ہے جس کی ادائیگی فرائض میں واجب نہیں۔ آجکل انگریزی معاہدہ میں اسے چھوٹا حج کہتے ہیں۔ ۲۔ بخاری و مسلم۔ ۳۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۲۔ ۴۔ بخاری و مسلم۔ ۵۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۹۲۔ ۶۔ نسائی و حاکم و ہیثمی بحوالہ زر قافی جلد ۲ صفحہ ۱۲۶ حالات سر یہ قُرطبا ۷۔

یہ واقعہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شفقت اور رحم اور عفو کا ایک بین ثبوت ہے وہاں اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ شروع شروع میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے قافلوں کی روک تھام کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اُس کی اصل غرض و غایت یہ نہیں تھی کہ قریش کو قحط میں مبتلا کر کے تباہ کیا جاتے بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مدینہ کے قُرب و جوار کو قریش کے خطرہ سے محفوظ کر لیا جاتے۔ اس واقعہ سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیم کی رُو سے حربی دشمن کے متعلق بھی یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ عام حالات میں اس کے سلسلہ رسل و رسائل کو اس حد تک بند کر دیا جاتے کہ وہ نان جویں تک سے محروم ہو جاتے۔ ہاں سامانِ حرب کی آمد و رفت یا ضروری سامانِ خور و نوش کے علاوہ دوسری اشیاء کی برآمد و درآمد کا سلسلہ جنگی ضروریات کے ماتحت روکا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ دشمن مسلمانوں کی خوراک کے سلسلہ کو روکے تو پھر قرآن کی اُصولی تعلیم جزاء سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٍ مِّثْلُهَا یعنی کے ماتحت اُس کے اس سلسلہ کو بھی روکنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ثمامہ بن اثال اپنے علاقہ کا ایک ذی اثر رئیس تھا۔ اُس کی پُر جوش تبلیغ کے ذریعہ پیامہ کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے شروع میں مسلمانوں کو کذاب جھوٹے مدعی نبوت کے پیچھے لگ کر پیامہ کے بہت سے بادیہ نشین اسلام سے مُرتد ہو گئے تو ثمامہ نہ صرف خود نہایت پختگی کے ساتھ اسلام پر قائم رہا بلکہ اُس نے اپنی والہانہ جدوجہد سے بہت سے لوگوں کو مسلمان کر کے شریعت سے محفوظ کر کے اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع رکھا اور مسلمہ کے فتنہ کے مٹانے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

غزوہ عکا شہ بن محصن  
ریح الاول سنہ  
اسی سال ماہ ریح الاول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک مہاجر صحابی عکا شہ بن محصن کو چالیس مسلمانوں پر افسر بنا کر قبیلہ بنی اسد کے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اس وقت ایک چشمہ کے قریب ڈیرہ ڈالے پڑا تھا جس کا نام غمر تھا جو مدینہ سے مکہ کی سمت میں چند دن کے فاصلہ پر واقع تھا۔ عکا شہ کی پارٹی جلدی جلدی سفر کر کے غمر کے قریب پہنچی تاکہ انہیں شرارت سے روکا جاسکے تو معلوم ہوا کہ قبیلہ کے لوگ مسلمانوں کی خبر پا کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے۔ اس پر عکا شہ اور اُس کے ساتھی مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں جائیں گے۔  
عکا شہ فضلاء صحابہ میں سے تھے اور اہل مکہ کے حلیف تھے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جنگِ مُرتدین میں شہید ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنکے



متعلق حدیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں ذکر فرمایا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے یعنی وہ ایسے رُوحانی مرتبہ پر فائز ہوں گے اور ان کے لیے خُدائی فضل و کرم اسقدر جوش میں ہوگا کہ ان کے حساب کتاب کی ضرورت نہیں سمجھی جاتے گی۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ان لوگوں کے چہرے قیامت کے دن اس طرح چمکتے ہوں گے جس طرح کہ چودھویں رات کے آسمان پر چاند چمکتا ہے۔ اس پر عکاشہ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! دُعا فرماتیں کہ خدا تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں سے کر دے۔" آپ نے اُسی وقت دعا فرمائی کہ اے خدا تو اپنے فضل سے عکاشہ کو بھی ان لوگوں میں سے کر دے۔ اس کے بعد ایک انصاری شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے لیے بھی یہ دُعا فرماتیں اس پر آپ نے فرمایا۔

### سَبَقَكَ بِهَا عَكَاشَةُ

یعنی "اب تو عکاشہ تم پر اس معاملہ میں بازی لے جا چکا ہے۔" لہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا یہ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ اپنے اندر بہت سے معارف کا خزانہ رکھتا ہے کیونکہ اوّل تو اس سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اُمت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کا اس درجہ فضل و کرم ہے اور آنحضرت کا رُوحانی فیض اس کمال کو پہنچا ہوا ہے کہ آپ کی اُمت میں سے ستر ہزار آدمی ایسا ہوگا جو اپنے نمایاں رُوحانی مقام اور خدا کے خاص فضل و کرم کی وجہ سے گویا قیامت کے دن حساب و کتاب کی پریشانی سے بالا سمجھا جاتے گا۔ دوسرے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایسا قرب حاصل ہے کہ آپ کی رُوحانی توجہ پر خدا تعالیٰ نے فوراً بذریعہ کشف یا القاء آپ کو یہ علم دیدیا کہ عکاشہ بھی اس ستر ہزار کے پاک گروہ میں شامل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عکاشہ پہلے اس گروہ میں شامل نہ ہو مگر آپ کی دُعا کے نتیجہ میں خدا نے اُسے یہ شرف عطا کر دیا ہو۔ تیسرے اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا اس درجہ ادب ملحوظ تھا اور آپ اپنی اُمت میں جہد و عمل کو اس درجہ ترقی دینا چاہتے تھے کہ جب عکاشہ کے بعد ایک دوسرے شخص نے آپ سے اسی قسم کی دُعا کی درخواست کی تو آپ نے اس شخص رُوحانی مقام کے پیش نظر جو اس پاک گروہ کو حاصل ہے مزید انفرادی دُعا سے انکار کر دیا تاکہ مسلمانوں کو تقویٰ اور ایمان اور عمل صالح میں ترقی کرنے کی طرف توجہ رہے۔ چوتھے اس سے آپ کے اعلیٰ اخلاق پر بھی غیر معمولی روشنی پڑتی ہے کیونکہ آپ نے انکار ایسے رنگ میں نہیں کیا جس سے سوال کرنے والے

۱۔ بخاری کتاب الرقاق باب یدخل الجنة سبعون ألفاً بغیر حساب۔ لہ یہ بھی ممکن ہے کہ ستر ہزار سے معتین تعداد مراد نہ ہو، بلکہ غیر معمولی طور پر بھاری جماعت مراد ہو کیونکہ عربی زبان میں شتر کا لفظ بھاری کثرت یا کامل تعداد کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔



انصاری کی دل شکنی ہو بلکہ ایک نہایت لطیف رنگ میں بات کو ٹال گئے۔

### سریہ محمد بن مسلمہ

### بطرف ذوالقعدة ربيع الآخر ۶ھ

ربیع الآخر کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد بن مسلمہ انصاری کو ذوالقعدة کی طرف روانہ فرمایا جو مدینہ سے

چوبیس میل کے فاصلہ پر تھا اور جہاں اُن ایام میں بنو ثعلبہ آباد تھے۔ محمد بن مسلمہ اور اُن کے دس ساتھی رات کے وقت وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس قبیلہ کے ایک سونو جوان جنگ کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ صحابہ کی جماعت سے یہ پارٹی تعداد میں دس گئے زیادہ تھی مگر تعداد کا فرق اسلامی ضابطہ حرب میں چننا قابل لحاظ نہیں تھا۔ محمد بن مسلمہ نے فوراً اس لشکر کے سامنے صف آرائی کر لی اور فریقین کے درمیان رات کی تاریکی میں خوب تیر اندازی ہوئی۔ اس کے بعد کفار نے صحابہ کی اس مٹھی بھر جماعت پر دھاوا بول دیا اور چونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی ایک ایک کی آن میں یہ دس فدا یان اسلام خاک پر تھے۔ محمد بن مسلمہ کے ساتھی تو سب کے سب شہید ہو گئے مگر خود محمد بن مسلمہ بچ گئے۔ کیونکہ کفار نے انہیں دوسروں کی طرح مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور اُن کے کپڑے وغیرہ اُتار کر لے گئے۔ غالباً محمد بن مسلمہ بھی وہاں پڑے پڑے فوت ہو جاتے مگر حسن اتفاق سے ایک مسلمان کا وہاں سے گذر ہو گیا اور اُس نے محمد بن مسلمہ کو پہچان کر انہیں اٹھا کر مدینہ پہنچا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے ابو عبیدہ بن الجراح کو جو قریش میں سے تھے اور کبار صحابہ میں شمار ہوتے تھے محمد بن مسلمہ کے انتقام کے لیے ذوالقعدة کی طرف روانہ فرمایا اور چونکہ اس عرصہ میں یہ بھی اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ کے لوگ مدینہ کے مصافات پر حملہ کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے آپ نے ابو عبیدہ کی کمان میں چالیس مستعد صحابہ کی جماعت بھجوائی اور حکم دیا کہ راتوں رات سفر کر کے صبح کے وقت وہاں پہنچ جائیں۔ ابو عبیدہ نے تعیل ارشاد میں یلغار کر کے عین صبح کی نماز کے وقت انہیں جا دیا اور وہ اس اچانک حملہ سے گھبرا کر تھوڑے سے مقابلہ کے بعد بھاگ نکلے اور قریب کی پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ ابو عبیدہ نے مال غنیمت پر قبضہ کیا اور مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اس مہم میں جن دو صحابہ کا ذکر ہے یعنی محمد بن مسلمہ اور ابو عبیدہ بن الجراح وہ دونوں کبار صحابہ میں سے تھے۔ محمد بن مسلمہ اپنے ذاتی اوصاف اور قابلیت کے علاوہ قتل کعب بن اشرف یہودی کے میرو تھے۔ کیونکہ یہ مُفسد انہی کے ہاتھ سے اپنے کفر کو دار کو پہنچا تھا۔ محمد بن مسلمہ انصاری کے قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں اُن کے خاص معتمد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ عموماً انہی کو اپنے عُمال کی شکایتوں کی تحقیق کے لیے بھجوا کر لاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں میں اندرونی فتنوں کا دروازہ کھلا تو محمد بن مسلمہ نے اپنی تلوار کو ایک پتھر پر توڑ کر اپنے ہاتھ میں صرف ایک چھڑی لے لی اور

جب کسی نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے یہی سنا ہوا ہے کہ جب مسلمانوں کے اندر باہمی قتل و غارت کا دروازہ کھلے تو تم تنوار کو توڑ کر گھر میں اس طرح دبا کر بیٹھ جانا جس طرح کسی کمرہ میں اُس کا فرش پڑا ہوا ہوتا ہے یہ یہ حکم غالباً محمد بن مسلمہ کے لیے یا اس فتنہ کے لیے خاص تھا ورنہ بعض اوقات اندرونی فتنوں کا مقابلہ بھی ایک اعلیٰ دینی خدمت کا رنگ رکھتا ہے۔

دوسرے صحابی ابو عبیدہ بن الجراح تھے۔ یہ چوٹی کے صحابہ میں سے تھے اور قریشی تھے۔ اُن کی رفعت شان اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں امین الملت کا خطاب عطا فرمایا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے جن دو صحابہ کو خلافت کا اہل سمجھا تھا اُن میں سے ایک یہ بھی تھے۔ ابو عبیدہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مرض طاعون سے وفات پا کر شہید ہوئے۔

سہریہ زید بن حارثہ  
بطرف بنی سلیم۔ ربيع الآخر ۳ھ

اسی ماہ ربيع الآخر ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام اور سابق متبنی زید بن حارثہ کی امارت میں چند مسلمانوں کو قبیلہ بنی سلیم کی طرف

روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اُس وقت نجد کے علاقہ میں بمقام جموم آباد تھا اور ایک عرصہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار چلا آتا تھا۔ چنانچہ غزوہ خندق میں بھی اس قبیلہ نے مسلمانوں کے خلاف نمایاں حصہ لیا تھا۔ جب زید بن حارثہ اور اُن کے ساتھی جموم میں پہنچے جو مدینہ سے قریباً پچاس میل کے فاصلہ پر تھا تو اُسے خالی پایا۔ مگر انہیں قبیلہ مزینہ کی ایک عورت حلیمہ نامی سے جو مخالفین اسلام میں سے تھی اس جگہ کا پتہ لگ گیا جہاں اس وقت قبیلہ بنو سلیم کا ایک حصہ اپنے مویشی چرا رہا تھا۔ چنانچہ اس اطلاع سے فائدہ اٹھا کر زید بن حارثہ نے اُس جگہ پر چھاپا مارا۔ اس اچانک حملہ سے گھبرا کر اکثر لوگ تو ادھر ادھر بھاگ کر منتشر ہو گئے مگر چند قیدی اور مویشی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے جنہیں وہ لے کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔ اتفاق سے ان قیدیوں میں حلیمہ کا خاوند بھی تھا اور ہر چند کہ وہ عربی مخالف تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلیمہ کی اس امداد کی وجہ سے نہ صرف حلیمہ کو بلا فدیہ آزاد کر دیا بلکہ اُس کے خاوند کو بھی احسان کے طور پر چھوڑ دیا اور حلیمہ اور اس کا خاوند خوشی خوشی اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔



## سریہ زید بن حارثہ

### بطرف عیص - جمادی الاولیٰ سنہ

زید بن حارثہ کو اس مہم سے واپس آتے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمادی الاولیٰ کے مہینہ میں انہیں ایک سو

ستر صحابہ کی کمان میں پھر مدینہ سے روانہ فرمایا۔ اس مہم کی وجہ اہل سیر نے یہ لکھی ہے کہ شام کی طرف سے قریش مکہ کا ایک قافلہ آ رہا تھا اس کی روک تھام کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستہ کو روانہ فرمایا تھا۔ قافلوں کی روک تھام کے متعلق ہم غزوات کے ابتداء میں ایک اصولی بحث درج کر چکے ہیں۔ اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قریش کے قافلے ہمیشہ مسلح ہوتے تھے اور مکہ اور شام کے درمیان آتے جاتے ہوئے وہ مدینہ کے بالکل قریب سے گذرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی طرف سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ابتدائی بحث میں ذکر کیا جا چکا ہے یہ قافلے جہاں جہاں سے گذرتے تھے۔ قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے جاتے تھے جس کی وجہ سے سارے ملک میں مسلمانوں کے خلاف عداوت کی ایک خطرناک آگ مشتعل ہو چکی تھی اس لیے ان کی روک تھام ضروری تھی۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قافلہ کی خبر پا کر زید بن حارثہ کو اس طرف روانہ فرمایا اور وہ اس ہوشیاری سے گھات لگاتے ہوئے بڑھے کہ بقاء عیص قافلہ کو جا دایا۔ عیص ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے چار دن کی مسافت پر سمندر کی جانب واقع ہے چونکہ یہ اچانک حملہ تھا اہل قافلہ مسلمانوں کے حملہ کی تاب نہ لاسکے اور اپنے ساز و سامان کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ زید نے بعض قیدی پکڑ کر اور سامان قافلہ اپنے قبضہ میں لے کر مدینہ کی راہ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ کے داماد

ان قیدیوں میں جو سریہ بطرف عیص میں پکڑے گئے ابو العاص بن

الزیع بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے اور

حضرت خدیجہ مرحومہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے اس

### ابو العاص کا مسلمان ہونا

سے قبل وہ جنگ بدر میں بھی قید ہو کر آئے تھے مگر اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ مکہ پہنچ کر آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کو مدینہ بھجوادیں۔ ابو العاص نے اس وعدہ کو تو پورا کر دیا تھا مگر وہ خود ابھی تک شرک پر قائم تھے جب زید بن حارثہ انہیں قید کر کے مدینہ میں لائے تو رات کا وقت تھا مگر کسی طرح ابو العاص نے حضرت زینب کو اطلاع بھجوادی کہ میں اس طرح قید ہو کر یہاں پہنچ گیا ہوں تم اگر میرے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔ چنانچہ عین اس وقت کہ

آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ صبح کی نماز میں مصروف تھے زینبؓ نے گھر کے اندر سے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ ”اے مسلمانو! میں نے ابوالعاص کو پناہ دی ہے“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تو صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ”جو کچھ زینبؓ نے کہا ہے وہ آپ لوگوں نے سُن لیا ہوگا۔ واللہ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ مگر مومنوں کی جماعت ایک جان کا حکم رکھتی ہے اگر ان میں سے کوئی کسی کافر کو پناہ دے تو اس کا احترام لازم ہے۔“ پھر آپ نے زینبؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا ”جسے تم نے پناہ دی ہے اُسے ہم بھی پناہ دیتے ہیں“ اور جو مال اس مہم میں ابوالعاص سے حاصل ہوا تھا وہ اُسے لوٹا دیا۔ پھر آپ گھر میں تشریف لائے اور اپنی صاحبزادی زینبؓ سے فرمایا ”ابوالعاص کی اچھی طرح خاطر تواضع کرو۔ مگر اُس کے ساتھ خلوت میں مت ملو کیونکہ موجودہ حالت میں تمہارا اُس کے ساتھ ملنا جائز نہیں ہے۔“ چند روز مدینہ میں قیام کر کے ابوالعاص مکہ کی طرف واپس چلے گئے مگر اب اُن کا مکہ میں جانا وہاں بھڑنے کی غرض سے نہیں تھا کیونکہ اُنہوں نے بہت جلد اپنے لین دین سے فراغت حاصل کی اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ جس پر آپ نے حضرت زینبؓ کو اُن کی طرف بغیر کسی جدید نکاح کے لوٹا دیا یعنی زینبؓ کو اجازت دیدی کہ اب وہ اُن کے ساتھ ازدواجی تعلقات رکھ سکتی ہیں۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اُس وقت حضرت زینبؓ اور ابوالعاص کا دوبارہ نکاح پڑھا گیا تھا مگر پہلی روایت زیادہ مضبوط اور صحیح ہے۔

ایک مسلمان اور کافر کے ازدواجی  
تعلق کے متعلق اسلامی تعلیم

اس جگہ ضمیمہ یہ ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ ایک  
مسلمان اور کافر کے باہمی نکاح کے بارے میں قرآنی  
احکام تین مختلف موقعوں پر درجہ بدرجہ نازل

ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہجرت کے کچھ عرصہ بعد سورۃ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں جن میں یہ حکم  
دیا گیا کہ کوئی مسلمان کسی مشرک عورت کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا اور نہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی  
مشرک مرد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے۔

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ..... وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ  
حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ

لے مراد یہ ہے کہ عام حالات میں ایسا ہونا چاہیئے ورنہ خاص حالات میں جب کہ مثلاً کسی بالا افسر کا کوئی اہل حکم موجود ہو یا پناہ دینے  
والا بدیتی یا فساد کی غرض سے یہ طریق اختیار کرے وغیر ذلک تو ایسے حالات میں یہ فعل جائز نہیں سمجھا جائیگا۔ واللہ اعلم  
لے طبقات ابن سعد و زرقانی حالات سریرہ عیسیٰ۔ سنے ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ۔ سنے زرقانی۔ لے سورۃ البقرہ: ۲۲۲





اب اگر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب سرِ عیص جس میں ابوالعاص قید ہو کر آتے تھے صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا تھا تو پھر کس طرح ممکن ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والے حکم مندرجہ سورۃ ممتحنہ کو سرِ عیص کے موقع پر چسپاں فرمایا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک سرِ سری نظر میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اعتراض دو طریق پر حل کیا جاسکتا ہے۔ اول اس طرح کہ بیشک سورۃ ممتحنہ والا حکم جس میں مشرک عورتوں کا نکاح ہر حال میں ناجائز قرار دیا گیا ہے بعد میں نازل ہوا مگر ہر حال سورۃ بقرہ والا حکم تو جس میں کم از کم آئندہ کے لیے مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح روک دیا گیا تھا، پہلے نازل ہو چکا تھا اور اغلباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم پر قیاس کر کے احتیاط کا رستہ اختیار کرتے ہوئے حضرت زینبؓ کو ہدایت فرمادی ہوگی کہ جب تک ابوالعاص مسلمان نہ ہو جائیں تم ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات نہ رکھنا اور پھر بعد میں اسی کے مطابق حکم بھی نازل ہو گیا۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے سرِ عیص اور ابوالعاص کے قید ہونے کا واقعہ دراصل صلح حدیبیہ کے بعد ہوا ہو، لیکن مؤرخین نے غلطی سے اسے صلح حدیبیہ سے پہلے رکھ دیا ہو، مگر ہمارے نزدیک مقدم الذکر تشریح زیادہ صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ابوالعاص کے کفر کی وجہ سے حضرت زینبؓ کا نکاح فسخ سمجھا گیا تھا تو پھر ان کے مسلمان ہونے پر بلا نکاح جدید انہیں کیوں اکٹھا ہونے کی اجازت دیدی گئی؟ اس کا جواب ایک فریق نے تو اس طرح دیا ہے کہ بلا نکاح والی روایت قابل عمل نہیں بلکہ اس کے مقابل پر وہ روایت زیادہ سند کے قابل ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت زینبؓ کا دوبارہ نکاح پڑھا گیا تھا، لیکن اصل جواب یہ ہے کہ بے شک نکاح فسخ ہو چکا تھا، لیکن چونکہ ابھی تک حضرت زینبؓ کی دوسری جگہ شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے جب اس عرصہ میں ابوالعاص مسلمان ہو گئے تو نئے نکاح کی ضرورت نہ سمجھی گئی گویا یہ ایک متعلق قسم کی صورت تھی یعنی اگر اس عرصہ میں حضرت زینبؓ کا دوسری جگہ نکاح ہو جاتا تو وہ جائز تھا، لیکن چونکہ وہ ابھی تک آزاد تھیں اس لیے سابقہ خاوند کے مسلمان ہونے پر انہیں اس کی طرف بلا نکاح لوٹا دیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ایک مفقود الخیر انسان کی ہوتی ہے جس پر ایک معین عرصہ گزرنے پر اس کی بیوی دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر قبل شادی اس کا اصل خاوند آجاتے تو سابقہ نکاح ہی قائم رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس ضمن میں اس حکمت کا بیان کرنا بھی مناسب ہو گا کہ اسلام میں غیر مسلم مرد کے نکاح میں مسلمان لڑکی کا دنیا یا مسلمان مرد کے نکاح میں غیر اہل کتاب کی لڑکی لینا کیوں حرام قرار دیا گیا۔ سو جانا چاہیے کہ مقدم الذکر صورت یعنی غیر مسلم مرد کے ساتھ نکاح نہ کرنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کو غیر مسلم مرد

کی شادی میں دینے کے معنی ہیں کہ لڑکی کے دین کو خود اپنے ہاتھ سے خطرہ میں ڈالا جائے اور اسلام کو ترقی دینے کی بجائے اس کے تنزل کا راستہ کھولا جائے جسے اسلام کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور غیر اہل کتاب کافر کی لڑکی لینے سے اس لیے روکا گیا ہے کہ چونکہ ایسی لڑکی اصول مذہب سے بالکل بے بہرہ ہوگی اس لیے وہ نہ صرف بچوں کی تربیت کے لحاظ سے خطرناک ہوگی بلکہ خاوند کے ساتھ بھی اگر وہ سچا مسلمان ہے اس کا دل نہیں مل سکے گا اور خانگی زندگی حقیقی خوشی سے محروم رہے گی۔ اس کے مقابل پر اہل کتاب کی لڑکی لینے کی اجازت دینے میں یہ مصلحت ہے کہ اول تو بین الاقوام تعلقات کی توسیع کا راستہ کھلا رہے دوسرے ایسی لڑکی اصول مذہب سے واقف ہونے کی وجہ سے ایک حد تک بچوں کی تربیت میں مدد ہو سکتی ہے اور تیسرے یہ کہ اس کے لیے خاوند کے مشفقانہ اثر کے ماتحت اسلام کی طرف کھینچ آنے کی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر بایں ہمہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن و حدیث دونوں میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اہل کتاب کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا بھی اسلام میں ایک استثنائی رنگ رکھتا ہے جس کی صرف خاص حالات کے ماتحت خاص مصالح کے پیش نظر اجازت دی گئی ہے اور عام حالات میں بہتر یہی سمجھا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح حتیٰ الوسع مسلمان عورت کے ساتھ ہو۔

**ابو العاص کے متعلق**  
**آنحضرت ﷺ کی خوشنودی**

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص بن الربیع حضرت خدیجہؓ مرحومہ کے قریبی رشتہ دار یعنی حقیقی بھانجے تھے اور باوجود مشرک ہونے کے ان کا سلوک اپنی بیوی سے بہت اچھا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد بھی میاں بیوی کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جنت سے ابو العاص کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے کہ اُس نے میری لڑکی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ ابو العاص حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں ۱۲ سنہ میں فوت ہوئے مگر ان کی زوجہ محترمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی فوت ہو گئیں۔ ان کی لڑکی امّہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھی۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں مگر اولاد سے محروم رہیں۔

**غزوہ بنو لحيان**  
**جمادی الاولیٰ ۶۲۷ء مطابق ستمبر ۶۲۷ء**

اصحاب ریح کا المناک واقعہ ۱۲ سنہ کے واقعات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس موقع پر دس بے گناہ مسلمان جو اسلام کی پُر امن تبلیغ کیلئے

بھجواتے گئے تھے نہایت بے دردی اور دھوکے کے ساتھ قتل کر دیئے گئے تھے اور اس سارے فتنہ کی تہ میں بنو لحيان کا ہاتھ تھا جو اُس زمانہ میں مکہ اور مدینہ کے درمیان وادی غران میں آباد تھے۔ طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ تھا اور چونکہ بنو لحيان کا رویہ ابھی تک اسی طرح معاندانہ اور مفسدانہ تھا اور اُن کی طرف سے آئندہ کے لیے بھی اندیشہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی مزید فتنہ انگیزی کا باعث نہ بنیں اس لیے آپ نے انتظامی لحاظ سے مناسب خیال فرمایا کہ اُن کی کسی قدر گوشمالی ہو جائے تاکہ کم از کم آئندہ کے لیے مسلمان ان کے فتنوں سے محفوظ ہو جائیں اس خیال سے آپ دو صحابہ کی جمعیت کو ساتھ لیکر ماہ جمادی الاول سنہ ۱ میں مدینہ سے نکلے یہ اور اس خیال سے کہ اس سفر کی غرض و غایت مخفی رہے تاکہ بنو لحيان خبر پا کر ہوشیار نہ ہو جائیں۔ آپ نے مدینہ سے نکل کر شروع شروع میں شمال کا رخ کیا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جنوب کی طرف گھوم گئے یہ مگر باوجود اس احتیاط کے دشمن کسی طرح خبر پا کر ہوشیار ہو چکا تھا اور پیشتر اس کے کہ آپ وادی غران میں پہنچتے بنو لحيان کے لوگ ارد گرد کی پہاڑیوں میں منتشر ہو کر غائب ہو چکے تھے یہ

آپ نے منزل مقصود پر پہنچ کر وہاں کچھ وقت قیام فرمایا اور روایت آتی ہے کہ جب اس سفر میں آپ اُس مقام پر پہنچے جہاں آپ کے صحابہ شہید کئے گئے تھے تو آپ پر سخت رقت طاری ہو گئی اور آپ نے نہایت الحاح کے ساتھ ان شہداء کے لیے دُعا مانگی یہ پھر آپ مقام عسفان کی طرف آگے بڑھے جو اس جگہ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر مکہ کی جانب واقع تھا اور اپنے اصحاب کی متفرق پارٹیاں ادھر ادھر روانہ فرمائیں جن میں سے ایک پارٹی کے امیر حضرت ابو بکرؓ بھی تھے جو مکہ کی سمت میں بھیجی گئی تھی مگر ان میں سے کسی پارٹی کو بھی لڑائی پیش نہیں آئی اور چند دن کی غیر حاضری کے بعد آپ مدینہ میں واپس تشریف لے آئے یہ

**سفر سے واپسی کی دُعا**  
اپنے اہم سفروں سے واپسی کے موقع پر عموماً پڑھا کرتے تھے۔ وہ دُعا یہ ہے :-

اَسْبُؤْنَ تَاَسْبُؤْنَ عَايِدُؤْنَ سَاَجِدُؤْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُؤْنَ  
یعنی "ہم لوگ اپنے خدا کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اُسی کی طرف ٹھکانے والے۔ اُسی کی عبادت کرنیوالے۔ اُسی کے سامنے گرنے والے اور اپنے رب کی تعریف کے گیت گانے والے۔"

۱۔ ابن ہشام وطبری حالات غزوہ بنو لحيان۔ ابن سعد نے اس غزوہ کی تاریخ ربیع الاول بیان کی ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ ابن سعد وابن ہشام۔ ۳۔ ابن ہشام۔ ۴۔ ابن سعد ۵۔ ابن ہشام وطبری وابن سعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے بعد کے سفروں میں عموماً یہ دُعا فرمایا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کے ساتھ یہ الفاظ زیادہ فرماتے تھے کہ :-

صَدَقَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَحَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ  
یعنی "ہمارے خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور دشمن کے لشکروں کو خود اپنے دم سے پسپا کر دیا"

یہ دُعا جو غزوہ بنو لحيان کے تعلق میں اہل سیر نے بیان کی ہے اور محدثین نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اپنے اندر ایک خاص کیفیت کی حامل ہے اور اس کے مطالعہ سے ان جذبات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے جو اس پُر آشوب زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہِ نفسی کے قلبِ مطہر میں موجزن تھے اور جنہیں آپ اپنے صحابہ کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دُعا میں یہ تڑپِ مخفی ہے کہ دشمن کی طرف سے جو روک مسلمانوں کی عبادت گزاری اور اسلام کی پُر امن تبلیغ کے رستے میں ڈالی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ اُسے دُور فرماتے اور جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اس روک کو دُور کیا ہے اس پر شکر گزاری کا گیت گایا گیا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے ایک نہایت دل پسند کام میں منہمک ہو اور پھر یکلخت کوئی دوسرا شخص اُس کے کام میں مغل ہو کر اُس کی توجہ کو منتشر کر دے۔ مگر کچھ وقت کے بعد خدائی فضل کے ماتحت یہ روک دُور ہو جاتے اور وہ شخص پھر اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف ہونے کا موقع پالے۔ ایسے موقع پر جو جذبات اُس شخص کے دل میں اُٹھیں گے وہی اس دُعا میں مخفی ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم اس سفر کی عارضی رخنہ اندازی سے آزاد ہو کر پھر اس کیفیت کی طرف واپس آ رہے ہیں کہ جس میں ہم اپنے خدا کی یاد میں وقت گزار سکیں گے اور اُس کی حمد کے گیت گانے کا موقع پائیں گے۔ ہاں وہی خدا جو اس سے پہلے بھی متعدد موقعوں پر ہمیں دشمن کے فتنہ سے محفوظ کر کے امن عطا کرتا رہا ہے۔ یہ جذبہ کیسا مبارک اور کیسا دلکش اور کیسا پُر امن ہے! مگر افسوس کہ پھر بھی بعض دشمنانِ اسلام اعتراض سے باز نہیں آتے اور یہی کہتے چلے جاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی اصل غرض جارحانہ فوج کشی اور دُنیا طلبی تھی۔

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

غزوہ بنو لحيان کی تاریخ کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے اسے ربیع الاول سنہ ۶ میں بیان کیا ہے مگر ابن اسحاق اور طبری نے تصریح کی ہے کہ وہ جمادی الاولیٰ سنہ ۶ میں ہوا تھا۔ میں نے اس جگہ ابن اسحاق کی پیروی کی ہے۔ واللہ اعلم۔





آنحضرت ﷺ کے متعلق توریہ کا الزام غزوہ بنو لحيان کے ذکر میں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ پردہ رکھنے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں

شمال کی طرف تشریف لے گئے تھے اور بعد میں مدینہ سے کچھ فاصلہ پر جا کر جنوب کی طرف گھوم گئے۔ اسی قسم کے واقعات بعض دوسرے غزوات کے متعلق بھی بیان ہوتے ہیں کہ دشمن سے اپنی حرکات و سکنات کو مخفی رکھنے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں سفر کا مقصد ظاہر نہیں فرمایا اور مدینہ سے نکلتے ہوئے اصل جہت کو چھوڑ کر دوسری جہت کی طرف تشریف لے گئے مگر کچھ فاصلہ پر جا کر پھر اصل جہت کی طرف گھوم گئے وغیرہ ذالک۔ اس قسم کے واقعات کی بنا پر جو عربی محاورہ کے مطابق توریہ کہلاتے ہیں بعض کوتاہ اندیش لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ نعوذ باللہ یہ افعال چالاکی اور دھوکے میں داخل ہیں جو ایک نبی کی شان سے بعید ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں ہمیں زیادہ تفصیل کیساتھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعتراضات زیادہ سمجھدار طبقہ کی طرف سے نہیں ہوتے بلکہ عموماً کم علم اور کم فہم لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ گذشتہ انبیاء اور صلحاء کے حالات سے واقف نہیں بلکہ موقع اور محل کو سمجھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور نیکی صرف اسی بات کو سمجھتے ہیں کہ انسان اول تو دنیا کی کسی بات میں حسد نہ لے اور اگر کبھی بصورت مجبوری حصہ لینا پڑے تو اس کے لیے کوئی مادی تدبیر اختیار نہ کرے اور اگر کبھی کوئی تدبیر اختیار کرنی پڑے تو وہ نہایت سادہ اور بھونڈے طریق پر کی جائے اور ہر صورت میں ہر بات بر ملا ہو اور کبھی کسی بات میں اخفا اور رازداری کا طریق اختیار نہ کیا جائے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر نیکی اسی کا نام ہے تو بے شک آنحضرت ﷺ کے بعض افعال اعتراض کا نشانہ بنتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی نیکی کی یہی تعریف ہے اور کیا اس تعریف کی رو سے دنیا کا کوئی نبی اور کوئی مصلح ایسا ہے جو ایسے اعتراضوں سے بچ سکتا ہے؟

دور نہ جاؤ حضرت شیخ ناصری کو ہی لے لو جنہیں اس زمانہ میں یورپ و امریکہ کی ترقی یافتہ اقوام عرش الوہیت پر بٹھاتے ہوئے ہیں اور ہر نیک کام کو ان کے اقوال و افعال کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ مگر کیا یہ درست نہیں کہ جب ان کے خلاف یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حکومت وقت کے خلاف تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت کو خراج نہ دو اور اس طرح انہیں حکومت کی نظروں میں معتبوب کرنا چاہا تو انہوں نے صاف اور سیدھا جواب دینے کی بجائے ایک رائج الوقت سکہ منگایا اور اس پر قیصر روم کی تصویر دیکھ کر کہا کہ یہ تو قیصر کی تصویر ہے۔ تو پھر جو قیصر کی چیز ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کی چیز ہے وہ خدا کو دو۔ اور اس طرح ایک غیر حقیقی سا جواب دیکر بات کو ٹال دیا۔ اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی کتب

لے یہ نام لحيان اور لحيان دونوں طرح آتا ہے۔

لے نو تا باب آیت ۲۶ تا ۲۹ وتی باب آیت ۲۵ تا ۲۸ وقرس باب ۱۲ آیت ۱۳ تا ۱۷



میں ذکر آتا ہے کہ شری کرشن جی ہماراج (جو ہندوؤں کے سب سے بڑے اوتار گذرے ہیں) اور ان کے بعض مقدس ساتھی ایک راجہ کو قتل کرنے کی غرض سے بھیس بدل کر اس کے قلعہ میں داخل ہوئے اور ایک انتہائی غرض کے حصول کے لیے اپنی اصل شناخت کو چھپایا اور لوگوں کے خیال کو غلط رستے پر ڈال دیا۔ اسی طرح سکھوں کی کتب میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب شاہی فوج نے گورو گوبند جی کا محاصرہ کر لیا جو سکھوں کے ایک نہایت نامور اور ممتاز گورو گذرے ہیں تو انہوں نے اپنے ایک ہم شکل شخص کو اپنا لباس پہنا کر اُسے اپنی جگہ بٹھا دیا اور خود اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ مسلمان حاجیوں کا لباس پہن کر حملہ آوروں کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے نکل گئے۔ اگر یہ مذہبی پیشوا باوجود اپنے اس قسم کے افعال کے پاک اور مقدس شمار ہو سکتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک بالکل جائز جنگی تدبیر اختیار کرنے کی وجہ سے کس طرح اعتراض ہو سکتا ہے؟

حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں اکثر لوگوں کے دلوں میں نیکی اور صداقت کا ایک نہایت ہی غلط مفہوم قائم ہو گیا ہے حالانکہ حقیقی نیکی یہ نہیں کہ انسان عقل و خرد سے عاری ہو کر بیوقوفی کی حرکات کرے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا بیج بولے بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان اگر ایک طرف جھوٹ اور غداری سے بچے اور کوئی کام صداقت اور دیانتداری کے خلاف نہ کرے تو دوسری طرف پوری پوری ہوشیاری کے ساتھ اور ہر پہلو سے چوکس رہتے ہوئے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے دینی اور دنیوی ترقیات کے راستے کھولے اگر ایک شخص ہوشیار اور چوکس ہے مگر جھوٹ اور غداری سے پرہیز نہیں کرتا اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ یقیناً نیک کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص صداقت اور وفاداری کو تو اختیار کرتا ہے مگر اپنے کاموں میں عقل و خرد اور ہوشیاری اور بیدار مغزی نہیں دکھاتا تو اُسے بھی ہرگز اعلیٰ درجہ کا نیک نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ نیکی کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ انسان کا خدا کے ساتھ تعلق ہو اور اگر خدا کا تعلق جو ساری دانیوں کا سرچشمہ ہے انسان کے اندر عقل و خرد پیدا نہیں کر سکتا تو اور کونسی چیز پیدا کرے گی اور یقیناً اس صورت میں یہ خدا کا حقیقی تعلق نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی لیے اسلام نے نیکی کی تعریف میں کسی خاص فعل کو داخل نہیں کیا بلکہ اصل نیکی دل کے تقویٰ کو قرار دیا ہے اور صرف اُسی فعل کو نیک شمار کیا ہے جو دل کے تقویٰ کے ساتھ خدا کی رضا اور مخلوق کی بہتری کو مد نظر رکھتے ہوئے حالات پیش آمدہ کے مطابق اختیار کیا جائے۔ مثلاً اگر دوستوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال ہو تو اُس کے مناسب حال اعلیٰ اخلاق دکھاتے جائیں۔ دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال ہو تو اُس کے مطابق اچھے اخلاق ظاہر کئے جائیں۔ امن کا ماحول ہو تو اُس کے مطابق بہتر سے بہتر اخلاق کا اظہار کیا جاتے اور جنگ کا موقع ہو تو اُس کے مناسب حال اعلیٰ اخلاق دکھائے جائیں۔ غرض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور مخلوق خدا کی بہتری کو مد نظر رکھتے

ہوتے جو بھی اعلیٰ اور کامل اخلاق دل کے تقویٰ کے ساتھ اختیار کئے جائیں وہی نیکی ہے اور اسلام نے ہر موقع اور ہر ماحول کے مناسب حال علیحدہ علیحدہ اخلاق کی تعیین فرمادی ہے اور یہی وہ صحیح تعریف ہے جو نیکی کی قرار دی جاسکتی ہے اور اسلام کے لیے یہ جائے فخر ہے کہ اس کے مقدس بانی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دنیا میں نیکی کی صحیح تعریف قائم کی ہے اور وہی وہ بزرگ ہستی ہے جس نے ہر میدان میں اعلیٰ ترین اخلاق کا اظہار کیا ہے اور اعتراض کرنے والے محض جہالت اور کوتاہ بینی سے اعتراض کرتے ہیں۔

جنگ میں اپنی نقل و حرکت کو دشمن سے چھپانا یا کامیاب نتائج پیدا کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا نہ صرف ایک بالکل جائز فعل ہے بلکہ فنون جنگ کے لحاظ سے نہایت ضروری اور واجب ہے اور اگر کوئی جرنیل ایسی تدابیر اختیار نہیں کرتا تو وہ اعلیٰ اخلاق کا مالک تو پھر بھی نہیں کہلا سکتا مگر یقیناً وہ پرلے درجہ کا بے وقوف جرنیل ضرور سمجھا جائے گا جسے بالکل ابتدائی اور اصولی تدابیر جنگ کا بھی علم نہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی تدابیر اختیار نہ فرماتے اور جنگوں میں غنی رکھنے والی تدابیر کو کھلے بندوں کرتے تو پھر یہی مقررہ لوگ آپ پر یہ اعتراض کرتے کہ آپ فنون جنگ سے بالکل بے بہرہ اور حسن تدبیر کی صفت سے بالکل محروم تھے۔ یہ ایک قیاس ہی نہیں بلکہ بعض غیر مسلم مورخین نے بعض اسلامی مہموں کی ظاہری ناکامی پر واقعی اس قسم کے اعتراضات کئے ہیں کہ بعض موقعوں پر مسلمانوں کا ایسی حالت میں دشمن کی قیام گاہ تک پہنچنا کہ وہ ان کی خبر پا کر پیٹے سے منتشر ہو چکا ہوتا تھا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی ہمتوں میں سوتے تدبیر سے کام لیا جاتا تھا۔ حالانکہ کبھی کسی مہم میں ایسا ہو جانا سوتے تدبیر کی علامت نہیں بلکہ صرف اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دشمن بھی اپنی جگہ ہوشیار اور چوکس تھا اور باوجود مسلمانوں کی ہوشیاری اور بیدار مغزی کے وہ کبھی کبھی شرارت کر کے اپنی شرارت کی مزا سے بچ جاتا تھا۔ مگر پھر بھی مجموعی نتیجہ ہر حال اسلام کے حق میں پیدا ہو رہا تھا۔ مخالفین اسلام کی یہ ذہنیت اس بات کے سوا کچھ ثابت نہیں کرتی کہ انہوں نے ہر حال میں اعتراض کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یعنی مسلمان اگر بیدار مغزی اور حسن تدبیر کا اظہار کریں تو تب یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام ہوشیاری اور چالاکی کی تعلیم دیتا ہے اور اگر وہ کبھی دشمن کی ہوشیاری اور چالاکی کا نشانہ بن جائیں تو تب یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام میں بیدار مغزی اور حسن تدبیر کا فقدان تھا۔ اس ذہنیت کا علاج سوائے خدا کے اور کسی کے پاس نہیں۔ مگر یہ ایک شکر کی بات ہے کہ اس قسم کے جابلانہ اعتراض صرف بے وقوف اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اور سمجھدار لوگ اس بات کو جانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ سچا مذہب روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کو بھی تیز کرتا ہے اور یہ کہ اسلام کا مقدس بانی صداقت اور دیانت کے ساتھ ساتھ حسن تدبیر کا بھی مجسمہ تھا۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلِّمْ۔

خلاصہ کلام یہ کہ جنگ میں اپنی حرکات و سکنات کو چھپا کر یا اسی قسم کی اور مناسب احتیاطی تدابیر

اختیار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً کسی ناجائز یا خلاف اخلاق بات کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ حتیٰ یہ ہے کہ یہ مذاہیر آپ کی دوراندیشی اور بیدار مغزئی کی دلیل ہیں اور جو شخص ان باتوں پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ خود اپنی جہالت کا ثبوت دیتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تور یہ (یعنی پردہ رکھنا) اور کذب بیانی (یعنی جھوٹ بولنا) میں زمین آسمان کا فرق ہے اور کوئی عقلمند ان دونوں کو ایک نہیں قرار دے سکتا۔ تور یہ کے معنی چھپانے کے ہیں یعنی ایسے رنگ میں بات کرنا کہ مصلحت وقت کے ماتحت کسی بات کو پردہ میں رکھا جاتے تاکہ فتنہ کی صورت پیدا نہ ہو۔ لیکن کذب کے معنی خلاف واقعہ بات بیان کرنے اور جھوٹ بولنے کے ہیں اور ان دونوں مفہوموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں سینکڑوں باتوں کو چھپاتا ہے۔ کسی کو شرم و حجاب کی وجہ سے اور کسی کو فتنہ کی روک تھام کی بنا پر اور کسی کو اور کسی جائز غرض کے ماتحت۔ لیکن آج تک کسی عقلمند نے اس طریق پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اسے ایک بہت اچھا خلق سمجھا جاتا ہے مگر کذب بیانی اور دروغ گوئی بالکل اور چیز ہے جو ہر شریف انسان کے نزدیک ایک مکروہ اور ناجائز فعل ہے اور اسلام نے تو اسے نہایت سختی سے روکا اور حرام قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ اُس وقت آپ ایک مجلس میں تکیہ لگاتے بیٹھے تھے۔ آپ نے پہلے شرک اور والدین کی نافرمانی کا ذکر فرمایا اور پھر بڑے جوش کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے کہ:-

الْاَوْقُولَ الزُّوْرَ - الْاَوْقُولَ الزُّوْرَ

یعنی "کان کھول کر سُن لو! ہاں پھر کان کھول کر سُن لو کہ ان کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹ بولنا ہے۔"

راوی کہتا ہے کہ آپ نے یہ الفاظ اس جوش کے ساتھ بار بار دہرائے کہ ہم نے آپ کی تکلیف کا خیال کر کے دل میں کہا کہ کاش آپ اب خاموش ہو جاتیں اور اس نصیحت کے دہرانے میں اتنی تکلیف نہ اٹھاتیں۔

غزوہ بنو لحيان کے کچھ عرصہ بعد جمادی الآخرۃ ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی کمان میں پندرہ صحابیوں کا ایک دستہ طرف کی جانب روانہ فرمایا جو مدینہ سے چھتیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور اس جگہ ان ایام میں بنو ثعلبہ کے لوگ

سریرہ زید بن حارثہ  
بہ جانب طرف جمادی الآخرۃ ۳ھ

آباد تھے۔ مگر قبل اس کے کہ زید بن حارثہ وہاں پہنچتے اس قبیلہ کے لوگ بروقت خبر پا کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور زید اور اُن کے ساتھی چند دن کی غیر حاضری کے بعد مدینہ میں واپس لوٹ آئے۔ اس سریر میں مسلمانوں کا جنگی شعار اَمِث اَمِث تھا۔

سریرہ زید لطف حشمی  
جمادی الآخرۃ ۶ سنہ

اسی ماہ جمادی الآخرۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو پانچ سو مسلمانوں کے ساتھ حشمی کی طرف روانہ فرمایا جو مدینہ کے شمال کی طرف بنو جذام کا مسکن تھا۔ اس مہم کی غرض یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی جن کا نام دحیہ کلبی تھا شام کی طرف سے قیصر روم کو مل کر واپس آ رہے تھے۔ اور اُن کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا جو کچھ نو قیصر کی طرف سے خلعت وغیرہ کی صورت میں تھا اور کچھ تجارتی سامان تھا۔ جب دحیہ بنو جذام کے علاقہ کے پاس سے گزرے تو اس قبیلہ کے رئیس بنید بن عارض نے اپنے قبیلہ میں سے ایک پارٹی کو اپنے ساتھ لیکر دحیہ پر حملہ کر دیا اور سارا سامان چھین لیا حتیٰ کہ دحیہ کے جسم پر بھی سوائے پھٹے ہوئے کپڑوں کے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ جب اس حملہ کا علم قبیلہ بنو ضبیہ کو ہوا جو قبیلہ بنو جذام ہی کی ایک شاخ تھے اور ان میں سے بعض لوگ مسلمان ہو چکے تھے تو انہوں نے بنو جذام کی اس پارٹی کا پیچھا کر کے اُن سے لوٹا ہوا سامان واپس چھین لیا اور دحیہ اس سامان کو لیکر مدینہ میں واپس پہنچے۔ یہاں آکر دحیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے حالات سے اطلاع دی جس پر آپ نے زید بن حارثہ کو روانہ فرمایا اور دحیہ کو بھی زید کے ساتھ بھجوا دیا۔

زید کا دستہ بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دن کو چھپتا ہوا اور رات کے وقت سفر کرتا ہوا حشمی کی طرف بڑھا اور عین صبح کے وقت بنو جذام کے لوگوں کو جا دیا۔ بنو جذام نے مقابلہ کیا مگر مسلمانوں کے اچانک حملہ کے سامنے اُن کے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے سے مقابلہ کے بعد وہ بھاگ نکلے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور زید بن حارثہ بہت سا سامان اور مال مولیٰ اور ایک سو کے قریب قیدی پکڑ کر واپس لوٹ آئے۔

مگر ابھی زید مدینہ میں پہنچے نہیں تھے کہ قبیلہ بنو ضبیہ کے لوگوں کو جو قبیلہ بنو جذام کی شاخ تھے زید کی اس مہم کی خبر پہنچ گئی اور وہ اپنے رئیس رفاعد بن زید کی معیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہماری بقیہ قوم کے لیے امن کی تحریر ہو چکی ہے تو پھر ہمارے قبیلہ کو اس حملہ میں کیوں شامل کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ درست ہے

لے لے ابن سعد۔ لے ابن اسحاق بحوالہ زرقانی حالات سریرہ حشمی۔ لے زرقانی۔

لے وہی دحیہ کلبی ہیں جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے جبریل ان کی شکل میں نظر آئے تھے۔



مگر زید کو اس کا علم نہیں تھا اور پھر جو لوگ اس موقع پر مارے گئے تھے اُن کے متعلق آپ نے بار بار افسوس کا اظہار کیا۔ اس پر رفاعہ کے ساتھی ابو زید نے کہا یا رسول اللہ! جو لوگ مارے گئے ہیں اُن کے متعلق ہمارا کوئی مطالبہ نہیں یہ ایک غلط فہمی کا حادثہ تھا جو ہو گیا۔ مگر جو لوگ زندہ ہیں اور جو ساز و سامان زید نے ہمارے قبیلہ سے پکڑا ہے وہ ہمیں واپس مل جانا چاہیے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ بالکل درست ہے اور آپ نے فوراً حضرت علیؓ کو زید کی طرف روانہ فرمایا اور بطور نشانی کے انہیں اپنی تلوار عنایت فرمائی اور زید کو کھلا بھیجا کہ اس قبیلہ کے جو قیدی اور اموال پکڑے گئے ہیں وہ چھوڑ دیتے جائیں۔ زید نے حکم پاتے ہی فوراً سارے قیدیوں کو چھوڑ دیا اور غنیمت کا مال بھی واپس لوٹا دیا۔

اس سر یہ کی تاریخ کے متعلق ایک اشکال ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔ ابن سعد اور اس کی اتباع میں دیگر اہل سیر نے اس سر یہ کی تاریخ جمادی الآخرة سنہ ۳۸ھ لکھی ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں تصریح کی ہے کہ یہ سر یہ ۳۸ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد ہوا تھا اور غالباً ابن قیم کے قول کی بنیاد یہ ہے کہ اس سر یہ کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دحیہ کلبی قیسر سے مل کر مدینہ کو واپس آ رہے تھے کہ انہیں راستہ میں بنو جذام نے لوٹ لیا اور یہ مسلم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو قیسر کی طرف خط و بکر صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا یا تھا اس لیے یہ واقعہ کسی صورت میں حدیبیہ سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل اپنی ذات میں بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کی روشنی میں ابن سعد کی روایت یقیناً قابل رد قرار پاتی ہے مگر خاکسار کی رائے میں ایک توجہ یہ ایسی ہے جسے علامہ ابن قیم نے نظر انداز کر دیا ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے کہ قیسر کی ملاقات کے لیے دحیہ شام میں دو دفعہ گئے ہوں۔ یعنی پہلی دفعہ وہ صلح حدیبیہ سے قبل از خود تجارتی غرض کے لیے گئے ہوں اور قیسر سے بھی ملے ہوں۔ اور دوسری دفعہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لیکر گئے ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قیسر کی طرف پیغامبر بننے کے لیے اسی غرض سے چنا ہو کہ وہ پہلے قیسر سے مل چکے ہیں۔ اس توجہ کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ اس سفر میں دحیہ کے پاس تجارتی سامان تھا اور صلح حدیبیہ کے بعد والے سفر میں بظاہر تجارتی سامان کا تعلق نظر نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دحیہ کا یہ سفر محض تجارتی غرض سے ہو اور ابن سعد کے راوی نے اس کے دوسرے سفر کے ساتھ اس سفر کو خلط کر کے قیسر کی ملاقات اور خلعت کے ذکر کو قیاساً شامل کر لیا ہو۔ واللہ اعلم۔

سر یہی کے قریباً ایک ماہ بعد  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

سر یہ زید بن حارثہ بطرف وادی القریٰ رجب ۳۸ھ



پھر زید بن حارثہ کو وادی القریٰ کی طرف روانہ فرمایا۔ جب زید کا دستہ وادی القریٰ میں پہنچا تو بنو فزارہ کے لوگ ان کے مقابلہ کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ اس معرکہ میں متعدد مسلمان شہید ہوئے اور خود زید کو بھی سخت زخم آئے مگر خدا نے اپنے فضل سے بچا لیا۔

وادی القریٰ جس کا اس سریر میں ذکر ہوا ہے وہ مدینہ سے شمال کی طرف شامی راستہ پر ایک آباد وادی تھی جس میں بہت سی بستیاں آباد تھیں اور اسی واسطے اس کا نام وادی القریٰ پڑ گیا تھا۔ یعنی بستیوں والی وادی۔ اور ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس وادی میں بعض یہودی قبائل بھی آباد تھے جو خیر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مفتوح ہوئے۔

زید بن حارثہ کی امارت پر لوگوں کا  
اعتراض اور آنحضرت ﷺ کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا اور ان کی وفات تک جو شہنہ ہجری میں غزوہ موتہ میں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں متعدد مہموں کا امیر مقرر فرمایا اور بڑے بڑے صحابہ کو ان کی ماتحتی میں رکھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اسامہ سے بھی آپ کو خاص محبت تھی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کو خیال تھا کہ اسامہ جس بے تکلفی اور آزادی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کر لیتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ اسامہ کو بھی آپ نے متعدد مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور بعض بڑے بڑے صحابہ کو ان کی ماتحتی میں رکھا اور جب اس پر بعض نو آموز مسلمانوں نے اسامہ کے نسب کی وجہ سے اعتراض کیا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا تم اسامہ سے پہلے زید کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو مگر اسلام میں صرف ذاتی اہلیت دیکھی جاتی ہے۔ اور خدا کی قسم جس طرح زید امارت کا اہل تھا اسی طرح اس کا بیٹا اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور مجھے یہ دونوں نہایت درجہ محبوب ہیں۔ اس ارشاد نبوی پر جو اسلام کی حقیقی مساوات کا حامل تھا صحابہ کی گردنیں جھک گئیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اسلام میں کسی شخص کا غلام یا غلام زادہ ہونا یا بظاہر کسی ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنا اس کی ترقی کے رستہ میں حارج نہیں ہو سکتا۔ اور اصل معیار ہر صورت تقویٰ اللہ اور ذاتی قابلیت پر مبنی ہے۔



# مساواتِ اسلامی پر ایک مختصر نوٹ

اس جگہ ایک مختصر سا نوٹ اسلامی مساوات کے متعلق سپرد قلم کرنا بے موقع نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کے متعلق اکثر لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے یعنی جہاں ایک طبقہ نے اسلامی مساوات کے یہ معنی سمجھ رکھے ہیں کہ اسلام میں سب چھوٹے بڑے ہر جہت سے برابر ہیں اور اسلام کسی صورت میں کسی شخص کے امتیاز یا بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا اور تمام امتیازات کو مٹا کر ہر شخص کو ہر لحاظ سے ایک لیول پر کھڑا کرنا چاہتا ہے وہاں ایک دوسرے طبقہ نے اسلام میں بھی اسی رنگ کے ناگوار طبقے بنا رکھے ہیں جو اکثر دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں اور ان طبقات کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دے دئے گئے ہیں۔ بلکہ ان طبقات کے اندر کی خلیج کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سو جاننا چاہیے کہ صحیح اسلامی تعلیم کی رو سے یہ دونوں خیالات افراط و تفریط کے طریق پر غلط اور نادرست ہیں بلکہ اصل اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک حقوق اور ذرائع ترقی کے حصول کا سوال ہے سب لوگ برابر ہیں اور کسی فرد یا کسی جماعت کو کسی دوسرے فرد یا کسی دوسری جماعت پر کسی رنگ میں فضیلت حاصل نہیں اور اس جہت سے اسلام میں قطعاً کوئی درجے یا طبقے پائے نہیں جاتے بلکہ پوری پوری مساوات ہے، لیکن دوسری طرف اگر کوئی شخص کسی جائز وجہ سے کوئی دینی یا دنیوی ترقی اور بڑائی حاصل کر لیتا ہے تو حقوق کے معاملہ کو الگ رکھتے ہوئے جس میں ہر حال سب برابر ہیں اسلام عام تعلقات میں ایسے شخص کی حاصل شدہ بڑائی اور ترقی کو تسلیم کرتا ہے اور اُسے اُس کے جائز مرتبہ سے گرا کر غلام اور حق تلفی کے طریق کو اختیار نہیں کرتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں ایک طرف اسلام نے سب بنی نوع آدم کو حقوق اور ذرائع ترقی کے حصول کے معاملہ میں ایک لیول یعنی ایک سطح پر کھڑا کیا ہے اور کسی ناو واجب نسل اور قومی یا خاندانی یا انفرادی امتیاز کو تسلیم نہیں کیا وہاں افراد اور قوموں کی حاصل شدہ بڑائی اور ترقی کو جبر و تشدد کے رنگ میں مٹایا بھی نہیں اور انہیں ان کی محنت یا خوش بختی کے ثمرہ سے محروم نہیں کیا البتہ اس صورت میں گھرے ہوتے لوگوں کو اٹھانے کے لیے موثر تدابیر ضرور اختیار کی ہیں اور یہی وہ اعلیٰ اور وسطی طریق ہے جسے نظر انداز کر کے دنیا آج کل مختلف قسم کے فتنوں کا شکار بن رہی ہے اور اس زمانہ کی سرمایہ داری اور اشتراکیت انہی فتنوں سے پیدا شدہ انتہائیں ہیں جن میں سے ایک میں افراط کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور دوسری میں تفریط کی۔

اسلامی مساوات کے فلسفہ کا پنجوڑ اور خلاصہ چند قرآنی آیات اور چند احادیثِ نبویؐ میں آجاتا ہے۔ قرآن شریف

اسلامی مساوات کا اصولی نظریہ

میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ لَهُ

یعنی "اے لوگو! تم آپس کے معاملات میں خدا کا تقویٰ اختیار کیا کرو اور اسی سے ڈرتے رہو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس ایک جان سے اُس نے اُس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے اُس نے دُنیا میں کثیر التعداد مرد اور عورت پھیلادئے۔"

اس قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اُس ابدی حقیقت کی طرف توجہ دلا کر کہ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں دُنیا میں صحیح مساوات کی بنیاد قائم کر دی ہے اور اس اصول کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ خواہ بعد کے حالات کے نتیجے میں مختلف انسانوں اور مختلف قوموں اور مختلف طبقات میں کتنا ہی فرق پیدا ہو جائے انہیں آپس کے معاملات میں اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بہر حال اپنی اصل کے لحاظ سے وہ ایک ہی باپ کی نسل ہیں۔ کیا اگر ایک باپ کے بیٹوں میں سے بعض بچے دوسروں کی نسبت زیادہ دولت یا زیادہ طاقت یا زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیں اور دوسرے ان باتوں میں نسبتاً پس ماندہ رہیں تو وہ اس فرق کی وجہ سے بھائی بھائی نہیں رہتے اور کوئی غیر چیز بن جاتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ۚ..... يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَلَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ ۚ..... يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۚ

یعنی "سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔۔۔۔۔۔ سوائے مسلمانوں! ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر ہنسی اُڑاتے اور اُسے ذلیل خیال کرے کیونکہ جب سب لوگ اپنی اصل کے لحاظ سے برابر ہیں اور سب کے لیے ترقی کے رستے یکساں کھلے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ فریق جس پر تم آج ہنسی اُڑاتے ہو کل کو تم سے آگے نکل جائے یا



یعنی "اے مسلمانو! خدا تعالیٰ نے ایمان کے ذریعہ تم میں سے زمانہ جاہلیت کے بیجا کبر و غرور اور آبا و اجداد کی وجہ سے بے جا تفاخر کرنے کی مرض کو دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اسلامی پیمانہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص خدا کو ماننے والا اور نیک عمل بجالانے والا ہوتا ہے اور دوسرا بد عمل ہوتا ہے اور اچھے اوصاف سے محروم۔ اور یاد رکھو کہ سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔"

پھر فرماتے ہیں:-

النَّاسُ مَعَادُونَ - خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فُقِهُوا إِلَيْهِ

یعنی دنیا میں لوگ بھی معدنیات کی طرح ہیں۔ جو ایک ہی قسم کے عناصر ہوتے ہوتے اور ایک ہی قسم کی مٹی کے نیچے دبے ہوئے آہستہ آہستہ مختلف رنگ اور مختلف اوصاف اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر سن لو کہ ترقی اور بڑائی کی جو معروف علامتیں اسلام سے پہلے بھی جاتی تھیں۔ (یعنی عقل و دانش۔ سخاوت و شجاعت۔ طاقت و اثر وغیرہ) وہی اب بھی قائم ہیں۔ اور جو لوگ ان اوصاف کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بڑے سمجھے جاتے تھے وہ اب اسلام میں بھی بڑے سمجھے جائینگے (کیونکہ اسلام کسی شخص کی حاصل شدہ بڑائی کو چھینتا نہیں) مگر شرط یہ ہے کہ وہ علم دین اور ذاتی نیکی اختیار کر لیں۔"

اوپر کے حوالوں سے جو اسلامی مساوات کے نظریہ کے متعلق اصولی رنگ رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

۱۔ یہ کہ اپنی اصل کے لحاظ سے سب لوگ ایک باپ کی نسل اور ایک درخت کی شاخیں ہیں اور کسی فرد کو دوسرے فرد پر اور کسی قوم کو دوسری قوم پر محض نسلی فرق کی بنا پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔  
۲۔ یہ کہ مسلمان ایک نبی کی امت اور ایک ایمان کے حامل ہونے کی وجہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

۳۔ یہ کہ زمین کے اندر کی معدنیات کی طرح مختلف قومیں اور مختلف افراد ایک دوسرے سے مختلف اوصاف اختیار کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں مگر ان کی وجہ سے کسی فرد کو دوسرے فرد پر اور کسی قوم کو دوسری قوم پر بڑائی اور فخر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

۴۔ یہ کہ اسلام سے قبل جو اوصاف حمیدہ قومی یا انفرادی بڑائی کی بنیاد سمجھے جاتے تھے مثلاً عقل و دانش۔ سخاوت و شجاعت۔ طاقت و اثر وغیرہ وہ اسلام میں بھی بدستور قائم ہیں مگر اسلام نے ان پر



اس شرط کا اضافہ کر دیا ہے کہ عام معروف اوصاف کے علاوہ دینداری کا وصف پایا جانا بھی ضروری ہے۔  
۵۔ یہ کہ اسلام نے سب سے بڑا وصف دینداری اور تقویٰ اللہ کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ وصف خدا نے  
اسلام کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور جو شخص اس وصف میں ممتاز ہوگا وہی دوسروں پر ممتاز سمجھا  
جائے گا۔

عام تعلقات میں مراتب کو ملحوظ رکھنے کی تلقین  
اسلامی مساوات کے متعلق یہ بنیادی نظریہ بیان کرنے  
کے بعد اسلام اس سوال کو لیتا ہے کہ جب اصل کے لحاظ  
سے ایک ہونے کے باوجود مختلف لوگوں کے حالات اور  
اوصاف مختلف ہو سکتے ہیں تو اس ناگزیر اختلاف کی موجودگی میں مختلف مدارج کے لوگوں کے  
متعلق عام تمدنی معاملات میں کیا رویہ ہونا چاہیے۔ سو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
فرماتے ہیں:-

أَنْزَلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ

یعنی "اے مسلمانو! تمہارے لیے ضروری ہے کہ آپس کے معاملات میں لوگوں کے  
معروف مرتبوں کا خیال رکھا کرو اور ان کے حالات اور درجہ کے مطابق ان کے ساتھ  
معاملہ کیا کرو۔"

اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ کسی دینی یا دنیوی بناء پر کوئی رتبہ یا بڑائی حاصل کر لیں تو عام  
معاملات میں ان کے مرتبہ کا خیال رکھنا اور ان کے ساتھ واجبی احترام سے پیش آنا اسلامی اخلاق کا حصہ  
ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بات ہے کہ جب یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے فیصلہ کے  
لیے سعد بن معاذ انصاری قبیلہ اوس کے رئیس موقع پر تشریف لے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے  
انہیں آنا دیکھ کر صحابہ سے فرمایا:-

قُومُوا اِلٰی سَيِّدِكُمْ

یعنی "اپنے رئیس کے اکرام اور احترام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔"

اسی طرح قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو پیغام رسالت دیکر  
فرعون کی طرف بھیجا تو حضرت موسیٰ کو تاکید فرمائی کہ (چونکہ فرعون کو اس وقت ملک میں رتبہ حاصل ہے  
اس لیے) اُس کے ساتھ نرمی اور ادب کے طریق پر بات کرنا۔

عدالتی امور میں مکمل مساوات  
لیکن اس کے مقابل پر عدالتی اور قضائی حقوق کے متعلق  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور کن شاندار الفاظ

میں فرماتے ہیں کہ:-

إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكَ أَنَّهُمْ كَانُوا يُقِيمُونَ الْحَدَّ  
عَلَى الْوَضِيعِ وَيَتْرَكُونَ الشَّرِيفَ - وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ  
فَاطِمَةَ فَعَلَتْ ذَلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا لِه

یعنی ”تم سے پہلے اس بات نے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جب ان میں سے کوئی  
چھوٹا آدمی جرم کرتا تھا تو وہ اُسے سزا دیتے تھے اور جب کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تھا تو  
وہ اُسے چھوڑ دیتے تھے۔ سو اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ مجھے اُس پاک ذات کی قسم ہے  
جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر میری لڑکی فاطمہ بھی چوری کر لگی تو میں اسلامی طریق  
پر اُس کے بھی ہاتھ کاٹوں گا۔“

اللہ! اللہ! کیسے زور دار الفاظ ہیں اور کس جلال کے ساتھ اسلامی مساوات کو قائم کیا گیا ہے! اور  
یہ تعلیم وہ تھی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے بھی بڑی سختی کے ساتھ مد نظر رکھا۔ چنانچہ  
حضرت ابوبکر خلیفہ اول رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے سب سے پہلے خطبہ میں فرماتے ہیں:-

الضَّعِيفُ فَبِكُمْ قَوِيٌّ عِنْدِي حَتَّىٰ أَرْيَحَ عَلَيْهِ حَقَّهُ إِنْ شَاءَ اللَّهُ  
وَالْقَوِيُّ فَبِكُمْ ضَعِيفٌ عِنْدِي حَتَّىٰ أَخْذَ الْحَقَّ مِنْهُ يَه

یعنی ”اے مسلمانو! سن لو کہ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے لیے اُس وقت تک قوی  
ہو گا جب تک کہ میں اُسے اُس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے  
لیے اُس وقت تک کمزور ہو گا جب تک کہ میں اُس سے وہ حق جو اُس نے کسی اور کا  
دبایا ہوا ہو واپس نہ لے لوں۔“

اسی طرح حضرت عمر خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ شمالی عرب کے  
ایک بڑے رئیس جب بن ابیہ نامی نے جو مسلمان ہو چکا تھا کسی غریب مسلمان کو غصہ میں آکر تھپڑ مار دیا۔  
جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپؓ نے جبکہ کو بلا کر فرمایا۔ جبکہ! میں سُننا ہوں کہ تم نے  
ایک غریب مسلمان کو تھپڑ مارا ہے۔ اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو خدا کی قسم تم سے اس کا بدلہ لیا جائیگا۔  
اس پر جبکہ جس میں غالباً ابھی تک جاہلیت والے تکبر کی رگ باقی تھی مغرور ہو کر مرتد ہو گیا۔

عدالتی حقوق کے سوال کے بعد عسدوں اور  
ذمہ داروں کی تقسیم کا سوال آتا ہے اور ایک

ملکی عہدوں کی تقسیم میں مکمل مساوات

لحاظ سے یہ سوال سب سے زیادہ اہم ہے سو اس کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے :-  
 إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ  
 بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ

یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ قومی اور ملکی عہدوں کی تقسیم کے معاملہ میں جو خدا کے نزدیک ایک مقدس امانت کا رنگ رکھتے ہیں صرف ذاتی قابلیت اور ذاتی اہلیت کو دیکھا کرو۔ اور جو شخص بھی اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے کسی عہدہ کا اہل ہو اُسے وہ عہدہ سپرد کیا کرو خواہ وہ کوئی ہو۔ اور پھر اے مسلمانو! جب تم کسی عہدہ یا ذمہ داری کے کام پر مقرر کئے جاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ لوگوں میں کامل عدل و انصاف کا معاملہ کرو۔

یہ تین تعلیم ہمیشہ اسلامی حکومتوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں بعض بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگ ترقی کر کے عروج کے کمال تک پہنچے ہیں چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جو ایک آزاد شدہ غلام تھے کئی فوجی دستوں کا امیر مقرر فرمایا۔ اور پھر زید کی وفات کے بعد آپ نے اُن کے نوجوان فرزند اسامہ بن زید کو بھی ایک بڑی فوج کا امیر مقرر فرمایا جس میں بعض بڑے بڑے صحابہ شامل تھے جو قدیم دستور کے مطابق گویا عرب سوسائٹی میں پہاڑ کی طرح سمجھے جاتے تھے اور جب اس پر بعض ناسمجھ نو مسلموں میں چہ میگوئی ہوتی کہ ایک نوجوان غلام زادہ کو ایسے ایسے معزز اور جلیل القدر لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غصہ کیا تھا فرمایا کہ :-

إِنْ تَطْعَمُونِي أَمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَمُونَنِي فِي أَمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ  
 وَأَيُّكُمْ اللَّهُ إِنْ كَانَ لَخَلِيقًا لِلْأَمَارَةِ وَإِنْ كَانَ لَيَمُنُّ أَحَبُّ النَّاسِ إِلَيَّ  
 وَإِنْ هَذَا لَيَمُنُّ أَحَبُّ النَّاسِ إِلَيَّ بَعْدَكَ ۖ

یعنی تم اسامہ کی امارت پر نکتہ چینی کرتے ہو اور اس سے قبل تم اس کے باپ زید پر بھی نکتہ چینی کر چکے ہو۔ خدا کی قسم جس طرح اس کا باپ امارت کا اہل تھا اور مجھے بہت محبوب تھا اسی طرح اس کے بعد اسامہ بھی امارت کا اہل ہے اور مجھے بہت محبوب ہے۔

یہ اسی مبارک تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام میں ہمیشہ بظاہر ادنیٰ ترین لوگوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی حاصل کی اور کبھی کسی شخص کی غربت یا نسلی پستی اُس کی ترقی میں روک نہیں بنی۔ چنانچہ اس کی مزید مثالیں دیکھنی ہوں تو اس کتاب کے حصہ دوم کا وہ باب ملاحظہ کیا جاتے جو غلامی کی بحث سے تعلق رکھتا ہے۔

سوشل اجتماعوں میں برادرانہ اختلاط  
اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ عہدوں اور ذمہ داری کے کاموں کے متعلق تو بے شک اسلام نے حقیقی

مساوات کی تعلیم دی ہے اور سب کے لیے ترقی کا ایک جیسا راستہ کھول دیا ہے مگر ہو سکتا ہے کہ اس انتظامی مساوات کے باوجود تمدنی معاملات اور آپس کے میل ملاقات کے بارے میں مختلف قسم کے لوگوں میں خلیج باقی رہے اور اسلام نے اس خلیج کو دور نہ کیا ہو۔ سو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس رخنہ کو بھی بڑی سختی کے ساتھ بند کیا ہے۔ چنانچہ اس قرآنی ارشاد کے علاوہ جو اوپر گزر چکا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں بھائیوں کی طرح مل کر رہنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمدنی تعلقات کے سب سے بڑے ذریعہ اور سب سے بڑے میدان یعنی آپس کی دعوتوں اور کھانے پینے کی ملاقاتوں وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيْمَةِ يُدْعَى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ  
وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ

یعنی ”سب سے بُری اور سب سے زیادہ قابل نفرت دعوت وہ دعوت ہے جس میں صرف امیر بلاتے جائیں اور غریبوں کو نہ بلایا جاتے اور جو شخص کسی بھائی کی دعوت کا انکار کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔“

اس مبارک ارشاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سخت ناپسند فرمایا ہے کہ امیر لوگ اپنی دعوتوں وغیرہ میں صرف امیروں کو مدعو کریں اور غریبوں کو گویا کوئی اور جنس خیال کرتے ہوئے بھول جائیں۔ اور دراصل مساوات کی روح زیادہ تر تمدنی معاملات میں ہی بگڑتی شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے تمدنی معاملات کا اثر براہ راست دل پر پڑتا ہے۔ اسی طرح آپ نے یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اگر کوئی غریب کسی امیر کی دعوت کرے تو امیر کے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی امارت کے گھمنڈ میں آکر یا یہ خیال کر کے کہ غریب کے ہاں کا کھانا اس کی عادت اور مزاج کے مطابق نہیں ہوگا۔ غریب کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ اس قسم کی دعوتوں کا رستہ کھولنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

تَوَدُّعِيْتُ اِلَى كُرَاعٍ لَا جَبِيْتُ تَه

یعنی ”اگر کوئی غریب شخص کسی بکری یا بھیر کا ایک پایہ پکا کر بھی مجھے دعوت میں بلائے تو میں اس کی دعوت کو ضرور قبول کروں گا۔“

یاد رہے کہ اس جگہ کُرَاع کے معنی پائے کے پچھلے حصہ کے ہیں جو ٹخنوں سے نیچے ہوتا ہے اور

یقیناً وہ ایک ادنیٰ قسم کی غذا ہے کیونکہ ٹخنوں کے نیچے کا حصہ قریباً گھری بن جاتا ہے، لیکن اگر کمر اع کے معنی پورے پائے کے بھی سمجھے جائیں تو پھر بھی عربوں کی روایات سے یہ ثابت ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب لوگ پائے کو اچھی غذا نہیں سمجھتے تھے چنانچہ عربوں میں مشہور محاورہ تھا کہ

لَا تَطْعِمِ الْعَبْدَ الْكُرَاعَ فَيَطْمَحُ فِي السَّدَاخِ

یعنی "اپنے غلام کو پایہ بھی کھانے کو نہ دو ورنہ وہ اس سے اوپر نظر اٹھا کر دست و ران کے گوشت کی بھی طمع کرنے لگے گا۔"

بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنا ذاتی اسوہ پیش کر کے مسلمانوں کو تحریک فرمائی ہے کہ خواہ دعوت کرنے والا کتنا ہی غریب ہو اس کی دعوت کو غربت کی وجہ سے رد نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ تمہاری سوسائٹی میں ایسا رخنہ پیدا ہو جائے گا جو آہستہ آہستہ سب کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔

مجلسوں میں مل کر بیٹھنے کے متعلق بھی اسلام ہی سنہری تعلیم دیتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی بڑا شخص بعد میں آتے تو کسی چھوٹے شخص کو اٹھا کر اس کی جگہ اسے دیدی جاتے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:-

نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُقَامَ الرَّحْلُ مِنْ مَجْلِسِهِ وَيُجْلَسُ فِيهِ آخِرُ وَلَاحِقُ تَفَسَّحُوا وَتَوَسَّحُوا ۝

یعنی "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے اس لیے اٹھایا جاتے کہ تا اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص بیٹھ جائے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر جگہ تنگ ہو اور زیادہ آدمی آجائیں تو پھر سب سمٹ سمٹ کر آنے والوں کے لیے گنجائش نکال لیا کرو۔"

یہی اصول نمازوں کے موقع پر مسجدوں میں ملحوظ رکھا گیا ہے جہاں کسی شخص کے لیے کوئی جگہ ریزرو نہیں ہوتی۔ اگر ایک خادم پہلے آتا ہے تو وہ پہلی صف میں جگہ پائیگا اور اگر ایک آقا پیچھے پہنچتا ہے تو وہ آخری صف میں بیٹھے گا۔ غرض خدا کے گھر میں امیر و غریب، خادم و آقا، حاکم و محکوم، طاقتور اور کمزور سب برابر ہوتے ہیں اور کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا تھا جس میں آپ اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح بل جل کر بیٹھتے تھے کہ بعض اوقات ایک اجنبی شخص کے لیے آپ کی مجلس میں اس بات کا جاننا اور پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں۔



## خادم و آقا کے تعلقات

خادم و آقا کے تعلقات کا سوال بھی ایک بہت اہم سوال ہے مگر چونکہ اس سوال کے متعلق کتاب ہذا کے حصہ دوم میں مسئلہ

غلامی کی ذیل میں اصول بحث گذر چکی ہے اس لیے اس جگہ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ خادموں اور غلاموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بھی اسلام نے نہایت تاکید و ہدایتیں دی ہیں۔ مثلاً آقاؤں کو ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ اُسے اُس کے سب ماتحت لوگوں کے متعلق میں فرماتے ہیں:-

عَلَيْكُمْ رَاعٍ وَحُلَّتْكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ يَه

یعنی تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی جہت سے بعض دوسرے لوگوں کا آقا اور افسر ہوتا ہے پس ہر شخص کو ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ اُسے اُس کے سب ماتحت لوگوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اور خادموں اور آقاؤں کی درمیانی خلیج کو اُڑانے کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

اِنَّ حَوَالَكُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَآكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تَخْلِفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ خَلَفْتُمُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَاَعْيَنُوهُمْ

یعنی تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں۔ پس جب کسی شخص کے ماتحت اُس کا کوئی بھائی ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنے خادم بھائی کو اُس کھانے میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے جو وہ خود کھاتا ہے اور اُس لباس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دے جو وہ خود پہنتا ہے اور اے مسلمانو! تم اپنے خادموں کو کوئی ایسا کام نہ دیا کرو جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر کبھی مجبوراً انہیں کوئی ایسا کام دینا پڑے تو پھر اُس کام میں خود بھی اُن کی مدد کیا کرو۔

یہ حدیث جیسا کہ اس کے الفاظ اور اسلوب بیان سے ظاہر ہے ایک نہایت اہم اور اصولی حدیث ہے اور اُن کی مدد کیا کرو کے الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کام ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر وہ خود آقا کو کرنا پڑے تو وہ اُسے اپنے لیے موجب عار سمجھے بلکہ ایسا ہونا چاہیے کہ جسے خود آقا بھی کر سکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو۔ گویا اس حدیث میں خادموں کے ساتھ حسن سلوک اور برادرانہ برتاؤ کی تلقین کے

علاوہ یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ کسی کام کو اپنے لیے موجب عار سمجھے یا یہ خیال کرے کہ یہ کام صرف خادم کے کرنے کا ہے میرے کرنے کا نہیں۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کا کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے اور کسی کام کو عار نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اوپر کی حدیث میں جو تحویل کا لفظ آیا ہے وہ عربی محاورہ کے مطابق نوکروں اور خادموں اور غلاموں اور اسی قسم کے دوسرے حاشیہ نشینوں سب پر بولا جاتا ہے۔ اس طرح اس حدیث میں گویا ایک نہایت وسیع مضمون مد نظر رکھا گیا ہے۔ بہر حال اسلام نے آقاؤں اور خادموں کے تعلقات کو بھی بہترین بنیاد پر قائم کیا ہے۔

بیابہ شادی کے معاملات میں  
اسلامی تعلیم

بیابہ شادی کا معاملہ بھی تمدنی تعلقات ہی کا حصہ ہے  
مگر افسوس ہے کہ دنیا داروں نے اس میدان میں بھی  
اپنے خیال کے مطابق مختلف طبقے بنا رکھے ہیں

اور غیر طبقہ میں رشتہ دینے کو موجب ہتک سمجھا جاتا ہے۔ سو اس کے متعلق ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

تُكْرَهُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاطْفَرُ  
بِذَاتِ الدِّينِ تَرَبُّثٌ يَدَاكُ ۝

یعنی "ایک عورت کے ساتھ چار خیالات کی بناء پر شادی کی جاتی ہے۔ یا تو دولت کی وجہ سے، بیوی کا انتخاب کیا جاتا ہے اور یا حسب نسب (یعنی قوم یا خاندان) کی وجہ سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ اور یا حسن و جمال کی وجہ سے انتخاب کیا جاتا ہے اور یا اخلاقی اور دینی حالت کی بناء پر انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن اسے مرد مومن! تو ہمیشہ بیوی کا انتخاب دینی اور اخلاقی بناء پر کیا کر اور ذاتی اوصاف اور ذاتی نیکی کے پہلو کو ترجیح دیا کر ورنہ یاد رکھ کہ تیرے ہاتھ ہمیشہ خاک آلود رہیں گے؟"

یہ وہ مبارک تعلیم ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے گھروں کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے بلکہ ان کی نسلوں کو بھی دین و دنیا میں ترقی دینے کی بنیاد بننے کا بھاری ذریعہ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نمونہ بھی اس معاملہ میں یہ ہے کہ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے ساتھ کر دی تھی اور اس معاملہ میں عربوں کے قدیم رسم و رواج اور خیالات کی قطعاً پروا نہیں کی۔ اسی طرح خود آپ نے عربوں کی ہر معروف قوم میں شادی کی یعنی قریش میں بھی کی

غیر قریش میں بھی کی اور بنی اسرائیل میں بھی کی اور عرب میں یہی تین قومیں آباد تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل کئی مسلمان اپنی قوم سے باہر شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک سید اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف سید کے گھر جاتے اور ایک راجپوت کا اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف راجپوت کی بیوی بنے۔ اور ایک لگے زنی اس بات پر ضد کر کے بیٹھ جاتا ہے کہ اُس کی لڑکی صرف لگے زنی کے ساتھ بیاہی جائے۔ اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریعہ تعلیم اور آپ کے مبارک اُسوہ کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

**مرد و عورت میں حقوق کی مساوات** پھر مساوات کی بحث میں مرد و عورت کی مساوات کا سوال بھی بہت اہمیت رکھتا ہے یعنی

جہاں آج کل ایک طبقہ عورت کو نعوذ باللہ جوتی کی طرح اپنے پاؤں کے نیچے رکھنا چاہتا ہے تو وہاں دوسرا طبقہ اسے ایسی آزادی دینے پر تیار ہوا ہے کہ گویا وہ انتظامی لحاظ سے بھی خاوند کی نگرانی سے باہر ہو گئی ہے۔ اور پھر یورپ کا ایک طبقہ تو اسلام کی طرف یہ تعلیم بھی منسوب کرتے ہوتے نہیں شرماتا کہ اسلام عورت میں رُوح تک کو تسلیم نہیں کرتا۔ گویا وہ صرف مشین کی طرح کا ایک جانور ہے جس کی زندگی اُس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن شریف ان سارے باطل خیالات کی تردید فرماتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ مرد و عورت اپنے اعمال کی جدوجہد اور ان کے نتائج کے حصول میں برابر ہیں اور سب کے اعمال کا نتیجہ یکساں نکلنے والا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

إِنِّي لَذَٰلِكُ أَضَيِّعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّثْلَ ذَٰلِكَ ۚ أَتُنتَهِىٰ عَنْ بَعْضِكُمْ

مِّنْ بَعْضٍ ۚ لَّٰ

یعنی اے لوگو! میں جو تمہارا خالق و مالک ہوں میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کیونکہ تم سب ایک ہی نسل کے حصے اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہو۔

اور خاوند بیوی کے مخصوص حقوق کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَكُلُّهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ ۚ

یعنی جس طرح خاوندوں کے بعض حقوق بیویوں کے ذمہ ہیں اسی طرح بیویوں کے بعض حقوق خاوندوں کے ذمہ بھی ہیں۔

اس قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ حقوق اور ذمہ داریوں کے معاملہ میں میاں بیوی برابر ہیں کہ کچھ پابندیاں خاوند کے ذمہ لگادی گئی ہیں اور کچھ پابندیاں بیوی کے ذمہ لگادی گئی ہیں اور دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کے متعلق پوچھے جائیں گے۔

مگر چونکہ انتظامی لحاظ سے گھریلو زندگی کی باگ ڈور ہر حال ایک ہاتھ میں رہنی ضروری ہے اس لیے اس جہت سے قرآن شریف فرماتا ہے :-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَنَاطٌ لَّهُ

یعنی "گھریلو زندگی میں مردوں کو عورتوں پر امیر اور نگران رکھا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فطری قوی میں مردوں کو فضیلت عطا کی ہے اور پھر عورتوں کے اخراجات کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے۔ پس نیک بیویوں کو ہر حال اپنے خاوندوں کا فرمانبردار رہنا چاہیے"

لیکن اس انتظامی فرق کو ایک طرف رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیویوں کیساتھ سلوک کرنے کے متعلق فرماتے ہیں :-

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَإِنَّا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي يَه

یعنی "تم میں سے خدا کے نزدیک بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں سب سے بہتر ہے اور خدا کے فضل سے میں تم سب میں اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہوں"

اور اس بارے میں قرآن شریف یہ ارشاد فرماتا ہے :-

عَايِشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكُنَّ هُنَّ شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ

یعنی "اے مسلمانو! اپنی بیویوں کے ساتھ بہت نیک سلوک کیا کرو۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو ناپسند بھی کرتا ہو تو پھر بھی یاد رکھو کہ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو مگر خدا نے اس میں تمہارے لیے انجام کے لحاظ سے بہت بڑی خیر مقدر کر رکھی ہو"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے مساوات انسانی کے متعلق بہترین تعلیم دی ہے۔ چنانچہ (۱) سب سے پہلے اُس نے اس اصول کو بیان کیا ہے کہ سب لوگ ایک ہی جنس کی مخلوق اور ایک ہی باپ کی نسل اور

ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اس لیے نسلی لحاظ سے سب کا حق برابر ہے۔ (۲) اس کے بعد اس نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نسلی وحدت کے باوجود یہ ممکن ہے کہ جس طرح زمین کے پیٹ میں ایک ہی قسم کے عناصر مختلف قسم کی صورتیں اور مختلف قسم کے خواص اختیار کر کے مختلف قسم کی معدنیات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح مختلف انسان بھی بعد کے حالات کی وجہ سے مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو کر مختلف اوصاف اختیار کر سکتے ہیں مگر اس فرق کی وجہ سے کسی قوم یا کسی قبیلہ یا کسی فرد کو کسی دوسرے پر بے جا فخر اور تکبر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ جو قوم یا جو شخص آج نیچے ہے وہ کل کو اوپر ہو جائے۔ (۳) اس کے بعد اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس وحدت نسلی کے علاوہ مسلمان خصوصیت کے ساتھ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہی ایمان کے حامل اور ایک ہی دامن رسالت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی روحانی باپ کے بچے ہیں پس انہیں ہر حال میں بھائی بھائی بن کر رہنا چاہیے (۴) اس کے بعد اسلام یہ بتاتا ہے کہ بے شک مومنوں میں بھی فرق ہو سکتا ہے مگر یہ فرق اُن کے ذاتی اوصاف پر مبنی ہونا چاہیے اور بہر حال خدا کے نزدیک زیادہ عزت والا شخص وہ ہے جو دینداری اور تقویٰ اور جذبہ خدمت میں دوسروں سے آگے ہے (۵) اس کے بعد اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ کسی شخص کے دینی امتیاز یا دنیوی بڑائی کی وجہ سے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ قضائی اور عدالتی معاملات میں کوئی فرق ملحوظ رکھا جائے کیونکہ عدالتی حقوق کے میدان میں سب لوگ قطعی طور پر برابر ہیں (۶) اس کے بعد اسلام اس زرین اصول کو بیان کرتا ہے کہ قومی عہدوں کی تقسیم میں صرف ذاتی اہلیت کو دیکھنا چاہیے اور بلا لحاظ امیر و غریب اور بلا لحاظ نسل و خاندان جو شخص بھی کسی عہدہ کا اہل ہو اسے وہ عہدہ سپرد کرنا چاہیے خواہ وہ کوئی ہو۔ (۷) اس کے بعد اسلام یہ ارشاد فرماتا ہے کہ کوئی صاحب عزت شخص کا واجبی اکرام کرنا اچھے اخلاق کا حصہ ہے مگر تمدنی معاملات میں سب مسلمانوں کو آپس میں اس طرح مل جل کر رہنا چاہیے کہ وہ ایک خاندان کے افراد نظر آئیں۔ وہ مجلسوں میں بلا لحاظ امیر و غریب مل جل کر بیٹھیں۔ اگر کوئی امیر دعوت کرے تو اُس میں غریبوں کو بھی ضرور بلائے اور اگر کوئی غریب دعوت کرے تو امیر اُس سے انکار نہ کریں اور (۸) بالآخر اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ بیاہ شادی کے معاملات میں بیوی کا انتخاب اُس کے ذاتی اوصاف اور ذاتی نیکی کی بناء پر ہونا چاہیے نہ کہ اس کے حسب نسب اور مال و دولت وغیرہ کی بناء پر۔

اس کے بعد دولت کی تقسیم کا سوال آتا ہے جو آج  
اسلام میں دولت کی تقسیم کا نظریہ

کل کی اشتراکیت اور سرمایہ داری کی باہمی کشمکش  
جو لا نگاہ بنا ہوا ہے ہو گو اس بحث کا اصل موقع تو انشاء اللہ دوسری جگہ آئے گا۔ مگر اس جگہ مختصر طور پر



اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس اہم سوال کے متعلق بھی اسلام نے ایک ایسی اعلیٰ اور وسطیٰ تعلیم دی ہے جس کی نظیر کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں اسلام نے عام حالات میں دولت پیدا کرنے کے انفرادی حق کو تسلیم کیا ہے وہاں اس نے ملکی دولت کو سمونے کے لیے ایک ایسی مشینری بھی قائم کر دی ہے کہ اگر اُسے اختیار کیا جائے تو کسی ملک یا کسی قوم کی دولت کبھی بھی عامۃ الناس کے ہاتھوں سے نکل کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہیں ہو سکتی۔ میں اس جگہ اختصار کے خیال سے اس مشین کے صرف چار پُر زوں کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ سب سے اول نمبر پر اسلامی قانونِ ورثہ ہے جس کی رُو سے ہر مرنے والے کا ترکہ صرف ایک بچے یا صرف نرینہ اولاد یا صرف اولاد کے ہاتھ میں ہی نہیں جاتا بلکہ سارے لڑکوں اور ساری لڑکیوں اور بیوی اور خاوند اور ماں اور باپ اور بعض صورتوں میں بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں میں ایک نہایت مناسب شرح کے ساتھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ یہ اگر کوئی مسلمان زمیندار مرتا ہے تو اُس کی زمین اُس کے سب وارثوں میں تقسیم ہوگی۔ اگر کوئی دوکاندار مرتا ہے تو اُس کی دکان کا مال سب وارثوں کو پہنچے گا۔ اگر کوئی کارخانہ دار فوت ہوتا ہے تو اُس کے کارخانہ کا حصہ بھی سارے وارثوں میں بٹے گا و علیٰ ہذا القیاس۔ اس طرح گویا اسلام نے دولت کی دُور میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بعض قدرتی روکیں یعنی ہرڈلیں (HURDLES) قائم کر دی ہیں اور ہر نسل کے خاتمہ پر ایک روک (یعنی ہرڈل) سامنے آ کر اس فرق کو کم کر دیتی ہے جو گذشتہ نسل کے دوران میں پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ تقسیمِ ورثہ کا یہ قانون جس کا مل اور مکمل صورت میں اسلام نے قائم کیا ہے وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتا اور اس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے جس کے بیان کرنے کی اس جگہ گنجائش نہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس نظامِ ورثہ میں صرف ورثہ کو ورثہ پہنچانا ہی مد نظر نہیں ہے بلکہ ملکی دولت کو سمونا بھی اس کا ایک بڑا مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر مرنے والے کو اپنے مال کے ایک ٹکڑے یعنی ایک تہائی کی وصیت کی اجازت بھی دی ہے اور یہ وصیت ورثہ کے حق میں جائز نہیں رکھی گئی گویا اس ذریعہ سے اسلام نے ورثہ کی جبری تقسیم کے علاوہ اس بات کا دروازہ بھی کھولا ہے کہ نیک دل لوگ اپنے اموال کو مزید مستحقین میں تقسیم کرنے کا موقع پاسکیں مگر افسوس ہے کہ وصیت کے نظام سے فائدہ اٹھانا تو درکنار آجکل کے مسلمانوں نے ورثہ کی جبری تقسیم والے حصہ کو بھی پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اور سرمایہ داری کے نمار نے لڑکیوں اور بیویوں اور ماں باپ تک کو اُن کے جائز حق سے محروم کر دیا ہوا ہے۔ بہر حال اسلام کا قانونِ ورثہ ایک ایسا بابرکت نظام ہے کہ جس کے ذریعہ

تھوڑے تھوڑے وقفہ پر ملک کی دولت کے سمونے کا عمل جاری رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے یہ ہدایت بھی دی ہے کہ قومی نسل کو بڑھانے کے ذرائع اختیار کرتے رہو۔ پس جب ایک طرف نسل ترقی کرے گی اور دوسری طرف ورثہ وسیع ترین صورت میں تقسیم ہوگا تو ظاہر ہے کہ ملکی دولت خود بخود بڑھتی چلی جائے گی۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اس مبارک تعلیم پر عمل کریں۔

۲۔ دوسرے نمبر پر اسلام کا قانون امداد باہمی ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک جبری اور دوسرے طوعی۔ جبری قانون نظام زکوٰۃ سے تعلق رکھتا ہے جس کے ذریعہ امیر لوگوں کی دولت پر حالات کے اختلاف کے ساتھ اڑھائی (۲½) فی صدی شرح سے لے کر بیس فی صدی شرح تک خاص ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور اس ٹیکس کے ذریعہ جو روپیہ حاصل ہوتا ہے وہ حکومت وقت یا نظام قومی کی نگرانی کے ماتحت غریبوں اور مسکینوں وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ہمارے آقا انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ٹیکس کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ:-

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَاءِهِمْ

یعنی "زکوٰۃ کے نظام کا مقصد یہ ہے کہ امیروں کے اموال کا ایک حصہ کاٹ کر غریبوں کی طرف لوٹایا جائے۔"

اس حدیث میں "لوٹایا جائے" کے پر حکمت الفاظ کے استعمال کرنے میں یہ لطیف اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ زکوٰۃ کا ٹیکس کوئی صدقہ و خیرات نہیں ہے جو غریبوں کو بطور احسان دیا جاتا ہے بلکہ وہ امیروں کی دولت میں غریبوں کا ابدی حق ہے جو انہیں طبعی طریق پر حاصل ہے کیونکہ جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ہر مال کے پیدا کرنے میں غریبوں اور مزدوروں کا بھی کافی دخل ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے نظام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ خدائے حکیم نے ایسے اموال پر زکوٰۃ کی شرح زیادہ مقرر فرمائی ہے جو تجارت کے چکر میں نہیں آتے چنانچہ بند ذخائر پر زکوٰۃ کی شرح بیس فی صدی رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جہاں تجارت یا صنعت میں لگے ہوتے روپے میں سے غریب اور مزدور پیشہ لوگ دوسرے طریق پر بھی کچھ نہ کچھ حصہ لے لیتے ہیں وہاں جمع شدہ ذخائر میں انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس لیے ذخائر میں زکوٰۃ کی شرح بہت بڑھا کر رکھی گئی ہے۔

امداد باہمی کے نظام کا دوسرا حصہ طوعی نظام کی صورت میں قائم کیا گیا ہے اور اس نظام کے ماتحت اسلام نے غریبوں اور بے کس لوگوں کی امداد پر اتنا زور دیا ہے کہ حق یہ ہے کہ ایک نیک اور خدا ترس انسان کے لیے یہ صورت بھی قریباً جبری نظام کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ گو ذاتی نیکی کے معیار کو بلند کر لے

اور اخوت کے جذبات کو ترقی دینے کے لیے اسے قانون کی صورت نہیں دی گئی۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ننگوں کو کپڑا پہنانا، مقروضوں کو قرض کی معیبت سے نجات دلانا، بیماروں کے لیے علاج کا انتظام کرنا، غریب مسافروں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچانا، یتیموں اور یتیم خانوں کو خاک آلود ہونے سے بچانا وغیرہ وغیرہ ایسی نیکیاں ہیں۔ جنکی تحریک و تحریریں میں قرآن و حدیث بھرے پڑے ہیں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی اسوہ اس معاملہ میں یہ تھا کہ رمضان کے مہینہ میں جو غریبوں کی ضروریات کا خاص زمانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد عید بھی آنے والی ہوتی ہے آپ کا ہاتھ غریبوں اور محتاجوں کی امداد میں اس طرح چلتا تھا کہ جس طرح ایک تیز آمدنی چلتی ہے جو کسی روک کو خیال میں نہیں لاتی بلکہ الغرض زکوٰۃ کے جبری نظام اور دوسرے صدقات کے طوٹی نظام کے ذریعہ اسلام نے امیروں کی دولت کو کاٹ کر غریبوں کو دینے اور اس طرح ملکی دولت کو سمونے کی ایک عظیم الشان مشینری قائم کر رکھی ہے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر اسلام کا قانون تجارت ہے جس کی رو سے اسلام میں سودی لین دین ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ آج دنیا کا سمجھدار طبقہ اس بات کو محسوس کر چکا ہے کہ سودی وہ چیز ہے جو ملکی دولت کے توازن کو برباد کرنے کی سب سے زیادہ ذمہ دار ہے کیونکہ اس کے ذریعہ غریبوں کا روپیہ سمٹ سمٹ کر آہستہ آہستہ ایڑوں کے خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے بچے اور غور کیا جاتے تو دراصل سود کی لعنت ہی سرمایہ داری کے پیدا کرنے کی بڑی موجب ہے۔ اگر آج سود بند ہو جاتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اول تو آہستہ آہستہ ملک کی بڑی بڑی تجارتیں یا تو حکومت کے ہاتھ میں چلی جائیں گی اور یا چھوٹی چھوٹی مناسب تجارتوں میں تقسیم ہو کر ملک کی دولت کو خود بخود سود نیکی اور دوسرے امیروں کے لیے غریبوں کے پسینہ کی کمائی پر ڈاکہ ڈالنے کا موقع نہیں رہے گا۔ یہ خیال کہ سودی نظام کے بند ہونے سے تجارت ناممکن ہو جائے گی بالکل غلط اور باطل ہے ایسا خیال صرف موجودہ ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جب کہ یورپ و امریکہ کے سرمایہ داروں کی نقالی کے نتیجہ میں سود کا جال وسیع ہو چکا ہے۔ ورنہ جب سود نہیں تھا اس وقت بھی دنیا کی تجارت چلتی تھی اور انشاء اللہ آئندہ بھی چلے گی اور یہ خیال کہ اسلام میں صرف وہ سود حرام کیا گیا ہے جو بڑی شرح کے مطابق چارج کیا جاتے یا جس میں سود در سود کا طریق اختیار کیا جائے محض نفس کا ایک دھوکہ ہے جو اس دلدل میں پھنس جانیکی وجہ سے کمزور لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے ورنہ اسلام نے ہر قسم کا سود منع کیا ہے اور حق بھی یہی ہے کہ جو چیز ضرر رساں ہے وہ بہر حال ضرر رساں ہے خواہ وہ تھوڑی مقدار میں ہو یا بڑی مقدار میں۔

۴۔ چوتھے نمبر پر اسلام نے جوئے کی قسم کی تمام آمدنیوں کو جن کی بنیاد محض اتفاق پر ہوتی ہے منع قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بھی قوم اور ملک کی دولت میں ناواجب تقسیم کا رستہ کھلتا ہے

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَلْطَابُ وَ  
الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ  
تُفْلِحُونَ ۝

یعنی "اے مسلمانو! شراب اور جوا اور بُتوں کے تھان اور تقسیم کے تیریقینا ایک

شیطانی عمل ہیں۔ پس تم ان سے بالکل دُور رہو تاکہ تم کامیاب و با مُراد ہو سکو۔"

اس آیت میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جوا ان شیطانی اعمال میں سے ہے جو قوموں کی کامیاب زندگی کو تباہ کرنے والے ہیں اور اس کی سببی وجہ ہے کہ جوئے میں دولت کے حصول کو محنت اور ہنرمندی پر مبنی قرار دینے کی بجائے محض اتفاق پر مبنی قرار دیا جاتا ہے جو نہ صرف قومی اخلاق کے لیے مُلک ہے بلکہ ملک میں دولت کی نا واجب تقسیم کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا حکم نظر آتا ہے مگر اس سے اس لطیف نظر پر بھاری روشنی پڑتی ہے جو اسلام اپنے اقتصادی اور اخلاقی نظام کے متعلق قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی آمدنی محنت اور ہنرمندی پر مبنی ہونی چاہیے نہ کہ اتفاقی حادثات پر۔ مَیْسِر کا لفظ بھی جو مَیْسِر (یعنی سہولت اور آسانی) سے نکلا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کہ جوئے کی آمدنی محنت اور ہنرمندی پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ یونہی بیٹھے بٹھائے آسانی سے مل جاتی ہے جو اسلام کے اقتصادی نظریہ کے سرسمر خلاف ہے۔

اوپر کی چار اصولی باتیں صرف اختصار کے خیال سے بیان کی گئی ہیں ورنہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں دولت کے سمونے کے بہت سے ذریعے تجویز کئے ہیں اور اسلام کا منشاء یہ ہے کہ ایک طرف تو ذاتی جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے اور ہر شخص کے لیے اپنی ذاتی محنت کے پھل کھانے کا راستہ کھلا ہو کیونکہ دُنیا میں محنت اور ترقی کا یہی سب سے بڑا محرک ہے۔ اور دوسری طرف ملکی دولت بھی نا واجب طور پر چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے محفوظ رہے۔ اور یہی وہ وسطی طریق ہے جس پر گامزن ہو کر مسلمان افراط و تفریط کے رستوں سے بچ سکتے ہیں۔

لیکن اگر باوجود ان ذرائع کے ملک کا کوئی حصہ

معدور لوگوں کی ذمہ داری حکومت پر ہے

بیماری یا بیکاری کی وجہ سے یا زیادہ کنبہ دار

ہونے کے نتیجے میں اپنی جائز ضروریات کو اپنی جائز آمدنی کے اندر اندر پورا نہ کر سکے تو اس کے متعلق اسلام یہ



ہدایت دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کی اقل ضرورت جو کھانے اور کپڑے اور مکان سے تعلق رکھتی ہے اُس کے پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہے اور اس کا فرض ہے کہ اپنے ملکی محاصل سے ایسے لوگوں کی اقل بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہی ہوتا تھا۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب عرب کے علاقہ بحرین کا رئیس مسلمان ہوا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے ہدایت بھجوائی کہ:-

اَفْرِضْ عَلَى كُلِّ رَجُلٍ لَيْسَ لَهُ اَرْضٌ اَرْبَعَةَ دَرَاهِمَ وَعَبَاءَةً  
یعنی "جن لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے اُن میں سے ہر شخص کو ملکی خزانہ میں سے چار درہم اور لباس گزارہ کے لیے دیا جائے۔"

اسی اصول کی طرف یہ قرآنی آیت اشارہ کرتی ہے کہ:-

"اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجْبُوَ فِيْهَا وَلَا تَعْرِىٰ ۚ وَاَنْتَ لَا تَظْمُوْا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰی ۝"

یعنی "سچی بہشتی زندگی کی یہ علامت ہے کہ اے انسان! تو اس میں بھوکا نہ رہے اور نہ ہی ضروری لباس سے محروم ہو اور نہ ہی سردی سے ٹھٹھرے اور نہ ہی پیاس کی تکلیف اٹھائے اور نہ ہی دھوپ کی شدت میں جلے۔"

پس ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا انتظام کرے کہ ملک و قوم کا کوئی فرد ان اقل ضرورتوں کی وجہ سے تکلیف نہ اٹھائے جو نسل انسانی کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ جہاں تک ملکی دولت کی تقسیم کا سوال ہے اسلام نے اول تو قانون ورثہ اور قانون زکوٰۃ اور قانون تجارت اور حرمت قمار کے ذریعہ ایسی مشینری قائم کر دی ہے کہ اُسے اختیار کرنے کے نتیجہ میں ملکی دولت کبھی بھی عامۃ الناس کے ہاتھ سے نکل کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع نہیں ہو سکتی اور اگر بعض استثنائی حادثات کی وجہ سے پھر بھی کوئی فرد یا خاندان زندگی کی اقل ضرورتوں سے محروم رہ جائے تو اس کے لیے اسلام اس بات کی ہدایت فرماتا ہے کہ امیروں کی دولت پر مزید ٹیکس لگا کر غریبوں کی ضرورت کو پورا کیا جائے کیونکہ ہر انسان کا جو زندگی کی جدوجہد میں کوتاہی نہیں کرتا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ بہر حال بھوکا نہ رہے نہ نگاہ نہ ہو اور سر چھپانے اور سردی گرمی کے بچاؤ سے محروم نہ ہونے پائے۔

### اقتصادی مساوات کے متعلق ایک خاص نکتہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے کیوں نہ جبری طریق پر دولت کی تقسیم کو بھی مساوی

کر دیا یعنی جس طرح اسلام نے عدالتی معاملات میں پوری پوری مساوات قائم کی اور قومی اور ملکی عہدوں کی تقسیم



کے معاملہ میں پوری پوری مساوات قائم کی اور تمدنی میل ملاقات کے معاملہ میں برادرانہ مساوات کا رنگ قائم کیا اور سب انسانوں کو ایک باپ کے بیٹے اور سب مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا اُسی طرح اُس نے کیوں نہ دولت کو بھی سارے انسانوں میں برابر تقسیم کرنے کی سکیم جاری کی؟ سو اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ ایسا کرنا ایک ظلم ہوگا اور اسلام ظلم کو مٹانے آیا ہے نہ کہ اُسے قائم کرنے۔ دولت کی اندھا دھند مساویانہ تقسیم کے یہ معنی ہیں کہ ایک تو لوگوں کی ساری حاصل شدہ دولت اُن سے جبری طور پر چھین لی جائے اور دوسرے آئندہ ان سے دولت پیدا کرنے کی طاقت اور دولت پیدا کرنے کا حق بھی چھین لیا جائے اور یہ دونوں باتیں ظلم میں داخل ہیں۔ بیشک قومی حقوق کی خاطر انفرادی حقوق پر جائز پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں اور بیشک افراد سے یہ مطالبہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ قومی مفاد کی خاطر ضروری قربانی دکھائیں، مگر افراد کے حقوق کو کامل طور پر مٹا کر قوم کے نام پر اُن کے حقوق کو کلیتہً غصب کر لینا ظلم میں داخل ہے جسکی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں اگر غور کیا جائے تو اس رستہ پر پڑنے سے صرف انفرادیت ہی نہیں مٹتی بلکہ بالآخر قومیت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے اور اگر افراد کو دولت کمانے اور اس کا پھل کھانے کے حق سے محروم کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سے دولت پیدا کرنے کا سب سے زبردست فطری محرک کھو یا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس محرک کے کھوئے جانے سے وہ بالآخر دولت پیدا کرنے کی قوت کو بھی ضائع کر دیں گے اور آہستہ آہستہ ان کے دماغی قومی میں انحطاط پیدا ہو جائے گا۔ بے شک یہ خطرہ اس وقت صرف ایک موہوم خطرہ نظر آتا ہے لیکن ہر شخص جو صحیح تدبیر کا مادہ رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ ایک زمانہ کے بعد اس قسم کے قومی خطرات حقیقت بن جایا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں دولت کی کامل طور پر مساویانہ تقسیم خود اشتراکی ممالک میں بھی نہیں پائی جاتی مثلاً کیا مارشل سٹائن اور مسٹر مالوٹو اور روس کے دوسرے صنادید اُسی قسم کا کھانا کھاتے ہیں جیسا کہ روس کا مزدور یا کسان کھاتا ہے۔ یا اُسی قسم کا کپڑا پہنتے ہیں جیسا کہ روس کا مزدور اور کسان پہنتا ہے۔ یا اُسی قسم کے مکانوں میں رہتے ہیں جس میں کہ روس کا مزدور یا کسان رہتا ہے۔ یا اُسی قسم کے حالات میں سفر کرتے ہیں جن میں کہ روس کا مزدور یا کسان سفر کرتا ہے؟ جب نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر مساوات کہاں رہی؟ صرف فرق یہ ہے کہ کسی نے سرمایہ داری کے رنگ میں ملک کی دولت پر ہاتھ صاف کیا اور کسی نے اشتراکیت کا پردہ کھڑا کر کے خادم ملت کے رنگ میں اپنے لیے خاص مراعات محفوظ کر لیں حالانکہ فطری اور طبعی طریق وہ ہے جو اسلام نے قائم کیا ہے یعنی انفرادی حقوق اور انفرادی جہد و جہد بھی جاری رہے اور غریبوں کو اوپر اٹھانے اور امیروں کی دولت میں سے ایک حصہ کاٹ کر غریبوں کی ضرورت کو پورا کرنے کا سلسلہ بھی قائم رہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ انتظام بھی قائم ہو کہ قومی اور ملکی دولت

نا واجب طور پر چند باتھوں میں جمع ہونے سے محفوظ رہے۔

در اصل سارا دھوکا اس بات سے لگا ہے کہ انسانی حقوق کی اقسام پر غور نہیں کیا گیا۔ انسانی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) ایک وہ حقوق ہیں جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں جیسے کہ مثلاً عدل و انصاف کا قیام یا قومی عہدوں کی تقسیم وغیرہ۔ اور (۲) دوسرے وہ حقوق ہیں جو یا تو فطری اور قدرتی رنگ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے جسمانی طاقتیں اور دماغی قوی وغیرہ اور یا وہ انفرادی کوشش اور انفرادی جدوجہد کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جیسے دولت یا مکسوب علم وغیرہ۔ اسلام نے نہایت حکیمانہ طریق پر ان دونوں قسم کے حقوق میں اصولی فرق ملحوظ رکھا ہے یعنی جہاں تک ان انسانی حقوق کا تعلق ہے جو حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اسلام نے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کامل مساوات قائم کی ہے اور مختلف قوموں اور مختلف انسانوں میں قطعاً کوئی فرق پیدا نہیں ہونے دیا، لیکن جہاں دوسری قسم کے حقوق کا دائرہ شروع ہوتا ہے جو فطری قوی اور انفرادی جدوجہد سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اسلام نے ایک مناسب حد تک دخل دے کر مختلف طبقات اور مختلف افراد کے فرق کو سمونے کی تو ضرور کوشش کی ہے لیکن ظلم و جبر کے رنگ میں سارے فرقوں کو یکسر مٹانے کا طریق اختیار نہیں کیا۔ اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں سارے فرقوں کو مٹانا ممکن بھی نہیں ہے۔ مثلاً جسمانی طاقتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ دماغی قوتوں کے فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟ اور جب یہ فرق نہیں مٹائے جاسکتے تو ظاہر ہے کہ ان فرقوں کے طبعی نتائج بھی نہیں مٹائے جاسکتے۔ ہاں چونکہ انسان مَدَنی الاصل صورت میں پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس لوگوں کے ساتھ مل کر اور جہاں تک ممکن ہو ان کے لیے قربانی کرتے ہوئے زندگی گزارے اس لیے اسلام نے یہ ضرور کیا ہے کہ انسان کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اس سے بعض قومی ضرورتوں کے لیے قربانیوں کا مطالبہ کیا ہے اور اس مطالبہ کو اس انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے جو ایک انسان کی انفرادیت کو مٹانے اور ظلم کا طریق اختیار کرنے کے بغیر اس کے ارد گرد کے گھرے ہوئے لوگوں کو زیادہ زیادہ اوپر اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھ لینے کے بعد اسلامی مساوات اور اشتراکیت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے بشرطیکہ کوئی شخص دیانت داری کے ساتھ اسے سمجھنے کے لیے تیار ہو۔

اسلام ایک وسطی نظریہ پیش کرتا ہے

متعلق اسلام یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اس میں ہر وقت ایک جدوجہد کی کیفیت قائم رہنی چاہیے اور درحقیقت زندگی ایک پیہم حرکت اور مسلسل جدوجہد کا ہی نام ہے اور انسان کی ساری ترقی اسی پیہم حرکت اور اسی مسلسل سعی کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس اسلام کسی ایسے نظام کا موید نہیں ہو سکتا جس میں

انسان کو جدوجہد کے میدان سے نکل کر دوسرے کے کما تے ہوتے مال کو بیٹھے بیٹھے کھانے یا دوسرے کے سہارے پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنے کا راستہ اختیار کرنا پڑے۔ بیشک اسلام بھی انفرادی زندگی کے لیے بعض خارجی سہارے مہیا کرتا اور ان سے واجبی فائدہ اٹھانے کا سامان پیدا کرتا ہے مگر اس کا اصل زور اس بات پر ہے کہ ہر انسان خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور اپنے ہاتھ کی طاقت یا اپنے دماغ کی قوت سے اپنے لیے زندگی کا راستہ بنائے۔ وہ خارجی سہاروں کو ایک زائد آمدنی حیثیت تو ضرور دیتا ہے مگر صرف انہی پر کامل تکیہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے قرآن شریف ورثہ کے ذریعہ مال کئے ہوئے مالوں کو بیٹھ کر کھانے والوں کے متعلق فرماتا ہے:-

تَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَصْلًا لَّسَّمَا هُ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبَّ جَمَّاءَ

یعنی "تم لوگ فارغ بیٹھے ہوئے ورثہ کے مالوں کو کھانا چاہتے ہو اور خواہش رکھتے ہو کہ یہ جمع شدہ مال کبھی ختم نہ ہو۔ اور تم ذخیرہ شدہ مال و دولت سے عشق لگاتے بیٹھے ہو۔"

اس لطیف آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خدائے اسلام کو ایسی زندگی پسند نہیں جو انسان کو جدوجہد اور سعی و عمل کے میدان سے نکال کر کسی خاص کھونٹے کے ساتھ باندھ دے۔ کیونکہ اس طرح آہستہ آہستہ انسان کے فطری قوی رنگ آلود ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت یعنی کمیونزم دونوں انسان کو جدوجہد والی زندگی سے نکال کر دوسروں پر تکیہ کر کے بیٹھ جانے کا راستہ کھولتے ہیں۔ یعنی جہاں سرمایہ داری جمع شدہ روپے کا کھونٹا گاڑ کر اس کے ساتھ انسان کو باندھ دیتی ہے وہاں اشتراکیت یعنی کمیونزم دوسری انتہاء کی طرف لیجا کر اور حکومت کے کھونٹے کے ساتھ باندھ کر انسان کو گویا سلا نا چاہتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گویہ انتہائیں جُلا جُلا ہیں مگر حقیقت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں میں یہی اصول چلتا ہے کہ انسان کو انفرادی جدوجہد کے میدان سے نکال کر کسی مضبوط کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے جہاں وہ ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت محسوس کرنے کے بغیر آرام کی زندگی گزار سکے۔ پس غور کیا جاتے تو یہ دونوں افراد و تفریط کی راہیں ہیں جن سے خدائے اسلام لوگوں کو بچا کر جدوجہد کے سرگرم میدان میں کھڑا رکھنا چاہتا ہے اشتراکیت کا اصول کیا ہے؟ یہی ناکہ قوم کے سب افراد مل کر متحدہ زندگی گزاریں اور خواہ بعض افراد دوسروں سے کمزور ہوں اور بعض مضبوط ہوں اور خواہ بعض سست ہوں اور بعض چوکس ہوں وہ گریں تو اکٹھے گریں اور کھڑے ہوں تو اکٹھے کھڑے ہوں۔ مگر غور کرو کہ کیا یہ بھی سرمایہ داری کی طرح

ایک غیر طبعی سہارا نہیں جو انفرادی جدوجہد سے انسان کو غافل کرنے کا موجب ہو سکتا ہے ؟ بیشک اسلام نے بھی کمزور افراد کے لیے ملک و قوم کا سہارا مہیا کیا ہے مگر اُس نے کمال دانشمندی سے اس سہارے پر پورا بھروسہ نہیں ہونے دیا اور انفرادی بوجھ کی اصل ذمہ داری افراد پر رکھی ہے اور زائد سہارا صرف جزوی امداد کے طور پر یا غیر معمولی حالات کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ پس اسلام ہی وہ وسطی مذہب ہے جس نے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انتہاؤں سے بچتے ہوئے ایک درمیانی رستہ کھولا ہے۔ وہ نہ تو جمع شدہ اموال کے ساتھ انسان کو باندھ کر اسے سرمایہ داری کے طریق پر پیکار کرتا چاہتا ہے اور نہ ہی اسے اشتراکیت کے اصول پر کلینٹ حکومت کے سہارے پر رکھ کر اُس کی انفرادی جدوجہد کو کمزور کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-

جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَشْكُوُوا شَهِدَ آدَمُ عَلَى النَّاسِ بِهٖ  
یعنی "اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک وسطی اُمت بنایا ہے تاکہ تم ہر قسم کی انتہاؤں کی طرف جھک جانے والی قوموں کے لیے خدا کی طرف سے نگران رہو۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں وسطی طریق اختیار کیا ہے اور اگر کوئی دل و دماغ رکھنے والا شخص اشتراکیت کے مقابلہ پر اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق منصفانہ غور کرنا چاہے تو اُس کے لیے اس نکتہ میں بھی بھاری سبق ہے کہ گوانتہاؤں کا فرق ضرور ہے۔ یعنی سرمایہ داری ایک انتہاء پر واقع ہے اور اشتراکیت دوسری انتہاء پر مگر بہر حال اشتراکیت بھی ایک دوسری صورت میں اُسی مصیبت کو دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہے جو اُس کے مقابل کی انتہاء یعنی سرمایہ داری نے پیش کر رکھی ہے۔ یعنی یہ دونوں نظام انسان کو جدوجہد کے میدان سے نکال کر کسی نہ کسی کھونٹے کے ساتھ باندھنا چاہتے ہیں اور یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے وسطی رستہ اختیار کر کے ایک طرف تو انسان کی انفرادی جدوجہد کو قائم رکھا ہے اور دوسری طرف خاص حالات کے پیش نظر نیز قوم میں اخوت اور اتحاد کی رُوح قائم رکھنے کے لیے بعض خارجی سہارے بھی مہیا کر دیے ہیں اور یہی وہ رستہ ہے جس سے انسان کا دماغ گند اور منجمد ہونے سے بچ سکتا ہے ورنہ جو لعنت آج دُنیا کے سامنے سرمایہ داری نے پیدا کی ہے وہی کچھ عرصہ کے بعد ایک مختلف صورت میں اشتراکیت کے ذریعہ دُنیا کے سامنے آنے والی ہے۔

دولت کی تقسیم کے متعلق اس حکیمانہ نظریہ کے باوجود جس میں عام حالات

استثنائی حالات میں خوراک کی مساویانہ تقسیم



کے ماتحت جبری طریق کے اختیار کرنے کے بغیر دولت کو منصفانہ رنگ میں سمونے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ انفرادی جدوجہد کا محرک بھی قائم رہے اور ملکی دولت چند ہاتھوں میں جمع بھی نہ ہونے پاتے۔ اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسے خاص حالات پیدا ہو جائیں کہ کسی ملک یا قوم یا بستی کی خوراک کے ذخیرہ میں کمی آجائے یعنی ایک حصہ کے پاس تو زیادہ خوراک موجود ہو اور دوسرے حصہ کے پاس اس کی اقل ضرورت سے بھی کم ہو یا بالکل ہی نہ ہو تو اس قسم کے ہنگامی حالات میں خوراک کی مساویانہ تقسیم کا جبری نظام بھی جاری کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ:-

خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةٍ فَأَصَابَنَا  
جُحْدٌ حَتَّى هَمَمْنَا أَنْ نَنْحَرَ بَعْضُ ظَهْرِنَا فَأَمَرَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَمَعْنَا أَزْوَادَنَا۔

یعنی ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے مگر رستہ میں ہمیں خوراک کی سخت کمی پیش آگئی حتیٰ کہ ہم نے ارادہ کیا کہ اپنی سوار یوں کے بعض اونٹ ذبح کر دیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ سب لوگوں کے خوراک کے ذخیرے اکٹھے کر لیے جائیں پس ہم نے سب ذخیرے اکٹھے کر لیے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے سب کو مساویانہ راشن بانٹنا شروع کر دیا۔

پھر ایک اور روایت آتی ہے کہ:-

بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَعْثًا قَبْلَ السَّاحِلِ وَأَمَرَ عَلَيْهِمْ أَبَا عُبَيْدَةَ  
بْنَ الْجَرَّاحِ وَهُمْ ثَلَاثُ مِائَةٍ فَخَرَجْنَا وَكُنَّا بِقُصْبِ الطَّرِيقِ فَبَيْنَ  
الزَّادِ فَأَمَرَ أَبُو عُبَيْدَةَ بِأَزْوَادِ الْجَيْشِ فَجُمِعَ فَكَانَ مَزُودِي  
تَمْرٍ فَكَانَ يَقْوَتُنَا كُلَّ يَوْمٍ قَلِيلًا قَلِيلًا حَتَّى فَبَيْنَ فَلَمْ يَكُنْ  
يُصِيبُنَا إِلَّا تَمْرَةٌ تَمْرَةٌ۔

یعنی آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی ایک پارٹی ساحل سمند کی طرف روانہ کی اور اس سریر کا امیر (اپنے مقرب صحابی) ابو عبیدہ بن جراح کو مقرر فرمایا اور یہ پارٹی تین سو صحابہ پر مشتمل تھی۔ راوی کہتا ہے کہ ہم اس سریر میں نکلے لیکن رستہ بھول جانے کی وجہ سے، ابھی ہم اس کے رستہ میں ہی تھے کہ ہمارا زاد کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر ابو عبیدہ نے حکم دیا کہ سب لوگوں کی خوراک کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے تو یہ سارا جمع شدہ ذخیرہ دو توشہ دان بنا۔ اس کے بعد



الوعیدہ ہمیں اس ذخیرہ میں سے تھوڑی تھوڑی خوراک تقسیم کرواتے تھے حتیٰ کہ یہ ذخیرہ اتمام ہو گیا کہ بالآخر ہمارا راشن صرف ایک کھجور فی کس پر آ گیا۔

اس روایت سے یہ بھاری اصول مستنبط ہوتا ہے کہ خاص ہنگامی حالات میں خوراک کے انفرادی ذخائر کو اکٹھا کر کے قومی ذخیرہ میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری روایت آتی ہے کہ :-

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ الْأَشْعَرِيَّيْنِ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغُرُو أَوْ قُلْ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ جَمَعُوا مَا كَانَ عَنْدهُمْ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اقْتَسَمُوا بَيْنَهُمْ فِي إِنْاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِيَّةِ فَهُمْ مِتْنِي وَأَنَا مِثْلُهُمْ بِهِ

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اشعر قبیلہ کے لوگوں کا یہ طریق ہے کہ جب کسی سفر میں انہیں خوراک کا ٹوٹا پڑ جاتا ہے یا حضر کی حالت میں ہی ان کے اہل و عیال کی خوراک میں کمی آ جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہ سب لوگوں کی خوراک ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور پھر اس جمع شدہ خوراک کو ایک ناپ کے مطابق سب لوگوں میں مساویانہ طریق پر بانٹ دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا میرے ساتھ حقیقی جوڑ ہے اور میرا ان کے ساتھ حقیقی جوڑ ہے۔“

یہ الفاظ جس بند اور شاندار رُوح کا اظہار کر رہے ہیں وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اپنے اس عظیم الشان محسن کی قدر نہیں کی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام میں دولت کی تقسیم کے متعلق چار بنیادی اصول تسلیم کئے گئے ہیں :-  
اول :- تقسیم ورثہ اور نظام زکوٰۃ کے قیام اور سود اور جوئے کی حرمت کے ذریعہ ملکی دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے بچایا جائے۔

دوم :- مگر دولت پیدا کرنے کے انفرادی حق کو قائم رکھا جائے تاکہ کام کرنے کا ذاتی محرک بھی قائم رہے اور افراد کے دماغ منجمد نہ ہونے پائیں۔

سوم :- جو لوگ باوجود ان ذرائع کے کسی خاص معذوری کی وجہ سے اپنی اقل ضروریات کا سامان بھی پیدا نہ کر سکیں ان کی ضروریات کے پورا کرنے کا حکومت انتظام کرے۔

چہارم :- خاص ہنگامی حالت میں جب کہ خوراک کی خطرناک قلت پیدا ہو جائے۔ تمام انفرادی

ذخیروں کو جمع کر کے ایک مرکزی قومی ذخیرہ قائم کر لیا جائے تاکہ سب لوگوں کو اقل خوراک کا مساویانہ راشن ملتا رہے اور یہ نہ ہو کہ ملک کا ایک حصہ تو عیش اڑاتے اور دوسرا قوتِ لامیت سے بھی محروم ہو۔

اس کے بعد ہم اُس مساوات کی بحث کو لیتے ہیں جو دینی اور روحانی امور سے تعلق رکھتی ہے

## دینی اور روحانی امور میں مساوات

سو جاننا چاہیے کہ گولاً مذہب لوگوں اور دنیا داروں کو اس میدان کی اہمیت پر اطلاع نہ ہو مگر قرپ الہی کی تڑپ رکھنے والوں اور نجاتِ اخروی کے متلاشیوں کے نزدیک یہ میدان دنیا کی زندگی سے بھی بہت زیادہ اہم اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے اور الحمد للہ کہ اس میدان میں بھی اسلامی تعلیم نے صحیح مساوات کے ترازو کو پوری طرح برابر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جہاں دوسرے مذاہب تعلیم دیتے ہیں کہ خدا کے کلام کا نزول اور اُس کے نبیوں اور رسولوں کا ظہور صرف خاص قوموں کے ساتھ ہی مخصوص رہا ہے اور دنیا کی دوسری قومیں اس عظیم الشان روحانی نعمت سے کلی طور پر محروم رہی ہیں مثلاً یہودی لوگ اپنے سوا کسی دوسری قوم کو اس روحانی انعام کا حقدار نہیں سمجھتے اور اسی طرح ہندو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا کلام صرف آریہ ورت تک محدود رہا ہے اور کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم نے اس سے حصہ نہیں پایا اور عملاً عیسائی قوم بھی بنی اسرائیل کے باہر کسی نبی اور رسول وغیرہ کی قائل نہیں۔ الغرض جہاں دنیا کی ہر قوم اس روحانی نعمت کو صرف اپنے آپ تک محدود قرار دے رہی ہے اور کسی دوسری قوم کو اس کا حقدار نہیں سمجھتی وہاں اسلام آ رہا ہے۔ بلند یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح خدا نے اپنی مادی نعمتوں کو ہر قوم اور ہر ملک پر وسیع کر رکھا ہے اور کسی ایک قوم یا ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں کیا مثلاً اُس کا سورج ساری دنیا کو روشنی پہنچاتا ہے اُس کی ہوا سارے گزرتہ ارض کو یکساں گھیرے ہوئے ہے۔ اُس کا پانی ساری دنیا کو سیراب کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح خدا نے اپنی روحانی نعمتوں کو بھی کسی خاص قوم یا خاص ملک تک محدود نہیں کیا بلکہ ہر قوم اور ہر ملک کو اس سے حصہ دیا ہے۔ کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق دنیا کا خدا کسی خاص قوم یا خاص ملک کا خدا نہیں بلکہ ساری دنیا اور ساری قوموں کا خدا ہے اور وہ ایک ایسا منقسط اور عادل حکمران ہے کہ سب مخلوق کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَقْنَا فِيْهَا نَذِيْرًا

یعنی "دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس کی طرف خدا نے اپنی طرف سے کوئی رسول نہ بھیجا ہو تاکہ وہ انہیں ہوشیار کر کے نیکی کا رستہ دکھا دے اور ترقی کی راہیں بتا دے۔"

یہ الفاظ کیسے مختصر ہیں مگر غور کرو تو ان کے اندر روحانی اور دینی مساوات کا ایک عظیم الشان فلسفہ مخفی ہے جس نے دنیا کی ساری قوموں کو خدا کی توجہ کا یکساں حقدار قرار دیکر ایک لینول پر کھڑا کر دیا ہے اور اس خیال کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا ہے کہ خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا یا صرف آریہ ورت کا خدا ہے اور دوسری قوموں کے لیے اس کی محبت اور انصاف کی آنکھ بالکل بند ہے۔ الغرض اسلام نے روحانی مساوات کے میدان میں پہلا اصول یہ قائم کیا ہے کہ کلام الہی اور نبوت و رسالت کا وجود کسی خاص قوم یا خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اپنے اپنے وقت میں ہر قوم اس عظیم الشان روحانی انعام سے حصہ پاتی رہی ہے۔ کیونکہ ہر قوم خدا کی پیدا کردہ ہے اور خدا سے یہ بعید ہے کہ ایک ظالم باپ کی طرح اپنے ایک بیٹے کو حصہ دے اور دوسرے کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دے۔

اسی ضمن میں نجات اور قرب الہی کے حصول کا سوال آتا ہے۔ اکثر قوموں نے دنیوی اور اخروی اُمور میں بھی گویا ایک اجارہ داری کا رنگ اختیار کر رکھا ہے اور ایک خاص نسلی طبقہ کو خدا کا مقرب اور نجات کا مستحق قرار دیکر باقی سب کو عملاً محجوب اور ملعون گردانا ہے جسے کبھی بھی نجات اور قرب الہی کی ٹھنڈی ہوا نہیں پہنچ سکتی۔ مثلاً یہودی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف ایک اسرائیلی نسل کا انسان ہی نجات کا مستحق ہے اور باقی سب لوگ خواہ وہ کیسے ہی نیک ہوں جہنم کا ایندھن ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے گو نسلی رنگ میں نجات کو محدود نہیں کیا۔ مگر بہت سے دینی حقوق و فرائض کو ایک خاص گروہ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے جسے پریسٹ ہڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے چنانچہ عیسائیوں کے متعدد دینی اُمور بلکہ بعض تمدنی امور بھی ایک پریسٹ کی وساطت کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بعض دینی حقوق کو صرف برہمن کا ورثہ قرار دیا گیا ہے اور دوسرے لوگ اس سے محروم ہیں۔ گویا ان قوموں نے نہ صرف دوسری اقوام کو نحس اور پلید قرار دیکر دھتکار دیا ہے۔ بلکہ خود اپنے اندر بھی دینی اور مذہبی امور میں ناگوار طبقات کا وجود تسلیم کر کے خدائی انعامات کو بعض خاص طبقوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے مگر اسلام کا دامن ان سب ناپاک جنبہ دار یوں کے داغ سے پاک ہے بلکہ جس طرح اس نے دنیوی حقوق میں پوری پوری مساوات قائم کی ہے اسی طرح اس نے دینی امور میں بھی انصاف اور مساوات کے ترازو کو کسی طرف جھکنے نہیں دیا چنانچہ اس بارے میں ایک اصولی قرآنی آیت اوپر کی بحث میں گزر چکی ہے جو یہ ہے۔

إِنَّ أَحْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْسَمُ

۱۔ یہ صرف موجود الوقت عیسائیوں کا حال ہے ورنہ خود حضرت مسیح نے تو غیر اسرائیلی اقوام کو گتے کہہ کر دھتکار دیا ہے مثلاً دیکھئے مرقس باب آیت ۲۴ تا ۲۷۔ ۲۔ سورۃ الحجرات ۱۴۱۔

یعنی "اے لوگو! تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ معزز اور زیادہ مقرب وہ شخص

ہے جو زیادہ متقی اور زیادہ نیک اور زیادہ صالح ہے۔"

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرب الہی کے حصول کے معاملہ میں کسی قوم یا کسی طبقہ کی خصوصیت نہیں بلکہ سب گورے کالے، بڑے چھوٹے، طاقتور کمزور مرد و عورت خدا کا قرب حاصل کرنے کے معاملہ میں برابر ہیں اور آگے آنے کے لیے صرف ذاتی تقویٰ اور ذاتی نیکی کی ضرورت ہے۔ ان مختصر الفاظ میں خدا تعالیٰ نے یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ جب ہم بادشاہوں کے بادشاہ ہو کر سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا قرب عطا کرنے میں ذاتی تقویٰ و طہارت کے سوا کسی اور بات کا خیال نہیں کرتے تو پھر دوسروں کو تو بدرجہ اولیٰ یہ چاہیے کہ ذاتی اوصاف کے سوا کسی اور بات پر اپنے انتخاب کی بنیاد نہ رکھا کریں۔

پھر دینی امور میں جزا و سزا اور انعام و الزام کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-  
 مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ

یعنی "جو شخص بھی خواہ وہ کوئی ہو ایک ذرہ بھر بھی نیکی کرتا ہے وہ ہم سے اس کا اجر پائے گا (اور اس کا کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھنا اسے نیک عمل کے پھل سے محروم نہیں کر سکتا) اور اسی طرح جو شخص بھی کوئی بدی کرتا ہے وہ اس کا خمیازہ بھگتے گا (اور اس کا کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھنا اسے اس کی بدی کے نتیجہ سے بچا نہیں سکتا)۔"

پھر فرماتا ہے :-

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارًا تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ

یعنی "سیودی اور عیسائی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی شخص یہودی یا نصاریٰ کے سوا جنت میں نہیں جاسکتا۔ یہ ان لوگوں کی محض خام خیالی ہے اور ایک ہنس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ تو انہیں کدے کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی دلیل لاؤ۔ ہاں بے شک جس شخص نے اپنے تئیں خدا کے سپرد کر دیا یعنی اس پر سچا ایمان لایا اور پھر نیک عمل کئے تو وہ خواہ



کوئی ہو خدا سے اپنا اجر پاتے گا اور ایسے لوگوں پر خدا کے حضور کوئی خوف و حزن نہیں آئیگا۔  
 اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نجات پانے اور قرب الہی کے حصول کے لیے صرف قومی یا سرکاری رنگ  
 میں یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کی طرف منسوب ہونا ہرگز کافی نہیں بلکہ نجات اور قرب الہی کے لیے  
 سچا ایمان اور عمل صالح ضروری ہے۔ پس جو شخص بھی یہ دو باتیں یعنی سچا ایمان اور عمل صالح اپنے اندر پیدا  
 کرتا ہے تو پھر خواہ وہ قومی یا نسلی رنگ میں کوئی ہو وہ خدا کی طرف سے ثواب اور العام کاستحق ہوگا۔ یہ  
 آیت صنف مسلمانوں کو بھی ہوشیار کرتی ہے کہ وہ محض مسلمان کہلانے پر تسلی نہ پائیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو خالی  
 ناموں سے سروکار نہیں بلکہ اس کی نظر حقیقت پر ہے۔

پھر دینی فرائض کی ادائیگی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَقْرَبُكُمْ لِحَبَابِ اللَّهِ فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً  
 فَأَعْلَمُهُمْ بِالشُّنَّةِ فَإِنْ كَانُوا بِالشُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هَجْرَةً  
 فَإِنْ كَانُوا فِي الْهَجْرَةِ سَوَاءً فَأَكْثَرُهُمْ سَنَاءً وَفِي رِوَايَةٍ فَلْيَسْئَلُوا مِنْهُمْ  
 أَحَدُهُمْ وَأَحَقُّهُمْ بِالْإِمَامَةِ أَقْرَبُهُمْ

یعنی "اے مسلمانو! جب تم آپس میں فریضہ نماز کی ادائیگی کے لیے اکٹھے ہو رہو جو اسلام میں  
 سب سے اہم اور سب سے وسیع تر عبادت ہے، تو اس وقت اپنا امام بنانے کے لیے صرف  
 یہ دیکھا کرو کہ تم میں سے قرآن کا علم کس شخص کو زیادہ حاصل ہے۔ پس جو شخص بھی قرآنی علم  
 میں زیادہ ہو اسے نماز میں اپنا امام بنایا کرو اور اگر چند آدمی علم قرآن میں برابر ہوں تو پھر ان  
 میں سے جو شخص سنت رسول کے علم میں زیادہ ہو اسے امام بنایا کرو۔ اور اگر چند آدمی سنت  
 کے علم میں بھی برابر ہوں تو پھر ان میں سے جس شخص نے خدا کی راہ میں پہلے ہجرت کی ہو اسے امام  
 بنایا کرو۔ اور اگر وہ ہجرت میں بھی برابر ہوں تو پھر جو شخص عمر میں زیادہ ہو اسے اپنا امام بنایا  
 کرو۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ نمازوں میں مسلمانوں کا امام ہر وہ شخص  
 ہو سکتا ہے جو ان میں سے ہے اور کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں مگر امامت کا زیادہ  
 حقدار وہ شخص ہے جو دین کا زیادہ علم رکھتا ہے۔"

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و دنیا کے ہر میدان میں حقیقی مساوات قائم فرمائی ہے، اور  
 سوسائٹی کی ہر ناوہاب کش مکش کو جیسے کاٹ کر رکھ دیا ہے اور جسم اور روح دونوں کی اصلاح کی ہے  
 اور یہ وہ مساوات ہے جس کی نظیر یقیناً کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی



لَحْمَدٌ قَبَارِثٌ وَسَلَامٌ۔ مساواتِ اسلامی کے متعلق یہ نوٹ سپردِ قلم کرنے کے بعد ہم پھر اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

### سریہ دومۃ الجندل

شعبان ۱۲۷۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۷ء

اب بڑی سرعت کے ساتھ اسلامی اثر کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور عرب کے دور دراز کناروں میں بھی اسلام کی تبلیغ

پہنچ رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ دور کے علاقوں میں مخالفت بھی بڑھ رہی تھی اور جو لوگ اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے انہیں اپنے ہم قبیلہ لوگوں کی طرف سے سخت مظالم سننے پڑتے تھے اور ان مظالم سے دور کر بہت سے کمزور طبع لوگ اسلام کے اظہار سے رُکے رہتے تھے۔ اس لیے اب جنگی مہموں کی اغراض میں اس غرض کا اضافہ ہو گیا کہ ایسے قبائل کی طرف فوجی دستے روانہ کئے جائیں جن میں بعض لوگ دل میں اسلام کی طرف مائل تھے مگر مظالم کے ڈر کی وجہ سے وہ اسلام کو قبول کرنے سے رُکتے تھے۔ گویا ان دستوں کے بھجوانے کی غرض مذہبی آزادی کا قیام تھی جس پر اسلام خاص طور پر زور دیتا ہے۔

اس غرض و غایت کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ شعبان ۱۲۷۶ھ میں ایک فوجی دستہ عبدالرحمن بن عوف کی کمان میں دومۃ الجندل کے دور دراز مقام کی طرف روانہ فرمایا۔ تاہم کو یاد ہو گا کہ اسی جگہ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ۱۲۷۵ھ میں قیام امن کی غرض سے تشریف لے گئے تھے اور اس طرح یہ علاقہ آج سے دو سال قبل اسلامی دائرۃ اثر میں داخل ہو چکا تھا اور وہاں کے باشندے اسلامی تعلیم سے غیر مانوس نہیں رہے تھے بلکہ غالباً ان میں سے ایک حصہ اسلام کی طرف مائل تھا مگر اپنے رؤساء اور اہل قبیلہ کی مخالفت کی وجہ سے جرات نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال آپؐ نے ہجری کے چھٹے سال میں ایک بڑا فوجی دستہ عبدالرحمن بن عوف کی امارت میں جو کبار صحابہ میں سے تھے دومۃ الجندل کی طرف روانہ فرمایا۔

اس سریہ کی تیاری اور روانگی کے متعلق ابن اسحاق نے عبداللہ ابن عمرؓ سے یہ دلچسپ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ جب ہم چند لوگ جن میں حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور عبدالرحمن بن عوف بھی شامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے، ایک انصاری نوجوان نے حاضر ہو کر آپؐ سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! مومنوں میں سے سب سے افضل کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "وہ جو اخلاق میں سب سے افضل ہے۔" اُس نے کہا "اور یا رسول اللہ! سب سے زیادہ متقی کون ہے؟" آپؐ نے فرمایا "وہ جو موت کو زیادہ یاد رکھتا اور اُس کے لیے وقت سے پہلے تیاری کرتا ہے۔"

اس پر وہ انصاری نوجوان خاموش ہو گیا اور آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے مہاجرین کے گروہ! پانچ بدیاں ایسی ہیں جن کے متعلق میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ کبھی میری امت میں پیدا ہوں کیونکہ وہ جس قوم میں رونما ہوتی ہیں اُسے تباہ کر کے چھوڑتی ہیں۔

اول۔ یہ کہ کبھی کسی قوم میں فاحشہ اور بدکاری نہیں پھیلی۔ اس حد تک کہ وہ اسے برلا کرنے لگ جائیں کہ اُس کے نتیجہ میں ایسی بیماریاں اور وبائیں نہ ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہوں جو اُن سے پہلے لوگوں میں نہیں تھیں۔

دوم۔ کبھی کسی قوم میں تول اور ناپ میں بددیانتی کرنے کی بدی نہیں پیدا ہوتی کہ اُس کے نتیجہ میں اُس قوم پر قحط اور سخت اور شدت اور حاکم وقت کے ظلم و ستم کی مصیبت نازل نہ ہوتی ہو۔ سوم۔ کبھی کسی قوم نے زکوٰۃ اور صدقات کی ادائیگی میں سستی و غفلت نہیں اختیار کی کہ اُس کے نتیجہ میں اُن پر بارشوں کی کمی نہ ہو گئی ہو۔ حتیٰ کہ اگر خدا کو اپنے پیدا کردہ جانوروں اور مویشیوں کا خیال نہ ہو تو ایسی قوم پر بارشوں کا سلسلہ بالکل ہی بند ہو جاتے۔

چہارم۔ کبھی کسی قوم نے خدا اور اُس کے رسول کے عہد کو نہیں توڑا کہ اُن پر کوئی غیر قوم اُن کے دشمنوں میں سے مسلط نہ کر دی گئی ہو جو اُن کے حقوق کو غصب کرنے لگ جاتے۔

پنجم۔ کبھی کسی قوم کے علماء اور ائمہ نے خلاف شریعت فتوے دے دیکر شریعت کو اپنے مطلب کے مطابق نہیں بگاڑنا چاہا کہ اُن کے درمیان اندرونی لڑائی اور جھگڑوں کا سلسلہ شروع نہ ہو گیا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زریں تقریر قوموں کی ترقی و تنزل کے اسباب پر بہترین تبصرہ ہے اور اگر مسلمان چاہیں تو اُن کے لیے موجودہ زمانہ میں بھی یہ ایک بہترین سبق ہے۔

اس کے بعد آپ اپنے مقرب صحابی عبدالرحمن بن عوف سے مخاطب ہوئے اور فرمایا "ابن عوف! میں تمہیں ایک سریر پر امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں تم تیار رہو۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کے وقت عبدالرحمن بن عوف آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے اپنے ہاتھ سے اُن کے سر پر انہی کا عمامہ لیکر باندھا اور بلا لاکھ کو حکم دیا کہ ایک جھنڈا اُن کے سپرد کر دیا جائے اور پھر آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے ماتحت صحابہ کا ایک دستہ متعین کر کے اُن سے فرمایا:-

خُذُوا يَا ابْنَ عَوْفٍ فَأَعْرِضُوا جَمِيعًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَاتِلُوا  
مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ وَلَا تَغْلُوا وَلَا تَغْدِرُوا وَلَا تَمْتَلِكُوا وَلَا تَقْتُلُوا

وَلْيَدَّ - فَهَذَا عَهْدُ اللَّهِ وَسِيْرَةُ نَبِيِّهِ فِيكُمْ يَلْ

یعنی "اے ابن عوف! اس جھنڈے کو لے لو اور پھر تم سب خدا کے رستہ میں جہاد کے لیے نکل جاؤ اور کفار کے ساتھ لڑو مگر دیکھنا کوئی بددیانتی نہ کرنا اور نہ کوئی عہد شکنی کرنا اور نہ دشمن کے مردوں کے جسموں کو بگاڑنا اور نہ بچوں کو قتل کرنا۔ یہ خدا کا حکم ہے اور اس کے نبی کی سنت"

اس روایت میں غالباً راوی نے سہواً عورتوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے ورنہ دوسری جگہ صراحت آتی ہے کہ آپ جب کوئی دستہ بھجواتے تھے تو یہ بھی تاکید فرماتے تھے کہ عورتوں کو قتل نہ کرنا اور نہ بوڑھے پیر فرزتوں کو قتل کرنا اور نہ ایسے لوگوں کو قتل کرنا جن کی زندگی مذہبی خدمت کے لیے وقف ہو۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو ہدایت فرمائی کہ وہ دوئمۃ الجندل کی طرف جاتیں اور کوشش کریں کہ صلح صفائی سے فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر وہ لوگ جنگ و جدال سے دستکش ہو کر اطاعت قبول کر لیں تو یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اور آپ نے عبدالرحمن بن عوف سے فرمایا کہ اس صورت میں مناسب ہوگا کہ تم ان لوگوں کے رئیس کی لڑکی سے شادی کر لو۔ یہ اس کے بعد آپ نے اس سریرہ کو رخصت فرمایا اور حضرت عبدالرحمن بن عوف سات سو صحابیوں کو ساتھ لے کر دوئمۃ الجندل کی طرف جو عرب کے شمال میں تبوک سے شمال مشرق کی طرف شام کی سرحد کے قریب واقع ہے، روانہ ہو گئے۔ جب یہ اسلامی لشکر دوئمۃ میں پہنچا تو شروع شروع میں تو دوئمۃ کے لوگ جنگ کے لیے تیار نظر آتے تھے اور مسلمانوں کو تلوار کی دھمکی دیتے تھے مگر آہستہ آہستہ عبدالرحمن بن عوف کے سمجھانے پر وہ اس ارادے سے باز آ گئے اور چند دن کے بعد ان کے رئیس اصبع بن عمر کلبی نے جو عیسائی تھا عبدالرحمن بن عوف کی تبلیغ سے بطیب خاطر اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ اس کی قوم میں سے بھی بہت سے لوگ جو غالباً پہلے سے دل میں اسلام کی طرف مائل ہو چکے تھے مسلمان ہو گئے اور جو لوگ اپنے دین پر قائم رہے انہوں نے بھی بشرح صدر اسلامی حکومت کے ماتحت آجانا منظور کر لیا۔ اس طرح بڑی خیر و خوبی کے ساتھ یہ مہم اختتام کو پہنچی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق عبدالرحمن بن عوف دوئمۃ الجندل کے رئیس اصبع بن عمر کی لڑکی تناضر کے ساتھ شادی کر کے مدینہ میں واپس لوٹ آئے۔ اور خدا کے فضل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ

۱۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۸، ۸۹ ۲۔ مسلم وموطا والوداؤد وطحاوی حین کا حوالہ سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جلد ۴

۳۔ گذر چکا ہے۔ ۴۔ ابن سعد۔ ۵۔ دارقطنی بحوالہ زرقانی حالات سریرہ دوئمۃ الجندل

۶۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۴، ۶۵

کی برکت سے عبدالرحمن بن عوف کے ہاں یہی تماضر کے بطن سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوا جو خاص فداکاران اسلام میں سے نکلا اور علم و فضل کے اس مرتبہ کو پہنچا کہ وہ اپنے وقت میں اسلام کے چوٹی کے علماء میں سے سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نام ابوسلمہ زہری تھا۔

مدینہ میں یہودی قوم پر ان کی اپنی غداروں اور فتنہ انگیزوں کی وجہ سے جو تباہی آئی تھی وہ تمام عرب کے یہودیوں کے دل میں ایک کانٹا بکرکٹک رہی تھی اور غزوہ بنو قریظہ کے بعد سے جب کہ مدینہ میں یہود کا خاتمہ ہو گیا۔ خیبر کی بستی جو حجاز کے یہودیوں کا سب سے بڑا مرکز تھی اسلام کے خلاف خفیہ سازشوں کا اڈہ بن گئی تھی اور اس جگہ کے یہودی جو عداوت سخت کینہ ور اور حاسد و ظالم واقع ہوئے تھے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش میں سرگرم رہتے تھے۔ چنانچہ بالآخر یہی حالات جنگ خیبر کا باعث بن گئے جو ۶۲۷ء کے ابتداء میں وقوع میں آئی اور جس کے نتیجہ میں خیبر کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہو گیا۔ اب جس واقعہ کا ہم ذکر کرنے لگے ہیں وہ بھی اسی سلسلہ میں منسلک ہے۔

## سریہ حضرت علیؑ بطرف فدک شعبان ۳۰ھ

شعبان ۳۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ قبیلہ بنو سعد بن بکر اور خیبر کے یہودیوں میں مسلمانوں کے خلاف باہم سرگوشیاں ہو رہی ہیں اور یہ کہ بنو سعد اہل خیبر کی اعانت میں اپنی طاقتوں کو جمع کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کی کمان میں صحابہ کا ایک دستہ روانہ فرمایا جو دن کو چھپتے اور رات کو سفر کرتے ہوئے فدک کے پاس پہنچ گئے۔ جس کے قریب یہ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو ایک بدوی شخص ملا جو بنو سعد کا جاسوس تھا۔ حضرت علیؑ نے اسے پکڑ کر قید کر لیا اور اس سے بنو سعد اور اہل خیبر کے حالات دریافت کئے۔ پہلے تو اس نے بالکل لاعلمی اور بے تعلقی کا اظہار کیا مگر آخر وعدہ معافی لے کر اس نے سارا راز کھول دیا اور پھر مسلمان لوگ اس شخص کو اپنا گائیڈ بنا کر اس جگہ کی طرف بڑھے۔ جہاں بنو سعد جمع ہو رہے تھے اور اچانک حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ کی وجہ سے بنو سعد گھبرا کر میدان سے بھاگ نکلے اور حضرت علیؑ مال غنیمت لے کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور اس طرح یہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کا ایک دستہ حضرت ابوبکرؓ کی کمان میں بنو فزارہ

## سریہ حضرت ابوبکرؓ بطرف بنو فزارہ



طرف روانہ فرمایا۔ یہ قبیلہ اس وقت مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا اور اس دستہ میں سلمہ بن اکوع بھی شامل ہوئے جو مشہور تیر انداز اور دوڑنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ سلمہ بن اکوع بیان کرتے ہیں کہ ہم صبح کی نماز کے قریب اس قبیلہ کی قرار گاہ کے پاس پہنچے اور جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ نے ہمیں حملہ کا حکم دیا۔ ہم قبیلہ فزارہ سے لڑتے ہوئے اُن کے چشمہ تک جا پہنچے اور مشرکین کے کئی آدمی مارے گئے جس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ہم نے کئی آدمی قید کر لئے۔ سلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ بھاگنے والے لوگوں میں ایک پارٹی بچوں اور عورتوں کی تھی جو جلدی جلدی ایک قریب کی پہاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اُن کے اور پہاڑی کے درمیان تیر پھینکنے شروع کئے جس پر یہ پارٹی خائف ہو کر کھڑی ہو گئی اور ہم نے انہیں قید کر لیا۔ ان قیدیوں میں ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی جس نے اپنے اوپر سُرخ چٹڑے کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور اُس کی ایک خوبصورت لڑکی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ میں ان سب کو گھیر کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس لے آیا اور آپ نے یہ لڑکی میری نگرانی میں دیدی۔ پھر جب ہم مدینہ میں آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یہ لڑکی لے لی اور اُسے مکہ بھجوا کر اُس کے عوض میں بعض اُن مسلمان قیدیوں کی رہائی حاصل کی جو اہل مکہ کے پاس محبوس تھے۔

**ام قرفہ کے قتل کا غلط واقعہ**  
 سر یہ حضرت ابو بکرؓ کی جگہ جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے  
 ابن سعد نے ایک ایسے سر یہ کا ذکر کیا ہے جس میں

زید بن حارثہ امیر تھے۔ یعنی ابن سعد اس سر یہ میں حضرت ابو بکرؓ کی بجائے زید بن حارثہ کو امیر بیان کرتا ہے اور تفصیل میں بھی کسی قدر اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ مہم بنو فزارہ کی گوشمالی کے لیے تھی جو وادی قریٰ کے پاس آباد تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلہ پر چھاپہ مار کر اس کا سارا مال و اسباب چھین لیا تھا۔ اس مفسد گروہ کی رُوح رواں ایک بوڑھی عورت تھی جس کا نام ام قرفہ تھا جو اسلام کی سخت دشمن تھی۔ جب یہ عورت اس لڑائی میں پکڑی گئی تو زید کی پارٹی کے ایک شخص قیس نامی نے اُس عورت کو قتل کر دیا۔ اور ابن سعد اس قتل کا قصہ یوں بیان کرتا ہے کہ اُس کے دونوں پاؤں دو مختلف اونٹوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے اور پھر ان اونٹوں کو مختلف جہات میں ہنکایا گیا جس کے نتیجے میں یہ عورت درمیان میں سے چر کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ اور اس کے بعد اس عورت کی لڑکی سلمہ بن اکوع کے سپرد کر دی گئی۔ یہی قصہ کسی قدر اختصار اور اجمال اور اختلاف کے ساتھ ابن اسحاق نے بھی بیان کیا ہے۔



اس روایت کی بنا پر سر ولیم میور نے جو دوسرے یورپین مورخین کی نسبت زیادہ تفصیل دینے کا عادی ہے اس واقعہ کو مسلمانوں کی "وحشیانہ رُوح" کی مثال میں بڑے شوق سے اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے بلکہ سر ولیم نے اسے اپنی کتاب میں درج کرنے کی وجہ ہی یہ لکھی ہے کہ اس مہم میں مسلمان ایک ظالمانہ فعل کے مرتکب ہوتے تھے۔ چنانچہ میور صاحب لکھتے ہیں :-

"اس سال مسلمانوں کو بہت سی مہموں میں مدینہ سے نکلتا پڑا مگر یہ سب قابل ذکر نہیں ہیں البتہ میں ان میں سے ایک مہم کے ذکر سے رُک نہیں سکتا کیونکہ اس کا انجام مسلمانوں کی طرف سے ایک نہایت ظالمانہ فعل پر ہوا تھا۔"

جو مورخ ایک واقعہ کو دوسرے واقعات پر محض اس وجہ سے ترجیح دیکر اسے اپنی کتاب کی زینت بناتا ہے کہ اس میں کسی قوم کے ظلم و ستم کا ثبوت ملتا ہے وہ درحقیقت ایک غیر جانبدار محقق کہلانے کا حقدار نہیں ہے کیونکہ اس سے کبھی بھی یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اس بات کی تحقیق کی طرف توجہ کرے گا کہ آیا یہ ظلم و ستم کا واقعہ کوئی اصلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں اس کے ہاتھ سے اس کی ایک دلیل نکل جاتی ہے۔ بہر حال میور صاحب نے اس واقعہ کو خاص شوق کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے مگر جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا یہ واقعہ بالکل غلط اور قطعاً بے بنیاد ہے اور نقل اور عقل ہر دو طرح سے اس کا بناؤنی ہونا ثابت ہے۔

عقل طریق پر تو یہ جاننا چاہیے کہ ایک عورت کو جس پر قتل کا الزام نہیں ہے قید کر کے ٹھنڈے لمحات میں قتل کرنا اور پھر قتل بھی اس طریق پر کرنا جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے یہ تو ایک بہت دُور کی بات ہے اسلام تو عین جنگ کے میدان میں بھی عورت کے قتل کو سختی کے ساتھ روکتا ہے اور ہم جہاد کی اصولی بحث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان درج کر چکے ہیں جو آپ نے عورتوں کے قتل کو ممنوع فرماتے ہوئے جاری فرمایا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقع پر میدان جنگ میں کسی دشمن قبیلہ کی ایک عورت مقتول پائی گئی تو باوجود اس کے کہ یہ معلوم نہیں تھا کہ عورت کن حالات میں اور کس کے ہاتھ سے قتل ہوئی ہے آپ اسے دیکھ کر بہت ناراض ہوئے اور صحابہ سے تاکید فرمایا کہ ایسا کام آئندہ نہیں ہونا چاہیے یہ اسی طرح یہ ذکر بھی اُوپر گزر چکا ہے کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دشمن روانہ فرماتے تھے تو منجملہ اور نصیحتوں کے صحابہ سے ایک نصیحت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کسی عورت اور بچے کو قتل نہ کرنا۔

ان اصولی ہدایات کے ہوتے ہوتے صحابہ کے متعلق اور صحابہ میں سے بھی زید بن حارثہ کے متعلق جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے آدمی تھے یہ خیال کرنا کہ انہوں نے کسی عورت کو اس طریق پر قتل کیا یا کروایا تھا جو ابن سعد نے بیان کیا ہے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ بیشک روایت میں قتل کرنے کا فعل زید کی طرف منسوب نہیں کیا گیا بلکہ ایک دوسرے مسلمان کی طرف کیا گیا ہے لیکن جب کہ یہ واقعہ زید کی کمان میں ہوا تو بہر حال اس کی آخری ذمہ داری زید پر ہی سمجھی جائیگی اور زید کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو جانتے پہچانتے ہوئے اس قسم کے کام کی اجازت دی ہوگی ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ بیشک اگر کوئی عورت کسی جرم کی مرتکب ہوتی ہے تو وہ اس جرم کی سزا پائیگی اور کسی مذہب کی شریعت اور کسی ملک کے قانون نے عورت کو جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہیں رکھا۔ اور آئے دن عورتوں کی سزا بلکہ قتل کے جرم میں پھانسی تک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں مگر محض مذہبی عداوت کی وجہ سے یا شرکتِ جنگ کی وجہ سے کسی عورت کو قتل کرنا اور قتل بھی اس طریق پر کرنا جو اس روایت میں بیان ہوا ہے ایک ایسا فعل ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصولی ہدایت اور ساری اسلامی تاریخ صریح طور پر رد کرتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ عورت مجرم تھی اور جیسا کہ بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کیا تھا یہ اس لیے اس کے خلاف جائز طور پر قتل کی سزا جاری کی جاسکتی تھی تو یہ درست ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب صحابہ نے اُم قرفہ سے سخت اور زیادہ خونی دشمنوں اور پھر مرد دشمنوں کو بھی کبھی اس طرح قتل نہیں کیا تو یہ خیال کرنا کہ زید بن حارثہ جیسے واقف کار صحابی کی کمان میں ایک بوڑھی عورت کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہوگا ہرگز قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ پس معقولی رنگ میں اس قصہ کا جھوٹا اور بناوٹی ہونا ظاہر و عیاں ہے اور کوئی غیر متعصب شخص اس میں شبہ کی گنجائش نہیں دیکھ سکتا۔

اب رہا منقولی طریق سوا اول تو ابن سعد یا ابن اسحاق نے اس روایت کی کوئی سند نہیں دی اور بغیر کسی معتبر سند کے اس قسم کی روایت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایت اور صحابہ کے عام اور معروف طریق کے خلاف ہو ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ یہی واقعہ حدیث کی نہایت معتبر کتب صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد میں بیان ہوا ہے مگر اس میں اُم قرفہ کے قتل کئے جانے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے اور بعض دوسری تفصیلات میں بھی اس بیان کو ابن سعد وغیرہ کے بیان سے اختلاف ہے۔ اور چونکہ صحیح احادیث عام تاریخی روایات سے یقیناً اور مسلمہ طور پر بہت زیادہ مضبوط اور قابل ترجیح

لے زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۶۳۔ لے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابن اسحاق نے بروایت ابن ہشام صرف یہ لکھا ہے کہ اُم قرفہ کو سختی کے ساتھ قتل کروادیا گیا اور اس کی تفصیل نہیں دی۔ تفصیل ابن سعد نے دی ہے۔

ہوتی ہیں۔ اس لیے صحیح مسلم اور سنن البوداؤد کی روایت کے سامنے ابن سعد وغیرہ کی روایت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ یہ امتیاز اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم اس بات کو مد نظر رکھیں کہ جہاں ابن سعد اور ابن اسحاق نے اپنی روایتوں کو یونہی بلا سند بیان کیا ہے وہاں امام مسلم اور البوداؤد نے اپنی روایتوں کو پوری پوری سند دی ہے اور ویسے بھی محدثین کی احتیاط کے مقابلہ میں جنہوں نے انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے مورخین کی عام روایت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

صحیح مسلم اور سنن البوداؤد میں یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے وہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں اُم قرقہ کے قتل کا ذکر تک نہیں ہے۔ بیشک مسلم اور البوداؤد کی روایت میں اُم قرقہ کا نام مذکور نہیں ہے اور امیر کا نام بھی زید کی بجائے ابوبکر درج ہے مگر اس کی وجہ سے یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہم اور ہے کیونکہ باقی جملہ اہم تفصیلات ایک ہیں مثلاً :-

- ۱۔ دونوں روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ ہم بنو فزارہ کے خلاف تھی۔
- ۲۔ دونوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ بنو فزارہ کی ریش ایک بوڑھی عورت تھی۔
- ۳۔ دونوں میں اس عورت کے قید کئے جانے کا ذکر ہے۔
- ۴۔ دونوں میں یہ ذکر ہے کہ اس عورت کی ایک لڑکی بھی تھی جو ماں کے ساتھ قید ہوئی۔
- ۵۔ دونوں میں یہ ذکر ہے کہ یہ لڑکی سلمہ بن اکوع کے حصّہ میں آئی تھی۔

اس کے علاوہ اور بھی بعض باتوں میں اشتراک ہے۔ اب غور کرو کہ کیا ان اہم اور بنیادی اشتراکات کے ہوتے ہوئے کوئی شخص شبہ کر سکتا ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں مگر ہم صرف اس عقلی استدلال پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ گزشتہ محققین نے بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحیح مسلم اور سنن البوداؤد میں وہی واقعہ بیان ہوا ہے جو ابن سعد نے دوسرے رنگ میں درج کیا ہے چنانچہ علامہ ذرقانی اور امام شبلی اور علامہ حلبی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جو ابن سعد اور ابن اسحاق نے اُم قرقہ والے قصّہ میں غلط طور پر بیان کیا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر اس بات کا ثبوت کہ یہ وہی واقعہ ہے یہ ہے کہ طبری نے ان دونوں روایتوں کو پہلو بہ پہلو بیان کر کے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی واقعہ ہیں یہ

الغرض یہ بات بالکل یقینی ہے کہ مسلم اور البوداؤد کی سلمہ بن اکوع والی روایت میں وہی واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے ابن سعد اور ابن ہشام نے اُم قرقہ کے سر یہ کے نام سے غلط طور پر درج کیا

ہے اور چونکہ صحاح کی روایت جو سند کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ایک شریک واقعہ کی زبان سے مروی ہے بہر حال ابن سعد اور ابن ہشام کی غیر مستند روایت سے قابل ترجیح ہے اس لیے اس بات میں ہرگز کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اُم قرقہ کے ”ظالمانہ قتل“ کا واقعہ ایک بالکل جھوٹا اور بے بنیاد واقعہ ہے جو کسی مخفی دشمن اسلام اور منافق کی مہربانی سے بعض تاریخی روایتوں میں راہ پا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس سر یہ کی حقیقت اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں جو مسلم اور البوداؤد نے بیان کی ہے۔ کسی غلط واقعہ کا تاریخ میں درج ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس قسم کی مثالیں ہر قوم اور ہر ملک کی تاریخ میں ملتی ہیں، لیکن یہ ضرور ایک تعجب کی بات ہے کہ سر ولیم جیسا انسان اس غلط واقعہ کو بغیر کسی تحقیق کے اپنی کتاب میں جگہ دے اور اس بات کا برملا اعتراف کرے کہ اس کے اندراج کی وجہ محض یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے ایک ظالمانہ فعل کی مثال ملتی ہے۔

جن یہودی رؤساء کی مفسدانہ انگیزت اور  
اشتعال انگیزی سے شہنہ کے آخر میں مسلمانوں  
کے خلاف جنگ احزاب کا خطرناک فتنہ برپا

اہل خیبر کی شرارت اور البورافع یہودی  
کا قتل رمضان ۶۲۸ء مطابق جنوری ۶۲۸ء

ہوا تھا اُن میں سے جی بن خطبہ تو بنو قریظہ کے ساتھ اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا، لیکن سلام بن ابی الحقیق جس کی کنیت البورافع تھی ابھی تک خیبر کے علاقہ میں اسی طرح آزاد اور اپنی فتنہ انگیزی میں مصروف تھا۔ بلکہ احزاب کی ذلت بھری ناکامی اور پھر بنو قریظہ کے ہوناک انجام نے اُس کی عداوت کو اور بھی زیادہ کر دیا تھا۔ اور چونکہ قبائل غطفان کا مسکن خیبر کے قریب تھا اور خیبر کے یہودی اور نجد کے قبائل آپس میں گویا ہمسائے تھے اس لیے اب البورافع نے جو ایک بہت بڑا تاجر اور امیر کبیر انسان تھا دستور بنالیا تھا کہ نجد کے وحشی اور جنگجو قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا رہتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں وہ کعب بن اشرف کا پورا پورا مشیل تھا یہ چنانچہ اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس نے غطفانیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حملہ آور ہونے کے لیے اموال کثیر سے امداد دی تھی۔

اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ماہ شعبان میں بنو سعد کی طرف سے جو خطرہ مسلمانوں کو پیدا ہوا تھا اور اس کے سد باب کے لیے حضرت علیؑ کی کمان میں ایک فوجی دستہ مدینہ سے روانہ کیا گیا تھا اُس کی تہ میں بھی خیبر کے یہودیوں کا ہاتھ تھا یہ جو البورافع کی قیادت میں یہ سب شرارتیں کر رہے تھے۔

مگر البورافع نے اسی پر بس نہیں کی۔ اس کی عداوت کی آگ مسلمانوں کے خون کی پیاسی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اُس کی آنکھوں میں خار کی کھٹکتا تھا۔ چنانچہ بالآخر اُس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ جنگ احزاب کی طرح نجد کے قبائل غطفان اور دوسرے قبیلوں کا پھر ایک دورہ کرنا شروع



کیا اور انہیں مسلمانوں کے تباہ کرنے کے لیے ایک لشکر عظیم کی صورت میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی احزاب والے منظر پھرنے لگ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ خزرج کے بعض انصاری حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب اس فتنہ کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کسی طرح اس فتنہ کے بانی مبانی البورافع کا خاتمہ کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سوچتے ہوئے کہ ملک میں وسیع کشت و خون کی بجائے ایک مفسد اور فتنہ انگیز آدمی کا مارا جانا بہت بہتر ہے ان صحابیوں کو اجازت مرحمت فرمائی اور عبداللہ بن عتیک انصاری کی سرداری میں چارہ خزر جی صحابیوں کو البورافع کی طرف روانہ فرمایا۔ مگر چلتے ہوئے تاکید فرمائی کہ دیکھنا کسی عورت یا بچے کو ہرگز قتل نہ کرنا۔ چنانچہ سترہ کے ماہ رمضان میں یہ پارٹی روانہ ہوئی اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کر کے واپس آ گئی۔ اور اس طرح اس مصیبت کے بادل مدینہ کی فضا سے مٹ گئے۔ اس واقعہ کی تفصیل بخاری میں جس کی روایت اس معاملہ میں صحیح ترین روایت ہے مندرجہ ذیل صورت میں بیان ہوئی ہے :-

"برابر بن عازب روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک پارٹی البورافع یہودی کی طرف روانہ فرمائی اور ان پر عبداللہ بن عتیک انصاری کو امیر مقرر فرمایا۔ البورافع کا یہ قصہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو سخت دکھ دیا کرتا تھا اور آپ کے خلاف لوگوں کو ابھارتا تھا اور ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ جب عبداللہ بن عتیک اور ان کے ساتھی البورافع کے قلعہ کے قریب پہنچے اور سورج غروب ہو گیا تو عبداللہ بن عتیک نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور خود قلعہ کے دروازے کے پاس پہنچے اور اس کے قریب اس طرح چادر لپیٹ کر بیٹھ گئے جیسے کوئی شخص کسی حاجت کے لیے بیٹھا ہو۔ جب قلعہ کا دروازہ بند کرنے والا شخص دروازہ پر آیا تو اس نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر آواز دی کہ اسے شخص میں قلعہ کا دروازہ بند کرنے لگا ہوں تم نے اندر آنا ہو تو جلد آ جاؤ۔ عبداللہ چادر میں لپٹے لیٹا بے جلدی سے دروازہ کے اندر داخل ہو کر ایک طرف کو چھپ گئے۔ اور دروازہ بند کرنے والا شخص دروازہ بند کر کے اور اس کی گنجی ایک قریب کی کھونٹی سے لٹکا کر چلا گیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن عتیک کا اپنا بیان ہے کہ میں اپنی جگہ سے نکل اور سب سے پہلے میں نے قلعہ کے دروازے کا قفل کھول دیا تاکہ ضرورت کے وقت جلدی اور آسانی کے



ساتھ باہر نکلا جاسکے۔ اس وقت البورافع ایک چوبارے میں تھا اور اس کے پاس بہت سے لوگ مجلس جمائے بیٹھے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جب یہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے اور خاموشی ہو گئی تو میں البورافع کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا اور میں نے یہ احتیاط کی کہ جو دروازہ میرے راستہ میں آتا تھا اُسے میں آگے گزر کر اندر سے بند کر لیتا تھا جب میں البورافع کے کمرے میں پہنچا تو اُس وقت وہ چراغ بجھا کر سونے کی تیاری میں تھا اور کمرہ بالکل تاریک تھا۔ میں نے آواز دیکھ البورافع کو پکارا جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ کون ہے؟ میں نے اس آواز کی سمت کا اندازہ کر کے اُس کی طرف پیکا اور تلوار کا ایک زوردار وار کیا مگر اندھیرا بہت تھا اور میں اُس وقت گھبرایا ہوا تھا اس لیے تلوار کا وار غلط پڑا اور البورافع چیخ مار کر چلتا یا جس پر میں کمرہ سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کمرہ کے اندر جا کر اپنی آواز کو بدلتے ہوئے پوچھا۔ البورافع یہ شور کیسا ہوا تھا؟ اُس نے میری بدلی ہوئی آواز کو نہ پہچانا اور کہا۔ تیری ماں تجھے کھوئے مجھ پر ابھی ابھی کسی شخص نے تلوار کا وار کیا ہے۔ میں یہ آواز سُن کر پھر اُس کی طرف پیکا اور تلوار کا وار کیا اس دفعہ وار کاری پڑا مگر وہ مرا پھر بھی نہیں جس پر میں نے اُس پر ایک تیسرا وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد میں جلدی جلدی دروازے کھولتا ہوا مکان سے باہر نکل آیا، لیکن جب میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا تو ابھی چند قدم باقی تھے کہ میں سمجھا کہ میں سب قدم اتر آیا ہوں جس پر میں اندھیرے میں گر گیا اور میری پنڈلی ٹوٹ گئی (اور ایک روایت میں یوں ہے کہ پنڈلی کا جوڑا تر گیا) مگر میں اُسے اپنی گپڑی سے باندھ کر گھسٹتا ہوا باہر نکل گیا، لیکن میں نے اپنے جیب میں کہا کہ جب تک البورافع کے مرنے کا اطمینان نہ ہو جائے میں یہاں سے نہیں جاؤنگا چنانچہ میں قلعہ کے پاس ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب صبح ہوئی تو قلعہ کے اندر سے کسی کی آواز میرے کان میں آئی کہ البورافع تاجر حجاز وفات پا گیا ہے۔

اس کے بعد میں اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں میں آ ملا اور پھر ہم نے مدینہ میں آکر آنحضرت کو البورافع کے قتل کی اطلاع دی۔ آپ نے سارا واقعہ سُکر مجھے ارشاد فرمایا کہ اپنا پاؤں آگے کر دو۔ میں نے پاؤں آگے کیا تو آپ نے دُعا مانگتے ہوئے اُس پر اپنا دست مبارک پھیرا جس کے بعد میں نے یوں محسوس کیا کہ گویا مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں تھی۔ ۱۰

ایک دوسری روایت میں ذکر آتا ہے کہ جب عبداللہ بن عتیک نے ابورافع پر حملہ کیا تو اسکی بیوی نے نہایت زور سے چلا نا شروع کیا جس پر مجھے فکر ہوا کہ اس کی چیخ و پکار سن کر کہیں دوسرے لوگ نہ ہوشیار ہو جائیں اس پر میں نے اس کی بیوی پر تلوار اٹھائی مگر پھر یہ یاد کر کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے میں اس ارادہ سے باز آ گیا یہ

ابورافع کے قتل کے جواز کے متعلق ہمیں اس جگہ کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ابورافع کی خون آشام کارروائیاں تاریخ کا ایک کھلا ہوا ورق ہیں اور اس سے ایک نئے جلتے واقعہ میں ایک مفصل بحث کتاب کے حصہ دوم میں کعب بن اشرف کے قتل کے بیان میں گذر چکی ہے جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں اصولاً اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ :-

۱۔ اس وقت مسلمان نہایت کمزوری کی حالت میں چاروں طرف سے مصیبت میں مبتلا تھے اور ہر طرف مخالفت کی آگ شعلہ زن تھی۔ اور گویا سارا ملک مسلمانوں کو مٹانے کے لیے متحد ہو رہا تھا۔  
۲۔ ایسے نازک وقت میں ابورافع اس آگ پر تیل ڈال رہا تھا جو مسلمانوں کے خلاف مشتعل تھی اور اپنے اثر اور رسوخ اور دولت سے عرب کے مختلف قبائل کو اسلام کے خلاف ابھار رہا تھا اور اس بات کی تیاری کر رہا تھا کہ غزوۂ احزاب کی طرح عرب کے وحشی قبائل پھر متحد ہو کر مدینہ پر دھاوا بول دیں۔

۳۔ عرب میں اس وقت کوئی حکومت نہیں تھی کہ جس کے ذریعہ دادرسی چاہی جاتی بلکہ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور مختار تھا۔ پس سوائے اس کے کہ اپنی حفاظت کے لیے خود کوئی تدبیر کی جاتی اور کوئی صورت نہیں تھی۔

۴۔ یہودی لوگ پہلے سے اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ کی حالت قائم تھی۔

۵۔ اس وقت ایسے حالات تھے کہ اگر کھلے طور پر یہود کے خلاف فوج کشی کی جاتی تو اس سے جان اور مال کا بہت نقصان ہوتا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ جنگ کی آگ وسیع ہو کر ملک میں عالمگیر تباہی کا رنگ نہ پیدا کر دے۔

ان حالات میں صحابہ نے جو کچھ کیا وہ بالکل درست اور سجا تھا اور حالت جنگ میں جب کہ ایک قوم موت و حیات کے ماحول میں سے گذر رہی ہو اس قسم کی تدابیر بالکل جائز سمجھی جاتی ہیں اور ہر قوم اور ہر ملت انہیں حسب ضرورت ہر زمانہ میں اختیار کرتی رہی ہے مگر افسوس ہے کہ موجودہ اخلاقی

پستی کے زمانے میں مجرم کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اس نا جائز حد تک پہنچ گیا ہے کہ ایک ظالم بھی، میر و بن جاتا ہے اور وہ سزا جو وہ اپنے جرموں کی وجہ سے پاتا ہے عوام کی ہمدردی کی جاذب ہونے لگتی ہے اور اس کے جرم لوگوں کو بھول جاتے ہیں مگر اسلام کے متعلق ہمیں اعتراف ہے کہ وہ ان جھوٹے جذبات کا مذہب نہیں ہے وہ مجرم کو مجرم قرار دیتا ہے اور اس کی سزا کو ملک اور سوسائٹی کے لیے رحمت سمجھتا ہے۔ وہ ایک شرے ہوئے عضو کو جسم سے کاٹ دینے کی تعلیم دیتا ہے اور اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ ایک متعقن عضو اچھے اور تندرست اعضاء کو خراب کر دے۔ باقی رہا طریقی سزا کا سوال سو اس کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ عرب کے اس وقت کے حالات کے ماتحت اور اس حالت جنگ کے پیش نظر جو اس وقت مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان قائم تھی جو طریقی اختیار کیا گیا امن عامہ کے لحاظ سے وہی بہتر اور مناسب تھا۔ چنانچہ ہم اس بارے میں ایک اصولی بحث کعب بن اشرف کے معاملہ میں حصہ دوم میں درج کر چکے ہیں جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔

عبداللہ بن عتیک کی پنڈلی کے شفا پانے کے متعلق بخاری کی روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آیا یہ شفا خارق عادت رنگ میں فوری طور پر وقوع میں آگئی تھی یا یہ کہ آہستہ آہستہ اپنے طبعی کورس کو پورا کر کے ظاہر ہوئی۔ مؤخر الذکر صورت میں یہ ایک عام واقعہ سمجھا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر صرف اس قدر متصور ہوگا کہ آپ کی دعا کی برکت سے اس چوٹ نے کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑا اور کوئی خراب نتیجہ نہیں نکلا بلکہ عبداللہ کی پنڈلی نے بالآخر اپنی اصلی اور فوری طاقت حاصل کر لی اور چوٹ کا اثر کلیتہً زائل ہو گیا، لیکن اگر یہ شفا خارق عادت رنگ میں فوری طور پر وقوع میں آئی تھی تو یقیناً یہ واقعہ خدا تعالیٰ کی تقدیر خاص کا کرشمہ تھا جو اس نے اپنے رسول کی دعا اور برکت کے نتیجہ میں ظاہر فرمایا اور اس صورت میں اس کی تشریح اس اصولی بحث کے نیچے آئیگی جو ہم اس کتاب کے حصہ دوم میں معجزہ کے عنوان کے تحت درج کر چکے ہیں۔ اور جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ اسلام کی تعلیم کی رو سے خدا ہر بات پر قادر ہے اور نہ صرف قادر ہے بلکہ اپنے خاص بندوں کے ذریعہ وہ اپنی تقدیر عام کو بدل کر اپنی خاص قدرت کا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ کوئی بات خدا کی سنت یا وعدہ یا صفت کے خلاف نہ ہو اور اس میں شہود کا ایسا رنگ نہ پایا جائے جو ایمان کی غرض و غایت کو باطل کر دے۔

الوراق کے قتل کے زمانہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ بخاری نے زہری کی اتباع میں اسے معین تاریخ دینے کے بغیر مطلقاً کعب بن اشرف کے قتل کے بعد بیان کیا ہے جو بہر حال درست ہے اور غالباً ان واقعات کو متصل کر کے اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی نوعیت ایک ہی ہے۔ طبری نے اسے سنہ میں کعب بن اشرف کے واقعہ کے بعد رکھا ہے۔ واقدی نے سنہ میں بیان کیا ہے۔ ابن ہشام نے بروایت ابن اسحاق اسے مطلقاً غزوہ بنو قریظہ کے بعد رکھا ہے جو اواخر سنہ میں ہوا تھا اور اس طرح اسے اوائل سنہ میں سمجھا جاسکتا ہے مگر ابن سعد نے صراحتاً سنہ میں بیان کیا ہے اور عام مؤرخین نے ابن سعد کی اتباع کی ہے۔ واللہ اعلم

اسی سال ماہ رمضان میں مدینہ اور اُس کے گرد و نواح میں دیر تک بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کے آثار پیدا ہونے لگے جس پر صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

مدینہ میں بارش کا قحط  
اور آنحضرت کی دعائے استسقاء

خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تکلیف بیان کی اور درخواست کی کہ ان کے لیے بارش کی دعا فرمائی جائے اس پر آپ صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لیکر مصلیٰ یعنی عید گاہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قبلہ رخ ہو کر بارش کے لیے دعا فرمائی اور اُس کے بعد خدا کے فضل سے بہت جلد بارش ہو گئی۔ اِس کے بعد اسلام میں استسقاء کی نماز کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ اِس نماز کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عام نمازوں کی طرح امام مقتدیوں کے آگے تو کھڑا ہوتا ہے مگر قوی دعا کے علاوہ جس میں انسانوں اور جانوروں کی تکلیف کا ذکر کر کے خدا سے بارش کی التجا کی جاتی ہے امام ایک چادر کے کونے پکڑ کر اُسے اپنی پیٹھ پر ڈالتا ہے اور پھر اُسے اِس طرح اُٹا دیتا ہے کہ چاروں کونے بدل جاتے ہیں جو گویا زبان حال سے اِس بات کی استدعا ہوتی ہے کہ خدا یا ہم پر سختی کے دن پوری طرح بدل جاتیں اور تیری وہ رحمت جو ہر چیز کے پیچھے مخفی ہوتی ہے تکلیف کے ظاہری پہلوؤں کو کلی طور پر دبا کر باہر آجائے۔

بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقع پر جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ کے لیے منبر پر چڑھے ہوئے تھے ایک صحابی نے موسم کی سختی کا ذکر کر کے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! جانور مر رہے ہیں اور سفر کشن ہو رہے ہیں۔ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ بارش برساتے" آپ نے اُسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور بارش کے لیے بلند آواز سے دعا فرمائی انس بن مالک جو



اس روایت کے راوی ہیں اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خدمت گار تھے بیان کرتے ہیں کہ اُس وقت آسمان بالکل صاف تھا، لیکن ابھی ہم مسجد میں ہی تھے اور جمعہ سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نمودار ہوا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ سارے آسمان پر چھا گیا۔ اور پھر بارش برسنے لگی اور برابر ایک ہفتہ تک برستی رہی اور اس عرصہ میں ہم نے سورج کی شکل تک نہیں دیکھی (حالانکہ اُس ملک میں اسی صورت بہت شاذ ہوتی ہے)، پھر جب دوسرا جمعہ آیا تو ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! بارش نے تو رستے روک دیئے اور چراگاہوں کے غرقاب ہو جانے سے مویشی بھجوں کے مر رہے ہیں دعا فرماتیں کہ اب اللہ تعالیٰ اس بارش کے سلسلہ کو روک دے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ اور پھر آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ:-

اللَّهُمَّ حَوِّالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا. الخ

یعنی "خدا یا اب ہم پر اس بارش کے سلسلہ کو بند فرما اور دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو وہاں برسا۔"

انہی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔



۱۔ اس تبسم فرمانے میں غالباً اشارہ یہ تھا کہ انسان کسی پہلو سے بھی تسلی نہیں پاتا نیز یہ کہ اللہ کی رحمت کسی خاص چیز میں محصور نہیں بلکہ ہر چیز رحمت بن سکتی ہے اور ہر چیز ہی عذاب کا رنگ اختیار کر سکتی ہے اس لیے ہر وقت خدا سے ڈرنا چاہیئے اور خدا سے بہر حال رحمت کو مانگتے رہنا چاہیئے۔

۲۔ بخاری البواب الاستسقاء باب الاستسقاء فی المسجد الجامع



## اسلام میں قبولیت دُعا کا مسئلہ

اس جگہ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بادل نہیں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی اور بادل آگئے اور بارش ہونے لگی اور پھر جب بارش کی کثرت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کے بند ہونے کی دُعا فرمائی اور بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف ہو گیا یعنی جب یہ باتیں عام قانونِ قدرت کے ماتحت ظہور پذیر ہوتی ہیں تو پھر اس معروف و مشہود قانونِ قدرت کے خلاف یہ بات کیونکر ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے بادل نمودار ہو گئے اور پھر دُعا سے ہی بادلوں نے پھٹ کر سورج کو راستہ دیدیا؟ سو اس کے جواب میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ قبولیت دُعا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر مذہب میں اور ہر زمانہ میں اس مسئلہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور کم و بیش ہر قوم کے مذہبی بزرگوں کی زندگی میں قبولیت دُعا کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ دراصل یہ مسئلہ اپنے بیشتر پہلوؤں میں معجزات کے مسئلہ کے ساتھ مربوط ہے جس کے متعلق ایک اصولی بحث کتاب کے حصہ دوم میں گذر چکی ہے اور ہم اپنے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس نوٹ کے ساتھ کتاب کے حصہ دوم کے متعلقہ اوراق بھی ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

دُعا کا مسئلہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے  
بات یہ ہے کہ ایسے امور میں استدلالی  
براین کو زیادہ دخل نہیں ہوتا بلکہ بحث کا

مرکزی نقطہ یہ بات قرار پاتی ہے کہ آیا دُعائیں عملاً قبول ہوتی ہیں یا نہیں اور آیا کوئی بات دُعا کے نتیجہ میں عملاً وقوع میں آتی ہے یا نہیں۔ اگر دُعا کی قبولیت کا نتیجہ عملاً نظر آجائے اور ایسی صورت میں نظر آئے کہ اس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ ہو اور سمجھدار اور معتبر اور صادق القول لوگوں کی ایک جماعت اس کی شاہد ہو اور پھر مختلف قسم کے حالات میں ایسا مشاہدہ بار بار کے تجربہ سے پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس صورت میں کوئی عقلمند انسان اس کے متعلق شبہ نہیں کر سکتا جب ہم دوسرے امور میں معتبر لوگوں کی شہادت پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں اور ساری دُنیا اس طریق فیصلہ کو قبول کرتی ہے حتیٰ کہ سائنس کے جدید مشاہدات بھی خواہ اُن میں کس قدر ہی غیر متوقع اور عجیب و غریب حالات کا انکشاف ہو کم از کم ابتداءً سائنسدانوں کی شہادت کے ذریعہ ہی قبول کئے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سمجھدار

اور صادق القول لوگوں کی شہادت کے ہوتے ہوئے جو مختلف قوموں اور مختلف زمانوں میں کیساں پائی جاتی ہے۔ دُعا کی قبولیت اور معجزات و خوارق کے وجود سے انکار کیا جاتے۔

مستلزم دُعا اور سائنس کا مشترکہ اصول

اور اگر یہ اعتراف کیا جائے کہ سائنس کی دریافتیں تو ایسی ہیں کہ ہر شخص جو ان کا علم حاصل کرنا چاہے

اور جو رستہ اس علم کے حصول کے لیے مقرر ہے اُسے اختیار کرے اور اُن آلات اور ذرائع کو استعمال میں لائے جو اُن امور کے معلوم کرنے یا تصدیق کرنے کے لیے ضروری ہیں تو وہ انہیں معلوم کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اے ہمارے بھٹکے ہوئے بھائیو! خدا تمہاری آنکھیں کھولے بعینہ ہی صورت دُعا اور معجزات اور خوارق کے معاملہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی اُن پر بھی یہی ازلی قانون چسپاں ہوتا ہے کہ جو شخص اُن کی حقانیت کے تجربہ کرنے کا سچا خواہشمند ہو اور اس رستہ پر گامزن ہو جو اس علم کے حصول کا رستہ ہے اور اُن ذرائع کو استعمال کرے جو اس حقیقت کی دریافت کے لیے مقرر ہیں اور اس کوشش میں وہ کسی غلط رستہ کو اختیار کر کے بھٹک نہ جائے تو ناممکن ہے کہ وہ اُن صحیح نتائج تک پہنچنے سے محروم رہے جو ہر سچے اور صحیح طریق پر کام کرنے والے کے لیے مقدر ہیں خواہ وہ سائنس کے میدان سے تعلق رکھتا ہو یا کہ رُوحانیت کے میدان سے کیونکہ دونوں کا منبع خدا کی ذات ہے اور دونوں ایک ہی ازلی حکومت کے نیچے ہیں مگر افسوس ہے کہ دُنیا کے علوم کے متعلق تو لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ بغیر صحیح کوشش اور صحیح جدوجہد کے حاصل نہیں ہو سکتے اور اس لیے وہ دن رات اس کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی وجہ سے درمیان میں صد ہا ناکامیاں بھی دیکھتے ہیں مگر پھر بھی ہمت نہیں ہارتے مگر رُوحانی میدان میں وہ صرف دل کی خواہش یا مَنہ سے نکل کر اڑ جانے والے الفاظ سے تمام مراحل طے کرنا چاہتے ہیں اور جب اس طرح اُن کی خواہش پوری نہیں ہوتی اور اُن کا مقصود انہیں حاصل نہیں ہوتا تو وہ مایوس ہو کر اس خواہش کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اس مقصود کو ایک وہی چیز قرار دینے لگ جاتے ہیں یقیناً کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ

یعنی "جو لوگ ہمارے معاملہ میں پوری پوری اور صحیح صحیح کوشش کرتے ہیں ہم ضرور بالضرور

اُن کے لیے اپنے رستے کھول دیتے ہیں"

اب ناظرین خود غور کریں کیا انہوں نے اس معاملہ میں پوری پوری اور صحیح صحیح کوشش سے کام لیا

ہے یعنی کیا انہوں نے کم از کم اس معاملہ میں ایسی کوشش کی ہے جو وہ دنیا میں اہم مقاصد کے لیے رکھا کرتے ہیں؟ اگر انہوں نے ایسی کوشش نہیں کی اور یقیناً نہیں کی تو انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی زبان اور قلم کو بند رکھیں اور ان لوگوں کی شہادت کے متعلق حسن ظنی سے کام لیں جو اس میدان میں اپنی زندگیوں وقف رکھتے ہیں اور جن کے حالات اس بات کے ضامن ہیں کہ وہ کم از کم مفتری یا مجنون نہیں۔

**دُعا کا مسئلہ ہستی باری تعالیٰ کے مسئلہ کی فرع ہے**

درحقیقت اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا واقعی اس دُنیا کا کوئی خدا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اس سارے کارخانہ عالم کو اپنے دست قدرت سے چلا رہا ہے۔ اگر تو ایسا خدا ہے اور وہ دُنیا کو پیدا کر کے اپنے عرش اُلوہیت سے معزول نہیں ہو گیا اور نہ ہی اُس کی طاقتیں معطل ہوتی ہیں تو پھر دُعا کا مسئلہ کسی عقلمند کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا کوئی مخصوص دُعا عملاً قبولیت کے درجہ کو پہنچی ہے یا نہیں اور آیا اُس کا کوئی معین نتیجہ نکلا ہے یا نہیں؟ سو یہ بات مشاہدہ کے میدان سے تعلق رکھتی ہے جس میں استدلالی براہین کا دخل نہیں۔ مجھے اپنے اصل مضمون سے ہٹنا پڑتا ہے ورنہ میں سینکڑوں مثالیں دے کر ثابت کر سکتا ہوں۔ کہ ہمارا خدا ایک نام کا بادشاہ نہیں اور نہ ہی وہ اپنے پیدا کردہ قانون کا غلام ہے کہ اُس میں کسی صورت میں بھی کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ بے شک جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے وہ اپنی سنت اور وعدہ کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا مگر دوسری طرف وہ ایک زندہ اور متصرف خدا ہے جو اپنے بندوں کی دُعاؤں کو سُنتا اور اُن پر یقینی نتائج مترتب کرتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جس طرح وہ اپنے قانون کا غلام نہیں اسی طرح وہ اپنے بندوں کا بھی غلام نہیں اور ضروری نہیں کہ ہر دُعا کو منظور کرے۔ بلکہ دُعا کی منظوری بعض خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہے جنہیں ہم انشاء اللہ آگے چل کر درج کریں گے۔ اس اصولی نوٹ کے بعد ہم مسئلہ دُعا کے متعلق اپنے ناظرین کی تنویر کے لیے چند قرآنی آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس بارے میں اسلامی تعلیم کا خلاصہ کیا ہے۔ سو جانتا چاہیے کہ دُعا ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی کسی کو بلانے یا پکارنے کے ہیں اور گویا پکارنے اور بلانے میں زیادہ غالب مفہوم سوال کرنے اور مانگنے کا ہوتا ہے مگر اپنے وسیع معنوں کے لحاظ سے دُعا

لے یہ مثالیں کم و بیش ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں کیونکہ اپنی اصل کے لحاظ سے تمام مذاہب جن کی بنیاد الہام الہی پر ہے خدا کی طرف سے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں خدائی نصرت کا مشاہدہ کر چکے ہیں گو اب وہ غلط رستہ پر پڑ کر اس نصرت سے محروم ہو چکے ہوں۔

ہر رنگ کا پکارنا شامل سمجھا جائیگا خواہ یہ پکارنا سوال یا طلب نصرت کی غرض سے ہو یا کسی اور غرض سے ہو۔  
 شوق اگر کوئی شخص خدا کو محض اپنی محبت اور عبودیت کے جذبات کے اظہار کے لئے مخاطب کرتا ہے  
 تو یہ بھی ایک نوع دعا کی ہے خواہ اس میں کوئی پہلو سوال یا استعانت کا نہ پایا جاتے مگر ان وسیع  
 معنوں کے علاوہ دعا کے لفظ کو اصطلاحاً ایک مخصوص اور محدود مفہوم بھی حاصل ہو گیا ہے جو سوال  
 کرنے اور مانگنے اور طلب نصرت سے تعلق رکھتا ہے اور اس جگہ یہی مؤخر الذکر مفہوم ہمارے مد نظر  
 ہے۔

**دعا کا میابی کا ایک روحانی ذریعہ ہے** سب سے پہلے اسلام مسئلہ دعا کے متعلق یہ  
 تعلیم دیتا ہے کہ دعا صرف ایک عبادت ہی نہیں

ہے بلکہ حقیقی سوال کا رنگ بھی رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ حسب حالات اس سوال کو قبول کرتا اور اس پر  
 نتیجہ مترتب فرماتا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کبھی اس روحانی ہتھیار کی طرف غافل  
 نہ ہوں بلکہ اسے ہمیشہ اپنے استعمال میں رکھیں۔ دراصل اسلام میں دعا کے متعلق نظریہ یہ ہے کہ جس طرح  
 خدا نے دنیا میں مختلف مقاصد کے حصول کے لیے مختلف ذرائع مقرر فرماتے ہیں اور خدا کا یہ منشاء ہے  
 کہ لوگ حسب حالات ان ذرائع اور اسباب کو اختیار کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں اور دنیا میں ساری ترقی  
 کا راز انہی اسباب کے استعمال میں مخفی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے ان مادی اسباب کے علاوہ ایک روحانی  
 سبب بھی مقرر فرمایا ہے اور یہ روحانی سبب دعا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اُس کے بندے  
 اپنے کاموں میں ظاہری اور مادی ذرائع کے ساتھ ساتھ دعا یعنی روحانی ذریعہ کو بھی استعمال کریں۔ اور  
 اس منشاء الہی میں دوسری غرض مد نظر ہے :-

اول یہ کہ تا محض مادی اسباب میں گھرے رہنے کی وجہ سے لوگوں کی نظر مادیت کے ماحول میں محصور  
 ہو کر نہ رہ جائے اور وہ ان مادی اسباب کو ہی اپنا آخری سہارا نہ سمجھنے لگیں۔ بلکہ ان اسباب  
 کے ساتھ ساتھ ان اسباب کے پیدا کرنے والے خدا کو بھی یاد رکھیں جس کے سہارے پر یہ سارے  
 مادی اسباب قائم ہیں۔

دوم یہ کہ تا لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ جس طرح مختلف مقاصد میں کامیابی کے لیے  
 بعض مادی اسباب مقرر ہیں اسی طرح خدا کی ازلی تقدیر نے ایک روحانی سبب بھی مقرر کر رکھا  
 ہے اور یہ روحانی سبب دعا ہے جو ہمارے معاملات میں اسی طرح مؤثر ہے جس طرح کہ مادی  
 اسباب مؤثر ہیں البتہ جس طرح قانون قدرت کے ماتحت ہر مادی سبب کے استعمال کا ایک طریق  
 مقرر ہے اسی طرح روحانی سبب کے استعمال کا بھی ایک طریق مقرر ہے جسے اختیار کرنے کے بغیر وہ  
 مؤثر نہیں ہوتا، لیکن جب اس طریق کو اختیار کر لیا جائے تو یہ روحانی سبب مادی اسباب کی نسبت



بھی زیادہ موثر ہو جاتا ہے کیونکہ گو مادی اور روحانی اسباب ہر دو کی تہ میں خدا ہی کا ہاتھ ہے اور وہی ہر چیز کی علت العلل ہے مگر چونکہ روحانی سبب میں گویا خدا تعالیٰ سے براہ راست اپیل ہوتی ہے اس لیے اگر اس میں صحیح طریق کو اختیار کیا جائے تو وہ لازماً مادی اسباب کی نسبت بہت زیادہ قوی الاثر اور بہت زیادہ سریع الاثر اور بہت زیادہ وسیع الاثر ثابت ہوتا ہے۔

اس اصولی نوٹ کے بعد ہم مسئلہ دعا کے متعلق بعض قرآنی آیات اور احادیث اس جگہ درج کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام اس بارے میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ سو قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝

یعنی "تمہارا پروردگار تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ رجب بھی تمہیں کوئی ضرورت یا حاجت پیش آیا کرے) تم مجھے پکارا کرو۔ میں تمہاری پکار کو سنوں گا اور قبول کروں گا، لیکن وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں (اور ان کی گردنیں مجھے پکارنے کے لیے نہچی نہیں ہو سکتیں) وہ عنقریب ذلیل و رسوا ہو کر آگ کے عذاب میں داخل کئے جائیں گے۔"

پھر فرماتا ہے:-

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۚ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝

یعنی اے رسول! جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھیں تو تو انہیں کہہ دے کہ میں (تم سب کے) قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی آواز کو سننا اور اس کا جواب دیتا ہوں (یعنی اسے قبول کرتا ہوں) مگر میرے بندوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری آواز پر کان دھریں اور مجھ پر سچا ایمان لائیں تاکہ وہ (اپنی دعاؤں میں) کامیابی کا منہ دیکھ سکیں۔"

پھر فرماتا ہے:-

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ وَذُوقُوا خَوْفًا ۚ



طَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ۝  
 یعنی "اے لوگو! اپنے رب کو ہر حال میں پکارا کرو خواہ تم اضطراب اور گھبراہٹ کی حالت میں آہ و پکار کر رہے ہو یا ضبط اور صبر کی حالت میں خاموش ہو۔ اور جانو کہ خدا حد اعتدال سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور تمہیں چاہیے کہ بعد اس کے کہ خدا نے دُنیا میں اس کی اصلاح کا سامان پیدا کر دیا ہے، فساد نہ برپا کرو اور اپنے خدا کو خوف اور طمع ہر حالت میں پکارتے رہو یعنی خواہ تمہیں کسی مصیبت سے رہائی پانے کی خواہش ہو یا کسی بھلائی کے حاصل کرنے کی تمنا ہو ہر حالت میں دُعا کرتے رہو، یقیناً خدا کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔"

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیث میں فرماتے ہیں :-

إِنَّ رَبَّكُمْ حَيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَجِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ أَنْ يَزِدَّهُمَا صَفْرًا ۝

یعنی "اے مسلمانو! تمہارا رب شرمیلا اور بخشش کر نوالا آقا ہے۔ وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ جب کوئی بندہ اُس کے سامنے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلائے تو وہ اُس کے ہاتھوں کو خالی ٹوٹا دے۔" اللہ اللہ کیا شانِ دلربائی ہے!

**کافروں کی دُعائیں** مگر اس کے مقابل پر کافروں کی دُعاؤں کے متعلق فرماتا ہے :-

وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

یعنی "بے شک خدا اپنے بندوں کی دُعائیں سنتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ ہر شخص کی ہر دُعا ضرور قبول ہوتی ہے بلکہ خدا کا یہ قانون ہے کہ ناشکر گزار لوگوں کی دُعائیں یا کافروں کی دُعائیں جو وہ نیک لوگوں کے خلاف مانگتے ہیں قبول نہیں ہوتیں بلکہ یونہی ادھر ادھر بھٹک کر ضائع ہو جاتی ہیں۔"

اور ایک اور جگہ فرماتا ہے :-

**خدا اپنے وعدہ اور سنت کے خلاف دُعا قبول نہیں کرتا**

إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝  
 وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

یعنی "اللہ تعالیٰ کسی صورت میں اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اور تم خدا کی سنت میں کبھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں پاؤ گے"

پھر حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-  
الدُّعَاءُ مَخْرَجُ الْعِبَادَةِ لَهُ

یعنی "دُعا کو عبادت میں وہ درجہ حاصل ہے جو ایک ہڈی میں گوڈے کو حاصل ہوتا ہے جو گویا ہڈی کی جان ہوتا ہے" پس جس عبادت میں دُعا کا عنصر شامل نہیں وہ ایک بے جان جسم سے بڑھ کر نہیں۔

مومن کی دُعا خُدائی تقدیر کو بھی بدل سکتی ہے پھر فرماتے ہیں:-

لَا يَرُدُّ الْقَضَاءُ إِلَّا الدُّعَاءُ

یعنی "لوگو! سن لو کہ دُعا کو وہ طاقت حاصل ہے کہ وہ خدائی قضا و قدر کو بھی بدل دیتی ہے۔ یعنی اگر عام قانون و قدر کے ماتحت کسی فرد یا قوم پر کوئی مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو دُعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص حکم سے اس مصیبت کو مٹا سکتا ہے" اس جگہ وہ لوگ غور کریں جو دُعا کو محض عبادت خیال کرتے ہیں۔

دُعا کی قبولیت کی تین امکانی صورتیں پھر فرماتے ہیں:-

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَلَا قَطِيعَةٌ رَحِمَ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا أَحَدَ ثَلَاثٍ إِمَّا يَعْجِلُ لَهُ دَعْوَتَهُ وَإِمَّا أَنْ يَدْخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ الشُّوْمِ مِثْلَهَا۔

یعنی "جب ایک مسلمان خدا سے کوئی دُعا کرتا ہے تو بشرطیکہ وہ دُعا کسی گناہ یا قطع جی پر مشتمل نہ ہو خدا اُسے تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی ایک صورت میں ضرور قبول فرمالیتا ہے یعنی (۱) یا تو وہ اُسے اُسی صورت میں اسی دُنیا میں قبول کر لیتا ہے اور (۲) یا اسے آخرت کے لیے دُعا کرنے والے کے واسطے ذخیرہ کر لیتا ہے اور (۳) یا اگر اُس کا قبول کرنا کسی سنتِ الہی یا مصلحتِ الہی کے خلاف ہو تو اس کی وجہ سے دُعا کرنے والے سے کسی

ملتی جتنی تکلیف یا بدمی کو دور فرما دیتا ہے۔ قبولیتِ دعا کی ان تین امکانی صورتوں کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی؟

### دُعائیں جلد بازی مُہلک ہے پھر فرماتے ہیں:-

إِنَّهُ يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يُعَجَّلْ فَيَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ رَبِّي فَلَمْ يُسْتَجِبْ لِي بِهِ وَفِي رِوَايَةٍ مَا لَمْ يُسْتَعَجَلْ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا إِلَّا سِتْعَجَالُ قَالَ يَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجِبْ لِي فَيُسْتَحْزِرُ عِنْدَ ذَلِكَ وَيَدْعُ الدُّعَاءَ.

یعنی ”دُعائیں لمبے صبر و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اور جو انسان جلد بازی سے کام نہیں لیتا وہ بالآخر اپنی دعا کا پھل ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ ہاں اگر وہ خود تنہا کر یہ کہنے لگ جائے کہ میں نے تو بہت دعائیں کر کے دیکھ لیا ہے خدا نے میری کوئی نہیں سنی اور پھر وہ اس خیال کے ماتحت دعا چھوڑ بیٹھے تو ایسے شخص کی دعا واقعی قبول نہیں ہوتی“

### غافل دل کی دعا قبول نہیں ہوتی پھر فرماتے ہیں:-

أَدْعُوا اللَّهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا يُسْتَجِيبُ دَعَاءَ مَنْ قَلَبٌ غَافِلٌ لَدَيْهِ

یعنی ”جب تم دعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ خدا تمہاری دعا ضرور سنے گا۔ اور یاد رکھو کہ خدا ایسے دل سے نکلی ہوئی دعا ہرگز نہیں سنتا جو غافل اور بے پروا ہے۔“

### دُعائیں معین و درخواست ہونی چاہیے پھر فرماتے ہیں:-

إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ فَلْيُعْزِمِ الْمَسْئَلَةَ وَلَا يَقُولَنَّ اللَّهُمَّ إِنِّي شِئْتُ فَأَعْطِنِي فَإِنَّهُ لَا مُسْتَكْرَهَ لَهُ بِهِ

یعنی ”جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرنے لگے تو اُسے چاہیے کہ اپنے سوال پر پختگی سے قائم ہو اور ایسے الفاظ استعمال نہ کرے کہ خدا یا اگر تو پسند کرے تو میری اس دعا کو قبول

کر لے کیونکہ خدا تو ہر حال اسی صورت میں قبول کرے گا کہ وہ اُسے پسند کرے گا کیونکہ خدا سب کا حاکم ہے اور اس پر کسی کا دباؤ نہیں پس خواہ مخواہ مشروط یا ڈھیلے ڈھالے الفاظ لکھ کر اپنی دُعا کے زور اور اپنے دل کی توجہ کو کمزور نہیں کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری ارشاد علم انفس کے ایک بھاری اور پختہ اصول پر مبنی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دُعا کے لیے توجہ اور انہماک اور استغراق کی کیفیت ضروری ہے اور یہ کیفیت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ جب دُعا کرنے والا عزم اور یقین کے ساتھ ایک بات پر قائم ہو کر کسی چیز کا سوال کرے لیکن اگر وہ اس قسم کے الفاظ کہے کہ خدا یا تو اگر چاہے تو میری یہ بات مان لے تو اس صورت میں اس کے اندر کبھی بھی وہ توجہ اور وہ استغراق کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا جو دُعا کی قبولیت کے لیے ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر حال خدا انسان کے ماتحت تو ہے نہیں کہ ہر چیز جو انسان مانگے تو وہ ضرور اُسے دیدے اور انکار کی طاقت نہ رکھتا ہو بلکہ وہ ایک حکمران خدا ہے اور اپنے مصالح کے ماتحت قبول کرنے اور رد کرنے ہر دو کی طاقت رکھتا ہے تو پھر انسان کیوں اپنے دل میں ایک شک کی حالت پیدا کر کے اس عزم اور توجہ اور استغراق کے مقام سے متزلزل ہو جو سوال میں کشش اور قوت جذب پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔

**خدا پر ہمیشہ نیک گمان رکھو** اس اصول کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ۔

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي لَهُ

یعنی "خدا فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے متعلق جس قسم کا گمان رکھتا ہے میں اُسی کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں۔"

یہ نکتہ بھی بے شمار کامیابیوں کی کلید ہے مگر افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ہر حال دُعا کے لیے عزم اور یقین کی کیفیت ضروری ہے اور عام حالات میں شک کے الفاظ میں دُعا کرنا جائز نہیں مگر یہ عدم جواز اسی صورت میں ہے کہ دُعا کرنے والا عدم یقین یا عدم توجہ کی وجہ سے ایسا طریقی اختیار کرے لیکن اگر وہ خاص حالات میں توجہ اور یقین کے مقام پر قائم رہتے ہوئے پھر کسی معاملہ میں اپنے فیصلہ کو خدا پر چھوڑ دے اور اس کی وجہ سے اس کی حالت میں بے غماہی یا بے توجہی یا عدم یقین کا رنگ پیدا نہ ہو بلکہ توکل علی اللہ اور تفویض الی اللہ کا رنگ ہو تو ایسی صورت میں اس طریق پر دُعا کرنا بھی ناجائز نہیں ہوگا۔

## دُعا کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے مسئلہ دُعا کے متعلق مندرجہ ذیل اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر حال میں خدا سے دُعا کرتا رہے خواہ اُسے خوف کی حالت درپیش ہو یا طمع کی خواہ وہ تنگی کی حالت میں ہو یا آرام میں خواہ وہ کسی مصیبت سے بچنا چاہتا ہو یا کسی بھلائی کے حاصل کرنے کا آرزو مند ہو۔

۲۔ دُعا ہر حالت میں ہونی چاہیے تفرع کی حالت میں بھی اور خفیہ حالت میں بھی یعنی اُس وقت بھی کہ جب انسان پر افکار کا ایسا ہجوم ہو کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکتا ہو اور وہ پھوٹ پھوٹ کر باہر آتے ہوں اور اُس وقت بھی کہ جب وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر صبر اور خاموشی کے ساتھ اپنی التجا کو پیش کر سکتا ہو۔

۳۔ دُعا کی قبولیت کے لیے سچا ایمان اور نیکی اور طہارت اور اطاعت اور عبودیت ضروری ہیں۔ جو لوگ خدا کی آواز پر کان دھرتے ہیں خدا بھی اُن کی آواز کو زیادہ توجہ اور زیادہ محبت کے ساتھ سنتا ہے۔

۴۔ ناشکر لوگوں کی دُعائیں جو خدا کے انعاموں پر شکر گزاری کا طریق اختیار نہیں کرتے اور نیز ان لوگوں کی دُعائیں جو خدائی نظام کے باغی ہیں درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتیں بلکہ صداے صحران کی طرح فضا میں گونج کر ختم ہو جاتی ہیں۔

۵۔ دُعائیں یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ خدائی قضا و قدر کو بھی بدل سکتی ہے یعنی اگر خدا کے عام قانونِ قدرت کے ماتحت کوئی بات ہونے والی ہو اور پھر اس کا کوئی پاک بندہ اس سے اس بات کے ٹل جانے کی دُعا کرے تو خدا تعالیٰ اپنی اس عام تقدیر کو بدل کر اپنے بندے کی دُعا کے مطابق خاص تقدیر جاری کر دیتا ہے۔

۶۔ مگر خدا کا یہ ازلی فیصلہ ہے کہ وہ اپنی کسی سنت یا وعدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا۔ پس ایسی دُعائیں جو اُس کی کسی سنت یا وعدہ کے خلاف ہوں قبول نہیں ہوتیں۔ اسی طرح ایسی دُعائیں جو گناہ یا قطع رحمی کا دروازہ کھولتی ہوں قبول نہیں ہوتیں۔

۷۔ دُعا کے لیے جلد بازی ستم قاتل ہے بلکہ صبر اور استقلال کے ساتھ دُعائیں لگے رہنا چاہیے جو لوگ کچھ وقت دُعا کر کے پھر تنک جاتے اور اس قسم کے الفاظ بولنے لگ جاتے ہیں کہ ہم نے بہت دُعائیں کر کے دیکھ لیا خدا ہماری سنتا ان کی دُعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

۸۔ دُعائیں شک یا عدم یقین یا مایوسی کے الفاظ پر گزرا استعمال نہیں کرنے چاہئیں بلکہ یقین اور عزم کے ساتھ یہ امید رکھتے ہوئے کہ خدا ہماری سُننے گا دُعا کرنی چاہیے۔



۹۔ خدا دُعا کے قبول کرنے یا رد کرنے میں آزاد ہے۔ اُس پر کسی کا دباؤ یا جبر نہیں۔ جب وہ کسی دُعا کو قبولیت کے قابل خیال کرتا ہے تو اُسے قبول کرتا ہے اور جب قبولیت کے قابل نہیں سمجھتا تو اُسے رد کر دیتا ہے۔ مگر بظاہر رد کرنے کی صورت میں بھی اگر دُعا کرنے والا مستحق ہے تو خدا کسی اور رنگ میں اُس کی تلافی فرما دیتا ہے خواہ اسی دُنیا میں خواہ آخرت میں۔

۱۰۔ دُعا تمام عبادتوں کی جان اور رُوحِ رواں ہے اور جو عبادت دُعا سے خالی ہے وہ اس رُوح اور کھوکھلی ہڈی کی طرح ہے جو گودے سے خالی ہو۔

اس نوٹ کو ختم کرنے سے پہلے یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام نے نہ صرف دُعا کے مسئلہ کو تشریح اور تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اس پر خاص زور دیا ہے بلکہ مسلمانوں کو دُعا کا عملی سبق دینے اور دُعا کا عادی بنانے کے لیے انسان کی ہر حرکت و سکون کے ساتھ کوئی نہ کوئی دُعا مقرر کر دی ہے تاکہ اس کی کوئی گھڑی خدا کی یاد سے خالی نہ رہے مثلاً کسی کے پیدا ہونے کسی کے وفات پانے مسجد میں داخل ہونے مسجد سے نکلنے سفر میں جانے سفر سے واپس آنے سواری پر چڑھنے سواری سے اُترنے کھانا شروع کرنے کھانا ختم کرنے بستر پر جانے بستر سے اُٹھنے پہاڑی پر چڑھنے وادی میں اُترنے دوستوں سے ملنے دوستوں سے جدا ہونے شادی کرنے بیوی سے ملنے نیا چاند دیکھنے بارش کے برسنے بارش کے رکنے آندھی کے چلنے گھر سے نکلنے گھر میں داخل ہونے موسم کا پہلا پھل کھانے بیماری کی تیاری کرنے کسی شگمگم کی لعش کے پاس جانے کسی مسلمان کو دفن کرنے غرض زندگی کے ہر حرکت و سکون کو کسی نہ کسی دُعا کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور یہ دُعا محض رسمی دُعا نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی زندہ چیز ہے جو ایک سچا مسلمان کامل یقین اور حضورِ قلب کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ کاش دُنیا اس عظیم الشان خزانہ کی قدر کرے۔

اہل خیبر کی طرف سے مزید خطرہ  
اور قتل اُسیر بن رزام شوال ۱۳۸۵ھ

الورافع سلام بن ابی الحقیق کے قتل کے بعد خیبر کے یہودیوں نے اپنی سرداری کا تاج ایک ایسے شخص کے سر پر رکھا جو اسلام کی عداوت میں الورافع سے

کم نہیں تھا۔ اس شخص کا نام اُسیر بن رزام تھا۔ اس ظالم نے اپنے نئے عہدہ پر فائز ہوتے ہی اہل کام کی تکمیل کا تہیہ کر لیا جسے الورافع اذھورا چھوڑ کر مر گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلا کام اُسیر نے یہ کیا کہ تمام یہودیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک سخت اشتعال انگیز تقریر کی اور کہا کہ اب تک یہودی رؤساء نے جو تدابیر اسلام کے خلاف اختیار کی ہیں وہ درست نہیں تھیں اب

میں ایک نیا طریق اختیار کروں گا اور قبائل غطفان وغیرہ کی مدد سے ایک ایسی چال چلوں گا کہ محمدؐ کے گھر کی بنیاد میں نقب لگ جائے گی یہ اس کے بعد اس بد بخت نے نجدی قبائل غطفان وغیرہ کا دورہ کرنا شروع کیا اور اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے اُن میں ایسی آگ لگادی کہ وہ پھر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہونے لگے یہ

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات سے اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فوراً اپنے ایک انصاری صحابی عبداللہ بن رواحہؓ کو تین دوسرے صحابیوں کی معیت میں خیبر کی طرف روانہ فرمایا اور انہیں تاکید فرمائی کہ خفیہ خفیہ جاتیں اور سارے حالات معلوم کر کے جلد تر واپس آجائیں یہ چنانچہ عبداللہ بن رواحہ اور اُن کے ساتھی گئے اور خفیہ خفیہ تمام حالات اور کوائف کا پتہ لیکر اور یہ تصدیق کر کے کہ یہ خبریں درست ہیں واپس آ گئے۔ بلکہ عبداللہ بن رواحہ اور اُن کے ساتھیوں نے ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ خیبر کے قلعوں کے آس پاس گھوم کر اور اُسیر بن رزام کی مجلس گاہوں کے پاس پہنچ کر خود اُسیر اور اس کے ساتھیوں کی زبانی یہ سُن لیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ یہ تدبیریں کر رہے ہیں۔ انہی دنوں میں ایک غیر مسلم شخص خارجہ بن حُسیل اتفاقاً خیبر کی طرف سے مدینہ میں آیا اور اس نے بھی عبداللہ بن رواحہ کی تصدیق کی اور کہا کہ میں اُسیر کو ایسی حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے اپنے لاؤ لشکر کو جمع کر رہا تھا یہ

اس تصدیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن رواحہ کی امارت میں تیس صحابہ کی ایک پارٹی خیبر کی طرف روانہ فرمائی اور گوروايات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پارٹی کو کیا ہدایات دے کر روانہ فرمایا تھا مگر اس گفت و شنید سے جو خیبر میں عبداللہ بن رواحہ اور اُسیر بن رزام میں ہوئی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ تھا کہ اُسیر کو مدینہ میں بلا کر اُس کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کیا جائے جس سے اس فتنہ انگیزی کا سلسلہ رک جائے اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہو۔ اس خواہش میں آپؐ اس حد تک تیار تھے کہ اگر اُسیر کو خیبر کے علاقہ کا امیر تک تسلیم کرنا پڑے تو تسلیم کر لیا جائے بشرطیکہ آئندہ کے لیے وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی فتنہ انگیزی سے باز آجائے یہ

جب عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی خیبر میں پہنچی تو سب سے پہلے انہوں نے اُسیر بن رزام سے مدد مانگی

۱۔ زرقانی جلد ۱ صفحہ ۱۹ حالات سر یہ عبداللہ بن رواحہ - ۲۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۶ و ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۲، ۸۳

۳۔ ابن سعد و زرقانی - ۴۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۰ - ۵۔ زرقانی

۶۔ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۲، ۸۳ و ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۷ و سیرۃ حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۳

گفتگو کے لیے امن وامان کا عہد لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت خطرہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مسلمان سمجھتے تھے کہ کہیں اس گفت و شنید کے درمیان ہی اُسیر کی طرف سے کوئی غداری کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اُسیر نے اقرار کیا کہ ایسا نہیں ہوگا مگر ساتھ ہی اپنی شرم رکھنے کے لیے اسی قسم کا عہد عبداللہ بن رواحہ سے بھی لیا۔ مگر عبداللہ بن رواحہ کی طرف سے اس معاملہ میں پہل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اصل خطرہ کس کی طرف سے تھا۔ بہر حال اس قول و قرار کے بعد عبداللہ بن رواحہ نے اُسیر سے گفتگو شروع کی جس کا مآل یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ ایک امن وامان کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ آپس کی جنگ رُک جائے اور اس کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ تم خود مدینہ میں چل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ بات کرو اگر اس قسم کا معاہدہ ہو گیا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ رسول اللہ تمہارے ساتھ احسان کا معاملہ کریں گے اور ممکن ہے کہ تمہیں خیبر کا باقاعدہ رئیس تسلیم کر لیا جائے۔ اُسیر کو سخت جاہ طلب تھا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں کوئی اور نیت مخفی ہو یہ تجویز پسند آئی اور کم از کم اُس نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے یہ تجویز پسند ہے مگر ساتھ ہی اُس نے خیبر کے یہودی عمائد کو جمع کر کے اُن سے مشورہ مانگا کہ مسلمانوں کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی ہے اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ یہود نے جو اسلام کے خلاف عامیاناہ عداوت میں اندھے ہو رہے تھے عام طور پر اس تجویز کی مخالفت کی اور اُسیر کو اس ارادے سے باز رکھنے کی غرض سے کہا کہ ہمیں اُمید نہیں کہ محمد (ﷺ) تمہیں خیبر کا امیر تسلیم کریں مگر اُسیر جو حالات سے زیادہ واقف تھا اپنی بات پر قائم رہا اور کہنے لگا: "تم نہیں جانتے۔ محمد اس جنگ سے تنگ آیا ہوا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ جس طرح ہو اس لڑائی کا سلسلہ رُک جائے۔"

الغرض اُسیر بن رزام عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی کے ساتھ مدینہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا اور عبداللہ بن رواحہ کی طرح خود اُس نے بھی تیس یہودی اپنے ساتھ لے لیے۔ جب یہ دونوں پارٹیاں خیبر سے نکل کر ایک مقام قرقرہ میں پہنچیں جو خیبر سے چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ تو اُسیر کی نیت بدل گئی یا اگر اُس کی نیت پہلے سے خراب تھی تو یوں سمجھنا چاہیے کہ اُس کے اظہار کا وقت آ گیا۔ چنانچہ اس نے باتیں کرتے کرتے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی پارٹی کے ایک معزز فرد عبداللہ بن انیس انصاری کی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ فوراً تاڑ گئے کہ اس بد بخت کے تیور بد سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جھٹ اپنی اونٹنی کو ایڑ لگا کر اُسے آگے کر لیا اور پھر اُسیر کی طرف گھوم کر آواز دی کہ "اے دشمن خدا کیا تم ہمارے ساتھ غداری کرنا چاہتے ہو؟" عبداللہ بن انیس نے دو دفعہ یہ الفاظ دہرائے۔ مگر اُسیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور نہ ہی اُس نے اپنی کوئی بریت کی بلکہ وہ سامنے سے جنگ کے لیے تیار تھا۔ یہ غالباً یہودیوں میں پہلے سے مقرر شدہ اشارہ تھا کہ ایسا موقع آئے تو سب مل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ اُسی جگہ عین راستہ میں مسلمانوں اور یہودیوں میں تلوار چل گئی۔ اور گودنوں پارٹیاں تعداد میں برابر تھیں اور یہودی لوگ پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھے اور مسلمان بالکل بے ارادہ تھے مگر خدا کا ایسا فضل ہوا کہ بعض مسلمان زخمی تو بے شک ہوتے مگر اُن میں سے کسی جان کا نقصان نہیں ہوا، لیکن دوسری طرف سارے یہودی اپنی غداری کا مزا چکھتے ہوئے خاک میں مل گئے۔

جب صحابہ کی یہ پارٹی مدینہ میں واپس پہنچی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات سے اطلاع ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کے صحیح سلامت بچ جانے پر خدا کا شکر کیا اور فرمایا:-

قَدْ نَجَّاكُمْ اللَّهُ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

”شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اس ظالم پارٹی سے نجات دی“

اس واقعہ کے متعلق بعض مسیحی مؤرخین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ گویا عبداللہ بن رواحہ کی پارٹی اُسیر وغیرہ کو خیر سے اسی نیت سے نکال کر لاتی تھی کہ رستہ میں موقع پا کر انہیں قتل کر دیا جائے مگر اعتراض مغربی سینہ زوری کے ایک ناگوار مظاہرہ کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے تاریخ میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمان اس نیت سے وہاں گئے تھے، بلکہ غور کیا جاوے تو قطع نظر دوسرے شواہد کے صرف عبداللہ بن انیس کے یہ الفاظ ہی کہ ”اے دشمن خدا! کیا غداری کی نیت ہے؟“ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ ”شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اس ظالم پارٹی سے نجات دی۔“ اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مسلمانوں کی نیت بالکل صاف اور پُر امن تھی اور جو کچھ ہوا وہ محض اس غداری کا نتیجہ تھا جو یہودی لوگ حسبِ عادت مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہتے تھے مگر جسے خدا نے اپنے فیصل سے خود اُنہی پر اُلٹا دیا۔

آنحضرتؐ کے قتل کی سازش اور

سر یہ عمرو بن اُمیہ شوال ۳ھ

غزوہ احزاب کی ذلت بھری ناکامی کی یاد نے قریش مکہ کے تن بدن میں آگ لگا رکھی تھی اور طبعاً یہ قلبی آگ زیادہ تر ابوسفیان کے حصہ میں آئی تھی

جو مکہ کا رئیس تھا اور احزاب کی مہم میں خاص طور پر ذلت کی مار کھا چکا تھا۔ کچھ عرصہ تک ابوسفیان اس آگ میں اندر ہی اندر جلتا رہا مگر بالآخر معاملہ اس کی برداشت سے نکل گیا اور اس آگ کے مخفی شعلے باہر آنے شروع ہو گئے۔ طبعاً کفار کی سب سے زیادہ عداوت بلکہ درحقیقت اصل عداوت آنحضرت صلی اللہ



علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ تھی۔ اس لیے اب البوسفیان اس خیال میں پڑ گیا کہ جب ظاہری تدبیروں اور جیلوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کیوں کسی مخفی تدبیر سے محمد (ﷺ) کا خاتمہ نہ کر دیا جاتے۔ وہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد کوئی خاص پہرہ نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات آپ بالکل بے حفاظتی کی حالت میں ادھر ادھر آتے جاتے۔ شہر کے گلی کوچوں میں پھرتے۔ مسجد میں روزانہ کم از کم پانچ وقت نمازوں کے لیے تشریف لاتے اور سفروں میں بالکل بے تکلفانہ اور آزادانہ طور پر رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ اچھا موقع کسی کرایہ دار قافلے کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟ یہ خیال آتا تھا کہ البوسفیان نے اندر ہی اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تجویز بچتہ کرنی شروع کر دی۔

جب وہ پورے عزم کے ساتھ اس ارادے پر جم گیا تو اس نے ایک دن موقع پا کر اپنے مطلب کے چند قریشی نوجوانوں سے کہا کہ ”کیا تم میں سے کوئی ایسا جوان مرد نہیں جو مدینہ میں جا کر خضیفہ خضیفہ محمد (ﷺ) کا کام تمام کر دے؟ تم جانتے ہو کہ محمد کھلے طور پر مدینہ کی گلی کوچوں میں پھرتا ہے۔ ان نوجوانوں نے اس خیال کو سنا اور لے اڑے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک بدوی نوجوان البوسفیان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”میں نے آپ کی تجویز سنی ہے اور میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ میں ایک مضبوط دل والا اور پختہ کار انسان ہوں جس کی گرفت سخت اور حملہ فوری ہوتا ہے۔ اگر آپ مجھے اس کام کے لیے مقرر کر کے میری مدد کریں تو میں محمد (ﷺ) کو قتل کرنے کی غرض سے جانے کے لیے تیار ہوں۔ اور میرے پاس ایک ایسا خنجر ہے جو شکاری گدھ کے مخفی پروں کی طرح رہے گا۔ سو میں محمد (ﷺ) پر حملہ کروں گا اور پھر بھاگ کر کسی قافلہ میں مل جل جاؤں گا اور مسلمان مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔ اور میں مدینہ کے رستہ کا بھی خوب ماہر ہوں۔“ البوسفیان نے کہا۔ ”بس بس تم ہمارے مطلب کے آدمی ہو۔“ اس کے بعد البوسفیان نے اسے ایک تیز رو اونٹنی اور زادراہ وغیرہ دیکر رخصت کیا اور تاکید کی کہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا۔

مکہ سے رخصت ہو کر یہ شخص دن کو چھپتا ہوا اور رات کو سفر کرتا ہوا مدینہ کی طرف روانہ ہوا اور چھٹے دن مدینہ پہنچ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ لیتے ہوئے سیدہا قبیلہ بنی عبد الشمل کی مسجد میں پہنچا جہاں آپ اس وقت تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ چونکہ ان ایام میں نئے سے نئے آدمی مدینہ میں آتے رہتے تھے اس لیے کسی مسلمان کو اس کے متعلق شبہ نہیں ہوا۔ مگر جو نبی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا آپ نے فرمایا یہ شخص کسی بُری نیت سے آیا ہے۔ وہ یہ الفاظ سنکر اور بھی تیزی کے ساتھ آپ کی طرف بڑھا مگر ایک انصاری رئیس اسید بن خضیر فوراً لپک کر اس کے



ساتھ لپٹ گئے اور اس جدوجہد میں اُن کا ہاتھ اُس کی چچی ہوتی خنجر پر جا پڑا جس پر وہ گھبرا کر بولا "میرا خون میرا خون" جب اُسے مغلوب کر لیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو اور کس ارادے سے آئے ہو؟ اُس نے کہا میری جان بخشی کی جاتے تو میں بتا دوں گا۔ آپ نے فرمایا ہاں اگر تم ساری بات سچ سچ بتا دو تو پھر تمہیں معاف کر دیا جائے گا جس پر اُس نے سارا قصہ من وعن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ البوسفیان نے اُس سے اس قدر انعام کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد یہ شخص چند دن تک مدینہ میں ٹھہرا اور پھر اپنی خوشی سے مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گیا۔

البوسفیان کی اس خونی سازش نے اس بات کو آگے سے بھی زیادہ ضروری کر دیا کہ مکہ والوں کے ارادے اور نیت سے آگاہی رکھی جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے دو صحابی عمرو بن امیہ ضمیری اور سلمہ بن اسلم کو مکہ کی طرف روانہ فرمایا اور البوسفیان کی اس سازش قتل اور اس کی سابقہ خون آشام کارروائیوں کو دیکھتے ہوتے انہیں اجازت دی کہ اگر موقع پائیں تو بے شک اسلام کے اس حربی دشمن کا خاتمہ کر دیں مگر جب اُمیہ اور اُن کا ساتھی مکہ میں پہنچے تو قریش ہوشیار ہو گئے اور یہ دو صحابی اپنی جان بچا کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔ راستہ میں انہیں قریش کے دو جاسوس مل گئے جنہیں رؤساء قریش نے مسلمانوں کی حرکات و سکنات کا پتہ لینے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا علم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ تدبیر بھی قریش کی کسی اور خونی سازش کا پیش خیمہ ہو مگر خدا کا فضل ہوا کہ اُمیہ اور سلمہ کو انکی جاسوسی کا پتہ چل گیا جس پر انہوں نے ان جاسوسوں پر حملہ کر کے انہیں قید کر لینا چاہا مگر انہوں نے سامنے سے مقابلہ کیا۔ چنانچہ اس لڑائی میں ایک جاسوس نو مارا گیا اور دوسرے کو قید کر کے وہ اپنے ساتھ مدینہ میں واپس لے آئے۔

اس سربہ کی تاریخ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ ابن ہشام اور طبری اسے ۳۰ھ میں بیان کرتے ہیں مگر ابن سعد نے اسے ۳۰ھ میں لکھا ہے اور علامہ قسطلانی اور زرقانی نے ابن سعد کی روایت کو ترجیح دی ہے لہذا میں نے بھی اسے ۳۰ھ میں بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ابن سعد کی روایت کے مفہوم کی تائید بیہقی نے بھی کی ہے یہ مگر اس میں اس واقعہ کے زمانہ کا پتہ نہیں چلتا۔

ۛ

۱۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۸ و زرقانی جلد ۲ حالات سربہ عمرو بن امیہ ضمیری۔

۲۔ ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۶۸ و زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۸ و ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸۹ و طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۳۔

۳۔ تہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۷۷۔

## قبائلِ عکَل و عَرینہ کی غداری اور اسکا ہولناک انجام شوال سنہ ۶

مسلمانوں کے لیے یہ دن بہت خطرناک تھے کیونکہ قریش اور یہود کی انگلیخت سے سارا ملک اُن کی عداوت کی آگ سے شعلہ زن ہو رہا تھا اور اپنی

جدید پالیسی کے ماتحت اُنہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ مدینہ پر باقاعدہ حملہ کرنے کی بجائے درپردہ طریقوں سے نقصان پہنچایا جائے اور چونکہ دھوکا دہی اور غداری عرب کے وحشی قبائل کے اخلاق کا حصہ تھی اس لیے وہ ہر جائز و ناجائز طریق سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے چنانچہ جس واقعہ کا ذکر ہم اب کر رہے ہیں وہ اسی ناپاک سلسلہ کی ایک کڑی تھی جو ایک ہولناک رنگ میں اپنے انجام کو پہنچی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ شوال سنہ ۶ میں قبیلہ عکَل اور عَرینہ کے چند آدمی جو تعداد میں آٹھ تھے مدینہ میں آئے اور اسلام کے ساتھ محبت اور موانست کا اظہار کر کے مسلمان ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے قیام کے بعد انہیں مدینہ کی آب و ہوا میں معدہ اور تلی وغیرہ کی جو کچھ شکایت پیدا ہوئی تو وہ اُسے بہانہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تکلیف بیان کر کے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم جنگلی لوگ ہیں اور جانوروں کے ساتھ رہنے میں عمر گزاری ہے اور شہری زندگی کے عادی نہیں اس لیے ہمیں یہاں سے ہٹا کر مدینہ میں فرمایا کہ اگر تمہیں یہاں مدینہ میں تکلیف ہے تو مدینہ سے باہر جہاں ہمارے مویشی رہتے ہیں وہاں چلے جاؤ اور اونٹوں کا دودھ وغیرہ پیتے رہو۔ اچھے ہو جاؤ گے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ انہوں نے خود کہا کہ یا رسول اللہ اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم مدینہ سے باہر جہاں آپ کے مویشی رہتے ہیں وہاں چلے جاتے ہیں جس کی آپ نے اجازت دے دی بہر حال وہ آنحضرت سے اجازت لیکر مدینہ سے باہر اُس چراگاہ میں چلے گئے جہاں مسلمانوں کے اونٹ رہتے تھے۔

جب ان بدبختوں نے یہاں اپنا ڈیرا جمایا اور آگے پیچھے نظر ڈال کر سارے حالات معلوم کر لیے اور گھٹی ہوا میں رہ کر اونٹوں کا دودھ پی کر خوب موٹے تازے ہو گئے تو ایک دن اچانک اونٹوں کے رکھوالوں پر حملہ کر کے انہیں مار دیا اور مارا بھی اس بے دردی سے کہ پہلے تو جانوروں کی طرح دیر کھا اور پھر جب ابھی کچھ جان باقی تھی تو اُن کی زبانوں میں صحرا کے تیز کانٹے چبھوئے تاکہ جب وہ کمنہ سے کوئی آواز نکالیں یا پیاس کی وجہ سے تڑپیں تو یہ کانٹے اُن کی تکلیف کو اور بھی بڑھاویں۔ اور پھر ان ظالموں

۱۔ ابن سعد۔ ۲۔ بخاری کتاب المغازی۔ ۳۔ مسلم کتاب القسامۃ۔ ۴۔ بخاری کتاب المغازی و

کتاب المحاربین۔ ۵۔ البخاری بروایت زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۔

۶۔ ابن ہشام وابن سعد

نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ گرم سلاٹیاں بیکر ان نیم مردہ مسلمانوں کی آنکھوں میں پھیریں۔ اور اس طرح یہ بے گناہ مسلمان کھلے میدان میں تڑپ تڑپ کر جان بحق ہو گئے۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ذاتی خادم بھی تھا جس کا نام یسار تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹوں کے چرانے پر مقرر تھا۔

جب یہ درندے اس وحشیانہ رنگ میں مسلمانوں کا کام تمام کر چکے تو پھر سارے اونٹوں کو اکٹھا کر کے انہیں ہزکا لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ حالات ایک رکھوالے نے پہنچائے جو اتفاق سے بچ کر نکل آیا تھا جس پر آپ نے فوراً بیس صحابہ کی ایک پارٹی تیار کر کے اُن کے پیچھے بھجوا دی اور گو یہ لوگ کچھ فاصلہ طے کر چکے تھے مگر خدا کا یہ فضل ہوا کہ مسلمانوں نے پھرتی کے ساتھ پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا اور رسیوں سے باندھ کر واپس لے آئے۔ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ احکام نازل نہیں ہوئے تھے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکت کرے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے چنانچہ آپ نے اپنے قدیم اصول کے ماتحت کہ جب تک اسلام میں کوئی نیا حکم نازل نہ ہوا اہل کتاب کے طریق پر چلنا چاہیے۔ موسوی شریعت کے مطابق حکم دیا کہ جس طرح ان ظالموں نے مسلمان رکھوالوں کے ساتھ سلوک کیا ہے اسی طرح قصاصی اور جوانی صورت میں ان کے ساتھ کیا جائے۔ تاکہ یہ سزا دوسروں کے لیے عبرت ہو۔ چنانچہ خفیف تغیر کے ساتھ اُسی رنگ میں مدینہ سے باہر گھلے میدان میں ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا مگر اسلام کے لیے خدا نے دوسری تعلیم مقدر کر رکھی تھی چنانچہ آئندہ کیلئے جوانی اور قصاصی صورت میں بھی شہد کی سزا منع کر دی گئی یعنی اس بات کو ناجائز قرار دیا گیا کہ کسی رنگ میں مقتول کے جسم کو بگاڑا جائے یا انتقامی رنگ میں اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے وغیرہ ذالک۔

اس واقعہ کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ بہر حال اس معاملہ میں ظلم کی ابتداء کفار کی طرف سے تھی جنہوں نے بغیر کسی جائز وجہ کے محض اسلام کی عداوت میں بے گناہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا اور جو کچھ اُن کی سزائیں کیا گیا وہ محض قصاصی اور جوانی تھا اور تھا بھی ایسے حالات میں جب کہ اسلام کے خلاف سارا ملک دشمنی اور عداوت کی آگ بے بجبرک رہا تھا۔ اور پھر یہ فیصلہ بھی موسوی شریعت کے مطابق کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی اسلام نے اسے برقرار نہیں رکھا اور آئندہ کے لیے ایسے طریق سے منع کر دیا۔ ان حالات میں کوئی عقل مند اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس موقع

۱۔ مسلم کتاب انقسامہ باب حکم المحاربین اور ترمذی کتاب الطہارۃ ماجار فی بول مایوکل لمحہ۔ ۲۔ ابن ہشام

۳۔ بخاری کتاب اللباس باب الفرق۔ ۴۔ خروج ۲۱ و اجابار ۲۲ و استثناء ۱۹

۵۔ بخاری کتاب المغازی قصہ عکلی و عربہ و ابن سعد حالات سر یہ کوز بن جابر و سر ولیم مور صف ۳۵

پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ لوگ شروع سے ہی بُری نیت کے ساتھ مدینہ میں آئے تھے اور غالباً اپنے قبیلہ کے سکھاتے ہوئے تھے کہ تا مسلمانوں میں رہ کر انہیں نقصان پہنچائیں اور ممکن ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اُن کا کوئی بُرا ارادہ ہو مگر جب مدینہ میں رہ کر انہیں کوئی موقع نہیں ملا تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ مدینہ سے باہر نکل کر کارروائی کی جاوے۔ اُنکی اس نیت کا اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے چرواہوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ خالی چوروں اور لیٹروں والا سلوک نہیں تھا بلکہ سرسرمہ منتہمانہ رنگ رکھتا تھا۔ اگر وہ ابتداء میں سچے دل سے مسلمان ہوتے تھے اور بعد میں اونٹ دیکھ کر اُن کی نیت بدل گئی تو اس صورت میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ اونٹ لے کر بھاگ جاتے اور اگر کوئی رکھوالا روک بٹا تو زیادہ سے زیادہ اُسے مار کر نکل جاتے مگر جس رنگ میں انہوں نے مسلمان چرواہوں کو قتل کیا اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر قتل کے سفاکانہ فعل کو لمبا کیا اور عذاب دے دیکر مارا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا یہ فعل اتفاقی لالچ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سرسرمہ معاندانہ رنگ رکھتا تھا اور دلی کینہ اور لمبے بغض کا نتیجہ تھا۔ اور اُن کے اس ظالمانہ فعل کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا وہ محض قصاصی اور جوابی تھا جو اسلامی احکام کے نزول سے پہلے موسوی شریعت کے مطابق کیا گیا، لیکن اس کے بعد جلد ہی اسلامی احکام نازل ہو گئے اور اس قسم کی تعذیب انتقامی رنگ میں بھی ناجائز قرار دیدی گئی چنانچہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں :-

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعْدَ ذَلِكَ كَانَ يَحُثُّ عَلَى الصَّدَاقَةِ وَيَنْهَى  
عَنِ الْمُثْلَةِ ۚ

یعنی "اس واقعہ کے بعد آنحضرت ﷺ احسان اور حُسن سلوک کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور ہر حال میں دشمنوں کے جسموں کے مُثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے"

بعض مغربی محققین نے جن میں میور صاحب بھی شامل ہیں۔ اس واقعہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے حسبِ عادت اعتراض کیا ہے کہ جس رنگ میں اُن قاتل ڈاکوؤں کو قتل کیا گیا وہ ظالمانہ اور وحشیانہ تھا، لیکن اگر سارے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اس معاملہ میں اسلام کا دامن بالکل پاک نظر آتا ہے کیونکہ دراصل یہ فیصلہ اسلام کا نہیں تھا بلکہ حضرت موسیٰ کا تھا۔ جنکی شریعت کو حضرت مسیح ناصری نے منسوخ نہیں کیا بلکہ برقرار رکھا ہے ہاں اگر ہمارے معترضین کے پیش نظر حضرت مسیح



کا یہ قول ہے کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دو اور اگر کوئی شخص تمہارا گرتہ لینا چاہے تو اُسے اپنا چوغہ بھی دیدو اور اگر کوئی تمہیں ایک کوس بیگارے جا چاہے تو دو کوس چلے جاؤ۔ تو بے شک ہمارے مقررین کو اس اعتراض کا حق ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم کسی عقلمند کے نزدیک قابل عمل ہے اور کیا آج تک ان ساڑھے انیس سو سالوں میں کسی مسیحی مرد یا عورت یا کسی مسیحی جماعت یا حکومت نے اس تعلیم پر عمل کیا ہے؟ منبروں پر چڑھ کر وعظ کرنے کے لیے بیشک یہ ایک عمدہ تعلیم ہے مگر عملی دنیا میں اس تعلیم کو کوئی بھی وزن حاصل نہیں اور نہ کوئی عقل مند اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس قسم کے جذباتی کھلونے سامنے رکھ کر مسلمانوں کو اعتراض کا نشانہ بنانا خود اپنی جمالت کا ثبوت دینا ہے۔ ہاں حضرت موسیٰ کی تعلیم کو سامنے رکھ کر دیکھو جو بخلاف حضرت مسیح ایک سچے مفتن تھے اور قانون کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے یا مسیحیوں کے قول کو نہیں بلکہ اُن کے عملی کارناموں کی روشنی میں حالات کا امتحان کرو تو پھر حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عملی میدان میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے اور اُس کے کھانے کے دانت اور دکھانے کے دانت الگ الگ نہیں ہیں اور اس کے قول و فعل ہر دو اُس اعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ کوئی عقلمند غیر متعصب انسان ان پر اعتراض نہیں کر سکتا بلکہ دل سے اُس کی تعریف نکلتی ہے۔ نہ تو وہ موسوی شریعت کی طرح یہ کہتا ہے کہ ہر حالت میں انتقام لو اور بلا امتیاز حالات قصاص کا ثبوت چلاتے جاؤ اور نہ وہ مسیحی تعلیم کے مطابق یہ ہدایت کرتا ہے کہ کسی حالت میں بھی سزا نہ دو بلکہ اگر مجرم کوئی مجرم کرے تو اس کے مجرم کے منشاء کو اپنی طرف سے مدد کر کے اور بھی مضبوط کر دو۔ بلکہ اسلام افراط و تفریط کے رستے کو چھوڑ کر وہ وسطی تعلیم دیتا ہے جو دنیا میں حقیقی امن کی بنیاد ہے اور وہ یہ کہ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ یعنی ہر بدی کی سزا اُس کے مناسب حال اور اُس کی شدت کے مطابق ہونی چاہیے، لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ معاف کرنے یا نرمی کرنے سے اصلاح کی امید ہو تو پھر معاف کرنا یا نرمی کرنا بہتر ہے اور ایسا شخص خدا کے نزدیک نیک اجر کا مستحق ہوگا۔ یہ وہ تعلیم ہے جو اسلام نے اس بارے میں دی اور کوئی عقلمند اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ایک بہترین تعلیم ہے جس میں انسانی ضروریات کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا ہے اور سزا کی صورت میں بھی اسلام نے یہ قید لگا دی ہے کہ وہ مناسب حد سے آگے نہ گزرے۔ اور مثلاً وغیرہ کے وحشیانہ افعال کو یک قلم بند کر دیا گیا۔ اسکے مقابل پر مسیحی لوگ باوجود حضرت مسیح ناصرؑ کی اس نمائشی تعلیم کے جو علیٰ نمونہ دشمنوں کیساتھ سلوک کا دکھاتے رہے ہیں اور جنگوں میں جن افعال کے مرتکب ہوتے رہے ہیں وہ تاریخ عالم کا ایک کھلا ہوا ورق ہے جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں۔



# صلح حدیبیہ اور اُس کے عظیم الشان نتائج

(ذوقعدہ ۱۳۸۰ھ)

## صلح حدیبیہ کی اہمیت

اب ہم اسلامی تاریخ کے اُس حصہ میں داخل ہونے لگے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے دوسرے دور میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میری مراد صلح حدیبیہ سے ہے جس کے نتیجے میں کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگ و جدال کا سلسلہ بند ہو کر اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور دنیا کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع میسر آیا کہ اسلام کی اصل طاقت صلح میں ہے نہ کہ جنگ میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں بظاہر جنگ نہیں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ روماء قریش کی حکومت کے ماتحت زندگی گزارتے تھے مگر قریش کی یہ حکومت جنگ سے بھی بڑھ کر مظالم و مصائب کا منظر پیش کرتی تھی کیونکہ قریش کی ساری طاقت اسلام کو مٹانے میں خرچ ہو رہی تھی۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا دور آیا تو اُس کے ساتھ ہی جنگ کا آغاز ہو گیا اور بے چارے مسلمان ایک مصیبت میں سے نکل کر دوسری مصیبت اور بعض لحاظ سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، اس لیے حقیقتاً آج تک اسلام کو اپنی صلح کی طاقت کے اظہار کا موقع ہی نہیں ملا تھا، لیکن صلح حدیبیہ نے جس کا اب ہم ذکر شروع کرنے لگے ہیں یہ موقع میسر کر دیا۔ اور دنیا جانتی ہے کہ اس امتحان میں اسلام نے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت کر دی کہ اس کی صلح کی طاقت اس کی جنگ کی طاقت سے بدرجہا بہتر اور بدرجہا افضل ہے۔ الغرض وہ تاریخی واقعہ جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اور ہم اپنے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے حالات کو نظر غور سے مطالعہ فرمائیں۔

## آنحضرت ﷺ کی خواب اور سفر حدیبیہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے تو

اس کے جلد بعد ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کی طرف سے بدل کر بیت اللہ کی طرف پھیر دیا تھا اور اس تحویل قبلہ کے ساتھ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی دیا

تھا کہ اپنی توجہ کو مکہ کی طرف لگاتے رکھیں اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ مکہ اسلام کا مذہبی مرکز ہے جو جتنی جلدی بھی ممکن ہو مسلمانوں کے قبضہ میں آجانا چاہیے۔ ان احکام کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ مکہ کی طرف خیال لگا رہتا تھا اور پھر وطن ہونے کی وجہ سے بھی آپ کو اور آپ کے ساتھ کے مہاجرین کو مکہ کے ساتھ طبعاً خاص محبت تھی۔ اس پر اتفاق یہ ہوا کہ انہی دنوں میں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھی کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس وقت ذوقعدہ کا مہینہ قریب تھا جو زمانہ جاہلیت میں بھی ان چار مبارک مہینوں میں سے سمجھا جاتا تھا جن میں ہر قسم کا جنگ و جدال منع تھا۔ گویا ایک طرف آپ نے یہ خواب دیکھی اور دوسری طرف یہ وقت بھی ایسا تھا کہ جب عرب کے طول و عرض میں جنگ کا سلسلہ رک کر امن و امان ہو جاتا تھا اور گویہ حج کے دن نہیں تھے اور ابھی تک اسلام میں حج باقاعدہ طور پر مقرر بھی نہیں ہوا تھا، لیکن خانہ کعبہ کا طواف ہر وقت ہو سکتا تھا اس لیے آپ نے اس خواب دیکھنے کے بعد اپنے صحابہ سے تحریک فرمائی کہ وہ عمرہ کے واسطے تیاری کر لیں۔ عمرہ گویا ایک چھوٹی قسم کا حج تھا جس میں حج کے بغض مناسک کو ترک کر کے صرف بیت اللہ کے طواف اور قربانی پر اکتفا کی جاتی تھی اور بخلاف حج کے اس کیلئے سال کا کوئی خاص حصہ بھی معین نہیں تھا بلکہ یہ عبادت ہر موسم میں ادا کی جاسکتی تھی۔ اس موقع پر آپ نے صحابہ میں یہ بھی اعلان فرمایا کہ چونکہ اس سفر میں کسی قسم کا جنگی مقابلہ مقصود نہیں ہے بلکہ محض ایک پر امن دینی عبادت کا بجالانا مقصود ہے اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس سفر میں اپنے ہتھیار ساتھ نہ لیں البتہ عرب کے دستور کے مطابق صرف اپنی تلواروں کو نیا موموں کے اندر بند کر کے مسافرانہ طریق پر اپنے ساتھ رکھا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی آپ نے مدینہ کے گرد و نواح کے بدوی لوگوں میں بھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے یہ تحریک فرمائی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر عمرہ کی عبادت بجالائیں مگر افسوس ہے کہ ایک نہایت قلیل یعنی برائے نام تعداد کے سوا ان مسلمان کھلانے والے کمزور ایمان بدوی لوگوں نے جو مدینہ کے آس پاس آباد تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے سے احتراز کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ خواہ مسلمانوں کی نیت عمرہ کے سوا کچھ نہیں مگر قریش بہ حال مسلمانوں کو روکیں گے اور اس طرح مقابلہ کی صورت پیدا ہو جائے گی اور وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہ مقابلہ مکہ کے قریب اور مدینہ سے دور ہو گا اس لیے کوئی مسلمان بچ کر واپس نہیں آسکے گا تاکہ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اوپر چودہ سو صحابیوں کی جمعیت کے ساتھ ذوقعدہ سنہ ۶ کے شروع میں پیر کے دن بوقت صبح مدینہ سے

روانہ ہوئے۔ اس سفر میں آپ کی زوجہ محترمہ حضرت اُم سلمہؓ آپ کے ہم رکاب تھیں اور مدینہ کا امیر نمیلہ بن عبداللہ کو اور امام صلوة عبداللہ بن اُم مکتوم کو جو آنکھوں سے معذور تھے مقرر کیا گیا تھا یہ

جب آپ ذوالحلیفہ میں پہنچے جو مدینہ سے قریباً چھ میل کے فاصلہ پر مکہ کے رستہ پر واقع ہے تو آپ نے ٹھہرنے کا حکم دیا اور نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد قربانی کے اونٹوں کو جو تعداد میں ستر تھے نشان لگاتے جانے کا ارشاد فرمایا اور صحابہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ حاجیوں کا مخصوص لباس جو اصطلاحاً احرام کہلاتا ہے پہن لیں اور آپ نے خود بھی احرام باندھ لیا۔ اور پھر قریش کے حالات کا علم حاصل کرنے کے لیے کہا یا وہ کسی شرارت کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔ ایک خبر رساں اُس بن سفیان نامی کو جو قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا جو مکہ کے قُرب میں آباد تھے آگے بھجوا کر آہستہ آہستہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے یہ اور مزید احتیاط کے طور پر مسلمانوں کی بڑی جمعیت کے آگے آگے رہنے کے لئے عباد بن بشر کی کمان میں بیس سواروں کا ایک دستہ بھی متعین فرمایا یہ جب آپ چند روز کے سفر کے بعد عسفان کے قریب پہنچے جو مکہ سے قریباً دو منزل کے رستہ پر واقع ہے تو آپ کے خبر رساں نے واپس آ کر آپ کی خدمت میں اطلاع دی کہ قریش مکہ بہت جوش میں ہیں اور آپ کو روکنے کا پختہ عزم کئے ہوئے ہیں یہ حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے اپنے جوش اور وحشت کے اظہار کے لیے چیتوں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور جنگ کا پختہ عزم کر کے بہر صورت مسلمانوں کو روکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قریش نے اپنے چند جانباہر سواروں کا ایک دستہ خالد بن لبد کی کمان میں جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آگے بھجوا دیا ہے۔ اور یہ کہ یہ دستہ اس وقت مسلمانوں کے قریب پہنچا ہوا ہے اور اس دستہ میں عکرمہ بن ابوہل بھی شامل ہے وغیرہ وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سنی تو تصادم سے بچنے کی غرض سے صحابہ کو حکم دیا کہ مکہ کے معروف رستہ کو چھوڑ کر دائیں جانب ہوتے ہوئے آگے بڑھیں۔ چنانچہ مسلمان ایک دشوار گزار اور کٹھن رستہ پر پڑ کر سمندر کی جانب ہوتے ہوئے آگے بڑھنا شروع ہوئے یہ

جب آپ اس نئے رستہ پر چلتے ہوئے حدیبیہ کے قریب پہنچے جو مکہ سے ایک منزل یعنی صرف نو میل کے فاصلہ پر ہے اور حدیبیہ کی گھاٹیوں پر سے مکہ کی وادی کا آغاز ہو جاتا ہے تو آپ کی اونٹنی جو القصوا کے نام سے مشہور تھی اور بہت سے غزوات میں آپ کے استعمال میں رہ چکی تھی بیکھنت پاؤں پھیلا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور باوجود اٹھانے کے اٹھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ شاید یہ تھک

۱۔ ابن سعد ابن ہشام وطبری و زرقانی۔ ۲۔ ابن سعد۔ ۳۔ ابن ہشام۔ ۴۔ ابن سعد و نجاش

۵۔ بخاری کتاب الغازی باب غزوة الحدیبیہ من مسور مردان۔ ۶۔ ابن ہشام وطبری حالات صلح حدیبیہ

۷۔ ابن سعد

گئی ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں نہیں یہ تھکی نہیں اور نہ ہی اس طرح تھک کر بیٹھ جانا اس کی عادت میں داخل ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جس بالامستی نے اس سے پہلے اصحاب فیل کے ہاتھی کو مکہ کی طرف بڑھنے سے روکا تھا اُسی نے اب اس اونٹنی کو بھی روکا ہے۔ پس خدا کی قسم مکہ کے قریش جو مطالبہ بھی حرم کی عزت کے لیے مجھ سے کریں گے میں اُسے قبول کروں گا۔" اس کے بعد آپؐ نے اپنی اونٹنی کو پھر اٹھنے کی آواز دی اور خدا کی قدرت کہ اس دفعہ وہ جھٹ اُٹھ کر چلنے کو تیار ہو گئی۔ اس پر آپؐ اُسے وادیِ حدیبیہ کے پرلے کنارے کی طرف لے گئے اور وہاں ایک چشمہ کے پاس ٹھہر کر اونٹنی سے نیچے اُتر آئے اور اسی جگہ آپؐ کے فرمانے پر صحابہ نے ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

مسلمانوں کو پانی کی تکلیف  
اور تکثیر المار کا معجزہ

ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ صحابہ کی ایک پارٹی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ چشمہ کا پانی ختم ہو کر خشک ہو گیا ہے اور اب انسان اور جانور سخت تکلیف میں ہیں۔ اس کے لیے کیا کیا جائے؟ آپؐ نے ایک تیریا اور حکم دیا کہ اس تیر کو خشک شدہ چشمہ کی تہ میں نصب کر دیا جائے۔ اور آپؐ خود چشمہ کے کنارے پر تشریف لا کر وہاں بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی لیکر اُسے اپنے مُنہ میں ڈالا اور پھر خدا سے دُعا کرتے ہوئے یہ پانی اپنے مُنہ میں سے چشمہ کے اندر اُنڈیل دیا اور صحابہ سے فرمایا کہ اب تھوڑی دیر انتظار کرو۔ چنانچہ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ چشمہ کے اندر اتنا پانی بھر آیا کہ سب نے اپنی اپنی ضرورت کے لیے استعمال کیا اور پانی کی تکلیف جاتی رہی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ اُسی رات یا اُس کے قریب بارش بھی ہو گئی۔ چنانچہ جب

۱۔ بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد

۲۔ اس سے پہلے دورانِ سفر میں بھی ایک دفعہ پانی کی تکلیف ہو چکی تھی جب کہ ایک وقت ایسا آیا تھا کہ سوائے اس لوٹے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ استعمال تھا ہر برتن پانی سے خالی ہو گیا تھا۔ اس موقع پر آپؐ نے صحابہ کی طرف سے پانی کی شکایت ہونے پر اپنے لوٹے کے مُنہ پر اپنا دست مبارک رکھا اور لوٹے کے مُنہ کو جھکاتے ہوئے صحابہ سے فرمایا کہ اب اپنے اپنے برتن لاؤ اور بھرو۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اُس وقت آپؐ کی انگلیوں کے اندر سے پانی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا تھا کہ گویا ایک چشمہ جاری ہے۔ حتیٰ کہ سب نے اپنی ضرورت کے مطابق پانی لے لیا اور مسلمانوں کی تکلیف جاتی رہی۔ بخاری کتاب المغازی روایت جابر بن

عبداللہ دسیرۃ علیہ حالات صلح حدیبیہ۔ ۳۔ بخاری کتاب الشروط

۴۔ بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیہ عن براء بن عازب



صبح کی نماز کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو میدان پانی سے تر ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سُکراتے ہوئے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس بارش کے موقع پر تمہارے خدا نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ صحابہ نے حسبِ عادت عرض کیا کہ خدا اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندوں میں سے بعض نے تو یہ صبح حقیقی ایمان کی حالت میں کی ہے مگر بعض کفر کی حالت میں پڑ کر ڈگمگا گئے۔ کیونکہ جس بندے نے تو یہ کہا کہ ہم پر خدا کے فضل و رحم سے بارش ہوئی ہے وہ تو ایمان کی حقیقت پر قائم رہا مگر جس نے یہ کہا کہ یہ بارش فلاں فلاں ستارے کے اثر کے ماتحت ہوئی ہے تو وہ بیشک چاند سورج کا تو موثر ہو گیا، لیکن خدا کا اُس نے کفر کیا؟“ اس ارشاد سے جو توحید کی دولت سے محروم ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ سبق دیا کہ بے شک سلسلہ اسباب و علل کے ماتحت خدا نے اس کارخانہ عالم کو چلانے کے لیے مختلف قسم کے اسباب مقرر فرما رکھے ہیں اور بارشوں وغیرہ کے معاملہ میں اجرامِ سماوی کے اثر سے انکار نہیں مگر حقیقی توحید یہ ہے کہ باوجود درمیانی اسباب کے انسان کی نظر اُس وراء الوراہ ہستی کی طرف سے غافل نہ ہو جو ان سب اسباب کی پیدا کرنے والی اور اس کارخانہ عالم کی علتِ العلل ہے اور جس کے بغیر یہ ظاہری اسباب ایک مُردہ کپڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ سوال کہ اس موقع پر عام قانونِ قدرت کے خلاف چشمہ کا پانی کس طرح زیادہ ہو گیا؟

### معجزات کے متعلق ایک مختصر اصولی نوٹ

معجزات کی بحث سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق ہم اس کتاب میں دوسری جگہ ایک اصولی نوٹ درج کر چکے ہیں اور اس جگہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل معجزات کی بحث دو اصولی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ عقلی دلائل سے تعلق رکھتا ہے جن سے معجزات کا امکان اور اُن کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اور دوسرا حصہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے جس سے معجزات کا عملاً وقوع میں آنا ثابت ہوتا ہے۔ عقلی دلائل کا نتیجہ صرف اس حد تک ہے کہ معجزہ وقوع میں آ سکتا ہے اور یہ کہ انسان کی روحانیت کی تکمیل کے لیے اُسے وقوع میں آنا چاہیے۔ مگر اس سے آگے اس بات کے ثبوت کے لیے کہ معجزہ واقعی ہوتا بھی ہے مشاہدہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور خوش قسمتی سے اس قسم کے مشاہدہ کا وجود ہر نبی کے زمانہ میں اور ہر قوم کی تاریخ میں ملتا ہے مگر افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ کی عالمگیر روایت نے انسان کے روحانی کمالات اور روحانی حواس کو اس حد تک خاک میں ملا رکھا ہے کہ مادہ پرستی کے خیالات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا اور انسانیت کے اعلیٰ کمالات زمین دوز دینیوں کی



طرح نظروں سے دُور اور آنکھوں سے مستور ہو چکے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ خدا کا قانون دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جو اس کی نہ بدلنے والی سُنتوں اور اُس کے وعدوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی مُردہ زندہ ہو کر اس دُنیا میں دوبارہ واپس نہیں آ سکتا۔ اور دوسرا وہ جو ان دُواتروں کے علاوہ ہے مثلاً نیک اور بد بندوں کے ساتھ خدا کے سلوک کے اظہار کا طریق وغیرہ۔ پس جہاں تک اَوّل الذکر قانون کا تعلق ہے قرآن شریف بڑے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ وہ بالکل اُٹل ہے اور نہ صرف دُنیا کی تمام علمی و عملی ترقی بلکہ خدا کی شان اور وقار کا اظہار بھی اس کے اُٹل ہونے کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن مَوْخر الذکر قانون حالات کے اختلاف کے ساتھ اپنی صورت بدل سکتا ہے اور اس کا بدلنا خدا کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے اور اسی تبدیلی کے غیر معمولی ظہور کا نام معجزہ ہے۔ دراصل اگر اس دُنیا کا کوئی خدا ہے جس نے اس دُنیا کی چیزوں کو اور ان چیزوں کے خواص کو پیدا کیا ہے اور یہ خدا اپنے تختِ حکومت سے معزول و معطل نہیں ہو گیا اور اپنے قانون کا غلام نہیں بن گیا تو پھر اس خدا میں یہ قوت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اپنی سُنت اور وعدہ کی باتوں کو الگ رکھ کر جن میں بہر حال کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی وہ کسی حقیقی ضرورت کے وقت اپنے ایسے قانون کو جو اس کی کسی سُنت یا وعدہ کے دائرہ سے تعلق نہیں رکھتا خاص استثنائی رستہ پر چلا سکتا ہے یا بعض محض اسباب کے ذریعہ ایک ایسا ظاہری تغیر پیدا کر سکتا ہے جو بظاہر اشتناک کا رنگ رکھتا ہو اور اسی استثنائے یا خاص تقدیر الہی کے غیر معمولی ظہور کا نام معجزہ ہے۔

اور معجزہ کی ضرورت اس طرح ثابت ہے کہ جیسا کہ ہر سمجھدار انسان محسوس کر گیا محض عقلی دلیلوں کا وجود خدا کے متعلق اس حد تک کا ایمان ہرگز پیدا نہیں کر سکتا جو انسان کی رُوحانی زندگی کے لیے ضروری ہے کیونکہ عقلی دلیلیں زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ اس کا رِخاء عالم کا کوئی خالق و مالک ہونا چاہیے مگر ظاہر ہے کہ یہ "ہونا چاہیے" والا مقام محض ایک قیاس کا مقام ہے جسے قطعی اور زندہ یقین میں بدلنے کے لیے جسے ہم "ہے" کے مقام سے تعبیر کر سکتے ہیں الہام الہی اور معجزہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لیے ہر نبی اور رسول کے ساتھ معجزہ کا وجود لازم و ملزوم کے طور پر رہا ہے۔ اور اسلامی معجزات سے انکار کرنے والوں کی خود اپنی کُتب معجزات کے ذکر سے جن میں سے افسوس ہے کہ اکثر فرضی اور بلا ثبوت اور سُنتِ الہی کے خلاف ہیں، بھری پڑی ہیں۔ باقی رہا مشاہدہ کا سوال سو جن ابتدائی لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بیان کئے ہیں وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور دن رات آپ کی صحبت میں رہنے والے تھے انہوں نے اپنا ذاتی

مشاہدہ ہی بیان کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر روایت صحیح ہو اور راوی سچ بولتے والا اور سمجھدار ہو تو یہ مشاہدہ اُسی طرح قابل قبول ہے جس طرح کہ دُنیا کے دوسرے پختہ مشاہدات قابل قبول ہوتے ہیں۔ اور گو موجودہ مادی زمانہ میں رُوحانی اہل کمال کا وجود عُنقا کا رنگ رکھتا ہے مگر اس زمانہ میں بھی مقدس بانی سلسلہ احمدیہ نے معجزات کے متعلق معترضین کا جواب دیتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ ۱۔

کرامت گرچہ بے نام و نشان است      بیابنِ گرزِ غلمانِ محمّد !

یعنی "گو اس زمانہ میں معجزات کا وجود بے نام و نشان ہو چکا ہے مگر اے مُنکر

اسلام آ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے ہاتھ پر معجزات کا مشاہدہ کر لے"

ایک اور اصولی بات جو معجزات کے متعلق یاد رکھنی ضروری ہے اور جسے نظر انداز کرنے سے

اکثر مذاہب میں بعد میں آنے والوں کی دست برد سے جھوٹے اور فرضی معجزات کا وجود پیدا ہو گیا ہے یہ

ہے کہ معجزات کی غرض و غایت چونکہ ایمان پیدا کرنا یا پیدا شدہ ایمان کو مضبوط کرنا ہوتی ہے اور ایمان

کے لیے اُس کے ابتدائی مراحل میں کسی قدر اخفاء کا پردہ ضروری ہے اور اسی لیے قرآن شریف نے

اپنی ابتداء میں ہی ایمان بالغیب کے اصول کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ کامل مشاہدہ کے بعد ایمان کسی انعام

یا تعریف کا حقدار نہیں رہتا اس لیے سنت اللہ اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ سچے معجزات کبھی بھی

ایسی صورت میں ظاہر نہیں ہوتے کہ گویا بالکل شہود کا رنگ پیدا ہو جائے بلکہ کسی نہ کسی جہت سے کچھ نہ

کچھ اخفاء کا پردہ باقی رکھا جاتا ہے۔ اسی لیے اہل اللہ نے معجزات کی مثال دن کی تیز روشنی سے نہیں

دی بلکہ ایک ایسی چاندنی رات کی روشنی سے دی ہے جس میں کسی قدر بادل بھی ہوں۔ ایسی صورت میں

جہاں ایک طرف توجہ اور غور سے دیکھنے والوں کو رستہ نظر آ جاتا ہے وہاں دوسری طرف ہندی

اور کجرو لوگوں کے لیے شک کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے۔ البتہ بعض اوقات ایسے معجزات ہیں جو

صرف ان مومنوں کو دکھائے جاتے ہیں جو ایمان کے ابتدائی مراحل سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں

کسی قدر شہود کا رنگ پیدا کر دیا جاتا ہے مگر یہ ایک لمبا اور باریک سوال ہے جو تفصیلی بحث

چاہتا ہے اور اس مختصر اور ضمنی نوٹ میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ معجزات اور آیات کا وجود برحق ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا اور ہر نبی اور رسول

کے زمانہ میں اس کے ظہور کا دعویٰ فرماتا ہے مگر اول تو کوئی معجزہ خدا کی نہ بدلتے والی سنت

یا اُس کے کسی وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ایسا ہو تو دُنیا میں اندھیر پڑ جائے۔ اور قرآن

شریف نے صراحت کے ساتھ ایسے معجزات کے وجود سے انکار کیا ہے تب اور دوم کسی معجزہ میں

۱۔ سورۃ البقرہ: ۲۱۔ ۲۲ دیکھو براہین احمدیہ ج ۱ صفحہ ۱۱۱

۲۔ سورۃ الاحزاب: ۶۳ و سورۃ آل عمران: ۱۰۱

جو مکرین کو دکھانا مقصود ہو نصف النہار والی روشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ ایمان بالغیب کے اصول کے خلاف ہے جسے قرآن شریف نے اپنی ابتدا میں ہی بڑے زور کے ساتھ پیش کیا ہے یہ مکران دونوں حدود کے اندر اندر معجزہ ہو سکتا ہے اور ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا رہا ہے اور حق یہ ہے کہ اگر ایسے معجزات کا دروازہ بند ہو جاتے تو دنیا روحانی طور پر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

**قریش کیساتھ صلح کی گفتگو کا آغاز** معجزات کے متعلق یہ مختصر اور اصولی نوٹ دینے کے بعد ہم پھر اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے

ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی وادی میں پہنچ کر اس وادی کے چشمہ کے پاس قیام کیا۔ جب صحابہ اس جگہ ڈیرے ڈال چکے تو قبیلہ خزاعہ کا ایک نامور رئیس بدیل بن ورقا نامی جو قریب ہی کے علاقہ میں آباد تھا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لیے آیا اور اس نے آپ سے عرض کیا کہ مکہ کے رُوساہ جنگ کے لیے تیار کھڑے ہیں اور وہ بھی آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے فرمایا ”ہم تو جنگ کی غرض سے نہیں آتے بلکہ صرف عمرہ کی نیت سے آتے ہیں اور افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ قریش مکہ کو جنگ کی آگ نے جلا جلا کر خاک کر رکھا ہے مگر پھر بھی یہ لوگ باز نہیں آتے اور میں تو ان لوگوں کے ساتھ اس سمجھوتہ کے لیے بھی تیار ہوں کہ وہ میرے خلاف جنگ بند کر کے مجھے دوسرے لوگوں کے لیے آزاد چھوڑ دیں۔ لیکن اگر انہوں نے میری اس تجویز کو بھی رد کر دیا اور ہر صورت جنگ کی آگ کو بھڑکائے رکھا تو مجھے بھی اُس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ پھر میں بھی اس مقابلہ سے اُس وقت تک پیچھے نہیں ہٹوں گا کہ یا تو میری جان اس رستہ میں قربان ہو جائے اور یا خدا مجھے فتح عطا کرے۔ اگر میں ان کے مقابلہ میں آکر مٹ گیا تو قصہ ختم ہوا، لیکن اگر خدا نے مجھے فتح عطا کی اور میرے لائے ہوئے دین کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر مکہ والوں کو بھی ایمان لے آنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے، بدیل بن ورقا پر آپ کی اس مخلصانہ اور دردمندانہ تقریر کا بہت اثر ہوا اور اُس نے آپ سے عرض کیا کہ آپ مجھے کچھ مہلت دیں کہ میں مکہ میں جا کر آپ کا پیغام پہنچاؤں اور مصالحت کی کوشش کروں آپ نے اجازت دی اور بدیل اپنے قبیلہ کے چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب بدیل بن ورقا مکہ میں پہنچا تو اُس نے قریش کو جمع کر کے اُن سے کہا کہ میں اس شخص یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ ایسے موقعوں پر جب ایک معروف شخص کے متعلق گفتگو

کرنی ہو تو نام لینے کی بجائے "یہ شخص" یا "اس شخص" وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے [کے پاس آ رہا ہوں اور میرے سامنے اُس نے ایک تجویز پیش کی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کا ذکر کروں۔ اس پر قریش کے جوشیلے اور غیر ذمہ دار لوگ کہنے لگے۔ ہم اُس شخص کی کوئی بات سُنانے کے لیے تیار نہیں مگر اہل الرائے اور ثقہ لوگوں نے کہا۔ ہاں ہاں جو تجویز بھی ہے وہ ہمیں بتاؤ۔ چنانچہ بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تجویز کا اعادہ کیا۔ اس پر ایک شخص عروہ بن مسعود نامی جو قبیلہ ثقیف کا ایک بہت بااثر رئیس تھا اور اُس وقت مکہ میں موجود تھا کھڑا ہو گیا اور قدیم عربی انداز میں قریش سے کہنے لگا۔ "اے لوگو! کیا میں تمہارے باپ کی جگہ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا۔ "ہاں"۔ پھر اُس نے کہا۔ "کیا آپ لوگ میرے بیٹوں کی طرح نہیں ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "ہاں"۔ پھر عروہ نے کہا۔ "کیا تمہیں مجھ پر کسی قسم کی بے اعتمادی ہے؟" قریش نے کہا۔ "ہرگز نہیں"۔ اُس نے کہا۔ "تو پھر میری یہ رائے ہے کہ اس شخص (محمد ﷺ) نے آپ کے سامنے ایک عمدہ بات پیش کی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس تجویز کو قبول کر لیں اور مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کی طرف سے محمد (ﷺ) کے پاس جا کر مزید گفتگو کروں"۔ قریش نے کہا۔ "بے شک آپ جاتیں اور گفتگو کریں"۔ لہ

**آنحضرت ﷺ کی مجلس کا ایک نوح پرور نظارہ** عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپ کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ آپ نے اُس کے سامنے اپنی وہی تقریر دوہرائی جو اس سے قبل آپ بدیل بن ورقا کے سامنے فرما چکے تھے۔ عروہ اصولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے ساتھ متفق تھا مگر قریش کی سفارت کا حق ادا کرنے اور اُن کے حق میں زیادہ سے زیادہ شرائط محفوظ کرانے کی غرض سے کہنے لگا۔ "اے محمد اگر آپ نے اس جنگ میں اپنی قوم کو بلیا میٹ کر دیا تو کیا آپ نے عربوں میں کسی ایسے آدمی کا نام سُنا ہے جس نے آپ سے پہلے ایسا ظلم ڈھایا ہو۔ لیکن اگر بات دگرگوں ہوتی یعنی قریش کو غلبہ ہو گیا تو خدا کی قسم مجھے آپ کے ارد گرد ایسے مُنہ نظر آرہے ہیں کہ انہیں بھاگتے ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اور یہ سب لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے" حضرت ابو بکرؓ جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی بیٹھے تھے عروہ کے یہ الفاظ سُکر غصہ سے بھر گئے اور فرمانے لگے "جاؤ جاؤ اور لات کی شرمگاہ کو چومتے پھرو۔ کیا ہم خدا کے رسول کو چھوڑ جائیں گے؟" عروہ نے طیش میں

لے۔ بخاری کتاب الشروط۔ لے لات قبیلہ بنو ثقیف کا ایک مشہور بُت تھا اور حضرت ابو بکرؓ کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ بت پرست ہو اور ہم لوگ خدا پرست ہیں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم تو بتوں کی خاطر صبر و ثبات دکھاؤ اور ہم خدا پر ایمان لاتے ہوئے رسول خدا کو چھوڑ کر بھاگ جائیں؟



آکر پوچھا۔ یہ کون شخص ہے جو اس طرح میری بات کاٹتا ہے؟ لوگوں نے کہا "یہ ابو بکرؓ نہیں۔ ابو بکرؓ کا نام سُکر عروہ کی آنکھیں شرم سے نیچی ہو گئیں۔ کہنے لگا۔ اے ابو بکر! اگر میرے سر پر تمہارا ایک بھاری احسان نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں تمہیں اس وقت بتاتا کہ ایسی بات کا جو تم نے کہی ہے کس طرح جواب دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر عروہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوا اور اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نقطہ نظر کی طرف کھینچ لانے کی تدبیر کرتا رہا اور گاہے گاہے عرب کے دستور کے مطابق آپؐ کی ریش مبارک کو بھی ہاتھ لگا دیتا تھا۔ مگر جب کبھی بھی وہ ایسا کرتا ایک مخلص صحابی جن کا نام مغیرہ بن شعبہ تھا اور جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے تھے (اور رشتہ میں عروہ کے بھتیجے تھے) اپنی تلوار کے نیام سے عروہ کا ہاتھ جھٹک کر برے کر دیتے اور کہتے "اپنا ناپاک ہاتھ رسول مقبولؐ کے مبارک چہرہ سے دُور رکھو۔" چونکہ اس وقت مغیرہ کا چہرہ ایک خود کے اندر ڈھکا ہوا تھا عروہ نے انہیں نہ پہچانتے ہوئے پوچھا۔ یہ کون شخص ہے؟ لوگوں نے کہا۔ "یہ مغیرہ بن شعبہ ہے۔" عروہ نے حقارت اور غصہ سے کہا۔ "اے بے وفا! کیا تجھے میرا احسان بھول گیا؟" اس پر مغیرہ شرم سے جھینپ گئے۔ اُس وقت عروہ نے اپنے ارد گرد فخر کی نگاہ ڈالی مگر یہی نگاہ اُسے گھائل کر گئی۔ کیونکہ عروہ نے اُس وقت صحابہ کی جماعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد اس طرح جمع پایا جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے ہیں اور خود عروہ کا اپنا بیان ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے جوشِ محبت و اخلاص کا یہ عالم تھا کہ اگر پانی پیتے ہوئے آپؐ کے مُنہ سے کوئی قطرہ گرتا تو صحابہ اسے شوق سے اپنے ہاتھوں پر لیتے اور برکت کے خیال سے اُسے اپنے چہروں اور جسموں پر رکھ لیتے۔ اور جب آپؐ کسی چیز کا ارشاد فرماتے تو لوگ آپؐ کی آواز پر اس طرح لپکتے کہ گویا ایک مقابلہ ہو جاتا تھا۔ اور جب آپؐ وضو کرتے تو صحابہ اس شوق سے آپؐ کو وضو کروانے کے لیے آگے بڑھتے کہ گویا اس خدمت کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے لڑ پڑیں گے۔ اور جب آپؐ گفتگو فرماتے تو صحابہ خاموش ہو کر ہمہ تن گوش ہو جاتے اور محبت اور رُعب کی وجہ سے اُن کی نظریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اٹھ نہیں سکتی تھیں یہ۔

عروہ ان رُوح پرور نظاروں کو دیکھ کر اور آپؐ کے ساتھ گفتگو ختم کر کے قریش کی طرف لوٹاؤ۔

لے عروہ ایک دفعہ بھاری قرضہ کے نیچے دب گیا تھا اور حضرت ابو بکرؓ نے اپنے پاس سے اُس کا قرضہ ادا کر کے اس کی جان چھڑائی تھی۔ اُسے عروہ نے مغیرہ کے اسلام لانے سے پہلے اُن پر یہ احسان کیا تھا کہ اُن کی طرف سے بعض قتلوں کا خون بہا ادا کیا تھا اور عربوں میں احسان کی بڑی قدر و قیمت تھی جسے اسلام نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔

تے بخاری کتاب الشروط۔



جاتے ہی قریش سے کہنے لگا۔ "اے لوگو! میں نے دنیا میں بہت سفر کیا ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں شامل ہوا ہوں اور قیصر کسریٰ اور نجاشی کے سامنے بطور وفد کے پیش ہو چکا ہوں مگر خدا کی قسم جس طرح میں نے محمد (ﷺ) کے صحابیوں کو محمد کی عزت کرتے دیکھا ہے ایسا میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔" پھر اُس نے اپنا وہ سارا مشاہدہ بیان کیا جو اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دیکھا تھا اور آخر میں کہنے لگا۔ "میں پھر یہی مشورہ دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) کی تجویز ایک منصفانہ تجویز ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔"

عروہ کی یہ گفتگو سن کر قبیلہ بنی کنانہ کے ایک رئیس نے جس کا نام حلیس بن علقمہ تھا قریش سے کہا اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں محمد (ﷺ) کے پاس جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا "ہاں بے شک جاؤ۔" چنانچہ شخص حدیبیہ میں آیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دُور سے آتے دیکھا تو صحابہ سے فرمایا "یہ شخص جو ہماری طرف آرہا ہے ایسے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے جو قربانی کے مناظر کو پسند کرتے ہیں۔ پس فوراً اپنے قربانی کے جانوروں کو اکٹھا کر کے اُس کے سامنے لاؤ تاکہ اُسے پتہ لگے اور احساس پیدا ہو کہ ہم کس غرض سے آتے ہیں۔" چنانچہ صحابہ اپنے قربانی کے جانوروں کو ہنکاتے ہوئے اور تکبیروں کی آواز بلند کرتے ہوئے اُس کے سامنے جمع ہو گئے۔ جب اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو کہنے لگا۔ "سبحان اللہ سبحان اللہ یہ تو حاجی لوگ ہیں۔ انہیں بیت اللہ کے طواف سے کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔" چنانچہ وہ جلدی ہی قریش کی طرف واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہنے لگا۔ "میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے جانوروں کے گھے میں قربانی کے ہار باندھ رکھے ہیں اور اُن پر قربانی کے نشان لگائے ہوئے ہیں۔ پس یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ انہیں طواف کعبہ سے روکا جائے۔" لہ

قریش میں اس وقت ایک سخت انتشار کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور لوگوں کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک پارٹی بہر صورت مسلمانوں کو واپس لوٹانے پر مُصر تھی اور مقابلہ کے خیالات پر سختی سے قائم تھی۔ مگر دوسری پارٹی اسے اپنی قدیم مذہبی روایات کے خلاف پا کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اور کسی باعزت سمجھوتہ کی متمنی تھی اس لیے فیصلہ معلق چلا جا رہا تھا۔ اس موقع پر ایک اور عربی رئیس مکرز بن حفص نامی نے قریش سے کہا۔ "مجھے جانے دو میں کوئی فیصلہ کی راہ نکالوں گا۔" قریش نے کہا۔ "اچھا تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔" چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دُور سے آتے دیکھا تو فرمایا خدا خیر کرے یہ آدمی تو اچھا نہیں۔ بہر حال مکرز آپ کے پاس آیا اور گفتگو کرنے

لگا۔ مگر ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ مکہ کا ایک نامور رئیس سہیل بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جسے غالباً قریش نے اپنی گھبراہٹ میں مکرز کی واسطی کا انتظار کرنے کے بغیر بھجوا دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل کو آتے دیکھا تو فرمایا یہ سہیل آتا ہے۔ اب خدا نے چاہا تو معاملہ آسان ہو جاتے گا۔

### کفارِ مکہ کی فتنہ انگیزی

اس موقع پر ایک ضمنی مگر اہم واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جب قریش کی طرف سے پے در پے سفیر آنے شروع ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کر کے آپ کی طرف سے بھی کوئی فہمیدہ شخص قریش کی طرف جانا چاہیے جو انہیں ہمدردی اور دانائی کے ساتھ مسلمانوں کا زاویہ نظر سمجھا سکے ایک شخص خراش بن امیہ کو اس کام کے لیے چنا جو قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یعنی وہی قبیلہ جس سے قریش کے سب سے پہلے سفیر بدیل بن ورقا کا تعلق تھا اور اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خراش کو سواری کے لیے خود اپنا ایک اونٹ عطا فرمایا۔ خراش قریش کے پاس گیا مگر چونکہ ابھی یہ گفتگو کا ابتدائی مرحلہ تھا اور نوجوانانِ قریش بہت جوش میں تھے ایک جوشیہ نوجوان عکرمہ بن ابوہل نے خراش کے اونٹ پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا جس کے عربی دستور کے مطابق یہ معنی تھے کہ ہم تمہاری نقل و حرکت کو جبراً روکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قریش کی یہ جوشیلی پارٹی خود خراش پر بھی حملہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر بڑے بوڑھوں نے بیچ بچاؤ کر کے اس کی جان بچائی اور وہ اسلامی کیمپ میں واپس آ گیا۔

قریش مکہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے جوش میں اندھے ہو کر اس بات کا بھی ارادہ کیا کہ اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ مکہ سے اس قدر قریب اور مدینہ سے اتنی دور آئے ہوئے ہیں تو ان پر حملہ کر کے جہاں تک ممکن ہو نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے چالیس پچاس آدمیوں کی ایک پارٹی حدیبیہ کی طرف روانہ کی اور اس گفت و شنید کے پردے میں جو اس وقت فریقین میں جاری تھی ان لوگوں کو ہدایت دی کہ اسلامی کیمپ کے ارد گرد گھومتے ہوئے تاک میں رہیں اور موقع پا کر مسلمانوں کا نقصان کرتے رہیں یہ بلکہ بعض روایتوں سے یہاں تک پتہ لگتا ہے کہ یہ لوگ تعداد میں انہی تھے اور اس موقع پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی سازش کی تھی یہ مگر بہر حال خدا کے فضل سے مسلمان اپنی جگہ ہوشیار تھے۔ چنانچہ قریش کی اس سازش کا راز کھل

۱۔ سہیل کا لفظ سہل سے نکلا ہے جسکے معنی آسانی کے ہیں۔ ۲۔ بخاری کتاب الشروط و زرقانی۔ ۳۔ ابن ہشام و زرقانی۔

۴۔ طبری و ابن ہشام حالات حدیبیہ۔ ۵۔ مسند احمد و مسلم و ابوداؤد و بخاری ابن کثیر جلد ۴ ص ۱۹۲

گیا اور یہ لوگ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ یہ مسلمانوں کو اہل مکہ کی اس حرکت پر جو اشہر حرم میں اور پھر گویا حرم کے علاقہ میں کی گئی سخت طیش تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو معاف فرمایا اور مصالحت کی گفتگو میں روک نہ پیدا ہونے دی۔ اہل مکہ کی اس حرکت کا قرآن شریف نے بھی ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے:-

هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَآَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ

یعنی "خدا نے اپنے خاص فضل سے کفار کے ہاتھوں کو مکہ کی وادی میں تم سے روک کر رکھا اور تمہاری حفاظت کی اور پھر جب تم نے ان لوگوں پر غلبہ پایا اور انہیں اپنے قابو میں کر لیا تو خدا نے تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک کر رکھا۔"

مسلمانوں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کی سفارت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی اس شرارت کو دیکھا اور ساتھ

ہی خراش بن اُمیہ سے اہل مکہ کے جوش و خروش کا حال سنا تو قریش کو ٹھنڈا کرنے اور راہ راست پر لانے کی غرض سے ارادہ فرمایا کہ کسی ایسے با اثر شخص کو مکہ میں بھجوائیں جو مکہ ہی کا رہنے والا ہو اور قریش کے کسی معزز قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو چنانچہ آپؐ نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے فرمایا کہ بہتر ہو گا کہ آپؐ مکہ میں جائیں اور مسلمانوں کی طرف سے سفارت کا فرض سرانجام دیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ جانتے ہیں کہ مکہ کے لوگ میرے سخت دشمن ہو رہے ہیں اور اس وقت مکہ میں میرے قبیلہ کا کوئی با اثر آدمی موجود نہیں جس کا اہل مکہ پر دباؤ ہو اس لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ کامیابی کا راستہ آسان کرنے کے لیے اس خدمت کے لیے عثمان بن عفان کو چنا جائے جن کا قبیلہ (بنو امیہ) اس وقت بہت با اثر ہے اور مکہ والے عثمانؓ کے خلاف شرارت کی جرأت نہیں کر سکتے اور کامیابی کی زیادہ امید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور حضرت عثمانؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ مکہ جائیں اور قریش کو مسلمانوں کے پُر امن ارادوں اور عمرہ کی نیت سے آگاہ کریں۔ اور آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو اپنی طرف سے ایک تحریر بھی لکھ کر دی جو رؤساء قریش کے نام تھی۔ اس تحریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور قریش کو یقین دلایا کہ ہماری نیت صرف ایک عبادت کا بجالانا ہے اور ہم پُر امن صورت میں عمرہ بجالا کر واپس چلے جائیں گے۔ آپؐ نے

۱۔ اس واقعہ کے بارے میں روایات کسی قدر مختلف ہیں۔ ہم نے اس جگہ بغیر خاص تحقیق کے معروف روایات کو لے لیا ہے۔

۲۔ ابن ہشام و طبری و زر قانی۔ ۳۔ سورۃ الفتح: ۲۵۔ ۴۔ ابن ہشام

حضرت عثمانؓ سے یہ بھی فرمایا کہ مکہ میں جو کمزور مسلمان ہیں انہیں بھی ملنے کی کوشش کرنا اور ان کی ہمت بڑھانا اور کہنا کہ ذرا اور صبر سے کام لیں خدا عنقریب کامیابی کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

یہ پیغام لیکر حضرت عثمانؓ مکہ میں گئے اور ابوسفیان سے مل کر جو اس زمانہ میں مکہ کا رئیس اعظم تھا اور حضرت عثمانؓ کا قریبی عزیز بھی تھا اہل مکہ کے ایک عام مجمع میں پیش ہوئے۔ اس مجمع میں حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پیش کی جو مختلف رؤساء قریش نے فرداً فرداً بھی ملاحظہ کی مگر باوجود اس کے سب لوگ اپنی اس فتدیر قائم رہے کہ بہر حال مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ حضرت عثمانؓ کے زور دینے پر قریش نے کہا کہ اگر تمہیں زیادہ شوق ہے تو ہم تم کو ذاتی طور پر طواف بیت اللہ کا موقع دے دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ تو مکہ سے باہر روکے جائیں اور تم طواف کروں؟ مگر قریش نے کسی طرح نہ مانا اور بالآخر حضرت عثمانؓ مایوس ہو کر واپس آنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس موقع پر مکہ کے شہرہ لوگوں کو یہ شرارت سوجھی کہ انہوں نے غالباً اس خیال سے کہ اس طرح ہمیں مصالحت میں زیادہ مفید شرائط حاصل ہو سکیں گے حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں روک لیا۔ اس پر مسلمانوں میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ اہل مکہ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا ہے۔

## بیعت رضوان

یہ خبر حدیبیہ میں پہنچی تو مسلمانوں میں سخت جوش پیدا ہوا کہ کیونکہ عثمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور معزز ترین صحابہ میں سے تھے اور مکہ میں بطور اسلامی سفیر کے گئے تھے۔ اور یہ دن بھی اشہر حرم کے تھے اور پھر مکہ خود حرم کا علاقہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً تمام مسلمانوں میں اعلان کر کے انہیں ایک بول (کیکر) کے درخت کے نیچے جمع کیا۔ اور جب صحابہ جمع ہو گئے تو آپؐ نے اس خبر کا ذکر کر کے فرمایا کہ ”اگر یہ اطلاع درست ہے تو خدا کی قسم ہم اس جگہ سے اس وقت تک نہیں ٹھیں گے کہ عثمانؓ کا بدلہ نہ لے لیں۔“ پھر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا ”آؤ اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر (جو اسلام میں بیعت کا طریق ہے) یہ عہد کرو کہ تم میں سے کوئی شخص بیٹھ نہیں دکھائے گا اور اپنی جان پر کھیل جائے گا مگر کسی حال میں اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا۔“ اس اعلان پر صحابہ بیعت کے لیے اس طرح پکے کہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے لہذا اور ان چودہ پندرہ سو مسلمانوں کا کہ یہی اس وقت اسلام کی ساری پونجی تھی، ایک ایک فرد اپنے محبوب آقا کے ہاتھ پر گویا دوسری دفعہ

۱۔ زرقانی جلد ۱ ص ۳۰۰۔ ۲۔ ابن ہشام وابن سعد۔ ۳۔ یہ بیعت ایک ہی دفعہ اکٹھی نہیں ہوئی بلکہ تین دفعہ باری باری کر کے مکہ میں ہوئی تھی۔ طبری جلد ۲ ص ۳۴۳۔ ۴۔ سوائے شاید ایک شخص جد بن قیس کے جس کے متعلق ایک روایت آتی ہے کہ وہ منافق تھا اور بیعت کے وقت اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ (ابن ہشام واسد الغابہ)۔



بک گیا۔ جب بیعت ہو رہی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا۔ "یہ عثمان کا ہاتھ ہے کیونکہ اگر وہ یہاں ہوتا تو اس مقدس سودے میں کسی سے پیچھے نہ رہتا لیکن اس وقت وہ خدا اور اس کے رسول کے کام میں مصروف ہے" اس طرح یہ بجلی کا سا منظر اپنے اختتام کو پہنچا۔

اسلامی تاریخ میں یہ بیعت "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہے یعنی وہ بیعت جس میں مسلمانوں نے خدا کی کامل رضامندی کا انعام حاصل کیا۔ قرآن شریف نے بھی اس بیعت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يَبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ  
فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا  
قَرِيبًا ۝ ٢٥

یعنی "اللہ تعالیٰ خوش ہو گیا مسلمانوں سے جب کہ اے رسول! وہ ایک درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے کیونکہ اس بیعت سے اُن کے دلوں کا غمی اخلاص خدا کے ظاہری علم میں آ گیا سو خدا نے بھی ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں ایک قریب کی فتح کا انعام عطا کیا۔"

صحابہ کرام بھی ہمیشہ اس بیعت کو بڑے فخر اور محبت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور اُن میں سے اکثر بعد میں آنے والے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تم تو مکہ کی فتح کو فتح شمار کرتے ہو مگر ہم بیعت رضوان کو ہی فتح خیال کرتے تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیعت اپنے کوائف کے ساتھ مل کر ایک نہایت عظیم الشان فتح تھی۔ نہ صرف اس لیے کہ اس نے آئندہ فتوحات کا دروازہ کھول دیا بلکہ اس لیے بھی کہ اس سے اسلام کی اس جاں فروشانہ روح کا جو دین محمدؐ کا گویا مرکزی نقطہ ہے ایک نہایت شاندار رنگ میں اظہار ہوا۔ اور فدائیان اسلام نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ وہ اپنے رسول اور اس رسول کی لائی ہوئی صداقت کے لیے ہر میدان میں اور اس میدان کے ہر قدم پر موت و حیات کے سودے کے لیے تیار ہیں۔ اسی لیے صحابہ کرام بیعت رضوان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ بیعت موت کے عہد کی بیعت تھی یعنی اس عہد کی بیعت تھی کہ ہر مسلمان اسلام کی خاطر اور اسلام کی عزت کی خاطر اپنی جان پر کھیل جائیگا مگر پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اور اس بیعت کا خاص پہلو یہ تھا کہ یہ عہد و پیمان

۱۔ طبری و ابن ہشام و ابن سعد۔ ۲۔ بخاری باب مناقب عثمان۔ ۳۔ ابن سعد۔ ۴۔ سورۃ الفتح: ۱۹۔

۵۔ بخاری کتاب المغازی حالات صلح حدیبیہ۔ ۶۔ بخاری حالات صلح حدیبیہ۔



صرف منہ کا ایک وقتی اقرار نہیں تھا جو عارضی جوش کی حالت میں کر دیا گیا ہو بلکہ دل کی گہرائیوں کی آواز تھی جس کے پیچھے مسلمانوں کی ساری طاقت ایک نقطہ واحد پر جمع تھی۔

جب قریش کو اس بیعت کی اطلاع پہنچی تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ اور نہ صرف حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کو آزاد کر دیا۔ بلکہ اپنے ایچھیوں کو بھی ہدایت دی کہ اب جس طرح بھی ہو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیں مگر یہ شرط ضرور رکھی جاتے کہ اس سال کی بجائے مسلمان آئندہ سال آکر عمرہ بجالائیں اور بہر حال اب واپس چلے جائیں۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء سے یہ عہد کر چکے تھے کہ میں اس موقع پر کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو حرم المحرم اور بیت اللہ کے احترام کے خلاف ہو۔ اور چونکہ آپ کو خدا نے یہ بشارت دے رکھی تھی کہ اس موقع پر قریش کے ساتھ مصالحت آئندہ کامیاب ہوں گا پیش خیمہ بننے والی ہے اس لیے گویا فریقین کے لحاظ سے یہ ماحول مصالحت کا ایک نہایت عمدہ ماحول تھا اور اسی ماحول میں سہیل بن عمروؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ نے اُسے دیکھتے ہی فرمایا کہ اب معاملہ آسان ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ بات روایتوں سے واضح نہیں ہوتی کہ سہیل معین طور پر کس مرحلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا اور آیا اُس کا آنا حضرت عثمانؓ کے مکہ کی طرف جانے سے پہلے تھا یا کہ بعد۔ اور اس بارے میں بعض روایات میں کسی قدر اختلاف و انتشار بھی پایا جاتا ہے مگر بہر حال یہ بات مسلم ہے کہ صلح کی وہ تحریر جس کا ہم اب ذکر کرنے لگے ہیں وہ سہیل بن عمروؓ کے ذریعہ ہی تکمیل کو پہنچی۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ قریش کے یہ جملہ سفرا جو یکے بعد دیگرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ سب کے سب بعد میں اسلام لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہو گئے۔ یہ سوائے مکرز بن حفص کے جسے دیکھتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ اس شخص سے بد اخلاقی اور غداری کی بو آتی ہے۔ یہ

**صلح کی گفتگو**  
سہیل بن عمروؓ نے جو گفتگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی اور جس رنگ میں یہ اہم تاریخی معاہدہ ضبط تحریر میں آیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ

ورق ہے جسے سب محدثین اور مؤرخین نے بڑے شوق اور تفصیل کے ساتھ سُپرِ ذلَم کیا ہے۔ ہم اس جگہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اس واقعہ کی موٹی موٹی تفصیل ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ امام بخاری جو روایت کے لحاظ سے جملہ محدثین میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں اس دلچسپ واقعہ کو مندرجہ ذیل صورت میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰۸۔ ۲۔ ابن ہشام وطبری۔ ۳۔ دیکھو اسد الغابہ حالات بدیل و عمروہ وسہیل

۴۔ زرقانی جلد دوم صفحہ ۱۹۳ و ابن ہشام حالات حدیبیہ

جب سہیل بن عمرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ نے اُسے دیکھتے ہی فرمایا یہ سہیل آتا ہے اب خدا نے چاہا تو معاملہ سہل ہو جائے گا۔ بہر حال سہیل آیا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا: اوجی (اب لمبی بحث جانے دو) ہم معاہدہ کے لیے تیار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم بھی تیار ہیں۔ اور اس ارشاد کے ساتھ ہی آپ نے اپنے سیکرٹری (حضرت علیؓ) کو بلوایا۔ اور چونکہ شرائط پر ایک عمومی بحث پہلے ہو چکی تھی اور تفصیل نے ساتھ ساتھ طے پانا تھا، اس لیے کاتب کے آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سہیل صلح کے لیے تو تیار تھا مگر قریش کے حقوق کی حفاظت اور اہل مکہ کے اکرام کے لیے بھی بہت چوکس رہنا چاہتا تھا۔ فوراً بولا یہ رحمٰن کا لفظ کیا ہے ہم اسے نہیں جانتے جس طرح عرب لوگ ہمیشہ سے لکھتے آتے ہیں اس طرح لکھو یعنی بِاسْمِکَ اَللّٰہُمَّ دوسری طرف مسلمانوں کے لیے بھی قومی عزت اور مذہبی غیرت کا سوال تھا وہ بھی اس تبدیلی پر فوراً چونک پڑے اور کہنے لگے ہم تو ضرور بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی لکھیں گے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر مسلمانوں کو خاموش کر دیا کہ نہیں نہیں اس میں کوئی حرج نہیں جس طرح سہیل کتاب ہے اُسی طرح لکھ لو۔ چنانچہ بِاسْمِکَ اَللّٰہُمَّ کے الفاظ لکھے گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکھو "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے کیا ہے" سہیل نے پھر ٹوکا کہ یہ رسول اللہ کا لفظ ہم نہیں لکھنے دیں گے۔ اگر ہم یہ بات مان لیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو پھر تو یہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے اور ہمیں آپ کو روکنے اور آپ کا مقابلہ کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ بس جس طرح ہمارے ہاں طریق ہے صرف یہ الفاظ لکھو کہ محمد بن عبد اللہ نے یہ معاہدہ کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ لوگ مانیں نہ مانیں میں خدا کا رسول تو ہوں۔ مگر چونکہ میں محمد بن عبد اللہ بھی ہوں اس لیے چلو یہی سہی لکھو کہ محمد بن عبد اللہ نے یہ معاہدہ کیا ہے۔ مگر اس اثناء میں آپ کے کاتب حضرت علیؓ معاہدہ کی تحریر میں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ لکھ چکے تھے۔ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا محمد رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اُن کی جگہ محمد بن عبد اللہ کے الفاظ لکھ دو۔ مگر اس وقت جوش کا عالم تھا حضرت علیؓ نے غیرت میں آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو آپ کے نام کے ساتھ سے رسول اللہ کے الفاظ کبھی نہیں مٹاؤں گا۔ آپ نے اُن کی از خود رفتہ حالت کو دیکھ کر فرمایا۔ اچھا تم نہیں مٹاتے تو مجھے دو میں خود مٹا دیتا ہوں۔ پھر آپ نے معاہدہ کا کاغذ (یا جو کچھ بھی وہ تھا)

۱۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اس لفظ میں ادبی خوبی یہ تھی کہ لفظ سہیل اور سہل ایک ہی روٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ بعض اوقات ناموں سے نیک فال لے لیا کرتے تھے۔

۲۔ بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد

ہاتھ میں لیکر اور حضرت علیؑ سے اُن الفاظ کی جگہ پوچھ کر رسول اللہ کے الفاظ اپنے ہاتھ سے کاٹ دیئے اور اُن کی جگہ ابن عبد اللہ کے الفاظ لکھ دیئے۔  
(حاشیہ میں نوٹ ملاحظہ فرمائیں)

## آنحضرت کی اُمتیت

متن کی روایت میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے ”محمد رسول اللہ“ کے الفاظ کاٹ کر اُن کی جگہ ”محمد“ بن عبد اللہ کے الفاظ لکھ دیئے۔ اس پر بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال گذر سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمتی یعنی ناخواندہ تھے جیسا کہ خود قرآن شریف آپ کے متعلق اُمتی کا لفظ استعمال فرماتا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ آپ نے خود اپنے ہاتھ سے محمد رسول اللہ کے الفاظ کاٹے اور اُن کی جگہ دوسرے الفاظ لکھ دیئے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ یا تو آپ اُمتی نہیں تھے اور یا اوپر والی روایت غلط ہے۔ سو اس اعتراض کے متعلق کتاب ہذا کے حصہ اول میں ایک مختصر بحث گذر چکی ہے وہ ہمارے ناظرین کی تسلی کے لیے کافی ہونی چاہیئے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک آپ اُمتی تھے اور جیسا کہ قرآن اور حدیث اور تاریخ کے متحدہ بیان سے ثابت ہے آپ نے کبھی بھی درسی رنگ میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ اُمتی اور ناخواندہ تھے۔ چونکہ زمانہ نبوت میں آپ کے سامنے کثرت کے ساتھ مراسلات وغیرہ پیش ہوتے رہتے تھے اس لیے اس زمانہ میں آپ کو کچھ حروف شناسی ہو گئی ہوگی اور ایک ذہین انسان کے لیے یہ بات ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ وہ باوجود ناخواندہ ہونے کے مراسلات کے بار بار سامنے آنے کی وجہ سے کچھ حروف شناسی پیدا کر لے مگر ظاہر ہے کہ ایسی حروف شناسی کے باوجود ایسے شخص کے اُمتی ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور بہر حال وہ ناخواندہ ہی سمجھا جائے گا اور پھر جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اول میں بیان کیا جا چکا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ بخاری وغیرہ کی روایت میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ”محمد بن عبد اللہ“ کے الفاظ لکھ دیئے اس سے مراد لکھا دینا ہو کیونکہ عام محاورہ میں بعض اوقات ”لکھنے کا لفظ“ لکھا دینے کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ گویا اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ ”رسول اللہ“ کے الفاظ تو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹ دیئے اور نشان دہی کے بعد ایک ناخواندہ شخص بھی آسانی کے ساتھ لکھے ہوئے الفاظ کاٹ سکتا ہے مگر اس کے بعد بن عبد اللہ کے الفاظ کا تب سے لکھوا دیئے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کی اصل غیرت ”رسول اللہ“ کے الفاظ کاٹنے پر بھی نہ کہ اُن کی جگہ ”بن عبد اللہ“ الفاظ لکھنے پر۔ اور حدیث میں ان کی طرف الفاظ بھی یہی منسوب کئے گئے ہیں کہ خدا کی قسم میں رسول اللہ کے الفاظ نہیں کاٹوں گا۔ بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونا قطعی طور پر ثابت ہے اور اسلام کا یہ ایک عظیم الشان علمی اور روحانی معجزہ ہے کہ خدا کے نور نے ایک ناخواندہ انسان کو ساری قوموں اور سارے زمانوں کا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۔ بخاری کتاب المغازی باب عمرہ القضا۔ و کتاب الصلح و صلح المسلمین

۲۔ سورة الاعراف : ۱۵۸، ۱۵۹۔ نیز دیکھئے سورة الحکوت ۲۹۱۔

اس کے بعد آپؐ نے لکھوایا کہ ”معاہدہ یہ ہے کہ اہل مکہ ہمیں بیت اللہ کے طواف سے نہیں روکیں گے۔“ سیل فوراً بولا۔ ”خدا کی قسم اس سال تو یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا ورنہ عربوں میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ ہاں اگلے سال آپؐ لوگ آکر طواف کر سکتے ہیں۔“ آپؐ نے فرمایا۔ اچھا یہی لکھو۔ پھر سیل نے اپنی طرف سے لکھایا کہ یہ بھی شرط ہوگی کہ اہل مکہ میں سے کوئی شخص مسلمانوں کے ساتھ جا کر شامل نہیں ہو سکے گا۔ خواہ وہ مسلمان ہو۔ اور اگر ایسا کوئی شخص مسلمانوں کی طرف جائے گا تو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ صحابہ نے اس پر شور مچایا کہ سبحان اللہ! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو کر آئے اور ہم اُسے لوٹا دیں۔ اسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا کہ اچانک قریش مکہ کے سفیر سیل بن عمرو کا لڑکا ابو جندل بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا اس مجلس میں گھرتا پڑتا آپؐ نے فرمایا۔ اس نوجوان کو اہل مکہ نے مسلمان ہونے پر قید کر لیا تھا اور سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے اس قدر قریب تشریف لاتے ہوئے ہیں تو وہ کسی طرح اہل مکہ کی قید سے چھوٹ کر اپنی بیڑیوں میں جکڑا ہوا گھرتا پڑتا حدیبیہ میں پہنچ گیا اور اتفاق سے پہنچا بھی اُس وقت جب کہ اُس کا باپ معاہدہ کی یہ شرط لکھا رہا تھا کہ ہر شخص جو مکہ والوں میں سے مسلمانوں کی طرف آئے وہ خواہ مسلمان ہی ہو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ ابو جندل نے گرتے پڑتے اپنے آپ کو مسلمانوں کے سامنے لا ڈالا اور دردناک آواز میں پکار کر کہا کہ ”اے مسلمانو! مجھے محض اسلام کی وجہ سے یہ عذاب دیا جا رہا ہے خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔“ مسلمان اس نظارہ کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے مگر سیل بھی اپنی ضد پر اڑ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا۔ یہ پہلا مطالبہ ہے جو میں اس معاہدہ کے مطابق آپؐ سے کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ابو جندل کو میرے حوالہ کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا ”ابھی تو معاہدہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔“ سیل نے کہا اگر آپؐ نے ابو جندل کو نہ لوٹایا تو پھر اس معاہدہ کی کارروائی ختم سمجھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”آؤ آؤ۔ جانے دو اور ہمیں احسان و مروت کے طور پر ہی ابو جندل کو دیدو۔“ سیل نے کہا نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا ”سیل! ضد نہ کرو۔ میری یہ بات مان لو۔“ سیل نے کہا میں یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا۔ اس موقع پر ابو جندل نے پھر پکار کر کہا۔ اے مسلمانو!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

معلم اور استاد بنا دیا اور آج کے علمی زمانہ میں بھی جب کہ گویا علم کے دریا چھوٹ چھوٹ کر بہہ رہے ہیں ہر پتے تلاشی اور ہر سچے محقق کی نظر مذہب کے میدان میں ہر علمی الجھن کے موقع پر آپؐ کی طرف اٹھتی ہے اور وہ آپؐ کی ہدایت کے مواسی اور جگہ حقیقی تسلی نہیں پاتا۔ اللہمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عربی زبان میں اُمّی کے معنی ناخواندہ کے علاوہ معصوم اور پاک و صاف کے بھی ہوتے ہیں (تاج العروا) کیونکہ اُمّی کا لفظ دراصل اُمّ (یعنی ماں) سے نکلا ہوا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ گناہوں اور لغزشوں سے اس طرح بچا ہوا جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ بچا ہوا ہوتا ہے اور یہ تعریف بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے۔



کیا تمہارا ایک مسلمان بھائی اس شدید عذاب کی حالت میں مشرکوں کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا؟ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس وقت ابو جندل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپیل نہیں کی بلکہ عامۃ المسلمین سے اپیل کی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خواہ کتنا ہی درد ہو آپ کسی صورت میں معاہدہ کی کارروائی میں رخصت نہیں پیدا ہونے دیں گے مگر غالباً عامۃ المسلمین سے وہ یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ شاید غیرت میں آکر اس وقت جبکہ ابھی معاہدہ کی شرطیں لکھی جا رہی تھیں کوئی ایسا رستہ نکال لیں جس میں اس کی رہائی کی صورت پیدا ہو جائے مگر مسلمان خواہ کیسے ہی جوش میں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آپ نے کچھ وقت خاموش رہ کر ابو جندل سے دردمندانہ الفاظ میں فرمایا: "اے ابو جندل! صبر سے کام لو اور خدا کی طرف نظر رکھو۔ خدا تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ کے دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے ضرور خود کوئی رستہ کھول دیگا، لیکن ہم اس وقت مجبور ہیں کیونکہ اہل مکہ کے ساتھ معاہدہ کی بات ہو چکی ہے اور ہم اس معاہدہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

**حضرت عمرؓ کا جوش و خروش** مسلمان یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور مذہبی غیرت سے ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا مگر رسول اللہ کے سامنے سہم کر خاموش تھے۔ آخر حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے اور کانپتی ہوئی آوازیں فرمایا: "کیا آپ خدا کے برحق رسول نہیں؟" آپ نے فرمایا: "ہاں ہاں ضرور ہوں۔" عمرؓ نے کہا: "کیا ہم حق پر نہیں اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں؟" آپ نے فرمایا: "ہاں ہاں ضرور ایسا ہی ہے۔" عمرؓ نے کہا: "تو پھر ہم اپنے سچے دین کے معاملہ میں یہ ذلت کیوں برداشت کریں؟" آپ نے حضرت عمرؓ کی حالت کو دیکھ کر مختصر الفاظ میں فرمایا: "دیکھو عمر! میں خدا کا رسول ہوں اور میں خدا کے منشاء کو جانتا ہوں اور اس کے خلاف نہیں چل سکتا اور وہی میرا مددگار ہے۔" مگر حضرت عمرؓ کی طبیعت کا تلاطم لمحظہ بلحظہ بڑھ رہا تھا۔ کہنے لگے: "کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟" آپ نے فرمایا: "ہاں میں نے ضرور کہا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ طواف ضرور اسی سال ہوگا؟" عمرؓ نے کہا: "نہیں ایسا تو نہیں کہا۔" آپ نے فرمایا: "تو پھر انتظار کرو تم التماس اللہ ضرور مکہ میں داخل ہو گے اور کعبہ کا طواف کرو گے۔" مگر اس جوش کے عالم میں حضرت عمرؓ کی تسلی نہیں ہوتی، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص رعب تھا اس لیے حضرت عمرؓ وہاں سے ہٹ کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور ان کے ساتھ بھی اسی قسم کی جوش کی باتیں کیں اور حضرت ابو بکرؓ نے بھی اسی قسم کے جواب دیتے مگر ساتھ ہی حضرت



ابو بکرؓ نے نصیحت کے رنگ میں فرمایا۔ ”دیکھو عمرؓ سنبھل کر رہو اور رسول خدا کی رکاب پر جو ہاتھ تم نے رکھا ہے اُسے ڈھیلا نہ ہونے دو کیونکہ خدا کی قسم یہ شخص جس کے ہاتھ میں ہم نے اپنا ہاتھ دیا ہے بہر حال سچا ہے۔“ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں اپنے جوش میں یہ ساری باتیں کہہ تو گیا مگر بعد میں مجھے سخت ندامت ہوئی اور میں توبہ کے رنگ میں اس کمزوری کے اثر کو دھونے کے لیے بہت سے نقلی اعمال بجالایا۔ یعنی صدقے کئے۔ روزے رکھے۔ نقلی نمازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے تاکہ میری اس کمزوری کا داغ دھل جائے۔

**صلح کی شرائط**  
بہر حال بڑی رد و کد کے بعد یہ معاہدہ تکمیل کو پہنچا اور قریباً ہر امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات کو چھوڑ کر قریش کا مطالبہ مان لیا اور خدائی منشأ کے ماتحت اپنے اس عہد کو پوری وفاداری کے ساتھ پورا کیا کہ بیت اللہ کے اکرام کی خاطر قریش کی طرف سے جو مطالبہ بھی ہوگا اُسے مان لیا جائے گا اور بہر صورت حرم کے احترام کو قائم رکھا جائیگا اس معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں :-

- ۱۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھی اس سال واپس چلے جاتے ہیں۔
- ۲۔ آئندہ سال وہ مکہ میں آکر رسم عمرہ ادا کر سکتے ہیں مگر سوائے نیام میں بند تلوار کے کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہو اور مکہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔
- ۳۔ اگر کوئی مرد مکہ والوں میں سے مدینہ جائے تو خواہ وہ مسلمان ہی ہو آنحضرت ﷺ اُسے مدینہ میں پناہ نہ دیں اور واپس لوٹا دیں۔ چنانچہ اس تعلق میں صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ لَا يَأْتِيَنَّ مَنَازِلَهُمْ إِلَّا عَلَىٰ ذِيْنَلِكِ إِلَّا رَدُّوْهُ اِلَيْنَا۔ یعنی ”ہم میں سے اگر کوئی مرد آپ کے پاس جاتے تو آپ اسے واپس لوٹا دیں گے۔“
- لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ کو چھوڑ کر مکہ میں آجائے تو اُسے واپس نہیں لوٹایا جائے گا۔
- اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص اپنے ولی یعنی گارڈین کی اجازت کے بغیر مدینہ آجائے تو اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔

۱۔ بخاری کتاب الشروط ۵۔ ۲۔ ابن ہشام حالات حدیبیہ ۵۔ ۳۔ بخاری کتاب الشروط و کتاب الشرح و کتاب الصلح  
۴۔ بخاری کتاب المغازی باب عمرة القضاء و کتاب الجہاد باب المصالح علی ثلاثہ و کتاب الصلح باب الصلح مع المشرکین  
۵۔ مسلم باب صلح الحدیبیہ۔ ۶۔ بخاری کتاب الشروط اور کتاب المغازی حالات حدیبیہ حدیث عن مردان و مسور  
۷۔ بخاری کتاب الصلح باب الصلح مع المشرکین۔ ۸۔ مسلم باب صلح الحدیبیہ عن انس و ابن سعد حالات حدیبیہ  
۹۔ سیرۃ ابن ہشام

۴۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ چاہے مسلمانوں کا حلیف بن جائے اور جو چاہے اہل مکہ کا۔  
 ۵۔ یہ معاہدہ فی الحال دس سال تک کے لیے ہوگا اور اس عرصہ میں قریش اور مسلمانوں کے

درمیان جنگ بند رہے گی۔  
 اس معاہدہ کی دو نقیصہ کی گئیں اور بطور گواہ کے فریقین کے متعدد معززین نے ان پر اپنے دستخط ثبت کئے۔ مسلمانوں کی طرف سے دستخط کرنے والوں میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ (جو اس وقت تک مکہ سے واپس آچکے تھے)، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہؓ تھے۔ معاہدہ کی تکمیل کے بعد سہیل بن عمرو معاہدہ کی ایک نقل لے کر مکہ کی طرف واپس لوٹ گیا اور دوسری نقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہی۔

### صحابہ میں اضطراب

جب سہیل واپس جا چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ لو اب اٹھو اور میں اپنی قربانیاں ذبح کر کے سروں کے بال منڈوا دو (قربانی کے بعد سر کے بالوں کو منڈوا یا یا کترا یا جاتا ہے) اور واپسی کی تیاری کرو مگر صحابہ کو اس بظاہر رسوا کن معاہدہ کی وجہ سے سخت صدمہ تھا اور ساتھ ہی جب انہیں اس طرف خیال جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایک خواب کی بنا پر یہاں لائے تھے اور اللہ تعالیٰ نے خواب میں طواف بیت اللہ کا نظارہ بھی دکھایا تھا تو ان کی طبیعت بہت ہی مضطرب ہونے لگتی تھی اور وہ قریباً بے جانوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے تھے۔ انہیں خدا کے رسول پر پورا پورا ایمان تھا اور اس کے وعدہ پر بھی کامل یقین تھا مگر لوازمات بشریت کے ماتحت ان کے دل اس ظاہری ناکامی پر غموں سے نڈھال تھے اس لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ فرمایا کہ اب یہیں قربانی کے جانور ذبح کر دو اور واپس لوٹ چلو تو کسی صحابی نے سامنے سے حرکت نہ کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ نحوذبا اللہ اپنے رسول کے نافرمان تھے کیونکہ صحابہ سے بڑھ کر دنیا کے پردے پر کوئی فرمانبردار جماعت نہیں گذری پس ان کی طرف سے یہ عدم تعمیل بغاوت یا نافرمانی کے رنگ میں نہ تھی بلکہ اس لیے تھی کہ غم اور ظاہری ذلت کے احساس نے انہیں اتنا نڈھال کر رکھا تھا کہ وہ گویا سنستے ہوئے نہ سنستے تھے اور دیکھتے ہوئے بھی ان کی آنکھیں کام نہ کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کو دوبارہ سہ بارہ دہرایا مگر کسی صحابی نے سامنے سے حرکت نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ ہوا اور آپ خاموش ہو کر اپنے خیمہ کے

۱۔ ابن ہشام و ابن سعد و طبری : ۱۔ البوداد کتاب الجہاد باب فی صلح العدو و ابن ہشام و ابن سعد۔  
 ۲۔ ابن سعد و زرقانی : ۱۔ ملاحظہ ہو کہ باوجود سخت اختلاف رائے کے حضرت عمرؓ دستخط کرنے میں قطعاً شامل نہیں ہوئے۔ ۲۔ ابن ہشام : ۱۔ ابن سعد و طبری و زرقانی

اندر تشریف لے گئے۔ اندرون خیمہ آپ کی حرم محترم حضرت اُمّ سلمہؓ جو ایک نہایت زیرک خاتون تھیں یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے موقر اور محبوب خاوند کو فکر مند حالت میں اندر آتے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے آپ کے فکر و تشویش کی تفصیل معلوم کیں تو ہمدردی اور محبت کے انداز میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ رنج نہ فرمائیں آپ کے صحابہ خدا کے فضل سے نافرمان نہیں مگر اس صلح کی شرائط نے انہیں غم سے دیوانہ بنا رکھا ہے پس میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اُن سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ خاموشی کے ساتھ باہر جا کر اپنے قربانی کے جانور کو ذبح فرما دیں اور اپنے سر کے بالوں کو منڈوا دیں پھر آپ کے صحابہ خود بخود آپ کے پیچھے ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ نے باہر تشریف لا کر بغیر کچھ کہے اپنے قربانی کے جانور کو ذبح کر کے اپنے سر کے بال منڈوانے شروع کر دیئے۔ صحابہ نے یہ منظر دیکھا تو جس طرح ایک سویا ہوا شخص کوئی شور و غیرہ سُکر اچانک بیدار ہوتا ہے وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دیوانہ وار اپنے جانوروں کو ذبح کرنا شروع کر دیا اور ایک دوسرے کے سر کے بال منڈانے لگے مگر غم نے اس قدر بے چین کر رکھا تھا کہ راوی بیان کرتا ہے کہ اُس وقت ایسا عالم تھا کہ ڈر تھا کہ مسلمان کہیں ایک دوسرے کے بال منڈاتے منڈاتے ایک دوسرے کا گلا ہی نہ کاٹ دیں۔ بہر حال حضرت اُمّ سلمہؓ کی تجویز کارگر ہوئی اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے الفاظ وقتی طور پر ناکام رہے تھے وہاں آپ کے عمل نے سوتے ہوؤں کو چونکا کر بیدار کر دیا۔

حدیبیہ سے واپسی اور  
سُورۃ فتح کا نزول

قربانی وغیرہ سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف واپسی کا حکم دیا۔ اُس وقت آپ کو حدیبیہ میں آتے کچھ کم ہیں یوم ہو چکے تھے۔ جب آپ واپسی سفر میں عسفان کے قریب کراخ الغنیم میں پہنچے اور یہ رات کا وقت تھا تو اعلان کرا کے صحابہ کو جمع کروایا اور فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایک سُورۃ نازل ہوئی ہے جو مجھے دُنیا کی سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے اور وہ یہ ہے:-  
إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۚ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ

۱۔ بخاری کتاب الشروط ورتانی۔ ۲۔ اس موقع پر اکثر صحابہ نے تو اپنے سر کے بال منڈوا دیئے تھے مگر بعض نے صرف کتروانے پر اکتفا کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منڈوانے والوں کو مکرر مکرر دُعا دی۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ نے منڈوانے والوں کو تین دفعہ دُعا دی ہے اور کتروانے والوں کے لیے صرف ایک دفعہ دعا تیرے الفاظ فرماتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ بال منڈوانے والے لوگ وہ ہیں جو اس وقت شک میں مبتلا نہیں ہوتے مگر بال کتروانے والے شک میں مبتلا ہو گئے۔ ابن ہشام

ذُنُوبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيَتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝  
وَيُنْصِرِكَ اللَّهُ نَصْرًا عَظِيمًا ۝ ..... لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ  
الرُّمُيَا بِالْحَقِّ ۝ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ  
إِٰمِنِينَ ۝ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَهُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۝ لَا تَخَافُونَ لَهُ



کس طرح تمہارے خلاف چڑھائیاں کر کر کے آتے تھے۔ اور یہ زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی تھی اور تمہاری آنکھیں پتھر لگی تھیں اور کلیجے مُڑ کو آتے تھے مگر آج ہی قریش تمہارے ساتھ امن و امان کا معاہدہ کر رہے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سمجھ گئے۔ ہم سمجھ گئے۔ جہاں تک آپ کی نظر پہنچی ہے وہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچتی۔ مگر اب ہم نے سمجھ لیا ہے کہ واقعی یہ معاہدہ ہمارے لیے ایک بھاری فتح ہے۔

**حضرت عمرؓ کا مزید تیج و تاب**  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر سے پہلے حضرت عمرؓ بھی بڑے تیج و تاب میں تھے۔ چنانچہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کی واپسی پر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت سفر میں تھے تو اسوقت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کچھ عرض کرنا چاہا مگر آپ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ۔ سہ بارہ عرض کیا مگر آپ بدستور خاموش رہے۔ مجھے آنحضرت کی اس خاموشی پر بہت غم ہوا اور میں اپنے نفس میں یہ کہتا ہوا کہ عمر تو تو ہلاک ہو گیا کہ تین دفعہ تو نے رسول اللہؐ کو مخاطب کیا مگر آپ نہیں بولے چنانچہ میں مسلمانوں کی جمعیت میں سے سب سے آگے نکل آیا اور اس غم میں تیج و تاب کھانے لگا کہ کیا بات ہے؟ اور مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی قرآنی آیت نازل نہ ہو جائے۔ اتنے میں کسی شخص نے میرا نام لیکر آواز دی کہ عمر بن خطاب کو رسول اللہؐ نے یاد فرمایا ہے۔ میں نے کہا بس ہونہ ہو میرے متعلق کوئی قرآنی آیت نازل ہوئی ہے چنانچہ میں گھبرا ہوا جلدی جلدی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کر کے آپ کے پہلو میں آگیا۔ آپ نے فرمایا: ”مجھ پر اس وقت ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے۔“ پھر آپ نے سورۃ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں یہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ صلح واقعی اسلام کی فتح ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں یقیناً یہ ہماری فتح ہے۔“ اس پر حضرت عمرؓ تسلی پا کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں واپس تشریف لے آئے۔

**مسلمان مہاجر و عورتوں کیلئے  
 ایک استثنائی انتظام**

معاہدوں میں رخصتہ رہ جایا کرتے ہیں جو بعض اوقات بعد میں اہم نتائج کا باعث بن جاتے ہیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ میں بھی یہ رخصتہ رہ گیا تھا کہ اس میں گویا مسلمان مردوں کی

لہ۔ بیہقی بحوالہ الزرقانی جلد دوم ص ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ غالباً اسوقت سورۃ فتح کی آیات نازل ہو رہی ہوں گی۔ تہ۔ بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورۃ فتح و کتاب المغازی عن زید بن اسلم عن ابیہ۔ تہ۔ مسلم باب صلح الحدیبیہ عن انس



والہی کے متعلق صراحتاً ذکر تھا مگر ایسی عورتوں کا کوئی ذکر نہیں تھا جو اہل مکہ میں سے اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں آئیں۔ مگر جلد ہی ایسے حالات رونما ہونے لگے جن سے کفار مکہ پر اس رخنہ کا وجود کھلے طور پر ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ ابھی اس معاہدہ پر بہت تھوڑا وقت گذرا تھا کہ مکہ سے بعض مسلمان عورتیں کفار کے ہاتھ سے چھٹ کر مدینہ میں پہنچ گئیں۔ ان میں سب سے اول نمبر پر مکہ کے ایک فوت شدہ مشرک رئیس عقبہ ابن ابی معیط کی لڑکی اُم کلثوم تھی جو ماں کی طرف سے حضرت عثمان بن عفان کی بہن بھی لگتی تھی۔ اُم کلثوم بڑی ہمت دکھا کر پا پیادہ مدینہ پہنچی یہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ مگر اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دو قریبی رشتہ دار بھی اُس کے پکڑنے کے لیے پہنچ گئے اور اُس کی والہی کا مطالبہ کیا۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ دو معاہدہ میں مرد کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر دراصل معاہدہ عام ہے اور عورت مرد دونوں پر مساوی اثر رکھتا ہے مگر اُم کلثوم معاہدہ کے الفاظ کے علاوہ اس بنا پر بھی عورتوں کے معاملہ میں استثناء کی مدعی تھی کہ عورت ایک کمزور جنس سے تعلق رکھتی ہے اور ایسے ہی وہ مرد کے مقابلہ پر ایک ماتحت پوزیشن میں ہوتی ہے اس لیے اُسے واپس کرنا گویا روحانی موت کے منہ میں دھکیلنا اور اسلام سے محروم کرنا ہے۔ پس عورتوں کا اس معاہدہ سے مستثنیٰ سمجھا جانا نہ صرف عین معاہدہ کے مطابق بلکہ عقلاً بھی قرین انصاف اور ضروری تھا اس لیے طبعاً اور انصافاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُم کلثوم کے حق میں فیصلہ فرمایا اور اس کے رشتہ داروں کو واپس لوٹا دیا اور خدا تعالیٰ نے بھی اس فیصلہ کی تائید فرمائی چنانچہ انہی دنوں میں یہ قرآنی آیات نازل ہوئیں کہ جب کوئی عورت اسلام کا ادا کرتی ہوئی مدینہ میں آئے تو اُس کا اچھی طرح سے امتحان کرو اور اگر وہ نیک بخت اور مخلص ثابت ہو تو پھر اُسے کفار کی طرف ہرگز نہ لوٹاؤ، لیکن اگر وہ شادی شدہ ہو تو اُس کا مہر اُس کے مشرک خاوند کو ضرور ادا کر دو۔ اس کے بعد جب بھی کوئی عورت مکہ سے بھل کر مدینہ میں پہنچتی تھی تو اُس کا اچھی طرح سے امتحان لیا جاتا تھا اور اُس کی نیت اور اخلاص کو اچھی طرح پرکھا جاتا تھا۔ پھر جو عورتیں نیک نیت اور مخلص ثابت ہوتی تھیں اور ان کی ہجرت میں کوئی دُنیوی یا نفسانی غرض نہیں پائی جاتی تھی۔ تو انہیں مدینہ میں رکھ لیا جاتا تھا اور اگر وہ شادی شدہ ہوتی تھیں تو ان کا مہر ان کے خاوندوں کو ادا کر دیا جاتا تھا اس کے بعد وہ مسلمانوں میں شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتی تھیں۔

۱۔ اسد الغابہ حالات اُم کلثوم و سیرۃ حبیبہ حالات حدیبیہ

۲۔ سیرۃ حبیبہ جلد ۲ صفحہ ۲۹ ۳۔ قرآن شریف سورۃ الممتحنہ ۱۱۴ و بخاری وغیرہ

۴۔ بخاری حالات حدیبیہ و باب تفسیر سورۃ ممتحنہ و باب صلح الحدیبیہ نیز طبری حالات حدیبیہ صفحہ ۱۵۵۳ و ابن جریر

جلد ۲ صفحہ ۲۴۴ و اسد الغابہ حالات اُم کلثوم

## مشرک عورتوں کو بھی آزاد کر دیا گیا

جہاں ایک طرف مسلمان عورتوں کے لیے یہ خاص صورت  
تجوذ کی گئی وہاں دوسری طرف اس موقع پر مشرک

عورتوں کے متعلق بھی یہ خاص احکام جاری ہوئے کہ اگر کوئی مشرک عورت مسلمانوں کے نکاح میں ہو  
تو مسلمان اُسے آزاد کر دیں اور آئندہ کے لیے یہ حکم نافذ کیا گیا کہ کوئی مشرک عورت کسی مسلمان مرد کے  
نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ یہ احکام بھی قرآن شریف کے ذریعہ نازل ہوئے اور ان آیات کے نزول کے  
بعد حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے جن کے نکاح میں اس وقت تک بعض مشرک عورتیں تھیں  
اپنی مشرک بیویوں کو طلاق دیکر آزاد کر دیا۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام نے ہر غیر مسلم عورت  
کے ساتھ نکاح منع نہیں کیا بلکہ صرف مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح منع کیا ہے اور اہل کتاب عورتوں  
کے ساتھ نکاح جائز رکھا ہے۔ ان احکام میں مصلحت یہ ہے کہ :-

اول تو مشرک کا مذہب اسلام سے بعید ترین ہے اور دونوں کے درمیان کوئی اتصال کی کڑی  
نہیں ہے اور ایک مشرک عورت کے ساتھ نکاح میں یہ اندیشہ ہے کہ اسکی تربیت  
میں اولاد دین کے مبادی سے ہی بے بہرہ رہے۔

دوسرے ایک مشرک انسان کا کوئی ضابطہ اخلاق معین نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کے ساتھ  
تعلقات کبھی بھی کسی معین اور مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتے۔ دوسری طرف خاص حالات  
میں تعلقات کی توسیع کی گنجائش کا رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ پس مشرک عورتوں سے نکاح  
حرام قرار دیکر باقی غیر مسلم عورتوں سے نکاح کی اجازت دیدی گئی۔ دُنیا کے موجودہ مذاہب  
میں سے عیسائی۔ یہودی۔ ہندو وغیرہ اہل کتاب کی اصطلاح میں داخل ہیں۔ جن سے  
ایک مسلمان کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ البتہ افریقہ وغیرہ کی اکثر وحشی اقوام اہل کتاب میں سے  
نہیں ہیں اور ان کے ساتھ رشتہ ہر صورت میں ممنوع ہے۔ چونکہ اس مسئلہ میں کسی قدر  
مفصل بحث اُوپر گزر چکی ہے اس لیے اس جگہ اسی قدر مختصر نوٹ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ابو بصیر کا واقعہ اور اس کے نتائج

معاہدہ حدیبیہ کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ  
اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ کی طرف  
آوے تو مدینہ والے اُسے پناہ نہیں دیں گے بلکہ واپس لوٹا دیں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام سے منحرف  
ہو کر مکہ کا رخ کرے تو مکہ والے اُسے واپس نہیں کریں گے۔ بظاہر یہ شرط مسلمانوں کے لیے موجب ہتک

سمجھی گئی تھی اور اسی لیے کئی مسلمان اس پر دل برداشتہ تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر اور فہیم صحابی کو بھی اُس وقت کی برقی زدہ فضا میں اس شرط پر ناراضگی اور بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے بعد جلد ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے جن سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دراصل یہ شرط قریش کیلئے کمزوری کا باعث اور مسلمانوں کی مضبوطی کا موجب تھی۔ کیونکہ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں ہی فرمادیا تھا اگر کوئی مسلمان مدینہ سے منحرف ہو کر جائے گا تو وہ ایک گندہ عضو ہو گا جس کا کٹا جانا ہی بہتر تھا لیکن اس کے مقابل پر اگر کوئی شخص سچے دل سے مسلمان ہو کر مکہ سے نکلے گا تو خواہ اُسے مدینہ میں جگہ ملے یا نہ ملے وہ جہاں بھی رہے گا اسلام کی مضبوطی کا باعث ہو گا اور بالآخر اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ کھول دیگا۔ اس نظریہ نے جلد ہی اپنی صداقت کو ثابت کر دیا۔ کیونکہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تشریف لائے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص ابوبصیر عتبہ بن اسد ثقفی جو مکہ کا رہنے والا تھا اور قبیلہ بنو زہرہ کا حلیف تھا مسلمان ہو کر اور مکہ والوں کی حرارت سے بھاگ کر مدینہ پہنچا۔ قریش مکہ نے اُس کے پیچھے پیچھے اپنے دو آدمی بھجوائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم التجا کی کہ ابوبصیر کو معاہدہ کی شرائط کے مطابق اُن کے حوالہ کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبصیر کو بلایا اور واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ ابوبصیر نے سامنے سے واویلا کیا کہ میں مسلمان ہوں اور یہ لوگ مجھے مکہ میں تنگ کریں گے اور اسلام سے منحرف ہو جانے کے لیے جبر سے کام لیں گے۔ آپ نے فرمایا: ”ہم معاہدہ کی وجہ سے معذور ہیں اور تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر تم خدا کی رضا کی خاطر صبر سے کام لو گے تو خدا خود تمہارے لیے کوئی رستہ کھول دیگا۔ مگر ہم مجبور ہیں اور کسی صورت میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔“ ناچار ابوبصیر اُن لوگوں کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا مگر چونکہ اُس کے دل میں اس بات کی سخت دہشت تھی کہ مکہ میں پہنچ کر اس پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جائیں گے اور اُسے اسلام جیسی نعمت کو چھپا کر رکھنا پڑے گا بلکہ شاید جبر و تشدد کی وجہ سے اس سے ہاتھ ہی دھونا پڑے اس لیے جب یہ پارٹی ذوالحلیفہ میں پہنچی جو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر مکہ کے رستہ پر ہے تو ابوبصیر نے موقع پا کر اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو جو اس پارٹی کا رئیس تھا قتل کر دیا اور قریب تھا کہ دوسرے کو بھی نشانہ بنائے مگر وہ اپنی جان بچا کر اس طرح بھاگا کہ ابوبصیر سے پہلے مدینہ پہنچ گیا۔ پیچھے پیچھے ابوبصیر بھی مدینہ میں آ پہنچا۔ جب یہ شخص مدینہ میں پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف رکھتے

لے مسلم بحوالہ زرقانی جلد ۱ ص ۱۹۹۔ اُس کا دوسری طرف جانے کی بجائے مدینہ کی طرف آنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں یہ یقین تھا کہ میرے لیے مدینہ ایک محفوظ جگہ ہے اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال اُس کی حفاظت فرمائیں گے اور کسی صورت میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

تھے۔ اس کی خوف زدہ حالت کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے اسے کوئی خوف و ہراس کا سخت ڈھکا لگا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُس نے خود بھی ہانپتے کانپتے آپؐ سے عرض کیا کہ "میرا ساتھی مارا گیا ہے اور میں بھی گویا موت کے منہ میں ہوں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے واقعہ سنا اور تسلی دی۔ اتنے میں ابوبصیر بھی ہاتھ میں تلوار تھامے اُن پہنچا اور آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "یا رسول اللہ آپؐ نے مجھے قریش کے حوالہ کر دیا اور آپؐ کی ذمہ داری ختم ہو گئی مگر مجھے خدا نے ظالم قوم سے نجات دے دی ہے اور اب آپؐ پر میری کوئی ذمہ داری نہیں" آپؐ نے بے ساختہ فرمایا:

وَيْلٌ أَقْبَمَ مُشْعَرُ حَرْبٍ لِّوَكَّانَ لَهُ أَحَدٌ ۖ لَه

یعنی اس کی ماں کے لیے خرابی ہو رہی یہ الفاظ عربوں کے محاورہ میں لفظی معنوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ملامت یا تعجب کے موقع پر بولے جاتے ہیں) یہ شخص تو جنگ کی آگ بھڑکا رہا ہے کاش کوئی اسے سنبھالنے والا ہو۔

ابوبصیر نے یہ الفاظ سنے تو سمجھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے بہر حال معاہدہ کی وجہ سے واپس جانے کا ارشاد فرمائیں گے۔ چنانچہ اس بارے میں بخاری کے الفاظ یہ ہیں:-

فَلَمَّا سَمِعَ ذَلِكَ عَرَفَ أَنَّهُ سَيُرَدُّ إِلَى بَيْتِهِ

یعنی جب ابوبصیر نے آنحضرت ﷺ کے یہ الفاظ سنے تو جان لیا کہ آپؐ بہر حال اُسے مکہ والوں کی طرف واپس بھجوا دیں گے۔

اُس پر وہ چپکے سے وہاں سے نکل آیا اور مکہ جانے کی بجائے جہاں اُسے جہانی اور روحانی دونوں موتیں نظر آتی تھیں، بحیرہ احمر کے ساحل کی طرف ہٹ کر سیف البحر میں پہنچ گیا۔

جب مکہ کے دوسرے مخفی اور کمزور مسلمانوں کو یہ علم ہوا کہ ابوبصیر نے ایک علیحدہ ٹھکانا بنا لیا ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ مکہ سے نکل نکل کر سیف البحر میں پہنچ گئے۔ انہی لوگوں میں رئیس مکہ سیل بن عمرو کا لڑکا ابو جندل بھی تھا جس کے متعلق ہم پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حدیبیہ سے واپس لوٹا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی تعداد شتر کے قریب یا بعض روایات کے مطابق تین سو تک پہنچ گئی تھے اور اس طرح گویا مدینہ کے علاوہ ایک دوسری اسلامی ریاست بھی معرض وجود میں آگئی جو مذہباً تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت تھی مگر سیاستاً جدا اور آزاد تھی۔ چونکہ ایک طرف حجاز کی حدود میں ایک علیحدہ اور آزاد سیاسی نظام کا موجود ہونا قریش کے لیے خطرہ کا باعث تھا اور دوسری طرف



سیف البحر کے مہاجر قریش مکہ سے سخت زخم خوردہ تھے اس لیے ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ان مہاجرین سیف البحر اور قریش مکہ کے تعلقات نے قریباً قریباً وہی صورت اختیار کر لی جو ابتداء میں مہاجرین مدینہ کے متعلق پیدا ہوئی تھی اور چونکہ سیف البحر اس رستہ کے بالکل قریب واقع تھا جو مدینہ سے شام کو جاتا تھا اس لیے قریش کے قافلوں کے ساتھ ان مہاجرین کی مٹھ بھڑ ہونے لگی۔ اس نئی جنگ نے جلد ہی قریش کے لیے خطرناک صورت اختیار کر لی کیونکہ اول تو قریش سابقہ جنگ کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے اور دوسرے اب وہ پہلے کی نسبت تعداد میں بھی بہت کم تھے اور ان کے مقابل پر سیف البحر کی اسلامی ریاست جو اب البصیر اور ابو جندل جیسے جان فروشوں کی کمان میں تھی ایمان کے تازہ جوش اور اپنے گزشتہ مظالم کی تلخ یاد میں اس برقی طاقت سے معمور تھی جو کسی مقابلہ کو خیال میں نہیں لاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں ہی قریش نے ہتھیار ڈال دیئے اور البصیر کی پارٹی کے حملوں سے تنگ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سفارت کے ذریعہ درخواست کی اور اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر عرض کیا کہ سیف البحر کے مہاجرین کو مدینہ میں بلا کر اپنے سیاسی انتظام میں شامل کر لیں اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ کی اس شرط کو کہ مکہ کے نو مسلموں کو مدینہ میں پناہ نہیں دی جائیگی اپنی خوشی سے منسوخ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخواست کو منظور فرمایا اور البصیر اور ابو جندل کو ایک خط کے ذریعہ اطلاع بھجوائی کہ چونکہ قریش نے اپنی خوشی سے معاہدہ میں ترمیم کر دی ہے اس لیے اب انہیں مدینہ میں چلے آنا چاہیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایلچی سیف البحر پہنچا تو اس وقت البصیر بیمار ہو کر صاحب فراش تھا اور حالت نازک ہو رہی تھی۔ البصیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب مبارک کو بڑے شوق کے ساتھ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا اور تھوڑی دیر بعد اسی حالت میں جان دیدی اور اس کے بعد ابو جندل اور اس کے ساتھی اپنے اس باہمت اور جوانمرد امیر کو سیف البحر میں ہی دفن کر کے خوشی اور غم کے مخلوط جذبات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بٹہ غم اس لیے کہ ان کا بہادر لیڈر البصیر جو اس واقعہ کا ہیرو تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی سے محروم رہا۔ اور خوشی اس بات پر کہ وہ خود اپنے آقا کے قدموں میں پہنچ گئے اور قریش کے خونی مقابلہ سے نجات ملی۔

البصیر اور ان کے رفقاء کا دلچسپ کارنامہ صلح حدیبیہ کے معاہدے سے لیکر کئی ماہ کے وقفہ پر پھیلا ہوا تھا اور اس عرصہ میں بعض دوسرے واقعات بھی پیش آئے مگر ہم نے صلح حدیبیہ سے



تعلق رکھنے والے واقعات کو یکجا بیان کرنے کی غرض سے اسے صلح حدیبیہ کے ساتھ ہی بیان کر دیا ہے۔

صلح حدیبیہ کے تعلق میں عیسائی  
غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح کا کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں ہے جسے مسیحی مورخین نے بغیر اعتراض کے چھوڑا ہو اور صلح حدیبیہ کا واقعہ بھی اسی کلیہ کے نیچے آتا ہے۔ بعض ضمنی اور غیر اہم اعتراضات کو نظر انداز کرتے ہوئے عیسائی مصنفین نے صلح حدیبیہ کے تعلق میں دو اعتراض کئے ہیں۔

اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلح حدیبیہ کی شرائط سے عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا یہ شرائط معاہدہ کی رو سے جائز نہیں تھا۔ کیونکہ معاہدہ کے الفاظ عام تھے جس میں مرد و عورت سب شامل تھے۔

دوم یہ کہ ابوبصیر کے واقعہ کے تعلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کی روح کو توڑا بلکہ ابوبصیر کو یہ اشارہ دیکر کہ وہ مکہ میں واپس جانے کی بجائے ایک الگ پارٹی بنا کر اپنا کام کر سکتا ہے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

ان اعتراضوں کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ معاہدہ قریش مکہ کے ساتھ ہوا تھا اور قریش مکہ وہ قوم تھی جو ابتداء اسلام سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برسرِ پیکار چلی آتی تھی اور بات بات پر اعتراض کرنے اور طعنہ دینے کی عادی تھی۔ اور ویسے بھی وہ کوئی دُور دراز کی غیر قوم نہ تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ہی قوم تھی جسے سب حالات کا پورا پورا علم تھا۔ اور پھر شرائط معاہدہ کی تمام تفصیلات اور ان کا مکمل پس منظر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھا پس جب مکہ کے قریش نے جو فریق معاہدہ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر اعتراض نہیں کیا اور اسے معاہدہ کے خلاف نہیں سمجھا تو تیرہ سو سال بعد میں آنے والے لوگوں کو جن کی آنکھوں سے بہت سی جزئی تفصیل پوشیدہ ہیں اور انہیں اس معاہدہ کے پس منظر پر بھی پوری طرح آگاہی نہیں اعتراض کا حق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہوا کہ جن کے ساتھ یہ سارا قصہ گذرا ہے وہ تو اُسے درست قرار دیکر خاموش رہتے ہیں مگر تیرہ سو سال بعد میں آنے والوں نے گویا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ آخر یہ کیا وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ قرآن و حدیث اور عرب کی تاریخ ان اعتراضوں سے بھرے پڑے ہیں جو کفار مکہ اور دوسرے کفار عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے مگر یہ ذکر کسی جگہ نہیں آتا کہ مسلمانوں پر صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کا الزام لگایا گیا ہو۔

علاوہ ازیں یہ بات مضبوط ترین شہادت سے ثابت ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کی طرف تبلیغی خط ارسال کیا اور اُس وقت اتفاق سے ابوسفیان بن حرب ریس مکہ بھی شام میں گیا ہوا تھا اور ہرقل شہنشاہ روم نے اُسے اپنے دربار میں بلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض سوالات کئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "کیا تمہاری قوم کے اس بُدعی نبوت نے کبھی کسی معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں ابوسفیان نے جو اُس وقت راس المنکرین اور اسلام کا اشد ترین دشمن تھا جو الفاظ کے وہ یہ تھے۔

لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَذَرُ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا وَلَا يُمَكِّنُنِي  
كَلِمَةً أَدْخُلُ فِيهَا شَيْئًا غَيْرَ هَذِهِ الْكَلِمَةِ

یعنی "نہیں۔ محمد (ﷺ) نے کبھی کسی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی ہاں آجکل اُس کے ساتھ ہمارے ایک معاہدہ کی میعاد چل رہی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس معاہدہ کے اختتام تک اُس کی طرف سے کیا امر ظاہر ہو۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ اس ساری گفتگو میں میرے لیے اس فقرہ کے بڑھا دینے کے سوا کوئی اور موقع نہیں تھا کہ میں آپ کے خلاف ہرقل کے دل میں کوئی امکانی شبہ پیدا کر سکوں۔"

ابوسفیان اور ہرقل کی یہ گفتگو صلح حدیبیہ کے معاہدہ نہیں ہوتی تھی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہرقل کے نام تبلیغی خط تیار کر کے روانہ کرنے اور پھر اس خط کے ہرقل تک پہنچنے اور پھر ہرقل کی طرف سے دربار منعقد ہونے اور ابوسفیان کو تلاش کر کے اپنے دربار میں بلانے وغیرہ میں لازماً وقت لگا ہو گا اور قرین قیاس یہ ہے کہ اس وقت تک البصیر کے مدینہ میں بھاگ آنے اور اُم کلثوم وغیرہ مسلمان عورتوں کے مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچ جانے کے واقعات ہو چکے ہوں گے اسی لیے سب مؤرخ البصیر اور اُم کلثوم والے واقعہ کو پہلے اور قیصر روم والے خط کے واقعہ کو اس کے بعد بیان کرتے ہیں مگر باوجود اس کے ابوسفیان ہرقل کے دربار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عہد شکنی کا الزام نہیں لگا سکا حالانکہ اُس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اُس کی یہ خواہش تھی کہ اگر کوئی ہاتھ پڑ سکے تو دریغ نہ کروں۔ مگر باوجود اس کے تیرہ سو سال بعد میں پیدا ہونے والے نقاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عہد شکنی کا الزام لگاتے ہوئے خدا کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ افسوس افسوس!

پھر اگر ان اعتراضوں کی تفصیل میں جائیں تو ان کا بودا پن اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے مثلاً

پہلا اعتراض یہ ہے کہ دراصل معاہدہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سے کام لیکر عورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا، لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ اعتراض بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ معاہدہ کے وہ الفاظ جو صحیح ترین روایت میں بیان ہوئے ہیں ان میں صراحتاً مذکور ہے کہ معاہدہ میں صرف مرد مراد تھے نہ کہ مرد اور عورتیں دونوں۔ چنانچہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں صحیح بخاری میں معاہدہ کے یہ الفاظ درج ہیں:-

لَا يَأْتِيكَ مِمَّا رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ عَلَىٰ دِينِكَ إِلَّا رَدَّ دَنَّهُ إِلَيْنَا  
یعنی "ہم میں سے جو مرد بھی آپ کی طرف جائے گا وہ خواہ مسلمان ہی ہو گا اسے ہماری طرف لوٹا دیا جائے گا"

ان واضح اور غیر مشکوک الفاظ کے ہوتے ہوئے یہ اعتراض کرنا کہ دراصل معاہدہ میں مرد و عورت دونوں مراد تھے صرف بے انصافی ہی نہیں بلکہ انتہائی بددیانتی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ کی بعض روایتوں میں معاہدہ کے الفاظ میں رجل (مرد) کا لفظ مذکور نہیں بلکہ عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں مرد و عورت دونوں شامل سمجھے جاسکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بہر حال مضبوط روایت کو مقدم سمجھا جائے گا اور جب صحیح ترین روایت میں رجل (مرد) کا لفظ آتا ہے تو لازماً اسی کو صحیح لفظ قرار دینا ہوگا علاوہ ازیں جو الفاظ تاریخی روایت میں آتے ہیں وہ بھی اگر غور کیا جائے تو اسی تشریح کے حامل ہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ مثلاً تاریخ کی سب سے زیادہ مشہور اور معروف کتاب سیرۃ ابن ہشام میں یہ الفاظ آتے ہیں:-

مَنْ آتَى مُحَمَّدًا مِنْ قُرَيْشٍ بِخَيْرٍ إِذِنْ وَلِيَّتِهِ رَدَّاهُ عَلَيْهِمْ  
یعنی "جو شخص قریش میں سے محمد (ﷺ) کے پاس اپنے گارڈین کی اجازت کے بغیر پہنچے گا اسے قریش کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا"

عربی کے ان الفاظ میں بیشک "مرد" کا لفظ صراحتاً بیان نہیں ہوا مگر عربی زبان کا ابتدائی علم رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ عربی میں بخلاف بعض دوسری زبانوں کے عورت اور مرد کے لیے علیحدہ علیحدہ صیغے اور علیحدہ علیحدہ ضمیریں استعمال ہوتی ہیں اور اوپر کی عبارت میں شروع سے لیکر آخر تک مردوں والے صیغے اور مردوں والی ضمیریں استعمال کی گئی ہیں۔ پس جیسا کہ معاہدوں کی زبانوں کی تشریح کا اصول ہے لازماً اس عبارت میں صرف مرد ہی شامل سمجھے جائیں گے نہ کہ عورت اور مرد دونوں۔ بیشک بعض اوقات عام محاورہ میں مردانہ صیغہ بول کر اس سے مرد و عورت دونوں مراد لے لیے جاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ

زیر بحث عبارت اس قسم کی عبارت نہیں ہے بلکہ معاہدہ کی عبارت ہے جسے قانون کا درجہ بلکہ اس سے بھی اوپر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر رکھا جاتا ہے اور الفاظ کا انتخاب دونوں فریقوں کی جرح اور منظوری کے بعد ہوتا ہے لہذا ایسی عبارت میں لازماً وہی معنی لیے جائیں گے جو محدود ترین اور مخصوص ترین پہلو رکھتے ہوں پس اس جہت سے بھی ہر حال یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس معاہدہ میں صرف مرد شامل تھے نہ کہ مرد اور عورت دونوں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عورت جو ایک کمزور جنس ہے اور عموماً اپنے خاوند یا مرد رشتہ داروں کے رحم پر ہوتی ہے اسے واپس لوٹانے کے یہ معنی تھے کہ اُسے اسلام لانے کے بعد پھر اپنے ہاتھوں سے کفر اور شرک کی طرف لوٹا دیا جائے جو نہ صرف رحم و شفقت بلکہ عدل و انصاف کے جذبہ سے بھی بعید تھا۔ بیشک ایک مرد کو واپس لوٹانے میں بھی اُس کے لیے یہ خطرہ تھا کہ مکہ کے کفار اُسے مختلف قسم کے عذابوں اور دھکوں میں مبتلا کریں گے مگر مرد پھر بھی مرد ہے۔ وہ نہ صرف تکلیفوں کا زیادہ مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ حرب ضرورت اور ہر اُدھر چھپ کر یا بھاگ کر یا جتھہ وغیرہ بنا کر اپنے لیے بچاؤ کے کئی رستے کھول سکتا ہے مگر ایک بے بس عورت کیا کر سکتی ہے؟ اس کے لیے ایسے حالات میں یا تو اسلام سے جبری محمدی کی صورت تھی اور یا موت۔ اندریں حالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی رحیم و کریم ہستی سے بالکل بعید تھا کہ بیکس اور بے بس مسلمان عورتوں کو ظالم کفار کے مظالم کی طرف لوٹا دیتے۔ پس جو کچھ کیا گیا وہ نہ صرف معاہدہ کے الفاظ کی رو سے بالکل صحیح اور درست تھا بلکہ عدل و انصاف اور رحم و شفقت کے مستلزم اصول کے لحاظ سے بھی عین مناسب اور درست تھا اور اعتراض کرنے والوں کے حصہ میں اس قابلِ افسوس شرم کے ہوا کچھ نہیں آیا کہ انہوں نے مظلوم اور بے بس عورتوں کی حقانیت کے انتظام پر بھی زبانِ طعن دراز کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

دوسرا اعتراض البصیر کے واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر غور کرنے سے یہ اعتراض بھی بالکل بوجہ اور کمزور ثابت ہوتا ہے۔ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاہدہ فرمایا تھا کہ کفار مکہ میں سے جو شخص یعنی جو مرد مدینہ بھاگ کر آجائے گا تو وہ خواہ مسلمان ہی ہو گا اُسے مدینہ میں پناہ نہیں دی جائیگی اور واپس لوٹا دیا جائیگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ آپ نے اس معاہدہ کے ایفاء کا ایسا کامل اور شان دار نمونہ دکھایا کہ دنیا اُس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔ غور کرو اور دیکھو کہ البصیر اسلام کی صداقت کا قائل ہو کر مکہ سے بھاگتا ہے اور کفار کے مظالم سے محفوظ ہونے اور اپنا ایمان بچانے کے لیے چھپتا چھپتا مدینہ میں پہنچ جاتا ہے مگر اُس کے ظالم رشتہ دار بھی اُس کے پیچھے پیچھے پہنچتے ہیں اور اُسے تلوار کے زور سے اسلام کی صداقت سے منحرف کرنے کے لیے جبراً واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ اس پر یہ دونوں فریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ البصیر بھرائی ہوئی آواز اور سہمے ہوئے انداز میں عرض کرتا ہے کہ یا رسول اللہ! مجھے خدا نے اسلام کی نعمت سے نوازا ہے اور مکہ واپس جانے میں جو دکھ اور خطرہ کی زندگی میرے سامنے ہے اُسے آپ جانتے ہیں خدا کے لیے مجھے واپس نہ لوٹائیں۔ مگر اس کے مقابل پر البصیر کے رشتہ دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کا اور ہمارا معاہدہ ہے کہ ہمارا جو آدمی بھی مدینہ آئے گا اُسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔ البصیر کا دکھ اور اپنے صحابہ کی غیرت آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے اور خود آپ کے اپنے جذبات آپ کے دل میں تلاطم برپا کر رہے ہیں مگر یہ امانت و دیانت کا مجسمہ اپنے عہد پر چٹان کی طرح قائم رہتے ہوئے فرماتا ہے اور کن پیائے لفاظ میں فرماتا ہے۔

يَا أَبَا بَصِيرٍ أَتَقْدِرُ أَنْ تُعْطِينَاهُ هَؤُلَاءِ الْقَوْمَ مَا قَدْ عَلِمْتَ وَلَا يَصْلَحُ  
لَنَا فِي دِينِنَا أَنْ نَخْذِرَهُمْ إِنْ أَلَّاهُ جَاعِلٌ لَكَ وَلِسْمِنَ مَعَكَ مِنْ مُسْتَضْعِفِينَ  
خَرَجًا وَمَخْرَجًا فَأَنْطَلِقُ إِلَى قَوْمِكَ بِه

یعنی "اے البصیر! تم جانتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو اپنا عہد و پیمان دے چکے ہیں اور ہمارے مذہب میں عہد شکنی جائز نہیں ہے پس تم ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ پھر اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ اسلام پر قائم رہو گے تو خدا تمہارے لیے اور تم جیسے دوسرے بے بس مسلمانوں کے لیے خود کوئی نجات کا رستہ کھول دیگا۔" اس ارشاد نبوی پر البصیر مکہ والوں کے ساتھ واپس چلا گیا اور جب وہ مکہ کے رستہ میں اپنے قید کرنے والوں کے ساتھ لڑائی میں غالب ہو کر پھر دوبارہ واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے دیکھتے ہی غصہ کے ساتھ فرمایا:-

وَيْلٌ لِمَنْ مَشِعْرُ حَرْبٍ لَوْ كَانَ كَهَذَا أَحَدٌ.

یعنی "خرابی ہو اس کی مال کے لیے یہ شخص تو لڑائی کی آگ بھڑکار رہا ہے۔ کاش اسے کوئی سنبھالنے والا ہو۔"

یہ الفاظ سننے ہی البصیر یہ یقین کر لیتا ہے کہ آپ اُسے بہر حال واپس لوٹا دیں گے اور مدینہ سے چپکے چپکے نکل آتا ہے اور ایک دور کی علیحدہ جگہ میں اپنا ٹھکانا بنا لیتا ہے۔ اب اس سارے واقعہ کو الفاظ کی نظر سے دیکھو کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا ذمہ واری عائد ہوتی ہے اور آپ کے خلاف کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بلکہ حق یہ ہے کہ آپ نے اس معاملہ میں اپنے جذبات کو کچلتے ہوئے معاہدہ کو پورا کیا اور نہ صرف ایک دفعہ بلکہ دو دفعہ البصیر کو واپس لوٹایا اور واپس بھی ایسے شان دار الفاظ میں



لوٹایا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپؐ نے اپنے جذبات کو گچلا۔ اپنے صحابہ کے جذبات کو گچلا اور ابوبصیر کے جذبات کو گچلا اور ہر حال میں معاہدہ کو پورا کیا۔ پھر اگر ابوبصیر خود اہل مکہ سے آزاد ہو کر کسی اور جگہ چلا گیا تو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور معاہدہ کی وہ کونسی شرط ہے جس کے مطابق آپؐ اس بات کے پابند تھے کہ خواہ مکہ سے بھاگا ہوا شخص کہیں بھی ہو آپؐ اُسے مکہ میں واپس پہنچا دینے کے ذمہ دار ہوں گے۔ افسوس! افسوس!! اسلام کے دشمنوں نے کئی جہات میں بھی اسلام سے انصاف نہیں کیا۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبصیر کو اُس کے قائم کردہ کمپ میں حکم بھجوا سکتے تھے کہ تم مدینہ واپس چلے آؤ اور یہ کہ چونکہ آپؐ نے ایسا نہیں کیا اس لیے آپؐ نے گویا معاہدہ کے الفاظ کو تو نہیں مگر اُن کی روح کو توڑا۔ سو یہ اعتراض بھی ایک سراسر جہالت کا اعتراض ہے اور خود معاہدہ کے الفاظ اور ان الفاظ کی روح اسے رد کرتے ہیں۔ معاہدہ کی یہ شرط کہ اگر کوئی مکہ کا رہنے والا مسلمان بھاگ کر مدینہ میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے واپس لوٹا دیں گے صاف طور پر ثابت کرتی ہے کہ اس شرط کی غرض و غایت یہ تھی کہ ایسے شخص کو باوجود اُس کے مسلمان ہونے کے مدینہ کی اسلامی سیاست کے دائرہ میں قبول نہیں کیا جائیگا یعنی گو وہ عقیدہ کی رو سے مسلمان ہوگا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے اپنی مدنی سیاست میں شریک نہیں کریں گے۔ تو جب ایسا شخص خود معاہدہ کی شرائط کے ماتحت مدینہ کی اسلامی سیاست سے خارج قرار دیا گیا تھا تو اس کے متعلق یہ مطالبہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے حکم دے کر واپس لوٹا دیں گے پس یہ کتنا بھاری ظلم ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کو مدینہ میں رکھتے ہیں تو آپؐ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آپؐ کا معاہدہ تھا کہ مسلمان ہونے کے باوجود آپؐ اُسے اپنی سیاست میں شامل نہیں کریں گے اور اگر آپؐ اُسے اپنی مدنی سیاست سے خارج کر کے اہل مکہ کے سپرد کرتے اور مدینہ سے نکالتے ہیں تو پھر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپؐ اُسے اپنی سیاست میں شامل کر کے حکم کیوں نہیں بھجواتے۔ پس سیاسی لحاظ سے یہ ایک ایسا بودا اور ایسا کمزور اور ایسا لالچنی اعتراض ہے کہ کوئی سمجھ دار شخص اس کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اور حق یہ ہے کہ یہ نامعقول شرط جو کفار کی طرف سے معاہدہ میں شامل کی گئی تھی کہ کسی مسلمان مہاجر کو مدینہ میں پناہ نہ دی جائے خدا نے اسی کو اُن کے لیے عذاب بنا کر بتا دیا کہ ہمارے رسولؐ نے تو ہر حال معاہدہ کی پابندی کی مگر تم نے اپنے رشتہ میں خود کاٹے بوتے اور خود اپنے ہی بنائے ہوئے ہتھیار سے اپنے ہاتھ کاٹے جب تم نے خود کہا کہ مکہ کا جو نوجوان بھی مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں رکھیں گے اور یہ کہ وہ مدینہ کی سیاست سے خارج سمجھا جائے گا تو پھر اسی منہ سے تم یہ مطالبہ کس طرح کر سکتے ہو کہ یہ

مدنی سیاست سے خارج لوگ جہاں جہاں بھی ہوں انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیکر اور ان پر اپنی سیاست قائم کر کے مکہ پہنچائیں؛ تم نے خود یہ شرط پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کی رُوحوں پر اور ان کے امورِ اخروی پر تو بیشک حکومت کریں مگر ان کی سیاست اور دنیوی امور پر حاکم نہیں۔ اور جب تم نے خود انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست سے نکال دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیسا؟ بہر حال یہ قریش مکہ کا اپنا مکر تھا جو خود انہی پر لوٹ کر گرا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہر صورت پاک تھا اور پاک رہا۔ آپ نے معاہدہ کے الفاظ کو بھی پورا کیا اور ابوبصیر کو مکہ والوں کے سپرد کرتے ہوئے مدینہ سے رخصت کر دیا۔ اور پھر آپ نے معاہدہ کی روح کو بھی پورا کیا کہ جیسا کہ اس شرط کا اصل منشاء تھا۔ آپ نے ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو اپنی سیاست کے دائرہ سے خارج رکھا۔ پس آپ ہر جہت سے سچے رہے اور کفار مکہ اپنے ہی پھیلاتے ہوئے حال کا خود شکار ہو کر رہ گئے اور بالآخر خود ذلیل ہو کر آپ کے پاس آئے کہ ہم اس شرط کو معاہدہ سے خارج کرتے ہیں۔

اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کہہ کر کہ وَنَبِلُ اُمَّہٗ مُسْعِرُ حَرْبٍ نَّوْكَانَ لَہٗ اَحَدٌ (یعنی اس کی ماں کے لیے خرابی ہو یہ شخص تو جنگ کی آگ بھڑکا رہا ہے۔ کاش کوئی اسے سنبھالنے والا ہو) ابوبصیر کو اشارہ کیا تھا کہ تم الگ پارٹی بنا کر قریش سے جنگ شروع کر دو۔ کتنا ظلم اور کتنی گندی ذہنیت اور حالات پیش آمدہ سے کتنی جہالت ہے! یہ الفاظ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور نا واجب جنگ سے آپ کی بیزاری کا بین ثبوت ہیں اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ آپ ابوبصیر کے اس فعل سے بریت اور بیزاری کا اظہار فرما رہے ہیں نہ یہ کہ اسے کوئی مخفی اشارہ دیکر جنگ پر ابھارنا چاہتے ہیں۔

اور اگر کوئی شخص یہ خیال کرے جیسا کہ سر ولیم میور نے خیال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ نَّوْكَانَ لَہٗ اَحَدٌ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ "اگر اُسے کوئی ساتھی مل جائے" اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ آپ کا یہی منشاء تھا کہ اگر ابوبصیر کو کوئی ساتھی مل جائے تو وہ جنگ کی آگ بھڑکا سکتا ہے اور اس طرح اس کلام میں گویا جنگ کی انگیخت کا اشارہ پایا جاتا ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ اول تو جو معنی ہم نے کہے ہیں وہ عربی محاورہ کے عین مطابق ہیں جس کی مثالیں حدیث میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر بالفرض دوسرے معنی جاتر بھی ہوں تو پھر بھی عبارت کے سیاق و سباق کے ماتحت اس فقرہ کا مطلب اس کے سوا کوئی اور نہیں لیا جاسکتا کہ اگر ابوبصیر کو اس کا کوئی ہم خیال ساتھی مل جائے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکا دے مگر شکریہ ہے کہ اُسے مدینہ میں کوئی ایسا ساتھی میسر نہیں۔ پس خواہ کوئی معنی لئے جائیں اس عبارت کا سیاق و سباق اور اس کے ابتدائی ٹکڑے اس بات کا کافی وشافی ثبوت

میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء البصیر کو ملامت کرنا تھا نہ کہ جنگ کے لیے ابھارنا کیا اپنے کلام کو اس غصہ اور ملامت کے الفاظ سے شروع کرنے والا شخص کہ فلاں شخص کی ماں کے لیے خرابی ہو وہ تو جنگ کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ اس کے معاً بعد اس قسم کے الفاظ منہ پر لاسکتا ہے کہ ہاں ہاں جنگ کی آگ بھڑکاؤ؟ آخر اعتراض کرنے کے شوق میں عقل کو تو ماتھ سے نہیں دینا چاہیے! پھر سب سے بڑی بات یہ دیکھنے والی ہے کہ خود البصیر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ نے کیا اثر کیا اور اس نے آپ کا کیا مطلب سمجھا۔ سو اس کے متعلق اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ:-

فَلَمَّا سَمِعَ ذَلِكَ عَرَفَ أَنَّهُ سَيَرُدُّكَ إِلَيْهِمْ

یعنی "جب البصیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ سنے تو اس نے سمجھ لیا کہ آپ بہر حال اُسے مکہ والوں کی طرف واپس لوٹا دیں گے۔ جس پر وہ چپکے سے بھاگ کر دوسری طرف نکل گیا۔

افسوس! افسوس! کہ جس شخص کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے گئے وہ خود تو ان کا یہ مطلب سمجھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اس فعل کو ناپسند کیا ہے اور آپ بہر حال اُسے مکہ کی طرف واپس لوٹا دیں گے مگر ہمارے تیرہ سو سال بعد آنے والے مہربان یہ کہہ رہے ہیں کہ دراصل آپ نے البصیر کو الگ پارٹی بنا کر جنگ کرنے کی انگلیخت کی تھی۔ تعصب کا ستیاناس ہو۔ بے انصافی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔

اسلامی سیاست اسلام کے  
دینی نظام سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہے

البصیر والے واقعہ سے اسلامی اصول سیاست کے متعلق بھی ایک اہم استدلال ہوتا ہے یعنی یہ کہ خاص حالات میں بعض علاقوں کے مسلمانوں کی

سیاست اُن کے مشترکہ دینی نظام سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو اپنے ایسے سیاسی نظام میں جو خود اُن کے اپنے اختیار میں ہو اسلامی اصولوں کے ترک کر دینے کا اختیار ہے۔ کیونکہ بہر حال جو قوم بھی اسلام پر ایمان لاتی ہے اس کا فرض ہے کہ اپنی دینی اور دنیوی زندگی کو اسلام کی تعلیم کے مطابق بنائے۔ پس میری مراد یہ نہیں کہ مسلمانوں کا کوئی حصہ اپنی سیاست میں دینی اصولوں کو ترک کر دینے کا حق رکھتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر مسلمان دو یا دو سے زیادہ علیحدہ علیحدہ ملکوں میں آباد ہوں یا جغرافیائی لحاظ سے ایک ملک میں رہتے ہوئے بھی اُن کی تنظیم ایک دوسرے سے جدا گانہ ہو تو وہ ایک مشترکہ امام اور مقتدا کی دینی اور روحانی قیادت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ علیحدہ سیاست

قائم کر سکتے ہیں بلکہ اگر اس صورت میں ایک پارٹی امام کی روحانی اقتدا کے علاوہ امام کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی سیاست میں منسلک ہو تو پھر بھی دوسری پارٹی امام کی دینی اور روحانی اقتدا میں ٹخنوں کے باوجود اپنا علیحدہ سیاسی نظام رکھ سکتی ہے گویا اس صورت میں جہاں ایک پارٹی دینی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے امام کے ساتھ ہوگی وہاں دوسری پارٹی دینی لحاظ سے تو امام کے ساتھ ہوگی مگر سیاست میں علیحدہ نظام رکھے گی۔ یہ استدلال ابوبصیر کے واقعہ سے اس طرح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ کی اس شرط کو قبول کیا کہ اگر مکہ کا کوئی مسلمان مدینہ میں آئے تو آپ اُسے مدینہ میں رکھ کر اپنی سیاست میں شامل نہیں کریں گے۔ بلکہ واپس لوٹا دیں گے اور پھر اس شرط کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً بھی ابوبصیر اور اس کی پارٹی کو اُن کے مسلمان ہونے کے باوجود مدینہ کی سیاست سے خارج رکھا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صلح کی اس شرط کو قبول کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ثابت کرتا ہے کہ آپ نے اس طریق کو جائز قرار دیا ہے کہ مختلف علاقوں کے مسلمان ایک دین پر قائم ہوتے ہوئے بلکہ ایک امام کے ماتحت ہوتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ علیحدہ سیاست رکھ سکتے ہیں اور یہ ایک نہایت اہم استدلال ہے جو ابوبصیر کے واقعہ کے تعلق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہوتا ہے اور دراصل اسی قسم کے حالات کے پیش نظر قرآن شریف کی یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:-

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا  
فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ  
تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ  
وَاقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ

یعنی ”اگر مومنوں میں سے دو پارٹیاں آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کرادو پھر اگر صلح کے بعد اُن میں سے کوئی پارٹی دوسری کے خلاف سینہ زوری اور سرکشی سے کام لے (اور شرائط کو توڑے) تو پھر سب مل کر اُس پارٹی کے خلاف لڑائی کرو جو سرکشی سے کام لے رہی ہو یہاں تک کہ وہ سیدھی ہو کر خدا کے فیصلہ کے سامنے جھک جائے۔ پھر اگر وہ سینہ زوری اور سرکشی سے باز آکر جھک جائے تو پھر ان دونوں پارٹیوں کے درمیان پورے عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور دیکھو عدل کے ترازو کو بہر حال برابر رکھو کیونکہ خدا عدل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔“

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں افراد کی لڑائی یا ایک سیاسی نظام کے اندر رہنے والی پارٹیوں

کی باہم لڑائی مُراد نہیں ہے بلکہ ایسی پارٹیوں کی لڑائی مُراد ہے جو اسلام پر قائم ہونے اور دینی لحاظ سے متحد ہونے کے باوجود علیحدہ علیحدہ سیاسی نظام رکھتی ہیں۔ بلکہ یہ وہ زریں اصول ہے جو صرف اسلامی پارٹیوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ دُنیا کی تمام قوموں اور تمام پارٹیوں پر یکساں چسپاں ہوتا ہے اور دراصل یہی وہ اصول ہے جو برسرِ بیکار قوموں کے درمیان حقیقی امن قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔





## اسلام کی امن اور جنگ کی طاقت کا مقابلہ

صلح حدیبیہ اسلامی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں سے ہے جس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس نئے دور کا آغاز غزوہ احزاب سے ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلْاَوَّلُ نَحْزُوْهُمْ وَلَا يَحْزُوْنَ اَيْلَہ یعنی آئندہ قریش مکہ پر ہم چڑھائی کریں گے مگر انہیں مدینہ کے خلاف چڑھائی کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ اس نئے دور کی تکمیل صلح حدیبیہ سے ہوئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ لڑائی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور انیس سال کی طویل کشمکش کے بعد جو شروع میں جابرانہ تشدد اور تعذیب کا رنگ رکھتی تھی اور آخر میں باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے لیے کم از کم جہاں تک اہل مکہ کا تعلق تھا امن کا ماحول قائم ہو گیا۔ سو اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی اسلام کی اس انیس سالہ خون آلود زندگی پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ ان انیس سالوں میں اسلام نے کس رنگ میں ترقی کی اور اس کے بعد امن کے دور میں رامن سے مراد نسبتی امن ہے کیونکہ گو مکہ کے ساتھ صلح ہو گئی تھی مگر عرب کی دوسری قومیں ابھی تک اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھیں، اسلام کی ترقی نے کیا صورت اختیار کی؟ یہ ایک نہایت لطیف مقابلہ ہو گا جس سے ہر انصاف پسند محقق اور مبصر کو اسلام کی امن اور جنگ کی طاقت کے موازنہ کا بہت اچھا معیار حاصل ہو سکے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی ابتدائی مردم شماری کا ریکارڈ موجود نہیں ہے اس لیے ہمیں لازماً اسلام کی ترقی کی رفتار کا اندازہ اس تعداد سے لگانا ہو گا جو ابتدائی اسلامی لڑائیوں میں شریک ہوتی رہی ہے اور نسبتی ترقی کو دیکھنے کے لیے یہ طریق کافی تسلی بخش ہے۔ سو چھوٹے چھوٹے درمیانی واقعات کو چھوڑتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی سب سے پہلی لڑائی میں یعنی جنگ بدر کے موقع پر جو سترہ ہجری میں ہوئی مسلمان مجاہدین کی تعداد باخلاف روایت تین سو دس سے یکتر تین سو انیس تک تھی۔ اس کے بعد اُحد کی لڑائی سترہ ہجری میں ہوئی اور اس میں شریک ہونے والے مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی۔ اُحد

کے بعد بڑی لڑائی غزوہ خندق تھی جو شہنہ ہجری میں ہوئی۔ اس لڑائی میں گو خندق وغیرہ کے کھودنے کے کام پر بچے اور بوڑھے سب مسلمان ملا کر کل تعداد تین ہزار ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ لڑائی ہوتی بھی گویا مدینہ کے اندر تھی اور گھر سے باہر نکلنے کا سوال نہیں تھا مگر غالباً علی لڑائی کے وقت صرف ایک ہزار مسلمان شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد شہنہ ہجری میں صلح حدیبیہ کا غزوہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو بیان ہوئی ہے۔ پہلے یکل اُنیس سال ہوئے کیونکہ قریباً تیرہ سال مکی زندگی والے اور قریباً چھ سال صلح حدیبیہ تک کی مدنی زندگی والے ملا کر کل اُنیس سال بنتے ہیں۔ گویا ان اُنیس سالوں میں جو ابتداءً مکہ کے جابرانہ تشدد اور بعد میں باقاعدہ لڑائی کی حالت میں گزرے اسلام کل چودہ سو مسلمان جوان پیدا کر سکا۔ اس کے بعد امن اور صلح کا زمانہ آتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد نے جو ترقی کی اُس کا اندازہ اُس تعداد سے ہو سکتا ہے جو صلح حدیبیہ کے دو سال بعد یعنی شہنہ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر شریک ہوئی۔ یہ تعداد مسلمہ طور پر دس ہزار تھی۔ گویا جہاں جنگ کے زمانہ میں اُنیس سال کی طویل جدوجہد نے صرف چودہ سو مسلمان پیدا کئے وہاں اس کے بعد امن کے زمانہ میں دو سال کی پُر امن تبلیغ نے اس تعداد میں آٹھ ہزار چھ سو کا اضافہ کر دیا۔ یہ حیرت انگیز فرق اس طرح پیدا ہوا کہ ایک طرف تو جنگ کے زمانہ میں کافروں اور مسلمانوں کے درمیان باہم میل ملاقات کا بہت کم موقع ملتا تھا اس لیے اسی نسبت سے کفار کو اسلام کی دلکش تعلیم کے سُسنے اور اُس سے متاثر ہونے کا موقع بھی بہت کم میسر آتا تھا اور دوسری طرف جو لوگ جنگ کے زمانہ میں اسلام کی تعلیم سے متاثر ہوتے تھے اُن میں سے بھی اکثر اس زمانہ کی غیر معمولی تکالیف اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے آگے آنے سے ڈرتے تھے، لیکن جب جنگ ختم ہونے سے صلح کا ماحول قائم ہوا تو گویا وہ بھاری بند جو اسلام کے دریا کے بہاؤ کو روکے ہوئے تھا یکجہت ٹوٹ کر گر گیا اور اسلام کے حیات افزا پانیوں کو گھلا رستہ ملنے سے اسلام نے وہ حیرت انگیز ترقی کی جو ہمارے سامنے ہے۔ کیا اس واضح نظارے کو دیکھتے ہوئے کوئی منصف مزاج انسان یہ اعتراض منہ پر لا سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ دیکھو اور غور کرو کہ جب تلوار نیام سے باہر تھی تو اُنیس سال کی طویل جدوجہد نے صرف چودہ سو مسلمان پیدا کئے لیکن جب یہ تلوار نیام کے اندر آگئی تو دو سال کے قلیل عرصہ نے ساڑھے آٹھ ہزار انسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا ڈالا۔ یہ وہ ٹھوس اور بولتے ہوئے اعداد و شمار ہیں جن پر کسی متعصب سے متعصب انسان کا تعصب بھی پردہ نہیں ڈال سکتا۔

آؤ اب ذرا ان اعداد و شمار کی مزید تفصیل میں جا کر پورا حساب نکالیں کہ اسلام کی امن کی طاقت کو اس کی جنگ کی طاقت کے مقابلہ پر کیا وزن حاصل ہے۔ موٹے طور پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگ کے اُنیس

سالوں نے چودہ سو مسلمان پیدا کئے اور اس کے مقابل پر امن کے دو سالوں نے اس تعداد میں آٹھ ہزار چھ سو مسلمانوں کا اضافہ کیا، لیکن اگر زیادہ حسابی نظر سے دیکھا جائے تو جو زمانہ ہم نے انیس سال کا شمار کیا ہے وہ دراصل کسروں میں جا کر اٹھارہ اور انیس سال کے درمیان یعنی قریباً ساڑھے اٹھارہ سال بنتا ہے اسی طرح ہم نے صلح حدیبیہ کے وقت جو تعداد چودہ سو شمار کی ہے اس کے متعلق صحیح روایات سے یہ نکلتا ہے کہ دراصل وہ چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان تھی بلکہ یعنی اسے قریباً ساڑھے چودہ سو سمجھنا چاہیے مگر ابھی اس کے علاوہ ایک اور فرق بھی ہے جو صحیح حسابی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے دور کرنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ تاریخ وحدیبیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دعویٰ نبوت کے ابتدائی تین سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل خاموشی کے ساتھ انفرادی تبلیغ میں گزارے تھے اور اسلام کی تبلیغ کو عام نہیں کیا تھا۔ پس ان ابتدائی تین سالوں کو ساڑھے اٹھارہ سال کے عرصہ میں سے منہا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح جنگ کے زمانہ میں اصل تبلیغی جدوجہد کا عرصہ ساڑھے پندرہ سال بنتا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ والے ۱۵ سال میں ساڑھے چودہ سو مسلمان ہوئے اور اس کے مقابل پر امن و صلح والے دو سال میں اس تعداد پر آٹھ ہزار پانچ سو پچاس کا اضافہ ہوا۔ اس طرح ان دونوں زمانوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ جنگ والے زمانہ کی رفتار ترقی ۱۴۵۰ ÷ ۱۵ = ۹۶ فی سال بنی اور امن و صلح والے زمانہ کی رفتار ۵۵۰ ÷ ۵ = ۱۱۰ فی سال نکلی۔ اور اگر حساب ایک بچہ بھی نکال سکتا ہے جو یہ ہے کہ ان دونوں کی باہمی نسبت ایک کے مقابلہ پر چھیالیس بنتی ہے یعنی اگر جنگ کے زمانہ کی تبلیغی طاقت کا نتیجہ ایک ہو تو اس کے مقابل پر امن کے زمانہ کی تبلیغی طاقت کا نتیجہ چھیالیس ہوگا اور یہ بعینہ وہی نسبت ہے جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عام مومن کے مقابلہ پر ایک نبی اللہ کی قرار دی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :-

الْأَرْوِيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَارْبَعِينَ  
جُزْءًا مِنَ النَّبُوَّةِ ۖ

یعنی "ایک مومن کی سچی روایا ایک نبی کی نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتی ہے"۔  
اب غور کرو کہ یہ کیسی عجیب و غریب اور کیسی لطیف مطابقت ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اُس کے جنگ کے زمانہ کی طاقت اس کے امن کے زمانہ کی طاقت کے مقابلہ پر بعینہ وہی حیثیت رکھنے والی ثابت ہوئی ہے جو ایک نبی اللہ کے مقابلہ میں عام مومن کی ہوا کرتی ہے اور یہ ایک باریک دھانی نکتہ ہے جس سے کئی اہم مسائل پر اصولی روشنی پڑتی ہے مثلاً :-  
۱۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی اصل روحانی طاقت امن کے زمانہ کی تبلیغ میں ہے

نہ کہ جنگ کی معرکہ آرائی میں۔ اور عقلاً بھی یہی ہونا چاہیے کیونکہ وہ پُر امن تبلیغ جس میں دلائل و براہین اور آیات بینات کے ذریعہ اسلام کی خوبی اور برتری ثابت کی جاتے ہیں اور یہی اسلام کی اندرونی قوت کی علامت دار ہے اور اس کے مقابل پر جنگ کا ماحول ایک محض خارجی چیز ہے جو صرف منکرین کی عداوت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اصل اندرونی طاقت جو گویا اسلام کے ذاتی اور مستقل جوہر کا رنگ رکھتی ہے خارجی عنصر کے نتائج پر بہر حال غالب ہونی چاہیے۔

۲۔ پھر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ خود اپنی روحانی طاقت اور اندرونی جاذبیت اور دلائل کے غلبہ سے پھیلا ہے۔

۳۔ اور پھر اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل ذاتی میلان امن و صلح کی طرف تھا نہ کہ جنگ کی طرف۔ اور جنگ کی حالت صرف منکرین کی پیدا کی ہوئی چیز تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبوراً داخل ہونا پڑا۔

یہ وہ تین زبردست نتائج ہیں جنہیں قبول کرنے کے لیے ہر عقل مند اور منصف مزاج انسان مجبور ہے اور ان کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ و سوانح پر ایک ایسی اصولی روشنی پڑتی ہے کہ اس سے یہ سارا میدان ایک خاص قسم کے نور سے جگمگا اٹھتا ہے۔ بیشک جہاد بالسیف بھی اسلامی تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے کیونکہ جو قوم یا حکومت اسلام کو بزور مٹانے کے لئے تلوار اٹھاتی ہے یا اسلام کی اشاعت کو تلوار کے زور سے روکنا چاہتی ہے اُس کے مقابلہ کے لیے اسلام بھی تلوار ہی اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ اور نہ صرف تلوار اٹھانے کا حکم دیتا ہے بلکہ ہدایت فرماتا ہے کہ ایسے ظالم دشمن کے خلاف اس طرح ڈٹ کر لڑو کہ گویا تم ایک سیسہ پلاتی ہوئی آہنی دیوار ہو۔ اور اُسے ایسی مار مارو کہ صرف وہی نہیں بلکہ اُس کے پیچھے آنے والے دوسرے دشمن بھی لرزہ بر اندام ہو کر منتشر ہو جائیں۔ مگر ان ظالم دشمنوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے خلاف تلوار اٹھانے میں پہل کرتے اور اسلام کو جبر و طاقت کے زور سے مٹانے کے درپے رہتے ہیں اسلام ساری قوموں کے لیے پُر امن تبلیغ کا پیغام لیکر آیا ہے اور اس کے اس پیغام میں اس کی روحانی طاقت کی شان اور اس کے خدا داد براہین کا غلبہ مخفی ہے۔ اور یہی وہ جہاد ہے جسے اسلام میں تلوار کے جہاد کے مقابل پر جہاد کبیر (یعنی بڑا جہاد) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ جب ایک دفعہ صحابہ کی ایک پارٹی ایک غزوہ سے واپس لوٹی تو آنحضرت ﷺ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ اب تم جہاد اصغر سے لوٹ کر جہاد اکبر کی طرف آرہے ہو اور جب صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہاد اکبر سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا: انسان کا اپنے نفس کیساتھ جہاد کرنا ہے۔



# اُسود و احمر کے نام اسلام کا پیغام

## قیصر و کسریٰ کو دعوتِ حق

ہم بتا چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے ساتھ اسلام کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نیا دور کامل امن کا دور تو ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ ابھی تک عرب کے بہت سے قبیلے اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے، لیکن ہاں چونکہ عربوں میں قریش کا قبیلہ خانہ کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے عموماً سارے قبیلوں میں زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اسلام کے خلاف جنگ کی ابتداء بھی اسی قبیلہ کی طرف سے ہوتی تھی اس لیے قریش کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو جانے کے نتیجے میں ملک کے ایک حصہ میں عارضی امن کی صورت ضرور پیدا ہو گئی تھی اور اس جزوی امن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ آپ کے خدا داد منصب نبوت کے تبلیغی پہلو کا ایک نہایت شاندار کارنامہ تھا۔ ہماری مراد اُن تبلیغی مراسلات سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے معاہدے کے بعد مختلف ملکوں کے بادشاہوں اور رئیسوں کے نام ارسال فرمائے اور اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ آپ کی توجہ کا مرکزی نقطہ تبلیغ اسلام ہے۔ یعنی اس ابدی اور آخری صداقت کا اقوامِ عالم تک پہنچانا جو خداوندِ عالم نے آپ کے ذریعہ دنیا میں نازل فرمائی۔ مگر اُن عالمگیر تبلیغی خطوط کے ذکر سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تبلیغی مذہب ہونے کے متعلق ایک اصولی نوٹ درج کر کے ناظرین کو بتایا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی نظریہ کیا تھا اور آپ کی بعثت کی غرض کتنے وسیع میدان پر پھیلی ہوئی تھی۔

## اسلام کا تبلیغی نظریہ

سوسب سے پہلے جانتا چاہیے کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور اس کے مقدس بانیؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو صداقت بھی اسلام کے ذریعہ آسمان سے نازل ہوئی ہے اُسے اپنے آپ تک چھپا کر نہ رکھے بلکہ لوگوں تک پہنچائے۔ اور اس کے سارے پہلوؤں کو کھول کھول کر بیان کر دے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ  
كَمَا بَلِّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ



یعنی "اے خدا کے رسول جو کچھ بھی تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے وہ لوگوں تک کھول کھول کر پہنچا دے اور اگر تو نے ایسا نہ کیا اور کسی حصہ کو چھپا کر رکھا اور کسی کو بیان کر دیا، تو جان لے کہ اس صورت میں تو خدا کی رسالت کو پہنچانے والا نہیں سمجھا جائے گا"

اور یہ فریضہ تبلیغ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آپ پر ایمان لانے والوں کا بھی یہی فرض مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کی صداقتوں کو دوسروں تک پہنچائیں چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

یعنی "اے مسلمانو! تم دنیا کی بہترین امت بنا کر اقوام عالم کے فائدہ کیلئے قائم کئے گئے ہو۔ تمہارا یہ کام ہے کہ لوگوں کو اسلام کی نیکی کی طرف بلاؤ اور خلاف اسلام بدی سے روکو"

پھر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک حصہ ہمیشہ تبلیغ اسلام کی خدمت کے لیے وقف رہنا چاہیے جو گویا اپنے آپ کو کفایت خدمت دین کے لیے وقف کر دے چنانچہ فرماتا ہے:-

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

یعنی "چاہیے کہ تم میں سے ملت کا ایک حصہ تبلیغ حق کے لیے وقف رہے اس کا کام لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور بھلائی کی تلقین کرنا اور بدی سے روکنا ہو۔ اور بات یہ ہے کہ یہی لوگ حقیقتہً بائرا ہیں"

فریضہ تبلیغ کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ہی قرآن شریف یہ اصول سکھاتا ہے کہ تبلیغ ہمیشہ

دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں

نہایت احسن طریق پر حکمت و دانائی کے رنگ میں ہونی چاہیے تاکہ صداقت پسند مخاطب کے دل میں ضد اور دُوری پیدا ہونے کی بجائے اس کے دل کی کھڑکیاں سچائی کے قبول کرنے کے لیے خود بخود کھلتی چلی جائیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:-

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ  
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ

یعنی "اے خدا کے رسول اپنے رب کے رستہ کی طرف حکمت اور عمدہ طریق نصیحت کے رنگ میں لوگوں کو دعوت دو۔ اور اگر کبھی بحث و مجادلہ کی صورت پیدا ہو جائے تو بحث بھی دلکش اور بہترین انداز میں کرو۔"

پھر اسی اصول کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا طریق کسی طرح جائز نہیں اور نہ جبر و تشدد کے نتیجہ میں سچا ایمان پیدا ہو سکتا ہے۔ پس دلائل و براہین کیساتھ سمجھا دینے کے بعد مخاطب کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ اگر وہ چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو انکار کر دے کیونکہ آزادانہ اقرار یا انکار کے بغیر کوئی شخص انعام یا سزا کا مستحق نہیں سمجھا جاسکتا چنانچہ فرماتا ہے۔

۱۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

یعنی دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہو سکتا۔ ہدایت اور گمراہی کھلی چھریں ہیں اور ہر شخص خود فیصلہ کا حق رکھتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے :-

۲۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۚ

"پس جو شخص چاہے ایمان لے آئے اور جو شخص چاہے انکار کر دے۔ ہاں جو لوگ انکار کر کے ظالم بنیں گے ان کے لیے آخرت میں ضرور آگ کا عذاب مقدر ہے۔"

پھر اسی لطیف مضمون کے دوسرے پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جبر کے نتیجہ میں پیدا شدہ ایمان قطعاً کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ ایمان کہلانے کا حقدار ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں انسان کی زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ اور انعام کا مستحق ہونا تو درکنار ایسے دورے منافق دوہرے عذاب کے سزاوار ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے کفر کے جرم کے ساتھ جھوٹ اور دھوکے بازی کے جرم کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ وہ کافر ہیں کیونکہ ان کے دل میں کفر ہوتا ہے اور وہ جھوٹے اور دھوکے باز ہیں کیونکہ وہ اپنے دل کے یقین کے خلاف مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے زبان سے جھوٹے طور پر اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے :-

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَةِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ

یعنی "منافق لوگ جو زبان سے تو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کے دل میں کفر بھرا ہوتا ہے وہ آخرت میں دوزخ کی آگ کی سب سے سخت اور سب سے نیچے کی تہ میں رکھے جائیں گے۔"

بالآخر اسلام اس سوال کو لیتا ہے کہ گذشتہ نبیوں یعنی حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور کرشن علیہم السلام وغیرہ کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن صرف اپنی قوم یعنی عربوں تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ صرف کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ دنیا کی ساری قوموں کے لیے ہے اور سارے زمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ساری قوموں کی طرف یکساں توجہ دینی چاہیے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ

یعنی "اے نبی تو لوگوں سے کہہ دے کہ خدا نے مجھے تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ہاں وہی خدا جو اس کل کائنات یعنی آسمانوں اور زمین کا مالک و آقا ہے۔" اور اس ہدایت کی تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عالمگیر مشن کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي - نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً ۖ وَفِي رِوَايَةٍ بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ ۖ

یعنی مجھے پانچ ایسی باتیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ (۱) مجھے ایک ماہ کی مسافت تک خدا داؤر عطا کیا گیا ہے (۲) میرے لیے تمام زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ (۳) میرے لیے جنگوں میں حاصل شدہ مال غنیمت جائز قرار دیا گیا ہے (۴) مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا ہے اور (۵) مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا مگر مجھے سب بنی نوع آدم کے لیے مبعوث کیا گیا ہے اور (ایک روایت میں یہ ہے کہ) میں اسود و احمر کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پانچوں خصوصیات اپنے اندر نہایت شاندار پہلو رکھتی ہیں مگر اس جگہ ہمارا تعلق صرف پانچوں خصوصیت کے ساتھ ہے جس میں نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کا پیغام دنیا کی ساری قوموں کے واسطے ہے نہ کہ صرف کسی ایک قوم کے واسطے۔

اسلام کی دائمی شریعت

پھر قرآنی شریعت کے دائمی اور ناقابلِ تفسیح ہونے کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے :-

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَارْتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

یعنی "اے لوگو! میں نے آج تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی تمام نعمتوں کے دروازے کھول دیئے اور میں نے تمہارے واسطے اسلام کا دین پسند کیا ہے"

روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ بعض یہودیوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ لوگوں پر ایک ایسی آیت یعنی یہی الیوم اکملت لکم دینکم۔۔۔۔۔ (والی آیت) اُتری ہے کہ اگر وہ ہم پر اُترتی تو ہم اُس دن کو اپنے واسطے عید بنا لیتے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہمارے لیے تو خود خدا نے اسے عید بنا رکھا ہے کیونکہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حج کے مقدس موقع پر اور عرفہ کے متبرک مقام میں نازل ہوئی تھی جبکہ اس کے بعد کا دن عید الاضحیہ کا دن تھا اور مجھے یہ ساری تفصیل یاد ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں کہ :-

إِنِّي أَخْرُجُ الْإِنْسِيَاءَ وَمَسْجِدِي هَذَا آخِرُ الْمَسَاجِدِ

یعنی "میں آخری نبی ہوں (میرے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو میرے دور نبوت کو منسوخ کر دے) اور میری یہ مسجد آخری مسجد ہے (جس کے بعد کوئی ایسی عبادت گاہ نہیں ہو سکتی جو میری مسجد کو منسوخ کر کے نیا طریق عبادت جاری کر دے)"۔

یاد رکھنا چاہیے کہ الفاظ "میری یہ مسجد آخری مسجد ہے" کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میری اس مسجد کے بعد کوئی مسجد نہیں بنے گی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے بہت سی مسجدیں بنائیں اور آج تک اسلامی ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسجدیں بنتی چلی آتی ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ آئندہ میری مسجد کے مقابل پر کوئی مسجد نہیں بنے گی بلکہ جو سچی مسجد بھی ہوگی وہ لازماً میری مسجد کی نقل اور نقل ہوگی۔

اور اسی حقیقت کو ایک اور لطیف رنگ میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ :-

أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ

یعنی "میں اور قیامت اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں کہ جس طرح میری یہ دو انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں اور یہ الفاظ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیں۔"

اس لطیف حدیث کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میری وفات کے معاً بعد قیامت آجائے گی۔ کیونکہ یہ بات نہ صرف واقعات بلکہ آپ کی بعثت کی غرض و غایت کے بھی خلاف ہے کہ آپ کے معاً بعد قیامت آجائے۔ پس اس حدیث میں بھی یقیناً یہی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ میرا دور شریعت قیامت تک چلے گا اور میرے بعد کوئی اور شریعت نہیں آئے گی جو میری شریعت کو منسوخ کر کے ایک نیا دور شروع کر دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا و مشن مکانی لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہے اور دنیا کی کوئی قوم آپ کی دعوت سے باہر نہیں اسی طرح زمانی لحاظ سے بھی آپ کا مشن کسی ایک زمانہ تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک وسیع اور غیر محدود ہے۔ اس تہیدی لوٹ کے بعد جو اسلام کے تبلیغی نظریہ کی وضاحت کے لیے ضروری تھا ہم اپنے اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

تبلیغی خطوط کیلئے  
انگوٹھی کی تیاری

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے صلح حدیبیہ کے بعد جب کہ مکہ والوں کے ساتھ صلح ہو جانے کے نتیجے میں تلوار کے جہاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قدر فرصت حاصل ہوئی تو آپ نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ اسلام کے عالمگیر مشن کے پیش نظر مختلف حکومتوں کے فرمانرواؤں کی طرف تبلیغی خطوط بھجوانے کی تجویز کی تاکہ ان فرمانرواؤں اور ان کے ذریعہ ان کی رعایا کو اسلام کا پیغام پہنچایا جائے کہ یہی آپ کی بعثت کی اصل غرض و غایت تھی۔ چنانچہ آپ نے حدیبیہ سے واپس آتے ہی اس بارہ میں اپنے صحابہ سے مشورہ کیا اور جب اس مشورہ میں آپ سے یہ عرض کیا گیا کہ نبوی حکمرانوں کا یہ عام دستور ہے کہ وہ مُرشدہ خط کے بغیر کسی اور خط کی طرف توجہ نہیں دیتے تو آپ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کروائی جس میں مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہ کے الفاظ کندہ کروائے گئے۔ اور خدا تعالیٰ کے نام کو مقدم اور بالا رکھنے کے خیال سے آپ نے ان الفاظ کی ترتیب یہ مقرر فرمائی کہ سب سے پہلے اللہ کا لفظ لکھا گیا اور درمیان میں رسول کا لفظ کندہ کیا گیا اور سب سے نیچے کی سطح میں مُحَمَّد کا لفظ رکھا گیا۔

۱۔ بخاری جلد ۱ کتاب العلم ۵۱ نیز بخاری جلد ۲ کتاب الجہاد ۱۰۱ ۲۔ فتح الباری بحوالہ زرقانی جلد ۴ ص ۳۳۲ بروایت اسنوی جس کی تصدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط بنام متوفی مصر سے بھی ہوتی ہے جو اصلی صورت میں دریافت ہو گیا ہے اور ہم آگے چل کر اسی کتاب میں اس کا نوٹ درج کر رہے ہیں۔



نیز چونکہ ان تبلیغی خطوط میں اس انگوٹھی کا نقش لینا مد نظر تھا، اس لیے یہ تدبیر بھی اختیار کی گئی کہ ان الفاظ کو سیدھے رخ پر لکھنے کی بجائے اُلٹا لکھا گیا تاکہ جب اس کا نقش لیا جائے تو یہ نقش پریس کی چھپائی کی طرح سیدھی صورت میں ظاہر ہو لے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ انگوٹھی اس کے بعد ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہی اور آپ کی وفات کے بعد اسے حضرت ابوبکر خلیفہ اولؓ نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد وہ حضرت عمر خلیفہ ثانیؓ کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد حضرت عثمان خلیفہ ثالثؓ نے اسے پناہی کہ ایک دن وہ اُن کے ہاتھ سے اریس نامی کنوئیں میں گر کر کھوئی گئی یہ حضرت عثمانؓ اور اُن کے ساتھیوں نے تین دن تک اس انگوٹھی کی تلاش جاری رکھی اور کنوئیں کا سارا پانی نکال کر چھان مارا مگر وہ نہ ملی یہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تدبیر سے جو آپ نے صحابہ فریضہ تبلیغ میں حسن تدبیر کے مشورہ سے انگوٹھی تیار کرانے میں اختیار کی اس بات

پر اُصولی روشنی پڑتی ہے کہ آپ کس طرح تبلیغ کے کام میں اُن تمام رستوں کو اختیار فرماتے تھے جو مخاطب کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس کے دل پر اچھا اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری تھے۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک خالص تبلیغ کا تعلق ہے کسی مہر کا ہونا یا نہ ہونا ایک بالکل زائد چیز ہے اور کلمہ حق مہر کے بغیر بھی اتنا ہی وزن رکھتا ہے جتنا کہ مہر کے ساتھ، لیکن چونکہ آپ کو بتایا گیا تھا کہ اس زمانہ کے بادشاہ مہر کے بغیر کسی خط کی طرف توجہ نہیں دیتے اور آپ کسی ایسے پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے مخاطب کے دل میں کسی جہت سے بے توجہی کی صورت پیدا ہو اس لیے آپ نے اس معمولی سی زائد تجویز کو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا تاکہ آپ کی تبلیغ میں کوئی ایسا رخ نہ رہ جائے جو تبلیغ کے اثر کو کسی جہت سے کمزور کرنے والا ہو۔ اور یہی اس قرآنی آیت کی عملی تفسیر ہے کہ :-

جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۝

یعنی "اے رسولِ دینِ حق کی تبلیغ کے معاملہ میں ہمیشہ اُس رستہ کو اختیار کرو جو مخاطب کے دل و دماغ پر اثر پیدا کرنے کے لحاظ سے بہترین ہو"

عرب کے چاروں اطراف میں تبلیغی مہم جو تبلیغی خطوط اس موقع پر روانہ کئے گئے وہ عرب کے چاروں اطراف کے حکمرانوں کے

لے زرقانی جلد ۳ ص ۳۳۳ - نیز ملاحظہ ہو آنحضرت ﷺ کے خط بنام مقوقس مصر کا کس جو اسی کتاب میں دوسری جگہ درج کیا گیا ہے جس میں محمد رسول اللہ کے الفاظ کی تحریر سیدھی نظر آتی ہے جو اس بات کا تین ثبوت ہے کہ اصل انگوٹھی میں الٹی تحریر تھی۔

لے بخاری کتاب القباس روایت ابن عمرؓ - مسند احمد بن حنبل - لے سورة النمل ۱۶۶



کر رہے ہیں۔ اس زمانہ میں روما کی مشرقی سلطنت اور کسریٰ کی ایرانی سلطنت دُنیا بھر میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنتیں تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کی آپس میں بھاری رقابت رہتی تھی کیونکہ سیاسی حسد کے علاوہ دونوں کا مذہب اور تمدن بھی جدا جدا تھا۔ یعنی جہاں روما کی سلطنت عیسائی مذہب کی پیروی تھی وہاں فارس کی ساسانی سلطنت آتش پرست اور مُشرک تھی۔ اور جیسا کہ کتاب ہذا کے حصہ اول و دوم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کے درمیان جنگ شروع تھی اور فارس کے کسریٰ نے روما کے قیصر کو اوپر تلے شکستیں دیکر اُس کا بہت سا علاقہ چھین لیا ہوا تھا۔ چونکہ مکہ والے بھی مُشرک اور بت پرست تھے اس لیے انہیں طبعاً اس جنگ میں ایرانیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی تھی لیکن مسلمان حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے عیسائیوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ سے الہام پا کر وہ پیشگوئی فرمائی جو قرآن شریف کی سورۃ روم کے شروع میں بیان ہوئی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:-

عُلِبَتِ الرُّومُ ۚ فِيْ اٰذْنِ الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ  
فِيْ بَضْعِ سِنِيْنَ ۚ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ۚ وَ كَيْوْمَئِذٍ  
يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۚ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۚ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ  
الرَّحِيْمُ ۚ وَعَدَ اللّٰهُ ۚ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدًا ۚ وَلَٰحِقَ الْاَكْثَرُ النَّاسِ  
لَا يَعْلَمُوْنَ ۚ

یعنی ”رومی لوگ قریب ترین زمین میں مغلوب کئے گئے لیکن وہ اپنی مغلوبی کے بعد غنقریب غالب آئیں گے۔ یہ تغیر نو سالوں کے اندر اندر ہوگا۔“ اور اس سے پہلے اور اس کے بعد اصل حکومت تو صرف خدا ہی کی ہے۔ (یعنی اس سے پہلے روحانی حکومت خدا کی ہے) اور اس کے بعد ظاہری حکومت بھی اسلام کے غلبہ کے ذریعہ خدا ہی کی ہونے والی ہے) اور اس دن مومن خوش ہوں گے۔ اللہ کی مدد کی وجہ سے۔ وہ مدد دیتا ہے جسے چاہتا ہے کیونکہ وہ طاقتور اور رحیم خدا ہے۔ یہ خدا کا پختہ وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔“

یہ قرآنی آیات اُس وقت نازل ہوئیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں تشریف رکھتے تھے

اور کسریٰ کی فتوحات کا سیلاب پورے زور میں تھا حتیٰ کہ وہ قیصر کا بہت سا علاقہ چھین کر اور شام اور مصر اور ایشیائے کوچک کو تاراج کر کے قیصر کے دار السلطنت قسطنطنیہ کے دروازے کھٹکھا رہا تھا مگر اس قرآنی پیشگوئی کے مطابق جنگ نے اچانک پٹا کھایا اور چند سال کی جدوجہد کے بعد قیصر کی فوجوں نے نہ صرف اپنا سارا علاقہ واپس چھین لیا بلکہ کسریٰ کے علاقہ میں بھی یلغار کرتی ہوئی گھس گئیں۔ یہ وہ عظیم الشان پیشگوئی تھی جس کی صداقت کو غیر مسلم مورخین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ ان واقعات کے متعلق سر ولیم میور لکھتا ہے:-

”قریباً قریباً اس زمانہ سے بیکر جب کہ محمد (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کیا روما اور فارس کی حکومتیں ایک دوسرے کے خلاف ایک خونی جنگ لڑ رہی تھیں۔ ۶۲۱ء عیسوی تک اس جنگ میں کسریٰ کی فوجوں کو مسلسل فتح حاصل ہوتی گئی۔ شام، مصر اور ایشیائے کوچک یکے بعد دیگرے تاراج کئے گئے اور خود قسطنطنیہ کا شہر بھی خطرہ میں پڑ گیا۔ بالآخر ہرقل (شہنشاہ روم) اپنی غفلت سے بیدار ہوا اور محمد (ﷺ) کی ہجرت از مکہ کے زمانہ میں وہ دشمن کی فوجوں کو ایشیائے کوچک کی قلعہ بندیوں سے پسپا کر رہا تھا۔ اس جنگ کی دوسری مہم میں قیصر اپنی فاتح افواج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا کسریٰ کے علاقہ کے اندر گھس گیا۔“

”اس جنگ میں محمد (ﷺ) کی ہمدردی اور دُعا قیصر کے حق میں تھی۔ مسیحیت ایک الہامی مذہب تھا جس کی اسلام کے ساتھ صلح ممکن تھی مگر ایران کے آتش پرست مشرک محمد (ﷺ) کے خیالات سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ بہر حال ابھی کسریٰ کی فاتح فوجیں قیصر کے خلاف بہیم غلبہ پاتی جا رہی تھیں کہ محمد (ﷺ) نے قرآن کی تیسویں سورت (سورۃ روم) میں یہ حکیمانہ پیشگوئی بیان کی کہ غَلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلِبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ۚ فِي بَضْعِ سِنِينَ۔ (یعنی عنقریب روم کو غلبہ حاصل ہوگا) اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ پیشگوئی بعد کے واقعات کے مطابق ٹھیک نکلی۔“

قیصر کی ان غیر معمولی فتوحات کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ کیساتھ شروع ہوا اور مسلمانوں کو قیصر کی پہلی فتح کی اطلاع اُس وقت ملی جب وہ قریش مکہ کے خلاف بدر کے میدان میں نمایاں فتح حاصل کر کے مدینہ کو واپس لوٹے تھے۔ یہ اور کسریٰ کے خلاف قیصر کو آخری اور فیصلہ کن فتح



صلح حدیبیہ کے زمانہ کے قریب حاصل ہوئی یہ  
اپنی اس غیر معمولی فتح کی خوشی اور شکرانہ میں قیصر نے محض سے لیکر ایلیا (یعنی یروشلم یا بیت المقدس)  
تک کا پیدل سفر کیا یہ دراصل ہرقل کا یہ سفر ایک نذر کی ایفائیں تھا جو اس نے فتح حاصل ہونے کی  
صورت میں مانی ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ ایڈلیسا سے لیکر یروشلم تک پیدل گیا جہاں حضرت مسیح ناصری کی  
اصل صلیب جو اہل فارس سے واپس چھینی گئی تھی اپنی جگہ پر دوبارہ رکھی جانے والی تھی یہ اور یہ سفر اس  
شان سے کیا گیا کہ رستہ میں ہرقل جہاں جہاں سے گذرنا تھا زمین پر فرش اور فرش کے اوپر پھولوں کی  
سیج بچھائی جاتی تھی یہ

صلح حدیبیہ کے بعد غالباً سب سے پہلا تبلیغی خط  
ہرقل کے نام آنحضرت ﷺ کا تبلیغی خط

صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے معاً بعد ماہ ذوالحجہ سنہ ۶ میں روانہ کیا۔ اور اس خدمت کے لیے  
آپ نے اپنے ایک ہوشیار اور مخلص صحابی وحیہ بن خلیفۃ الکلبی کو منتخب فرمایا جو اس سے  
پہلے بھی شام کی طرف سفر کر چکے تھے اور اس علاقہ کے واقف تھے۔ وحیہ ایک خوش رو و جوان تھے  
جن کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ کشفی طور پر حضرت جبرائیل کو بھی دیکھا تھا یہ  
اور آپ نے اس خط کے مجھواتے ہوتے یہ اُمید ظاہر فرمائی تھی کہ وحیہ یا جو شخص بھی یہ خدمت بجالا دے گا  
خواہ وہ بظاہر اس مہم میں کامیاب ہو یا نہ ہو وہ انشاء اللہ ضرور جنت میں جائے گا۔ اس تبلیغی خط  
کی تیاری اور مٹرو وغیرہ لگانے کے بعد آپ نے وحیہ کو ہدایت فرمائی کہ میرا یہ خط پہلے بصریہ  
کے رئیس کے پاس لے جاؤ (جو عرب کے شمال میں قیصر کی طرف سے گویا موروثی گورنر یا حاکم تھا)  
اور پھر اس کے توسط سے قیصر کے پاس پہنچو۔ اس وقت بصریہ کا گورنر حارث بن ابی شمر تھا جو اس  
علاقہ میں ریاست غسان کا والی اور حکمران تھا۔

۱۔ لائف آف محمد مصنف میور صفحہ ۳۶۸، ۳۶۹ ۵۔ HIMS AR EMESA ۶۔ بخاری جلد ۱  
کتاب الجہاد صفحہ ۱۰۷ ۷۔ EDESSA مگر غالباً یہ ایسیا (EMESA) یعنی حمص ہے اور غلطی سے  
ایڈلیسا لکھا گیا ہے جو ایک دوسرا شہر ہے۔ ۸۔ لائف آف محمد مصنف میور صفحہ ۳۶۹  
۹۔ ابن اسحاق بحوالہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۳۳۵ ۱۰۔ HERACLIUS ۱۱۔ ابن سعد بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ  
۳۳۴، ۳۳۵ ۱۲۔ شمالی ترمذی و مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۱۰۷ ۱۳۔ زرقانی۔ ۱۴۔ یہ عرب کے شمال اور شام کے جنوب میں ایک  
شہر تھا جسے انگریزی میں BOSRA کہتے ہیں۔ اسے عراق کے جدید شہر بصرہ کے ساتھ غلط نہیں کرنا چاہیے۔  
۱۵۔ بخاری کتاب الجہاد باب دعا النبی الی الاسلام۔ ۱۶۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۳۳۵



بصری کے گورنر یعنی ملک خسان کا واسطہ اختیار کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دانشمندی اور حسن تدبیر کا ثبوت دیا جو آپ اس سے قبل انگوٹھی کے تیار کرانے میں ظاہر فرما چکے تھے۔ کیونکہ غالباً آپ قیصر و کسریٰ کے درباروں کے متعلق یہ بات سن چکے تھے کہ یہ لوگ اپنی دنیوی بڑائی اور علوم و تربیت کی وجہ سے عموماً کوئی چھٹی براہ راست وصول نہیں کرتے جب تک کہ وہ علاقہ کے گورنر یا رئیس کے توسط سے نہ آتے اور چونکہ آپ کی اصل غرض کلمہ حق کی تبلیغ تھی اس لیے آپ نے ان درباری آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری خیال کیا تاکہ ان کی وجہ سے اصل کام میں کوئی روک نہ پیدا ہو سکے۔ ضمناً آپ کی ینیت بھی ضرور ہوگی کہ اس طرح اصل مخاطب کے علاوہ ایک درمیانی رئیس تک بھی آپ کا پیغام پہنچ جائے گا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے یہی طریق آپ نے مملکت فارس کے کسریٰ کے متعلق اختیار کیا جسے مراسلہ بھجواتے ہوئے آپ نے اپنے انجی کو ہدایت فرمائی تھی کہ پہلے یہ خط بحرین کے رئیس کے پاس لے جانا اور پھر اُس کے توسط سے کسریٰ کے پاس پہنچنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکیمانہ فعل جہاں ایک طرف آپ کے حزم و احتیاط اور حسن تدبیر کی دلیل ہے وہاں وہ اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ دنیوی حکمرانوں کے جائز آداب کو ملحوظ رکھنا نبوت کی شان کے منافی نہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون کی طرف بھجویا تو انہیں ہدایت فرمائی کہ:-

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّنَا تَعْلَمُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ۝

یعنی فرعون کے پاس جا کر اس کے ساتھ نرم انداز پر گفتگو کرنا شاید وہ اسی طرح نصیحت

حاصل کر لے اور خدا سے ڈرنے کا رشتہ اختیار کر لے۔

غالباً ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہرقل کے نام خط روانہ کرنے کی تیاری ہی فرما رہے تھے کہ ایک غیبی نصرت کے ماتحت ہرقل کو خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرف توجہ پیدا ہو گئی۔ کیونکہ بخاری میں روایت آتی ہے جو غالباً اسی موقع سے تعلق رکھتی ہے کہ جونہی شہنشاہ ہرقل ایلیا میں آیا تو ایک صبح کو وہ بہت پریشان خاطر اور گھبراہٹا ہوا نظر آتا تھا جس پر اُس کے بعض مذہبی درباریوں نے اُس سے عرض کیا کہ آج آپ کی حالت کچھ پریشان نظر آتی ہے، یہ کیا بات ہے؟ اُس نے کہا میں نے آج رات ستاروں میں غور کر کے (ہرقل علم ہیئت میں کافی دسترس رکھتا تھا) معلوم کیا ہے کہ کسی

۱۔ بخاری کتاب العلم و کتاب الجہاد۔ ۲۔ سورۃ طہ ۴۱۔ ۳۔ ایلیا بیت المقدس یعنی یروشلم کا پرانا نام ہے اور غالباً یہ لفظ عبرانی زبان کا ہے کیونکہ عبرانی میں ایل خدا کو کہتے ہیں گویا ایلیا کے معنی خدا کی طرف منسوب ہونے والے شریک بالفاظ دیگر مقدس شہر کے ہیں اور یہی بیت المقدس کے لفظ کا مفہوم ہے۔

ختم کرنے والی قوم میں ایک نئے بادشاہ کا ظہور ہوا ہے۔ اور اُس نے پوچھا کہ آج کل کون کون سی قوم ختم کرتی ہے؟ اُس کے درباریوں نے جواب دیا کہ ہمارے علم میں تو یہودیوں کے سوا کوئی ختم نہیں کرتا اور آپ کو یہودیوں کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اپنی حکومت کے مختلف شہروں میں حکم بھجوا دیں کہ یہود کو قتل کرنا شروع کر دیا جائے، لیکن ابھی یہ معاملہ اسی مرحلہ پر تھا کہ ہرقل کو ریاست عُسّان کے رئیس کی طرف سے یہ اطلاع پہنچی کہ عرب میں ایک شخص محمد نامی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اسے ملک میں کامیابی ہو رہی ہے۔ ہرقل نے اس خبر کے سُننے پر ہدایت دی کہ فوراً معلوم کیا جائے کہ آیا عرب لوگ ختم کرتے ہیں یا نہیں جس پر اُسے بتایا گیا کہ عرب لوگ ختم کرتے ہیں۔ ہرقل نے بے ساختہ کہا۔ تو پھر یہی اس اُمت کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے اور ہرقل نے مزید احتیاط کے طور پر اپنے ایک رفیق کو جو ایک بڑا عالم انسان تھا رومیہ میں خط لکھا اور اس معاملہ میں اُس کی بھی رائے پوچھی گئی۔

لیکن اس عرصہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا خط ہرقل کو پہنچ گیا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس جگہ بخاری کے الفاظ میں ہی یہ روایت درج کر دیں کیونکہ وہی اس تعلق میں صحیح ترین اور مفصل ترین روایت ہے۔ سو عبد اللہ بن عباس جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے بیان کرتے ہیں کہ:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر کی طرف اسلام کی دعوت کا خط لکھا اور اپنا یہ خط وحیِ کلّی کے ہاتھ بھجوا یا اور آپ نے وحیہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ آپ کے اس خط کو بُصریٰ کے رئیس کے پاس لے جائیں تاکہ وہ اُسے آگے قیصر کے پاس بھجوا دے۔ اس زمانہ میں قیصر روم سلطنتِ فارس کے خلاف فتح پانے کے شکرانے میں حمص سے ایلیا کی طرف پیدل چل کر آیا تھا اور ایلیا (دیت المقدس) میں ہی آنحضرت ﷺ کا یہ خط قیصر کو پہنچا۔ قیصر نے جب اس خط کو پڑھا تو ہدایت دی کہ اگر اس مدعی رسالت کی قوم کا کوئی شخص یہاں موجود ہو تو اُسے تلاش کر کے پیش کیا جائے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھے البوسفیان سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ان دنوں میں اپنے بعض قریشی ساتھیوں کے ساتھ شام کی طرف تجارت کی غرض سے گیا ہوا تھا اور یہ صلح حدیبیہ کے بعد کا زمانہ تھا۔ البوسفیان نے بتایا کہ قیصر کے آدمی ہمیں تلاش کر کے ایلیا میں لے گئے اور قیصر کے سامنے پیش کیا۔ اس وقت قیصر اپنی پوری شان کے ساتھ دربار میں بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے سر پر حکومت کا تاج تھا اور اُس کے ارد گرد روم کے بڑے بڑے درباری موجود تھے۔ قیصر نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان عرب لوگوں سے پوچھو کہ اس مدعی رسالت

کاسب سے قریبی رشتہ دار کون ہے۔ ابوسفیان نے عرض کیا میں ہی محمد (ﷺ) کا سب سے قریبی رشتہ دار ہوں اور وہ رشتہ میں میرے چچا کا بیٹا ہے۔ ابوسفیان بیان کرتا ہے کہ قیصر نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے ساتھیوں کو اپنے سامنے مگر میری پیٹھ کی طرف کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ترجمان سے کہا کہ اُس کے ساتھیوں سے کہدو کہ میں اس سے اُس شخص کے متعلق بعض سوالات کرنا چاہتا ہوں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ پس اگر ابوسفیان اپنے جواب میں کوئی بات غلط بیان کرے تو تم مجھے فوراً بتا دینا ابوسفیان کہتا ہے کہ خدا کی قسم اگر مجھے یہ شرم نہ ہوتی کہ میرے ساتھی یہ محسوس کریں گے کہ میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو میں اس موقع پر ضرور کوئی نہ کوئی غلط بات کہہ جاتا مگر میں سچی سچی بات کہنے پر مجبور ہو گیا اس کے بعد قیصر نے ترجمان کے ذریعہ اپنے سوالات شروع کئے۔

قیصر۔ اس مدعی کا تمہاری قوم میں حسب نسب کیا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ وہ ہم میں اچھے نسب کا ہے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔  
 قیصر۔ کیا اس سے پہلے تم میں سے کسی شخص نے اس قسم کا دعویٰ کیا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ نہیں۔  
 قیصر۔ کیا اس دعویٰ سے پہلے تم نے اس مدعی کے خلاف کبھی جھوٹ کا الزام لگتے سنا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ نہیں۔  
 قیصر۔ کیا اس کے باپ دادوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ نہیں۔  
 قیصر۔ کیا اس مدعی کو بڑے بڑے لوگ مان رہے ہیں یا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ ؟  
 ابوسفیان۔ کمزور اور غریب لوگ۔  
 قیصر۔ کیا اس کے ماننے والے بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں ؟  
 ابوسفیان۔ بڑھ رہے ہیں۔  
 قیصر۔ کیا ان میں سے کبھی کوئی شخص اُس کے دین کو برا سمجھتے ہوئے مُرتد ہوا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ کیا یہ شخص کبھی اپنے عہد کو توڑتا ہے ؟  
 ابوسفیان۔ نہیں۔ لیکن آج کل ہمارا اور اس کا ایک معاہدہ چل رہا ہے اس کے متعلق ہمیں ڈر ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ مجھے اس موقع پر اس فقرہ کے سوا کوئی اور موقع نہیں مل سکا کہ میں اپنی طرف سے آپ کے خلاف کوئی

بات لگا سکوں۔

قیصر۔ کیا کبھی اس کے ساتھ تمہاری کوئی جنگ ہوئی ہے؟

ابوسفیان۔ ہاں جنگ ہوئی ہے۔

قیصر۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ کیا نکلتا رہا ہے؟

ابوسفیان۔ یہ جنگ ایک اوپر چڑھنے والے اور نیچے گرنے والے ڈول کی طرح رہی ہے کہ کبھی اُسے غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی ہمیں۔

قیصر۔ یہ مدعی تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟

ابوسفیان۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کو ایک سمجھو اور شرک نہ کرو۔ اور وہ ہمیں اپنے باپ دادوں

والی عبادت سے روکتا ہے اور کہتا ہے نماز پڑھو اور صدقہ دو اور برائیوں

سے بچ کر رہو اور اپنے عہدوں کو پورا کرو اور امانتوں میں خیانت نہ کیا کرو۔

اس سوال و جواب کے بعد قیصر نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہو کہ جب تم سے میں

نے اس شخص کے حسب نسب کے متعلق پوچھا تھا تو تم نے جواب دیا تھا کہ وہ شریف خاندان سے

ہے اور خدا کے رسول ہمیشہ شریف خاندانوں میں سے مبعوث کئے جاتے ہیں۔ پھر میں نے تم سے

پوچھا تھا کہ کیا اس سے پہلے تم میں سے کسی شخص نے کبھی ایسا دعویٰ کیا ہے تو تم نے یہ جواب دیا کہ نہیں۔

یہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ اگر کسی اور نے ایسا دعویٰ کیا ہوتا تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید یہ اس

کی نقل کر رہا ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم نے اس کے دعویٰ سے پہلے کبھی کسی بات میں

اس کا جھوٹ دیکھا تو تم نے کہا کہ نہیں۔ تو میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص انسانوں پر جھوٹ نہیں

بول سکتا وہ خدا پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اسکے باپ دادوں

میں سے کوئی بادشاہ گذرا ہے اور تم نے کہا کہ نہیں۔ یہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ اگر اس کے باپ

دادوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ شاید وہ اپنے خاندان کی کھوتی ہوئی بادشاہت

کو واپس حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اسے بڑے بڑے لوگ مان رہے ہیں

یا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ۔ اور تم نے جواب دیا کہ کمزور اور غریب مزاج لوگ مان رہے ہیں۔ اور

حق یہ ہے کہ (شروع شروع میں) خدا کے رسولوں کو کمزور اور غریب مزاج لوگ ہی مانا کرتے ہیں۔ پھر

میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اس کے ماننے والے زیادہ ہو رہے ہیں یا کہ کم ہو رہے ہیں؟ اور تم نے

یہ جواب دیا کہ زیادہ ہو رہے ہیں۔ اور ایمان کا یہی حال ہوا کرتا ہے کہ جب تک کہ وہ اپنے کمال کو

نہیں پہنچ جاتا وہ برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا کبھی کوئی شخص ایمان

لانے کے بعد اس کے دین کو ناپسند کرنے کی وجہ سے مُرتد ہوتا ہے۔ تم نے کہا نہیں۔ اور یہی سچے



ایمان کا حال ہوتا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ دل میں داخل ہو جائے تو کوئی شخص (خواہ کسی اور وجہ سے مُرتد ہو جائے تو ہو جائے مگر) اُسے بُرا سمجھ کر پیچھے نہیں ہٹتا۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا کبھی یہ شخص بد عہدی کرتا ہے۔ اور تم نے کہا کہ نہیں۔ اور خدا کے رسولوں کا یہی مقام ہوتا ہے کہ وہ کبھی بد عہدی نہیں کرتے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اس کے اور تمہارے درمیان کبھی کوئی جنگ ہوتی ہے اور تم نے اس کا جواب دیا کہ ہاں ہوتی ہے اور یہ کہ کبھی لڑائی میں اُسے غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی ہمیں ہو جاتا ہے۔ اور یہی خدا کے رسولوں کا حال ہوتا ہے کہ اُن کی جماعتوں پر بھی کبھی کبھی تکلیفیں آتی رہتی ہیں مگر انجام بہر حال اُن کے حق میں ہوتا ہے اور آخر کار وہی جیتتے ہیں۔ پھر میں نے تم سے پوچھا تھا کہ وہ تمہیں کیا تعلیم دیتا ہے اور تم نے بتایا کہ وہ کہتا ہے کہ خدا کو ایک مانو۔ شرک نہ کرو۔ نماز پڑھو۔ صدقہ دو۔ بُری باتوں سے پرہیز کرو۔ اپنے عہدوں کو پورا کرو اور امانتوں میں خیانت نہ کرو۔ اور یہی ایک نبی کے اوصاف ہوا کرتے ہیں۔

اس کے بعد قیصر نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ غفریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، لیکن اے عرب کے لوگو! میرا خیال نہیں تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اور اگر وہ باتیں جو تم نے مجھ سے بیان کی ہیں درست ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت دُور نہیں کہ یہ شخص اس زمین پر جو اس وقت میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے ضرور قابض ہو کر رہے گا۔ اور اگر مجھے توفیق ملے تو میں اُس کی ملاقات کے لیے پہنچوں۔ اور اگر میں اُس کے پاس پہنچوں تو اُس کے قدموں کو دھو کر راحت پاؤں۔

ابوسفیان کہتا ہے کہ اس کے بعد قیصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط منگوایا اور اُسے دربار میں پڑھے جانے کا حکم دیا۔ اس خط میں یہ عبارت لکھی تھی :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ اِلٰی  
هٰرُقْلَ عَظِیْمِ الرُّومِ - سَلَامٌ عَلٰی مَنْ اَتَّبَعَ الْهُدٰی - اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ  
اَدْعُوْكَ بِدَ اِیْمَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْتُ سَلَمًا وَاَسْلِمْتُ یُوْتِیْكَ اللّٰهُ  
اَجْرَكَ مَرَّتَیْنِ - فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَعَلِیْكَ اِثْمُ الْاِیْسِیْنِ -  
وَاِیَّا اَهْلَ الْاِحْتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی حِلْمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ  
اَنْ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا  
بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اَشْهَدُ وَاِیَّا نَا  
مُسْلِمُوْنَ -

ترجمہ :- میں اللہ کے نام کے ساتھ اس خط کو شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط محمد خدا کے بندے اور اُس کے رسول کی



طرف سے روما کے رئیس ہرقل کے نام ہے۔ سلامتی ہو اس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد اسے رئیس روما! میں آپ کو اسلام کی ہدایت کی طرف بلاتا ہوں۔ مسلمان ہو کر خدا کی سلامتی کو قبول کیجئے کہ اب یہی صرف نجات کا رستہ ہے۔ اسلام لائیے خدا تعالیٰ آپ کو اس کا دوبرا اجر دیگا، لیکن اگر آپ نے روگردانی کی تو یاد رکھیے کہ آپ کی رعایا کا گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا اور اے اہل کتاب! اس کلمہ کی طرف تو آجاؤ جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی صورت میں خدا کا کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور خدا کو چھوڑ کر اپنے میں سے کسی کو اپنا آقا اور حاجت روا نہ گردانیں پھر اگر ان لوگوں نے روگردانی کی تو ان سے کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو بہر حال خدا کے واحد کے دامن کے ساتھ وابستہ اور اس کے فرمانبردار بند ہیں۔)

ابوسفیان روایت کرتا ہے کہ جب یہ گفتگو اور اس خط کا پڑھا جانا ختم ہوا تو دربار میں ہر طرف رومی رئیسوں کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں اور آپس کا کلام اونچا اور خلط ملط ہونے لگا اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم باہر چلے جائیں۔ اور جب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آیا اور مجھے اُن کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمدؐ کا اشارہ تو بہت بلند ہوتا نظر آتا ہے کیونکہ روما کی حکومت کا بادشاہ اس سے خوف کھا رہا ہے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ اپنے آپ کو نیچا اور ہیٹھا محسوس کرتا رہا۔ اور میرا دل اس یقین سے پُر تھا کہ محمدؐ اب غالب ہو کر رہے گا۔ حتیٰ کہ میرے دل میں اسلام کی صداقت نے رستہ پالیا حالانکہ میں اس سے پہلے اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔

اسی سے ملتی جلتی روایت بخاری باب کیف کان بدأ النسخی میں بھی آتی ہے اور طبری اور ابن اسحاق اور دوسرے سب مورخوں کی روایتیں بھی خفیف لفظی فرق کے ساتھ اس کی توثیق ہیں اور یکجائی بیان کے لیے فتح الباری اور تاریخ خمیس اور زرقانی کا کوئی جواب نہیں۔

گو اس موقع پر اپنے معزز درباریوں اور خصوصاً مذہبی لیڈروں کی مخالفت کی وجہ سے ہرقل خائف ہو کر خاموش ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی طبیعت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط اور اس سے قبل اور بعد کے حالات کا گہرا اثر ہو چکا تھا کیونکہ جب وہ ایتلیا سے لوٹ کر دوبارہ حصّ کی طرف گیا

۱۔ اریس (جس کی جمع اریسیین ہے) کے معنی کاشتکار اور زمیندار کے ہیں اور اس جگہ اس سے رعایا مراد ہے۔

۲۔ بخاری کتاب الجہاد باب دُعَا النبی الی الاسلام

اور اس عرصہ میں اس کو روایت کے عالم کا جواب بھی موصول ہو چکا تھا جس میں اُس نے ہر قل کی رائے کی تصدیق کی تھی کہ اس زمانہ میں ایک نبی کا مبعوث ہونا ظاہر ہوتا ہے تو ہر قل نے ایک دفعہ پھر مملکت روم کے بڑے بڑے اہل الرائے لوگوں کو دعوت دیکر بلایا اور اپنے مجلس کے شاہی محل میں انہیں جمع کر کے رازداری کے خیال سے دربار کے تمام دروازے بند کروا دیئے اور پھر روساء روم کو مخاطب کر کے ان سے کہا کہ اے میری مملکت کے سردارو! اگر تمہیں اپنی فلاح اور بہبودی منظور ہے اور تم تباہی سے بچ کر ترقی کا راستہ دیکھنا چاہتے ہو اور اپنے ملک کو ہلاکت سے بچانے کے خواہاں ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ اُس نبی کو قبول کر لو جو عرب کی سرزمین میں مبعوث ہوا ہے۔ قیصر کی یہ بات سنکر اُس کے درباری اس طرح بپھرے جس طرح کہ جنگل میں گور خر پھرتا ہے۔ اور قیصر کی مجلس سے بھاگ کر دروازوں سے باہر نکل جانا چاہا، لیکن قیصر کی دُور اندیشی نے پہلے سے دروازے بند کروا رکھے تھے اُس نے فوراً ان شکرتیوں اور پادریوں کو واپس بلایا اور اُن سے محبت کے انداز میں کہا کہ میں تو صرف تمہارے دین کا امتحان لیتا تھا اور شکر ہے کہ تم پختہ نکلے۔ جب قیصر کے درباریوں نے اپنے بادشاہ میں یہ تبدیلی دیکھی تو وہ خوش ہو گئے اور خوشی کے جوش میں اُس کے سامنے سجدہ میں جا گرے۔ بس یہ وہ انجام تھا جس کو ہر قل شہنشاہ روم اپنی زندگی کے اس بھاری امتحان میں پہنچا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قل نے ایلیا کے دربار میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا تھا تو دراصل یہ دوسری بار کا پڑھنا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ ایک پرائیویٹ مجلس میں اس خط کو اپنے طور پر پڑھ چکا تھا۔ اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے کہ جب پہلی دفعہ قیصر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملا تو اُس نے اپنی پرائیویٹ مجلس میں وحیہ کو بلایا اور اپنے چند مصاحبوں اور عزیزوں کے سامنے اس خط کو پڑھنا چاہا۔ اس وقت غالباً یہ خط پہلے ہر قل کے بھتیجے کے ہاتھ میں گیا اور اُس نے ہر قل کے سامنے پیش کرنے سے قبل اس خط کو خود کھول کر دیکھنا چاہا اور خط دیکھتے ہی چلا اٹھا کہ یہ خط تو ہرگز قبول کرنے کے قابل نہیں کیونکہ اس میں شروع میں آپ کے نام کی بجائے لکھنے والے نے اپنا نام لکھا ہے۔ یہ جو آپ کی ہتک ہے اور اسی طرح آپ کو شہنشاہ

لے۔ بخاری جلد اباب کیف کان بدآلوی و زرقانی جلد ۳ ص ۳۳۹؛ مے فتح الباری و زرقانی جلد ۳ ص ۳۳۸؛ تے ایک روایت میں بھائی کا نام آتا ہے، واللہ اعلم۔ مے غالباً اُس وقت درباروں میں یہ دستور ہوگا کہ رئیس کو مخاطب کرتے ہوئے از طرف فلاں بنام فلاں کی بجائے "بنام فلاں از طرف فلاں" کے الفاظ لکھتے ہوں گے۔ مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از طرف محمد رسول اللہ بنام ہر قل عظیم الروم کے الفاظ لکھے تھے۔

روم لکھنے کی بجائے رئیس روم لکھا ہے اور یہ دوسری ہتک ہے، لیکن ہر قل نے اسے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ ایک مدعی رسالت کی طرف سے خط آتے اور میں اسے پڑھنے بغیر پھینک دوں؟ اور "شاہ روم" کی بجائے "رئیس روم" کے الفاظ لکھنے میں کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اصل بادشاہت تو خدا ہی کی ہے اور میں اور یہ مدعی دونوں اُسی کے بندے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ سے خط لے لیا اور حکم دیا کہ پبلک دربار سے قبل وحیہ کلمی کو سرکاری مہمان کے طور پر رکھا جائے یہ مگر بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ہر قل کو اپنی بہت سی خوبیوں اور داناتیوں اور دُور اندیشیوں کے باوجود دُنیا کے خوف اور طاقت و عزت کی ہوس کی وجہ سے ہدایت نصیب نہیں ہوتی اور گویا ایمان کی چنگاری اُس کے سینہ میں روشن ہوتے ہوتے بجھ کر رہ گئی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس انکار اور محرومی کے اس کے دل کی گہرائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت گھر کر چکی تھی۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تبلیغی خط کو ایک تبرک کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ اور وہ کئی سو سال تک اس کے خاندان میں محفوظ رہا۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب شاہ منصور قلاوون (جو ساتویں صدی ہجری میں گذرا ہے) کے بعض سفیر ایک دفعہ ملک الفرنج کے پاس گئے تو اس وقت ملک مذکور نے انہیں دکھانے کے لئے ایک سنہری ڈبہ منگوایا اور اس کے اندر سے ایک ریشی رومال میں رپیٹا ہوا خط نکال کر انہیں دکھایا کہ میرے ایک دادا ہر قل کے نام آپ کے رسول کا ایک خط آیا تھا وہ آج تک ہمارے گھر میں ایک تبرک تحفہ کے طور پر محفوظ ہے۔ اگر شاہ منصور قلاوون کے مزید حالات دیکھنے ہوں تو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں دیکھے جاتیں۔

ہر قل والے خط کے تعلق میں ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ جب پہلی دفعہ وحیہ کلمی قیصر کے سامنے پیش ہونے لگے تو اُن سے کہا گیا کہ یہاں کا درباری آداب یہ ہے کہ قیصر کے سامنے جاتے ہی سجدہ میں گر جاتے ہیں اور پھر جب تک وہ خود نہ کہے سر نہیں اٹھاتے۔ وحیہ نے کہا۔ میں تو خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا خواہ مجھے اس کے سامنے جانے کا موقع ملے یا نہ ملے مگر پھر خدا نے ایسا فضل کیا کہ وہ اس خلاف اسلام حرکت کرنے کے بغیر ہی قیصر کے دربار میں بار بار پہنچتے رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط بنام ہر قل میں ایک بات ایسی ہے جس کی بناء پر بعض عیسائی مؤرخین نے اعتراض کیا ہے اور اس کی وجہ سے خط کی صداقت کے متعلق بھی شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ خط میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ "یا اھل الکتاب

لے مواہب اللدیہ و زرقانی۔ لے کتاب الاموال بحوالہ زرقانی جلد ۳ ص ۳۲۲ نیز دیکھو ص ۳۲۹۔ لے فتح الباری بحوالہ زرقانی

جلد ۳ صفحہ ۳۲۲، ۳۲۳۔ لے جلد ۲ صفحہ ۶۸۵ تا ۶۸۷۔ لے تاریخ خمس جلد ۲ صفحہ ۳۵

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔ الآية۔ یہ سورۃ آل عمران کی ابتدائی آیتوں میں سے ایک آیت ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ سورۃ آل عمران کی ابتدائی انہی آیتیں اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب شہہ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور چونکہ قیصر کے نام کا خط بہر حال صلح حدیبیہ کے معاہدہ کا ہے اس لیے شہہ ہجری میں نازل ہونے والی آیت شہہ یا شہہ میں لکھے جانے والے خط کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ خط کا قفہ سرے سے ہی درست نہیں ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جو اس موقع پر کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں خود مسلمان مورخوں کے سامنے یہ سوال آیا اور انہوں نے بڑی مفصل بحث کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے اور کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ بعض کلمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے اور پھر کچھ عرصہ بعد اسی کے مطابق قرآنی آیات کا نزول ہو گیا۔ اور یہ صورت اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ روحانی قلوب کے متعلق ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ وہ اپنے خاص نور قلب یا مخصوص روحانی جس کی وجہ سے ایک الہامی صداقت کے نزول سے قبل ہی اُس کی مخفی تاروں سے متاثر ہو کر اس کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ سلوک اور منافقین کی نماز جنازہ اور شراب کی حرمت اور احکام پر رد وغیرہ کے متعلق اس قسم کے متعدد واقعات تاریخ اور حدیث میں مذکور ہیں۔ پس یہ ہرگز بعید از قیاس نہیں کہ اس موقع پر بھی یہ عبارت اولاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود اظہار فرمائی ہو اور پھر بعد میں وہی عبارت قرآنی آیت کی صورت میں نازل ہو گئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۃ آل عمران کی شروع کی انہی آیتیں سب کی سب وفد نجران کے وقت نازل نہ ہوتی ہوں بلکہ ان میں سے ایک آدھ آیت پہلے نازل ہو چکی ہو، لیکن اکثریت کی وجہ سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ پہلی انہی آیتیں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت دو دفعہ نازل ہوئی ہو۔ ایک دفعہ اوائل ہجرت میں اور دوسری دفعہ شہہ میں وغیرہ وغیرہ۔

مگر غالباً اس بحث میں سب سے زیادہ یقینی ثبوت اُس اصل خط کے دریافت ہو جانے سے ملتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی زمانہ میں مقوقس مصر کو لکھ کر بھیجا۔ یہ خط اپنی اعلیٰ صورت میں دریافت ہو چکا ہے اور ہم اس کا ایک نوٹو آگے چل کر درج کر رہے ہیں۔ اس خط میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی عبارت یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ۔۔۔۔۔ والی درج کرائی تھی۔ پس جب



یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ عبارت مقوقس والے خط کا حصہ بھی تھی اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ مقوقس والا خط اور ہرقل والا خط ایک ہی زمانہ میں لکھے گئے تو پھر ہر حال ان خطوں کی صدا کا معاملہ تو کسی صورت میں مشکوک نہیں سمجھا جاسکتا۔ وَهُوَ الْمُرَادُ۔

جو تبلیغی خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کے نام لکھا وہ اپنے معانی اور الفاظ کی خوبصورتی اور جامعیت کے لحاظ سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی تحریر ہے۔ اس تحریر کے الفاظ گو بہت مختصر ہیں مگر اس عبارت کا ایک ایک لفظ دلکش نگینوں کا حکم رکھتا ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کے جڑاؤ زیور میں ایک باکمال ہنرمند نصب کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اس مختصر سے خط میں اسلام کی تبلیغ کا اور خصوصاً اس تبلیغ کا جو ایک مسیحی کو مخاطب کر کے ہونی چاہیے بہترین نمونہ درج کر دیا گیا ہے اور اس میں توحید کا بھی وہ جامع سبق موجود ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور پھر اسلوب بیان ایسا لطیف ہے کہ گویا بشارت و انداز کی دو کامل نہریں پہلو بہ پہلو رواں ہیں۔ اور ایک طرف بلاوجہ دل دکھانے اور دوسری طرف مبالغہ کی پردہ میں حق کو چھپانے کے بغیر اسلامی صداقت کا مکمل نقشہ کھینچ دیا گیا ہے اور آخر میں اپنے اس فولادی عزم کا اظہار بھی کر دیا گیا ہے کہ تم مانو یا نہ مانو ہم تو ہر حال اسلام کی خدمت کا بیڑا اٹھا چکے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

ہرقل والے خط کے واقعہ سے یہ بھاری سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ سچی قربانی کی روح کے بغیر کوئی بڑی صداقت قبول نہیں کی جاسکتی۔ ہرقل کے وہ سوالات جو اس نے البوسفیان سے کئے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی عقل و دانش کا انسان تھا جس نے سلسلہ رسالت اور سلسلہ ایمانیات کا کافی گہرا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ پھر اس نے جس طرح اسلام کی صداقت سے متاثر ہو کر اپنے درباریوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی، وہ نہ صرف اس کی حسن تدبیر بلکہ ایک حد تک اس کے جذبہ دینداری کی بھی دلیل ہے مگر پھر بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہا اور بالآخر اسلام کی فوجوں سے لڑتا ہوا اس جہان سے رخصت ہوا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس کی روح اس بھاری قربانی کے لیے تیار نہیں تھی جو سچی دینداری کے لیے ضروری ہے۔ وہ اپنی دنیا کی جاہ و عظمت کھونے کے بغیر اپنے درباریوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا اسلام کی طرف قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک حد تک دین کا طالب ضرور تھا مگر دنیا کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہی کمزوری اس کی ہلاکت کا باعث بن گئی۔ بیشک البوکیرؓ اور عمرؓ نے بھی دنیا کی بہترین نعمتوں اور عزتوں کا ورثہ پایا مگر انہوں نے اسلام کے ساتھ سودا نہیں کرنا چاہا۔ وہ خالی ہاتھ ہو کر



محض دین کی خاطر اسلام کی طرف آئے اور پھر خدا نے جو کسی کا قرضہ اپنے ذمہ نہیں رکھا کرتا انہیں وہ سلطنت عطا کی جس کے سامنے قیصر و کسریٰ کی مجموعی سلطنت بھی ماند تھی۔ مگر قیصر خالی ہاتھ ہو کر اسلام کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے ڈرا۔ اُس نے اپنا کمزور ہاتھ اسلام کی طرف بڑھایا اور مضبوط ہاتھ اپنی حکومت کے عصا پر جھاتے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بٹے ہوئے دل کو نہ تو دین ہی ملا اور نہ ہی دنیا زیادہ دیر تک اُس کے ہاتھوں میں ٹھہر سکی۔

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بڑا نکتہ شناس تھا اور آپ کسی کی ذرا سی نیکی کو بھی فراموش کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ کسریٰ نے تو آپ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہے مگر قیصر نے گو آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا لیکن بظاہر عزت اور ادب سے پیش آیا ہے تو آپ نے فرمایا :-

أَمَّا هَؤُلَاءِ فَيَمْرُقُونَ وَ أَمَّا هَؤُلَاءِ فَتَسِيكُونَ لَهُمْ بَقِيَّةٌ يٰ  
یعنی "ایرانی حکومت تو فوراً پاش پاش کر دی جائے گی مگر رومی حکومت کو خدا کچھ مُہلت عطا کرے گا"

سولہینہ یہی ہوا کہ کسریٰ کی حکومت تو چند سال کے اندر خاک میں مل گئی مگر قیصر کی سلطنت بہت ساحتہ چھینے جانے کے باوجود قسطنطنیہ اور اُس کے گرد و نواح میں سینکڑوں سال تک قائم رہی ۵ فَاغْتَبِرُوا يٰ اُولِيَ الْاَبْصَارِ۔

**کسریٰ کے نام آنحضرت ﷺ کا خط**  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا تبلیغی خط کسریٰ شہنشاہ فارس کے نام تھا جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کسریٰ فارس کے بادشاہوں کا سرکاری اور موروثی لقب تھا اور جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس زمانہ میں فارس کے بادشاہ کا ذاتی نام خسرو پرویز بن ہرمز تھا جو ایران کے مشہور ساسانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بادشاہ جو بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا مالک تھا۔ مذہباً آتش پرست یعنی مشرک تھا اور یہی اُس کی رعایا کا مذہب تھا جو اپنے بادشاہ کو بھی قابل پرستش خیال کرتی تھی۔ فارس کے کسریٰ ایک طرح سے عرب کے ملک پریمی گویا اپنا سیاسی حق جھاتے تھے۔ کیونکہ عرب کے علاقہ بحرین اور علاقہ یمن کے رئیس دونوں کسریٰ کے ماتحت تھے اور کسریٰ کی طرف سے ان علاقوں کے والی یعنی گورنر سمجھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کی طرف تبلیغی خط لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو درباری آداب کے پیش نظر اپنا خط پہلے رئیس

بحرین کی طرف بھیجا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ یہ خط آگے کسریٰ کے نام بھجوادے۔ اسی طرح جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے جب خسرو پرویز نے غصہ میں آکر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے احکام صادر کئے تو ان احکام کے اجراء کے لیے اُس نے اپنے مین کے گورنر کو ہدایت بھجوائی۔ بہر حال بحرین اور مین پر اقتدار حاصل ہونے کی وجہ سے کسریٰ کو عرب کے معاملات میں کافی دلچسپی تھی اور وہ عرب کی ہر نئی تحریک کو طبعاً شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔

عرب کے معاملات میں کسریٰ کی دلچسپی کا دوسرا بڑا باعث عرب کے یہودی قبیلے تھے جو مدینہ اور خیبر اور وادی القریٰ وغیرہ میں کثرت سے آباد تھے۔ یہ یہودی قبیلے طبعاً اور روایتاً قیصر کی عیسائی حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ حق یہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے سخت خلاف تھے اور دوسری طرف قیصر کی حکومت یہودیوں کے متعلق معاندانہ رویہ رکھتی تھی اور ہر قفل نے تو خصوصیت سے اُن کے خلاف تشدد کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ اندریں حالات عرب کے ماحول میں صرف فارس کی حکومت ہی ایسی تھی جس کے ساتھ عرب کے یہودی تعلقات رکھ سکتے تھے۔ یہ تعلقات یزدجرد اول کے عہد میں شروع ہوئے جسکی ایک بیوی یہودی نسل کی تھی اور پھر خسرو پرویز کے زمانہ میں اپنے کمال کو پہنچ گئے جبکہ یہودیوں اور ایرانی حکومت کے درمیان گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے بلکہ عرب کے یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کثرت کے ساتھ کسریٰ کے دربار میں جلتے رہتے تھے اور جانتے کہ اُن کا بس چلتا تھا خسرو پرویز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُکاتے تھے۔ اس حقیقت کو سر ولیم میور نے بھی اشارۃً تسلیم کیا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کے نام تبلیغی خط روانہ کیا۔ یہ خط آپ نے اپنے قدیم اور مخلص صحابی عبداللہ بن حذافہ سہمی کے ہاتھ بھجوایا۔ اور انہیں ہدایت کی کہ آپ کے خط کو پہلے بحرین کے رئیس کے پاس لے جائیں اور پھر اُس کے توسط سے کسریٰ تک پہنچیں۔ اس رئیس بحرین کا نام منذر بن ساوی تھا جو بحرین کے علاقہ میں کسریٰ کا نائب السلطنت تھا۔ یہ خط بھی قیصر کے خط کی طرح باقاعدہ مکرگ کر بھیجا گیا تھا اور اس کی عبارت یہ تھی:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ اِلٰی کِسْرٰی عَظِیْمِ

۱۔ بخاری کتاب العلم و کتاب الجہاد۔ ۲۔ مخطوطہ ہوسٹون نیز مسٹری آف دی ورلڈ جلد ۷ صفحہ ۱۷۵۔ نیز دیکھو ہٹری آف دی نیشنز مصنفہ جیمز صفحہ ۵۵۰۔ ۳۔ جیوایش انسائیکلو پیڈیا جلد ۹ صفحہ ۴۴۸ زیر عنوان پرشیا۔

۴۔ لائف آف محمد صفحہ ۳۷۱۔ ۵۔ زر قانی و تاریخ خلیس۔ ۶۔ بخاری کتاب العلم و کتاب الجہاد

۷۔ زر قانی جلد ۳ صفحہ ۳۴۱

فَارِسَ - سَلَامٌ عَلٰی مَنْ اتَّبَعَ الْهُدٰی وَ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ وَ  
 شَهِدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا  
 عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ - اَدْعُوْكَ بِدَعَايَةِ اللّٰهِ فَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ  
 خَافَةً لَا تُنْذِرُ مَنْ كَانَ حَيًّا وَ يَحِقُّ الْقَوْلُ عَلٰی الْكَافِرِيْنَ -  
 اَسْلِمْتُ سَلَمًا - فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ اِسْمُ الْمُجْرِمِيْنَ

یعنی میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور  
 اعمال کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط خدا کے رسول محمد کی طرف سے فارس کے  
 رئیس کسری کے نام ہے۔ سلامتی ہو اُس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے اور خدا اور  
 اس کے رسول پر ایمان لاتا اور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود  
 نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی شریک ہے۔ اور وہ اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد  
 خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ اے رئیس فارس! میں آپ کو خدا کی دعوت کی  
 طرف بلاتا ہوں۔ کیونکہ میں سب انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ میں ہر زندہ  
 انسان کو ہوشیار کر دوں اور تا انکار کرنے والوں پر خدا کا فیصلہ واجب ہو جائے۔  
 اے رئیس فارس! آپ اسلام کو قبول کریں کیونکہ اب آپ کے لیے صرف اسی میں  
 سلامتی کا رستہ ہے، لیکن اگر آپ روگردانی کریں گے تو یاد رکھیں کہ اس صورت میں  
 (آپ کے اپنے گناہ کے علاوہ) آپ کی محوس رعایا کا گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا۔

عبداللہ بن حذافہ کہتے ہیں کہ جب میں اس خط کے ساتھ کسری کے دربار میں پہنچا اور اجازت  
 ملنے کے بعد کسری کے سامنے اس خط کو پیش کیا تو اُس نے یہ خط اپنے ایک ترجمان کے سپرد کیا کہ تا  
 وہ اُسے پڑھ کر سنائے۔ جب ترجمان نے اس خط کو پڑھا تو کسری اس کے مضمون کو شکرِ خفہ سے بھر  
 گیا اور ترجمان کے ہاتھ سے خط لیکر اُسے یہ کہتے ہوئے ریزہ ریزہ کر دیا کہ میرا غلام ہو کر مجھے اس  
 طرح مخاطب کرتا ہے! روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسری کی اس  
 حرکت کی اطلاع پہنچی تو آپ نے دینی غیرت کے جوش میں فرمایا: "خدا خود ان لوگوں کو پارہ پارہ  
 کرے۔" اور ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے اس موقع پر یہ الفاظ فرمائے تھے کہ  
 اَمَّا هٰؤُلَاءِ فَيَسْمَرْقُونَ یعنی اب یہ لوگ خود ریزہ ریزہ کر دیتے جاتے گے۔

کسریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو پھاڑنے پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ یہودی پراپیگنڈا کے گہرے تاثرات کے ماتحت اُس نے اپنے مین کے گورنر کو جس کا نام باذان تھا ہدایت فرمائی کہ حجاز میں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اُس کی طرف فوراً دو طاقتور آدمی بھجوا دو تاکہ وہ اُسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے حاضر کریں۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ دو آدمی بھجوا کر اُس سے توبہ کراؤ۔ اور اگر وہ انکار کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ باذان نے اس غرض کے لیے اپنے ایک قہرمان یعنی سیکرٹری کو جس کا نام بالویہ تھا منتخب کیا اور اُس کے ساتھ ایک مضبوط سوار مقرر کر کے مدینہ کی طرف بھجوا دیا اور اُن کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط بھی بھجوا دیا کہ آپ فوراً ان لوگوں کے ساتھ کسریٰ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باذان کا خط دیکر بطریق نصیحت سمجھایا کہ بہتر ہے آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں ورنہ کسریٰ آپ کے ملک اور قوم کو تباہ کر کے رکھ دیگا۔ آپ نے اُن کی یہ بات سن کر قسم فرمایا اور جواب میں اسلام کی تبلیغ کی اور پھر فرمایا کہ تم آج رات ٹھہرو میں انشاء اللہ تمہیں کل جواب دوں گا۔ پھر جب وہ دوسرے دن آپ کے پاس آئے تو آپ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا :-

أَبْلَغَا صَاحِبِكُمَا أَنَّ رَبِّي قَتَلَ رَبِّي فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ

یعنی ”اپنے آقا (والی مین) سے جا کر کہدو کہ میرے رب یعنی خدا نے ذوالجلال نے

اُس کے رب (یعنی کسریٰ) کو آج رات قتل کر دیا ہے۔“

چنانچہ بالویہ اور اُس کا ساتھی واپس لوٹ گئے اور باذان کے پاس جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا۔ باذان نے کہا جو بات یہ شخص کہتا ہے اگر وہ اسی طرح ہو جاتے تو پھر وہ واقعی خدا کا نبی ہو گا۔ چنانچہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ باذان کو خسرو پرویز کے بیٹے شیروہ کا ایک خط پہنچا جس میں لکھا تھا کہ میں نے ملکی مفاد کے ماتحت اپنے باپ خسرو پرویز کو جس کا رویہ ظالمانہ تھا اور جو اپنے ملک کے شرفاء کو بے دریغ قتل کرتا جا رہا تھا قتل کر دیا ہے۔ پس جب تمہیں میرا یہ خط پہنچے تو میرے نام پر اپنے علاقہ کے لوگوں سے اطاعت کا عہد لو۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے باپ نے تمہیں عرب کے ایک شخص کے متعلق ایک حکم بھیجا تھا اُسے اب منسوخ سمجھو اور میرے دوسرے حکم کا انتظار کرو۔ جب باذان کو نئے کسریٰ شیروہ بن خسرو کا یہ فرمان پہنچا تو اس نے بے اختیار ہو کر کہا کہ پھر تو محمد (ﷺ) کی بات سچی نکلی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کے برحق رسول ہیں۔ اور میں اُن پر ایمان لاتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے اُسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کا خط لکھ دیا اور اس کے ساتھ مین کے کئی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ اور روایت آتی ہے کہ خسرو پرویز اُسی رات



قتل ہوا تھا جس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے متعلق خدا سے اطلاع پائی تھی۔  
 یہ ایک عجیب بات ہے کہ قیصر و کسریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوں کے ساتھ جو جو  
 سلوک کیا اُسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بھی اُن سے معاملہ کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پھاڑ  
 کر پھینک دینے کی وجہ سے کسریٰ کی بھاری سلطنت چند سال کے اندر ریزہ ریزہ کر دی گئی وہاں  
 قیصر کی طرف سے آپ کے خط کے ساتھ مودبانہ رویت رکھنے پر خدا تعالیٰ نے اُس کی نسل کو کافی لمبی  
 مدت دی اور اُس کے خاندان نے سینکڑوں سال حکومت کی۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب  
 قیصر کا ایک تنوخی سفیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ نے اُسے یہ الفاظ فرمائے کہ :-  
 "میں نے کسریٰ کو ایک خط لکھا مگر اُس نے اُسے پھاڑ دیا۔ اس کی وجہ سے میں  
 یقین رکھتا ہوں کہ خدا اُسے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا اور اُس کی سلطنت جلد تباہ ہو کر  
 رہے گی۔ مگر اس کے مقابل پر میں نے ایک خط تیار کیا اور اُسے لکھا اور اس نے  
 اُس کے متعلق ادب کا رویت اختیار کیا اور اُسے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ میں اُمید کرتا  
 ہوں کہ جب تک اُن میں نیکی کا مادہ ہے خدا اُس کے خاندان کی کچھ نہ کچھ طاقت  
 ضرور قائم رکھے گا۔" لہ

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ بعینہ ہی ان دونوں حکومتوں کے ساتھ خدا کا سلوک ہوا بلکہ جیسا کہ  
 ہم آگے چل کر دیکھیں گے ان دو خطوں کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبلیغی خطوط  
 ان ایام میں لکھے اور ان خطوں کے پہنچنے پر مکتوب الہیم نے جو جو رویت اختیار کیا اُسی کے مطابق خدا نے  
 حکیم و قدیر نے اُن کے ساتھ سلوک کیا۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی  
 صداقت کی ایک بھاری دلیل ہے۔

کسریٰ والے خط کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں قدیم مورخین نے صراحت کے  
 ساتھ لکھا ہے کہ خسرو پرویز نے جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یمن کے والی کے نام جاری  
 کیا تھا اس کا سبب وہ خط تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے بھجوا یا وہاں بعض جدید محققین نے  
 یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط لکھنے کا واقعہ بعد کا ہے  
 اور خسرو پرویز کا حکم یہودی پراسپیڈے کی وجہ سے اس سے پہلے جاری ہو چکا تھا۔ دوسرا اختلاف  
 یہ ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط خسرو پرویز کے نام لکھا گیا تھا یا اُس کے بیٹے  
 شیروہ کے نام؟ میں نے اس جگہ معروف خیال کی اتباع کی ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



کا خط خسرو پرویز کے نام تھا اور اُس نے آپ کے خلاف احکام جاری کئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔  
در اصل میرے پاس اس وقت لاہور میں ان کتابوں کا پورا ذخیرہ موجود نہیں ہے جن کا مطالعہ اس  
قسم کے سوال کی کامل تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے فی الحال معروف خیال درج کر دیا گیا  
ہے اور یہ اختلاف بھی ایسا نہیں ہے کہ جو زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو بصورت ضرورت  
بعد میں اصلاح کی جاسکے گی۔

**مقوقس مصر کے نام آنحضرت ﷺ کا خط**  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا خط مقوقس  
والی مصر کے نام تھا جو قیصر کے ماتحت مصر اور  
اسکندریہ کا والی یعنی موروثی حاکم تھا اور قیصر کی طرح مسیحی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا ذاتی نام جرجین بن  
مینا تھا اور وہ اور اس کی رعایا قبلی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خط آپ نے اپنے ایک بدری  
صحابی حاطب بن ابی بلتعہ کے ہاتھ بھجوایا اور اس خط کے الفاظ یہ تھے:-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
إِلَى الْمَقْقُوسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ - سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى - أَمَا بَعْدُ  
فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدَعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْتُ تَسْلِمُ يُؤْتِيكَ اللَّهُ أَجْرَكَ  
مَرَّتَيْنِ - فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْقِبْطِ - يَا أَهْلَ الْكِتَابِ  
تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا  
نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ  
تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

یعنی "میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے مانگے رحم کرنے والا اور اعمال  
کا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔ یہ خط محمد خدا کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے  
قبطیوں کے رئیس مقوقس کے نام ہے۔ سلامتی ہو اُس شخص پر جو ہدایت کو قبول کرتا ہے  
اس کے بعد اسے والی مصر! میں آپ کو اسلام کی ہدایت کی طرف بلا رہا ہوں۔ مسلمان ہو کر  
خدا کی سلامتی کو قبول کیجئے کہ اب صرف یہی نجات کا رستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دودھرا  
اجر دے گا، لیکن اگر آپ نے روگردانی کی تو علاوہ خود آپ کے اپنے گناہ کے) قبطیوں کا  
گناہ بھی آپ کی گردن پر ہوگا۔ اور اسے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف تو آجاؤ جو تمہارے  
اور ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی صورت

میں خدا کا کوئی شریک نہ ٹھہرائیں اور خدا کو چھوڑ کر اپنے میں سے ہی کسی کو اپنا آقا اور حاجت روا نہ گردانیں۔ پھر اگر ان لوگوں نے رُوگردانی کی تو اُن سے کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو بہر حال خدا سے واحد کے فرمانبردار بندے ہیں۔“

جب حاطب بن ابی بلتعہ اسکندریہ میں پہنچے تو مقوقس کے حاجب یعنی دربان سے مل کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پیش کیا۔ مقوقس نے خط پڑھا اور پھر حاطب بن ابی بلتعہ سے مخاطب ہو کر نیم مذاقیہ رنگ میں کہا کہ اگر تمہارا یہ صاحب واقعی خدا کا نبی ہے تو اس خط کے بھجوانے کی بجائے اُس نے میرے خلاف خدا سے یہ دُعا ہی کیوں نہ کی کہ خدا اُسے مجھ پر مسلط کر دے۔ حاطب نے جواب دیا کہ اگر یہ اعتراض درست ہے تو وہ حضرت عیسیٰ پر بھی پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفوں کے خلاف اس قسم کی دُعا کیوں نہیں کی۔ پھر حاطب نے مقوقس کو اندازہ نصیحت کہا کہ آپ (سجیدگی کے ساتھ) غور فرمائیے کیونکہ اس سے پہلے آپ کے اسی ملک مصر میں ایک ایسا شخص (فرعون) گزر چکا ہے جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہی ساری دنیا کا رب اور حاکم اعلیٰ ہے جس پر خدا نے اُسے ایسا پکڑا کہ وہ اگلوں اور پچھلوں کے لیے عبرت بن گیا۔ پس میں آپ سے مخلصانہ طور پر عرض کروں گا کہ آپ دوسروں کے حالات سے عبرت پکڑیں اور ایسے نہ بنیں کہ دوسرے لوگ آپ کے حالات سے عبرت پکڑیں۔ مقوقس نے کہا بات یہ ہے کہ ہمیں پہلے سے ایک دین حاصل ہے اس لیے جب تک ہمیں اس سے کوئی بہتر دین نہ ملے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ حاطب نے جواب دیا کہ اسلام وہ دین ہے جو سب دوسرے دینوں سے غنی کر دیتا ہے لیکن وہ یقیناً آپ کو اس بات سے نہیں روکتا کہ آپ حضرت مسیح ناصری پر بھی ایمان لائیں بلکہ وہ سب سچے نبیوں پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جس طرح حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تھی اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت بھی دی ہے۔ اس پر مقوقس کچھ سوچ میں پڑ کر خاموش ہو گیا مگر اس کے بعد ایک دوسری مجلس میں جبکہ بعض بڑے بڑے پادری بھی موجود تھے مقوقس نے حاطب سے پھر کہا۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے نبی اپنے وطن سے نکالے گئے تھے انہوں نے اس موقع پر اپنے نکالنے والوں کے خلاف بددعا کیوں نہ کی تاکہ وہ ہلاک کر دیئے جاتے؟ حاطب نے جواب دیا کہ ہمارے نبی تو صرف وطن سے نکلنے پر مجبور ہوئے مگر آپ کے مسیح کو تو یہودیوں نے پکڑ کر سولی کے ذریعہ ختم ہی کر دینا چاہا مگر پھر بھی وہ اپنے مخالفوں کے خلاف بددعا کر کے انہیں ہلاک نہ کر سکے۔ مقوقس نے متاثر ہو کر کہا۔ تم بیشک ایک دانا انسان ہو اور ایک دانا انسان کی طرف سے سفیر بنکر آئے ہو۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ میں نے تمہارے نبی کے معاملہ میں غور کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے واقعی کسی بُری بات کی تعلیم نہیں دی اور نہ کسی اچھی بات سے روکا ہے۔ پھر اس نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ایک ہاتھی دانت کی ڈبیر میں رکھ کر اُس پر اپنی مہر لگائی اور اُسے حفاظت کے لیے اپنے گھر کی ایک معتبر لڑکی کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد مقوقس نے اپنے ایک عربی دان کا تب کو بلایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مندرجہ ذیل خط املا کر کے حاطب کے حوالہ کیا۔ اس خط کی عبارت یہ تھی :-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ لِمُحَمَّدٍ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ مِنَ الْمُقَوْسِ  
عَظِيمِ الْقَبْطِ - سَلَامٌ عَلَيْكَ - أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَرَأْتُ كِتَابَكَ وَفَهِمْتُ  
مَا ذَكَرْتَ فِيهِ وَمَا تَدْعُو إِلَيْهِ - وَقَدْ عَلِمْتُ أَنَّ نَبِيًّا قَدْ بَقِيَ  
وَكُنْتُ أَظُنُّ أَنَّ يَخْرُجُ مِنَ الشَّامِ - وَقَدْ أَكْرَمْتُ رَسُولَكَ وَبَعَثْتُهُ  
إِلَيْكَ بِجَارِيَتَيْنِ لَهُمَا مَكَانٌ مِنَ الْقَبْطِ عَظِيمٌ وَحِسْوَةٌ  
وَأَهْدَيْتُ إِلَيْكَ بَعْلَةً لَتَرْكُبَهَا - وَالسَّلَامُ -

یعنی ”خدا کے نام کے ساتھ جو رحمن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمد بن عبد اللہ کے نام قبطیوں کے رئیس مقوقس کی طرف سے ہے۔ آپ پر سلامتی ہو۔ میں نے آپ کا خط اور آپ کے مفہوم کو سمجھا اور آپ کی دعوت پر غور کیا۔ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے مگر میں خیال کرتا تھا کہ وہ ملک شام میں پیدا ہوگا (نہ کہ عرب میں) اور میں آپ کے سفیر کے ساتھ عزت سے پیش آیا ہوں اور میں اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھجوا رہا ہوں جنہیں قبطی قوم میں بڑا درجہ حاصل ہے اور میں کچھ پارچات بھی بھجوا رہا ہوں اور آپ کی سواری کے لیے ایک خچر بھی بھجوا رہا ہوں۔ والسلام۔“

اس خط سے ظاہر ہے کہ مقوقس مصر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اُس نے آپ کے دعویٰ میں ایک حد تک دلچسپی بھی لی مگر بہر حال اُس نے اسلام قبول نہیں کیا اور دوسری روایتوں سے پتہ لگتا ہے کہ عیسائی مذہب پر ہی اُس کی وفات ہوئی تھی اس کی گفتگو کے انداز سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ بے شک مذہبی امور میں دلچسپی تو لیتا تھا مگر جو سنجیدگی اس معاملہ میں ضروری ہے وہ اسے حاصل نہیں تھی۔ اس لیے اُس نے بظاہر مودہ بانہ رنگ رکھتے ہوئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ٹال دیا۔

جو دو لڑکیاں مقوقس نے بھجوائی تھیں ان میں سے ایک کا نام ماریہ اور دوسری کا نام سیرین

لے زرقانی تاریخ خیس۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقوقس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کی نقل میں بسم اللہ کے الفاظ لکھ دیئے ہونگے ورنہ ان میں اس کا رواج نہیں تھا۔ سے تاریخ خیس

تھا۔ اور یہ دونوں آپس میں نہیں تھیں۔ اور جیسا کہ مقوقس نے اپنے خط میں لکھا تھا وہ قطبی قوم میں سے تھیں۔ اور یہ وہی قوم ہے جس سے خود مقوقس کا تعلق تھا۔ اور یہ لڑکیاں عام لوگوں میں سے نہیں تھیں بلکہ مقوقس کی اپنی تحریر کے مطابق انہیں قطبی قوم میں بڑا درجہ حاصل تھا۔ دراصل معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں یہ پرانا دستور تھا کہ اپنے ایسے معزز مہمانوں کو جن کے ساتھ وہ تعلقات بڑھانا چاہتے تھے رشتہ کے لیے اپنے خاندان یا اپنی قوم کی شریف لڑکیاں پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم مصر میں تشریف لے گئے تو مصر کے رئیس نے انہیں بھی ایک شریف لڑکی (حضرت ہاجرہؑ) رشتہ کے لیے پیش کی تھی جو بعد میں حضرت اسماعیلؑ اور ان کے ذریعہ بہت سے عرب قبیلوں کی ماں بنی۔ بہر حال مقوقس کی بھجوائی ہوئی لڑکیوں کے مدینہ پہنچنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو تو خود اپنے عقد میں لے لیا اور ان کی بہن سیرین کو عرب کے مشہور شاعر حسان بن ثابت کے عقد میں دیدیا۔ یہ ماریہ وہی مبارک خاتون ہیں جن کے بطن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ جو زمانہ نبوت کی گویا واحد اولاد تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی حاطب بن ابی بلتعمر کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئی تھیں۔ جو خچر اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں آتی وہ سفید رنگ کی تھی اور اس کا نام دلدل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اکثر سواری فرمایا کرتے تھے اور غزوہ حنین میں بھی یہی خچر آپ کے نیچے تھی۔

یہ سوال کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ کو زوجہ کے طور پر اپنے عقد میں لیا یا کہ صرف ملکیمین کے رنگ میں اپنے عقد میں رکھا ایک اختلافی سوال ہے جس کی تفصیل میں ہمیں اس جگہ جانے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال دو باتیں قطعی طور پر یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ کو شروع سے ہی پردہ کرایا۔ اور پردہ کے متعلق ثابت ہے کہ وہ صرف آزاد عورتیں اور ازواج ہی کرتی تھیں۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے بعد ایک یہودی رئیس کی بیٹی صفیہ کے ساتھ عقد کیا تو صحابہ میں اختلاف ہوا کہ کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں یا کہ محض ملکیمین۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پردہ کرایا تو صحابہ نے سمجھ لیا کہ وہ زوجہ ہیں نہ کہ ملکیمین۔ دوسرے یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی ذاتی غلام نہیں رکھا بلکہ جو لونڈی یا غلام بھی آپ کے قبضہ میں آیا آپ نے اُسے آزاد کر دیا۔ اس

۱۔ کتاب ہذا حصہ اول : ۱۔ زرقانی جلد ۳ حالات ماریہ قبطیہ و اسد الغابہ حالات ماریہ و سیرین :

۲۔ اسد الغابہ : ۱۔ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۲ : ۲۔ تاریخ الخلفاء : ۱۔ ابن سعد بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۷۲ :

۳۔ بخاری بحوالہ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۵۶، ۲۵۷ : ۴۔ کتاب ہذا حصہ دوم :



لحاظ سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کے طور پر اپنے پاس رکھنا بعید از قیاس اور ناقابل قبول ہے۔ واللہ اعلم۔ ویسے اگر لونڈیوں کے متعلق اسلامی تعلیم کا خلاصہ ملاحظہ کرنا ہو تو کتاب ہذا کے حصہ دوم کے صفحات ۴۱، تا ۴۲ مطالعہ کئے جائیں۔

مقوقس والے خط کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ وہ کئی سو سال پر وہ خطافیں مستور رہنے کے بعد قریباً ایک سو سال ہوا کہ اپنی اصلی صورت میں دریافت ہو چکا ہے اور ہم اس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس متبرک خط کا فوٹو یعنی عکس درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ رسم خط میں کافی تبدیلی ہو جانے کے باوجود اس عکس کے اکثر الفاظ نظر غور کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں اور وہ بعینہ وہی الفاظ ہیں جو ہم نے اسلامی کتب کے حوالہ سے اوپر درج کئے ہیں۔ یہ خط ۱۸۵۸ء میں بعض فرانسیسی سیاحوں کو مصر کی ایک خانقاہ میں ملا اور اب اصل خط قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ اور اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس خط کا دریافت کرنے والا مسیو ایٹین برٹیمی تھا اور غالباً سب سے پہلے اس کا فوٹو مصر کے مشہور جریدہ الملک بابت نومبر ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا تھا اور پھر پروفیسر مارکولیتھ نے بھی اپنی کتاب محمد اینڈ دی رائز آف اسلام میں اسے شائع کیا۔ اسی طرح وہ مصر کی ایک جدید تصنیف تاریخ الاسلام سیاسی مصنفہ الدكتور حسن بن ابراہیم اساذالتاریخ الاسلامی جامعہ مصریہ میں بھی چھپ چکا ہے اور بہت سے غیر مسلم محققین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ وہی اصل خط ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس مصر کو لکھا تھا۔

ضمناً اس خط کی دریافت جس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف حدیث اور تاریخ اسلامی کی روایت کے عین مطابق ہے اس بات کا بھاری ثبوت مہیا کرتی ہے کہ معتبر جامعین حدیث اور محقق مورخین اسلام نے روایات کے جمع کرنے میں کتنی بھاری احتیاط اور کتنی عظیم الشان امانت و دیانت کا کام لیا ہے۔ انہوں نے زبانی حافظہ کی بنیاد پر راویوں کے ایک لمبے سلسلہ کے ساتھ اس خط کی عبارت بیان کی اور بتایا کہ فلاں موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کی تحریر مقوقس کو لکھی تھی اور پھر تیرہ سو سال کے طویل زمانہ کے بعد اصل خط کے دریافت ہونے پر یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ جو روایت ان مسلمان محدثین اور مورخین نے بیان کی تھی وہ حرف بحرف درست تھی۔ اس سے بڑھ کر اسلامی روایات کی صحت اور محدثین کی دیانت و امانت کا کیا ثبوت ہو گا؟ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب راوی ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہیں کیونکہ یقیناً ان میں حافظہ یا سمجھ یا دیانت کے لحاظ سے بعض کمزور راوی بھی پائے جاتے تھے، لیکن جو اچھے تھے ان کا تاریخ عالم میں جواب نہیں





نجاشی کے نام آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط

کتاب ہذا کے حصہ اول میں براعظم افریقہ کی عیسائی حکومت حبشہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس حکومت کے بادشاہ کاٹوٹ

لقب نجاشی ہوا کرتا تھا۔ یہ بات بھی کتاب کے حصہ اول

میں گزر چکی ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں کے خلاف قریش کے مظالم نے زور پکڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے صحابہ کو (جن میں بعض عورتیں بھی شامل تھیں) حبشہ بھجوا دیا تھا۔ اور باوجود قریش کے پیچھا کرنے اور نجاشی کو طرح طرح سے بہکانے کے نجاشی حتیٰ وانصاف کے رستہ پر قائم رہا اور مسلمان مہاجر ایک لمبے عرصہ تک اس کی حکومت میں امن و عافیت کے ساتھ رہتے رہے یہ نجاشی جس کا نام اہمہ تھا شروع سے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت مداح تھا اور آپ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتا تھا اور آپ کے صحابہ کے ساتھ بھی اس کا سلوک صرف منصفانہ ہی نہیں تھا بلکہ حقیقتہً مرتبانہ تھا، لیکن بہر حال وہ ابھی تک عمومی رنگ میں خوش عقیدہ ہونے کے باوجود مسلمان نہیں ہوا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط لکھے تو اس موقع پر ایک خط اپنے صحابی عمرو بن امیہ صمری کے ہاتھ نجاشی کے نام بھی لکھ کر بھجوا دیا۔ اس خط کی عبارت یہ تھی۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ إِلَى النَّجَاشِيِّ مَلِكِ  
الْحَبَشَةِ سَلَامٌ - أَمَا بَعْدُ فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا  
هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهِيمُنُ - وَأَشْهَدُ أَنَّ عِيسَى  
ابْنَ مَرْيَمَ رُوحُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أُنْقَاها إِلَى مَرْيَمَ ابْنَتِ  
أَدْعُوكَ إِلَى اللَّهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَالْمَوَالِةَ عَلَى طَاعَتِهِ وَإِنْ تَتَّبِعْنِي  
وَتُؤْمِنُ بِالَّذِي جَاءَنِي فَإِنِّي رَسُولُ اللَّهِ وَإِنِّي أَدْعُوكَ وَجُنُودَكَ إِلَى اللَّهِ  
تَعَالَى وَقَدْ بَلَغْتُ وَنَصَحْتُ فَأَقْبِلُوا نَصِيحَتِي وَقَدْ بَعَثْتُ إِلَيْكَ  
ابْنَ عَمِّي جَعْفَرًا وَمَعَهُ نَفَرٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ - وَالسَّلَامُ عَلَى  
اتَّبَعَ الْهُدَى ۝

یعنی "میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بن مانگے دینے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط اللہ کے رسول محمد کی طرف سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام ہے اسے بادشاہ! آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ اس کے بعد میں آپ کے سامنے اس خدا کی حمد

بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں۔ وہی زمین و آسمان کا حقیقی بادشاہ ہے جو تمام خوبیوں کا جامع اور تمام نقصوں سے پاک ہے۔ وہ مخلوق کو امن دینے والا اور دنیا کی حفاظت کرنے والا ہے اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم خدا کے کلام کے ذریعہ مبعوث ہوئے اور اس کے حکم سے عالم وجود میں آئے جو اس نے مریم بتول پر نازل کیا تھا۔۔۔۔ اور اسے بادشاہ! میں آپ کو خدا سے واحد کی طرف بلاتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ خدا کی اطاعت میں میرے ساتھ تعاون کریں اور میری اتباع اختیار کرتے ہوئے اس کلام پر ایمان لائیں جو مجھ پر نازل ہوا ہے کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں اور اسی حیثیت میں آپ کو اور آپ کی رعایا کو خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے آپ کو اپنا پیغام پہنچا دیا ہے اور اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ آپ کو صداقت کی طرف دعوت دی ہے پس میرے اس اخلاص اور ہمدردی کو قبول کریں۔ میں (اس سے قبل) آپ کی طرف اپنے چچا زاد بھائی جعفر اور ان کے ساتھ بعض دوسرے مسلمانوں کو بھیجا چکا ہوں۔ اور سلامتی ہو ہر اس شخص پر جو خدا کی ہدایت کو اختیار کرتا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط نجاشی کو پہنچا تو اس نے اسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور آپ کے طریق پر اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں۔ پھر اس نے ایک ہاتھی دانت کی ڈبیہ منگوائی اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط محفوظ کر کے رکھ دیا اور کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ جب تک یہ خط ہمارے گھرانے میں محفوظ رہے گا، اہل حبشہ اس کی وجہ سے خیر اور برکت پاتے رہیں گے یہ تاریخ النہیس کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ خط آج تک حبشہ کے شاہی خاندان میں محفوظ ہے۔

اس کے بعد نجاشی نے ذیل کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھا:-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - إِلَى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ مِنَ النَّجَاشِيِّ أَهْلَ حِمَّةٍ  
سَلَامٌ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُ اللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا  
هُوَ الَّذِي هَدَانِي لِلْإِسْلَامِ - أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ بَلَغْنِي كِتَابُكَ يَا رَسُولَ  
اللَّهِ فَمَا ذَكَرْتُ مِنْ أَمْرِ عَيْسَى فَوَرَّتِ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ إِنَّ عَيْسَى  
عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَزِيدُ مَا ذَكَرْتُ تَفَرُّوقًا وَقَدْ عَرَفْنَا مَا بَعَثْتَ بِهِ

اَلَيْنَا - فَاشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ صَادِقًا مُّصَدِّقًا وَقَدْ بَايَعْتُكَ وَبَايَعْتُ  
ابْنَ عَمَلِكَ وَ اَسْلَمْتُ عَلَى يَدَيْهِ اللهُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ..... وَالسَّلَامُ  
عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ ۱۰

یعنی "اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نجاشی اصمہ کی طرف سے ہے۔ یا رسول اللہ آپ پر سلامتی ہو اور اُس خدا کی طرف سے برکتیں نازل ہوں جس کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں۔ اور وہی ہے جس نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے اس کے بعد یا رسول اللہ آپ کا خط مجھے پہنچا۔ خدا کی قسم جو کچھ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان کیا ہے میں انہیں اس سے ذرہ بھر بھی زیادہ نہیں سمجھتا۔ اور ہم نے آپ کی دعوتِ حق کو سمجھ لیا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں جن کے متعلق پہلے صحیفوں میں بھی خبر دی گئی تھی۔ پس میں آپ کے چچا زاد بھائی جعفر کے ذریعہ آپ کے ہاتھ پر خدا کی خاطر بیعت کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو آپ پر اور اُس کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط نجاشی کو لکھا اور نجاشی نے اس کا جو جواب دیا ان دونوں میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے جو اوپر کے کسی اور خط میں نظر نہیں آتی۔ یعنی ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کے الفاظ اس اُمید سے معمور نظر آتے ہیں کہ انشاء اللہ آپ کی تبلیغ سے نجاشی ضرور مسلمان ہو جائے گا اور دوسری طرف نجاشی کا خط اس حقیقت کا حامل ہے کہ گویا اُس کی رُوح پہلے سے صداقت کے قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ بہر حال خدا تعالیٰ نے نجاشی کو اسلام کی توفیق عطا کی۔ اور یہ وہی نجاشی ہے جو سُنہ ہجری میں فوت ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے یہ فرماتے ہوئے اُس کی نماز جنازہ ادا کی کہ تمہارا ایک صالح بھائی نجاشی حبشہ میں فوت ہو گیا ہے۔ اُوہم سب مل کر اُس کی رُوح کے لیے دُعا کریں یہ

جو نجاشی اس نجاشی کی وفات کے بعد حبشہ کے تخت پر بیٹھا اُس کا نام روایات میں محفوظ نہیں ہے مگر تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے بھی ایک تبلیغی خط لکھا تھا مگر بد قسمتی سے اُس نے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور مسیحی مذہب پر ہی فوت ہوا۔ غائبانہ وجہ ہے کہ حبشہ میں اسلام زیادہ پھیل نہیں سکا۔

اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ چونکہ یکے بعد دیگرے دو نجاشیوں کو تبلیغی خط لکھے گئے

تھے یعنی ایک خط تو اصحہ نامی نجاشی کو لکھا گیا جس کے پاس ابتدائی صحابہ پناہ لینے کی غرض سے ہجرت کر گئے تھے اور جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملنے پر اسلام قبول کیا اور اسلام پر ہی سُنہ ہجری میں وفات پائی۔ اور دوسرا خط اس کے بعد آنے والے نجاشی کو لکھا گیا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر کی حالت میں ہی فوت ہوا۔ اس لیے بعض مؤرخین کو اس معاملہ میں غلطی لگ گئی ہے اور انہوں نے دونوں نجاشیوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علیحدہ علیحدہ زمانوں میں دو علیحدہ نجاشیوں کو خط لکھے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی صریح روایت آتی ہے کہ جس نجاشی کو بعد والا خط لکھا گیا وہ اس نجاشی کے علاوہ تھا جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ اور زرقانی اور تاریخ خمیس نے بھی اس معاملہ میں مفصل بحث کر کے دونوں کو علیحدہ علیحدہ ثابت کیا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نجاشی کو تبلیغی خط ارسال کیا جس پر وہ مسلمان ہو گیا تو اسی وقت آپؐ نے اُس کے نام ایک دوسرا خط پرا تویت مضمون کا بھی لکھا تھا۔ اس خط میں آپؐ نے نجاشی کو دو باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ایک یہ کہ وہ ابوسفیان کی بیٹی اُم حبیبہ کے ساتھ آپؐ کا غائبانہ نکاح پڑھ دے اور دوسرے یہ کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور اُن کے ساتھیوں کو جنہیں حبشہ میں گئے ہوتے بہت عرصہ ہو گیا تھا اپنے انتظام میں عرب واپس بھجوا دے۔ نجاشی نے ان دونوں باتوں کی تعمیل کی۔ یعنی اولاً اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُم حبیبہ کے نکاح کا اعلان کیا اور پھر حضرت جعفر اور اُن کے ساتھیوں کے لیے کشتی کا انتظام کر کے انہیں عرب میں واپس بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر کی فتح سے واپس آرہے تھے اور روایت آتی ہے کہ آپؐ حضرت جعفر سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ فرمایا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا کہ جعفر اور اُس کے ساتھیوں کی آمد سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ حضرت جعفر کی زندگی نے زیادہ وفائیں کی اور وہ اس کے تھوڑا عرصہ بعد ہی غزوہ موتہ میں شہید ہو گئے۔

اُم حبیبہ جن کی اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شادی ہوئی وہ مکہ کے رئیس اعظم ابوسفیان بن حرب کی بیٹی اور امیر معاویہ کی بہن تھیں۔ وہ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھیں اور ان کے خاوند عبید اللہ بن جحشؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے جو حبشہ میں ہی وفات



پاگئے۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب خیال کیا کہ اُمّ حبیبہ کو اپنے عقد میں لے لیں جس میں غالباً یہ دوہری غرض تھی کہ ایک تو اس طرح شاید ابوسفیان کو اسلام کی طرف مائل کیا جاسکے اور دوسرے تا اُمّ حبیبہ کی جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی کی بیوہ تھیں ولداری ہو جاتے۔ اُمّ حبیبہ جن کا نام رملہ تھا سائنہ ہجری میں فوت ہوئیں۔ نکاح پڑھنے سے پہلے نجاشی نے اُمّ حبیبہ کو پیغام بھیج کر ان کی باقاعدہ اجازت لی اور پھر ان کی طرف سے ان کے ایک قریبی عزیز خالد بن سعید نے ولی بن کر چار سو دینار پر نکاح منظور کیا۔ اگر اس موقع پر اسلام کے مسئلہ تعدد ازواج پر بحث دیکھنی ہو تو کتاب ہذا حصہ دوم صفحہ ۴۳۲ تا ۴۴۶ ملاحظہ کئے جاتیں۔

گو دوسرے نجاشی نے جو غالباً سائنہ ہجری میں تخت نشین ہوا اسلام قبول نہیں کیا، لیکن چونکہ پہلا نجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ایک لمبے عرصہ تک حبشہ میں پناہ نیکر امن و عافیت کی زندگی پائی تھی اس لیے مسلمانوں نے اس ملک کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ جہاں دُنیا کے چاروں کونوں میں ان کی فاتحانہ یلغار نے اسلام کی حکومت کا جھنڈا گاڑا وہاں انہوں نے حبشہ کے خلاف کبھی فوج کشی نہیں کی۔ ان کی تلوار شمال میں بھی چلی اور جنوب میں بھی چلی اور پھر مشرق میں بھی چلی اور مغرب میں بھی چلی اور چین اور راس کمار کی حد سے لے کر مراکش اور سپین کے آخری کناروں تک مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے رُوئے زمین کو ہلادیا اور قیصر و کسریٰ جیسے عظیم الشان بادشاہ ان کے سامنے ریت کے تودوں کی طرح گر کر پیوست خاک ہو گئے مگر فتح کے اس عالمگیر سیلاب میں بھی اگر مسلمانوں کی تلوار کسی ملک کے خلاف نہیں اٹھی تو وہ یہی حبشہ کی چھوٹی سی ریاست تھی۔ اس کے چاروں طرف کا علاقہ مسلمانوں کے ماتحت آچکا تھا مگر جب وہ حبشہ کے قریب پہنچتے تھے تو ہمیشہ کترا کر ادھر ادھر سے گذر جاتے رہے اور اس کے خلاف کبھی انگلی تک نہیں اٹھائی۔ اس کی تہ میں یہی اعلیٰ اخلاقی جذبہ کام کر رہا تھا کہ وہ اپنی انتہائی فتح کے زمانہ میں سینکڑوں سال گذر جانے کے بعد بھی اس چھوٹے سے احسان کو نہیں بھولنا چاہتے تھے جو حبشہ کے نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابیوں کو پناہ دیکر ابتدائی مسلمانوں پر کیا تھا۔ یہ ایک بہت بھاری اخلاقی نکتہ ہے جس سے دُنیا کی قومیں سبق حاصل کر سکتی ہیں۔

پانچواں تبلیغی خط ریاست غسان کے فرمانروا  
رئیس غسان کے نام آنحضرت ﷺ کا خط  
عارض بن ابی شمر کے نام لکھا گیا۔ یہ وہی حارث  
ہے جس کا ذکر قیصر والے خط کے تعلق میں بھی آچکا ہے۔ غسان کی ریاست عرب کے ساتھ متصل جانب

شمال واقع تھی اور اس کا رئیس قیصر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خط اپنے صحابی شجاع بن وہب کے ہاتھ روانہ فرمایا اور آپ نے اپنے اس خط میں حارث کو اسلام کی دعوت دی اور ساتھ ہی لکھا کہ اگر آپ اسلام قبول کریں گے تو آپ کی حکومت کو لمبی زندگی حاصل ہوگی۔ حارث اس وقت قیصر کی فتح کے جشن کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ حارث سے ملنے سے پہلے شجاع بن وہب اُس کے دربان یعنی منتم ملاقات سے ملے۔ وہ ایک اچھا آدمی تھا اور اُس نے شجاع کی زبانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سُکر فی الجملہ اُن کی تصدیق کی مگر شجاع کو بتایا کہ اُسے حارث سے چند اُمید نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ وہ قیصر سے ڈرتا ہے اور اُس کی منظوری کے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔ چند دن کے انتظار کے بعد شجاع بن وہب کو رئیس غسان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور انہوں نے اُس کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پیش کیا۔ حارث نے خط پڑھ کر غصہ میں پھینک دیا اور کہنے لگا۔ مجھ سے میرا ملک چھیننے کی کون طاقت رکھتا ہے۔ بلکہ میں خود اس مدعی کے خلاف فوج کشی کروں گا اور اگر مجھے یمن تک بھی جانا پڑے تو اُسے پکڑ کر لاؤں گا اور اُس نے اپنے سواروں کے دستے کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور دوسری طرف قیصر کو خط لکھا کہ مجھے حجاز کے مدعی نے اس قسم کا خط لکھا ہے اور میں اُس کے خلاف فوج کشی کرنے لگا ہوں۔ اس خط کا جواب قیصر نے یہ دیا کہ فوج کشی نہ کرو اور مجھے آکر دربار کی شرکت کے لیے ایلیا یعنی بیت المقدس میں ملو اُس کے بعد ایلیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر وحیہ کلبی کے ساتھ جو گزری اُس کا ذکر قیصر والے خط کے بیان میں کیا جا چکا ہے اور رئیس غسان والا قصہ یہیں ختم ہو گیا۔ اور وہ مسلمان نہیں ہوا۔ البتہ حدیث اور تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ مدینہ میں ایک عرصہ تک اس بات کا خوف رہا کہ غسانی قبائل مسلمانوں کے خلاف کب حملہ کرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ عرصہ بعد حارث بن ابی شمر کا جانشین جبکہ بن ایہم جو ریاست غسان کا آخری فرمانروا تھا مسلمان ہو گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مدینہ میں بھی آکر رہا۔ مگر جب اُس نے ایک غریب مسلمان کو تھپڑ مار دیا اور اس پر حضرت عمرؓ نے اُسے ڈانٹا کہ حقوق کے معاملہ میں سب مسلمان برابر ہیں تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا تو وہ زمانہ جاہلیت والے تکبر میں مبتلا ہو کر یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ کیا میں اور ایک عام مسلمان برابر ہو سکتے ہیں؟ اور پھر اسی ارتداد کی حالت میں اُس کی وفات ہوئی تھی۔

۱۔ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۵۷ و تاریخ خیس جلد ۲ صفحہ ۴۳۔ ۲۔ زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۶۶

۳۔ بخاری کتاب النکاح باب مَوْعِظَةُ الرَّجُلِ اِنْتَهَى لِحَالِ ذَوْجِهَا۔

۴۔ تاریخ خیس جلد ۲ صفحہ ۴۳، ۴۴

رئیس پیامہ کے نام آنحضرت ﷺ کا خط چھ تبلیغی خط پیامہ کے رئیس ہوزہ بن علی کے نام بھجوا گیا۔ اس خط کو لے جانے والے سلیط بن عمرو قرشی تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط میں ہوزہ کو اسلام کی دعوت دی مگر ہوزہ ایک منکر مزاج انسان اور دنیا کا بندہ تھا اس نے بظاہر سلیط بن عمرو کی بڑی آؤ بھگت کی مگر جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام بھیجا کہ میرا عربوں میں بڑا مقام ہے رغاباً مراد یہ تھی کہ میرا وجود آپ کے سلسلہ کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے، آپ اگر میرے لیے وصیت کر جائیں کہ کچھ حکومت کا حصہ آپ کے بعد مجھے بھی مل جائے تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خط پڑھ کر غصہ سے فرمایا کہ (یہ تو خدا کی چیز ہے) اگر ہوزہ مجھ سے کھجور کا ایک کتیا دانہ بھی مانگے تو میں اسے نہیں دوں گا۔ اس کے بعد ہوزہ بن علی فتح مکہ کے بعد کفر کی حالت ہی میں مر گیا۔ اور جب آپ کو ہوزہ کی موت کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ پیامہ کے علاقہ میں عنقریب ایک جھوٹا نبی پیدا ہوگا جو میری وفات کے بعد قتل کیا جائے گا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ اُسے کون قتل کرے گا؟ آپ نے فرمایا تم اور تمہارے ساتھی اور کون؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی مسئلہ کذاب کے ظہور میں پوری ہوئی جو مسلمانوں کے خلاف بعض خونریز لڑائیاں لڑنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں ہلاک ہوا۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیامہ کی طرف سلیط بن عمرو کو بھجواتے ہوئے ان کے سپرد دو تبلیغی خط کئے تھے۔ ایک ہوزہ کے نام اور دوسرا ثامہ بن اثمال کے نام۔ مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ اسی کتاب میں دوسری جگہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ثامہ اس سے پہلے ایک سریہ میں قید ہو کر مدینہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ پس اگر اس موقع پر ثامہ کو کوئی خط لکھا گیا تو یقیناً وہ تبلیغ کا خط نہیں ہوگا بلکہ اس تحریک کے لیے ہوگا کہ وہ آپ کے خط کو ہوزہ تک پہنچانے اور اُسے تبلیغ کرنے میں سلیط بن عمرو کی امداد کرے۔ یہی وہ تشریح ہے جو علامہ زرقانی نے اس اختلاف کی ہے۔

اوپر کے چھ تبلیغی خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد بعض روایتوں کے مطابق ایک ہی دن میں اور دوسری روایتوں کے مطابق اوپر تلے لکھ کر بھجواتے تھے۔ ان کے بعد جو خط لکھے گئے وہ کچھ وقفہ کے بعد لکھے گئے تھے اور ہم انہیں انشاء اللہ اپنے اپنے موقع پر بیان کریں گے۔

اوپر کے چھ تبلیغی خطوط سے اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ صلح ہوتے ہی اپنی پہلی فرصت میں کس درجہ مستعدی اور انہماک کے ساتھ تبلیغ کا فرض ادا کیا۔ گویا آپ نے ایک آن واحد میں عرب کے چاروں اطراف میں اسلام کا بیج بکھیر دیا۔ آپ کے اس فعل سے آپ کے اس قول پر بھاری روشنی پڑتی ہے جو آپ نے ایک جنگی مہم سے واپسی پر فرمایا کہ :-

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ  
یعنی "اب ہم تنوار کے چھوٹے جہاد سے تبلیغ و عبادت کے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں"

حق یہ ہے کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ دین اور خدمتِ خلق میں خرچ ہوتا تھا اور حالات کے ماتحت جس جس قسم کے کام کی ضرورت پیش آتی تھی آپ کی روح اس کی طرف اس طرح لپکتی تھی جس طرح ایک محبت کے جذبات سے بھری ہوئی ماں اپنے کھونے ہوتے بچے کے دوبارہ پانے پر اس کی طرف لپکتی ہے۔ دنیا آپ کے لیے ایک سفر کی منزل سے زیادہ نہیں تھی اور اپنے آقا کی خدمت اور اس کی عبادت اور اس میں ہو کر مخلوق کی محبت سب کچھ تھی۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

بعض متفرق واقعات جوئے اور شطرنج کی ممانعت  
جو تبلیغی خطوط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مختلف

بادشاہوں کے نام لکھے گئے اُن کے لکھے جاتے کی تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے یعنی بعض روایات میں ان کی تاریخ ذوالحجہ سنہ ۱ ہجری بیان ہوئی ہے اور بعض میں محرم سنہ ۱ ہجری بیان ہوئی ہے مگر بہر حال اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ یہ چھ تبلیغی خطوط جو اوپر درج کئے گئے ہیں صلح حدیبیہ کے معاً بعد لکھے گئے اس لیے میں نے انہیں سنہ ۱ ہجری کے واقعات میں درج کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اتنے دور دراز کے سفروں پر ایچھیوں کا جانا اور پھر جواب لیکر واپس آنا لازماً کافی وقت چاہتا تھا اس لیے خواہ یہ خطوط سنہ ۱ کے آخر میں لکھے گئے ہوں یا سنہ ۲ کے شروع میں بہر حال ان کے جوابات سنہ ۲ میں موصول ہوئے، لیکن سارے متعلقہ حالات کو ایک جگہ بیان کرنے کے خیال سے میں نے ان خطوط کو سنہ ۲ کے واقعات میں درج کر دیا ہے۔ اسی سال میں یعنی سنہ ۱ ہجری کے دوران میں حضرت عائشہؓ کی والدہ اُمّ رومان کی وفات ہوئی



اُمّ رومان جن کا نام زینب تھا۔ پہلے عبداللہ بن منجرہ کے نکاح میں تھیں اور عبداللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے نکاح میں آئیں اور انہیں کے بطن سے عبدالرحمن بن ابوبکر اور حضرت عائشہؓ پیدا ہوئے۔ اُمّ رومان ایک بہت نیک مگر سادہ مزاج عورت تھیں، لیکن حضرت ابوبکر خلیفہ اولؓ کی بیوی اور حضرت عائشہؓ کی ماں ہونے کی وجہ سے انہیں تاریخ اسلام میں جو امتیاز حاصل ہوا ہے وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ جب وہ قبر میں اتاری جا رہی تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے جنت کی کوئی حور دیکھنی ہو وہ اُمّ رومان کو دیکھ لے۔ یہ ایک بہت سادہ سافقرہ ہے مگر اس سے پتہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جنت کی حوروں سے مراد ناز و ادا والی خوبصورت لڑکیاں نہیں تھیں جو عالم آخرت میں پیدا کی جا کر مومنوں کے ساتھ جنت میں رکھی جائیں گی بلکہ اس سے مراد دنیا کی ان پاک عورتوں کی رُو ہیں جو جنت میں نیک لوگوں کی رفیق بنیں گی اور گو جنت میں ہر روح زندگی کے کمال کی حالت میں جو ان بنا کر داخل کی جائے گی یہ مگر ہر حال اس سے ظاہر ہے کہ جنت کی جنسی رفاقت روحانی ہوگی نہ کہ جسمانی۔

شراب کی حرمت بھی بعض لوگوں کے نزدیک سنہ ہجری میں ہوئی، لیکن جیسا کہ ہم اس کتاب کے حصہ دوم میں بیان کر چکے ہیں ہمارے نزدیک اس کی حرمت غزوہ احد کے بعد سنہ ہجری کے آخر یا سنہ ہجری کے شروع میں ہوئی تھی۔ اور سی اکثر مسلمان محققین کا خیال ہے۔ غلطاً بھی میرے نزدیک شراب جیسی گندی چیز جو کئی دوسری بدیوں کی ماں ہے اس کی حرمت میں ہجرت کے بعد زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی۔ شراب کی حرمت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تاکید فرماتے تھے کہ فرمایا کرتے تھے کہ جس دسترخوان (یا میز) پر کوئی اور شخص شراب پی رہا ہو تمہیں اس دسترخوان پر بھی نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

اسی سال بعض اقوال کے مطابق جو ابھی حرام کیا گیا۔ جوئے سے مراد اتفاق کی کھیل ہے جس میں آدمی کی بنیاد محنت یا ہنر پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ محض اتفاقی حالات پر مبنی ہوتی ہے اور چونکہ ایسی آمد میں وقت لگانا کیر کیٹریکی تباہی کے علاوہ ملکی دولت کے توازن کو بھی برباد کرنے کا موجب ہوتا ہے اس لیے اسلامی شریعت نے کمال دانشمندی کے ساتھ جو ابھی حرام قرار دیا ہے۔ بیشک جلد باز انسان

۱۔ زرقانی جلد ۳ حالات حضرت عائشہؓ۔ ۲۔ تاریخ خیس حالات سنہ ۳۔ تاریخ کبیر مصنف امام بخاریؒ بحوالہ زرقانی

حالات حضرت عائشہؓ و ابن سعد بحوالہ تاریخ خیس جلد ۲ صفحہ ۳۹۔ ۴۔ سورۃ الواقعہ آیت ۲۳، ۲۴ و ترمذی

۵۔ ملاحظہ ہو کتاب ہذا حصہ دوم صفحہ ۵۰۹ تا صفحہ ۵۱۱۔ ۶۔ ابو داؤد کتاب ۲ باب ۱۸ دسمند احمد جلد ۱ صفحہ ۲۰

۷۔ سورۃ المائدہ آیت ۹۱۔ نیز تاریخ خیس جلد ۲ صفحہ ۳۰



آزادی کی رو میں بہہ کر ہر قسم کی پابندی سے گھبراتا ہے لیکن اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ جو پابندیاں اسلام نے مسلمانوں پر لگائی ہیں وہ سراسر اُن کے اپنے فائدہ کے لیے ہیں اور جوئے کی حرمت بھی اسی اصول کے ماتحت آتی ہے یہ

اسی سال شطرنج کی کھیل بھی ممنوع قرار دی گئی۔ کیونکہ ایک تو وہ بالعموم جوئے کا بہانہ بن جاتی ہے اور دوسرے اس میں اتنا انہماک پیدا ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے مفید شعبوں کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسلام یقیناً انسان کو جائز تفریحوں سے نہیں روکتا لیکن وہ اس بات سے ضرور روکتا ہے کہ انسان بالکل ہی شتر بے ہمار بن کر جو چاہے کرتا پھرے اور اپنی زندگی کے مفید پہلوؤں کو تباہ کر لے۔ اور چونکہ شطرنج کی کھیل اپنے اندر یہ دو بھاری نقصان کے پہلو رکھتی ہے یعنی ایک تو حد سے زیادہ انہماک جو شطرنج کے کھلاڑی کو گویا دُنیا و مافیہا سے غافل کر دیتا ہے اور دوسرے جوئے کی طرف میلان کیونکہ شطرنج بھی اکثر جوئے لگا کر کھیلا جاتا ہے اس لیے کمال حکمت سے اسلام نے اس کھیل سے روک دیا ہے۔ دراصل اسلام کے فلسفہ شریعت میں صرف یہی بات داخل نہیں کہ جو چیز اپنی موجودہ صورت میں بُری ہے صرف اسی کو روکا جائے بلکہ یہ بات بھی داخل ہے کہ جو چیز خواہ وہ اپنی موجودہ صورت میں بُری نہ ہو لیکن اگر وہ عام حالات میں انسان کو بُرائی کی طرف کھینچتی ہے اور اس کی یہ کشش غیر معمول غلبہ رکھتی ہے تو اسے بھی روک دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شراب وغیرہ کے متعلق اصولی طور پر فرماتے ہیں کہ :-

مَا أَشْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ ۖ

یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرتی ہے اُس کی تھوڑی مقدار بھی جائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد ایک نہایت گہرے اور لطیف نفسیاتی فلسفہ پر مبنی ہے کہ دُنیا میں بعض بدیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اکثر انسان اُن میں ایک دفعہ قدم رکھ کر پھر آگے بڑھنے سے رُک نہیں سکتے۔ اور ہر پہلا قدم دوسرے قدم کی طرف دھکیلتا ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگ اس فلسفہ کو سمجھتے یا اس کی قدر کرتے ہیں۔

(اس جگہ حصہ سوم کی جزو اول ختم ہوئی)





## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

میری تصنیف سیرۃ خاتم النبیین ﷺ کی اس وقت تک خدا تعالیٰ کے فضل سے دو جلدیں مکمل اور تیسری جلد جزو اشائع ہو چکی ہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائی اور میری اس کوشش کو قبولیت سے نوازا۔ لا الحمد لله علی ذالک۔

میں نے کچھ عرصہ سے سیرۃ خاتم النبیین کی تیسری جلد کے بقیہ حصہ کے مضامین کی فہرست تیار کر کے مرتب کر رکھی تھی۔ جو اب الفضل میں شائع کرنے کی غرض سے بھجوا رہا ہوں۔ اس اشاعت کی سہ گو نہ غرض ہے۔

اول یہ کہ تاجھے اس کتاب کی تکمیل کی یاد دہانی ہوتی رہے۔  
دوسرے یہ کہ اگر خدا نخواستہ میں اسے اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکوں تو خدا کا کوئی اور بندہ اسے انہی لائنوں پر مکمل کر دے اور میں بھی اس کے ثواب میں حصہ دار بن جاؤں۔

اور تیسرے یہ کہ اگر کسی دوست کے خیال میں اس فہرست کی تکمیل کے متعلق کوئی مفید تجویز آئے۔ یعنی ان کی رائے میں اس فہرست میں کوئی عنوان زیادہ ہونے والا ہو یا ترتیب بدلنے والی ہو یا کوئی اور تبدیلی ضروری ہو تو وہ مجھے مطلع فرما کر اس تصنیف کے ثواب میں شریک ہو جائیں۔

بالآخر دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس ضروری تصنیف کی تکمیل کے لئے دعا بھی فرمائیں۔ کیونکہ ہر امر حقیقتاً خدا تعالیٰ ہی کے فضل اور اس کی توفیق کے ساتھ مطلق ہوتا ہے۔

خاکسار راقم آثم

مرزا بشیر احمد عفی عنہ

ربوہ ۳۱ / جنوری ۱۹۵۵ء

(منقول از روزنامہ الفضل ربوہ شمارہ ۲۰ / فروری ۱۹۵۵ء)



# سیرت خاتم النبیین کے بقیہ حصہ کے مجوزہ عناوین

از اوائل سنہ تا وفات

واقعات سنہ

ماہ	واقعہ	کیفیت
ماہ محرم سنہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا مزعومہ واقعہ اور اس کی حقیقت	
"	سریہ ابان بن سعید بطرف نجد	
"	البہرہ کا اسلام لانا (جو روایتوں کی تعداد کے لحاظ سے حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں۔)	
"	غزوہ ذی قرد یعنی غائبہ (سلمہ بن اکوع کو رسول پاک کا لطیف ارشاد	(عام موزعین اسے سنہ میں بیان کرتے ہیں مگر حدیث سے سنہ ثابت ہوتا ہے۔)
ماہ محرم و صفر یعنی اگست ۶۲۸ء	غزوہ خیبر جو عرب کے یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔	(امام مالک کے نزدیک یہ غزوہ سنہ میں ہوا تھا)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیکر قتل کرنے کی ناکام کوشش	
"	کنانہ بن ابی الحقیق کے قتل کا واقعہ اور غیر مسلم موزعوں کے اعتراضات کا رد	
"	حضرت صفیہ کی شادی جو اسرائیلی قوم سے تھیں (حضرت صفیہ کی خواب اور اس کی تعبیر اس خواب کا معجزہ شق القمر سے تعلق)	
"	بعض فقہی مسائل کی تشریح یعنی پالتو گدھے کا گوشت۔ درندوں کا گوشت۔ متعہ۔ استبراء۔ بیع۔ مال غنیمت وغیرہ	
"	اہل فذک کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معاہدت (فدک کے متنازعہ مسئلہ کی تشریح)	
"	غیر مسلموں کے ارض مجاز میں رہنے کے بارہ میں اسلامی حکم (اور ضمناً ارض حرم کے متعلق احکام)	
جمادی الآخرة	غزوہ وادی القری	(بعض کے نزدیک یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے)



ماہ	واقعہ	کیفیت
جمادی الآخرۃ	نماز فجر کا بے وقت ادا ہونا	(اس معاملہ میں اختلاف ہے یہ واقعہ غزوہ تبوک میں ہوا یا کہ حدیبیہ سے واپسی پر)
"	حاجرین حبشہ کی واپسی (حضرت جعفر بن ابی طالب کی واپسی پر)	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی خوشی	
"	حضرت ام حبیبہ بنت البسفیان کا رخصتانہ	
"	خسرو پرویز کسریٰ شاہ ایران کا مارا جانا	
"	غزوہ ذات الرقاع	(مورخین میں اس کی تاریخ کے متعلق اختلاف ہے)
"	صلوۃ خوف اور مختلف حالات میں اس کے مختلف طریق	
"	اسلام میں سیر کے پہلو پر زور اور حالات کی رعایت ملحوظ رکھنے کے متعلق اصولی نوٹ۔ اسلامی شریعت کے ٹھوس اور لچکدار حصے	
"	حضرت ماریہ قبطیہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں آنا	
"	لوٹ لیاؤں کے مسئلہ پر ایک اصولی نوٹ	
شعبان	سریہ حضرت عمرؓ بطرف توبہ	
"	سریہ بشر بن ساعد بطرف بنی مرہ	
رمضان	سریہ غالب بن عبد اللہ لیشی بطرف میفعا اور حضرت اسامہ کا واقعہ۔ دربارہ قتل جری مسلمان	
شوال	سریہ بشر بن ساعد بطرف مین دجبار	
"	سریہ ابن عمر بطرف نجد	(بعض کے نزدیک سریہ ابان بن سعید اور یہ ایک ہی ہیں)
ذو القعدہ فردی ۱۳۶۹ھ	عمرۃ القضا جو صلح حدیبیہ کے نتیجہ میں ادا کیا گیا۔	
"	حضرت میمونہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی	
"	(یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری شادی تھی)	

ماہ	واقعہ	کیفیت
ذو القعدة فروری ۶۲۹ء	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں اور ازواج مطہرات کے متعلق ایک مجموعی نوٹ	(مزید شادیوں پر پابندی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج کے متعلق یہ پابندی کہ آپ کے بعد اور کسی سے شادی نہ کریں)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلی زندگی پر نوٹ (معاشرہ خانہ و نفقہ)	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گزاردہ کا ذریعہ وغیرہ	
"	سریہ ابن ابی العوجا بطرف بنی سلیم	
پہلے ماہ	عبداللہ بن ابیہم رئیس غسان کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی خط اور اس کا مسلمان ہونا (مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ شخص پھر مرتد ہو گیا)	

### واقعات سنہ

ماہ صفر سنہ	خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کا اسلام لانا (خالد اور عمرو بن عاص کی تاریخ اسلام میں نمایاں حیثیت)
"	سریہ غالب بن عبداللہ بطرف بنی طو ح
"	سریہ غالب بن عبداللہ بطرف فدک
"	مسجد نبویؐ میں منبر بنانے کی تجویز اور حنین الجذع کا واقعہ (فلسفی منکر حنا نہ است - از حواس انبیاء بیگناہ است)
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کو ایک شخص کے قتل کرنے کے جرم میں قتل کی سزا دینا (یہ اسلام میں قتل کی پہلی سزا تھی)
"	اسلامی شریعت میں قانون قصاص پر اصولی نوٹ
ربیع الاول	سریہ شجاع بن وہب بطرف بنی عامر
"	سریہ کعب بن عمر بطرف ذات الملاح
جمادی الاول	عرب کی شمالی سرحد میں اسلام کے خلاف پرو پگینڈہ اور بیرونی
ستمبر ۶۲۹ء	ممالک کے خطرات کا آغاز

ماہ	واقعہ	کیفیت
جمادی الاول ستبر ۶۲۹ء	غزوہ موتہ - (زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب اور عبد اللہ بن رواحہ کی شہادت)	
جمادی الآخرہ	سریہ عمرو بن عاص بطرف ذات سلاسل اور سریہ ابو عبیدہ مکہ کی صورت میں	
رجب (نومبر ۶۲۹ء)	سریہ ابو عبیدہ بطرف السیف البحر (اس سریہ میں راشن بندی کی ضرورت پیش آئی اور خوراک کے متفرق ذخائر کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا)	
شعبان	سریہ ابو قتادہ بطرف خضرہ	
رمضان	سریہ ابو قتادہ بطرف بطن اصنم	
"	سریہ عبد اللہ بن ابی حدرد بطرف غابہ	
جنوری ۶۳۰ء	غزوہ فتح مکہ	بعض مؤرخین کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی ہیں۔
"	حرم کی حدود میں اسلام کا پُر امن اور شاندار داخلہ۔ عام معافی۔ بعض خاص مجرمین (جن پر قتل و غارت کا الزام تھا) کے قتل کا حکم۔ بیت اللہ کے بتوں کا ٹوڑا جانا۔ حضرت ابو بکرؓ کے والد ابو قحافہ ابوسفیان، حکیم بن حزام، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابو جہل وغیرہ کا مسلمان ہونا۔	
"	اس بات پر نوٹ کہ فتح مکہ کے بعد بھی مکہ کے کئی لوگ کفر پر قائم رہے۔	
"	مکہ سے بعثت خالد بطرف عزا۔ عمرو بن عاص بطرف سواع	
"	سعد بن زید بطرف مناة۔ سریہ خالد بطرف جذیمہ	
"	اسلام کا ایک روحانی مذہب ہونا اور روحانیت پر ایک اصولی نوٹ	
شوال	غزوہ حنین (حنین کے واقعہ میں مسلمانوں کیلئے ایک بڑا سبق تھا)	
"	سریہ ابو عامر اشعری بطرف ادطاس	
"	سریہ طفیل بن عامر بطرف ذوالکفین	
فروری ۶۳۰ء	غزوہ طائف	

ماہ	واقعہ	کیفیت
فروری سنہ ۹۳۰ھ	جعفرانہ کے مقام میں غنائم کی تقسیم بعض انصار کی طرف سے اعتراض اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب۔ ایک لطیف روحانی منظر۔ اپنے رضاعی عزیزوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی مزیدار سلوک وغیرہ	
"	دیس بھڑین کی طرف تبلیغی خط اور اس کا جواب	
"	اسلام میں بیکار لوگوں کے گزارہ کا استثنائی انتظام	
"	جزیرہ پر ایک اصولی نوٹ	
ذوالحجہ	ابراہیم ابن رسول اللہ کی ولادت	
اپریل سنہ ۹۳۰ھ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف اطراف سے وفود کی ابتداء	
بلاتعین ماہ	حضرت زینب بنت رسول اللہ کی وفات	
"	زکوٰۃ کا فرض ہونا	
"	نظام زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت	
"	واقعات سنہ ۹۳۰ھ	
"	قصہ عام الوفود یعنی سال بھر وفودوں کا مدینہ میں آتے رہنا اور اسلام کی اشاعت میں غیر معمولی توسیع	
محرم	بعث عیینہ بن حصن بطرف بنی تمیم	
محرم یا صفر	بعث ولید بن عقبہ بن ابی معیط بطرف بنی مصطلق	
"	سریہ ابن عذیبہ بطرف بنی عمرو	
"	بعث طلحہ بن عامر بطرف خثعم	
ربیع الاول	بعث فہاک بطرف بنی کلاب	
"	بعث علقمہ بن معمر بطرف حبشہ	
ربیع الثانی	بعث حضرت علیؑ بطرف فلس	
"	بعث عکاشہ بن محسن بطرف الحجاب	
"	کعب بن زہیر شاعر کا مسلمان ہونا	

(حاکم کے نزدیک یہ ماہ صفر میں ہوا)

(ماہ ربیع الثانی اور بعض کے نزدیک  
سنہ ہجری)

ماہ	واقعہ	کیفیت
ربیع الآخر	مشہور قصیدہ بردہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج سے ایک ماہ بھر کرنا	(ابن حبان کے نزدیک یہ واقعہ میں ہوا۔ اور ابن حجر نے بھی کہا ہے)
رجب	غزوہ تبوک جسے غزوہ عسراء بھی کہتے ہیں۔	
ستمبر ۳۳ھ	(غزوہ موتہ کے بعد روم اور ایران کے ساتھ جنگ کا یہ پہلا قدم تھا)	
"	سریہ خالد بن ولید اور مقام تبوک	
"	وفات عبداللہ ذی البجاء بن تبوک میں	
"	ہرقل کے نام خط از تبوک	(یہ قصیر کے نام دو سرا خط تھا)
رمضان	منافقین کا قتل اور مسجد فرار کا گرایا جانا اور منافقین کی پردہ دری	
"	قتلہ منیر و معانی کعب بن مالک وغیرہ	
"	قتلہ لعان اور واقعہ عویر (مسئلہ لعان کے متعلق اسلامی حکم)	
"	قبیلہ بنو ثقیف کا مسلمان ہونا۔	
"	لات کے بت کا منہدم کیا جانا	
بلا تعین ماہ	ملوک حیر کے نام خط	
"	غامدیہ عورت کا رجم	(اس واقعہ کی تاریخ قابل تحقیق ہے)
"	رجم کی سزا پر ایک اصول نوٹ۔ (کیا رجم کی سزا حقیقتہً اسلامی سزا ہے)	
بلا تعین ماہ	{ نجاشی بادشاہ حبشہ کی وفات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نجاشی کا غائبانہ جنازہ پڑھنا۔	
"	اس بات پر نوٹ کہ یہ کونسا نجاشی تھا۔	
"	مسئلہ جنازہ کے متعلق اصول نوٹ	
"	وفات اُمّ کلثوم بنت رسول اللہ	
"	زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عمال کا تقرر	
ذو قعدہ	عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کی موت	

(علامہ ابن قیم کے نزدیک ان کی  
وفات شعبان میں ہوئی تھی)



اہ	واقعہ	کیفیت
ذوقعدہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کا جنازہ پڑھنا اور حضرت عمر کا اقرار جس جگہ کا فرض ہونا	(زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ و تراویح جلد ۱ صفحہ ۱۸۰)
ذوقعدہ و مارچ ۶۳۱ء	حضرت ابو بکرؓ کی اقتداء میں مسلمانوں کا پہلا حج	علامہ زرقانی نے سفر کی ابتداء بھی ذوالحجہ میں لکھی ہے
بلا تعین ماہ	اسلام میں قمری اور شمسی نظام (یعنی سولت عامہ کے لحاظ سے کسی امر میں قمری نظام اور کسی میں شمسی)	
بلا تعین ماہ	اہل فارس کا کسریٰ شہر یار کو قتل کر کے اس کی لڑکی بوران کو تخت پر بٹھانا	
بلا تعین ماہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر نوٹ کہ عورت کو بادشاہ بنانے والی قوم کامیاب نہیں ہوگی۔	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انفرادی حکومت کے زمانہ کا ہے ایسے میں خیال نہ کیا جاتے کہ یورپ کے بعض ممالک نے عورت کے حاکموں کے نام میں خاص ترقی کی ہے کیونکہ یورپ میں اہل حکومت قوم کی ہوتی ہے اور مکہ برائے ہم ہوا کرتی ہے۔ گو پھر بھی بعض نقائص پیدا ہو جاتے ہیں۔)
محرم	عدی بن حاتم طائی کا مسلمان ہونا	(یا شعبان ۹۷۰ء)
ربیع الاول	بعث ابو موسیٰ اشعری بطرف یمن	(یا ربیع الآخر)
"	بعث معاذ بن جبل بطرف یمن	"
"	بعث خالد بن ولید - بطرف نجران	"
" (جون ۶۳۱ء)	وفات ابراہیم ابن رسول اللہؐ اور کسوف شمس	
	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اگر میرا بیٹہ زندہ رہتا تو نبی بنتا)	

ماہ	واقعہ	کیفیت
بلاتعین ماہ	بعث جریر بن عبداللہ بطف ذوالکلاع	
"	بعث ابوعبیدہ بطف نجران	
"	قفطہ بدیل و تمیم الداری و ابن صیاد	
"	دجال کے متعلق اصولی نوٹ	
"	جبرائیل کا مثیلی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہو کر مسائل دریافت کرنا	
رمضان	بعث حضرت علیؑ بطف ین	
بلاتعین ماہ	سود کی ممانعت	
"	اشتراکیت یعنی کمیونزم پر ایک اصولی نوٹ	
"	ابوعامر راہب کی موت	
"	وفات باذان والی ین	
"	نزول احکام بابت استثنیٰ ان	
ذوالقعدہ و ذوالحجہ	حجۃ الوداع جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب کے خیال سے مسلمانوں کو الوداع کہا۔	
مارچ ۱۳۳۷ھ	آیت اَنْتُمْ اَحْمَنُ تَعْمَدُ مِنْهُ ذَاتُ شَمْتٍ عَلَیْکُمْ نَعْمَتِیْ کا نزول	
"	اسلام کی تعلیم کا خلاصہ (سابقہ مذاہب کے متعلق اسلام کا مسلک - پنج ارکان اسلام - مستند ختم نبوت - اسلام کی عالمگیر شریعت - شریعت کے ٹھوس اور پکدہ ارہمے وغیرہ)	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر	
بلاتعین ماہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جَوَامِیْعُ الْکَلِمِ عطا کئے گئے۔	
"	آپ کے خاص خاص امتیازی کلمات	

### واقعات سال ۱۰

محرم	وفد نفع از ین (یہ آخری وفد تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا)
	مدفونین جنت البقیع کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دُعا (نیز اُحد میں جا کر شہداء اُحد کے لیے دُعا)

ماہ	واقعات	کیفیت
صفر (مئی ۱۳۲۲ء)	سریہ اسامہ بن زید (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری سریہ ہے گو اس کی روانگی بھی آپ کی وفات کے بعد ہوئی۔	
صفر یا ربیع الاول	اسود غسی کذاب کا ظہور	
"	مسئلہ کذاب کا ظہور (سجاح تنبیہ کا واقعہ)	
"	طلیحہ بن خویلد کا ظہور	
"	الحی سلسلوں میں ارتداد پر ایک اصول نوٹ	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت کا آغاز (مرض کیا تھی۔ کتنے دن رہی۔ کیا علاج کیا گیا وغیرہ وغیرہ)	
"	قرطاس کے واقعہ کی تشریح	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ امام الصلوٰۃ مقرر کرنا۔	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے فرمانا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق خلافت کی وصیت لکھ دوں مگر پھر اُسے خدا اور مومنوں پر چھوڑ دیا۔	
ربیع الاول	افاقہ قبل وفات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد میں تشریف لے جا کر صحابہؓ سے باتیں کرنا	
"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام	
"	وصال اکبر	(جون ۱۳۲۲ء)
"	مسجد نبویؐ میں صحابہؓ کا غم و اندوہ۔ حضرت عمرؓ کا بیچ و تاب کھانا۔ حضرت ابوبکرؓ کا خطبہ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ نَزَّ الْآلَ مِنْ حَوَانٍ يَعْْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنْ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ۔	
"	اسلام کا سب سے پہلا بلکہ واحد اجماع	
"	سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کی ابتدائی بیعت	
"	مسجد نبویؐ میں حضرت ابوبکرؓ کی عام بیعت	

کیفیت	واقعہ	ہا
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل - تکفین - جنازہ - قبر اور تدفین وغیرہ	ربیع الاول
	کیا آنحضرتؐ کا جنازہ اکٹھا باجماعت پڑھا گیا - اگر نہیں تو کیوں؟	"
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بحساب نظام قمری و شمسی -	"
	آنحضرتؐ کا ورثہ (تشریح حدیث مَا تَرَكَ نَاؤُ حَبْدَقَةُ)	"
	شمالی نبویؐ کی ایک اجمالی جھلک -	"
	محمد مفلح یعنی سب نبیوں میں سے زیادہ کامیاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم -	"
	صلی اللہ علیہ وسلم -	"
	کتاب کا خاتمہ	"

# اَشَايِرُ

۳	..... اسماء
۲۳	..... مقامات
۲۹	..... غزوات
۳۱	..... کتلیات
۳۹	..... آراء









۳۶۵	ابو عزیز بن عمیر بن ہاشم	۶۳۳'۶۳۲'۵۵۸'۳۸۲'۲۵۳'۱۸۸
۴۵۱'۴۴۸'۴۴۶	ابو عقیق	۴۶۷'۴۴۸
۲۳	ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمت المعروف بابن الصلاح	۷۳۸'۷۳۶'۷۳۴'۷۳۳'۷۳۲'۷۳۱
۴۱	ابو الفداء	ابو رافع دیکھے سلام بن ابی الحقیق
۴۳۰	ابو کجیہ رضی اللہ عنہ	۴۴۹
۱۳۵	ابو قیس بن فاکہ	۶۵۵
۴۹۸'۴۹۶	ابن قنہ	۶۸۲
۶۰۰'۵۹۹'۵۹۸'۳۵۳	ابو لبابہ بن منذر انصاری	۶۰۰'۴۶۸
۹۹'۹۳	ابو لبیب بن عبد المطلب	۸۵'۵۷
۱۳۳'۱۳۹'۱۳۵'۱۳۹'۱۳۸'۱۰۸		۳۱۳'۲۸۲'۲۱۰'۱۳۶'۱۲۵'۱۲۳'۱۱۵'۱۰۳'۸۸
۴۹۳'۳۷۴'۳۵۰'۲۱۸'۲۱۷'۲۱۶		۳۶۹'۳۵۶'۳۵۲'۳۵۱'۳۵۰'۳۴۹'۳۴۵'۳۴۴
۴۸۵	ابو مسعود بدری	۴۵۳'۴۵۳'۴۵۲'۴۹۶'۴۹۵'۳۷۴'۳۷۱'۳۷۰
۲۵۳'۱۸۸'۱۳۱	ابو موسیٰ اشعری	۵۰۵'۵۰۰'۴۹۹'۴۹۸'۴۸۸'۴۸۴'۴۸۳'۴۶۶
۴۶۹	ابو نائلہ	۵۸۳'۵۸۳'۵۷۳'۵۴۳'۵۳۰'۵۲۹'۵۱۶
۴۸۳	ابو نوار	۷۷۹'۷۷۹'۷۷۳'۷۷۲'۷۷۱'۶۶۵'۵۹۵'۵۹۳
۲۱'۲۰'۱۵'۱۳	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ	۸۲۸'۸۲۷'۸۱۴'۸۰۸'۸۰۷'۸۰۶'۸۰۵'۸۰۴
۶۴۷'۴۰۸'۴۹۳'۴۹۱'۴۸۷'۴۸۳'۴۱۲'۱۸۹		۵۳۰'۵۱۱'۴۴۹'۱۳۶'۱۳۳
۲۳۰'۲۲۸'۲۲۳	ابو الہیثم مالک بن تیمان	۷۱۶
۴۸۳	ابو الیسر رضی اللہ عنہ	۲۸۱
۴۵	ابو یوسف یعقوب بن ایراجیم	۸۷
۲۹	ابو یعلیٰ	۱۰۰'۹۹
۲۵	احمد بن حجر عسقلانی ابو الفضل	۱۳۷'۱۳۶'۱۳۹'۱۲۷'۱۱۰'۱۰۷'۱۰۳
۲۹	احمد بن حسین بیہقی	۵۳۰'۱۷۳'۱۷۳'۱۷۲'۱۷۱'۱۷۰'۱۶۵'۱۳۸
۴۷'۴۳	احمد بن حنبل	۵۱۰'۴۹۵'۴۸۳
۲۸	احمد بن شعیب النسائی	۳۶۶'۱۷۳'۱۰۸
۲۶	احمد بن عبد اللہ الحللی	۶۷۳'۶۷۳'۶۷۱'۶۷۰'۳۶۸
۲۶	احمد بن علی بن محمد بن علی بن حجر العسقلانی	۴۸۹'۴۸۸'۴۷۵
۴۲'۳۹	احمد بن محمد بن ایراجیم قاضی المعروف بابن علقم	۲۲۳
۴۴	احمد بن یحییٰ بن جابر ابو جعفر	۲۷۷'۱۳۳
۴۰۳'۱۹۷	اورلیس	۷۶۹'۷۰۷'۶۶۹'۶۶۸'۶۵۳'۴۹۷
۴۹'۳۷	الذہبی علامہ	۵۰۵
		ابو عروہ

۱۳۶	امجد نجاشی	۱۳۷	اراشه
۱۱'۹۹'۹۷'	ام ایمن	۱۲۹'۱۴۴'	ارقم بن ابی ارقم
۸۲۸'۸۲۷'۱۲۳'	ام حبیبہ ام المومنین (زملہ)	۳۶	ازد
۸۳۲'۸۳۱'۱۷۶'	ام رمان (ذنب) زوجہ حضرت ابو بکرؓ	۴۱	الزرکانی محمد بن عبد الباقی بن یوسف
۱۳۶'۱۳۳'۱۲۳'	ام سلمہ ام المومنین	۷۱	اساف
۷۷۰'۷۵۰'۵۹۰'۵۳۱'۵۳۰'۳۲۳'		۲۹۱'۱۱'۹۱'	اسلمہ بن زید رضی اللہ عنہ
۳۹۳'	ام سلیط	۶۹۰'۶۸۳'۵۶۳'۳۸۶'۳۹۹'۳۹۸'۳۲۰'	
۳۹۳'۳۶۸'	ام سلیم والدہ انس بن مالک	۳۷	اسحاق بن ابراہیم المعروف بابن راویہ
۲۸۵'	ام عبد اللہ دیکھے عائشہ ام المومنین	۱۷۵'۷۶'۶۶'۶۱'۷۲'۷۱'۷۰'	
۳۹۶'	ام عمارہ	۸۷	اسد بن ہاشم
۱۴۵'	ام فضل زوجہ عباس بن عبد المطلب	۳۷۳'	اسرائیل
۷۲۱'۷۲۰'۷۱۹'۷۱۷'	ام قرقہ	۲۲۳'۲۲۲'	اسعد بن زرارة ابوالمہدی
ام کلثوم بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم		۲۸۶'۲۸۴'۲۲۹'۲۲۶'۲۲۵'	
۳۶۳'۱۰۸'۱۰۷'		۶۷'۶۶'۶۵'۵۰'	اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام
ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط		۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۷۰'۷۰'۷۰'	
۷۷۹'۷۷۳'۷۷۲'۷۷۱'۷۷۰'		۸۳۱'۸۲۵'۸۲۴'۸۲۳'۸۲۲'۸۲۱'۸۲۰'	
۵۶۳'	ام مطح	۳۱	اسماعیل بن عمر ابن کثیر ملا الدین
۵۳۰'	ام بانی رضی اللہ عنہا	۲۹۰'۲۸۵'۲۳۶'۱۲۵'	اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ
۷۲۰'	امام مسلم	۱۳۵'	اسود بن مطلب
۱۰۸'	امامہ بنت ابی العاص	۳۷۰'۱۳۵'	اسود بن عبد غوث
۶۷۳'	امامہ بنت زینب والی العاص	۶۰'	اسود بن مطلب
۵۸'۳'	امرء القیس	۱۵'	اسود بن یزید
۵۳۳'	امیرہ بنت عبد المطلب	۲۳۰'۲۲۹'۲۲۵'	اسید بن خضیر رئیس لوس
۷۳'۶۲'۴'	امیہ بن ابی الصلت	۷۲۲'۵۶۵'۵۶۴'۵۶۳'۵۶۲'۵۶۱'۵۶۰'	
۱۶۵'۱۶۰'۱۳۰'۱۳۵'۱۲۲'۱۵'	امیہ بن خلف	۷۳۱'۷۳۰'۷۲۹'۷۲۸'	اسیر بن رزام
۳۷۲'۳۶۳'۳۵۶'۳۵۰'۲۹۷'۲۸۲'۲۸۱'		۵۹۳'	اشج
۸۶'	امیہ بن عبد شمس	۳۶۷'	اشرف
۲۸'	اتسالی احمد بن شعیب	۷۰۸'۱۸۸'	اشعر
۲۶۳'۲۰۳'۲۰۱'۹۶'	انس بن مالک رضی اللہ عنہ	۷۱۵'	اصغ بن عمر کلیبی
۳۰۵'۳۹۳'۲۷۶'۲۶۸'۲۶۸'		۷۵۱'۹۳'۹۱'	احباب الفیل
۸۲۷'۷۲۷'۷۲۶'۶۳۵'۵۱۸'۵۰۹'		۸۲۷'۸۲۶'۸۲۵'۸۲۴'	احمد



جلال بن رباح رضی اللہ عنہ ۳۵'۱۲۳  
 ۳۶۹'۳۶۳'۲۸۲'۲۷۲'۲۷۱'۱۳۰  
 ۷۳ ۷۵۶'۷۵۵  
 ۷۳ ۵۹۸  
 ۵۹۸  
 ۵۵ بنو بکر بن وائل  
 ۲۲۳ بنو بلی  
 ۳۶۷ بنو بنیان  
 ۵۵ بنو تغلب بن وائل  
 ۱۲۳'۱۰۵'۸۵'۵۵'۵۴ بنو تميم  
 ۶۸۰'۶۶۸'۳۶۳'۲۳۱ بنو عجلہ  
 ۷۸۱ بنو حنیفہ  
 ۱۳۵'۱۲۳'۸۵ بنو جذام  
 ۵۱۵'۲۳۰ بنو حجاج  
 ۲۸۷'۲۳۲ بنو حارث  
 ۲۲۲ بنو حارثہ  
 ۲۱۸ بنی حرام  
 ۳۲۹'۳۲۸'۳۲۷ بنو حضارمہ  
 ۶۶۳'۲۱۸'۲۷ بنو حمزہ  
 ۵۵۷'۵۰۵ بنو حنیفہ  
 ۱۲۳ بنو خزاعہ  
 ۶۷'۱۰۵'۸۵ بنو خلج  
 ۶۶'۵۷۴'۵۱۴'۵۱۳'۱۳۹'۱۳۳'۱۲۳ بنو غسان  
 ۷۹'۷۲ بنو اسامہ  
 ۵۷۴ بنو اسامہ  
 ۱۲۳'۱۰۵'۱۰۰'۸۷'۸۵'۸۴ بنو اسامہ  
 ۷۶۰'۶۲۳'۶۳۶'۶۳۵'۱۳۹'۱۳۵'۱۳۳'۱۲۳ بنو اسامہ

انس بن نصر انصاری ۳۹۵  
 اوس ۶۱'۳۸'۳۷  
 ۲۲۵'۲۲۳'۲۲۳'۲۲۱'۲۲۰  
 ۲۴۳'۲۴۳'۲۵۴'۲۳۳'۲۳۲'۲۲۹'۲۲۸'۲۲۶  
 ۳۰۱'۲۸'۲۸۰'۲۷۹'۲۷۸'۲۷۷'۲۷۵'۲۶۳  
 ۳۸۶'۳۸۵'۳۶۹'۳۶۰'۳۵۷'۳۵۵'۳۵۳'۳۰۲  
 ۶۰۰'۵۹۹'۵۹۵'۵۸۳'۵۶۵'۵۶۰'۵۲۳'۳۸۸  
 ۶۸۸'۶۱۳'۶۰۱  
 اوس بن ثابت ۲۷۷  
 ایاس ۲۲۱

## ب-پ-ت-ث

بازان (گورنر یمن) ۸۱۶  
 باز ظہین ۷۹۹  
 باعور ۷۳  
 بانویہ ۸۱۶  
 بخاری امام محمد بن اسماعیل ۵۲۵'۳۹۳'۳۸'۳۲'۲۷  
 بکیر اراہب ۱۰۳'۱۰۰  
 بدیل بن ورقا ۷۵۹'۷۵۶'۷۵۵  
 براء بن عازب رضی اللہ عنہ ۷۲۲'۳۸۷'۲۶۳  
 البراء بن معرور ۲۳۰'۲۲۸  
 برثن مسر ۳۶  
 برہ بنت حارث نیز دیکھئے جویریہ ۵۷۰  
 بریدہ رضی اللہ عنہ ۳۱۰  
 بریدہ حبیب رضی اللہ عنہ ۵۵۷  
 بریرہ ۵۶۳  
 بزار ۲۹  
 بسر بن سفیان ۷۵۰  
 بسوس ۵۲'۵۵  
 بسیس رضی اللہ عنہ ۳۵۳  
 بشیر احمد مرزا عرض حال

٢٨٢'١٨٨'١٣٠	بنو غفار	٢٢٩	بنو الدليل
٥٤٢'٢١٨	بنو فزار	٢٢١'٢٢٩'٢٢٢	بنو زريق
٤٢٠'٤١٤'٤١٩'٦٨٢		١٢٢'١٠٥'٩١	بنو زهراء
٢٣٢'٤٤'٦٤'٢٨'٢٤'٢٦	بنو قحطان	٤٤٥'٢٥١'٢٢٢'٢٢١'١٢٢	
٢٣٢'٢٣٢'٢٢٠	بنو قريظة	٢٣٠	بنو ساعدة
٥٨٦'٥٨٥'٥٨٢'٥٢٨'٥٢٦'٥٢٥'٢٥٤'٢٤٨		٢٢٦'٢٢٢	بنو سالم بن عوف
٥٩٩'٥٩٨'٥٩٤'٥٩١'٥٩٥'٥٩٢'٥٩٣'٥٩٢		٥٤٢'٩٥'٩٢	بنو سعد
٦٠٤'٦٠٦'٦٠٥'٦٠٣'٦٠٣'٦٠٢'٦٠١'٦٠٠		٤٢١	بنو سعد بن بكر
٤٢١'٦٨٨'٧٣٠'٧١٣'٧١١'٧١٠'٦٠٩'٦٠٨		٢٨٤'٢٢١'٢٢٠'٢٢٢	بنو سلمة
٢٦٣'٢٣٢'٢٢٠	بنو قينقاع	٢٦٣'٢٦٣'٢٥٢'٢٥٢'٢١٨	بنو سليم
٢٧٢'٢٦٠'٢٥٩'٢٥٨'٢٥٤'٢٢٩'٢٤٨		٦٦٩'٥٨١'٥١٤'٢٨٢'٢٤٢'٢٦١'٢٦٥	
٦٠٩'٦٠٨'٦٠٤'٦٠٦'٦٠٠'٥٢٢'٢٦١'٢٦٣		٨٥	بنو سم
٢١٨'٧	بنو كلب	٦٨١	بنو نسيب
١٦٦'١٠٢'٧'٢٦	بنو كنانة	٥١٨'٥١٤'٢١٨	بنو عامر بن صعصعة
٤٥٨'٦٦٢'٢٥١'٢٥٠'٢٢٤'٢٢١		٥٢٥'٥٢٢'٥٢٢	
٢١٨	بنو كندة	٧٣٦'٧٣٥	بنو عباس
٥١٢'٥١٢'٢١٦	بنو ليثان	٢٢٥'٢٢٢	بنو عبد الأشثل
٦٤٥'٦٤٢'٥٢١'٥١٩'٥١٢		٤٢٢'٢٢٠'٢٢٩'٢٢٦	
٩٤'٩١'٨٤	بنو نجار	٢٢٢'١٣٥'١٢٩'٨٢	بنو عبد الدار
٢٨٦'٢٦٤'٢٦١'٢٢٩'٢٢٢'٢٢٢		١٢٥'٨٨'٨٤	بنو عبد الشمس
٢٨٩'٢٤٨'٢٦٣'٢٦٢'٢٢٠	بنو نضير	١٢٨	بنو عبد المطلب
٥٢٤'٥٢٥'٥٢٢'٥٢٢'٥٢٢'٢٦٤'٢٥٤'٢٥٢		٢٢٥'٢١٨'١٥٤'١٢٢	بنو عبد مناف
٦٠٢'٦٠٢'٥٩٤'٥٩١'٥٩٣'٥٨٢'٥٤٣'٥٢٨		٢١٨	بنو عيس
٦٥٥'٦٥١'٧٠'٦٠٩'٦٠٨'٦٠٦		٢٥١'١٥٩'١٣٠'١٢٩'١٢٢'٨٥	بنو عدي
٢٢٢'١٣٢'١٠٥'٩٩'٨٨'٨٤'٨٢	بنو نفل	٢١٨	بنو عذرة
٢٦٣'٢١٨	بنو محارب	٢٢٢	بنو عمرو بن عوف
٢٢٩'٢٢١	بنو مدحج	٢٣٠	بنو عوف
٥٤٢'٢١٨	بنو مره	٢١٨	بنو عيسان
١٢١'١٢٠'١٢٥'١٢٢'١٢٢'٨٥	بنو مخزوم	٢٢٣'٢٥٢'٢٥٢	بنو قحطان
٥٤١'٥٤٠'٥٥٩'٥٥٨'٥٥٤	بنو مطلق	٢٨٢'٢٤٢'٢٦٦'٢٦٥'٢٦٣	
١٠٥'٨٨	بنو مطلب	٥٩٢'٥٩٣'٥٩٢'٥٩١'٥٨٩'٥١٤	



۳۵	حمیر قبیله	۳۲۱'۸۰'۷۱	حجاج بن یوسف
۲۸۸'۲۷۵	منظله بن ابی عامر	۵۹۵'۵۹۳'۳۹۳'۳۵۸'۲۷۷	حذیفه بن یمان
۷۱۲	خور	۵۱۸	حرام بن ملحان
۵۲۸'۳۵۳'۱۷۰	حمی بن اخطب	۱۳۳'۸۸	حرب بن امیه
۷۲۱'۶۰۵'۶۰۳'۶۰۲'۵۹۷'۵۹۳'۵۸۳'۵۷۳		۵۵۷	حراث بن ابی ضرار
۷۳۹	خارجہ بن حیل	۱۵۱'۱۲۱'۳	حسان بن ثابت
۲۷۷	خارجہ بن زید	۸۲۱'۵۹'۵۹۰'۵۶۸'۵۶۷'۱۸۳	
۳۰۳'۳۷۰'۲۸۱'۲۸۲'۳۵	خالد بن ولید	۳۲۱'۳۰۳	حسن بصری
۸۲۸'۷۵۰'۵۸۸'۵۸۷'۳۹۷'۳۹۱'۳۸۸'۳۸۲		۳۵	حسن بن احمد بن یعقوب الحمدانی ابو محمد
۱۲۵	خباب بن الارت	۳۸۰'۱۰۸	حسن بن علی رضی اللہ عنہ
۵۳۳'۲۳۹'۱۵۸'۱۵۷'۱۳۳'۱۳۱		۶۳۹'۶۳۸'۵۲۸'۳۸۱	
۵۱۵'۵۱۳	حسب بن عدی رضی اللہ عنہ	۳۱	حسین بن محمد بن حسن دیار بکری
خدیجہ بنت خویلد ام المومنین / خدیجہ الکبریٰ		۱۰۵	حسین بن علی بن ابی طالب
۱۱۸'۱۱۶'۱۱۳'۱۱۳'۱۱۰'۱۰۸'۱۰۷'۷۳		۶۳۳'۶۳۳'۶۳۷'۵۳۳'۵۲۹'۵۲۸'۱۰۸	
۱۷۱'۱۶۷'۱۳۳'۱۳۰'۱۲۵'۱۲۲'۱۲۱'۱۱۹		۲۷۳'۲۷۳	حسین بن سلام دیکھے عبد اللہ بن سلام
۳۵۵'۳۳۵'۳۲۳'۳۶۸'۱۷۶'۱۷۵'۱۷۳'۱۷۳		۱۹۷	حطیم
۶۷۳'۶۷۰'۵۵۳'۵۵۳		۳۸۰'۳۷۸'۳۷۷	حفصہ بنت عمر
۷۶۰'۷۵۹	خراش بن امیہ	۱۳۹'۱۳۵	حکم بن ابی العاص
۷۵۹'۷۵۵'۷۵۰'۸۶'۸۳'۷۹'۷۸'۷۷	خزاعہ	۳۳۳	حکم بن کیان رضی اللہ عنہ
۲۲۱'۲۲۰'۸۷'۷۱'۳۸'۳۷	خزرج	۳۹۷'۳۵۹'۳۵۶'۱۶۷'۱۱۳'۱۱۰	حکیم بن حزام
۲۳۱'۲۳۰'۲۲۹'۲۲۸'۲۲۷'۲۲۵'۲۲۳'۲۲۳		۷۲۰	حلی علامہ
۲۷۵'۲۶۸'۲۶۳'۲۶۳'۲۶۲'۲۵۲'۲۳۳'۲۳۲		۷۵۸	حلیس بن علقمہ
۳۵۳'۳۵۲'۳۰۲'۳۰۱'۲۸۰'۲۷۹'۲۷۸'۲۷۷		۷۸	حلیل بن حبشہ خزاعی
۷۲۲'۶۰۰'۵۸۳'۵۶۵'۵۴۱'۳۸۶'۳۶۰'۳۵۷		۵۶'۵۵	حلیلہ بنت مرہ
۸۱۸'۸۱۷'۸۱۶'۸۱۳'۸۱۳	خسرو پرویز بن هرمز	۹۷'۹۵'۹۳	حلیہ
۲۹	خطیب بغدادی	۶۶۹	حلیہ (مزی)
۵۹۸	خلاد	۹۳'۹۱'۵۷	حزہ بن عبد المطلب
۵۹'۳	خضاء عرب شاعر	۱۶۰'۱۵۷'۱۵۶'۱۵۵'۳۵'۹۹	
۳۷۸'۳۷۷	خنس بن حذافہ	۳۹۰'۳۸۹'۳۶۲'۳۶۰'۳۲۹'۱۶۶	
۳۳۲'۳۲۳'۱۷۶	خولہ بنت حکیم	۵۰۹'۵۰۳'۵۰۰'۳۹۸'۳۹۳'۳۹۲	
۱۰۷	خویلد بن اسد	۵۶۷	حنہ بنت عکش

زبیر بن العوام  
 ۱۳۶'۱۳۹'۱۴۳'۶  
 ۴۹۰'۴۸۹'۴۶۲'۴۵۵'۴۸۵'۴۴۴'۱۵۴  
 ۵۸۷'۵۸۴'۵۳۲'۵۰۰'۴۹۹'۴۹۶'۴۹۵  
 ۶۵۷  
 زرشت  
 ۱۵۱'۳۹  
 زر قانی ملازم  
 ۸۳۰'۷۴۴'۷۲۰'۵۵۲'۴۴۸'۴۲۵  
 ۴۵۶'۶۸  
 زمرہ بن اسود  
 ۴۰  
 زبیر رضی اللہ عنہ  
 ۵۶۰  
 زبیر بن ارقم  
 ۴۷۶'۴۶۹'۴۴۸'۷۶  
 زبیر بن ثابت رضی اللہ عنہ  
 ۵۳۳'۵۴۲'۵۳۱  
 زبیر بن ثابت انصاری  
 ۱۴۹  
 زبیر بن الخطاب  
 ۵۶'۵۴  
 زبیر بن دثنہ رضی اللہ عنہ  
 ۱۴۲'۱۴۱'۱۳۱'۱۱۰'۹۹  
 زبیر بن حارثہ  
 ۴۰۳'۴۹۹'۴۹۸'۴۶۷'۴۳۰'۴۹۱'۴۶۹'۴۱۷  
 ۵۵۱'۵۵۰'۵۴۵'۵۴۴'۵۴۳'۴۴۶'۴۴۴'۴۴۱  
 ۶۸۳'۶۸۲'۶۸۱'۶۸۰'۶۷۰'۶۶۹'۵۵۸  
 ۷۲۰'۷۱۹'۷۱۷'۶۹۳'۶۹۰  
 زبیر بن عمرو بن نفیل  
 ۱۴۳'۱۱۳'۶۲  
 زین الدین عبد الرحیم بن الحسن العراقی  
 ۱۴  
 زینب رضی اللہ عنہا  
 ۵۵۶'۵۵۵'۵۵۴'۵۵۱  
 زینب دیکھے ام رمان  
 ۸۴۲  
 زینب بنت جحش ام المومنین  
 ۴۴۱'۴۹۹'۱۴۳  
 ۵۴۶'۵۴۵'۵۴۴'۵۴۳'۴۴۲  
 ۶۹۴'۵۶۷'۵۶۶'۵۵۰'۵۴۹'۵۴۷  
 زینب بنت خزیمہ  
 ۵۲۸  
 زینب بنت رسول اللہ ﷺ  
 ۱۰۸'۱۰۷  
 ۶۷۳'۶۷۱'۶۷۰'۴۶۸'۴۶۶'۱۷۳  
 زہری امام  
 ۷۲۶'۵۴۴'۵۴۵'۵۴۴'۳۲  
 زہیر  
 ۴  
 زہیر بن ابی امیہ  
 ۶۷۷

۲۶	دار قطنی امام
۴۴۵'۱۷۵'۶۵	داؤد علیہ السلام
۷۵	دو شلوم مفسر تورات
۶۸۱	دحیه بن خلیفہ الکلبی
۸۲۹'۸۱۰'۸۰۹'۸۰۳'۸۰۲'۶۸۲	
۴۶۳	دعشور بن حارث
۳۷۳	دوانی
۱۸۹'۱۸۸	دوس
۵۲۱'۵۱۹'۵۱۸'۵۱۷	ذکوان
۲۲۳	ذکوان بن عبد قیس
۶۱	ذوالکلاع
۳۹۷	ذوالکلاع الحمیری
۱۵۳'۱۵۰	رازی فخر الدین
۴۸۶	رافع بن خدیج
۲۳۱'۲۳۳'۲۳۲	رافع بن مالک
۵۳'۱۷۵	رام چندری
۶۲	ربیع
۵۲۱'۵۱۹'۵۱۸'۵۱۷	رعل
۶۰۳	رفقہ
۶۸۲'۶۸۱	رفاعہ بن زید
۶۱۳	رفیدہ رضی اللہ عنہا
۶۱۲	رقم
۱۰۷	رقیہ بنت محمد رسول اللہ ﷺ
۴۶۳'۴۶۳'۳۶۷'۳۵۳'۳۶۶'۱۰۸	
۱۳۵	رکنہ بن یزید
	رملہ دیکھے ام حبیبہ ام المومنین
۱۳۳	زبیر بن ابواسمہ
۶۰۳'۶۰۳	زبیر بن باطیا
۱۰۳'۹۹	زبیر بن عبد المطلب



۳۵۳'۳۵۰'۲۷۷'۱۵۷'۱۳۹'۱۲۵

۵۱۵

سعید بن عامر

۲۹

سعید بن منصور

۵۱۳'۵۱۲

سفیان بن خالد

۵۷۲

سفیان بن عبد شمس

۱۷۶

سکران بن عمرو

۷۲۱'۵۷۲'۵۲۸

سلام بن ابی الحقیق ابورافع

۵۲۳'۳۵۳'۳۵۳

سلام بن شکم

۲۹

سلطان بن احمد طبرانی

۷۲۳

سلمه بن اسلم

۷۲۰'۷۶

سلمه بن اکوع

۵۱۱

سلمه بن خلیل

۸۷

سلطی زوجہ ہاشم

۲۶۶

سلطی والدہ عبد المطلب

۳۹۶'۳۹۵

سلیمان رضی اللہ عنہ

۵۷۵'۵۷۲'۲۷۷'۲۷۵'۲۷۳

سلیمان فارسی

۵۷۲'۵۷۳'۲۷۷

سلیم

۳۳۵'۱۷۵'۶۵

سلیمان علیہ السلام

۲۷

سلیمان بن اشعث ابوداؤد

۸۳۰

سلیط بن عمرو قرشی رضی اللہ عنہ

۲۸۶

سمرة بن جندب

۵۸

سموکل بن عادیہ

۱۳۱'۱۳۰

سمیدہ رضی اللہ عنہ

۵۵۹

سنان

۶۱

سواع

سوثر۔ اے مصف

TEXT • CANON OF NEW

۱۶۳

TESTAMENT

۱۷۶'۱۷۵

سودہ بنت زمعہ ام المؤمنین

۵۵۳'۳۳۳'۳۵۸'۲۷۱'۱۷۸'۱۷۷

۲۲۱

سوید بن صامت

۳۹۶

زیاد بن سکن  
س۔ ش۔ ص۔ ض

۷۵'۷۴'۶۶'۶۵

سارہ

۸۱۳

ساسان

۳۳۸

سالم بن عبد اللہ

۳۳۸

سالم بن عمرو

۳۳۸'۳۳۶

سالم بن عمیر

۳۰۳'۳۹۹

سالم بن معقل مولیٰ ابی حذیفہ

۳۲۹'۱۰۶

سائب بن عثمان بن مظعون

۳۷

سبا

۱۳۲

سیر نکر

۷۰۳

شالن مارشل

۲۳۹

سراقہ بن مالک بن جشم

۳۵۹'۳۵۱'۳۰۰'۲۳۲'۲۳۱

۵۶'۵۵

سعد

۱۲۷'۱۲۳

سعد بن ابی وقاص

۳۵۵'۳۵۳'۳۳۳'۳۳۱'۳۲۹'۲۸۲'۲۸۱

۷۶۹'۳۹۹'۳۹۶'۳۹۵'۳۹۳'۳۱۸'۳۷۳

۲۳۲

سعد بن خیشم

سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ رئیس انصار

۵۰۸'۵۰۷'۵۰۱'۵۰۰'۲۷۶'۲۳۱

۲۶۸'۲۵۳'۲۳۳

سعد بن عبادہ رئیس خزرج

۵۳۲'۵۳۱'۳۸۶'۳۵۳'۳۵۲'۳۲۷

۵۹۰'۵۸۹'۵۸۸'۵۸۵'۵۸۳'۵۶۵

۲۲۹'۲۲۶'۲۲۵'۱۵۵

سعد بن معاذ رئیس اوس

۳۷۱'۳۵۷'۳۵۵'۳۵۰'۳۰۱'۲۸۱'۲۷۷'۲۵۳

۵۸۵'۵۸۳'۵۶۵'۵۰۳'۳۹۵'۲۸۶'۳۸۵'۳۶۹

۶۰۳'۶۰۱'۶۰۰'۵۹۹'۵۹۵'۵۹۰'۵۸۹'۵۸۸

۶۸۳'۶۸۳'۶۸۳'۶۸۳'۶۸۳'۶۰۶'۶۰۵'۶۰۳

۱۲۳'۶۲

سعید بن زید رضی اللہ عنہ

۱۳۰	صیب بن شان روی	۳۹۰	سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ
۳۹۶'۳۹۵'۳۶۹'۱۳۰'۱۳۱		۶۵۷'۶۵۶	سل بن صیف رضی اللہ عنہ
۲۵۳	ضاد بن حبلہ ازدی	۳۶۶'۳۵۶'۳۶۹	سہیل بن عمرو
۳۵۲'۳۵۰	صنعم	۷۷۶'۷۶۹'۷۶۶'۷۶۳'۷۶۳'۷۵۹'۳۶۹	
۵۳۰	طالب بن ابی طالب	۷۲۰'۲۲۸	سہیلی امام
۱۰۷	طاہر بن محمد	۵۶۲	سیتاجی
۷۳۳'۳۳	طبری ابو جعفر محمد بن جریر	۸۶۱'۸۲۰'۳۹۳	سیر بن (قبلیہ)
۲	طرفہ عرب شاعر	۳۸'۲۸	شافعی امام محمد بن ادریس
۲۸	مسم	۳۲۰'۳۲۹	شہلی نعمانی
۳۹۲'۳۵۶	طعمہ بن عدی	۸۷	شہبہ بن ہاشم دیکھے عبد المطلب
۲۵۳'۱۸۹'۱۸۸	طفیل بن عمرو الدوسی	۸۲۹	شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ
۳۹۶'۳۹۵'۳۹۱'۳۸۹'۳۸۸	طلحہ رضی اللہ عنہ	۵۳۲'۶	شرجیل بن حسنہ
۸۳	طلحہ بن ابی طلحہ	۲۶	شعبہ بن الحجاج
۲۵۸	طلحہ بن براء	۶۱	شعی رضی اللہ عنہ
۳۵۳'۳۵۰'۱۲۳	طلحہ بن عبید اللہ	۲۷	شعیب علیہ السلام
۵۷۳'۵۱۱	طلحہ بن خویلد	۳۸۰	شفاء بنت عبد اللہ
۶۱	طی	۱۸۳'۱۸۲'۱۶۰'۱۳۵	شہ بن ربیعہ
۱۰۷	طیب بن محمد	۳۷۲'۳۷۱'۳۶۳'۳۶۰'۳۵۶	شہین
		۳۸۶	شیر علی مولوی بے اے
		۳۲۰'۳۲۹	شیرویہ بن خسرو
		۸۷۷'۸۱۶	شیماء (حضرت طلحہ کی بیٹی)
		۹۳	شیماء بنت حارث رضی اللہ عنہ
		۹۷	صالح علیہ السلام
		۲۷	صفوان بن امیہ بن خلف
		۲۳۷'۱۳۰'۸۵	
		۵۶۱'۵۱۳'۳۸۳'۳۶۶'۳۷۵'۳۷۴	صفوان بن معطل
		۵۶۸'۵۶۳	صفیہ ام المومنین
		۸۲۱'۱۷۰	صفیہ بنت عبد المطلب
		۵۹۱'۵۰۰'۱۲۳	صواب
		۳۹۱	صور
		۶۱۲	

## ع-غ

۳۵۰	عاتکہ بنت عبد المطلب
۳۸'۲۷	عاد
۱۳۶'۱۳۵	عاص بن وائل
۲۸۶'۲۳۹'۱۸۵'۱۶۰'۱۵۹'۱۳۰	
۵۱۶'۵۱۳'۵۱۳	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
۳۵۳	عاصم بن عدی
۳۱۱	عاصم بن کلیب
۳۶۰	عامر حضرمی
۵۲۳'۵۱۹'۵۱۸	عامر بن طفیل
۵۲۰'۲۲۲'۲۲۰'۲۳۹'۱۳۰'۱۲۵	عامر بن فہیرہ
۳۹۶'۳۹۵	عائذ بن عمرو

عائشة رضي الله عنها بنت ابوبكر

٤٦٩'٤١٦'٤١٥'٤١٣'٤١٣'٦٣٦'٥٠٢	١٤٠'١٥٥'٣٣'١١٣'٤٩'٣٤'١٤'١٣'٨
٢٥ عبد الرحيم بن الحسين العراقي زين الدين	١٩٢'١٨٣'١٤٨'١٤٤'١٤٦'١٤٥'١٤٣'١٤٣
٢٩ عبد الرزاق	٣٩٥'٢٨٥'٢٤١'٢٦٦'٢٣٤'٢٣٦'٢٣٦'٢٢٩
٢٥ عبد الرؤوف المنلوي	٣٣٠'٣٢٩'٣٢٨'٣٢٤'٣٢٦'٣٢٥'٣٢٣'٣٢٣
٨٥ عبد العزيز	٥٢٤'٥٣٣'٥٣١'٣٩٣'٣٨٠'٣٤٨'٣٣٢'٣٣١
٢٦ عبد القتي بن عبد الواحد المقدسي	٥٦٨'٥٦٤'٥٦١'٥٦٥'٥٦٣'٥٦٢'٥٥٣'٥٥٠
٢٤٥'٢٦٣'٢٣٣ عبد الله بن ابي ابن سلول	٨٣٢'٨٣١'٧٣٠'٧٦'٥٤١
٥٠٦'٢٨٤'٢٨٥'٢٨٣'٢٧٦'٢٦٥'٢٠٠'٢٨٠	٤٥٠'٢٢٩
٥٦٣'٥٦٢'٥٦١'٥٦٠'٥٥٦'٥٥٣'٥٥٢'٥٢٦	عباد بن بشر
٢٦٩'٢٣٩	عباده بن صامت
١٠٦ عبد الله بن ابي الحساء رضي الله عنه	٦٣٢'٢٦٠'٢٣٠'٢٢٣
١١٢ عبد الله بن ابي قحافة ابوبكر رضي الله عنه	٣٨٣
٢٣٩ عبد الله بن ارسطو	عبادة بن الوليد
٢٦٣ عبد الله بن عثمان بن عفان	٢٢٨'٢٢٢
٤٥٠'٥٢٦'٢٨٦'٢٥٣'١٣٠ عبد الله بن ام مكتوم	عباس بن عباد بن فضال انصاري
٤٣١'٤٣٠'٥١٣'٥١٢ عبد الله بن انيس انصاري	١١٠'٩٩'٨٣
٢٩١'٢٨٤ عبد الله بن جهم	٢٣٦'٢٣٢'٢٢٨'١٣٠'١٢٥'١١
٥٢٨'٥٠٠'٢٣٢'٢٣١'٢٣٠'١٢٣ عبد الله بن شمس	٢٨٣'٢٩٤'٢٦٩'٢٦٨'٢٦٦'٢٦٥'٢٦٤
١٣١'١٠٥'٨٩ عبد الله بن جدعان قرشي تميمي	عباس بن فضال
٩٤'٩٥ عبد الله بن حارث (عليه كايثا)	٢٢٢
٩٣ عبد الله (حضرت عليه كايثا)	عبد البر
٨١٥'٨١٢ عبد الله بن حذافه سمعي	٢٢٨
٢٨٨'١٥٢ عبد الله بن ربيعة	٨٦'٨٥
٥٣٢ عبد الله بن سعد بن سرح	عبد الدار
٥٨٩'٢٤٣ عبد الله بن سلام (حصين بن سلام)	عبد شمس
٢٩٣ عبد الله بن شهاب	١٣٣'٨٦
٥١٢ عبد الله بن طارق	عبد قصي
٢٦٩'٢٣٠'٦ عبد الله بن رباح	٨٥
٤٣١'٤٣٠'٤٣٩'٤٣٨'٦٥٣'٥٣٢	عبد المطلب بن هاشم
٨٠'٤٩ عبد الله بن زهير	٩٠'٨٩'٨٨'٨٤'٤٨
٦٣٣'٦٣٢'٦٣'٤٢٨٥'١٠٥	٥٣٩'٢٦٦'٢٢٣'١٤٢'١٠٠'٩٩'٩٣'٩٢'٩١
	عبد المطلب (شيبه بن هاشم)
	٨٤
	عبد مناف
	٨٨'٨٦'٨٥
	عبد الرحمن بن ابي بكر
	٨٣٢
	عبد الرحمن بن ابي بكر جلال الدين السيوطي
	٣١
	عبد الرحمن بن ابي حاتم الرازي
	٢٦
	عبد الرحمن بن زهير بن باطيا
	٦٠٣
	عبد الرحمن بن عبد الله سبيلي
	٣٠
	عبد الرحمن بن عوف
	١٣٦'١٣٥'١٢٢
	٢٩٤'٢٦٣'٢٦٢'٢٩٨'٢٤٤'٢٤٦'٢٥٣

٦٣	عثمان بن حورث	٥٥١	عبد الله عامر اسلمى
٨٣	عثمان بن طلحة	٨٠٣'٥٣٢	عبد الله بن عباس
٢٣	عثمان بن عبد الرحمن ابو عمرو المعروف بابن الصراح	٢٩	عبد الله بن عبد الرحمن الدارى
١٢٢'١٠٨'٤٠٦	عثمان بن عفان رضى الله عنه	٥٦١'٥٢٩	عبد الله بن عبد الله ابى ابن سلول
٣٦٤'٣٥٣'٢٤٤'٢٣٠'١٣٦'١٣٩		٩٩'٩٢'٩١'٨٩'٤٢	عبد الله بن عبد المطلب
٥٣٢'٥٠٦'٥٠٥'٢٩٣'٣٤٤'٣٦٣'٣٦٣'٣٩٤		٤٢٥'٤٢٣'٤٢٢	عبد الله شيك انصارى
٤١٣'٦٦٨'٦٣٣'٦٣٨'٦٣٦'٦٣٥'٦٣٢'٥٣٣		٤١٣'٣٨٦'٣١٦'٣٩٤'١٥٩	عبد الله بن عمر
٤٩٨'٤٤٣'٤٦٩'٤٦٣'٤٦٢'٤٦١'٤٦٠		٢٣١	عبد الله بن عمرو
٣٦٣'٣٦٢'٣١٨'١٤٦'١٣٦'١٣٣	عثمان بن نفيعون	٢٠	عبد الله بن عمرو بن العاصى
٦٥٨'١٨٣	عمر اس	٣٩٦'٣٩٣'٣٩٣	عبد الله بن قننه
٥٠	عمران	٣٠٣	عبد الله بن مبارك
٣٥٣	عدي رضى الله عنه	٣٤٢'٢٦	عبد الله بن محمد ابو احمد المعروف بابن عدي
٣٦'٢١٦'٢٠٦'١٨٨	عرب	١٠٤	عبد الله بن محمد
٨٣١'٨٢٨'٨٢٤'٧١٤'٥٩٣'٣٥٠'٣٤٢'٢٣٣		٣٦٣'٢٥٣'١٦٩'١٣٩'١٢٣	عبد الله بن مسعود بن بلي
٣٣١	عروة بن زبير رضى الله عنه	٣٣	عبد الله بن مسلم بن قتيبة
٤٥٨'٤٥٤'٤٥١	عروة بن مسعود	٨٣٢	عبد الله بن منجزة
٤٢٣	عريضة	٣٣	عبد المالك بن هشام
٣٩٩'٢١٨'١٣٩'١٣٠'١١	عزى (بت)	٢٨٥'٤٩	عبد الملك بن مروان
٣٥١'٣٣٩'٣٣٨'٣٣٤'٣٣٦	عصماء	١٨٢	عبد ياريل ريس طائف
٥٢١'٥١٩	عصه	٨٢٤'١٢٣	عبيد الله بن جحش
٥١٣'٥١٣	عقل	٣٢٨'٣٢٣'١٢٣	عبيدة بن حارث مطلى
٣١٦'٣٠٣'٣٩٩	عطاء بن ابى رباح	٣٦٠	عبيدة بن مطلب
٦٠٣	عطية قرطى	٣٤٢'٣٦٣'٣٥٦'١٨٣'١٦٠'٥٤	عتبة
١٢٣	عتبة ابى محيط ريس قریش	١٠٨	عتبة بن ابى لب
٤٤٣'٣٤٢'٣٦٦'٣٥٦'١٤٢'١٣٣'١٣٥		٣٩٣	عتبة بن ابى وقاص
٥١٥	عتبة بن حارث	٤٤٥'٤٤٣	عتبة بن اسيد ثقفى ابو بصير
٢٢٣'٢٢٢	عتبة بن عامر	١٣٦'١٣٥'١٢٣	عتبة بن ربيعة
٥٣٠'٣٦٦'١١١	عتيل بن ابى طالب	٥٥٣'٣٤١'٣٥٩'٣٣٣'١٨٢'١٦٠	عتبة بن غزوان
٣٤١	عتيل (بن اسود)	٣٣٣'٣٣١'٣٢٨'٣٢٢	عتبان بن مالك انصارى
٢٩'٢٦	عتيلى حنظل	٢٤٤'٦	عثمان (برادر طلحة)

٢٤١'٢٣٩'٢٣٥'٢٣٢'٢٣٠'٢٢٢'١٤٠'١٢١	٦٦٤'٦٦١	عكاشة بن محسن
٣٦٩'٣٦٤'٣٦٣'٣٥٢'٣٢٠'٢٨٩'٢٤٤'٢٤٢	٣٣٣'٣٢٨'٣٢٣'٢٩٣	عكرمة بن أبي جهم
٣٥٥'٣٣٦'٣٠٢'٣٩٩'٣٩٣'٣٨٦'٣٤٥'٣٤٣	٤٥٩'٤٥٠'٥٩٣'٥٨٤'٥٨٦'٣٩'٢٨٨'٢٨٣	
٥٠٩'٢٩٨'٢٩٤'٢٩٥'٢٨٩'٢٨٥'٢٤٨'٢٤٤	٢٠٣	عكرمة مولى ابن عباس
٥٦٠'٥٥٩'٥٥٨'٥٣٣'٥٣٢'٥١٦'٥١٥'٥١٠	٤٣٣	عكل
٦٥٦'٦٥٥'٦٥٣'٦٥١'٦٣٦'٦٣٥'٦٣٣'٦٢٨	٣	علقمة بن شاعر
٤٦٩'٤٦٨'٤٦٤'٤٦٠'٤١٣'٦٨٩'٦٦٩'٦٦٨	٣	عقتره بن شاعر
٨٢٩'٨١٢'٨١١'٤٩٨'٤٩٦'٤٤٥'٤٤٣'٤٤٢	٢٢٣'٢٢٢	عوف بن حارث
١٠٤	٢٢٣	عويم بن ساعدة
٨٢٣'٤٣٣'٥٢٣'٥٢٢'٥٢٠'٥١٩	١١'١٠٨'٢١'٦	علي بن أبي طالب
٥٢٣	١٢٨'١٢٤'١٢٣'١٢٢'١٢١'١١٣	
٣٩٨	٣٥٥'٢٣٤'٢٣٣'٢٣٠'٢١٤'١٣٥'١٣١'١٣٠	
٤٨	٣٥٥'٣٠٥'٣٩٥'٣٨٣'٣٦٦'٣٦٢'٣٦١'٣٦٠	
٣٦٠'٣٥٩'٣٢٩'٣٢٤'٣٢٣'٣٢٢	٢٨٩'٢٨٨'٢٨٦'٢٨٠'٢٤٠'٢٣٦'٢٣١'٢٣٠	
٥٨٤'٢٨٣'٢٨٦'١٥٣'١٥٣'١٣٥	٥٣٠'٥٣٩'٥٣٢'٥٠٩'٢٩٩'٢٩٤'٢٩٣'٢٩٠	
٥٨٩'٥٨٨'٥٨٤	٦٤٣'٦٣٤'٥٩٤'٥٨٩'٥٨٨'٥٨٤'٥٨٦'٥٨٣	
٢٦٥'٤٨	٨٢٤'٤٦٥'٤٦٣'٤٢١'٤١٦'٤١٣'٦٨٢	
٥٨'٢	٢١'٢٣	علي بن بريهان الديلمي
٤٨	٥٣٣	علي بن حسين امام زين العابدين
٥٠٣	٣٥	علي بن حسين مسعودي ابو الحسن
١٥٨'١٣٥	٣٤	علي بن عبد الله بن جعفر المعروف بابن المدني
٥٨	٣٤'٢٩	علي بن محمد الدار قطني
٢٩٢	٢٦	علي بن محمد بن عبد الكريم المعروف بابن اثير
٣٠٣		علي بن محمد سلطان القاري المشهور ملا علي القاري
٢٢٨'٢٢٦	٢٥'١٢	مصنف موضوعات كبير
٣٤٦'٣٤٥'٣٤٣'٣٥٩	٣٦٩'٢٤٤'١٣١'١٣٠	عمار بن ياسر
٣٦٥	١٣٨	عمارة بن وليد
١٥٢'١٥٠	٢٦٢	عماليق
٢٠٠'١٩٤	٦٢'١٤'١٦'٤'٦	عمر بن الخطاب
٦٥٤'٥٦٢'٣٢٥'٢٥٢'٢٢٩'٢٠٣'٢٠٢'٢٠١	١٣١'١٢٩'١٢٥'١٢٣'١٢٢'١٢١'٨٥'٤٦	
٨٢٦'٨٢٥'٨٢٣'٨١٩'٨٠٢'٨٠٠'٤٩٥'٤١٠	١٦٠'١٥٩'١٥٨'١٥٤'١٥٦'١٣١'١٣٠'١٢٩	



۲۲۲'۲۲۱'۲۱۸'۲۱۷'۲۱۶'۱۸۹'۱۸۸'۱۸۱  
 ۲۲۱'۲۲۹'۲۲۸'۲۲۵'۲۲۴'۲۲۳'۲۲۲'۲۲۱  
 ۲۸۳'۲۸۱'۲۸۰'۲۷۹'۲۵۵'۲۵۴'۲۵۳'۲۴۲  
 ۲۰۰'۲۹۹'۲۹۸'۲۹۷'۲۹۵'۲۸۷'۲۸۵'۲۸۳  
 ۲۲۸'۲۲۷'۲۲۵'۲۲۴'۲۲۳'۲۱۵'۲۱۴'۲۰۱  
 ۲۴۲'۲۴۱'۲۳۹'۲۳۸'۲۳۷'۲۳۶'۲۳۵'۲۳۴  
 ۲۵۱'۲۵۰'۲۴۹'۲۴۷'۲۴۶'۲۴۵'۲۴۴'۲۴۳  
 ۲۷۰'۲۶۹'۲۶۸'۲۶۷'۲۶۶'۲۵۹'۲۵۸'۲۵۷'۲۵۶  
 ۲۵۸'۲۵۷'۲۵۶'۲۵۵'۲۵۴'۲۷۷'۲۷۶'۲۷۵'۲۷۴  
 ۲۸۳'۲۸۲'۲۸۱'۲۶۸'۲۶۷'۲۶۵'۲۶۴'۲۶۳  
 ۲۹۵'۲۹۴'۲۹۳'۲۹۲'۲۹۱'۲۸۹'۲۸۸'۲۸۷  
 ۵۰۶'۵۰۵'۵۰۴'۵۰۳'۴۹۹'۴۹۸'۴۹۷'۴۹۶  
 ۵۳۰'۵۲۹'۵۲۸'۵۱۷'۵۱۶'۵۱۵'۵۱۴'۵۱۳  
 ۵۸۹'۵۸۷'۵۷۴'۵۷۳'۵۵۸'۵۵۷'۵۵۶'۵۵۵  
 ۶۴۳'۶۴۲'۶۴۱'۶۰۷'۵۹۵'۵۹۴'۵۹۳'۵۹۲  
 ۶۷۰'۶۶۸'۶۶۷'۶۶۵'۶۶۴'۶۵۶'۶۵۷'۶۵۶  
 ۷۵۱'۷۵۰'۷۴۸'۷۴۷'۷۴۶'۷۴۵'۷۴۴'۷۴۳  
 ۷۶۷'۷۶۰'۷۵۹'۷۵۸'۷۵۷'۷۵۶'۷۵۵  
 ۷۷۳'۷۷۲'۷۷۱'۷۶۹'۷۶۸'۷۶۷'۷۶۶  
 ۷۸۶'۷۸۳'۷۸۰'۷۷۸'۷۷۷'۷۷۶'۷۷۵  
 '۸۳۱'۸۳۳'۸۰۳'۸۰۱'۷۹۲'۷۸۷  
 ۶۳  
 ۷۳۳'۷۲۵'۱۵۱  
 ۸۰'۷۸  
 ۸۳۶'۸۳۸'۸۶'۸۵'۸۳'۸۲  
 ۸۷  
 ۲۲۳'۲۲۲  
 ۶۵  
 ۷۷  
 ۶۵۷'۶۵۶  
 ۱۰۳

قیس بن سعد  
 قسطنطینی علامہ  
 قیس بن کلاب  
 فضیلہ بن ہاشم  
 قطبہ بن عامر  
 قطور ارحم حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 قیس  
 قیس بن سعد  
 قیس علان

عینی علامہ  
عینہ بن حصن فزاری  
غزالی امام  
غزنیہ  
غشمیر  
عطفاں  
غفار  
غلام احمد قادیانی بانی سلسلہ احمدیہ  
غیلان بن سلمہ شافعی

۳۳۵۱۵۰  
۵۷۳  
۱۷۱  
۵۸  
۳۳۸  
۷۳۹'۷۲۱'۵۷۳'۵۷۳'۳۷  
۱۲۵  
۷۵۳'۳۱۵  
۳۳۱

ف-ق

فاطمہ / فاطمہ الزہراء بنت محمد ﷺ  
فاطمہ بنت اسد  
فاطمہ بنت الخطاب  
فاطمہ بنت قیس  
قرات  
فرعون  
فطیون رئیس یہود مدینہ  
فہر بن مالک  
قارہ  
قاسم بن محمد  
قبط  
قرطاب  
قریش

۳۳۵'۳۵۷'۳۵۵'۱۷۳'۱۰۸'۱۰۷  
۶۸۹'۶۷۳'۵۲۸'۳۹۸'۳۸۱'۳۸۰'۳۶۳  
۵۳۰'۵۳۹  
۱۵۸'۱۵۷'۲۵  
۱۶  
۳۶۶'۱۹۸  
۶۳۳'۳۳۱'۳۶۰'۲۳۹  
۸۱۹'۸۰۳'۶۸۸'۶۳۳  
۵۹  
۱۳۳'۸۳'۸۲'۷۸  
۵۴۳'۵۱۳'۱۵۵  
۱۰۸'۱۰۷  
۸۲۱'۸۱۸  
۶۶۳  
۸۸'۸۷'۸۳'۸۲'۷۱'۶۹'۶۱'۵۰  
۸۳'۱۰۹'۱۰۸'۱۰۳'۱۰۰'۹۱'۹۰'۸۹  
۱۳۳'۱۳۳'۱۳۲'۱۳۱'۱۲۸'۱۲۶'۱۲۳'۱۱۵  
۱۳۷'۱۳۳'۱۳۳'۱۳۲'۱۳۱'۱۳۰'۱۲۸'۱۲۵  
۱۷۳'۱۷۲'۱۶۶'۱۶۵'۱۶۰'۱۵۳'۱۵۳'۱۲۸



[illegible]

۷۳۸'۶۲۹'۶۱۱'۷۱۸'۷۲۱'۷۳۵'۷۴۶

۸۸۳'۸۰۱'۷۸۳

۱۰۷

میسره

## ن-و

۷۷

ثابت بن اسماعیل

۳

ثابت بن یحیی

۳۰۳'۳۹۹

نافع مولى ابن عمر

۶

ثابت بن

۱۳۵

نسیه بن الحجاج

۳۳۹

نیولین

۲۸۰'۱۲۱'۱۵۳'۱۵۳'۱۳۶'۹۰

نجاشی

۸۲۸'۸۲۷'۸۲۶'۸۲۵'۸۲۳'۷۹۹'۷۵۸'۲۹۸

۳۸

نسائی امام

۶

نسرت

۵۶

نسطاس

۸۶'۱۱۵

النکسر بن حارث

۳۷۲'۳۶۷'۳۶۶'۳۵۶'۱۶۰'۱۳۵

۸۳'۸۲

نضر بن کنانه

۲۸

نعمان بن ثابت ابو حنیفه

۵۳۰'۵۲۹

نصیم

۵۹۳'۵۹۳'۵۹۱

نصیم بن مسعود

۳۰۶'۹

نکسن

۷۵۰

نمیه بن عبد الله

۶۵

نوح علیه السلام

۳۵۶

نوفل بن خولید

۵۸۷

نوفل بن عبد الله

۸۷'۸۶

نوفل بن عبد مناف

۳۰۵'۸

نولدرکی

۳۲۵'۱۵۰'۳۸

نودی امام

۱۹۸

نیل

۳۶۳'۲۲۳

مخاوی بن حارث

۱۲۳'۱۰۳

مخاویه بن ابوسفیان امیر مخاویه

۸۴۷'۶۳۳'۶۳۳'۶۳۸'۶۳۷'۱۳۱'۱۲۲

۶۰۶'۵۰۵

مخاویه بن مغیره

۵۰۵

معبد - رئیس خزانه

۳۳۷

معقل بن یسار

۷۵۷

مغیره بن شعبه

۳۵۳

مقداد بن اسود (مقداد بن عمرو)

۳۲۸'۳۲۳

مقداد بن عمرو

۷۹۹'۷۹۸'۷۹۷

مقوقس

۸۲۲'۸۲۱'۸۲۰'۸۱۹'۸۱۸'۸۱۷'۸۱۶

۷۶۳'۷۵۹'۷۵۸

مکرز بن حفص

۳۰۳

مکحول بن عبد الله

۱۲۹'۶

منات بن

۳۵

منیه بن الحجاج

۸۴۳

منذر بن سلوی

۵۱۹'۵۱۸'۲۳۲

منذر بن عمرو انصاری

۵۱۹

منذر بن محمد

۵۶

منذر ثالث ملک حیره

۸۱۰

منصور قلاوون

۱۹۹'۱۹۸'۱۹۷'۱۹۶'۱۹۵'۱۹۴'۱۹۳'۱۹۲'۱۹۱'۱۹۰'۱۸۹'۱۸۸'۱۸۷'۱۸۶'۱۸۵'۱۸۴'۱۸۳'۱۸۲'۱۸۱'۱۸۰'۱۷۹'۱۷۸'۱۷۷'۱۷۶'۱۷۵'۱۷۴'۱۷۳'۱۷۲'۱۷۱'۱۷۰'۱۶۹'۱۶۸'۱۶۷'۱۶۶'۱۶۵'۱۶۴'۱۶۳'۱۶۲'۱۶۱'۱۶۰'۱۵۹'۱۵۸'۱۵۷'۱۵۶'۱۵۵'۱۵۴'۱۵۳'۱۵۲'۱۵۱'۱۵۰'۱۴۹'۱۴۸'۱۴۷'۱۴۶'۱۴۵'۱۴۴'۱۴۳'۱۴۲'۱۴۱'۱۴۰'۱۳۹'۱۳۸'۱۳۷'۱۳۶'۱۳۵'۱۳۴'۱۳۳'۱۳۲'۱۳۱'۱۳۰'۱۲۹'۱۲۸'۱۲۷'۱۲۶'۱۲۵'۱۲۴'۱۲۳'۱۲۲'۱۲۱'۱۲۰'۱۱۹'۱۱۸'۱۱۷'۱۱۶'۱۱۵'۱۱۴'۱۱۳'۱۱۲'۱۱۱'۱۱۰'۱۰۹'۱۰۸'۱۰۷'۱۰۶'۱۰۵'۱۰۴'۱۰۳'۱۰۲'۱۰۱'۱۰۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰'۹۹'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'







# مقامات

## سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

۸۰۲	ایڈیسیا	۱	
۸۱۳'۵۷۳'۴۷۹'۳۷۴'۳۲۳'۶۶۲	ایران	۳۰۳	آسٹریلیا
۸۰۱	ایشیائے کوچک	۳۲۸'۹۸	ابو
۸۲۹'۸۰۹'۸۰۸'۸۰۳'۸۰۳'۸۰۲	ایلیا (بیت المقدس)	۳۰۵	ابی سینیا دیکھے جیش
ب-پ-ت		۳۹۳'۳۸۷'۳۸۶'۳۸۳'۳۱۳'۲۹۶'۲۶۱	احد
۷۵	بابل	۷۷۱'۵۸۳'۵۰۷'۵۰۶'۵۰۲'۵۰۱'۳۹۹'۳۹۸	
۲۶'۱۵۴'۵۳'۳۶'۳۳	بحر احمر	۳۸'۳۷	الاحقاف
۵۳'۳۳	بحر ہند	عرض حال	احمد نگر (ضلع جھنگ)
۷۹۹'۷۰۲'۱۰۶'۵۳'۵۳'۳۷۷'۳۶	بحرین	۷۹۸	ارلیس (اسم ہنر)
۸۱۳'۸۱۳'۸۰۳		۲۲۳	اسرائیل
۷۷۶'۱۳۶	بحیرہ احمر	۸۱۹'۸۱۸	اسکندریہ
۳۳۰'۲۹۶'۵۳	بدر	۷۹۹'۳۰۳'۱۵۴'۱۳۶'۸۹	افریقہ
'۳۵۴'۳۵۱'۳۴۷'۳۴۵'۳۴۴'۳۴۳'۳۴۲'۳۴۱'۳۴۰		۸۲۲	افریقہ براعظم
۳۷۳'۳۷۲'۳۷۱'۳۶۷'۳۶۵'۳۶۰'۳۵۵'۳۵۳		۱۵۴'۱۳۶	اکسوم AXSUM
۸۱۱'۸۰۱'۵۳۰'۵۲۹'۵۰۶'۳۵۳'۳۵۲'۳۷۷		۳۹۰	ایڈ
۱۵۵	برک الغماد	۳۰۵'۳۰۳'۳۰۲'۳۰۱'۳۰۰'۲۱۳'۲۰۶	امریکہ
۲۶۹	بصرہ (عراق)	۷۰۰'۶۷۷'۵۱۱	
۸۰۳'۸۰۳'۸۰۲'۱۰۰	بصری (شام)	۱۷۰	امریکہ (جنوبی)
۳۰۰'۷۶'۶۸'۶۷'۶۶	بکہ وادی	۳۲۹'۳۰۶	انگلستان
۳۲۹	بواط		ایتھوپیا دیکھے جیش

١٨٣'١٧٩	حراء كود (جبل)	٢٣٣'٢٣٢	بئر معونه
٣٤	الحساء	٥٢٥'٥٢٣'٥٢٢'٥٢١'٥٢٠'٥١٨'٥١٤	
٦٨٢'٦٨١	حصى	٢٠٦'٢٠٥'٢٠١'٢٠٠'١٩٣'١٩٣'١٩١'١٩٠	بيت المقدس
١٣٥'٥٣'٣٤	حضرت موت	٨٢٩'٨٠٢'٨٠٢'٤٣٨'٣٣٥'٣٣٣'٢٤٠'٢٠٤	
٥٠٥'٥٠٣	حمرء الاسد	عرض حال	پاکستان
٨٠٩'٨٠٨'٨٠٣'٨٠٢	محس	٤١٥	تبوک
٣٥٤	حشین	٣٦	تنامه
٤٠	حويلة	٢٤٣'٣٣'٣٤	جنا
٥٦'٣٨	حیره	٣٢٨	ثنية المرة
٣٣٠	خراء	ج-ج-ج-ج-خ	
٣٣	خليج عمان		
٣٤'٣٣	خليج فارس	٣٣	جبل السراة
٦٥٣'٦٥١'٥٤٣'٥٢٨'٣٦٩'١٤٠'٦٣'٣٤	خيبر	٣٥١	محفه
٨٢٤'٨٨٣'٤٣١'٤٣٠'٤٣٨'٤٢١'٤١٦'٦٨٣		٣٦	جده
و-و-ر-ز		٣٠٥	جرمني
٤١٥'٤١٣'٥٣١'٥٣٠'٦١'٥٣	دومة الجندل	٦٦٩	جوم
٤٤٥'٤٥٠	ذو الحليفة	٣٨	جوف
٦٦٨	ذو القصة	١٤٠	جونس برگ
٢١٨'٢١٤'١٨١	ذو الحجاز	عرض حال	چينوٹ
٣٦٣	ذی امر	٨٢٨	چین
٨٢٨	راس کماري (بھارت)	١٢٦'١٥٣'١٥٢'١٣٤'١٣٦'١٢٣'٨٩'٣٦	جيشه
٣٣	الربيع الخالي	٢٥٣'١٨٨'٢٨٠'٢٩٨'٣٠٩'٥٣١'٤٩٩'٨٢٣	
٦٤٣'٥٢٢'٥٢٠'٥١٤'٥١٣'٥١٣	رجيع	٨٢٨'٨٢٤'٨٢٦'٨٢٥	
٥٠٥'٣٥٣	روحاء	٣٧١'٤٠'٦٩'٦٦'٥٣'٥٣'٥٠'٣٨'٣٦'٣٥	حجاز
٤٠٣	روس	٤٢٣'٤١٦'٥٤٣'٥٥٤'٥٣٠'٥٢٨'٣٦٥'٣٢١	
٣٤٩'٣٤٤'٣١٢'٢١٦	روم	٨٢٩'٨١١'٤٤٦	
٨١٠'٨٠٨'٨٠٣'٨٠١'٨٠٠'٤٩٩	روبا	٢٣٣'٣٤	حجر
٨٠٩'٨٠٣	روسيه	١٤٣'٩٨	حجون
٦٠٥'٦٠٣	ريحانة	٤٥١'٤٥٠'٢٩٦'٢٩٥	حدیبیہ
٣٥٣'١٩٤'٨٩'٨٨'٨٣'٦٤	زمرم	٤٤٢'٤٤١'٤٤٠'٤٦٦'٤٥٩'٤٥٨'٤٥٥	
		٨٣١'٨٠٣'٤٩٩'٤٩٤'٤٩٣'٤٨٩'٤٨٨'٤٤٦	

## س-ش

۸۱۳'۸۰۹'۸۰۷'۷۹۹'۷۹۳'۷۸۷'۷۸۱'۷۷۵

۸۲۰'۸۱۶'۸۱۳

۷۹۶

عرفہ

۵۱۲

عرنہ

۵۳

عریض

۷۷۰'۷۵۰'۷۴۵'۵۱۳

عشقان

۳۲۹

عشیرہ

۲۲۳'۲۲۳

عقبہ

۲۱۷'۱۸۱'۶۳'۵۳

عکاظ

۵۳'۴۷'۴۳

عمان

۶۷۰'۳۲۹

میس

۳۰۰'۲۹۸'۲۳۹'۲۳۸'۲۳۷'۲۳۶

غار ثور

۲۵۱'۱۱۹'۱۱۷'۱۱۲

غار حراء

۶۷۵

غران (واوی)

۶۶۶

غمر (چشمہ)

۸۲۹'۸۲۸'۸۰۳'۸۰۳'۸۰۲'۷۹۹'۲۶۳'۲۳۸

غسان

## ف-ق-ک-ل

۷۰'۶۹

فاران

۲۷۳'۲۱۷'۲۱۶'۹۳'۴۷

فارس نیز دیکھئے ایران

۸۱۵'۸۰۳'۸۰۱'۸۰۰'۷۹۹'۸۱۳'۸۱۳'۵۷۷'۳۷۷

۷۶

فدک

۶۵

فلسطين

۶۵۶

قلادیہ

۳۳۹

قلایان

۳۸۳'۳۵۳'۲۸۶'۲۶۹'۲۶۶'۲۶۵

قباہ

۳۶۶

قرہ

۷۳۰

قرقرہ

۳۵۳'۳۵۳

قرقرہ الکدر

۷۱۷

قرقئ واوی / واوی القرقئ

۸۲۲'۸۱۳'۸۰۱'۷۹۹

قسطانیہ

۸۲۸

سین

۳۳۰

سلوان

۵۸۳

سلج (پھاڑی)

۳۲۹

سج

۷۷۷'۷۷۶'۳۲۹

سیف البحر

۱۰۶'۱۰۰'۹۱'۸۷'۸۶'۵۳'۵۳'۴۶'۴۳

شام

۱۸۸'۱۸۷'۱۸۳'۱۷۱'۱۳۵'۱۲۳'۱۲۳'۱۰۷

۳۳۳'۳۳۹'۳۳۹'۳۲۳'۲۷۵'۲۷۵'۲۶۱'۲۶۱

۶۵۵'۶۵۳'۶۵۱'۵۷۷'۵۳۱'۵۳۰'۵۲۸'۴۶۵

۸۰۱'۷۷۹'۷۷۷'۷۱۵'۶۸۲'۶۸۱'۶۷۰'۶۵۶

۸۲۰'۸۰۳'۸۰۲

۳۶۶'۱۸۱'۱۷۱'۱۶۸'۱۶۶'۸۸

شعب الی طالب

۹۳

شعیب بنی ہاشم

۱۳۷

شعیب (بندر گاہ بحر احمر)

۷۰

شور

## ص-ض-ط

۶۷'۶۶

صفا

۵۷۷'۱۳۵'۵۳'۴۷

صحاء (شام)

۶۶۲

ضریہ

۱۸۳'۱۸۲'۱۸۱'۱۳۳'۱۰۴'۹۱'۵۳'۴۵'۴۴'۴۳

طائف

۲۹۰'۲۷۵'۲۵۲'۲۲۳'۲۲۲'۲۱۸'۲۱۷'۱۸۲

۶۵۸'۳۶۶'۳۳۱'۳۲۳'۲۹۸

۶۸۰

طرف

## ع-غ

۱۳۶

عدوا ADOWA

۳۶۶'۳۷۳'۳۳۱'۱۸۳'۱۷۱'۱۲۳'۶۵'۴۳

عراق

۲۱۸'۱۰۳'۶۸'۶۶'۶۵'۵۰'۴۷'۴۵'۴۴'۴۳

عرب

۷۱۳'۶۶۲'۶۶۱'۶۳۹'۶۳۱'۴۲۹'۳۷۹'۳۲۳









# جنگ - سرایا - غزوات

## سيرة خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

غزوات	سرایا
۳۲۸ غزوہ ابواء	۵۱۱ سریرہ ابو سلمہ
۸۳۲' ۷۸۸' ۵۵۶' ۵۲۲' ۵۱۱' ۵۱۰' ۵۰۹' ۳۸۲ غزوہ احد	۳۲۹ سریرہ حمزہ بن عبد المطلب
۶۶۲' ۶۶۱' ۶۳۰' ۶۱۳' ۶۰۳' ۲۹۶ غزوہ احزاب	۷۱۳ سریرہ دومہ الجندل
۷۸۷' ۷۴۱' ۷۲۳ غزوہ بدر	۶۶۹ سریرہ زید بن حارثہ بطرف بنو سلیم
۷۸۸' ۳۷۳' ۳۲۶ غزوہ بدر	۶۸۱ سریرہ زید بن حارثہ بطرف حمی
۵۴۲' ۵۳۰' ۵۲۹ غزوہ بدر الموعود	۶۸۰ سریرہ زید بن حارثہ بجانب طرف
۷۲۶' ۷۱۶' ۶۳۱' ۶۳۰ غزوہ بنو قریظہ	۶۷۳' ۶۷۰ سریرہ زید بن حارثہ بطرف میص
۴۶۴' ۴۶۱' ۴۴۹ غزوہ بنو قینقاع	۴۷۷' ۴۶۶' ۴۶۵ سریرہ زید بن حارثہ بطرف قرہ
۶۸۰' ۶۷۷' ۶۷۶' ۶۷۵' ۶۷۴ غزوہ بنو لحيان	۶۸۲ سریرہ زید بن حارثہ بطرف وادی القرئی
۵۷۲' ۵۵۷' ۵۴۳ غزوہ بنو نضیر	۳۲۹ سریرہ سعد بن ابی وقاص
۵۲۵' ۵۲۲ غزوہ بنو نضیر	۶۶۲ سریرہ قرظا
۳۲۹ غزوہ بواط	۳۳۰ سریرہ عبد اللہ بن عث
۳۳۱ غزوہ بنو معونہ	۳۲۸ سریرہ عبیدہ بن الحارث
۵۵۶ غزوہ تبوک	۷۴۳' ۷۴۱ سریرہ عمرو بن امیہ
۷۸۹' ۶۶۲ غزوہ حدیبیہ	۶۶۸ سریرہ محمد بن مسلمہ
۵۰۴ غزوہ حراء الاسد	۴۴۹ سریرہ نخلہ
۸۲۱' ۳۶۷' ۲۹۷' ۹۷ غزوہ حنین	۳۴۹ سریرہ وادی نخلہ
۷۸۹' ۶۶۹' ۱۴۳ غزوہ خندق	
۸۲۱ غزوہ خیبر	

۷۲۱'۱۸۹'۱۵۴	جنگ احزاب	۵۴۰	غزوه دومه - الجندل
۳۳۹'۲۶۳'۲۳۲'۱۸۹'۱۵۴'۱۳۵	جنگ بدر	۳۶۳	غزوه ذات الرقاع
۷۸۸'۵۴۱'۵۴۳'۲۸۲'۳۷۷'۲۶۸'۲۵۸'۳۳۹		۳۶۳'۳۶۳	غزوه ذی امر
۳۱۴	جنگ بسوس	۳۳۰	غزوه سفوان
۳۵۷'۲۸۰'۲۶۳'۲۲۵'۲۲۱'۲۲۰	جنگ بعاث	۲۸۲'۲۶۱'۲۵۴'۲۵۳	غزوه سويق
۱۲۳	جنگ جمل	۸۹۲	غزوه طائف
۲۷۴	جنگ خندق	۳۲۹	غزوه عثیره
۱۸۹'۱۵۴	جنگ خیبر	۶۶۶	غزوه عکاشه بن محض
۲۳۰	جنگ صفین	۳۶۳'۲۵۲	غزوه قرقره الکدر
۱۰۴'۱۰۴	جنگ فجار	۵۷۰	غزوه مرتسج
۲۳۰	جنگ موده	۸۲۷'۶۸۳	غزوه موده
۶۸۹	جنگ یرموک	۳۲۸	غزوه ودان
۳۹۳'۱۲۹'۱۲۴	جنگ یمامه		
		جنگ	
		۲۳۱'۱۸۹'۱۸۳'۱۵۴	جنگ احد
		۵۲۹'۵۲۸'۵۰۶'۳۳۶'۳۳۳'۲۷۵	

# کتابیات

## BIBLIOGRAPHY

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

### قرآن کریم اور تفاسیر

- ۱۔ قرآن کریم
- ۲۔ تفسیر کبیر:- محمد بن عمر بن الحسین امام فخر الدین رازی (۵۴۳ھ تا ۶۰۶ھ)
- ۳۔ البحر المحیط:- الشیخ اشیر الدین ابو حیان بن محمد بن یوسف الاندلسی (وفات ۷۴۵ھ)
- ۴۔ تفسیر ابن کثیر:- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر ابن کثیر الدمشقی (۷۰۰ھ تا ۷۷۴ھ)
- ۵۔ الاقان فی علوم القرآن:- عبد الرحمن بن ابی بکر علامہ جلال الدین السيوطی (وفات ۹۱۱ھ)
- ۶۔ لباب النزول فی اسباب النزول:-
- ۷۔ ارض القرآن:- سید محمد سلیمان ندوی (۱۳۰۲ھ تا ۱۳۷۳ھ)



## احادیث و علوم حدیث

- ۱- جامع صحیح بخاری:- محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ البخاری (۱۹۳ تا ۲۵۶ھ)
- ۲- جامع صحیح مسلم:- ابو الحسین مسلم بن حجاج بن مسلم نیشاپوری (۲۰۲ تا ۲۶۱ھ)
- ۳- جامع صحیح ترمذی:- محمد بن عیسیٰ الترمذی (۲۰۹ تا ۲۷۹ھ)
- ۴- سنن ابو داؤد:- سلیمان بن اشعث البجستانی (۲۰۴ تا ۲۷۵ھ)
- ۵- سنن ابن ماجہ:- ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ (وفات ۲۸۳ھ)
- ۶- سنن نسائی:- ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائی (۲۱۵ تا ۲۹۵ھ)
- ۷- مؤطا امام مالک:- امام مالک بن انس (۹۳ تا ۱۸۹ھ)
- ۸- مسند احمد بن حنبل:- احمد بن محمد بن حنبل- ابو عبد اللہ (۱۶۳ تا ۲۴۱ھ)
- ۹- کنز العمال (فی سنن الاقوال والافعال):- شیخ علاؤ الدین السیسی بن حسام الدین (وفات ۹۷۵ھ)
- ۱۰- سنن دار قطنی:- ابو الحسن علی بن عمر دار قطنی (۳۰۶ تا ۳۸۵ھ)
- ۱۱- سنن بیہقی:- احمد بن حسین ابو بکر بیہقی (۳۸۳ تا ۴۵۶ھ)
- ۱۲- مشکوٰۃ المصابیح:- شیخ ولی الدین محمد بن عبد اللہ خطیب التبریزی (وفات ۷۴۳ھ)
- ۱۳- تلخیص الصالح (المختصر للصالح السیسی):- ابن قیم الجوزی عبد الرحمن بن علی بن محمد (۵۱۰ تا ۵۹۷ھ)
- ۱۴- جامع الصغیر:- علامہ جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۱ھ)
- ۱۵- مقدمہ ابن صلاح:- تقی الدین ابو عمر عثمان اشہر زوری المعروف بابن صلاح اصابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن حجر عسقلانی (۱۱۱۸ھ تا ۱۲۲۳ھ)
- ۱۶- تہذیب التہذیب:- ابن حجر عسقلانی حافظ شباب الدین احمد بن علی بن حجر (وفات ۸۵۲ھ)
- ۱۷- میزان الاعتدال:- شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد الذہبی (وفات ۷۴۸ھ)
- ۱۸- تاریخ کبیر فی الاحادیث والرواۃ:- امام بخاری محمد بن اسماعیل (۱۹۳ تا ۲۵۲ھ)
- ۱۹- المعجم الکبیر للطبرانی:- ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۲۶۰ تا ۳۶۹ھ)

- ۲۰- موضوعات کبیر:- ملا علی بن سلطان محمد القاری (وفات ۱۰۸۵ھ)  
 ۲۱- فتح الباری فی شرح صحیح بخاری:- ابن حجر عسقلانی شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی (وفات ۸۵۲ھ)  
 ۲۲- فتح المغیث فی شرح حدیث:- زین الدین عبد الرحیم بن الحسین (وفات ۸۰۵ھ)  
 ۲۳- اكمال شرح صحیح مسلم:- ابو عبد اللہ محمد بن خلفه الوشتانی (وفات ۸۲۸ھ)  
 ۲۴- سبل السلام شرح بلوغ المرام:- محمد بن اسماعیل البیہقی (وفات ۵۶۳ھ)

## تاریخ و سیرت

- ۱- سیرة ابن اسحاق:- محمد بن اسحاق (وفات ۱۵۱ھ)  
 ۲- سیرة ابن هشام:- ابو محمد عبد الملك بن هشام (وفات ۲۱۳ھ)  
 ۳- طبقات ابن سعد  
 ۴- سیرت حلبیہ  
 ۵- المواہب اللدنیہ:- شهاب الدین ابو العباس احمد بن محمد القسطلانی (وفات ۹۲۳ھ)  
 ۶- شرح المواہب اللدنیہ:- محمد بن عبد الباقي الزرقانی (۱۰۲۵ھ - ۱۰۹۰ھ)  
 ۷- نور النبراس فی شرح عیون الاثر:- برهان الدین ابراہیم بن محمد الحلبي (وفات ۱۳۸ھ)  
 ۸- الشفاء بتعريف حقوق المصطفى:- قاضي عياض المغربي (۵۴۶ھ - ۵۵۲ھ)  
 ۹- الروض الانف شرح سیرت ابن هشام:- ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد اللہ السبلی (وفات ۵۸۱ھ)  
 ۱۰- طحاوی:- احمد طحاوی (۵۲۳ھ - ۵۴۳ھ)  
 ۱۱- تاریخ طبری:- ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (۲۲۳ھ - ۳۱۰ھ)  
 ۱۲- کتاب المغازی:- محمد بن مسلم بن شهاب الزہری (وفات ۱۲۴ھ)  
 ۱۳- المغازی:- موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ)  
 ۱۴- مغازی الرسول:- ابو عبد اللہ محمد بن عمر الواقدي (۱۳۰ھ - ۲۰۷ھ)

- ۱۵- کتاب المعارف :- عبد الله بن مسلم بن قتيبة (وفات ۵۲۷ھ)
- ۱۶- زاد المعاد :- ابن قيم الجوزي عبد الرحمن بن علي بن محمد (۵۱۰-۵۹۷ھ)
- ۱۷- وفيات الاعيان :- ابن خلكان قاضي شمس الدين احمد بن محمد (وفات ۶۸۱ھ)
- ۱۸- المزهر :- جلال الدين عبد الرحمن بن ابی بکر السیوطی (وفات ۹۱۱ھ)
- ۱۹- تاریخ الکامل ابن اثیر :- عز الدين ابو حسن علي (۱۱۶۰-۱۲۳۳ھ)
- ۲۰- وفاء الوفاء باخبار دار المصطفى :- نور الدين السمهودی (وفات ۸۸۶ھ)
- ۲۱- تاریخ مکه :- ازرقی ابو الوليد محمد بن عبد الكريم (وفات ۲۲۳ھ)
- ۲۲- فتوح البلدان البلاذري :- ابو جعفر احمد بن يحيى (۵۲۷ھ)
- معجم البلدان ياقوت حموي :- شاب الدين ابو عبد الله ياقوت بن عبد الله (وفات ۶۲۶ھ)
- ۲۳- صفه جزيرة العرب :- ابن حاتك ابو محمد حسن بن احمد الحمداني (وفات ۳۳۳ھ)
- ۲۴- تاريخ الاسلام السياسي :- ذاكر حسن بن ابراهيم مصر (۱۸۳۱-۱۹۱۱ء)
- ۲۵- التوفيقات الالهامية (هجري - عيسوي كيلنذر) :- محمد مختار باشا مصري (۱۲۷۸-۱۳۱۵ھ)

## اسلاميات

- ۱- مجمع البحار :- شيخ محمد طاهر سمرقاني (۵۹۰-۹۸۶ھ)
- ۲- عوارف المعارف :- شيخ شاب الدين عمر بن محمد بن عبد الله السمرودي (وفات ۶۳۲ھ)
- ۳- تھذيب الانام (تجريد الروایا) :- عبد الغني بن اسماعيل النابلسي (۱۰۵۰-۱۱۴۳ھ)
- ۴- ازاله الخفاء عن خلافة الخلفاء :- شاه عبد الحق محدث دہلوی (وفات ۱۱۷۶ھ)
- ۵- كشف الغم عن جميع الامم :- محمد بن عبد الوهاب بن احمد الشمراني (وفات ۳۵۳ھ)
- ۶- کتاب الخراج :- امام ابو يوسف يعقوب بن ابراهيم (وفات ۱۸۲ھ)
- ۷- بدایۃ المجتہد :- ابن رشد قرطبي ابو الوليد محمد بن احمد بن رشد (۵۲۰-۵۹۵ھ)
- ۸- كشف الطنون :- مصطفى بن عبد الله حاجي خليفه كاتب طبلي

## کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام وخلفاء سلسلہ

- ۱۔ براہین احمدیہ چار حصہ :- ۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۳ء
- ۲۔ سرمد چشم آریہ :- ۱۸۸۶ء
- ۳۔ ازالہ اوہام :- ۱۸۹۱ء
- ۴۔ نشتی نوح :- ۱۹۰۲ء
- ۵۔ براہین احمدیہ حصہ پنجم :- ۱۹۰۸ء
- ۶۔ چشمہ معرفت :- ۱۹۰۸ء
- ۷۔ من الرحمن :- ۱۹۱۵ء
- ۸۔ فصل الخطاب :- حضرت الحاج حکیم نور الدین خلیفہ المسیح الاول (طبع اول ۱۹۱۱ء)
- ۹۔ تقدیر الہی :- تقریر حضرت المصلح الموعود مرزا بشیر الدین محمود احمد جلسہ سالانہ قادیان (۱۹۱۶ء)

## عربی ادب ولغات

- ۱۔ تاج العروس :- امام محب الدین المرتضیٰ (وفات ۱۸۹ھ)
- ۲۔ اقرب الموارد :- سعید الخوری الشریقی البستانی
- ۳۔ دیوان الحماسہ :- ابوتمام حبیب بن اوس الطائی (۱۸۸ھ تا ۲۲۲ھ)
- ۴۔ کتاب الشعروالشعراء :- ابن قتیبہ محمد عبد اللہ بن مسلم (۲۱۳ تا ۲۷۶ھ)
- ۵۔ عربی ادب کی تاریخ :- پروفیسر نکلسن (۱۸۶۸ تا ۱۹۳۵ء)

## عیسائیت

بائبل (عہد نامہ قدیم و جدید)

ٹیکسٹ اینڈ کینن آف نیو ٹیسٹامنٹ مصنفہ سر ہنری سوٹار ایم اے

(TEXT AND CANON NEW TESTAMENT

BY SIR HENRY SOVTAR M. A)

## کتب ہندو مذہب

۱۔ پنتھ پرکاش :- کیانی گیان سنگھ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۲۲ء)

۲۔ سری کرشن جی :- لالہ لاجپت رائے (۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۸ء)

۳۔ منو سمرتی اردو :- (ترجمہ منو شاستر شکر تھندو دھرم) ماسٹر آتمارام جی (وفات ۱۹۱۳ء)

۴۔ منو شاستر شکر ت :- از فرمودات منو مہاراج رشی

۵۔ یوگور کرشن :- پنڈت جمویتی (وفات ۱۸۴۸ء)

## انسائیکلو پیڈیا

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

۲۔ انسائیکلو پیڈیا بلیکا

۳۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا

۴۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا

۶۔ چیمبرز انسائیکلو پیڈیا



- اخبارات و رسائل

- ۱۔ الہلال مصر:- نومبر ۱۹۰۴ء  
۲۔ ریویو آف ریلیجنز اردو:- قادیان  
۱۔ " " " " اگست ۱۹۰۶ء  
۲۔ " " " " اگست ۱۹۱۰ء  
۳۔ " " " " جنوری ۱۹۳۴ء  
۳۔ ہندوستان ٹائمز دہلی:- مورخہ ۲۹ / اپریل ۱۹۲۸ء



## سیرۃ خاتم النبیین حصہ دوم کے متعلق بعض آراء

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح " اس سال ایک کتاب سلسلہ کی طرف سے بیش قیمت شائع ہوئی ہے جس کا نام سیرۃ خاتم النبیین حصہ دوم ہے جو میاں بشیر احمد صاحب کی تصنیف ہے میں نے اس کا بہت سا حصہ دیکھا ہے اور اس کے متعلق مشورے بھی دیئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی سیرتیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس تصنیف میں اُن علوم کا بھی پر تلو ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلام کی تبلیغ میں بہت آسانی پیدا ہو جائیگی۔ "

نواب سرسکندر حیات خان سابق " سیرۃ خاتم النبیین کی تکمیل غیر مذاہب تک سرور کائنات کے صحیح معاشرتی و انتظامی حالات واضح کرنے کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ۔ بالخصوص ان بے بنیاد الزامات جنکے متعلق اکثر غیر مسلم بوجہ ناواقفیت یا تعصب بیجا نکتہ چینی کرنے کے عادی ہیں اُن کے متعلق نہایت خوبی اور وضاحت سے تاریخی واقعات کا حوالہ دیکر مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ہو جائے تو میرے خیال میں اسلام کی ایک بڑی بھاری خدمت ہوگی۔ "

سیٹھ عبداللہ ہارون ایم ایل۔ اے تاجر کراچی کی رائے " میری رائے میں اس زمانہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اُن میں سے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب مسلمانان ہند کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ "

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال باریٹ لاء لاہور کی رائے " اس تصنیف میں بعض اہم مباحث پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ "

جنابے لوی الف دین ایڈووکیٹ " عمدہ حاضر میں سیرۃ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور حق یہ ہے کہ ہر گلے دار رنگ و بوئے دیگر است " مگر اس کتاب کی نسبت جو نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ گلے سرسید ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خدا تے بلند و برتر نوجوان میرزا کی ہمت میں برکت دے کہ انہوں نے اس مبارک تالیف سے اسلام اور اسلامیوں کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ "

جنابے لوی الف دین ایڈووکیٹ " عمدہ حاضر میں سیرۃ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور حق یہ ہے کہ ہر گلے دار رنگ و بوئے دیگر است " مگر اس کتاب کی نسبت جو نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ گلے سرسید ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خدا تے بلند و برتر نوجوان میرزا کی ہمت میں برکت دے کہ انہوں نے اس مبارک تالیف سے اسلام اور اسلامیوں کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ "

جنابے لوی الف دین ایڈووکیٹ " عمدہ حاضر میں سیرۃ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور حق یہ ہے کہ ہر گلے دار رنگ و بوئے دیگر است " مگر اس کتاب کی نسبت جو نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ گلے سرسید ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خدا تے بلند و برتر نوجوان میرزا کی ہمت میں برکت دے کہ انہوں نے اس مبارک تالیف سے اسلام اور اسلامیوں کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ "

نواب اکبر یار جنگ بہادر زنج  
 بایکورٹ حیدر آباد دکن کی رائے

میری نظر میں سیرت کی اُردو تالیفات میں یہ بے مثل کتاب ہے۔ جنگ  
 غلامی۔ تعدد ازدواج پر اس قدر دل نشین اور سیرگن بحث کی گئی  
 ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ایک زمانہ میں ان مضامین پر میں نے  
 کافی غور کیا ہے اور جو کچھ اس کے متعلق مل سکتا تھا سب پڑھ ڈالا ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ  
 آپ نے ان مضامین کا حق ادا کر دیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے

سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد دوم موصول ہوئی۔ شکریہ مباحث ضروریہ  
 پڑھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی اس خدمت کی جزائے خیر دے۔ اور  
 مزید سعادت عطا فرمائے۔ اختلاف و اتفاق کی بحث الگ ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آپ نے اپنی  
 اس تصنیف میں محنت اٹھائی ہے۔

ایڈیٹر رسالہ المعارف اعظم گڑھ (یو۔ پی) کا ریویو

سیرۃ خاتم النبیین قادیان کی جماعت احمدیہ کی جانب  
 سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا  
 حصہ دوم زیر نظر ہے جس میں آپ کی مدنی زندگی شہد تک پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا نمایاں وصف مستشرقین  
 اور غیر مسلم مورخین کے اعتراضات کا رد ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب محنت اور کوشش سے  
 لکھی گئی ہے۔

ایڈیٹر اخبار "سیچ" لکھنؤ کا ریویو

سیرۃ خاتم النبیین حصہ دوم بہت مفصل و مشرح ہے اور  
 اس میں علاوہ واقعات تاریخی کے مسائل کا حصہ بھی کثرت سے  
 آگیا ہے۔ قانون ازدواج و طلاق۔ غلامی۔ تعدد ازدواج۔ جہاد وغیرہ کے مباحث خصوصاً  
 مفصل ہیں اور انگریزی خوان نوجوانوں کے حق میں مفید۔ معجزات پر بھی شافی بحث ہے۔۔۔ اور  
 سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مسائل پر بحث کرتے وقت مصنف کا قلب تحقیقات فرنگ  
 سے مرعوب و دہشت زدہ نہیں معلوم ہوتا۔ جیسا کہ اکثر متکلمین حال کا حال ہے۔۔۔ سرور کائنات  
 کی ذات پر جمال تو وہ ہے جس نے خدا معلوم کتنے بیگانوں تک کے دلوں کو موہ لیا ہے۔ اہل  
 قادیان تو بہر حال کلمہ گو ہیں ان کے کسی مصور کے قلم نے اگر اس حسین و جمیل کی ایسی دلکش تصویر تیار  
 کر دی ہے تو اس پر حیرت بے محل ہے۔

Published by :  
Islam International Publications Limited  
Islamabad. Sheephatch Lane.  
Tilford, Surrey GU10 2AQ U.K.

☆ 1996